ادیبوں کی معاشقہ خیاتے

''تم کو میرا پیار — پھول بہار دکھا رہے ہیں اور تم کو تہنیت بھیج رہے ہیں''۔

جواہر لال نہرو کا خط پدمجا نائڈو کے نام!

مرتب: ف۔ س۔ اعجاز

24 قیراطی رومانی سچائیاں

ادیبوں کی معاشقہ خیاتِ

نامور ادیبوں اور مفکروں کے اعترافاتِ عشق اور رومانی سوانحی تذکروں پر مشتمل نفسیاتی مطالعہ

مرتب: ف۔س۔اعجاز

ISBN 978-81-86346-34-1

ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ

مرتب : ف۔س۔اعجاز

"Adeebon Ki Hayat-e-Muasheqa"

(Love life of the litterateurs)

1st edition : 1990

2nd edition : 2014

Compiler : Fay Seen Ejaz

Price : Rs 800/- in India

US $ 25 or 17 Pounds (abroad)

BANK CHARGES EXTRA

Printer and publisher :

Insha Publications

25-B, Zakaria Street, Kolkata-700 073 (India)

Phone : 91-33-2235-4616

Email : inshapublications@yahoo.co.in

Layout, text composing, designing : Insha Publications

باشعور و باذوق لوگوں کو معنون

محبت کا خوبصورت دائمی جزیرہ

خبرِ تحیرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

(سراؔج اورنگ آبادی)

کیا ہے عشق---

کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق — جان کا روگ ہے بلا ہے عشق

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو — سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

عشق معشوق، عشق عاشق ہے — یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں — کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق

کون مقصد کو عشق بن پہنچا — آرزو عشق و مدعا ہے عشق

کوئی خواہاں نہیں محبت کا — تو کہے جنس ناروا ہے عشق

میرؔ جی زرد ہوتے جاتے ہیں
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

میرؔ تقی میرؔ

ترتیب نمبر	رونے کی نشاندہی	مضمون کا عنوان اور قلمکار کا نام	صفحہ نمبر
11	''اگر قیس و فرہاد کا کوئی جانشین یہ ارشاد فرمائے کہ جوش صاحب معاف کیجئے۔ اس صورت حال کو عشق نہیں عیاشی کہتے ہیں تو میں یہ جواب دوں گا کہ بھئی تم کو میرے اس اہتمام کی مطلق خبر نہیں کہ میں نے عشق و عیاشی کو ہمیشہ ایک بہت بڑے احترام آمیز فاصلے پر رکھا ہے اور ان قلبی و جسمانی دھاروں کے مابین میں نے ایک ایسا پردہ ہمیشہ حائل رکھا کہ وہ کبھی اور کسی عالم میں بھی ایک دوسرے سے ہم آغوش نہیں ہونے پائے۔'' جوش ملیح آبادی کی جرأتیں؛	''میرے معاشے'' جوش ملیح آبادی	098
12	''میں نے عشق کیا بھی تو کہاں۔ مگر ایسی کونسی نئی بات کر دی تھی میں نے۔ عشق تو ہوتا ہی غلط جگہوں پر ہے۔ یہی تو اس کی روایت ہے۔ میں کوئی ایسا کٹر قسم کا مذہب پرست نہیں ہوں۔ کبھی مندر نہیں جاتا۔ کبھی کسی پوجا پاٹھ یا یگیہ وغیرہ میں بھی شامل نہیں ہوتا۔ ہندو دھرم کا ایک بھی منتر مجھے یاد نہیں۔ سب ٹھیک ہے اور مجھے اسلام بطور دینی عقیدہ پسند بھی ہے مگر اس میں کیا تک ہے کہ میں محض اس لئے مسلمان بنا دیا جاؤں کیوں کہ مجھے ایک مسلمان لڑکی سے عشق ہے۔ صغریٰ مسلمان ہے۔ اس کی میرے ساتھ شادی ہو جائے تو وہ ہندو ہو جائے گی مگر کیوں؟'' زمین اور مذہب کے ساتھ تقسیم ہو جانے والی ایک آپ بیتی	''آج تک کی ہے کئی بار محبت میں نے'' بلراج ورما	129
13	''ایک دوسرا دھماکہ۔ ویسا ہی جیسا بچپن میں لگا تھا۔ وہی طوفانی رات کا منظر۔ بجلی کی چمک۔ اندھا دھند بارش۔ آوازیں۔ دوبلی جلی سانسوں کی آوازیں۔ دور۔ بہت دور۔ ایک تڑپتے ہوئے دل کی آواز۔ قریب۔ بہت قریب۔! اس سے زیادہ تسکین مجھے دنیا کے اور کسی جذبے میں حاصل نہیں ہوتی۔ اسی جذبے نے صرف اسی جذبے نے مجھ میں تخیلی رفعتیں اور لکھنے کی بڑی انوکھی صلاحیتیں بخشی ہیں۔''	''سحر ہونے تک'' آغا جانی کشمیری تلخیص و ترتیب: ف۔س۔اعجاز	159

ترتیب نمبر	رویے کی نشاندہی	مضمون کا عنوان اور قلمکار کا نام	صفحہ نمبر
37	''اختر شیرانی کی عیش کوشی رندی و مستی اقربا و اعزہ سے لاتعلقی اور ہر وقت کی شعر نوازی نے اس کے والد کے دل میں اس کے خلاف سخت غم و غصہ اور رنج و نفرت کے احساسات پیدا کر دیے تھے۔'' اختر شیرانی کہتا تھا۔ اگر مجھے نہ ملیں تم تمہارے سر کی قسم میں اپنی ساری جوانی تباہ کروں گا	''سلمیٰ کا عاشق اختر شیرانی'' مضمون مرتب کردہ: ف۔س۔اعجاز	415
38	''فانی کو اپنے دور شباب میں ایک گوشت پوست کا انسان بطور معشوق ملا تھا جس سے ان کے تعلقات عارضی رہے مگر انھوں نے محبوب کی تجسیم ایک پیکر غم میں کروالی۔ انھوں نے غم کو ایک مستقل حیثیت دے ڈالی اور حسن، خدا کی قدرت اور اپنے اختیار کو اسی فرضی اوٹ سے دیکھتے رہے۔''	''محبوب غم فانی بدایونی'' ف۔س۔اعجاز	422
39	''یہ وہ حسن و نزاکت کی دیوی نہ تھی جس کی وہ برسوں سے پرستش کر رہے تھے۔ یہ ایک چوڑے منہ، چپٹی ناک اور پھولے ہوئے رخساروں والی مکروہ صورت عورت تھی جس پر صنف نازک کا کسی طرح بھی اطلاق نہ ہو سکتا تھا۔ ان کی ساری مستی رخصت ہو گئی۔ آہ! اس بھاگوان کو میرے ہی گلے پڑنا تھا..... اس کی طرف تو تاکتے ہی سے نفرت ہوتی ہے۔''	''پریم چند کی زندگی میں رومان'' پروفیسر قمر رئیس	431
40	''وہ کسی طرح نہیں مانتی تھی کہ میں بھی شاعر ہوں گا۔ وہ صرف تنقید کرتی اور کہتی کہ تم بہاری لال چکرورتی کی طرح شعر نہیں کہہ سکتے۔ اور میں اداس ہو جاتا''۔ ''ایک دن وہ آئے گا جب اس دنیا میں میری باتوں میں سے ایک بات بھی کسی کے دل میں نہیں رہے گی۔ لیکن کیا تم بھی ان باتوں میں سے ایک دو باتوں کو پیار سے یاد نہیں رکھو گی۔ تم جب میری تخلیقات کو اتنے پیار سے سنتی تھیں.......''	''ٹیگور کی داستان محبت'' شانتی رنجن بھٹاچاریہ	444

ترتیب نمبر	رویے کی نشاندہی	مضمون کا عنوان اور قلمکار کا نام	صفحہ نمبر
41	''اعصاب شکنی کا پہلا دورہ 1944ء...... مجاز...... اچانک بہت زیادہ بولنے لگے تو اتنا زیادہ کہ کسی دوسرے کو بولنے نہ دیتے تھے۔ دوسری پہچان یہ تھی کہ کرتے یا واسکٹ کی جیب سے چھوٹی سی ڈائری بار بار نکالتے تھے۔ پتہ نہیں ایسے موقعوں میں یہ ڈائری کہاں سے ان کے پاس آجاتی تھی اور جیسے ہی کوئی ٹیلی فون دکھائی دیتا وہ لپک کر نمبر ملانے لگتے تھے اور بہت دیر تک اپنے خیال میں زہرہ سے ٹیلی فون پر بات کرتے رہتے تھے۔''	''مجاز کا رومان'' پروفیسر محمد حسن	457
42	''عاشق، معشوق اور وصل۔ اس نے اس معاشقے میں شکست کھا کر اس مثلث کے ٹکڑوں کو اس طرح جوڑا تھا کہ ان میں ایک سالمیت تو آگئی تھی مگر اصلیت مسخ ہوگئی تھی۔ حسن، عشق اور موت۔ یہ تکون پچک کر میراجی کے وجود میں گول ہوگئی تھی۔'' سعادت حسن منٹو کا خیال	''ہندو صنمیات کے شاعر میراجی کی عشقی پیچیدگیاں'' ف۔س۔اعجاز	465
43	''اس پہاڑی لڑکی سے جو جسمانی لذتوں کی دلدادہ تھی میرے تعلقات صرف ذہنی اور روحانی تھے۔'' منٹو کے ایک خط سے اقتباس ''منٹو نے اپنی محبوبہ کو جو ایک پہاڑی چرواہی لڑکی تھی کئی پیارے نام دیئے ہیں۔ بیگو، وزیر بیگم وغیرہ لیکن دراصل ان سب پر ایک ہی کردار کی مہر ثبت ہے۔''	''منٹو کا عشق'' جگدیش چندر ودھاون ایم۔اے	470
44	''ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اپنی شاعری کی امتیازی معنویت کیا ہوسکتی ہے تو انھوں نے حسب عادت شرماتے، لجاتے اور الفاظ کو ناپ تول کر ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں حسن وعشق کی توہین کو گوارا نہیں کرتا۔ ان کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہوں۔ یہاں تک کہ رقیب کا ذکر بھی اہانت کے ساتھ نہیں کرتا ہوں.....''	''جگر مرادآبادی کے معاشقے'' رئیس الدین فریدی	484
45		''روشن فاطمہ اور جگر مرادآبادی'' محمد عابد شمس مرادآبادی	
46	''ساتھ کھیلے کی محبت بڑھ کے بن جاتی ہے عشق اس سے زائد عشق کا اے شاد میں قائل نہیں''	''شاد عارفی کے معاشقے اور ان کا تخلیقی ردعمل'' ڈاکٹر مظفر حنفی	494

ترتیب نمبر	رویے کی نشاندہی	مضمون کا عنوان اور قلمکار کا نام	صفحہ نمبر
52	''اُس (ساحر) کے جانے کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑوں کو سنبھال کر الماری میں رکھ لیتی اور پھر ایک ایک ٹکڑے کو اکیلی بیٹھ کر جلاتی تھی اور جب انگلیوں میں اسے پکڑتی تھی تو محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا ہاتھ چھو رہی ہوں ...... سگریٹ کے دھوئیں میں وہ جیسے جن کی طرح نمودار ہو جاتا ہے۔''	''اس کی یادوں کے لمس'' امرتا پریتم	544
53	''محبت کے روشن پہلو کے ساتھ ایک تاریک پہلو بھی تھا جو حسد کے روپ میں دیکھا گیا۔ وہ حسد دو دھاری تلوار ثابت ہوا جس نے فیض کو چاہنے والوں کے دل کاٹ ڈالے۔ ایک طرف ایلس فیض کو چاہنے والی دوسری عورتوں سے حسد میں مبتلا ہو گئیں اور دوسری طرف حاسد شوہر تھے جو فیض پر اپنی بیویوں کے نچھاور ہونے سے پریشان تھے۔''	''فیض، خواتین اور حسد'' انگریزی مضمون از ڈاکٹر خالد سہیل۔ اردو ترجمہ: ف۔س۔ اعجاز	550
54	''میری زندگی ایک عذاب ہے جس کا تجربہ میں اپنے دشمن سے دشمن کو بھی نہیں چاہتا کہ ہو۔۔۔ زندگی میں مجھے سب کچھ ملا جیون ساتھی کوئی نہیں ملا۔ اگر کوئی جیون ساتھی بن کر میری صلاحیتوں سے فیض یاب ہونا چاہے تو میں اسے آسمانِ ادب کا سب سے درخشندہ ستارہ بنا سکتا ہوں۔ ارے یہ میں کیا کہہ گیا۔ کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟'' فراق	''فراق گورکھپوری کے الٹے سیدھے معاملات'' ڈاکٹر افغان اللہ خاں	555
55	''اب سے نصف صدی پہلے کی لڑکیاں اور جوان العمر عورتیں شاعروں کو آسمانی مخلوق سے کم نہیں سمجھتی تھیں، وہ ان کے بارے میں خواب دیکھتیں...... یہ صورتحال ساغر صاحب کی زندگی میں بھی پیش آئی۔''	''ساغر نظامی کا عہدِ رومان'' سلمیٰ شاہین	562
56	''ان کا جاں نثار اختر سے عشق اسی جذبہ کے تحت پروان چڑھا جس میں نفسانی خواہشات کی ذرا بھی جھلک نہیں تھی ...... ان کی رباعیوں کے مجموعہ ''گھر آنگن'' کا انتساب خدیجہ کے نام اس طرح کیا گیا: ''خدیجہ کے نام جو میرے لئے صفیہ کا دوسرا روپ ہے۔''	''جاں نثار اختر اور خدیجہ'' نعیم کوثر	569

ترتیب نمبر	رونے کی نشاندہی	مضمون کا عنوان اور قلمکار کا نام	صفحہ نمبر
57	''جس کے لئے میں نے اپنے ماں باپ اور دوسرے رشتے داروں کو خیرباد کہہ دیا اگر اسے چھوڑ دوں گی تو میرا اور کون سا ٹھکانہ ہو سکتا ہے؟۔ یہ کہہ کر بیگم (ساحر ہوشیارپوری) رو پڑیں''۔		
	ساحر ہوشیارپوری	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	575
58	''میرے ہمسفر کیفی اعظمی''	شوکت اعظمی	
	چار عظیم سیاستداں ادباء: گاندھی' جناح' نہرو' منڈیلا		
			578
59	''گاندھی کے نزدیک جنسی اور سیاسی استحصال میں فرق تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کا انفعالی مزاحمت کا فلسفہ بیگم کستوربائی کا سکھایا ہوا ہے۔ ''میری خواہش کے خلاف اس کی پختہ مزاحمت نے مجھے خود سے شرمسار کر دیا اور مجھے اس احمقانہ خیال کے روگ سے نجات دلا دی کہ میں اس پر راج کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔''		
	''مہاتما گاندھی''	ف۔س۔ اعجاز	581
60	''رتن کے قبول اسلام اور محمد علی جناح سے شادی پارسی برادری کے لئے بڑا دھچکا تھا۔ انھوں نے مجبور ہو کر ڈنشا پیٹیٹ سے محمد علی جناح کے خلاف رتن کے اغوا کا مقدمہ درج کروایا۔۔۔۔ جج ۔۔۔۔۔ جناح سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''تم آخر اس چھوکری کے پیچھے کیوں پڑے ہو' کیا صرف اس لئے کہ یہ لاکھوں کی جائیداد کی وارث ہے؟'' جناح نے بپھر کر کہا ''اس کا جواب میرے بجائے رتن سے لیں۔''		
	''رتن بائی اور محمد علی جناح''	حکیم راحت نسیم سوہدروی	586
61	''کیا تم نے کبھی اس درد کا بھی خیال کیا ہے جو تمہارے کچھ نہ لکھنے سے پیدا ہوتا ہے؟ کیا تم نے میری اس تنہائی کا تصور کیا ہے جو میری تقدیر بن چکی ہے؟ کیا تم نے اس خول کے بارے میں سوچا جس میں میں بند ہوں' سب سے الگ تھلگ اور جس سے بھاگنے کے لئے میں خود کو مصروف پاتا ہوں؟''		

ترتیب نمبر	رویے کی نشاندہی	مضمون کا عنوان اور قلمکار کا نام	صفحہ نمبر
66	''ان کی گفتگو تو نہایت سنجیدہ ادبی اور کتابی رہی لیکن الگ ہوتے وقت معلوم نہیں کیوں اور کیسے انھوں نے ایک دوسرے کو چوم لیا۔ یہ ایک اچانک سا بوسہ تھا ارادتاً نہیں۔ پھر کیا تھا۔ وہ جذبات سے لبریز ہوگئی اور ---- صاف کہہ دیا کہ بوسہ ایک قسم کا وعدہ ہوتا ہے۔''	ایچ جی۔ ویلز کی داستانِ معاشقہ ''ایچ۔ جی۔ ویلز'' پروفیسر ایش کمار۔ ایم۔ اے	640
67	''لارڈ بائرن ہر محبوبہ کی زلف اپنے بکس میں رکھ لیتا......''	''لارڈ بائرن کی حیاتِ معاشقہ'' ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	644
68	''نہ جانے دم بھر میں کیا سوز ہو جائے ..... اپنے جذبات پردے میں رکھنا نہیں آتا تھا اسے۔ جب دیکھو دل کی بات زبان پر۔ اگر کوئی خوشگوار واقعہ ہو گیا ہے تو نا قابلِ بیان۔ بھلا مانس، ایک بار تری گورسکوے میں ---- کتاب بغل میں دبائے آیا۔ ہم سب اس کے گرد ست آئے اور اس نے ہمیں اپنی نظم ''بنجارے'' (سکانی) سنانی شروع کر دی۔ ایک تو نظم کی روانی اور پھر اس کی خوش الحانی 'پڑھنے کے انداز میں اس قدر ترنم بھرا تھا کہ مجھے تو نشہ ہو گیا''۔ پوشکن کی ایک تحفۂ الفت مہمان حسینہ مادام کیرن کی یادداشت ہے۔	ظ۔ انصاری کی کتاب پوشکن سے ماخوذ پوشکن کی حیاتِ معاشقہ ترتیب وتلخیص: ف۔ س۔ اعجاز	647
69	''خوش ہی نکلی ہے اور خوبصورتی مذہب۔ نرم مزاج تھا۔ یہاں تک کہ کھیلوں سے اسے نفرت تھی۔ اس کا مقولہ تھا کہ فٹبال جیسے کھیل سخت جان لڑکیوں کے لئے ہیں' لطیف مزاج لڑکوں کے لئے نہیں۔''	آسکر وائیلڈ کی حیاتِ رومان: ''آسکر وائیلڈ'' پروفیسر ایش کمار ایم۔ اے	660
70	''یہ کتاب میرے لئے مقدس ہے اور کیوں کہ کوئی دوسری مخلوق اسے کبھی نہیں دیکھے گی اس لئے میں جو جی چاہے اس پر لکھ سکتی ہوں۔ لیکن میں کیا لکھوں؟۔ کیا یہ لکھوں کہ میں اظہار کی تمام قوتوں سے بڑھ کر کتاب کے مصنف کو پیار کرتی ہوں اور یہ کہ میں اس کے جسم گویا پہلی) سے تیار ہوئی ہوں؟''۔ میری نے شیلے کے لئے لکھا۔	''شیلے۔ ایک انوکھا عاشق'' ف۔ س۔ اعجاز	666

ترتیب نمبر	رویے کی نشاندہی / مضمون کا عنوان اور قلمکار کا نام	صفحہ نمبر
77	''اچھی شادی کی پیشگی ضرورت ہے بے وفا ہونے کا لائسنس حاصل کرنا۔'' ''فرائڈ کا ہمعصر ماہر نفسیات فلاسفر ادیب'' کارل گستو ینگ'' (Carl Gustav Jung) ف۔س۔اعجاز	696
78	''ڈورا کمرے میں داخل ہوئی۔اس کے دونوں ہاتھوں میں پھول تھے۔اس نے پھول اس کے چہرے کے سامنے رکھے'' فرانز! خوبصورت پھولوں کو دیکھو ذرا سونگھ کر تو دیکھو۔بقول مسز آنا'' مردہ آدمی نے خود کو اوپر اٹھایا' پھولوں کو سونگھا' اس کی بائیں آنکھ بھی دوبارہ کھلی' یہ ناقابل یقین تھا۔'' ''کافکا کی آخری محبت'' سید سفیر حیدر	699
79	''اس کا ماننا تھا کہ عورت جو سب سے بڑا کام کر سکتی ہے یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ جنگ میں اتر پڑے اور اس کی بصیرت کو شعلہ بنا ڈالے۔'' ''ہنرک ابسن'' ف۔س۔اعجاز	706
80	''میں اپنے زانو پر تمہارے سامنے جھکتا ہوں اور تمہارے قدم ناز کو لاتعداد بوسے دیتا ہوں..... میں تمہارے پنجوں کو چومنے کو بے تاب رہتا ہوں۔'' ''فیودور دوستو وسکی'' ف۔س۔اعجاز	709
81	''ان محبتوں سے انہوں نے لفظوں کے سناٹوں کو توڑ دیا مگر ان کے اندر سناٹا ہی رہا...... عجیب داخلی تضادات کا شکار تھا یہ عظیم فن کار کہ انسانی جسموں کی عریاں تصویریں تو بنائیں مگر عریاں جسموں کی لذتوں میں کھویا ہوا رہنا انہیں کبھی اچھا نہیں لگا۔وہ یہ مانتے تھے کہ ایک عریاں جسم زندگی کی سب سے سچی اور مہذب علامت ہے مگر عملی طور پر کبھی بھی انہوں نے اس مہذب علامت کو اپنی زندگی کے دائرے میں داخل نہیں ہونے دیا۔'' ''خلیل جبران کی محبتیں'' حقانی القاسمی	712
82	خلیل جبران کی دو نظموں کا اردو ترجمہ میر گوہر علی خان	717
83	''یہ سوال بالکل لغو ہے کہ میں نے سلمیٰ سے شادی کیوں کی؟ آپ بھی کسی ہندو لڑکی سے شادی کر لیجئے۔میں روکتا تھوڑا ہی ہوں، یہ تو اپنا ذاتی معاملہ ہے جس میں دخل انداز ہونے کا کسی کو اختیار نہیں۔'' کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی پروفیسر بیگ احساس	721

فہرست/متفرق

شیکسپیر کے ۵۲ اقوالِ محبت : 52 Love Quotes of Shakespeare

عشقیہ نظمیں : (Love Poems)

پیش لفظ

18رفروری 1990ء۔

اتوار کی شام۔

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین۔

دن میں رُک رُک کر بارش ہوتی رہی۔ سہ پہر بعد تھم گئی۔ مگر فضا دھندلی اور موسم خوب ٹھنڈا ہوگیا۔ گلی غالب اکیڈمی کے ہال تک سجی ہوئی تھی۔ انشاء کے تیسرے خصوصی شمارے ''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' کا اجرا مرکزی وزیر، ماہر تعلیم، جمالیاتی نقاد پروفیسر شکیل الرحمٰن کے ہاتھوں ہونے والا تھا۔ دسمت میں شام کے ناشتے سے فارغ ہوکر تقریب کے شرکاء اور مہمان اپنی نشست لے چکے تھے۔ ہال پورا بھر گیا تھا۔ شرکاء کے بیٹھنے کی جگہ اسٹیج پر نہیں ہو پا رہی تھی۔ مشکل سے سب بیٹھ پائے۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ادارہ ''قلم زاد'' کے تحت پروفیسر قمر رئیس نے اپنے چند ہونہار شاگردوں کو تقریب کے انتظام کی ذمہ داری دے رکھی تھی۔ جلسے کے کنوینر ڈاکٹر خالد اشرف تھے۔ رئیس مرزا جو گذشتہ تین چار دنوں سے ہمارے ساتھ لطف و تفریح میں شریک تھے نظامت کرنے والے تھے۔ قمر رئیس اور خالد اشرف وغیرہ نے پہلے ہی انتباہ کیا تھا کہ یہ صاحب پیے لئے بغیر نظامت نہیں کرتے چاہے کوئی انہیں جتنا بھی کھلا پلا دے۔ آخر وہی ہوا۔ وہ سر شام ہمارے کلکتہ کے ساتھی اور ٹیم ممبر افضل اقبال کے ساتھ روسی سفارت خانے میں جس سے وہ کسی طور وابستہ تھے، بیٹھے ووڈکا چڑھاتے رہے۔ پروگرام شروع ہونے والا تھا کہ اپنی کار سے افضل اقبال کو باہر مین روڈ پر چھوڑ کر غائب ہو گئے۔

میں نے کئی پروگرام کئے اور بہتوں میں شریک ہوا۔ اجرا کا اُس جیسا یکسو، معروضی اور معنوی درجات میں اتنا بلند پروگرام اب تک نہیں دیکھا۔ علم و دانش میں ایک سے بڑھکر ایک مقرر خواہ ''ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر'' کا قلمی شریک رہا ہو یا نہ رہا ہو اظہار خیال میں بہت خوب رہا۔ دہلی میں ہمارے رہتے روزنامہ ''قومی آواز'' میں رسم اجرا کا اعلان اور اشتہار لگاتار شائع ہوتے رہے تھے اور کناٹ پلیس سے کمپیوٹرائزڈ دعوت نامے ہوا کر پروگرام سے چھ دن قبل پوسٹ کئے جا چکے تھے۔ ''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' موضوع ایسا اچھوتا اور پُرکشش اور ڈیڑھ دو سال سے ادبی حلقوں میں چرچے میں تھا کہ دور دراز سے کئی شائقین ادب نے بغیر دعوت ناموں کے حاضر ہونے میں تکلف محسوس نہ کیا۔

ہم اشوکا روڈ پر ہوٹل یاتری نواس کی شاید بارہویں منزل پر مقیم تھے۔

ریستوران نیچے تھا۔ وہیں قمر رئیس اور ان کے چند رفقا و شاگردوں کے ساتھ ایک آدھ روز کے وقفے سے بیٹھک ہوتی تھی اور پروگرام پر غور و خوض کیا جاتا تھا۔ سب ٹھیک چل رہا تھا لیکن ایک بات ہمارے موافق نہیں جا رہی تھی۔ وہ تھی مقامی ادبی سیاست۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے لئے چند روز قبل (یعنی پچھلی 26 جنوری کو) پدم شری کے اعزاز کا اعلان کیا گیا تھا جس سے کچھ لوگ حسد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن نارنگ صاحب سے میرے مراسم نئے نہیں رہے تھے۔ انشاء کے اولین خاص شمارے ''احمد سعید ملیح آبادی نمبر'' کا اجرا 1987ء میں کلکتہ کے گریٹ ایسٹرن ہوٹل کے ہال روم میں ایک شاندار تقریب میں ان کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ اور اب دہلی کی اس تاریخی تقریب میں نارنگ صاحب کو مدعو نہ کیا جائے مجھے منظور نہ تھا۔ لیکن افسوس ہوا جب پروگرام سے دو دن قبل یہ تاثر دیا جانے لگا کہ کچھ بہی خواہ جو اس پروگرام میں انشاء سے معاونت کر رہے ہیں اور ان کے نام دعوت نامے میں شامل ہیں، نارنگ صاحب کے آنے سے ان کی شرکت مشکوک ہو سکتی ہے۔ منتظمین کی طرف سے نارنگ صاحب کا نام دعوت نامہ میں شامل نہیں کیا گیا لیکن میں اپنے طور پر نارنگ صاحب کے گھر افضل اقبال کے ساتھ گیا۔ (بلکہ خود نارنگ صاحب نے فون پر ہمیں ناشتے کی دعوت دی تھی)۔ نارنگ صاحب نے میری غیر رسمی زبانی دعوت قبول کر لی اور وعدے کے مطابق ہال میں بروقت تشریف لائے۔ لیکن میں بڑی کشمکش میں تھا۔ ایک تو یہی فکر دامن گیر تھی کہ میری وجہ سے خدانخواستہ نارنگ صاحب کو کوئی شکایت کا موقع نہ مل جائے۔ شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ نارنگ صاحب کو جب مائک پر مدعو کیا گیا انہوں نے جم کر موضوعاتی علمی تقریر کی۔ ہاں اس کے بعد وہ رکے نہیں چلے گئے۔ کوئی اور مصروفیت انہیں درپیش تھی۔

میرا دوسرا اندیشہ زیادہ گمبھیر تھا۔ پروگرام سے دو دن قبل کہیں سے یہ اشارہ بھی ملا کہ جس موضوع پر یہ شمارہ نکالا گیا ہے اور جن پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے ان کو لے کر کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ سو ایک اضطراب اور وسوسہ مجھ پر طاری تھا۔ اللہ جانے کیا ہوگا؟ لیکن ہوا یہ کہ محض ''بخیر گذشت'' تک بات نہیں رہی بلکہ بہت جلد ملک بھر میں اور بیرون ملک اس نئے کام کو خوب سراہا جانے لگا۔ خصوصاً اس لئے کہ اس کے مضامین کسی بھی قسم کے اسکینڈل اور جنسی سنسنی خیزی سے پاک رہتے ہوئے متعلقہ ادیبوں کے رومان پرور ذہنوں کا انوکھا کرداری جائزہ پیش کر رہے تھے۔ ان مضامین میں ان کی عشقیہ جسارتوں کے ان کی زندگی، سوچ اور تخلیقات پر جو اثرات مرتسم ہوئے ان کا راست نفسیاتی تجزیہ اس سے پہلے اس طرح پیش نہیں کیا گیا تھا۔ پاکستان، برطانیہ، ناروے تک میں شہرہ ہوا۔ اجرا سے پہلے بین الاقوامی رسالے ''شمع'' میں دوبار پورے صفحے کا اشتہار شائع ہو چکا تھا۔ پاکستان میں تو قتیل شفائی صاحب نے خود اس نمبر کی خبروں اور اس پر تبصروں کا اہتمام کیا تھا۔

غالب اکیڈمی میں رسم اجرا کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب کی صدارت میں ادا کی گئی۔ مہمانان خصوصی اور مقررین میں پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شکیل الرحمن، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر تنویر احمد علوی، مجتبیٰ حسین، سید عاشور کاظمی (لندن)

اور جوگندر پال وغیرہ شامل تھے۔ ہال میں تشریف فرما معروف علمی ہستیوں میں ڈاکٹر ملک رام، ڈاکٹر ظ انصاری (وہ اُن دنوں دہلی آئے ہوئے تھے اور از خود ہال میں تشریف لائے۔ مجھے افسوس ہے کہ انہیں اسٹیج پر نہیں بلایا گیا اور وہ آخری کسی قطار میں بیٹھے رہے)، پروفیسر محمد حسن، یونس دہلوی، آمنہ ابوالحسن، نارنگ ساقی، اوم کرشن راحت، انجم عثمانی، ابن کنول، پیغام آفاقی، حاجی انیس دہلوی، دلیپ سنگھ، حسن نجمی، سکندر پوری، ذہین نقوی، علی صدیقی، انور عظیم، شرودت، بلراج ورما، ایوب تاباں، جگدیش چندر ودھاون، کمال جعفری وغیرہ کے نام اس وقت یاد آرہے ہیں۔

اجرا کے بعد جتنی کاپیاں فروخت ہوئیں اس سے زیادہ لوٹ لی گئیں۔ کیونکہ اسٹاک سنبھالنے والا کوئی صحیح آدمی میسر نہ تھا۔ پروگرام کی مختصر روداد اگلے صفحات میں موجود ہے۔ پہلے ایڈیشن کا اداریہ (مقدمہ) بھی شامل ہے۔ اب کچھ باتیں اس دوسرے ایڈیشن کے تعلق سے عرض ہیں۔

رومانی ادب جسم اور حسیات سے ہرگز لاتعلق نہیں رہتا۔ بشری تقاضوں کو نظرانداز کرتے ہوئے انسانی ذہن کا صحیح مطالعہ یا کسی شخصیت کا مناسب جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ عشق کے جذبے کی سمجھ اور پرکھ ہمیں روحانی اور ارضی کیفیاتِ عشق سے آشنا کراتی ہے۔ ادب انسان کی تفصیل ہے لیکن ہم نفسانی خواہشات کی ناز برداری کرنے کے باوجود روایتاً خود کو روحانیت کا پرستار ثابت کرنے کے خوگر واقع ہوئے ہیں۔ نیک و بد اور خوب و زشت کے پیمانے اپنی جگہ لیکن ہم اپنے اس میلان کے زیرِ اثر انسان کی جو تفصیل رقم کرتے ہیں اس کا ایک حصہ نامکمل سچ یا تصنع پر مبنی ہوتا ہے۔ ادب کو جز و بدن نہ بنانے کی پابندی ہم نے آپ خود پر لگالی ہے۔ ''ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ'' کے مضامین نگاروں نے محبت کے جذبے کی تفہیم کی خاطر ادب کو جز و بدن بنانے کا جتن کیا ہے جس سے کہیں روحانی، کہیں ارضی، کہیں جمالیاتی تو کہیں جنسی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ ان مضامین کے ذریعہ ادیبوں کے باطن میں جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے کہ جو عظیم شاعر و افسانہ نگار اپنے ادب میں محبتیں لکھ گئے خود ان کی محبتیں کیسی تھیں۔ آپ کی یہ جستجو آپ کو انسان کی فطرت کے بہت قریب پہنچا دے گی۔ کسی بے جا تکلف و شرم یا احساسِ معصیت سے آزاد ہو کر یہ اقبالی اور بیانیہ مضامین لکھے گئے ہیں جن میں جذبہ کھلا اور روانی میں ہے اور عقل پرستش کردار و عمل کے قرینے سے دستبردار نظر نہیں آتی۔ مشرق اور مغرب میں بلا شک و شبہ جرأتِ اظہار کا فرق ہے۔ ہمارے ذہنی سانچے مذہب اور تہذیبی اقدار کی پاسداری کے بغیر تیار نہیں ہوتے۔ یہ تکلف ہمیں تصوف، مزیت اور بھگتی کے پردوں میں چھپا کر روحانیت کی جانب لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس عشق کے بیان میں مغرب کم اِخفا پسند واقع ہوا ہے۔ اُن کے عشق میں گمشدگی کی کیفیت چاہے جس درجہ کی ہو جنسی ماورائیت کے وہ قائل نہیں ہیں۔ وہاں کے ادیب مصور اور فلم ساز عشق کے باب میں جنسی گرویدگی کے ذکر سے گریز نہیں کرتے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے ادب میں رومانی تحریک مغرب سے آئی لیکن اہلِ مغرب کی ارضیت پسندی کی اپنے ادب میں ہم نے تقلید کم کی ہے۔

اب چند اشارے دوسرے ایڈیشن کی ترکیب کے بارے میں۔ پہلے ایڈیشن کے بعض مضامین میں نئی تحقیق کی روشنی میں ترمیم کی گئی ہے۔ بعض شخصیات سے متعلق پرانے مضامین نکال کر نئے مضامین ڈالے گئے ہیں۔ بعض میں جزوی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ کلاسیکی شعرا مثلاً داغ، اختر شیرانی کے ابواب میں ترمیم ہوئی ہے۔ بنگالی شعرا میں سے قاضی نذرالاسلام کے تعلق سے نئی تحریر کا اضافہ ہوا ہے۔ کچھ اور بنگالی ادبا کے مختصر رومانی تذکرے شامل ہوئے ہیں۔ اسی طرح چارلس ڈکنس اور دو ایک اور انگریزی ادیبوں کے ابواب جدید ترین معلومات کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔ محقق و نقاد وتارا چرن رستوگی مرحوم کے ایما پر عظیم سنسکرت شاعر بھرتری ہری کی داستان عشق بھی لکھ دی گئی ہے۔ چند نئے یورپی ادبا کے علاوہ اسپین کی دو شاعرات ولّادہ اور حفصہ کے رومانی تذکرے بھی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ شیکسپیئر پر بہت مواد ملتا ہے مگر سب منتشر اور نا تمام نظر آتا ہے۔ اشاعت سے ذرا پہلے بہت سوچ سمجھ کر ڈاکٹر ستیہ پال آنند صاحب سے ہم نے درخواست کی اور موصوف نے ناسازی طبیعت کے باوجود چند روز میں شیکسپیئر پر ایک عمدہ مضمون تحریر کر دیا۔ یہ مضمون ہمارے حاشیائی اضافہ اور نجیب رامش مرحوم کے دو مکتوبات کے ساتھ موضوع کا مناسب احاطہ کرتا ہے۔

ایک بہت اہم اضافہ جناب اسلم کاویانی کی تحقیق کی دین ہے۔ مغلیہ عہد کے ادیب بادشاہوں اور فرماں رواؤں کے عشق کے تذکرے واقعی اچھوتی پیشکش ہیں۔ انہیں کاویانی صاحب نے خاص طور پر اس اشاعت کے مقصد کی تکمیل کے لئے مرتب کیا ہے۔

عظیم سیاسی ادیبوں اور رہنماؤں میں سے نہرو اور جناح کے بارے میں جو مضامین پہلے ایڈیشن میں شامل تھے ان میں سے ایم۔ جے۔ اکبر کا مضمون نہرو کے بارے میں برقرار رکھتے ہوئے میں نے اپنا ایک مضمون ''ایڈوینا اور نہرو'' اضافی نوعیت کا شامل کیا ہے۔ اور جناح پر پرانے مضمون کی جگہ حکیم راحت نسیم سوہدروی کا مضمون پیش کیا جا رہا ہے جو ہفت روزہ ''اخبار نو'' دہلی کے انتظامی مدیر مودود صدیقی صاحب کے توسط سے حاصل ہوا۔ گاندھی پر پہلے ایڈیشن میں کوئی مضمون نہ تھا۔ بابائے قوم کی زندگی کا یہ پہلو بڑے غور و فکر کا متقاضی تھا۔ میں نے احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ گاندھی جی کی زندگی پر اس زاویۂ نگاہ سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ قمر رئیس صاحب پہلے ایڈیشن میں ایسا ایک مضمون چاہتے تھے مگر وہ ممکن نہ ہوا۔ نیلسن منڈیلا پر ڈاکٹر خالد سہیل نے بڑی لگن سے ایک مضمون لکھا ہے (جس کا ترجمہ میں نے کیا ہے)۔ خالد سہیل نے علامہ اقبال اور فیض کے بارے میں بھی سیر حاصل مضامین لکھے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کا تذکرہ پہلے ایڈیشن میں اوم کرشن راحت نے چھیڑا تھا۔ لیکن ساحر کا موضوع 3D تحریر کا متقاضی تھا۔ چنانچہ نئے ایڈیشن میں اسے امرتا پریتم اور اظہر جاوید کے مضامین کے ساتھ مکمل کیا گیا ہے۔ (اظہر جاوید مرحوم نے یہ مضمون خصوصاً انشاء کے لئے لکھا تھا) جاں نثار اختر اور خدیجہ کی محبت پر ایک مہذب باب نعیم کوثر صاحب مدیر ''صدائے اردو'' بھوپال کی دین ہے۔ پیشتر قتیل شفائی پر میں نے ایک مکمل مضمون پیش کیا تھا۔ موجودہ ایڈیشن میں رنگی بادشاہ کی اقبالیہ تحریر اس پر ایک اضافہ ہے۔

ایک چوتھائی صدی کے بعد ادیبوں کی حیات معاشقہ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ ترمیم و اضافہ نے اس نئی پیشکش کو پچھلی پیشکش سے زیادہ وقیع اور مقصد میں بلند تر کر دیا ہے۔ دوسرے ایڈیشن کے لئے نئے اور پرانے ادیبوں کو لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن موصول مضامین میں سے بیشتر رد کر دئے گئے۔ بعض از سر نو لکھوائے گئے۔ اور آخر میں زیادہ سے زیادہ خود لکھنا پڑا۔ حالانکہ مرتّب نوعیت کی ادارت اور کتابت کا دوسرا ایک بڑا جوکھم ہے پھر بھی آخری مرحلے میں اس کتاب میں شیکسپیئر کے بعض ڈراموں سے منتخب اقوال محبت (Love Quotes) کے علاوہ کئی اعلیٰ غیر ملکی رومانی نظموں کا ترجمہ نیز اپنی چند منظومات شامل کر دی ہیں جن سے مضامین کی کیفیات میں خوشگوار اضافہ ہوگا۔ اپنی خوش قسمتی ہے کہ ''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' جیسی ایک منفرد اور بے مثال شے ہندوستان کی کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔ مقامِ مسرت ہے کہ اگر ربع صدی قبل ادب کا یہ زمرہ اس طرح پہلی بار سوچا گیا تھا تو آج اس زمرے کی تجدید کی سعادت بھی ہمیں ہی نصیب ہو رہی ہے۔

انشاء کے جلال الدین رومی نمبر کا ذکر کئے بغیر یہ اعتراف کرنے کا جی چاہتا ہے کہ عشق اور انسان کی ارضی تہوں اور روحانی بلندیوں کی پیمائش واقعی مشکل امر ہے۔ ادب تو محض اس کوشش کا ایک ذریعہ بنتا ہے۔ بڑی بات یہ بھی ہے کہ مشرقی نقطۂ نگاہ کو برقرار رکھتے ہوئے ہم نے دوسرے ایڈیشن کے مشمولات کو بھی مخرب اخلاق اور سنسنی خیز ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ ان مضامین میں ادیبوں کے معاملات عشق کو لے کر ان کے تصورِ حسن و جمال اور عشق سے وابستگی پر جس ذہنی یکسوئی سے گفتگو کی گئی ہے وہ حاصل کلام بھی ہے اور قابلِ رشک بھی۔ ارضی نکتۂ نظر کو بھی اوجھل نہیں ہونے دیا گیا ہے۔ ادب کی کارگہِ شیشہ گری میں ''ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ'' ایک نیا تجربہ سہی مستقبل میں یہ دستاویز جس کے پیچھے ایک شخصِ واحد کا 26 سالہ غور و خوض اور پُر خلوص جتن کار فرما ہے' متعلقہ ادیبوں اور مفکروں کی تفتیشِ ذات کے حوالے سے ایک اعلیٰ ماخذ ثابت ہوگی۔ ہماری رائے میں اس پیشکش کا مطالعہ سوانحی اور نفسیاتی تکنیک کے طور پر کیا جانا چاہئے۔ کہیں کہیں تو یہ مطالعہ عصبی علم Neuro Study میں داخل ہو گیا ہے۔ مگر لکھنے والوں کی خوبی ہے کہ انہوں نے ادب کو ادب کی طرح ہی لکھا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

آخر میں یہ سوچ کر ملال ہوتا ہے کہ ادیبوں کی حیات معاشقہ کے پہلے ایڈیشن کے بیشتر قلمکار بشمول ڈاکٹر قمر رئیس اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ میں ان کی یادوں کو سلام کرتا ہوں۔ کیسے اچھے تھے، وہ اور ہم۔ ایک جذبے کی ڈور سے بندھے ہوئے۔ مل کر کام کرنے والے!۔

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

'معاشقہ' معاشرے کا ایک رسوا لفظ ہے جسے کبھی شرفا اور ثقہ لوگوں میں سر اٹھانے کی اجازت یا توفیق نہیں ملی۔ اس کے باوجود سوسائٹی میں اس کا رواج رہا ہے۔ جب ایک مرد ایک عورت پر فریفتہ ہوتا ہے اور اپنی زندگی کے ہمسفر کے طور پر اسے حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ شخص عورت کے بارے میں ایک مخصوص پسند رکھتا ہے جو کسی اور کی پسند سے مختلف ہو سکتی ہے۔ یہی بات عورت کی جانب سے مرد کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔

ہر معاشرے کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ مشرقی تہذیب میں جنسِ عام (Free Sex) کا رواج نہیں ہے۔ یہاں جنس کی حدیں مذہب و اخلاق کی متعین کردہ ہیں جن کی پاسداری سے اصنافِ مخالف کے درمیان رشتوں کا تقدس اور احترام قائم ہے۔ اہلِ مغرب کے برعکس اہلِ مشرق مرد و زن کے رشتوں میں دائمی پاکیزگی اور محبت تلاش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے یہاں بھی عشاق کسی کے تیرِ نظر کے گھائل ہوتے آئے ہیں اور کسی کی چاہ میں اپنے سینے چاک کرتے رہے ہیں۔ عشق کرنے میں سارے انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔ سب کے غم و نشاط ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن حسی طور پر ادیب کے نزدیک عشق کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ ایک تو عام انسانوں کا سا تجربہ ہوتا ہے جو ادیب پر بھی اسی طرح گزرتا ہے جس طرح کسی اور پر۔ نفسیات کی رو سے اسے ہم کسی کے فطری میلان یا صنفِ مخالف کی جانب رویے (Attitude) سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جنسیات کی رو سے اسے طرفین کی تسکین کا سامان کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ناکام خواہشات شدید ردِ عمل پیدا کر دیتی ہیں اور ادیب جو ایک عام آدمی سے صرف اظہار کی قوت اور صلاحیت کی بنا پر مختلف سمجھا جاتا ہے، کے وجود کو متزلزل کئے بغیر نہیں رہتیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فطرت نے انسان کو محبت کا جذبہ تحفے میں دیا ہے۔ اگر محبت سچی ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ لیکن جہاں اس نے لذت و ہوس کی آلائش قبول کی یا ناپاک ارادے اس میں داخل ہوئے وہاں انسان منھ کے بل گرا ہے۔ عشقِ حقیقی بندے کو خدا تک پہنچا سکتا ہے تو عشقِ مجازی اسے شیطان بنا سکتا ہے۔

کسی ادیب یا شاعر کا ادب اس کے تجربات اور خیالات ہی کا بیان ہوتا ہے جس کے پیچھے اس کی نفسانی خواہشات اور جبلتوں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ سرگزشتِ حیات کا اہم ترین حصہ جو مشرقی سوسائٹی میں عموماً کسی بھی ادیب کی سوانحِ حیات میں جگہ نہیں پاتا ہم نے ان صفحات میں انہی کھوئے ہوئے افسانوں کی یادیں تازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ہمارا مقصد لفظ 'معاشقہ'

کو سماج کی نظروں میں اپنی طرف سے محترم بنا کر پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ناقدین اور شائقین کے روبرو ایک ادعا ہے کہ عشق مجازی ہو یا حقیقی زندگی اور کائنات کا ایک اہم جزو ہے۔ ادب مختلف جذبوں کی اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ جب ہم تجربات کی کئی اکائیوں کو داستان حیات سے چرا کر الگ رکھ لیتے یا چھپا لیتے ہیں تو حقیقت چھوٹی اور نامکمل ہو جاتی ہے اور فن تاریکی میں چلا جاتا ہے۔ ہمیں ادب میں دلچسپی ہے مگر ادیب سے لاتعلق ہیں۔ ہم اس کے ذہن و دل میں اترنے کی جسارت کریں تو ممکن ہے کہ اس کے ادب کو زیادہ قریب سے اور شاید ان زاویوں سے دیکھ سکیں جو اس کے اپنے تھے لیکن معاشرتی آداب کی پاسداری میں اُس نے انھیں چھپا لیا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہم نے ان ادیبوں کے بارے میں بھی فرشتوں جیسی رائیں قائم کر رکھی ہیں جو انسانی کمزوریوں کے باوصف بالکل نارمل انسان تھے اور اپنے خلاقانہ ذہن کی بدولت آسمان ادب پر اپنے ناموں کو چاند ستاروں کی طرح روشن کر گئے۔ ہماری رومانی شاعری کی بنیاد نفسانی لذتوں یا آرزوؤں کے اظہار پر قائم ہے۔ جب میر فرماتے ہیں ؎

اک عشق بھر رہا ہے زمیں آسمان میں

یا فیض دعویٰ کرتے ہیں ؎

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا ہے کیا

یا مجروح سلطانپوری کہتے ہیں کہ ؎

مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

یا جب شیکسپیئر کہتا ہے کہ ''جس نے پہلی نظر میں محبت نہیں کی اس نے محبت ہی نہیں کی'' تو یقیناً یہ ان ادیبوں کے مشاہدات اور تجربات کا سیدھا بیان ہوتا ہے۔ یہ وہ تحریکات ہیں جو حسن کو پانے کی لگن میں بیدار ہوتی ہیں اور جن کے ہلکے سے ایک اشارے پر درد کے بھاری پتھر کو ناتوانی کے عالم میں بھی اکثر شعرا اٹھانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

مجازی عشق عشقِ حقیقی ہی کا نمونہ پیش کرتا ہے بلکہ کبھی کبھی عشقِ مجازی سے ہی عشقِ الٰہی کی معنویت آشکارہ ہوئی ہے۔ یہ عمل تخلیق کی سطح پر رونما ہوتا ہے اور جذبۂ عشق کی آگ میں تپ کر ہی رومانی ادب 'لازوال' کی تخلیق کر پاتا ہے۔ جو اس آگ میں ڈوب کر گذر گئے انھوں نے اپنے قلم سے پھول کھلا دیے جن کی خوشبوؤں سے آج بھی سارا گلشنِ ادب مہک رہا ہے۔

زندگی سے کٹ کر ادب پیدا نہیں ہوا۔ سارا افسانوی یا شعری ادب ہماری زندگی کی پرچھائیں ہے۔ جب محبت ہوتی ہے تو کائنات کی ایک ایک شے میں نیا حسن نظر آتا ہے، درختوں کے پتے پازیب بجاتے ہوئے سے لگتے ہیں، ہواؤں کی سرگوشیاں، دریا کی موجوں کا تلاطم، آسمان کا پل پل بدلتا ہوا رنگ، بادلوں کا جھومنا دلوں میں ایک نئی ہلچل اور نیا سنگیت پیدا کر دیتا ہے۔ اور محبوب کو پانے اور اس کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ پوری طاقت اور خلوص کے ساتھ ابھرتا ہے۔ ایسے میں ادبا کے قلم سے نئی کہانیوں کا جنم ہوا ہے لیکن جن کہانیوں کا نتیجہ لاحاصلی اور جن دلوں کا مقدر صرف ٹوٹ جانا رہا ہو انھیں یا تو خوبصورت موڑ دے دئے گئے یا پھر یاس و الم کی تجسیم نئے الفاظ کے پیکر میں کر دی گئی۔ کئی بار کوئی

ہوئی جنتوں اور بہاروں کے بدل بھی تلاش کئے گئے مگر ۔

آج ہر آنکھ میں غیرت کی کہاں ہوتی ہے
ہر بدن بھی نہیں عاشق کی معیت کا علاج

کے مصداق لا حاصلی ہی دلِ ناکام کا مقدر بنی رہی ۔ اس ادھیڑ بن میں نجانے کتنے راہرو اپنے پاؤں توڑ کر ایک منزل پر بیٹھ رہے ۔ کتنوں نے آنسو پی لئے اور کتنوں نے چھلکا دئے ۔ اسے صرف زندگی کی ریاضت سے تعبیر کیا جائے گا ۔

اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اگر ادیبوں نے عشق نہ کئے ہوتے تو ادب کا بیشتر حصہ وجود میں نہ آتا اور لوگوں کے ذہن تخیل سے عاری اور حسن و عشق کے لئے جذب و قبول کی صلاحیت سے محروم ہوتے (کیونکہ اس صورت میں حسن ایک شجرِ ممنوعہ قرار دیا جا چکا ہوتا ۔ اور صنفِ مخالف کسی کے لئے کشش کا باعث نہ ہوتی بلکہ افزائشِ نسل محض ایک حیوانی عمل کے تابع ہوتی) ۔ یہ بھی درست ہے کہ عشق جو کیا نہیں جاتا بلکہ ہو جاتا ہے اپنی رفعتوں کو فیضانِ محبت کی بدولت نہیں بلکہ عرفانِ محبت کے ذریعہ ہی چھو سکتا ہے ۔ یوں تو سنگیت، مصوری یا فنِ لطیف کی کوئی بھی صنف عشق کے احساسات کے لئے وسیلۂ اظہار بن سکتی ہے لیکن اس کے لئے تمام فنونِ لطیفہ میں سے ادب کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔

جو کچھ ہم نے اوپر لکھا اس سے یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہئے کہ ہم ادیبوں کو سماج میں محبت کے نام پر کسی قسم کی بد اخلاقی کا لائسنس دلوانا چاہتے ہیں ۔ اس کے برخلاف ان تحریروں میں کئی ادیبوں کے کردار، ان کی انسانی کمزوریوں کے ساتھ پیش ہوئے ہیں جن سے یہ سمجھ لیا جانا چاہئے کہ عشق اور رومان کے تجربات عام سے ہوتے ہیں ۔ ان میں ادیب اور غیر ادیب کی تخصیص نہیں ہوتی ۔ تخصیص صرف 'اظہار' کی بنیاد پر ممکن ہے ۔ یعنی سرگزشتِ حیات کے کسی بھی واقعہ کو ہم اس نتیجے کی صورت میں دیکھیں جو ادب، فلسفہ یا کسی دیگر فنِ لطیف کی صورت میں برآمد ہوا ہے تو ہم اس مخصوص واردات میں ملوث ہونے والے کی سائیکی، اس کی طرزِ فکر، طبعی رجحان، فیصلہ کرنے کے انداز حتیٰ کہ اس کی مصلحتوں کو ایک معنوی رخ دے سکتے ہیں ۔ شاعر جب جمالیات کا اپنا نظریہ لے کر اپنے دور کا نمائندہ بنتا ہے تو اپنے ہمعصروں بلکہ آنے والی نسل کے افکار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر اختر شیرانی کا نام لیا جا سکتا ہے جن کے سیال اور جھاگ دار جذبات ان کے بعد والی نسل کے بھی کئی شعرا کے ذہنوں پر چھائے رہے ۔ چنانچہ ہماری یہ کاوش فنکاروں کے شوقِ بے جا کی مدافعت ہرگز نہیں کرتی ۔ اس کے برعکس یہ مجازی عشق کے حوالے سے انسانی کمزوریوں کو خلاقی کی سطح پر پرکھنے کی کوشش کرتی ہے ۔ اس شمارہ میں فاضل تذکرہ نگاروں اور اسکالروں نے ادیبوں، شاعروں اور مفکروں کے معاشقوں کا معروضی انسانی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے جس میں ادیب اپنی تخلیق کے پیچھے یا اس سے ہٹ کر زندگی اور سماج کے ایک کونے میں کھڑا ہوا نظر نہیں آئیگا بلکہ اس کے چہرے کو پہچانا اور پڑھا جا سکے گا ۔

اس خصوصی شمارے کے مشمولات کم و بیش اس طرح ہیں :

(۱) عشق اور ادیبوں کے رومان نیز حسن کے نظریات سے متعلق

نظری مضامین۔

(۲) کلاسیکی ادبا و شعرا کے رومانی تذکرے جو اسکالروں نے قلمبند کیے ہیں۔

(۳) کچھ ادیبوں کے رومان اور فنی نقطۂ نگاہ سے ان کے فطری کرداروں کا تجزیہ۔

(۴) چند گذرے ہوئے یا زندہ ادیبوں کے اعترافاتِ عشق۔

چوتھی اور آخری نوعیت کے مضامین میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن میں محض کوچۂ یار سے بازار تک کی خاک اڑانے کا احوال ملتا ہے یعنی ان میں عشق یا رومان کو تخلیق کی سطح پر لا کر بات کم کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک دو نوجوان مصنفین کی آپ بیتیاں شاید معتبر لوگوں کی خاص توجہ حاصل نہ کر پائیں۔ کیونکہ ابھی ان کے ادبی کردار زیرِ تعمیر ہیں اور قدم کوچۂ جاناں میں اب تک کہیں ٹھہرے نہیں ہیں۔ یقیناً ایک دن عمر انھیں سنجیدہ کر دے گی۔ لیکن اس ضمن میں چند باتیں کہنا واجب ہے۔ ایک تو یہ کہ ان مضامین کے مصنفین نے کم از کم اپنے بارے میں وہ سچ بولا ہے جو عدالت کے کٹہرے میں آسانی سے نہیں بولا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ ان کی سرگزشت داخلی اور خارجی محرکات کو پوری طرح خاطر میں لائی ہے۔ اور نئے زمانے کی جنسی اقدار اور طرفین کے مابین 'تو نہیں اور سہی' کی روش کو اجاگر کرتی ہے۔ ہر چند کہ یہ رسمی اخلاق کی رمز نہیں ہے لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ صنعتی انقلاب، مادی و سائنسی ترقی، معاشی انتشار نیز مغرب کے زیرِ اثر پلنے والی ذہنیت نے ہمارے معاشرے کی اعلیٰ کلاسیکی قدروں کا بے جا استحصال کیا

ہے جس کے سبب حسن روایتی حجاب و معصومیت اور عشق سنجیدگی سے عاری ہو گی
ہے۔ اس لحاظ سے یہ جذب و قبول یا امید و یاس کی داستانیں ایک طرف حسن و
عشق کی نئی نفسیات کی طرف ہمیں متوجہ کرتی ہیں تو دوسری جانب کلاسیکی ادب او
اس کے محرکات کا از سرِ نو جائزہ لینے پر بھی اکساتی ہیں۔

امید ہے کہ ان مضامین کی اشاعت سے اردو رومانی ادب کا احیا
ہوگا۔ اس گلدستہ میں ہم نے چند پرانے مضامین بھی نئے ڈھنگ سے پیش کرنے
کی سعی کی ہے۔ بلا شک و شبہ ادب میں یہ اضافہ صرف اس لئے ممکن ہوا کہ بقول
میر ۔

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

ف۔س۔ اعجاز

مدیر اِنشاء کے نام
بعض اہم قلمکاروں کے دلچسپ خطوط

"ادیبوں کی حیات معاشقہ" کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے سلسلے میں کئی قلمکاروں سے خط و کتابت رہی۔ بعض قلمکاروں کے اہم اور دلچسپ جواب موصول ہوئے جو یہاں پیش کئے جارہے ہیں۔ انہیں پڑھ کر قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "ادیبوں کی حیات معاشقہ" کے لئے مضامین حاصل کرنے میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ، نئی دہلی

محبی اعجاز صاحب! سلام و دعا،

معاشقہ نمبر کو اسکینڈلوں سے ضرور بچایئے ورنہ لوگ ذاتیات کی سطح پر اتر آئیں گے، یا پھر اسے "گزر چکے" ادیبوں تک محدود کیجئے، اس لئے کہ زندہ ادیب اکثر یا تو دور کی لیتے ہیں جیسا جوش ملیح آبادی نے 'یادوں کی بارات' میں کیا اور جھوٹ کو ایسی سہولت سے اظہار کی زبان دی گئی گویا کوئی سچ کیا بولتا ہوگا کہ اس سے ان کی تسکین ہوئی ہے۔ تو اکثر اس نمبر سے اپنی محرومیوں پر انا پرستی کا پردہ ڈالیں گے یا دوسروں پر کیچڑ اچھالیں گے یعنی اپنی frusturations کا بدلہ دوسروں سے لیں گے۔ بہر حال آپ دیکھ لیں۔

والسلام

گوپی چند نارنگ

۲۲ مئی ۸۸ء

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، نئی دہلی

مکرمی اعجاز صاحب! تسلیمات و نیاز

آپ نے انشاء کے "ادیبوں کے معاشقے نمبر" کے لئے مجھے کچھ لکھنے کو کہا ہے۔ اول تو ہر معقول کلام یا ڈرامہ کامیڈی یا ٹریجڈی جو بھی ہو سب کا محرک کوئی نہ کوئی معاشقہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ معاشقہ صرف اونٹ پر روایتی گھاس کے مترادف ہوتا ہے۔ اچھے شعر میں عصری، آفاقی، تجرباتی، ماحولیاتی خدا جانے کیا کیا عناصر ہوتے ہیں۔ شاعر ایک وجدانی کیفیت میں ہوتا ہے۔ بوقت تخلیق شعر صرف معاشقہ کچھ نہیں۔

اب یہ عشق ضروری نہیں جنس سے ملوث ہو۔ بیٹی، نواسی، ماں، بہن بھی سے ہوسکتا ہے۔ کسی حسینہ کو دیکھ کر لمحاتی عشق بھی ہوسکتا ہے جو کچھ سوئے ہوئے خوابوں اور ناآسودہ آرزوؤں کو جگا دیتا ہے اور شعر ہو جاتا ہے۔

"بڑے بڑے لوگوں" کے "بڑے بڑے معاشقے" پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس میں بہت کچھ من گھڑت بھی ہے۔ شبلی اور عطیہ فیضی کے معاشقہ کا بہت شور رہا ہے لیکن شہاب الدین دسنوی نے اسے جھوٹ اور ناقابلِ اعتنا ثابت کیا ہے۔ میں کس معاشقے پر لکھوں۔ معاشقے کے متعدد مدارج اور قسمیں ہوتی ہیں اور پھر لوگ معاشقہ کھلے

ضروری ہے کہ ''دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی''۔ عشق یا معاشقے کے مدارج ہو سکتے ہیں مگر یہ صفت جذباتی ہونے کے علاوہ بڑی حد تک جبلّی بھی ہے جسکے لئے ضروری نہیں کہ چاہنے والے کے سامنے کوئی ذات ہی ہو۔ وہ کوئی شے، کوئی ہنر یا خود اپنا آپ بھی ہو سکتا ہے۔ خوب وناخوب اسمیں کون اور کتنا ہے یہ بحث بالکل الگ۔ حسن وجمال اور اسکی کشش صرف انسانوں ہی کا حصہ نہیں ہے۔ یہ حیوانات میں بھی میں پایا جا سکتا ہے اور اب تو بات نباتات تک بھی پہونچ گئی ہے کہ موسیقی کے اثر سے پیار کی گفتگو سے انکا متاثر ہونا سائنس نے ثابت کر دیا ہے۔ شاید اچھی صورتوں کا اثر بھی ان پر ویسا ہی پڑتا ہو جیسا کہ ہم پر۔ غرض یہ کہ احساس جمال ایک ایسی نعمت ہے جسکے بغیر وجود انسانی ہی نہیں بلکہ وجود کائنات کا تصور نا ممکن ہے۔ اسی کے ظہور کا ایک اہم پہلو ہے عشق ومعاشقہ۔ پیمبروں سے لیکر ہم تک کوئی ایسا صحیح الدماغ نہیں جو اس سے مبرا ہو بلکہ بصد سامان رسوائی سربازار بھی محبوب کا نام لے کر رقص کرنے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ اسکے مظاہر تعمیری بھی ہیں تخریبی بھی کہ محبت تا جنس میں یہی حسن جمال تنزہ سے گر کر ابتذال تک پہونچ جاتا ہے۔ عشق ہوس بن جاتا ہے۔ گویا تاج محل کی تعمیر سے لیکر خانہ سوزی اور قتل انسانی تک پر منتج ہوتا ہے مگر یہاں گفتگو اسکے اُن عطایا ومظاہر سے ہے جس نے ذات الٰہی سے لیکر فرد انسانی تک کی پرستش پر اہل دل کو مجبور ہی نہیں فخر کے ساتھ وابستہ وجتلا کیا ہے۔ تاریخیں بھری پڑی ہیں کہ عشق اور معاشقہ کی بدولت اس کائنات نے کیا کیا مناظر دیکھے ہیں اور کائنات کو کیا کیا نہیں ملا ہے۔ تفصیل میں جانا تحصیل حاصل ہوگا۔ اب رہا وہ شخص جو یہ حروف رقم کر رہا ہے تو اس نے بھی عشق کئے ہیں اور کرتا ہے۔ کامیاب بھی ہوا ہے اور ناکام بھی اور رسوائے عام بھی۔ میری شاعری پر اسی کی کارفرمائیاں ہیں۔ کہیں وہ جان ہے اور کہیں جہاں۔ کہیں اسکا لہجہ عاشقانہ ہے اور کہیں سیاسی انقلابی، معاشرتی اور دانشورانہ کہ بقول میرؔ۔

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

والسلام

مجروح

حسن نجمی سکندر پوری، دہلی

پیکرِ خلوص جناب ف۔ س۔ اعجاز صاحب! اسلام وخلوص

''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' کے سلسلے میں احباب کو خطوط لکھ چکا ہوں۔ لیکن تادمِ تحریر کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ مرزا نوشہ اور جوش ملیح آبادی جیسے جیالے اب کہاں جو اپنی زندگی میں اپنا بایوڈاٹا لکھ ماریں۔ بلا سے دنیا خوش ہو یا ناراض!

اسی کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے طوائف بازی اور طوائف پرستی، شرفاء اور شعراء میں عام تھی۔ اس سماجی لعنت کو یہ طبقہ اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا لیکن

''وہ دن ہوا ہوئے جو پسینہ گلاب تھا''

اب تو سیٹھ ساہوکار اور گینڈا پہلوان طوائف بازی کرنے لگے ہیں۔ نہ و بازارِ حسن رہا اور نہ وہ آدابِ مجلس اور کورنش سے واقف طوائفیں رہیں۔ ایسی صورت میں جدید نسل کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی قسمت میں قدیم روایتی معاشق کہاں۔ پاس پڑوس میں تاک جھانک تو کی جا سکتی ہے (شرافت کو بالائے طاق رکھ کر

لیکن اس اقدام میں گنجا ہونے کے سو فی صدی امکانات ہیں۔

جس دانشور نے گھر میں ایک عدد حوا کی بیٹی کو بیوی بنا کر رکھ چھوڑا ہے اور اس کے آگے پیچھے سُر ملا کر رونے والے دو چار بچے ہیں وہ عقل خورانہ ہوا تو جیتی مکھی نگلنے کی حماقت کیوں کرے گا۔

یہی مسائل ہیں جن کا حل احباب کے لئے دردِ سر بنا ہو گا اور وہ دل ہی دل میں مندرجہ ذیل شعر دہرا رہے ہوں گے

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل — کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

حسن نجمی سکندر پوری

۶/جولائی ۸۸ء

خلیق انجم، نئی دہلی

اعجاز صاحب، آداب

آپ یقین جانئے کہ میرے لئے آپ سیکنڈ کلاس نہیں، فرسٹ کلاس آدمی ہیں۔ میری بدنصیبی ہے کہ میں اپنی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے عزیز دوستوں کو ناراض کر لیتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ بھائی اگر فرصت ہوتی تو میں دوسروں کے معاشقوں پر لکھنے کے بجائے خود اپنے معاشقوں پر مضمون لکھتا۔ اگلے چار پانچ مہینے تک قطعی فرصت نہیں ہے۔ آج کل ایک کتاب کی ترتیب میں مصروف ہوں۔ وہ کتاب پریس چلی جائے۔ پھر آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر۔

آپ کا خلیق انجم

۱۹/۷/۸۸

بلراج ورما، دہلی

۸۲/۷/۸۸

برادر عزیز اعجاز صاحب، آداب

لو آج ہم نے اپنے سارے کپڑے اتار پھینکے ہیں۔ "آج تک کی ہے کئی بار محبت میں نے" جو کہانی نہیں میری بھی آپ بیتی ہے، لکھ دی ہے۔ میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ لہٰذا افسانوی رنگ تو ضرور ہو گا اس آپ بیتی میں بھی۔ مگر جھوٹ اس میں ذرا نہیں ہے۔ میں نے بیجا ساج و سجاوٹ سے بھی پرہیز کیا ہے اور اگر کچھ ایک مناظر کو تفصیلی ڈھنگ سے لکھا ہے تو اس لئے کہ یہ ضروری تھا۔ اب تم اسے چھاپو یا لوٹا دو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ لیکن اگر تم واقعی سچ چھاپنے پر تلے بیٹھے ہو تو اسے نہ چھاپ کر تم ایک ایڈیٹر کے فرض سے کوتاہی کرو گے۔

اس کو پڑھ کر لوگ کیا کہیں گے اس کا خوف میں نے اپنے دل سے نکال دیا ہے۔ اس عمر میں بلا وجہ جھوٹ بول کر میں گناہگار نہیں بنوں گا۔ یہی سوچ کر سب کچھ لکھ دیا ہے جو ذہن میں محفوظ تھا۔

سجاد ظہیر پر میں ایک معتبر مضمون لکھواؤں گا۔ اس شخص نے بھی بہت بار لوگوں سے محبت کی تھی اور بہر طور وہ سچا اور صادق تھا مگر میں تفصیلات سے آگاہ نہیں ہوں۔

کرشن چندر البتہ عورت کے معاملے میں بڑے کمزور تھے۔ بیوی سے بھی زیادہ۔ میں انہیں 'سب نارمل' بلکہ 'اِم مارل' عاشق ہی کہوں گا۔ یہ شخص اخلاص سے بے تعلق تھا اور بہت بڑا عشق باز تھا۔ عاشق مزاجی کرشن جی کے دل و دماغ بلکہ روح پر بھی

تا عمر سوار رہی۔ سلمیٰ صدیقی نے ان کی زندگی میں اگر اس بیمار روش کو روک نہ دیا ہوتا تو
وہ دل کی بیماری سے نہیں کسی جنسی بیماری سے جاتے۔ اس اعتبار سے میں سلمہ صدیقی کو
ان کے لئے ایک بہت بڑا شگون سمجھتا ہوں۔ اگرچہ کسی کو بھی ان کا اپنی پہلی بیوی سے
الگ ہونا پسند نہ تھا۔ مہندرناتھ اور خواجہ احمد عباس کرشن کے سب سے مخلص دوست
تھے۔ مہندر تو ان کا چھوٹا بھائی تھا مگر عباس صاحب ان پر دل و جان سے فدا تھے۔ میں
نے کرشن جی کی پہلی بیوی کو کبھی نہیں دیکھا مگر شریمتی عباس کو کئی بار دیکھا ہے۔ مجھے
اعتراف ہے کہ ان سے بہتر بیوی بلکہ عورت میں نے زندگی میں دوسری کہیں بھی نہیں
دیکھی۔ وہ کرشن جی کی پہلی بیوی کو ایک اچھی عورت سمجھتی تھیں۔ وہ اتنی اچھی تھیں کہ ان
کے لئے اپنے شوہر کو کسی ایک سیما میں رکھنا قطعی ممکن نہ تھا۔ سلمیٰ صدیقی نے آتے ہی
لکشمن ریکھائیں کھینچ دیں اور کرشن نے باقی ماندہ زندگی انہیں حد بندیوں میں گزاری۔
معمولی گانے والیوں اور ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ سونے کو عشق یا معاشقے کا نام نہیں دیا
جاسکتا کیوں کہ ان کے ناموں کی فہرست تیار کرنا بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ بمبئی میں
مجھے بتایا گیا تھا کہ مہندرناتھ نے جس ایکسٹرا لڑکی سے شادی کی تھی یا جس کے ساتھ بغیر
شادی کے رہتے تھے وہ بھی پہلے ان کے برادر محترم ہی کی منظور نظر رہی تھی۔ وہ لڑکی اتنی
مخلص و نیک تھی کہ مجھے اس لاانجمن کے پیچھے چھوٹے لوگوں کی فطری کمینگی، خباثت اور
کینہ پروری زیادہ اور سچائی کم نظر آتی ہے۔ اس قسم کے بدباطن لوگ جو سماج کی کوڑھ
ہوتے ہیں ہر جگہ بروقت مل جاتے ہیں۔

سلمیٰ صدیقی کو میں ایک اچھی فنکارہ کے طور پر تو جانتا ہوں مگر ایک شخصیت
کے طور پر ان سے متعارف نہیں ہوں۔ اتنا البتہ میں ضرور کہوں گا وہ کرشن جی پر کچھ اس

طرح چھا سی گئی تھیں کہ ان کی آمد کے بعد کرشن جی نے ڈھنگ کا کچھ بھی نہیں لکھا۔ زبان
و بیان کے تو وہ شہنشاہ تھے اور تا عمر رہے بھی مگر گلشن جو ان کی شناخت ہے ان سے روٹھ
گئی تھی۔ اے کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔ ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ ہمیں بیسیوں نہیں درجنوں ایسی
کہانیاں دے جاتے جنہیں ہم فخر سے شاہکار کہہ سکتے۔ جو ہوا وہ ہونا ہی تھا۔ مقدروں
کی خدائی آدمی کے ہاتھ میں نہیں ہوتی مگر اس سب کے باوجود میں کرشن کو بیدی اور منٹو
سے بڑا فنکار مانتا ہوں یعنی کہ وہ ہماری کہانی کا سب سے اہم نشان تھے۔ سب سے بڑی
اشاریت، علامت اور رمز تھے۔ اگر زندگی نے وفا کی اور خدائے بزرگ و برتر نے بھی
توفیق بھی عطا فرمائی تو میں کرشن چندر پر ایک بھرپور شمارہ ترتیب دوں گا۔ یہ ایک عظیم
فنکار کے فن کا تقاضا اور ہم لوگوں کا فرض ہے۔

بلراج ورما

عزیز قیسی، بمبئی

برادر عزیز!

سلام و خلوص

آپ کا وہ خط بھی ملا جس میں ''ادیبوں کے معاشقے نمبر'' کے لئے آپ نے
مجھ سے لکھنے کی فرمائش کی تھی اور وہ خط بھی ملا جس میں آپ نے اپنا یہ یقین ظاہر کیا تھا کہ
میں مضمون کی تیاری کر رہا ہوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں آپ کے نمبر کے لئے کیا لکھوں۔ یہی
سوچتا رہ گیا۔ ادیبوں کے معاشقے زیادہ تر ان کے اپنے تالیف شدہ ہوتے ہیں۔ یا پھر پیر
نہیں اڑاتے مرید انہیں اڑاتے ہیں۔ اور بنیادی بات یہ ہے کہ ہم جس ملک میں رہ رہے
ہیں اور ادیب جس طبقے میں پیدا ہوتے ہیں (کم سے کم اردو کے بیشتر ادیب متوسط طبقے

کے افراد ہیں) اس میں "رسمِ عشق" یا تو بڑی عامیانہ گھٹیا سی بات سمجھی جاتی ہے۔ یا پھر
"یکطرفہ" ہوتی ہے۔ اس ملک کے اس طبقے کی نفسیات عجیب ہے۔ وہ فن اور ادب میں
عشق کو عشق کے بیان اور عشق کے دکھوں کے بیان کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ لیکن زندگی
میں اس جذبے کے عمل دخل سے متنفر ہیں۔ حسن لطیف کی کمی کا یہ عالم ہے کہ اگر دبے دبے
لفظوں میں ہی آپ نے کسی "ادیب یا شاعر" کے معاشقے کا ذکر کر دیا تو مرحوم کے ورثاء
خاندانی و ورثاء معنوی، مارنے مرنے پر تل جاتے ہیں۔ اپنے ہمعصروں کے معاشقے لکھئے تو
زندگی بھر کے لئے فریقین کا ہدف ملامت بنئے۔ فوجداری کا بازار گرم کیجئے۔

آپ نے اس نمبر کا اعلان اور ارادہ کر کے بڑی جرأت کا کام کیا ہے۔ پتہ
نہیں آپ "کن ادیبوں" کے معاشقے کس طرح چھاپ رہے ہیں۔ مرحومین کے
معاشقوں کے سلسلے میں تو کافی مواد آپ کو مل جائے گا لیکن ہمعصر ادیبوں کے معاشقے کو
چھاپنا ذرا مرحلۂ سخت ہی لگتا ہے۔

اس نمبر کے لئے میرے خیال میں میری ایک نظم کافی حسب حال ہے۔ یہ نظم
ادیب، شاعر، مصور، مغنی بدیہہ حسن پرستی اور تصور عشق۔ اس کے خوابوں اور آرزوؤں
کی تجسیم و تحلیل ہے۔ اگر یہ نظم آپ کو پسند آئے تو معاشقے نمبر کا پیش لفظ بنائیے۔ نظم ۵۲
سال پہلے کہی ہوئی ہے۔ اور میرے پہلے مجموعۂ شعر آئینہ در آئینہ میں شامل ہے۔ اس کا
عنوان Confession ہے۔ وہ کنفیشن جو چرچ میں کیا جاتا ہے۔ اور یہ عقیدہ ہے
کہ اس طرح اقرار کر لینے سے گناہ بخشا جاتا ہے

خیر طلب آپ کا، عزیز قیسی

۲۸ر جولائی ۸۸ء

ڈاکٹر شارب ردولوی، دہلی

مکرمی! تسلیم

ابھی ابھی آپ کا کارڈ "معاشقہ نمبر" کے مضمون کے لئے ملا۔ اس سے قبل
بھی آپ نے اس سلسلے میں خط لکھا تھا۔ عشق کرنا آسان ہے لیکن اسے کسی مضمون میں
بیان کرنا خواہ اپنے بارے میں ہو یا دوسرے کے، بہت مشکل کام ہے۔ اس لئے کہ
اپنے بارے میں آدمی ایمانداری سے نہیں لکھ سکتا۔ دوسرے کے بارے میں اس کا بیان
مکمل صحت پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ بہرحال دلچسپ موضوع ہے۔ اسی طرح کچھ معلومات
ادیب کی زندگی کے اس پہلو پر اکٹھا ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ اس کی
تخلیقات کے مطالعے میں بھی معاون ہوں۔

مضمون کے بارے میں عرض ہے کہ "ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق"۔ اب
اس کا ذکر کیا۔

مخلص

شارب ردولوی

۰۳ر اکتوبر ۱۹۸۸ء

علی سردار جعفری، بمبئی

برادرم! تسلیم

میں میر تقی میر اور سجاد ظہیر کی حیاتِ معاشقہ پر مضامین نہیں لکھ سکا جس کی
آپ نے فرمائش کی ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ ایک تو مصروفیت زیادہ ہے۔ دوسرے میر
کی حیاتِ معاشقہ پر اس سے زیادہ کچھ نہیں ملتا جو میں نے دیوان میر کے دیباچہ میں لکھا

ہے۔ یہ دیباچہ 'پیغمبرانِ سخن' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ سجاد ظہیر پر اس لئے قلم نہیں اٹھا سکا
کہ ہمارا معاشرہ طہارتِ نفس کی اس منزل تک ابھی نہیں پہونچا جہاں ادیبوں کے ذاتی
مسائل پر اعلیٰ تخلیق کی جا سکے۔'' اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔'' ہم یہ
کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

آپ کا
سردار جعفری
۱۳ر اکتوبر ۸۸ء

038 جوگندر پال، نئی دہلی

عزیزی اعجاز صاحب

خوش رہیے!

میرا معاشقہ اتنا زوروں اور کمزور ہے کہ تحریر میں اپنا سارا خون انڈیل کر بھی
اسے اپنے پاؤں پر کھڑا نہ کر پاؤں گا، سو بھول جایئے۔

آپ کا
جوگندر پال
۸ر نومبر ۸۸ء

نجیب رامش
31, Bagh Dilkusha
Lala Lajpat Rai Colony
Bhopal-462023 (M.P)
25-3-2010

ایک ان لینڈ لیٹر سے اقتباس۔
چند عبارتیں (......) واضح نہ تھیں۔

گرامی محترم!

شیکسپیئر کی داستانِ عشق Passing Reference کی شکل میں تو مندرجہ
ذیل کتابوں میں جو میں نے اس سلسلے میں پڑھی ہیں، ملتی ہے لیکن پوری کہانی کہیں نہیں
ملتی۔ شیکسپیئر کے سانیٹس پر ایک کتاب Martin-Seymour Smith کی ہے۔ اس
میں بھی ایک مضمون Autobiographical Elements in S'sonnets ہے۔
اس مضمون میں مختلف سانیٹس کے حوالے سے Deductions ہیں۔ پوری داستان
عشق یا اس کی Sensual Extravagence کے بارے میں منضبط اور مستقل
مضمون کی صورتیں کہیں نہیں ملتیں۔ اور تو اور اس Lady Love کا نام بھی افشا نہیں
ہوتا جسے چند ماہ کے لئے اس کا سرپرست Mr. W. H. لے بھاگا تھا۔ اس کہانی کی
تلاش میں مندرجہ ذیل کتب میں دیکھ چکا ہوں:

1. Life of Shakespeare by Dr. Samuel Johnson (1765)

2. Variaricum Editions of Shakespeare, Edited by Aldia Wright
3. Arden Edition of Shakespeare By Campbell (1890)
4. Shakespeare by Prof. Quiller - Couch (1902)
5. W. Shakespeare - a study of facts and problems by E.K. Chamber (1930)
6. William Shakespeare - Life & Works by Sir Ifor Evans (1938)

ان میں صرف ایک یا دو پیراگراف میں اس کی شادی، دو بیٹیوں کی پیدائش کے بعد اسٹراٹ فورڈ سے اُس کی روپوشی اور چھ یا آٹھ سال کے بعد دوبارہ اس کی نموداری کے بارے میں الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ ہمیں وہی کچھ ملتا ہے جو ایک کتاب میں ہے۔ یہ سب مطالعہ اپنے Cold Indifference towards fine arts کے باوجود میں نے کیا اور اب اپنی ناکامی کی تفصیل آپ کو لکھ رہا ہوں۔ پانچویں نمبر پر جس کتاب کا نام ہے اس کی اطلاعات کی توثیق کم وبیش بقیہ پانچ سے ہوتی ہے لیکن ایک یا دو پیراگراف کے سہارے مضمون نہیں لکھا جا سکتا۔ معذرت!۔

رہ گیا گاندھی جی کا سوال تو یہ سب کو معلوم ہے کہ ان کی شادی لڑکپن ہی میں کر دی گئی تھی اور وہ لندن جب بیرسٹر بننے گئے تھے تو شادی شدہ تھے۔ انہوں نے کستور با سے گوشت اور شراب نہ استعمال کرنے کا وعدہ کیا تھا جس پر وہ کاربند رہے۔ My Experiments With Truth میں ان کی اور کستور با گاندھی کی Intimate Life کی کہانی نہیں ہے۔ ایک پیراگراف میں ضرور یہ اطلاع ہے کہ وہ ایک ''دن'' یعنی دن کے وقت کستور با کے ساتھ عمل خاص میں مشغول تھے[1] جبکہ Annexed Room میں ان کی ماں یا شاید باپ نزع میں مبتلا تھے۔ اپنا intimate act ختم کرنے کے بعد جب وہ کمرے سے نکلے تو اس شخص مذکور کی موت واقع ہو چکی تھی۔ اس moral lapse کو انہوں نے یاد رکھا اور تا زندگی اس کے لئے خود کو معاف نہیں کر پائے۔

بس۔ اب اس سلسلے میں بھی آپ کی مدد کیا کر سکتا ہوں۔ چنانچہ معذرت خواہ ہوں۔ Gandhi, the Legend جو اُن کے پرائیویٹ سکریٹری پیارے لال نے لکھی تھی اس کی manuscript اور چھپی ہوئی ایک ..... کتابیں کانپور کے فساد میں پیارے لال کے مکان کے ساتھ ہی جل کر تباہ ہو گئیں۔ پیارے لال ..... کی کتاب میں مہاتما کے بارے میں چند دلچسپ انکشافات تھے۔ اب کہئے میں کیا کروں۔ Respectful Withdrawal اور کیا۔

خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

مخلص

نجیب راش

---

[1] یہاں راش صاحب کا فقرہ بدل دیا گیا۔ (اعجاز)

نجیب رامش (بھوپال)

16.3.2012 (ایک پوسٹ کارڈ سے اقتباس جو مکتوب الیہم نے شدید اور طویل علالت سے بحال ہونے کے بعد لکھا)۔

گرامی محترم!

...... اب بھی پندرہ بیس منٹ پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہوں تو پاؤں میں ورم پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اس لئے بستر پر پڑا رہتا ہوں۔ ایسے حالات میں شیکسپیر کے معاشقے کا مواد فراہم کرنا دوبھر ہے اور اس لئے بھی کہ اس کی سوانح میں کم سے کم ۸ یا ۱۰ سال کا عرصہ ایسا ہے جہاں وہ دنیا سے غائب رہا۔ مگر وہ تھیٹر کے باہر رئیسوں اور خوابوں کے گھوڑے تھامے کب کہاں چلا گیا اور پھر اسی تھیٹر میں اسٹیج پر اپنے ہی ڈراموں میں "Fool" کا کردار نبھاتے ہوئے ملا۔ اتنے دن کا خلا اُس کا کوئی بھی بایوگرافر پُر نہیں کر پا رہا ہے۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما (آگرہ یونیورسٹی) نے ایک بار کہا تھا کہ وہ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ اسٹراٹ فورڈ اپٹ ایون (یعنی شکسپیئر کا مکان۔ اعجاز) میں اس ڈرامہ نگار کے کمرے کی کھڑکی کدھر کھلتی ہے اور وہاں سے اس کی محبوبہ کے گھر کا کون حصہ دکھائی دیتا تھا۔ اب کوئی کم سے کم بھوپال میں تو ایسا نہیں ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ سی۔ سکسینہ ہیں۔ اُن سے پوچھوں گا کہ وہ اگر ایسی کوئی کتاب بتا دیں جس میں اس کے معاشقے بھی تحریر ل جائیں ورنہ صرف اُس کے سانیٹس ہی سہارا ہیں ان میں بھی کہانی بیحد بکھری ہوئی ملتی ہے...... ؂

نجیب رامش ●●

؂ میں نے شیکسپیئر کے اُن عظیم الشان سانیٹس میں سے چار کا اردو سانیٹس میں ترجمہ کیا تھا جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ اعجاز

بھرتری ہری کی دو کویتائیں

(1)

اپنی پھسلتی چوڑیوں کی کھنکناہٹ
اور اُن کے دائروں کی مرصع آوازوں سے
اپنی پائلوں کی جھنکار سے
وہ شاہی ہنس کی آواز کو شرماتی ہیں
اپنی خوف زدہ فاختاؤں کی سی کانپتی آنکھوں سے
لڑکیاں مردوں کے دماغوں کو غلام بنا سکتی ہیں۔

شرنگار شتک: 80

(2)

عورتیں صندل کی خوشبوؤں میں نہائی ہوئی
بارہ سنگھوں کی سی بڑی بڑی آنکھیں
جھرنوں، پھولوں اور چاندنی کے حسین کنج
کھلی چنبیلی کی بے پناہ معطر ہوائیں
اُڑا دالی اُنھوں نے چھت۔۔۔۔
موسم گرما میں یہی ہوا تو لگا دیتی ہے آگ
جذبے اور محبت میں!۔

شرنگار شتک: 98

روداد: محمد امیر الدین (کلکتہ)

دہلی میں ''ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ'' کا شاندار اجراء

ماہنامہ انشاء کلکتہ کے خصوصی شمارہ ''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' کی رسم اجرا غالب اکاڈمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ۱۸ر فروری ۱۹۹۰ء کو ہوئی۔ تقریب کی صدارت جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے کی۔ رسم اجرا نامور اردو پروفیسر ممبر پارلیمنٹ جناب شکیل الرحمٰن صاحب کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ تقریب کے مہمان خصوصی سید عاشور کاظمی (لندن) تھے۔

اجرا کے بعد پروفیسر قمر رئیس نے خصوصی شمارہ جو (انشاء کے سائز پر) بطور کتاب شائع کیا گیا ہے، کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے انشاء کے چار سالہ علمی سفر اور ادبی خدمات کا ذکر کیا۔ موصوف نے اس نئے موضوع کی انفرادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مدیر انشاء کی ادارتی صلاحیتوں اور جدید علوم پر ان کی دسترس کی ستائش کی۔ انہوں نے کہا کہ ''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' میں نہ صرف اردو بلکہ دیگر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی زبانوں کے ادبا، شعرا و مفکرین کی رومانی زندگی ضبط تحریر میں لائی گئی ہے جس سے یہ خصوصی شمارہ انٹرنیشنل بن گیا ہے۔ پہلی بار اردو میں ادیبوں کے رومان کے حوالے سے ان کے ذہنی سفر کا سراغ لگایا گیا ہے۔ موصوف نے امید ظاہر کی کہ جلد ہی اس شمارہ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگا جس میں نمایاں معاصر ادبا بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے کیوں کہ ف۔ س۔ اعجاز نے اسکینڈل اور سنسنی خیزی سے گریز کرتے ہوئے تمام مضامین جن میں ان کے اپنے بھی ۲۱-۴۱ مضامین ہیں، کی افادی حیثیت کو برقرار رکھا ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے ''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' کو اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ قرار دیتے ہوئے اس کے سرورق سے لے کر آخری صفحہ تک کی خوبصورتی اور معنوی تہہ داری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ انہوں نے میر و غالب کے عشق کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ حیات معاشقہ کا فن کار کے فن سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ خاص شمارہ میں مجروح سلطان پوری کے ایک خط بنام مدیر انشاء کا ذکر کرتے ہوئے خلیق انجم نے مجروح کے اس خیال سے اختلاف کیا کہ جب جمال پرستی کی حد سے گذر کر عشق لذت پرستی میں داخل ہو جاتا ہے تو عشق نہیں رہتا۔ موصوف نے دلچسپ انداز میں فرمایا ''میں بھی کبھی جوان رہا ہوں گا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرا معاملہ جمال پرستی سے شروع ہوا ہو۔ اس کے برعکس میرا معاملہ لذت پرستی سے شروع ہو کر لذت پرستی پر ہی ختم ہوا''۔ خلیق انجم صاحب نے نیاز فتحپوری کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے بیان کیا کہ جو لوگ تصوف کی ادعائیت کو عشق کا منبع قرار دیتے ہیں وہ عشق کی جسمانی اور نفسی صورت حال کی صحیح عکاسی

نہیں کرتے۔ شاعر اور ادیب کیونکہ حساس زیادہ ہوتے ہیں اس لئے کسی سطح پر
ان کی واردات عشق کے اثرات ان کے فن میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مدیر انشاء نے
پہلی بار اردو قارئین کو ایک مثبت ذہنی سمت دی ہے۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے خاص شمارہ کے سرورق کے مبہوت کن حسن
کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی اور مدیر ہوتا تو وہ ٹائٹل کی جگہ پُر کرنے کے
لئے ایک مرد اور ایک عورت یا انارکلی اور سلیم کی شبیہیں چھاپ دیتا لیکن ف۔س۔
اعجاز نے کسی انسانی چہرے کو سرورق کی زینت نہیں بنایا ہے۔ اس کے باوجود
سرورق اعلیٰ جمالیات کا مظہر ہے۔ مقرر نے مولانا شبلی اور عطیہ فیضی کے تعلقات
کے حوالے سے بات کرتے ہوئے خاص شمارے کے ایک مضمون کا ذکر تفصیل
سے کیا اور آئندہ ایسے موضوع پر لکھنے والوں کو زیادہ ہمہ جہت ہو کر اور انشاء کے
خاص شمارے کو رہبر مان کر لکھنے کی ترغیب دی۔

پروفیسر عنوان چشتی نے ف۔س۔اعجاز کے مقدمہ ''عشق بن یہ ادب
نہیں آتا'' کے دلائل کی داد دیتے ہوئے کہا کہ شاعر اور ادیب جو کچھ اسٹیج پر یا
اپنی تحریر و تقریر میں پیش کرتے ہیں ان کی بات وہیں محدود رہ جاتی ہے۔ کوئی
ادیب بالخصوص مشرقی ادیب اپنی خوابگاہ میں جھانکنے کا حق کسی کو نہیں دیتا لیکن
''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' میں مدیر نے فنی چابکدستی کے ذریعہ کسی کی خوابگاہ
میں جھانکے بغیر عشق سے متعلق مختلف ذہنی تصورات کو خوبصورتی سے یکجا کر دیا ہے
اور کسی کے بھی معاملے کو اسکینڈل بننے سے بچایا ہے۔ جب ہم کسی کے معاشقے کو یا
عشق کو اس کی زندگی سے متعلق سمجھ کر اس کے فن اور ادب میں دریافت کرتے
ہیں تو وہ معاشقہ یا عشق اسکینڈل بن ہی نہیں سکتا بلکہ وہ عشق بڑا بن جاتا ہے۔
عنوان چشتی صاحب نے جذبۂ عشق کی ازلیت اور مذاہب کی روشنی میں اس کی
معقولیت پر روشنی ڈالی۔

مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اردو ادیب ف۔س۔اعجاز انشاء اور
معاشقے کے حوالے سے نہایت عمدہ خاکہ پڑھا۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز
میں کہا کہ ف۔س۔اعجاز نے خصوصی شمارے ترتیب دے کر کئی ادیبوں کو مصیبت
میں ڈال دیا ہے۔ انہوں نے اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا کہ
شمارہ ترتیب دینے میں ف۔س۔اعجاز نے جتنی محنت کی ہے اگر اتنی محنت ادیبوں
نے اپنے معاشقے میں کی ہوتی تو وہ ضرور کامیاب ہو جاتے۔ صدر محفل کنور مہندر
سنگھ بیدی سحر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین نے کہا کہ بیدی صاحب اپنی
ذات سے خود حیات معاشقہ کا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا خصوصی شمارہ ہیں اور ان
کے حوالے سے جن تین چار شعراء کے معاشقوں کا ذکر ''ادیبوں کی حیات معاشقہ''
میں آیا ہے وہ تمام بیدی صاحب کے مرہونِ منت ہیں۔ ان کے معاشقوں کی
پرورش و پرداخت میں نہ صرف بیدی صاحب کے ہاتھ کا دخل رہا ہے بلکہ ان کی
اور بھی بہت سی چیزوں کا دخل رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ جو کوئی بھی اپنے عشق کو
ناکام بنانا چاہے گا وہ اس شمارے سے ضرور استفادہ کرے گا۔

مہمانِ معزز پدم شری گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اس وقت انشاء
پورے ہندوستان میں اردو کا واحد غیر سرکاری رسالہ ہے جو ہر ماہ پابندی سے
شائع ہوتا ہے۔ خصوصی شمارے کے بارے میں انہوں نے کہا کہ اس کی جامعیت

کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں ہر زاویہ سے عشق کے موضوع کو دیکھنے اور برتنے کی کوشش کی گئی ہے اور نہ صرف اردو بلکہ انگریزی، فرانسیسی، بنگالی، تلگو اور دیگر زبانوں کے فنکاروں، سیاسی مدبروں اور مفکروں کی سرگذشتِ عشق کو مدیر نے بڑی ذمہ داری سے پیش کردیا ہے جس سے ناقد کو یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ تمام ادب میں واقعاتی عشق کتنا ہے اور تخیلاتی کتنا ہے۔ سارا ادب حقیقت نہیں ہوتا۔ اگر ادب کو تمام تر حقیقتوں کا ترجمان کہا جائے تو پھر اخبار کیا ہے؟۔ عشق اور وارداتِ قلب ادیب کے لئے، صوفی سنتوں کے لئے بہت اہم ہے لیکن ادیب صرف اپنے عشق واقعی کے سہارے ادب کی تخلیق نہیں کرسکتا۔ اسے تخیل اور زیب داستان کی مدد لینا پڑتی ہے۔ ہمارے لئے دشواری اس وقت ہوتی ہے جب ہم ادب سے واقعات اور تخیل کو علیحدہ کرتے ہیں۔ ف۔س۔ اعجاز نے ہر زاویے سے خاص شمارہ کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ شائد آئندہ اس میں اور بہت سے اضافے کرنا چاہیں گے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کلاسیکی شعراء کے مجازی عشق کے حوالے سے گفتگو کی۔ ف۔س۔ اعجاز کے ادارتی ہنر کو کسوٹی پر پرکھتے ہوئے علوی صاحب نے ان کے اداریہ ''عشق بن پا ادب نہیں آتا'' میزان کے لکھے ہوئے بارہ چودہ مضامین کی افادیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ف۔س۔ اعجاز نے سوچ کا سفر حقیقتوں سے گذر کے طے کیا ہے۔

اجرا کار پروفیسر شکیل الرحمٰن ممبر پارلیمنٹ نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ شمارہ ایک ایسے شاعر، ادیب اور صحافی نے پیش کیا ہے جسے ہم بہار کے ایک تازہ جھونکے سے تعبیر کرتے ہیں۔ مسٹر رحمٰن نے کہا کہ یہ شمارہ ''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' نقادوں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب ایک نئی بحث اردو میں شروع ہوجائے گی جس کے واضح نتائج کم از کم دس بیس سال میں سامنے آئیں گے۔ فن کار کے لئے اعتراف کرنا سب سے مشکل کام ہے اور اپنے موضوعات کے لحاظ سے یہ شمارہ اردو میں بالکل اچھوتا کارنامہ ہے۔ اس شمارے نے ناقدین پر بڑی ذمہ داری عائد کردی ہے۔ جمالیات اور عشق کا موضوع ہمیں پکارنے لگا ہے۔ عشق عام آدمی بھی کرتا ہے اور ادیب بھی۔ عشق کی ایک سطح بھی ہوسکتی ہے اور مختلف سطحیں بھی۔ لیکن اس تجربے کی راہ سے کسی کے فن میں تلاش وجستجو کرنا ایک مشکل کام ہے۔ انسان کے ذہن اور جسم کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ ایک آشرم ہے جس میں انسان تنہا بیٹھا رہتا ہے۔ اس کی نفسی تحلیل کا تجزیہ کرنا محققوں سے زیادہ نقادوں کا فرض بنتا ہے۔ ف۔س۔ اعجاز نے نقادوں کو ایک نئی اور صحیح راہ پر لگادیا ہے۔

سید عاشور کاظمی (لندن) نے کہا کہ انہیں مجروح کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ عشق انسان کی فطرت ثانیہ ہے۔ یہ حقیقت میں انسان کی فطرت اوّل ہے۔ چنانچہ ہابیل اور قابیل کے مابین جو نفرت پیدا ہوئی اس سے پہلے ان کے مابین محبت کا جذبہ زندہ تھا۔ عاشور کاظمی صاحب نے ف۔س۔ اعجاز کا یہ شعر پڑھا۔

رقصِ حالات سے نظر ہٹ کر
تیرے رخسار پر ٹھہر جائے

انہوں نے حسن وعشق کی قربتوں میں نرگسی نزاکت کے پہلوؤں کا
ذکر کرتے ہوئے داغ کا بھی ایک شعر پڑھا

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

کاظمی صاحب نے کہا ف۔س۔اعجاز مجازی عشق کے کس مرحلے میں
ہیں وہ نہیں جانتے لیکن یہ بہت بڑی بات ہے کہ انہوں نے انسان کو فرشتہ نہیں
انسان بنا کر دکھایا ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں اپنی ایک دوست ڈاکٹر سعید
فریدین کا ذکر کیا کہ انہوں نے اقبال پر ایک تحقیق پڑھ کر فرمایا کہ پہلی بار انہوں
نے اقبال کو انسان سمجھا ہے۔

جوگندر پال نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ عام آدمی کے عشق میں جو
ایک تحریک اور طاقت ہوتی ہے وہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ ہمارے یہاں
کنفیشن کی روایت نہیں ہے۔ ہمارا ادیب اپنی سوانح عمری لکھتے وقت ادھر ادھر
سے اسے ڈھانپنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس خاص شمارے نے مناسب ڈھنگ
سے اصلیت اور GENUINNESS کا چہرہ دکھانے کی سعی کی ہے اور ہم
رک رک کر بھی اس روایت کو آگے بڑھائیں تو ہمیں اس کا یقین ہے کہ تازہ ہوا
آنے لگے گی۔ اور ہم فن کار کے انسپریشن کی روح کو اس طور بھی دیکھنے لگیں
گے۔ اس کے بیان سے تصنع کا نقاب اٹھ جائے گا۔

ف۔س۔اعجاز نے تمام شرکاء تقریب، دہلی کے ادارہ ''قلم زاد''
خاص طور پر اس کے کنوینر خالد اشرف کے تعاون اور حاضرین کی محبت اور توجہ کا
شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے ادیب کے عشق یا معاشقوں کے ذریعہ پہلی
بار اس کے ذہن و دل میں اترنے کی جسارت کی ہے۔ بڑی بڑی کہانیاں،
افسانے گڑھے جاتے ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کی عکاسی کرنا بہت مشکل کام
ہے۔ یہ شمارہ انہی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کی عکاسی کر رہا ہے جن سے مل کر زندگی
زندگی بنتی ہے۔ ہمارے افسانہ نویس اور شعراء کہانیاں اور شاعری لکھتے ہیں۔
پیش منظر دکھائی دیتا ہے پس منظر کا پتہ نہیں چلتا۔ پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ بعض افسانہ
نگاروں نے اپنی زندگی کی حقیقتیں اس خاص شمارے کے لئے قلمبند کی ہیں۔ کیوں
کہ اب تک وہ اپنے قلم سے صرف افسانوں کی تخلیق کرتے رہے ہیں اس لئے ان
کے قلم حقیقت کو بھی افسانہ بنانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ پہلی بار یہ چند لوگ
حقیقت کو حقیقت کی طرح لکھنے کی آزمائش سے گذرے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عرصہ
تحریر میں ہر لمحہ اور ہر موڑ پر تصنع سے گریز کرنا ان کے لئے ممکن نہ رہا ہو۔ لیکن یہ
بڑی بات ہے کہ انہوں نے اس کی جسارت کی۔ صدر محفل کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
نے تنگی وقت کی وجہ سے مختصر خطبہ صدارت پیش کیا۔

[بشکریہ ''سیاست'' حیدرآباد]۔
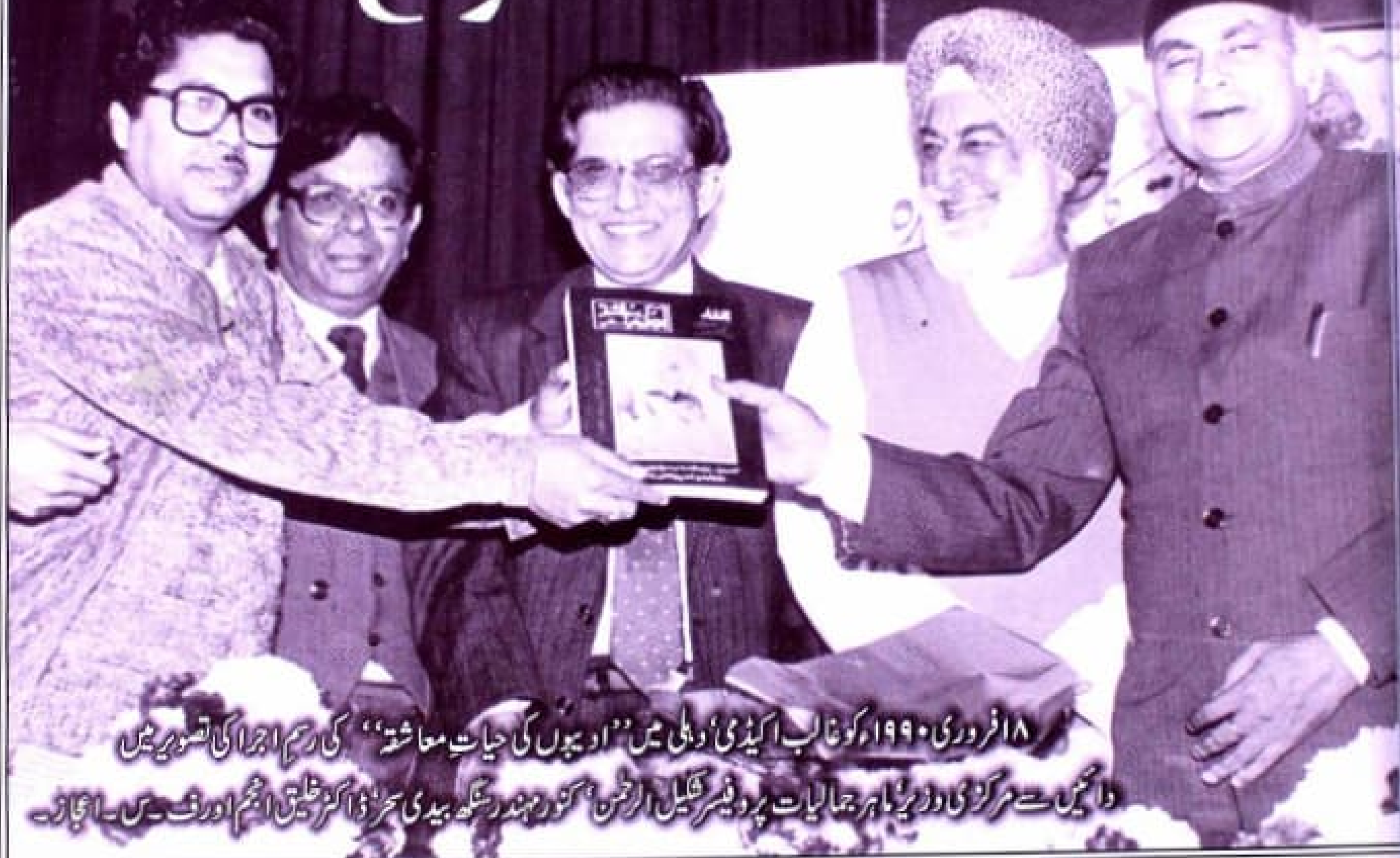
۱۸ فروری ۱۹۹۰ء کو غالب اکیڈمی، دہلی میں ''ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ'' کی رسمِ اجرا کی تصویر میں
دائیں سے مرکزی وزیر ماہر جمالیات پروفیسر شکیل الرحمن، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ڈاکٹر خلیق انجم اور ف۔ س۔ اعجاز۔

میں خود کو

کسی خوفناک ' لمبے ' من موجی ' چکر یلے

سیاہ کنول جیسے چمکدار سانپ سے ڈسوانا

پسند کروں گا

بہ نسبت کسی عورت کے تیرِ نظر کا شکار ہونے کے۔

سانپ کے کاٹے کا علاج کرنے والے

ہر کہیں مل جاتے ہیں

لیکن میرے لئے کوئی ٹوٹکا یا علاج نہیں

کیونکہ میں کسی حسینہ کی ایک اُچٹتی نظر کا مارا ہوں۔

بھرتری ہری: شرِنگار شتک سے ایک نظم
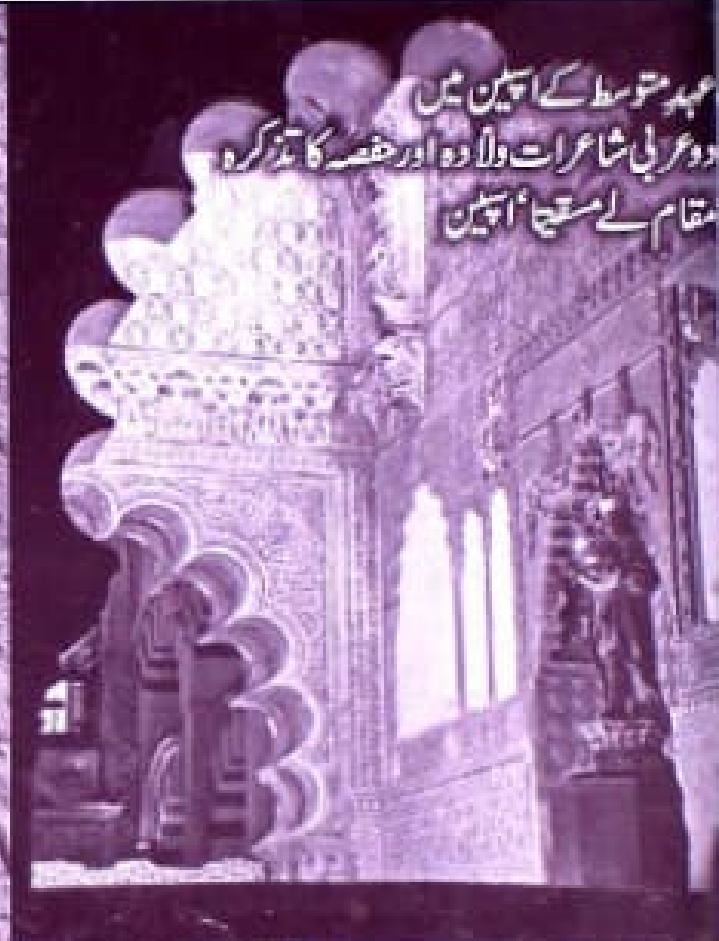
عہد متوسط کے اسپین میں
دو عربی شاعرات ولادہ اور حفصہ کا تذکرہ
مقام لے مستجا' اسپین

مدینۃ الزہرا ابن زیدون (1003-1070)

ولادہ (خاکہ)

المعتمد سویلے (1040-1095)

الاندلس

ڈرامہ ڈارک ایڈی 2:
ڈرامہ ڈارک ایڈی 1:
ولیم شیکسپیئر
شیکسپیئر کا ”روز تھیٹر“

غل بادشاہ جہانگیر
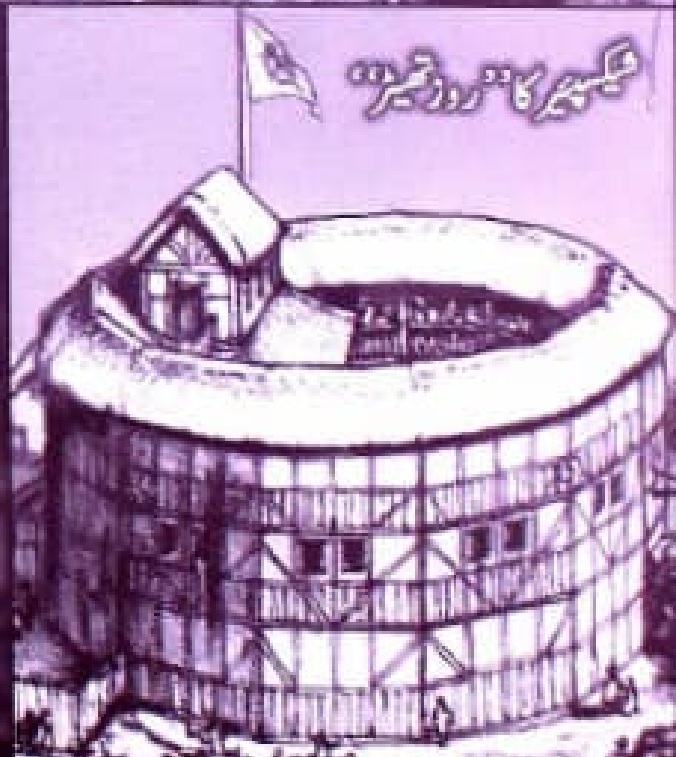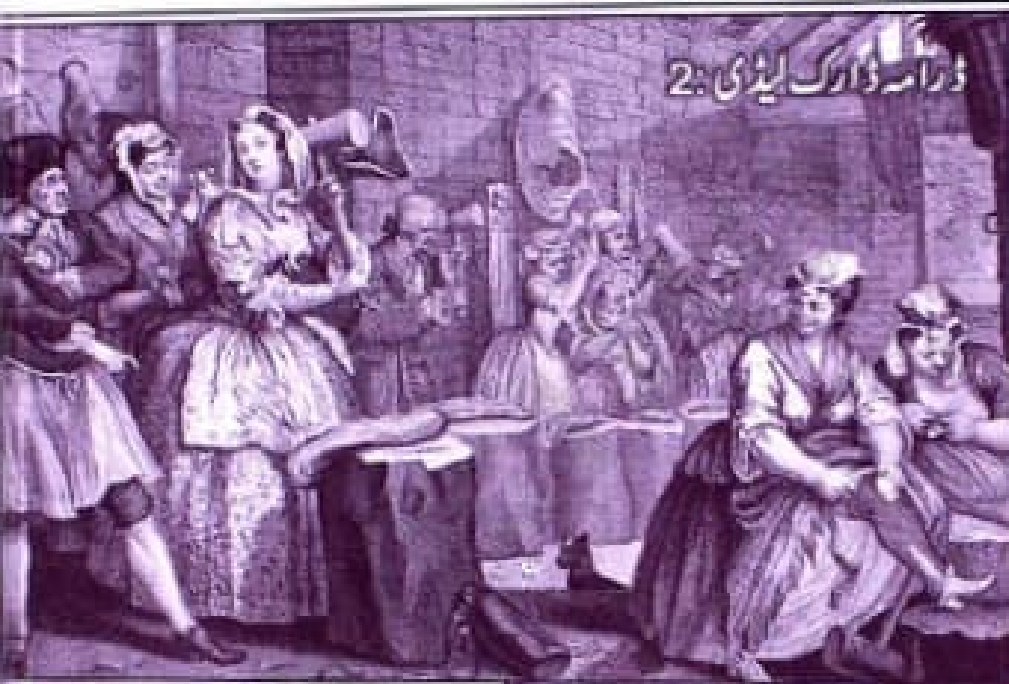
ملکہ نورجہاں

بادشاہ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء

دشاہ اورنگ زیب

شہزادی زیب النساء (خاکہ)
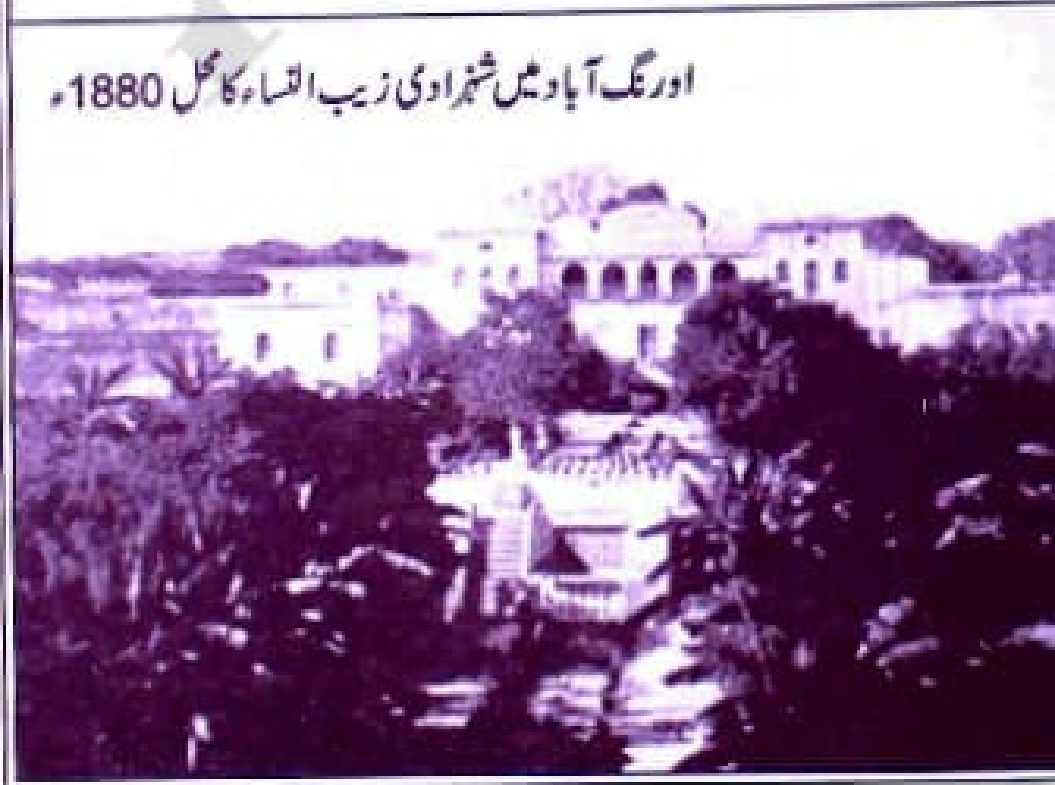
اورنگ آباد میں شہزادی زیب النساء کا محل 1880ء

میر تقی میر
مومن دہلوی
مرزا غالب
شبلی نعمانی
داغ دہلوی
سر محمد اقبال
میراجی
منشی پریم چند
اختر شیرانی
مجاز لکھنوی
بیگم عطیہ فیضی
فانی بدایونی
سعادت حسن منٹو
جگر مرادآبادی
جوش ملیح آبادی

ساحر
امرتا پریتم
ساحر لدھیانوی
امرتا پریتم
خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور
سدھا ملہوترہ
امرتا پریتم

فراق گورکھپوری

فیض احمد فیض

سمریش باسو

شرت چندر چٹرجی

مائکل مدھوسودن دت

کیفی اعظمی اور بیگم شوکت اعظمی

عزیز قیسی

جاں نثار اختر، بیگم خدیجہ اختر اور ان کی بیٹی منیزہ

ایک پرانی ہیروئن

ہمت رائے شرما اور فلم اداکارہ مدھوبالا

مدھوبالا

ہمت رائے شرما

ہمت رائے شرما اور مینا کماری

اقبال متین اور منیرہ

ساغر نظامی
آغا جانی کشمیری
بلراج ورما
قتیل شفائی
اقبال بانو
رشمی بادشاہ
ن۔م۔ راشد
خالد سہیل
بیٹی ڈیوس (Bette Davis)
مشرف عالم ذوقی
تبسم

نمک آندولن کے وقت

دائیں سے گاندھی، آبھا، سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان

کستوربا اور موہن داس کرم چند گاندھی

گاندھی اور کستوربا گاندھی

آبھا، گاندھی اور منو

محمد علی جناح
رتن بائی (مریم جناح)
رتن بائی کا پورٹریٹ

ایڈوینا' نہرو اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن

ایڈوینا اور جواہر لال نہرو

نیلسن منڈیلا

ونی اور نیلسن منڈیلا شادی کے بعد

منڈیلا اور بیوی ونی

منڈیلا بڑھاپے میں ایک جنم دن پر

منڈیلا اپنی بیوی گریکا کے ساتھ

ونی

پرجوش عوامی لیڈر منڈیلا

رابندرناتھ ٹیگور

ٹیگور اور بیوی مرنالنی دیوی

ٹیگور کی بھابھی کادمبری دیوی

وکٹوریہ اوکامپو

قاضی نذرالاسلام (مختلف وقتوں کی تین تصویریں)
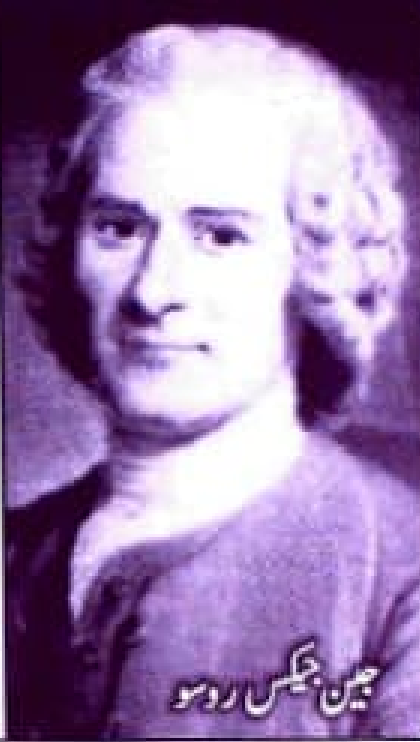
غری بیگم گری بالا دیوی

پرمیلا نذرالاسلام

شیلے
آرتھر شوپنہار
جین جیکس روسو
کارل مارکس (نوجوانی میں)
میکسم گورکی
فرانز کافکا
کارل گستو ینگ اور بیوی ایما
چارلس ڈکنس
کیتھرینے ڈکنس
ٹرنن ڈکنس

آسکر وائیلڈ
ایڈگر ایلن پو
پشکن
ایچ جی ویلز
آگسٹا بائرن
اوکسفورڈ بائرن
اینا بیلا ازابیلا بائرن
لارڈ بائرن

لیو ٹالسٹائی

لیو ٹالسٹائی
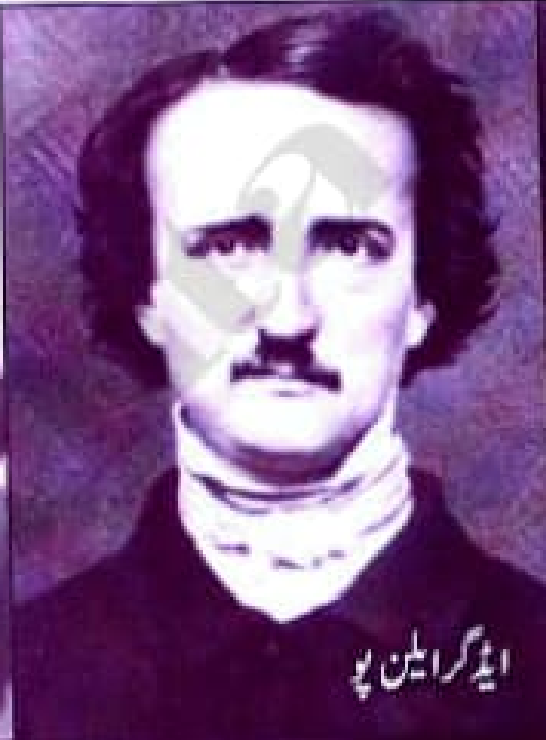
ٹالسٹائی کی بیوی صوفیہ اور اُن کی بیٹی الکسانڈرا
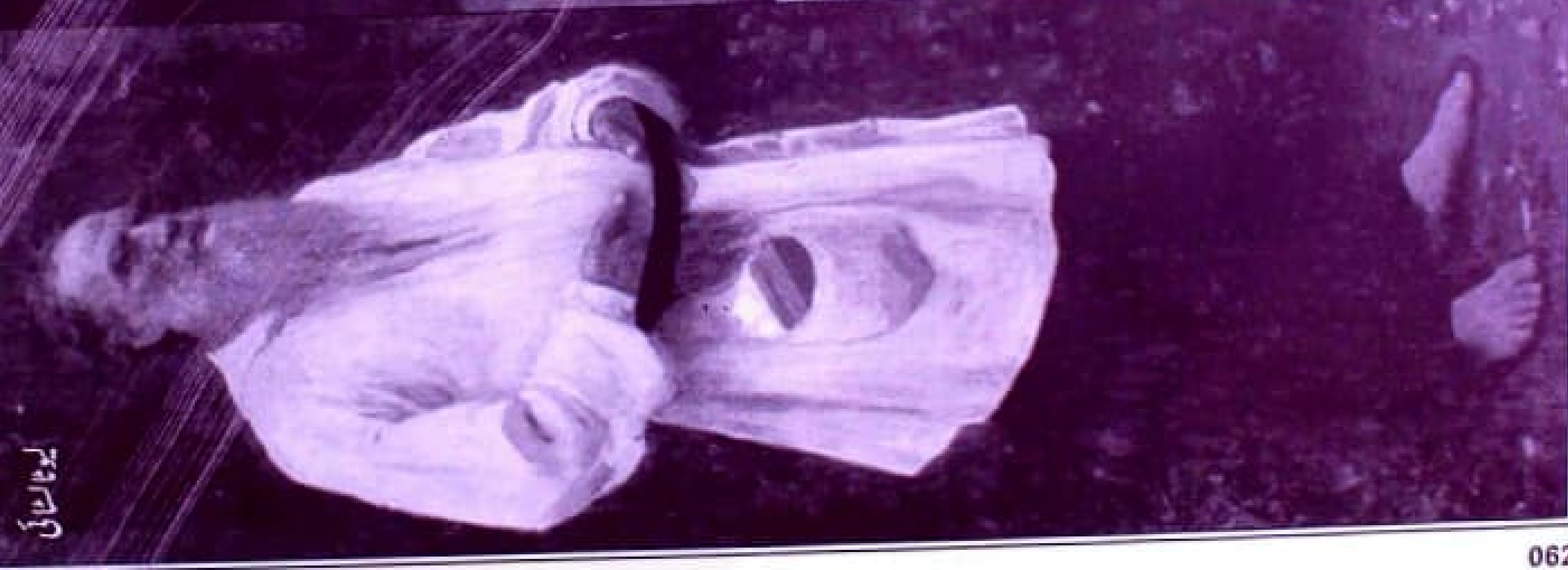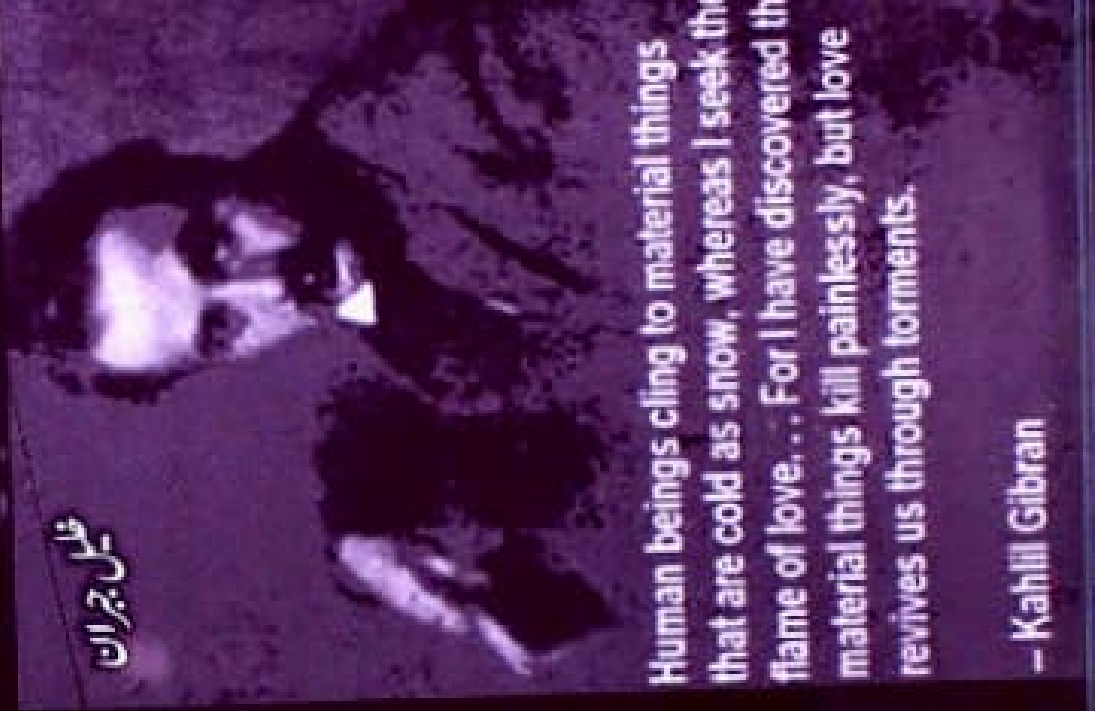
ہنرک ابسن
فیودور دوستوویکی
خلیل جبران
Human beings cling to material things that are cold as snow, whereas I seek the flame of love. . . For I have discovered that material things kill painlessly, but love revives us through torments.
– Kahlil Gibran
خلیل جبران

پروفیسر محمد حسن

ادیبوں کے رومان: ایک تجزیہ

اکثر شاعر اور ادیب عام انسان کی طرح زندگی شروع کرتے ہیں۔ وہ بھی ماں باپ کی مرضی سے ایک عام قسم کی لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں، بچے پیدا ہوتے ہیں اور زندگی بسر ہونے لگتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس عام قسم کی شریک حیات کو اپنے شوہر کی جن چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے وہ اس کی صحت، آمدنی اور اس کے خاندان والے یا ملنے جلنے والوں تک ہی محدود رہتی ہے یا یوں کہئے کہ نون، تیل، لکڑی کا معاملہ غالب رہتا ہے اور شاعر کے تخلیقی سفر کی وہ ساتھی نہیں ہوتی۔ اکثر بیویوں کو عملی مسائل سے اتنی دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ شاعر اور ادیب کی شعری اور ادبی دلچسپیوں کو یا تو سرے سے وقت ضائع کرنے کا ذریعہ سمجھتی ہیں یا کم سے کم ان دلچسپیوں سے خود کوئی لگاؤ نہیں رکھتیں بلکہ کبھی کبھی ان میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

اس کے برخلاف ادیبوں کی کم اور شاعروں کی کچھ زیادہ ہی مان دان سماج میں ہونے لگتی ہے۔ تھوڑا بہت گلیمر اور چمک دمک بھی ان کی شخصیت میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسٹیج پر آنے کا موقع ملا۔ تھوڑی بہت پبلسٹی ہوئی اور کچھ مشاعرے پڑھے۔ کچھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام ہوئے۔ کچھ کالجوں میں شعر خوانی ہوئی تو نوجوان لڑکیوں (یا لڑکوں) میں کچھ شہرت ملتی ہے اور چونکہ نیا شاعر کچھ خواب دکھاتا ہے، نیا ادیب کچھ ایسے تصورات ' کچھ ایسے دلنواز لمحے فراہم کرتا ہے جو نوجوان دلوں کے قریب ہوتے ہیں اس لئے ان خوابوں اور لمحوں کی خود ہی ایک علامت بن جاتا ہے۔ اور سننے اور پڑھنے والے اور والیاں اس کے شعروں میں خود اس کی ذات کو تلاش کرنے لگتے ہیں۔

اس قسم کی دلچسپیاں دوستی میں تبدیل ہونے لگتی ہیں اور وہ شاعر اور ادیب جس کی بیوی اس کا گھر بار تو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش تو کر رہی ہے مگر اس کی ادبی دلچسپیوں میں رفاقت نہیں کرتی ہے اور بحیثیت شاعر یا ادیب اس کی رفیق نہیں بنتی' آخر کار کسی ایسی ہستی سے دوچار ہوتا ہے جو اس کے اسی تشنہ پہلو کو سیراب کرتی ہے یعنی وہ اس میں صرف شاعر یا ادیب ہی کی حیثیت سے دلچسپی رکھتی ہے۔ یہ گویا اس کی فنی شخصیت کو خراج عقیدت ہے اور اسی لئے شاعر اور ادیب بے اختیار محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ نوبت دوسری شادی تک بھی پہنچتی ہے یا پھر پرانی گھریلو زندگی کے بحران، ٹکراؤ یا شکست و ریخت تک معاملہ جا پہنچتا ہے۔

اس میں شاعر اور ادیب کا اپنا قصور بھی ہوتا ہے اور رفیقۂ حیات کا بھی۔ دراصل شادی صرف جسمانی یا اقتصادی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک

دوسرے کے مشغلوں اور دلچسپیوں میں شرکت بھی لازم ہے۔ اگر دونوں کے دل ملے ہیں تو ان کو ایک دوسرے کی پسند اور ناپسند نہ سہی کم سے کم ایک دوسرے کی دلچسپیوں میں تو ضرور حصہ بٹانا چاہئے۔ لیکن دنیا میں جو چند رشتے نہایت بیہودہ قسم کے ہیں ان میں میاں بیوی کا رشتہ بھی ہے۔ دونوں چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی کمزوریوں سے اتنے زیادہ واقف ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کو ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے کشش کھو بیٹھتے ہیں اور اگر اس قسم کا رشتہ باہمی رومان سے بھی قائم ہوا ہو تو بھی جلد ہی بار خاطر بن جاتا ہے۔ وجہیں کئی ہو سکتی ہیں لیکن ایک دوسرے کے ہم مذاق نہ ہوئے تو پھر یہ رشتہ ٹوٹ بھی سکتا ہے یا ابدی تلخی میں بدل سکتا ہے۔

اب اس مسئلے کے دو پہلوؤں پر اور بھی غور کرتے چلئے۔ دونوں پہلو فریقین یا طرفین سے متعلق ہیں۔ اکثر شاعر اور ادیب چونکہ مرد ہیں اس لئے انہیں کے نقطۂ نظر سے غور کیجئے۔ انہوں نے اپنے خیالوں میں جس کامنی کا تصور کیا تھا اس میں جنسی پہلو بھی شامل تھا اور ہمدردی، رفاقت اور چاہت کا پہلو بھی تھا جسے نفسیات کی زبان میں کہیں کہ محبوبہ بھی اور خبرگیری اور چاہت کے لحاظ سے مادر مہربان جیسی بھی۔ شادی کے وقت بیوی نے ہونے والے شوہر کو عاشق ہی نہیں محافظ بھی سمجھا تھا لہٰذا دونوں محض جنسی آسودگی ہی کی تلاش میں ایک دوسرے کے قریب نہیں آتے تھے بلکہ محافظ یا گارجین بھی تلاش کر رہے تھے یا یوں کہیئے کہ دونوں بلوغت کی تلاش میں تھے۔ ایک ایسا کاندھا جس پر سر رکھ کر دکھ درد کے لمحوں میں رویا جا سکے۔ ایک ایسا ہاتھ جو دھڑکتے دل کو سنبھال لے۔ گویا دونوں رنگین خوابوں کے کردار تلاش کر رہے تھے۔

عورت کی مجبوریاں کچھ اس سے بھی زیادہ تھیں۔ اسے بیک وقت اپنے آپ کو تین روپ میں ظاہر کرنا تھا۔ ایک محبوبہ کے روپ میں جب اس کی زلف ماتھے پر لہرا رہی ہو اور سینے پر پڑا آنچل مستی اور کیفیت بیدار کر رہا ہو۔ دوسرے ایسی گرہستن جس کے ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے ہیں اور جس کا بدن دن بھر کے کام سے تھک گیا ہے اور تیسرے اس کی اپنی شخصیت جس کے اپنے بھی کچھ خواب تھے جو بکھر گئے۔ کچھ مطالبے تھے جو پورے نہیں ہوئے۔ شاید وہ خود بھی کبھی شاعر تھی۔ اس تیسری شخصیت سے اس کے شوہر کی شخصیت کا کبھی کبھی مقابلہ بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ اپنے شوہر کی کامیابیوں سے جلتی بھی ہے اور حسد بھی کرتی ہے جبکہ شاعر یا ادیب کی حیثیت سے شہرت پا جانے کے بعد والی لڑکی اس کی شخصیت کے اسی پہلو سے محبت کرتی ہے۔

اب ذرا شاعر یا ادیب کے نقطۂ نظر سے مسئلے پر غور کیجئے۔ وہ تو تخیل کا بندہ ہے۔ دنیائیں بناتا ہے اور بگاڑتا ہے اور بگاڑتا پہلے ہے بناتا بعد میں ہے اور اس بگاڑنے کے عمل میں برابر یہ سوچتا ہے "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"۔ گویا حال سے ناآسودگی اس کا مقدر ہے۔ اس کی ملک اس لئے بھی ہوتی ہے کہ وہ نئے تجربوں سے گزرنا چاہتا ہے۔ کبھی شعوری طور پر کبھی غیر شعوری طور۔ پرانے تجربوں کی بھی کم سے کم نئی گہرائیوں کی ضرور تھاہ پانا چاہتا ہے جسے دنیا اطمینان کہتی ہے۔ سکون کے نام سے یاد کرتی ہے اور معمولات قرار دیتی ہے۔

ادیب اور فنکار اس کی سرحدوں سے آگے بڑھ کر کچھ دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر عملی طور پر نہ کر سکے تو کم سے کم تخیلی طور پر ہی سہی۔

عملی طور پر ان سرحدوں کو پار کرنے کا انجام ہیں مجاز، اختر شیرانی، نریش کمار شاد اور تخیلی طور پر پار کرنے کا بیان ہے۔ اقبال کا یہ شعر:

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اسی کاوش نے شاعروں کو رن دوار کی طرف کھینچا ہے۔ مخدوم اور فیض پیدا کئے۔ مجاز کی نظم "طفلی کے خواب" کے شعر یاد کیجئے

طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں
اک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں
اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

چاہت کا بھی ارمان، خطر پسندی، مہم جوئی یا تخیل کی عربدہ جوئی سے حال کے معمولات کو تہہ کر کے نئے تجربوں سے گزرنے کا ارمان عشق کی راہ ہموار کرتا ہے اور گھر میں اگر پہلے سے کوئی نیک بخت بیٹھی ہو تو بقول غالب وہی طوبیٰ کی ایک شاخ وہی ایک حور۔ زندگی اجیرن کرنے کے لئے کافی ہوگی۔

یہ تو ہے رندوں اور قلندروں کا حال۔ مگر ظاہر ہے ادیبوں اور شاعروں میں ایسے بھی ہیں جو عملی زندگی میں کامیاب ہیں۔ افسر ہیں پروفیسر ہیں یا کسی اور شعبے میں کامیابی نے ان کے قدم چومے ہیں ان کے اپنے الگ مسئلے ہیں۔ ماں باپ کی مرضی سے یا خود اپنی پسند سے زندگی کی کامیابیوں کے حاصل کرنے سے پہلے شادی کی تھی اور ایک عام قسم کی لڑکی کو رفیقۂ حیات چن لیا تھا۔ اب کامیابی حاصل ہوئی اور وہ عام قسم کی لڑکی یا تو تعلیم کے اعتبار سے یا سلیقہ مندی اور اوڑھنے، پہننے اور ملنے جلنے کے آداب کے لحاظ سے ہم چشموں اور ہم مشربوں میں اٹھنے بیٹھنے کے لائق نہ ہوئی تو فوراً دل کی خلش جاگ اٹھتی ہے اور کسی ایسی رفیقۂ حیات کی تلاش شروع ہوتی ہے جو ہم جلیسوں میں رشک کی نظر سے دیکھی جائے جسے ساتھ لے کر پارٹی یا کلب میں داخل ہوں تو نظریں اٹھیں اور اس رشک قمر سے ترقی میں نہ سہی تو کم سے کم وقعت میں اضافہ ہو۔

اس لئے آپ ادیبوں اور شاعروں میں اکثر ترقی درجات کے ساتھ دوسری شادی یا محبوبہ کا رواج بھی پائیں گے۔ مثالیں بہت سی ہیں، نام لے نہیں سکتا کہ بات کہنے سے پرائی ہوتی ہے۔

پھر عشق اور عشق میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک معاملہ وہ ہے جسے نظیر اکبرآبادی نے یوں بیان کیا تھا کہ دل شاد کیا' خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔ یہ بھی معاملہ ماہرین کا ہے۔ غالب نے اسی لئے مشورہ دیا تھا کہ مصری کی مکھی ہو، شہد کی مکھی نہ ہو۔ کسی مرد دانا کا قول ہے کہ عشق کرنا آسان ہے مگر چھوڑنا مشکل ہے۔ یہ رشتے جوڑ تو ہر کوئی سکتا ہے مگر توڑنا اور اس طرح توڑنا کہ دلوں پر خراش باقی نہ رہے صرف ماہرین کے بس کا کام ہے۔

ادیب اور شاعر جتنا زیادہ تخیل زدہ ہے اس کے لئے یہ کام اتنا ہی مشکل ہے۔ غور سے دیکھئے تو وہ معشوق اور محبوب سے نہیں خود تصور عشق ہی سے عشق کرتا ہے اور کیسا والہانہ عشق کرتا ہے کہ سوتے جاگتے اسی خیال میں ڈوبا رہتا ہے۔ اپنی پوری زندگی اسی تڑپ اور کرب میں گزار دیتا ہے۔ اس کے خواب دیکھتا ہے۔ اسی کے گیت گاتا ہے۔ وہی ایک پیکر ہر وقت آنکھوں میں سمایا رہتا ہے۔ یہ محض شاعرانہ بات نہیں ہے کہ اس معاملے میں سب سے پہلے اور سب سے آسان سودا جان کا ہوتا ہے۔ کسی نے اسی وجہ سے کہا تھا کہ تم کہتے ہو جان دے کر یہ سودا کیا یوں ہوتا تو یہ سب سے سستا سودا تھا۔

گر ایں سودا بجاں بودی چہ بودی

یا اگر جان کے بدلے کامرانی ملے تو سستی ہے اس کا نرخ بڑھانا چاہئے۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اس تڑپ اور کرب سے ابدی دردمندی تو ہاتھ آتی ہے وہ دولت بھی ملتی ہے جسے سوز و گداز کہا جاتا ہے جس کے رشتے بعض نے عشق حقیقی سے جا ملائے۔ بعض نے شعریت سے اور بعض نے فیض کے لفظوں میں اس سے دنیا کے غم اپنانے کا راز سیکھا۔

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی

اور یہی راہ خودکشی کی طرف جاتی ہے جو اچانک بھی ہو سکتی ہے اور ایک طویل صبر آزما عمل سے بھی ممکن ہے۔ میرا جی کی زندگی اس کی مثال ہے۔

فانی کے لفظوں میں

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی ہے یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہئے تھا

اور اسی کی مثال ہے سرت چندر چٹرجی کا کردار دیوداس جو محبوب کی ایک جھلک کے لئے زندگی تباہ کر لیتا ہے۔

غرض عشق کی سوچ یہ نہیں کس کو کہاں لے جائے یہ اپنے اپنے مزاج اور حالات کی بات ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کا عشق پروردہ ہوتا ہے ان کے تخیل کا، وہی تخیل جوانی کا نشہ بھی ہے نجات بھی ہے اور عذاب بھی۔ اب اسے آپ چاہیں اس طرح سمجھیں کہ

عشق میں کہتے ہیں حیران ہوئے جاتے ہیں
یوں نہیں کہتے کہ انسان ہوئے جاتے ہیں

یا اس طرح بیان کریں کہ

اے عشق تو نے اکثر قدموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

پھر یہ نظریہ بھی قابل غور ہے کہ عشق اور شاعری (بلکہ تمام فنون لطیفہ ہی) کو دیوانگی ہی کی مختلف قسمیں قرار دیا گیا ہے۔ شاعر اور ادیب عرفان کے لئے نئے تجربات کے پیچھے بھٹکتا ہے اس کی مثال تتلیوں کے پیچھے دوڑنے والے بچے کی ہے اور جب وہ ان تجربات سے اکتا جاتا ہے یا ان تجربات کا نیاپن ختم ہو جاتا ہے تو وہ انہیں پرانے کھلونوں کی طرح پھینک دیتا

ہے۔ اس کی شخصیت کے ان دونوں، کسی قدر غیر متوازن اور غیر متناسب عناصر کو پہچاننا ضروری ہے۔ مثالیں تو اپنے ملک میں بھی بہت سی ہیں (بلونت گارگی نے تو پوری کتاب اسی قسم کے رومانی زلزلوں کے بارے میں لکھ ڈالی ہے اور اس میں اردو کے بھی کئی شاعر اور ادیب ہیں) مگر غیر ملکی فنکاروں میں ٹی ایس ایلیٹ، برٹرینڈ رسل اور عالمی شہرت کے مصور پکاسو کی رومانی زندگیوں کی طوفان خیزی کا ذکر ہی کافی ہے۔ ان طوفانوں میں مکمل توازن لانا تو ممکن نہیں لیکن مشترک دلچسپیوں اور رفاقتوں اور ذہنی شرکتوں سے انہیں کسی قدر سنبھالا جا سکتا ہے۔

(ختم)

068

جسمانی کشش

''مجھے تم اس لئے پسند ہو کہ تمہاری صورت مجھے اچھی لگتی ہے''۔

ہم میں سے کئیوں کو یہ ماننے میں تامل ہے کہ ظاہری شکل و شباہت دوسروں سے متعلق ہمارے فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ حسن صرف ایک سطحی شئے ہے۔ اور کئی عظیم تاریخی مرد اور عورتیں جسمانی طور پر غیر دلکش یا کریہہ الصورت گزرے ہیں۔ یہ نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو محض اس کے چہرے کے نقوش کی بنا پر پسند یا ناپسند کیا جانے لگے جبکہ اس کے یہ نقوش محض ایک حادثۂ توارث (Accident of heredity) کے بطن سے جنم لیتے ہیں۔

حقیقی زندگی میں جسمانی دلکشی کے دو اثرات دیکھنے میں آتے ہیں جنہیں زبان سے قبولا نہیں جاتا۔ حد تو یہ کہ بچے بھی اکثر ایک دوسرے کو ظاہری نقوش کی بنیاد پر قبول یا رد کر دیتے ہیں۔ زیادہ خوبصورت بچوں کو بڑوں کی بھی خصوصی بلکہ ترجیحی توجہ حاصل ہوتی ہے۔

بالغوں کے آپسی تعلقات میں جسمانی کشش کی اہمیت مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک کالج میں طلباء سے پوچھا گیا کہ اگر ایک مضمون کسی کالج کی طالبہ نے تحریر کیا ہو تو اس مضمون کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی۔ طلباء نے رائے ظاہر کی کہ اگر مضمون نگار خاتون غیر معمولی حسین واقع ہوئی ہو تو اس کا مضمون اول درجے کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ لیکن جب یہ یقین ہو جائے کہ خاتون کے خدوخال کسی کشش سے عاری ہیں تو مضمون کو سب سے کم نمبر ملیں گے۔ خوش قسمتی سے ہم میں سے جنہیں، مرد ہوں یا عورتیں، کبھی حسن کا انعام حاصل نہیں ہوا ہے ان کے خیالات جسمانی خوبصورتی کے بارے میں مختلف ہیں۔ ایک جائزہ میں بچوں، کمسنوں اور بالغوں کی تصاویر کی خوبصورتی کے بارے میں رائے طلب کی گئی تو ہر تصویر کو کم سے کم ایک شخص نے اول انعام کا مستحق قرار دیا! بہرحال حُسن کی جاذبیت سے متعلق ایک قسم کا اتفاق رائے ضرور پایا جاتا ہے۔ کیونکہ حسن کے تعین کیلئے کئی دیگر عناصر بھی لازم و ملزوم ٹھہرتے ہیں۔

(ف۔ س۔ اعجاز)

پروفیسر عنوان چشتی

عِشق: حقیقت سے مجاز تک

عشق انسانی جذبوں میں سے ایک بنیادی جذبہ ہے۔ اس کی تاریخ اور محرکات سے قطع نظر، صرف یہ کہنا ہے کہ اس کی دو بہت واضح صورتیں ہیں۔ ایک عشق حقیقی اور دوسری عشق مجازی۔ ادب اور سماج میں ان دونوں رجحانات کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ عشق حقیقی کی جلوہ گری صوفیوں اور سنتوں کی زندگی کے ساتھ، صوفیانہ اور مذہبی ادب میں ملتی ہے۔ اسی طرح عشق مجازی کا رنگ فرد یا سماج کی جنسی زندگی اور جنسی وجسمانی ادب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی یہ دونوں میلانات ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر کسی نے کہا ہے کہ انسان کی اکثر فتوحات، خاص طور پر ادب اور شاعری کا محور یا تو خدا ہے یا عورت۔ بہر حال عشق حقیقی ومجازی سے زندگی کا نگارخانہ ازل سے جگمگا رہا ہے اور ابد تک منور رہے گا۔ بقول شاعر

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

عشق حقیقی کو صوفیانہ افکار وعقائد نے خاص طور پر تقویت دی ہے۔ تخلیقِ کائنات کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ اس کا بنیادی محرک خود عشق ہے۔ یعنی ذات باری تعالیٰ نے خود اپنے حُسن و جمال کا نظارہ فرمانے کے لئے کائنات کی تخلیق کی ہے۔ وہ اس آئینہ میں لگاتار سنور رہا ہے۔ اپنے جمال کا نظارہ فرما رہا ہے۔ یعنی خود اپنے جلووں پر عاشق ہے۔ اس نقطۂ نظر کے دو بہت واضح نتائج ہیں۔ ایک تو یہ کہ کائنات کی تخلیق کا محرک ''عشق'' ہے۔ دوسرے یہ کہ عشق کی بدولت لگاتار کائنات کا نمو اور فروغ جاری ہے۔ اس کی طرف اردو کے اکثر ممتاز شاعروں نے اپنی اپنی شاعری میں جمالیاتی انداز سے اشارے کئے ہیں۔ میر تقی میر، جن کو ان کے گھر میں ''بیٹا عشق کرو'' کی تلقین ملی تھی۔ اس طرح اپنی مثنوی ''شعلۂ عشق'' میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

محبت سے ظلمت نے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبّب، محبت سبب
محبت سے آتے ہیں کارِ عجب

میر تقی میر نے اپنی دوسری مثنوی ''معاملات عشق'' میں اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔

عشق حاضر ہے اور غائب ہے
عشق ہی مظہر العجائب ہے
کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق حق ہے کہیں، نبی ہے کہیں
ہے محمدؐ کہیں، نبی ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

070 اقبال کو تصوف کا دشمن بنا کر پیش کرنے والے اقبال دشمنوں اور کور باطنوں کی کمی نہیں۔ لیکن اقبال نے اپنی شاعری اور اپنے فلسفہ میں تصوف کے اسرار و رموز سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے بعض حقی اثرات کی ضرور مخالفت کی ہے۔ لیکن تصوف کے مثبت نظریوں کی اکثر تائید کی ہے۔ خاص طور پر اقبال نے ''نظریۂ عشق'' کو اپنے مخصوص اسلوب میں پیش کیا ہے۔ ''شمع و شاعر'' میں یہ اشعار ملتے ہیں۔

صبح ازل جو حسن ہوا دل ستان عشق
آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق
یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ
اک آنکھ لے کے ہیں خواب پریشاں ہزار دیکھ

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی
شام فراق، صبح تھی میری نمود کی

صرف نظموں ہی نہیں بلکہ غزل کی منفرد سچائیوں اور اکائیوں میں بھی اس نظریے کی جھلکیاں ملتی ہیں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

شخص و عکس اس آئینہ میں جلوہ فرما ہو گئے
اُن نے دیکھا آپ کو، ہم اس میں پیدا ہو گئے

(خواجہ میر درد)

لایا ہے برا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں
عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصور بے مثل
ہائے کیا صورتیں پردے میں بنایا ہے میاں

(میر تقی میر)

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

(غالب)

ہو بھی چکے تھے دام محبت میں ہم اسیر
عالم ابھی اسیر زمان و مکاں نہ تھا

(فانی)

ان اشعار کی تشریح مقصود نہیں ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینا مناسب ہے کہ

ان اشعار میں ایک طرف ''خواہش خود بینی'' کی جلوہ سامانی ہے اور دوسری طرف ''عشق کی کرشمہ سازی کی''۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تصوف اور ادب میں عشق اور جمال کی زبردست اہمیت ہے جس کا ثبوت ان اشعار سے فراہم ہوتا ہے جس کو سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ''عشق حقیقی'' کے نگار خانے میں ایک رنگ کے بہت سے شیڈ نظر آتے ہیں جو تصوف اور ادب میں میلانات کی شکل میں جلوہ گر ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خیال تو یہ ہے کہ جو کچھ ہے حق ہے، حق کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ وہم بھی حق ہے۔ اس نظریے کے تحت عشق، نظارہ، نظر اور ناظر نیز منظور ایک ہی شے ہے۔ غالب نے ''اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے'' اسی ذیل میں کہا ہے۔ دوسرے نظریے کے تحت عالم میں جو حسن و جمال ہے وہ اسی کے دم سے ہے۔ خواجہ میر درد نے اسی خیال کے تحت کہا ہے کہ ''خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا''۔ اور ''تو ہی آیا نظر، جدھر دیکھا''۔ اس لئے ہر عالم میں عشق اپنی جگہ ایک بیکراں حقیقت کی شکل میں باقی رہتا ہے اور ایک عظیم محرک کی صورت میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت اگر فنا یا ''وصل'' کے تصورات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا اگر ایک طرف ''وہم غیریت'' کو فنا کرنے یا مٹا دینے کا نام وصل یا فنا ہے تو دوسری طرف اس بحر میں ڈوب جانے اور ہم رنگ ہو جانے کا نام وصل یا فنا ہے۔ یہ ''نظریۂ فنا'' یا وصل ''عشق حقیقی'' بھی عشق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہنا بجا ہے کہ عشق حقیقی ''موجود اور وجود'' کے درمیان ایک حقیقی اور موثر رابطہ ہے جس کی حقیقت اور طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

عشق مجازی بہر حال مجازی ہے جس کو ارضی، جسمانی اور جنسی عشق کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ عشق مجازی کی عمر بھی اتنی ہی ہے جتنی خود حضرت انسان کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت آدم کو جنت میں حوا کے بغیر سکون نہیں ملتا تھا۔ عشق مجازی کے سلسلہ میں مذہبی نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ عورت و مرد کے مابین ایک محکم رشتہ قائم کرتا ہے جس سے نسل انسانی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کا تواتر قائم رہتا ہے۔ ایک دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ مخلوق فطرتاً لذت پسند ہے اس لئے عشق مجازی کا مقصد لذت اندوزی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس نظریے میں عشق جنس کا تابع ہے اور اس کی الگ کوئی حیثیت نہیں۔ یعنی جنسی کشش کا نام ہی عشق ہے۔ جس کو لہو کی گردش اور حرارت کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

کہاں کا روح تماشا بدن شریعت کیا؟
نہ آدمی سے ہو رشتہ تو پھر محبت کیا؟

یا یہ شعر

رگوں میں درد کی سرگوشیاں سی ہوتی ہیں
لہو کی ضد ہے فقط، پیار کیا محبت کیا

(عنوان چشتی)

پہلے شعر میں روح کے تماشے اور بدن کی شریعت (عشق حقیقی اور عشق مجازی) کا مدار آدمی سے ''رشتۂ محبت'' پر ہے۔ اس انداز فکر میں محبت کے خارجی مگر انسانی اظہار پر زور ہے۔ دوسرے شعر میں محبت کو لہو کی ضد قرار دے کر اور رگوں میں درد کی سرگوشیوں کے استعارے کا سہارا لے کر خالص جنسی

اور جذباتی عشق اور اس کی کیفیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس ضمن میں فرائڈ نے مربوط اور انقلابی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان کے تمام افعال کے پسِ پشت (ایک طاقتور محرک کی حیثیت سے) جنسی جذبہ کار فرما ہے۔ اس نے انسانی ذہن کو شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے نام سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ لاشعور میں ناآسودہ جنسی خواہشات کا طوفانی رقص برپا رہتا ہے۔ اس نے جنسی جبلت کو ''ایروز'' (EROS) کا نام دیا ہے اور جنسی انرجی کو لبیدو (LIBIDO)۔ لبیدو کا مرکز ایک مقام ہے جس کو اِڈ (ID) کہتے ہیں۔ اس مرکز (اِڈ) پر تمام جنسی خواہشوں اور طاقتوں کا ارتکاز ہوتا ہے اور جنگلی رقص ہوتا رہتا ہے۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ انسان کے تمام افکار و افعال انہی جنگلی خواہشوں پر منحصر ہیں۔ وہ فنونِ لطیفہ کو بھی جنسی جبلتوں کی رقص گاہ قرار دیتا ہے۔

معاملہ یہیں تک رہتا تو کوئی ہرج نہیں تھا۔ لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جب ایک معمر ماں اپنے کمسن بیٹے کو اور ایک معمر باپ اپنی نوزائیدہ بچی کو پیار کرتا ہے تو اس کے محرکات بھی صرف جنسی ہوتے ہیں۔ اس اندازِ فکر کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ کے ''مقدس رشتوں'' کے تصورات پر کاری ضرب لگتی ہے۔ باپ، بیٹی اور ماں بیٹے نیز بھائی بہن کے مقدس رشتوں کے تار جھنجھنا کر ٹوٹنے اور بکھرنے لگتے ہیں۔ اردو شاعری میں جنسی جذبوں کی بجلیاں چمکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ اردو شاعروں نے فرائڈ کے اثرات کو قبول کیا ہے۔ صرف یہ کہنا ہے کہ اردو میں ''جنسی جذباتی شاعری'' کا وجود ہے۔ اور یہ مختلف شکلوں میں نظر آتی ہے۔ اکثر ناقدوں نے میر کو فسردگی و بیچارگی نیز ہجرو حرماں نصیبی کا شاعر بتایا ہے جبکہ میر کے یہاں جنسی اور جذباتی شاعری کی بہترین مثالیں بھی ملتی ہیں۔

گوندھ کے گویا پتی گل کی کیا ترکیب بنائی ہے
رنگ اس کے بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

اور فراق تو یہاں تک پہنچ جاتا ہے:

پہلو کی وہ کہکشاں، وہ سینے کا ابھار
ہر عضو کی نرم لو میں مدھم جھنکار
ہنگامِ وصال وہ چمک لیتا ہوا جسم
سانسوں کی شمیم اور چہرہ گلنار

یہاں اردو شاعری میں جنسی میلانات کی تلاش مقصود نہیں ہے بلکہ اردو میں جنسی شاعری کے سرچشمے یعنی مجازی عشق اور شاعروں کے معاشقوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنی ہے۔ عام طور پر مجازی عشق کا سفر دو سمتوں میں ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ شاعر کا مرکزِ دل و نگاہ کوئی ایک شخص ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ شاعر کسی ایک شخص کا دلدادہ نہیں ہوتا بلکہ ''حسن'' کا دلدادہ ہوتا ہے۔ جہاں وہ حسن و جمال کو دیکھتا ہے پگھل جاتا ہے۔ اردو شاعروں میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کوئی شاعر کسی ایک کا ہو رہا۔ اور ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بقول شاعر۔

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

کا منظر نظر آتا ہے۔ اس کی دلکش مثال غالب کے یہاں نظر آتی
ہے۔ اگرچہ غالب کے معاشقے کے ضمن میں ''ستم پیشہ ڈومنی'' کا ذکر ملتا ہے مگر
یہ مختصر ذکر ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری اس ڈومنی کے کردار کے اثرات کی
گواہی نہیں دیتی۔ ہوسکتا ہے کہ جزوی طور پر اس میں صداقت ہو مگر غالب کے
یہاں ''حسن پرستی'' کی جو قوی لہر ملتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب
''حسین'' کا نہیں ''حسن'' کا شاعر ہے۔ اس سلسلہ میں غالب کے ایک دلچسپ
خط کا ذکر کرنا غیر موزوں نہ ہوگا۔ غالب کے ایک جگری دوست کی محبوبہ کا انتقال
ہوگیا۔ غالب نے انہیں مخاطب کر کے جو تعزیت نامہ لکھا ہے وہ بہت دلچسپ
ہے۔ غالب نے لکھا ہے کہ مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں
اسے مار رکھتے ہیں۔ میں نے بھی ایک ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کیا اور اسے مار
رکھا۔ اور آخر میں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ بیٹا ''گو کی مکھی بنو شیرے کی مکھی نہ
بنو''۔ غالب کی شاعری میں وہ ستم پیشہ ڈومنی نظر نہیں آئی جس کا غالب نے خود
ذکر کیا ہے مگر غالب کے گو کی مکھی بننے کے وافر ثبوت موجود ہیں۔ غالب نے
دلی کی کسی حسینہ کے تصور میں نعرہ لگایا تھا۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی ایک زلف کا اسیر ہے۔ مگر غالب جب سفر پر
نکلتے ہیں اور بنارس پہنچتے ہیں تو ''بتانِ کاشی'' کی کافر ادائیوں سے مسحور ہو
جاتے ہیں۔ انھوں نے ''صبح بنارس'' کا منظر اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھا تو
ان کے ذہن و دل میں ''مثنوی چراغ دیر'' رقص کرنے لگی جس میں گنگا کے
گھاٹ پر صبح کے جاں فزا عالم میں بتانِ دلنواز کا ''غسل نیم برہنہ'' کا دلکش بیان
بھی ملتا ہے اور خود غالب کے دل کی کیفیات بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس روح
نواز منظر کو دیکھ کر غالب چیخ پڑے۔

''زمژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں''

بہر حال غالب کاشی کے ''غسل جمال'' سے فارغ ہو کر کلکتے پہنچے تو
وہاں ''حسن صبیح و ملیح'' کا امتزاج دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کے دل پر بنگال کا
جادو چل کر رہا اور بتانِ فرنگ کا سحر اثر کر گیا۔ کلکتے پہنچنے کے بعد بے اختیار
زبان پر آتا ہے۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اور ــــ ''وہ نازنین بتاں'' خود آرا کہ ہائے ہائے کہنے کا مطلب یہ
ہے کہ غالب کے یہاں دوسرے رجحان کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ حسین سے
زیادہ حسن کا شاعر ہے۔ اس کی جمال پرستی کی شہادت اس کی شاعری سے فراہم
ہوتی ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے ایک جگہ کہا ہے کہ 'عشق ہو جائے کسی سے
کوئی چارہ تو نہیں' ــــ اسی لئے اردو میں محبوب 'امرد' کی شکل میں بھی ملتا ہے اور
شکل نسوانی میں بھی۔ یہاں ''امرد پرستی'' کی تاریخ سے کوئی سروکار نہیں۔ اس
کے جنسی اور سماجی، اقتصادی اور تہذیبی محرکات سے بھی بحث مقصود نہیں۔ صرف

''امرد پرستی'' کی دو ایک شکلوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ''امرد پرستی'' کی طرف شاعروں کا ہی نہیں بلکہ صوفیوں کا رجحان بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر خسرو کے ایک جگری دوست حسن تھے، جو اپنے دور میں یوسف ثانی کا درجہ رکھتے تھے۔ امیر خسرو اور حسن ایک جان دو قالب کی طرح ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ یہ خبر بادشاہِ وقت تک پہنچی۔ امیر خسرو کے مخالفوں نے بادشاہ کے کان بھر دیئے۔ چنانچہ ایک دن سر دربار حسن کو تنہا پا کر بادشاہ وقت نے ان کی کمر پر کوڑے رسید کرا دیئے۔ اس واقعہ کے بعد امیر خسرو دربار میں پہنچے۔ حسن کا اور کوڑے مارنے کا واقعہ زیر گفتگو آیا۔ حضرت امیر خسرو نے اپنی قمیض اپنی کمر اور بازو سے اُلٹ دی اور کہا، دیکھو لو جو کوڑے حسن کی پیٹھ پر لگے تھے۔ ان کے نشانات میری کمر پر موجود ہیں۔ واقعہ صحیح ہو یا برائے زیب داستان، اس سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ صوفیاء میں امرد پرستی کا رجحان کسی مریضانہ جنسی ذہنیت کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اس کے پس پردہ اہم روحانی اور اخلاقی حقیقت کارفرما ہوتی تھی۔ اسی روحانی اور اخلاقی حقیقت کی وجہ سے سرمدؔ نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ یہ بات تو تاریخ کے صفحات میں ابھی تک زندہ ہے کہ جب اورنگ زیب نے اپنے سیاسی مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تو سرمدؔ پر چند الزامات عائد کئے۔ ان میں سے ایک الزام یہ تھا کہ سرمدؔ ایک ''لڑکے'' سے عشق کرتا ہے۔ بہرحال ''امرد پرستی'' کی پاداش میں سرمدؔ نے اپنی گردن کٹا دی۔ لیکن اپنے ''تصورِ حسن'' اور ''تصورِ عشق'' سے انحراف نہیں کیا۔ یادش بخیر کہیں پڑھا تھا کہ دہلی کا ایک امیر اعظم خاں جب شام کو سیر کے لئے نکلتا تو اس کے ساتھ دہلی کے خوبرو لڑکوں کا ایک ہجوم ہوتا۔ یہ شکل یقیناً قبیح ہے اور تعیش کی غمازی کرتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ایران کے ''مُغ بچوں'' کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ایران اور ہندوستان کی سوسائٹی میں کسی نہ کسی شکل میں ''امرد پرستی'' کا رجحان رہا ہے۔

اردو شاعری میں ''عشق کا تارِ حریر دو رنگ'' نظر آتا ہے۔ ایک ہی شاعر کے یہاں امرد پرستی اور نسوانی محبت دونوں کی شہادتیں مل جاتی ہیں۔ وؔلی دکنی ایک صوفی شاعر تھے۔ وؔلی نے شاہ نورالدین سہروردی احمد آبادی سے درسِ سلوک لیا تھا اور ایک اور صوفی شاعر شاہ سعداللہ گلشن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ ان بزرگوں کے علاوہ وؔلی نے شیخ یحییٰ چشتی کے خلیفہ حضرت سید علی رضا سے بھی اکتسابِ فیض کیا تھا۔ اس کے باوجود وؔلی کے کلام سے ''امرد پرستی'' اور عشقِ صنفِ نازک دونوں کی بو آتی ہے۔ انہوں نے شمس الدین، گوبند لال، امرت لال اور سید معالی جیسے امردوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً

ہر طرف ہے جگ میں روشن نام شمس الدین کا
چمن میں ہے شور جس کے ابروئے پرچین کا

شمعِ بزمِ وفا ہے امرت لال
سروِ باغِ ادا ہے امرت لال

ترا قد دیکھ اے سید معالی
سخن فہماں کی ہوئی ہے فکر عالی

وؔلی کے کلام میں اس نوع کے اشعار مل جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا

ہے کہ ولی کے دور میں ''امرد پرستی'' کا رجحان تھا۔ لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ ولی کے یہاں ایسے شواہد بھی ملتے ہیں جن کی موجودگی میں کہا جا سکتا ہے کہ ولی نے صنفِ نازک کو بھی پسند کیا ہے اور اس کی محبت کے گہرے اثرات قبول کئے ہیں۔ ولی کی یہ غزل پکار پکار کہہ رہی ہے کہ ''کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں''۔ غزل کے چند اشعار سنئے۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں دل نہیں ہے مرا واقف
اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رات اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پانو کے جھانجھن کی جھنکار سناتی جا
تجھ نیہہ میں دل جل جل جوگی کی لیا صورت
یک بار اسے موہن چھاتی سوں لگاتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

اس انداز فکر و اظہار کی موجودگی میں کہا جا سکتا ہے کہ ولی نے حُسنِ انسانی اور حسنِ نسوانی دونوں سے محبت کی ہے۔

میر تقی میر کے یہاں بھی یہی اسلوب نظر آتا ہے۔ ایک طرف میر کے یہاں ''امرد پرستی'' کا رجحان ملتا ہے۔ اور دوسری طرف نسوانی حُسن کی جلوہ گری بھی نظر آتی ہے۔ میر تقی میر کے تذکرہ نگاروں نے میر کے ''عشق'' (یا معشوقوں) پر بھرپور روشنی تو نہیں ڈالی لیکن ایک جگہ ''پری تمثال عزیزہ'' کا ذکر کیا ہے۔ میر تقی میر آگرے سے جن حالات میں دہلی آئے۔ اور یہاں آکر جس جنون سے دوچار ہوئے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میر کو نسوانی حسن نے اپنا اسیر بنا رکھا تھا۔ میر کے حالات میں یہ بات ملتی ہے کہ میر پر دہلی آکر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہوئی۔ وہ رات کو چاند کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے اور دیوانہ وار دیکھتے تھے۔ احباب و اعزاء کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ انہیں چاند میں ایک نسوانی صورت نظر آتی ہے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ نسوانی شکل اس ''پری تمثال عزیزہ'' کی ہوگی جس کی محبت نے میر کو بہت پہلے اسیر کر لیا تھا۔ ان کی شاعری میں بھی صنفِ نازک کے حسن اور اس کی محبت کی جلوہ گری ملتی ہے۔ مثلاً

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

یا یہ شعر جو اپنی جگہ بے پناہ ہے۔

گوندھ کے گویا پتی گل کی کیا ترکیب بنائی ہے
رنگ اس کے بدن کا تب دیکھو، جب چولی بھیگے پسینے میں

میر کی شاعری میں محض نسوانی صورتوں کی ہی جلوہ گری نہیں ہے بلکہ ''امردوں'' کی کرشمہ سازیاں بھی ملتی ہیں۔ اور ''لڑکوں'' کا ذکر بھی ملتا ہے۔ میر کے اس نوع کے اشعار تو زباں زد ہیں۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ترش رُو بہت ہے وہ زرگر پسر
پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم

میر کی شاعری میں ''عطار کے لونڈے'' اور ''پسر زرگر'' جیسے امردوں کا ذکر ہے۔ اس لئے میر کے معاشقوں میں ان داخلی شہادتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

خواجہ میر درد ایک عظیم شاعر اور اپنے دور کے زبردست عالم اور صوفی تھے۔ ان کے تمام تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ خواجہ میر درد کی شاعری میں محض عشق حقیقی کی جلوہ گری ہے اور عشق مجازی کا سایہ تک نہیں پڑا ہے۔ ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب نے ان کی باقاعدہ صوفیانہ تربیت کی تھی اور انہیں اول المحمدین کا خطاب دیا تھا۔ خواجہ میر درد کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شخصیت مردانہ وجاہت کا پیکر تھی۔ اور ان کے عقیدتمندوں میں عوام اور خواص مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نسوانی حسن سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ مثلاً

دل کو کیوں ہے یہ بے کلی ایسی
کون دیکھی ہے اچپلی ایسی
خون ہوتا ہے دل کا یاں آؤ
مہندی پانوں میں کیا ملی ایسی

ان اشعار میں اس ''اچپلی'' کا ذکر ہے جس کے پانو میں مہندی لگتی ہے۔ اس کو محض روایتی انداز اور رواج زمانہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان کے تمام جمالیاتی اشعار کو سامنے رکھا جائے تو یہ صورتحال اور بھی واضح ہو جاتی ہے — میر تقی میر اور خواجہ میر درد کے معاصروں میں نظیر اکبرآبادی کا نام بھی آتا ہے۔ نظیر ایک قلندر صفت انسان تھے۔ ہر روز اپنے مریل ٹٹو پر سوار ہو کر بازار سے گزرتے۔ کسبیوں سے پان کے بیڑے وصول کرتے اور ہنسی مذاق کرتے گزرتے۔ ان کی شاعری میں بھی وصل کی کیفیات ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ ''پسینے کی اُمس'' سے پسینے کی بو تک سب کچھ نظر آتا ہے۔ اب کون بتائے کہ ان کا معاشقہ کس سے تھا۔ اور تھا بھی کہ نہیں؟

یادش بخیر، غالب کی ''ستم پیشہ ڈومنی'' کا ذکر ہو چکا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح غالب حضرت شاہ کالے شاہ صاحب سے بیعت وارادت کے باوجود بادہ خوار ہی رہا، ولی بھی نہ بن سکا۔ اسی طرح ''ستم پیشہ ڈومنی'' کا خود ذکر کرنے کے باوجود وہ اس ''ڈومنی'' کی ستم رانیوں کا شکار نہ ہو سکا۔ غالب اپنی تمام خوش گفتاریوں کے باوجود حسن پرست ہی رہا۔ کسی ایک کا ہو کر نہیں۔ مگر اس کے برعکس حکیم مومن خان مومن کے نام کے ساتھ امت الفاطمہ صاحب جی کا نام اس طرح وابستہ ہے جس طرح سورج سے اس کی کرنیں اور چاند سے اس کی چاندنی۔ حکیم مومن خاں مومن کے مذہبی خیالات پر وہابیت کا اثر تھا۔ ان کی شاعری گواہ ہے کہ ان کا ذہن ''تجرید'' میں سوچتا اور تجرید میں ہی اظہار کرتا تھا۔ ان کا تخلیقی ذہن مجسمہ سازی اور پیکر تراشی کے عمل سے آشنا تو

تھا لیکن اس میں کامیاب نہیں تھا۔ حکیم مومن خاں مومن اپنی وہابیت اور تحریک
آزادی سے اپنی ذہنی وابستگی کے باوجود عاشق جانباز ہی رہا۔ جنگ آزادی کا
مجاہد اور نقطۂ موحد نہ بن سکا۔ انہوں نے اپنے پیشہ کی آڑ میں اپنے عشق کی پرورش
کی، او رامت الفاطمہ صاحب جی کو اپنی محبت اور شاعری کا محور بنایا۔

ماضی قریب میں حسرت موہانی کی بنت عم، فانی بدایونی کی چھتو اور
جگر کی تیم کا بہت ذکر آتا ہے۔ حسرت موہانی کی شاعری میں جو جذباتیت اور
عنفوان شباب کی طوفانی نفسیات ملتی ہے، وہ اس بات کی گواہ ہے کہ حسرت نے
محبت کی ہے۔ اس سلسلہ میں اگر ان کے ایسے تمام اشعار کو سامنے رکھا جائے جو
تہذیب رسم عاشقی کی دلیل ہیں تو بے جھجک کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری میں
"بنت عم" نے خوب گل کھلائے ہیں لیکن حسرت بھی عام انسانی نفسیات سے
مبرا نہ تھے۔ انہیں بھی حسن مرغوب تھا۔ اس کا ثبوت زوپا ہے۔ جس کی زبانی
انہوں نے اٹلی کے حسینوں کی کہانی سنی تھی۔ لیکن اپنے معاشقوں کے باوجود
حسرت ایک بے لوث محب وطن، ایک وسیع المشرب صوفی اور صاحب طرز شاعر
نظر آتے ہیں۔ دراصل محبت ان کی سرشت میں داخل تھی۔ انہوں نے جو گیت
لکھے ہیں ان میں ایک طرف شاہ عبدالرزاق سے محبت وعقیدت کا رنگ ہے۔
اور دوسری طرف کرشن جی سے گہری عقیدت ملتی ہے۔ حسرت کے سلسلہ میں یہ
بات اہم ہے کہ وہ کرشن جی کی یاد تازہ کرنے کے لئے بندرابن کا سفر کرتے
تھے۔ حسرت کی زندگی میں جو محبت "بنت عم" سے معاشقے کی صورت میں شروع
ہوئی وہ اٹلی کی زوپا سے ہوتی ہوئی شاہ عبدالرزاق کے فیضان کی وجہ سے کرشن
جی کی محبت اور عشق حقیقی تک پہنچ جاتی ہے۔ فانی بدایونی کے سلسلہ میں خلیل
الرب صدیقی نے لکھنؤ کے "بیروں پھیروں" اور آگرے کی رنگین صحبتوں" کا
ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فانی کی آگرے کی ایک ذیرہ دارنی (جو اپنے
رنگین دور کی ایک ممتاز ہستی تھی) سے معمولی سی رسم وراہ کا پتا چلتا ہے۔ لیکن مولانا
میکش اکبرآبادی نے ایک گفتگو کے دوران فرمایا تھا کہ فانی اور چھتو کی محبت کی
بات محض افسانہ ہے۔ بہر حال یہ افسانہ ہو یا حقیقت اتنی بات ضرور ہے کہ فانی
کی شاعری میں عشق وحسن کی کیفیات کا بھرپور اثر ہے۔ وہ تصور حسن سے زیادہ
تاثیر حسن کا شاعر ہے۔ فانی نے اپنی شاعری میں اپنے محبوب کو تحلیل کردیا ہے۔
ان کی شاعری سے ان کے محبوب کے سراپا کی کوئی واضح تصویر نہیں بنائی جاسکتی۔
لیکن ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے اکثر مقامات پر ان کے دھڑکتے ہوئے دل
اور عشقیہ سائیکی کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں تک جگر کا تعلق ہے۔ وہ بھی حضرت شاہ
قاضی عبدالولی منگوری کے مرید تھے۔ مگر مجازی عشق کے بہت بڑے رسیا تھے۔
انہوں نے کئی شہروں میں زنان بازاری سے محبت کی پینگیں بڑھائیں۔ لیکن وہ
بنیادی طور پر تیم کے ہو کر رہ گئے۔ اس سلسلہ میں بہت سی باتیں اور شہادتیں
ہیں۔ جنہیں جگر کے دوست اور دشمن سب بیان کرسکتے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہنا
چاہتا ہوں کہ اپنے مجازی عشق کے باوجود جگر ایک مہذب، شریف اور دردمند
انسان تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس دور میں جگر جیسے افراد کہاں۔ ان کی شاعری
میں وہی رندی وسرمستی، وہی سرشاری وشگفتگی، وہی کرب وکیف ہے جو محبت کا
طرۂ امتیاز ہے۔ جگر کے تغزل میں ان کے تصور حسن کو جو اہمیت ہے اس سے

زیادہ اہمیت ان کے تصورِ عشق کی ہے۔ ان کی شاعری میں عشق کا جو کردار ہے
جہاں اس میں سپردگی وقربانی کا جذبہ ہے وہیں وہ خود شناسی احساس اور عزت
نفس کا پیکر بھی ہے۔

اردو شاعری نے عشق حقیقی سے عشق مجازی کا سفر بڑی خوبی اور
خوبصورتی سے طے کیا ہے۔ واقعی اردو شاعری اس نقطۂ نظر سے تاریخ دورنگ
ہے۔ جہاں تک مجازی عشق کا تعلق ہے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ قدما
کے یہاں صنفِ نازک کے ساتھ امرد پرستی کا رنگ بھی ملتا ہے مگر رفتہ رفتہ امرد
پرستی کا رنگ غائب ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کی جگہ حتمی طور پر بلا شرکت غیرے
صنفِ نازک لے لیتی ہے۔ اردو شاعروں کے حالات مرتب انداز میں نہیں ملتے
پھر بھی کہیں کہیں سے پردہ اٹھتا ہے تو ان کی محبوباؤں کے نام ونشان کا پتا چل
جاتا ہے اور ان کے ''معاشقوں'' کی ہلکی سی جھلک نظر آجاتی ہے۔ چونکہ ہماری
قدیم تہذیب میں ''عشق'' کو یوں ہی شجر ممنوعہ تصور کیا جاتا تھا۔ پھر کسی کے ذاتی
اور درونِ پردہ حالات کو طشت از بام کرنا خلاف تہذیب تھا۔ اس لئے بیشتر
شاعروں کے مرکزِ ذہن ونظر کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں اب یہ
روایت ہے کہ بعض شعراء اپنے ذاتی حالات بھی مزے لے لے کر بیان کرتے
ہیں۔ مثال کے طور پر جوش ملیح آبادی کے اٹھارہ بڑے بڑے عشقوں کو پیش کیا
جاسکتا ہے جن کا بیان انہوں نے ''یادوں کی برات'' میں کیا ہے۔

جنسی خواہش اور رویہ

جنسی برتاؤ ان خواہشات اور ترجیحات سے ضرور متاثر
ہوتا ہے جنہیں ہم اپنے بچپن میں پہچاننا شروع کردیتے ہیں اور اپنی
زندگی کے آخر تک ان پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔
اس کا سانچہ ہماری شخصیت، اخلاقی معیار اور سماجی روابط سے تیار
ہوتا ہے۔ بعض لوگ جنسی تجربات کو اس لئے پسند نہیں کرتے کہ ان
سے انہیں کسی قسم کا تلذذ حاصل ہوتا ہے بلکہ ایسے تجربات انہیں اس
لئے مرغوب ہوتے ہیں کہ یہ ایک ترسیل، دوستی یا جارحیت کا وسیلہ
ثابت ہوتے ہیں۔ ماہرین نفسیات بتاتے ہیں کہ کئی زنا کار شہوانی
جذبہ سے مجبور ہوکر جارحانہ رویہ نہیں اپناتے بلکہ ان کے وحشیانہ
اقدام کے پیچھے جنسِ مخالف کیلئے ان کی نفرت پوشیدہ ہوتی ہے۔
محبت کا جذبہ اگرچہ اکثر جنسی خواہش سے وابستہ کردیا جاتا ہے لیکن
اسے کئی غیر جنسی صورت حالات میں بھی دریافت کیا جاسکتا ہے مثلاً
ایک بچے، ماں، باپ یا قریبی دوست کی جانب اپنے رویئے میں
اس کی بازیافت کرنا ہمارے لئے ممکن ہے۔

ف۔س۔اعجاز

ڈاکٹر قمر جہاں

ہمارے ادب اور کلچر میں معاشقے کا تصور

ہمارے ادب و کلچر میں عشق و محبت کی روایت بے حد پرانی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق کے ساتھ ساتھ عشق کا جذبہ بھی خلق ہوا۔ بی حوا کی پیدائش اس بات کی ضامن ہے کہ آدم بغیر حوا کے ادھورے تھے۔ جنت کا جنتی ماحول اور نورٌ علیٰ نور کی نورانی فضا میں آدم کی طبیعت جب نہ لگی تو خداوند عالم خود ان کی پسلی سے بی حوا کو وجود میں لایا اور اس زمین و آسمان کی تمام ویرانیاں یک لخت دور ہو گئیں۔ زندگی بامعنی اور بامقصد ہو گئی۔ پھر آدم و حوا کے جنت سے نکالے جانے کی روایت سے بھی ہم سب آگاہ ہیں — یونانی صنمیات میں کیوپڈ اور سائیکی کا عشق، رومیو اور جولیٹ کی رومانی داستانیں، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا اور سوہنی مہیوال کی عشقیہ وارداتیں وغیرہ وہ رومانی اور عشقیہ قصے ہیں جن سے ہم سب واقف ہیں۔ ان تمام حکایتوں کے مطالعہ سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ عشق کا جذبہ امر ہے اور یہ انسان کی وہ جبلت ہے جسے دبایا نہیں جا سکتا۔

دورِ وحشت سے لے کر تہذیب و تمدن کے مختلف ادوار تک پہنچتے پہنچتے انسان کے رہن سہن، پسند و ناپسند، لباس و پوشاک اور عادات و اطوار میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں مگر ہنسنا، رونا اور عشق کرنا اس دور میں بھی تھا اور آج بھی مروّج ہے۔ بقول کسی شاعر۔

محبت آئینہ بن چکی تھی وجودِ بزمِ جہاں سے پہلے

مختصر یہ کہ عشق کا جذبہ ایک الوہی جذبہ ہے، یہ خداداد ہے۔ اسے ہم نقل یا عقل سے نہیں سیکھتے۔ بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی روتا ہے اور کھاتا ہے اور جوان ہونے کے ساتھ ہی خود بخود چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش بھی ہر نارمل (Normal) اور صحتمند انسان کے دل میں جاگ اٹھتی ہے۔ ہمارا سماجی ماحول اور معاشرہ اس خواہش کو معیوب سمجھ کر اس کے نشو و نما میں دیواریں حائل کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر سب بے سود۔ ایسا کرنے سے تو عشق وحشت و جنون میں مبدّل ہو جاتا ہے اور عاشق کے لئے سوہانِ روح بن جاتا ہے۔

لفظ ''مُعاشقہ'' عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ لفظ ''عشق'' سے مشتق ہے۔ عشق کا لغوی مفہوم ہے محبت رکھنے والا یعنی کسی کو چاہنا، پیار اور محبت کرنا، شوق اور خواہش کے معنی میں بھی یہ لفظ اکثر اوقات استعمال ہوتا۔ معاشقے کا مفہوم ہے عشق کو عملی صورت دینا بہ الفاظ دیگر ازدواجی زندگی سے باہر مرد اور عورت کا ایک دوسرے کے ساتھ اظہار محبت کرنا۔ انگریزی زبان میں اس کے لئے Love affair، To be in love وغیرہ اصطلاح مروّج ہیں۔

ہندی ادب میں پریم، پریتی یا انوراگ وغیرہ الفاظ ملتے ہیں۔ یہاں ایک خاص نکتہ غور طلب یہ ہے کہ لفظ معاشقے کے ساتھ عمومی طور پر جنس کا پہلو شامل ہوتا ہے جبکہ محبت یا عشق یا رومان زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شعر و ادب میں معاشقے کا تصور اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر یا ادیب ایسا نظر آئے جس کا دل اس جذبے سے خالی ہو۔

یا رب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے
اک عشق بھر رہا ہے زمیں آسمان میں

(میر)

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

(اقبال)

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

(اقبال)

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لئے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاک داں کے لئے

(ذوق)

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

(غالب)

اب عشق کو درکار ہے اک عالم حیرت
کافی نہ ہوئی وسعت میدان تمنا

(حسرت موہانی)

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

(میر تقی میر)

فارسی اور اردو شاعری میں تو رومان و محبت کی لہریں کچھ زیادہ ہی گہری ہیں۔ ہمارے شاعروں میں روایت کی پیہم تجدید اور تقلید کی وجہ سے عشق و عاشقی اور حسن پرستی کے جذبات اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ گویا یہ فطرت ثانیہ بن چکے ہیں۔ معاشقے کا تصور ہمارے ادب اور کلچر کی روح رواں ہے۔
بقول فراق گورکھپوری:

''یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہماری تمام شاعری کا نوے فی صد جنسی، شہوانی یا عشقیہ ہے اور انگریزی، فرانس اور جرمن کی شاعری کا صرف دسواں حصہ جنسی یا عشقیہ ہے''۔

(شاہکار، فراق نمبر۔ ص ۲۲۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تحقیقی تصنیف ''تاریخ ادب اردو'' جلد

اول میں اردو کی کلاسیکی شاعری سے متعلق اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ — جدید اصطلاح میں یوں کہنا چاہئے کہ فنکارانہ حیثیت سے ولی سے پہلے کے شعرا رومانوی تھے''۔

(تاریخ ادب اردو۔ ص ۵۳۲)

اردو کی سب سے مقبول اور محبوب صنف غزل رہی ہے۔ غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی مفہوم ہی میں ''باز ناں گفتن'' یا ''راز گفتن با معشوق''۔ اس طرح غزل کی شاعری اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے خالص عاشقانہ مزاج کی حامل ہے۔ بقول اسلوب احمد انصاری:

''اردو غزل گو شعراء کلاسیکی نہیں، رومانی ہیں اور ان کی غزلیں رومانی روح کا رقص مستانہ ہیں''۔

(بہترین ادب ۱۹۵۵ از اسلوب احمد انصاری۔ ص ۵۷)

مختصر یہ کہ رومان جسے عرف عام میں ہم عشق ومحبت سے موسوم کرتے آئے ہیں ہماری شاعری کا مزاج بن چکا ہے اور آج کے ادب کا یہ ایک خوشگوار موضوع بحث ہے۔

ہمارے ادب اور کلچر میں معاشقے کا تصور اپنی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ سہولت کے لئے ہم اس تصور کو مختلف درجات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) روایتی تصور (۲) حقیقی تصور (۳) تخیلی یا تصوراتی تصور۔

معاشقے کے روایتی تصور کی مثال اس واقعہ سے دی جا سکتی ہے جسے مولانا شبلی نعمانی نے اپنی تصنیف ''شعرالعجم'' میں قلمبند کیا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ دور متوسط میں اردو کا ایک شاعر اپنے دوسرے شاعر دوست سے ملنے جب اس کے گھر جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ دروازے پر اس کے دوست کا لڑکا مٹی کے گھروندے بنا کر کھیل رہا ہے۔ نووارد نے پوچھا ''میاں صاحبزادے، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' بچے نے برجستہ شعر میں جواب دیا۔

کوئے جاناں سے خاک لاتا ہوں
اپنا کعبہ الگ بناتا ہوں

یہ معاشقے کا وہ روایتی و توریثی تصور ہے جو ہمارے بیشتر اردو شعراء کے حصے میں آیا ہے۔ بقول اختر شیرانی۔

ادب سے جا کے کہنا اے صبا اس شوخ پُر فن سے
کہ روماں اور محبت مشغلہ ہے میرا بچپن سے

محمد تقی میر فرماتے ہیں۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

مندرجہ بالا مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ گویا ''زلفوں کا اسیر ہونا'' کلاسیکل اردو شاعری کا توریثی مزاج بن چکا تھا۔ بعض شعراء کے یہاں یہ ''اسیری'' حقیقی اور فطری رنگ میں ظاہر ہوئی ہے لیکن بیشتر نے محض تقلیدی صورت اختیار کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بسا اوقات ہمارے یہاں معشوق کا کردار اور عشق کا تصور دونوں ہی بے حد مضحکہ خیز ثابت ہوئے ہیں۔ غالب

جیسے قابل احترام اور عظیم شاعر کے یہاں بھی عشق کا تصور بیشتر اوقات محض
روایتی معلوم ہوتا ہے یا پھر بازاری۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے میرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ میرے آگے

مندرجہ بالا اشعار میں معنی آفرینی ضرور ہے لیکن اثر آفرینی نہیں۔
یہی وجہ ہے کہ اس نوع کے اشعار ہمارے ذہن کو چھوتے ہیں دل کو نہیں۔ بات
یہ ہے کہ اثر اور کیف صداقت کا مرہون منت ہے۔ مندرجہ بالا مثالوں میں
اصلیت اور صداقت کی جگہ محض روایت پرستی ہے۔ عشق کرنے کے لئے جس
فطری معصومیت اور ایثار و خودسپردگی کی ضرورت ہے۔ غالب کی انا پسند شخصیت
چاہتے ہوئے بھی اپنے اندر ان خصوصیات کو جگا نہ سکی۔ ان کی عقل اور ان کا
فلسفیانہ ذہن ہمیشہ ان پر حاوی رہا اور جب بھی بے خطر کود پڑنے کی نوبت آئی
وہ چوں چرا میں الجھتے چلے گئے۔ اس لئے غالب کی شاعری، معنی آفرینی، وقت
پسندی، مضامین کی ندرت اور انداز اظہار کی دلفریبی کے باوجود عشق کے حقیقی
اور فطری تصور کی غمازی بہت کم ہی کر پائی ہے۔ عشق ان کے یہاں دوسرے
فلسفیانہ موضوعات کی طرح ایک عقلی فلسفہ ہے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں۔

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا پڑا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

حقیقی عشق غور و فکر کے ان منازل میں نہیں جاتا۔

آئندہ سطور میں ہم عشق کے اس تصور کو زیر بحث لائیں گے جسے
تصوراتی یا تخیلی عشق کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ عشق کی وہ کیفیت ہے جس سے
ہمارے اکثر نوجوان عمر کی اس منزل میں دوچار ہوتے ہیں جسے Teen age
کہا جاتا ہے۔ یہ عمر کا وہ وقفہ ہے جب آپ ہی آپ دل کسی کو چاہنے اور چاہے
جانے کے لئے بے چین ہو اٹھتا ہے اور کبھی کبھی کوئی معمولی سا حادثہ، واقعہ یا چھیڑ
چھاڑ عشق کے اس تصور کو بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس کو ہم
افلاطونی عشق بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک طرح کے خبط اور خلل دماغی کی کیفیت
ہے۔ یہاں موہوم بھی محسوس معلوم ہونے لگتا ہے اور ہر کیفیت پر ایک رومانی
دھندلکا چھایا نظر آتا ہے۔ عشق کے اس تصور میں ایک ایسی سرمستی اور رندانہ
کیفیت ہوتی ہے کہ بے پیے بھی اک گونہ بے خودی کی کیفیت غالب رہتی ہے۔
یہاں عاشق معشوق سے زیادہ خود اپنی ذات کا گرویدہ بن جاتا ہے۔ دراصل یہ
ایک قسم کی نرگسی کیفیت ہے جس سے عاشق دوچار ہوجاتا ہے۔ ماہرین نفسیات
کے نزدیک یہ ایک ذہنی مرض ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے کیرن ہارنی
(Karen Horney) کی تصنیف "New ways in Psycho

"analysis" کے حوالے سے ''نرگسیت'' کی تفصیل میں جاتے ہوئے کہا ہے

''اس موقعہ پر خود پرستی Autserotism اور نرگسیت کے فرق کو بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔خود پرستی انسان کی بنیادی خصوصیت ہے۔ بچہ پیدائش کے وقت ہی سے اپنی ذات سے محبت کرتا ہے مگر بعد کی زندگی میں خود پسندی کا رجحان ابھرتا ہے۔خود پسندی ایک نازک اور لطیف موج نرگسیت ہے''۔

(اردو شاعری میں نرگسیت از ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ص ۳۲)

کیرن ہارنی نے نرگسیت کی تعریف کرتے ہوئے اس کے اندر مندرجہ ذیل خصوصیات کو شامل پایا ہے۔اس کا قول ہے کہ نرگسیت کے دائرے میں ''خودستائی، غرور، طلب جاہ، جذبۂ محبوبیت، دوسروں سے کنارہ کشی، خودداری، تصوریت، تخلیقی خواہشات، شدید فکر صحت، شکل و شباہت اور ذہنی صلاحیت شامل ہیں''۔

ادب میں یہ تصور یونانی صنمیات کے ذریعہ داخل ہوا ہے۔آگے جا کر فرائیڈ کیرن ہارنی اور دوسرے ماہرین نفسیات نے بھی اس سے بھرپور دلچسپی دکھائی۔اور اس طرح انسان کے اندرون میں جھانکنے کی سعی کی ہے۔

ہمارے اکثر اردو شعراء نے عشق کے اس تخیلی تصور کی بڑی دلکش تصویر کشی کی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مومن)

تم سامنے کیا آئے اک طرفہ بہار آئی
آنکھوں نے میری گویا فردوس نظر دیکھا

(اصغر گونڈوی)

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

(فیض)

یہ تمام اشعار تصوراتی اور تخیلی عشق کی غمازی کر رہے ہیں۔ یہاں خواب اور حقیقت ایک دوسرے سے اس طرح متصادم ہیں کہ اصل اور نقل کی پہچان دشوار ہو جاتی ہے۔ اردو شاعری ایک بڑا حلقہ عشق کے مندرجہ بالا تصورات کا امین رہا ہے یعنی ہماری شاعری میں یا تو تصوراتی اور تخیلی معاشقے کی داستانیں ملتی ہیں یا پھر روایتی عشق و عاشقی کی بھونڈی مثالوں کی بہتات ہے۔چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے
کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟

غیر عیادت سے بُرا مانتے
قتل کیا آن کے اچھا کیا

تم کو ہے وصل غیر سے انکار
اور جو ہم نے آکے دیکھ لیا

ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی برے قتل کی باتیں
اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے

بری نعش کے سرہانے وہ کھڑے یہ کہہ رہے ہیں
اسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

بھنویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
یہ کس سے آج بگڑی ہے جو یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیرا انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

اب ہمارے سامنے معاشقے کا وہ تصور ہے جسے ہم حقیقی تصور سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ بات ہمیں خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ شعرائے کرام نہایت ذکی الحس اور عام انسانوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی دل پُر درد کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا دل توجہ کی ذرا سی آنچ میں پگھلنے لگتا ہے اور دوسروں کو اپنا بنانے کا ہنر بھی انہیں خوب آتا ہے اس لئے بعض شعرائے کرام کی زندگی میں ایسے واقعات ضرور رونما ہوئے ہیں جنہیں ''حادثۂ دیدہ و دل'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قلی قطب شاہ کی بھاگ متی یا مشتری، میر کی بنتِ عم، غالب کی ستم پیشہ ڈومنی، مومن کی امتہ الفاطمہ عرف صاحب جان، داغ کی منی بائی حجاب، فانی کی نور جہاں اور تمن جان، اختر شیرانی کی سلمیٰ، مجاز کی نورا، جمیل مظہری کی عذرا اور میرا جی کی میرا سین وغیرہ نسائی کرداروں کی اہمیت سے ہم نا آشنا نہیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے اکثر نام فرضی ہیں مگر ان کے پس پردہ جن کیفیات کا اظہار کیا گیا

ہے وہ تو فرضی نہیں، ان کے حقیقی ہونے میں بھلا کسے شک ہے۔

عہد بہ عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی انداز میں بھی
اور تبدیل رونما ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب معشوق پتھر کا صنم تھا۔ ہر وقت
اور خنجر ہی اس کے ہاتھ میں رہتا تھا، اسکی نگاہیں اور چال ایسی قیامت خیز تھیں
اک نگاہ میں وہ دنیا کو تہہ و بالا کر دیتی تھیں۔ پھر امرد پرستی کی مثالیں بھی سا
آئیں، یہاں تک کہ میر، مصحفی اور درد جیسے معتبر شعراء کے یہاں بھی امرد پر
کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ یہ معاشقے کا ایک غیر صحتمند انداز تھا جسے ہم ذ
کج روی ہی کہیں تو بہتر ہوگا۔ البتہ دکنی عہد کی شاعری زیادہ نیچرل اور حقی
ہے۔ وہاں اس قسم کی مکروہ روایات کی پیروی نہیں ملتی۔ بلکہ عشق و محبت کا ای
صحتمند انداز نظر آتا ہے۔ عام طور پر معشوق کی شبیہ اپنی حقیقی شکل میں ہی سامن
آئی ہے۔ یعنی اگر معشوق مرد ہے تو پھر اسے مرد ہی رہنے دیا گیا اور اگر صنف
نازک سے متعلق ہے تو پھر اظہار عشق کی خاطر اس کی جنس بدلنے کی سعی مکروہ نہیں
کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ قلی قطب شاہ سے لے کر ولی دکنی تک معاشقے کی ج
روایات ملتی ہیں ان میں غیر اخلاقی عناصر ضرور موجود ہیں مگر غیر صحتمند اور مصنوعی
جذبات کے اظہار سے عموماً گریز کیا گیا ہے۔ عام طور پر اس وقت ہندی
شاعری کی طرح مرد معشوق ہے اور عورت عاشق — چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

نبی صدقے بارا اماماں کرم
کرو عیش جم یارا پیاریوں سوں پیارے

(قلی قطب شاہ)

پیا باج پیالہ پیا جائے نا   پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں   کہا جائے لیکن کیا جائے نا

(قلی قطب شاہ)

پیا ایسے میں آئے تو گلے لگ کر گرم ہوں گی
کرم سیں اب کے ہوؤں گی دو داناداں ٹھنڈ کالا

(ہاشمی)

میں مست ہو کر سیج میں بیتاب ہو رہی تھی نپٹ
باتاں پرم کی کاڑ کر منجہ کیوں جگاتا سادے

(نصرتی)

دکنی عہد میں عشق کا صحت مند تصور ضرور ملتا ہے مگر وہاں بھی شاہی ماحول کنیزوں اور نچلے طبقے کی عورتوں کو ہی منظر عام پر لایا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ یہ کنیزانِ حرم اس وقت کے بادشاہوں کے لئے دادِ عیش کا سامان بنی ہوئی تھیں۔ کبھی بدیع الجمال بدر منیر اور مہ جبیں جیسے کردار سامنے آئے بھی تو ان میں شہزادی یا شریف زادی کا عکس کم ہی نظر آتا ہے۔ بقول داغ دہلوی۔

عشق کا حال بیسوا جانیں   ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں؟

مختصر یہ کہ اردو شاعری میں معشوقہ کی سیرت میں شریف النفس کے جذبات شاذ و نادر ہی سامنے آئے ہیں۔ عام طور سے پیشہ ور طوائف ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی دلچسپی کا سبب بنی رہی ہے۔ شاذ ہی کوئی خوبصورت دوشیزہ، نرم و نازک احساس کی مالک ہندوستانی لڑکی ترقی پسند شاعری کے دور میں ہمارے سامنے آئی۔ ورنہ عموماً جلوہ نما بازاری عورت ہمارے شاعروں کے ذہن و اعصاب پر چھائی رہی خواہ غالب ہوں، مومن، جرأت، داغ و جگر ہوں یا نواب مرزا شوق وغیرہ۔ اگر ہم اپنے قدیم معاشرے کی اخلاقی قدروں اور اس وقت کے سماجی حالات و کوائف کی روشنی میں عشق کے اس مبالغہ آمیز اور تصنع پسند تصور کی نفسیاتی توجیہ کریں تو بہت ساری گتھیاں خود بخود سلجھ جائیں گی۔ میں نے پہلے بھی کہیں تحریر کیا ہے کہ ہماری شاعری میں عشق و عاشقی کی دھوم دھام خوب ہے لیکن حسن و عشق کے حقیقی تصورات کی بجائے ہماری شاعری میں مصنوعی اور مبالغہ آمیز تصورِ عشق کارفرما رہا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں وجہ تو یہ ہے کہ قدیم سماج میں پابندیاں زیادہ تھیں عشق و محبت کے جذبات کو عام طور پر غلط اندازِ نظر سے دیکھا جاتا تھا لوگ اس کی تضحیک کرتے تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ عشق تو ایک فطری جذبہ ہے۔ اپنے اظہار کی صورتیں کسی نہ کسی انداز میں ڈھونڈتا رہا اور عموماً غیر فطری اور مجہول اندازِ اظہار کی اس نے پیروی کی ہے۔ بقول سید احتشام حسین ـــ بہت سے صوفی شعراء نے لڑکوں سے محبت کی ہے اور اپنی اس مجازی محبت کو عشقِ خداوندی کا زینہ قرار دیا ہے بلکہ ایسی محبت کو پاک اور جنسی آلودگی سے ماوراء بھی بتایا ہے۔ بہت سے شعراء نے افلاطونی محبت یعنی ''محبت برائے محبت'' کی جانب اشارے کئے ہیں اور اکثر نے جنسی محبت کو ہوس کہہ کر اپنے جذبۂ عشق کو تقدس کا جامہ پہنایا ہے لیکن ان تمام باتوں سے اگر کوئی حقیقت واضح ہوتی ہے تو وہ یہی ہے کہ رقابت کا یہ جذبہ بھیس بدل کر شعر و ادب کی دنیا میں آتا ہے اور ہر جگہ رشتۂ ازدواج کے علاوہ اور خانگی زندگی کی

تنگنائے سے باہر اس کی تلاش جاری رہی ہے"۔

(ذوق ادب و شعور۔ ص ۷۵)

سب سے پہلے اختر شیرانی نے طوائف سے درگزر کرتے ہوئے سلمیٰ، ریحانہ اور عذرا جیسی دوشیزاؤں کو اپنی شاعری میں معشوق کی حیثیت سے داخل کیا۔ پھر جوش نے جامن والی مہترانی وغیرہ کو جاذب توجہ قرار دیا ہے۔ ترقی پسند شاعری نے بقول سردار جعفری عورت کے مختلف درجات سے ہمیں آشنا کیا مگر یہاں بھی عورت کی سب سے نمایاں شکل طوائف میں ہی ابھری ہے بقول ڈاکٹر محمد حسن ـــ

"یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اختر شیرانی کی محبت اور پوجا کی مورتی سلمیٰ کے زوال کے فوراً بعد خود رومانوی ادیبوں نے عورت کو طوائف کے روپ میں دیکھنا اور پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ طوائف اس دور کا محبوب موضوع ہے"۔

(معاصر ادب کے پیش رو از ڈاکٹر محمد حسن۔ ص ۳۹)

البتہ اتنا فرق ضرور پیدا ہوا ہے کہ اگلے زمانے کی طوائفیں لذتِ وصال اور شوقِ بوس و کنار کا مکمل نمونہ تھیں اور ترقی پسندوں کے زمانے میں یہ سماج کے ایک مظلوم طبقہ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اب یہ جنسی خواہشات کا آلۂ کار تو ہیں مگر ان کے دل میں بھی درد کا ایک چشمہ ابل رہا تھا۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش ایک فطری صورت میں سامنے آئی ہے۔ ترقی پسند شعراء کی بیشتر نظمیں طوائف کے اس نئے رُخ کو نمایاں کرتی ہیں۔ (اختصار کی خاطر میں یہاں مثالوں سے گریز کر رہی ہوں)۔

ترقی پسند تحریک کے ہی زمانے میں علامہ جمیل مظہری جو اس تحریک سے براہ راست وابستہ کبھی نہیں رہے، ان کی شاعری نے بھی فروغ پانا شروع کیا اور غالباً پہلی دفعہ اردو شاعری کو ایک ایسی عورت سے انہوں نے متعارف کیا ہے جسے ہم صحیح معنوں میں ہندوستانی دوشیزہ کا اصل روپ کہہ سکتے ہیں۔ جمیل کی عذرا، ہندوستانی عورت کی مظلومیت کا ایک دلکش استعارہ ہے۔ اس کے اندر جو سچائی اور بے باکی ہے، جو درد اور کسک ہے، جو سوجھ بوجھ اور سماجی شعور ہے جمیل سے قبل کی نسائی سیرتیں ان صفات سے نا آشنا ہیں۔ جمیل مظہری نے شاید پہلی دفعہ ہندوستانی عورت کی مظلومیت کے فسانے کو ایک بھرپور سماجی اور گھریلو ماحول کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ یہ ان کا وہ اہم کارنامہ ہے جس کے لئے وہ ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ فی الحال ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جمیل مظہری کے نسائی کردار سے اردو دنیا کو پوری طرح متعارف کرائیں۔

جمیل کی عذرا، اختر شیرانی کی سلمیٰ کا ارتقائی روپ ہے۔ اختر شیرانی کی سلمیٰ پر جو رومانی دھندلکا تھا۔ جمیل کی حقیقت پسندی نے اس رومانی دھندلکے کی جگہ اپنے پریم راگ میں سماجی شعور کو بیدار کیا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ فراق، جاں نثار اختر، مجاز، اختر الایمان، خلیل الرحمٰن اعظمی، مخدوم محی الدین وغیرہ نے عورت کی اس شکل سے ہمیں واقف کرایا جس کو ہم اس کا صحیح روپ کہیں گے۔ ان شعراء کے کلام کے مطالعہ سے عشق و عاشقی کا جو تصور بیدار ہوتا ہے وہ قدیم سے بہت مختلف ہے۔ اب عورت محض تسکین و تفریح کا ذریعہ نہیں یہ زندگی کی ایک اہم ضرورت اور ایک ازلی خواہش کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔

عہد حاضر کے شعراء کے یہاں معاشقے کا تصور محض وصل کی لذت کو نہیں ابھارتا بلکہ آج کے زمانے میں جسم اور روح دونوں دو مختلف سمتوں میں بہہ رہے ہیں اس لئے اکثر اوقات ان لذت آگیں لمحوں میں بھی آج کا شاعر اداس، مضمحل اور فرسٹریٹیڈ نظر آتا ہے۔

درمیانی عہد میں عورت 'فاصلے کا جادو' (Magic of distance) تھی۔ شاید اسی لئے زیادہ جاذب توجہ بھی تھی لیکن نئی زندگی میں وہ مردوں کے شانہ بشانہ چل رہی ہے۔ وہ دفتروں میں، کالجوں میں، سیاست میں مردوں کے ساتھ ساتھ کام کر رہی ہے۔ بڑے بڑے عہدوں کو وہ بھی مردوں کی طرح حاصل کر رہی ہے اس لئے اب وہ کوئی سہانا خواب نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے اور اس کی اپنی ایک مکمل شخصیت ہے۔ لہٰذا معاشقے کا تصور بھی موجودہ عہد میں زیادہ فطری اور حقیقی ہو گیا ہے۔ اس میں اب ماورائیت اور معصومیت کی جگہ مادیت پرستی کا رجحان فزوں تر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نئی شاعری میں روح کی تشنگی بڑھتی جا رہی ہے جبکہ گزشتہ زمانے میں روح کی تشنگی سے زیادہ جسمانی تشنگی کا احساس نمایاں تھا۔

●●

جسمانی کشش اور اولین تاثرات

آخر جسمانی دلکشی اتنی اثر انگیز کیوں ہوتی ہے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ آناً فاناً اور پہلی جھلک میں اپنے آپ کو ظاہر کر دیتی ہے۔ جب ہم کسی سے پہلے پہل ملتے ہیں تو بس ایک اندازہ قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ یہ شخص رجحان، دلچسپی اور مذاق میں ہم سے کتنا ملتا ہے۔ اس کی استعداد اور ذہانت کا کوئی واضح سراغ ہمارے ہاتھ نہیں آتا۔ بس ہم ایک جھلک میں یہ دیکھ لینا چاہتے ہیں کہ جو شخص ہم سے مل رہا ہے وہ کشش اور جاذبیت کے بارے میں ہمارے خیالات کے موافق ہے یا نہیں۔ چنانچہ ہم یا تو اسے قبول کر لیتے ہیں یا رد کر دیتے ہیں۔

پہلے تاثرات دنیا کے بارے میں ہمارے ادراک کو بہت زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ ادراک کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ "یہ پہلے تاثرات کا علم ہے"۔ چنانچہ نئے لوگوں سے ملنے پر ہمارا پہلا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ ہم اس دیرپا تاثر کو دریافت کر لیں جو ان کی کشش سے برآمد ہوتا ہے۔ اگر ہم محض ان کی ظاہری کشش کی وجہ سے انہیں پسند کر لیتے ہیں تو پھر عموماً پسند ہی کرتے رہتے ہیں چہ جائیکہ ان کا بعد کا رویہ قابلِ اعتراض ثابت ہو۔ اگر ہم ابتدا میں انہیں ناپسند کر بیٹھیں تو گمان یہی ہے کہ ہم ہمیشہ انہیں ناپسند کرتے رہیں گے خواہ ان کا بعد کا رویہ قابلِ تعریف نہ ہو۔

●●

حُسن کے نظریات

حُسن کیا ہے؟ حسین کسے کہتے ہیں؟ حُسن کے عالمی نظریات

نوٹ: ادیبوں کو حسن کی اصطلاح سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن عام طور پر حسن کو بہت تنگ معنوں میں لیا جاتا ہے۔ حسن کے فنی اور عالمی نظریات کو سمجھے بغیر بھی ادیبوں کا بہر حال حسن سے تعلق قائم رہتا ہے اور حسن ان کی تخلیقات میں ایک تشکیلی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے اس مضمون کو تفہیم حسن کے نقطۂ نظر سے ترتیب دیا ہے۔ اور روسی ماہر جمالیات اینفرزس "AVNERZIS" کے ایک مقالے سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ (ف۔س۔اعجاز)

'حسین' کسے کہتے ہیں یہ جمالیات کا اصل اور اہم ترین مسئلہ ہے۔ ماضی میں جمالیات کو خوبصورتی کے علم (SCIENCE OF THE BEAUTIFUL) سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اور آج بھی حسن کے حوالے سے 'جمالیات' کی تشریح کی جاتی ہے۔ لیکن جمالیات کوئی حسن کا نظریہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا علم ہے جس کا تعلق انسان کے حقیقی دنیاوی مشاہدۂ حسن سے ہے اور اس سے بڑھ کر فن کی بالیدگی نیز فنکارانہ تخلیقیت کے نظریہ سے ہے۔ بہر حال نظریۂ جمالیات کی تاریخ میں اس خیال کا جڑ پکڑ لینا کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ جمالیات کا تعلق جس شئے سے ہوتا ہے وہ ''حُسن'' ہے اور حسن کے سوا کچھ نہیں۔ خوبصورتی بنیادی اہمیت کا جمالیاتی خیال ہے اور اس خیال سے بچ کر کسی جمالیاتی خیال کی تشریح ممکن نہیں ہے۔ حسن کی ماہیت کی جداگانہ تعریف نہ کی جائے تو آرٹ کے عام قوانین اور فنکارانہ تخلیقیت کو پورے طور پر سمجھنا مشکل ہوگا۔

حسن کی ماہیت کی تعریف کرنا ایک مشکل کام ہے۔ زندگی اور فن میں ہم خوبصورتی کے متنوع اظہار سے درپیش ہوتے رہتے ہیں جہاں ایک دوسرے میں کسی مماثلت کا امکان تک نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل نظر آتا ہے کہ انسان کے رومانی حسن اور 'حسنِ ادا' جو آنکھوں کے لئے دعوتِ نظارۂ فردوس سے کم نہیں، یا جام بلور اور کسی برگ شجر اور فنی شاہکار میں کیا فرق پایا جاتا ہے۔ یہ مظاہر حقیقت کے مختلف خطوں سے حاصل کئے گئے ہیں اور ان میں کسی مشترکہ باضابطہ خوبی کو دریافت کرنا ناممکن ہے جو حسن کی تعریف

(DEFINITION) کی وجہ یا سبب بن سکے۔

افلاطونی نظریہ۔ (PLATO) افلاطون نے جمالیاتی فکر کی تاریخ میں پہلی بار حسن کا فلسفیانہ اصول وضع کیا۔ اس کا اصرار تھا کہ دو سوالوں کا موازنہ کیا جائے۔ اول یہ کہ حسین کیا ہے؟ دوئم یہ کہ حسن کا وقوع کہاں ہے اور اس کی ماہیت یا اصل کیا ہے؟

مادہ پرست یا خیال پرست جمالیات پسند لوگ حسن کی ماہیت کے بارے میں متضاد نظریات رکھتے ہیں۔ خیال پرست جمالیات میں حسن ایک شئے ہے جس کا تعلق آدمی کی روحانی زندگی سے ہوتا ہے جس کی جڑ انسانی شعور کی تہہ میں دبی ہوتی ہے اور جس کی کوئی معروضی یا خارجی شکل مفقود ہوتی ہے۔ مادی حسن پرست حسن کے تعین. قدر کے لئے داخلی عنصر کو بے پناہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہ حسن کے تغیر پذیر نظریات کو خاطر میں لاتے ہیں اور حسن کے تاریخی ماخذ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے باوجود ان کے اصول کا نقطۂ آغاز یہ ہوتا ہے کہ حسن کوئی معروضی یا حقیقی شئے ہے۔ گویا یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حسن شعور انسانی سے بالکل آزاد ہے۔

حُسن کے قدیم نظریات میں ارسطو کا کلاسیکی نظریہ بڑا اہم اور تاریخی سمجھا جاتا ہے جو آج بھی خاطر میں لایا جاتا ہے۔ ارسطو کا نظریہ اس لئے باعث کشش ہے کہ یہ حسن کے حقیقی خدوخال کی توضیح کرتا ہے۔

ارسطو کا نظریہ۔ ارسطو حسن کو زندگی کے مظہر میں مخصوص جنسی اور شہوانی (Sensual) اوصاف سمیت دیکھتا ہے۔ ارسطو اور اس کے مریدوں کے مطابق بعض اصولوں کے تیئں ہم آہنگی، تناسب اور وابستگی (Harmony Proportion and Adherence) حسن کیلئے اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔

"حُسن ناپ، جسامت اور ترتیب کا معاملہ ہے لہٰذا اسے اس وقت طے کرنا ناممکن ہو جاتا ہے جب کوئی بہت چھوٹی مخلوق ہماری نظر کے سامنے ہو کیوں کہ ہمارا ادراک ایک انتہائی چھوٹی مخلوق کے اچانک سامنے آجانے پر غیر واضح رہتا ہے اور چونکتا نہیں ہے یا جب کوئی بڑی مخلوق ہمارے سامنے آجائے جو مثلاً ایک ہزار میل لمبی ہو۔ کیوں کہ ایسی صورت میں اس خارجی شئے کو ایک جھلک میں پورا دیکھنے کی بجائے اس کی وحدت اور سالمیت تماشائی کی نظر سے غائب ہو جاتی ہے"۔

(Aristotle' On the Art of Poetry, Oxford, 1920, P.40)

ارسطو جمالیات کے لئے تناسب کو اہم قرار دیتا ہے۔ کسی شئے یہ حسن کو بہت بڑا ہونا چاہئے اور نہ بہت چھوٹا۔ تناسب سے یہی مراد ہے۔ اسی بناء پر ارسطو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ حسن کے اظہار کے لئے ترتیب، تناسب اور نزاکت بنیادی عوامل ہیں۔

نظریۂ حسن جس کی رو سے حسن مادی دنیا کے کسی روپ میں پایا جاتا ہے اور اس کا اظہار ظاہری صفات مثلاً تناسب، ہم آہنگی، موزونیت کی بنیاد پر ہوتا ہے' ایک مادی نظریہ تھا۔ یہ نظریہ نہ صرف حسن پرستوں بلکہ فنکاروں میں بھی کافی مقبول ہوا۔ اس نظریے نے حسن کے لئے ایک حقیقی کسوٹی تیار کرنے میں

آسانیاں فراہم کر دیں۔ اس سے حسن کے لئے پیمانے اور مسلم اصول وضع کرنے میں سہولت ملی جن کا علم فنکارانہ خلاقی کے لئے از حد ضروری تھا۔ چنانچہ ارسطو کے افکار جمالیات سے پہنچنے والے نظریات کو یورپ کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) میں کافی منظوری ملی۔ ان کی پذیرائی کلاسیکیوں کے افکار جمالیات میں بھی ہوئی اور اٹھارہویں صدی کے روشن خیالوں (Enlighteners) میں بھی۔ آہنگ اور تناسب کو حسن کی اصل ماننے والوں کے خیالات میں اختلاف بھی تھا۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے اپنے طور پر ایک معین تناسب اور طے شدہ پیمانے کی تلاش میں سرگرداں تھے جسے حسن کا معیار قرار دیا جا سکے۔ اٹھارہویں صدی کے انگریز آرٹسٹ اور ماہر جمالیات ولیم ہوگارتھ (William Hogarth) نے اپنے مقالہ ''حُسن کا تجزیہ'' (The Analysis of Beauty) میں حُسن کی ایک نئی روپ ریکھا کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے ماخذ کی وضاحت کی۔ یہ ایک پُر پیچ نقشہ تھا جس کے خطوط حسین و جمیل اور سراپا کے مجموعی نشیب و فراز دلپذیر اور آنکھوں کے لئے خوشگوار تھے۔ ایسی ریکھا بقول ہوگارتھ انسان کے جسم، پیڑ کے پتوں یا آدمی کے ہاتھوں سے آراستہ کئے گئے نمونوں میں حسن کی نمود کے طور پر جھلکتی ہے۔

نشأۃ ثانیہ اور عہد جدید میں تسلیم کئے جانے والے حسن کے نظریات میں تال میل، اتار چڑھاؤ اور موزونیت، کُل اور اجزاء کے مابین ہم آہنگی اور کثرت میں وحدت کے اصولوں کو فطرت کے حُسن ترتیب کے مطابق تسلیم کیا گیا ہے۔ انہی اصولوں سے فنکاروں نے تخلیقیت اور حسن کی شرح مرتب کی ہے۔

خیال پرست اہل جمالیات۔ خیال پرستوں نے اس نظریہ کو رد کر دیا کہ حسن کو ریاضی کے تناسب تک محدود کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے نظریے کا آغاز اس اصول سے کیا کہ حسن کو سبب یا استدلال کے ذریعہ بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے کسی پیمانے پر ناپا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی اصل اس کی اظہاریت میں ہے۔ ان کا اصرار اس پر تھا کہ نشأۃ ثانیہ کے مجسمہ سازوں نے ایک حسین انسانی چہرے کا ٹکسالی اصول وضع کرنے کی خاطر اصول پیمائش سے کام لیا ہوگا لیکن ان کا مقصد کبھی پورا نہیں ہوا کیونکہ انسانی چہرے کی خوبصورتی کسی ایک خاص تناسب یا صرف ظاہری نقوش میں پنہاں نہیں کہی جا سکتی بلکہ یہ اس کی اظہاریت، وجدان اور انسان کی اندرونی دنیا کے عکس کی خارجی شکل میں مضمر ہے۔

حُسن اور روحانیت کا یہ سر رشتہ ہی تمام خیال پرست جمالیاتی نگارشات کا محرک ہے۔ خیال پرستوں کی رائے میں وجدان صرف انسان میں ہی نہیں پایا جاتا بلکہ کسی خیال کو بھی لیجئے، وہ خوبصورت ہو سکتا ہے مگر یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب اس کے قلب میں ایک روحانی عنصر اور اس کے اظہار کی صلاحیت موجود ہو۔ جس طرح انسان اپنے اندر ایک ادراک رکھتا ہے اسی طرح جذبات، محسوسات، افکار اور خیالات باہری مادی شکل میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ اگر کسی شئے کی ماہیت یا اس کا تمام سراپا کسی روحانی جذبے کا اظہار نہیں کر پائے یا اس کے پہلو میں کوئی خیال مضمر نہ ہو تو حسن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ حسن ایک 'قدر' ہے اور آرٹ اس قدر کا

اظہار۔ یہاں 'قدر' کا خیال آدمی کے روحانی تجربے سے برآمد ہوا ہے اور فطرت کے عمرانیاتی تاریخی تجربے اور اس کے تخلی تقاضوں سے جڑا ہوا نہیں سمجھا جائے گا۔ حسن کی 'مفہوسیاتی' (Semantic) اصطلاح اسے فنی شاہکار کے خاصہ، عمل یا نتیجہ کی رمز کے طور پر پیش کرتی ہے۔ یہ رمز یا اشارہ بذاتِ خود ایک ایسے وصف کے طور پر ظاہر ہوتا ہے جس کا انکشاف انسان کی روحانی زندگی سے ممکن ہوتا ہے۔

کئی بنیادی سوالوں کا جواب مختلف جمالیاتی نظامات میں ایک جیسا نہیں ہے۔ مثلاً حسن کو مرکب کرنے والا روحانی مادہ کس شئے میں مضمر ہے اور یہ مادی شکل میں خود کو کس طرح ظاہر کرتا ہے یا یہ کس محسوس کن خول میں رہتا ہے۔ معروضی اور داخلی اہل جمالیات اس سوال کا الگ الگ جواب دیتے ہیں اگرچہ ان کے اختلافات اصولی نہیں ہیں۔

معروضیت پرست۔ معروضیت پرست جمالیات حسن کیلئے تکمیل، (Perfection) کے کلیہ کی طرفدار ہے اور اس کلیہ کا نفاذ ایک صنف یا ایک جنس (Species) میں ہونا چاہئے۔ مثلاً ایک خوبصورت گلاب ایسے گلاب کو سمجھا جائے گا جسے اس کی 'قسم' میں بے نظیر اور ناقابلِ سبقت قرار دیا جا سکے جس میں کسی گلاب کی تمام لازمی صفات پائی جاتی ہوں۔ ایک جسمِ انسانی اگر نوعِ انسانی کی بہتر سے بہتر صفات اور خوبیوں کا مرقع ہو تو اسے انسانی شکلوں میں خوبصورت مانا جائے گا۔

داخلیت پرست۔ داخلیت پرست جمالیات حسن کی روحانی سرشت کو مان کر چلتی ہے۔ معروضی جمالیات پرستوں کے برخلاف داخلی جمالیات پرست حقیقی دنیا کے معاملے میں روحانی اصول کو لے آتے ہیں چہ جائیکہ ان کا یہ عمل رب کی معرفت نہیں بلکہ انسان کے اپنے شعور کے ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ اس کا ادعا کرتے ہیں کہ انسان کسی چیز کو اس وقت خوبصورت قرار دیتا ہے جب اس شئے موجود سے وابستہ اس کی اندرونی دنیا یعنی قلب میں بیدار ہونے والے محسوسات' جذبات اور صفات اس کے ذہن میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے تصور کی مدد سے فطرت اور اپنی چوطرفہ دنیا میں روح پھونک دیتا ہے اور ان کے حسن کو جلا دیتا ہے۔ یہ فطری اور انسانی خوبیوں کی مماثلتیں آدمی کی زبان سے بھی ادا ہوتی ہیں۔ اور زبان میں باہمی مطابقت کی راہ بھی پاتی ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ سورج 'طلوع ہو رہا ہے' اور 'غروب ہو رہا ہے' یا یہ کہ موسم 'دھندلا اور اداس ہے' یا 'جھرنے گا رہے ہیں' وغیرہ تو ہمارے یہ کہنے میں انسانی صفت فطرت کی واقعیت سے میل کھا جاتی ہے۔ خیالی حسن پرستوں کی جمالیات کے نقطۂ نظر سے یہ ایک عام Universal اصول ہے جو حسن کی عبارت کو خط کشیدہ بھی کر دیتا ہے اور اسے ابھارتا بھی ہے۔ یہاں نظریے کی اساس بقول شاعر وہی ٹھہرتی ہے۔

نظر حسیں ہو تو جلوے حسین لگتے ہیں

حسن پرستی داخلی جمالیات پرستوں کے زاویۂ نگاہ سے ایک داخلی امر ہے۔ ان کی رائے میں حسن محض انسانی دماغ کی ایک مخصوص حالت کا نام ہے۔ چنانچہ تھیوڈر لپس (Theodor Lipps) اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حسن نتیجہ

ہے فنکار کے خارجی دنیا کو اپنے احساسات کے رنگ میں رنگ لینے کا۔

یہاں رمیش چندر دویدی کے مضمون ''فراق گھر کے باہر'' سے فراق گورکھپوری کا نظریہ منقول ہے:

''جب تک ہم چیزوں کو دور سے دیکھتے ہیں یا اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہیں تب تک ہمیں اس چیز یا مادّے کی باہری شکل کا ہی اندازہ ہو پاتا ہے۔ جیسے جیسے ہم اس چیز کے قریب ہوتے جاتے ہیں یا وہ چیز ہمارے نزدیک آتی جاتی ہے ویسے ویسے وہ چیز ہمارے لئے ایک راز بنتی جاتی ہے۔ قریب اور نزدیک یا چیزوں سے ہماری INTIMACY ایک MYSTERY کا SENSE پیدا کرتی ہے۔ آپ کبھی اندھیری رات یا تاروں بھری رات یا کسی وادی، دریا، پہاڑ، جنگل یا کسی معمولی درخت یا پودے یا ایک بچّے کو دیکھئے اور دیکھتے جایئے۔ جتنی بھی ان چیزوں میں آپ کی محویت بڑھتی جائے گی آپ ان چیزوں کی خارجی شکل کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں گے۔ اور آپ ایک دم ششدر، بدحواس ہو بیٹھیں گے۔ چیزیں آپ کے لئے ایک راز بنتی جائیں گی۔ اور یہ مادّی دنیا یا مجاز دنیائے راز بن جائے گا''۔

نیا دور: فراق نمبر

مئی جون جولائی ۱۹۸۳ء ص۔ ۸۹

اگرچہ مثالی حسن پرستوں کے نظریات بنیادی طور پر ناقابلِ قبول ٹھہرتے ہیں تاہم انہوں نے جن فنی شاہکاروں کے خارجی مواد کا مطالعہ اور تجزیہ کیا ان کے حوالے سے حسن کی فطرت کے بارے میں کئی مسائل کے مثبت حل پیش کئے۔ جن میں ان کا یہ اٹل عقیدہ بھی شامل ہے کہ حسن معنی خیزی اور مواد سے پُر ہے۔ نیز حسن ایک مظہر (Phenomenon) کی صورت میں اجاگر نہیں ہوتا بلکہ اس کے معنی یا باطنی جوہر میں پنہاں ہوتا ہے۔

حُسن زندگی ہے۔ حُسن کا تفصیلی مطالعہ عہدِ جدید میں روس کے انقلابی جمہوریت پسندوں نے بڑے اعتبار کے ساتھ کیا ہے جن میں چرنیشیوسکی (Chernyshevsky) کا نام بہت اہم ہے جس کا مقالہ ''آرٹ کا حقیقت سے جمالیاتی رشتہ'' بہت مقبول ہے۔ بقول چرنیشیوسکی ''حسن وہ عالم ہے جس میں زندگی کو اسی طور پر دیکھتے ہیں جیسا اسے ہمارے خیالات کے مطابق ہونا چاہئے۔ خوبصورتی ایک شئے ہے جو زندگی کا اظہار کرتی ہے یا ہمیں زندگی کی یاد دلاتی ہے''۔ یہ بیان سب سے پہلے تو حسن کے حقیقی وجود کو تسلیم کرتا نظر آتا ہے۔ حسن خود زندگی میں پایا جاتا ہے۔ حسن زندگی ہے۔ جن مظاہر میں ہم زندگی کا اظہار اس کے 'کُل' کے ساتھ پاتے ہیں وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی خود اپنی ناگزیریت اور التزام کی مکمل شکلوں میں فطرتاً اور از خود ترقی پا گئی ہے۔

''حسن زندگی ہے'' کا نظریہ مادی جمالیات کے لئے اساسی ہی سہی مگر یہ حسن کی ماہیت کو پورے طور پر آشکار نہیں کرتا۔ چرنیشیوسکی اپنی تعریف کی مدافعت میں ایک داخلی استدلال پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ 'کُل' زندگی خوبصورت نہیں ہوتی، چنانچہ ساری زندگی کو زندگی نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ بقیہ حصہ زندگی کا وہ ہے جیسا اسے ہمارے فہم و خیال کے مطابق ہونا چاہئے۔ چرنیشیوسکی 'خوبصورت' کی تفہیم کو زندگی کا مساوی مانتے ہوئے اسے انسانی مطمحِ نظر بنا دیتا

ہے اور اس جمالیاتی نصب العین کو وہ ایک عمرانی تاریخی کردار عطا کر کے جماعتی تصور (Class Ideal) میں تبدیل کر دیتا ہے جس میں سماجی ترقیوں کے صحیح تقاضے منعکس ہوتے ہیں۔

چرنیشیوسکی کے نظریۂ حسن میں معروضی اور داخلی عناصر ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ یہ اتحاد ہمیں خوبصورتی کا معروضی وجود دکھا دیتا ہے۔ ساتھ ہی اس خوبصورتی کے متعلق انسان کے ادراک کا عمرانی و تاریخی پہلو بھی ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ حسن ایک شئے ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔

مارکس کا نظریہ۔ فطرت میں جو کچھ غیر صحتمند، مردہ یا انسان کی زندگی کی تنظیم کے برعکس ہے۔ وہ حسن کو تباہ کرتا ہے اور اسے بھدا تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو بات ہماری زندگی کے خیال کے موافق ہے وہ خوبصورت ہے۔ انسان فطرتاً ایک مصور ہے جو اپنی زندگی کے خاکے میں رنگ بھرنے کے درپے ہے۔ اس کی تمام تخلیقات خوبصورت نہیں ہوتیں۔ بعض تو بالکل بھدی قرار دینے لائق ہوتی ہیں مگر یہ بھدی تخلیقات تخلیقی طریقے سے زندگی کی عدم تکمیل کا احساس دلا کر اس میں حسن کے لئے ایک آرزو اور عزم پیدا کر دیتی ہیں۔

مارکس اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی بات کو پیش کرتا ہے کہ انسان قوانین حسن کے مطابق تخلیق کرتا ہے۔ اس موضوع پر وہ کہتا ہے کہ جانور مادے کی تجسیم صرف اپنی صنف یا طبقہ کی ضرورت اور پیمانے کے مطابق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جبکہ انسان کسی بھی طبقہ کی احتیاج اور پیمانے کے مطابق (اور ہر جا و ہر کہیں کسی خارجی شئے کے پیمانے کے مطابق) تخلیق کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس بنا پر آدمی حسن کے قوانین کے مطابق مادے کو کوئی صورت دے سکتا ہے۔ ایک مرغابی اپنے انڈے سیتی ہے اور اس کے انڈے سینے کا عمل اس وقت بھی جاری رہے گا جب انڈوں کو پتھروں سے بدل دیا جائے۔ اپنی تفسیخ عمل سے بے خبر مرغابی اس فعل کو جاری رکھے گی۔ کیونکہ اسے صرف اپنے رجحان کی تسکین چاہئے۔ اس کا یہ رجحان اس کا 'فریضہ' ہے جو اسے قدرت نے سونپا ہے نیز اس کی پچھلی نسلوں نے اسے یہ 'تجربہ' وراثت میں دیا ہے۔ اس کے برعکس آدمی اپنی سرگرمی اور اپنے عمل کو نہ صرف اپنی ضرورت سے ملا لیتا ہے بلکہ جس شئے معروضی پر وہ کام کر رہا ہوتا ہے اس کے تقاضے کے مطابق اپنے عمل کا رخ موڑ دیتا ہے۔ وہ اپنی باطنی صلاحیت کی بنا پر کسی خارجی شے کی طرف راغب ہو سکتا ہے گویا اس کی یہ باطنی صلاحیت خارجی شے کے امکانات دریافت کرنے اور قدر آنکنے کا وسیلہ ہے۔

زندگی کا مظہر جتنا پیچیدہ اور واضح ہوگا اس میں اتنا ہی حسن کا گزر ہونے کا امکان ہے۔ اونچا آدمی اپنی متحرک تخلیقی کوششوں کے ذریعہ اپنے آپ کو اتنا ہی بلند کر سکتا ہے جتنا اس کے عمل میں حسن کا قانون عمل پذیر ہو۔ اس کی تخلیق جتنی مکمل ہوگی اسی قدر حسین ہوگی۔

انسان کے خیالات حسن جس شکل میں ڈھلتے ہیں وہ سماجی زندگی کا ڈھانچہ ہے۔ اس میں طریق زندگی، تاریخی حالات، سوسائٹی کی طبقاتی ساخت

اور قومی روایات وغیرہ کو بہت دخل ہوتا ہے۔

قدیم یونانی۔ قدیم یونانیوں کی نظر میں دنیا اپنی ہم آہنگی کی بنا پر خوبصورت تھی۔ ان کے نزدیک آہنگ اور حسن لازم وملزوم تھے۔

عہد متوسط میں۔ عہد متوسط میں جلال کو جمال پر فوقیت حاصل تھی۔ اس دور میں حسن و جمال کی حیثیت ثانوی تھی۔ اور اس وقت شہوانی مادے کو رد کر دیا گیا تھا۔ حسن کی ماہیئت کا اندازہ اس دور میں عیسائی راہبوں کے لباس سے ہوتا تھا جس نے انسانی جسم کے سارے ابھار اپنے اندر چھپا ڈالے تھے۔ انسانی جسم کے حسن کا یوں رد کر دیا جانا اور زندگی کا گلکاری کی تسکین سے محروم ہو جانا اور صرف خدائی اور آسمانی عظمت اور ظاہری انسانی وجود کے اعتراف کے علاوہ سب کچھ باطل قرار دینا ہی وہ نظریۂ حسن تھا جو اس عہد کے فن میں ترک وزہد کے غالب رجحان کے طور پر بکثرت ملتا ہے۔

نشاۃ ثانیہ۔ نشاۃ ثانیہ کے عظیم لوگوں نے انسان کی بے قدری کی مخالفت کرتے ہوئے دینیاتی تفہیم حسن سے بغاوت کر دی۔ کارل مارکس کا یہ قول "میں ایک انسان ہوں اور انسانی بے رخی میرے شمار خاطر میں نہیں ہے"۔
("I am a man and count nothing human indifferent to me") نشاۃ ثانیہ کے جمالیاتی نصب العین کو ظاہر کرتا ہے۔

طبقاتی دور۔ طبقاتی دور میں جمالیات کا خط فاصل عقل اور عادت کو ٹھہرایا گیا۔ زندگی اپنی اصلی اور فطری صورت میں بھدی ہے۔ صرف مصنوعی طور سے پیدا کی گئی فطرت کو حسن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس طرح شاہی گھروں کے بغیچوں میں پیڑ پودوں کو تراش خراش کے ذریعہ خوبصورت بنایا جاتا ہے۔

رومان پرست۔ رومان پرستوں کا نظریۂ حسن بھی نشاۃ ثانیہ کے نظریے سے مختلف تھا۔ لیکن اس کا اختلاف دیگر نوعیت کا تھا۔ ان کے لئے جو سب سے اہم تھا وہ تھا حسن کا روحانی اور مثالی پہلو۔ بہرحال انقلابی رومان پرستوں کے نزدیک خوبصورتی کی اصل، ربانی نہیں بلکہ انسانی تھی۔

حقیقت پسند۔ حقیقت پسندی کے آرٹ میں خوبصورتی کی معنویت میں کافی توسیع ہوئی۔ حقیقت پسند زندگی کے تمام متنوع تعلقات اور وابستگیوں کو بغور دیکھتے ہیں۔ حقیقی دنیا پر دیدہ و دانستہ غور کرتے ہوئے حقیقت پرست فنکار حسن کے ایسے نصب العین کی وکالت کرتے ہیں جو مشکل حرکتوں اور تبدیلیوں کو اپنی کوکھ میں پالنے والی زندگی کا مظہر ہو۔

مارکسی لینی جمالیات خوبصورتی کو ایک 'قدر' کی بجائے دیکھتی ہے جس کا تعین سماجی تاریخی تجربہ سے ممکن ہوتا ہے۔ آدمی کے نظریۂ حسن پر اس کے جغرافیائی حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ (مثلاً عمارت سازی کے فن کو لیجئے)۔ انسان خوبصورتی کی شناخت کر سکے، اس سے محظوظ ہو سکے اور اسے پیدا کر سکے۔ اس کے لئے اس میں جمالیاتی شعور اور اپج بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ آدمی کے پاس کان، آنکھیں اور دوسری حسیں موجود ہیں۔ اس لئے وہ مظاہر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ آدمی کی آنکھ صرف کسی شئے کا رنگ یا نقشہ ہی نہیں دیکھتی بلکہ اس کی ہندسی (Geometrical) شکل، موزونیت،

رنگوں کا امتزاج اور درجہ، بناوٹ، ساخت، مواد سب کا حسن دیکھ سکتی ہے اور انسانی کان، آواز کے آہنگ اور اتار چڑھاؤ کا اندازہ کرسکتا ہے۔

حُسن اور افادیت ۔ مثالیت پسند حسن پرستوں کا نظریہ اس سے قدرے مختلف ہے۔ جرمن فلاسفر کانٹ (Kant) نے اپنی تصنیف 'Critique of Judgement' میں طے کیا ہے کہ جمالیاتی فیصلہ لاتعلق (Disinterested) ہوتا ہے اور آدمی کا جمالیاتی شعور عملی مفید مقاصد سے کوئی موافقت یا مطابقت نہیں رکھتا۔ کانٹ نے آدمی کے جمالیاتی شعور کو '' بے غرض مصلحت'' (Disinterested Expediency) کا نام دیتے ہوئے اس کا ادعا کیا ہے کہ جمالیاتی شعور سے افادیت کا مقصد جوڑتے ہی جمالیات منتشر ہونے لگتی ہے۔

واقعی آدمی کا جمالیاتی شعور افادی مقاصد کے حصول کو براہ راست پیش نظر نہیں رکھتا۔ اور جب ہیگل نے مادی حسن پرستوں پر تنقید کرتے ہوئے حسن اور افادیت کے روابط پر روشنی ڈالی تو اس نے اس دلیل کا سہارا لیا کہ ایک تصویری زندگی (Still-Life) کا تصور کیا جاتا ہے تو اس تصویر میں دکھائے جانے والے پھلوں کو نہ تو استعمال کیا جا سکتا ہے اور نہ کھایا جا سکتا ہے لیکن اس موضوع پر ہیگل کی سوچ غلط تھی کیونکہ خوبصورتی اور افادیت کا رشتہ اتنی رکی دنیاوی سطح پر دریافت نہیں کیا جاتا۔

مارکسی اور لیننی جمالیات پرست اس میں یقین رکھتے ہیں کہ حسن اور افادیت آپس میں مطابقت اور میل رکھتے ہیں۔ اکثر کسی مظہر کی خوبصورتی معدوم ہو جاتی ہے لیکن عملی معنویت کے روپ میں اس کے اجاگر ہونے کا امکان باقی رہتا ہے۔ عملی فنون، ڈیزائن سازی، وضع تعمیرات اور مختلف انسانی سرگرمیوں میں خاموش تقاضوں کو پورا کرنے والا حسن زندگی میں اپنی عملی افادیت رکھتا ہے۔ اس سے اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے احساس، ارادے اور فکر کو متحد کر لینے کے بعد حسن میں وہ انوکھی قوت پیدا ہو جاتی ہے جو سماجی جذبات کی تعمیر پر اثر انداز ہوتی ہے اور سماجی مقصد کے تحت جینے کا ارمان لوگوں کے دلوں میں جگاتی ہے۔

مارکسی جمال پرست نام نہاد '' خالص حسن'' کے خیال کو اور جمالیاتی شعور کو رد کر دیتے ہیں جو کسی سیاسی مقصد یا اخلاقی اصول کے بندھن سے آزاد ہو۔ حسن کو اخلاق سے یا حسن کو نیکی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

جدید جمالیات پرست جمالیات و اخلاقیات کو ایک دوسرے کا عکس سمجھتے ہیں۔ اس نکتۂ نگاہ سے انسان اور افعال دونوں خوبصورت قرار دیے جا سکتے ہیں اور دونوں کو جمالیاتی قدر کا حامل سمجھا جائے گا۔ آرٹ کا مقصد حسن کے بیج بونا ہے نہ کہ باطنی خوبی یا نیکی گھڑنا۔ یہ خیال فن میں ابدیت کے نظریہ کو کاٹ دیتا ہے۔ اخلاقیات کی تنسیخ جمالیات کو بے عمل اور باطل نیز فن کو زوال پذیر کر دیتی ہے جو ظاہر ہے سارے آرٹ کے لئے تباہ کن اور خطرناک ہے۔ اس قسم کا فن ایک غیر جمالیاتی تاثر کو جنم دیتا ہے۔

عزیز قیسی

کنفیشن سے (Confession)

بس اتنی رُوداد ہے میری — عشق میں خانہ خراب ہوا میں
ان کی آنکھوں کا تھا اشارا — وقفِ جام و شراب ہوا میں

ظلمتِ شام و الم کم کرنے — اپنے ہی گھر میں آگ لگا دی
میں نے کفرِ جنوں کے ہاتھوں — مملکتِ کونین گنوا دی

درد و وفا کو شہرت دے دی — محفل محفل غزل سُنا کر
زخموں کے گلدستے بیچے — گلی گلی آواز لگا کر

دیس دیس پھیلائی کہانی — اپنی وفا کی ان کی جفا کی
دھجی دھجی رسوا کر دی — اپنے گریباں، ان کی قبا کی

دل کے لہو سے کتنے آنسو — چمکا چمکا کر چھلکائے
ریزہ ریزہ کانچ کے سپنے — لیے بھرا پلکوں پہ اٹھائے

کبھی تو خود رویا محفل میں — کبھی انہیں خلوت میں رلایا
ان کی اک اک یاد کو سمجھا — روح و دل و جاں کا سرمایہ

ان سے غم جو ملا اس غم کو — اک سوغاتِ وفا ٹھیرایا
دنیا کی اک اک الجھن کو — ان کی زلفوں سے الجھایا

ان کے قامت کا افسانہ — دور تلک میں نے پہونچایا
ان کیلئے سو جان سے میں نے — موت کو اپنے گلے لگایا

ہر اک سر کو ان کا سودا — ہر اک شوق کو وحشت دے دی
ہر اک دل کو ان کی تمنا — ہر سینے کو حسرت دے دی

بس اتنی روداد ہے میری
عشق میں خانہ خراب ہوا میں

کسی شجر میں کسی حجر میں — فرش زمیں پہ عرش بریں پہ
کسی ستارے کسی قمر میں — عالم ارض و سماں میں کہیں پہ

کاش کوئی وہ ہستی ہوتی — جس کو یہ روداد سناتا
بوجھ گناہوں کا ہے دل پہ — آج کی شب ہلکا ہو جاتا

اس سے کاش یہ کہہ سکتا میں — عالم کل!! تجھ سے کیا پردہ
کذب مکمل ہے یہ کہانی — یہ سارا افسانہ جھوٹا

میں نے خود ہی تراشا یہ بت — اور اس بت کو خدائی دے دی
مجھ کو بھی اس پہ سچ کا گماں ہے — جھوٹ کو وہ رعنائی دے دی

آئینہ خانوں میں رنگوں کے — اپنی ہی صورت کو سراہا
اپنی ہی تخلیق کو پوجا — اپنی ہی تلبیس کو چاہا

دل کے محرم!! روح کے شاہد — جھوٹ اور سچ پہچاننے والے
میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں ہے — میری حقیقت جاننے والے

میرے خیر و شر کے محاسب!! — تجھ پہ تو سب کچھ روشن ہے
میری سزا و جزا کے مالک — میرا جرم یہ میرا فن ہے

اپنی تمنا کا ملزم ہوں
میں ان خوابوں کا مجرم ہوں

ـ کلیسا کی رسم۔ اقرار گناہ، جو وسیلۂ مغفرت بھی سمجھی جاتی ہے۔

میرے معاشقے

جوش کے شائع شدہ ۱۸ معاشقوں کے بارے میں ناقدین کی ملی جلی رائیں ہیں۔ بعض انہیں سراسر بکواس قرار دیتے ہیں۔ بعض صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ معاشقے جوش کی آپ بیتی کے حصے ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ بالکل حقیقت سے خالی ہوں۔

رومانی اردو ادب میں بہر حال ان خاص طرح کے ''پٹھانی تذکروں'' کا ذکر اب تک ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں جوش کے چند اہم ترین معاشقے شائع کر رہے ہیں۔

اختصار کی خاطر ان میں سے بعض حصے حذف کر دیئے گئے ہیں، اس سے واقعات کا تسلسل کہیں نہیں ٹوٹتا بلکہ بیان کی دلچسپی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ بہر حال پوری تفصیلات کے لئے جوش کی ''یادوں کی برات'' کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

ف۔س۔اعجاز

پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں زہدِ ازلی، بسم اللہ کے گنبد میں پالا گیا تھا، اور میرے باپ نے مجھ کو، اس بے پایاں احتیاط کے ساتھ پروان چڑھایا تھا کہ آج کل اس احتیاط کے ساتھ لڑکیوں کی بھی پرورش نہیں کی جاتی ہے۔

اور اسی بنا پر مجھ میں کنواری لڑکیوں کی سی جھجک پیدا ہوگئی تھی۔ اور کسی مردانہ جرأت کا تو ذکر ہی کیا، مجھ میں اس قدر شرمیلا پن پیدا ہوگیا تھا کہ جب اپنے باپ کی بھری محفل یا کسی مشاعرے میں جاتا تو، دل دھڑکنے اور پنڈلیاں کانپنے لگتی تھیں۔

اور:۔

گوری۔ دھیرے چلو، گگریا چھلک نہ جائے

کا عالم طاری ہو جایا کرتا تھا۔

میرے انتہائی شرمیلے پن کے سیکڑوں واقعات میں سے فقط ایک واقعہ سن لیجئے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ میں نام خدا، کس حد تک شرمیلا تھا۔

لکھنؤ کا ذکر ہے، میرے باپ کہیں باہر تشریف لے جاچکے تھے کہ ایک روز، شام کے وقت میرے باپ کی ڈیوڑھی کے ایک رنگین مزاج تماش بین قسم کے، سپاہی، سبحان علی خاں، عرف جمن نے مجھ سے کہا منجھلے بھیا، چلئے آج آپ کو گھما لائیں۔

میں ان کے ساتھ ہولیا اور وہ مجھ کو لئے ہوئے، ایک طوائف کے کوٹھے

پر چڑھ گئے —— طوائف پر نظر پڑتے ہی مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا وہ بلا کی حسین تھی' میں قیامت کا شرمیلا، اس کی جوانی بھرپور، میں شرم سے پکنا چور —— میرے اندر چھپے ہوئے شاعر نے کہا، اس کے مکھڑے سے نظریں نہ ہٹاؤ، اور میری تربیت نے حکم دیا کہ آنکھیں نہ ملاؤ —— تربیت کا حکم غالب آیا، اور میں ہڑبڑا کر فرش پر بیٹھ گیا، میری لانبی لانبی پلکیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں اور فراوانی شرم سے اس کے کمرے کے قالین کے ریشے نوچنے لگا۔

طوائفوں کے مجرے تو بارہا دیکھ چکا تھا، لیکن طوائف کا حجرہ ابھی تک نہیں دیکھا تھا، اس لئے بدن میں کپکپی پیدا ہوگئی۔

طوائف تو چنچل چلبلے، چناخ تناش جیوں کی خوگر تھی۔ مجھ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے لگی جس طرح کوئی سلوتر گھوڑے کو آنکتا ہے۔

تھوڑی دیر تک تو وہ مجھے گھورتی رہی، لیکن جب میں ٹس سے مس نہیں ہوا تو اس سے رہا نہیں گیا اور اپنا ماتھا اوپر چڑھا کر اس نے کہا" اے ہے صاحب زادے میرا تو نگوڑا جی اوبھا جا رہا ہے، اے اللہ کچھ تو منہ سے بولئے، سر سے کھیلئے"۔

اس کے اس کہنے سے میں اور بھی شرما گیا۔ اور میری قالین کے ریشے نوچنے کی رفتار تیز سے تیز ہوگئی۔

محسن نے کہا" کھلے بھیا" میں نے ہاتھ کے تحکمانہ اشارے سے انہیں روک دیا۔ اب وہ طوائف میرے قریب آگئی، میری ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر کہا" ہے ہے کیا چپ شاہ کا روزہ رکھ کر آئے ہیں آپ، ارے اللہ کچھ تو بولئے، میری چھاتی پھٹی جا رہی ہے —— "اس کی اس التجا سے مجبور ہو کر آپ جانتے ہیں، میں نے کیا جواب دیا؟ نہیں آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے، سنئے مجھ سے۔

میں نے کن انکھیوں سے اس کو دیکھا، اور شیشے کی طرح درکتی آواز میں —— رک رک کر اس سے کہا کہ ایک مہینے کے بعد میرا امتحان شروع ہونے والا ہے، اللہ سے دعا کیجئے کہ میں پاس ہو جاؤں۔

میری یہ التماس سن کر طوائف ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوگئی اور محسن بھی پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے —— میں زمین میں گڑ کر رہ گیا۔

طوائف نے ہنسی کے دورے سے نجات پائی تو میری طرف بڑی شوخی سے نگاہ اٹھائی اور کہا، صاحب زادے یہ طوائف کا کوٹھا ہے، خواجہ غریب نواز کی درگاہ نہیں —— اور میرے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

جس طرح ایک چاول کو دیکھ کر، پوری دیگ کا پتہ چلا لیا جاتا ہے، اسی طرح —— مندرجۂ بالا ایک واقعہ سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ میری اٹھان کیسی تھی۔

جی ہاں، میرے باپ نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، مجھ کو" وہ" بنا دینے میں جس کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اصطلاح میں" جوان صالح" اور اہل نظر کی زبان میں" مخنث" کہا جاتا ہے۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ، جس کو اللہ رکھے، اسے کون چکھے، میرے باپ کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی اور قدرت کی حکمت و غیرت نے یہ بات کسی طرح

بھی گوارا نہیں فرمائی کہ میں شاعر کے بجائے مولانا بخش اللہ بن کر رہ جاؤں — مطرب کو چھوڑ کر، مؤذن سے دل لگاؤں، مکھڑوں کے تلوں سے نظر پھیر کر تسبیحوں کے دانے گھماؤں، صہبا کے شیشوں سے قرابت کا رشتہ کاٹ کر، استنجوں کے ڈھیلوں سے اپنا شجرۂ نسب ملاؤں، شراب کے پیالوں میں تیرنے کے بدلے، وضو کے بدھنوں میں غوطے کھاؤں، اور کالی زلفوں کی گھنیری چھاؤں سے بھاگ کر، سفید داڑھیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ کس قدر صادق آتا ہے یہ شعر مجھ پر۔

کوئی کمی نہ کی تھی، دلِ بے قرار نے
مجھ کو بچا لیا، مرے پروردگار نے

اب سنئے میری گھٹن کیوں کر دور ہوئی، اور قوت وحیات کی بے پایاں شفقت نے، ''اندک اندک عشق، درکار آورد بیگانہ را'' کے طور پر مجھے کس حکیمانہ توقف وتدریج کے ساتھ فردوسِ ادب کی جان موڑا۔........

میری عملی تربیت کا آغاز

سب سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ، ہمارے گھر کی کسی تقریب میں ایک پٹاخا سی کم سن اور بلور اندام طوائف، مجرے کے لئے آئی۔ اس کے گالوں کی جلد بنارسی ساری کے مانند باریک تھی۔ ناک کی نتھ بتا رہی تھی کہ ابھی تک اس کا پنڈا کورا ہے اور اس کے شلوکے میں ہلکا سا جھول پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ معاذ اللہ!

جب اس کی نقلی انگلیوں میں کھلاوٹ کا باب، میرے تارِ وجود پر مچلنے لگی مضراب — اور جب ناچتے ناچتے وہ میرے بالکل قریب آئی اور انعام کے لئے بیٹھ گئی تو اس کی شرتی پیش واز کا ملائم سرا میرے ہاتھ کی پشت سے مَس ہو کر اس طرح سرسرایا کہ میری پور پور میں شیرنی کی لہر دوڑ گئی — اٹھنے لگی ایک بھاپ سی میری مسامات سے، ہوا کنے اور پوی پھٹنے لگی میرے جسم کے اندر۔

اک دامنِ حریر کے لمسِ خفیف سے
لَو دے اٹھا ہے خونِ رگِ جاں کبھی کبھی

یہ تھا میرا پہلا آپریشن — جو برگِ یاسمین کی دھار سے کیا گیا تھا۔ اب سنئے دوسرا واقعہ — لڑکپن سے لے کر جوانی تک مجھ پر دردِ سر کا دورہ پڑا کرتا تھا، ایک دن، جب دردِ سر کا دورہ پڑا تو رجیا میرا سر دبانے لگی۔ وہ ککڑی بیل کی سرو قامت، شہابی رنگ والی چودہ برس کی رجیا، ہمارے گھر کے چوکیدار بدلو گنڈی کی بیٹی تھی۔

سر دبانے میں وہ بار بار جو میرے منہ کی طرف جھکی تو اس کی سانسوں کی کچی خوشبو میرے دل میں بسنے لگی، اور اس کی ملائم ہتھیلیوں کی میٹھی گرمی، ایک ایسے جزیرے میں لے گئی مجھ کو، جہاں کچے اناروں پر بھونرے منڈلا رہے تھے۔ اور سیکڑوں قوس قزح کی سی بانہیں میری گردن میں پڑتی چلی جا رہی تھیں۔ اور اس کا یہ اثر ہوا کہ میرا درد، میرے سر سے منتقل ہو کر دوڑنے لگا میری پور پور میں — میں نے رجیا کی طرف نظر اٹھائی، اس نے میری آنکھوں

میں آنکھیں ڈال دیں، اور ابھی اس کی ڈوروں کی زبان کھلی ہی تھی کہ میری ماں کی مثلائی عتابی سی خانم آگئیں اور وہ طلسم پل بھر میں، ٹوٹ کر رہ گیا۔ جناب والا، یہ طلوعِ صبح کی جگمگاہٹوں سے لیکر، رجیا کی ہتھیلیوں کی گرماہٹوں تک کے تمام واقعے تو ایسے تھے جیسے ڈھیلے ہاتھوں کی مار — اب سنئے گھن کا ماجرا۔

ایک دن، جب گلابی جاڑے کی نویلی صبح اپنے بستر پر بیٹھی آنکھیں مل رہی تھی میرا تمام گھر، حسبِ دستور محوِ خواب، اور میں حسبِ عادت بیدار ہو کر اپنی انگنائی کی ہری بھری نیم کے نیچے کھڑا جھوم رہا تھا کہ نیم کے قریب کی کوٹھری میں رہنے والی جونئی لونڈی ظہورن، میرے سامنے آکر، کھڑی ہو گئی اور مجھے گھورنے لگی۔ اور جب میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک ناقابلِ فہم، رنگین سی غلگجاہٹ ہے — اس کے ہونٹوں کے ابھار میں ایک نامعلوم سا تقاضہ ہے اور اس کا ٹھوڑی تک ابھرا سینہ، گہری سانسوں کے گرداب میں اوپر نیچے ہو رہا ہے — تو میں نے پوچھا "ظہورن کیا بات ہے" اس نے کہا "اے جرنیلی ٹوپی کے منجھلے بھیا، میری کوٹھری میں ذری چلے چلو تو بات بتاؤں — میری کوٹھری بڑی گرم گرم[1] ہے ......

...... اس گھن[2] یا یوں کہیئے کہ، اس آپریشن کے بعد میری بے حیائی کا مادۂ فاسد کلیتہً نہ سہی، لیکن بڑی حد تک میرے جسم سے نکل گیا۔ اور پھر موڑ دی قدرت نے میری باگ، جادۂ عشق بازی کی جانب۔

دوش وقتِ سحر، از غصہ نجاتم دادند

[1] گرم کی (ر) کو بافتح کہا تھا۔ [2] گھو گرتگی۔

بندہ پرور، ایک بار نہیں، میں اٹھارہ بار عشق کر چکا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ قیامت آئے گی تو کوئی زندہ نہیں رہے گا، لیکن مجھے دیکھئے کہ اٹھارہ قیامتیں میرے سر سے گذر چکی ہیں، اور میں ابھی تک زندہ ہوں اور شاخِ حیات پر اونگھا نہیں بیٹھا، بلکہ جی بھر کے آج بھی چہچہا رہا ہوں۔

آفریں باد، برایں ہمتِ مردانہ ما!!

اپنے معاشقوں کے ذکر سے پہلے، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند اہم باتوں پر روشنی ڈال دوں کہ غلط فہمیوں کا امکان باقی نہ رہے۔

سب سے پہلے اس امر کو ذہن نشین کر لیجئے کہ جہاں تک کہ محبوبوں کے دل موہ لینے کا تعلق ہے، میرا ایک معاشقہ بھی ناکام نہیں رہا — اور یہ بات صرف یہیں تک نہیں رہی بلکہ یہاں تک بھی ہوا کہ حسین عورتوں نے خود مجھ سے عشق کیا، اور بعض نے تو یہاں تک مجھ کو چاہا کہ مجھ میں نازِ معشوقانہ پیدا کر دیا۔ آپ میرے ان مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھیں (جو میرے مجموعوں میں طبع ہو چکے ہیں) تو میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔

۱۹۲۰ء

میری پرسش اور تیری بزمِ ناز — آفریں اے شاہدِ عاشق نواز
اک مرے دل کی تسلی کے لئے — زلزلے میں آئے اور تمکینِ ناز
تیری طبعِ ناز، اور آشفتگی — تیرا پہلو، اور دردِ جاں گداز
یہ ترا رخ، اور گردِ خستگی — یہ ترے لب اور حروفِ سوز و ساز
آہِ سوزاں اور تیرے لعلِ لب — اشکِ خونیں اور تیری چشمِ ناز
جس کے قدموں پہ ہو خود فطرت کا سر — وہ بڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز

۱۹۳۰ء

ہنوز یاد ہے وہ رنگ اضطراب ترا
بھرا تھا درد کے نغموں سے جب رباب ترا

وہ ابتدائے محبت کی تند راتوں میں
بساطِ غم پہ مچلتا ہوا شباب ترا

وہ آنسوؤں کے دھندلکے میں چشمِ نم تیری
وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرشِ خواب ترا

وہ بات بات میں چھالا سا اک چمک اٹھنا
نظر جھکا کے وہ لہجہ دمِ خطاب ترا

وہ تیری زلف کے غم سے مری پریشانی
وہ اپنی سانس کی خوشبو سے اضطراب ترا

مژہ کی طرح جھپکتا ہوا وہ میرا سوال
وہ دل کی طرح دھڑکتا ہوا جواب ترا

۱۹۳۰ء

دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھ کو
یاد ہے وہ خلشِ عہدِ تمنا تجھ کو

ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے
ہر نفس، میری جدائی کا تھا دھڑکا تجھ کو

راستے سے کوئی آواز جب آجاتی تھی
میری آواز کا ہو جاتا تھا دھوکا تجھ کو

قہر ڈھاتا تھا، مرا درپئے تحمل تجھ پہ
زہر لگتا تھا مرا وعدۂ فردا تجھ کو

۲۔ دوسری بات یہ کہنا ہے کہ میرے ناقدین میری عاشقانہ شاعری کے باب میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں میر تقی میرؔ اور فانی بدایونی کا سا غم نہیں پایا جاتا۔ اگر ناقدین غور سے میری عاشقانہ شاعری پر نگاہ ڈالیں تو انہیں پتا چل جائیگا کہ عنصرِ غم کی اس میں کمی نہیں، لیکن میرے اور حضرت میرؔ وغیرہ کے غم میں فرق یہ ہے کہ ان کا غم شکستگیٔ دل پر اور میرا غم معشوقوں کی مفارقت پر مبنی تھا۔ میرے کلام میں ہجر کی ہچکیاں تو ضرور گونجی ہوئی ہیں، مگر شکستِ دل کی جھنکار موجود نہیں ہے۔ آپ خود ہی انصاف کریں، جس کا دل کبھی توڑا ہی نہیں گیا ہو، وہ شکستِ دل کا رونا کیوں کر رو سکتا ہے۔

جنابِ عالی، روتے دھوتے تو وہ ہیں جنہیں معشوق منہ نہیں لگاتے، اور باتوں سے ان کو ذلیل کراتے، ان کی آنکھوں کے سامنے غیروں کو چھاتی سے لگاتے اور بڑی بے حیائی کے ساتھ عاشق کی زبان سے کہلاتے ہیں۔

لے، شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

اگر نصیبِ دشمناں میں جوانی میں ایسے شرمناک حادثے کا شکار ہو جاتا تو خدا کی قسم بے حیا معشوق اور سالے رقیب، دونوں کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا۔

دوسری بات یہ کہنا کہ میں اس نکتے سے بخوبی واقف ہوں کہ عاشق پر سان چڑھتی ہے ایک تو معشوق کی بے اعتنائی و کج ادائی، دوسرے اسکی جدائی سے۔ آیئے پہلے اس کی بے اعتنائی و کج ادائی پر نگاہ ڈالیں، اور دیکھیں کہ عاشق پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔

(الف) اس سے عاشق احساس کمتری کا صید زبوں ہو کر رہ جاتا ہے اور اس قدر شدت کے ساتھ کہ جب وہ آئینہ دیکھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا کوئی خارشتانی کتا اس کے روبرو کھڑا دم ہلا رہا ہے۔

(ب) احساس کمتری کے گھن سے شیشۂ انا کے چکنا چور ہو جانے کے بعد اس کا دل اس قدر بجھ جاتا ہے کہ وہ قرابت داروں اور یاروں کو منہ دکھانے سے جھجکنے اور شرمانے لگتا، اور گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔

(ج) جب اس کی غم اور ذلت میں ڈوبی ہوئی گوشہ نشینی پر ایک مدت گذر جاتی ہے تو اس کے دل میں اقرباء و احباب کی جانب سے یہ گمان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بھی میرے معشوق کے مانند سراسر نا مہربان اور سرتاپا ناقابل اعتماد ہیں اور بعض اوقات تو فانی بدایونی کی طرح وہ تمام عالم کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ معاشرے کے واسطے ایک زہریلا انسان بن جاتا ہے۔

(د) اس تمام صورت حال کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر اس کے عشق میں جان کم ہوتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کے عشق پر اوس پڑ جاتی ہے، اور گاہ گاہ کی ایک آہ سرد کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہتا لیکن اگر عشق قوی اور حوصلہ ضعیف ہوتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ گھل کر مر جاتا ہے اور حوصلہ بھی عشق کے مانند قوی ہو تو خودکشی کر لیتا ہے یا خود معشوق کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا ہے۔

۳۔ آیئے اب دوسری شق یعنی ساز گار و غم گسار معشوق کی جدائی کے اثرات پر نگاہ ڈالیں۔

جدائی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک طویل، ایک مختصر۔

طویل جدائی میں شعلہ بار و پائے دار جذبات رکھنے والا عاشق یا تو کڑھ کر مر جاتا ہے، یا عاشق میں اگر زیادہ حدت نہ ہو تو کچھ روز تڑپتے رہنے کے بعد اس جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے اور بالآخر صبر آ جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ ''طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں'' اور پھر ''اب وہ اگلی سی درازیِ شب ہجراں میں نہیں'' کا عالم طاری ہو جاتا ہے لیکن گاہ گاہ کی جدائی اس سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ وہ عشق کو فاقوں سے مارتی نہیں، اسے غذا دیتی ہے، وقت کو ٹھہرا، اور زندگی کو ٹھٹھرا دینے والی ایک رنگی سے بچاتی ہے اور تواتر عیش و تسلسل قرب محبوب کے یخ کدے سے بار بار باہر نکل کر، شعلۂ عشق کو ہوا دیتی رہتی ہے۔

قدرت کو چوں کہ مجھے زندہ، اور بشاش رکھنا، اور مجھ سے کام لینا تھا اس لئے اس نے بڑی توسط آمیز دیدہ وری کے ساتھ مجھ کو معشوق کی جان لیوا بے اعتنائی اور ولولہ سوز طویل جدائی کے جھٹکوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا، اور اسی کے ساتھ ساتھ میری ذہنی پرورش و تربیت کی خاطر یہ انتظام بھی کر دیا کہ مجھ کو بار بار مفارقت سے ڈسوایا، لیکن کسی مفارقت کو اس قدر طویل نہیں ہونے دیا

کہ سارا کھیل ہی بگڑ کر رہ جائے۔

اور اس مشفقانہ و مدبرانہ صورتِ حال نے ایک حکیمانہ توازن قائم کر کے مجھ کو زحمتِ شیون، کرب و کیف، اور نیش و نوش کے بین بین رکھا۔ اس طرح عشرت دریدگی و حزن گزیدگی، دونوں سے بچا لیا۔

طغیان ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیل
آرد بزیرِ تیغ و شہیدش نہ می کند!

اب رہی یہ بات کہ میں نے قیس و فرہاد کے مانند، ایک لیلیٰ اور شیریں سے عشق کرنے کے بدلے، اٹھارہ معشوقوں سے عشق کیوں کیا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عمر بھر کے واسطے کسی ایک کو اپنا کر رکھنا اور کسی ایک کا ہو کر رہ جانا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے میرے نزدیک، یہ صورت حال معشوقیت کی زوجیت کے سیلے تہ خانہ میں قید کر دینے کی بدمذاقی، بہتے پانی کو بند کر دینے کی عفونت انگیزی، جذبات نو بنو کا اجناس قانونِ تغیرات کی خلاف ورزی۔ ذوقِ تنوع کی بے حوصلگی۔ تصور کی تہی دستی اور تخیل کا افلاس ہے۔

اس لئے میری طبع رواں نے یہ جوا اختیار نہیں کیا اور "بہتا دریا، جوگی چلتا اچھا" کے جادے پر ہمیشہ گامزن رہا۔ پروانہ کبھی نہیں بنا، کہ

پھر نہ کچھ دیکھا بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

کی سی کھوکھلی داستانِ عبرت بن کر رہ جاتا۔ اس کے برعکس میں نے بھونرے کی زندگی کو اپنایا، ہر گلِ نو دمیدہ پر منڈلایا، اس کا گن گایا، اس کی خوشبو پی اس کا رنگ چکھا، اس پر کالی گھٹاؤں کے سائے میں گایا، گونجا، اور پھر یہ کہتا ہوا اڑ گیا:

در ہیچ مقام نہ گزارد بد رنگے
از بوئے بجوئے برود، از رنگ برنگے

مجھ پر جمال نے بار بار جال پھینکے، میں بار بار گرفتار ہوا، اور ہر بار یہ کہتا ہوا جال سے نکل گیا کہ

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے، کرے شکار مجھے

اگر قیس و فرہاد کا کوئی جانشین یہ ارشاد فرمائے کہ جوش صاحب معاف کیجئے، اس صورت حال کو عشق نہیں، عیاشی کہتے ہیں، تو میں یہ جواب دوں گا کہ بھئی تجھ کو میرے اس اہتمام کی مطلق خبر نہیں کہ میں نے عشق و عیاشی کو ہمیشہ ایک بہت بڑے احترام آمیز فاصلے پر رکھا ہے اور ان قلبی و جسمانی دھاروں کے مابین میں نے ایک ایسا پردہ ہمیشہ حائل رکھا کہ وہ کبھی اور کسی عالم میں بھی، ایک دوسرے سے ہم آغوش نہیں ہونے پائے۔

جی ہاں میں نے جی بھر کے عیاشی کی ہے، لیکن اس طرح کہ رات ہوتے ہی اس کی شمع جلائی، اور صبح ہوتے ہی بجھا دی۔

میں نے کبھی اپنے دل کو عیاشی کا وطن بننے نہیں دیا، بلکہ اسے ایک رات کا مسافر خانہ بنائے رکھا، اور ایسا مسافر خانہ، جس پر صبح کی پہلی کرن کبھی نہیں پھوٹی۔

میں نے کسی آوارہ یا بازاری عورت سے کبھی ایک بار بھی عشق نہیں کیا اور
زندگی میں ایک بار بھی ان کے انتظار میں چشم براہ و گوش بر آواز بن کر نہیں بیٹھا۔
البتہ عشق کو میں نے کلیجے سے لگایا، سر آنکھوں پر بٹھایا۔ راتیں
پچھاڑوں پر پچھاڑیں کھائیں، ہچکیوں سے دل کو ڈسایا، تڑپایا، تلملایا، تکیے
بھگوئے، پلکوں میں آنسو پروئے، تارے گنے اور تلواروں کی دھاروں پر
کروٹیں بدلیں۔ جان لیوا خطروں کو ٹھوکر لگائی، موت کے سامنے آنکھیں نہیں
جھپکائیں۔ اور ایک دن تو یہاں تک ہوا کہ عین مان سون کے ہیجانی موسم میں
اس امر کے باوجود کہ میں تیرنا نہیں جانتا الا اللہ کہہ کر، ہو لکتے سمندر میں جھم
سے کود پڑا۔

بندہ نواز، اپنے کو اگر ایسے ہولناک جھلکے میں ڈال دینا عیاشی ہے، تو
خدا کے واسطے بتایئے کہ پھر عشق نام ہے کس چڑیا کا؟ جی ہاں میں نے عیاشی کی
ہے، جی بھر کر، لیکن عشق بازی کی ہے، جی سے گزر کر، عیاشی نے، میرے جسم کی
کھیتیاں لہلہائیں، عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں عیاشی نے لذات
حواس سے دوچار کیا، عاشقی نے نشاط شعور سے سرشار کیا، عیاشی نے گردن کو
نقرئی بانہوں سے اجالا، عاشقی نے گردن میں قوس قزح کا زریں ہار ڈالا۔
عیاشی نے، موج ہائے رنگا رنگ میں ترایا، عاشقی نے گرداب خون جگر
میں گھمایا، عیاشی نے فقط مکھڑوں کی چاندنی دکھائی، عاشقی نے میرے
سامنے، نفس و آفاق کی نقاب اٹھائی۔
عیاشی نے میرے حیوان کو تھپتھپایا، عاشقی نے میرے انسان کو جگایا اور
قلب گداختہ کی دولت بیدار مرحمت فرما کر، مجھ کو شاعری اور حب نوع انسانی
کا راستہ دکھایا۔
میرا جسم بھی متمول ہے، میری روح بھی مالا مال ہے۔ اب کی کس چیز کی
ہے۔

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے
اب اور چاہیے کیا ہو پیمبری مل جائے؟

اس قدر طویل، لیکن ضروری دیباچہ پڑھ چکنے کے بعد، آیئے میرے
صحیفہ عاشقی کی سعادت قرأت حاصل فرمایئے۔
لیکن یہ بھی سن لیجیے کہ اب میرا حافظہ اس قدر گھٹا ٹوپ ہو چکا ہے کہ
اپنے اٹھارہ معاشقوں کو بیان نہیں کر سکتا، بہت سے واقعات قطعی بھول چکا ہوں
اور جو یاد بھی ہیں وہ بھی آدھے کملا چکے ہیں اس لئے نیم حافظہ نیم معاشقوں
ہی پر روشنی ڈال سکوں گا......
......ہائے میں اپنی داستان محبت کیوں کر لکھوں، حافظے کے ایوان میں
بڑی تاریکی ہے۔ خدارا، واپس آجاؤ، اے میری جوانی کے گونجنے، گرجنے،
کھنکنے، گنگناتے، چہچہاتے، اور بھاؤ بتاتے، رنگین و شاداب لمحو۔ چمک پڑو،
میرے برگ حیات سے اے شبنم کے قطرو برس پڑو، میرے دیدۂ خشک سے
اے آنسوؤں کی بوندو۔ ابل پڑو، اے میری ترنگوں کے خشک چشموں۔ گرج
اٹھو میرے سفید سر پر، اے میری برکھا کی کالی گھٹاؤ۔ لو دینے لگو، اے میرے
شبستانوں کی بجھی شمعو۔ پھوٹ جاؤ اے میرے گلابی جاڑوں کی کرنوں۔ جھڑی

لگا دو اے میری کھوئی ہوئی، بھری برسا تو۔ دمک اٹھو، اے میری خوابیدہ چاندنی راتوں۔ کوک اٹھو۔ اے میری آمریوں کی خاموش کوئیلو۔ نصب ہو جاؤ دوبارہ، اے میرے رامش و رنگ کے، خاک آسودہ خیمو۔ جھنک اٹھو اے میرے سازِ شکستہ کے تارو۔ اور جگمگا اٹھو اے مجھ پر صحیفۂ انسانیت نازل کرنے والے، نکیلے اور صبیح کھڑو۔

ہائے ماہ و سال کی دبیز تاریکیوں کے الجھے ہوئے لچھے۔ ان لچھوں کے پیچ و خم میں اس طرح، جھلمل ہو رہے ہیں کچھ واقعات اور چند چہرے جیسے دور کے جنگل کے جگنو، جیسے کہرے میں بھاگتے آہو، جس طرح دل سے آنکھوں کی طرف جاتے ہوئے آنسو اور جیسے خواب کے بن میں کوئل کی کوکو۔

سامنے ایک رنگ و بو کا میلہ سا لگا ہوا ہے گویا تاریک جنگل میں دیئے ٹمٹما رہے ہیں، کوئی لحہ، اور کوئی مکھڑا نقاب الٹ کر سامنے نہیں آ رہا ہے۔

اچھا۔ اب میں اس میلے، اور دور کی اس لپلپاہٹوں کی ریلے کی جانب خود بڑھوں۔ شاید کچھ نظر آ سکے۔ لیجئے میں پچاس قدم آگے بڑھ گیا۔ ہاں اب تو کچھ واقعات اجاگر ہو رہے ہیں کچھ مکھڑوں[1] سے نقابیں ہٹ رہی ہیں۔

---

[1] ان مکھڑوں کے نام:- س۔ ج + ع۔ ج + الف الف خ + م۔ ج + ت، د + ش۔ د + الف۔ ن + ک۔ د + ع۔ ج + الف۔ خ + ر۔ ب + مس میری + مس گلشن + م۔ ب + ر۔ ک + ط۔ ج + ج۔ ب + اور ع۔ خ۔

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

ترجمہ: ف۔س۔اعجاز

۱۔ اگر نغمگیت محبت کی غذا ہو تو اسے بجاؤ۔

Twelfth Night - Act 1, Scene 1

۲۔ محبت میں ایک منگتا پن ہے جس کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔

Antony & Cleopatra - Act 1, Scene 1

۳۔ محبت کی بات کرنی ہو تو آہستہ بولو۔

Much Ado About Nothing - Act 2, Scene 1

۴۔ پیار کا رستہ کبھی ہموار نہیں چلا۔

A Midsummer Night's Dream - Act 1, Scene 2

۵۔ محبت واقعات سے چلتی ہے۔ کیوپڈ تیروں سے گھائل کرتا ہے تو کچھ لوگ پھندوں سے مار دیتے ہیں۔

Much Ado About Nothing - Act 3, Scene 2

۶۔ موت کی چوٹ کسی عاشق کی چٹکی جیسی ہوتی ہے جو زخمی کر دیتی ہے۔ پھر بھی اس کی آرزو کی جاتی ہے

Antony & Cleopatra - Act 5, Scene 5

۷۔ وہ خوبصورت ہے چنانچہ اس کی خوشامد کرنا چاہئے۔ وہ عورت ہے چنانچہ اسے جیت لینا چاہئے۔

Henry VI Part I - Act 5, Scene 2

مس میری رومالڈ

یہ اس دور کا ذکر ہے، جب میں لکھنؤ چرچ مشن ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم اور لاٹوش روڈ کی گلی کے ایک دو منزلہ مکان میں، رئیس احمد اور ابرار کے ساتھ رہتا تھا۔

وہ ایک وسیع اور دو منزلہ مکان تھا، اس مکان کے ایک حصے میں مس میری رومالڈ اپنی سوتیلی جوان بیوہ ماں مسز روبی رومالڈ کے ساتھ رہتی تھی۔ زینہ ہم دونوں کا مشترک تھا۔ اور آتے جاتے ہم دونوں کی مڈبھیڑ ہو جایا کرتی تھی اور ہم ایک دوسرے کو مقناطیسی نظروں سے دیکھا کرتے، لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔

ہماری خواب گاہوں کے درمیان پتلا سا زینہ تھا، اور جب ہم اپنے بستروں پر لیٹتے تھے تو فریقین، دیر تک، ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنا کرتے تھے۔

ایک روز، سرِ شام، ہم دونوں زینے پر چڑھ رہے تھے، وہ آگے تھی۔ میں پیچھے اس کے لونڈر کی خوشبو میرے وجود کا احاطہ کیئے ہوئے تھی کہ یکایک اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور ''او گاڈ'' (ہائے اللہ) کہہ کر زینے پر بیٹھ گئی، اور بڑے کرب کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ میں نے انگریزی میں پوچھا۔ آپ کو کیا تکلیف ہے، اس نے کہا میرے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا ہے، آپ مجھے سہارا دیکر میری خواب گاہ تک پہونچا دیں، او مائی گاڈ، او مائی گاڈ۔

میں نے لپک کر اس کی چھلا سی کمر میں ہاتھ ڈال دیا، اور سہارا دیکر اسے اس کی خواب گاہ میں پہونچا دیا۔ وہ بستر پر لیٹ کر تڑپنے لگی۔ میں نے کہا میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں، اس نے کہا نہیں، پہلے آپ میرا پیٹ سہلا دیں، اگر اس سے افاقہ نہ ہو تو پھر ڈاکٹر بلا لائیں۔

میں بڑے انہماک کے ساتھ اس کا پیٹ سہلانے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں، اور ایسا معلوم ہوا کہ اس کے درد میں تخفیف ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے بڑے تشکر سے دیکھا اور کہا اگر تکلیف نہ ہو تو یہ سامنے کی سوڈے کی بوتل کھول کر مجھے پلا دیجئے۔

میں نے بوتل کھول کر، گلاس میں سوڈا بھرا اور پیش کر دیا، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، اور کہا آپ پہلے اسے ذرا سا چکھ لیں، میں نے ایک گھونٹ پی کر گلاس اس کو دے دیا، وہ میری طرف نگاہیں اٹھا کر اس طرح پینے لگی، گویا سوڈے کے ساتھ، وہ مجھے بھی پی رہی ہے۔

مجھے اور سوڈے کو پی کر، اس نے پھر میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے

کہا، میری ماں باہر گئی ہوئی ہیں۔ اکیلے جی گھبرائے گا۔ تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیے۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اس نے کہا نہیں، میرے بستر پر بیٹھ جائیے۔

میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا اس نے حضرت مسیح کی بڑی تصویر پر جو اس کے سرہانے آویزاں تھی، چادر ڈال دی۔

اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے اور ابرار اس کی سوتیلی ماں پر ریجھ گئے اور دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔

ایک روز ہم لوگ حضرت گنج کے ایک شاندار ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ دو گورے جو نشے میں دھت تھے وہاں آ گئے۔ میری اور اس کی ماں کو برا بھلا کہنے لگے کہ تم یورپین ہو کر نیٹو آدمیوں کے حلقے میں بیٹھی ہوئی ہو۔ میں نے ان کو ڈانٹا کہ بدتمیزی نہ کرو۔ ہمارا ہی نمک کھاتے اور ہمیں پر غراتے ہو۔ ایک گورے نے، میری بات ان سنی کر کے، مس میری کی جانب ہاتھ بڑھایا، میں نے اس کے سر پر ڈنڈا مار دیا، دوسرا گورا بڑھا تو ابرار نے اس کے سر پر اچار کی بھری بوتل مار دی۔ اچار آنکھوں میں پہنچا تو وہ بلبلا گئے اور دونوں گورے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ایک روز اس کی کتیا، دو منزلے سے انگنائی میں گر کر دم توڑنے لگی، میری نے چیخ کر مجھ سے کہا ارے وہ سامنے برانڈی کی بوتل نہیں چھو سکتا، اس نے مجھے قہر سے دیکھا، دوڑ کر بوتل اٹھائی اور نیچے اتر کر دم توڑتی کتیا کے جبڑے چیر کر، کوئی آدھی بوتل اس کے منہ میں انڈیل دی اور یہ دیکھ کر، مجھے حیرت ہوگئی کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد کتیا کی حالت بہتر ہوگئی اور کلیلیں کرنے لگی۔

اس نے مجھ سے کہا تم نے برانڈی کا معجزہ دیکھا، جو چیز مُردوں کو جلا سکتی ہے تم اس کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے۔ شرم، شرم، شرم۔

ایک شام کو اس نے مجھ سے کہا جب تم سہ پہر کو ٹہلنے چلے جاتے تو روز ایک حبشی نوجوان آتا، اور میرے کمرے کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر، کچھ گاتا اور پھر چلا جاتا، کل تم ٹہلنے نہ جانا اور یہیں بیٹھنا اور اس کالے حبشی کا دماغ صحیح کر دینا۔

دوسرے دن میں ٹہلنے نہیں گیا اور ٹھیک پانچ بجے، سڑک سے آواز آنے لگی۔

مارے ہیں جواں لاکھوں اے رشک چمن تو نے۔ اے رشک چمن تو نے، اے رشک چمن تو نے۔ بن بن کے دلہن تو نے۔

میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہی حبشی نوجوان تھا۔ ڈنڈا لے کر میں نے اس کی ایسی ٹھکائی کر دی کہ پھر اس نے کبھی اس گلی کا رخ بھی نہیں کیا۔

مس میری نے، مسکرا کر کہا تم تو بہت بڑے ''نائٹ'' ہو جو گوروں کو بھی پیٹتا ہے اور کالوں کو بھی۔

اڑتے اڑتے میرے معاشقے کی خبر میرے باپ تک پہنچی، وہ نہایت دانش مند انسان تھے، ابرار کو بلا کر انہوں نے ارشاد فرمایا کہ وہ فرنگی لڑکی اگر مسلمان ہو جائے اور پردہ نشینی اختیار کر لے تو میں بڑی خوشی سے تیار ہوں کہ شبیر سے اس کا عقد کر دوں۔

جب میں نے میری کے سامنے اپنے باپ کی یہ دونوں شرطیں پیش کیں تو اس نے کہا۔ ڈارلنگ میں تمہاری خاطر پردہ نشینی کی گھٹن تو برداشت کر لوں گی

لیکن اسلام کبھی قبول نہیں کروں گی، اس لئے کہ یہ غنڈوں کا دین ہے۔

یہ سنتے ہی مجھ کو تاؤ آ گیا، عشق کو جذبۂ اسلام نے دبوچ لیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سامنے رکھا ہوا ایک بھاری اسٹول اس کو کھینچ کر مار دیا وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اسٹول ایک لکڑی کی الماری پر لگا اس کا پٹ چور چور ہو گیا۔ اور میں اسے اور عیسائی مذہب کو برا بھلا کہتا اس کے گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد، میں اس کے یہاں پھر کبھی نہیں گیا۔ اور لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل ہو گیا۔ اس واقعہ کے کوئی سال بھر کے بعد جب چھٹیوں میں لکھنؤ آیا تو نہ جانے اسے کیونکر پتا چل گیا۔ وہ عین دوپہر کے وقت میرے پاس آئی۔ اور جب میں نے اس کی جانب نظر اٹھائی تو یہ دیکھ کر میرے دل کو بڑا زبردست دھکا لگا کہ صرف ایک سال کی مدت میں اس کا آدھا حسن برباد ہو چکا ہے اور وہ شام کے مرجھائے پھول کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ دوڑ کر مجھ سے چمٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، میری بھی ہچکیاں بندھ گئیں اور آواز گلے میں پھنسنے لگی، اس نے مجھ سے کہا ڈارلنگ تمہاری محبت مجھ کو کھا گئی۔ مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ تم کہاں چلے گئے ہو، ورنہ وہیں پہونچتی، تمہاری جدائی کے ہاتھوں ڈارلنگ مجھ کو دق کا مرض ہو چکا ہے۔ میری سانس سے دور ہٹ کر بیٹھو۔ میں اس وقت تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ آج سے ایک سال قبل میں نے جو اسلام کی توہین کی تھی، تم اسے معاف کر دو، اب میں اس دنیا سے جا رہی ہوں، جانے والے کا یہ حق پیدا ہو جاتا ہے کہ اسے دل سے معاف کر دیا جائے۔ ڈارلنگ جو اسٹول تم نے کھینچ کر مارا تھا کاش وہ میرے لگ جاتا، میں اسی وقت مر جاتی، لیکن یہ دن نہ دیکھتی۔

میں نے اسے بڑی گرم جوشی کے ساتھ چمٹا لیا۔ میری آنکھیں پھر برسنے لگیں۔ میں نے کہا پیاری میری میں تمھیں دل سے معاف کر رہا ہوں، اور میں تم کو مرنے نہیں دوں گا۔ میرے پاس جو کچھ ہے سب تمہارے علاج پر نثار کر دوں گا، تم گھبراؤ نہیں، اس نے کہا شبیر تم میرا علاج نہ کراؤ، اب میں بچوں گی نہیں، اور ہاں یہ بھی ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے سے پیشتر میں تم کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ تمہارے چلے جانے کے بعد میرے پیٹ سے تمہاری لڑکی پیدا ہوئی تھی، ہو بہو تمہارا نقشہ تھا اور تمہارے سیدھے پاؤں کی انگلی میں جو تل ہے وہ بھی اس نے وراثت میں پایا تھا۔ ہائے وہ مر گئی۔ یہ کہکر اس کی آواز رندھ گئی اور اس کے گورے گورے گالوں پر ملگجا پن سا دوڑنے لگا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور بے سہارہ آنسو بہنے لگے۔

میں نے اس کے علاج پر، اپنی ماں سے لے کر ہزاروں روپے صرف کر دیے۔ ڈاکٹروں پر ڈاکٹر بدلے، ان کے بورڈ بٹھائے، بڑے بڑے نامی طبیبوں کو بلایا، لیکن ہائے وہ بچ نہیں سکی اور مجھے دغا دیکر وہاں چلی گئی جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا۔

اس کا پھول سا چہرہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہے اور مجھ سخت جان کی بیری اب تک اس زمین پر سانس لے رہی ہے۔ یہ کتنی عبرت انگیز اور شرمناک بات

ہے

پس از معشوق جینا، عشق کو بدنام کرتا ہے

خدا مجنوں کو بخشے، مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

ہائے اے میری مس میری، صرف ڈھائی یا تین سال کی قلیل مدت کے لئے تیرے گلستان جمال نے مجھ پر پھول برسائے اور اب تیری موت پچاس سال سے مجھ پر انگارے برسا رہی ہے۔ مسرت کی عمر کس قدر قلیل اور غم کی عمر کس قدر طویل ہوتی ہے۔

ہم کو صرف ایک بوند بھر تبسم کی لہروں میں تیرا کر، آنسوؤں کے بے شمار گردابوں میں ہمیشہ کے لئے غرق کر دیا جاتا ہے۔ ارے کیسا یہ کارخانہ ہے؟ اے تازہ واردان بساط ہوائے گل، مجھ سے عبرت حاصل کرو، اور خوشی کے حصول سے ہاتھ اٹھا لو مگر تم ایسا نہیں کر سکتے، سفاک قدرت تمہاری جوانی کو تازیانے مار مار کر حصول مسرت کے میدانوں کی جانب ایک ظالم چرواہے کی طرح ہنکائے گی۔ اور پھر مسرور ہونے کے جرم میں، تم کو، مرتے دم تک رلائے گی۔ ہائے ....

مس گلینسی

لکھنؤ کے ایک اسپتال کی خوب رو، خوش چشم، اور کم سن لیڈی ڈاکٹر تھی۔

جب میرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ چل رہا تھا، اس وقت میرے باپ نے اس کو ملیح آباد بھیجا تھا کہ وہ میری منکوحہ کا معائنہ کر کے اس کے بلوغ کا سرٹیفکیٹ دے دے۔

جب وہ ملیح آباد سے معائنہ کر کے آ گئی تو میرے باپ نے مجھے اس کے پاس بھیجا کہ میں اس سے اپنی منکوحہ کے بلوغ کی سند لے آؤں۔

میرے باپ کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ میرے اور گلینسی کے درمیان معاشقہ ہو جائے گا تو وہ کبھی مجھ کو اس کے پاس نہ بھیجتے۔

میں اس کے وہاں پہنچا ابھی برآمدہ طے کر رہا تھا کہ دیکھا ایک نہایت خوب رو، اور کم عمر عورت، غسل خانے سے نکل اپنی خواب گاہ میں کھڑی اپنی بھوری زلفیں نچوڑ رہی ہے اور چوں کہ میں نے اس کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا، اس لئے اسے پہچان نہیں سکا۔ اتنے میں اس کی نظر میری طرف اٹھ گئی، اس نے کھڑکی کا پٹ کھول کر انگریزی میں پوچھا، آپ کون ہیں؟ میں نے کہا جوش، اس نے بڑی جھانولی کے ساتھ کہا "اوہ EBULLITION, AGITATION,HEAT" (یعنی ولولہ، اچھل، حرارت) اس کے اس انداز سے میں نے بھانپ لیا کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا ہے، میں نے مسکرا کر پوچھا اور آپ کون ہیں، اس نے سر کو جنبش دے کر کہا مس گلینسی۔ میں نے کہا صرف ایک GLANCE (اچٹتی نظر کے واسطے آیا ہوں)۔ وہ آنکھیں جھکا کر متبسم ہوئی اور پوچھا اور کوئی کام؟۔ میں نے کہا آپ میری منکوحہ کے معائنے کی خاطر ملیح آباد گئی تھیں، میں اس کی رپورٹ لینے آیا ہوں، اس نے کہا میری خواب گاہ میں

آجایئے۔

وہ میرے بالکل سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سنہرے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، اور غسلِ صبوحی کی تازگی و بالیدگی اس کے روئے گل گوں پر مچل رہی تھی، اس نے پوچھا آپ نے اپنی ہونے والی دلہن کو دیکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں، اس نے کہا آپ بڑے خوش قسمت ہیں، آپ کی بیوی کا رنگ بالکل ہم لوگوں کا سا ہے۔ وہ بے حد خوبصورت ہے، میں نے کہا بالکل آپ کی طرح؟ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپالیا۔

اتنے میں اس کا ملازم تھالی میں ایک کارڈ لے آیا، اس نے کارڈ پڑھ کر میز پر رکھ دیا۔ کہا ٹھہرو، اور میری بیوی کے بلوغ کی سند میرے حوالے کر کے کہا آپ غسل خانے کے دروازے سے باہر چلے جائیں، جب میں جانے لگا، اس نے کہا اب کب آیئے گا، میں نے کہا کل صبح کو۔ اس نے کہا صبح کو نہیں، شام کو آیئے گا ٹھیک سات بجے۔

جب میں نے جا کر باپ کو سرٹیفکٹ دیا، وہ نہایت دانا تھے، انہوں نے میرے چہرے کی طرف نگاہ اٹھا کر فرمایا، یہ تمہارا چہرہ اس وقت کیسا ہو رہا ہے؟

دل میں چور تھا، باپ کی اس دیدہ وری سے گھبرا گیا، اور آنکھیں جھک گئیں۔ میری اس حالت سے میرے باپ معاملے کی تہہ تک پہونچ گئے۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ارشاد فرمایا۔ میں نے تمہیں اس ڈاکٹرنی کے پاس بھیج کر بڑی غلطی کی، دیکھو خبردار اب اس کے پاس نہ جانا۔ ہرگز نہ جانا۔ میں نے بڑی معصومیت آمیز سعادت سے کہا بہت اچھا، اور دل ہی دل میں کہا خدا کی قسم جاؤں گا، اور ضرور جاؤں گا۔

بابا تو جلوۂ رخِ جاناں نہ دیدۂ!

دوسرے دن ٹھیک سات بجے میں اس کے وہاں پہنچ گیا، وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولے کھڑی تھی — مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ گلاب کی کلی طرح چٹک گیا، بڑی گرم جوشی سے ہات ملایا، ہات کیا تھا دھنکی روئی کا گالا، اور اس لہجے میں میرا مزاج پوچھا، جیسے انگیٹھی میں فرطِ حرارت، کوئلہ چٹک جاتا ہے۔ تڑاق سے۔ مجھ کو، وہ بڑے تپاک سے ڈرائنگ روم میں لے آئی، بوائے (خادم) کو بلا کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں حکم دیا کہ تم برآمدے میں بیٹھ جاؤ، اگر کوئی آئے تو کہہ دو مس صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ یہ کہکر اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مجھے خواب گاہ میں لے گئی، کھڑکیوں کے پردے گرا دئے اور صوفے پر میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی، پوچھا وسکی پیو گے یا برانڈی یا بیئر؟ میں نے کہا میں پیتا نہیں ہوں، آپ شوق کریں، اور میں آپ کی آنکھوں سے پیوں گا۔ وہ بیئر کی بوتل اٹھا لائی اور پینے لگی۔ جب دوسری بوتل آدھی ختم ہوگئی، اس کے چہرے پر طلوعِ صبح کی سی دھاریاں مچلنے لگیں اور آنکھوں کے ڈورے ابھر آئے۔

اب اس نے صوفے کی ٹیک پر اپنا سیدھا ہاتھ، اس طرح پھیلا کر رکھ دیا کہ وہ میری گردن سے مل گیا، مجھ کو جھرجھری سی آگئی، میں نے اپنا ہاتھ اسی طرح پھیلا دیا اور ہمارے پہلوؤں کے درمیان اب ہاتھوں کا وجود باقی

نہیں رہا۔ دوسری بوتل ختم کر کے وہ آہستہ سے میری طرف کھسک آئی، میرے
پہلو میں انگیٹھی سی جلنے لگی اور اعصاب کے اندر دھمال سا ہونے لگا۔

اس کے بعد وہ اٹھی اور روشنی بند کر دی، پھر میرے پہلو سے لگ کر بیٹھ
گئی، تاریکی میں اس کا مکھڑا اور بھی دہکنے لگا۔

اب اس نے اپنا گال میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کے گالوں کا
رنگ اور اس کی جلد کی خوشبو، ڈغڈغا کر، پی لی —— اور پھر ہم دونوں کو اپنے تن
بدن کا ہوش نہیں رہا۔

وہاں بیٹھے ہوئے ہیں سکھوں کے ہر طرف پہرے
جہاں آباد کی تھیں، مرکیوں کی بستیاں میں نے
نظر آتے ہیں کافور و کفن کے اب وہاں ڈیرے
جہاں کھولا تھا، بازار حریر و پرنیاں میں نے
وہاں، قبروں کی لوحوں کے پڑے ہیں دور تک پتھر
سجائی تھی، جس انگنائی میں شیشے کی دکاں میں نے

علی شیر خاں نے اس کی کھڑی موٹر کے پاس جا کر کہا آپ ہمارا راستہ
روکے ہوئے کیوں کھڑے ہیں۔ اس نے گلیسی کی طرف اشارہ کیا کہ اسے بھیج
دو۔ علی شیر خاں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ وہ موٹر سے اتر کر ہاتھا پائی
کرنے لگا۔ میں تانگے سے کود پڑا اور کوچ بان کا ہنٹر اس پر برسانے لگا۔ اتنے
میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اور وہ انگریز موٹر اسٹارٹ کر کے بھاگ کھڑا
ہوا۔ گلیسی نے میری پیٹھ ٹھونکی، اور کہا مجھے اس بات پر بڑا فخر ہے کہ تمہارے
سے بہادر آدمی کے پہلو میں بیٹھی ہوں۔

جب تانگہ آگے بڑھا کھانچوں نے برا حال کر دیا، اور وہ کہنے لگی آج
ہی تمہاری موٹر کو خراب ہونا تھا۔ یہ بھی کوئی سواری ہے "فیک، فیک، فیک"۔
(لرزندگی، لرزندگی، لرزندگی) اس نے "فیک" کو اس طرح ادا کیا
کہ میرے تمام بدن میں سنسنی پیدا ہو گئی۔

ایک رات کو جب میں گلیسی کی خواب گاہ میں بیٹھا ہوا تھا، اور وہ میرے
زانو پر بیٹھی بیئر پی رہی تھی کہ اس کی خواب گاہ کا دروازہ یکایک دھڑام سے کھل گیا
اور ایک لمبا تڑنگا، ادھیڑ عمر کا انگریز جو اس کا چچا یا ماموں تھا، ہاتھ میں پستول لئے
لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ گلیسی اور میں دونوں گھبرا کر کھڑے
ہو گئے، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دھڑام سے مجھ پر گولی چلا دی، گلیسی نے سقف
شگاف چیخ ماری اور لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی، نشانہ خطا ہو گیا تھا، میں نے جست کر
کے اس کی کلائی پکڑ لی اور پستول چھیننے لگا۔ اسی کشمکش میں اس نے دوسری گولی چلا
دی جو چھت میں جا کر لگی اور میں نے جھٹکا دے کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین
لیا۔ اتنے میں اس کے نوکر چاکر اور پڑوس کے بنگلوں کے دس بیس آدمی خواب گاہ
میں آ گئے۔ انہوں نے اس انگریز کو پکڑ لیا، اس کے بعد تھوڑی دیر میں پولس آ گئی اور
ہمارے بیانات قلمبند کرنے کے بعد اس انگریز کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔

اس تھانے کا انچارج میرے باپ سے واقف تھا۔ اس نے صبح ہوتے ہی یہ
خبر میرے باپ تک پہنچا دی —— میرے باپ نے مجھ کو طلب کیا، میں کانپتا ہوا ان

کے سامنے گیا، انہوں نے، بڑی بھاری آواز میں ارشاد فرمایا میں نے منع کر دیا تھا کہ اس ڈاکٹرنی کے وہاں ہرگز نہ جانا، لیکن تم نے میری بات نہ مانی، یہ کہکر میرے منہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ میں چکرا کر گر گیا۔ میری ماں کانپتی کانپتی آئیں، اور پوچھا یہ کیا قصہ ہے، میرے باپ نے سارا ماجرا بیان فرما دیا، میری ماں نے اپنے زانو پر میرا سر رکھ کر کہا، اگر، سو سو سمندر پار، شیطان کے کان بہرے تیرے گولی لگ جاتی ننھے، تو ہائے میں کیا کرتی، میں تو زندہ درگور ہو کر رہ جاتی، ہائے ماں اللہ آمین سے پالے اور بچہ اپنے کو کوفت میں ڈالے۔ اس کے بعد میں ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کر دیا گیا، اور در و دیوار کے سناٹے سے گلیسی گلیسی کی آوازیں آنے لگیں۔

میرے باپ نے پولس کی منہ بھرائی کر کے مقدمے کو تو ختم کرا دیا، لیکن مجھ کو قید سے باہر نہیں نکالا۔

ایک روز شام کے وقت جب کہ میں اپنے زنداں میں اداس بیٹھا ہوا تھا، ایک بڑی مانوس آواز میرے کان میں آئی، دل نے کہا ہو نہ ہو یہ گلیسی کی آواز ہے، میں سلاخوں دار کھڑکی کے پاس گیا۔ اور دیکھا کہ گلیسی میری ماں کے قدموں پر سر رکھے یہ درخواست کر رہی کہ خدارا شبیر کو ایک نظر دکھا دیجئے۔ اور میری رقیق القلب ماں، ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ میاں (میرے باپ) باہر گئے ہوئے ہیں ان کی واپسی تک ٹھہر جاؤ، اور گلیسی قدموں سے سر اٹھا کر، بڑی بے کسی کے ساتھ، میری ماں کو دیکھ رہی ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا، خاندانی آداب کا پاس اور غیرت کا احساس، اگر میرے منہ پر بات نہ رکھ دیتا تو میں ایسی چیخ مارتا کہ میرے زنداں کی چھت گر پڑتی۔

میں نے بڑے زور سے اپنے سینے کو دبایا، دانتوں پر دانت جما کر، اپنی آہوں کو روکا اور دل پر اس قدر دھکا لگا کہ میں دھڑام سے فرش پر گر پڑا، گرتے ہوئے میز پر پاؤں لگا اور میز پر رکھی ہوئی اچاری پتھر کے فرش پر گر کر تڑاق سے ٹوٹ گئی۔ میری ماں گھبرا کر کھڑی ہو گئیں، جھپٹ کر میرے زنداں کا دروازہ کھولا اور ہائے میرے بچے کہکر زمین پر بیٹھ گئیں اور میرے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر زار و قطار رونے لگیں۔

گلیسی کو موقع مل گیا، وہ میرے کمرے کی طرف جھپٹی۔ ابھی دہلیز تک پہونچی تھی کہ میرے باپ آ گئے، انہوں نے یہ خلاف توقع سماں دیکھا تو دنگ ہو کر رہ گئے، اور ڈانٹ کر فرمایا ڈاکٹرنی ــــ ابھی میرے باپ کچھ اور نہیں کہنے پائے تھے کہ وہ ''پاپا'' کہکر ان کے قدموں سے لپٹ گئی۔ میرے باپ لاکھ تند خو پٹھان سہی، مگر شاعر تھے، ان کا دل پسیج گیا، اسے میرے زنداں میں لے کر آ گئے اور وہ میرا اترا ہوا منہ دیکھ کر رونے لگی۔

میں نے باپ کی موجودگی کے باعث اس کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی اور اپنی رسوائی سے میرا تمام بدن ٹھنڈا ہو گیا۔

میرے باپ نے کہا ڈاکٹرنی، اگر تو مسلمان ہونے اور پردہ نشینی اختیار کرنے پر تیار ہے تو میں شبیر سے تیرا نکاح کرا دونگا۔ میں دلوں کو توڑنے کا گناہ نہیں کر سکتا۔

گلیسی میرے باپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی، سوالیہ انداز میں

اس نے میرے باپ کی طرف نگاہ اٹھائی۔

میرے باپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا، منیر اس کو میری بات انگریزی میں سمجھادو، میں شرم کے مارے بول نہیں سکا، تو میرے باپ نے کہا، میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ انگریزی میں اس ڈاکٹرنی کو میری بات سمجھادے۔

میں نے آنکھیں اٹھائے بغیر، انگریزی میں اس کو بات سمجھادی، اس نے کہا پاپا سے کہہ دو، مجھ کو یہ دونوں شرطیں منظور ہیں۔

میرے باپ نے فرمایا، اس سے کہہ دو کہ جمعرات کے روز وہ یہاں آجائے، فرنگی محل چل کر مولانا عبدالباری کے سامنے مشرف بہ اسلام ہو جائے اور نوکری سے استعفیٰ دے دے، میں جمعہ کے دن اس کا نکاح پڑھوادوں گا۔

میں نے گلیسی کو یہ بات سمجھادی اور اس نے خوشی کے ساتھ منظور کرلی، بدھ کے دن سرشام، اس کے وہاں پہونچا تو اس کے بنگلے پر کچھ اس طرح سوگواری دیکھی کہ مجھے یقین ہوگیا کہ خدانخواستہ، میں کسی نہایت الم ناک سانحے سے دوچار ہونے والا ہوں۔

جب ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو ایک شخص نے یہ کہکر مجھے اس کی خواب گاہ میں جانے سے روک دیا کہ مس گلیسی پر دل کا بے حد شدید دورہ پڑا ہے، ان کو گیس دی جارہی ہے۔ یہ سنتے ہی مجھ پر بجلی گر پڑی، دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ٹھنڈا پسینہ آنے لگا، تمام بدن میں کپکپی پیدا ہوگئی۔

اتنے میں وہ آدمی اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا، میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا، وہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے مجھ سے کہا آپ باہر چلے جائیں۔ میں ڈرائنگ روم میں آگیا اور بوجھل قدموں کے ساتھ اس کونے سے اس کونے کے درمیان ایک ایسے عالم میں ٹہلنے لگا جو الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتا۔

اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد جو میری نظروں میں ہزارہا صدیوں کے برابر تھا، ڈاکٹر نے باہر آکر کہا افسوس وہ مرگئی، میں اسے بچا نہیں سکا۔ میں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر وہیں گر گیا۔

جب رات گئے ہوش آیا پہلے تو دیر تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں۔ اور میری حالت کیا ہے۔ جب تھوڑی دیر میں حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ میں اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں ہوں، اور میرے باپ میرے روبرو ننگے سر کھڑے دعائیں مانگ رہے ہیں۔

میرے آنکھ کھولتے میرے باپ میری طرف جھکے اور بڑی مسرت آمیز نرمی سے پوچھا بیٹا طبیعت کیسی ہے، میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا میاں میں اچھا ہوں۔ میرے باپ سجدۂ شکرانہ میں گر گئے، میرے سر سے صدقہ اتار گیا، اور تمام اسپتال میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔

گلیسی کی موت نے مجھ کو ادھ موا کردیا۔ زندگی میری نظر میں بے معنی اور سپاٹ ہو کر رہ گئی مجھ کو ہر روز دو بجے دن کے بعد خفیف بخار آنے لگا اور چہرہ اس قدر اتر گیا کہ میرے باپ کو سخت تشویش پیدا ہوگئی، وہ مجھ کو نینی تال لے گئے، ابرار اور مختار کو میرا جی بہلانے کے لئے ساتھ لے لیا۔ میرے باپ

میرے ساتھ نہیں ٹھہرے، ایک دوسری کوٹھی میں قیام کیا اور صبح و شام ڈاکٹر کو لے کر آتے رہے۔

جب کوئی چار مہینے کے بعد سہ پہر کے خفیف بخار سے نجات حاصل ہو گئی اور میرا رنگ ٹھہرنے لگا، تو ملیح آباد لے آئے اور ایک سال تک لکھنؤ جانے نہیں دیا۔

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ یہ بات سچ ہے لیکن سو فیصد صحیح نہیں۔ ہر چند وہ اگلی سی اداسی باقی نہیں رہی، لیکن بار بار دل میں برسوں کسک ہوتی رہی اور اب بھی جب اس عمر میں بھی گلیسی کی موت یاد آ جاتی ہے تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا ہوں......

ج ب ۔ ع خ

ایک[1] بار دفتر سے گھر پہنچا تو یہ دیکھا کہ میری بیوی تخت پر متمکن ہیں اور صوفے پر ایک بیس اکیس برس کی نہایت قبول صورت خاتون بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں یہ سمجھ کر کہ کوئی پردہ نشین میری بیوی سے ملنے آئی ہوئی ہیں، جب الٹے پاؤں باہر جانے لگا تو میری بیوی نے رکتی سی آواز میں کہا یہ تم سے ملنے کو مدراس سے آئی ہیں۔

میں پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بیوی کی طرف بڑے معصومانہ انداز میں دیکھنے لگا کہ وہ اس خاتون کا مجھ سے تعارف کرا دیں۔

جب بیوی کچھ نہیں بولیں اور منہ پھلائے، گم سم بیٹھی رہیں، تو میں ایک عجیب کش مکش میں پڑ گیا۔ بیوی کی موجودگی میں ہمت تو پڑی نہیں کہ براہ راست بات کروں — آخر کار تنگ آ کر میں نے بیوی سے پوچھا آپ کون ہیں؟ بیوی نے کہا تم خود پوچھ لو، میں کیا کروں گی بول کے۔

اس آنے والی نے عجیب شش و پنج کے عالم میں نظر اٹھائی، اور کہا میں آپ سے ملنے کے لئے مدراس سے آئی ہوں۔ میرا نام ہے ''ج۔ ب'' رہنے والی یو پی کی ہوں۔ مگر قیام ہے مدراس میں۔ میرے دل میں تین شخصیتوں یعنی ابوالکلام آزاد، انور پاشا اور آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ انور پاشا کا انتقال ہو گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے مل چکی، اور آج آپ سے ملنے آئی ہوں، مجھے شاعری سے بیحد شوق ہے، آپ کی کتاب ''روح ادب'' شروع سے آخر تک مجھے یاد ہے، میں آپ کی بیحد عقیدت مند ہوں، میں نے آج سے کئی برس پہلے آپ کی ایک نظم ''جنگل کی شاہزادی'' کا یہ آخری شعر جب پڑھا تھا:-

مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مر چکی تھی
پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

تو میں رونے لگی تھی، اور ابھی میں رو رہی تھی کہ نانی جان آ گئیں، انہوں نے مجھ سے پوچھا اری کیوں رو رہی ہے، میں نے کہا جوش صاحب کو آپ جانتی ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں جانتی ہوں، میں نے کہا تو جوش صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے، جنگل میں گاڑی رکی، وہ ریل سے اتر

کر جنگل کی سیر کرنے لگے، اور اس قدر محو ہو گئے کہ گاڑی چھوٹ گئی، اور وہ جنگل میں رہ گئے، نانی جان اللہ سے دعا کیجئے کہ ان کی جان بچ جائے، میری نانی جان نے قہقہہ مار کر کہا اری دیوانی شاعروں کی بات پر نہ جا، یہ روز مرتے اور روز جیتے ہیں۔

چاہئے تو مجھے یہ تھا کہ یہ ماجرا سن کر، میں اس سے کھل مل کر باتیں کرتا، مگر بیوی سامنے بیٹھی ہوئی تھیں اس لئے میں ایک نہایت اعلیٰ درجے کے بے وقوف آدمی کی طرح، اس کی طرف دیکھ کر گدی کھجلانے لگا۔

اس نے مجھ کو غور سے دیکھا، معاملے کی تہ تک پہنچ گئی اور ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے اس نے کہا آپ کا مکان شہر سے دور ہے یہاں کوئی ٹیکسی نہیں مل سکے گی۔ میں جس ٹیکسی پر آئی تھی اسے رخصت کر دیا ہے، اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھ کو میری سہیلی کے مکان تک پہنچا دیجئے جن کے پاس میں ٹھہری ہوئی ہوں۔

میں ایک عجیب ادھیڑ بن میں پڑ گیا، جاتا ہوں تو بیوی کو ناگوار گذرے گا نہیں گیا تو اس کو رنج ہو گا۔ کیا کروں، کیا نہ کروں۔

آخر یہ فیصلہ کر کے کہ اسے اس کی جائے مقام تک پہنچا آؤں، میں اٹھا، بیوی کی جانب نگاہ نہیں اٹھائی، اس سے کہا چلئے میں پہنچا آؤں۔

وہ مجھ سے سات میل کے فاصلے پر ٹھہری ہوئی تھی۔ جب میری گاڑی ایک بہت بڑے بند کی سڑک سے گزرنے لگی، اس نے مجھ سے کہا جوش صاحب بڑی پیاری شفق پھولی ہوئی ہے۔ پل بھر گاڑی روک لیجئے کہ یہ منظر دیکھ لوں۔

جب گاڑی رک گئی، اس نے بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھا اور اپنی بھری بھری انگیا سے ایک پرچہ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔

یہ پرچہ پڑھا تو اسے اظہارِ عشق سے لبریز پایا۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ ط۔ج کی مفارقت کا گھاؤ ابھی مندمل نہیں ہوا تھا اور اس وقت تک میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ میں نے جیب سے قلم نکالا اور اس پرچے کی پشت پر یہ لکھ کر کہ میں آج کل، بری طرح زخمی ہوں، کسی نئے زخم کی تاب نہیں لا سکتا۔ ایک نہایت طویل بیداری کے بعد اب کوشش کر رہا ہوں کہ سو جاؤں، مجھ کو جگائیے نہیں۔

میرے جواب کو پڑھ کر اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آنکھوں میں نمی آ گئی، اس نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا، تو پھر مجھے یہیں اتار دیجئے، میری سہیلی کا مکان قریب آ گیا ہے، میں پیدل چلی جاؤں گی۔

یہ سن کر میں کانپ گیا، اس کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا کر کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو یہیں اتار دوں، آپ کو میرے دل کا حال نہیں معلوم، آپ کی طرف میرا دل کھنچ رہا ہے، مگر — اس نے آس ٹوٹ جانے کے بعد آس بندھ جانے کی نظر سے مجھے دیکھا، اور کہا، آپ کا شکریہ۔

راستے بھر وہ خاموش رہی، اس خاموشی میں ہزاروں باتیں تھیں، جنہیں کانوں نے نہیں دل نے سن لیا۔

میں نے دل میں کہا میاں جوش خدارا پھر کسی نئے جھیلے میں نہ پڑ

---

۱ یہ غالباً ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے جب کہ میں حیدرآباد دکن میں تھا۔

جانا، سنبھالے رہو اپنے کو، اب عشق کیا تو مر کر رہ جاؤ گے خاں صاحب۔

اتنے میں اس کی سہیلی کا مکان آ گیا۔ میں نے موٹر سے اتر کر دروازہ کھولا۔ وہ اتری، پوچھا تھوڑی دیر بیٹھیے گا بھی نہیں؟ میں نے کہا خود میرا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ بیٹھ جاؤں اور پہروں بیٹھوں مگر — میں پھر کسی وقت آؤں گا اس نے بڑی حسرت سے مجھے دیکھا، میں نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا حسن معصوم میرے دل کو زخمی نہ کر دے، فوراً آنکھیں جھکا لیں اور جلدی سے روانہ ہو گیا۔

گھر آیا، بیوی کو آگ بگولا پایا۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑیں اور کہا اور تو اور اب تو میری آنکھوں کے سامنے عشق بازی کرنے لگے ہو، میں نے کہا اشرف جہاں اللہ اللہ کرو، تم میری ایک شرافت اور مروت کی بات کو عشق بازی کہہ رہی ہو۔ میں اور عشق، الٰہی تیری پناہ۔ یہ سن کر انہوں نے میرے گریبان پر ہات ڈال دیا، اور اسے، چر سے پھاڑ ڈالا۔ اور کہا جوتیوں سمیت آنکھوں میں نہ گھسو، میں نے کہا خدا کے واسطے بات سمجھنے کی کوشش کرو، اور یہ سوچو کہ کوئی اتنا بڑا سفر طے کر کے میرے گھر آئے، اور گھگھیا کر کہے کہ مجھے میری جائے قیام تک پہنچا دو اور میں اس کو لٹکا سا جواب دے دوں یہ بات شرافت کے خلاف ہے، ارے تم شرافت کو بھی عشق بازی سمجھتی ہو، یہ تو بڑا اندھیر ہے۔

بیوی نے کہا اچھا قسم کھا کر بتاؤ اس نیچری کے ساتھ، اس کے گھر جا کر بیٹھے تھے کہ نہیں، میں نے کہا بیٹھنا کیسا، میں نے تو اس کے گھر میں قدم بھی نہیں رکھا۔

بیوی نے کہا تم سر پر قرآن رکھ کر قسم کھا سکتے ہو؟ سانچ کو آنچ نہیں، لے آؤ قرآن، وہ قرآن لے آئیں، میں نے سر پر قرآن رکھ کر قسم کھا لی۔ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ کہنے لگیں، ناحق میں نے تمہارا گریبان پھاڑ ڈالا۔ لاؤ سی دوں۔

اس واقعے کے دو تین دن بعد، دفتر میں بیٹھا تھا چپراسی نے آ کر کہا کوئی بیگم صاحب آپ سے ملنے آئی ہیں اور ٹیکسی میں بیٹھی انتظار کر رہی ہیں۔ نیچے اترا تو دیکھا وہی ہے، صاحب سلامت کے بعد اس نے کہا موٹر میں آ جایئے۔ میں بیٹھ گیا تو اس نے کہا کہ آپ آنے کا وعدہ کر گئے تھے لیکن آئے نہیں۔

اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے شوفر سے کہا باغ ...... لے چلو۔ باغ میں موٹر ٹھہری، اس نے کہا آیئے اس کنج میں تھوڑی دیر بیٹھ جائیں۔ کنج میں بیٹھتے ہی اس نے کہا جوش صاحب، آپ کا کلام پڑھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آپ کا دل موم کی طرح نرم ہے لیکن دیکھا تو وہ پتھر نکلا، سچ بتایئے، شعر آپ خود کہتے ہیں یا کوئی اور آپ کو لکھ کر دے دیتا ہے؟

میں نے کہا میں آپ کے پاس کل آنے والا تھا، آتا اور ضرور آتا، آپ اس قدر بدگمانی سے کام نہ لیں۔ طبیعت کی ناسازگاری کی بنا پر کل پرسوں نہیں آ سکا۔ اس نے مسکرا کر کہا جس کی طبیعت ناساز ہوتی ہے اس کا چہرہ کیا ایسا ہوتا ہے؟ اب میں آپ کو چھوڑنے والی نہیں، اسی وقت میرے ساتھ ...... نہر کے کنارے چلئے، یہ کہتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ موٹر میں آتے ہی اس لئے شوفر سے کہا پہلے مجھ کو جہاں سے لائے ہو وہاں لے چلو، اور جب گاڑی

اس کی قیام گاہ پر گئی، اس نے کہا جوش صاحب اندر آ جائیے میں ...... نہر پر اپنی
سہیلی کو بھی لے چلوں گی۔

گھر پہنچتے ہی اس نے اپنی سہیلی کو آواز دی کہ ادھر آؤ، جوش صاحب
کے ساتھ نہر پر چلنا ہے۔

تھوڑی دیر میں اس کی سہیلی آ گئی، سرمئی دلائی اوڑھے اور اس کا سرا
منہ پر ڈالے ہوئے، میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی تو ایسا معلوم ہوا گویا افق
کے گریبان سے آفتاب طلوع ہو رہا ہے، اور جب اس نے اپنی گوری ہتھیلیوں
پر رکھ کر مجھے پان دیا، تو میں نے دیکھا کہ اس کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی
پر، مہدی کا ہلال بنا ہوا ہے اور اس ہلال کے اندر مہدی ہی سے لکھا ہوا ہے
''جوش''۔ میں نے اپنے آپ کو حد سے زیادہ سنبھالنے کی کوشش کی، پھر بھی
میرے تمام بدن میں کپکپی طاری ہو ہو گئی۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

الغرض کھانے پینے کا سامان لیکر ہم تینوں ...... نہر کی طرف روانہ
ہو گئے۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ بیوی پریشان ہوں گی اور بدگمان بھی
ی۔ں نے ایک موڑ پر گاڑی رکوا دی، اور اپنے ایک دوست سے بیوی کو ٹیلی
فون کرا دیا کہ آج میرے گھر جلسہ ہو رہا ہے، اس لئے جوش صاحب کو میں نے
روک لیا ہے، وہ کل دوپہر تک گھر پہنچ جائیں گے۔

...... نہر کے کنارے پہنچ کر ہم ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر گئے، میں نے کہا ہم
تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ یہ کہہ میں لیٹ گیا۔

ابھی مجھے لیٹے آدھ یا پون گھنٹہ ہوا ہو گا کہ ج۔ب نے آ کر میرے
پاؤں دبانا شروع کر دیئے، اور سہیلی کو حکم دیا کہ وہ بھی آ کر میرے پاؤں
دبانے لگے۔ سہیلی نے کہا باجی میری ہمت نہیں پڑ رہی ہے، لیکن جب اس نے
ڈانٹا تو وہ بھی آ کر پاؤں دبانے لگی۔

میں نے کہا ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں، برائے خدا ایسا نہ کیجئے میں
شرم کے مارے کٹا جا رہا ہوں۔

لیکن وہ نہیں مانیں، اور میں دس پندرہ منٹ کے بعد، شرم کی تاب نہ
لا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے چلا گیا، میرے غسل
خانے میں داخل ہوتے ہی ''ج۔ب'' بھی آ گئی، اور ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی سہیلی
کو بھی وہیں بلا لیا۔

مجھ سے ان دونوں کی موجودگی کے باعث اچھی طرح منہ نہیں دھویا
گیا، اور جب الٹا سیدھا منہ دھو کر میں تولیا کی طرف بڑھا تو ''ج ب'' نے کہا
نہیں تولیہ نہیں میں اپنے دوپٹے سے آپ کا منہ پونچھوں گی، میں کیا کرتا، اس
نے اپنے دوپٹے سے میرا منہ پونچھا، پھر اس نے مجھ سے کہا آپ کرسی پر بیٹھ
جائیں اور سہیلی کو حکم دیا کہ وہ جگ سے میرے پاؤں دھلا دے، اس نے تعمیل
کی، اور جب میرے پاؤں دھل گئے تو دوپٹے کے عوض اس کی سہیلی نے اپنی
زلفیں کھول کر میرے پاؤں پونچھنا شروع کر دئے۔ میں اس کی وضع سے گھبرا
گیا، پاؤں کھینچ لئے اور شرم کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔

اب شام ہو گئی رسٹ ہاؤس کے بوائے کے تھیلے میں گلاس، سوڈے اور بوتل رکھوا کر ہم نہر کے ایک ایسے کنارے پر جا کر بیٹھ گئے جدھر کوئی آتا جاتا نہیں۔ ہائے وہ رنگین شام وہ سامنے وہ گلفام، وہ چھلکتا جام، وہ آنکھوں آنکھوں میں کلام — وہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، وہ آسمان پر ابر کے ہلکے ہلکے لکے، وہ لہروں میں ڈوبتے سورج کا سونا، وہ چار، مدھ بھری انکھڑیوں میں جادو ٹونا۔

جب میں نے اس حلقۂ جمال میں دو پیگ ختم کر کے، تیسرا پیگ بنا کر، سامنے رکھ لیا، تو ''ج۔ب'' نے پوچھا وہ ''جنگل کی شاہ زادی'' سچ مچ تھی، یا خیالی، تو میں نے کہا، میں نے آج تک کوئی خیالی اور ہوائی نظم نہیں کہی ہے، اس نے کہا آپ نے اپنی اس نظم میں اس جنگل کی لڑکی کا جو حسن و جمال بیان کیا ہے، اس میں کوئی مبالغہ تو نہیں — اور جب آپ اس کو بھول گئے تو ہمیں بھی بھول جائیں گے، میں نے کہا ایسا نہیں ہوگا، میرا دل ایک مرقع ہے جس میں اس کی تصویر اب تک لگی ہوئی ہے اسی طرح آپ کی بھی تصویر لگی رہے گی، اس نے کہا آنکھیں بند کر لیجئے اور میرے سر کی قسم جب تک میں نہ کہوں میچے ہی رہئے۔

جب میں نے آنکھیں بند کر لیں، اس نے میری آنکھ کا بوسہ لے لیا، مجھ پر ایک ناقابل شرح کیفیت طاری ہو گئی، پھر اس نے سہیلی سے کہا آ تو دوسری آنکھ کا بوسہ لے لے، اس نے کہا باجی میرا حیاؤ نہیں پڑ رہا ہے میری طرف سے آپ ہی بوسہ لے لیں۔ اس نے چٹ سے میری دوسری آنکھ کا بھی بوسہ لے لیا۔ اور میرا سر ہوا میں اڑنے لگا۔ اس نے کہا اب آنکھیں کھول دیجئے، اور مجھے دنیا بدلی ہوئی نظر آنے لگی۔

چوتھا پیگ ختم کر کے میں نے کہا اب اندھیرا ہو گیا ہے، آیئے رسٹ ہاؤس چلیں۔

ناہموار ساحل سے جب موٹر کی طرف چلا، ایک بہت نکیلا پتھر میرے ٹخنے میں چبھ گیا، اور خون نکلنے لگا، ''ج۔ب'' نے اپنا پلّو پھاڑ کر سوڈے میں تر کیا اور میرے ٹخنے پر باندھ دیا۔

اب ہم آ کر موٹر میں بیٹھ گئے، میرے بائیں طرف ''ج ب'' اور داہنی طرف اس کی البیلی سہیلی ''ع۔خ'' بیٹھ گئی۔

موٹر نے ابھی بمشکل آدھا فرلانگ ہی طے کیا ہوگا کہ اس کی سہیلی نے مجھ سے کہا ذرا اپنا ٹخنا دکھا دیجئے، میں نے ٹخنا اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے اپنی کلائی میرے ٹخنے پر چپاں کر دی۔

ج۔ب نے پوچھا کیا کر رہی ہو اس نے کہا باجی، میں نے اپنی کلائی کو دانتوں سے لہولہان کر کے اس کو جوش صاحب کے ٹخنے پر اس لئے چپاں کر دیا ہے کہ جوش صاحب کے خون سے میرا خون مل جائے۔

یہ سنتے ہی ''ج۔ب'' سہیلی سے بگڑ گئی اور کہنے لگی میں تو یہاں تجھے تفریح کرانے لائی تھی، تو تو جوش صاحب سے عشق لڑانے لگی۔

سہیلی نے روہانسی آواز میں کہا باجی آپ انسانی ہمدردی کو عشق لڑانا کہہ رہی ہیں۔ مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی۔ اتنا کہہ کر اس نے پلّو سے منہ چھپا

لیا اور رونے لگی۔

اب ہم رسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ میں نے دیکھا ''ج۔ب'' کی آنکھوں میں رقابت کی سرخی اور ''ع۔خ'' کی انگڑیوں میں گھٹن کی ملگجاہٹ پائی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ بات بھی بھانپ لی کہ ''ج۔ب'' کے مزاج میں نپولین کی سی سختی اور ''ع۔خ'' کے مزاج میں حضرت مسیح کی سی نرمی کارفرما ہے۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی اس نے ''ع۔خ'' کو حکم دیا کہ تم اس سامنے والے کمرے میں چلی جاؤ۔ تمہارا کھانا وہیں بھیجدیا جائیگا، وہ اداس ہوکر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے اس طرح چلے جانے سے میرے دل کو بڑا دھکا لگا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکا۔

وہ رسٹ ہاؤس کی رات عجیب رات تھی، جس میں شیرینی بھی تھی، تلخی بھی کیف بھی تھا، کرب بھی، ''ج۔ب'' کی موجودگی کا نیش بھی تھا اور ''ع۔خ'' کی غیر موجودگی کا نیش بھی۔

میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو میں یہ کہوں کہ ہر چند ''ج۔ب'' کی بھرپور جوانی، اور اس کے رخساروں کی گل فشانی بے حد نظر فریب تھی، لیکن ہائے اس کی سہیلی ''ع۔خ'' کا مکھڑا اور اس مکھڑے پر اس کی مسکینی کا جمال، میرا دل ٹوٹ کر اس پر آ چکا تھا۔

اب سنئے اللہ کا کرنا کیا ہوا، اس واقعے کے دو ماہ بعد، جب میں ''ج۔ب'' کا تار پاکر مدراس گیا اور اس کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا، اس کے پانچویں دن ''ع۔خ'' بھی اپنے بھائی کے ساتھ وہاں[1] پہنچ گئی۔

اس کو دیکھتے ہی میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ وہ دوڑ کر ''ج۔ب'' سے لپٹ گئی، ''ج۔ب'' نے اپنے چہرے کی تلخی پر جھٹ سے نقاب ڈال کر، اس کا ماتھا چوم لیا۔

''ع۔خ'' نے اس کے یعنی ''ج۔ب'' کے چہرے کی تلخی محسوس کر لی تھی، اس لئے اس کو اپنے ماتھے کے چوم لئے جانے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی اور اس کی جھکی ہوئی پلکوں کی چھاؤں میں مومن کا یہ شعر سرپیٹتا نظر آیا۔

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا، کیا ذلیل
میں، کوچۂ رقیب میں بھی، سر کے بل گیا

''ج۔ب'' نے ہم دونوں کی طرف بار بار نظر اٹھائی اور بڑی تلخی کے ساتھ میرے میں کان کہا آگ، دونوں طرف لگ چکی ہے۔ اور میں بیچ میں لکڑی جل رہی ہوں۔

اس کو دوسرے کمرے میں لیجا کر میں نے کہا تمہارا یہ خیال غلط ہے، مجھ کو محبت تم سے ہے اور ترس اس پہ آتا ہے کہ اس بیچاری کی صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے۔

[1] اس کے بھائی کو کسی ضروری کام سے مدراس جانا تھا، اس نے یہ سوچ کر کہ میں وہاں موجود ہوں اپنے بھائی سے استدعا کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو، سمندر کی ہوا سے میری صحت درست ہوجائے گی۔

''ج۔ب'' نے کہا، اچھا قسم کھا کر کہو تم میرے ہو یا اس کے؟ میں نے قسم کھا کر کہا میں تمہارا اور صرف تمہارا ہوں، اس نے کہا عورت سے زیادہ کوئی محبت کی نظر کو پہچان نہیں سکتا۔ تمہاری نظریں بتا رہی ہیں کہ تم اس بڈیوں کے مالے پر دل جان سے فدا ہو چکے ہو۔

بات تو اس نے سچ کہی تھی، لیکن میں نے دھاندلی اور بے ایمانی سے کام لے کر اس سے کہا تم دھوکا کھا رہی ہو۔ کہہ چکا ہوں کہ اس کی صحت کی خرابی پر مجھ کو بڑا ترس آتا ہے، تم ترس کھانے والی نظر کو محبت کی نظر سمجھ بیٹھی ہو، یہ تمہاری بڑی نادانی ہے۔ ارے کہاں تم اور کہاں وہ۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اس کے چہرے پر بحالی آگئی اور یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ میں صرف اسی کو چاہتا ہوں، اس نے ''ع۔خ'' کو جو باہر بیٹھی ہوئی تھی، بڑے پیار سے آواز دی کہ وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو، یہاں چلی آؤ، وہ سبک دری کی طرح قدم اٹھاتی خوشی خوشی آئی اور میرے سامنے کے صوفے[1] پر بیٹھ گئی۔

میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ''ع۔خ'' کی جانب نگاہ نہیں اٹھاؤں گا۔ اس لئے کہ ایسا کیا تو پکڑا جاؤں گا۔ میں سختی سے آنکھیں جھکا کر بیٹھ گیا۔ لیکن اسے کیا کرتا کہ میرا چہرہ بگڑ بگڑ اٹھنے اور الف ہونے لگا۔ اتنے میں ''ج۔ب'' کوئی چیز لانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی، میں نے بعجلت کے ساتھ ''ع۔خ'' کی طرف نگاہ اٹھائی، اس نے میری جانب دیکھا، نظروں میں دو دو باتیں ہو گئیں اور اس نے اپنے سینے پر گھونسہ مار لیا۔

''ج۔ب'' نے پٹ کی آڑ سے یہ ماجرا دیکھ لیا، وہ کمرے میں آئی ''ع۔خ'' سے کہا آؤ میں تمہارا کمرہ تمہیں دکھادوں اور وہ دونوں دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور میرا دل دھڑکنے لگا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔

---

[1] معاف کیجئے ایک بڑی ان مل بے جوڑ بات لکھ رہا ہوں، یعنی آج ۱۳ نومبر ۱۹۶۷ء کو پونے تین بجے سہ پہر کے وقت، جبکہ میں اس سطر کو تمام کر کے آگے بڑھنے والا تھا۔ میری وفادار بیوی یخنی کا پیالہ ہاتھ میں لئے آئیں اور کہا، جلدی سے کلی کر کے، اسے پی لو، اور گلے ہاتھوں وہ سنگھاڑے اور بتاسے بھی کھا لو، جو میں نے تمہارے واسطے منگائے ہیں، اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے واسطے آرام کرلو، صبح چار بجے سے لگاتار لکھ رہے ہو، اب تین بجے کا عمل ہے بس لکھنا بند کر دو۔

میں نے دل میں سوچا کہ اگر ان کو یہ پتہ چل جائے کہ میں اپنے حالات عشق لکھ رہا ہوں، تو پیالہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے، اور مجھ پر برس پڑیں کہ آج بھی میرے دل میں جوانی کی یادیں مچلتی رہتی ہیں۔

پھر میں نے سوچا کہ ہر چند میں ان کی سرکار جمال کا نمک حرام ہوں، پھر بھی ان کی محبت میں کمی نہیں آئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی میرے دل میں آیا کہ جو زریں پروں کی چڑیاں، میری جوانی کے موتی چگنے کے لئے، مجھ پر ٹوٹ پڑی تھیں، میری جوانی کے ختم ہوتے ہی، وہ پھڑ پھڑا کر اڑ چکی ہیں، اور ہزاروں دل شکنیوں کے باوصف، میری بیوی آج تک میری محبت کا دم بھر رہی ہیں۔

اللہ کرے میری محراب پیری کی یہ شمع تاباں کم سے کم اس وقت تک روشن رہے، جب تک کہ میرا چراغ حیات گل نہ ہو جائے۔

عشق و محبت میں یہ بنیادی فرق ہے کہ عشق کا نشہ جوانی کے بعد اتر جاتا ہے اور محبت کا نشہ، جوانی کے بعد اور بھی چڑھ جاتا ہے اور ہر آن تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

''ع۔خ'' کو اس کمرے میں بٹھا کر وہ میرے پاس آئی، اس کا منہ پھولا اور چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ میرے پہلو میں بیٹھ کر اس نے کہا کیوں صاحب یہ نظروں کا ملاؤ اور چھاتی کا کٹاؤ کیسا تھا۔

میں نے کہا تمہارے جاتے ہی دروازہ کھٹ سے بولا۔ میری نظر اٹھ گئی، اتنے میں تمہاری سہیلی کو کھانسی آ گئی، فرط کرب سے اس نے اپنے سینے پر گھونسہ مار لیا، یہ دونوں عمل فطری تھے، اس میں بدگمانی کی کیا بات۔

اس نے بگڑ کر کہا، میں ان باتوں میں نہیں آنے کی، کان کھول کر سن لیجئے صاحب، میں آپ کو اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دوں گی، اب مجھے آپ اور اس پر سختی کرنا پڑے گی، میں نے کہا تم شوق سے سختی کرو، سر تسلیم خم ہے، لیکن وہ سختی ایک بدگمان دل کی بے جا سختی ہو گی۔

اتنے میں ایک نوعمر بے حد گھبرایا ہوا آیا، اس نے ''ج۔ب'' سے کہا خالہ جان سلام میری ماں پر دل کا دورہ پڑ گیا ہے، جلدی میرے ساتھ چلئے ''ج۔ب'' بدحواس ہو گئی، مجھ سے کہا میری بڑی بہن کے دل پر دورہ پڑا ہے، میں ان کی تیمارداری کے واسطے جا رہی ہوں۔ اللہ خیر کرے، میں رات گئے آ جاؤں گی، لیکن نہ آؤں تو آپ پریشان نہ ہو جیے گا۔ یہ کہتے ہی وہ دیوانہ وار اٹھی اور تیزی کے ساتھ زینہ طے کر کے، مکان سے چلی گئی۔ اور میں زینے کا دروازہ بند کر کے، اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ دبے پاؤں ''ع۔خ'' آ گئی، پوچھا باجی کہاں گئی ہیں؟ میں نے سارا ماجرا بیان کر دیا اور اس کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھیں میری طرف اٹھائیں، اور کہا میں یہاں ناحق آئی، باجی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے پردہ شروع کر دوں، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، میں نے اس کو سینے سے لگا لیا، اور کہا تم ان کی سختی کی پرواہ نہ کرو، وہ میرے دل پر حکومت نہیں کر سکتیں، ان کی مجال نہیں کہ تمہاری محبت کو میرے دل سے نکال دیں۔ اس نے پوچھا آپ میرے ہیں؟ میں نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا تمہارا نہیں تو اور کس کا ہو سکتا ہوں، اس کے لبوں پر تبسم آ گیا اور میں نے اس کو آغوش میں لے لیا۔

صبح ہوتے ہی ''ج۔ب'' آ گئی، اس کے چہرے پر شب بیداری کے آثار تھے۔ میں نے پوچھا خیریت تو ہے۔ اس نے کہا خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری بہن کی جان بچ گئی، لیکن یہ تمہارا چہرہ کیسا ہو رہا ہے، کیا رات بھر جاگتے رہے ہو، میں نے کہا تمہاری مفارقت نے سونے نہیں دیا۔ جھپکیاں لے لے کر رات گزاری ہے، اور پھر اس خیال سے بھی پریشان رہا کہ تمہاری بہن پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا ''ع۔خ'' تو اس طرف نہیں آئی تھی، میں نے کہا تمہارے جاتے ہی میں نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا، کوئی نو بجے تمہارا ملازم کھانا لے کر آیا، بس اتنی دیر کے لئے دروازہ کھولا، کھانا کھایا نہیں گیا۔ تمہاری جدائی میں، در و دیوار سے رونے کی صدائیں آ رہی تھیں، دو چار لقمے بدقت نگل کر، نوکر کو رخصت کر دیا، اور بستر پر لیٹ کر، کروٹیں لینے لگا۔ اللہ نے صبح ہوتے ہی، تمہاری چاندی صورت دکھائی تو جان میں جان آئی۔

میری اس مکمل ایکٹنگ کا اس پر بڑا اثر پڑا، مجھے بڑھ کر سینے سے لگا لیا اور کہا آؤ ہم دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں، دو گھڑی پڑ کر سو جائیں۔

ہم دونوں کوئی دس بجے سو کر اٹھے، نہائے دھوئے، ناشتہ کیا اور نوکر سے اس نے کہا'' ع۔خ'' کے کمرے میں ناشتہ پہونچا آؤ۔

ان مراحل کے بعد اس نے کہا آج سر شام سمندر کے ساحل پر چلیں گے اور شام ہوتے ہی جب ہم روانہ ہونے لگے'' ع۔خ'' کالا برقعہ اوڑھے آئی اور کہا باجی، ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے، باجی یہ سن کر چند سیکنڈ کے واسطے خاموش ہو گئیں، اور پھر کہا اچھا، تم بھی چلی چلو۔

'' ج۔ب'' نے مجھ کو موٹر کے دروازے کے پاس بٹھایا، بیچ میں خود بیٹھی اور'' ع۔خ'' کو اپنے پہلو میں بٹھا دیا۔ اور ٹیکسی روانہ ہو گئی، ساحل کی طرف۔

'' ع۔خ'' نے'' ج۔ب'' کی آنکھ بچا کر اور اپنے ہاتھ کو اس کے پیچھے دراز کر کے، میرے ہاتھ میں ایک پرچہ دے دیا، جس کو میں نے جلدی سے شیروانی کی جیب میں رکھ لیا۔

'' ج۔ب'' سنک گئی، اس نے موٹر رکوا دی، مجھ سے کہا فٹ پاتھ پر آئیے اور وہاں پہنچ کر اس نے کہا— اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ مرد، مرغوں کی طرح، کئی کئی مرغیوں پر حکومت کریں، آپ صاف صاف بتا دیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا'' ع۔خ'' سے، میں نے کہا اللہ ری بدگمانی، پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، اس نے قلم اور کاغذ دیکر، مجھ سے کہا، یہ بات اس کاغذ پر لکھ دیجئے، میں نے با دل ناخواستہ وہ بات لکھ دی، اس نے کہا یہ پرچہ اپنے ہاتھ سے'' ع۔خ'' کو دے دیجئے۔ میرا ہاتھ کانپنے لگا، اس نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر'' ع۔خ'' کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے پرچہ پڑھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

اب ہم ساحل پر آ گئے، لہریں بجلی کی روشنی میں جگمگ جگمگ چمک رہی تھیں، مانسون کا زمانہ تھا، سمندر اچھل اچھل کر ہونک رہا تھا اور اس کے سیاہ بخارات پھنوں کی صورت میں پرواز کر رہے تھے۔

'' ع۔خ'' عین سمندر کے کنارے جا کر کھڑی ہو گئی، اس کے اس طرح ہٹ کر کھڑا ہو جانے سے میرے دل پر بڑی چوٹ لگی، مگر منہ سے اف تک نہیں کی۔

اتنے میں پاور ہاؤس کی کسی خرابی کی بنا پر روشنیاں گل ہو گئیں۔

'' ج۔ب'' نے مجھ سے کہا منظر بڑا بھیانک ہو چکا ہے۔ آیئے گھر چلیں۔ یہ کہتے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں طے کرنا شروع کر دیں، میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا،'' ع۔خ'' کہیں نظر نہیں آئی— میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دیوانہ وار اس کا نام لے لے کر، اسے پکارنے لگا۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، اتنے میں بجلی چمکی، اور مجھ بدبخت نے یہ دیکھا کہ وہ سمندر کی بپھری موجوں میں ہچکولے کھا رہی ہے۔

ہر چند مجھے تیرنا نہیں آتا، اور گہرے ٹب میں بھی ڈوب سکتا ہوں لیکن میں نے پرواہ نہیں کی اور جھم سے سمندر میں کود پڑا۔

سمندر کی موجیں ساحل کی طرف آ آ کر اسے میری طرف ڈھکیل رہی

تھیں میرا ایک ہاتھ ساحل کے چبوترے پر ٹکا ہوا، اور دوسرا ہاتھ اسے پکڑ لینے کے واسطے بڑھا ہوا تھا، کہ اتنے میں کسی اللہ کے بندے نے مجھ سے کہا یہ چھتری لیجئے اور اس کی موٹھ اس کے برقعے میں پھنسا کر اسے کھینچ لیجئے۔

اتنے میں سمندر کی موجیں زیادہ تیزی کے ساتھ میری طرف آنے لگیں، میں نے حواس درست رکھتے ہوئے، چھتری کے ہینڈل کو اس کے برقعے میں پھنسا کر، اسے کھینچنا شروع کر دیا، اور دل میں ارادہ کر لیا کہ اگر اسے اوپر نہ لا سکا تو چبوترے سے ہاتھ ہٹا کر خود کو سمندر کے حوالے کر دوں گا۔ لیکن قسمت نے میری مدد کی، میں نے اس کے برقعے سے الجھے ہینڈل کو زور سے کھینچنا شروع کر دیا اور جب وہ قریب آ گئی، تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی، اور ساحل کی سیڑھیوں کی طرف اسے کھینچنے لگا۔ اس نے چیخ مار کر کہا، مجھ کو اب زندگی کی طرف واپس نہ لے جاؤ، یہ کہکر وہ بے ہوش ہو گئی، اور میں اس کو کھینچ کر ساحل کی طرف لے آیا۔ اور چبوترے پر لٹا دیا۔ ہزاروں تماشائیوں نے مجھ کو حلقے میں لے لیا۔ ''ج۔ب'' نے کہا اب کیا کرو گے۔ میں نے کہا ہسپتال لے جاؤں گا۔

میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوڑ کر ٹیکسی لے آیا، لوگوں نے میری مدد کی اور پھر اسے ٹیکسی میں ڈال کر ایک یوروپین ہسپتال لے گیا۔ اور ایک ادھیڑ انگریز نرس کی سرکردگی میں تین چار ہندوستانی نرسیں اس کی تیمارداری میں سرگرم ہو گئیں۔

''ج۔ب'' اس کی پٹی کے پاس کھڑی ہو گئی اور میں پاگلوں کی طرح برآمدے میں ٹہلنے لگا اور اسپتال کا عملہ مجھ کو غور سے دیکھنے لگا — ایک جوان یوروپین نرس نے مجھ سے کہا آپ گھبرائیں نہیں، وہ جلد ہوش میں آ جائے گی۔ آپ اس کرسی پر بیٹھ جایئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہی مجھ کو چکر پہ چکر آنا شروع ہو گئے، وہ جوان نرس دوڑی ہوئی کمرے میں گئی اور دوا کا ایک گلاس دیکر کہا اسے فوراً پی لیجئے۔ میں نے دوا پی لی۔ سر کا چکر تھوڑی دیر میں کم ہو گیا۔

کوئی سوا گھنٹے کے بعد جب اسے ہوش آیا، تو اس کی نحیف آواز سنائی دی، ''جوش، جوش، جوش''۔

میں دیوانہ وار اس کی طرف دوڑ پڑا، اور اس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور آنکھوں کے کونوں سے آنسو ابلنے لگے۔

ادھیڑ نرس نے، اشارے سے کہا کہ میں اس کے ساتھ برآمدے میں چلا چلوں، برآمدے میں پہنچ کر اس نے انگریزی میں پوچھا آپ کا نام، میں نے بتایا جوش۔ اس نے کہا یہ جوان عورت جو کمرے میں کھڑی ہوئی ہیں، یہ اس مریضہ کی کون ہیں، میں نے کہا بڑی پرانی سہیلی، اس نے پوچھا آپ مریضہ کے قرابت دار ہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ پھر اس نے سوال کیا کہ آپ مریضہ کو کب سے جانتے ہیں؟ میں نے کہا دو تین مہینے سے، میں تو اس کمرے میں کھڑی ہوئی خاتون کا ملنے والا ہوں۔

پھر اس نے سوال کیا کہ اس پرانی سہیلی پر تو کوئی اثر نہیں تھا۔ آپ تو مریضہ کو فقط دو ماہ سے جانتے ہیں، آپ اس قدر بے تاب کیوں تھے؟ میں نے جواب دیا کہ میں شاعر ہوں، شاعروں کے دل نرم ہوا کرتے ہیں۔ پھر اس

نے دریافت کیا کہ مریضہ نے، ہوش میں آتے ہی اپنی پرانی سہیلی کے بدلے آپ ایک نئے آدمی کو کیوں پکارا؟ میں نے جواب دیا اس عظیم سانحے کے باعث اس کے حواس میں پراگندگی آگئی ہے۔

نرس نے میرے چہرے کو بغور دیکھا، اندر چلی گئی، اور فون کرنے لگی، میرا ماتھا ٹھنک گیا، ہو نہ ہو یہ پولس کو بلا رہی ہے اور اس کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ یہ عاشقانہ خودکشی کا واقعہ ہے۔

اس وقت مجھے وہ پرچہ یاد آگیا جو ''ع۔خ'' نے مجھے موٹر میں دیا تھا، اس لئے اسے دیکھنے کے لئے میں غسل خانے چلا گیا، پرچہ نکالا، وہ بھیگ کر خراب ہو چکا تھا صرف پہلی سطر پڑھ سکا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ میری زندگی باجی اور آپ کی بیوی کے واسطے ایک عذاب بن چکی ہے، اس لئے ......

اس کے آگے پڑھا نہیں گیا، میں نے پرچہ پھاڑ کر، نالی میں بہا دیا۔ اور سیدھا ''ع۔خ'' کے پاس جا کر کان میں کہا۔ پولس اگر بیان لینے آئے، تو میرے سر کی قسم تم یہ کہنا کہ میرا پاؤں پھسل گیا تھا اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہنا۔

اتنے میں پولس آگئی اور ایک سرجنٹ نے اس سے پوچھا آپ سمندر میں کیسے گر گئی تھیں، اس نے کہا پاؤں پھسل گیا تھا۔ سارجنٹ نے دریافت کیا آپ کو کسی نے دھکا دیدیا تھا، اس نے کہا نہیں، اس نے سوال کیا کیا آپ کے دل کو کسی نے دھکا دے دیا تھا، اس نے زبان سے تو کہا نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ تو کہئے خیر یہ ہوگئی کہ سارجنٹ اس کے سرہانے کے ڈسک پر کہنیاں ٹیکے اس کا بیان لے رہا تھا۔ وہ اس کے آنسو دیکھ نہیں سکا، ورنہ بڑی آفت آجاتی۔[1]

جب سارجنٹ بیان لے کر چلا گیا تو میرے پیٹ میں سانس آئی۔ نرس نے کہا چوں کہ یہ خاتون بیحد نازک اور کمزور ہے، میں رات بھر اس کو اسپتال میں رکھوں گی اور اس کی حالت قابل اطمینان ہوئی تو کل دوپہر تک چھٹی دے دوں گی، اب آپ جائیں اور صبح خبر لینے آئیں۔

''ج۔ب'' نے کہا جوش صاحب آیئے اب گھر چلیں۔ میں اس کے ساتھ دروازے تک گیا۔ اور اس سے کہا تم جاؤ، میں رات یہیں بسر کروں گا۔ اس نے کہا رہیے گا کہاں۔ میں نے کہا اسی لان پر، اس نے کہا سردی میں اکڑ جایئے گا، اور مینھ برسنے لگے گا تو؟ میں نے جواب دیا برآمدے میں چلا جاؤں گا، یہ سن کر اس نے بڑے طنز سے کہا اُفوہ، آپ تو بڑے جانباز عاشق نکلے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ اور وہ سخت بدمزہ ہو کر چلی گئی۔

اب میں غم خوردہ لان پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور پان کی ڈبیا نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ جیب کٹ چکی ہے، اور روپے کا بٹوہ غائب ہو چکا ہے۔ دھک سے ہو کر رہ گیا، خیال آیا کہ اب کیا ہوگا۔ صبح کو اسپتال کا بل کیوں کر ادا کر سکوں گا۔ سوچا کہ ''ج۔ب'' سے جا کر روپیہ لے آؤں، غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ اور پھر یہ بھی سوچا کہ وہ یہاں سے آٹھ دس میل دور رہتی ہے، ٹیکسی کا کرایہ کہاں سے لاؤں گا۔ اس سے کرایہ بھی دلواؤں، قرض بھی مانگوں، یہ میرے بس کا روگ نہیں۔

---

[1] پورا مکالمہ یاد نہیں رہا ہے۔

حسن اتفاق سے وہ نوجوان لیڈی ڈاکٹر، جس نے مجھے برآمدے کی کرسی پر بیٹھا کر، دوا پلائی تھی، برآمدے سے گزر کر جب کسی کمرے کی طرف مڑنے لگی، مجھ پر اس کی نظر پڑ گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور دبے پاؤں میرے پاس آکر پوچھا کیا آپ تمام رات اس لان پر گزار دیں گے۔ میں نے کہا جی ہاں، اس نے کہا آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ میں نے جواب دیا کہ میں جھیل لوں گا۔ اس نے کہا یہ نہیں ہوسکتا، آپ میرے کمرے میں چل کر آرام کریں — میں ساتھ ہولیا — اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر، اس نے جلدی جلدی، کھڑکیوں کے تمام پردے گرادیے، دروازہ بند کرلیا، بڑی مہربانی کے ساتھ مجھے صوفے پر بٹھایا، الماری کھولی، برانڈی اور بیئر کی بوتل نکالی۔ سامنے کی میز سے دو گلاس اور سوڈے کی بوتلیں اٹھا لائی، برانڈی میرے سامنے رکھ دی اور خود بیئر پینے لگی۔

جب ہم دونوں پی چکے، وہ کچے انڈے اور توست لے آئی، اور ایک گدے کی بید کی بنچ پر تکیے لگا کر مجھے لٹا دیا، کمرے کی لائٹ گل کردی۔ غسل خانے کا دھیما بلب جلا دیا، اور مسہری پر جا کر لیٹ گئی۔

میں نے لاکھ چاہا کہ سو جاؤں، مگر نیند نہیں آئی، کروٹوں پر کروٹیں بدلنے لگا، اور دیکھا کہ لیڈی ڈاکٹر بھی کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی ہے۔

ابھی میں اسی کرب کے عالم تھا کہ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی مسہری سے اٹھی، آہستہ آہستہ میری طرف آئی، اور جھک کر میرا منہ دیکھنے لگی، اور جب میں نے اس کی طرف آنکھیں اٹھائیں، اس نے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا۔ کیا نیند نہیں آرہی ہے؟ میں نے بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہا بالکل نہیں۔ اس نے میری کلائی پکڑ کر کہا چلیے میرے بستر پر وہاں نیند آجائے گی۔ میں اٹھا اور اس کی مسہری پر جا کر لیٹ گیا۔ اور اس نے اپنا ہاتھ تکیے کے طور پر میرے سر کے نیچے رکھ دیا۔ اور میری نیند اور بھی اچٹ گئی۔

صبح جاگتے ہی ہم دونوں نے تبسم کا تبادلہ کیا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا بل بتا دیجیے تاکہ میں اپنی قیام گاہ پر جا کر روپے لے آؤں۔ اس نے آنکھیں جھکا کر کہا بل میں ادا کردوں گی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ میرے پاس آتے جاتے رہیں گے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھ سے بغل گیر ہوگئی — اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا دوبارہ شکریہ ادا کیا، اور ہفتے کی شام کو ملنے کا وعدہ کرکے، میں اسپتال سے باہر آگیا، اور گیٹ پر کھڑے ہوکر سوچنے لگا کہ بل تو خیر ادا کردے گی۔ لیکن نرسوں وغیرہ کو انعام کہاں سے دوں گا، اور "ح۔خ" کو ٹیکسی پر لے جاؤں گا تو کیا "ج۔ب" سے کرایہ دلاؤں گا اور فرض کیجیے کہ یہ بھی ہوگیا تو میں اس عالم افلاس میں یہاں رہوں گا کیوں کر؟ پھر خیال آیا کہ تار دیکر گھر سے روپیہ منگا لوں، لیکن سوال یہ ہے کہ تار کیسے دوں؟

میرا سر چکرانے لگا، اور کبیر کا یہ دوہا یاد آگیا "اک دن آن پھنسو گے بچارے جیسے بن کا ہرنا"۔

اس ادھیڑ بن میں جب گھنٹہ سوا گھنٹہ گزر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ریاست دتیا کے دیوان، قاضی سر عزیز الدین صاحب موٹر سے گزر رہے ہیں۔ جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں، قاضی صاحب نے موٹر رکوائی، دوڑ کر میرے گلے مل

گئے، اور کہا ارے یہ دولت غیر مترقبہ اور مدراس میں۔ آپ کب آئے اور یہاں اس طرح اداس کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟

میں نے کہا اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے آپ کو اس وقت میرے پاس بھیج دیا، اگر آپ کے سے بے تکلف دوست کے بدلے کوئی اور آتا تو میں اس سے اپنا عالم کیوں کر بیان کر سکتا تھا۔

قاضی صاحب نے گھبرا کر کہا کہیئے بات کیا ہے۔ میں نے کہا جیب کٹ گئی ہے اور پورے تین ہزار غائب ہو چکے ہیں قاضی صاحب نے کہا، کوئی اپنی پوری پونجی بٹوے میں رکھ کر باہر نکلتا ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔ وہ مجھے اپنی قیام گاہ پر لے گئے اور پانچ ہزار کے نوٹ ایک پرس میں بھر کر میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے کہا میں گھر جا کر یہ رقم واپس کر دوں گا۔ انہوں نے میرا گریبان پکڑ کر کہا مجھ سے اور اس قدر غیریت کی باتیں۔ اب ناشتہ کر کے جایئے گا اور کل رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھایئے گا۔

میں غسل اور ناشتہ کر کے جانے لگا، انہوں نے کہا کہ آپ میری گاڑی پر جائیں، تا کہ میرا شوفر آپ کا گھر دیکھ لے، اور کل آپ کو لیکر یہاں آ جائے۔

میں ان کی موٹر پر اسپتال پہنچا "ع۔خ" کو بحال پایا، دل کی کلیاں کھل گئیں، اس نے پوچھا باجی ساتھ نہیں آئیں، میں نے کہا وہ تو رات ہی کو چلی گئی تھیں، اس نے پوچھا کہاں رہے میں نے کہا اسی اسپتال میں، اس کی آنکھوں میں کامیابی اور تشکر کے آنسو آ گئے۔

جب اسے لیکر "ج۔ب" کے وہاں پہونچا تو اس نے چھوٹتے ہی کہا، اگر تم ڈوب جاتیں تو ہم لوگ پولس میں کھنچے کھنچے پھرتے، میں نے سوچا اللہ اکبر، رقابت بھی بڑی بد بلا ہوتی ہے، اس نے یہ نہیں کہا اگر تم خدانخواستہ ڈوب جاتیں تو میرا دل شق ہو جاتا، یعنی اس کے نہ ڈوبنے کی اس کو صرف اس لئے خوشی ہوئی کہ وہ پولس میں کھنچے کھنچے پھرنے کے عذاب سے بچ گئی۔

اللہ رقابت کی ڈاہ سے بچائے۔

وہ دونوں سہیلیاں ابھی تک، خدا کے فضل و کرم سے بقید حیات ہیں ایک کلکتہ میں رہتی ہے ایک مدراس میں۔

میں جب ہندوستان جاتا ہوں تو فرض کر کے ان دونوں سے ملتا ہوں اور جب ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں ہماری ہر نظر سیکڑوں افسانے کہنے لگتی ہے۔ تمام مناظر اور واقعات ہمارے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں اور ہمارے مابین کے تمام رنگین مکالے گونجنے لگتے ہیں ہمارے کانوں میں۔

ابھی دو ڈھائی برس کی بات ہے کہ میں ہندوستان گیا اور "ع۔خ" کو تار دیکر دہلی بلا بھیجا تھا۔

مدت کے بعد جب ہماری آنکھیں چار ہوئیں، فریقین ڈوب گئے ماضی کے سمندر میں اور ایک دوسرے سے دیر تک بات نہ کر سکے۔

اس ملاقات سے متاثر ہو کر میں نے اسی زمانے جو چند رباعیاں کہی تھیں، آپ بھی انہیں سن لیں:۔

مدھم مدھم ہے، ضو فشانی اس کی	سونی سونی ہے راجدھانی اس کی
طالع ہو مرے دل کے افق پر اے موت	مائل بغروب ہے، جوانی اس کی

پہلے تو ہوا غروب میرا چہرہ
پھر یار قمر جبیں کا اترا چہرہ
شاید مرے چہرے کو منانے کیلئے
اس شوخ نے بھیجا ہے خود اپنا چہرہ

اک گونج سی تن بدن میں لہراتی ہے
اک تان سی زندگی پہ بل کھاتی ہے
پازیب اتارے انہیں جگ بیت چکا
جھنکار ہے لیکن کہ نہیں جاتی ہے

انجام کے آغاز کو دیکھا میں نے
ماضی کے ہر انداز کو دیکھا میں نے
کل نام ترا لیا، جو بوئے گل نے
تادیر اس آواز کو دیکھا میں نے

آنسو آنکھوں میں کس لئے ہیں، اے جان
جھوٹا ہے یہ آئینہ مری بات کو مان
میری آنکھوں میں دیکھ اپنا مکھڑا
تو کیوں ہے اداس اداس تیرے قربان

چہرے ہیں اداس اداس گم سم طرفین
اچھا ہے کہ اندھی ہی رہے بیت کی رین
لبوں ہی سے دیکھیں گے ہم اک دوسرے کو
آئے نہ چراغ اب ہمارے مابین

تیری زلفوں میں ہے کہانی میری
تیری پلکوں میں پرفشانی میری
یہ جو تری آنکھوں میں ہیں غلطاں ذرے
گزری تھی یہیں سے کل، جوانی میری

جوش کے معاشقوں پر وحید اختر کا تبصرہ

"یادوں کی برات" کا بدترین حصہ ان کی (جوش کی) حیات معاشقہ کی داستانوں پر مشتمل ہے۔ اگر یہ ضمیمہ نہ ہوتا تو کتاب پر لغویت کا وہ گمان نہ گزرتا جو کچھ اصحاب نظر کو ہوا۔ اس حصے میں جوش نے امرد پرستی سے آغاز کر کے ہر طرح کے ناقابل یقین واقعات کا ہالا اپنے اطراف یوں بُنا ہے کہ اس سے روشن ہونے کے بجائے ان کا چہرہ دھندلا جاتا ہے۔ السٹریٹڈ ویکلی میں خشونت سنگھ نے جوش کی ان داستانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے دلچسپ بات لکھی ہے کہ فرینک ہیرث (Frank Harris) نے اپنی خودنوشت "میری حیات اور معاشقے" میں عورتوں کو یاد رکھنے کے کئی سنسنی خیز واقعات لکھے ہیں۔ جب ان کی توثیق ان خواتین سے چاہی گئی جن کے عشق بے محابہ کا مصنف نے بیان کیا ہے تو پتہ چلا کہ مصنف آغاز شباب میں ہم کناری کے فن سے نابلد تھا اور ادھیڑ عمر میں مکمل طور پر نامرد ہو چکا تھا۔ خشونت سنگھ کا خیال ہے کہ جوش فرینک ہیرث سے کہیں بڑے فنکار ہیں اس لئے اس سے عظیم تر دروغ گو بھی ہوں گے۔ جوش کی لذت کوشی اور جسمانی تقاضے (جنہیں انہوں نے عشق کا نام دیا ہے) ان کے پورے آدمی ہونے کی دلیل یقیناً ہیں مگر ان داستانوں کے بطن میں جو نفسیاتی گرہیں Complexex کام کر رہی ہیں، وہ جنس کی طرف ان کے رویے کو پوری طرح صحتمند نہیں رہنے دیتیں۔ ان کے دادا کی جنسی قوت کے محیر العقول واقعات کے بیان کو بھی جوش کے شاعرانہ طرز بیان ہی کا کرشمہ سمجھنا چاہئے۔ ●●

بلراج ورما

"آج تک کی ہے کئی بار محبت میں نے"

(یہ کہانی نہیں میری آپ بیتی ہے)

ہر شخص کی پہلی محبوبہ اس کی ماں ہوتی ہے۔ اُس کے اس عشق کی ابتدا ماں کے گربھ میں وارد ہوتے ہی ہو جاتی ہے اور پورے ۹ مہینے اسی عشق کے سہارے وہ غریب ماں کے پیٹ کے چاروں اطراف ڈھکے چھپے کیندر میں پنپتا ہے۔ وہیں وہ ہلنا جلنا اور اپنی اولین شوخیاں جو اس کے ہونے کی دلیل و شناخت ہوتی ہیں، سیکھتا ہے۔ کھیل کود کا یہ محدود میدان اس کی ساری دنیا ہوتا ہے۔ اپنی اس محفوظ آماجگاہ سے وہ باہر کی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اسے یہ کھلی کشادہ اور روشن فضا ایک بڑی آفت کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ وہ کوئی زبان نہیں جانتا لہٰذا اس کا احتجاج ان چیخوں میں نمایاں ہوتا ہے جن کی آواز ماں کے لئے ایک آفاقی نغمہ ہوتی ہے تو باپ اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے لئے انبساط و مسرت کے گیت۔ اس کے رونے پر بھی اطمینان سے مسکراتے ہیں۔

دوران گربھ اور بچے کو اپنا بدن چاک کر کے دھرتی پر لانے کی ماں کی ساری تکالیف بچے کے جنم لیتے ہی دور ہو جاتی ہیں۔ اس سمندر منتھن کے نتیجے کے طور پر ابھرے وہ سارے جوہر اس کی چھاتیوں سے میٹھے شیر کے چشمے بن کر پھوٹتے ہیں۔ اس شیر میں اپنے خون کی شکر گھول کر وہ اپنے لختِ جگر کو پلاتی ہے۔ اپنے اس جوہر کو اپنے بچے کے بدن میں انڈیل کر اسے جس انوکھی مسرت کا آبھاس ہوتا ہے وہی اس کی زندگی کا پر مسرت تجربہ ہوتا ہے۔ اور وہ جان لیتی ہے کہ اس کی عورت کی یونی دھنیہ ہوگئی ہے اور اس نے اپنا سب سے بڑا دھرم نبھا دیا ہے۔ بچہ جب تک خود سے چلنا پھرنا، کھیلنا کودنا اور کھانا پینا نہیں سیکھ لیتا، ماں ہی اس کی ساری کائنات ہوتی ہے۔ اس دوران بچہ اپنے باپ، دادا دادی، نانا نانی اور دوسرے دنیاوی رشتوں کو کچھ کچھ سمجھنے اور پہچاننے تو لگتا ہے مگر ماں کی گود سے محفوظ جگہ اور اس کی چھاتیوں سے ابلتے ہوئے امرت کی مٹھاس کے برابر کسی کو نہیں سمجھتا۔ ماں بیٹے کا رشتہ دنیا کا سب سے بڑا اور اہم رشتہ ہے۔ آگے چل کر یہ رشتہ اکثر یکطرفہ ہو جاتا ہے۔ بیٹے کے لئے ماں کے جذبات میں بھی کبھی کبھی فرق آجاتا ہے مگر یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے جبکہ نئے مشاغل اور نئی انوکھی مسرتوں کی کھوج میں بیٹا اکثر بھٹک جاتا ہے۔ ماں کو بھول جاتا ہے۔ بھول جاتا ہے کہ وہ بھی ایک ابودھ بے سہارا بچہ تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ماں کی محبت کے محفوظ دائرے سے باہر نکلنے کے بعد مجھے جس شخصیت نے سب سے بھرمانا شروع کیا تھا، وہ کملا تھی۔ ہمارے پڑوس کی ایک لڑکی، جو مجھے ماں ہی کی طرح خوبصورت، مہربان اور

پیار کرنے والی لگتی تھی۔ میں بمشکل سات آٹھ سال کا رہا ہوں گا مگر کملا چودہ
پندرہ سال سے کم کی نہ تھی۔ وہ بڑی شوخ، نڈر اور زندہ دل لڑکی تھی۔ لوگ اس
کے بیاہ کی بات کرتے تو وہ مجھے اپنی گود میں بھر لیتی اور بلند آواز سے اعلان کر
دیتی کہ اس نے اپنا دُلہا چن لیا ہے۔ وہ میرے گھر آتی تو ماں مسکرا کر کہتی۔
''لے چھوڑ میری جان۔ تیری دلہن آگئی ہے''۔

اسی طرح جب کبھی میں اس کے نسبتاً بڑے گھر کے وسیع و عریض آنگن
میں کھیلنے جاتا تو اس کے گھر والے بھی میری ماں ہی کی طرح چہک کر کہتے ''لے
ری کملا تیرا دُلہا آگیا ہے۔ اب چھوڑ ہماری جان اور کھیل اپنے کھلنڈرے
کھلونے کے ساتھ''۔

مجھ سے پوچھتے۔ کمو تیری کیا لگتی ہے رے؟

میں جواب دیتا۔ ''دلہن''۔ مجھے وہ سب آج بھی خوب اچھی طرح
یاد ہے۔

جب اس سے کوئی پوچھتا۔ ''یہ تیرا کون ہوتا ہے ری''۔

تو وہ کھل کر جواب دیتی ''سب کچھ۔ میرا کنہیا۔ میرا دُلہا''۔

کمو کے الفاظ کا ذخیرہ زیادہ تھا لہٰذا وہ ہمارے اس معصوم گھاؤ کو
کتنے ہی نئے نئے نام دینا جانتی تھی۔ اور دیتی بھی رہتی تھی۔

ہم پڑوسی تھے مگر ہمارے گھروں میں کچھ ایسی پٹتی تھی کہ ہم قریبی رشتہ
داروں کی طرح مانتے تھے۔ ایک دوسرے کو بتایا جاتا ہے کہ بچپن میں میرے
جیسا خوبصورت لڑکا اس پڑوس میں دوسرا کوئی نہ تھا۔ کمو تو پریوں کی شہزادی
تھی۔ ایک اور نام جو مجھے کافی کچھ جان لینے کے بعد سوجھا وہ تھا اپسرا۔ اندر دیو
کے دربار کی اپسرا جیسے مینکا تھی۔ مینکا جس کے لافانی حسن پر راج رشی وشوامتر
نے اپنے یگوں کی تپسیا نچھاور کردی تھی۔

ایک بار میں نے اس کی چھاتیوں کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پوچھا۔

تیرے ان کٹوروں میں دودھ ہے کیا؟

کملا نہ لجائی، نہ شرمائی، ٹھنک کر بولی۔ عورت کی چھاتیوں میں دودھ
مرد بھرتے ہیں۔ جب تم مرد بن جاؤ گے اور میں عورت تو ہم بیاہ کرلیں گے اور
پھر تم میری چھاتیوں میں دودھ بھرنا اور میں تمہیں تمہارے ہی جیسا ایک
خوبصورت بچہ پیش کروں گی جو اس دودھ کو پیے گا۔

مجھے نہیں پینے دو گی۔

مرد اپنی عورت کا دودھ نہیں پیتے۔ وہ اس کی چھاتیوں سے صرف
کھیلتے ہیں۔ اسی کھیل میں مرد اور عورت کا پیار پنپتا ہے۔ اسی کھیل سے دنیا چلتی
ہے۔ یہ زندگی کا کھیل ہے مگر تم ابھی نہیں سمجھو گے۔ ابھی تم میرے ساتھ کھیلو اور
مجھے وہ سب کرنے دو جس کا مزہ صرف میں لے سکتی ہوں۔ تمہیں صرف گدگدی
ہوگی۔ یہ گدگدی بھی بڑی مزے دار ہوتی ہے اور وہ میرے ہونٹ چومنے لگتی
اور کبھی کبھی وہ مجھے ایک منجھی ہوئی تجربہ کار استانی کی طرح سبق سکھایا پڑھایا
کرتی تھی۔ یہ کھیل ہم چوری چھپے کھیلتے تھے۔ میں کمسن تھا مگر مجھے اتنا علم ضرور ہو
گیا تھا کہ یہ کھیل کھلے میں نہیں، اسی طرح دوسروں سے چھپ کر اور ایسی جگہوں
پر کھیلنا چاہئے جہاں کوئی آئے نہ دیکھے۔

ہمارا یہ کھیل بہت دیر نہیں چلا۔ کملا نے جیسے ہی میٹرک پاس کیا اس کی شادی ہو گئی۔ وہ سسرال جاتے ہوئے بہت روئی۔ میکے کو چھوڑنے کے غم میں سبھی لڑکیاں روتی ہیں مگر میں، نجانے کیسے اور کس بنا پر جانتا تھا کہ اس کے ان آنسوؤں کے پیچھے جو درد و رنج و غم تھا اس میں ہماری جدائی اور ہمارا ابودھ پیار بھی تھا جسے تب کوئی مناسب نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ میں بڑا ہوتا گیا مگر ساتھ ساتھ ان دنوں کی وہ بے نام یادیں بھی بڑی اور اہم ہوتی گئیں۔

کمو کا شوہر ایک فوجی تھا۔ دیکھنے بھالنے میں ایک مضبوط اور بھرپور مرد۔ وہ اسے ایک دن کے لئے بھی نہ چھوڑتا تھا۔ وہ جب بھی میکے آتی وہ بھی ساتھ آتا اور اِدھر بھی ہر پل ہر دم بیوی کے ساتھ چپٹا رہتا۔ ظاہر تھا کہ کملا اپنی ازدواجی زندگی سے پوری طرح مطمئن تھی۔ اور ہمیشہ خوش و خرم رہتی تھی۔

اس کا جب من ہوتا وہ مجھے سب کے سامنے بلا جھجک چومنے لگتی۔ اس کا شوہر بھی اکثر مجھے اپنی گود میں بھر لیتا۔ اور چوم چوم کر بے حال کر دیتا۔ مجھے اب نہ کمو سے چوما جانا بھاتا تھا نہ اس کے شوہر سے۔ مگر میں کبھی کوئی احتجاج نہ کرتا تھا۔ اب میں کافی چنٹ اور ہوشیار ہو گیا تھا اور کافی کچھ سمجھنے بھی لگ گیا تھا۔

جب وہ پہلی بار گربھوتی ہوئی تو رواج کے مطابق جاپے کے لئے میکے آ گئی۔ اب کی بار وہ کوئی دو سال اُدھر ہی رہی۔ ایک تو بچے اور زچہ کی مناسب دیکھ ریکھ کے مدِ نظر اور دوسرے اپنے شوہر کے کسی لمبے ٹریننگ کورس پر چلے جانے کی وجہ سے۔

کملا کی آنکھیں نیلے پانیوں کی دو ایسی صاف شفاف جھیلیں تھیں جن میں ہر کوئی ڈوب ڈوب جانا چاہتا تھا۔ اس کا بچہ بھی ایک فرشتہ تھا۔ ماں ہی کی طرح نیلی آنکھوں والا حسین و جمیل کھلونا، جسے اٹھائے اٹھائے پھرنا میرا معمول ہو گیا تھا۔ اب میں بھی ایک چھوٹا موٹا مرد تھا۔ سولہ برس کا غیر معمولی طور پر گٹھے جسم والا ایک بھرپور نوجوان جو بدن کے بھیدوں سے کافی حد تک واقف ہو چکا تھا۔ اس دوران کملا کے دونوں بڑے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ اپنی اپنی بیویوں کو لے کر اپنی اپنی نوکریوں پر چلے گئے تھے۔ بڑا بھائی تو بہت دور بنگالے کے کسی بڑے قصبے میں جا بسا تھا مگر چھوٹا تحصیلدار ہو کر ہماری ہی تحصیل میں تعینات ہو گیا تھا۔ کملا کے ماں باپ اپنے بہو بیٹے اور پوتے کو اکثر دیکھنے جاتے تھے۔ وہ صبح سویرے نور کے تڑکے ہی تیار ہونے لگتے اور پو پھٹنے کے ساتھ ہی گھر کی بیل گاڑی سے چل دیتے تاکہ رات ہوتے ہوتے لوٹ سکیں۔ ایسے موقعوں پر کملا کی دیکھ ریکھ کی ساری ذمہ داری ہم لوگوں پر رہتی۔ اس کا بچہ اتنا پیارا تھا کہ محلے کی لڑکیاں اس کے ارد گرد گھومتی رہتیں اور جسے جب موقع ملتا اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ وہ بھی ہر کسی کے پاس چلا جاتا تھا۔ میرے پاس تو وہ ایسے آ جاتا جیسے میرا اس کا جنم جنمانتر کا رشتہ ہو۔ بچے کو پیار ملے تو وہ اپنے محسن کے بدن کی مہک سے ایکدم مانوس ہو جاتا ہے۔ پیار کو پہچاننے کی جو صلاحیت خدا نے بچوں کو دے رکھی ہے وہ بڑوں کا مقدر نہیں ہوتی۔

کملا اپنے بچے کو اپنا پلا کہہ کر بلاتی تھی۔ پلا جو کتے کا تخم ہوتا ہے اور جسے آدمی کے پیار کی پہچان اور پرکھ ہر جاندار سے زیادہ ہوتی ہے۔

اکتوبر کا مہینہ تھا۔ درختوں سے پتے جھڑنے لگے تھے۔ پھولوں کی
بیلیں سوکھنے لگی تھیں۔ مگر پھلدار درختوں پر بہار آ گئی تھی۔ گلیاں، سڑکیں اور
کھیت کھلیان جھڑے ہوئے پتوں سے اٹے پڑے تھے۔ ہوا ایک عجیب قسم کی
خنک اور من موہنی مہک سے شرابور تھی۔ اس بار کملا کے ماتا پتا تین چار روز کے
ساتھ گزارنے کا پروگرام بنا کر گئے تھے۔ پوتے کے منڈن میں ان کی شرکت
ضروری تھی۔ یہ جشن کھاتے پیتے ہندو گھرانوں میں بڑے چاؤ اور اہتمام سے
منایا جاتا ہے۔ مناسب تو یہی تھا کہ یہ فنکشن اپنے پرکھوں کی حویلی یعنی گاؤں ہی
میں مناتے مگر ان کی بہو بہت ہوشیار عورت تھی اور جانتی تھی کہ اس کا شوہر چونکہ
علاقے کا حاکم تھا۔ منتوں کی دعوت پر جتنا خرچ اٹھے گا آمدنی اس سے کئی گنا
زیادہ ہو گی۔ کملا کا جانا بھی بنتا تھا۔ مگر وہ بیماری کا بہانہ بنا کر رک گئی تھی۔ اس
کی ماں نے بھی زور نہ دیا تھا کیونکہ نند اور بھابھی کی آپس میں ذرا بھی نہ بنتی تھی
اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسے مبارک موقع پر کسی قسم کا ناواجب تناؤ پیدا ہو۔
شادی ہو جائے تو عورت کو اپنی مان مریادہ کا بھرم کھانے لگتا ہے۔ اس کے
بھائی کو اسے کئی روز پہلے لے جانا چاہئے تھا مگر اس نے رسمی طور پر بھی اسے آنے
کے لئے نہ کہا تھا۔ اس کے والدین کو بیٹے کی یہ بے رخی اچھی نہ لگی تھی۔ ماں نے
تو اسے بیٹے کی لاپرواہی کا نام دیا تھا۔ مگر باپ جو صورتحال سے آگاہ تھا جانتا تھا
کہ تحصیلدار صاحب بھلے ہی اوروں پر حکم چلانا سیکھ گئے ہوں گھر کی عورت سے
خوف کھاتے تھے کیونکہ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی اور اسی وجہ سے بیجا طور پر بد
زبان و بد اخلاق بھی تھی۔ ایسے موقعے پر کسی قسم کی بدمزگی پیدا نہ ہو اسی کو مدنظر
رکھتے ہوئے وہ بیٹی کو پیچھے چھوڑنے پر راضی ہو گئے تھے۔ کملا تو اس طرح اکیلے
رہنے کی عادی تھی ہی۔ علاوہ ازیں ہم لوگ بھی تو تھے۔ طے پایا تھا کہ میں کملا کی
حویلی میں سو جایا کروں گا اور وہ اپنے بچے سمیت ہمارے گھر راتیں کاٹ لے
گی۔ چند روز ہی کی تو بات تھی۔ اس قسم کا انتظام ہمارے دونوں پریواروں کے
لئے کوئی نیا نہ تھا۔

پہلا دن اور رات تو اسی طرح بیت گئے۔ دوسرے دن اس کا بچہ اور
میں حویلی میں سو گئے اور وہ ہمارے ادھر ماں کے پاس رہ گئی۔ تیسرے دن جب
تحصیل میں اس کے بھانجے کے منڈن کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ کملا نے طے کیا کہ
وہ بھی اپنے بھانجے کا شگن کرے گی۔ اس نے رسم کے مطابق پڑوسیوں کو خاصی
پر تکلف دعوت دے ڈالی اور پانچ پنڈتوں کو بھی پورے تپاک سے بھوجن کرایا۔
لڑکیاں، عورتیں اور برادری کے دوسرے لوگ سارا دن گاتے بجاتے رہے۔
لڑکیوں نے وہ دھما چوکڑی مچائی جو شاید تحصیلدار صاحب کے ہاں بھی نہ مچی
ہو گی۔ ناچ گانے کی ان تقاریب میں میں نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا
تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے نہیں خود اپنے بچے کے منڈنوں کا تہوار منا
رہی ہو۔

شام ہوتے ہوتے تھک ہار کر میں وہیں کونے میں رکھی ایک چارپائی
پر لڑھک گیا۔ کملا نے اپنا بچہ بھی میرے ساتھ لٹا دیا۔ کسی نے ہم دونوں کو جگانا
مناسب نہ سمجھا کیونکہ میرے اس طرح سو جانے میں کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔
پھر جو ہوا۔ کیسے ہوا۔ کیوں ہوا۔ اسے الفاظ میں پوری طرح بیان

کرنا مشکل ہے۔ ضروری بھی نہیں۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں نے کملا کو اپنے ماتھے پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے اور بالوں کو اپنی مخروطی انگلیوں سے سہلاتے سنوارتے محسوس کیا۔ میری نیند ٹوٹ گئی تھی مگر جاگ کر میں پیار کے اس لمس سے محروم نہ ہونا چاہتا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے ہوئے بھی اس انوکھے منظر کو دیکھ سکتا تھا۔ اس بے پناہ لذت کی یاد کبھی کبھی اس بڑھاپے میں بھی میرے اندر مخصوص قسم کی ایک شوخ گدگدی پیدا کر دیتی ہے۔

بالآخر اس کھیل میں وہ مقام آ ہی گیا جس کا مجھے اور غالباً اسے بھی دنوں سے انتظار تھا۔ ہم صرف ایک دوسرے کی دل کی دھڑکنیں سن رہے تھے۔ ایسے میں کوئی بھی اپنا توازن کھو سکتا تھا۔ میں کیا تھا ایک کچا کنوارہ، ناتجربہ کار، سولہ برس کا چھوکرا۔ ایسی حالت میں بھی میرا شعور کسی حد تک زندہ تھا اور ذہن پورے طور پر سوجھ بوجھ سے عاری نہ ہوا تھا۔ ضمیر کہہ رہا تھا: ''یہ مناسب نہیں۔ وہ بیاہتا ہے۔ ایک بچے کی ماں ہے اور اس کے والدین ہم لوگوں پر بھروسہ کر کے اسے ہماری حفاظت میں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ لڑکھڑا گئی ہے اور جوانی کے الھڑپن میں مدہوش ہے تو کیا۔ تُو تو حواس باختہ نہیں تجھے تو محتاط رہنا چاہئے۔ یہ تیری تعلیم و تربیت، تیرے خاندان کے نام و ناموس کے نہیں، تہذیب و تمدن کے تقاضوں کے بھی خلاف ہے''۔

پھر ایک آواز آئی ''مگر بدن کا تقاضا۔ بدن کا بھی اپنا ایک دھرم ہے۔ تُو مرد ہے تُو اس کے پاس نہیں گیا وہ تیرے پاس آئی ہے''۔

میرا ماتھا اس خنک موسم میں بھی پسینے سے شرابور تھا۔ گلاب کی پتیوں سے بنا کملا کا بدن مجھے شبنم کی بوند کی طرح تازہ اور سچے سونے کی طرح پاکیزہ لگا۔ وہ ایک بیوی، ایک ماں ہے، یہ میں بھول گیا۔ اس کے بدن کی مہک میں جو نشہ تھا میں اس سے پہلے کبھی دوچار نہ ہوا تھا۔ میرے لئے یہ مہک کنواری تھی۔ پوتر تھی اور ایک ایسی سمت سے آ رہی تھی جس سے میں ناآشنا تھا۔ یہ مہک، یہ باس، میرا سارا وجود جھنجھوڑے جا رہی تھی۔ مجھے لگا میری ہم بستر کوئی عورت نہیں۔ پیار کی وہ امر بیل ہے جس نے اپنی پوری طاقت سے جکڑ کر باندھ لیا ہے۔ اس کے بازو اپنی ملائمیت کے باوجود کسی مشاق ماہی گیر کے جال کی طرح تھے۔ رات کے اس اندھیرے میں بھی اس کا پرکشش سراپا، اس کا بے پناہ حسن ایک ایسا چمکتا دمکتا نور تھا جس کو صرف من کی آنکھوں سے دیکھا پرکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ جس کو بیان کرنے کی کوشش کرنا بھی گستاخی ہے۔ حسن الفاظ کی گرفت میں کہاں آتا ہے۔ شعور کی گرفت میں کہاں آتا ہے۔ میرے ایمان کی لگامیں میرے ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور میں کافر ہو گیا۔

میرے دل میں اب صرف ڈر، یعنی رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا خوف تھا۔ باقی سارے جذبات کُند ہو چکے تھے۔ آرزوؤں کا ایک ہجوم تھا جو اپنے نرم و لطیف آہنگ سے مجھے ہوا میں اڑائے لئے جا رہا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ چھوٹے چھوٹے لطیف جھونکے پہلے بگولے بنے پھر بڑے طوفان کی صورت اختیار کر گئے۔ اب میرے منہ سے جو سہما ہوا جملہ ایک مہین چیخ کی طرح نکلا وہ تھا ''سب ٹھیک ہے نہ؟''

جواب ملا ''سب ٹھیک ہے، سب سو رہے ہیں، اور حویلی کے کواڑ بھی

بند ہیں''۔

''اور یہ کمرہ''۔

''اس کا دروازہ بھی میں نے بند کر دیا ہے''۔ اس کی آواز میں جو ٹھہراؤ تھا اس میں خوف کا ذرا سا عنصر بھی نہ تھا۔

میری زبان پر اس کے معصوم بچے کا نام آتے آتے رک گیا۔ ظاہر تھا کہ میں اب بھی سوچ سکتا تھا۔ میں نے اس ننھے فرشتے کو وہیں سونے دیا اور قریب ہی لگے دوسرے پلنگ پر کملا کو اٹھا کر لٹا دیا۔ دیئے کی مدھم روشنی میں میں نے کملا کے اور اس کی آنکھوں میں جھلکتی التجا اور دانتوں میں دبے نچلے ہونٹ کی انکساری دیکھی تو جھوم اٹھا۔

اس رات میں نے اس عورت کو مرد کے پیار کی دھارا میں اتنا نہلایا کہ وہ نہال ہو گئی۔ میرے بدن پر غنودگی طاری ہوتے دیکھ کر وہ مسکرا دی اور پلنگ پر سے بڑی ہی پُر لطف ادا سے اتری۔ میں نے اسے دوبارہ دبوچنے کی کوشش کی تو چہک کر بولی۔ ''ذرا تو رکو، ساری رات اپنی ہے۔ میں ابھی آتی ہوں''۔

کچھ دیر بعد جب وہ الائچی اور پسے باداموں والا گرما گرم دودھ لے کر آئی تو میں تقریباً مدہوش تھا۔ میرا ذہن البتہ اب بالکل صاف تھا۔ ہمارے درمیان جو جھجک کی دیوار تھی ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ سات آٹھ سال کا وہ فرق جس کی بدولت وہ عورت تھی اور میں جوانی کی اولین منازل طے کرتا ہوا ایک ناتجربہ کار اور الھڑ چھوکرا اب مٹ گیا تھا اور مجھے وہ اپنے سے کہیں چھوٹی لگ رہی تھی۔

''تم نے مجھے جس خوبصورت تجربے سے آج روشناس کرایا ہے وہ میرے تحت الشعور میں تو شاید کہیں خمار رہا تھا مگر اس انکاؤنٹر سے پہلے مجھے اس کی عظمت کا اندازہ قطعی نہ تھا''۔

وہ مسکرا دی۔ ''کیسا لگ رہا ہے''۔

''تم ایک کنواری کنیا ہو اور میں ایک ایسا مرد جس نے تمہاری آبرو ہلاک کر دی تھی''۔

وہ کھلکھلا کر میرے سینے سے چمٹ گئی تھی۔

دودھ ہم دونوں نے باری باری پیا۔ اس کے اصرار پر پہلے میں نے، پھر اس نے اپنے بچے کی موجودگی سے بے نیاز وہ میرے ساتھ رات بھر ایسے لپٹی رہی جیسے میری بیاہتا ہو اور یہ ہمارا روزمرہ ہو، جب ہم آدم و حوا کے اس ازلی ابدی اور سرمدی کھیل سے تھک گئے تو اس نے نجانے کس جذبے کے تحت دیا بجھا دیا۔ ہمارے بدنوں کو اندھیرے کی چادر نے ڈھک دیا تو ہم مدہوش ہو کر سو گئے۔

دوسری صبح کوئی آٹھ بجے کے قریب مجھے ماں نے جگایا تو میں نے دیکھا کہ میں اسی چارپائی پر لیٹا پڑا ہوں۔

''تو ماں بیٹے کی حفاظت کر رہا ہے یا لمبی تان کر کل کی تھکن اتار رہا ہے''۔

کملا بیٹے کو اٹھائے سامنے کھڑی کچھ ایسی لاپرواہی سے مسکرا رہی تھی

جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی اس بے نیازی اور چہرے پر رقصاں تمکنت نے میرا حوصلہ بھی لوٹا دیا اور میں بھی ماں سے آنکھیں دوچار کرتے ہوئے اسی معصومیت سے مسکرا سکا جس کی وہ عادی تھی۔

دوسرے دن کملا کے والدین لوٹ آئے۔ وہ اپنے پوتے کے منڈن۔ تحصیلدار صاحب کی پر تکلف دعوت اور اس تقریب کے سلسلے میں آئے تحفوں کی فہرست سے اتنے مرعوب تھے کہ انہوں نے ہم سے یا بیٹی سے ایکبار بھی اپنی غیر حاضری میں گزرے اوقات کا بکھان نہ مانگا۔ کملا کے بھائی نے ۱۰۱ روپے، ایک قیمتی ساڑھی، ایک سونے کی زنجیر اور اس کے بیٹے کے لئے ایک نہایت عمدہ بابا سوٹ بھجوایا تھا۔

دو ہفتے بعد کملا کا شوہر جواب لیفٹیننٹ بن چکا تھا۔ بیوی بچے کو اپنی نئی پوسٹنگ پر لے گیا۔

پیار کا جذبہ تکمیل کو جالے تو یہ اپنی حرارت اکثر کھو بیٹھتا ہے مگر اس کی دھیمی دھیمی آنچ ایک من موہنی یاد بن کر زندگی میں کچھ ایسے پھول کھلا جاتی ہے جس کی مہک سے آدمی برسوں محظوظ ہوتا رہتا ہے۔ کملا کے چلے جانے کے بعد اس ایک رات کی رومانی یادوں نے کئی بار دھڑکنیں پیدا کیں۔ بدن میں خون کی حرکت بھی کئی بار تیز ہوئی۔ بیٹھے بیٹھے سانسیں بھی کئی بار پھولیں اور دل بھی کتنی ہی بار کھوکھلا سا لگا۔ مگر زندگی ایک جگہ جم کر کب بیٹھی ہے اور کونسا ایسا جذبہ ہے جس کی شدت ہمیشہ برقرار رہے۔

کملا نے مجھے کبھی کوئی خط نہ لکھا۔ اس کے میکے میں جب تب جو خطوط آتے تھے ان میں میرا ذکر بھی نہ ہوتا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھے بھلا دینا چاہتی تھی۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی تھی۔

اُپلوں کی آگ راکھ بن جاتی ہے تو بھی کچھ حرارت، کچھ چنگاریاں اس میں دبی سلگتی رہتی ہیں۔

انہیں دنوں خبر ملی کہ پشپا پوسٹ گریجوایشن کرنے شانتی نکیتن جا رہی ہے۔ پشپا میرے ننھیال یعنی راولپنڈی کے سب سے بڑے جوہری کی اکلوتی بیٹی تھی۔ راجہ کی بیٹی کا جو درجہ اپنے ہم عمر مگر نسبتاً چھوٹی حیثیت والے ساتھیوں میں ہوتا ہے ہمارے مابین اس کا وہی درجہ تھا۔ ہمارے بچپن کا زمانہ تھا۔ ان دنوں میں اپنے مرحوم نانا کے گھر رہتا تھا۔ میرے نانا اور اس کے بابو جی چونکہ خاصے اچھے دوست رہے تھے اس لئے میں بھی ان چند بچوں میں شامل تھا جن کو پشپا کے ساتھ کھیلنے کی اجازت تھی۔ تب میں بمشکل پانچ چھ سال کا تھا۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سال کی رہی ہوگی۔ مگر ہم دونوں میں خوب پٹتی تھی۔ وہ میرے لئے طرح طرح کے کھاجے بچا کر رکھتی تھی اور ہم جب ملتے وہ میری جیبیں بڑھیا کوالیٹی کے پستوں، اخروٹوں، باداموں چلغوزوں وغیرہ سے بھر دیتی تھی۔ ڈرائی فروٹ جتنے میں نے ان دنوں کھائے بعد میں کبھی نصیب نہ ہوئے۔ ہم بچے لوگ جب بھی اس کی وسیع وعریض حویلی میں جمع ہوتے ایک ہی کھیل کھیلتے۔ آنکھ مچولی کا کھیل جو بچوں کو بہت بھاتا ہے۔

وہ چنڈی سے کلکتہ جاتے ہوئے چند روز لاہور میں رکنا چاہتی تھی۔ کیونکہ آج ہی کی طرح ان دنوں بھی لاہور شمال مغرب کا سب سے عمدہ اور

دلفریب شہر تھا۔ مجھے ہدایت ہوئی تھی کہ اسے اسٹیشن پر ریسیو کروں اور وہ جو جو دیکھنا اور جہاں جہاں جانا چاہے لے جاؤں بھلے ہی یہ کام مجھے چھٹی لے کر کرنا پڑے۔

پشپا کو لینے میں لاہور اسٹیشن پر گاڑی کے آنے سے گھنٹہ بھر پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر انتظار کا وہ گھنٹہ بچپن کی کتنی ہی چھوٹی موٹی معصوم یادوں کی تصویریں میرے دل و دماغ کے اسکرین پر پھیلاتا سمٹاتا جارہا تھا۔ کوئی میری آنکھوں کی چمک اور زیر لب مسکراہٹوں کو بنتے مٹتے دیکھتا تو ایکدم سمجھ جاتا کہ میں جاگتے بھی سپنوں کی دنیا میں کھویا ہوا ہوں۔

چھوٹی چھوٹی یادوں کی یلغاریں میرے اندر کچھ اس طرح رقصاں اور نغمہ سرا تھیں گویا زندگی میں پہلی باران کے روبرو ہوا ہوں۔

پشپا کا گھر اتنا بڑا، اونچا، کھلا کھلا اور کچھ ایسے ڈھنگ سے بنا تھا کہ قرب وجوار کے ہم بچوں کے لئے اس کی نوعیت بھول بھلیوں جیسی تھی اور وہاں ہمیں صرف ایک ہی کھیل سوجھتا تھا، لکن چھپن کا کھیل یعنی آنکھ مچولی۔ گھر کے اوپر کی سپاٹ چھت پر ایک بہت بڑا تنور تھا جسے صرف بڑی پارٹیوں کے دن استعمال کیا جاتا تھا۔ عام طور پر وہ خالی ہی رہتا تھا۔ میں اور پشپا اکثر اسی تنور میں چھپ جاتے۔ اس میں سمانے کے لئے ہمیں مجبوراً ایک دوسرے سے سٹ کر بلکہ بغلگیر ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ چھپنے کی اس جگہ کا علم کسی دوسرے بچے کو نہ تھا لہٰذا ہم کبھی بھی پکڑے نہ جاتے۔

ایک بار نجانے کس جذبہ سے مغلوب ہو کر میں نے پشپا کا منہ چوم لیا۔ پھر ایکدم ڈر گیا کہ وہ ناراض ہو کر مجھے پیٹ دے گی۔ وہ دوسرے بچوں کو اکثر پیٹ دیا کرتی تھی۔ چھوٹوں کو ہی نہیں۔ اپنے سے سال دو سال بڑے بچوں کو بھی۔ وہ راجکماری تھی۔ وہ تو ہم سب کو پیٹ سکتی تھی مگر ہم بھولے میں بھی اُسے ہاتھ لگاتے بھی ڈرتے تھے مبادا وہ ہمارا اپنے گھر آنا جانا ہی بند کرا دے۔

''ویری گڈ''۔ وہ ایک انگریزی اسکول میں پڑھتی تھی۔ لہٰذا اکثر حکم نامے انگریزی میں ہی صادر کیا کرتی ہے۔

ویری گڈ کا مطلب تھا بہت اچھا یعنی پھر چومو۔

میں نے حکم کی تعمیل کی اور اسے پھر چوم لیا۔

بڑا اچھا لگتا ہے۔ تم مجھے اسی طرح چوما کرو۔ ہمیشہ۔ ہر روز۔

تم بھی تو مجھے چومو۔

میں نے چوما تو تمہارے ہونٹوں سے خون نکل آئے گا کیونکہ میرے دانت بہت تیز ہیں اور تمہارے ہونٹ پکے سیبوں کی طرح لال، میٹھے اور گلاب کی پتیوں کی طرح کومل ہیں۔

تو پھر میں ہی چوم لیتا ہوں۔

یہی ٹھیک ہے۔ تم مرد ہو، میں عورت ہوں۔ چومنا مرد کا کام ہے عورت کا نہیں۔

میں مسکرا دیا تو وہ خفا ہو کر بولی۔ 'ارے تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں'۔

تم تو ایک لڑکی ہو، میرے سے ذرا بڑی تو ہو مگر ہو تو لڑکی ہی۔

عورت تو بہت بڑی ہوتی ہے۔

اس کے بعد میں جب مہیال جاتا ہم یہی کھیل کھیلتے اسی طرح تنور میں چھپتے اور میں ہر بار سارے کھیل کے دوران اس کے لب چوم لیا کرتا۔ ادھر اپنے گاؤں میں کملا اور ادھر پنڈی میں پشپا۔ میری تو جیسے چاندی تھی۔

ایکبار جب میں کافی زیادہ باتیں کرنا سیکھ گیا تھا۔ میں نے کہا۔
''تیرے ہونٹوں میں کبھی گنے کا رس ہوتا ہے تو کبھی کچی گری (ناریل) کی کرا ہری مٹھاس''۔

'منع کون کرتا ہے۔ رس بھی پیو اور گری بھی کھاؤ۔ بڑا اچھا آتا ہے۔''

''پشپا اب بائیس تیس سال کی ہو چکی ہو گی۔ اتنے سالوں بعد میں اسے کیسے پہچانوں گا'' میں نے سوچا۔ مگر جیسے ہی وہ گاڑی کے فرسٹ کلاس والے زنانہ ڈبے سے اتری اس نے مجھے اور میں نے اسے ایکدم پہچان لیا۔

''تم پشپا ہو نہ؟''۔

''اور تم......؟''۔

''بالکل ٹھیک۔ تم میرے تصور کے عین مطابق ہو۔ میری کلپنا نے مجھے دھوکا نہیں دیا''۔

ظاہر تھا کہ وہ بھی دوران سفر میرے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ میں گدگد ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے مجھ سے کم اور ماں سے زیادہ باتیں کیں۔ نہا دھو کر آلو پیاز کے پراٹھوں اور دہی کا ناشتہ کیا اور سو گئی۔ اٹھی تو شام ہو چکی تھی۔

ظاہر ہے آج تم کچھ بھی نہ دیکھ سکو گی۔ مگر نشاط میں 'دیوداس' چل رہی ہے۔

''میں نے دیکھ رکھی ہے۔ آج میرا رونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آج ہم ادھر کرشن نگر میں ہی گھومیں گے اور لوٹ کر ریڈیو اور ماسی جی سے ست سنگ کی باتیں سنیں گے''۔

ہم پورے چار دن کبھی تانگے اور کبھی اپنی ٹانگوں پر لاہور کے گلی کوچوں اور وہاں کی کھلی کشادہ سڑکوں پر گھومتے رہے۔ اس بانکے شہر کی ہر اہم عمارت نئے اور پرانے تعلیمی و تہذیبی ادارے سارے کالج، یونیورسٹی کے سارے ڈیپارٹمنٹ، تاریخی عمارات اور باغات۔ میوزیم اور چڑیا گھر غرضیکہ ہر دیکھنے لائق چیز ہم نے دیکھ ڈالی۔ پچھلے روز کی شام میں نے اور پشپا نے لارنس باغ میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ باغ کے ایک کونے میں بینچ پر چپ چاپ اپنے اپنے افکار کے ہجوم میں کھوئے بیٹھے ہم اپنے ماضی کو کرید رہے تھے کہ پشپا ایکا ایک پھپھک کر رونے لگی۔ پرانی یادوں کی نمی میری آنکھوں میں بھی جمع ہوتی جا رہی تھی مگر میں اسے بہہ چلنے سے کسی طرح روکے ہوئے تھا۔ اس کے اس طرح اچانک پھوٹ پڑنے سے میری آنکھیں بھی چھلک گئیں اور ایک نامعلوم جذبے کے تحت میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہماری زبانوں پر لگے قفل البتہ اب بھی بند تھے۔

''تمہیں یاد ہیں ہمارے بچپن کے وہ کھیل پشپا''۔

''اپنا پہلا پیار کسے بھولتا ہے۔ عورت کو تو کبھی نہیں بھولتا۔ وہ بھولا بھالا معصوم لگاؤ میری یادوں کا ایک ایسا قیمتی سرمایہ ہے جسے میں زندگی بھر چھاتی سے لگائے رکھوں گی''۔ (آج کیسی بے حیائی سے میں سب کچھ لکھ رہا ہوں۔

آدمی واقعی بڑی خبیث شے ہے)۔آنکھوں سے پانی جھڑ رہا تھا مگر وہ مسکرا رہی تھی۔''ہم پانچ دن سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں مگر تم نے ایک بار بھی مجھے نہیں چوما۔شاید اس لئے کہ تم جانتے ہو کہ میری سگائی ہو چکی ہے اور میرا انگیتر آج کل لندن میں تعلیم پا رہا ہے اور دو سال بعد جب لوٹے گا تو ہماری شادی ہو جائے گی''۔

''اب تم کسی دوسرے کی امانت ہو۔ جبکہ ان دنوں تم ساری کی ساری میری تھیں۔ میں نے سپنوں میں بھی تم سے پیار کیا اور جاگتے جاگتے بھی تمہارے سپنے دیکھے ہیں مگر اب تم جس لکشمن ریکھا میں قید ہو اسے لانگنا میرے جیسے کمزور آدمی کے لئے ممکن نہیں۔تم سے آج تک جو اور جتنا ملا ہے وہی میرے لئے کافی ہے''۔

''میں دو سال کے لئے شانتی نکیتن جا رہی ہوں۔گارڈن کالج سے بی۔اے کرنے کے بعد میرا ارادہ لاہور چلے آنے کا تھا۔لاہور کالج فار ومن میں میری ایڈمیشن بھی ہو گئی تھی۔مگر بابو جی نے طے کر دیا کہ مزید تعلیم کے لئے مجھے ایک ایسی عظیم ہستی کے چرنوں میں بیٹھنا ہوگا جسے ساری دنیا عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔خود مجھے بھی گورو دیو رابندر ناتھ ٹیگور کی ذات میں بڑی شردھا ہے''۔

''ضرور جاؤ پشپا۔تم تقدیر والی ہو پشپا جو تمہیں یہ موقع مل رہا ہے۔تم جانتی ہو کہ اونچی تعلیم پانے کا حق مجھے بھی ہے مگر میں ایک یتیم اور بے سہارا لڑکا ہوں جو ٹیوشنیں کر کے اپنی پڑھائی کا خرچ نکالتا ہے اور جس کی ماں لوگوں کے کپڑے سی کر گھر کا خرچ چلاتی ہے۔لکھ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی اور ایک بڑے ڈاکٹر کی بیوی۔کتنی بدنصیب ہے بیچاری ماں۔نانا تھے تو ایک سہارا تھا۔اب وہ بھی نہیں رہے اور گاؤں سے بھی ہمارا ناتا ٹوٹ چکا ہے''۔

''میں تم سے کم از کم چار سال بڑی ہوں۔ہوں کہ نہیں؟''

''سالوں کا حساب میں نہیں جانتا۔غریب ہوں اس لئے ریاضی کبھی بھی مجھے راس نہیں آئی۔میرا چھوٹا اور تمہارا بڑا ہونا میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا مگر میری غریبی اجازت نہیں دیتی کہ اپنے بچپن کے خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈتا پھروں۔میرے حالات اچھے ہوتے تو میں تمہیں کبھی کہیں جانے نہ دیتا۔تم پر اپنا حق اپنا ادھیکار جتاتا بلکہ زبردستی تمہیں لے اڑتا مگر میرے پاؤں میں زنجیریں ہیں اور میرے مقدر نے میرے پَر کاٹ ڈالے ہیں''۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے۔یہ چھوٹے بڑے کا سوال۔یہ امیری غریبی کی ناقابلِ تسخیر دیواریں۔ہم آزاد پرندوں کی طرح کھلی فضاؤں میں اپنی مرضی سے کیوں نہیں اڑ سکتے۔ہم اپنے آپ کو ایسی بیڑیوں میں جکڑنے کیوں دیتے ہیں جو ہماری پرواز ہماری اڑان میں مخل ہوتی ہیں''۔

''ان تمام سوالوں کا جواب میرے پاس نہیں مگر ادھر گورو دیو کے پاس یقیناً ہوگا۔سنا ہے اس درسگاہ میں دوسری ضروری معلومات کے ساتھ ساتھ زندگی بسر کرنے کا درس بھی دیوتاؤں کے پرساد کے طور پر بانٹا جاتا ہے۔تمہیں ان سوالات کا حل مل جائے تو مجھے بھی بتانا۔شانتی نکیتن لندن میں نہیں، ہندوستان میں ہی ہے''۔

ایکا ایک گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے پشپا نے پوچھا۔ ''سنا ہے آجکل تم اپنے کسی دوست کی سالی کے چکر میں ہو''۔

''کہاں سے سنا ہے! ماں نے ہی بتایا ہوگا۔ انہیں وہ لڑکی ذرا بھی پسند نہیں۔ مگر میری تقدیر ہی ایسی ہے۔ میں ہمیشہ ہی کسی نہ کسی چکر میں پھنسا رہا ہوں۔ میرے ہاتھوں کی دسوں انگلیوں میں چکر ہیں۔ قاعدے سے مجھے چکرورتی سمراٹ ہونا چاہئے تھا مگر میری ساری زندگی ایک 'چکر ویو' ہے جس میں میں ابھی منیو کی طرح داخل تو ہوگیا ہوں مگر جس سے نکلنے کا راستہ مجھے نہیں آتا۔ اور سنو تم جس ابھاگی لڑکی کا ذکر کر رہی ہو وہ میرے دوست کی سالی ابھی نہیں بنی۔ بن جائے اسی غرض سے میں اس کے گھر کے چکر کاٹا رہتا ہوں۔ اگر میں اس کی بہن کا ہاتھ اس کے والدین کی مخالفت کے باوجود اپنے دوست کو پکڑا سکا تو مجھے اپنے اس ڈرامے پر کسی قسم کی ندامت کا احساس نہ ہوگا۔ لڑکی کا باپ میرا پرانا منیجر ہے اور مجھے بہت مانتا ہے''۔

''اور سنا ہے تم اچھے خاصے فنکار ہو گئے ہو اور خوب چھپتے بھی رہتے ہو''۔

''لکھوں گا تو ظاہر ہے کہ چھپنا بھی چاہوں گا۔ مگر تم سے یہ سب کس نے کہا ہے۔ یقیناً ماں نے بتایا ہوگا۔ انہیں میرا یہ لگاؤ بھی پسند نہیں۔ میرے مقدر کا گھر مقفل ہے اور اس کی کنجی مجھ سے کھوگئی ہے۔ مجھے اسی طرح ویرانوں میں بھٹکنا ہے۔ مگر یہ سب بتا کر میں تمہیں کیوں پریشان کر رہا ہوں۔ بڑا کمینہ ہوں۔ شاید چاہتا ہوں کہ کوئی میرا درد بانٹ لے۔ آدمی کو اپنی خوشیاں ضرور بانٹنی چاہئے۔ مگر درد نہیں۔ زخم نہیں۔ رنج و غم تو بالکل نہیں۔ تمہاری زندگی پر میرا منحوس سایہ کبھی نہ پڑے۔ اب یہی میری تمنا ہے۔ میں تمہاری ہر خوشی پر اپنی ہزار خوشیاں نچھاور کر سکتا ہوں''۔

''تعلیم ختم کرنے یا شادی کر لینے کے بعد مجھے وہ خوشیاں نصیب ہو ہی جائیں گی جن کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو اور جن کی شاید میں بھی متلاشی ہوں؟''

''یہ میں کہہ سکتا ہوں۔ آگے کیا ہوتا ہے یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا پشپا''۔

''تم سمجھتے ہو اونچی تعلیم اور دولت میں ہی آدمی کی تسکین کا راز چھپا ہے؟''

''یہ میں نے کب کہا۔ تسکین قلب مقدر سے ملتی ہے پشپا۔ اس کا بیج نہ دولت میں ہے اور نہ اس دانائی میں جو تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔ میں تو کہوں گا کہ حسن و محبت بھی اس راز سے بیگانہ ہیں۔ کیونکہ وہ بھی روٹی مانگتے ہیں اور روٹی نہ ملے تو مُرجھا کر اپنے آپ مر جاتے ہیں۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں اور میرا روم روم تمہارے لئے بیقرار ہے۔ مگر تمہاری کندن جیسی اس کایا پر ہلدی کا لیپ پوت دینا بھی منظور نہیں۔ ایک حقیر فقیر کی طرح یادوں کے سہارے ساری زندگی گزار دینا مجھے منظور ہے کیوں کہ شاید یہی میرا مقدر ہے''۔

''میں آج کی یہ ملاقات یاد رکھوں گی اور تمہارے لئے دعا کروں گی''

دوسرے روز پشپا چلی گئی۔ لکھتے رہنے یا دوبارہ کبھی ملنے کا وعدہ کئے

بغیر۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ لاہور ہی سے نہیں، میری زندگی سے بھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی شادی ناکام رہی مگر اس شادی سے چھٹکارا پا کر بھی اس نے مجھے نہ کھوجا۔ جلد ہی دوسری بار بیاہ کر لیا وہ بھی ایک ایسے شخص سے جو اور جس کا سارا خاندان اس کے بابو جی کا زرخرید غلام تھا۔ پشپا شہزادی تھی اسے راج کمار چاہئے تھا یا ایک غلام۔ مگر جس خوشی کی اسے کھوج تھی وہ اسے ملی کہ نہیں، یہ میں نہیں جانتا۔

لاہور ہمیں جلد ہی چھوڑ دینا پڑا۔ لاہور سے جالندھر منتقل ہو جانا بھی ایک کہانی، ایک خاص الجھی ہوئی طویل داستان ہے۔ مگر اس کی تفصیلات بیان کرنے کی یہاں ضرورت ہے نہ گنجائش۔

جالندھر سے بمبئی چلا گیا جہاں فلموں اور چند ایک فلمی ایکسٹراؤں کے چکر میں کوئی سال بھر بھٹکتا رہا۔ اس دوران میرے بڑے بھائی کی شادی طے ہو گئی تھی جس میں میری شمولیت ضروری تھی۔ میں جالندھر لوٹا تو معلوم ہوا کہ کملا اپنے بیٹے کے ساتھ ہمارے ہی محلے کی ایک دوسری گلی میں رہ رہی ہے۔ اب وہ کافی موٹی تازی ہو گئی تھی۔ مگر اس کے بدن کے خم پہلے ہی کی طرح نمایاں تھے۔ اس کا وزن کافی بڑھ گیا تھا مگر گوشت اس کے جسم کے کسی ایک حصے پر نہیں ساری کایا پر اس تناسب سے چڑھا تھا کہ وہ موٹی کم اور گدرائی گدرائی زیادہ دکھتی تھی۔ اس کا چہرہ اور بھی نکھر گیا تھا۔ اب اس کا بیٹا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔

یہ دوسری جنگ عظیم کا اولین دور تھا۔

سبھاش بوس نے کانگریس سے مستعفی ہو کر فارورڈ بلاک کی بنیاد ڈال دی تھی۔ برصغیر کی سیاست اب چار بڑی سیاسی پارٹیوں یعنی کانگریس، مسلم لیگ، کیمونسٹ پارٹی اور فارورڈ بلاک میں منقسم ہو گئی تھی اور ہر پارٹی اپنی اپنی زبان میں بولنے لگی تھی۔ ملک کے سیاسی منظر نامے پر کئی صوبوں میں چند ایک مقامی گروپ بھی اس میدان میں اتر آئے تھے۔ جموں کشمیر میں نیشنل کانفرنس، پنجاب میں اکالی پارٹی وغیرہ۔ گاندھی جی کے ''انگریزو، ہندوستان چھوڑو'' جیسے بلند و بالا نعرے کے باوجود ہندوستان انگریزوں کا تھا اور پورے زور شور سے عالمی جنگ میں شریک ہو چکا تھا۔ جنگ میں روسی داخلے کے بعد بھارتیہ کیمونسٹ پارٹی اور ایم۔ این۔ رائے جیسے مدبرین نے بھی اس جنگ کو عوامی یعنی Peoples War قرار دے دیا تھا۔

اس دوران کملا کا شوہر بھی جواب کپتان بن چکا تھا جنگ کے محاذ پر جا چکا تھا۔ شوہر کی غیر حاضری کے باوجود وہ ایک فوجی افسر کی بیوی کی طرح پورے ٹھاٹھ باٹھ سے ایک ایسے کھلے اور کشادہ گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ جس میں چار کمرے تھے اور وہ تمام سہولیات بھی میسر تھیں جو بہت کم گھروں میں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ بجلی، پنکھے، ریڈیو وغیرہ۔ اس کے بالمقابل ہمارا گھر نسبتاً بڑا ہوتے ہوئے بھی پرانے ڈھنگ کا تھا۔ بجلی تو ہماری پوری گلی کے گھر میں تب تک نہ آئی تھی۔

کملا میرے بھائی کی شادی میں قریبی رشتہ داروں کی طرح شریک رہی تھی یہاں تک کہ اس نے گھر میں آئے سارے مہمانوں کی خاطر تواضع کا ذمہ بھی سنبھال لیا تھا۔ بہت سی عورتیں اور بچے تو اس دوران اسی کے گھر میں سوتے

تھے۔ وہیں نہاتے اور صبح کا ناشتہ کرتے۔ یہی نہیں اس نے ہماری شادی میں مالی مدد بھی کی تھی۔ گھر کا ہر فرد اس پر فریفتہ تھا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ کہاں گاؤں کی کملا اور کہاں شہر کی یہ سلیقہ شعار عورت۔

بھائی کی شادی کے چند ہی ہفتوں بعد خبر ملی کہ کملا کے ہاں چوری ہوگئی ہے اور چور کافی ساز و سامان قیمتی پارچہ جات' زیور اور کچھ نقدی وغیرہ لے کر فرار ہو گئے تھے۔ ہم لوگوں نے اسے پولیس میں رپورٹ لکھوانے کا مشورہ دیا مگر وہ راضی نہ ہوئی۔

جنگ میں گئے فوجیوں کے گھر والوں کی دیکھ ریکھ اور حفاظت مقامی پولیس کی خاص ذمہ داری تھی۔ یہ سب سمجھانے پر بھی وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی۔

''میں اکیلی بے سہارا عورت اس قسم کی الجھنوں میں پڑنا نہیں چاہتی۔ جو جانا تھا چلا گیا۔ اب واپس تو ملے گا نہیں۔ پھر بلاوجہ گھر پر پولیس والوں کے دورے کیوں لگواؤں''۔

اس نے ماں سے کسی طرح منوا لیا کہ میں رات کو اس کے گھر سو جایا کروں۔ گھر کا ایک کمرہ جو بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا اس نے میرے لئے وقف کر دیا۔ کمرے میں ایک خاصا بڑا دیوان، صوفہ اور کرسی میز کے علاوہ ایک قیمتی قالین اور پردے وردے سب کچھ تھا۔ سب سے بڑی چیز تھی بجلی اور چھت والا پنکھا۔ میں مزے سے پڑھ لکھ سکتا تھا۔ ایسی سہولیات میسر ہوں تو کہانیاں اپنے آپ جنگلی گھاس کی طرح اگنے لگتی ہیں۔

میں نے دکھاوے کی چوں چراں کی، مگر سب نے قسم قسم کے دلائل دے کر اور اپنے اوپر کملا کے احسانات گنا کر مجھے راضی کر لیا۔

اب میرا زیادہ وقت کملا کے گھر پر ہی گزرتا۔ ہمارا ہاتھ ان دنوں خاصا تنگ تھا۔ مجھے بمبئی لوٹنے سے روک لیا گیا تھا اور میں تقریباً بیکار تھا۔ کملا نے زور دے کر گھر والوں سے یہ بھی منوا لیا تھا کہ میں اس کے لڑکے کی ٹیوشن کرلوں۔ لڑکا پانچویں میں تھا تو وہ ماسٹر کو تیس روپے ماہانہ دیتی تھی اب چونکہ وہ چھٹی میں تھا لہٰذا وہ مجھے دس روپے زیادہ دیا کرے گی۔ ان دنوں میں پندرہ پندرہ روپے کی دو ٹیوشنیں کر رہا تھا۔ چالیس اور تیس یعنی پورے ستر روپے ماہانہ۔ میری تو جیسے لاٹری نکل آئی تھی۔

ہمارا تعلق جو گاؤں کے اس بریف انکاؤنٹر کے بعد ختم ہو گیا تھا، اپنے آپ زندہ ہو گیا۔ اس سلسلے میں نہ مجھے کچھ کہنا پڑا نہ اسے۔ سالوں کا پاٹ ہم ایک ہی جست میں پھلانگ گئے۔ اس نے پہلی ہی رات مجھے بتا دیا کہ اس کے گھر چوری ووری کچھ نہ ہوئی تھی۔ سارا واویلا مجھے اپنے لئے حاصل کرنے کا ایک حربہ تھا جو کامیاب رہا۔

اب اس کا معمول ہو گیا تھا کہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اور بچے کو سلا کر وہ چپ چاپ میرے ساتھ آ لیٹتی اور ہم ——

ان ہی دنوں مجھے جالندھر چھاؤنی میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ ساٹھ روپے ماہانہ۔ یعنی اب میں پورے ایک سو تیس روپے ہر ماہ گھر لانے لگا تھا۔ گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ سب خوش تھے۔ تیس روپے اپنے پاس رکھ کر میں باقی کے سو

گھر دے دیتا۔ گھر والے بلکہ محلے کے لوگ بھی میری اس سعادت مندی پر رشک
کرتے تھے اور لڑکوں کو میرے حوالے سے اکثر کوستے رہتے۔ ماں تو میرے
اس ذمہ دارانہ دیوہار سے بے حد متاثر تھیں۔ اور اکثر اس خوشحالی کا سہرا کملا
کے سر باندھتی تھیں۔ کملا جیسے ان کے روٹھے بھاگیہ کا وہ ستارہ تھی جس نے ان
کے دن پلٹ دیئے تھے۔ بھائی ایئر فورس میں بھرتی ہو گیا تھا۔ یعنی ایک ساتھ دو
تنخواہیں۔ دو سو روپے ماہانہ بڑی رقم ہوتی تھی۔ ان دنوں آجکل کے چار ہزار
کے برابر۔ ایک لکھ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی اور ایک رئیس خاندان کی بہو میری
ماں نے جس طرح زندگی گزاری تھی وہ بھی ایک طویل داستان ہے۔ شوہر کا
سایہ سر پر نہ رہے تو عورت، کم از کم ان دنوں بڑی بے سہارا ہو جاتی تھی۔

اپنی زندگی کی حماقتوں میں دیوی جیسی اپنی ماں کا ذکر جوڑ کر کسی
کوٹھے والی کے آنگن میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کے مترادف ہو گا۔

ان دنوں میں جس قسم کی زندگی گزار رہا تھا اسے آج بازاری کہنے
میں مجھے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہو رہی۔ اب جبکہ ننگا ہو جانے کا فیصلہ ہی کر لیا
ہے تو بیکار کی جھوٹی جھجک کے چکر میں کیوں پڑوں۔ میل پراسٹی چیوٹ (Male
Prostitude) کا تصور ویسٹ میں تو سنا ہے عام ہے مگر مشرقی ممالک میں اس
قسم کی زندگی کرنے والے نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ اب صورتحال یہ تھی
کہ کملا میری داشتہ نہ تھی۔ اگر داشتہ لفظ کا استعمال مرد کے لئے ہو سکے تو میں شرم
وحیا کو بالائے طاق رکھ کر اعتراف کروں گا کہ میں کملا کا/کی......

کملا ہر صبح میرے بٹوے کو کھولتی۔ تیس روپے میں سے جتنے کم ہوتے
ڈال دیتی اور اس طرح میرے تیس کے تیس برابر بنے رہتے۔ کبھی میں ایک
ساتھ دس بیس لٹا آتا تو وہ اتنے ہی پھر سے ڈال دیتی۔ میں کبھی جھوٹ موٹ کا
اعتراض اٹھاتا تو وہ مسکرا کر ٹال دیتی۔ ''تم میرے محافظ یا میرے بیٹے کے
استاد ہی نہیں بلکہ میرے یار بھی تو ہو۔ تم میرے لئے اتنا کچھ کرتے ہو۔ کیا میں
تمہارے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتی''۔

''تو یہ میرا محنتانہ ہوتا ہے؟''

وہ مسکرا دیتی۔ ''میں نے تم سے جو پایا ہے اس کی کوئی قیمت نہیں''۔

چونکہ اس عجیب و غریب رشتے میں فائدہ ہی فائدہ تھا۔ لہٰذا میں چپ
ہو جاتا۔ میری اخلاقی گراوٹ کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر چلا۔ اس کا شوہر لڑائی میں
بری طرح زخمی ہو کر گھر نہ لوٹ آتا تو شاید یہ سلسلہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام
تک اسی طرح چلتا رہتا۔ زخمی شوہر کے اصرار پر وہ اپنے سسرال منتقل ہو گئی۔

آنے جانے والے لوگوں سے اس کی خبر کافی عرصہ تک ملتی رہی پھر
ایک دن سنا کہ وہ جنوبی ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں مستقل طور پر سیٹل ہو گئے
ہیں۔ نہ اس نے کبھی ہمیں کوئی پیغام بھیجا نہ ہم میں سے ہی کسی نے اسے پھر کبھی
لکھا۔ یہ میری زندگی کا ایک ایسا واحد تجربہ تھا جس پر میں کبھی شرمسار ہوتا ہوں تو
کبھی مسرور۔ کیسی پیاری اور معصوم ابتدا تھی۔ مگر ــــ

اب اگر میں کہوں کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ محض ایک دھندہ
کیا تھا تو آپ کیا کہیں گے۔ سالا ــــ

اپنی پہلی اور آخری محبت کے درمیان ایک معاشقہ اور بھی تھا۔ وہی

جس کا ذکر پشپا نے کیا تھا۔ میں غلط فہمی میں اسے بھی محبت ہی سمجھتا رہا۔ میرا دوست ہندی نہیں جانتا تھا مگر تھا خاصا اچھا ادیب وہ۔ اردو فارسی کا طالب علم ہی نہیں۔ شاعر بھی تھا۔ اب جس لڑکی پر وہ فدا تھا اسے ہندی میں خط لکھنے کی ذمہ داری میری ہو گئی تھی۔ میں خط لکھتا وہ جواب دیتی۔ کافی عرصہ بعد پتہ چلا کہ وہ خطوں کا جواب اپنی چھوٹی بہن سے لکھواتی تھی۔ یعنی ادھر میں اور ادھر اس لڑکی کی بہن۔ جب یہ انکشاف ہوا تو لازمی تھا کہ میری توجہ اس کی بہن کی طرف جاتی۔ اور ایسا ہوا بھی۔ مگر وہ لڑکی ایک کھلاڑی تھی اور صرف کھیل سمجھ کر ہی یہ سب کئے جا رہی تھی۔ اس کے اس کھیل میں تھوڑا بہت جذبہ بھی رہا ہوتا تو شاید میاں بیوی ہو چکے ہوتے۔

وہ لڑکی اب دنیا میں نہیں ہے لہٰذا اب اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ البتہ اتنا کہنا ضروری ہے کہ ہمارے اس کھیل میں میرے دوست کا کام بن گیا یعنی اس کی محبوبہ اس کی بیوی بن گئی۔ میں آج تک دونوں کا گناہ گار ہوں۔ نہ اس نے نہ اس کی بیوی نے ہی مجھے کبھی معاف کیا۔ اس کی بیوی کی کلپنا میں جو لڑکا تھا وہ میں تھا اس کا شوہر نہ تھا۔ اور میرے دوست کی کلپنا میں جو لڑکی تھی وہ اس کی بیوی نہ تھی اس کی چھوٹی بہن تھی۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کی بیوی اس کی سالی سے بدرجہا اچھی اور نیک لڑکی تھی۔ خطوط میں خلوص جھلکنے لگے تو وہ بڑی اہم دستاویز بن جاتے ہیں مگر جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلوص بناوٹی یعنی کلّی دھلذ تھا تو دل لخت لخت ہو کر بکھر جاتا ہے۔

پشپا سے میرا عشق یکطرفہ تھا کہ نہیں یہ میں کبھی نہیں جان پایا۔ کملا سے میرا لگاؤ ایک دلچسپ کھیل تھا جو ہم دونوں نے جی بھر کر کھیلا۔ اپنے دوست کی بیوی کی بہن سے میرا عشق یقیناً یکطرفہ تھا۔ شاید یہی میرا مقصد تھا۔ مگر ہر آدمی زندگی میں ایک بار تو پیار کرتا ہی ہے۔ کچھ پیار کامیاب ہوتے ہیں تو کوئی غالبؔ کے تیر نیم کش کی طرح ایک کسک بن کر زندگی بھر آدمی کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ پیار کی روایت ہی یہ رہی ہے کہ وہ اکثر غلط جگہ پہنچنا چاہتا ہے۔ مٹی کی جانچ پڑتال کرائے بغیر پودے بوئے جائیں تو وہ کہاں پھلتے پھولتے ہیں۔ آدمی پیار کرتا ہے تو صرف دل سے مجبور ہو کر۔ اس کا دماغ، اس کا شعور اسے روکتا ہے مگر پیار کرنے والے کب رکے ہیں۔ جس پیار میں ترک شامل ہو جائے وہ پیار کہاں رہتا ہے۔ کندن لال سہگل مرحوم کی میت میں شامل ہونے سارا شہر امڈ پڑا تھا۔ جالندھر والوں کو اس عظیم فنکار پر بڑا ناز تھا۔ اس نے ان کے شہر کو جو عزت اور شہرت بخشی تھی اسی کے احترام میں چھوٹے بڑے سب اپنے گھروں سے نکل کر اس کے ماتمی جلوس میں شامل ہو گئے تھے۔ میں خود سہگل مرحوم کی آواز پر فدا تھا۔ مگر چونکہ ایک لمبی علالت کے بعد حال ہی میں روبہ صحت ہوا تھا میرے کنبے کے سارے افراد مجھے گھر میں اکیلا چھوڑ گئے تھے۔

غالباً دوپہر کا وقت تھا جب گھریلو سامان سے بھرا لدا ایک بڑا شیورلے ٹرک دندناتا ہوا ہماری گلی میں داخل ہوا اور ہمارے گھر کے سامنے آ کر رک گیا۔ میں نے پڑے پڑے بیٹھک کی کھڑکی سے دیکھا کہ ڈرائیور اور دو نوجوان لڑکے ٹرک سے اتر کر سامان کو گھور رہے ہیں۔ ظاہر تھا کہ وہ پریشان تھے کہ اتنا سامان کیسے اتارا جائے۔ میں نے ایک نظر دیکھتے ہی جان لیا کہ یہ

لوگ ہمارے گھر کے ساتھ والے گھر کے جو عرصہ دراز سے خالی تھا، نئے کرائے دار تھے۔ میں باہر نکل آیا اور دو تین منٹ کی رسمی دعا سلام کے بعد ڈرائیور اور ہم تینوں سامان اتارنے اور گھر کے اندر لیجانے میں مشغول ہو گئے۔ گھر چھ کمروں اور سیڑھیوں پر مبنی ایک چھوٹی سی میانی پر مشتمل تھا۔ پہلے ہی دھو دھلا کر صاف کیا جا چکا تھا۔ دو ہی گھنٹوں میں ہم لوگوں نے سامان نہ صرف گھر کے اندر پہنچا دیا بلکہ اپنے طور پر اس پر جمی گرد وغیرہ جھاڑ کر قرینے سے سجا بھی دیا۔ اس کام سے نبٹ کر میں تینوں کو اپنی بیٹھک میں لے آیا۔ ناشتہ وغیرہ کر کے بڑا لڑکا جس نے اپنا نام اظہار الحسن بتایا تھا ڈرائیور کے ساتھ چلا گیا۔ مگر دوسرا رشید جو میرا ہم عمر تھا وہیں میرے پاس رک گیا اور باتیں کرتے کرتے وہیں دیوان پر سو گیا۔ ظاہر تھا کہ لمبے سفر اور سامان اتارنے چڑھانے کی محنت نے اسے بری طرح تھکا دیا تھا۔

ہمارے مکان ایک دوسرے کے مقابل تھے اور چھتیں ایک دوسری سے اس طرح ملی تھیں گویا بغلگیر ہو رہی ہوں۔ شام ہوتے ہوتے رشید کے گھر والے بھی آ پہنچے۔ گھر کا سالار دلاور خاں راجپوت اس کی بیوہ ماں راشدہ بیگم، اہلیہ محترمہ آمنہ بیگم بڑا بیٹا عالم خان، بہو نیلوفر اور بیٹی صغریٰ۔

ایگزرشن اور ایکسپوزر کی وجہ سے میری بیماری جو تقریباً ختم ہو چکی تھی دوبارہ لوٹ آئی اور ڈاکٹر کے مشورے پر میرا پلنگ سے اٹھنا منع کر دیا گیا۔ دوسرے روز رشید ملنے آیا تو میری حالت کو دیکھ کر بہت شرمندہ ہوا۔ میں علیل تھا پھر بھی دو تین گھنٹے قطعی اجنبیوں کا بھاری بھرکم سامان ڈھوتا رہا تھا۔ گھر لوٹ کر

اس نے ساری واردات جس طرح اپنے کنبے والوں کو سنائی ہوگی اس کا اندازہ مجھے اس گرمجوش استقبال سے ہی ہو گیا جو مجھے ان لوگوں کے گھر میں اپنے پہلے داخلے پر ملا۔

رشید کی دادی اماں مجھے دیکھ کر ایسے چونک گئیں جیسے وہ مجھے مدتوں سے جانتی ہوں۔ جب انہوں نے اپنے یوں حیران ہونے کی وجہ بتائی تو دوسرے لوگ بھی ایکدم سکتے میں آ گئے۔ فیملی البم میں ان کے مرحوم شوہر کی تصویر تھی جسے وہ اب سب باری باری دیکھ رہے تھے۔ وہ کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی البم میں چپکی اس تصویر کو۔ بعد میں انہوں نے وہ تصویر مجھے بھی دکھائی۔ گھر کے بڑے بزرگ کی یہ تصویر خاصی پرانی تھی۔ یہ ان کے طالب علمی کے زمانے کی تصویر تھی۔ تصویر مجھے دکھائی گئی تو میں بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لباس پرانی طرز کا تھا مگر شکل وصورت سے صاحب تصویر ہو بہو میرا روپ تھے۔

دلاور خاں مسکرائے۔ یہ میرے ابو کی تصویر ہے۔

مگر یہ تو میری تصویر ہے۔

راشدہ بیگم بہت مسرور تھیں۔ آخر بنانے والا بھی روز روز نئے چہرے کہاں تک گھڑتا رہے۔

''تم ٹھیک کہتی ہو اماں۔ دراصل ہم سب ایک ہی کنبے کے افراد ہیں۔ آدمی کا کنبہ۔ فیملی آف مین (FAMILY OF MAN) نسل، دھرم مذہب، ذات پات۔ سب ہمارے بھرم ہیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ہمارے گھروں کے افراد ایک دوسرے

کے قریب آتے گئے اور ہماری یہ رفاقت ہندو مسلم دوستی کی ایک روشن مثال کے
طور پر سارے محلے بلکہ شہر بھر میں جگوائی جانے لگی۔ میری رشید اور صغریٰ کی
دوستی اور کھلے کشادہ ماحول میں اپنے آپ پنپتی اور بڑھتی چلی گئی۔ اس دوستی کی
سب سے بڑی انسپی ریشن اور موٹیو فورس رشید اور صغریٰ کی بھابھی نیلوفر صاحب
تھیں۔

وہ کیا دن تھے۔ مجھے اپنے ماضی کے سارے رومانی تعلق ایکدم بے
معنی اور پھیکے لگنے لگے۔ ان دنوں جب بھی مجھے اپنی پرانی حماقتوں کی یاد آجاتی
میں دل ہی دل شرمندہ ہو جاتا۔

وہ رات اور وہ کیسی کتنی ہی راتیں۔

''بڑا سمجھدار تھا ہمارے تمہارے ان گھروں کو بنانے والا''۔ صغریٰ
جیسے ہی دونوں گھروں کی چھتوں کے درمیان والی منڈیر پر آکر بیٹھتی میں اسے
اپنے بازوؤں میں بھر کر اپنی چھت پر اتار لیتا۔ صغریٰ کے گھر والی چھت میرے
گھر والی چھت کی نسبت بہت اونچی تھی۔ پورے دو اور پانچ کی نسبت تھی۔ یعنی
صغریٰ کو اپنی منڈیر پر چڑھنا ہوتا تو معاملہ دو ہی فٹ کا تھا۔ مجھے وہاں چڑھنا ہوتا
تو معاملہ پانچ فٹ بلکہ شاید اس سے انچ دو انچ زیادہ ہی تھا۔ صغریٰ جس کا قد
بمشکل پانچ فٹ ایک انچ تھا منڈیر سے سٹ کر ہماری چھت پر کھڑی ہوتی تو
دوسری طرف سے ایکدم اوجھل ہو جاتی یعنی اسے بغیر کوشش کے ادھر سے دیکھا
نہ جاسکتا تھا۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ اس کے گھر کا کوئی فرد پیٹ ہلکا کرنے
چھت پر آیا مگر فارغ ہو کر لوٹ گیا۔ خوش قسمتی سے تو میری چھت کی دوسری
جانب یعنی سیڑھیوں کے قریب ہی تھی۔

بھرا بھرا گداز اور کنوارے پن سے مہکتا صغریٰ کا بدن میرے
بازوؤں میں آتے ہی بے وزن ہو جاتا اور میں کئی کئی منٹ اسے ایسے ہی اپنی
چھت پر لئے لئے پھرتا گویا وہ کوئی جوان چھوکری نہ ہو ہوا بھری ربر کی گڑیا ہو۔

سردیوں کی راتوں کے گونگے سناٹے میں دو وارماتوں بھرے دل۔

''نیچے اپنے بند کمرے میں لحاف میں پڑے پڑے بھی میں سردی سے
ٹھٹھری جارہی تھی مگر ادھر اوپر کھلے میں تمہارے ساتھ۔ تم تو جیسے ..... نجانے
تمہارے بدن میں مجھے ایکدم گرما دینے والا ایسا کونسا آلہ لگا ہے''۔

''تیرا میرا پیار ہی وہ الاؤ ہے جس کی تپش'' اور میں اسے چوم لیتا۔

دو دو تین تین گھنٹے ایک دوسرے سے اسی طرح چمٹے ہم اکثر یوں ہی بے سر پیر کی
ہانکا کرتے۔ محبت کی باتیں کیسی ہوتی ہیں، شاید وہ نہیں جانتی تھی۔ محبت کسی منظم
ساخت، ترتیب، آداب، ضابطے یا شائستگی کی پابند نہیں ہوتی۔ جب دو دل ایک
دوسرے کے اتنے قریب ہوں کہ انہیں ایک دوسرے کی دھڑکنیں تک سنائی
دینے لگیں تو کچھ کہنا یا سننا بے معنی ہو جاتا ہے۔ کسی بھی گہرے جذبے میں الفاظ
اچھے بھلے آدمی کا بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ بھلے ہی وہ الفاظ کا سوداگر ہو۔

ایکبار اس نے اپنے ریشمی بال جھٹک کر اپنا چہرہ میرے سینے سے لگا
دیا۔ ''بھابھی بتا رہی تھی کہ آجکل کے چھوکرے بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔
کہیں کوئی جوان لڑکی ان کے ہاتھ لگ جائے تو ان کے کپڑے تک اتار دیتے
ہیں۔ وہ اعتراض کرے تو اس کے کپڑے پھاڑ کر اسے ایکدم ننگی کر دیتے ہیں'۔

''تم نے بھابھی جان کو بتایا نہیں کہ میں اس قسم کا چھوکرا نہیں ہوں''۔ ''وہ کیا جانتی نہیں۔ وہ تو تم کو شاید تم سے بھی زیادہ جانتی ہیں۔ وہ نہ ہوں تو میں تمہارے پاس اس طرح نہ آجا سکوں۔ وہ جنم کی ہندو ہیں شاید اسی لئے۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ وہ دوسرے لڑکے ایسے کیوں ہوتے ہیں اور تم ویسے کیوں نہیں ہو؟''

اب اس کا میں کیا جواب دیتا۔ اپنے ماضی میں جھانکتا تو ایکدم گھبرا جاتا مگر کیسے کہتا کہ میں بھی انہیں جیسا ایک آوارہ مزاج چھوکرا رہا ہوں۔

''تم نے جواب نہیں دیا''

''میں کوئی آجکل کا چھوکرا تھوڑے ہی ہوں۔ میں تو ماضی کے اس دور کا سردار ہوں جب بہادر اور جانباز لوگ جن کا سر مغرور اور سفاک حاکموں کے بالمقابل بھی کبھی نہ جھکتا تھا۔ اپنے محبوب کے سامنے سرنگوں ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو حسن وعشق کی داستانیں ہماری تہذیب کا سرمایہ نہ بنتیں۔ شادی سے پہلے میں تمہارے بدن کی اس کنواری خوشبو ہی کا حقدار ہوں''۔

''شادی کے بعد —'' وہ شرارت سے مسکرا کر پوچھتی۔

''بعد کی بات اور ہے۔ تب تمہارے ہی نہیں میں اپنے کپڑے بھی اتار پھینکوں گا''۔

''یعنی ہماری شادی کے بعد تم بھی — بڑے بدمعاش ہو جی''۔

''بھابھی سے پوچھ لینا۔ شادی کے بعد یہ سب معیوب نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہوتا ہے''۔

نیلوفر بھابھی یعنی سابقہ مس مالتی بھٹاچاریہ دل و جان سے چاہتی تھی کہ میری اور صغریٰ کی شادی ہو جائے۔ انہوں نے تو جیسے طے کر لیا تھا ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہیں یعنی کہ میں ان کی بھولی بھالی اور پری چہرہ نند کے لئے ہر اعتبار سے یوگیہ ور ہوں۔ چونکہ وہ خود ہندو نژاد تھیں لہٰذا اپنے سنسکاروں کے زیر اثر قطعی نظر انداز کئے بیٹھی تھیں کہ صغریٰ ایک مسلمان بچی ہے۔ ایک غیور راجپوت کی بیٹی۔ ہم دونوں میں پیار کا بیج بھی انہوں نے ہی بویا تھا اور انہی کے مشورے پر میں نے صغریٰ کو انگریزی اور تاریخ پڑھانا شروع کیا تھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں اور یہ تعلق استاد شاگرد کا ہی نہیں رہا تو وہ کھلے بندوں ہمارے پیار کی حمایت میں جٹ گئیں۔ جب بھی انہیں موقعہ ملتا وہ اپنے گھر والوں کے سامنے میری تعریفوں کے پل باندھ دیتیں'' اے کاش! یہ لڑکا مسلمان ہوتا''۔

اس قسم کے جملے وہ بڑی اماں راشدہ بیگم اور چھوٹی ماں آمنہ بیگم کے سامنے درجنوں بار دہرا چکی تھیں۔ دلاور خاں صاحب یعنی صغریٰ کے ابو کے علاوہ وہ اس قسم کے مکالمے کھلے عام اپنے شوہر اور رشید کے ساتھ بھی دہراتی رہتیں۔ صغریٰ نے مجھے یہ سب کتنی ہی بار بتایا.... ''جانتے ہو بھابھی کی دیدہ دلیری۔ وہ ہم دونوں کو ایک آدرش جوڑے کے طور پر اکثر ایسے پیش کرتی ہیں کہ سننے والے مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں''۔

''آجکل تم ہمارے گھر کے افراد کی گفتگو کا سب سے اہم موضوع

بنے ہوئے ہو۔ صرف ابا ہی ہیں جن کے سامنے اس قسم کی بات گھر کا کوئی فرد نہیں کرسکتا۔ دادی اماں بھی نہیں''۔

محبت کا یہ کھیل جو ننھی ننھی کونپلوں کی طرح اپنے آپ پھوٹا تھا دھیرے دھیرے ایک تناور پیڑ بنتا جارہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس پیڑ کی گھنی چھاؤں سارے گھر پر چھاتی چلی گئی۔ بالآخر ایسا ماحول بن گیا کہ دلاور خاں صاحب کے علاوہ مسلمان راجپوتوں کے اس خاندان کا ہر فرد نیلوفر بھابھی کا ہم خیال ہوگیا۔ رشید جو مجھ پر جان چھڑکتا تھا اس نئی ڈیولپمنٹ سے بے حد خوش تھا۔

''ارے کمبخت تو ہندو راجپوت کیوں ہے مسلمان راجپوت کیوں نہیں۔ یا پھر میں مسلمان کیوں ہوں ہندو کیوں نہیں۔ جب ہم دونوں کی جانیں ایک دوسرے میں اس طرح الجھی ہوئی ہیں اور ہم ہر اعتبار سے ہم خیال ہیں تو ہمارے مذاہب جدا جدا کیوں ہیں''۔

''راجپوتوں کا ایک ہی مذہب تھا۔ اب اگر تمہارے پرکھوں نے اسلام قبول کرلیا تو اس میں تمہارا یا میرا کیا قصور ہے''۔

''تمہیں اسلام کیسا لگتا ہے''۔

''بہت عمدہ، بہت ہی ترقی پسند''۔

''تو سالے مسلمان کیوں نہیں ہوجاتا''۔

''تو زور دے گا تو شاید ہو بھی جاؤں مگر میں جانتا ہوں کہ تو مجھے اس کے بغیر بھی قبولے ہوئے ہے''۔

''قبولے ہوئے؟ ارے احمق میں تو تجھے اپنا رشتہ دار بنانا چاہتا ہوں''۔

''چھوڑ سالے''۔

''تو نے تو رشتہ کو نام بھی دے دیا''۔

ایک دن میں رشید عالم خان اور صغریٰ بیٹھے ملکی سیاست پر بحث کر رہے تھے کہ نیلوفر بھابھی ہم سب کے لئے چائے بنا کر لے آئیں۔ باتوں باتوں میں نجانے کیسے وہ ایکدم بکھری گئیں۔ ''تم جانتے ہو بھیا ابا حضور کے لئے میں آج بھی مالتی بنتا جارہی ہوں۔ تین نمازی جن کر میں نے اسلام سے اپنی وفاداری کا ثبوت مہیا نہ کر دیا ہوتا تو شاید آجکل کی اس فضا میں یہ لوگ مجھے کافرہ یعنی ہندو زادی کہہ کر گھر سے بے دخل کر دیتے۔ عالم سامنے بیٹھے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ مجھ سے پیار کرتے ہیں مگر یہ ابو کے بیٹے پہلے ہیں اور میرے شوہر و خداوند بعد میں۔ ان کی کیا مجال جو باپ کے سامنے سر اٹھا کر بات بھی کرسکیں۔ سسر جی لفظ کے اصلی معنوں میں راجپوت سردار ہیں''۔ عالم بولے ''نومسلم دوسرے مسلمانوں سے کہیں زیادہ کٹر ہوتے ہیں باوجودیکہ ہماری جڑیں راجپوتانہ کی اس دھرتی میں گڑی ہیں جو کبھی صرف ہندو راجپوتوں کی ملکیت تھی۔ ہم لوگ سرے سے ہی بھلا چکے ہیں کہ ہمارے پرکھے کبھی ہندو راجپوت تھے''۔

میں نے جب جاننا چاہا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ہندو ہیں بڑے ابو نے انہیں بہو کے طور پر کیسے قبول کرلیا تو وہ تقریباً رو دیں۔ شوہر کو ایکدم نظرانداز کرتے ہوئے وہ بولیں۔ ''مصلحت بڑی ظالم

چیز ہوتی ہے بھیا۔ بڑے سے بڑے آدمی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عالم میرے والد کے ماتحت تھے۔ وہ بڑے ہی اچھے انسان ہیں اور ہماری شادی کی وجہ ہمارا ایک دوسرے سے پیار ہی تھا۔ مگر اس گھر میں میرے قبول کیے جانے کی وجہ ہمارا پیار نہ تھا۔ میرے بابا کا رتبہ اور وہ رسوخ تھا جس کی وجہ سے یہ اس علاقے میں بابا کی اسی چائے کمپنی کے واحد ڈسٹری بیوٹر بنے بیٹھے ہیں جس میں کبھی ایک معمولی ملازم تھے اور یہ بھی جان لو بھیا کہ اس گھر کی خوشحالی کی وجہ ابا جان کی بڑی نوکری نہیں تمہارے ان عالم بھیا کا کاروبار ہے''۔

''یہ سب تو میں جانتا ہوں، پھر بھی بھابھی کبھی کبھی تو یہ لوگ!''

''یہ سوال ایک بار ابا کے ایک دوست نے بھی اٹھایا تھا۔ جانتے ہو انہوں نے کیا جواب دیا۔ ''ہندو کی لڑکی گھر میں ڈال لی ہے۔ ہندو کو لڑکی دی تو نہیں''۔

''میں لجا سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ مگر کیا کرتی۔ دل سے مجبور تھی اور چنی کے علاوہ تین بچوں کی ماں بھی تھی''۔

یہ سن کر میرا اداس ہو جانا لازمی تھا۔ یہ چھیالیس سینتالیس کا دور تھا۔ نفرت کی یہ آگ کہیں شعلوں کی طرح نمایاں تھی تو کہیں اپلوں میں چھپی چنگاریوں کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ یہ تناؤ ہمیں کہاں لے جائے گا۔ اس کا اندازہ ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔

''میں تمہارا کرب سمجھتی ہوں بھیا۔ ہم تینوں سمجھتے ہیں کہ تم دونوں کا پیار گنگا میا کے پانیوں کی طرح پوتر ہے''۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ صغریٰ اپنا پیالہ لے کر اٹھ گئی تھی۔ اس روز شام کے آٹھ بج رہے تھے اور میں خراماں خراماں گھر لوٹ رہا تھا کہ اچانک یاد آیا کہ اس شام تو صغریٰ اور رشید کے کزن اظہار بھائی کے یہاں دعوت تھی جس میں ہر سال کی طرح اس بار بھی خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ وہاں رشید ہوگا اور صغریٰ بھی۔

میں نے اپنے گھر کا راستہ چھوڑ دیا اور نو بجے سے پہلے ہی قاضی محلہ پہنچ گیا۔ میں نے جیسے ہی ڈاکٹر اظہار الحسن رضوی کی نیم پلیٹ پڑھی دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ دروازہ کافی دیر کے بعد کھلا۔ کھولنے والا صاحب خانہ خود تھا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ ماحول کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ لوگ جو پہلے ہی سے وہاں جمع تھے۔ مجھے دیکھ کر ہکے بکے سے رہ گئے۔ کسی نے آگے بڑھ کر نہ مجھے خوش آمدید کہا نہ رسمی سلام دعا ہی بلائی۔ باہر کھڑے کھڑے میں نے ان لوگوں کو بلند آواز میں چہکتے اور خوشیاں مناتے سنا تھا۔ تو پھر یہ ایکا ایک کیا ہو گیا۔ یہ بھلے لوگ ایکدم پتھرا سے کیوں گئے ہیں؟

میرے سامنے صغریٰ کھڑی تھی۔ باقی کے سب لوگ بھی میرے اپنے ہی لوگ تھے۔ کوئی نیا یا غیر مانوس چہرہ نہ تھا۔ سب کے سب جانے پہچانے لوگ تھے۔ وہی تصویر۔ تو پھر؟

مگر یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہی۔ ان لوگوں کی آنکھوں کا اجنبی پن جس سے میں کسی قدر بوکھلا سا گیا تھا، دھیرے دھیرے دوستانہ مسکراہٹوں میں بدلنے لگا حتیٰ کہ ہر آنکھ میں مجھے وہی پہلے والی رفاقت اور دوستی دکھائی دینے

گی۔ میں نے یہ تصویر کئی بار دیکھی تھی اور اس کے خدوخال سے پوری طرح مانوس تھا۔

اب ہر کوئی سنبھل گیا تھا۔ میں خود بھی پوری طرح ری لیکس ہو گیا تھا۔ ہر آنکھ کی سختی پگھل کر نرم و تر ہو گئی تھی اور پتھر کے بے جان مجسمے پھر سے جاندار ہو گئے تھے۔ اس غیر موافق منظر کو موافق بننے میں کتنی دیر لگی۔ میں ابھی اندازہ بھی نہ کر پایا تھا کہ رشید نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ چھوٹی اماں آمنہ بیگم نے بھی بیٹے ہی کی طرح آگے بڑھ کر میری بلائیں اتاریں اور میرا ماتھا چوما۔

ساجدہ بھابھی (بیگم اظہار) نے بڑے فخر سے اٹھ کر اپنے شوہر کو جھنجوڑتے ہوئے کہا "لاؤ میری شرط کے روپے"۔

اظہار نے دس دس کے پانچ نئے نوٹ بیوی کو تھماتے ہوئے کہا۔

"اللہ قسم سجدے" آج یہ شرط ہار کر میں جو اطمینان اور جس قسم کی مسرت سے دوچار ہو رہا ہوں وہ مجھے شرط جیت کر بھی نہ ملتی۔ جب تمہارا اپنا بھائی بھی نہ پہنچ سکا تو میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ یہ حضرت بھی نہ آسکیں گے۔ شہر میں اتنا تناؤ ہے کہ رات تو ایک طرف دن میں بھی ہندو مسلمان اور مسلمان ہندوؤں کے محلوں میں جانے سے کتراتے ہیں۔ تیری ضد کہ اگر اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے تو ضرور آئے گا۔ سچ سچ بڑی ہی خوبصورت تھی"۔

"مجھے یقین تھا اور تم جانتے ہو کہ یقین بڑی چیز ہوتی ہے" یہ کہہ کر ساجدہ نے بیس بیس روپے نیلوفر بھابھی اور صغریٰ کو تھما دیئے اور باقی کے دس اپنے پاس رکھ لئے۔

"مجھ سے بھی زیادہ نیلوفر بھابھی اور صغریٰ بی بی کو یقین تھا کہ بھائی جان نے وعدہ کیا تھا تو ضرور تشریف لائیں گے"۔

اب دلاور خاں صاحب نے بھی آگے بڑھ کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بڑی ہی رقت آمیز آواز میں گویا ہوئے۔ "راجپوت ہو کر میں راجپوتی وچن کی اہمیت بھول گیا تھا بیٹے۔ اللہ تجھے لمبی عمر دے"۔

چند ہی لمحوں میں اچھے انسانوں کی وہ محفل پھر لہکنے، چہکنے اور مہکنے لگی۔ مجھے ایکدم یاد آیا کہ آج تو عید ہے۔ "عید مبارک" کا نغمہ میرے منہ سے نکلا ہی تھا کہ ساجدہ بھابھی ایک بڑی سی طشتری میں بوٹیاں پروس لائی۔ طشتری میں تین چمچ تھے۔ سب سے پہلے بوٹیوں کو اظہار نے چکھا۔ پھر رشید نے اور پھر میں نے اور بعد میں تینوں نے مل کر۔

"جانتی ہیں دادی اماں"۔ میں نے راشدہ بیگم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں نے مجھے جھوٹی بوٹیاں کیوں کھلائیں۔ اس لئے کہ میں شک نہ کروں کہ...... "میرا گلا رُندھ گیا اور پھر رشید کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "ترے ہاتھ سے زہر پی لوں گا پیارے تو وہ بھی امرت بن جائے گا۔ تو میرا یار ہے۔ بھگوان قسم۔۔۔" میں آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ جذبہ گہرا اور سچا ہو تو الفاظ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

اب سب کی آنکھوں میں موتی تیرنے لگے تھے۔ راشدہ بیگم اور دلاور خاں صاحب کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئی تھیں۔ اے کاش میں ان انمول

موتیوں کو سمیٹ کر، سنبھال کر رکھ سکتا۔ ان کی آب آج بھی میری روح میں محفوظ ہے۔ میری یادوں کا ایک ناقابلِ فراموش سرمایہ ہے۔

ہائے وہ دن۔ وہ لوگ۔ وہ پیارے پیارے لوگ۔

جب سب لوگ کھا پی چکے اور ہنسی مذاق کا دور پھر شروع ہو گیا تو کنبے کے بزرگ لوگ یعنی رشید کی دادی اماں اور ابو جوانوں کی محفل چھوڑ کر اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد میں باتھ روم میں گیا تو ان لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب تقریباً جڑے ہوئے دیکھا۔ ظاہر تھا کہ وہ محوِ گفتگو تھے اور کسی بڑی ہی گمبھیر سمیا پر مکالمہ آرا تھے۔ دوسروں کی پرائیوٹ باتیں سننے سے میں نے ہمیشہ پرہیز کیا ہے مگر اپنا نام سن کر میں ان کے کمرے کے باہر ٹھٹھک گیا۔ اماں کہہ رہی تھیں۔ ''ہائے اللہ کتنا پیارا بچہ ہے۔ مجھے تو سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ کمبخت کافر ہے اور دوزخ کو جائے گا۔ میرا بس چلتا تو کلمہ پڑھا کر اسے سچا مومن بنا لیتی تاکہ عاقبت سدھر جاتی غریب کی''۔

آمنہ بیگم نے اپنی ساسو ماں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''انہیں سمجھاؤ نہ اماں۔ ہم بیٹی والے ہیں۔ رسول کی خدمت کا اس سے بڑھیا موقعہ پھر کب ملے گا۔ میں ہوں تو آپ دونوں سے چھوٹی مگر دنیا کا کچھ تجربہ مجھے بھی ہے اور میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ہماری صغریٰ اس ہندو چھوکرے پر جان چھڑکتی ہے۔ یہ محض استاد و شاگرد کا رشتہ نہیں بہت ہی گہرے قسم کا لگاؤ ہے۔ حیادار مسلمان بچی ہے اسی لئے کچھ بولتی نہیں''۔

اب باری دلاور خان صاحب کی تھی۔ ''آپ دونوں ٹھیک فرماتی ہیں۔ میں خود بھی آپ لوگوں سے متفق ہوں مگر موجودہ حالات میں یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ اب چند ہی دنوں کی تو بات ہے بٹوارہ ہوا نہیں کہ — پھر کون یہاں سے جائے گا۔ تم دیکھ لینا اِدھر کے سب ہندو مسلمان ہو جائیں گے اور اُدھر کے سب مسلمان ہندوؤں کا مذہب قبول کر لیں گے''۔

بڑی اماں نے آہ بھر کر کہا۔ ''کیسے برے دن آ گئے ہیں۔ انسان کی جان کی تو کوئی قیمت رہی ہی نہیں۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے بیٹے کہ اور خون خرابہ نہ ہو۔ اس سے تو یہی بہتر ہو گا۔ نجانے مجھے ابھی کیا کیا دیکھنا ہے۔ وعدہ کرو دلاور بیٹے کہ اگر واقعی ایسا ہوا جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو اس بچے کے اسلام قبول کرتے ہی تم اسے اپنی فرزندگی میں لے لو گے''۔

دلاور خاں صاحب کا جواب سنے بغیر ہی میں وہاں سے ہٹ گیا۔ اور چپ چاپ بیٹھک میں لوٹ آیا۔ بڑوں کی باتیں سننے کے بعد اب میں مسلمانوں کے اس کنبے کی نوجوان پیڑھی کی باتیں سن رہا تھا۔ کتنا فرق تھا دونوں کے لہجے میں۔ سوچنے کے انداز میں۔ تین نوجوان مرد اور تین نوجوان عورتیں۔ تین نہیں دو۔ میری صغریٰ کوئی عورت تھوڑے ہی تھی۔

خوشی کا موقعہ ہو تو ہم عمر لوگوں کی باتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ موضوع کوئی بھی ہو۔ کوئی مخصوص موضوع نہ بھی ہو تو بھی۔

میں سوچ رہا تھا۔ ''صغریٰ کو پانا کتنا سہل ہے۔ میں آج مسلمان ہو جاؤں تو وہ مجھے آج ہی مل سکتی ہے۔ ابو اور دادی اماں کو بھی صرف میرے مذہب پر اعتراض ہے۔ پسند مجھے وہ بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے بڑے سب

کے سب میرے خیر خواہ ہیں۔ میرا بھلا چاہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جوان پیڑھی مجھے ایسے ہی سویکار کرنے کو تیار ہے اور بزرگ لوگ تھوڑی قربانی چاہتے ہیں۔ آج جسے میں قربانی کہتا ہوں کل میری مجبوری بھی بن سکتی ہے۔''

''تم چپ چاپ کیوں ہو۔ اندر سے کچھ سن کر آئے ہو کیا؟''

میں ایکدم چونک اٹھا جیسے چوری کرتے پکڑا گیا ہوں۔ ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں''۔ پھر میں نے ساجدہ اور نیلوفر سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تم لوگوں کی شادی ہوتے ہی تم لوگوں کا نام بدل جاتا ہے۔ دھرم بدل جاتا ہے۔ ذات بدل جاتی ہے۔ یہ تمہیں کیسا لگتا ہے؟''

جواب پہلے نیلوفر بھابھی نے دیا ''یہ یگوں پرانی ریت ہے بھیا مگر کسی بھی یگ میں یہ عورت کی پرابلم نہیں رہی۔ مگر میں پوچھتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔ یعنی کہ میں مالتی کیوں نہیں رہی، نیلوفر کیوں ہوگئی ہوں اور میری اولاد مسلمان کیوں ہے، ہندو کیوں نہیں۔ میں نے عالم سے شادی کی تھی تو اس قسم کے سوالات میرے ذہن میں کبھی نہ ابھرے تھے۔ میرا ایمان تھا کہ میری انفرادیت، میری ذات اور میری شخصیت کا بھی کچھ مطلب ہے''۔

ساجدہ بولی — ''میں نہیں مانتی نیلوفر بھابھی کہ اس قسم کے سوالات، اب تمہارے ذہن میں کبھی نہ اٹھتے ہوں۔ تمہاری رگوں میں ہندو خون ہے اور تمہارے سنسکاروں کا منبع اسلام نہیں ہندو دھرم ہے۔ میرے اپنے ذہن میں تو یہ سوال تقریباً ہر روز ہی اٹھتا رہتا ہے۔ نام اور دھرم تو میرا بھی بدلا ہے مگر اظہار حق خودارادیت کا احترام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ہیں لہٰذا جانتے ہیں کہ ہندو، مسلمان اور عیسائی کے خون کا رنگ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ میں ان کی پرستار ہوں اور یہ بھی مجھے بے پناہ پیار دیتے ہیں۔ انہیں میرے صلیب پہنے رکھنے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی''۔ اور انہوں نے اپنی چھاتی کے ابھاروں کے درمیان سے سونے کی زنجیر کھینچ کر دکھائی جو وہ ہر وقت پہنے رکھتی تھیں مگر اظہار بھائی کے علاوہ کنبے کے کسی فرد کو معلوم نہ تھا کہ وہ کراس پہنے رہتی ہیں۔ ''جب میں اپنے ننھے شہزادے کو پیٹر محمود کہہ کر بلاتی ہوں تو لوگ مسکرا دیتے ہیں۔ وہ اسے مذاق سمجھتے ہیں مگر خدا گواہ ہے کہ میرے بیٹے کا یہی نام ہے۔ نیلوفر کے بیٹے بیٹیوں کے نام بھی کچھ اسی قسم کے ہونے چاہئے تھے مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیوں نہیں ہوا۔ اس کی وجہ ہم سب جانتے ہیں''۔

صغریٰ جو چپ بیٹھی تھی کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''کیا آپ لوگوں نے کبھی سوچا ہے کہ جب ہمارے پہلے پُرکھے نے اسلام قبول کیا ہوگا تو اس بیچارے پر کیا گزری ہوگی''۔

بات بگڑ نہ جائے یہ سوچ کر میں نے کہا ''مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے جس پر کسی قوم، فرقے یا نسل کی اجارہ داری نہیں۔ ہر مذہب کی طرح اسلام بھی ایک خوشبو اور روشنی ہے۔ نئے ہونے والے مسلمانوں نے اسلام کے لئے جو کام کیا اور جو قربانیاں دی ہیں وہ کسی سے چھپی نہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کے ترجمے کئے۔ تفسیریں لکھیں۔ مدرسے قائم کرکے قرآن مجید کے ہزاروں حافظ پیدا کئے اور اپنے مذہب کی تبلیغ میں پوری حیات لگا دی۔ سب کے سب کسی ڈر یا خوف یا دباؤ یا ذاتی آسودگی کے لئے مسلمان

ہوئے تھے، یہ میں نہیں مانتا۔ تلوار عقیدوں کی قاتلہ ہے محافظ نہیں''۔

اس روز میں کافی دیر بعد گھر پہنچا۔ وہ لوگ مجھے اپنے محلے کی نکڑ تک چھوڑنے آئے تھے۔ وہ رات ایک قیامت کی رات تھی۔ میں تقریباً نور کے تڑکے تک کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا۔

وہ لوگ میری تقریر کو سن کر کیا سوچتے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اچھا ہی سوچتے ہوں گے۔ میں نے عشق بھی کیا تو کہاں۔ مگر ایسی کونسی نئی بات کر دی تھی میں نے۔ عشق تو ہوتا ہی غلط جگہوں پر ہے۔ یہی تو اس کی روایت ہے۔ میں کوئی ایسا کٹر قسم کا مذہب پرست نہیں ہوں۔ کبھی مندر نہیں جاتا۔ کبھی کسی پوجا پاٹھ یا یگیہ وغیرہ میں بھی شامل نہیں ہوتا۔ ہندو دھرم کا ایک بھی منتر مجھے یاد نہیں۔ سب ٹھیک ہے اور مجھے اسلام بطور دینی عقیدہ پسند بھی ہے مگر اس میں کیا تک ہے کہ میں محض اس لئے مسلمان بنا دیا جاؤں کیونکہ مجھے ایک مسلمان لڑکی سے عشق ہے۔ صغریٰ مسلمان ہے اس کی میرے ساتھ شادی ہو جائے تو وہ ہندو ہو جائے گی۔ مگر کیوں۔ نہیں ایسا کبھی نہ ہوگا۔ صغریٰ کیا پیارا نام ہے۔ میرے گھر والے اسے سنگرا کہہ کر بلاتے ہیں تو بھی وہ برا نہیں مانتی۔ نہیں صغریٰ صغریٰ ہی رہے گی اور میں میں ہی رہوں گا۔ آدمی کو عورت کی طرح اپنا نام بدلنا ہوتا ہے نہ اپنے مذہبی عقیدے تو پھر عورت ہی کیوں نیا جنم لے۔ آج ثابت ہو گیا کہ نہیں کہ عورت صرف اپنا نام بدلتی ہے دوسرا کچھ نہیں۔

اسلام ایک خدا، ایک رسول اور ایک مقدس کتاب کو ہی اپنا سب کچھ مان کر چلتا رہا ہے جبکہ ہم ہندوؤں کے ہزاروں خدا ہیں اور ہزاروں مذہبی عقیدے۔ آپ شو کے اُپاسک ہیں تو شوآئیٹس (SHIVAITES) ہیں، وشنو کو مانتے ہیں تو ویشنوائیٹ ہیں۔ آپ آدی گرنتھ کے پیروکار ہیں، آریہ سماجی یا نرنکاری یا رادھا سوامی ہیں۔ دیوی کے پجاری ہیں۔ اگنی، وائیو یا اندر کے ماننے والے ہیں تو بھی آپ ہندو ہیں۔ ہندو دھرم تو مختلف عقیدوں کی ایک پارلیامنٹ ہے۔ آپ کسی دیوتا کو نہ مانو تو بھی آپ ہندو ہیں۔ ہر آدمی ہندو پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں کچھ مسلمان بن جاتے ہیں تو کچھ عیسائی وغیرہ۔

صغریٰ کے ابو، بڑی اور چھوٹی اماں، نیلوفر بھابھی اور عالم، ساجدہ بھابھی اور اظہار اور بھائی رشید سب کے سب میرے خیر خواہ ہیں۔ میرا بھلا چاہتے ہیں۔ اور صغریٰ۔ میری صغریٰ۔ میری اپنی۔ میری۔ سوچتے سوچتے جب میرا دماغ شل ہو گیا تو میں صغریٰ کو اپنے ساتھ چمٹا کر سو گیا۔

آخر وہ منحوس گھڑی آ ہی پہنچی۔ جس روز بٹوارے کا اعلان ہوا میں دلی میں تھا۔ جالندھر اور امرتسر ہندوستان کے حصے آئے اور لاہور سے پرے کا علاقہ پاکستان میں شامل کر دیا گیا۔ قلم کی ایک ہی جنبش نے برصغیر کے ٹکڑے کر دئے جیسے بجاج ناپ تول کر کپڑا پھاڑتا ہے۔

اب جو نعرہ بلند ہوا وہ تھا ''ہر ہر مہادیو'' یا ''جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال''۔ میں جالندھر پہنچا تو سارے شہر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ غازیوں کی لاشوں سے بازار، سڑکیں اور گلیاں بھری پڑی تھیں۔ رسول کے بیٹے بیٹیاں جو کسی وجہ سے ابھی تک بچے ہوئے تھے۔ بے سہارا مظلوموں کی طرح گھروں کے دروازے بند کئے بے حس و حرکت خدائے پاک سے اپنے گناہوں کی معافیاں

مانگ رہے تھے۔ اظہار کا گھر چونکہ راستے میں پڑتا تھا لہٰذا میں پہلے وہیں گیا۔ دلیز پر اظہار کے ملازم کی لاش پڑی تھی اور گھر ایکدم خالی تھا۔ سارا ساز و سامان لوٹا جا چکا تھا۔ وہاں سے اپنے محلے میں آیا تو وہاں بھی یہی کچھ دیکھنے کو ملا۔ صغریٰ کے گھر کے دروازے تک لوگوں نے جلا دیئے تھے اور گھر کے مکین لاپتہ تھے۔ محلے کے لوگ عجیب قسم کی بے حیائی سے چہک چہک کر بتا رہے تھے۔ ''ہم نے سب کو ختم کر دیا۔ یہ محلہ کیا آجو باجو کا کوئی بھی مسلمان نہ بچا ہوگا''۔

میں سر پکڑ کر اپنی بیٹھک کی دلیز پر بیٹھ گیا۔ مہندر جو ہمارا پڑوسی تھا اور رشید کا بیڈمنٹن پارٹنر، کچھ ایسی بے حیائی سے اپنے کارنامے بیان کر رہا تھا کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ ''ہم نے سب سالوں کا صفایا کر دیا۔ مگر یار میرے، ایک حسرت رہ گئی۔ وہ سالا دلاور خاں اور اس کے کنبے کے لوگ ہاتھ سے نکل گئے۔ جانتے ہو اس سالے نے سرِ عام قسم لی تھی کہ وہ تیرے سارے خاندان کا خاتمہ کر دے گا اور تیری ماں اور بھاوج کی سرِ بازار بے حرمتی کرے گا کیونکہ تم نے اس کی عزت پر حملہ کیا تھا۔ نجانے کیسے صغریٰ کے نام لکھے ہوئے تمہارے چند خطوط اس کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ ایوارڈ سے ایک دن پہلے اس نے اپنی بچی کو بھی خوب پیٹا تھا۔ بیچاری کی چیخیں دور دور تک سنائی دیتی تھیں۔ مگر یار میرے تم بھی بڑے رستم نکلے۔ ہاتھ بھی مارا تو کہاں۔ بھگوان قسم تم پر رشک آتا ہے۔ یقین مانو، صغریٰ مجھے مل جاتی تو تیرے لئے بچا کر رکھ لیتا۔ مگر بیچاری شاید تیج پوریوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس محلے پر سب سے پہلے انہوں نے ہی حملہ کیا تھا۔ ایوارڈ کے چند ہی گھنٹوں بعد گویا ایوارڈ کا اعلان سالے فرنگیوں کا حکم نامہ تھا کہ جاؤ ہم سے جو بن پڑا ہم نے کیا۔ اب تمہاری باری ہے''۔

میں سر جھکائے سب کی سنتا رہا۔ میری ماں' بڑا بھائی اور بھاوج بھی وہیں دلیز پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بھائی بیمار تھا لہٰذا ماں نے اسے آرام کرنے اندر بھیج دیا اور بہو سے بھی کہا کہ وہ اپنے شوہر کو دیکھے۔

ہم ماں بیٹے اپنے اپنے خیالوں میں گم سم بیٹھے نجانے کیا سوچ رہے تھے۔

''کہیں کوئی بڑا گناہ ضرور ہوا ہے، جو اتنا بڑا بھونچال آ گیا''۔

''انسان مر رہا ہے۔ ہماری ساری تہذیب مر رہی ہے''۔

مندر کے پجاری پنڈت شو دیال جی اُدھر سے گزرے تو ہمیں دیکھ کر رک گئے۔

''ایک تم ہی ہو برخوردار۔ ورنہ دیکھتا ہوں ہر کسی نے اپنا گھر بھر لیا ہے''۔

اتنے میں ایک دوسرے بزرگ آ پہنچے ''یہ بیچارہ تو دلّی میں تھا اور اس کا بھائی بیچارہ تو دائمی مریض ہے''۔ میں اپنی کاہلی پر ندامت محسوس کر رہا ہوں۔ غالباً یہ سوچ کر انہوں نے میری حمایت میں یہ سب کہنا ضروری سمجھا تھا۔

''ہر ایک نے اپنا فرض ادا کیا''۔ فرض؟ یہ کیسے لوگ ہیں۔ کہاں چلا گیا ہے ان کی آنکھوں کا پانی۔

آخر جب کرفیو کا اعلان ہو گیا اور بھیڑیئے پھر بھیڑیں بن کر اپنے اپنے ڈربوں میں بند ہو گئے تو میں اور ماں بھی باہر کا کواڑ بند کر کے اندر چلے

گئے۔ اندر والے کمرے میں ہم نے ابھی پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ کوئی آ کر میرے ساتھ چمٹ گیا۔ یہ صغریٰ تھی۔

بھائی صاحب اندر آ کر بستر پر لیٹ گئے تھے اور بھابھی ان کے پاؤں دبا رہی تھی۔ عالم اور رشید ان کے سرہانے بیٹھے باری باری ماتھا سہلا رہے تھے۔ باقی لوگ یعنی دلاور خاں صاحب، بڑی اماں، چھوٹی اماں، نیلوفر، اظہار اور ساجدہ کمرے کے دوسرے کونے میں دبکے بیٹھے تھے۔ چھوٹے بچے بھی دہشت کے مارے انہی کی طرح چپ چاپ بیٹھے تھے۔

میں جو ایک اداس اور شکست خوردہ انسان کی طرح کمرے میں داخل ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ایکدم چونک گیا۔ فخر سے میری گردن تن گئی۔ اور مسرت سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ اپنی بیوہ ماں کے لئے اس روز میں نے جس قسم کی عقیدت محسوس کی اس کا بیان لفظوں میں کرنا میرے لئے آج بھی ممکن نہیں۔ صغریٰ کو اپنے ساتھ چمٹائے چمٹائے میں نے کمرے کے ہر مکین کو دیکھا اور جب مجھے پورے طور پر اطمینان ہو گیا کہ اس کی اس لاابالی، مگر بڑی ہی نیچرل حرکت سے کوئی بھی خفا نہ تھا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ اندر سے خاموش ہو چکے ہیں۔ وقت کی کج ادائی کا پچھاڑا دلاور خان راجپوت بھی اب پوری طرح سے ہار چکے ہیں۔

ساجدہ بتا رہی تھی۔ ''اس رات ہم سب پریشان تھے اور اپنے اندھیرے مستقبل کے بارے میں مختلف زاویوں سے سوچ رہے تھے کہ صغریٰ نے کہا۔ ''ایک دروازہ اب بھی کھلا ہے ہمارے لئے۔ میرے اپنے گھر کا دروازہ''۔ عین اسی وقت رشید نے آ کر اطلاع دی کہ تیج پوریے اس محلہ پر حملہ کرنے کی ترکیبیں بنا رہے ہیں۔ انہیں کچھ خوف ہے تو ابا کی بندوق سے جس میں ہم سب جانتے ہیں کہ اتنی گولیاں بھی نہیں کہ ہم سب خودکشی کر سکیں''۔

صغریٰ نے پھر دوہرایا۔ ''چلو میرے گھر چلو''۔ ہم میں سے کسی ایک نے بھی نہ پوچھا کہ لڑکی تیرا کون گھر ہے۔ بڑی اماں کے منہ سے بھی بس اتنا ہی نکلا تھا ''مگر تیرا وہ تو دتی گیا ہوا ہے''۔

''تو کیا۔ ماں تو ہے۔ بڑے بھیا اور بھابھی تو ہیں''۔

بیٹی کے جس پیار پر دلاور خاں صاحب کل تک اتنے خفا تھے کہ بچاری کی جان لینے پر تل گئے تھے۔ وہی پیار اب ان کی زندگیوں کا آخری سہارا بن کر آیا تھا۔ صغریٰ خود چل کر ماں کے پاس آئی تھی۔ پھر ماں اور بڑے بھیا خود گئے تھے ان لوگوں کے گھر اور سب کو چپکے چپکے ایک ایک کر کے اوپر چھت کے راستے سے اپنے گھر لے آئی تھی۔ وہ لوگ رات ہی رات میں اپنا سارا قیمتی سامان بھی اٹھا کر لائے تھے۔ کپڑے، زیور، نقدی، ضروری کاغذات وغیرہ۔

ساری تفصیلات سن کر میں اپنی ماں کے قدموں میں گر گیا۔ ''تو نے میری لاج رکھ لی ماں۔ تو واقعی ایک ماں ہے''۔

''ہٹ رے۔ پگلا کہیں کا۔ یہ میں نے تیرے یا شکراں کے لئے نہیں کیا۔ یہ میں نے ایک اچھے پڑوسی کے ناتے کیا ہے۔ مگر بیٹے ہم ابھی جو کر سکے ہیں کہیں بیکار نہ چلا جائے کیونکہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں''

''نہیں ماں'' میں نے تحکمانہ لہجے میں اعلان کیا۔ ''ان پر حملہ کرنے

والوں کو اب پہلے مجھ سے نپٹنا ہوگا۔ پہلے میرا سر قلم کرنا ہوگا۔ دیکھتا ہوں ایسا مائی کا لال بلوؤں کی اس بستی میں کون ہے''۔

میں ہر ایک سے گلے ملا۔ بڑوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے۔ بڑی اور چھوٹی اماں نے باری باری میری بلائیں اتاریں اور ہم عمروں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آنکھوں ہی کی زبان سے کہا۔ ''ہمیں تم پر ناز ہے۔ اب کچھ بھی ہو جائے۔ موت نے ایک دن تو آنا ہی ہے۔ ہم اب کہہ سکیں گے کہ ہم بے موت نہیں مرے''۔

ہر آنکھ میں محبت، یقین اور بھروسے کی چمک تھی۔ خوف، ندامت کی خفیف سی جھلک بھی کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ موت کا ڈر تو جیسے ایکدم غائب ہو گیا تھا۔

جالندھر میں ان دنوں فلش کا انتظام بہت کم گھروں کو میسر تھا۔ ڈرائی لیٹرن کا رواج عام تھا۔ روز کا مَل مُوتر اٹھانے جمادارنی آتی تھی۔ ان لوگوں کا مَل مُوتر جو اب تک میری ماں ہر صبح و شام چپکے سے ساتھ والے گندے نالے میں پھینکنے جایا کرتی تھی اب میں اٹھانے لگا تھا۔ جمادارنی کو یہ کام کرنا ہوتا تو ظاہر ہے کہ حیران ہو جاتی کہ ان دنوں ان لوگوں نے اچانک ایسا کیا کھانا شروع کر دیا ہے کہ — لیٹرن عام رواج کے مطابق ہماری چھت پر تھی۔ رات کو تو وہ لوگ ایک ایک کر کے اوپر ہو بھی آتے مگر دن کو یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کیونکہ آس پاس کے کتنے ہی گھر ہمارے غریب خانے سے قد آور تھے۔ دن میں کسی کو بھی حاجت ہوتی تو وہ وہیں کمرے میں ہی پردہ ڈال کر فارغ ہو لیتا۔ پورے دس دن وہ لوگ اسی طرح اسی ایک کمرے میں بند رہے۔

وہ غالباً آٹھواں دن تھا جب ساجدہ بھابھی کے بھائی والٹر پیٹر نے آ کر خبر دی کہ اس نے مسلم پناہ گزین کیمپ کے کمانڈر کو اطلاع پہنچا دی ہے۔

یہ کیمپ جسے غالباً بلوچ رجمنٹ کی ایک ٹکڑی چلا رہی تھی جالندھر چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن کے قریب کھلے میدان میں بڑے بڑے ٹینٹ لگا کر چلایا جا رہا تھا۔ اس کی کمان کیپٹن — ضیاء الحق (جو خدا کے فضل و کرم سے آج صدر پاکستان ہیں) کے پاس تھی جو جالندھر کے کوٹ پکشیاں کے ایک ممتاز گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ ہم سب ہی اُسے جانتے تھے۔ ان دنوں بھی اس نوجوان افسر کی شخصیت میں ایک ایسا وقار تھا جو عام افسروں میں دیکھنے کو کم ہی ملتا ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے بھی وہ کتنے ہی ہندوؤں کا جگری دوست تھا۔

''اب کوئی فکر کی بات نہیں۔ اس نے وعدہ کیا ہے تو ضرور آئے گا۔ سچ کہتا ہوں برادر، جب میں نے اسے بتایا کہ یہ سب لوگ تمہارے گھر میں پناہ لئے ہوئے ہیں تو عقیدت و احترام سے اس کی آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ اسے ایکدم ایک ایسی ہی مہم پر کسی نزدیک کے گاؤں میں نہ جانا ہوتا تو شاید میرے ساتھ ہی آ جاتا۔ اب یہ آخری دن ہے ہمارے امتحان کا''۔ والٹر ایک بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ساجدہ کو اس نے اپنی چھاتی سے چمٹا رکھا تھا۔

''میں نے تیری شادی کی رضامندی کیا اس لئے دی تھی کہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ ہم سوچا کرتے تھے کہ اس نئے رشتے کی بنا پر ہم تم دونوں کو پاکستان جانے سے روک سکیں گے اور آج خود ہی تم دونوں کو جلاوطن کر رہے ہیں''۔

صغریٰ جو ماں کی گود میں بیٹھی دھیرے دھیرے سسک رہی تھی والٹر
کی بات سن کر بلک بلک کر رونے لگی۔ "میں پاکستان نہیں جاؤں گی ماں جی،
مجھے اپنے پاس رکھ لو۔ میں تمہاری بیٹی بن کر رہوں گی۔ تم سب کی خادمہ بن کر
رہوں گی"۔

دلاور خاں صاحب کے چہرے پر غمزدگی تھی۔ شکست خوردگی تھی مگر
غصہ قطعی نہ تھا۔ وہ شخص چپ چاپ بیٹھا اوپر چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ وہ
سخت جان راجپوت سردار رو تو نہ رہا تھا مگر آنکھیں اس کی بھی بھیگی جا رہی تھیں۔

راشدہ بیگم نے اٹھ کر میری ماں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے
ہوئے کہا۔ "یہ ٹھیک کہتی ہے بہو۔ یہ تیری بہو ہے۔ اس کا گھر اب یہی ہے۔
لڑکی کی کوئی ذات نہیں ہوتی بیٹی۔ کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ جالندھر پاکستان میں
آجاتا تو ہم تیرے بیٹے کو کلمہ پڑھا کر ان دونوں کا بیاہ کر دیتے۔ اب ہمیں وہی
کرنا چاہئے جو اس نئے منظرنامے میں مناسب اور درست ہے۔ ہم نے ایک
ہندو لڑکی کو اپنی بہو بنایا تھا۔ اب اپنی لڑکی کو ایک ہندو گھر میں دے کر قرضہ چکا
دیں گے۔ تم صغریٰ کو ہندو بنا کر یہیں رکھ لو۔ ہمیں کوئی اعتراض ہوگا نہ شکایت۔
یہ میں کسی ڈر یا خوف کی وجہ سے نہیں کہہ رہی پورے دل سے کہہ رہی ہوں"۔

دوسرے روز سورج نکلنے سے گھنٹہ بھر پہلے ہی کیپٹن ضیاء الحق کی کمان
میں تین فوجی گاڑیاں دندناتی ہوئی ہماری گلی میں داخل ہوئیں۔ ایک بس تھی اور
دو مسلح گاڑیاں۔ جیپ میں ضیاء الحق خود اور اس کے صوبیدار بیٹھے تھے اور دن
ٹرک میں دو درجن مسلح فوجی اور بس میں کیمپ کی ایک مسلمان سوشل ورکر بیٹھی تھی۔

ہم لوگوں نے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ ایک ایک کر کے سارے پناہ
گزیں باہر آتے اور بس میں سوار ہوتے گئے۔ ساتھ ساتھ ان کا سامان بھی بس
میں لادا جاتا گیا۔ جب سب بس میں بیٹھ گئے تو بلوچی صوبیدار نے بس کا
دروازہ بند کر دیا۔ میں اور ماں اب گلی میں کھڑے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔
بڑے بھیا اور بھابھی دہلیز میں کھڑے تھے۔ کپتان نے بڑے احترام سے ماں کو
بڑا ہی پر تکلف سیلوٹ دیا۔ "میں کیپٹن ضیاء الحق مملکتِ پاکستان کے مقامی
نمائندہ کی حیثیت سے اپنے وطن، اسلام اور قائداعظم کی طرف سے آپ کا
شکریہ ادا کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ میں اور میرے ساتھی اور یہ خواتین و
حضرات جن کی قیمتی جانیں آپ نے اپنی جان پر کھیل کر بچائی ہیں۔ اس احسان
کا بدلہ اگرچہ کبھی بھی نہ چکا سکیں گے مگر آج کا یہ دن انہیں اور مجھے کبھی نہ بھولے
گا۔ آپ واقعی فخرِ انسانیت ہیں۔ ایک ماں ہیں"۔

اس جوانمرد پاکستانی سپاہی کے حوصلہ افزا الفاظ سن کر بھی ماں چپ
رہی۔ مگر جیسے ہی فوجی گاڑیاں واپس لوٹنے کو تیار ہوئیں وہ چیخ اٹھیں۔
"رُکو!"

پھر ایک زنانے دار طمانچہ میرے گال پر رسید کرتے ہوئے
چلائیں۔ "سنگرا کہاں ہے"۔

صغریٰ جو دروازہ کی اوٹ سے یہ سب دیکھ رہی تھی باہر آکر ماں کے
قدموں میں گر گئی۔ "مجھے رکھ لو اماں۔ میری اماں۔ میں تیری بیٹی بن کر رہوں گی۔
اس گھر کی خادمہ بن کر رہوں گی"۔

ماں جواب خود بھی رو رہی تھی جھک کر صغریٰ کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ بڑے پیار سے اس نے صغریٰ کو سینے سے لگا لیا اور جیب سے اپنا مدتوں پہلے سے اترا ہوا منگل سوتر نکال کر اپنی بہو کے گلے میں ڈال دیا۔ ''یگوں یگ سہاگ وتی رہو میری بیٹی۔ میں نے تجھے آج جی جان سے اپنا لیا ہے۔ مگر میں آج تجھے رکھ نہیں سکتی۔ جن لوگوں کی وجہ سے آج یہ سب ہوا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ انہوں نے کیا کر دیا ہے مگر کبھی جان جائیں گے تو میرا یقین ہے کہ پچھتائیں گے کہ ان ہی کے کارن آج ایک ماں اپنی بیٹی، ایک ساس اپنی بہو اور ایک بہادر راجپوت اپنی منگیتر کو جلاوطنی سے روک نہ سکا تھا''۔

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولیں مگر ان کی کھلی کھلی آنکھیں جو بہادر کپتان کے پُر وقار چہرے پر گڑی تھیں بلند آواز میں کہہ رہی تھیں۔ ''خدا کرے تجھے آج کا اپنا یہ وعدہ یاد رہے بہادر سپاہی۔ تُو تو جوان ہے۔ پاکستان کا مستقبل ہے۔ اگر تجھے یاد رہے تو کبھی ایسے حالات بھی پیدا کرنا کہ میری بہو اپنے گھر لوٹ سکے''۔ آنسوؤں کا ایک سمندر آنکھوں کے پپوٹوں میں تھامے وہ اندر چلی گئیں۔

میری صغریٰ اور ماں کی سنگراں پھر کبھی نہ لوٹی۔ وہ لوگ پاکستان پہنچے بھی کہ نہیں۔ پہنچے تو کہاں پہنچے اور اب کہاں ہیں۔ کسی کی کوئی خبر نہیں ملی۔

میرے اس غیر رسمی لگاؤ کی چرچا تو بہت ہوئی اور کئی سال ہوتی رہی مگر پھر بھی میرے اور صغریٰ کے رشتے کی پاکیزگی پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی۔ کچھ لوگوں کے لئے میں دیوداس تھا تو کچھ کے لئے مجنوں و فرہاد۔

اماں کی ایک سہیلی جو ان کی ہم نام ہی نہیں ان ہی کی طرح بیوہ اور غیر موافق حالات کا شکار تھیں اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کا رشتہ میرے ساتھ جوڑنا چاہتی تھیں۔ کہاں چودہ پندرہ سال کی وہ چھوکری اور کہاں پچیس چھبیس سال کا میں پورا مرد۔ مجھے یہ رشتہ منظور نہ تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں صغریٰ کا پتہ لگاؤں گا اور تب تک بیاہ کی نہ سوچوں گا جب تک کہ سن نہیں لیتا کہ وہ بیاہی گئی ہے۔

چار پانچ سال گزر گئے۔ جب کہیں سے کوئی خبر نہ آئی اور میں زندگی سے تقریباً مایوس و بیزار ہو گیا تو میں نے ماں کے اصرار پر بالآخر ہاں کر دی۔ میں ۳۱ برس کا تھا اور میری دلہن ۱۹ برس کی۔ اس نے بھی جیسے طے کر لیا تھا کہ وہ شادی کرے گی تو مجھ سے ورنہ کرے گی ہی نہیں۔ ہماری شادی ہو گئی۔ یہ شادی ہر اعتبار سے ایک کامیاب شادی کہی جا سکتی ہے۔

کئی برس بعد میری بڑی بیٹی نے جب میری پرانی کہانیاں سنیں تو اپنی ماں سے پوچھا۔

''تو تم نے لَو میرج کی تھی اماں؟''

''ارے نہیں ری۔ تیرے باپو نے کہا تھا کہ میں اس کے یوگیہ نہیں ہوں، بہت چھوٹی ہوں۔ مگر میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ تیری ایسی تیسی، تو کیسے میرے سے بیاہ نہیں کرے گا۔ تم اب اسے لَو میرج کہو یا کچھ اور۔ مگر یہ سب میری ضد کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ آخر اس آدمی میں ایسے کون سے سرخاب کے پَر لگے ہیں جو ایک مسلمان چھوکری اس کے لئے اپنا مذہب تک چھوڑنے کو تیار ہو گئی تھی''۔

''تمہیں وہ پنڈ نظر آئے کہ نہیں؟''

''نہیں رہی۔ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس نے البتہ میری ضد کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے تھے۔ یہ تھک گیا تھا اپنی لیلیٰ کی انتظار کرتے کرتے''۔

اپنی بیٹیوں کے ساتھ میرا رشتہ بڑا دوستانہ ہے۔ جب اس نے اپنی ماں کی یہ کہانی سنائی تو میں نے اسے آسکر وائیلڈ کا یہ جملہ سنا کر مطمئن کر دیا:

"Men marry because they are tired. Women marry because they are curious."

کچھ عشق شادی کے بعد بھی ہوتے ہیں۔ میں نے شادی کے بعد جس عورت سے عشق کیا وہ میری بیوی تھی۔ ہمارے اس عشق کی کامیابی کا ثبوت ہماری چار پیاری پیاری بیٹیاں ہیں۔

●●

اعصاب (Nerves)

محبت کا جدید روگ اعصاب کا ہے۔
پیار جو کبھی سیدھی سادی دیوانگی ہوا کرتا تھا
اب اپنے جذباتی مرض کے خضبناک مرحلوں کا مشاہدہ کرتا ہے
اور پہلے سے دوگنا مغموم نظر آتا ہے
کیونکہ وہ ایک تجزیہ کرانچ یا نچ اپنے اندر
داخل ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔
اے سیدھے سادے دماغوں کی صحت
اپنے آپ کو میرے حوالے کردے
اور کبھی آدھی رات کے اوقات میں
میری ساعت مجھ سے چھین لے
تاکہ گھنٹے کی یہ ٹِک ٹِک
میرے کانوں میں نہ آنے پائے..........
گھنٹہ جو میرے دماغ کو وقت بتاتا ہے..........
نہ تو یہ پیار ہے اور نہ پیار کی مایوسی
جو محبت اور نقصان کی ٹیسوں کو
حد سے سوا کر ڈالے۔
اعصاب، اعصاب!——
اے بچے کی حماقت! تو آسمان کے خواب دیکھتی ہے
لیکن رات میں آنکھ کھل جائے تو خوف سے چیخ اٹھتی ہے۔

آغا جانی کشمیری
تلخیص وترتیب: ف۔س۔ اعجاز

سحر ہونے تک

کامیاب اور مشہور پلے رائٹ آغا جانی کاشمیری کے اعترافات۔
ان کی سوانح عمری ''سحر ہونے تک'' سے مرتب کردہ۔

لکھنؤ - اب میں تیرہ سال کا تھا۔ فٹبال کا بہترین کھلاڑی۔ بے حد تندرست۔ حد کا طاقتور، گورا چٹا گلابی رنگ۔ محلے کے جس گھر میں گھس گیا لڑکیاں چیخ اٹھیں۔ ''ارے اماں یہ تو انگریز معلوم ہوتا ہے''۔ آج تک ایک دو کے نہیں سینکڑوں لڑکیوں کے یہی جملے کانوں میں گونجا کرتے ہیں۔ جو چوری چوری کنکھیوں سے مجھے دیکھا کرتی تھیں، اور میں زندگی کے اس راز کو سمجھنے کا جذبہ ہر لڑکی اور ہر عورت میں ڈھونڈا کرتا تھا۔ خاص طور پر شادی شدہ عورتوں میں۔ ان کے شوہروں کی غیر موجودگی میں۔ حسن اتفاق کہ کبھی ایسا موقع ہاتھ نہیں لگا۔ اور میں اناڑی کا اناڑی رہا۔

اسی زمانے میں ایک جوڑا گھر میں مہمان آیا، لاہور کا، بیوی جوان پندرہ سولہ برس کی۔ اور شوہر پچاس سے اوپر۔ واقعی یہ لڑکی بلا کی حسین تھی۔ قدرت نے وہ تندرستی اور خوبصورتی عطا کی تھی جسے میں آج تک نہ بھلا سکا اور نہ شاید مرتے دم تک بھلا سکوں گا۔ اس شادی کا راز لڑکی کی غربت اور شوہر کی امیری تھا۔ خریدی گئی تھی۔ شادی کے بعد ہی اچھا لباس اور سچے زیور پہننے کو ملے۔ اسی لئے بہترین لباس اور بہترین زیور پہنتی تھی۔ جس میں اس کا حسن اور قیامت ڈھاتا تھا۔ سارے خاندان میں دھوم مچ گئی۔ آج کل ہمارے گھر میں کوہ قاف سے ایک پری اتر آئی ہے۔ سب ہی اس کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ کیا بچے کیا بزرگ۔ شوہر ایک ہی گھاگ۔ میرے علاوہ کسی پر بھروسہ نہ کرتا تھا۔ سب ہی سے پردہ کرواتا تھا۔ میری تو عید ہوگئی۔ رات دن اس کی صورت تکتا رہتا تھا۔ رات کو جب بھی موقع دیکھا۔ ''چچی ڈر لگ رہا ہے''۔ اور اس کے صاف ستھرے بستر پر جا لیٹا۔ وہ بیچاری معصوم گھنٹوں اس بے ماں کے بچے پر شفقت کا ہاتھ پھیرا کرتی تھی۔ ایک رات ...... بیچاری جوانی کے جوش میں اندھی تو تھی ہی، سسکیاں بھرنے لگی۔ تیرہ برس کا سن ہی کیا۔ لاکھ لاکھ اس نے سمجھایا، بتایا، لیکن کسی طرح سمجھ میں نہ آیا۔ عجیب حالت ہوگئی۔ سارا جسم کانپنے لگا۔ دانت بجنے لگے۔ دل میں ہول سا گیا۔ آخر، ڈر کر بھاگا، اور بھرپور جوانی دیر تک میرا تعاقب کرتی رہی۔ اس دن سے ''وہ'' ڈر دل میں ایسا سمایا ہے کہ آج تک ہر حسین اور تندرست لڑکی سے گھبراتا ہوں۔ بس ایک

حد تک ملتا جلتا ہوں۔ جہاں معاملات آگے بڑھے —— اور میں غائب! یا تو وہ
مجھے پاگل سمجھتی ہوں گی یا، اور کچھ! مشکل یہ کہ میں ان سے اپنی اس بزدلی کی نہ
صفائی کر سکتا ہوں اور نہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ سکتا ہوں۔ حالانکہ اپنی اس
حرکت پر ان سے زیادہ مجھے کوفت ہوتی ہے۔ مگر یہ ضرور عرض کردوں کہ کسی
بھی تندرست اور حسین لڑکی کو جسکا جسم کا ہلکا سا گداز بھی ہو، اس حد تک ابھارنا
اور اس کو اس عالم میں بیتاب دیکھنا میرا مذہب بن چکا ہے۔ اس سے زیادہ
تسکین مجھے دنیا کے اور کسی جذبے میں حاصل نہیں ہوتی۔ اسی جذبے نے وہ
قوت عطا کی ہے جو مجھے باریک سے باریک نقطہ اور گہری سے گہری چیز پیدا
کروانے کا دم رکھتی ہے۔

ابھی تھوڑے دن کی بات ہے انہی میں کی ایک لڑکی بمبئی میں ملی۔
میری بھی شادی ہو چکی تھی اور اس کی بھی۔ ہم دونوں نے چرچ گیٹ کے
قریب ایک ہوٹل میں کافی پی۔ جب اس قسم کا ذکر ہوا تو صاف جھوٹ بول
گیا۔ کہہ دیا کہ "فلاں دوست نے مجھ سے کہا تھا کہ تم ان سے عشق کرتی ہو،
اور وہ تم سے۔ بس اسی لئے اس نے قربانی پیش کی"۔ حالانکہ سبب وہی تھا——
اس رات والا ڈر!

بہرحال اس رات کے بعد وہ لاہور کا حسن مجسم تڑپتا ہی رہا اور میں
اس سے بھاگتا ہی رہا۔ ایک رات جب میرے والد اس کے شوہر کے ساتھ
تھیٹر دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ صرف میں گھر میں تھا۔ میں نے اس ڈر سے کہ کہیں

پھر وہی نوبت نہ آئے۔ رشتے کے ایک بھائی کو دوسرے ملے ہوئے مکان میں
سلا لیا تھا۔ وہ رات بھی ہماری زندگی کی عجیب وغریب رات تھی۔ بارش ہو رہی
تھی۔ بجلی چمک رہی تھی، بادل گرج رہے تھے۔ یک بیک ہمارے مکان میں
بڑی بڑی اینٹیں گرنا شروع ہوئیں۔ وہ بھرپور جوانی برابر کروٹیں بدل رہی تھی
اور کنکھیوں سے مجھے دیکھتی جارہی تھی۔ میں جاگ رہا تھا اور اس کے جسم کی
قیامت خیز جنبشوں کو تک رہا تھا جو دور سے میری زندگی اور قریب سے میری
موت بن چکی تھیں۔ بہانہ یہ تھا کہ میں غافل سو رہا ہوں مجھے کسی بات کا ہوش
نہیں۔ یک بیک ایک اینٹ، قریب رکھے ہوئے ایک گھڑے پر پڑی۔ گھڑا
ٹوٹا اور یہ لڑکی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر مجھ سے کہا کہ "کہیں سے
بڑے بڑے ڈھیلے آرہے ہیں"۔ میں نے اونہہ ہوں کر کے دوسری طرف
کروٹ لے لی۔ دل اب بھی وہی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ان لطیف ترین
جنبشوں سے بے تابانہ چمٹتا رہوں، مگر ڈر نے کسی طرح اجازت نہ دی، کہ پھر
وہی نوبت آئے گی اور میں پھر کچھ نہ کر سکوں گا۔ اتنے میں دو چار اینٹیں اور
قریب آکر گریں۔ اب وہ بوکھلا کر اس دروازے پر پہنچی جہاں میرے رشتے
کے بھائی جاگ رہے تھے۔ اینٹیں آنا بند ہو گئیں! اس کے بعد کیا میں نے
دیکھا —— اور نہ جانے کیا کیا دیکھتا رہا۔ وہی رات آج تک میرے دل و
دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ آج تک جب رات کو بادل گرجتے ہیں، بجلی چمکتی
ہے، بارش ہوتی ہے، تو میں سو نہیں سکتا گھبرا کر بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔
پھاند پڑنے کو دل کہتا ہے۔ اسی قسم کی آوازیں۔ انسانی آوازیں، وہ جنبش

جاگتی تو جوان تصویروں کی آوازیں۔ بادل، بجلی اور بارش کی تیز آوازیں
میرے کانوں میں آنے لگتی ہیں اور میں بیتاب سا رہتا ہوں۔ پھر مجھے غصے کا
دورہ پڑتا ہے جو کبھی بچوں پر اترتا ہے، کبھی بیوی پر یا کسی ناز اٹھانے والے قلم
کے پروڈیوسر یا ڈائرکٹر پر۔ غرض اس عالم کو کسی دوسری طرف موڑ کر اور تصویر
کا رخ بدل کر ہی قرار حاصل ہوتا ہے۔ اس رات نجات اس وقت ملی جب اس
کے شوہر اور میرے والد تھیٹر سے گھر واپس آئے۔ اس واقعے سے غصے کا ایسا
جذبہ چڑھا جو ساری زندگی نہ اترا۔ صبح سے حسنِ مجسم سے جھگڑا۔ اس کو کسی
طرح مار ڈالنے کی ترکیبیں۔

میری زندگی کے سب سے بڑے رقیب سے وہ اب بھی چھپ کر ملتی
تھی۔ اب میں جب بھی اس سے لپٹنے کی کوشش کرتا تھا تو وہ ڈانٹ کر الگ کر دیا
کرتی تھی اور جب بہت زور دیتا تھا اور زبردستی پہ اتر آتا تھا تو کہہ دیا کرتی
تھی کہ تم ابھی بچے ہو — اور جل اٹھتا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ جل بھن کر
دبی زبان سے ایک دن اس کے شوہر سے شکایت کر دی۔ گھر میں وہ جوتا چلا کہ
معاذ اللہ۔ جلد ہی وہ لوگ لاہور واپس چلے گئے۔ سنا ہے دونوں بالکل پاگل
سے رہنے لگے تھے، لیکن مرتے دم تک الگ الگ نہیں ہوئے۔

اس لاہور والے پیکرِ حسن و شباب کے سدھارنے کے بعد میں سچ مچ
پاگل سا ہو گیا۔ شہر کے مشہور حکیم ڈاکٹر اکٹھا ہو گئے۔ باپ کا ایک ہی لڑکا۔ نسل
ضرور باقی رہے خواہ پاگل ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اولاد نرینہ ضرور ہو اور زندہ بھی
رہے۔ کسی ایک قابل کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرض کیا ہے؟ ہزاروں روپیہ حکیم اور
ڈاکٹر کھا گئے۔ ہزاروں گنڈے تعویذ والوں کی نذر ہو گیا۔ مگر میں ہوں کہ بستر
نہیں چھوڑتا۔ اٹھا اور چکر۔ قدم اٹھایا اور مرا۔ ناامید ہو کر باپ ایک اردو
پڑھے لکھے انگریز کے پاس لے گئے جو قسمت کا حال بتانے میں بھی مشہور تھا۔
دیر تک بڑے پیار سے مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ آخر اس نے بتایا کہ یہ لڑکا کسی
سے محبت کرتا ہے۔ اور بہت سی دوسری باتیں جو باپ سے راز میں ہوئیں۔
نتیجہ یہ ہوا کہ علاج کے ساتھ ساتھ ایک جوان لڑکی بہت خوبصورت کسی غریب
خاندان سے گھر میں لا کر رکھی گئی۔ وہی وقت وقت سے مجھے دوا بھی پلاتی تھی۔
اور میں دیکھتے دیکھتے کچھ ہی ماہ میں تندرست ہو گیا۔ بالکل تندرست! پڑھائی
جاری ہوئی۔ کھیل شروع ہوئے۔ فٹبال زوروں پر تھا۔

زمانہ اور آگے بڑھا۔ اب میں چودہ برس کا ہوا۔ مگر اس خوبصورت
جوان لڑکی کے ساتھ بھی کسی قسم کی کوئی خاص گستاخی نہیں کی۔ معمولی معمولی
گستاخیاں تو رات دن ہوا کرتی تھیں۔ دن اور گزرے۔ میں اور بڑا ہوا۔
فٹبال کی بڑی بڑی ٹیموں میں کھیلنے لگا۔ شاعری میں حضرت آرزو لکھنوی کا
شاگرد ہوا۔ بیدل تخلص رکھا۔ اسی نام سے پچاس غزلیں کہہ ڈالیں۔ اس
عرصے میں بہت سے زندگی کے تجربے بھی کیے، اور ان جگہوں پر جہاں کوئی
امتیاز نہیں ہوتا۔ ہر ملاقات پہلی اور آخری ہوتی ہے صرف اس وجہ سے ایسی
جگہوں پر جاتا تھا کہ یہاں وہ خاندانی جملے سننے میں نہیں آئیں گے۔ اس طرح
عشق کا رتبہ اونچا کر کے الگ بنا دیا گیا اور تجربوں سے اس آگ کو بجھایا جاتا

تھا۔ یونہی زندگی دن بہ دن آگے بڑھتی گئی۔

اب ہم نویں درجے میں داخل ہوئے۔ پڑھائی پر زور کم، شادی اور کھیل کود پر زیادہ۔ فٹبال کی منتخب ٹیم میں کھیلنے لگے۔ بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ ادھر کھیل کی اخباروں میں تعریف، ادھر مشاعروں میں سامعین کی داد۔ استادوں کی ہمت افزائی، غرض کھیل اور شاعری میں ایسا الجھے کہ نواں درجہ کسی طرح پاس نہ کر سکے۔ باپ کا انتقال ہوا۔ مالی پریشانیاں بڑھیں۔ مجبوراً تعلیمی سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ نوکری کی تلاش ہوئی۔ نہ جانے کتنی نوکریاں کیں۔ دوکانوں پر، دفتروں میں، ریلوے میں، اسٹیٹ میں۔ اور آخرکار ''رنگون فلم کمپنی'' میں۔ اس وقت میری عمر چوبیس سال کی ہوگی۔ نتھے آغا مرحوم اسٹیج ایکٹر کی ترغیب پر ہیرو بننے کے شوق میں گھر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا گیا۔ اپنے رنگون روانہ ہونے سے پہلے آیئے ذرا میں آپ کو اپنے محلے وزیر گنج کی سیر کرا دوں اور ان لوگوں سے بھی ملوا دوں جو میری زندگی میں کسی نہ کسی حیثیت سے آئے اور اپنا اثر چھوڑ کر ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح غائب ہو گئے۔

ایک گھرانا ایک قلعی گر کا تھا، جہاں برسوں ہم لوگ ٹینس کھیلے ہیں۔ بڑا سا احاطہ، سامنے قلعی گر کا گھر۔ اس کے گھر میں بھی ایک سونے کا پانی چڑھی ہوئی لڑکی کسی طرح نہیں بھلائی جا سکتی۔ یہ حسین لڑکی، دبلی پتلی سنہرے رنگ کی، ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ والی، کھڑا پائنچہ، دوپٹہ اور کرتا پہنا کرتی تھی۔ ایک دن اتفاق سے ہمارا گیند اس کے گھر میں چلا گیا، اور لینے گئے ہم۔ یہ بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ گیند پڑا جا کر اس کے منہ پر۔ جھنجھلاہٹ اور آگ کی گرمی سے چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ ہنڈیا بھونتی جاتی تھی اور باتیں سناتی جاتی تھی۔ ہاتھ اور زبان ایک رفتار سے چل رہے تھے۔ میری صورت دیکھ کر چیخ اٹھی۔ ''یہ شریفوں کے بچے ہیں۔ کھانا تک نہیں پکانے دیتے''۔ میں نے دور سے اس کی صورت اکثر دیکھی تھی، آج قریب سے لُوکا لگا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''بس چلتا تو قلعی گر بن جاتا''۔

کہنے لگی۔ ''صورت دیکھی ہے کبھی؟''

میں نے کہا۔ ''دور دور سے دیکھا کرتا تھا، آج قریب سے دیکھ لی۔ خوب ہے!''

''شامت تو نہیں آئی ہے؟'' اس نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''اب تو گیند کے ساتھ ساتھ اکثر آتی رہیگی''۔

میں ہمیشہ کا بڑا جملے باز ہوں۔ بیساختہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی اور ماتھے سے جلدی جلدی پسینہ پونچھتے ہوئے بولی:۔

''اس باغ میں کیوں مرنے آتے ہو؟''

یہ احاطہ ایک صاحب کا باغ کہلاتا ہے۔ نام نہیں لوں گا ان کا۔ بہرحال، ان موٹے صاحب کو جو ذرا لنگڑا کر چلتے تھے، ہم لوگ پیار سے ہونٹ

کی گدھی کہا کرتے تھے۔ میں نے جواب دیا:۔

''گلاب کی گلی کے شوق میں''۔

گلاب، گلی اور شوق۔ انہیں تین لفظوں میں اس کا نام پوشیدہ ہے۔ کھل اٹھی۔ میں آگے بڑھا۔ مکان اکیلا تھا۔ اس نے جھینپ کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ دوسرے لمحے میں اس سے بالکل قریب ——! نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا کہ دروازے پر میرزوار، آغا بوچڑ۔ رضا کسوڑے اور شنو کے بھائی پیارے مرحوم نے زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں:۔

''اماں کیا مر گئے وہاں۔ باہر آؤ''۔

میں بھاگا۔ بھاگ کر باہر نکلا۔ ایک نے پھر پوچھا:۔

''مر گئے تھے وہاں؟''

میں نے کہا۔ ''مرنے والا تھا، سب دوڑے میں بھاگا''۔ اور کھیل پھر شروع ہو گیا۔

اپنی طبیعت کی ایک اور ذلیل کمزوری آپ سے کہتا چلوں۔ اسی زمانے میں میرے اور دوستوں کے ماحول میں عشق صرف اتنی اہمیت رکھتا تھا کہ خوبصورت لڑکی دیکھی اور مرے! کوشش صرف یہ کہ جس قدر جلد حاصل کر کے سوارت کر لی جائے اتنا ہی مناسب ہوگا۔ جبھی تو آج تک عشق کے نام کو روتے ہیں۔ ساری زندگی یہی نہ سمجھ سکے کہ عشق کس چڑیا کا نام ہے۔ عشق کو اتنا ہی سمجھا کہ خوبصورت لڑکی ذرا اونچے قد کی۔ بھرا ہوا جسم، نقش و نگار اچھے، نفیس باتیں کرنے والی۔ اس کی تاک جھانک، اور اس کا تعلق نہ دل سے اور نہ روح سے۔ نتیجہ یہ کہ آج تک زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتا ہوں، جو شاید آخری دم تک رہے مگر کیا کروں طبیعت سے مجبور فطرت سے عاجز، دماغ سے تنگ۔ اس لڑکی نے جس انداز سے محبت کی ہے، اگر کوئی پتھر دل بھی ہوتا تو پگھل جاتا۔ اور میں تھا کہ وہیں کا وہیں رہا۔ وہ گھنٹوں میرا دھوپ میں انتظار کرتی۔ میں پہنچتے ہی اس کی تاک میں۔ وہ کچھ پیار محبت کی باتیں کرنا چاہتی۔ میرا ہاتھ فوراً دست درازی شروع کر دیتا۔ وہ دل سے دل، اور روح سے روح ملانے کی کوشش کرتی اور میں صرف جسم سے جسم اور لب سے لب——!

کچھ عرصے بعد یہ طلسم جسم و خواہش اس پر بھی کھل گیا مگر غریب اتنا آگے بڑھ چکی تھی کہ کسی طرح بھلا نہ سکی۔ اسی زمانے میں اس کی شادی ٹھہری۔ آخری وقت تک سسک سسک کر روتی رہی۔ منتیں کرتی رہی کہ ''کہیں لے چلو۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی''۔ اور آخری وقت تک ہم اس تاک میں کہ کسی طرح معاملہ پٹ جائے۔ نہ وہ کامیاب ہوئی اور نہ ہم۔ آخر ایک ایسے بدصورت کالے دھیمو آدمی سے اسکی شادی ہو گئی جس کے ساتھ بُری سے بُری عورت بھی شادی کو تیار نہ ہوتی۔ شادی کے بعد سے اس قطعی کر کے نیچے گھرانے کی اس لڑکی نے، ہم اونچے گھرانے کے شریف اور سید کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا، اور یہ افسانہ یہیں دم توڑ گیا۔

اب بہر حال ہم لکھنؤ سے رنگون جانے کیلئے کلکتہ روانہ ہوئے۔ کلکتے پہنچے اور کلکتے سے رنگون جہاز کا نوے روپے سکنڈ کلاس کا کرایہ ملا۔ اور مشہور

ایکٹر نے آغا کے مشورے پر سولہ روپے کا ڈاک ٹکٹ خریدا۔ باقی روپے ہم دونوں نے بچا لئے۔ قضا و قدر کا معاملہ۔ ہمارے جہاز کو اس سال کا سب سے بڑا طوفان ملا۔ نہ جانے کیونکر جان بچی، اور رنگون خیریت سے پہنچے۔ تین دن تک آسمان سر پر گھومتا رہا۔ چوتھے دن ذرا ہوش آیا۔ اور ہماری تصویر ''شان سبحان'' کی مہورت ہوئی۔ چہرے پر رنگ پوتا گیا۔ نئے نئے کپڑے پہنائے گئے اور کیمرے کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا گیا۔ اس نئے ماحول سے وحشت ہو رہی تھی کہ بچپن کی سب سے بڑی کمزوری جس کے سامنے کبھی ٹھہر نہ سکا۔ یعنی ایک خوبصورت ہیروئن بھی قریب آکر کھڑی ہوگئی۔

مکالے دیئے گئے۔ وہ بھی عشقیہ مکالے۔ منشی احسن مرحوم کے لکھے ہوئے تھے۔ کیمرہ، تیز روشنی اور اس حسین عورت کے سامنے آنکھیں چکاچوند ہوگئیں۔ اور اتنے آدمیوں کی موجودگی میں، عشقیہ ڈائلاگ کسی طرح نہیں بولے گئے کبھی تم کی جگہ ڈم نکلے اور کبھی دم نکلے! کٹ! کبھی شرما کر کیمرے کی فیلڈ سے باہر نکل کر بول دوں۔ پھر کٹ! کبھی ہیروئن کو غلط جگہ پکڑ لوں۔ پھر کٹ!

ڈائرکٹر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس طرح میرے قریب آیا جیسے مجھے کھا جائے گا۔ لیکن آتے ہی مجھے شاباشی دی۔ اطمینان دلایا۔ ہمت بڑھائی۔ شاٹ شروع ہوا۔ اس بار ڈائلاگ شاید ٹھیک ہوگیا مگر ہیروئن کو اس طرح چپٹایا۔ اور اس کے شانے کے بجائے نہ جانے کونسا حصہ اس کے جسم کا دبا ڈالا کہ وہ کس کے چیخی ——— اور پھر کٹ!

اس شاٹ کو ڈائرکٹر او۔ کے۔ کہتا تھا اور ہیروئن کہتی تھی کہ ''دوبارہ شاٹ لیجئے، وہ ٹھیک نہیں تھا''۔ وجہ پوچھی تو بولی ''ہیرو سے پوچھئے''۔ ڈائرکٹر نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''آپ ہی لوگ فیصلہ کرلیں۔ میں تو بیہوش تھا''۔ بہرحال شاٹ وہی رہا۔

چائے پر ہیروئن نے کہا۔ ''عجیب آدمی ہو۔ یہ بھی نہیں جانتے ہو کہ عشق کیوں کر ہوتا ہے؟'' میں نے آہستہ سے کہا کہ ''عشق تو زبانی ہوتا ہے، خطوں سے ہوتا ہے۔ نظر سے ہوتا ہے۔ دل سے ہوتا ہے، روح سے ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو ڈائرکٹر نے چپٹانے اور دبانے کو کہا تھا۔ جب چپٹا لیا، دبا لیا تو عشق کہاں رہ گیا''۔ کہنے لگی کہ چپٹایا بھی غلط طریقے سے''۔ میں نے کہا۔ ''چپٹانے کا ہر شخص کا طریقہ الگ الگ ہوتا ہے۔ میری جس طرح اس وقت سمجھ میں آیا اس طرح چپٹا لیا''۔

غرض، آپ مانیں یا نہ مانیں صرف اس شاٹ کی وجہ سے تصویر خاصی کامیاب رہی۔ نہ جانے سنسر نے کس طرح چھوڑ دیا وہ شاٹ۔ گھبراہٹ میں یہ ہاتھ غلط جگہ پڑ کے بڑا کام کر گیا۔ لوگ ہال میں چیختے تھے۔ ''ابے ایک دفعہ ہماری طرف سے اور ایک ہاتھ مار دے''۔

دراصل لوگوں کے معیار کو بگاڑنے اور بنانے کی ذمہ داری بہت کچھ فلم والوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس شاٹ پر بھی لوگ تڑپ اٹھتے تھے۔ اور ''نجمہ'' ایک مسلم تصویر میں، جس کی ہیروئن سخت پردہ میں رہتی تھی، جسے محبوب صاحب نے ڈائرکٹ کیا تھا اور میں رائٹر کی حیثیت سے تھا۔ میں نے اس میں

کہیں ہیرو اور ہیروئن کو ملوایا ہی نہیں۔ صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ نہ ایک دوسرے سے بات کر سکے نہ مل سکے۔ لیکن عشق کا وہ بے پناہ جذبہ کارفرما تھا کہ لوگ اس پر بھی جھوم جھوم اٹھتے تھے۔

بہرحال رنگون والی یہ تصویر کافی چلی۔ مالکوں نے خوب پیسہ کمایا۔ لیکن سب کی نیتیں خراب۔ پیسہ کمانے پر بھی کئی مہینے کی تنخواہیں سب کی ماردیں۔ روز تنخواہ آج ملتی ہے، کل ملتی ہے۔ نتیجہ ظاہر۔ رنگون میں جان پہچان کے تمام ہوٹل والے مارے گئے۔ اب ہمارے مکان کے چاروں طرف قرضدار ہی قرضدار۔ کہیں نکلنا ناممکن ہے!

ایک یہودیوں کا خاندان۔ ایک اینگلو برمیز خاندان قریب ہی رہتا تھا۔ اور ایک ایرانی برمیز خاندان۔ ایک ہندوستانی برمیز خاندان دور رہتا تھا کئی میل ہمارے گھر سے۔ ہندوستانی برمیز ملے جلے خاندان ''زیربادی'' کہلاتے تھے۔ ہم یہودی خاندان کی چاروں جوان لڑکیوں سے، ایک اینگلو برمیز خاندان کی لڑکی سے، ایک ایرانی خاندان کی لڑکی سے اور ایک زیربادی خاندان کی لڑکی سے بہ یک وقت عشق فرما رہے تھے۔ ہر لڑکی نہایت شریف اور ہر لڑکی کو یہ امید کہ یہ ہم سے شادی ضرور کرلے گا۔ ہر لڑکی کھاتے پیتے گھرانے کی۔ چنانچہ کئی ماہ ناشتہ کہیں، چائے کہیں، دن کا کھانا کہیں، سہ پہر کا ناشتہ اور کھانا کہیں۔

ایک جا کھاتے نہیں عاشق بدنام کہیں
دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں شام کہیں

انگریزی فلمیں دیکھنے کو پیسے بھی وہیں سے آتے تھے۔ واشنگ کا بل وہیں سے۔ ایک اینگلو برمیز گھرانے کی خوبصورت لڑکی نے دسمبر میں ایک گرم سوٹ بھی سلوادیا تھا۔ اور زیربادی مسلمان لڑکی نے چائے، کیک، بسکٹ کے سوا اور کوئی تواضع نہیں کی۔ یہودی لڑکیاں سب سے زیادہ سیانی نکلیں۔ صرف آلو کے کچالو اور ہرے مٹر کھلایا کرتی تھیں۔

ان میں ہر لڑکی ہر اعتبار سے حسین تھی، اور آپس میں کچھ اس قسم کا مقابلہ کروادیا گیا تھا کہ ہر لڑکی جان بیچ کر ہمیں حاصل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ ان ناسمجھ ابھرتی ہوئی جوانیوں کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ آخر اس شخص میں کون سے لال جڑے ہیں۔ میرے ایسے ان کو ہزاروں مل سکتے تھے۔ صرف ایک تصویر کا ہیرو تھا۔ بالکل معمولی وضع قطع کا نوجوان البتہ رنگ سرخ و سفید اور باتیں بے پناہ کرنے والا۔ کیا مجال لڑکی ایک بار مل لے اور پھر دوبارہ یاد نہ کرے۔

نوجوان لڑکی کو بس میں کرنے کی ایک ترکیب قیامت ہے۔ آپ لڑکی کے دل میں تھوڑا گھر کرنے کے بعد کسی دوسری سے ملنے کا شوق ظاہر کریں اور کسی نہ کسی طرح اس کو یہ منظر دکھا بھی دیں۔ پھر اس غریب کی موت یقینی ہے۔ وہ تن من دھن یہاں تک کہ کوئی چیز آپ سے عزیز نہ رکھے گی۔ یہ ترکیب مجھے کسی نے بتائی نہیں۔ صرف رنگون کے مشاہدات نے سکھائی اور ہمیشہ کامیاب رہی۔ سو فیصدی کامیاب!

نوجوان لڑکیوں کی تباہی جب ان کے بڑوں سے برداشت نہ ہو سکی، تو مجھ کو جان سے مار دینے کی دھمکی دینے لگے۔ پہلے تو میں دھمکی ہی سمجھا، لیکن واقعی میں ختم کر دیا گیا ہوتا اگر چھ فٹ کچھ انچ کا لمبا چوڑا ایک پوربی نوجوان رام لکھن مجھ سے یہ نہ کہہ دیتا کہ ''بھیا بس چوبیس گھنٹے کے اندر رنگون چھوڑ دو''۔ اس گنڈے سردار کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی میں چوکنا ہو گیا۔

اس دن رجب کی تیرہ تاریخ تھی۔ خان بہادر چانڈو صاحب کی عالیشان کوٹھی پر ایک محفل قصیدہ خوانی تھی۔ مجھے خبر ملی اور دن بھر کوشش کر کے ایک بہت ہی عمدہ قصیدہ حضرت علیؓ کی شان میں پڑھا۔ ایک ایک شعر پر محفل جھوم جھوم اٹھی۔ اس کروڑ پتی آدمی کے بہت سے جہاز تھے۔ ہم قصیدہ پڑھنے میلوں پیدل گئے تھے۔ ایک پیسہ پاس نہ تھا۔ محفل کے بعد خان بہادر صاحب نے خاص طور پر ہمارے قصیدے کی بیحد تعریف کی۔ پھر بولے۔ ''مانگو کیا مانگتے ہو؟'' میں نے کہا ''کلکتے تک کا جہاز کا کرایہ اور کچھ سفر خرچ''۔

اسی وقت جہاز کا پاس اور سو روپے نذر کر دیے گئے اور میں کلکتے کا خواب دیکھتا ہوا گھر روانہ ہوا۔ ایک بجے رات کے قریب گھر پہنچنے ہی والا تھا کہ رام لکھن راستے میں پھر ملا۔ میرا ہی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''گھر مت جانا۔ ایرانی لڑکی کا باپ ریوالور لئے تمہارا منتظر ہے، اور زیرباڈی باپ پولس لے کر آیا ہے۔ اینگلو برمیز لڑکی کا باپ اپنی لڑکی کو زخمی کر کے چھرا لئے تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے یہاں بچے کے آثار ہیں''۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اور بھیا یہودیوں کی کیا حالت ہے؟ کیوں نہ ان سب لڑکیوں کے باپوں کو یہاں میرا انتظار کرنے دو۔ موقع اچھا ہے۔ ان بچاریوں کی تسلی کر آئیں''۔ رام لکھن مسکرایا بھی اور بھوچکا بھی ہوا۔ ''کہنے لگا۔ بھیا بڑے بڑوں سے واسطہ پڑا۔ تمہارا ایسا نہ دیکھا جو اس وقت بھی مذاق کر رہا ہے''۔ میں نے کہا۔ ''میرے کپڑے تو لا دو۔ اس نے کہا۔ ''ہم دونوں مار ڈالے جائیں گے''۔ میں نے پھر کہا ''اچھا ایک نظر یہودیوں کو تو دیکھ لینے دو۔ وہ تو خاموش ہیں''۔ اس نے کہا۔ ''بھیا! راون کی سی حالت نہ ہو تو میرا ذمہ۔ تم اپنے شوق میں مارے جاؤ گے اور میں تمہاری محبت میں مارا جاؤں گا۔ بھگوان کا واسطہ یہاں سے جلدی چلو''۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اینگلو برمیز کے دو افراد نظر آئے۔ اس نے کہا تھا۔ ''بھاگو'' اور ہم دونوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ باقی رات ایک سڑے ہوئے یوپی والوں کے ہوٹل میں گزاری اور صبح تڑکے ہم لوگ جہاز پر تھے۔ نو بجے کے قریب جہاز روانہ ہوا اور ایک بار پھر ہم نے اطمینان کی سانس لی۔

جہاز رنگون کو خیرباد کہہ رہا تھا۔ رام لکھن اب بھی دور کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ کنارا دور ہوتا جا رہا تھا۔ ہزاروں باتیں اور نہ جانے کتنے حسین چہرے، ان کی ملاقاتیں نظروں میں ناچ رہی تھیں اور میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ ان میں کی ہر لڑکی شریک حیات بنا لینے کے قابل تھی۔ کاش! میں کسی سے شادی کر لیتا۔ مگر کیسے کرتا۔ احساس کمتری جس کا کسی لڑکی کو وہم بھی نہ تھا آگ

166

کی طرح میرے دل و دماغ میں چوبیس گھنٹے دہکا کرتا تھا۔ اس پنجابی بیوی کے بچپن کے سنے ہوئے جملے آج بھی کانوں میں گونج رہے تھے۔ ''تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم کسی قابل نہیں ہو''۔ پھر آنکھوں کے سامنے وہ منظر آیا۔ وہ گھڑا ٹوٹا۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ ڈھیلے آنا بند ہو گئے۔ اس نے گھبرا کر میرے ان عزیز کو پکارا پھر۔

آشیاں اجڑا کیا، ہم ناتواں دیکھا کئے

میں نے آنکھیں بند کر کے سر کو ایک جھٹکا سا دیا اور ایک طرف ایک لمبی سانس بھر کر نکل گیا۔ جہاز اب پورے سمندر میں تھا اور میں ایک جگہ کھڑا چائے، ٹوسٹ اور انڈے کھا رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ سوائے لپٹانے چمٹانے کے اور کوئی حرکت تو مجھ سے ہوئی نہیں، پھر یہ بچے کے آثار ہوں کیا معنی! پھر وہی پنجابی بوڑھے مرد کی کمسن بیوی نظروں کے سامنے گھومی۔ ایک ایک کر کے سارے واقعات سامنے آتے رہے۔ اس کا مجھے سمجھانا۔ میرا گھبرانا۔ وحشت۔ ہول۔ آخر میرا بھاگنا۔ اس کا پیچھے دوڑنا۔ میرے رشتے کے بھائی ——— وہ سارا منظر! ایسا محسوس ہوا جیسے رنگون کی ہر لڑکی ان رشتے کے بھائی کی اس حرکت کی شکار ہو رہی ہے۔

سر چکرانے لگا۔ بادل کی گڑگڑاہٹ کان سننے لگے۔ اُف! کاش! میں یہ سب گناہ کر سکتا۔ میری سلگائی ہوئی آگ اور ان کی گھٹی ہوئی تمناؤں سے نہ جانے کس کس نے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ ان زخمی ہرنیوں کو کیسے کیسے اناڑی شکاریوں نے شکار کیا ہوگا۔

اکثر دوست رنگون کی عاشقی کے زمانے میں پوچھتے تھے اور میں بڑے فخر سے مسکرا دیا کرتا تھا۔ ان کو میری بزدلی کی کیا خبر تھی۔ میں تو تسکین کیلئے صرف ان عورتوں کے پاس جا سکتا تھا جو پیسے لے کر جوانیاں بیچتی ہیں۔ جو یہ نہیں کہتیں کہ اب آپ میں وہ اگلا سا دم خم باقی نہیں رہا۔ جن کے چہرے ہر قسم کے جذبات سے خالی۔ جن کی آنکھوں میں صرف دوسرے گاہک کی تلاش اور بس..........!

رنگون کی یہ حسین لڑکیاں اور ان کے علاوہ کتنے حسین خواب دیکھتا ہوا کلکتہ پہنچ گیا۔ قبل اس کے کہ کلکتہ پہنچوں، رنگون کا ایک یادگار واقعہ اور سن لیجئے:۔

میں تین چار دن ایک سرکس میں بھی کام کر چکا ہوں۔ ہوا یہ کہ ہمارے کمرے سے بالکل ملے ہوئے کمرے میں سرکس کی خوبصورت برمیز ہیروئن آ کر ٹھہری تھی۔ اس کے پاس ایک ''شی گوریلا'' رہتی تھی۔ بڑے سے پنجرے میں بند۔ اس کی لمبی لمبی سانسیں سن کر کبھی کبھی ہماری سانس رکنے لگتی تھی۔ اور خیال آتا تھا کہ اگر کسی دن یہ ظالم ہمارے کمرے میں گھس آئی تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ ہمارا دروازہ کھلا ہوا تھا، اور رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ کہیں گوریلا بیگم صاحبہ تشریف نہ لے آئیں۔ دروازہ بند کرنے اٹھا ہی تھا کہ واقعتاً وہ اندر تشریف لے آئیں۔ نہ جانے کیسے چھٹ گئی تھیں۔ دیکھتے ہی دم نکل گیا۔ چوتھی منزل سے برابر والے کمرے میں کود گیا۔ کیوں کر؟ کس طرح؟

کچھ نہیں معلوم۔ یہ بھی ہمارے ساتھ پھاندیں۔ سامنے ان کی مالکہ کپڑے بدل رہی تھیں۔ بے تحاشا ان سے لپٹ گیا۔ انہوں نے ڈانٹ کر ان محترمہ کو پنجرے میں بند کیا اور نیم عریاں حالت میں پھر کمرے میں واپس آئیں۔ مجھ کو دیکھا۔ سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور، کانپ رہا تھا۔ انہوں نے تسلی دی۔ تھپ تھپایا اور تھوڑی دیر کیلئے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ کبھی کبھی ''شی گوریلا'' کی لمبی لمبی سانسوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، جو ہم دونوں کے کمرہ بند ہو جانے کے بعد اور زیادہ تیز ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن ہم سرکس میں ملازم ہو گئے تھے۔ ایک بہت بھاری پتھر ہمارے سینے پر رکھ کر، پبلک کے سامنے لوہے کے بڑے ہتھوڑے کی مسلسل ضرب سے کس طرح توڑا جاتا تھا؟ ہمیں بالکل نہیں معلوم۔ پتھر ٹوٹتا تھا، تالیاں بجتی تھیں اور ہم کھڑے ہو کر ادھر اُدھر پبلک کے سامنے سینے پر ہاتھ رکھ کے جھک جھک جاتے تھے۔ شی گوریلا کے سلسلے میں اب بھی ہم کسی آئیٹم پر تیار نہ تھے۔ اور یہ محترمہ جنہوں نے شی گوریلا سے میری جان بچائی تھی کمرہ بند کرنے کے سلسلے میں ہم پر بڑی مہربان تھیں۔ سینے پر پتھر توڑنے والا آئیٹم دوسرے کو دیا گیا، اور یہ ایک دن ہم سے بڑے پیار سے بولیں۔ ''ڈیر آج تم ہمارے ساتھ شیروں کے جمرمٹ میں چلے گا۔ ان کے بیچ میں سوئے گا''۔ ڈیر نے کہا۔ ''مر جائیگا نہیں سوئے گا''۔ ہنس کر بولیں۔ ''تم آؤ تو سہی کچھ نہیں ہوگا''۔

گھنٹی بجی اور ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو شیر نکل آئے۔ یہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج پر لے گئیں۔ شیر ایک لائن میں ایک کے پیچھے ایک اسٹیج کی دیوار سے ملے ہوئے گھومنے لگے۔ چاروں طرف لوہے کی مضبو
جالی لگی ہوئی تھی۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ ایک شیر گرجا۔ میں قریب قریب بیہوش ہو چکا تھا۔ اب ان شیروں کے بیچ میں سونے کا وقت آیا۔ میرے کانوں میں ایک ہنٹر کی آواز کے ساتھ کئی شیروں کے گرجنے کی آواز آئی۔ آنکھیں کھولیں تو شیروں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ ایک جست میں درواز
کھول کر اسٹیج کے باہر پبلک میں۔ اب جو وہاں سے بھاگا تو سید حارگون کی سڑک پر۔ تالیاں بے تحاشا بج رہی ہیں۔ لوگوں کے قہقہوں کی آوازیں دور تک سنائی دیتی رہیں اور میں بھاگتا رہا۔ پھر میں نے کبھی سرکس کا رخ نہیں کیا، اور یہ گوریلا کے سلسلے میں عشق کی داستان وہیں دم توڑ گئی۔

اس زمانے میں بہت سی ہیروئنوں میں سے ایک تھی ہیروئن (ک) جن پر مالک کروڑوں روپے صرف کرنے کو تیار رہتے تھے، اور صرف کرتے تھے۔ ان سے ہمارا بے تحاشا عشق چل رہا تھا۔ عشق کیا چل رہا تھا اپنا کام چل رہا تھا۔ اچھا کھانا مل رہا تھا۔ بہترین سگریٹ ملتی تھی۔ کبھی کبھی تحفے تحائف ملتے تھے۔ موٹر میں گھومنا ملتا تھا۔ بڑے بڑے صوفی، رئیس، شاعر اور مولوی رشک سے دیکھتے تھے اور ہم مزے کرتے تھے۔ مگر صحیح معنوں میں مزے کبھی نہیں کئے۔ وہی پرانا خوف وہی ڈر۔ کہ ایک بار حرکت اور لعنت بری۔ قلعی کھلی، اور دودھ کی مکھی کی طرح یا دامن کی گرد کی طرح جھاڑ دیئے جائیں گے۔

چنانچہ ہر حسین اور ہر مہ جبیں سے ملتے رہے۔ سب سے یہی ظاہر کیا

کہ عشق حقیقی فرمارہے ہیں۔ اور اس عشق حقیقی کا بہاؤ ایسی جگہ لے جاتا تھا جہاں طوفان کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ اور طبیعت کی روانی کی لہریں کسی ایسے کنارے سے ٹکرائیں جس کی صورت دیکھنا پھر زندگی میں نصیب نہ ہو اور اس حرکت کے سلسلے میں کبھی یورپ کے کنارے سے ٹکرایا کبھی خالص ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہندوستان کے کنارے سے کبھی مسلمان ہونے کی حیثیت عرب کے کنارے سے ٹکرایا۔ کبھی حضرت موسیٰ کو ماننے کے پھیر میں یہودیوں کے سمندر کے تھپیڑے کھائے۔

مختصر یہ کہ اس مختصر سی زندگی میں شاید ہی کوئی قومی اور مذہبی گھاٹ ایسا بچا ہوگا جس کے کنارے سے یہ بے چاب سوچ نہ ٹکرائی ہو! مگر عشق حقیقی اپنے مقام پر کہ دامن تر بھی نہ ہو اور ہوشیار بھی رہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک سیرابی نصیب نہیں ہوئی۔ اور آج بھی جب کبھی آنکھیں بند کر کے سوچتے ہیں تو ایک سلسلہ ہے جو گھنٹوں جاری رہتا ہے کہ یہ کر سکتے تھے اور وہ کر سکتے تھے۔ وہ اس حسین کے چمکتے ہوئے موتی جیسے دانت۔ وہ اس حسین کی بدمست و مخمور نیم باز آنکھیں۔ وہ اس حسین کی بھرپور الھڑ جوانی۔

وہ ایک شعلہ رو کا بھبوکا رنگ۔ وہ ایک سرو قد کا لچکتا، بل کھاتا جسم وہ ایک پری پیکر کی صراحی دار گردن وہ ایک حسینہ کے بھرے بھرے عریاں بازو۔ اور وہ دکھائی دیے ایک ماہ پیکر کے لمبے گھنیرے بال۔ اور وہ نظر آئے کسی دوشیزہ کے چاند جیسے پیر۔ جن کو غالب لگن میں دھونے کے خواہش مند رہتے تھے۔

یہ مرزا صاحب کی بھی سب سے بڑی کمزوری تھی اور ہم سید صاحب کی بھی۔ گھنٹوں کے بعد اس خواب گراں سے چونکتا ہوں۔ کبھی ٹیلی فون نے کان مروڑا۔ کبھی بیگم صاحبہ نے۔ کبھی بچوں نے تو کبھی دوستوں نے۔ چلئے تو کہانی لکھنا شروع کی۔ اور سچ سچ لکھا۔ کیوں کر لکھا۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دوسروں کو لکھنا سکھاؤ۔ تم اتنے اچھے مصنف ہو۔ ہزاروں مصنف بنا سکتے ہو۔ ان سے کون کہے کہ ہم خود کس طرح بنے؟ یہ ہم کو خود نہیں معلوم اور نہ کبھی معلوم ہو سکے گا۔ اور معلوم کر کے کریں گے بھی کیا۔ کسی حقیقت کے متعلق یہ سوچنا کہ یہ کیوں کر بنی کیسے وجود میں آئی جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔

ایک ہیروئن کے عشق کے سلسلے میں مالک ہم سے کافی بدظن رہتے تھے۔ اور اب ہم ان کو کس طرح سمجھاتے تھے کہ دوسرے عشاق کی خبر لیجئے حضور۔ ہم تو اس سلسلے میں بالکل معصوم ہیں اور ان کو ہماری بات کا کسی طرح یقین نہ آتا بہرحال بات یہاں تک بڑھ گئی کہ کلکتہ چھوڑ دو، ورنہ تمہارا خون کر دیا جائے گا۔ ایک ہزار پر فیصلہ ہوا اور کلکتے بھر کے عشق کو ہم نے ایک ہزار روپے پر بیچا۔ تین سو کے کپڑے بنوائے اور بمبئی روانہ ہوئے۔

زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ بمبئی بھر کی فلم کمپنیوں میں صبح سے شام تک خاک چھاننے کے بعد بھی کام نہ مل سکا۔ مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ ہوٹل کے کرایے کے علاوہ تھوڑے تھوڑے کر کے دو سو کے قریب نقد بھی لئے تھے۔ اور اتنی ہی رقم دوستوں کی خاطر داری اور واشنگ وغیرہ کے بل کے سلسلے میں ہو گئی تھی۔

میں تو اسی بھرم میں کچھ دن اور نکال لے جاتا۔ مگر ایک صاحبزادی بہت ہی خوبصورت ہمارے پاس آیا کرتی تھیں۔ وہ ایک کمپنی کے مالک کی محبوبہ نکلیں۔

ایک دن انہوں نے وعدہ کیا کہ تم ''رنجیت'' میں کام مت کرو میں فلاں کمپنی کے مالک سے بات کر کے تم کو وہاں رکھواتی ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ عشق مجھ ہی سے کرتے رہو گے۔ جس دن کسی دوسری ہیروئن کی طرف متوجہ ہوئے، میں خودکشی کرلوں گی۔ میں نے قسم کھا کر اپنی وفا کا یقین دلا دیا۔

اس کمپنی کا مالک جس کی یہ محبوبہ تھیں بہت دنوں سے پریشان تھا کہ یہ کمبخت کون ہیرو کباب میں ہڈی نکل آیا۔ اس کا پتہ لگانا چاہئے۔ اتفاق سے ہم کئی بار ان کے پاس نوکری مانگنے جا چکے تھے اور وہ صاف انکار کر چکے تھے۔ یہی صاحب ایک دن ان صاحبزادی کا تعاقب کرتے کرتے سرشام ہمارے ہوٹل میں آ گئے۔ ہم مزے سے ان صاحبزادی کے ساتھ ہوٹل کے مالک کی کرسی پر بیٹھے چائے نوش فرما رہے تھے۔ اس عرصہ میں ان صاحبزادی کا ایک اور عاشق' ایک گجراتی تاجر کا لڑکا بھی پیدا ہو چکا تھا۔ یہ کپڑے کی تجارت کرتا تھا۔ ان نئے عاشق نے کچھ اپنی شان اور ہماری خوشامد کے طور پر ایک گرم شیروانی اور ایک گرم سوٹ کا کپڑا ہمیں نذر کیا تھا اور سلائی کے دام بھی انہیں نے دیئے تھے گو کہ ہم نے جھوٹ موٹ بہت انکار بھی کیا۔ اتفاق سے وہ بھی ساتھ بیٹھے تھے ہوٹل کا مالک بھی تھا کہ وہ مالک صاحب آ گئے۔ اور میں اچھل پڑا۔ میں نے چائے پیش کی۔ مسکرا کر چائے پینے لگے۔ پھر مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔ ''کہیں نوکری ملی؟''

جس طرح انہیں دیکھ کر میں اچھل پڑا تھا۔ اسی طرح ان کے اس سوال پر ہوٹل کا مالک اچھل پڑا۔ میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ ''میں تو رنجیت کا ہیرو بن کر آیا ہوں''۔ ہوٹل کے مالک کی تسلی ہوئی لیکن انہوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ کہنے لگے۔ ''پھر ہمارے پاس نوکری مانگنے کیوں آئے تھے؟''

ہوٹل کے مالک کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔ میں نے جھوٹی مسکراہٹ زبردستی لا کر کہا۔ ''وہ کوئی اور ہوگا۔ آپ کو شک ہو رہا ہے؟'' بولے ''شک دور کئے لیتا ہوں'' اور فون اٹھا کر رنجیت فلم کمپنی کے نمبر ملائے۔ سارا بھانڈا پھوٹ گیا۔ ہم کو سب کے سامنے چار سو بیس ثابت کر دیا۔ ہم نے لاکھ لیپا پوتی کی کہ چندو لال شاہ آجکل کڑکا ہو رہا ہے۔ ہمارے ہزاروں روپے نہیں دے سکتا اس لئے بہانے تراشتا ہے۔ مگر کچھ چلی نہیں۔ وہ صاحبزادی ہمیں خوب بُرا بھلا کہہ کر اس مالک کے ساتھ چلی گئیں۔

یہ تھی ان کی محبت! ان تاجر صاحبزادے نے غصے میں سگریٹ زمین پر پٹخی اور کچھ انگریزی قسم کی گالیاں دیتے وہ بھی چلے گئے۔

ایک بہت ہی باریک نکتہ دماغ میں آ گیا۔ مرد شریف ہو یا بدمعاش، بڑی حد تک یہ عورت پر ہوتا ہے۔ یعنی عورت اس کی ذمہ دار ہوتی ہے کہ مرد سے کیوں کر ملے۔ کس قسم کی ادائیں دکھائے۔ کون سے طریقے برتے۔ کس قسم کی محبت ظاہر کرے۔ کیوں کر مسکرائے۔ کس طرح شرمائے۔ میرا خیال ہے جو جو خوبصورت عورت کے دماغ میں ہوگا۔ مرد اس سانچے میں ڈھلتا چلا جائے گا۔ عورت چاہے تو فرشتوں کے قدم ڈگمگا دے، چاہے تو

فرشتہ بنا دے۔

بعض پڑھے لکھے لوگوں کی نہ جانے بیویاں کیوں بہت زیادہ خوبصورت ہوا کرتی تھیں۔ یا چونکہ پڑھی لکھی ہوتی تھیں باتیں کھل کے کرتی تھیں بے تحاشہ کرتی تھیں اس لئے ہم ہی تڑپ اٹھا کرتے تھے اور پھر بچپن والی بیوی کی جھلک اور وہی بچپن کا شوق دل میں انگڑائیاں لینے لگتا تھا۔

چنانچہ ایک صاحب کی بیوی نے نہ جانے کیوں ہمکو اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ ممکن ہے آج کل کی سوسائٹی کا عطیہ ہو کہ شوہر کو یہ دکھایا جائے کہ آپ کے علاوہ اور بھی بہت سے نوجوان میرے گرویدہ ہو سکتے ہیں۔ یہ کسی رخ سے بری، بدطینت یا آوارہ مزاج نہیں تھیں۔ بلکہ بیحد پڑھی لکھی، عادت کی نیک، طبیعت کی شریف، انتہائی ہمدرد قسم کی ملنسار۔ معصوم صفت۔ لوگوں سے باتیں کرنے کا طریقہ نہایت نرم اور سادہ۔ بس ایک ہم سے باتیں کرنے کا انداز کچھ الگ ہی تھا۔ ہر ادا ہمیں دکھائی جائے گی۔ موٹر میں ہمیں قریب سے قریب تر بٹھایا جائے گا۔ باتیں گھنٹوں رہیں گی۔ کیا مجال جو آپ بھاگ سکیں۔ کبھی بالوں کی لٹ سے کھیل کر کبھی انگوٹھی منہ میں دبا کر کبھی عجیب انداز سے انگڑائی لے کر اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر خوب بھینچ بھینچ کر پیار کریں گی اور نیم باز آنکھوں سے چوری چوری ہمیں بھی دیکھتی جائیں گی۔ اور ہم دیکھتے دیکھتے نہ جانے کہاں پہنچ جائیں گے۔ کن کن گڑھوں میں گھس جائیں گے۔

واقعی جوان اور خوبصورت ماں کے اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ کھیلنے کی اور اس سے بچپن کے انداز میں باتیں کرنے کی ادا ایسی کمبخت زہر ہوتی ہے کہ اس سے جان بچانا قطعی ناممکن ہے۔ کالے ناگ کا زہر میرا خیال ہے اتر سکتا ہے۔ آپ بچ سکتے ہیں مگر یہ منظر دیکھ کر آپ اپنی جان نہیں بچا سکتے۔ اب ذرا میرا اندازہ لگایئے۔ وہ معصوم بچہ جس کو چھ سات سال کی عمر میں اپنی پیار ماں سے لپٹنے اور پاس اٹھنے بیٹھنے کو منع کر دیا گیا ہوگا۔ جس کی ساری زندگی صرف خوبصورت اور شریف عورتوں اور لڑکیوں سے بجز کر بیٹھنے کی مرہون منت ہوگی جس کی نظر مختلف قسم کے رنگین کپڑوں میں الجھ کر زخمی ہو جایا کرتی ہوگی۔ جس کی سانس حسین عورت کے قریب بیٹھ کر اس کی بے چین سانسوں کی محتاج ہوگی۔ جس کی پریشان زندگی بکھری ہوئی زلفوں میں پناہ لینے کی آرزو مند ہوگی اب اس کو ایک ایسی شریف اور حسین عورت سے سابقہ پڑے جو بجھو کر بیٹھنے پر خود بھی جھوٹ موٹ بے چین نظر آتی ہو۔ اور قدم قدم پر اس غریب کو بچپن والی کیچ بے چینی یاد آتی ہو۔ وہ لاہور والے حسن کی جس میں وہ ناکام رہا تھا۔ یہ کمبخت تو بچپن سے جوانی تک یہی سوچتا رہا کہ تمام بے چینیاں سچی ہوا کرتی ہیں۔ اس گدھے کو یہ کون بتاتا کہ کبھی کبھی یہ بے چینیاں صرف دکھائی جا سکتی ہیں۔ ہوتیں نہیں۔ جس مظلوم کا اس ادا کے سوا کوئی سہارا ہی نہ ہو اور یہ سہارا بھی کسی کی شریف اور حسین بیوی سے مل رہا ہو، کسی چھوٹے بچے کی ماں سے مل رہا ہو تو کیا حالت ہوئی ہوگی اس معصوم کی۔ اس کو وہی بچپن والی کسی کی

بیوی اور وہی واقعات پھر نظر آنے لگے ہوں گے۔

کچھ معنوں میں میری ایسی کی تیسی پھر گئی تھی۔ میں ایکبار پھر بچپن کے اس خواب اور رنگین چپنے میں کھو گیا تھا۔ میرا بچپن اس بھرپور شباب کے عالم میں ایکبار پھر پلٹ کر آ گیا تھا۔ میں ان سے ویسی ہی بچپن کی ضدیں کرنے لگا تھا اور وہ ہماری ضدیں اٹھاتی بھی تھیں۔

جب اس خوابِ گراں سے غمِ روزگار چونکا تا تھا تو پھر رائٹنگ اور شاعری کی طرف پلٹتا تھا۔ کیوں کر پلٹتا تھا یہ نہیں معلوم۔ بہرحال یہ طلسمِ جسم و خواہش برسوں رہا۔ یہاں تک کہ دل و دماغ کے علاوہ روح تک اس کی عادی ہو گئی۔ آج یہ چند اوراقِ پریشاں لکھنے بیٹھا ہوں۔ اور جب اس جگہ پہنچا ہوں دل وہی لطف لینے لگا، اسی انداز سے دھڑکنے لگا۔ اسی ضد سے مچلنے لگا۔

عرصے کے بعد دوستوں میں نکتہ چینیاں شروع ہوئیں اور گھبرا کر ان بیگم صاحبہ نے ہماری شادی ٹھہرائی اور ہم نے ہاں کر دی۔ ہماری شادی ہو گئی۔ پھر بھی ہم ان کے محتاج رہے۔ جب تک صبح یا شام کے وقت اس عبادت گاہ میں جا کر، اس مورتی کو کسی نہ کسی طرح چھو کر اس کی جنبشوں کو مختلف زاویوں سے پرکھ کر لطف اندوز نہ ہو لیتے تھے طبیعت بے چین سی رہتی تھی اور سکون کسی طرح نصیب نہ ہوتا تھا۔ اگر ان بیگم صاحبہ کا ہاتھ ہمارے کندھے پر ہے تو دل چاہے گا ساری زندگی یونہی رکھا ہے۔ ان کے ساتھ موٹر میں ہیں، بھرے ہوئے ہیں تو دل چاہے گا کہ کمبخت موٹر ساری عمر یونہی چلتی رہے اس سے آگے بڑھنے کی نہ کبھی ہماری ہمت ہوئی اور نہ انہوں نے چاہا۔ وہ بھی یہی چاہتی تھیں اور ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ مرتے رہیں اور پھڑکتے رہیں ان کی اداؤں پر اور دفن ہوں کہیں اور جا کر۔

غرض اس طرح یہ پاگل کا خواب آگے بڑھتا گیا اور ہم جی بھر کے دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ بڑے صاحبزادے پیدا ہوئے اور تھوڑے دنوں بعد ایک عجیب انقلاب آیا۔ وہ یہ کہ ان بیگم صاحبہ کی ایک دم سے طلاق ہو گئی۔ اور اب ان کو ہماری ہی محبت پر بھروسہ رہ گیا۔ کچھ معنوں میں ہم سے بہتر ان کا چاہنے والا اور کون ہو سکتا تھا، جس کو دو عالم میں صرف ایک ہی جنت دکھائی دے رہی ہو۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اب ہمیں اپنی بیوی سے، گھر سے، بچے سے عجیب قسم کی محبت پیدا ہونے لگی تھی، جو نہ کہی جا سکتی ہے اور نہ سمجھائی جا سکتی ہے۔ اس کا تعلق صرف دل اور دماغ سے ہے۔

گھنٹوں ہم سوچا کرتے تھے کہ یہ مانا کہ ہم ان بیگم صاحبہ کے بغیر جی نہ سکیں گے مگر ہماری بے گناہ بیوی اور معصوم بچے کا کیا گناہ ہے؟ یہ خیال رفتہ رفتہ دل میں اتنا گھر کر گیا کہ اپنی موت کے ساتھ اور بھی کئی موتیں دکھائی دینے لگیں۔ کچھ سال اور گزر گئے زمانہ اور آگے بڑھ گیا۔ چھوٹا لڑکا زہیر پیدا ہوا۔ اب ہم اپنے دل و دماغ میں، اپنی روح کی گہرائیوں میں ایک ایسی جنگ لڑ رہے تھے جو جیتی بھی جا سکتی تھی اور ہاری بھی جا سکتی۔ ہماری جیت میں صرف ہماری زندگی جھلک رہی تھی۔ لیکن ہماری ہار میں ان تین معصوم اور بے گناہ زندگیوں کا سوال تھا۔ خدا کی قسم برسوں نہ ہارتے بن پڑی اور نہ جیتتے۔ ہم

اس جنت کو پا کر بھی اس کے نہ بن سکے۔ زمانہ شہرت نام اور پیسہ قدموں پر
بکھرتا ہوا آگے بڑھتا گیا اور اسی کے ساتھ ساتھ میری الجھنیں اور بے چینیاں
بھی اسقدر بڑھتی گئیں کہ توبہ —!

اب یہ ہمارے گھر آ کر گھنٹوں ہمارے انتظار میں بیٹھی رہتی تھیں اور
کسی نہ کسی بہانے سے ہماری بیگم صاحبہ سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔ ایک دن
میں گھر میں دیر سے واپس ہوا۔ معلوم ہوا کہ کئی گھنٹوں سے تشریف فرما ہیں۔
میں نے اسی وقت یہ شعر کہا۔

ان کے قدم اور میری تربت
وقت نے کیسی ٹھوکر کھائی

کیونکہ اب وقت وہ آ پڑا تھا کہ میں قطعی کسی فیصلے کے قابل ہی نہ
تھا۔ آخر مجبور ہو کر ایک عرصے کے بعد ان کو ایک دوسرا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔
اپنی جنت میں حضرت آدم کو گھس کر جب ہم نے گندم کھاتے دیکھا ہوگا تو
ہمارے دل و دماغ کی کیا حالت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا اور
نہ میں ان چند صفحات پر تحریر کر سکتا ہوں۔

قدم قدم پر موت دکھائی دینے لگی، ہر قسم کا کھانا بند۔ پرہیز۔
دوائیں۔ حکیم۔ ڈاکٹر۔ اب مرا اور اب مرا۔ ممکن ہے ہم یہ چاہتے ہوں کہ
بیوی ترس کھا کر ہم کو مرتا دیکھ کر اس جنت میں مجھ آدم زاد کو بھی داخل ہونے کی
اجازت دے دیں۔ مگر آج کل کی پڑھی لکھی بیوی جو آپ کا ہر ارادہ اور اس کا
ہر سبب بھی جانتی ہے۔ اور پھر ایک حسین جوانی کے ساتھ جس کو اب وہ خوب
اچھی طرح سمجھ بھی چکی ہو، ہم کسی فیصلے پر تو نہ پہنچ سکے لیکن جب بھی دل و دماغ
میں جنگ چھڑی جیت دماغ کی ہوئی۔ ہم نے شکستوں پر شکستیں کھا کر ریس
زوروں پر شروع کر دی۔ شراب بھی کبھی کبھی پی لیتے تھے۔ بہت دنوں تک گناہ
کے خیال رو کے رکھتا تھا۔ ہزاروں کیا لاکھوں ریس میں ہارے۔ جب ہوش
آ جائے گھر، بیوی اور بچوں کو جہنم کا نمونہ بنا دیں مگر حیرت ہے کہ اس جہنم کو بھی
اس جنت کے ہاتھ نہیں بیچا جو ہماری زندگی خرید لینے کا ہر وقت دم رکھتی تھی اور
ہر وقت بکنے کو تیار بھی رہتے تھے۔ گھر تباہ ہو رہا تھا۔ شہرت دم توڑ رہی تھی،
مفلسی ہر طرف سے آ رہی تھی۔ کام برسوں سے بند کر دیا تھا۔ زندگی جہنم بن چکی
تھی اس کے باوجود سامنے جنت کھڑی تڑپ تڑپ کر بلا رہی تھی۔ اور ہم بھی
قریب سے اور کبھی دور سے بس اس کی شوخیاں دیکھتے رہے۔ آخر تنگ آ کر یہ
جنت اپنی تمام رنگینیوں سمیت ایک چھوٹے قد کے گندمی رنگ رقیب کے ساتھ
یورپ سدھاری — اور اس سرخ رنگ صحت مند آغا — کی زندگی میں —
ایک دوسرا دھچکا لگا — ویسا ہی جیسا بچپن میں لگا تھا — وہی طوفانی رات کا
منظر — بجلی کی چمک — ادھا دھند بارش — آوازیں — ملی جلی سانسوں
کی آوازیں — دور — بہت دور —! ایک تڑپتے ہوئے دل کی آواز —
قریب — بہت قریب!

تین سال اور گزر گئے۔ ایک دن اچانک پونا کے ایک ہوٹل میں
ایک اور نئی جنت سے ملاقات ہوگئی۔ یہ جنت وانا کی رہنے والی تھی اور پیرس

میں اس کے بہت سے عزیز رہتے تھے۔ اب سنئے حضور!

جب بمبئی میں ریس کا سیزن ختم ہو جاتا تھا تو ہم پونا ریس کھیلنے جاتے تھے۔ کبھی کبھی چھٹیاں ہوتی تھیں تو ریس دو دن ہوا کرتی ہفتے کو ریس۔ اتوار کو چھٹی، پھر پیر کو ریس۔ اس لئے ہم کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہر جایا کرتے تھے۔ اور تین چار دن بعد بمبئی واپس آتے تھے۔

ایکبار رات کو پونا پہنچے تو کسی ہوٹل میں جگہ نہ ملی۔ تمام ہوٹل بھرے ہوئے۔ ریلوے گسٹ روم اور سب کمرے بھرے ہوئے۔ سنہہ پربھا پردھان جو مشہور ہیروئن تھیں ہماری بیحد دوست۔ یہ ہمیشہ موٹر، بنگلہ، اور جب ریس میں ہار جاؤں تو ہزار پانچ سو، جو بھی مانگوں دے دیا کرتی تھیں۔ وہاں گئے، اتفاق کی بات وہ بھی بمبئی یا کہیں اور گئی ہوئی تھیں۔ شاہدہ اور احمد بھی نہیں ملے۔ بہرحال کن کن کے نہ جانے کتنے دوستوں کے گھر گیا اور کوئی نہ ملا۔ سب غائب۔ اب میں بیحد تھک گیا تھا۔

مجبور ہو کر ایک ہوٹل میں گھسا۔ بارہ بجے رات کا وقت۔ منیجر سے کہا۔ ''اگر جگہ نہ ہو تو سامان دفتر میں رکھ لو، ہم باورچی خانے میں بھی سونے کو تیار ہیں''۔ منیجر ہنسا۔ اور کہنے لگا کہ ''ایک کمرہ خالی ہے تین سے۔ ایک یوروپین صاحب بمبئی گیا ہوا ہے اور کل سے میم صاحب بھی گئی ہیں۔ جس وقت بھی ہی لوگ آگئے تم کو اپنے سامان کے ساتھ نکلنا پڑے گا''۔

میں نے کہا ''منظور ہے'' اور اس کمرے میں اسی طرح سوٹ پہنے سو گیا۔

دوسرے دن ریس کھیلی پھر اتوار آ گئی۔ اس رات بھی کوئی نہیں آیا۔ میں پھر سو گیا۔

بے خبر سو رہا تھا کہ بارہ ایک بجے کے قریب کسی کے دوسرے پلنگ پر گرنے کی آواز آئی۔ گھبرا کر اٹھا۔ دیکھا کہ ایک میم صاحب بیہوش ہو کر گری ہیں۔ جگانے کی کوشش کی۔ بالکل غافل۔ آوازیں دیں۔ صدائے برنہ خواست۔ یعنی بمبئی کی زبان میں گپ چپ گھبرا کر جھنجھوڑا، کبھی ادھر ڈھلک جائے کبھی ادھر ڈھلک جائے۔ اب تو میری بھی بری نوبت ہو گئی۔ ان کا چھوٹا بیگ جوان کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا تھا، کھولا۔ اس میں سے ایک نیند آنے والی گولیوں کی شیشی ملی جو آدھی سے زیادہ خالی ہو چکی تھی۔ سن سے ہو گیا پورا کمرہ گھومتا نظر آنے لگا۔ قریب تھا کہ میں بھی غش کھا کر گر پڑوں۔ ایسے نازک موقعوں پر ہمیشہ میری عقل بیحد تیزی سے کام کرنے لگتی ہے۔ کمرے کی میز پر ایک طرف بہت سی مکھیاں کسی چیز پر بیٹھی کھا رہی تھیں۔ پہلے ہی جھپٹے میں چار پانچ مکھیاں پکڑ لیں۔ پائپ سے گرم پانی گلاس میں لیا۔ مکھیاں اس میں ملائیں اور یہ مکھی مکسچر میم صاحب کو زبردستی اٹھا کر پلایا۔ اسی مکسچر کے دو گلاس اور میم صاحب کو پلائے۔ یہ نسخہ میں نے بچپن میں اللہ جانے کس سے سنا تھا جو اس وقت کام آیا۔

میم صاحب بیہوش تھیں اور میں یہی دوا پلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اب جو تے یعنی الٹی آتی ہے تو سارا پلنگ ...... ایک اور ...... ایک اور آئی۔ اب صبح پانچ بجے کے قریب ان کو پورے طور پر ہوش آ گیا تھا۔ یہ مکسچر انکو پھر پلانے کی کوشش کی تو انہوں نے غصے میں گلاس پر ایک ہاتھ مارا، اور گلاس سامنے والی الماری پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ میں نے نیند کی گولیوں کی بچی ہوئی شیشی باہر اچھال دی۔ گھبرا کر باہر نکلا۔ بمبئی کے ایک دوست ڈاکٹر بنرجی سے اسی عالم

میں ملاقات ہوئی۔ یہ چوتھے سال میں بمبئی کے جے جے اسپتال میں ابھی پڑھ رہے تھے۔ ریس کھیلنے پونا آئے تھے۔ گھبرا کر ان سے سارا قصہ بیان کیا۔ ان کو لا کر دکھایا۔ وہ فوراً ایک دوا لینے چلے، ہم سے کہنے لگے بھاگنا نہیں ڈر کر۔ نہیں تو ہم دونوں پکڑے جائیں گے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لو۔ میں کہیں سے بھی دوا لے کر آتا ہوں۔ اب ہم نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

میم صاحب نے ہم سے کہا۔ ''تم نے ہم کو کیوں بچایا۔ ہم کو مر جانے دیا ہوتا۔ ہم مریں گے، ضرور مریں گے''۔ یہ کہہ کر وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھیں۔ اور ہم نے اٹھا کر پلنگ پر زبردستی رکھ دیا۔ پھر اٹھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں غش آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بنرجی آ گئے۔ دن کے ایک بجے تک ان کو دوا پلاتے رہے۔ اس دن ہم ریس نہیں گئے۔ اور اب جو انکی آنکھ کھلی تو سات بجے شام کو کھلی۔ ریس سے بنرجی بھی آ گئے تھے۔ اب یہ بالکل ٹھیک تھیں۔

ان کا شوہر دوسری جنگِ عظیم میں مارا گیا تھا۔ ایک انگریز نوجوان سے کچھ سال بعد عشق ہوا۔ وہ شادی کرنے کے بہانے ان کا کل روپیہ، زیور وغیرہ لے کر اسی ہوٹل سے چار دن پہلے کہیں بھاگ گیا تھا۔ ان کو جب بمبئی سے ٹیلی فون پر یہ خبر ملی تو یہ نیند کی گولیاں کھا کر مر رہی تھیں اور اپنے ساتھ ہمیں بھی مارے ڈال رہی تھیں۔ مرنا بھی اسی ہوٹل میں تھا اور وہ بھی ہمارے ہی پہلو میں۔ وہ بھی قریب کے بستر پر! ہمیشہ سے ہم باتیں تو خوبصورت کرتے ہیں۔ اب جو تین دن اور تین راتیں ان کی سیوا میں صرف کیے، خوشامد کر کے، سمجھا بجھا کے، اونچ نیچ دکھا کے۔ خود اپنی جان ان کے ساتھ جھوٹ موٹ دینے کو تیار ہو کے، غرض ہر طرح ڈرا کے ان کی ہر ہر ادا پر تڑپ کے حسین جملے اور ترشے ہوئے ٹکڑے کہہ کہہ کے، تو یہ غمزدہ عورت پھر ایک بار جینے کو تیار ہو گئی۔

تین دن کے بعد ہم انکو 'کھنڈالے' لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہے۔ اور اب جو پونا کی ریسز میں پھر پلٹے تو معلوم ہوا کہ برسوں کے بعد عاشق و معشوق کہیں سے پلٹے ہیں اور اتفاق سے پونا ریس میں آ گئے ہیں۔ بڑے بڑے سنجیدہ تاجر ایک ہی بات تڑپ کر پوچھتے تھے۔ ''کون ہے یہ عورت؟''

ان سنجیدہ لوگوں میں ہمارے پرانے بوس یوسف فاضل بھائی بھی تھے۔ انہوں نے بھی بڑی بے چینی سے پوچھا تھا۔

اب ہم بمبئی پلٹے۔ ایک بڑے ہوٹل میں رہنے لگی یہ حسین اور معصوم صفت عورت۔ اور پھر ایک زمانہ آیا جب ہمارے قدم زمین کے بجائے آسمان پر پڑنے لگے تھے۔

سچ سچ اس قدر حسین تھی یہ عورت کہ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ لاکھوں صرف کر کے اسے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ تھی کہ صرف ہم کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ قریب قریب تین سال تک ہم کیا چاہتے ہیں، کیا نہیں چاہتے یہ اس کی کسی طرح سمجھ میں نہ آیا۔ اور نہ ہم نے آگے قدم بڑھایا۔ وہی جسم کی جنبشیں، وہی محبت بھری پیار کی باتیں، وہی بھرے ہوئے موٹر میں گھنٹوں ساتھ گھومنا پھرنا۔ اس سے ہم کو بیحد سکون ملنے لگا تھا کیوں کہ یہی تو ہماری زندگی تھی۔ مگر اب وہ بہت کچھ پاگل ہونے لگی تھی۔ اس کی کسی طرح یہ سمجھ میں

نہیں آتا تھا کہ جب وہ ہمارے ساتھ سب کچھ گوارا کر سکتی ہے' برسوں سے ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے ہیں تو پھر اتنا قریب رہ کر اتنی دور کیوں ہیں؟ وہ یہی سوچتی رہی اور ہم بچپن کا وہی واقعہ سوچتے رہے۔ مجھ سے بڑا گدھا اور کون ہوگا۔ ذرا بتایئے تو سہی۔ بیوی سے پورا ہواؤ کھل چکا تھا۔ بچے ہو چکے تھے مگر ادھر جب سوچا اور دل دھڑکا کہ ایک بار بیوی سے تو عزت بچ گئی، اس عزت کو باقی رکھا جائے۔ کیوں اپنے ہاتھوں اپنی عزت کھوئیں، اور مزہ بھی خراب کریں اور بعد میں مزہ کریں دوسرے۔ وہی رشتے کے بھائی—! وہی بچپن کا ڈر—! وہی بارش' وہی گرج وہی چمک—! وہی وحشت—! وہی رنگوں والی لڑکیاں۔

یہاں تک کہ پارٹیشن صاحب ٹہلتے ہوئے تشریف لے آئے۔ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جس نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ لوگ جان بچانے کیلئے بھاگ رہے تھے۔ اُدھر سے ادھر اور ادھر سے اُدھر—! گاندھی جی شہید ہو گئے۔ شاہدہ اور احمد بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ قیامت کا منظر تھا۔ بہترین دوست جا رہے تھے۔ احباب سے احباب چھوٹ رہے تھے۔ پہلی جنت ایک دوست کے ساتھ یورپ سدھاریں۔ دوسری یہ جنت جو ہم نے ایک ہوٹل میں بنائی تھی صحیح معنوں میں پاگل ہونے لگی۔ آخر اس نے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ بیچاری سمجھی کہ شادی کے بعد ہی کھلے گا۔ شاید اس خاص معاملہ میں بڑا مذہبی آدمی ہے۔ 'میک' کا اصرار، میرا انکار!

اس عورت کی ہمیشہ تیوری چڑھی رہتی تھی جو اس کے حسن کو اور جان لیوا بنا دیتی تھی۔ اس لئے میں پیار سے ''میک'' کہتا تھا یعنی جنرل میک آرتھر! اور تیوری چڑھی ہوئی ہوتے ہوئے بھی مسکرانے کی ادا۔ معلوم ہوتا تھا کہ خزاں میں بھری بہار گھس آئی۔

اب وہ بگڑ کر مجھ سے دور دور رہنے لگیں۔ ہم ان سے بدظن رہنے لگے۔ مگر واہ کس کیرکٹر کی عورت تھی۔ اس قدر حسین ہوتے ہوئے بھی کیا مجال جو کسی طرف نگاہ اٹھا کے بھی دیکھ لے۔ حالانکہ اس نگاہ کی حسرت بہتوں کو تھی۔ لیکن ...... ہم سے بار بار شادی کا سوال۔ ممکن تھا ہم ان سے کھل جاتے اور شادی بھی کر لیتے۔ مگر پھر وہی تین جانوں کا سوال! یعنی بیوی اور بچوں کا خیال جو اب دل کافی گھر کر چکا تھا۔ بچے اب بڑے ہو رہے تھے بچوں سے مذاق بھی ہوتا تھا اور ایک نئی معصوم جنت کی بنیاد بھی پڑ رہی تھی۔ آخر گھبرا کر تنگ آ کر، اپنی طبیعت سے ڈر کر یہ فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ وہ بھی یورپ سدھاریں۔ وہ گئیں اور ساری کیف و مستی، ساری سرشاریاں اور بیہوشیاں اپنے ساتھ لیتی گئیں۔ اب ہم زندگی کی ہر بازی ہار چکے تھے۔ مگر اس ہار میں بھی ایک جیت تھی جو صحیح معنوں میں ہماری جیت کہی جا سکتی ہے۔ مگر اس جیت پر خوش ہونے کیلئے دل کہاں سے لائیں؟ یہ تو بڑے ہی دل والوں کی بات ہے۔ نہ جانے کیوں کر ہم بزدل نے یہ جنگ جیت لی۔ مگر بے مثل اسٹوری رائٹر کے بجائے، پاگل مشہور ہو گئے۔ اگر آپ بھولے نہ ہوں تو یاد دلاؤں کہ اب میری بیوی کو پہلی جنت کے متعلق سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اور یہ وہی زمانہ تھا کہ انہوں نے اس بات

سے جل کر اور کچھ واقعی بچہ ہونے کے ڈر سے کسی قسم کی مدد دینے سے انکار کر
دیا تھا۔ اور۔

''ایک ہنگامے میں موقوف ہے گھر کی رونق'' کے بعد یقین دلایا تھا
کہ اب تم میں وہ اگلا سا دم خم نہیں رہا۔ اس لئے یکطرفہ مدد نہیں دی جا سکتی۔

اور اب ہم کبھی پہلی جنت کو ڈھونڈتے تھے اور کبھی اپنی دوسری جنت
کو...... وہ دونوں جا چکی تھیں! بمبئی بھر میں گھوم گھوم کر ان در و دیوار کو تکتے
تھے۔ جن میں ہماری کھوئی ہوئی جنتیں رہا کرتی تھیں۔ ان جگہوں کو تکتے تھے
جہاں جہاں ان کے ساتھ گھومے تھے، پھرے تھے، بیٹھے تھے۔ باتیں کی تھیں۔
کبھی ہم نے انکو اور کبھی انہوں نے ہمیں منایا تھا۔ بس اب ہمیں یہی ایک کام
رہ گیا تھا۔ آخر کار دل کی تسکین ہر آنے جانے والی جنت میں ڈھونڈنے لگے۔
شاید یہ مل جائے اور دل ٹھہر جائے، شاید وہ مل جائے اور تسکین ہو جائے لیکن
وقت کی طرح جانے والے بھی واپس نہیں آیا کرتے۔ بڑی الجھنوں اور
مایوسیوں کے ساتھ گھر آتے تھے تو اپنی بیگم صاحبہ سے پھر وہی سوال...... ان کا
پھر وہی جواب...... پھر وہی ہنگامہ۔

ہنگامے کے بعد پھر باہر چلے۔ اور پھر وہی ایک ہی جنت کی تلاش!
جوانی ساتھ چھوڑ رہی تھی، تندرستی میں گھن لگ رہا تھا۔ دوست احباب مفلسی کی
وجہ سے منہ چرانے لگے تھے۔ اپنے پرائے بن گئے تھے۔ اب ایک تو مفلسی
دوسرے کسی حسین جنت کو حاصل کرنے کا خواب، یہ جانتے ہوئے بھی کہ بڑھاپا
اور جہنم میں جانے کا وقت آ رہا ہے ایک چنگاری تھی جو اسی آب و تاب کے
ساتھ جلتی رہی۔ اس چنگاری نے قریب قریب سب کو جلا ڈالا تھا۔ اور اب اس
کو بجھانے کی فکر شروع ہو چکی تھی اور جو کچھ بچ گیا تھا۔ اس کو بچا لینے کے
ارادے مچل رہے تھے۔ بقول آرزو لکھنوی۔

پہلے تھی فکر آگ حسرت خانۂ دل کی بجھے
اب ہے اس کی جستجو کیا رہ گیا کیا جل گیا

اس ادھیڑ بن میں نہ جانے کتنے مزاروں کی خاک چھانی۔ ڈاکٹر
اور حکیموں کی خدمت گزاریاں کیں۔ آب حیات کی تلاش میں مختلف مقامات
کے دریاؤں کا پانی پیا۔ مگر وہ زندگی واپس نہ آئی جس کی تلاش صرف کھو دینے
کے بعد پیدا ہوتی ہے چنگاری اب بھی جل رہی تھی...... جس پر بظاہر راکھ آ چکی
تھی۔ اور اسی آب و تاب سے دہک رہی تھی کہ ۱۹۵۰ء میں گھبرا کر تیسری جنت
کی تلاش میں بغیر کچھ سوچے سمجھے اپنا سارا کام چھوڑ چھاڑ مڈل ایسٹ، کربلائے
معلی اور نجف اشرف کی زیارت کے بہانے، اپنی بیوی، دونوں بچوں اور
ایک نوکر ستار خاں کو لے کر روانہ ہو گیا۔ چھوٹا بچہ ستار خاں سے بہت زیادہ
مانوس تھا۔ اس لئے ان کو بھی لے جاتے ہی بنی۔ اس زمانے میں میری بیوی
کے بہنوئی آصف علی اصغر فیضی صاحب مڈل ایسٹ کے ہندوستان کی طرف سے
سفیر تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہم ہندوستان کے مشہور رائٹر کے بجائے پاگل
مشہور ہو گئے تھے۔ واقعاً ہو گئے تھے یا بنا دیئے گئے تھے، یا اپنے کو خود بنا رکھا تھا۔

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی
ورنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

میں اور منیرہ

افسانہ نگار اقبال متین کے اعترافات

اقبال متین ہمارے عہد کے نمایاں افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ افسانہ نگاری کے علاوہ شاعری اور مقالہ نگاری سے بھی انہیں گہرا شغف ہے۔ احساس کی سطح پر لکھتے ہیں۔

انہوں نے اپنی حیات معاشقہ ہماری فرمائش پر لکھی ہے اور اپنے بعض نمائندہ افسانوں سے ان کے اہم کرداروں کے متعلق اقتباسات پیش کر کے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ادیب بعض اوقات جس بات کو افسانہ اور کہانی بنا کر عوام کو پیش کرتا ہے وہ دراصل اس کی اپنی آپ بیتی کا ہی ایک ایسا پہلو ہوتا ہے۔ افسانوں کے اقتباسات نے ان کی حیات معاشقہ پر افسانوی رنگ چڑھا دیا ہے تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اقبال متین نے ماضی میں اپنے افسانوں میں اپنی زندگی کی کئی سچائیاں داخل کی ہیں جو کہیں ظالم کہیں معصوم نظر آتی ہیں۔

ابا ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے دسترخوان کی پیمائش کو اخلاقی گراوٹ نہیں گناہ سمجھ رکھا تھا۔ گھر کے بڑے دالان میں جتنا بڑا دستر خوان بچھتا، اتنا ہی انکے دل کی وسعتیں باچھوں پر پھیل کر مسکراہٹوں کا موج در موج سلسلہ اس طرح بن جاتے جیسے چودھویں کی چاندنی چٹک کر نیم شب کے سایوں کو پیروں میں دبا رکھتی ہے۔

مزاج کی یہ اپنائیت، التفات کا یہ رنگ، سارے گھر کو گلنار بنائے رکھتا۔ چچا حسین سرمست صاحب ابا کو بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ عزیز تھے۔ ان کی مستقل سکونت ابا کے ساتھ بشیر آبادی میں تھی۔ دو بیٹے ایک بیٹی اور چچی صاحبہ، گھر کا ایک حصہ ان کے لئے مختص تھا۔ ایک نہیں دو دو بیوہ پھوپھیاں بھی اپنے بچوں کے ساتھ کہاں چار چھ دن کیلئے آئی تھیں کہ دن ہفتوں میں تبدیل ہوئے اور ہفتوں نے مہینوں کا روپ دھارا۔ ابا ایسی ایسی ترکیبوں سے مہمانی اور میزبانی کرتے کہ جانے والوں کے بندھے ہوئے بستر کھل کھل جاتے۔

کسی کا آنا اور آ کر نہ جانا ہم بچوں کی عید ہو جاتا۔ اور ان طویل طویل عیدوں کا سلسلہ کبھی کبھی امی کو اکھر بھی جاتا۔ لیکن کیا مجال جو اس خدا کی بندی نے کبھی تیور میلے کئے ہوں۔ جو ابا کی خوشی سو ان کی خوشی۔ کچھ ان کی مرضی بھی یہی تھی کہ ہاتھ اونچا رہے ان کا۔ کھلے تو ابا یوں تھے کہ بچھ بچھ کر نہال ہوتے اور امی بچھا بچھا کر خوش حال۔ طور طریق کسی کے کچھ ہوں۔ کوئی دیتا ہے

تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی اور کوئی دیتا ہے تو انہیں بھی خبر ہو جاتی ہے جو بے خبری کے عالم میں ہوں۔ یہ ساری باتیں تو اماں اور امی کی تھیں، ہماری عیدوں میں بھلا کیا فرق پڑتا۔

چھوٹی پھوپھی اماں آئیں تو میری اتنی سی عمر میں جو ڈھیر ساری خوشیاں تھیں جانے کس جھپکے میں اٹھا کر کہیں چھپا دیں۔ وہ جوان کی منجھلی لڑکی تھی وہ مجھ سے کوئی ایک ڈیڑھ سال چھوٹی ہوگی۔ بھولی بھالی، کبھی میٹھی، کبھی سلونی، کبھی گوری، کبھی سانولی۔ کتنے روپ اس کے بتلا سکوں گا۔ میرے بس میں جیسے کچھ بھی نہ رہا، اٹھا کر اپنی آنکھیں اس کو دے دیں۔ اب وہ دکھائے تو دیکھوں نہ دکھائے تو اسی کو تکا کروں۔ اس کو دیکھا تو کچھ اس طرح نظروں میں کھب کر رہ گئی کہ خاندان کی ساری لڑکیوں کے چہرے ماند پڑ گئے۔ پھیکے پھیکے سے ہو کر رہ گئے۔ بس ایک ہی مکھڑا ساروں کی چمک دمک لے اڑا۔

''اب یہ احساس بھی تو میرے بس کا روگ نہیں تھا کہ اس کو پہلی بار دیکھ کر میں نے کچھ ایسا محسوس کیا تھا کہ میں نے اسے بارہا دیکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس احساس کی بنیاد کیا تھی۔ بس کچھ ایسا تھا جیسے میں تو اسے دیکھتا رہا ہوں۔ اسے تھم تھم کر آہستہ آہستہ کسی صنم کی طرح تراشا ہے۔ اسے ناز نخرے سکھائے ہیں۔ شرم و حیا سے لجا کر سمٹنے سکڑنے والے بدن کو میری نظروں نے شگفتہ پھول سے ادھ کھلی کلی بن جانا سکھایا ہے

لیکن کیا یہ سب کچھ میں جان بوجھ کر کرتا رہا ہوں۔ کیا یہ سب کچھ کر گزرنا میرے امکان میں تھا— بالکل نہیں— یہ سب کچھ تو ہو گیا تھا— ہوتا رہا تھا۔ میری آنکھیں دیکھنے کی گناہ گار تھیں......''

''بھری محفل میں آنکھوں کا مقدر ایک ہی آدمی کیسے بن جاتا ہے۔ رات جب میں تکیے میں سر چھپا کر رو رہا تھا جی چاہتا تھا کہ وہ مجھے بلک بلک کر روتا ہوا دیکھے۔ کوئی سایہ میرے سامنے بڑھتا ہوا دکھائی دے۔ پھر وہ جھک کر اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دے۔ جلتے ہوئے آنسوؤں کی نمی اپنی انگلیوں کی پوروں میں خشک کر لے۔ لیکن ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ دن بھر میں اسے کبھی مقابل ہو کر دیکھتا، کبھی چھپ کر۔ کبھی دور سے کبھی بہت قریب سے۔ اتنا قریب سے کہ اس کے بدن کی خوشبو مجھے مسحور کرنے لگتی اور میں اسے چھونے کیلئے تڑپتا۔ لمحہ بھر کیلئے قرب کی یہ نعمتیں سمیٹ کر میں اس سے دور ہو جاتا۔ لیکن میری آنکھیں میرے ساتھ اس وقت سے نہیں تھیں جس وقت سے اسے دیکھا تھا۔

''امی کہتیں— ''ارے تایا حضور سامنے کھڑے ہیں۔ قدم بوس ہوا تو؟''۔

میں چابی کے گڈے کی طرح جھک جاتا۔

تایا حضور پیلا تنگ مہری کا پاجامہ، چکن لگی کرتی
اور پہلے ہی گھڑے دوپٹے میں بھلا کیسے ملبوس ہوسکتے تھے لیکن
دکھائی دیتے۔ ارے میں تو پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ پاگل پن نہیں
تو اور کیا ہے۔ کوئی اس طرح کسی کو دیکھتا ہے کہ دوسرے بھی
وہی لگیں۔

ایک ایک دن میرے لئے قیامت بن رہا تھا۔ دن
کو اپنی آنکھوں کے پیچھے پیچھے پھرتا۔ رات انہی آنکھوں کے
آنسو سوجتن سے تکیئے میں چھپاتے رہتا۔ بھلا یہ بھی کوئی
زندگی ہوئی کہ سب کچھ آنکھوں ہی کو تج کر رکھ دیا۔ صبح آئینے
کے مقابل ہوئے تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی بہت دور سے آواز
دے رہا ہو۔ اور ہم آنکھیں جھکا جھکا کر آئینے کو تک رہے
ہوں کہ یہ آوازے لگانے والا کون ہے۔

بارہا میں نے اس سے نظریں ہٹا کر جب یکا یک
اسے دیکھا تو اس کی نظریں بھی چوری کرتی ہوئی پکڑی
گئیں —— وہ بھی مجھے چرا رہی تھیں۔ پھر ہم علانیہ ایک دوسرے
کو چرانے لگے۔ اس طرح نہیں جیسے کچھ دن پہلے اپنے آپ
سے چھپ کر ایک دوسرے کو چراتے تھے۔ اب صرف
دوسروں سے چھپنا رہ گیا تھا۔ اب تو ہم ایک دوسرے کو اس
طرح دیکھے جاتے کہ آنکھوں آنکھوں میں سمیٹ کر اپنی اپنی
زندگی میں بھر لیں گے۔

لیکن رات کو تکیے میں منھ چھپا کر رونے والی
آنکھیں، جی چاہتا کہ اس کی زلفوں، اس کے رخساروں، اس
کے جسم وجان کے سارے وجود کو آنسوؤں سے بھگو سکیں۔ لیکن
ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جس کے لئے
آنسو امڈ کر آتے ہیں۔ دھڑکنیں رکی رکی سی لگتی ہیں۔ جی
یوں بھر آتا ہے جیسے کبھی اس کیفیت سے آشنا ہی نہ تھا۔ چلتے
بولتے ہیں تو جھوٹے لگتے ہیں۔ بات کرتے ہیں تو بات کرنے
کو جی نہیں چاہتا۔ جبر کرتے ہیں تو اپنی ہی آواز پہچانی نہیں
جاتی۔ اب تو وہ سامنے ہے۔ بالکل پاس ہے۔ پھر یہ دوریاں
کیسے بڑھ جاتی ہیں۔ کیسے بڑھ گئیں۔ جیسے وہ ہے تو ہم نہیں
ہیں"

...... (شہر آشوب)

'لون پاٹ' ہو کہ 'آنکھ مچولی' 'کبڈی' ہو کہ 'گلی ڈنڈا' کھیل کے
میدان میں نہ بچوں کی تخصیص تھی نہ بچیوں کی۔ اس کو کوئی ستاتا تو میں پشتی پر اتر
آتا۔ وہ بھی کچھ اس طرح جھٹ سے مجھے پکارتی جیسے میں اپنے ابا کے گھر میں
رہتا ہی اس لئے ہوں کہ اس کے آگے پیچھے پھروں۔ اس کی دلجوئی کروں۔
اس کی خاطر دوسرے بچوں کا گریباں پکڑوں اور بچیوں کو گھرکیاں دوں۔ اتنا
سب کرنے پر بھی اس کے آنسو تھے کہ چھلک چھلک جاتے۔ اتنی بھیگی بھیگی

آنکھیں میں نے کم دیکھیں۔ وہ تو بس رونے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی۔

کھیل کھیل میں، میں نے کھویا بہت کچھ۔ پایا بہت کم۔ وہ جو ایک لڑکی جاگیردو دیال میں رہتی تھی، خالہ اماں سے کھس پھس کر کے امی نے اعلان کر دیا تھا کہ اکلو جانی کی دلہن زکو بی بی ہی بنے گی۔ زکو بی بی کی بھلمنساہٹ گھر بھر کو رجھاتی تھی — لیکن دل جب سودا کرتا ہے تو صرف بھلمنسائی کے سکے اس بازار میں نہیں چلتے۔ وہ تو زخم کھا کھا کر بوند بوند لہو سے زخموں کی آبیاری کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ اس کا سودا وہ کرتا ہی نہیں۔ سب کچھ لٹا کر زندگی کو تہی دست کر لینا اسکا شیوہ ہے۔ کھلی آنکھوں میں ریزہ ریزہ کنکر رکھ لینا اور نیندوں کا بیری ہو جانا اس کا مقدر ہے۔ یہ خود اذیتی اس کو جس آگ کی بھٹی میں جھونکتی ہے وہ اس بھٹی میں چاہے نہ چاہے، خواستہ نخواستہ کندن بنتا رہتا ہے۔ کوئی مفر ہی نہیں۔

اور میں کتنی چھوٹی عمر میں اس بھٹی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ امی کی نظریں شاید میرا پیچھا کرنے لگی تھیں۔ ہم سب بچے مل جل کر کھیلتے رہتے تو انہیں بس ایک ہی بات کی فکر رہتی کہ کوئی نا انصافی ہو یا نہ ہو منیرہ جھٹ سے پکار اٹھتی ہے۔

"دیکھو نا، اقبال بھائی مٹھولوتری کر رہا ہے"۔

"دیکھو نا، اقبال بھائی یہ شبو تو بڑا غصہ دکھاتا ہے"۔

"دیکھو نا، اقبال بھائی یہ جمیلہ چھیڑتی ہے۔ کہتی ہے، کہتی — کہہ دوں کر تو کیا کہتی ہے؟" کہ جمیلہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس کو منع کرتی۔

میں گھبرا جاتا۔ جانے جمیلہ کیا کہتی ہے۔ منیرہ تو اطمینان سے مسکرا دیتی۔ میں مسکرانے کی بات سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ جمیلہ جو کچھ بھی کہتی ہو گی میری امی اس سے کچھ بہت زیادہ ہی کہنا چاہتی ہیں۔ اب پھوپھی اماں کا ہمارے گھر وجود بھی امی کو بے آرام کئے دے رہا تھا۔ وہ بڑے مخمصوں میں پڑ گئی تھیں۔

وہ لڑکی جس کو میں چاہنے لگا تھا وہ بھی تو ابا کی بھانجی تھی۔ ایک بھرے گھر میں امی نے کہہ دیا

"چھوٹی ماں (میری خالہ) کا خط آیا ہے۔
تعطیلات ختم ہونے سے پہلے تمہیں اور سعدی کو ددھیال بلایا ہے۔ لکھا ہے چونکہ تمہیں پسند ہیں اس لئے بہت سارے کچے آم تمہارے لئے اچار رکھے ہیں۔ اور تم دونوں بھائیوں کیلئے دو اچھے سے یابو بھی فراہم کئے ہیں۔ خوب گھڑ سواری کرنا۔ لیکن بہت احتیاط سے۔ کھلے میدان میں دوڑانا۔ یابو کتنا ہی قابو میں کیوں نہ ہو، کھیتوں یا امرائیوں میں سرپٹ نہیں دوڑاتے"۔

امی نے ایک سانس میں ساری باتیں کہہ دیں اور میں منہ تکتا رہ گیا۔ چھوٹا بھائی سعدی تسکین اچھل پڑا۔

"چلئے بھائی جان، چلئے بھائی جان۔ کب جائیں گی امی؟"

منیرہ نے مجھے بغور دیکھا اور اس سے پہلے کہ امی میرے چھوٹے بھائی کو کچھ جواب دیتیں۔ کھک کھک منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے ہنسی دبالی۔

''کیوں، تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا ہے اقبال نواب''۔
امی برہم ہوتیں تو میں برہمی کی پہلی منزل پر اگو جانی سے اقبال بن
جاتا۔ اور دوسری منزل پر اقبال سے اقبال نواب۔
میں نے جرأت کی لیکن الفاظ ادا نہ ہوئے۔
''خاموش کیوں ہو، جواب کیوں نہیں دیتے''۔
''وہ میں نہیں تھا جس نے جواب دیا ہوگا۔ اندر سے کسی نے چیخ کر
کہا''۔
''میں نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا امی۔ میرا وہاں جی نہیں لگتا''۔
''کیوں بھئی پہلے تو جی لگتا تھا۔ اب کیوں نہیں لگتا بھلا''۔
ابا نے ناگواری سے امی کی طرف دیکھا۔ میں سمجھ رہا تھا۔ خاموش
رہ کر رفوچکر ہو جانے میں عافیت ہے۔ میں کھسک گیا۔ باہر برآمدے میں پہنچا تو
منیرہ دروازے کے پیچھے سے نکل آئی اور پھر اسی طرح ہنس پڑی۔ کھک کھک
اور ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔
جی چاہا ایک چپت لگا کر پوچھوں کہ کیوں ہنستی ہے۔
لیکن میں نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔
''یہ کیسی ہنسی ہے؟''۔
اس نے فٹ سے جواب دیا
''اس وقت تمہارا آنسو پیتا ہوا چہرہ دیکھنے کے بعد بھلا اور کس طرح
ہنس سکتی تھی میں؟''۔

''چلو چلتے ہیں ددھیال۔ مجھے بھی لے چلو نا''۔
اب کی بار غصے میں بھی مجھے اس کی ذہانت پر پیار آیا۔
شام کو پالش کیے ہوئے سیلو کے پتھروں کے بڑے سے چبوترے پر
جب شطرنجیاں بچھا کر سفید سفید چاندنیوں کا فرش کر دیا گیا تو میں نے وقت سے
پہلے ہی اپنا بستر سنبھال لیا۔ بھرے گھر میں رہ کر گھر بھر سے کٹ جانے میں
صرف دکھ شامل حال نہیں ہوتا۔ کچھ لذتیں بھی ڈھکی چھپی ساتھ ہو جاتی ہیں اس
کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب منیرہ حسب معمول میرے پاس آکر بیٹھ گئی
اور میرے پیٹ پر سے قمیض کا دامن اٹھا کر اس نے اپنی کلمے کی انگلی میرے
پیٹ پر لگا دی اور کہا پہچانو کیا لکھتی ہوں۔
اس نے پہلے بہت احتیاط سے اقبال لکھا۔
طے یہ تھا کہ اگر تین بار لکھنے پر بھی میں نہ پہچانوں تو اس کی جیت ہو
جائے گی اور غلط پہچانوں تو وہ من مانی سزا تجویز کر سکتی ہے۔ سزا کے طور پر اکثر
وہ رنگ برنگی پنسل منگواتی اور انہیں بڑے جتن سے اکھٹا رکھتی۔
میں تین بار اس سے ضرور لکھواتا۔ پہچان کو بھی لکھواتا کہ یہ سلسلہ
طویل ہو۔ لیکن اس شام میرا جی اس کھیل میں بھی نہ لگ سکا۔ کوئی اندر
آنکھوں میں آنسو بننے لگا تھا۔ کون تھا یہ۔
''تین نہیں پانچ بار لکھ چکی ہوں۔ کیا ہو گیا ہے آج تمہیں''۔
میں نے کہا۔ ''اقبال لکھا ہے''۔
بولی۔۔۔ ''لکھا نہیں لکھتی رہی ہوں''۔

مجھے اس کی ذہانت پر کیوں پیار نہیں آیا۔

پھر اس نے منیرہ لکھا— میں پہچان کر بھی خاموش رہا۔

اس نے پھر لکھا۔

میں نے کہا پھر لکھو— اس نے ٹوکا

"یہ تیسری بار ہے"۔

تیسری بار لکھ چکی تو میں نے کہا۔ "یہی نام سو بار لکھو"۔

"اچھا جی بس یہی کام ہے مجھے"۔

وہ ذرا سا میرے اور قریب ہو گئی۔

کہا— "یہ بچا لو تو انعام ملے گا"۔

اس نے ق کی بجائے رخ سے رقیہ لکھا۔

میں نے دوسری بار اسے لکھنے نہیں دیا۔ اور کچھ ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ نام تمہیں کیوں یاد آیا۔ لکھا بھی ہے تو غلط لکھا ہے"۔

اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"یہ نام زندگی بھر غلط ہی لکھوں گی"۔ اور جماہی لے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب چلوں میں، نیند آ رہی ہے"۔

اٹھنے لگی تو اس کا آنسو میرے بچھونے پر گرا۔

اس رات تکیے میں سر چھپا کر میں بہت رویا۔

اس رات پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ آنکھوں میں آنسوؤں کی کتنی جھیلیں ہوں گی جو شانت پڑی ہیں۔ کنکر کوئی پھینکے ہے نہ پتوار چلائے۔ ہوا کے جھونکوں کا بھی شاید ان تک گزر نہیں ہوتا۔ لیکن جب یہ جھیلیں دریا بنتی ہیں تو رونے میں کیا کیا مزہ ملتا ہے۔

"اور یہ پیسہ جوں کا توں رہ جائے تو؟"

"تو میری جیت ہو گی"۔

"اور اگر چپٹا یا ٹیڑھا ہو جائے تو؟"

"تم جیت جاؤ گی"۔

"اور اگر میں جیت جاؤں تو؟"

"تو میں تمہاری بات دن بھر مانتا رہوں گا"۔

"بات نہیں حکم کہو"۔

"تم تو ابھی سے خود کو منوانے چلی ہو"۔

"اس لئے کہ میری جیت یقینی ہے"۔

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ اچھا چلو دیکھتے ہیں"۔

میں اپنی جیب سے پیسہ نکال کر بڑی شان سے اس کی طرف بڑھا دیتا۔ اس طرح جیسے پیسے کی میرے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں اور وہ میری اس شان کی پرواہ نہ کرتی ہوئی پیسہ اس طرح میرے ہاتھ سے لے لیتی جیسے اس کا اپنا ہو اور بڑے اطمینان سے مسکراتی ہوئی ریلوے لائن کی طرف

بڑھ جاتی۔ میں بھی ساتھ ہو لیتا۔ بڑی احتیاط سے پیسہ ریل کی
پٹری پر رکھ دیا جاتا اور ہم دور کھڑے ٹرین کا انتظار کرتے۔

ٹرین جھک جھک کرتی دھواں اڑاتی ہمیں دور سے
نظر آتی تو ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ جیسے جیسے ٹرین قریب آتی
ویسے ویسے ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہونے لگتیں۔

ہم اس طرح پٹری پر پیسہ رکھ کر اپنی ہار اور جیت کا
فیصلہ سنانے کا حق دیوہیکل انجن کو دے دیتے۔ اب اس کے
بس میں ہوتا کہ وہ دن بھر کیلئے مجھے منی کا محکوم بنا دے یا منی کو
میرا۔

ٹرین گزرنے لگتی تو منی اپنے دونوں ہاتھ اپنی
آنکھوں پر رکھ آنکھیں بھینچ لیتی اور ٹرین گزر جاتی تو دور کھڑی
پٹری کی طرف تکتی رہتی۔ اپنی جگہ سے ہلتی بھی نہیں اور مجھ سے
اصرار کرتی کہ میں پیسہ اٹھا لاؤں۔ اصل میں پیسہ دیکھنے کا
شوق ہم دونوں کے دلوں میں ہوتا لیکن منی اپنی ہار کے تصور ہی
سے سہم سہم جاتی اور میں منی کو دکھانے کیلئے بڑی دلیری سے
پٹریوں کی طرف بڑھ جاتا۔

پٹریوں تک پہنچ کر میری گردن جھک جاتی تو منی
پکارتی۔

''ہم جیت گئے ہیں۔ ہم جیت گئے ہیں''۔

''ادھر آؤ ذرتے۔ ایک دم بھاگو وہاں سے اور پہنچو
میرے پاس''۔

''پیش کرو پیسہ''۔ میں بے نیازی سے اس کی
طرف ٹیڑھا میڑھا پیسہ پھینک دیتا۔

''ایسے نہیں۔ اٹھاؤ۔ اٹھاؤ فوری اور ادب سے
پیش کرو''۔

وہ واقعی خود کو کسی دیس کی رانی سمجھنے لگتی۔ دن بھر
مجھ پر حکومت چلاتی۔ میں کبھی کبھی ٹال جاتا تو اتنا برہم ہوتی کہ
رونے کیلئے بیٹھ جاتی۔ مجھ کو بھی ترس آ جاتا کہ بھئی اس کی جیت
ہوئی ہے تو سب کچھ سہہ لینا چاہیے۔ ساتھ ہی میں طے کر لیتا
کہ جس وقت میں جیتوں گا اس کو ناکوں چنے چبواؤں گا۔ لیکن
جس دن میری جیت ہوتی اس دن بھی منی کے ٹھاٹھ ہی رہتے۔

میں بڑے رعب سے اس سے کہتا۔

''کھڑی رہو میرے سامنے''۔

''لو کھڑے ہو گئے''۔ وہ بیٹھ کر کہتی۔

''تو بس بیٹھی رہو۔ بھاگو نہیں''۔

''اونہہ — ساتھ چلو، ہاتھوں پر چلو، آنکھوں پر
چلو۔ جاؤ نہیں مانتے تمہارا حکم''۔

اور واقعی فرنٹ ہو جاتی۔ مجھے بھی تاؤ آ جاتا۔

عجیب الٹی سمجھ ہے اس کی۔ اچھا جی بتاتے ہیں۔

مُنی، میں پکارتا۔ وہ سنی ان سنی کر دیتی۔

''منّی، منی، منی''

''کیا ہے جی''۔

''الٹے رعب جماتی ہے''۔

''کیا نوکر ہیں تمہارے؟''

''اور نہیں تو کیا ہیں پھر — آج دن بھر جو ہماری حکومت ہے''۔

''تو کرونا حکومت — اس طرح کھڑی کر دینے اور بٹھا دینے سے حکومت چلتی ہے بھلا''۔

''ہوں، اچھا جاؤ پانی پلاؤ''۔

وہ چٹکی بجا کر بھاگ جاتی۔ ''ابھی پلاتے ہیں''۔

اور بڑی تیزی سے گلاس میں پانی لے آتی۔

مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا کہ جس دن اس کی ہار ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے یہی چاہتی ہے کہ میں اس سے سلیقے اور ڈھنگ کا کوئی کام لیا کروں۔ اور وہ بڑی لگن سے کام کر دیتی — اور جس دن اس کی حکومت ہوتی، بس پوچھو نہیں میرا تو ناطقہ بند ہو جاتا۔ ایک منٹ چین سے مجھے بیٹھنے نہ دیتی۔

''امرود کے درخت پر چڑھ جاؤ۔ توڑ لو، وہ بڑا سا گدرا، آدھا کھاؤ۔ آدھا ہمیں دے دو''۔

میں بڑے چاؤ سے کہتا۔ ''تم پہلے کھا لو، بچا ہوا میں کھا لوں گا''۔

''اچھا جی — مانتے ہو کہ گراؤں درخت سے نیچے''۔

میری محبت دھری کی دھری رہ جاتی۔ ہم محکوم جو ہوئے۔ کچر کچر گدرایا ہوا امرود چبانے لگتے اور وہ دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔

ایک دن دوپہر کو کھانا کھاتے وقت میں نے ہری مرچ چبا ڈالی۔ منہ اس طرح جلا ہے اس طرح جلا ہے کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے نوکر کو پانی لانے کیلئے کہا تو وہ لے آیا۔ میں پانی پینے ہی والا تھا کہ منی کے بری طرح ٹھسکر لگ گیا اور اس کا سانس نیچے کا نیچے رہ گیا اور اوپر کا اوپر۔ میں نے جھٹ سے اپنا پانی اس کی طرف بڑھا دیا کہ وہ پی لے۔ اس نے اشارہ سے انکار کر دیا کہ تم پیئو۔

مجھے دونوں ہی مواقع حاصل تھے۔ ایک تو اسکی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ دوسرے آج میری حکومت کا دن تھا۔ میں نے ڈانٹا۔

''پیتی ہو کہ نہیں؟ حکم جو دے رہا ہوں''۔

وہ اب سنبھل گئی تھی۔ اس نے پھر اشارے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ وہ اس وقت ضد پر اتر آئی تھی۔

ادھر میری حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ میں نے جھٹ گلاس منہ سے لگا کر دو چار گھونٹ لے لئے اور پھر اس کو دے دیا تب کہیں جا کر اس نے پانی پیا۔

مجھے عجیب سا لگا۔ یہ بعض وقت کچھ نئے ڈھنگ سے ضد کرتی ہے۔ ہم دونوں کی طبیعت سنبھلی تو میں نے پوچھا۔

''تم نے اس حالت میں بھی مجھے پانی پلانے کے لئے ضد کیوں کی؟''

''برابر کریں گے جی — ہم نے بھی ایک بار مرچ چبا ڈالی تھی اور ہمیں معلوم ہے کس قدر تکلیف ہوتی ہے''۔

''اچھا جی — اور تم نے حکم نہیں مانا ہمارا''۔

''ایسے میں حکم کون مانے گا جی۔ تمہیں تو ہوش نہیں تھا اپنا۔ سال بھر کے بچے کی طرح سوں سوں کر رہے تھے''۔

''اس لئے ترس آ گیا تمہیں؟''۔

''اور نہیں تو کیا ترس بھی کہیں پوچھ کر آتا ہے۔ آ گیا تو آ گیا''۔

کتنے ہی چپٹے چپٹے اور ٹیڑھے میڑھے پیسے منی کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ یہ چپٹے اور ٹیڑھے میڑھے پیسے ڈبے میں بند کئے جانے سے پہلے میں اور منی ان کو مٹی سے مل کر پھر صابن سے دھو کر جتنا چمکا سکتے چمکا لیتے۔ سنگھار میز سے کبھی منی خوش بودار پوڈر اڑا لاتی کبھی میں۔ ان پیسوں پر پوڈر مل کر انہیں ڈبے میں ڈال دیا جاتا —— (ساجھی دنیا کھوٹے سکے)

منی میری پھوپھی زاد بہن تھی۔ وہ کسی کہانی میں منیرہ ہے کسی کہانی میں گولو اور کسی کہانی میں منی۔ میری کتنی ہی کہانیوں میں اس نے نئے نئے روپ میں خود کو چھپا رکھا ہے۔ اس کا اصلی نام منیرہ ہے لیکن اپنی کہانی ''ساجھی دنیا کھوٹے سکے'' میں اس کو میں پیار سے منی پکارتا ہوں۔ بڑی کومل سی لیکن بڑی شریر۔ چاند کے قریب رہنے والے ستارے کے مانند چمکتی اور شکاری سے خوف کھائے ہرن کی طرح اچھلتی کودتی۔ کبھی نچلی نہ بیٹھتی اور طرح طرح سے مجھ پر حکومت چلانے کی باتیں سوچا کرتی۔

میں نے بچپن سے اسے چاہا۔ بچپن سے امی نے اس چاہت کی دھجیاں بکھیر دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ کھیل کود اور قہقہوں کی عمر، میں نے چپ کے آنسوؤں کی نذر کر دی۔ میرے جسم و جان پر منیرہ کی حکومت تھی۔ میرے دل و دماغ پر وہی براجی ہوئی تھی۔ اپنی آنکھوں میں، میں نے اسی کو بسا رکھا تھا۔ جب چاہتا اس مورتی کو آنسوؤں سے نہلا لیتا اور جب کہیں کوئی کھٹ پٹ سنائی دیتی اس کو دل میں چھپا لیتا۔

امی تھیں کہ میری خالہ زاد بہن رقیہ کا نام لے لے کر مجھے چھیڑتیں

اور خاندان بھر میں اس کے گن گاتی رہتیں۔ رقیہ اچھی لڑکی تھی لیکن امی نے اپنی زود بازی اور ناعاقبت اندیشی سے ہم دونوں میں ایک خلیج حائل کر دی تھی جس کا پاٹنا مشکل نہیں محال تھا۔

محبت جب اپنا سلسلہ بڑھا کر اپنے انجام کو موت تک لے جانے کے درپے ہوتی ہے تو اکثر زندگی اس کا طواف کرنے لگتی ہے۔ جوانی کی سرحدوں تک پہنچتے پہنچتے میں اور منیرہ نے ایک دوسرے کی صورت کو ترس ترس کر رکاوٹوں اور مخالفتوں کے جلتے ہوئے جہنم کو آنسوؤں سے بجھانے کے کتنے جتن کئے — ہم ایک دوسرے کے لئے کتنا روتے تھے اس کا حساب نہ میرے پاس تھا نہ اس کے پاس۔ آج میرے دوست ف۔ س۔ اعجاز کی ذہانت طبع نے ان آنسوؤں کا حساب مجھ سے مانگا ہے۔ ان کی شاعری سے لے کر ان کی دوستی تک زخم ہرے کرنے کا جو ہنر ہے جانے یادوں کی کتنی جراحتوں کی سیر مجھے کرائے گا۔ اب تو خاروخس کی اس دشت نوردی میں منیرہ بھی میرے ساتھ نہیں ہے۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

چلئے پہلے ادھوری بات مکمل کرلوں۔ اپنی کہانی ''ساتھی دنیا کھونے سکے'' کی طرف مراجعت پھر ضروری ہے کہ اس کے بعد پھیلے ہوئے سناٹوں پر آوازے کسنے کا پندار یہ سمجھا سکے کہ اینٹ گارے کے گھر جل رہے ہوں تو آنسو بھی شعلوں میں جھلس جاتے ہیں، وہی آنسو جو دل کی ساری کائنات کو راکھ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم صبح صبح ریلوے لائن کی طرف نہ جا سکتے تو اس روز منی کا اور میرا کوئی بندھن ہی نہ رہتا۔ میں اپنی مرضی کا شہنشاہ اور منی اپنے جی کی رانی۔ میں پچھم کی اور جاؤں تو منی مجھے نہیں ٹوک سکتی اور وہ پورب کی اور جائے تو میں زبان نہیں ہلا سکتا۔ لیکن سارا دن اس آزادی کے باوجود کچھ سپاٹ سپاٹ سا گذر جاتا۔ جیسے ہم وہ کام نہیں کر رہے ہوں جس کام کیلئے پہاڑ جیسے دن مختصر ہو جاتے ہیں......

ایک دن ایسا ہوا کہ اچھی خاصی چلتی پھرتی ٹرینوں میں یکایک فوجیں بھر گئیں۔ شہر بھر میں کچھ ایسی باتیں ہوئیں۔ کچھ ایسے ہنگامے ہوئے کہ آدمی لہو کا رنگ بھول گیا۔

کتنے ہی دن تک ہم ریلوے لائن کے قریب نہ جا سکے۔ بڑوں نے منع کر دیا تھا کہ ریلوے لائین کے قریب نہ جانا۔ بہت ساری فوجی ٹرینیں وقت بے وقت چلی آتی ہیں۔

دن بہت پھیکے پھیکے سے گزر رہے تھے۔ ایک دن ہم چوری چوری ریلوے لائن تک جا پہنچے۔ پٹڑی پر پیسہ رکھا۔ ٹرین کا انتظار کیا۔ ٹرین گزر گئی تو منی جیتنے کے باوجود کانپ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ یہ فوجیوں کی ٹرین تھی جس سے منی کی ہنسی گم ہو جاتی تھی۔ بہت دنوں بعد اس کو مجھ پر حکم چلانے کا موقع

ملا تھا۔ اس نے اس روز مجھے بہت ستایا۔

''چلو آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے پیچھے''۔ اور
میں، بس اس کی آواز پر اندھوں کی طرح راستہ ٹٹول ٹٹول کر
چلتا رہا''... (سانجھی دنیا کھو نے سکے)

دوسرے دن یکا یک سارے گھر کی فضا مجھے بڑی اداس اداس سی
لگی۔ یہ اداسیاں شاید اپنے ہی سینے سے نکال کر میں نے گھر بھر میں پھیلا دی
تھیں۔ امی نے بتایا کہ پھوپھی ماں آج شام اپنے شہر واپس جا رہی ہیں۔
''...... میں نے محسوس کیا خوشی اور غم کے ملے جلے
جذبات کے درمیان کوئی اسے گدگداتا ہے۔ کوئی کچو کے لگا
دیتا ہے۔

مجھ سے کہنے لگی۔ ''تم بھی چلو نا — '' ہم ٹرین میں
بیٹھ کر اس درخت کے پاس سے گزر جائیں گے جس کے نیچے
کھڑے ہو کر ہم گزرتی ہوئی ٹرینوں کے نیچے پیسے رکھ دیتے
تھے''۔

''اس درخت کے پاس سے تم اس طرح گزر سکو گی
منی، جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں تم نے اب تک ہار جیت کے
بے شمار کھیل کھیلے ہیں''۔

''میں یہ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ جانے

یکا یک مجھے کیا سوجھی — میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔
''چلو میرے ساتھ''۔
''کہاں؟''
''ریلوے لائن پر''۔
''امی کو معلوم ہوگا تو پھر ڈانٹ پڑے گی ...... اور
پھر تمہیں فوجیوں سے ڈر نہیں لگتا؟''
''بالکل نہیں۔ کیوں لگے گا ڈر مجھے۔ وہ تو وطن کے
رکھوالے ہیں''۔
''اچھا بھئی — مگر امی جو ڈانٹیں......''
میں نے اس کو جملہ تک پورا کرنے نہ دیا۔ اور لگا
دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچنے۔ کبھی کبھی وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی
رہی۔ میں نے اسے تیز تیز گھسیٹا، کیوں کہ میں جانتا تھا، ٹرین کا
وقت قریب ہے۔

ہم ریلوے لائن کے قریب پہنچے تو مجھے اسٹیشن سے
نکلتا ڈیزیل انجن صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے منی کو پیڑ کے
نیچے چھوڑ دیا اور لپک کر پٹریوں پر پیسہ رکھ دیا۔ میں بس ہٹا ہی
تھا کہ ٹرین فراٹے بھرتی نکل گئی اور میں نے آنکھیں بند کر کے
دعا کیلئے ہاتھ اٹھا لئے۔
ٹرین جا چکی تو میں نے دیکھا کہ پیسہ جوں کا توں

پٹری کے نیچے گرا ہوا ہے۔

میں خوشی سے چلایا۔

''منی میں جیت گیا ہوں۔ منی میں جیت گیا ہوں''۔

''تو اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے۔ ہم بھی تو ہزار بار جیتے ہیں''۔ منی نے وہیں پیڑ کے نیچے سے جلی کٹی سنائی۔

''ٹھیک ہے لیکن آج تو میں جیت گیا ہوں''۔ میں نے اس کی جانب دوڑتے ہوئے کہا۔

''پھر دو حکم۔ کرو نا حکومت''۔

دن بھر منی نے بہت کوشش کی کہ میں اس کو کچھ نہ کچھ کرنے کیلئے کہوں۔ لیکن میں نے تو ٹھان لی تھی اور مطمئن تھا۔

''پھوپھی اماں اور منی اور دوسرے بھائی بہنوں کو چھوڑنے کیلئے جب ہم اسٹیشن پہنچے تو سب آپس میں ہنس بول رہے تھے۔

سب سے ملنے کے بعد جھکی جھکی نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی آبدیدہ منی ٹرین میں سوار ہوئی تو میں شرارت سے مسکرایا اور نیچے کھڑا کھڑا اسے چھیڑتا رہا۔

اور جب ٹرین نے سیٹی دی تو میں نے منی کو زور سے پکارا۔ ''اب اتر آؤ منی یہ میرا حکم ہے''۔

منی اپنی سیٹ سے اس طرح اچھل پڑی جیسے بجلی کا کرنٹ اسے چھو گیا ہو۔

میں نے فاتحانہ انداز سے پھر پکارا۔

''جلدی کرو منی ٹرین چھوٹ جائے گی''۔

اور ٹرین بڑھنے لگی تو منی بے تحاشا دروازے کی طرف بھاگ آئی۔ لیکن پھوپھی اماں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں نے پھر پکارا اور ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

''مت جاؤ منی۔ رک جاؤ۔ میری بات مان لو منی میں نے آج تمہیں کوئی حکم نہیں دیا''۔

منی پھوپھی اماں کی بانہوں میں تڑپ رہی تھی۔

میں نے اسے آخری بار پکارا۔

''چلی آؤ منی۔ چلی آؤ۔ انہیں بتا دو کہ تم ہار گئی ہو''۔

لیکن منی نے اپنے دونوں ہاتھ کھڑکی سے میری طرف بڑھا دیے اور سسکنے لگی۔

ابا نے پیچھے سے میرا ہاتھ تھام لیا تو میں جاتی ہوئی

ٹرین کو نظروں سے اوجھل ہو جانے تک چپ چاپ دیکھتا رہا۔
مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ٹرین کے نیچے بچھی
ہوئی پٹریاں بھی اس کے گھومتے ہوئے پہیوں کے ساتھ لپٹی
ہوئی چلی جا رہی ہیں اور زمین پر اب صرف ان کے نشان باقی
رہ گئے ہیں۔۔۔ (سانجھی دنیا کھونے کے)

چھوٹی عمر سے جو تعلق خاطر ذہن و دل کا حصہ بنتا ہے اس کی خیمہ زنی
کیلئے اپنی طنابیں روح و دل کی مرئی اور غیر مرئی مملکت میں کھینچ کر باندھنے میں
دیر نہیں لگتی۔ کوئی معصوم ترین محبت بھی جنسی جذبے سے وابستگی کے بغیر پروان
نہیں چڑھ سکتی۔ محبت کی اخلاقیات کا دوسرا نام جذبۂ جنس کی تہذیب ہے اور
بس۔ حسن کا حصول ہر عورت اور مرد کا فطری حق ہے۔ جسے آپ کی آنکھیں
دیکھ سکتی ہیں اور دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کا مطالبہ کرتی ہیں اور نہ دیکھ سکنے پر
اپنے وجود کا سارا توازن صرف آنکھوں کو سونپ کر رہ جاتی ہیں۔ وہیں سے
جنون کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ منیرہ چلی گئی تو مجھے ذہنی طور پر سنبھلنے میں
مہینوں لگ گئے۔ یہ سنبھالا بھی ایسا نہ تھا جو فنائی ہوئی ساری خوشیوں کو پھر سے
سینے میں لا بساتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اندر اور باہر کی دونوں دنیاؤں کو
تاراج کر کے رکھ دیا تھا۔ منیرہ میرے سارے کھیل اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ
درخت جس پر چڑھ کر میں منیرہ کے حکم سے گدرے گدرے امرود چباتا تھا اب
اس درخت پر ان موسموں نے آنا ہی چھوڑ دیا تھا جو میرا جھوٹا اس کو کھلوا کر مجھے
فاتح زماں بنا دیتے تھے۔ اب امرود لگتے بھی تو میرا ثمرہ شاید دبے پاؤں آ کر
منیرہ اٹھا لے جاتی۔ ریل گاڑی کی وہ پٹریاں جن پر ہم آڑے ترچھے۔
ٹیڑھے میڑھے سکے ڈھالتے تھے۔ وہ بھی اس نے اپنی ٹرین کے پہیوں کے
ساتھ سمیٹ لی تھیں۔ یہ بات میں نے شاید پہلے بھی بتلائی ہے۔ چلنے سے دو
روز قبل اس نے سکے تقسیم کر لئے۔ اور آخری سکہ جو جوں کا توں رہ گیا تھا میں
نے اٹھا رکھا تھا ورنہ ایسے سکے ہم خرچ کر لیتے تھے۔ اس نے جیت جیت کر یا
میری دانستہ ہار پر جتنے رنگ برنگے پیسے جمع کر لئے تھے وہ سب کے سب مجھے
دیتے ہوئے کہا تھا۔

''لو تم اپنے ہتھیار سنبھالو'' کچھ سوچ کر اس نے پھر کہا۔
''ممی سے کہہ کر میں پیام تعلیم، غنچہ، پھول، نونہال اور بچوں کا سب
رس سب ہی منگواؤں گی اور ڈھونڈ کر تمہیں پڑھوں گی''۔

میں روہانسا ہوتا رہا۔ ممی کے صبر و ضبط پر دکھی ہوتا رہا۔ جی چاہتا تھا
کہ وہ بھی میری طرح چھپ چھپ کر آنسو چھپاتی رہے۔

میں نے ساتویں جماعت میں کامیابی حاصل کی تو تعلیم کی غرض سے
میرے حیدر آباد جانے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ میں اپنی علاتی ماں محبوب
بیگم صاحبہ کے پاس رکھا گیا کیوں کہ میں ان کا بہت چہیتا تھا۔ ویسے میری امی
اور ابا بھی اولاد کے دیوانے تھے لیکن میں اپنی علاتی ماں کو سگی ماں سے
چاہتوں اور محبتوں میں کم سمجھنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میں
اپنی امی کو علاتی ماں جنہیں میں مماں پکارتا تھا۔ ان کو ماتا کی ترازو کے دو

پلڑوں میں رکھ سکتا تو وہ پلڑا جھک جاتا جس میں ممانی رکھی جاتیں۔ اور ممتا کے سارے فلسفے، کتابوں کی ساری یک طرفہ کہانیاں اپنے صفحات کی دھجیاں میری ممانی کے قدموں میں ڈھیر کر دیتیں۔ میں منیرہ کیلئے روتا تھا، میری ممانی میرے لئے روتی تھیں۔ میری امی نے میری پھوپھی اماں کو یعنی منیرہ کی ممی کو ایسے سخت خطوط لکھے تھے کہ حیدرآباد ہی میں رہ کر بھی میں پھوپھی اماں سے مہینوں نہ مل سکتا تھا۔ میری سسیں بھیگ رہی تھیں، منیرہ کو ایک نظر دیکھنے کی تمنا میں، تڑپ تڑپ کر میں نے عمر کا جو زریں حصہ کتابوں اور قلم سے دور ہو کر گزارا اس نے میری ممانی کو خون کے آنسو رلوائے۔

کندن لال سہگل کے دیوداس نے میری عمر کے محبت کرنے والوں کے ناپختہ ذہنوں پر محبت اور محبت کی پاکیزگی کے ایسے متضاد اثرات مرتسم کئے تھے کہ شراب حلال ہو گئی تھی اور محبوبہ کے سوا کسی دوسری عورت کا تصور حرام۔ میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ کوٹھوں کی سیر بدمستی کے عالم میں کی۔ قبول صورت تھا۔ رجھانے کی ریت لڑکیوں نے نباہنی چاہی۔ لیکن پاؤں کی لغزش نے بھی کبھی جسم کا سودا نہ کیا۔ چندہ بی بی اتنی فریفتہ ہوئیں کہ میں سنبھل سنبھل کر منزلوں سے اجتناب کرتا رہا اور وہ ممانی کے گھر اس طرح آنے لگیں جس طرح ولی دکنی کی محبوبہ سینے میں راز کی طرح آیا کرتی تھیں۔ اور جو نام زباں سے ادا کئے جا سکتے ہیں ان میں رشیدہ تھی، کمو دتی تھی، راحت تھی اور عباسیہ تھی لیکن میری آنکھوں نے سوائے منیرہ کے کسی اور کو دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

خاندانی مخالفتیں اتنی شدید ہو گئی تھیں کہ دو سال سے زیادہ طویل عرصے میں، منیرہ کی شبیہ تو کیا دیکھتا قامت کا سایہ بھی نہ دیکھ سکا۔ خاندان کی کسی بھی تقریب میں جہاں میری شرکت کا سان و گمان بھی پھوپھی اماں کو ہوتا تو وہ خود شرکت سے گریز کرتیں اور اگر مجبوراً انہیں آنا ہوتا تو منیرہ ساتھ نہ ہوتی۔

منیرہ کا پورا نام بدرالنساء تھا۔ عرف منیرہ۔ میں نے اپنی شاعری اور خطوط میں اسے بدرمنیر بنا رکھا تھا۔ سنتا تھا کہ اسکے حسن کی تابناکی نے خاندان بھر کے، اس کے اور میرے ہم عمر بھائیوں کو باولا بنا رکھا ہے۔ یہ سب ہی مجھ سے حسد کرنے لگے تھے لیکن ہم دونوں کے سینوں میں محبت کی آگ یکساں طور پر بھڑک رہی تھی کسی نے اس آگ کے شعلوں کی زد میں آنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ اور بعضوں نے کی تو اپنی پرچھائیاں بھی گنوا بیٹھے۔

ایک شام میں نئے پل پر سے گزر رہا تھا۔ سامنے سے چچا صاحب قسیم قاسمی کی بگی آتی ہوئی نظر آئی۔ چلمن اٹھا کر منیرہ جھانک رہی تھی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ نظروں سے اوجھل ہونے تک میں بگی کو تکتا رہا۔ اس روز میں نے اکیلے اکیلے بہت چڑھالی۔ مجھے یاد نہیں کہ رات سائیکل پر میں میکدے سے نئے پل کے درمیان تک کس طرح پہنچا۔ مجھے ایک ایسا شدید دھکا لگا کہ میں اڑ کر فٹ پاتھ کی ریلنگ سے ٹکرایا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو میں عثمانیہ ہاسپٹل کے عام وارڈ میں نیلے آسمان کو تک رہا تھا۔ بدن پر پٹیاں بندھی تھیں۔ سارا جسم ٹیسوں اور درد کو سہہ رہا تھا۔ آنکھیں جھپکائیں تو وہ آسمان نہیں تھا ہاسپٹل کی نیلی چھت تھی۔

صبح لوگوں نے بتایا کہ تمہارے بھائی رات بھر تمہارے پاس تمہارے سینے پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ پلک تک نہیں جھپکائی۔ میں حیران تھا

کہ آخر وہ کون فرشتہ تھا جس نے میرے ساتھ میرے گناہوں کی پاسداری کی۔ دس بجے کے قریب ایک صاحب کو میرے پاس آتا دیکھ کر — لوگوں نے کہا لو جی آگئے تمہارے بھیا — انہوں نے میری خیر خیریت پوچھی۔ حادثے کی تفصیل سنائی۔ پولس کے غیر انسانی سلوک کی روداد دکھ سے سنائی کہ وہ لوگ تمہارا اس وقت بیان لینے پر مُصر تھے۔ میں نے ان پر ظاہر کر دیا کہ میں عثمانیہ ہاسپٹل کا میل نرس (Male Nurse) ہوں اور رات کی ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا رہا ہوں۔ اس وقت اس زخمی نوجوان کو فوری طبی امداد چاہیے اور پھر وہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ کچھ بتا سکے۔

اس شخص نے جس نے اپنی فراٹے بھرتی ہوئی موٹر سیکل سے تمہیں ٹکر دی تھی پولس کو کچھ دے دلا کر کیس (Case) کو رجسٹرڈ ہونے ہی نہیں دیا۔ یہ بات مجھے اب معلوم ہوئی۔ تمہاری مرہم پٹی کے بعد میں رات بھر سو نہ سکا کہ مبادہ تم کروٹ لے لو۔ اب صبح صبح نہا کے ہو آیا ہوں۔ چلو ٹھیک ہی ہوا۔ جو بھی کرتے ہیں اللہ میاں بہتری کیلئے کرتے ہیں۔ میں ڈیوٹی کے درمیانی وقفے میں تمہارے گھر جا کر اطلاع دے دوں گا۔ تمہارا اتا پتہ۔ مجھے نوٹ کروا دو۔ تمہیں میں کیا نصیحت کروں۔ کل تمہاری حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ موت کے منہ سے نکل آئے ہو تو اب زندگی کی حفاظت کرنا سیکھو۔

آج مجھے اس فرشتے کا نہ چہرہ مہرہ یاد ہے نہ نام۔ اس کی بڑائی اور اپنا چھوٹا پن بس یہی یاد بن کر رہ گئے ہیں۔

منیرہ کے بھائی محمود مشیر نے جو میرا بہت پیارا دوست بھی تھا اور جو اب خدا رکھے پاکستان میں ہے۔ میرے اور اپنی بہن کے دکھ درد کو اپنے سینے میں چھپا کر جگہ دی۔ مجھے زندگی کا حوصلہ دیا۔ ورنہ کوئی تعجب نہیں جو میں اس خصوصی نمبر میں شامل ہی نہ ہو سکتا جو بھائی ف۔س۔ اعجاز نے زخموں کا چمن کھلانے کے لئے شائع کر دیا ہے۔ میری مماں نے حالات کو سازگار بنانے کیلئے محمود مشیر کو بھیگی پلکوں سے ہمیشہ دعائیں دیں۔

لطیف ساجد آج حیات ہوتا تو ہندو پاک کی شہرتیں اسکی شاعرانہ عظمتوں کی باج گزار ہوتیں۔ وہ منیرہ کو دیدی پکارتا تھا۔ میرے زخموں کی مہک جس صبا کے دوش پر اس کی دیدی کی چار دیواری تک پہنچتی تھی اسی صبا کا دوسرا نام لطیف ساجد بھی تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ میں نے ایک کہانی لکھی۔ انہیں پنسلوں سے لکھی جو کبھی منی مجھے دے گئی تھی۔ اب وہی پنسل تراش تراش کر وہ مجھے دیتی جاتی اور میں اس کو اپنی آنکھوں میں بھر بھر کر لکھتا جاتا۔ یہ کہانی ''اجلی پرچھائیاں'' میرے پہلے ''افسانوی'' مجموعے میں شامل ہے اور اس اولین ''مجموعے'' کا نام بھی یہی ہے۔ میں اس کہانی کا ایک اقتباس آپ کو سنا دوں۔

> ''بچپن سے اس نے جس کو چاہا تھا۔ جوانی میں اس نے جس کی پرستش کی تھی وہی لڑکی اس کی دلہن بنائی گئی۔ لیکن اس طرح کہ عقد میں دلہن کی ماں شریک نہ تھیں۔ خاندان کے بڑے بوڑھے منہ بسورے جیسے آفتوں کو سہہ رہے تھے۔ بکلا رہ سہرہ لاتے ہوئے راستے ہی سے لوٹا دیا گیا تھا اور

قاضی جی گھر کی بجائے محلے کی مسجد میں بیٹھے بادام چھواروں کی
خیر منا رہے تھے۔ لیکن اس نے ہزار ہزار منتیں کیں اور اپنے
والدین کو منا سمجھا کر اس روز عقد مسعود کو ٹلنے نہ دیا۔

ہاں اتنا ضرور ہوا کہ قاضی صاحب بے چارے
جس عالم میں عقد خوانی سے پہلے تھے اسی عالم میں عقد خوانی
کے بعد بھی رہے۔ یعنی سوائے ان کے مقررہ نیگ کے انہیں
بادام چھوہارے دیکھنا تک نصیب نہ ہوا اور نہ ہی ان کے شملے
کا دامن چاولوں سے بھرا گیا۔

ویسے دیکھنے کو لوگ کھاتے پیتے نظر آتے تھے اور
کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس عقد کا انداز آخر اتنا
اسلامی کیوں تھا۔ نہ نوبت، نہ روشنی، نہ دعوتیوں کا ہجوم، نہ
میراثنیں۔ بغیر مسند کے دروازے سے پیٹھ لگائے ہوئے
نوشاہ — گلے میں ایک پھولوں کا ہار جو قاضی صاحب کے عقد
خوانی شروع کر دینے کے بعد ڈال دیا گیا تھا — قاضی
صاحب سوچتے رہے، اس کو اسلامی شادی کیسے کہا جا سکتا ہے۔
مسند نہ ہو تو مضائقہ نہیں لیکن چاول اور چھواروں کی برکت
سے جو واقف نہ ہوں وہ کیا جانیں اسلام کیا ہے۔ ماحول کی
اجنبیت نے بے چارے قاضی صاحب کو اتنی اجازت بھی نہ
دی کہ اپنے حقوق کے اتلاف پر احتجاج کرتے۔ ورنہ اگر
شادی جیسی شادی ہوتی اور چھوہارے بادام کم نظر آتے تو
قاضی صاحب ضرور ٹوک دیتے کہ بھئی ان ضروری باتوں میں
بخالت نہیں کرنی چاہیے کہ اللہ کی برکت اسی میں ہے ورنہ
باجے گاجے اور جگمگاتے گولے صرف دنیا داری کی باتیں
ہیں۔ لیکن یہاں تو سرے سے سب کچھ غائب تھا۔ یہاں تک
کہ چہروں کی بشاشت غائب تھی۔ ہونٹوں پر ہنسی غائب تھی —
اور جب قاضی صاحب نے دلہن کی عمر اور نام دریافت کیا تو
سب کو خاموش دیکھ کر خود دلہا میاں بول اٹھے کہ نام یہ ہے، عمر
یہ ہے اور اس انداز سے قاضی صاحب کو دیکھنے لگے جیسے کہہ
رہے ہوں کہ مولوی صاحب فرمایئے تو ناک نقشہ سب نوٹ
کرا دوں۔ لیکن قاضی صاحب کی تیکھی نظروں نے دلہا میاں کو
ٹوک دیا اور اس بے ضابطگی پر انکی جھلاہٹ کو محسوس کرتے
ہوئے دلہن کے ماموں نے خواستہ ناخواستہ دوسرے سوالوں
کی تکمیل کروا دی۔

عقد پڑھا دیا گیا تو قاضی صاحب نے اپنے نیگ کو
اندرونی جیب میں اس طرح چھپا لیا جیسے یہ رقم بھی انہیں غلطی
سے دے دی گئی تھی اور وہ سلیپر پاؤں سے اٹکائے سٹر سٹر
کرتے دروازے کی طرف لپکے۔

غرض اس کی شادی بھی اتنے ہی ہنگاموں سے تکمیل

کو پہنچی جتنے ہنگاموں میں اس کی محبت پروان چڑھی تھی۔ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی جرائم پیشہ کی طرح وہ خاندان بھر کی نظروں میں کھٹکتا رہا تھا۔ مخالفتیں جتنی شدید ہوتیں ان کا ردعمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا۔ اور شاید ان مخالفتوں کی وجہ یہ بھی تھی کہ خاندان ہی کی ایک لڑکی سے جو اس کی قریب ترین رشتے دار بھی تھی اور خاندان بھر میں سب سے حسین بھی' اس نے بے اندازہ محبت کی تھی۔ جان کی بازی لگا کر دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا تھا۔ ایسی محبت جو بڑی سے بڑی رکاوٹوں کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی اور جو خاندان بھر کی پہلی محبت تھی پہلی کہانی تھی، پہلی حقیقت تھی۔

چھوٹی عمر سے ہی وہ ایک دوسرے سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ ساتھ کھیلنا، ساتھ ہنسنا اور کبھی نا جھگڑنا۔ اسکی امی کہتیں کہ لوتو سے کوئی جھگڑتا ہے تو یہ شریر اس کی وکالت کرتا ہے اور سب بچوں کو ڈانٹ بتاتا ہے۔ پتہ نہیں یہ مزاج داریاں کیا رنگ لائیں۔ اور جب یہ مزاج داریاں رنگ لائیں تو سارا خاندان اس کی مخالفت پر تل گیا اور جوں جوں مخالفتیں بڑھتی گئیں کوئی اس کے دل و دماغ پر چھاتا گیا۔ دل کے اندر ہی اندر ایک چھوٹی سی دنیا تعمیر کرتا گیا۔ تعمیر کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کو یقین ہو گیا کہ کوئی تخریبی قوت اس چھوٹی سی دنیا کو تہس نہس کر سکتی۔ یہاں تک کہ یہ اب اس کے بس میں بھی نہیں۔ اور کسی نے اس کے دل کی انتہائی گہرائیوں سے پکار کر کہا تھا، تم سچ کہتے ہو۔ اب یہ تمہارے بس میں ہے اور نہ میرے بس میں۔ میں صرف اس دنیا کی تعمیر کر سکتی ہوں اور تم نے جن ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ہے، میں انہی ہاتھوں سے اس دنیا کے چپے چپے کو سنوار دوں گی۔ ذرہ ذرہ کو نکھار دوں گی۔ اور آخر کار چپہ چپہ سنور گیا۔ ذرہ ذرہ نکھر گیا اور وہ دونوں اپنے دل کے اندر سجائی ہوئی اس خوبصورت دنیا کو اپنے ساتھ لئے اس مکان میں داخل ہو گئے جہاں انہیں اپنی اس دنیا کو زمین پر رکھ کر کچھ اور نکھارنا تھا، کچھ اور سنوارنا تھا''......

(اجلی پرچھائیاں)

وہ جو سب کا ہو کر شاید کبھی کبھی سب سے الگ ہو جاتا ہے۔ وہ جو ہونٹوں پر پھیلی ہوئی چاندنی اور چاندی جیسی مسکان کو آنسوؤں سے نہلا دیتا ہے۔ وہ جو دل کی خوبصورت دنیا کے نیچے سے زمین اس وقت کھینچ لیتا ہے جب دل کی یہ حسین تر دنیا زمین پر بس رکھی ہی گئی تھی۔ وہ جو کبھی سینوں میں چراغاں کر دیتا ہے۔ کبھی ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دینے والے اندھیرے بھر دیتا ہے۔ وہ جو موسموں سے ان کے موسم چھین لیتا ہے۔ کونپلوں سے ان کی کونپلتا۔ اس نے مجھے سب کچھ دے کر میرا سب کچھ چھین لیا...... میں دل کو کیسے راستے بجھاتا رہا۔ محبت لٹ گئی تو انسانیت میں پناہ ڈھونڈھی۔ انسانیت مر رہی تھی تو کھنڈر

ہوتی ہوئی محبت کی طرف اس طرح باز رفت کی کہ جیسے سمندر ریت پی جائیں
گے۔ اور جب منیرہ عثمانیہ ہاسپٹل کے یونیورسٹی وارڈ میں شریک کی گئیں تو میں
نے سوچا، میں نے دیکھا۔

''...... تجی کے جوڑے کے پھولوں کی شگفتگی آخر
مجھے کیوں کھلتی ہے۔ رشما اکثر اتنا سنٹ لگاتی ہے کہ پاس سے
گزرنے والا ڈاکٹر اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر آگے نہیں جا
سکتا تو اس میں میرے لئے دکھ کا کونسا پہلو نکل آتا ہے۔

کین نن کی سپلائی گرل سے میل نرس راجن پینگ
بڑھاتا ہوا دیکھا گیا ہے تو اس میں میرے لئے اداس ہونے کی
کیا بات ہے۔ مجھے تو لیڈی ڈاکٹروں کے ہونٹوں پر لپ اسٹک
بھی کھل جاتی ہے۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔

قہقہہ لگا کر کوئی کسی وارڈ میں کس طرح ہنس سکتا ہے
جبکہ کتنے ہی مریض کراہنے کی سکت بھی نہیں رکھتے۔ لیکن لوگ
ہنستے ہیں تو میرا کیا بگاڑ لیتے ہیں......

ہاں ایک بات ضرور ہے۔ دواخانے میں وہ
انسان مجھے نہیں ملا جس کی میں تلاش میں ہوں۔ خدا ضرور ملتا
ہے۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ دواخانے میں خدا کی ضرورت اور
اسے دواخانے سے نکال باہر کرنا شاید ابھی انسان کے بس

میں نہیں ہے......

ہفتہ بھر پہلے ایک عورت پاس کے یونیورسٹی وارڈ
میں داخل ہوئی ہے۔ اس کا شوہر روز دو دو بار دواخانے کا
چکر لگا جاتا ہے۔ بے حد خاموش اور کم گو آدمی ہے۔ شروع
شروع میں جب عورت کی طبیعت خراب تھی، میں نے اس کو
رات رات بھر کرسی پر پاس بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ جانتا
ہے کہ میں رات کو وارڈ میں اس کی موجودگی پر معترض ہو سکتا
ہوں۔ لیکن میں نے کبھی اس کو نہیں ٹوکا۔ اس نے کبھی میرا
شکریہ ادا کرنے کی زحمت نہیں کی۔ جب کبھی اس سے نظریں
ملیں، اس نے بھی نظریں جھکالیں، میں نے بھی۔ لیکن اب اس
کی بیوی اچھی ہو رہی ہے۔ بے حد ہنس مکھ اور خوبصورت
عورت ہے۔ باتیں بہت کرتی ہے اور اس سے ہنستی ہے۔ اس
کا شوہر اس کی ضد ہے۔ وہ باتیں بہت کم کرتا ہے اور کبھی نہیں
ہنستا۔ میں دونوں میں دلچسپی لینے لگا ہوں۔ یہ جو ایک دوسرے
کی ضد ہیں۔ ان کی زندگی میں قرب کے کتنے فاصلے ہوں
گے۔ لیکن پرسوں دن کے اجالے میں کھڑی دوپہر کی چمکتی
ہوئی دھوپ میں، میں نے ایک عجیب بات دیکھی ––– وہ پورٹیکو
کے پیچھے باڑھ میں چھپا ہوا رو رہا تھا ––– میں قریب سے
گزرتے گزرتے ٹھٹک گیا۔ اس کو پہچان کر میں نے یوں ظاہر

کیا جیسے میں نے اس کے آنسو نہیں دیکھے۔ اس نے بھی اپنی
آنکھوں پر عینک چڑھا کر مجھے اندھا بنانے کی کوشش کی جیسے اس
کے عینک چڑھا لینے سے میری عینک اتر جائے گی۔ میں نے
سلام کر کے پوچھا — کیوں کیسی ہیں۔ اس نے مسکرا کر کہا۔
اچھی ہیں۔ شکریہ۔

میں نے کم ہی ایسی زخمی مسکراہٹ دیکھی تھی۔
خاموش ہو رہا۔ اور آگے بڑھ گیا''۔ (''کاٹا ہوا نام'')

ساڑھے تین مہینے عثمانیہ ہاسپٹل کے یونیورسٹی وارڈ میں صبر و تحمل سے
منیرہ نے موت کو شکست دینے کے سو سو جتن کئے۔ اس نے آخری لڑائی کچھ اس
ڈھنگ سے لڑی ہے کہ موت کو اس کی زندگی پر تعدن ہو جانا چاہیئے۔ لیکن وہ
ہار گئی۔ اسکی آنکھ شاید لگ گئی ہے۔ جانے کب وہ پھر کسی کی محبت بن کر بیدار
ہو جائے۔

میں اس کا منتظر ہوں۔ وہ میری منتظر ہو کہ نہ ہو
جیسے کوئی لکھ ڈالے انگلی سے ہوا میں کچھ
اوجھل ہیں محبت کی لکھوائی ہوئی غزلیں

(ف۔س۔اعجاز)

لنڈا گڈ مین

مترجم: ف۔س۔اعجاز

ثور (Taurus)

کیا یہ تم ہو؟
یا پھر ایسا ہے کہ میری بدولت
تم نے محبت کی
وہ تنہائیں چھین رکھی ہیں
جنہیں میں اس وقت سے محفوظ رکھتی آ رہی تھی
جب میرے ریت کے قلعے
اتنے بڑے تھے
کہ میں اُن کے گرد گھوم سکتی تھی
مجھے یاد نہیں، کس نے پہلی بار کہا تھا
''جس بات کو تم نہیں جانتی ہو
وہ تمہیں زخمی نہیں کر سکتی''
لیکن جس نے بھی کہا، غلط تھا۔
فرض کرو، میں پیڑ کی اونچائی پر چڑھ جاؤں
اور پھر مجھے پتہ چلے
کہ واقعی یہ تم نہیں ہو

اس وقت، تم ہی بتاؤ،
میں خود نیچے کیسے اتروں گی؟

مجھے ہمیشہ بلندیوں سے ڈر لگتا رہا ہے۔

میں اور میری داستانِ محبت

خدا گواہ! مری داستانِ عہدِ شباب
لکھی گئی ہے "اندھیروں کی روشنائی" سے
(ہمت رائے شرما)

کہتے ہیں عشق اپنے آپ ہو جاتا ہے کیا نہیں جاتا۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ لیکن عشق ہے کیا؟۔ کیوں ہوتا ہے؟۔ یہ ایک ایسا راز ہے جو آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آسکا...... لفظ "عشق" کے لغوی معنی ہیں کسی شے کو نہایت دوست رکھنا۔ عزیز سمجھنا۔ بعض اطبا کا کہنا ہے کہ عشق ایک مرض ہے قسم جنون سے جو کسی حسین شکل کو دیکھنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ ماخوذ ہے عشقہ سے جس کو لبلاب اور عشق پیچاں بھی کہتے ہیں۔ اس نبات کا قاعدہ ہے کہ جس درخت سے لپٹتی ہے اس کو خشک کر دیتی ہے۔ یہی حالت عشق کی بھی ہے جس کو ہوتا ہے اسے خشک اور زرد کر دیتا ہے۔

لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ عشق ایک ایسا لطیف جذبہ ہے جو ابن آدم کو ورثے میں ملا ہے۔ غالباً تخلیق کائنات سے بہت پہلے عشق معرض وجود میں آیا ہوگا۔ دنیا میں اگر عشق نہ ہوتا تو انسان کے لئے ایک پل جینا مشکل ہو جاتا۔ عشق کے بارے میں ہر ایک کا اپنا اپنا نظریہ ہے۔ کچھ لوگ اسے خدا کی رحمت سمجھتے ہیں۔ کچھ بلائے جان تصور کرتے ہیں۔ کچھ دماغ کا خلل اور بعض دل لگی کا ایک ذریعہ — دراصل عشق ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان "اپنے باطن کی تصویر کو آنکھ بند کر کے دیکھ سکتا ہے"— عشق ایک حقیقت ہے — جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا — ایک طوفان ہے جسے دبایا نہیں جا سکتا — میں سمجھتا ہوں عشق قدرت کا ایک بیش بہا عطیہ ہے جو مجھے بھی بخشا گیا بلکہ بہت چھوٹی عمر میں بخشا گیا — یہ میں نے اس وقت محسوس کیا جب میں نیلے نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے خوشنما پتنگ دیکھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے پتنگوں سے عشق ہو گیا۔ والہانہ عشق جو پاگل پن کی انتہا تک پہونچ گیا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے میری آنکھوں کے سامنے پتنگ ہی پتنگ رہتے۔ رات کو میں پتنگ سرہانے رکھ کر سوتا۔ صبح اٹھتے ہی پتنگ لے کر چھت پر چڑھ جاتا۔ پتنگ حاصل کرنے کے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار تھا — آسمان پر اڑتے ہوئے پتنگ دیکھتا تو ان میں کھو جاتا۔ کبھی کبھی سوچتا کاش! میں بھی پتنگ ہوتا۔ اتنا اونچا اڑتا کہ جا کر آسمان والے سے باتیں کر سکتا — پتنگوں کے رنگوں نے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا۔ میرے دل میں رنگوں کا شوق پیدا ہوا — شام کو جب شفق پھولی تو اس کے بنفشی۔ نارنجی و چمپئی رنگوں میں کھو جاتا۔ میں رنگوں

سے کھیلنا پسند کرتا۔ پتنگوں کے خوشنما رنگوں کے عشق نے آخر مجھے ایک دن آرٹسٹ بنا کے چھوڑا۔ آج یہ مصوری اسی معاشقے کا نتیجہ ہے۔ اور یہ آرٹ ڈائریکشن بھی — جو آج میرا پیشہ ہے —

عشق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عشق حقیقی' دوسری عشق مجازی۔ عشق حقیقی آدمی کو انسان بلکہ دیوتا نما انسان بنا دیتا ہے جبکہ عشق مجازی کبھی کبھی انسان کو شیطان بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔

عشق دیوتاؤں نے کیا ہے۔ خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے۔ اولیائے کرام نے اپنے خدا سے کیا ہے۔ صوفیانہ کلام میں عشق کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ شیخ فرید، بلھے شاہ' وارث شاہ اور دوسرے روشن ضمیر فقیروں نے عشق حقیقی کو مالک حقیقی تک پہونچنے کا واحد ذریعہ بنایا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ خدا کا ایک ہی مذہب ہے اور وہ ہے عشق — انہوں نے پنجابی میں یہ بھی کہا ہے ''عشق نہ پچھے جات''۔ اور ''پہلوں ڈنگدا۔ عشق پچھوں رنگدا''۔ (عشق پہلے ڈستا ہے پھر اپنے ہی رنگ میں رنگ دیتا ہے)۔ یہ عشق نہ ہوتا تو لیلےٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھا کے قصے کبھی نہ دوہرائے جاتے۔ چنانچہ مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے عشق ہونا قدرتی بات ہے۔ عشق کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں بلکہ ایک خاص عمر میں قدرت انسان کو خود بخود عشق کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عشق ہر عمر میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میری رومانوی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ معاشقے کا مطلب کیا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک بار ہم امرتسر سے اپنے گاؤں

میں آئے۔ وہاں ہمارے پڑوس میں کسی کی شادی تھی۔ جب دلہن کی ڈولی آئی اور دلہن ڈولی سے اتری تو محلے کے تمام بچے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔ ضروری رسومات کے بعد دلہن کو دالان میں لے جا کر بیٹھایا گیا۔ اب بچے اس کے آس پاس بیٹھ گئے۔ میں بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔ نئی نویلی دلہن نے شادی کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اور اس میں سے عجیب قسم کی سہانی خوشبو آ رہی تھی جو نئی نویلی دلہن کے کپڑوں سے اکثر آیا کرتی ہے۔ دلہن نے ایک ایک کر کے سب کا نام پوچھا۔ مجھے بھی اور قریب آنے کو کہا۔ میری پیٹھ پر اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے مجھ سے بھی میرا نام پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب دنیا دکھائی دی۔ اس وقت مجھے وہ بہت ہی اچھی لگی۔ سب بچے اٹھ کر چلے گئے۔ میں بیٹھا رہا۔ بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ گھر واپس آ کر رات کو جب سویا تو اس کا خیال بار بار آیا۔ دوسرے دن صبح سویرے میں اپنے گھر کے آنگن کی چھوٹی سی دیوار پر جو ان کے اور ہمارے گھر کے بیچ میں تھی آ بیٹھا۔ اسے دیکھتا رہا۔ اس طرح ہر روز اسے دیکھتا۔ وہ مجھے بڑی اچھی لگتی ...... جی چاہتا اسے ہمیشہ دیکھتا رہوں۔ کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتی اور مسکراتی تو مجھے وہ اور اچھی لگتی۔ میں بچہ تھا۔ ناسمجھ — وہ مجھے کیوں اچھی لگتی! اس کا آج تک میرے پاس کوئی جواب نہیں — شاید یہ میرا پہلا ''معاشقہ'' — ''ہوگا'' —

اس کے بعد کئی سال گزر گئے۔ والد صاحب کے ریٹائر ہو جانے پر ہم دوبارہ اپنے گاؤں واپس آ گئے۔ میری مسیں بھیگ چلی تھیں۔ نئی نئی جوانی

تھی۔ دل میں نئی امنگیں نئے ولولے۔ خون میں اک نیا جوش نئی حرارت تھی۔ مجھے ساری دنیا بڑی حسین دکھائی دینے لگی تھی — لوگ کہتے ہیں "میں بھی اس زمانے میں بے حد خوبصورت تھا" — انہی دنوں گاؤں میں رام لیلا کا ناٹک کھیلا گیا۔ میں نے بھی ناٹک میں کام کیا۔ موسیقی اداکاری و دیگر فنون لطیفہ میری گھٹی میں پڑے تھے۔ کیوں کہ یہ بزرگوں کی دین تھی۔ (پانچ سال کی عمر میں ہی میں نے آغا حشر کاشمیری کے ایک ڈرامے میں کام کر کے چاندی کا ایک میڈل حاصل کیا تھا جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے)۔ ناٹک میں کام کرتے ہی میں سارے گاؤں میں مشہور ہو گیا۔ ہر گھر میں میرے چرچے ہونے لگے۔ میرے ہم عمر مجھ سے رشک کرنے لگے اور دوشیزائیں آپس میں باتیں — شام کو جب بازار میں نکلتا تو بڑے بوڑھے مجھے اپنے پاس بٹھاتے۔ شفقت اور پیار سے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتے۔ جیتے رہو بیٹا تم بڑے ہونہار ہو۔ آخر پنڈت سکھدیال کے پوتے ہو نا۔ تم ایک دن بہت بڑے آدمی بنو گے۔

ہمارے گھر کے قریب ہی گلی کے نکڑ پر ایک وثیقہ نویس رہتے تھے۔ بڑے بارعب اور بڑی پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے ہاں اکثر ہمارا آنا جانا رہتا — ایک دن سر شام ان کی لڑکی ہمارے گھر آئی۔ اس کی عمر کوئی چندرہ سولہ سال کی ہوگی — آتے ہی نمستے کر کے بیٹھ گئی۔ میری ماں نے پوچھا آؤ بٹی راج! کیسے آنا ہوا؟۔ اس نے جواب دیا یونہی ادھر سے گزری تھی سوچا تائی جی کو مل لوں ...... میں نے دیکھا اس کی آنکھیں ہمارے گھر میں کچھ تلاش کر رہی تھیں ...... کہ اتنے میں میں باہر آیا۔ فوراً اس کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں ...... پھر اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ چپ چاپ اٹھی اور یہ کہہ کر چلدی "اچھا پھر آؤں گی" جاتے جاتے اس نے پھر مڑ کر میری طرف اک بار دیکھا — میری نظریں اس کے ساتھ ہولیں — اور گلی کی نکڑ تک اسے چھوڑ کر واپس چلی آئیں — دوسرے دن گلی کے نکڑ پر ہی میرا اس کا سامنا ہوا۔ وہ اپنے گھر سے نکلی ہی تھی کہ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی — پھر مسکرائی۔ نظریں نظروں سے ٹکرائیں — نظروں کا ٹکرانا تھا کہ "ہزاروں بجلیاں ایک ساتھ کوند گئیں"۔ ...... دھڑکنیں فضاؤں میں بکھر گئیں — وہ اس نظارے کی تاب نہ لا کر واپس ہوئی اور اپنے گھر کے اندر چلی گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ سیدھی اپنی چھت پر گئی ہے۔ میں بھی فوراً اپنے گھر پہونچا اور سیدھا اپنی چھت پر چلا گیا۔ دیکھا کہ وہ نظریں اٹھائے ہماری چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں پھر ملیں ...... اور آپس میں جذب ہو کر رہ گئیں ......

دوسرے دن عین اسی وقت وہ پھر چھت پر آئی ...... وہ روز چھت پر آتی۔ گھنٹوں میری طرف دیکھتی رہتی۔ چپ چاپ ...... کھڑی رہتی۔ اس کی خاموشی میں تکلم تھا ...... جو صرف میں ہی سمجھ سکتا تھا۔ وہ آنکھوں آنکھوں میں ہی بہت کچھ کہہ جاتی۔ مگر اس سے بات کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا ......

دن گزرتے گئے۔ ہمارا چھت پر آنا جانا گلی محلے والوں کو ناپسند تھا — حاسدوں نے اس کے باپ کے کان بھرے ...... اور اس کا چھت پر آنا یکدم بند ہو گیا۔ اس عرصے میں میرے میٹرک کے امتحانات شروع ہو گئے۔ اور مجھے اس سلسلے میں امرتسر جانا پڑا۔ امتحانات کے بعد جس روز میں واپس

گاؤں پہونچا اسی روز ہمارے گھر میں کوئی تقریب تھی۔ خوشی کے اس موقع پر محلے کی تمام عورتیں اور لڑکیاں گانے بجانے کے لئے ہمارے گھر پر جمع تھیں۔ ان میں وہ بھی تھی — اس دن بھی اس کی آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ نظریں ہرنی کے کھوئے ہوئے بچے کی طرح ادھر اُدھر بھٹک رہی تھیں...... آخر رات کو جب گانا بجانا ختم ہوا تو مجھ سے تمام عورتوں اور لڑکیوں کو ان کے گھر تک چھوڑ آنے کے لئے کہا گیا۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں سب اپنے اپنے گھر پہونچ گئیں۔ اور اب صرف ایک ہی لڑکی باقی رہ گئی تھی — جو شاید جان بوجھ کر رک گئی تھی۔ راستے میں دو بار رکی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں...... ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ ہر بار کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر کہہ نہ سکتی تھی......

اس رات آسمان پر چاند پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا — سردیوں کی رات تھی۔ بادلوں کے کچھ آوارہ ٹکڑے ادھر سے اودھر اور اُدھر سے ادھر لڑھک رہے تھے۔ پلک جھپکتے ہی اس کا گھر آگیا۔ وہ پھر رکی کچھ کہنے کے لئے میری طرف بڑھی ہی تھی کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا۔ اس کا باپ کھڑکی میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا — میں آگے بڑھا۔ اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا کہ بادل کے ایک سیاہ آوارہ ٹکڑے نے چاند کو اپنے دامن میں چھپا لیا — چاروں طرف اندھیرا چھا گیا — وہ گھر کے اندر جا چکی تھی۔ چاند بادل کے ٹکڑے سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف پھر روشنی پھیل گئی...... مگر...... میری محبت کی دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھیرا چھا گیا...... اس کے بعد میں نے اسے آج تک نہیں دیکھا...... میں اپنے گھر کی طرف لوٹا...... مجھے ایسا لگا جیسے مجھ سے میرا سب کچھ چھن گیا ہے...... اس رات میں جی بھر رویا۔ ساری رات آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ روتا رہا اور تمام رات بدلیاں میرے آنسوؤں میں دھل دھل کر نکھرتی رہیں......

دوسرے روز پتہ چلا کہ اس کا گھر سے نکلنا بند ہوگیا ہے۔ اس پر پہرے لگا دیے گئے ہیں۔ گاؤں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں — مجھے بھی ڈانٹا گیا۔ اس کے باپ نے بدنامی کے ڈر سے گھر تبدیل کرلیا۔ وہ کسی دوسرے محلے میں رہنے کے لئے چلے گئے — اور — مجھے کلکتے بھائی صاحب کے پاس بھیج دیا گیا — میری زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا — "حالات نے میری تقدیر سے مل کر ایسی سازش کی...... کہ مجھے کہیں کا نہ رکھا" ...... لاکھ کوششیں کرنے پر بھی میں اسے نہ بھول سکا — زندگی بوجھ سا معلوم ہونے لگی۔ میں ہر وقت اداس رہتا۔ میرا عشق اب پرستش کی حد تک پہونچ چکا تھا۔ ایک اضطراب مسلسل کے زیر اثر میں نے شعر کہنے شروع کردیے۔ دل کی بھڑاس نکالنے کا ایک یہ بھی ذریعہ تھا......

جذبات۔ صدمات۔ حادثات اور حالات کا ستایا ہوا دل اکثر گھبرا کر شاعری کی طرف رجوع کرتا ہے...... میرے اشعار بہت پسند کئے جانے لگے اور انہی اشعار کے طفیل میں مجھے فلموں میں گانے لکھنے کا چانس ملا۔

مجھے افسردہ خاطر اور دنیا سے بیزار دیکھ کر میرے انکار کے باوجود گھر والوں نے میری شادی طے کردی۔ مجھے واپس گاؤں آنا پڑا۔ آکر دیکھا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ میری حالت اس قیدی جیسی تھی جو عمر قید کی سزا پانے کے

بعد چھوٹ کر گھر واپس آتا ہے۔

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
نہ پھول تھے نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا

شادی کے بعد میں پھر واپس کلکتے چلا آیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ کلکتے پر بمباری ہوئی اور گھر والوں کی ہدایات کے مطابق مجھے کلکتہ بھی چھوڑنا پڑا۔ میں بمبئی آیا اور بمبئی سے پونے چلا گیا۔ وہاں کے شالیمار اسٹوڈیو میں ایک عجیب ادبی ماحول تھا۔ جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، کرشن چندر کے علاوہ اور بھی کئی اہل قلم وہاں موجود تھے۔ پونے میں ایک آدھ فلم ہی بنی اور پھر بمبئی آ گیا اور رنجیت فلم کمپنی میں پانچ سو روپے ماہوار پر آرٹ ڈائریکٹر کی نوکری کرلی۔ ۵۰۰ روپے کی رقم اُس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ رنجیت میں ایک فلم شروع ہونے والی تھی۔ جس کا نام تھا ''دنیا ایک سرائے'' اداکار تھے جاگیردار راجندر۔ الطاف (ہیرو) اور مہ جبیں (ہیروئن)۔ ایک دن ڈریس ڈیزائن کے لئے جونہی فلم کی ہیروئن مہ جبیں کو میں نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی شکل ہو بہو اُسی لڑکی سے ملتی جلتی تھی جس نے میری زندگی میں ہلچل مچادی تھی۔ وہ بالکل راج کی متماثل تھی۔ وہی دلکش چہرہ، وہی نقوش، وہی قد، وہی چال ڈھال مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی ہے یا کوئی اور۔ اسے دیکھتے ہی میرے جسم میں بجلی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ میں بے اختیار اسکی طرف کھنچا چلا گیا۔ مہ جبیں پہلی بار ہیروئن کا رول ادا کر رہی تھی۔ چودہ یا پندرہ برس کا سن ہوگا۔ فلم کا ہیرو الطاف اسکا بہنوئی تھا اور فلم ڈائریکٹر میرے برادر محترم جناب کیدار شرما صاحب۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ اسٹوڈیو کے ساؤنڈ روم کے باہر ایک بہت بڑا بنچ تھا۔ بڑا تاریخی بنچ کیوں کہ فلم انڈسٹری کی مشہور و معروف ہستیوں کو اس تاریخی بنچ پر بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ لنچ کے دوران میں اکثر ہم لوگ اس بنچ پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ مہ جبیں کی والدہ اقبال بیگم گھر سے کھانا لے کر آتی۔ اقبال بیگم اپنے زمانے کی خاموش فلموں کی پیراماؤنٹ فلم کمپنی کی ہیروئن تھی۔ بڑی اچھی اور نیک خاتون تھی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ لنچ ختم ہونے کی گھنٹی بجنے تک اسی بنچ پر بیٹھ کر خوب گپیں ہانکتے۔ مہ جبیں کو اچھے اشعار سننے کا بہت شوق تھا۔ بڑی حساس طبیعت واقع ہوئی تھی۔ شاعری موسیقی اور فنون لطیفہ سے اس کو بڑی دلچسپی تھی۔ اس کی آواز میں ایک عجیب دلکشی اور لوچ تھا۔ باتیں کرتی تو پھول جھڑتے۔ انداز تکلم پر خواہ مخواہ نثار ہونے کو جی چاہتا۔ آج بھی اس کی صورتِ جاں نواز کبھی کبھی آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ اس کے سینے میں ایک معصوم فرشتے کا دل دھڑکتا تھا۔ اچھا شعر سنتے ہی اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ وہ چپ چاپ دیکھتی رہتی۔ رفتہ رفتہ اس کے حسن فسوں ساز نے کچھ ایسا جادو کیا کہ میں خود کو بھولنے لگا۔ ایک دن اس کے میک روم میں میں نے اسے اپنے شعر کا ایک مصرع سنایا۔

کھو یا گیا ہوں ایسا آنکھوں میں تجھ کو لا کر

اس نے فوراً برجستہ کہا۔

میں خود کو ڈھونڈتی ہوں دل کا دیا جلا کر

یہ کہہ کر اس نے نظریں نیچی کرلیں اور کسی گہری سوچ میں ڈوب

گئی۔ وہ جانتی تھی کہ میں شادی شدہ ہوں۔ ''میرا اس کا روحانی رشتہ تھا''۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اپنی محبوبہ دکھائی دیتی جو مجھ سے کوسوں دور تھی اور خدا جانے کہاں تھی۔ مہ جبیں میری بڑی عزت کرتی۔ وہ حد ادب سے کبھی آگے نہیں بڑھی۔ ہمیشہ مجھے جی کہکر پکارتی۔ ایک دن مجھے احساس ہوا کہ ہم جس راہ پر گامزن ہیں وہ راہ ہمیں کہاں لے جائے گی کچھ پتہ نہیں! اور پھر ایک شادی شدہ نوجوان کے لئے اس طرح عشق کرنا جائز نہیں۔ لیکن کرتا کیا؟۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ''عشق اپنے آپ ہو جاتا ہے کیا نہیں جاتا'' — اور پھر — ''جوان لڑکی جنگلی پھولوں کی ایک نرم و نازک بیل کی طرح ہوتی ہے جسے لپٹنے کے لئے آس پاس کوئی نہ کوئی سہارا چاہئے۔ جو چیز اس کے نزدیک ہوتی ہے۔ چاہے کوئی کھردرا درخت ہو۔ کانٹے دار پودا ہو یا پھر ''پھل دار'' پیڑ وہ اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لپٹ جاتی ہے'' ...... چنانچہ فرض شناسی نے مجھے اچھی طرح جھنجوڑا۔ اور پھر راہگذار زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا کہ ہم ایکدوسرے سے دور ہو گئے ...... ہم پھر سے اجنبی بن گئے ...... مہ جبیں کی تقدیر نے اس کا ساتھ دیا۔ اپنی سنجیدہ اور معنی خیز اداکاری کے طفیل میں اور اپنی خداداد قابلیت کے باعث وہ عالمی شناخت بن گئی — بھولی بھالی سیدھی سادی مہ جبیں ملکہ جذبات ''مینا کماری'' کہلائی — آج بھی اتنا عرصہ گزر جانے پر بھی وہ لمحے لوح دل پر ثبت ہیں —

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء اور پھر ۱۹۵۶ء تک کا عصر ایک خاص معنویت کا حامل ہے۔ افراتفری کے اس دور میں ایک لڑکی میری زندگی میں آئی اس کا نام تھا ''ممتاز''۔ شروع شروع میں جب وہ ہمارے پاس فلموں میں کام کرنے آئی تو اس کی عمر بمشکل ۱۲ سال کی ہوگی۔ اس چھوٹی سی عمر میں بھی بھائی صاحب نے اسے ہیروئن کا چانس دیا۔ لڑکی بڑی ہونہار تھی اور تھی بھی بڑی صحت مند۔ دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہوگئی اور کامیابی کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کرنے لگی۔ اسے مجھ سے ''بے حد لگاؤ تھا'' اور مجھے اس سے خاص دلچسپی ''یہ سب کچھ'' اس کے باپ خان صاحب کو معلوم تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے۔ مگر میرا بڑا احترام کرتے۔ بڑے ادب نواز تھے۔ انہوں نے ہی میرے بڑے بھائی صاحب سے کہہ کر مجھے ڈائریکشن کا چانس دلوایا۔ چنانچہ فلم ''نیکی اور بدی'' کی شوٹنگ شروع ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ معاشقہ بھی پروان چڑھنے لگا۔ فلم انڈسٹری میں ڈائریکٹر یا ہیرو سے ہیروئن کے تعلقات ''بڑے قریبی'' ہوتے ہیں۔ فلم کی شوٹنگ کے دوران میں ایک دن لنچ کے بعد اس نے مجھ سے کہا ''شرما جی! آپ کی آنکھیں بہت ہی خوبصورت ہیں! میں نے کہا ابھی میں نے اپنی آنکھیں آپ کو دکھائی کہاں ہیں!'' — اس کے بعد اور زیادہ قریب آکر مجھ سے سوال کیا ''اچھا یہ بتایئے! کہ عورت کے جسم کا سب سے خوبصورت حصہ کون سا ہے؟۔ آپ تو آرٹسٹ ہیں!''۔ اتنے میں پھر شوٹنگ شروع ہو جانے کی گھنٹی بجی۔ شاید میرے لئے یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ وقت گزرتا گیا اور وقت کے ساتھ ممتاز آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ ممتاز ترین بن کر ممتاز اب ''مدھوبالا بن چکی تھی'' — صف اول کی اداکارہ — میں نے ایک دن اس کے باپ خاں صاحب عطاء اللہ خاں سے پوچھا۔ خاں صاحب! یہ بتایئے آپ نے ممتاز کا نام مدھوبالا کیوں رکھا؟۔ انہوں نے کہا ہندی زبان میں

''ساقی'' مدھوبالا ہے۔ میں نے کہا ادبی اعتبار سے یہ غلط ہے کیوں کہ ''ساقی'' عربی لفظ ہے۔ اور ایسا ہے جس کے لئے ہندی میں کوئی شبد نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس ملک میں ساقی اور جام کی رسم تھی ہی نہیں۔ ساقی کا ترجمہ مدھوبالا لفظ ساقی کے ساتھ [illegible] ہے جیسے ہندی میں موم بتی کو ''شمع'' کہا جائے کیوں کہ ''شمع'' عربی میں بھی موم بتی ہے۔ ایران میں شمع چربی کی بھی بننے لگی مگر نام ''شمع'' ہی رہا۔ ہندوستان میں تو دیا بتی [illegible] جاتی تھی۔ اس لئے نہ شمع تھی نہ اس کا نام۔ یہ سن کر انہوں نے کہا یہ لفظ (مدھوبالا) کانوں کو اچھا لگتا ہے ..... خیر —

''شہرت۔ شراب اور دولت'' سے انسان کے باطن کا پتہ چل جاتا ہے۔ ''مدھوبالا'' اب دولت اور شہرت کے نشے میں بدمست رہنے لگی۔ آہستہ آہستہ غربت ثروت میں اور عصمت و انکساری بے مروتی میں بدل کر رہ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اتنی مغرور اور بدزبان ہوگئی کہ ایک دن اپنے محسن سے بھی بڑی گستاخی سے پیش آئی۔ اب اس کے ساتھ اس کا ایک محافظ پستول لئے اس کے اردگرد گھومتا رہتا۔ وہ بہت زیادہ بدل چکی تھی۔ اب اس سے دلنوازی کی امید فضول تھی۔ ایک دن میں نے دیکھا وہ کسی مشہور ہیرو کے ساتھ عشق فرما رہی تھی۔ دوسرے روز کسی دوسرے ہیرو کی کار میں تھی۔ اس پیکر صدق و صفا کی وفا پر جفا کا گمان ہونے لگا۔ اور میں نے ایسے بُت ہرجائی سے کنارہ کشی کرلی۔ تمنّا معصوم ماتم ہو کر رہ گئی۔ اس کے مخصوص رجحان کے زیر تحت یہ انجام پسندانہ صورت حال بڑی مختصر العمر ثابت ہوئی۔ جلدی ہی وہ مجھے بھول گئی اور مجھے اسکو بھول جانا پڑا — اس کے بعد کئی لڑکیاں میری زندگی میں آئیں اور چلی گئیں۔ شاید ان سب نے مجھے چاہا ہوگا۔ مگر میں نے سچے دل سے کسی کو نہیں چاہا۔ اگر چاہا ہے تو صرف اسے جو میری ''رفیقۂ حیات'' ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے۔ بساط حیات کے مہروں کو درہم برہم ہوتے دیر نہیں لگتی۔ زمانہ بدل گیا ہے حالات بدل چکے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی انسان بھی بدل گیا ہے۔ آج کے اس دور میں عشق حقیقی عشق مجازی معلوم ہوتا ہے بلکہ یہ عشق صرف جسم و جاں تک سمٹ کے رہ گیا ہے۔ آج کل کے عشاق کو فکری کوائف کے اظہار کے لئے نئی نئی ہیئتیں اختراع کرنا پڑتی ہیں۔ اپنا عشق جتانے کے لئے انہیں کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ ان کے لئے ''شادی'' نصب العین ہے۔ لیکن میرا خیال ہے شادی کے بعد عموماً عشق عشق نہیں رہتا۔ ایک عجیب قسم کی خواہش اور ایک انوکھے خیال میں بدل جاتا ہے۔ شروع شروع میں ہر نوجوان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب اس کی امیدیں ایک غیر یقینی مستقبل کی خوابناک فضاؤں میں اڑتی پھرتی ہیں۔ وہ کائنات و آفاق کی وسعتوں اور گہرائیوں میں کھو جاتا ہے۔ اس وقت معاشقے میں ناکامی و نا امیدی کے ساتھ ساتھ ایک مسلسل اضطراب، عشق صادق کی ادعائیت سے انقطاع کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس سے کئی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ گلشن ہستی میں معاشقوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں کہ آدمی کو انسان اور انسان سے شیطان بننے پر مجبور کر دیا۔ عشق ایک ایسا لطیف جذبہ ہے جو فرقت۔ ذہنی انتشار سوز پیہم کی آگ میں قلب محزون کو تپا کر انسان کو کندن بنا دیتا ہے۔ اور بسا اوقات آتشکدہ دل کے تپتے ہوئے جذبات و احساسات مخمس اشعار کی صورت میں شعلہ جوالہ بن کر جب

باہر نکلتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ شاعر آگ اگل رہا ہے۔

اگر میں نے عشق نہ کیا ہوتا — اور اگر کچھ معاشقے مجھ سے وابستہ نہ ہوتے تو آج میں جو کچھ ہوں باوجود تجاہلِ بسیار کے وہ نہ ہوتا۔ یہ شاعری۔ یہ مصوری۔ یہ طرزِ نگارش و دیگر فنونِ لطیفہ انہی معاشقوں کی دین ہیں —

لیکن ان تمام معاشقوں کے باوجود میں نے کبھی بھی کوئی داغ یا دھبہ اپنے دامن پر نہیں لگنے دیا۔ مجھے فخر ہے کہ آج تک بھی میرا دامن اتنا ہی سفید اور اجلا ہے جتنا اس وقت تھا۔ میں نے پہلے پہل عالم شباب میں قدم رکھا تھا۔ عشق کے نشے میں میرے پاؤں کبھی نہیں ڈگمگائے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ عشق عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور میں نے بھی اس کمزوری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ فلمی دنیا کے کچھ لوگوں نے عورت کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ میری فلمی زندگی کا میرے کریکٹر پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بالکل اسی طرح جیسے کنول پر کیچڑ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آج بھی میں اتنا ہی متورع ہوں جتنا پہلے تھا۔ لیکن دیوتا بننے کی بھی کوشش نہیں کی۔ میں جو ہوں سو ہوں۔ زندگی میں میں نے بھی عشق کیا ہے۔ کئی بار کیا ہے۔

چند ایک ہمراز دوستوں اور میری رفیقہ حیات کے سوا آج تک میرے معاشقوں کا کسی کو علم نہیں اور اب شاید زندگی میں پہلی بار اپنی محبتوں کا اعتراف کر رہا ہوں......

یہ معاشقے آج بھی متاعِ عزیز کی طرح معمورۂ تخیل کے تیرہ و تاریک کلبۂ احزاں کے گوشوں میں محفوظ ہیں کہ جن کے طفیل میں میری زندگی کی بے رنگ تصویر میں تقدیر نے بڑے پیارے اور خوبصورت رنگ بھر دیے اور زندگی کی بھیانک تصویر ایک خوبصورت اور دلکش تصویر بن کر رہ گئی۔ میں ان حالات و جذبات کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر میری رہبری کی۔ چنانچہ میری کتاب ''شہاب ثاقب'' (اردو ہندی فارسی مجموعہ کلام) میں انتساب کے نیچے یہ سطور درج ہیں۔

اس کے نام:

جس نے مجھے شہاب ثاقب لکھنے پر مجبور کیا......

ان گھٹاؤں کے نام:

جو ننھی ننھی بوندوں کی شکل شہاب ثاقب برساتی رہیں......

ان بہاروں کے نام:

جنہوں نے مجھ سے پنجہ بازی کی......

اس خزاں کے نام:

جس نے وہ گل کھلایا — جو ابھی تک تر و تازہ ہے......

چنانچہ میں سمجھتا ہوں میرے معاشقے میرے لئے باعث احتظاظ و التذاذ ہیں کہ ان معاشقوں نے میری کایا پلٹ دی...... اور اب بھی معاشقے میری زندگی کا ایک حصہ ہیں۔

م۔م۔راجندر

وہ کیسی محبت تھی؟

عشق سے میری پہلی مڈبھیڑ اس وقت ہوئی جب میں صرف بارہ سال کا تھا! جی ہاں بارہ سال کا، چھٹی جماعت کا طالب علم۔

اب جب میری عمر پینسٹھ سال سے تجاوز کر گئی ہے اور میں نے زندگی کے بے پایاں سمندر میں بار بار غوطے لگا کر تہہ در تہہ پانیوں کو کھنگال لیا ہے تو میں بے جھجک یہ کہہ سکتا ہوں کہ فن کار کے دل میں ایک محبوبہ اسی وقت جنم لے لیتی ہے جب وہ دیکھنے، بولنے، سوچنے اور کچھ پڑھنے لکھنے لگتا ہے اور وہ خیالی محبوبہ زندگی بھر اس کے دل میں بسی رہتی ہے اور وقت وقت پر انسانی پیکر کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ میں اس بات میں بھی یقین نہیں رکھتا کہ عشق صرف ایک بار ہوتا ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ پہلا عشق انتہائی شدت سے ہوتا ہو۔

۱۹۳۵-۳۶ء کی بات ہے۔ ہم انبالہ چھاؤنی میں رحمٰن بازار میں رہتے تھے۔ میں بناری داس ہائی اسکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں انبالہ چھاؤنی پنجاب کا حصہ تھا اور سارے پنجاب میں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ چھٹی جماعت سے فارسی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ مگر جو لڑکا فارسی پڑھنا نہیں چاہتا تھا وہ سائنس لے سکتا تھا۔ میں نے فارسی لے لی تھی۔ میں فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں بڑا ہوشیار تھا اور کلاس میں ان مضامین میں اوّل آتا تھا۔

ہم کسی زمانے میں بڑے امیر تھے مگر جب میں تین چار سال کا ہی تھا والد صاحب بزنس میں بڑا نقصان اٹھا کر دیوالیے ہو گئے تھے اور گھر کی موجودہ مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بڑی مشکل سے جوں توں کر کے گزارہ چل رہا تھا۔ میں ننگے پاؤں ہی اسکول آتا اور جاتا تھا اور ایک معمولی سی قمیض اور نیکر میں پھرتا رہتا تھا۔ گھر میں بچوں پر نگرانی بھی برائے نام تھی۔ اور میں اسکول سے لوٹ کر اپنے دوسرے بھائیوں اور گلی محلے کے بچوں کے ساتھ، دھوپ ہو یا چھاؤں، دن بھر اِدھر اُدھر پھرتا اور کنچے اور گولیاں وغیرہ کھیلتا رہتا تھا۔

ان دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ محلے تھے۔ ہندو مسلم فساد کے بارے میں کم از کم میں نے تو اس وقت تک نہیں سنا تھا۔ ہر گلی میں اگر دس گھر ہندوؤں کے تھے تو چار پانچ مسلمانوں کے بھی تھے۔ مسلمانوں کے گھروں کا شناختی نشان صرف یہ ہوتا تھا کہ ان کے بیرونی دروازوں پر ٹاٹ کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ دروازہ دن میں کھلا رکھا جاتا تھا اور ان کی عورتیں پردہ کرتی تھیں۔

ایک روز مجھے ہمارے ہی محلے کا ایک بڑا لڑکا شکورا اپنے گھر لے گیا

کہ چل میرے بھائی جان نے تجھے بلایا ہے، تجھ سے کچھ پوچھنا ہے۔ میں چلا گیا تھا۔ ان کا گھر ہماری گلی سے دو تین گلیاں چھوڑ کر تھا۔ شکور کی عمر تو سولہ سترہ سال کی ہوگی مگر بڑا لمبا چوڑا تھا۔ دراصل یہ لوگ ذات کے پٹھان تھے مگر دونوں بھائیوں کا رنگ کالا تھا۔ بڑے بھائی کا نام محمد بخش تھا مگر اسے سب لوگ بخشی کہتے تھے۔ وہ ایک انگریز کی کوٹھی پر خانساماں تھا۔ انگریزوں کے خانساماں، بیرے اور دھوبی اور ان کے بچے بڑے ٹھاٹ سے رہتے تھے اور میں بھی ان کے بچوں کو جو عمدہ کپڑے پہنے ٹافی اور چاکلیٹ کھاتے رہتے تھے، حیرت سے دیکھا کرتا تھا۔ میرا نام مدن تھا مگر گھر کا نام مدی تھا اور سب اسی نام سے بلاتے تھے۔ میں شکورا کے گھر میں اندر گھسا تو بخشی اپنے دونوں چھوٹے لڑکوں کے ساتھ فرش پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی بیوی سنگترے اور کیلے چھیل رہی تھی جو سب کھا رہے تھے۔ شکور مجھے یہاں چھوڑ کر اوپر چلا گیا تھا۔ نیچے بخشی رہتا تھا اور اوپر بخشی کے والدین اور شکور۔ بخشی نے ہاتھ سے ایک لوہے کی کرسی کو پونچھ کر مجھے اس پر بٹھایا اور چھیل کر مجھے ایک کیلا دیا اور بولا۔

''مدی تو شام کو آٹھ بجے کے بعد کبھی بھی گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے مجھے اردو اور انگریزی پڑھا دیا کر اور میرا حساب لکھ دیا کر۔ پڑھائی کے بغیر میرا کام نہیں چلتا کیونکہ میری میم میرے خرچے کا روزانہ حساب مانگتی ہے اور مجھے کسی کسی سے حساب لکھوانا پڑتا ہے۔ میں تجھے دو روپے مہینہ دوں گا۔ بول سکھا دیا کرے گا؟''

میں نے ہاں کر دی۔ ان دنوں تو ایک روپیہ بھی بڑی رقم ہوتا تھا۔

جب ہمارے گھر میں چھ فٹ کا لمبا چوڑا پہاڑی نوکر تھا تو بابو جی اسے روٹی کے ساتھ صرف دو روپے مہینہ تنخواہ دیتے تھے۔ یہاں مجھے یہ بھی لالچ تھا کہ چیزیں کھانے کو ملیں گی۔ اس کے علاوہ بخشی بڑی عمدہ نیت کا بڑا پیارا اور فراخ دل آدمی تھا۔ جتنا وہ لمبا چوڑا تھا اس کی بیوی سکینہ اتنی ہی پتلی دبلی اور چھوٹی تھی، مگر بڑی خوبصورت گورے رنگ کی اور سلیقے والی تھی۔ مگر دونوں لڑکے باپ پر تھے۔

میں نے گھر نہیں بتایا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ آنے جانے پر تو روک ٹوک تھی نہیں اور رات کے تو ساڑھے نو بجے سے پہلے گھر میں کوئی بھائی بھی نہیں آتا تھا۔ مگر چند دنوں کے بعد میں نے اپنی ماں کو بتا دیا تھا اور اس نے بابو جی کو۔ ایسا میں نے اس لئے کیا تھا کیونکہ بخشی کسی کسی دن رات کے نو بجے بھی آتا۔ جس دن اسے کافی دیر ہو جاتی تو وہ مجھ سے صرف حساب لکھوا لیتا اور پڑھائی کا کام اگلے دن پر چھوڑ دیا جاتا۔ بخشی جب کام سے لوٹتا تھا تو اس کی سائیکل کی ٹوکری میں کھانے پینے کا کافی سامان ہوتا، کبھی کیک کا ٹکڑا، کبھی پھل، کبھی پڈنگ اور کبھی طرح طرح کے چاکلیٹ اور گولیاں۔ غرضیکہ جن پھلوں اور چیزوں کو ہم ترسا کرتے تھے، وہ ہر روز ہی کھانے کو ملنے لگیں۔ بخشی مجھے بہت پسند کرنے لگا تھا اور اس کی بیوی سکینہ بھی، میری کم عمر کے باوجود، میری عزت کرتی تھی۔ وہ مجھے ماسٹر جی کہا کرتی تھی کیونکہ جب سے میں نے پڑھانا شروع کیا تھا بخشی نے بھی مجھے ماسٹر جی کہنا شروع کر دیا تھا۔ شاید یہ نیا تعلق اس کا متقاضی بھی تھا۔

بخشی کا کوٹھی کا حساب میں انگریزی میں لکھا کرتا تھا کیونکہ حساب میم دیکھتی تھی۔ اس کے لئے بخشی نے ایک باقاعدہ لمبی چوڑی کاپی بنا رکھی تھی۔ جب اس کے نئے صفحے پر تاریخ ڈال کر ہر چیز کا نام انگریزی میں لکھ کر اس کا وزن یا تعداد اور روپے، آنے اور پائی میں قیمت لکھ دیتا تھا۔ مجھے تو ہر ایک شئے اور پھل اور سبزی کی انگریزی نہیں آتی تھی مگر بخشی جانتا تھا اور غلط سلط سپیلنگ میرے ہوتے تھے۔ میرا خیال تھا بخشی قیمت اور وزن کچھ زیادہ لکھواتا تھا اور اس طرح سے ہر روز پیسے بچالیتا تھا۔ ایک دوبار وہ مجھے اپنی سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر سبزی منڈی بھی لے گیا تھا۔ کیونکہ وہاں کے دکاندار اسے اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ہر روز کا گاہک تھا۔ وہ اس کی بڑی آؤ بھگت کرتے اور انہوں نے اس روز مجھے بھی ایک کیلا اور کچھ انگور کھلا دئے۔ مجھے بخشی کی بے ایمانی کبھی بری نہیں لگی بلکہ اچھی لگی کیونکہ انگریز بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے تھے اور ان کی تنخواہیں بہت تھیں اور ہم بچے ان کی کوٹھیوں کے آگے سے بھی گزرتے تو وہ ہمارے پیچھے اپنے کتے چھوڑ دیتے۔ میں بھی غریب تھا اور بخشی بھی غریب تھا۔ ایک روز میں بخشی کے ساتھ اس کی کوٹھی میں بھی گیا۔ مگر کچن جہاں بخشی کام کرتا تھا، رہائشی کوٹھی سے بیس پچیس گز الگ تھی اور میں نے وہاں ایک کیک کا بچا کھچا ٹکڑا اور پڈنگ کھائی اور دور سے میم اور اس کے بچوں کو بھی دیکھا۔

ایک شام جب میں بخشی کے گھر پہنچا تو وہاں ایک اور عورت بھی بیٹھی تھی۔ میرے پہنچتے ہی بخشی کی بیوی بولی۔

''یہ میری نند زینب ہیں، ان کی چھوٹی بہن۔ انہیں بھی اردو اور فارسی کا شوق ہے اور یہ ہیں ہمارے ماسٹر جی''۔

زینب نے مسکرا کر اور اپنا ہاتھ پیشانی تک اٹھا کر مجھے آداب کہا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور ایک حیرت اور استعجاب کے جذبے میں جکڑا ہوا اسے چند لمحوں تک دیکھتا ہی رہا۔ وہ واقعی ایک پٹھان لڑکی تھی، بڑی مضبوط اور مجھ سے کوئی ایک فٹ لمبی۔ سرخ و سفید رنگ، بے حد گھنے، لچھے دار اور سیاہ بال۔ گالوں میں ایک پرکشش گولائی اور ابھار اور آنکھیں کنچوں اور بلوریوں کی طرح چمکتی ہوئی۔ گردن، کان اور ہاتھ زیور سے بے نیاز۔ ناک بیچ میں سے قدرے پست لیکن چہرے پر بھلی لگتی ہوئی۔

''ماسٹر جی'' وہ بولی'' آپ نے گلستان اور بوستان پڑھی ہیں؟''

''جی نہیں'' میں نے جھجک کر کہا'' ہماری فارسی کی کلاس تو اسی سال شروع ہوئی ہے اور است اور بود تک محدود ہے۔ مضارع اور مصدر سیکھ رہے ہیں۔ تین چار لفظوں کے سادہ فقرے سمجھ لیتا ہوں''۔

''اور اردو؟''

''اردو تو شروع سے پڑھ رہا ہوں۔ ہمارے کورس میں مرقع ادب لگی ہوئی ہے''۔

''مرقع ادب میں نے بھی پڑھی ہے''۔ زینب بولی'' بڑی عمدہ کتاب ہے۔ خیر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو دوپہر کو مجھے بھی فارسی سکھا دیا کیجئے۔ فارسی کی پہلی کتاب میں منگوا لوں گی۔ جو آپ نے ابتک پڑھا ہے وہ پڑھا دیجئے۔ پھر

جو اپنی جماعت میں آپ پڑھیں گے وہ مجھے پڑھا دینا۔ میں بھی آپ کو دو روپے مہینہ دے دوں گی۔ ٹھیک ہے؟ آپ اسکول سے کتنے بجے آجاتے ہیں''۔

''میں ایک بجے تک گھر آجاتا ہوں۔ روٹی کھانے تک ڈیڑھ تو بج جائے گا۔ یا تو آپ دو بجے پڑھ لیا کریں یا پھر رات کو بھائی جان کے ساتھ ہی''۔

''دوپہر کو ٹھیک رہے گا۔ رات کو تو گھر کے کام میں الجھی رہتی ہوں''۔ زینب بولی

''آپ رہتی کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا

''یہیں اوپر'' بخشی کی بہو بولی ''ان کی سگی بہن ہیں اور ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی''۔

میں نے ایک دفعہ پھر زینب کی طرف دیکھا۔ عمر کافی بڑی لگی۔ اس وقت بڑے لوگوں کی عمر کا اندازہ لگانا میرے بس کی بات نہیں تھی مگر اب سوچتا ہوں کہ زینب کی عمر تیس بتیس سال سے کم نہیں ہوگی''۔

اس طرح سے مجھے ایک ٹیوشن اور مل گئی۔ اب اس گھر میں دن میں دو مرتبہ جانا میرا معمول ہوگیا۔ میرے پاس اب پیسے بھی رہنے لگے۔ اور کھانے کی چیزیں تو ہر روز ہی مل جاتی تھیں۔ لیکن جب زینب نے مجھے اپنی فیس دی تو میں نے اسے بخشی کی فیس کے ساتھ ملا کر پورے چار روپے اپنی ماں کو فخریہ دے دئے اور انہوں نے تین روپے رکھ کر ایک روپیہ مجھے دے دیا۔ میں اپنے آپ کو امیر نہیں تو خوشحال ضرور سمجھنے لگا تھا۔

میں زینب کو پڑھاتے پڑھاتے زینب میں دلچسپی لینے لگا۔ یہ دلچسپی کس نوعیت کی تھی میں نہ جان سکا۔ ہاں اس کے ساتھ بیٹھ کر اس سے باتیں کر کے اور اسے پڑھا کر مجھے بہت ہی اچھا لگتا تھا اور زینب جب غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ چھو دیتی یا ہلکے سے پکڑ لیتی تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے گلیوں میں دوڑتے دوڑتے کوئی کٹی ہوئی پتنگ لوٹ لی تھی۔ کئی دفعہ زینب بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسے دیکھنے لگتی جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو یا اپنی کوئی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہی ہو۔ اکثر دوپہر کو جب میں زینب کو پڑھانے آتا تو چند منٹ بعد بخشی کی بیوی اپنے بچوں کو لے کر سو جاتی اور میں اور زینب اکیلے سے رہ جاتے اور دبی آواز میں ایک دوسرے سے مذاق کرتے اور ہنستے۔ میں اب بننے سنورنے بھی زیادہ لگا تھا یعنی اچھی طرح منہ دھو کر آتا اور بالوں میں تیل لگا کر کنگھے سے آگے انہیں ایک محراب کی شکل دے کر بناتا۔

ایک دوپہر کو بخشی کی بیوی نہیں سوئی اور ہم تینوں پڑھنے کی بجائے ادھر اُدھر کی باتوں میں اور ہنسنے میں مصروف تھے کہ زینب کسی بات پر بول اٹھی۔

''ماسٹر جی کے گال تو کچوریوں کی طرح ہیں''۔

بات کچھ نا اہم اور بے معنی سی تھی مگر میں کچھ شرما گیا اور نیچی نظر کر لی۔ مجھے گھر والے اور باہر والے بڑا خوبصورت سمجھتے تھے اور اس وجہ سے میں اپنے دوستوں میں بھی مقبول تھا۔ مگر زینب نے یہ بات کہہ کر میری توجہ خواہ مخواہ اپنے گالوں کی طرف دلا دی۔ وہ واقعی کچوریوں کی طرح گول اور نرم تھے۔ بخشی کی بیوی مسکرا کر بولی۔

''بی بی، ماسٹر جی کے گال کچوریوں کی طرح ہیں تو تمہیں کیا۔ اور

پھر ان کی بیگم کے لئے ہیں، جب وہ آئے گی۔ تم کیوں پھسل رہی ہوں؟''

یہ بھابی اور نند کا مذاق تھا۔ میں نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا:

''آئیے اب پڑھائی کرلیں''۔

میں بہت شروع سے ہی، شاید اس وقت سے جب میں تین چار سال کا ہی تھا، بڑا زود حس تھا۔ شاید میرے ذہن کے نہاں خانوں میں کوئی فنکار دھیرے دھیرے ابھر رہا تھا۔ میں زینب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ سوچنے لگا اور ایک روز تنہائی میں اس کے بارے میں سوچتے سوچتے میری آنکھوں میں آنسو چھلک گئے۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات زینب کے ساتھ بھی معلوم ہوتی تھی کیونکہ جب وہ مجھے دیکھتی تو اس کی شفاف آنکھوں میں مجھے محبت صاف جھلکتی نظر آتی۔ وہ پڑھائی سے زیادہ مجھ سے باتیں کرنے میں دلچسپی لیتی تھی۔ اور اب وہ اکثر رات کو بھی جب میں بخشی کو پڑھا رہا ہوتا تو کسی نہ کسی بہانے سے نیچے آجاتی، یہ دوسری بات تھی کہ اس وقت وہ مجھ سے بات نہ کرتی۔ دوپہر کو میں اسے پڑھا کر جانے لگتا تو وہ اداس سی ہو جاتی۔ میں جس روز نہیں جاتا وہ اگلے دن مجھ سے کہتی کہ کل میں نے بیسوں چکر نیچے کے لگا دیئے کہ ماسٹر جی اب آگئے ہوں گے، اب آگئے ہوں گے۔

مجھے زینب سے اپنے آپ کو ماسٹر جی کہلوانا بڑا برا لگتا تھا۔ مگر میں کیا کرتا کیونکہ یہاں شروع سے ہی سب مجھے ماسٹر جی کہتے تھے۔ ایک روز میں نے زینب سے اس کا ذکر کر دیا تو وہ بڑی ہنسی اور کہنے لگی کہ میں آپ کی بجائے تم کہہ سکتی ہوں کیونکہ آپ عمر میں بہت چھوٹے ہیں مگر میں ماسٹر جی کہنا کیسے چھوڑ دوں جبکہ بھائی جان بھی آپ کو ماسٹر جی کہتے ہیں!

ایک روز دوپہر کو میں زینب کو پڑھانے گھر پہنچا تو زینب کو زینے کے پاس ہی کھڑی پایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرا دی۔ آج وہ غضب کی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس نے گہرے ہرے رنگ کی قمیض اور غرارہ پہنا ہوا تھا اور گلے میں سرخ رنگ کا دوپٹہ تھا اور مجھے بے ساختہ لال کنٹھی والے ہرے طوطے کا خیال آیا جو کسی کے آنگن میں کہیں سے اچانک اتر آئے۔ وہ بولی۔

''ماسٹر جی، میں آج نہیں پڑھوں گی۔ نیچے بھابی جان سو رہی ہیں اور اوپر والدہ اکیلی ہیں۔ شکور آج کام پر نہیں گیا تھا۔ وہ اور ابا جان پیر صاحب کو یہاں لانے کے لئے گئے ہیں''۔

''کون سے پیر صاحب؟'' میں نے پوچھا

''ہمارے خاندان کے پیر صاحب ہیں۔ صاحب کرامات بزرگ ہیں۔ ہم سب انہیں بہت مانتے ہیں۔ سہارنپور رہتے ہیں مگر جب ابا لے آتے ہیں تو ایک دن ہمارے یہاں بھی ٹھہرتے ہیں۔ کل شام تک رہیں گے۔ ان کے آتے ہی گھر میں میلہ سا لگ جاتا ہے کیونکہ دوسرے رشتہ دار اور عقیدت مند بھی آجاتے ہیں''۔

زینب دو تین سیڑھیاں چڑھ کر رک گئی۔ میں نے کہا۔

''تو میں جاؤں؟''

''جی تو نہیں کرتا'' وہ آنکھوں میں شرارت سی بھر کر بولی ''لیکن خیر جاؤ''۔

''یہ آپ کے ہاتھ میں کون سی کتاب ہے؟''

''پڑھو گے؟ بڑی دلچسپ ہے۔ لو لے لو''۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر زینب کے برابر میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ سے بولی۔

''میرے اچھے سے پیارے ماسٹر جی، یہ کتاب تمہیں دینے لائق نہیں ہے''۔

''کیوں، کیا یہ اردو کا ناول نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں یہ بڑی گندی کتاب ہے''۔

''کیا مطلب؟ اور آپ کو یہ کس نے دی؟''۔

''مجھے کون دیتا۔ تم سے ناول مانگا تھا، تمہارے پاس تھا نہیں۔ کل ایک کباڑی آیا تھا۔ اسے کچھ ٹین ڈبے دیے تو اس کے پاس دو اردو کی کتابیں دیکھیں۔ ایک یہ اور دوسری ایک ناول ترکی حور۔ آٹھ آنے کا سامان بیچا اور دو آنے میں دونوں کتابیں خرید لیں۔ ناول کی تو ابھی باری نہیں آئی، مگر اف توبہ یہ کتاب تو بڑی خراب ہے۔ چھپ چھپا کر پڑھ رہی ہوں۔ پڑھتے ہی پھاڑ کر چولہے میں جلا دوں گی۔ وہ تو شکر ہے گھر میں میرے سوا کوئی اور کتاب نہیں پڑھ سکتا۔ مگر تصویریں تو سب دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کل سے یہ کتاب میرے ہاتھ میں ہے یا میرے بستر کے نیچے۔ بولو تو ایک تصویر دکھا دوں مگر برا نہ ماننا''۔

''نہیں مجھے نہیں دیکھنی آپ کی تصویر۔ میں چلتا ہوں۔ چھوڑیے میرا ہاتھ''۔

اور یہ کہہ کر میں نے ہاتھ چھڑا لیا اور نیچے اتر کر بھاگ گیا۔

اگلے روز دوپہر کو میں گیا تو، مگر اس سے پہلے پیر صاحب کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اگرچہ میں ایک کائستھ گھرانے کا لڑکا تھا اور ہمارا سب کا ہی مسلم گھرانوں میں آنا جانا تھا مگر میں شاید اپنے پچھلے زمانے میں مسلمان لڑکا رہا ہوں گا کیوں کہ مجھے مسلمانوں کی ہر چیز بڑی اچھی لگتی تھی حتیٰ کہ قبریں، مقبرے، خانقاہیں اور پیر فقیر بھی۔ میں آج صرف زینب کے پیر صاحب کی وجہ سے ایک اشتیاق اور تجسس کے جذبے میں بندھا ہوا چلا آیا تھا۔ آہستہ سے پردہ اٹھا کر داخل ہوا تو گھر میں خلاف توقع ہو کا عالم تھا مگر زینب اوپر سے کسی پری کی مانند چھم چھم کرتی ہوئی اتری اور بولی۔

''میں نے چھت پر سے تمہیں آتے دیکھ لیا تھا۔ پہلے تو یہ پرچہ رکھ لو، گھر جا کر اکیلے میں پڑھ لینا۔ نیکر کی جیب میں اچھی طرح دبا کر رکھ لو اور پڑھ کر فوراً پھاڑ دینا۔ اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ اور آؤ اب اوپر آ جاؤ۔ آج تو اتنی بھیڑ رہی کہ توبہ۔ ابھی سب رشتے دار گئے ہیں اور پیر صاحب پلنگ پر لیٹے ہیں مگر جاگے ہوئے ہیں۔ ان کی نیاز حاصل کر لو۔ ابا جان، امی، بھابی اور بچے بھی اوپر ہیں۔ شکورا آم لے کر آتا ہو گا۔ آم بھی کھا جانا۔ آ جاؤ''۔

اور زینب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر لے گئی مگر آخری سیڑھی پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ سیدھی مجھے پیر صاحب کے کمرے میں لے گئی۔ کیا مقناطیسی شخصیت تھی اور مجھے ڈر سا بھی لگا۔ عمر سے بوڑھے نظر آتے تھے۔ بھاری بھرکم جسم اور چہرہ بہت بڑا۔ لمبی لمبی زلفیں جن میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں گہرا کاجل۔ گلے میں رنگین پتھروں کی کئی مالائیں۔ تسبیح ہاتھ میں اب بھی تھی۔

''پیر صاحب'' زینب بولی'' یہ میرے چھوٹے سے ماسٹر جی ہیں۔ میں ان سے فارسی سیکھتی ہوں۔ ان کا نام مدی ہے''۔

میں تعظیم بجالایا اور انہوں نے مجھے دعا دی۔ آہستہ سے بولے۔

''مدی؟ بیٹے پورا نام محمد ہے یا احمد؟''

''پیر صاحب'' زینب بولی'' یہ ہندو ہیں اور ان کا پورا نام مدن ہے''۔

''بچی'' وہ بولے'' تو کیا ہوا؟ ہندو اور مسلمان دونوں ہی خدا کی ق ہیں۔ بیٹے یہ چھوٹا سا تعویذ لے لو اور اسے دائیں بازو پر باندھ لینا۔ کے اندر ایک کاغذ کے ٹکڑے پر صرف اللہ لکھا ہوا ہے۔ وہی اللہ ہے وہی پرماتما۔ خدا بھلی کرے گا''۔

میں چلا آیا۔ یہ تعویذ میرے بازو پر اس وقت تک بندھا رہا جب تک کہ میں نے کالج کی تعلیم مکمل نہ کر لی۔ پھر کہیں اتار کر میں اسے بھول گیا۔ اور وہ کھویا گیا۔ مگر زندگی میں متواتر ترقی کرتا چلا گیا۔ اور ہر کامیابی اور آسائش نصیب ہوئی جس کا اپنے سخت نامساعد حالات میں میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہاں تو پیر صاحب کے دیدار حاصل کر کے باہر نکلا تو سب سے پہلے میں نے زینب کا دیا ہوا پرچہ کھول کر پڑھا۔ اس میں صرف یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

''میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ یہ کیسی محبت ہے میں نہیں جانتی''۔

میں نے زینب کے کہنے کے مطابق پرچہ اسی وقت پھاڑ دیا۔ کئی روز بعد جب زینب پڑھ رہی تھی تو اس نے ایک صفحے پر یہ لکھ کر کاپی میری طرف بڑھا دی۔

''کیا تم نے وہ پرچہ پڑھا تھا؟''

میں نے اسی وقت نیچے لکھ دیا۔

''پڑھا تھا اور آپ کے کہنے کے مطابق پھاڑ دیا تھا۔ میں بھی آپ سے محبت کرتا ہوں۔ یہ کیسی محبت ہے، یہ میں بھی نہیں جانتا''۔

زینب نے میرا جواب پڑھ کر میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کاپی کے اس کاغذ کو پھاڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پڑھائی وہیں ختم ہو گئی۔

یہ محبت ڈگمگ ڈگمگ چلتی رہی۔ زینب موقع بے موقع میرا ہاتھ پکڑ لیتی اور میں دل ہی دل میں چاہتا کہ وہ یہ ہاتھ کبھی نہ چھوڑے۔ اس سے زیادہ ہماری محبت آگے نہ بڑھی۔ پھر ایک روز میں بخشی کو پڑھانے اور اس کا حساب لکھنے رات کو پہنچا تو بخشی کے کمرے میں ایک اور لمبے چوڑے آدمی کو بیٹھے ہوئے پایا۔ کھانے پینے کا کافی سامان بھی رکھا ہوا تھا۔ مجھے اس کی عمر چالیس کے قریب نظر آئی، بہت خوش پوش اور خوش مزاج اور بظاہر تعلیم یافتہ۔ بخشی نے میرا تعارف کرایا کہ میں اس کا اور زینب کا ماسٹر جی ہوں اور اس کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ وہ کوئی مسٹر نیاز احمد ہیں جو بنگلور میں کسی بڑے انگریز حاکم کے بیرے تھے اور بخشی کے دوست تھے۔

اگلے روز میں دوپہر کو پہنچا تو زینب روز مرہ کی طرح وہاں پہلے ہی سے موجود نہیں تھی۔ بخشی کی بیوی بولی۔ ''بی بی کی شادی نیاز احمد صاحب سے طے ہوگئی ہے۔ اسی جمعے کو نکاح ہے۔ ان کے بڑے پرانے دوست تھے۔ یہاں آئے تو یہ کام بھی بن گیا۔ یہ بڑے پریشان تھے بی بی کی شادی کے لئے۔ کل بی بی کہہ رہی تھیں کہ بنگلور جا کر بھی میں اپنے ماسٹر جی کو نہ بھول سکوں گی''۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھ پر بجلی سی ٹوٹ پڑی تھی مگر میں نے اچانک اپنے آپ کو بڑا مضمحل اور اداس محسوس کیا۔ مجھے اپنے حالات میں اس ناگہانی موڑ کی بالکل توقع نہیں تھی۔ بخشی کی بیوی کی کسی کسی بات سے پتہ لگتا تھا کہ وہ جانتی تھی کہ زینب مجھے چاہتی تھی۔ میں اٹھ گیا اور آہستہ آہستہ باہر چلا آیا۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے اوپر جاتے ہوئے زینے کی طرف دیکھا تھا۔ اور مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ زینہ نہیں کوئی ہرا بھرا درخت تھا جس کی شاخ پر سے کوئی دلنواز مینا لمبے بسیرے کے بعد اچانک اڑ گئی تھی۔

میں نے بخشی کے گھر جانا بند کر دیا۔ اب وہ اپنا حساب گزارے کے لائق انگریزی میں لکھنے کے قابل بھی ہو گیا تھا۔ ہاں بخشی کو بھی مجھ سے لگاؤ سا ہو گیا تھا اور وہ مجھ سے ہمیشہ پڑھنا چاہتا تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ مجھے بھی اس گھر سے پیار ہو گیا تھا جیسے وہ میرا ہی گھر تھا۔ مگر حالات اتنے ستم گر ہوتے ہیں کہ جذبات کے ان کچے گھروندوں کو آناً فاناً یوں ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔

نکاح کے اگلے دن، سنیچر کو شکور میرے پاس آیا کہ بھائی جان نے ابھی بلایا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی ہو لیا۔ نیچے ہی بخشی کے کمرے میں زرق برق کپڑوں میں ملبوس زینب بیٹھی تھی۔ پاس ہی، بخشی کے ساتھ اس کا دولہا نیاز احمد بیٹھا تھا۔ کافی سامان ادھر اُدھر بندھا ہوا رکھا تھا جس میں ایک موٹا بستر بند بھی تھا۔ زینب نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا لیا۔ بخشی بولا۔

''ماسٹر جی آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔ زینب تین بجے کی گاڑی سے بھائی جان کے ساتھ بنگلور جا رہی ہے۔ میں نے آپ کو بلوا لیا تاکہ آپ بھی مل لیں''۔

میں ننگے پاؤں حواس باختہ سا کھڑا تھا کہ نیاز احمد اٹھا اور مجھے بازو سے پکڑ کر زینب کے سامنے لے گیا اور بولا۔

''یہ تمہارے ماسٹر جی ہیں، ان سے گلے ملو''۔

اور نیاز احمد نے زینب کو بھی کھڑا کر کے اور مجھے اس کے قریب دھکیل کر ہمیں گلے ملوا دیا۔ مجھے زینب کی آنکھوں میں آنسو سے لرزتے نظر آئے۔ نیاز احمد بڑا خوش مزاج اور فراخ دل تھا۔ مجھے اور آگے کر کے زینب سے بولا۔

''ارے چھوٹے سے تو ماسٹر جی ہیں۔ ایسے نہیں، ان کی ایک چمی بھی لو۔ پھر پتہ نہیں کب ملنا ہوگا''۔

اور نیاز احمد نے ہنستے ہوئے زبردستی جھجکتی ہوئی زینب کو میرے اوپر جھکا دیا اور اس نے آہستہ سے اپنے ہونٹوں سے میرے گال کو چھو لیا۔

پھر میں باہر چلا آیا مگر میرے قدموں میں لغزش تھی اور میں نے محسوس کیا کہ جو آنسو کب سے اندر رکے ہوئے تھے، اب بے تحاشہ نیچے ڈھلک رہے تھے!۔

عورت سے رشتہ

جب کبھی میں اپنی رومانی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے چاروں طرف رنگوں اور خوشبوؤں کی قوسِ قزح پھیل جاتی ہے۔ مجھے عورت ذات سے نہ تو کل کوئی شکوہ تھا اور نہ آج کوئی شکایت ہے۔ اسکی قربت نے میری سوچ، میرے جذبوں، میری شاعری اور میری شخصیت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

میری عورت سے رشتے کی کہانی کافی طویل ہے میں اس وقت صرف ان چند رنگوں اور خوشبوؤں کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کروں گا جو میری زندگی میں شمالی امریکہ میں آنے کے بعد داخل ہوئے۔ اگر میں یہ کہوں کہ شمالی امریکہ میں میری زندگی ہمیشہ عورت کی نظرِ کرم سے مسحور رہی ہے تو مبالغہ آمیزی نہ ہوگی۔

چونکہ میرا ایمان ہے کہ رومانوی زندگی کا ایک حصہ بہت ذاتی اور Personal ہوتا ہے اس لئے میں کسی کا نام نہ لوں گا۔ میں اپنی زندگی کے چند پہلوؤں کی نقاب کشائی کر رہا ہوں کسی اور کی زندگی سے نہیں۔ رومانوی زندگی کے چند آداب ملحوظ خاطر ہیں۔

۱۹۷۷ء میں جب میں نے کینیڈا آنے کا فیصلہ کیا اور مجھے میموریل یونیورسٹی نیو فاؤنڈ لینڈ (Memorial University New Found Land) میں نفسیات (Psychiatry) میں فیلوشپ کرنے کیلئے داخلہ ملا تو میرا پہلا پڑاؤ شہر سینٹ جانز (St. Johns) میں تھا۔ نیو فن لینڈ کینیڈا کا مشرقی ترین صوبہ ہے۔ جس کا رقبہ پاکستان کے برابر ہوگا لیکن آبادی صرف پانچ لاکھ ہے۔ شہر سینٹ جانز کی آبادی تقریبا دس لاکھ لوگوں کی تھی۔ اس شہر میں چند ہفتوں میں ہی مجھے احساس ہونے لگا جیسے میں پاکستان اور ایران کی زندگی کی ۲۵ سالہ تنگ و تاریک سرنگ کے بعد ایک کھلی فضا میں آ گیا ہوں۔ میں نے ماحول کو آزادی اور جمہوریت کی تازہ ہوا کے جھونکوں سے معطر پایا۔ اس شہر میں پاکستان کے صرف چند خاندانوں کی موجودگی کی وجہ سے مجھے مقامی لوگوں کے ساتھ کام کرنے، ملنے جلنے اور قریب آنے کا بھرپور موقعہ ملا۔

پہلے چند مہینے تو غمِ دوراں کی نذر ہو گئے لیکن جب ہسپتال میں کام کی سوجھ بوجھ ہو گئی، رہنے کو اپارٹمنٹ اور شہر میں گھومنے کو گاڑی مل گئی تو رومانوی زندگی کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔

معاشرتی اور سماجی آزادی کی فضا میرے لئے نعمتِ غیر متوقعہ تھی۔

میں جس عورت سے چاہتا مل سکتا تھا۔ جس نازنین کو چاہتا اپنے قریب آنے کی دعوت دے سکتا تھا — لیکن اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے جذبات پابہ زنجیر ہیں۔

میں نے تو ایسے معاشرے اور ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں
عورتیں دوسرے درجے کی شہری تھیں۔
خاندان بیٹیوں کی پیدائش پر نادم ہوتے تھے۔
عورتوں کو آداب تقویٰ سکھائے جاتے تھے۔
ان کے مستقبل کے فیصلے خاندان کے ''بزرگ'' کرتے تھے۔
ان کے ناطے اجنبی مردوں سے باندھ دیے جاتے تھے اور وہ تمام عمر کسی کی بیٹی، کسی کی بیوی اور کسی کی ماں بن کر گزار دیتی تھیں۔ ان کی انفرادیت اختیار تو کیا گھر والے بھی قبول نہ کرتے تھے۔

مجھے رومانوی آزادی ملی تو میں بدہضمی کا شکار ہونے لگا۔ جب ہسپتال میں یا کسی محفل میں عورتیں میرے قریب آتیں یا مجھ سے بے تکلفانہ بغل گیر ہوتیں تو میں برف کا تودہ بن جاتا۔ مجھے لڑکپن کے وہ دن یاد آنے لگتے جن کے بارے میں میں نے لکھا تھا

اسے پا کر بھی اس کو چھو نہ پایا
یہی سوچا مقدس مورتی تھی
نجانے کسی نے سرگوشی یہ کی تھی
عقیدت تھی یا تیری بزدلی تھی

اگرچہ میں ساری عمر روایتی انداز کی مشرقی شادیوں کیخلاف اور بنیادی طور پر جواں مردوں اور عورتوں کے اپنے لئے خود شریک سفر اور شریک زندگی تلاش کرنے کے حق میں رہا تھا لیکن جب مجھے خود ان حالات کا سامنا کرنا پڑا تو میری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا یا ماحول کے اس تحفے نے مجھے اس مفلوک الحال شخص کی یاد دلائی جسے بادشاہ نے خوش ہو کر ایک ہاتھی تحفے میں دیا تھا اور وہ بادشاہ کی سادگی پر ہنس دیا تھا۔

مجھے جلد ہی احساس ہونے لگا کہ پاکستان کے ڈھکے چھپے معاشقوں، یکطرفہ رومانوں، جنسی تعلقات اور بغیر مرضی کی شادیوں سے مغرب کے مردوں اور عورتوں کے بالغ اور باہم رضامندی کے تعلقات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان تعلقات کے اپنے آداب ہیں اور اپنا رکھ رکھاؤ۔ ہر رشتہ آغاز سے انجام تک اپنے مخصوص مزاج کا مالک ہوتا ہے۔ رشتوں کا بننا، بگڑنا، ٹوٹ جانا اور ایک نئے رشتے کا آغاز ہونا کچھ خصوصی روایات کے مطابق طے پاتا ہے۔

میں اس مدرسہ قلب ونظر کا طفلِ مکتب تھا۔ میں اکثر اوقات اپنے ماحول کی طرف اس بچے کی طرح دیکھتا جو میلے میں کھو گیا ہو اور کبھی کبھار اپنے ماضی پر دل ہی دل میں غصہ ہوتا جس نے مجھے عورتوں سے آزادانہ راہ و رسم رکھنے کیلئے پوری طرح تیار نہ کیا تھا۔

آخر کار میں شہر رومان میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے داخل

ہوا۔ چند عورتوں سے اتفاقیہ ملاقاتوں (Casual Dates) کے بعد میری
ایک خوبصورت اور ذہین عورت سے ملاقات ہوئی جو مجھے بھا گئی۔ وہ عمر میں تو
مجھ سے چند سال چھوٹی تھی لیکن تعلقات کی دنیا میں بہت آگے۔ ہماری پہلی
ڈیٹ (Date) ویلنٹائنز ڈے (Valentine's Day) پر تھی اور آخری
کرسمس کے موقع پر۔ وہ دس ماہ کا رشتہ میری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی
تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جب میں اس سے ڈیٹ کر رہا ہوں تو کسی اور عورت
سے ڈیٹ نہ کروں۔ میں نے وہ شرط بخوشی منظور کر لی۔ میں نے ان دس مہینوں
میں کئی اور عورتوں سے ملاقات تو کی لیکن کسی عورت سے رومانوی طور پر ملوث
نہ ہوا۔ جوں جوں تعلقات میں قربت اور انسیت پیدا ہوتی گئی ہم ایک
دوسرے کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگے۔ شروع میں ہم ہفتے میں ایک دن
رات اکٹھے رہتے پھر پورا ویکنڈ (Weekend) اکٹھے گزرتا، پھر ہفتے میں بھی
ایک آدھ دفعہ ملاقات ہو جاتی۔ کرسمس کے دوران تعلقات بحران کا شکار ہو
گئے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ہفتے کی بھی دو تین شامیں میرے ساتھ گزارے
لیکن میں اس تبدیلی سے خوش نہ تھا۔ میں اپنے ہفتے کی دو تین شامیں فارغ رکھنا
چاہتا تھا تاکہ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام یکسوئی سے کر سکوں یا اپنے مرد دوستوں کے
ساتھ کچھ وقت گزار سکوں۔

اس کا کہنا تھا کہ اگر میں اسے پسند کرتا ہوں تو سارا فارغ وقت اس
کے ساتھ کیوں نہیں گزارتا اور مستقبل کے وعدے کیوں نہیں کرتا میرا کہنا تھا کہ
وہ مجھے عزیز ہے لیکن۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

میں جھوٹے وعدے بھی نہ کرنا چاہتا تھا اس کیلئے اس قسم کے شیر گرم
تعلقات میں کوئی مستقبل نہ تھا۔ چنانچہ ہم دس مہینوں کی قربتوں کے بعد جدا
ہو گئے۔

وہ بہت ہی اداس دن تھا

اس دس مہینے کے بھرپور رشتے نے میرے بہت سے نظریاتی سرابوں
کو بے نقاب کر دیا۔ اس تعلقات کے طوفان میں میر تقی میر سے لے کر احمد فراز
کی شاعری اور رومانوی تصورات کے چراغ ہی کام آتے ہیں۔ مستعار شمعوں
سے خجالت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

میں کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تعلقات میں اتنے نشیب و فراز بھی
آتے ہیں۔ وہی عورت جو ایک شام سراپا خوشبو محسوس ہوتی ہے اور گلے لگنے
کو جی چاہتا ہے اسی سے ایک سہ پہر بات تک کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی
عورت جس کی قربت ایک رات پیاری تھکاوٹوں کو دور کر دیتی ہے دوسری صبح
اس کی گفتگو بھی بار لگتی ہے۔ ان واقعات اور کیفیات سے جہاں ایک طرف
دل کے بہت سے نئے دروازے اور کھڑکیاں کھلیں وہیں کہیں کھڑکیوں کے
شیشے بھی چکنا چور ہو گئے۔ کبھی ایک رات یہ شعر لکھا۔

ہوس کے پردے میں ہم نے بہت محبت کی
تمام رات ترے جسم کی عبادت کی

تو کبھی ایک صبح یہ قطعہ تحریر کیا۔

سرسری بات کرنے آئی تھی
اک قیامت عجیب ڈھا کے گئی
شام کی چائے پینے آئی تھی
صبح کا ناشتہ وہ کھا کے گئی

کئی دفعہ تو یہ دھڑکا لگا کہ جذبات کے اس ریلے میں جہاں اور بہت سے سورما بہہ گئے کہیں میں بھی تو نہ بہہ جاؤں گا لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ جہاں جہاں دل ڈوبا دماغ نے سہارا دیا۔ جہاں جہاں جذبات کا ریلا آیا عقل نے لنگر ڈال دیا۔ انہی طوفانوں سے گزرتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔

مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ یہ جسم کی محبت اور روحانی رشتے کے تفرقات بے معنی ہیں۔ میرے نزدیک یہ پاک اور ناپاک محبت کا تصور ان ذہنوں کی اختراع تھا جو حقیقت کی نسبت خیالوں کی دنیا میں زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ مجھے مصطفیٰ زیدی کے وہ شعر بار بار یاد آتے۔

فنکار خود نہ تھی مرے فن کی شریک تھی
وہ روح کے سفر میں بدن کی شریک تھی
اس پہ کھلا تھا باب حیا کا ورق ورق
بستر کی ایک ایک شکن کی شریک تھی

وہ زندگی بھر ساتھ گزارنے اور ہمارے تعلقات کی منزلوں کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتی تھی اور میں اس تصور سے ہی کانپ کانپ جاتا تھا۔ میں تو اپنی شمالی امریکہ کی رومانوی زندگی کی پہلی سیڑھی پہ کھڑا ہانپ رہا تھا۔

میں نے تو اسے صرف چاہا تھا' اس نے مجھے ٹوٹ کے چاہا تھا۔ اس لئے میں تو صرف افسردہ ہوا، اس کا دل ٹوٹ گیا۔

جب ہم جدا ہوئے تو اس نے پوری طرح قطع تعلق کرنا چاہا۔ میری یہ خواہش تھی کہ ہم دونوں جنسی تعلقات منقطع کر دیں لیکن دوستی کا ناطہ جاری رہے کیوں کہ میں اس عورت کی دل سے قدر کرتا تھا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کیلئے میری موجودگی میں اپنے جذبات پر قابو رکھنا ناممکن تھا۔ میں اپنے دماغ سے کام لے رہا تھا' وہ اپنے دل سے۔ اسکی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے عجیب بے بسی کا احساس ہوا۔ میں چند جھوٹے وعدوں سے حالات وقتی طور پر بہتر بنا سکتا تھا لیکن دل نہ مانا۔ ہم اپنی اپنی راہوں پہ چل دیئے۔ مجھے نہ صرف اپنی ایک چاہنے والی بلکہ ایک دوست سے بھی دور ہونا پڑا۔ مجھے اس حادثے سے سنبھلنے کافی دیر لگی۔

جب میں اس بحران سے سنبھلا تو بہت سی اور عورتوں سے ملاقات ہوئی۔ میں اب شہر رومان میں بالکل نیا نہ تھا میں اسکی گلیوں، بازاروں اور نازک موڑوں سے واقف ہو چکا تھا۔

سینٹ جانز شہر تو چھوٹا سا تھا لیکن صوبے کا دارالخلافہ تھا۔ اس میں چار نرسنگ اسکول تھے جن میں پورے صوبے کی نوجوان دوشیزائیں ٹریننگ کیلئے آتی تھیں چونکہ میں بھی ٹریننگ کے سلسلے میں ہر چھ مہینے ہسپتال بدلتا تھا اس لئے بہت سی نرسوں سے ملاقات ہوتی۔ بہت سے تعلقات تعارف کی سرحد سے چل کر قربت کی بہت سی منزلوں تک آ کر رک گئے' میں اس آزاد ماحول سے

اپنی رومانوی پرواز کا اندازہ لگا رہا تھا اور محظوظ ہو رہا تھا۔ میں حسیناؤں کے ساتھ شامیں گزارنے، ڈنر، فلم، کلب، میری یا ڈرائیو پر جانے کو بہت پسند کرتا۔ اس شہر کے ماحول کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہاں باہر کے ملکوں سے آنے والے طلبا کی تعداد بہت کم تھی۔ اکثر عورتیں ان کے بارے میں متجسس تھیں اور ان کے ساتھ ڈیٹ کر کے خوش ہوتیں بلکہ بعض تو فخر محسوس کرتیں۔ اس بازار میں بہت سے یوسفوں کی قیمت لگی۔ اس چھوٹی سی صف میں میں بھی شامل تھا۔ زلیخاؤں کی صف لمبی تھی۔

میں نے وہاں مزید تین سال گزارے اور ان تین سالوں میں بہت سی تشنہ آرزوئیں اور خواہشیں سیراب ہوگئیں۔ میں شاید اپنی جوانی میں بہت سے ایسے مراحل سے گزر رہا تھا جو شمالی امریکہ میں اکثر مرد اپنی نوجوانی میں گزرتے ہیں۔ دیر آید درست آید۔

ان چار سالوں میں جتنے رومانوی اور جنسی تعلقات تھے ان کی کہانیاں ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہ تھیں صرف کرداروں کے نام بدل گئے تھے — چاہے وہ چند دنوں کی بات ہو، ہفتوں کی یا مہینوں کی۔ گفتگو اور تعلقات اس موڑ پر آ کر رک جاتے جہاں مجھ سے پوچھا جاتا ہمارے رشتے کی منزل کیا ہے؟۔

میں خاموشی سے اسکے چہرے کی طرف دیکھتا اسے اپنی آغوش میں لینے کی کوشش کرتا تو وہ دور ہو کر بیٹھ جاتی۔

''کیا ہم اکٹھے رہیں گے یا شادی کریں گے؟''۔

میں پھر بھی خاموش رہتا۔ میرے پاس ان سوالوں کا جواب نہ تھا۔ میں راستوں کا پجاری تھا' وہ منزلوں کی۔

میرے لئے حیرانگی کی بات یہ تھی کہ کسی بھی عورت نے تعلقات میں سونے سے پہلے مجھ سے وعدے لینے کی کوشش نہ کی لیکن چند مہینوں کے بعد وہ مجھے اتنا چاہنے لگتیں کہ منزلوں کی بحث چھڑ جاتی۔ میں انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کرتا کہ یہ گفتگو اور بحث بے فائدہ ہے لیکن وہ مصر رہتیں۔ آخر یہ بحث ہمارے تعلقات کو دیمک کی طرح کھا جاتی اور رومانویت کی بلڈنگ دھڑام سے گر جاتی۔

سینٹ جانز میں چار سالوں کی رومانوی رشتوں کے مسائل اور ناساعد حالات کی روداد تو طویل ہے۔ لیکن وہاں دو روایات ایسی تھیں جنہوں نے میرے لئے ذاتی طور پر پریشانیاں پیدا کیں۔ ایسی پریشانیاں جن سے نبرد آزما ہوئے بغیر میں آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔

پہلی روایت تھی کہ وہی دو انسان جو ایک دوسرے کی زندگی کا محور ہوتے حالات بگڑنے کے بعد اجنبی بن جاتے' وہی آنکھیں جو مستقبل کے سہانے خواب دیکھ کر مسحور ہوتیں ڈراؤنے خواب دیکھ کر راتوں کو ہڑبڑا کر جاگ جاتیں۔ میں اس روایت سے خوش نہ تھا۔ میں نہ چاہتا تھا کہ جس عورت کو میں دل سے چاہتا ہوں اور جس کے ساتھ مل کر میں شاموں کو رنگ وخوشبو سے نکھارتا ہوں جب وہ مجھے چھوڑ کر جائے تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ میں نے اس موضوع پر گفتگو کی تو پہلے تو میری گرل فرینڈز بہت جز بز ہوئیں پھر

ناراض۔ انکی یہ بات پوری طرح سمجھ میں نہ آتی۔ میرا کہنا تھا کہ اگر تم مجھ سے خوش نہیں ہو اور ہم اکٹھے زندگی نہیں بنا سکتے تو دوستی کو قطع کیوں کرتی ہو۔ کئی دفعہ مجھے ہفتوں غصے اور نفرت بھری باتیں بھی سننی پڑیں جنہیں میں خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا لیکن آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا — یہ منزلیں پہلی منزلوں سے بھی زیادہ صبر آزما ثابت ہوتیں — لیکن ہر دفعہ یہ مسئلہ مقابلتاً آسان ہوتا۔ آخر کار میں اپنی چاہنے والیوں کے ساتھ دوستی کا ناطہ برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اب یہ دوستی عمر بھر کی دوستی تھی۔ جنسی تعلقات کی آزمائشوں سے بے نیاز۔ مجھے ان دوستیوں پر پہلے بھی فخر تھا اور آج بھی ہے حتیٰ کہ میں اپنی پہلی گرل فرینڈ کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ وہ منزل تھی جسے بہت سے مقامی مرد اور عورتیں بھی سر نہ کر سکے۔

دوسری روایت جس سے میں خوش نہ تھا وہ Eggs in one basket کی روایت تھی۔ شمالی امریکہ میں بہت سے مرد اور عورتیں جب ڈیٹنگ شروع کرتے ہیں تو آہستہ آہستہ اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور دیگر مشاغل سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنا تمام وقت اور توانائی اپنی گرل فرینڈ یا بوائے فرینڈ میں صرف کر دیتے ہیں۔ یہ عادت میں نے مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ دیکھی۔ جب تک تعلقات میں کوئی نازک موڑ نہ آتا کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہوتا لیکن جب قربتوں میں تلخیاں گھلنے لگتیں تو وہ ذہنی بحران کا شکار ہو جاتے۔ نہ دن کو چین نہ راتوں کو نیند۔ تفکر (Anxiety) اور دباؤ (Depression) سے متاثر ہو کر وہ ماہرین نفسیات کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ تعلقات کے ان بحرانوں سے لڑکیاں اور عورتیں زیادہ متاثر ہوتیں۔ میں ایک نفسیاتی وارڈ میں کام کر رہا تھا تو مجھے حیرانی ہوئی کہ اس یونٹ کے ۲۵ مریضوں کے بستروں میں سے صرف پانچ مردوں کیلئے ہیں اور بیس عورتوں کیلئے۔ ہیڈ نرس سے پوچھا تو کہنے لگی" یہاں ڈیپریسڈ (Depressed) عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ آتی ہیں جن میں سے بہت رومانوی تعلقات کی ناکامی کا نتیجہ ہیں"۔

نفسیات کا طالب علم ہونے کی وجہ سے مجھے ان ذہنوں اور دلوں میں بھی جھانکنے کا موقع ملا جو رومانوی طوفانوں سے متاثر ہوئے تھے۔ مجھے یہ جان کر افسوس ہوا کہ شمالی امریکہ میں بھی جمہوریت اور آزادی کے باوجود دوہرا معیار (Double Standard) موجود تھا۔ عورتیں اب بھی اتنی آزاد و خود مختار نہیں تھیں جتنی بظاہر نظر آتی تھیں۔ بہت سی چیزیں مردوں کیلئے جائز لیکن عورتوں کیلئے ناجائز تھیں۔ ایک مرد بہت سی عورتوں سے جنسی تعلقات رکھ کر فخر سے ذکر کر سکتا تھا لیکن اگر عورت ایسا کرتی تو اس کے اخلاق کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔

ذاتی طور پر میں نے جن گرل فرینڈز سے راہ و رسم رکھی انکی شخصیت میں بھی کچھ تبدیلیاں آئیں اور میری بھی۔ طرفین نے اپنی زندگی کی خوشبوؤں اور رنگوں میں ایک دوسرے کو شریک کرنے کی کوشش کی۔ نیوفن لینڈ کے چار سال کے تجربات نے میرے ذہن، میری سوچ، میری شخصیت اور میری

رومانوی اقدار میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کیں۔ میں اپنی بہت سی Inhibititions کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ میں اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں میں اپنی کسی گرل فرینڈ کو گلے سے لگاتا یا بوسہ دیتا تو مجھے دل میں ماضی کی زنجیروں کی کھنک سنائی نہ دیتی۔

ان چار سالوں میں میں نے بہت سے دوست، بہت سی گرل فرینڈز اور بہت سی خواتین دوست بھی بنائیں۔ جس دن میں وہ شہر چھوڑ رہا تھا میرے دامن میں تجربات اور یادوں کا بہت ذخیرہ تھا۔ ان یادوں میں سے کچھ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے تھیں اور کچھ ظرافت کا اور کچھ پر رونا آتا تھا اور کچھ پر ہنسی۔

مجھے اس شام کی دعوت یاد تھی جب میری ایک نوجوان گرل فرینڈ کی والدہ (جن کی عمر ۴۵ برس کے قریب ہوگی لیکن دل جوان تھا) نے شراب کے چند جاموں کے بعد مجھ سے مجھے رات بھر کیلئے مستعار لینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

مجھے وہ عورت بھی یاد تھی جس نے میرے ساتھ ایک ویکنڈ تو خوب رنگ رلیاں منائیں لیکن پھر ایسی سرد مہری کا ثبوت دیا کہ مجھے اپنا جسم ناپسندیدہ لگنے لگا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس کا ایک منگیتر تھا جو شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اور وہ ان چند ہفتوں میں زیادہ سے زیادہ مختصر عشق کرنا چاہتی تھی۔

مجھے وہ شام بھی نہ بھولی تھی جب ایک مطلقہ عورت نے مجھے اپنے گھر پارٹی میں بلایا تھا لیکن جب میں پہنچا تو نیم تاریک فضا، گلابوں اور ہلکے سروں کی موسیقی نے میرا استقبال کیا تھا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ ''پارٹی کے باقی لوگ کہاں ہیں؟'' تو شریری مسکراہٹ سے کہنے لگی ''وہ تو ایک بہانہ تھا''۔

میں نے نیوفن لینڈ کے چار سالوں میں پاکستان اور ایران کے اس سے پہلے کے دس سالوں سے زیادہ رومانوی تجربے اپنے دامن میں بھر لئے تھے۔

اس کے بعد مجھے نیو برنزوک (New Brunswick) میں بطور ماہر نفسیات ملازمت مل گئی اور میں وہاں ۸۱ء سے ۸۳ء تک رہا۔ اگر نیوفن لینڈ میری رومانوی زندگی کا Climax تھا تو نیو برنزوک Anticlimax۔

نیوفن لینڈ کی رومانوی زندگی بھرپور تو تھی لیکن اتنی تہہ دار نہ تھی میں ایک وقت میں ایک عورت سے ہی ڈیٹنگ کرتا اور جب وہ رشتہ ختم ہوتا تو دوسرے رشتے کا منتظر رہتا۔

نیو برنزوک نے کچھ ایسے تجربات سے بغلگیر کروایا جن کی مجھے بالکل توقع نہ تھی۔

مجھے ہسپتال میں کام کرتے ہوئے چند مہینے ہی گزرے تھے کہ ہسپتال کی ایک رفیق کار نے مجھے لنچ پر دعوت دی۔ ہم خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے کہ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میں کتنے ہفتوں سے اشارتاً اظہار کر رہی ہوں تم سمجھتے کیوں نہیں؟''

''میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو'' میں نے تجاہل عارفانہ سے کام

لیتے کہا۔

''میں چاہتی ہوں تمہارے ساتھ ایک افیر (Affair) ہو جائے''۔

''کیا تم شادی شدہ نہیں۔ کیا تمہاری ایک بیٹی نہیں ہے؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''تو پھر کیا ہوا''۔ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''وہ میرا شوہر ہے۔ تم میرے لور (Lover) ہو گے''۔ میں خاموش رہا تو مزید کہنے لگی۔

''دیکھو سہیل! میں کوئی نادان اور بیوقوف عورت نہیں جو تمہارے عشق میں آہیں بھرنے لگے گی اور اپنے شوہر کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ رہنے کی التجا کرے گی۔ میں ایک تجربہ کار لبریٹڈ (Liberated) عورت ہوں۔ مجھے اپنا شوہر بھی عزیز ہے لیکن ایک لور (Lover) بھی چاہتی ہوں''۔

میں ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے اس قسم کی گفتگو کی امید نہ تھی۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا ''مجھے یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ میں تمہارے مقابلے میں ایک روایتی مرد ہوں۔ اس کے علاوہ خفیہ تعلقات رکھنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے باہر جا کر کھانا کھانے، فلم دیکھنے اور لمبی سیریں کرنے میں مزا آتا ہے''۔

''تم نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا''۔ وہ دل برداشتہ تھی۔

''لیکن تم اپنے خاوند کو کیا بتاؤ گی''۔

''کچھ بھی نہیں۔ تمہیں میرے خاوند کی کیا فکر ہے۔ وہ میرا خاوند ہے تمہارا تو نہیں — تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم مجھے جنسی طور پر پرکشش پاتے ہو یا نہیں''۔

''ہاں''

''تو پھر مسئلہ کیا ہے''۔

''قصہ کوتاہ — میں تمہارے ساتھ نہیں سو سکتا''۔ میں کئی دن رات سوچتا رہا کہ شہر رومان میں قانون کی باتیں زیادہ اہم ہوتی ہیں یا دل کی۔

اس گفتگو کے چند مہینوں کے بعد دو اور شادی شدہ عورتوں نے قریب آنا چاہا لیکن میں اپنی پٹری نہ بدل سکا۔ میرے پاؤں شل تھے اور دماغ بوجھل۔

مجھے اس بات کا بھی احساس ہوا کہ تو اپنے آپ کو تجربہ کار سمجھنے لگا تھا لیکن درحقیقت طفلِ مکتب ہی تھا۔

مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ شمالی امریکہ میں شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ماسوا ازدواج رومانوی اور جنسی تعلقات (Extra Marital Relationship) کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ایک سروے کے مطابق امریکہ کے ایک خاص علاقے میں ۸۰ فیصد شادی شدہ مردوں اور ۵۰ فیصد شادی شدہ عورتوں نے کسی اور کے ساتھ سونے کا اقرار کیا تھا اور کمال یہ تھا کہ ان میں سے اکثر کے شوہروں یا بیویوں کو اس کی خبر بھی تھی۔

میرے لئے یہ معلومات بہت حیران کن تھیں۔

نیو برنزوک میں میں دو سال تو رہا لیکن میرا دل نہ لگا۔ چنانچہ

۱۹۸۲ء میں میں ٹورانٹو چلا آیا اور پچھلے چار سال سے وہیں مقیم ہوں۔ ان چار سالوں میں میری رومانوی طرز زندگی اور سوچ میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔

پہلے دو سال تو نیوفن لینڈ کی زندگی سے زیادہ مختلف نہ تھے۔

ٹورانٹو آنے کے بعد چند ہی مہینوں میں بہت سے مردوں اور عورتوں سے جان پہچان ہو گئی۔ ڈیٹنگ شروع کی تو وہی وعدے کہ اگر میرے ساتھ رومانوی تعلقات ہیں تو کسی اور کے ساتھ تعلقات نہ ہوں گے۔ میں حالات کی وجہ سے اقرار کر بیٹھا اور خوش ہوا کہ۔

نئے مقام پہ محبوب بھی نئے پائے
جزائیں ملتی رہی ہیں ہمیں یہ ہجرت کی

لیکن چند مہینوں کے بعد وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہمارے تعلقات کا مستقبل کیا ہے؟

ہم شادی کب کریں گے؟

بچوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

اگر شادی نہیں کرنی تو اکٹھے رہنے میں کیا حرج ہے؟

میری خاموشی اور سوالات کا حسب توقع جواب نہ دینا میری گرل فرینڈ کو ناامید کرنے کیلئے کافی تھا۔

رومانوی تعلقات یا تو کانچ کی چوڑیوں کی طرح چھناکے سے ٹوٹ جاتے یا ان میں دراڑیں پڑ جاتیں۔

ایک کہانی — دو کہانیاں — تیسری کہانی — میں نے سوچا

عاقل را اشارہ کافی است

انہی دنوں ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے کچھ اور بنیادیں ہلا دیں۔

میں تو سمجھا تھا کہ میں نیوفن لینڈ اور نیو برنزوک سے سب رومانوی کشتیاں جلا آیا تھا لیکن ایک شام ایک فون کی گھنٹی نے خاموشی میں کنکر پھینکا۔

''ہیلو سہیل کیا حال ہیں؟''

''او۔ تم!'' وہ میری ایک پرانی گرل فرینڈ تھی۔

''کیا شادی ہو گئی؟''

''نہیں تو''

''اچھا ہوا۔ کیا کسی کے ساتھ رہ رہے ہو؟''

''نہیں'' میں ہنسا۔

''کوئی گرل فرینڈ ہے؟''

''ہاں۔ کیوں کیا بات ہے؟''

''میں ایک ہفتے تمہارے پاس آ کر رہنا چاہتی ہوں۔ میں بخوبی جانتا تھا کہ اس رہنے میں ساتھ سونا بھی شامل تھا۔

''ایسا ممکن نہیں میری گرل فرینڈ ہر ویکینڈ میرے ساتھ گزارتی ہے''۔

''دیکھو سہیل! میں نہیں جانتی کہ تمہاری ایک گرل فرینڈ ہے یا بہت

سی۔ کیا تم اس گرل فرینڈ کو ایک ہفتے کیلئے غائب نہیں کر سکتے۔ تمہاری بہت یاد آ رہی ہے۔

میں نے اسے انکار تو کر دیا لیکن ایک عورت کی خاطر دوسری عورت کی قربت سے انکار ___ دل کو کھٹکتا رہا۔

ایک طرف ایک عورت سے قربت کی خواہش ___ دوسری عورت سے وفاداری (Faithfulness) کا وعدہ ___ میں درمیان میں ایک ٹانگ پر کھڑا حیران و پریشان تھا۔

میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ایک طرف ایسی عورتیں کھڑی تھیں جو روایتی انداز کے تعلقات اور جنسی وفاداری (Exclusivity) کی خواہاں تھیں اور دوسری طرف وہ عورتیں تھیں جو جنسی تعلقات تو چاہتی تھیں لیکن جذباتی، ذہنی اور نظریاتی ہم آہنگی کو اہمیت نہ دیتی تھیں۔

میں ان دونوں گروہوں میں مس فٹ (Misfit) تھا۔

میں جذباتی، ذہنی اور رومانوی قربت کا تو خواہاں تھا لیکن مستقبل کے وعدے نہ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے برسوں کسی عورت کو فریب نہ دیا تھا لیکن شاید خود فریبی کا شکار رہا تھا۔

آخر میں نے اپنی ذات کے ساتھ اس طرح مصالحت کی کہ میرے تعلقات عورتوں کے ساتھ بنیادی طور پر دوستوں کے سے ہوں گے ___ اگر بعض کے ساتھ دو طرفہ کشش ہوئی اور حالات نے اجازت دی تو رومانوی اور جنسی تعلقات بھی قائم ہو سکتے ہیں لیکن ان تعلقات پر دوستی کے ناطے قربان نہیں ہو سکتے۔

میری اپنی ذات سے مصالحت ہوئی تو عورتوں سے ملنے جلنے اور اظہار خیال میں بھی آسانی ہوئی۔

مجھے امید نہیں تھی کہ عورتیں جنسی وفاداری کے وعدوں کے بغیر میرے قریب آئیں گی ___ لیکن زندگی، عورتیں اور انسانی تعلقات بہت پر اسرار ہیں۔ حیرتیں ہر موڑ پر آئینے لیے کھڑی رہتی ہیں۔

میری پرانی گرل فرینڈز بھی وقتاً فوقتاً دوستی میں رومانوی اور جنسی عناصر شامل کر کے تعلقات کو دو آتشہ بناتی رہتی ہیں اور اپنے عمل سے یہ کہتی ہیں۔

آجکل رشتوں کا یہ عالم ہے
جو بھی نبھ جائے بھلا لگتا ہے

میری زندگی اب عشق و محبت، رومان و دوستی کی نئی شاہراہوں پر گامزن ہے۔ جہاں عورتیں پہلے دوست اور پھر رومانوی اور جنسی سفر کی شریک ہیں۔

میں اپنی زندگی سے خوش ہوں۔ عورتیں ہمیشہ مجھ پر مہربان رہی ہیں اور میں نے عورت ذات کے ساتھ نئے رشتے دریافت کیے ہیں جو گہرے بھی ہیں اور پر معنی بھی۔

میرے جذبات اور احساسات کی چند جھلکیاں میری نظم ''عورت سے رشتہ'' میں نظر آتی ہیں۔

عورت سے رشتہ

میرے اس دنیا سے رشتے لاکھوں
ایک رشتہ میرا پھولوں سے بھی ہے
ایک خوابوں سے بھی ہے۔
ایک بچوں سے بھی بوڑھوں سے بھی ہے
ایک آہوں سے بھی نغموں سے بھی ہے
اور یہ سارے تعلق تیری نسبت سے بھی ہیں
یہ مرے شعر یہ نغمے تیری قربت سے بھی ہیں
تو نے دنیا سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر زیست کو تجھ سے ہی سمجھنا سیکھا
تو مرے ذہن میں مہکی کبھی پھولوں کی طرح
تو مری آنکھوں میں زندہ رہی خوابوں کی طرح
تو بنی زیست کی دوپہروں میں شاموں کی طرح

تیری قربت میری جنت تیری فرقت میرا پیغام اجل
تو مری ذات کی دلدل میں ابھرتی رہی بن بن کے کنول
تو نہ ہوتی تو میرا حال شکستہ ہوتا
کنج تنہائی کی دوزخ میں سلگتا رہتا
کبھی اپنوں کبھی بیگانوں سے لڑتا رہتا
تو نے مایوسی میں امید دلائی مجھ کو
شب تاریک میں لوری بھی سنائی مجھ کو
تیری آغوش سے ہمت کبھی جرأت پائی
تیرے پہلو سے محبت ہی محبت پائی
میرا آغاز ہے انجام ہے تو
میری محنت میرا انعام ہے تو
ایک رشتہ ہو تو میں اس سے تجھے یاد کروں
تجھ سے ہر گام پہ ہر موڑ پہ رشتے لاکھوں
تو مرا عکس بھی عکاس بھی آئینہ بھی
تو مری دوست بھی ہمراز بھی محبوبہ بھی

باقی رہی مستقبل کی بات تو کل کی کس کو خبر
وقت ہے بحر بیکراں خالد
ہر ملاقات اک جزیرہ ہے

ضمیمہ

1988 ۔ میں ''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' کے پہلے ایڈیشن کے لئے خالد سہیل نے اپنا یہ اعتراف نامۂ عشق تحریر کیا تھا۔ اس کے چند سال بعد خالد سہیل نے پاکستان کی ایک تمیز اداکارہ ارنیٰ غزل سے عشقیہ شادی کر لی۔ لیکن جلد ہی وہ رشتۂ ازدواج منقطع ہو گیا۔ ادیبوں کی حیات معاشقہ کے اس دوسرے ایڈیشن کے لئے خالد سہیل نے اپنے اُس رشتے اور اُس کے بعد کی سرگذشت لکھنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن وہ لکھ نہیں پائے۔ اس کا سبب ارنیٰ سے کیا ہوا وعدہ تھا کہ وہ اس تعلق کے بارے میں کچھ نہ لکھیں گے۔ البتہ اپنی چند مختصر نظموں میں اپنے اس تجربے کو انہوں نے بیان کیا ہے۔ مثلاً انشاء، نومبر دسمبر 2012 ۔ کے شمارے میں ان کی دو نظمیں ''پہلا بوسہ'' اور ''نامکمل خط'' اُسی حزنیہ تجربے کی جانب اشارہ کرتی ہیں اور انشاء کے 2013 ۔ کے عید نمبر میں ان کی مختصر نظمیں ''انکشاف''۔ ''تھوڑا فاصلہ''۔ ''جدائی کی پانچویں سالگرہ پر'' اور ''پیار'' جیسی نظمیں بھی غالباً اسی واردات قلبی کا احساس دلاتی ہیں۔

علاوہ ازیں بے ٹی ڈیوس سے متعارف کرانے کے لئے انہوں نے مئی 2010 ۔ میں مجھے ایک ای میل بغرض اشاعت روانہ کیا تھا جو جناب ظہیر انور کے نام ایک خط کی شکل میں تھا۔ وہ کنفیشن ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

(ف۔س۔اعجاز)

میری سہیلی بے ٹی ڈیوس Bette Davis

ڈیئر ظہیر انور!

تم نے بے ٹی ڈیوس کے بارے میں پوچھا ہے تو عرض ہے کہ میں نے ماہنامہ انشاء کی سلور جبلی کے پروگرام میں ہندوستان آنے کا پروگرام بنایا تھا تاکہ تم بے ٹی ڈیوس سے مل سکو لیکن ویزا نہ ملنے کی وجہ سے مجھے وہ پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔

بے ٹی ڈیوس میری دوست بھی ہے رفیق کار بھی ہے اور محبوبہ بھی۔ بے ٹی ڈیوس سے اپنی دوستی، اپنی محبت اور اپنے خصوصی تعلق کی چند یادیں اور چند جھلکیاں تمہیں سناتا ہوں تاکہ تمہیں میری زندگی میں آئی ہوئی اس دل پذیر عورت کی شخصیت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

مجھے بے ٹی ڈیوس سے پہلی ملاقات آج بھی یاد ہے۔ وہ جمعے کی شام تھی۔ وہ اپنے جسم پر لمبی سفید اسکرٹ اور چہرے پر حسین دلفریب مسکراہٹ

پہنے ہوئے تھی۔ میری ایک رفیق کار نے میرا اس سے تعارف کرایا تھا اس شام پارٹی میں ہم دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے اور ایک دوسرے کے کانوں میں رس گھولتے رہے تھے۔ پہلی ملاقات میں ہی بے ٹی ڈیوس کی خوش مزاجی، اس کے اخلاص، اس کی ذہانت، اس کی خوبصورتی اور اس کی اپنائیت نے میرا دل جیت لیا تھا۔ اس رات گھر آتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ضرور اس دلنشیں خوش شکل کو ڈیٹ (DATE) کرنا چاہیے۔

پیر کے دن جب میں ہسپتال گیا تو میں نے سوچا کہ میں اس ملاقات کا ذکر اپنے دوست گیری GARRY سے کروں جو ہمارے ہسپتال میں سائیکولوجسٹ کا کام کرتا تھا۔ میں گیری سے ملنے اس کے دفتر کی طرف بڑھا تو اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔ ملتے ہی مجھے کہنے لگا:

''تمہیں ایک خوشخبری سنانی ہے۔''

''وہ کیا۔''

''ہفتے کی شام کو میری ایک خوبصورت عورت سے ملاقات ہوئی ہے اور میں نے اسے ڈیٹ پر بلایا ہے۔''

''مبارک ہو......اور اس کا نام؟''

''بے ٹی ڈیوس۔''

مجھ پر تو جیسے منوں پانی گر گیا ہو۔ میرا جی تو چاہا کہ کہوں کہ تم اسے ہفتے کو ملے ہو اور میں جمعے کی شام کو اسی مہ جبیں سے مل چکا ہوں لیکن میں خاموش رہا۔

خوش قسمتی سے بے ٹی ڈیوس کا تبادلہ اس وارڈ میں ہو گیا جہاں میں کام کرتا تھا چنانچہ بے ٹی Garry کو ڈیٹ کرنے اور میرے ساتھ کام کرنے لگی۔ یہ 1978ء کی بات ہے۔

میں اور بے ٹی ڈیوس دونوں نفسیات کے طالب علم تھے ہم مل کر مریض دیکھتے اور اس کے بعد کیفی ٹیریا میں چائے پیتے اور انٹرویو پر تبادلۂ خیال کرنے چلے جاتے۔ اس طرح بے ٹی ڈیوس میری دوست بن گئی۔ اس کی شخصیت میں ایک مشرقی عنصر (EASTERN TOUCH) تھا جو مجھے بہت بھاتا تھا۔ بے ٹی سے ہر موضوع پر گفتگو ہو سکتی تھی چاہے وہ مذہب ہو یا سیاست، ادب ہو یا موسیقی۔

بے ٹی آج بھی میرے نئے دوستوں کو بتاتی ہے 'میں سہیل کو اس دور سے جانتی ہوں جب یہ نیا نیا کینیڈا آیا تھا اور کینیڈین رسم و رواج سے ناواقف تھا۔ وہ اپنے دوستوں کی طرح کینیڈین دوستوں سے بھی گلے ملتا تھا جس سے وہ پریشان ہو جاتے تھے۔ میں نے کئی پارٹیوں میں سہیل کو ایک کونے میں بیٹھا دیکھا تھا اور اس کے سامنے ایک لمبی قطار میں بیٹھی نوجوان عورتیں اپنی باری کا انتظار کر رہی ہوتی تھیں تاکہ وہ ان کا ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتائے۔ سہیل پامسٹری کا چکر چلا کر بہت سی عورتوں کو رام کر لیتا تھا۔ اگلے دن میں فون کرتی تو وہ مجھے بتاتا کہ اس نے ہاتھ دیکھتے ہوئے سوزن یا شیرن یا ڈیبی پر کو ڈیٹ پر بلایا ہے اور ہم دونوں ہنس دیتے۔ سہیل سے کینیڈین مرد یا تو حسد کرتے تھے یا اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔'

بے ٹی اور گیری کی ڈیٹنگ اس منزل تک پہنچی کہ انہوں نے شادی کر لی۔

میں نیوفن لینڈ میں نفسیات کی تعلیم مکمل کر کے نیو برنزوک اور پھر وھـــتبــی (Whitby) چلا آیا لیکن بے ٹی سے خطوط اور فون کا سلسلہ جاری رہا۔ میں جہاں بھی سیاحت کے لئے جاتا بے ٹی کو ایک کارڈ ضرور بھیجتا۔ مجھے چند سال پیشتر یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ بے ٹی نے میرے سارے کارڈ سنبھال کر رکھے تھے۔

ایک دن میں نے نیوفن لینڈ فون کیا تو گیری نے فون اٹھایا۔ حال پوچھنے کے بعد میں نے پوچھا 'کیا بے ٹی سے بات ہو سکتی ہے؟'

کہنے لگا 'کیا تمہیں خبر نہیں ملی؟'

'کیسی خبر؟'

'بے ٹی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس نے مجھے طلاق دے دی ہے'۔

'یہ تو بہت افسوس کی بات ہے'۔

میں نے دل میں سوچا کہ یہ تو خوشی کی بات ہے لیکن میں اسی طرح خاموش رہا جس طرح میں اُس دن خاموش رہا تھا جب گیری نے مجھے پہلی بار بتایا تھا کہ اس نے بے ٹی کو ڈیٹ پر بلایا ہے۔

گیری نے اتنا ضرور کیا کہ مجھے بے ٹی کا نیا فون نمبر دے دیا۔

میں ایک سال اپنے عزیز دوست ڈاکٹر نذیر، ان کی بیگم فاطمہ اور بچوں سونا اور عمر سے ملنے نیوفن لینڈ گیا تو بے ٹی سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ رومیناRomania سے تین ہفتے کی بچی ایڈرینا Adriana کو ایڈوپٹ Adopt کر کے لائی ہے۔ بے ٹی کو ماں بننے کا بڑا شوق تھا لیکن وہ خود ماں بننے میں تین دفعہ ناکام رہی تھی۔ اس لیے اس نے مامتا کے جذبے کو اس طرح پورا کیا تھا۔ اس طرح وہ خود بھی خوش ہو گئی اور ایک معصوم لاوارث بچی کو بھی سہارا مل گیا متاثر ہوا تھا۔

2000ء میں میں زندگی کے ایک ایسے دور سے گزرا جب مجھے احساس ہوا کہ مجھے اپنے عورتوں کے رشتے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ میں نے سوچا میں ان سے ملتا ہوں، کچھ عرصہ ڈیٹ کرتا ہوں اور پھر انہیں چھوڑ دیتا ہوں اور وہ دل برداشتہ ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ میں ایک سال کے رومانوی اعتکاف پر چلا گیا اور کسی عورت کو ڈیٹ date نہیں کیا۔ اس ایک سال میں مجھے احساس ہوا کہ میرے عورتوں سے رومانوی تعلقات اس لیے کامیاب اور پائدار نہیں ہوتے کیونکہ میں جن عورتوں کو ڈیٹ کرتا ہوں

......انہیں شادی کرنے کا شوق ہوتا ہے

......وہ ماں بننا چاہتی ہیں اور

......انہیں میرے دوستوں اور سہیلیوں سے حسد ہونے لگتا ہے۔

میں اس سال کے آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس دنیا میں صرف ایک ہی عورت ایسی ہے جس سے میرے رومانوی تعلقات کامیاب اور دیرپا ثابت ہو سکتے ہیں اور اس عورت کا نام بے ٹی ڈیوس ہے کیونکہ وہ شادی بھی

کر چکی ہے، ماں بھی بن چکی ہے اور میرے دوستوں اور سہیلیوں سے حسد بھی نہیں کرتی اور سب سے بڑی بات ایک تخلیقی ذہن بھی رکھتی ہے۔

چنانچہ دسمبر 2001ء میں میں نیوفن لینڈ گیا اور کرسس بے ٹی ڈیوس کے ساتھ گزاری۔ بے ٹی نے میرا تعارف ایڈرینا سے کروایا۔ وہ اس وقت گیارہ سال کی تھی۔ میں اس کے لئے ایک ٹیڈی بیر Teddy bear لے گیا تھا جسے پا کر وہ بہت خوش ہوئی۔

اس ملاقات کے بعد بے ٹی سے خط و کتابت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا اور میں نے اسے اپنی رفیق کار این Anne اور گریگ Greg کی شادی پر مئی 2002ء کو بلایا۔ اس ملاقات کے دوران میں نے پہلی دفعہ بے ٹی سے اپنی محبت کے جذبات کا اظہار کیا اور ایک مشترکہ مستقبل کا مشورہ پیش کیا۔

بے ٹی کہنے لگی 'میری بیٹی ابھی بارہ سال کی ہے میں سات سال بعد ٹورانٹو آسکوں گی لیکن جب محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں تو سات سال سے چھ سال، چھ سال سے پانچ سال اور پھر بے ٹی دو سال میں ہی وھٹبی آ گئی۔

میں نے بے ٹی کا اپنے پبلشر بل بیل فونٹین Bill Belfontaine سے تعارف کروایا اور پھر دو سالوں میں دو کتابیں Love, Sex and Marriage اور The Art of Working in Your Green Zone تخلیق کیں۔ جب Love, Sex and Marriage کا ہندی میں ترجمہ ہوا اور وہ ہندوستان میں چھپی تو میں نے بے ٹی سے کہا کہ تم ایک دن انڈیا کی Erica Jong بن جاؤ گی۔

شادی کے بعد این اپنے میاں کے ساتھ کنگسٹن kingston چلی گئی اور بے ٹی نے میرے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ پچھلے سات سالوں سے اب بے ٹی اپنی بیٹی کے ساتھ وھٹبی میں ہی رہتی ہے۔ مجھے اس کی دوستی اور محبت سے اخلاص کی خوشبو آتی ہے۔ ہمارا رشتہ غیر روایتی ہے۔ وہ میری بیوی اور منکوحہ ہونے کی بجائے دوست اور محبوبہ ہے۔ ہمارے نظریات مختلف ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے جذبات، خیالات اور نظریات کا احترام کرتے ہیں۔ میں خدا اور مذہب پر یقین نہیں رکھتا لیکن وہ روحانیت پر یقین رکھتی ہے۔ جب سی بی سی CBC نے دہریت Atheism پر فلم بنائی تو ہم دونوں کا انٹرویو لیا جس میں ہم نے بتایا کہ ہم ایک دوسرے کے نظریات بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہماری نگاہ میں ہمارے نظریات ہماری محبت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے۔

میرے ایک دوست نے بے ٹی سے پوچھا کہ تم سہیل کے دوستوں سے حسد کیوں نہیں کرتیں تو کہنے لگی کہ میں اس کی بیس سال سے دوست ہوں اور سات سال سے محبوبہ۔ جب میں اس کی دوست تھی تو اپنی دو بہنوں کے ساتھ آ کر اس کے پاس ایک دن رہی تھی کیونکہ جب میرے والد کا اچانک امریکہ میں کار کے حادثے کی وجہ سے انتقال ہوا تھا تو ہم نے ٹورانٹو میں ایک رات رکنا تھا۔ سہیل ہمیں ایرپورٹ سے لے کر بھی آیا تھا اور چھوڑ کر بھی آیا تھا۔ اگر وہ میرا دوست بن کر میرا خیال رکھتا تھا تو میں اسے اور دوستوں سے ملنے سے کیسے روک سکتی ہوں'۔

میں بے ٹی کو پیار سے 'چم چم' کہتا ہوں کیونکہ وہ میری پسندیدہ مٹھائی ہے اور وہ مجھے اپنائیت سے سہیلی Sohaili کہتی ہے جو سہیل اور سہیلی کا حسین امتزاج ہے۔

میں نے بے ٹی کے لیے بیسیوں نظمیں اور سینکڑوں خطوط لکھے ہیں۔

جب لوگ ہماری محبت کا راز پوچھتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ ہماری محبت میں

Friendship is the cake and romance is the icing.

ویسے بھی ہماری چاہت کی کہانی تیس برس کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔

ڈیئر ظمیر انور! مجھے پورا یقین ہے کہ تم بے ٹی ڈیوس سے مل کر بہت خوش ہو گے۔

تمہارا ہمزاد

خالد سہیل۔ مئی 2010ء

رابندر سنگیت بنگلہ سے رابندر سنگیت اردو میں ترجمہ: ف۔س۔اعجاز

بنگلہ مکھڑا: کاندالے تُمی مورے بھالو باشاری گھائے
نبیئر بیدوناتے پُلوک لاگے گائے

You make me cry with tenderness,
Even in deep pain I feel happiness.

تو نے ایسی اُلفت جتائی مجھ کو رُلا دیا

میرا غم گہرا، پر خوشی لگے
تیری اُلفت مجھ کو بھلی لگے
تیری چاہت کے سنگ دور دیس میں جا پہنچوں
میرے پاؤں چاہے دُکھ جائیں
بجے میرے من میں بانسری
بہے نینوں سے دھارا نیر کی
اس دکھ میں بے حد مٹھاس ہے، میرا سب کچھ تیرے پاس ہے
تو نے سب کچھ میرا چھین لیا، اب کچھ بھی کہاں میرے پاس ہے
میں پوری طرح تیرے بس میں ہوں
یہ کیسے وِچِش وِبس میں ہوں
آزاد نہ ہونا چاہے من، نہ جانے کیسا یہ بندھن
تو نے کس بندھن میں باندھ لیا!۔

ف ۔س ۔ اعجاز

قتیل شفائی کی مطربہ

''اک تو ہی دھنوان ہے گوری باقی سب کنگال''

عشق کے اصل اور نمائشی جذبوں کا ٹکراؤ۔ ایک کوئل کے کردار پر بحث

ہمارے ادب میں طوائف کو وہ مقام ملا ہے جو اسے سماج میں حاصل نہیں ہے۔ اور اگر افسانوں، کہانیوں اور ناولوں کے ذریعہ سماج نے طوائف کے دکھوں اور مجبوریوں پر دو آنسو بھی بہائے ہیں تو یہ کمال ان باضمیر ادیبوں کا ہے جنہوں نے اس عورت کو جسے عرف عام میں 'گری ہوئی عورت' کہا جاتا ہے ہمدردی کے قابل بنا دیا۔ اس ناتے طوائف کبھی کبھی ادیب کے تخلیقی سفر کی شریک بنی ہے اگرچہ بیشتر حالات میں ادیب کے اس تخلیقی سفر کو ہم صرف اس کی زندگی کے ایک معرکے سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں تاہم طوائف کا موضوع آج بھی تجرباتی ہے۔ نہ صرف ادب اور ادیب کے لئے بلکہ سارے معاشرے اور سماج کے لئے بھی۔ کیونکہ طوائف کا وجود شرافت کے ٹکسالی اور تسلیم کردہ حدود سے باہر سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جو مرد طوائف سے کسی قسم کا تعلق رکھتے ہیں وہ بھی اپنے اس ربط پر ظاہر کا پردہ ڈالے رکھنا ضروری سمجھتے ہیں اور اپنے کسی عزیز کو یہی نیک ہدایت کرتے ہیں کہ دیکھو اس برائی سے بچتے رہنا۔ لیکن خوش نصیبی سے ہمارے بعض ادیبوں نے آگہی کے فریضے سے پہلو تہی نہیں کی ہے اور لوگوں کو صرف آدھی سچائی نہیں دکھائی ہے۔ بلکہ جرأت اظہار سے کام لے کر ان عوامل کو بے نقاب کیا ہے جو عورت کے جنسی اور معاشی استحصال کے پیچھے مردوں کے زیر اثر چلنے والی سوسائٹی میں پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں جو ادیب اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے ان میں بھگوتی چرن ورما، ہادی حسن رسوا، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی اور علیم مسرور وغیرہ کے نام زیادہ اہم ہیں۔ چند شاعروں کے نام بھی لئے جا سکتے ہیں جن میں سر فہرست ساحر لدھیانوی کا نام ہے۔ ان میں سے کئی ادیب تو ایسے ہیں جو فنی تجربہ و مشاہدہ کی غرض سے چکلوں اور طوائف خانوں میں زندگی کو بہت قریب سے دیکھ کر آئے۔ اور شاید اس کے سبب یہ لوگ اس مسئلے کی انسانی اساس دریافت کر سکے جس کے نتیجے میں یہ طوائف یا گری ہوئی عورت کی کردار سازی میں حقیقت نگاری کی منزل تک پہنچ گئے اور اسے اپنے موضوع کے طور پر دنیا کے لئے عام universal اور قابل قبول بنانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ترقی پسند ادیبوں کا زندگی کے لئے ایک عملی Approach اپروچ تھا۔

ادیب اللہ کا نیک بندہ ہو یا نہ ہو مگر اللہ کا بندہ وہ بھی ہوتا ہے۔

پیغمبروں کے برعکس اس کا زور اس جانب ہوتا ہے کہ زندگی کے لئے تجربے کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی عبادت کی۔ یہاں اس بات سے ہرگز سیاہ کو سفید کہنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ گفتگو تجزیہ کے پہلو سے کی جارہی ہے۔ جن چند ادیبوں اور شاعروں کے نام ہم نے لئے ان کے ذاتی کردار کیسے تھے یہ ایک الگ بات ہے جس سے یہاں کوئی بحث نہیں ہے۔ ہمیں ان کے اس بڑے مقصد سے سروکار ہے جس کے تحت انہوں نے ایک عظیم افسانوی اور شعری ادب کی تخلیق کی جسے زبردست سماجی اخلاقی تائید حاصل ہوئی۔ ساتھ ہی اس حقیقت کی طرف بھی ہماری توجہ ہوتی ہے کہ اگرچہ ان ادیبوں نے طوائف سے ہمدردی کی اور اسے معاشرے کے لئے فنی نقطۂ نگاہ سے قابل ہمدردی بنا دیا لیکن ان میں سے کسی نے خود نہ تو گری ہوئی عورت کی کفالت کی اور نہ کوئی کسی ایسی عورت سے عشق کے دھاگوں میں بندھا۔ چنانچہ اگر کوئی فرد الزام لگائے کہ ان ادیبوں نے اپنے ادب میں طوائف سے صرف ماڈلنگ کا کام لیا ہے تو اس تہمت میں تھوڑی سی معقولیت ضرور ملے گی۔ لیکن اس الزام کو تسلیم کر لینے سے ان ادیبوں کا قد اور بڑھ جائے گا۔ اور یہ ثابت ہوگا کہ یہ اپنے مقصد کے تئیں کتنے سنجیدہ تھے، موضوع سے کبھی ہٹتے نہیں تھے اور نہ راہ سے بے راہ ہوتے تھے۔ انہوں نے جنس پر لکھا مگر جنس سے مغلوب نہیں ہوئے۔ بایں ہمہ اگر کوئی ادیب یا شاعر کسی چکلے یا کوٹھے پر موضوع کی تلاش میں گیا ہو۔ اور وہاں کسی کو دل دے بیٹھا ہو جس کے اعتراف کی اس میں جرأت نہ رہی ہو تو وہ ضرور ایک عام آدمی کی سی مجبوریوں اور مصلحتوں میں گھرا ہوگا۔ لیکن معاصر فنکاروں میں قتیل شفائی ایک ایسی ہستی کا نام ہے جس نے طوائف کے ساتھ نہ صرف اپنے روابط کا اعتراف کیا ہے۔ بلکہ اعتراف سے آگے بڑھ کر ایک طوائف کے ساتھ اپنی حیات معاشقہ کو اپنا شعری سرمایہ بنایا ہے۔ اگرچہ بعد کو طوائف کی رعایت سے انہوں نے اپنی حیات معاشقہ کو حیات آوارگی کا نام دے ڈالا۔ کیوں کہ اگلی اس داستان میں عاشق کا اصل جذبہ طوائف کے نمائشی جذبہ سے متصادم ہے۔

قتیل شفائی جن کا اصل نام اورنگ زیب خان ہے ۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہری پور ہزارہ (سرحد) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں قتیل تخلص خود تجویز کیا اور اپنے استاد گرامی حضرت شفا کی نسبت سے شفائی کا لفظ بڑھا دیا۔ ابتدا میں حضرت شفا اور بعد میں حضرت احمد ندیم قاسمی کو اپنا فنی استاد تسلیم کیا۔ قتیل شفائی کی شاعری کا محرک بعض فطری شاعروں کی طرح قدرت کا ودیعت کیا ہوا ذوق اور ان کے آس پاس کے حالات بنے۔ ان کی پہلی ادبی تخلیق ۱۹۳۴ء میں رقم ہوئی جب وہ اسکول میں بزم ادب کے سکریٹری تھے۔ ان کی شادی ۱۹۳۶ء میں بمقام ہری پور ہزارہ ہوئی جو ان کی بیوہ والدہ کی مرضی اور صوابدید سے ہوئی۔ پانچ کامیاب شعری مجموعوں کے بعد ان کا مجموعۂ منظومات ''مطربہ'' ۱۹۶۴ء میں منظر عام پر آیا جسے پاکستان رائٹرز گلڈ کا ''آدم جی ادبی انعام'' ملا۔ یہ وہ انعام ہے جس کے مصنفین میں پاکستان بھر کے منتخب اسکالر شامل ہوتے ہیں۔

''مطربہ'' جس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں کے پیش لفظ'' یہ

نظمیں'' میں شاعر رقمطراز ہے: ''مطربہ'' میری ان تخلیقات کے مجموعے کا نام
ہے جو میں نے اپنی حیاتِ آوارگی کے دوران کہیں۔ اگر میں یہ نظمیں نہ کہتا تو
اپنے فن سے شدید بددیانتی کا مرتکب ہوتا۔

''طوائف کا موضوع نیا نہیں۔ دمودر گپت کی تصنیف سے لے کر
میری ان نظموں تک ہزاروں سال کا فاصلہ ہے۔ لیکن پرانی اور نئی طوائف میں
کوٹھے اور کوٹھی کے سوا اور کوئی بعد نہیں۔ وہی تماشبین پر مرمٹنے کا ڈھونگ وہی
نائکہ کا مصنوعی جلال، وہی ماہانہ خرچے اور فرمائشیں۔ جو کچھ کل تھا وہی آج بھی
ہے۔ اس لئے میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ میں نے کسی اچھوتی چیز کو ہاتھ لگایا
ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ صرف میں ہی کہہ سکتا تھا
کیوں کہ میں نے یہ سب کچھ تماشائی بن کے نہیں بلکہ تماشا بن کے حاصل کیا
ہے۔ اور یہ میرا کمال ہے کہ میں نے ان لمحوں میں بھی ''تجربہ نگاری'' سے
غفلت نہیں برتی جب ایک مشاق طوائف کا مصنوعی پیار انسان کی سوچ کو اندھا
کردیتا ہے۔ یہ وضاحت اس لئے ہے کہ ''لیلیٰ کے خطوط'' جیسی تجربے اور
مشاہدے سے خالی رومینٹک کتابیں پڑھ پڑھ کر گمراہ ہوجانے والے اذہان
کہیں میری ان نظموں کو کسی انتقامی جذبے کی پیداوار نہ سمجھ بیٹھیں۔ ایسی بہت
کم نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں جو طوفان گزر جانے کے بعد قلمبند ہوئیں۔

''میں جانتا ہوں کہ بڑے بڑے انشا پرداز طوائف کے بارے میں
لکھ لکھ کر ہار گئے پھر بھی یہ جنس بازار میں موجود رہی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ
جب تک کوئی نیا معاشی نظام نہیں آجاتا تب تک نغموں کی اوٹ میں جسم بکتے ہی
رہیں گے۔ اس کے باوجود میں اپنی یہ نظمیں پیش کررہا ہوں اصلاح معاشرہ کی
غرض سے نہیں بلکہ اچھے ادب کے طور پر''۔

اس پیش لفظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بےباکی کا عنصر قتیل شفائی کی
شاعری میں ابتدا ہی سے ہے اور اس بےباکی میں چھپا ہوا طنز کا نشتر خود شاعر
کے لئے بھی محسوس کن ہے اور 'مطربہ' کی نظمیں بتاتی ہیں کہ نشتر نہ صرف شاعر
کے اپنے اعمال کے آپریشن کے کام آیا بلکہ کبھی کبھی اوروں کی جراحت میں
بھی لگا۔

قتیل شفائی نے پہلا عشق جس کے بارے میں ہمیں خبر ہے کہ وہ اپنا
آخری عشق بھی بتاتے ہیں کسی مطربہ سے نہیں بلکہ ایک نہایت باذوق اور سلجھی
ہوئی خاتون سے کیا جس نے ان کے لئے اپنا مذہب بھی چھوڑا اور وطن بھی۔
لیکن وہ اس کے لئے اپنی بیوی اور بچوں کو نہ چھوڑ سکے۔ اس لئے کہ یہ میاں
بیوی کے درمیان طے شدہ معاہدے کی خلاف ورزی تھا۔ اس طرح وہ عشق
قتیل شفائی پر غموں کا ایک پہاڑ چھوڑ کر کسی رقیب کے گھر میں پناہ گزیں ہوگیا۔
قتیل شفائی کا دوسرا عشق ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کا ہے جو ۲۹ نظموں اور
ایک غزل کی صورت میں منظوم ہوکر 'مطربہ' کے عنوان سے پیش ہوا۔ لیکن
شاعر نے اس عشق کو عشق ماننے سے انکار کیا ہے جس کا ثبوت پیش لفظ کا یہ پہلا
ہی جملہ ہے:

''مطربہ'' میری ان تخلیقات کے مجموعے کا نام ہے جو میں نے اپنی
حیاتِ آوارگی کے دوران کہیں''۔ لیکن ''نظم بھول'' سے اس اقتباس کو دیکھئے:

لاکھ سمجھاتے رہے شیشہ و پیمانہ مجھے
میں بہر حال ترے پیار کا دم بھرتا ہوں
غور سے دیکھتی ہے جرأت رندانہ مجھے
کیسے آیا مجھے مستقبل زریں کا خیال
یاد تھا جب ترے ماضی کا بھی افسانہ مجھے
آج کچھ ہوش میں آیا ہوں تو میں سوچتا ہوں
اب تو دیوانہ بھی کہہ سکتا دیوانہ مجھے

شاعر نے جب تک 'مطربہ' سے ربط برقرار رکھا اس تعلق کو عشق ہی سمجھتا رہا اسے دیوانگی ہی قرار دیتا رہا۔ طوائف کے پیار کا دم بھرتا رہا لیکن جب پیش لفظ لکھنے بیٹھا تو اس نے آوارگی اور عشق کے بیچ ایک خط فاصل کھینچ ڈالا۔ ممکن ہے طوائف محبوبہ سے تعلق کو خود آوارگی اور بدچلنی کا نام دے کر شاعر نے اپنے سماج اور متعلقین میں اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کی دانشورانہ سعی کی ہو، جسے عیاری اور مصلحت کوشی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ قتیل شفائی جیسے جہاں دیدہ آدمی کو خوب معلوم ہے کہ آوارگی میں اگر تھوڑا سا سنجیدہ ہو لیا جائے تو وہاں سے عشق کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ چہ جائیکہ اس کی منزل ایک بہت بڑے آتشکدے پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ ایک طرف فن کار کا مخلصانہ اعتراف' دوسری طرف کھلاڑی کا سا شاطرانہ انداز۔ ۳۸ سال کے تھے تو حضرت مطربہ کے پلے سے بندھے۔ اس سن میں تو آدمی آوارگی کو چھوڑنے کی سوچنا شروع کرتا ہے اور انہوں نے آوارگی میں قدم رکھنا شروع کیا۔ غالباً ماوزے تنگ کے اس فلسفے نے انہیں متاثر کیا ہوگا کہ زندگی ۴۰ کی عمر سے شروع ہوتی ہے! بہر حال اس عمر میں آدمی عشق یا آوارگی جو کرتا ہے سنجیدگی سے ہی کرتا ہے۔ کیونکہ اس سن میں شعور پختگی کو پہنچ چکا ہوتا ہے۔ جس کا ثبوت شاعر کا کلام 'مطربہ' ہے۔ لوگوں کا عشق سزا یافتہ ہوتا ہے جبکہ قتیل کی آوارگی آدم جی پرائز یافتہ ہے۔ اس لئے قتیل شفائی کے اس عشق آوارہ کا مطالعہ ان کی نسبت مطربہ کے لحاظ سے کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قتیل شفائی کی ''مطربہ'' اگرچہ اسی بازار سے تعلق رکھتی تھی جس کے ذکر سے ادب بھرا پڑا ہے۔ لیکن ان کی ملاقات اپنی مطربہ سے اس بازار میں نہیں ہوئی بلکہ اسٹوڈیو کے ماحول میں تعارف ہوا۔ اور اس کے بعد یہ تعارف قربتوں میں تبدیل ہوتا گیا کیوں کہ مطربہ کے لئے فلم کی شاعری زیادہ تر خود قتیل شفائی کے ذمہ تھی۔ اس بات کو یہیں صاف کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 'مطربہ' سے وابستگی کو بعض لوگ شاعر کا پبلسٹی اسکینڈل بتاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب مطربہ قتیل کی زندگی میں ''شامل'' ہوئی تو اس وقت ان کی اپنی شہرت نصف النہار پر تھی اور انہیں کسی ''موضوعاتی سہارے'' کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ شاعر نے اس تجربہ کے بعد یہ کہا۔

وہ کتنا خودغرض تھا کہ جو میرے نام سے
مشہور خود ہوا مجھے رسوائی دے گیا

اس تعلق کی شروعات کا قصہ بموجب نظم 'ساتولی سی اک عورت' یہ

ہے کہ مردوں جیسے نام والی ایک سانولی سی عورت عصمت کی منڈی اور جسم کے بازار سے فن گائیکی میں خاصا کمال حاصل کر کے شریفوں کی سوسائٹی میں بسنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور اب اس کے روابط چند لوگوں تک محدود رہ گئے۔ جن میں شاعر قتیل شفائی کی حیثیت سب سے جدا تھی اور کئی معاملات میں برتر بھی۔ ایسا نہیں ہے کہ شاعر صرف مطربہ کی سانولی رنگت ابھرے کھلتے سرخ گلاب جیسے لبوں اور چکور جیسی چال پر فدا تھا اور یہ بھی نہیں ہے کہ مطربہ کو شاعر سے زر کفالت کا خاص آسرا تھا۔ جس کے لئے اس نے ایک دنیا کو چھوڑ کر اسے اپنا میت بنا لیا۔

دونوں کی طبیعتوں کا نقطۂ اتصال نہ ایک کا حسن تھا اور نہ دوسرے کی دولت بلکہ سرخوشی اور محبت، وصال اور ہجر کے وہ نغمات تھے جنہیں شاعر فطرت کی ودیعت سے تخلیق کرتا تھا اور مطربہ ڈوب کر گاتی تھی۔ اور یہ تسکین جنسی تسکین سے الگ ایک مقام رکھتی تھی۔ اس اتفاق عشق کو آوارگی سے تعبیر کیا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمیں فنی تسکین اور شعر وصدا کے اس ملاپ کو یکسر نظر انداز کرنا پڑے گا۔ اور اس معاملت کو شاعر اور مطربہ کے بجائے وھنامل اور بائی جی کے کرداروں کی سطح پر لانا پڑے گا۔ جہاں آوارگی کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے یا فیصلہ صادر کرنے کے لئے صرف سیٹھ وھنامل کو بائی جی کے کوٹھے پر چڑھتے یا اس سے نکلتے دیکھ لینا ہی کافی ہوتا ہے۔ باقی روابط سے پردہ یہ دیکھنے والے کی چشم فہم خود اٹھا دے گی۔ لہٰذا قتیل اور مطربہ کے تعلق میں ایک چیز عام اور مشہور بات سے الگ بھی ہے جسے اپنے پیش لفظ میں شاعر نے تحریر نہیں کیا ہے اور وہ چیز یہی آسودگی اور فنی تسکین کا جذبہ ہے جس کی خاطر اس نے ایک ڈیرے دارنی کی قربت کو تین سال تک اپنے سینے سے چمٹائے رکھا۔ اور بعد میں ان دو جملوں کے ساتھ اپنی مطربہ کو لوگوں کے ہاتھوں میں تھما دیا:

''——— یہ نظمیں کچھ عرصہ پہلے میرے جذبات کی ملکیت تھیں لیکن اب یہ میرے فن کی امانت ہیں۔ جو میں اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا رہا ہوں''۔

یہ قابل توجہ ہے کہ فن کار اپنی آسودگی کے لمحات اور تسکین کے نقطۂ حصول کو ایک محترم شئے object جانتے ہیں۔ اگرچہ عموماً انہیں اس بات کا اعلان نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن قتیل شفائی نے اپنے پیش لفظ میں کہیں بھی اپنی مطربہ کی نظموں سے حرمت و آبرو کو وابستہ نہیں کیا۔ غالباً اس سرگشتگی سے چھٹکارا پا لینے کے بعد شاعر نے اپنی تجرباتی نظموں کو قارئین کے آگے طوائف کی سی مشاقی اور بے باکی کے ساتھ پیش کر دیا۔ اور ان سے واہ واہ اسی طرح چاہی جس ادا سے ایک بجرہ باز رقاصہ تماشبیوں کو نئے توڑے اور نئے گیت پیش کرتی ہے (کیوں نہ ہو شاعر نے ایک عرصہ مطربہ کی صحبت جو اٹھائی ہے!) حالانکہ عرصۂ آوارگی (شاعر نہیں چاہتا کہ اس ربط کو معاشقہ کہا جائے) میں ایک عید ایسی بھی آئی تھی جب حضرت قتیل حرمت فن کی پاسداری کرتے تھے نہ صرف اپنے گیتوں کے تئیں بلکہ مغنیہ کی گائیکی کے فن کیلئے بھی۔ ملاحظہ ہو۔

میں نے بخشا ہے ترے نغموں کو
آبرو مند مغنی کا غرور
میں نے بیدار کیا دل میں ترے
حرمتِ فن کی بلندی کا شعور

نظم: ''نیا چاند، نئی عید''

ایسا لگتا ہے اس واردات آوارگی میں کوئی موڑ ایسا ضرور آیا جب فن کار کی انا مجروح اور اس کے گیت رد ہوئے۔ یا خود شاعر نے اپنے گیتوں کو پسپا ہوتے دیکھا۔ مطربہ کی نظمیں ان اشارات سے خالی نہیں ہیں۔

اگرچہ قتیل شفائی کی اس واردات میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے تاہم یہ تجربات ایک شاعر پر گزرے ہیں اور اپنی مطربہ کو انہوں نے بقول خود ''تماشائی بن کے نہیں بلکہ تماشا بن کے حاصل کیا ہے''۔ اس طرح تماشا اور تماشائی دونوں کو سمجھنا دلچسپی کا سامان ہوگا۔

شاعر اپنے دور اور لوگوں کا جذباتی ترجمان ہوتا ہے جو حالات اور فکر و جمالیات کی آگ میں جل کر اپنے فن کی پرورش کرتا ہے۔ اس کا طریقۂ اظہار اور قدرتِ بیان اسے عام آدمیوں نیز دیگر شعرا سے مختلف شناخت اور اعتبار دلاتے ہیں۔ کوئی شاعر سماج کے تغیرات نیز جنس و جمالیات کے بارے میں اپنے تجربات کی روشنی میں دوسروں سے مختلف نظریات رکھ سکتا ہے جن کی تکمیل اس کی آسودگی اور عدم تکمیل اس کی شکستگی کا سبب ہوتی ہے۔ خلاصۂ وہ اپنے نظریات کی تکمیل اور عدم تکمیل کو انا کا مسئلہ جان کر اپنا بھرم اور اعتبار برقرار رکھتا ہے۔ ایسا عموماً ہوتا ہے۔ اس لئے شاعر کے کردار میں عام لوگوں کو اس قدر دلچسپی نہیں ہوتی جتنی اس کے خیالات و نظریات میں ہوتی ہے۔

دوسری طرف طوائف کا تعلق ایک ایسے ادارے سے ہے جو سماج کی نظر میں ذلیل ہے۔ اس کے باوجود سماج کے مرد دولت کی مدد سے اپنی حرص و ہوس کی آگ طوائف سے بجھاتے ہیں۔ مطربہ کا سرمایہ اس کا حسن، اس کی گائیکی کی کلا ہے۔ طوائف کا حسن ایک جنسی تربیت کا حامل ہوتا ہے اور عام عورت کا حسن بے نیازی سے کھلے ہوئے لالۂ صحرائی سے مطابقت رکھتا ہے۔ ایک سراسر اداکاری کے ضمن میں شمار کیا جا سکتا ہے اور دوسرا بناوٹ سے بے نیاز۔ جس طرح ابنائے جنس میں حسن کے پیمانے الگ ہیں اسی طرح عشق کا معیار بھی جدا ہو سکتا ہے۔ عورت اور طوائف کے عشق اگرچہ دونوں اپنی جگہ عشق ہی ہوتے ہیں لیکن طوائف کے عشق میں بے وفا عام طور پر طوائف ہوتی ہے اور عام عورت کے عشق میں بے وفا عام طور پر مرد ہوتا ہے (لیکن کہیں کہیں اگر یہ کلیہ قائم نہ رہ سکے تو اسے قدرت کا کرشمہ سمجھ لینا چاہئے) طوائف کو اس سے تسکین حاصل ہو نہ ہو مگر وہ اپنے تربیت یافتہ حسن کو مادی ترازو میں تولنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس کے پیشے کی مجبوریاں اس پر حاوی ہوتی ہیں۔ ''عمر پوشی'' عورت کی کمزوری بتائی جاتی ہے مگر طوائف کے لئے یہ ازحد ضروری ہے کہ وہ حقیقی عمر میں اپنی اصل عمر بتانے سے انکار کر دے۔ چنانچہ ہمارا شاعر قتیل شفائی اپنی نظم ''عمر پوشی'' میں کہتا ہے۔

''اس بازار کا جو کوٹھا ہے اس کی ریت نرالی ہے
یہاں تو ماں کو ماں کہہ دینا سب سے گندی گالی ہے''

شاعر نے تماشائی بن کر یہ بھی دیکھا۔

''ممتا کے ہونٹوں پر جب چاندی کی مہریں لگتی ہیں
ماں خود اپنی بیٹی کو کر دیتی ہے قربان یہاں''

نظم: ''چکلے''

اور اس چکلے کے ماحول میں ایک دن شاعر نے اپنی بھڑاس یوں نکالی:

ایک سے ایک بڑھ کر ترے شہر میں پیچتی عصمتوں کا خریدار ہے
کوئی ان میں پرستار چشم و لب، کوئی دیوانۂ زلف و رخسار ہے
تیرے ناموس فن سے انہیں کیا غرض جن کی نظروں میں تو جنس بازار ہے
سب کے مانند تجھ کو بھی معلوم ہے یہ لٹاتے ہیں کیوں سیم و زر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہوئی سو ہوئی روح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!

نظم: ''مطربہ''

یہی وہ نظم ہے جو شاعر کے تلخ تجربوں کا اظہار ہے۔ اس میں وہ مشاہدات ہیں جو شاعر کے ضمیر کو کچوکے لگاتے ہیں۔ اور اہل سیم و زر کے ہاتھوں حسن کے استحصال کے خلاف اس کی آواز کو اونچا اٹھانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ نظم شاعر نے اپنی 'مطربہ' کے گانے کے لئے نہیں کہی بلکہ اس کی خود اختیاریت کا نمونہ اور بے بسی و مفلسی کا اعتراف ہے۔ یہی نظم مطربہ کے تجربات و کردار کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

ان حالات میں جب شاعر کو اپنی اوقات کا ثبوت دینا نیز اپنے مطمح نظر کو واضح کرنا ضروری ہو گیا تو اس نے کہا:

مجھے خبر ہے کہ میں وہ رئیس شہر نہیں
کہ جس کی جیب میں ذلت کھنکتی رہتی ہے
وہ جس کے حجلۂ عشرت کی بے طلب اولاد
خود اپنے باپ کے دل میں کھٹکتی رہتی ہے
وہ جس کی دولت و ثروت غلیظ کوٹھوں پر
خبیث روحوں کی صورت بھٹکتی رہتی ہے

اگر میں ایسا ہی ہوتا کوئی رئیس تو پھر

....

تجھے میں اپنی نظر سے گرا بھی سکتا تھا
تری نظر میں جو ہوتا نہ خواب مستقبل
تو میں وفا کو تماشہ بنا بھی سکتا تھا

نظم: اے مری جان طرب

مطربہ کے پیشہ اور شاعر کے نظریۂ فن میں جب تصادم شباب پر پہنچا تو شاعر نے ایک نظم ''شعر اور موسیقی'' کہی جو یوں ہے:

(۱)

اک افسر اعلیٰ نے
''شاعر سے کہا صاحب!
یہ کام تو مشکل ہے
پر آپ برے گھر پر
قلقل کی صداؤں میں
آکر برے یاروں کو
بخشیں جو کلام اپنا
پھر آپ مجھے ہردم
پائیں گے غلام اپنا
اور شاعر آوارہ
اس شرطِ مروت کو
ٹھکرا کے چلا آیا

(۲)

اک افسر اعلیٰ نے
فرمایا طوائف سے
''یہ کام تو مشکل ہے
پر آپ برے گھر پر
آکر بری خلوت کو
بخشیں جو قیام اپنا
پھر آپ مجھے ہردم
پائیں گی غلام اپنا''
دل جھوم اٹھا اس کا
اس حکم رذالت پر
اور دل میں طوائف کے
گھنگھرو سے چھنک اٹھے
نظم: شعر اور موسیقی

اس پر مستزاد ''مطربہ'' کی یہ بے حسی۔

وہ حسن و دولت کے مندر میں
دیوی بن جانے کے بعد
پتھر کی دیوار تھی وہ (نظم: فنکار)

سچ تو یہ ہے کہ شاعر ''مطربہ'' کے تماشبیوں کے درمیان خود کو تماشا محسوس کرتا تھا۔ اگرچہ ''مطربہ'' کی نظموں سے شاعر کے اعتراف کا خلوص بہت زیادہ جھلکتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے مطربہ کو گری ہوئی عورت سمجھا تو خود کو بھی گرا ہوا آدمی قرار دیا (اور جب ان دونوں کو اس بات کا یقین آگیا تو انہوں نے اس سلسلے کو ختم کر دیا) تاہم شاعر مطربہ سے زیادہ اس کے تماشبیوں کے کردار کا شاکی تھا جن کی کوٹھے پر آمد اس کی معشوق کو مادی فوائد دونوں ہاتھ سے بٹورنے پر اکساتی اور مجبور کیے دیتی تھی۔ اور اسے نیک انسان بننے سے روکتی تھی۔ 'مطربہ' کے پاس آنے والے ہر بوالہوس کو دیکھ کر شاعر چوکنا اور سنجیدہ ہو جاتا ہے بلکہ سارے معاشرے کا اور سماج کے ٹھیکیداروں کا ناقد بن جاتا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے جس طرح 'چکلے' کی عورت کے لئے ہمدردی کے جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر للکارا تھا

''ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں''۔

اسی طرح قتیل شفائی بھی 'مطربہ' کے تماشبیوں کے ہوسناک کرداروں پر نکتہ چینی کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان کی نکتہ چینی کا بڑا مقصد اپنی معشوق کا تحفظ کر کے اپنے عشق کے لئے حسن کی گود میں پناہ ڈھونڈنا ہے۔ بہر حال اس کے پردے میں قتیل نے کوٹھے کے تماشبیوں کے کردار کا پوسٹ مارٹم کیا ضرور ہے۔ نظم ''تماشبین'' سے یہ اقتباس پڑھیے جس میں ایک بوالہوس تماشبین سے مخاطب ہے:

دیکھ میرے سامنے ہے وہ ترا جرم نہاں

جو عیاں کرتا رہے گا تیرے خد و خال کو
تو چھپا سکتا نہیں اب اپنے چہرے کے نقوش
مل گیا اک جسم اک پیکر ترے اعمال کو
اک نئے پیکر میں تو آیا ہے میرے سامنے

دیکھتا ہوں میں تجھے اس بھیڑیے کی شکل میں
جو کسی کی بھی نظر میں پیار کے قابل نہیں
بھول بیٹھا ہے جسے تو اپنے ماضی کی طرح
اس بھری دنیا میں جس کا کوئی مستقبل نہیں
تیری خوش ذوقی کا سرمایا ہے میرے سامنے

تیری خوش ذوقی کا سرمایا، یہ اک نورس کلی
کمسنی میں بھی ہے اس پر کتنے بھونروں کی نظر
جس طرح تو نے خریدا تھا کسی کے جسم کو
دے گا بولی اس کی بھی اک روز کوئی اہلِ زر
ایک بادل دور تک چھایا ہے میرے سامنے

یا ایک اور نظم کے یہ اقتباسات دیکھئے۔

دور تا حدِ نظر کوئی بھی اپنا تو نہیں
ایک پرچم کے تلے جمع ہیں سارے اغیار
مقصدِ جنگ یہاں سب کا جدا ہے لیکن
سب کے ہاتھوں میں چمکتی ہے سنہری تلوار

وسوسے دل میں لئے سوچ رہا ہے فاتح
کس طرح مملکتِ حسن رہے زیرِ نگیں
چند راتوں کی حکومت کا یہ بیکار غرور
تشنگی روح کی تسکین کا ضامن تو نہیں

اس سے پہلے بھی تو آئے ہیں کئی لوگ یہاں
حسن اور حسن کی سرکار پہ قابو پانے
فتح کے بعد بھی لیکن انہیں تسکیں نہ ملی
آخر کار تہِ تیغ ہوئے دیوانے

فاتحِ حسن کئی دن سے اسی سوچ میں ہے
اس کی بھی موت کا پیغام نہ آپہنچا ہو
کسی قارون کی دولت کے خزانوں کے عوض
اس کی تذلیل کا ہنگام نہ آپہنچا ہو

دو خبر مملکتِ حسن کے دربانوں کو
اب اجالوں کے بھی چہروں پہ سیاہی ہوگی
دفن ہو جائے گا یادوں میں پرانا فاتح
اب یہاں اور کسی اور کی شاہی ہوگی
(نظم: رزم شبستانِ طرب)

اسی طرح تماشیوں میں اہلِ سیم و زر کے علاوہ مذہب کے وہ ٹھیکیدار بھی شاعر کو نظر آتے ہیں جن کی داڑھیوں میں بقول کسے ہوس کے بے شمار پھندے پڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ریاکاروں اور ڈھونگیوں پر شاعر

یوں طنز کرتا ہے۔

مطربہ! اندھی عقیدت کا صنم خانہ ہے یہ
ذبح ہوتا ہے جہاں مذہب وہ کاشانہ ہے یہ
رات دن ایمان کی گردن پہ چلتی ہے چھری
تو یہاں پائے گی ہر قصاب کی نیت بری
بوٹیاں تک نوچ لینے کو سبھی تیار ہیں
جس قدر درویش ہیں اس بزم میں عیار ہیں

لوٹتے ہیں مال یہ جتنا خدا کے نام پر
سب لٹا دیتے ہیں آخر گیسوؤں کی شام پر
لیکن اب یہ گیسوؤں کی شام ڈھل جانے کو ہے
اک چھری ان کے کلیجے پر بھی چل جانے کو ہے
اب یہ محفل بن رہی ہے بزم ماتم رقص کر
رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھما چھم رقص کر

نظم: اوقاف ایکٹ

لیکن ان تماشیوں میں اگر قتیل کو کسی سے ہمدردی ہے تو اپنے رقیب سے جس کے لئے وہ اکثر ناصح اور رہبر مشفق کا سا لب ولہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ رقیب سے متعلق ایک حسن پرست شاعر کا ایسا مفاہمانہ اور دوستانہ رویہ اردو شاعری میں خال خال ہی نظر آئے گا جیسا قتیل نے اپنے رقیب سے روا رکھا ہے۔ عموماً رقیب کو "بوالہوس" اور "رقیب روسیاہ" "غیر" اور "دشمن" کے القاب سے نوازا گیا ہے لیکن قتیل شفائی کو "عرصۂ آوارگی" میں بھی اور اس کے بعد بھی اپنے رقیب سے ایک ہمدردی رہی۔ عملی زندگی میں دیکھا گیا ہے کہ ایک دل کا مریض دوسرے دل کے مریض سے جتنی ہمدردی رکھتا ہے اتنی شاید اس کا معالج بھی نہیں رکھتا۔ اسی طرح ایک ایسا شخص جو بے وفائی کے تجربے سے گزرا ہو ایک ایسے شخص سے ضرور ہمدردی کا اظہار کرے گا جو بیوفائی کی سولی پر چڑھتا نظر آ رہا ہو۔ اس لئے قتیل نے کہا ہے۔

لے میرے تجربوں سے سبق اے مرے رقیب
دو چار سال عمر میں تجھ سے بڑا ہوں میں

رقیب تو رقیب قتیل کی منظومات 'مطربہ' سے ظاہر ہوتا ہے کہ حرص و ہوس کے اس کھیل میں کئی ہاتھوں میں کھیلنے والی طوائف کو بھی وہ ابن الوقتوں، بوالہوسوں اور ریاکاروں سے زیادہ مطعون نہیں کرتے اور تلون مزاجی کے کھیل میں اپنے جرموں کا بھی اعتراف کر لیتے ہیں اور یہ وصف اردو شاعری میں قتیل کے علاوہ کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ اس اعتراف کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

وہ تیری بھی تو پہلی محبت نہ تھی قتیل
پھر کیا ہوا اگر کوئی ہرجائی بن گیا

یہ دو اشعار 'مطربہ' سے باہر کے تھے۔ 'مطربہ' میں بھی رقیب کے لئے ہمدردی کی گنجائش رکھنے والی چند منظومات شامل ہیں۔ مثلاً اس نظم کو دیکھیں۔

جانے تجھ پر کیا گزری ہے؟
آج تری چاہت سے جب انکار کیا ہے اُس نے
تیری وفا کو بھول کے مجھ سے پیار کیا ہے اُس نے
جانے تجھ پر کیا گزری ہے؟
جانے مجھ پر کیا گزری ہے؟
آج کا یہ افسانہ کل بھی جب دہرایا جائے گا
مجھ کو چھوڑ کے اور کسی سے پیار جتایا جائے گا
جانے مجھ پر کیا گزرے گی؟
جانے اُس پر کیا گزرے گی؟
تیرے میرے بعد بھی جس کے پیار کو وہ ٹھکرائے گی
جس کی لاش پہ رکھ کر پاؤں وہ آگے بڑھ جائے گی
جانے اُس پر کیا گزرے گی؟

نظم: منزل بہ منزل

یہ یا ایک اور نظم ''میری طرح'' جیسی نظمیں دراصل شاعر کی طرف سے اس بات کا اعلان ہیں کہ وہ اپنے رقیب سے عمر میں بڑا اور مطربہ کے تعلق میں پرانا ہے۔ چنانچہ اس کے تجربات و مشاہدات زیادہ وسیع، گہرے اور تہہ دار ہیں۔ اور اسی سبب سے رقیب کے لئے نصیحت آموز ہیں۔

آخرکار بیوی اور مطربہ کے کرداروں میں شاعر نے بیوی کی محبت کو ہی اپنا لیا۔ کیوں کہ بیوی کی محبت کا ایک عظیم کردار ہوتا ہے جس میں قربانی، تیاگ، سپردگی مذہبی درجے کی ہوتی ہے۔ گرچہ شمع خانہ اور شمع محفل سے بیک وقت جلنا قتیل کے لئے دوہری قیامت سے کم نہ تھا۔

ایک تو میرے لئے شمع بنی محفل میں
ایک چپ چاپ سُلگتی رہی دل ہی دل میں
جب نصیبوں پہ سیاہی چھائی
رات غموں کی آئی
مجھ پہ دونوں نے قیامت ڈھائی
ایک نے مجھ پہ ہنسایا ہے بھری محفل کو
ایک نے سوزِ ندامت دیا میرے دل کو

نظم: دوہری قیامت

اس طرح دل پر ایک داغِ ندامت لئے شاعر اپنی مطربہ کے بالا خانے سے یہ کہتا ہوا لوٹ آیا۔

تیرے اسلاف نے کھولی تھی جو نغموں کی دکاں
اس میں اک شاعرِ نادار کی توقیر کہاں
یہی بہتر ہے کہ خاموش رہے میری زباں
نہ تو ممتاز ہے تُو اور نہ میں شاہجہاں
پھر کوئی تاج محل کس کے لئے ——؟
میں لکھوں تازہ غزل کس کے لئے ——؟

نظم: کس کے لئے

شاعر کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ مطربہ اپنے حسن کے دلدادہ اور کلا کے پجاریوں کے درمیان نہ کسی عشق کی پاس داری کر سکتی ہے اور نہ اس محفل میں کسی عاشق کو بیٹھنے کی جگہ دے سکتی ہے۔ کیوں کہ اس سے اس کی دکانداری میں فرق واقع ہوتا ہے۔ یہ اخلاقی اور مادی ترجیحات کا مسئلہ ہے۔ اسی رخ سے قتیل شفائی نے اپنی 'کوئل مطربہ' کے کردار پر نکتہ چینی کی تھی۔

آموں کی حسیں رت کے سوا بھی تو وہ کوکے
لیکن کسی کوئل کا یہ کردار ہی کب تھا

مطربہ سے علیحدگی کے بعد قتیل کی شاعری کا یہ باب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ لیکن استحصالی عناصر کی کسی بھی طبقے میں نہیں ہے، یہ درست ہے کہ 'مطربہ' کی تخلیق ایک جنسی تجربے کے تحت ہوئی۔ اور اس میں انہوں نے جن استحصالی عناصر کو محسوس کیا، ان پر اپنے شعر کی بنیاد رکھی لیکن بعد میں انہوں نے دیکھا کہ استحصال زندگی کے ہر شعبے میں ہے۔ اس لئے انہوں نے زندگی کے ان گوشوں میں جھانکا جن سے ان کا جذباتی تعلق تو کوئی نہیں تھا لیکن معاشرہ ان کی زد میں آ رہا تھا۔ اور شاعر بھی اسی معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے جو زندگی کی تلخیوں، شیرینیوں، اچھائیوں اور برائیوں کے ذائقے چکھتا رہتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے معاشرے کا عکاس بن کے سامنے آتا ہے۔ گویا ان کی شاعری کے جس رویے نے شعور کی آنکھ کھولی وہ آگے چل کر بہت سی وسعتیں اختیار کر گیا۔ ایسی وسعتیں جن میں طوائف ایک چھوٹی سی اکائی دکھائی دینے لگتی ہے۔ تاہم طوائف سے رفاقت کے تجربات نے آگے چل کر قتیل شفائی کو شعور کے بہت سے افق دکھائے اور شاعری کو نغمگیت کا وہ رس پلایا جو شاید اس تجربے کے بغیر اسے کبھی حاصل نہ ہوتا۔ حالانکہ مطربہ کی نظمیں نیم کارس ہیں۔ مگر ان نظموں کے بعد قتیل کے شعروں میں اور گیتوں میں ایک البلا چھیلا انداز پیدا ہو گیا۔ جسے شاعری کے مروجہ اور ٹھیٹھ ترنم سے جدا کہنا چاہئے۔ مطربہ کے گھنگھروؤں کی چھنک لاشعوری طور سے قتیل شفائی کے بعض گیتوں میں اس طرح در آئی ہے کہ پنچ ادھاس جیسے کچھ مغنی اسے کیش کرتے پھر رہے ہیں۔

قتیل کی آپ بیتی صرف اس ریاضت پر مہر تصدیق ہے کہ ہر آن بدل جانے والی دنیا میں کسی چیز کا بھی بدل جانا غیر فطری نہیں ہے۔ تجربہ کوئی بھی ہو اسے آپ عشق کی تحلیل نفسی کا نام دیں یا آوارگی کا وہ کچھ دے کر اور کچھ لے کر جاتا ہے۔ تجربے میں فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی۔ شاعر نے مطربہ کی قربتوں میں ایک ایسے انسٹی ٹیوٹ کا قریب سے مطالعہ کیا جسے بہت کم تجزیاتی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اور بہت زیادہ اس کی رومانی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ قتیل نے جہاں اس تجربے میں 'مطربہ' جیسی ایک سچی اور کھری کتاب تخلیق کی وہاں ان پر کچھ ایسے انکشافات بھی ہوئے جن کی روشنی میں انہوں نے مطربہ کو ظالم محسوس کیا اور کبھی اپنے آپ کو۔ 'مطربہ' کا ظلم تو اپنے ہر وقتی ساتھی کے لئے تربیت کا ایک حصہ ہے۔ قتیل جیسے لوگوں کا ظلم ایک تخیلاتی نیکی کی آڑ میں اپنے بیوی بچوں پر اور اپنی آنے والی نسلوں پر ظلم ہے۔ بازگشت کے طور پر قتیل شفائی پر جب گزرا ہوا زمانہ کانوں میں گونجتا ہے تو تازہ ترین تجربات وحوادث اس زمانے کی سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ فن کار کے حال کا ماضی کے خیالوں سے سلسلہ کہیں نہ کہیں جڑ ضرور جاتا ہے۔ حتیٰ کہ داستان پارینہ کا از خود فن کار کے ذہن ودل کے دریچوں سے اس کے فن میں در آنا ناگزیر ہے۔ ●●

چندر کانتا کی جیت

قتیل شفائی کو عمر کے آخری برسوں میں رشمی سے محبت ہوگئی۔ رشمی بمبئی کے مشہور ماڈل فوٹوگرافر طیب بادشاہ کی بیوی تھیں۔ قتیل کی عمر کا آخری وقت تھا۔ رشمی اور قتیل کی محبت اپنی راہ چلتی رہی۔ طیب بادشاہ کسی مرض میں مبتلا رہ کر 2000ء میں چل بسے۔ سال بھر کے اندر قتیل شفائی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

رشمی شاعرہ تھیں۔ قتیل کی محبت نے انہیں پوری شاعرہ بنا دیا۔ رشمی کو احساس ہوا تو کہا۔

تو جو آیا میری غزلوں میں تو اندازہ ہوا
میں ہوں کیا اور مجھ کو کیا بن کر ابھرنا چاہئے

''رنگولی'' عنوان سے رشمی بادشاہ کا شعری مجموعہ 1997 میں لاہور سے شائع ہوا۔ یہاں رشمی کا لکھا ہوا ''رنگولی'' کا پیش لفظ اور اُس کے بعد ان کا مضمون ''چندر کانتا کی جیت'' میرے نام ان کے ایک مکتوب کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ قتیل کی یاد میں انشاء کا ایک وقیع گوشہ ستمبر اکتوبر 2001 میں شائع ہوا تھا۔ یہ صفحات اس میں شامل تھے۔

قتیل صاحب مجھے کتنا عزیز جانتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قتیل اور رشمی دونوں نے مجھے اور قارئین انشاء کو اپنے معاملات دل سے آگاہ رکھا۔ پیشتر قتیل شفائی کی داستان عشق میں نے ان کی شاعری میں تحقیق کے علاوہ ان سے زبانی اور تحریری انٹرویو کی بنیاد پر لکھی تھی جو ''قتیل شفائی کی معطر یہ'' کے عنوان سے اس جلد میں بھی پچھلے اوراق میں شامل ہے۔

ف۔س۔اعجاز

میں اور میری دو باتیں

شعری مجموعہ ''رنگولی'' (مطبوعہ ۱۹۹۷ء) کا پیش لفظ

شعری تخلیق میں ابھی تک میں نے کوئی منزل حاصل نہیں کی، کوئی مقام نہیں بنایا اس لئے میں اس معاملے میں کوئی بڑے بڑے دعوے کرنا مناسب نہیں سمجھتی، اور یہ بھی میرے لئے ممکن نہیں کہ اس فن کی اونچ نیچ یا صحیح غلط سے اپنے قارئین کو واقف کراؤں، میں اس کے بھی حق میں نہیں کہ میں خود تو ابھی سیکھ رہی ہوں اور تمام عمر جو چیز خود میں نہ سیکھ پاؤں اسے دوسروں کو سکھاؤں۔ غرض یہ کہ میں اب تک خود اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوں! مگر جو کچھ میں ہوں اس سے

ناواقف بھی نہیں، جو ہونا چاہئے اس سے بھی غافل نہیں۔ مجھے ایک بات کی خوشی بھی ہے جس کی وجہ سے مجھے اپنے آپ پر یقین رہا ہے وہ یہ کہ میں نے دنیا کو دیکھنے کے لئے بینائی تو ضرور اپنے بڑوں سے حاصل کی، مگر آنکھ اپنی ہی استعمال کی ہے، دکھایا ہوا دیکھا بھی تو ذہن کی آنکھیں استعمال کیں، میں نے ضمیر شعر گوئی میں دنیا اور روایات کی عام سوچوں کے ساتھ داخلہ نہیں لیا بلکہ میرے اپنے نظریہ خیال نے مجھے یہاں کی شہرت دلوائی ہے۔ میرا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ کوئی فن لاکھ خدا کی دین ہو، کسی کی رہنمائی کے بغیر اس میں کوئی نہ کوئی کمی باقی رہ جاتی ہے، نظریے لاکھ اپنے ہوں، وہ صحیح ہیں کہ غلط، اس سے واقف ہونا بھی ضروری ہے اور اس کے لئے رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ اپنے غلط نظریے بھی صحیح معلوم ہونے لگتے ہیں، اسی لئے کہ میں بھی اس خوش فہمی کی شکار نہ ہو جاؤں میں نے اپنے آپ سے ہمیشہ سختی برتی ہے اور اس سلسلے میں کوئی سمجھوتہ خود سے نہیں کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ میری راہنمائی اس دور کے اہم ترین شاعر قتیل شفائی نے کی ہے، جن کی عادت ہے کہ اگر دیکھیں گے کہ اڑان غلط راستے پہ ہے یا کسی خوش فہمی کا آسمان ناپ رہی ہے تو جھٹ سے ایک پل میں نیچے اتار دیں گے۔ تکلف میں آکے بھی غلط کو صحیح نہیں کہتے! کبھی کبھی تو مارے شرمندگی کے میرا چہرہ تمتما اٹھتا ہے مگر انہیں کون روکے؟ اور پھر میرا تو مسئلہ ہی الگ ہے، میں اس لئے ہوں کہ قتیل صاحب ہیں، یہ نہ ہوتے تو آج میں شاعرہ نہ ہوتی، قتیل نے مجھ میں سے شاعرہ ڈھونڈ ہی نہیں نکالی بلکہ قدم قدم پہ اسے سنبھالا بھی دیا ہے۔ میں نے پل پل غلطیاں کی ہیں، قتیل نے پل پل مجھ میں سدھار کیا ہے، مجھ میں عیب ہی عیب تھے مگر یہ قتیل ہی ہیں جنہوں نے مجھے سجایا سنوارا اور یہ سلسلہ آج بھی باقاعدگی سے چل رہا ہے میں بھول میں کرتی ہوں قتیل انہیں سدھار دیتے ہیں، میں نے اپنی زندگی میں اپنے علاوہ اگر کسی اور سے کچھ سیکھا ہے تو وہ قتیل ہیں، ان سے میں نے اتنا کچھ سیکھا جتنا سیکھنے کے لئے کسی کو ایک عمر کم پڑے۔ قتیل کی بات بات سے میں نے سیکھا ہے شاید خود انہیں یہ معلوم نہیں کہ جتنا انہوں نے مجھے بتایا اس کے علاوہ بھی بہت کچھ میں نے ان سے سیکھا ہے، کبھی کبھی جب یہ میری تعریف کرتے ہیں تو مجھے ہنسی آتی ہے کہ بے چارے اس بات سے بے خبر ہیں کہ جس چیز کی یہ تعریف کر رہے ہیں وہ میں نے انہیں سے سیکھی تھی! قتیل کا میری زندگی میں آنا ایک حسین اتفاق ہے شاید خدا نے میری قسمت میں شاعرہ ہونا لکھا تھا یا پھر قتیل میری قسمت بنانے آئے تھے یہ تو پتہ نہیں مگر یہ سچ ہے کہ قتیل کا میری زندگی میں آنا نہ ہوتا تو آج میں، میں نہ ہوتی۔ قتیل سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا تو شعر ہوتے تھے، ان سے لڑنے کو جی چاہے تو شعر ہوتے تھے اور ہوتے ہوتے آخرکار معلوم ہوا کہ میں شاعرہ تھی مگر خود کو جانتی نہ تھی۔ قتیل نے مجھ سے میرا تعارف کرایا، خود آسمان ہیں میرے فن کو پرواز بخش دی۔ ان کے سائے تلے میں بے تکان اڑ رہی ہوں لیکن جانتی ہوں کہ ان تک پہنچنا محال ہے۔ چاہتی ہوں کہ کبھی ان تک نہ پہنچ پاؤں مگر حسرت بھی رکھتی ہوں کہ انہیں پالوں کہ اگر حسرت بھی نہ رہی تو اڑان کا کوئی مطلب ہی نہ رہ جائے گا۔ حسرت نہ رہی تو تھک جاؤں گی، ہار جاؤں گی! ختم ہو جاؤں گی، خدا کرے میں جب تک جیتی رہوں تب تک قتیل میری رہنمائی کرتے رہیں اور میں اپنے آپ کو اس قابل بنا سکوں کہ قتیل مجھ پہ فخر کر سکیں، قتیل

میرے لئے اس قدر مکمل ہیں کہ اگر کوئی مجھ سے کچھ منوانا چاہے تو یہ نہ کہے کہ مذہب کیا کہتا ہے سماج کیا کہتا ہے صرف اتنا کہہ دے کہ قتیل نے یہ کہا ہے میں فوراً مان جاؤں گی۔ چاہے اس بات کو کائنات کا کوئی فرد مجھ سے نہ منوا سکے۔ قتیل نے ہمیشہ میری سوچ کا رخ پلٹ دیا ہے (اگر غلط ہو تو) اور مجھ سے وہ باتیں منوائی ہیں جو عام صورت حال میں کوئی بھی نہ مانے۔ غرض قتیل میرا کردار بن چکے ہیں، انہوں نے میری سوچ کو کسی کینوس میں مقید ہونے سے بچایا ہے، اور بھی نہ جانے کیا کیا انہوں نے مجھے دیا جسے لکھنا ممکن نہیں۔ مختصر یہ کہ میں شاعرہ ہوں کیوں کہ قتیل شفائی شاعر ہیں۔

آخر میں ایک اور شخص طیب بادشاہ جو میرے شوہر ہیں ان کا بھی شکریہ ادا کردوں کہ انہوں نے مجھے یہ جتا کے کبھی دبانے کی کوشش نہیں کی ہے کہ میں ''بیوی'' ہوں۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ کھل کر اپنی بات کہنے کا موقع دیا اور حوصلہ دیا، میرے جذبات کو ساتھ لے کر نہ چلے ہوں مگر میرے جذبات کو عزت بخشی ہے۔ میں نے قتیل کو قابلِ عبادت جانا۔ انہوں نے میری عبادت کو قابلِ اعتبار جانا اور انہیں عزت کی نظر سے دیکھا۔ یہ سچ ہے کہ میرے خیالات میں جو پختگی اور بانکپن ملتا ہے وہ کہیں نہ ہوتا جو انہوں نے مجھے انسان سے عورت نہ بنا دیا ہوتا۔ کسی عورت کے لئے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے ایک گھر کے طور پہ ایک حکومت مل جائے اور اس حکومت کا حاکم خود اپنا تخت اس کے نام کردے! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے فن دیا، قتیل دیئے اور گھر کے طور پہ مجھے ایک ایسی زمین دی جہاں سے میں اٹھوں تو آسمان تک جا کر بھی لڑکھڑاؤں نہیں!

چندر کانتا کی جیت

اعجاز صاحب!

آپ کے کئی فون آئے اور میں نے کئی جھوٹ بولے۔

قتیل کی شاعرہ یہ کیسے کہتی کہ اس کا ذہن شل پڑ گیا ہے۔

بہت ضد کی ہے اپنے آپ سے تب کہیں لکھنے کی طرف دوبارہ رجحان ہوا۔ قتیل مجھ میں بھرے ہوئے ہیں اور میں سمجھی کہ مجھ میں خلاء بھر گیا، خوب ٹٹولا تو محسوس ہوا قتیل سوئے تھے، زیادہ چھونے سے جاگ گئے اور اب یہ آرٹیکل آپ کے سامنے ہے۔ دیر سے ہی سہی میں نے وعدہ پورا کیا ہے، مجھے معاف کیجئے اور مجھ پہ فخر بھی کیجئے۔ دماغی بکھراؤ کے اس عالم میں یہ ممکن نہ تھا جو میں نے کر دکھایا۔ میرے لئے دعا کیجئے گا۔

خیر اندیش

رشی بادشاہ — ۸/اگست ۲۰۰۱ء

قتیل شفائی مر گئے اور مجھ تک خبر بھی آئی اور ماتم پرسی کو لوگ بھی پہنچنے لگے۔ رات ہوئی اور ف۔ س۔ اعجاز صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ میں قتیل پہ اپنی بے باک رائے لکھ بھیجوں اور میں تیار ہوگئی۔ قتیل پہ لکھنا، قتیل ہی پہ لکھنا، قتیل کو سوچنا، قتیل کو چاہنا، قتیل، قتیل اور صرف قتیل۔

رشی بادشاہ کے پاس قتیل کو چھوڑ کر تھا ہی کیا؟ اس سے پہلے بھی تو قتیل

کے لئے لکھتی رہی۔ میری پوری شاعری قتیل ہی کے لئے تھی۔ قتیل میری ہر سوچ کا
مرکز تھے۔ میں نے جب قلم اٹھایا قتیل کو سوچ کر اٹھایا اور کبھی قتیل سے لڑائی ہوئی
تو قلم کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیتی تھی۔ قتیل سے نالاں تو قلم سے نالاں! اور پھر
جتنے دنوں قلم نہ اٹھاؤں اتنے دنوں روز قتیل کے آگے پھوٹ پھوٹ کے
روؤں۔ آپ نے مجھ سے شاعری چھین لی، آپ نے میری فکر کو روند کے رکھ
دیا"۔ اور ایک دفعہ جب زیادہ ناراضگی کے باعث میں نے ساتھ آٹھ مہینے کچھ
نہ کہا کچھ نہ لکھا تب مجھے منانے کو قتیل نے ایک نظم کہی تھی "میری شاعرہ میری
شاعرہ میرے واسطے کوئی لکھ غزل"

(ان کے تازہ دیوان "صندل" میں یہ نظم شامل ہے)

اور پھر میں نے قلم اٹھا لیا تھا۔

قتیل مجھ سے لکھوا لیا کرتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کریں کہ
میں قلم اٹھا لوں۔ میری عادت سے وہ بخوبی واقف تھے۔ میں غصہ باز ہوں اور
زیادہ تر میرا قلم تب اٹھتا ہے کہ جب میں غصے اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا
ہوتی ہوں۔ اور قتیل کچھ ایسی بات کہہ دیتے کہ میرے اندر لہو کی ایک ایک بوند
انگارہ ہو جاتی اور دکھ سے سینہ پھٹنے لگتا اور ایسے وقت میں مجھے کاغذ کی زمین سب
سے زیادہ مناسب جگہ معلوم ہوتی تھی کہ جس پر میں اپنے لاوے کو بے روک ٹوک
بہنے دے سکتی تھی۔ بس یہی وہ زمین ہے جو چٹانوں سے بھی سخت ہے۔ اس لئے
ابلتی تو اسی پہ بہہ نکلتی۔ کبھی قتیل کا پیار، ان کے پیار کی شدت مجھ میں سیلاب کی
طرح ابھرتی اور میں غزل یا نظم کہنے لگتی۔ کبھی قتیل کا انتظار کبھی قتیل کی حیرت کبھی

قتیل پہ طعنہ بس قتیل، قتیل اور قتیل مگر آج!؟

جب ف۔ س۔ اعجاز صاحب کے کہنے پر قلم اٹھایا تو سمجھ میں نہیں آ
کہ اب کیا لکھوں؟ وہ میرا "جانِ شاعری" کدھر گیا! وہ جسے سوچ سوچ کر جس
کے ساتھ رہ رہ کر میں اس کی عادی ہو گئی۔ وہ قتیل شفائی تو رشی بادشاہ کا خلا
ہو گیا، قتیل مر گیا؟ تو پھر رشی بادشاہ بھی مر گئی۔ چھٹی ہوئی! کہانی ختم!! قلم رکھ د
اور لیٹ گئی۔ پھر یاد آیا ایک دفعہ قتیل سے کسی بات پہ چڑ گئی تھی اور چڑ کر میں نے
کہا تھا "آپ نے مجھے کچھ نہیں سکھایا" قتیل نے جواب دیا "رشی خدا گواہ ہے
میں میں نے قتیل شفائی کو پیوست کر دیا ہے، میں نے کچھ بچا نہیں رکھا۔ میں اپ
آپ تمہیں دے چکا ہوں"۔

تو پھر؟ قتیل شفائی مرا کہاں؟ وہ تو مجھ میں ہے، وہ تو رشی بادشاہ میں
ہے۔ وہ جسم چھوڑنے سے پہلے خود کو مجھ میں منتقل کر گیا۔ وہ سورج تو کب کا مجھے
آسمان بنا چکا۔

میں اٹھ بیٹھی اور میں نے کاغذ اور قلم اٹھا لیا۔ قتیل نے قتیل پہ لکھ
شروع کیا مگر نہیں! وہ آرٹیکل ہمیشہ کی طرح ناول بننے لگا، یاد آیا ناول نہیں لکھ
آرٹیکل لکھنا ہے۔ اسے اٹھا کر رکھ دیا۔ پھر دو تین دن گذرے پھر اپنے اور قتیل
کے تعلقات کو سوچتی رہی، ناول کو آرٹیکل کیسے بناؤں۔ دریا کو کوزے میں کیسے
بھروں۔ کیا لکھوں، کیا چھوڑ دوں۔ کیا یاد کروں، کیا بھول جاؤں۔ خیر اعجا
صاحب سے وعدہ وفا کرنا تھا، پھر لکھنے بیٹھی وہ پھر ناول بن گیا (قتیل پہ جب لکھتی
رہی ہوں ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ قتیل پہ لکھوں تو قلم رکنے کا نام نہیں لیتا تھا اور ہمیشہ

اس دریا کو کوزے میں بھرنے کے لئے مجھے کئی کئی بار کوشش کرنا پڑتی تھی اور یہاں تو
قتیل کے ساتھ خود میں شامل ہوں (دریا اور وہ بھی طوفان سے بھرپور) پھر وہ
ناول رد کر دینا پڑا۔ یہی ہوتا رہا اور اتنے میں ف۔س۔ اعجاز صاحب کے چار فون
آگئے اور میں ان سے جھوٹ بولتی رہی کہ آرٹیکل بھیج دیا ہے تاکہ ان کی امید نہ
ٹوٹے، وہ انتظار کرتے رہیں، جیسے میں کر رہی ہوں، میں کس کا انتظار کر رہی
ہوں؟ یہ قتیل کی یہ نظم بتائے گی جو انہوں نے میرے بارے میں سوچتے ہوئے کہی
تھی۔ اور بس اب کچھ نہیں لکھتی سوا اس کے کہ قتیل شفائی نہیں مرا! جب تک رشمی
بادشاہ نہیں مرتی تب تک وہ وہاں آسمان میں بیٹھا خلاء میں پھول برسا رہا ہے، وہ
مجھ میں بھی ہے میری شاعری میں بھی ہے اور وہ اپنے آپ میں بھی ہے۔ اس کا فن
تو ویسے بھی تا قیامت اسے مرنے نہیں دے سکتا۔ قتیل کا فن آب حیات کی مانند ہے
جسے میں نے بھی پیا ہے اور اسی لئے کہتی ہوں کہ نہ کبھی قتیل کو موت آ سکتی ہے نہ رشمی
بادشاہ کو! قتیل کرشن ہے اور رشمی بادشاہ رادھا۔ احمد عقیل روبی صاحب کی ''قتیل
کہانی'' کے حساب سے سکینہ (قتیل کی بیوی) جیت جاتی ہے اور چندر کانتا جو رشمی کا
روپ لے کر دوبارہ پیدا ہوئی تھی وہ ہار جاتی ہے مگر نہیں، ایسا نہیں ہوا۔ اب کے
چندر کانتا نے قتیل کے فن کا امرت چکھا اور اسے نس نس میں اتار لیا، قتیل شاعر تھے
اور رشمی بادشاہ قتیل کی شاعری ہے۔ قتیل کی روح کے ساتھ رشمی بادشاہ کو تا قیامت
ساتھ چلنا ہے۔ چندر کانتا نے اب کے قتیل کو واقعی پا لیا، حقیقت تو یہ ہے کہ چندر
کانتا جیت گئی! اب قتیل کی اس نظم پہ میں اپنی یہ تحریر تمام کرتی ہوں جو اس بات کی
گواہ ہے کہ رشمی بادشاہ کس کا انتظار کر رہی ہے۔ قتیل شفائی نے مرنے کے بعد کس
کا انتظار کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ جیتا کون ہے، ہارا کون ہے؟

''میرے ماضی کی جتنی بھی ہیں
محبوبائیں زندہ!
وہ میرے ساتھ چل سکتی ہیں میری عمر کی انگلی پکڑ کر
مگر جذبات کی ماری یہ بے چاری حسینہ
کہاں تک ساتھ دے سکتی ہے میرا
مجھے اب کے سفر میں
ہر قدم ٹھوکر ہی پہنچے گی
تو وہ بڑھ کر سنبھالے گی مجھے آخر کہاں تک
وہ تھک جائے گی
تھک کر گر پڑے گی
تو میں کیسے
اٹھا پاؤں گا اس کو
تھکن اس کی بھی
آ جائے گی مجھ میں
کہ میں نے
مکمل کے اقرار وفا
کرتے ہوئے اس سے کہا تھا

کہ تیرا دکھ میرا دکھ
اور میرا سکھ تیرا سکھ ہے
تو میں اس کے دکھوں کو
بھر کے اپنی سرد سانسوں میں
اک اندیکھے جہاں کی
اور اڑ جاؤں گا
اور پھر
انتظار اس کا کروں گا
وہ جب تک میرے
اندیکھے جہاں تک
آ نہ جائے گی
میں خود تڑپوں گا
اور اس کو بھی تڑپاتا رہوں گا
کروں گا آہٹ آہٹ
اس کا سواگت
خلاء میں پھول
برساتا رہوں گا"

قتیل کو میرا انتظار ہے اور مجھے اس دن کا کہ جب قتیل کا انتظار ختم ہو گا۔

غزل

جدائیوں کے کرب سے نجات پاؤں کس طرح
قتیل تم اداس ہو، تمہیں ہنساؤں کس طرح

جو دھیمی دھیمی بجلیاں ابھر رہی ہیں جسم میں
سرود ضبط غم سے ہیں تمہیں بتاؤں کس طرح

نہ جانے میری آرزو حقیقتوں میں کب ڈھلے
میں زندگی کی مانگ میں تمہیں سجاؤں کس طرح

گزر رہی ہے ہجر میں تمہاری میری زندگی
فراق میں ملاپ کے دیے جلاؤں کس طرح

میں گھونٹ گھونٹ پی تو لوں سمندر اضطراب کا
دکھوں کے دیوتاؤں سے تمہیں بچاؤں کس طرح

جھگڑ رہے ہیں آج مجھ سے میرے اپنے حوصلے
کہ کوئی میں سرحدوں کے پار جاؤں کس طرح

یہ رتجی کا وجود ایک چلتی پھرتی لاش ہے
تمہی نہیں تو زندگی میں جان لاؤں کس طرح

مشرف عالم ذوقی

تجھ سے شروع، تجھ پہ ختم

عشق کے کوچے سے

نگاہ عشق تو بے پردہ دیکھتی ہے اُسے
خرد کے سامنے اب تک حجاب عالم ہے

محبت کیا ہے؟ خود سے سوال کرتا ہوں تو دنیا کی بھیڑ بھاڑ سے الگ ایک نئی دنیا کے دروازے میرے سامنے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ غیب سے ایک آواز گونجتی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو عشق کرنا جانتے ہیں۔ میرا بے خوف عشق مجھ سے اور میری روح سے وابستہ ہے — اس کی محبت میری ہی محبت کا پرتو ہے۔ اس کی لبیک مجھے انتہا کے دروازے تک لے آتی ہے اور محبت کا نغمہ مجھے مسحور و دیوانہ کر دیتا ہے......

تبسم سوال کرتی ہیں' کیا تم محبت سے دور رہ سکتے ہو؟'۔

'شاید نہیں......'

ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ 'تم نے اس زندگی میں کتنی محبت کی ہے، سچ بتانا......؟'

میری آنکھیں آسمان کی گہرائیوں میں گم ہیں — نالۂ مومن بھی دارم دوست...... خدا کی محبت سے بندہ کبھی آزاد ہوا ہے کیا؟ محبت نصیب بن جائے تو عاشق کی شان بڑھ جاتی ہے۔ کیا عمر تھی میری اس وقت؟ ننھے ننھے پاؤں کے گھنگھرو جاگے تو ایک خزاں رسیدہ حویلی کی سوغات سامنے تھی...... مکتب میں بیٹھایا گیا تو عشق کے طلسم نے بچپن سے ہی دل کو رازدار بنالیا۔

اے سوختہ جاں پھونک دیا کیا مرے دل میں
ہے شعلہ زن اک آگ کا دریا مرے دل میں

ننھی منی عمر کی پازیب بجی تو ایک پری وادیِ حیرت سے نکل کر سامنے آگئی۔ مجھ سے عمر میں چار سال چھوٹی۔ رشتہ دار۔ خستہ حال حویلی میں جینے کو نغمہ مل گیا۔ اسے نہ دیکھتا تو جیسے جی کو چین نہ آتا...... نیا...... کہاں ہو تم...... کہاں کھو جاتی ہو نیا......

'میں تو یہیں ہوں۔ تمہارے پاس۔'

لیکن وہ میرے پاس کہاں تھی۔ چھوٹا سا شہر آرہ۔ اور عشق کی پہلی آواز نے جس شہر سے رشتہ جوڑا، وہ کلکتہ تھا۔ میرے لیے ایک طلسم ہوشربا۔ جہاں نیا نام کی ایک ساحرہ رہتی ہے۔ جو سال میں صرف ۱۴ دنوں کے لیے چھٹی کے موقع پر مجھے مل جاتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹی کے چھ سات دن اور سردیوں میں آگ کے شعلوں کے درمیان مجھ میں دبکی ہوئی...... آنسو بہاتی ہوئی...... یہ وقت

کتنی جلد گزر جاتا ہے...... میں جارہی ہوں...... مشرف...... آنے کے ساتھ ہی جانے کی باتیں کسقدر اذیت دیتی ہیں......

کالج میں پہنچتے تک نیا میری زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکی تھی۔ نیا اردو نہیں جانتی تھی۔ اردو سے عشق نہیں کرتی تھی۔ اور آہستہ آہستہ شہر کلکتہ کا طلسم میری نگاہوں میں کم ہوتا گیا...... تب تک کہانیاں لکھنے کی شروعات ہو چکی تھی۔ ۱۷ سال کی عمر میں، میں ایک ناول 'عقاب کی آنکھیں' لکھ چکا تھا۔ نیا گم تھی اور عشق کے پردے سے ایک معصوم چہرے نے سر اٹھایا تھا۔ صحرا کے سناٹے میں عشق روشن تھا۔ اور محبت کے راز سے میرے سوا کوئی واقف نہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اس چہرے کو چپکے سے سلام کیا۔

میں سانیال اور تبسم، ترانہ

یہ وہ دور تھا جب تبسم میرے لیے ترانہ تھی اور میں سانیال۔

تب یہ دنیا شاید اس قدر نہیں پھیلی تھی......

تب یہ دنیا شاید اس قدر نہیں سکڑی تھی......

آسمان پر چاند روشن تھا۔ تارے ٹمٹمارہے تھے...... نیلے آسمان پر دو ایک بادلوں کے ٹکڑے نظر آئے۔ مگر رم جھم چمکتے تاروں کے قافلوں نے جھومتے ہوئے بادلوں کی اس چادر کو اوڑھ لیا— پھر اس چادر کو وہیں چھوڑ، جھومتے کارواں کے ساتھ یہ تارے آگے بڑھ گئے......

تب کمپیوٹر نہیں تھا۔

انٹرنیٹ نہیں تھا۔ اپسرائیں نہیں تھیں...... عمر کی اپنی حدیں مقرر تھیں— اور ان حدوں سے تجاوز کرنا بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ تب جادو کا گھوڑا نہیں تھا۔ مگر تب بھی تھی محبت— شاید موجودہ وقت سے زیادہ آزاد اور بلونٹک— جسم کی جگہ سیدھے روح میں اتر جانے والی محبت— تب چاندنی راتیں تھیں۔ سولہ برس پیچھے لوٹوں تو ہندستان کے اچھے خاصے چھوٹے شہر کسی گاؤں یا قصبے جیسے لگتے ہیں۔ فون نہیں، ٹیلیفون نہیں۔ موبائیل تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ چھوٹے شہروں میں اپنی تمام تر دقتوں اور پریشانیوں کے باوجود بھی زندگی حسین اور پیاری لگتی تھی۔ تب محبت کی اپنی الگ شکل تھی۔ اپنی ترنگ اور اپنی لہر تھی— بارش اور خوشبو جیسے تصورات میں محبت کی گنگناتی موجوں کی طرح— اور آسمان پر دور چمکتے کسی ننھے چمکتے تارے کی طرح— مگر اس تارے کو دیکھ یا چھولینا سب کے بس کی بات نہیں تھی—

لیکن شاید عمر کی نازک پائیدان پر ادب سے دوستی ہوتے ہی میرے لیے محبت کے معنی بھی بدل گئے تھے۔ ایک سنسناتی ہوا— جو آپ کے تمام جسم کو اپنی روانی میں بہالے جائے۔ بہتے یا اڑتے ہوئے آپ یہ بالکل بھی نہیں سوچیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے— بلکہ آپ اس لمحہ کی آنچ میں اپنے تمام وجود کو ڈال دیں اور ایک ایک لمحہ کی زندگی اور فنا سی کو محسوس کریں—

اور اچانک کی شکل میں چھوٹے شہر میں جیسے خود کو خوش قسمت سمجھنے کا موقع مل گیا تھا— ہرنی سی۔ اپنے وجود کی خوشبو کے ساتھ جیسے بس اسی کے لیے بنائی یا لکھی گئی ہو— چھوٹی چھوٹی دو چند ملاقاتوں کے بعد ہی ہوا میں اڑنے کا احساس— تب چھوٹے شہر کے لوگ شاید اتنے مہذب نہیں ہوئے تھے۔

یا اتنے زیادہ کمرشیل......؟
باتیں اڑنے لگی تھیں۔ پھیلنے لگی تھیں۔ کالج سے گھر تک قصے کہانیوں کا
بازار گرم ہونے لگا تھا۔

ترانہ — سانیال......

لیکن شاید ہم دونوں میں ہی بغاوت بھری تھی۔ یا ہم دونوں کے گھر
والے اس بغاوت سے واقف تھے۔ اس دن ترانہ ملی، تو جیسے آہستہ آہستہ اپنی
روانی میں بڑھتا پیار ایک نئی خوبصورت سی کہانی لکھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ ایک
چھوٹی سی تنگ ندی تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے۔ دور ایک ریڑھی والا پیاز اور آلو
فروخت کر رہا تھا۔ دو چھوٹے گندے بچے ہماری طرف دیکھتے ہوئے ہنس رہے
تھے......

ترانہ نے میرے ہاتھوں کو چھوا — 'تم گھر کیوں نہیں آئے۔ کیوں
ڈرتے ہو......'

'نہیں۔ ڈرتا نہیں......'

'جھوٹ مت بولو۔ ڈر گئے ہو تم۔ کیونکہ شاید ہمارے قصے پھیلنے لگے
ہیں۔ معلوم...... اس نے میرے ہاتھوں پر اپنی گرفت سخت کر لی — میں ساری
ساری راتیں جاگتی ہوں۔ گھر کھڑکی، دروازے سب غائب ہو جاتے ہیں —
جیسے کوئی ہوا محل ہو — میرا پورا چہرہ صرف ایک مسکراہٹ میں بدل جاتا ہے —
اور تم ایک خوبصورت رات کے تصور میں ڈھل جاتے ہو...... میں تمہارا ہاتھ
تھامتی ہوں۔ بوسہ لیتی ہوں، اڑتی ہوں۔ اور...... ہوش کہاں رہتا ہے مجھے۔ گھر
کے آنگن میں برسوں پرانا ایک کنواں ہے — اس کنویں پر خاموش سی آ کر بیٹھ
جاتی ہوں۔ سب سوئے رہتے ہیں۔ اور میں آسمان کے چاند کو دیکھتی رہتی ہوں۔
چاند چھپ جاتا ہے...... اور تم...... آجاتے ہو...... یہ کیا ہے۔ سانیال...... کیا
ہے...... یہ؟

'سوچنے دو......'

'بتاؤ نا کیا ہے یہ......'

ریڑھی والا پیاز لو، آلو لو کی صدائیں لگا رہا ہے۔ دونوں گندے بچے
ابھی بھی ہماری طرف دیکھ رہے ہیں...... ترانہ کے ہاتھ میرے ہاتھوں پر سخت
ہو گئے ہیں — بتاؤ نا، کیا ہے یہ......'

'بتاؤں......؟'

'ہاں...... بولو نا......'

'تمہارے اندر 'ڈوپامائن' اور 'نورے پنفرین' کیمیکل کی سطح بڑھ گئی
ہے —'

'وہاٹ' ...... ترانہ چونکتی ہے — 'یہ کیا ہے...... ڈوپامائن؟'

'کیمیکل ہے...... جو دماغ میں خاموشی سے ایک نہیں ختم ہونے والی
خوشی کی ترنگیں رکھ دیتا ہے۔'

ترانہ مسکرائی — 'یعنی پیار۔ اور وہ۔ نورے......؟'

'نورے پنفرین......'

'ہاں وہی — تم بھی نا سانیال، یہ کیا ہے؟'

'یہ بھی ایک کیمیکل ہے جو دل میں اچھل اور جوش پیدا کرتا ہے.....'

ترانہ چونکی — تو تمہارا پیار بس اتنا ہے۔ ڈوپامائن اور نورے پنفرین کی سطح تک — اتنا ہی ہے پیار..... ادب سے کیمسٹری کی دنیا کی طرف چلے جانا — اور کل جو میرے ساتھ ہوا۔ پتہ ہے — آدھی رات — گھر کا دروازہ کھول کر خاموشی سے گلی میں تمہاری تلاش میں نکل پڑی۔ پھر اچانک احساس ہوا۔ ارے، یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ جاگی تو یکا یک ڈر کا احساس ہوا۔ ساری گلی سنسان تھی۔ لوگ اس وقت مجھے دیکھتے تو پتہ نہیں کیا کہتے مجھے۔

'کچھ نہیں۔ یہ سیروٹونن کی مسلسل گرتی ہوئی سطح کی وجہ سے ہوا.....'

'مطلب.....؟'۔

'محبت میں پاگل پن کی حد تک۔ خود کو فنا کر دینے کا احساس.....'

'ماروں گی تم کو.....' ترانہ زور سے کھلکھلائی تو ہمیں دیکھنے والے وہ دونوں بچے بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

بالکنی سے رات روشن تھی۔ تارے آنکھ مچولی کا کھیل کھیل رہے تھے — سولہ برس پہلے کا احساس ایک دم بارش کی طرح برس جانا چاہتا تھا۔ تب دل و دماغ پر بس ایک ہی نام کا بسیرا تھا..... ترانہ۔ اور اس نام کے ساتھ ہی جیسے خوشبوؤں کے در کھل جاتے۔ ہوا سرسراتی ہوئی جیسے سارے بدن میں ایک طوفان اٹھا دیتی — اور تنہائی کے کسی پراسرار لمحے ترانہ کا ایک جملہ میرے ہوش و حواس پر حاوی ہو جاتا۔

'میں بس اتنا جانتی ہوں، جسے پیار کروں، وہ مجھے ملنا چاہیے۔'

اس دن دوپہر کے تین بج رہے ہوں گے۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی معلوم ہوا۔ ترانہ اسپتال میں ہے..... بھابھی نے بتاتے ہوئے ایک لمحہ کو میرا چہرہ دیکھا۔ چوکی پر خاموشی سے بیٹھے پاپا نے بھی میری طرف نظریں کر لیں۔ میں نے کتاب وہیں میز پر رکھ دی.....

'میں جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے رات میں بھی نہ آؤں.....'

اتنا کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ میرے لیے کہنا مشکل تھا کہ ترانہ کے اندر 'ڈوپامائن' اور 'نورے پنفرین' کی سطح کتنی بڑھ گئی تھی یا پھر 'سیروٹونن' کی سطح کتنی گھٹ گئی تھی — جو اچانک پاگل پن کی حدوں کو چھوتے ہوئے وہ اسپتال میں بھرتی ہو گئی تھی — لیکن شاید سب کچھ معمول کے مطابق نہیں تھا۔ کیونکہ گذشتہ ہفتہ ہی اس نے میرے وجود کے ریشے ریشے میں گھلتے ہوئے اپنی جنگ کا اعلان کر دیا تھا.....

'میری سانسیں سوئیوں کی طرح ٹوٹتی بکھرتی جا رہی ہیں۔ کیونکہ یہ ہر وقت بس تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں — تم کیوں چلے جاتے ہو سانیال — کیوں نہیں ایسے رہتے، جیسے میرے کمرے میں میرا ٹھہرا ہوا وقت رہتا ہے۔ اس لمحہ جب تمہیں سوچتے ہوئے تمہارے وجود میں گھل جانے کی خواہش ہوتی ہے.....

اس کی ہتھیلیوں میں انگارے جمع تھے.....' کبھی اچانک ایک دھند سی کمرے میں بھر جاتی ہے۔ پھر دنیا بھر کی باتیں میرے کمرے میں گونجنے لگتی ہیں۔ تم یکا یک دھند میں کھو جاتے ہو تو لگتا ہے، یہ سانسوں کی سوئیاں بھی ٹوٹ سی گئی ہوں..... کہیں مت جاؤ پلیز۔ میرے ساتھ رہو۔ اس سے پہلے سانیال، یہ

سانسوں کی سوئیاں بکھر جائیں......'

قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے...... وہ جنرل وارڈ میں تھی۔ جہاں دو چار مریض اور بھی تھے۔ چھوٹے شہروں کی اپنی تاریخ اور تہذیب ہوتی ہے۔ اسے گھیرے ہوئے اس کے محلے کی کئی عورتیں جمع تھیں۔ مجھے دیکھ کر جو اجنبی سی خوشی اس کے چہرے پر لہلہائی، وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے ہی لمحہ جنرل وارڈ میں بہت سے لوگوں کی موجودگی کے باوجود وہ میری بانہوں میں تھی...... کمزور بیمار سی...... وہ مجھے بتا رہی تھی...... وہ بول نہیں پا رہی ہے...... آواز چھن گئی ہے۔ میں نے اسے زور سے سینے سے بھینچ لیا— ترانہ رو رہی تھی...... میں اسے سینے سے بھینچے ہوئے محبت میں ڈوبی انگلیوں کو اس کی آنکھوں کے پاس لہراتا کہہ رہا تھا'

''میں ہوں نا...... تمہارا سانیال۔ تمہاری آواز۔ تم کہتی تھی نا، ساری دنیا میں کوئی بھی تم سے اچھا نہیں بولتا۔ کسی کی بھی آواز تم سے زیادہ خوبصورت اور سحر انگیز نہیں ہو سکتی۔ ابھی اس لمحہ صرف تمہیں سنتا ہے مجھ کو۔ کیونکہ میں اپنی ترانہ کے لیے روح، جسم اور نغمہ سب بن گیا ہوں...... تمہاری آواز...... اس آواز کا سنگیت تمہارے ہونٹوں پر رکھوں گا ترانہ اور تمہارے ہونٹ دنیا کی سب سے حسین لڑکی کے ہونٹ بن جائیں گے...... اور جب تم میرے سُر میں سُر ملا کر جواب دو گی تو یہ کائنات کی سب سے سُریلی آواز ہو گی...... مگر ترانہ...... آج میں تمہاری آواز ہوں۔ اپنی آواز کو بھول کر میری آواز کا لمس محسوس کرو......'

ترانہ سمٹ گئی...... میری پشت پر اس کی ہتھیلیاں سخت ہو گئیں۔ میری شرٹ گیلی ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ اٹھایا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ ایسی مسکراہٹ — جسے شاید دنیا کی چند عظیم شاہکار مصوری کے نمونے میں ہی تلاش کیا جا سکے۔

اس رات میں جنرل وارڈ میں اس کے پاس والی چوکی پر ہی سویا۔ یہ سب جانتے ہوئے کہ چھوٹے شہر کی سنسنی دیتی ہوائیں ہم دونوں کی کہانی کی خوشبو کو لیتی ہوئی اڑ گئی ہیں۔

اب یہ کہانیاں اڑیں گی۔ پھیلیں گی...... مگر شاید آگے کی صورت حال پر غور و فکر کرتے ہوئے میں مطمئن تھا۔ یا پھر یوں کہنا چاہیے کہ اب مجھے کسی کی بھی پرواہ نہیں تھی—

●●

تب نیٹ نہیں تھا، موبائل بھی نہیں تھے...... چھوٹی چھوٹی آسانیاں بھی ہم سے بہت دور تھیں۔ لیکن محبت کا کرشمہ اور جادو اپنی پوری شدت کے ساتھ تب بھی موجود تھا، اور شاید آج سے بھی زیادہ تھا— باہر بالکنی میں دودھیا چاندنی کی روشنی میں ستاروں کا رقص جاری ہے۔

تم سے کیا رشتہ ہے اس کا؟

ترانہ زندگی میں آ گئی۔ ہم مہانگر کی بھیڑ کا حصہ بن گئے۔ پھر ایک بیٹا بھی ہو گیا۔ مہانگر کی بھیڑ کا حصہ بنتے ہوئے بھی اندر کا ادیب مرا یا سویا نہیں، کیونکہ ترانہ نے اس ادیب کو کسی بھی لمحے سونے نہیں دیا۔ اس کی محبت لکھاتی یا

چھلاوہ نہیں تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی سانیال کو ایک محبوب کے طور پر ہی دیکھتی
رہی۔ ادب سے سیریل کی دنیا تک جیسے ترانہ نے اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کر دیا
تھا۔ سولہ برسوں میں اگر کچھ تبدیلی آئی تھی تو صرف ایک جسمانی تبدیلی کہ اپنے
ہی جسم سے اپنے پیار کا ایک حصہ نکلتے یا بڑا ہوتے دیکھنے کا احساس اُسے ایک
پختہ عورت میں تبدیل کر گیا تھا۔ مگر اپنے تمام محسوسات کی سطح پر وہ صرف ترانہ
رہی۔ وہی سولہ برس پہلے کی ترانہ...... مگر ایک دن—

گھر میں کمپیوٹر آ گیا۔ نیٹ لگ گیا...... اور ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔

کیا بہت پیار کرنے کے باوجود آپ میں کہیں کوئی ایک دبی ہوئی خواہش باقی رہ
جاتی ہے— بہت پیار کرنے والے بچے اور بہت زیادہ چاہنے والی بیوی کے
باوجود کیا نیٹ پر اپنی محبتوں کی دنیا آباد کرنے والا شخص کہیں تقسیم نہیں ہوتا ہے؟
نیٹ کی دنیا نوجوانوں، ادھیڑ اور بچوں کے لیے معصوم اور متجسس ذہن میں، سیکس
دیکھنے والی ایک دنیا تھی— آرکٹ سے لیکر ہائی فائی، لو ہیپنس (Love
Happens)...... ڈریم کس تو ڈاٹ کام تک...... فرضی ناموں کا سہارا لینے
والی لڑکیوں اور لڑکوں کا ایک بڑا ریکیٹ پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ بچوں سے
بوڑھوں تک کے لیے تجسس کا ایک دلفریب سامان— کہیں کوئی جرم کا احساس
بھی تھا میرے اندر— ترانہ کے رہتے ہوئے یہ دنیائیں کیوں آباد ہو جاتی ہیں؟
یعنی ہم کسی اجنبی لڑکی سے دوستی کرنا ہی کیوں چاہتے ہیں۔ وہ بھی صرف ایک
نہیں...... ہزاروں ملک، کمیونٹی، مذہب...... نیٹ کی ایک پھیلی ہوئی دنیا— اس
جادو نگریا میں سیراب ہونے کا احساس کیا حقیقت میں ایک جرم ہے؟ کبھی لگتا،
سب کرتے ہیں...... پھر لگتا گھر، اپنوں کی بے پناہ محبت کے باوجود نئی ٹکنالوجی نے
یکا یک، نہ ختم ہونے والے پیار کا ایک سرچشمہ اندر تک گھول دیا ہے— آپ
محض گھر کے پیار سے سیراب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بہت سا پیار چاہئے آپ کو......
کیونکہ خون کے اندر تک شامل ہوس کی آگ کل کی تہذیب تک تو خاموش رہی،
لیکن آہستہ آہستہ نئی ٹکنالوجی کے آتے ہی دھماکہ خیز اور پر تشدد ہو گئی...... لیکن شاید
اس دنیا میں بدصورت چہروں کے علاوہ کچھ عام اور بیحد اچھے چہرے بھی ہیں۔
برائیوں کے علاوہ بہت کچھ اچھائیاں بھی ہیں— سیکس کے علاوہ ایک دوسرے کو
جاننے کی چاہت بھی ہے۔ اور اچانک ایک دن......

نیٹ اوپن کرتے ہی یاہو اسکرین پر ایک میسج ملا تھا—

میرا نام مہک ہے۔ مہک احمد۔ لاہور کی ہوں۔ عمر 23 سال، پانچ
سال کی تھی، ماں گذر گئی۔ چھوٹی عمر سے ہی دو چیزوں کی عادت پڑ گئی۔ ادب
پڑھنے کی اور ٹیلی چیٹ— تمہاری ایک کہانی پڑھی۔ لگا یہ کہانی تو میری ہی ہے۔
پھر مہینہ لگ گیا تمہارا میل آئی ڈی تلاش کرنے میں۔ زیادہ وقت نہیں ہے میرے
پاس کچھ بھی کہنے کے لیے۔ شاید یہ پورا نظام اب اڑنے، تیز اڑنے کو مجبور کرتا
ہے۔ کیونکہ پیار کرنے لگی ہوں تم سے— بغیر جانے، بغیر سمجھے۔ کیونکہ تمہاری
کہانی کا لمس اندر تک محسوس کیا ہے میں نے۔ تمہاری عمر اگر 80 سال کی ہوتی
تب بھی پیار کرتی تم سے۔ میرا میل مل جائے تو فوراً جواب دینا، اور ہاں— یاہو
میسنجر میں تمہیں ایڈ کر رہی ہوں۔ ہو سکے تو شام میں آنا۔ ٦ بجے۔ پاکستان اور
ہندستان کے وقت میں آدھے گھنٹے کا فرق ہے۔ آؤ گے نا؟ تمہاری مہک۔

پتہ نہیں، اس میسج کو کتنی بار پڑھا۔ پڑھتا گیا، ادب اور سیریل کی اس دنیا میں اس سے پہلے کتنی ہی چٹھیاں آئی تھیں میرے پاس۔ کتنی ہی لڑکیاں ٹکرائی تھیں۔ مگر یہ ای میل جیسے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ جیسے اندر، خون کا دوران بڑھ گیا تھا...... تمہاری عمر اگر ۸۰ سال بھی ہوتی' نظریں بار بار اس کے لکھے جملوں پر دوڑ رہی تھیں۔ میری عمر ۲۳ سال ہے...... اندر کوئی تشنہ خواہشات والا شخص تھا کیا؟ یا چالیس کی دہلیز پر کھڑا ایک ادھیڑ جسے اس بات سے سکون ملا ہو کہ کوئی ۲۲۔۲۳ سال کی لڑکی بھی اس سے پیار کر سکتی ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کون سا لمحہ تھا...... 'یورس سانیال' لکھنے تک میں اپنا ای میل اسے سینڈ کر چکا تھا۔

اور اسی شام وہ پہلی بار یاہو میسنجر پر آئی اور جیسے حقیقت میں پرستان جیسی کسی نئی دنیا کے دروازے میرے لیے کھلتے چلے گئے — پھر تھوڑے سے دن گزر گئے۔

●●

جب آپ پیار کرتے ہیں تو پھر آپ کو بتانا نہیں پڑتا۔ مشک کی طرح اس کی خوشبو آپ کے پورے وجود سے پتہ چل جاتی ہے۔ کئی بار ترانہ کے سامنے آتے ہوئے، یا اسے بازوؤں میں لیتے ہوئے چور سا بھی احساس ہوا۔ مگر یہ بات ایک مرد کے طور پر پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ترانہ کے ساتھ محبت کے کسی بھی لمحے میں مہک کہیں بھی موجود نہیں تھی۔ تو کیا وہ ایک لمحاتی کشش سے زیادہ نہیں تھی اور ترانہ مکمل طور پر میرے وجود پر حاوی — یا یہ ترانہ کا پیار تھا کہ مہک میری زندگی میں داخل تو ہونا چاہتی تھی — مگر ہو نہیں پا رہی تھی۔ یا یہ کہ ایک خاندان اور اس کی اخلاقیات سے بندھے ہونا بھی میری مجبوری تھی؟ یا پھر یہ کہ نیٹ کی اس چکا چوند دنیا میں ہم مکمل وجود کے ساتھ کہاں ملتے ہیں۔ شاید یہ بات مجھے کسی حد مطمئن کر رہی تھی — مگر سرحد پار ہی سہی، مہک کا جسم موجود تھا اور میں نیٹ کے کیمرے میں اس کے ہونے کی موجودگی کو پڑھ چکا تھا — کیا یہ محبت تھی۔ کیا ترانہ کی محبت میں کہیں کوئی کمی آ گئی تھی، جس نے اچانک مجھے مہک کی طرف موڑ دیا تھا۔ یا پھر ایک چالیس پار کے مرد کی مردانگی کو ملنے والی تھوڑی سی راحت تھی — ایک کم عمر کی لڑکی کا ساتھ پا کر — خاص کر ایک ایسی لڑکی کا، جو نہ صرف اس سے پیار کرنے لگی تھی، بلکہ اسے حقیقتاً پانا بھی چاہتی تھی......

شاید ترانہ سے بہت دن تک یہ سب کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کیونکہ جنگل میں آئی آندھی کی طرح ایک دن وہ اس سچ کو جان گئی...... وہ چپ تھی......

'کیا تم بھی اسے پیار کرتے ہو؟' ترانہ کے لفظ برف کی مانند سرد تھے۔

'نہیں جانتا......'

'شاید کرتے ہو......' اس نے لمبی سانس کھینچی...... مگر دوسرے ہی لمحہ اس کی آنکھوں میں برسوں کا پیار تھا — وہی دیوانگی اور جنون — ایک بار پھر اس نے مجھے میرے گلٹ کی کینچلی' میں جانے سے روک دیا تھا۔

جاتے ہوئے وہ صرف اتنا کہہ پائی— 'کوئی لڑکا اگر میری زندگی میں آ جاتا تو تمہیں کیسا لگتا— ؟'

'سانیال'— اپنی ہی اگنی پریکشا سے گزرتے ہوئے میں خود سے بولا...... 'سانیال۔ کیا کرو گے— آگے کیا کرو گے سانیال...... وقت تمہیں بہا لے جانا چاہتا ہے اور یہ، تمہارے اندر کوئی مضبوط سا احساس ہے— جو تمہیں روک رہا ہے۔

شام میں نیٹ آن کرتے ہی مہک احمد آن لائن مل گئی۔ اے اے کے— آن لائن ہوتے ہی سب سے پہلے AAK یعنی السلام علیکم لکھتی تھی۔ پھر الفاظ کا دریا نئے یوٹوپیا کے دروازے کھول دیتا۔ اور اس وقت...... شاید میں کسی پرستان میں تھا۔ مہک کے لفظ خوشبو بن گئے تھے

مہک احمد کے معصوم سوال

اس نے پوچھا— اس نے بہت کچھ پوچھا۔ اس نے پوچھا کہ پرندے اور خواب میں بہتر کون ہے۔ جواب تھا...... پرندے۔ کیونکہ پرندے سانس بھی لیتے ہیں اور بارش یا ساون کے موسم میں محبت کا ترانہ بھی گاتے ہیں— خواب تو ہرجائی ہوتے ہیں— آتے ہیں اور گم ہو جاتے ہیں۔

اس نے پوچھا— مور، تتلی اور بارش میں تمہیں کیا پسند ہے؟

اس نے پوچھا...... 'آسمان میں چمکنے والا، اس کی اپنی پسند کا ایک تارا، چودہویں چاند سے بھی بہتر کیوں نظر آتا ہے؟'

اس نے پوچھا— تم گلاب کیوں نہیں ہو، جسے میں توڑ کر اپنے سینے کے پاس لگا لیتی۔ تم میری دھڑکنیں میری سانس میں خوشبو کی طرح سما جاتے......

'تم تتلی کیوں نہیں ہو؟ جسے گلاب کی کیاریوں کے درمیان، مدہوش سی گھومتی ہوئی میں، پکڑنے کی کوشش میں کسی کانٹے سے اپنے ہاتھ زخمی کر لیتی...... اور رسنے والی خون کی ہر بوند میں پاگل کر دینے والی حسرت کے ساتھ محبت لکھ دیتی۔

اور پھر اس نے پوچھا— سنو، اتنا پہلے کیوں پیدا ہو گئے— ؟ مجھ سے کافی پہلے— ؟ یہ کیسا انتقام ہے تمہارا— ؟ چلو، پیدا ہو گئے...... تو میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟ میرے خواب کیوں نہیں دیکھے؟ میری آہٹ کیوں نہیں محسوس کی؟ اس لیے کہ زمین کے ذرّے ذرّے میں، آگے کے بھی کئی شاندار برسوں تک میں— کہیں نہیں تھی؟ مگر— میری خوشبو تو تھی جان...... میرا احساس تو تھا۔ میری دھوپ...... میرا سایہ تو تھا...... بس تم ہی محسوس نہیں کر پائے......'

اس نے پوچھا...... تم نے شادی کیوں کر لی مجھ سے پہلے؟ میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟

اس نے پوچھا...... تمہیں کون کون مجھ سے زیادہ جانتا ہے؟ لیکن میں چاہتی ہوں تمہیں کوئی بھی مجھ سے زیادہ نہ جانے— تمہارے اندر، پھول، خوشبو اور خواب سے زیادہ میری مہک ہو— بیوی، چاند اور سورج سے زیادہ میں تمہیں دیکھوں— سرسراتی ہوا سے زیادہ میں تمہیں چھوؤں...... میں تمہارے اندر کسی موسلا دھار بارش سی اُتر کر بس برستی رہوں۔ تاعمر......'

اس نے ٹھہر کر پوچھا...... مجھے میرا حق لاؤ۔

جواب میں کہا گیا...... یہ حق کسی اور کا ہے۔
'نہیں؟'

'حق دوسرے کا ہوتا تو تم یہاں نہیں ہوتے۔ بولو، کیوں ہو یہاں تم۔
اس کے پاس کیوں نہیں ہو، جس کے پاس تمہیں ہونا چاہئے—'
شاید وہ کھلکھلائی تھی...... لیکن وہ اب بھی پوچھ رہی تھی...... اور اس
نے پوچھا...'میرا حق مجھے دیتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو۔ محبت کا یہ حق کھو چکے
ہوتے تو کیا میں یہاں ہوتی — تمہارے پاس — تمہاری سانسوں کے
قریب...... تمہاری جنبش، تمہاری بیتابیوں میں — تمہاری حیرانیوں میں...... اور
تمہارے ہاتھوں کی انگلیوں میں...... جو کمپیوٹر پر ٹائپ کرتے ہوئے حرف سے
محبت اور لفظ سے شدت بن جاتے ہیں...... آنکھوں سے خواب اور ہونٹوں سے
نغمہ بن جاتے ہیں۔'

اور پھر اس نے پوچھا...... تمہارے بیٹے کو پتہ ہے کہ تمہاری زندگی میں
اس کی ماں کے علاوہ بھی کوئی آ گیا ہے؟'

یہ وہی وقت تھا، جب وینس کا دل دھڑکا تھا — اور سیاروں کے
جھرمٹ میں نویں سیارے کے روپ میں جانے گئے پلوٹو کو دیس نکالا دیا گیا تھا۔

●●

'بولتے کیوں نہیں۔ کتنا پیار کرتے ہو مجھے......'
'نہیں کرتا......' میں نے آہستہ سے دو لفظ ٹائپ کیے۔ وہ موسلا دھار
بارش کی طرح برس گئی...... 'کرتے ہو مگر ڈرتے بھی ہو...... اچھا، ترانہ کتنا پیار
کرتی ہے تمہیں......؟'
'بہت'
'مجھ سے زیادہ'
'ہاں۔'
'نہیں
مجھ سے زیادہ نہیں کر سکتی......' وہ مطمئن تھی...... مجھ سے زیادہ کوئی نہیں
کر سکتا۔ خود تمہارے جسم میں دھڑکنے والا دل بھی نہیں...... نگاہوں سے محبت کا
ترانہ چھیڑنے والی آنکھیں بھی نہیں...... اور — میرا نام لینے والے تمہارے
ہونٹ بھی تمہیں اتنا پیار نہیں کر سکتے جتنا میں کرتی ہوں......

مہک رک گئی ہے — 'کیم' پر میرے اندر چل رہی 'یہ سونامی' یا طوفان
کو دیکھا جا سکتا ہے۔ آنکھوں میں ایک لمحہ کو ہزاروں پرچھائیاں آ کر رخصت
ہو گئیں...... دوبارہ اس کے ہاتھ ٹائپ پر ہیں۔ میرا دل انجانے سوالوں کے
سیلاب سے دھڑک اٹھا ہے......

اس نے پوچھا...... اچھا سنو...... کتنا چھوا ہے ترانہ نے تم کو...... میری
بھی خواہش ہوتی ہے۔ ساون بن جانے کی۔ بارش بن جانے کی...... ترانہ کی
انگلیاں تمہارے بدن پر کیسے مچلتی ہیں...... بہت آہستہ...... بہت خاموشی سے —
پیڑ کے سبز پتے پر گرنے والی اوس کی بوندوں کی طرح — کتنا دیکھا ہے اس نے
تمہارے جسم کو — کتنا جانا ہے ترانہ نے — صرف اتنا ہی نا، جتنا ایک بیوی
نبھائے جانے والے رشتوں کی بنیاد پر جان سکتی ہے — صرف اتنا ہی نا، جتنا کہ

ایک جسم کا درد یا بھوک ہوتی ہے...... صرف اتنا ہی نا، کہ ایک وقت، اس بھوک میں ایک ساتھ واسنا کی لہریں بھی شامل ہو جاتی ہوں گی — لیکن...... وصال کے کسی بھی لمحے وہ کتنا تم کو دیکھتی ہے۔ تمہارے روم روم میں کتنے خواب دیکھ پاتی ہے — ؟ تمہاری سانسوں کی ہلچل میں کتنا ڈھونڈ پاتی ہے تم کو؟ ترانہ تم میں ہر بار ایک نئے سیلان کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہے یا نہیں......؟ ایک نئے گیت، نئے سپنے، اور نئے سیلان کو......

مہک غائب تھی — اور ترانہ اپنے مکمل وجود کے ساتھ ونیس کا دھڑکتا ہوا دل بن گئی تھی —

'اچھا تم نے کیا سوچا؟' ترانہ کی آنکھیں میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

'پتہ نہیں'

ایک ایمانداری تو ہے تم میں کہ محبت کا اظہار کرنے سے نہیں گھبراتے کہ تمہیں بھی مہک سے پیار ہے......

میں خاموشی سے خلاء میں دیکھتا رہا۔

'اچھا بتاؤ، تم اس سے رومانی باتیں بھی کرتے ہو؟'

'ہاں......'

'بہت؟'

'شاید'

'سامنے ہوتے تو شاید اس کا ہاتھ بھی تھام لیتے......' ترانہ کی آواز برف جیسی یخ تھی —

'شاید......'

'شاید نہیں۔ تھام لیتے۔ یا ممکن ہے، اس سے بھی آگے — ' وہ کہتے کہتے رکی...... مہک سے بات کرتے ہوئے ایک لمحہ کو بھی میری یاد نہیں آئی...... مان لو۔ ایک دن میں تم نے اس کے ساتھ تین گھنٹے گذارے تو ایک مہینے میں ۹۰ گھنٹے ہوئے نا...... یاد ہے سانیال —

ترانہ نے میرے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اس کی آنکھیں پرانی یادوں کو محسوس کرتے ہوئے تھوڑی نم تھیں — یاد ہے...... تم کہا کرتے تھے...... جو مرد اپنی بیوی کے علاوہ، باہر کی دنیا میں کسی دوسری عورت سے ملا۔ اسی پیار کے جذبے سے...... تو سمجھو اس نے اپنا ایک عضو کاٹ لیا۔ یاد ہے نا...... بار بار ملتا رہا تھا تو...... باہر کی دنیا میں۔ پرائی عورتوں سے...... تو اس کے سارے عضو کٹ گئے۔ یاد کرو کہتے تھے نا...... یہ بھی کہتے تھے...... کہ پھر ایسا آدمی، اسی پختہ جذبے کے ساتھ، اپنی بیوی سے بانہیں پھیلا کر کیسے مل سکتا ہے؟ اور اپنے بچوں سے؟ کیونکہ اپنے پیار کے سارے اعضاء کو کھو چکا ہے وہ...... ترانہ نے اس کی طرف دیکھا — مسکرائی تمہارے اعضاء تو سلامت ہیں نا سانیال؟ میرے لیے؟ اور میرے بچوں کے لیے......؟

میرے اندر جیسے میری اپنی چیخ ہی برف کی متعدد سلیوں کے درمیان لہولہان تھی...... اس ایک لمحہ اپنے ہی درد سے لڑتے، ابھرتے شاید میں نے کوئی فیصلہ لے لیا تھا۔

'وہ نیٹ کا سچ ہے، جسم کا نہیں......'

'اوہ'......ترانہ زور سے ہنس پڑی۔

'نیٹ سارے کرتے ہیں۔ کون نہیں کرتا۔ لوگ تو ایسی باتیں اپنی بیویوں سے شیئرز بھی نہیں کرتے......'

'میں لوگوں کو نہیں جانتی جان۔ سانیال کو جانتی ہوں'...... ترانہ کی آواز میں کہیں بھی غصہ کا اظہار نہیں تھا......تم نے کہا، وہ نیٹ کا سچ ہے۔ جسم کا نہیں۔ تم اس سے رومانٹک چیٹ بھی کرتے تھے؟

ہاں......

ہاتھ تھامتے تھے......؟

ہاں......

کس (Kiss)......؟

شاید......

شاید نہیں ہاں بولو

ہاں......

ہونٹوں پر......

ہاں......

چلو ہونٹوں پر، آنکھوں پر یا تمہاری مرضی۔ کیونکہ پیار کے کسی بھی لمحے کی شدت کو بیان کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر تم شاید سامنے ہوتے تو...... وہ سب کرتے نا سانیال......؟'

'سامنے ہوتے تو نا......؟'

'سامنے ہوتے تو شاید سنامی بن جاتے...... ہے نا۔ ڈرو مت سانیال......کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کل دیر تک سوچتی رہی۔ ہاری کہاں میں؟ سولہ برسوں میں تمہارے اندر کہاں ایک خلا چھوڑ دیا۔ کہاں سانیال' بتاؤ مجھے نہ۔ اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں روکوں گی۔ سمجھاؤں گی۔ کیونکہ محبت تم سے میں نے کی ہے۔ میں نے بہت محبت کی ہے۔ سانسوں سے سانسوں کی محبت۔ پہلی سانس سے آخری سانس کے سارے پھول۔ بس اسی کچی عمر میں تمہارے نام چن لیے — روکوں گی نہیں۔ سوچ لوں گی کہ شاید اتنی ہی محبت لکھی تھی میری تقدیر میں — کیونکہ جہاں محبت پر روک یا بندھن لگ جائے، وہاں محبت نہیں ہوتی۔ خودغرضی آجاتی ہے......

'پھر یہ سب......'

'تم بتاؤ۔ کیا سوچا ہے تم نے......'

'میری آواز جیسے گلے میں پھنس گئی — مہک شادی کرنا چاہتی ہے مجھ سے......'

'تو......'

'وہ کہتی ہے، وہ انڈیا آجائے گی......'

'تو لے آؤ نا......' ترانہ نے آہستہ سے میرا ہاتھ تھام لیا — لے آؤ مہک کو......

'اور تم......؟'

ترانہ آہستہ سے ہنسی..... جانتے ہو نا اپنی ترانہ کو — بچپن سے ہوا را بھی پسند نہیں آیا...... بس مہک کا ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں پکڑا کر چپکے سے نکل جاؤں گی۔'

••

مجھے نہیں معلوم، داستان، قصے کہانیوں کی اب تک کی تاریخ میں ایک بیوی نائیکا یا ہیروئن کیوں نہیں بنتی — ؟

مرد کی زندگی میں آنے والی دوسری یا تیسری عورت ہی 'نائیکا' یا ہیروئن کیوں بنتی ہے۔ کیا صرف اس لیے کہ ایک مکمل زندگی کے ساون اور سپنے اپنے مرد کو بانٹتے ہوئے وہ کہیں کھو جاتی ہے۔ مگر اپنی تکمیل کے ساتھ ایک ہی گھر میں ہر لمحہ، دکھ سکھ کی سب سے بڑی ہیروئن وہی رہتی ہے۔

میں کسی بھی طرح کے ایلیوژن یا ڈائیلما میں نہیں تھا —

محبت کے جھرنے اور بارش سے الگ میں ترانہ کے تمام رنگوں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس دن — شاید میرے جذبات مہک تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے آخری بار پوچھا تھا —

'بولو۔ میں دہلی آجاؤں؟ میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی سائیاں۔ معاشی طور سے بھی نہیں۔ بس تمہارا ساتھ، تمہارا وجود چاہیے۔ ہاں۔ یا نا...... مجھے اسی لیے تمہارا جواب چاہیے۔'

میرے اندر کسی بھی طرح کے پٹاخے یا آتش بازی کے چھوٹنے کی کوئی آواز نہیں تھی......

میں نے آہستہ سے ٹائپ کیا — بہت سوچ سمجھ کر — 'نہیں'

مہک 'سائن آؤٹ' کر گئی تھی۔ کیم پر اندھیرا تھا۔ مہک غائب تھی —

تبسم اور میرا سچ

ہم ہیں تو کہانیاں ہیں۔ ایک وقت آتا ہے جب کہانیاں پیچھے چھوٹ جاتی ہیں۔ نیا، مہک احمد اور بھی کتنے نام...... یہ سب پیچھے چھوٹ گئے۔ اب ہمارا ایک ۱۸ سال کا بیٹا ہے۔ عشق ابھی بھی آواز دیتا ہے تو تبسم مسکراتی ہوئی میری آنکھوں میں اتر جاتی ہے۔

'تم عشق سے الگ ہو ہی نہیں سکتے۔ عشق تمہیں مضبوط کرتا ہے......'

مگر حقیقت یہ ہے کہ اول تا آخر یہ عشق صرف اور صرف ایک ہی ذات سے رہا۔ عرصہ پہلے میں نے سوچا تھا۔ تبسم کو لے کر ایک ناول لکھوں گا۔ یہ قرض ابھی باقی ہے۔ مگر یہ بھی سوچتا ہوں کہ ناول کا قرض ادا کرنا مشکل ہے۔ تبسم پر ناول لکھنا آسان نہیں۔ جب زندگی مجھ پر اپنے راستے تنگ کر دیتی ہے۔ تاریکی مسلط ہو جاتی ہے تو ایسے میں تبسم کسی جادوگر کی طرح اپنی طلسمی پوٹلی سے رات کی جگہ دن کے چراغ نکال لیتی ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

لیکن وہ طلسمی چراغ سے ایک ایسی دنیا برآمد کر لیتی ہے جس پر مجھے ہمیشہ سے ناز رہا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہاتفی ہے اور میری طاقت بھی۔

تبسم اور میری ملاقات کب ہوئی، اب مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں۔ یاد اس لیے بھی نہیں کہ یہ محض جنوں جنوں کا ساتھ نہیں ہے، یہ کچھ اور بھی ہے، جسے

یا تو میں سمجھتا ہوں یا تبسم سمجھتی ہے — بیتے گزرے وقتوں کی وہ اداس پت جھڑ کے دنوں کی گرمیاں تھیں، جب ہم اچانک ایک دوسرے سے ٹکرائے اور آنکھوں نے سرگوشیاں کیں...... کہ زندگی کے جن پر اسرار حسین لمحوں کی تلاش میں تم سرگرداں ہو، وہ لمحے یہیں کہیں رکھے ہیں — اٹھو اور آگے بڑھو —

تبسم نے تب لکھنا شروع کیا تھا اور میں نے ''بیسویں صدی'' ''شمع'' جیسے نیم ادبی جرائد سے آگے بڑھ کر ادب کے خاردار جنگلوں میں پناہ ڈھونڈنی شروع کی تھی۔ اس وقت کا میں کچھ اور تھا۔ میرے احساس کچھ اور تھے۔ گھنگھریالے، ہوا میں اڑتے ہوئے بال — جاذب نظر چہرہ — ایسا اپنے بارے میں، میں سوچتا تھا — آج اس طرح کی کوئی خوش فہمی نہیں ہے — آرہ جیسے چھوٹے شہر میں قیام کے باوجود گفتگو کا ایسا قرینہ جو اچھے اچھوں کو اپنی جانب کھینچ لیتا اور ان سب سے بڑھ کر ادب تخلیق کرنے کا احساس...... خوش فہمیوں کے کچھ ایسے جنگل میرے آگے دور دور تک پھیلے تھے کہ بس خواب تھا اور میں تھا اور ایک آنکھوں کو خیرہ کرنے والی حسین جنت تھی — تب عمر کا بائیسواں سال تھا اور میں کہانی لکھنے بیٹھتا تھا...... 'وحشت کے بائیس سال'...... اور تبسم میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی پوچھ رہی تھی...... ''فلسفوں کے ایسے عجیب وغریب موتی کہاں سے چن کر لاتے ہو تم؟''

سچ تو یہ ہے کہ ان بائیس برسوں میں زندگی خوبصورت تو تھی مگر ایک حسین آمد نے اس ہنستی بولتی زندگی کو کچھ زیادہ ہی حسین اور خوشگوار بنا دیا —

آرہ جیسے چھوٹے شہر میں تبسم سے ملنا تھا کہ نت نئے شگوفوں کے دروازے وا ہو گئے — وحشت کے خاردار راستوں سے گزرنے کے بعد احساس ہوا تھا کہ ہم اب بھی تنگ نظری کے اندھیرے مکان میں قید ہیں — اور مکان سے باہر بلوائی قسم کے لوگ خونی آنکھیں لیے ہمیں دیکھ رہے ہیں — میں نے ان چند برسوں میں سیکھا کہ زندگی کو جتنا سہل سمجھتا آیا تھا دراصل زندگی اتنی ہی دشوار چیز ہے — تب بھی تبسم کسی باغی لڑکی کی طرح میرے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی — ڈرو مت۔ اپنی کہانیوں کی طرح ہمت والے بنو — میں ہوں نا...... پھر ڈرتے کیوں ہو؟''

تبسم سے میری ملاقات کیسے ہوئی یہ بہت دلچسپ کہانی ہے۔ ۸۲ء میں امی جان کا انتقال ہو گیا۔ تب ہم مظفر پور میں تھے۔ ابا حضور مشکور عالم البصیری آر ڈی ڈی ای کی پوسٹ پر تھے۔ ابی کو کوارٹر ملا ہوا تھا۔ یہ ہماری زندگی کے اگر سب سے خوبصورت دن تھے تو بدصورت ترین بھی — امی حضور کی ناگہانی موت ہم بھائی بہنوں میں سے کوئی بھی نہیں جھیل پایا — امی میرے لیے کیا تھیں، اسے بتا پانا لفظوں سے باہر کی بات ہے۔ وہ سب کچھ تو تھیں۔ میری کہانیاں — میرا آج جیسا بھی ہے، امی کی تمام، سب سے اچھی دعاؤں کا ہی ثمرہ ہے — ۸۴ء میں ابا ریٹائر ہو گئے — ہم آرہ آ گئے — تب تک میں گریجویشن کر چکا تھا — زندگی کی جو نازک سی ڈال میرے حصے میں آئی تھی، وہ بار بار تقاضا کر رہی تھی...... کہ میاں زندگی ایک حقیقت اور بھی ہے — مگر اس حقیقت سے الگ میں

افسانوی حقیقت کو زیادہ قبول کر رہا تھا — جہاں اونچی اڑانیں تھیں — کئی منزلہ عمارتیں تھیں — تب ایک دن اچانک ایک چھوٹا سا لڑکا میرے پاس کسی لڑکی کی کہانی لے کر آیا...... کہانی میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے لکھا گیا تھا — ''دیکھیے گا میں لکھ سکتی ہوں یا نہیں''

تب آرہ کے چھوٹے سے سمٹے سکڑے ماحول میں رہنے والا میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے شہر کی کوئی لڑکی بھی اس طرح افسانے لکھ سکتی ہے — یا مجھے بھیج سکتی ہے — میں نے افسانہ پڑھا اور پڑھتا چلا گیا — افسانہ میں کوئی خاص بات نہ تھی مگر افسانے نے جس طرح احساس کا لبادہ زیب تن کیا تھا، وہ میرے لیے چونکانے والا تھا — سچ کہوں تو پہلی بار میں ہی تبسم کا فین بن گیا — ادھر تبسم میری تحریروں کی فین ہوتی چلی گئی۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا اگر ایک دلچسپ راز کی بتاؤں — میری لکھاوٹ بہت خراب ہے اور خاص کر جب میں جلد بازی میں لکھتا ہوں تو شاید اللہ کے فرشتے بھی میری تحریر نہ پڑھ سکیں۔ لیکن یہ بندی تو غضب کی واقع ہوئی تھی — میرے دستخط کر ڈالتی تھی۔ میری اچھی بری ہر طرح کی تحریر پڑھ ڈالتی تھی — اور حد تو تب ہونے لگی جب میری کہانیوں پر بھی نکتہ چینی کرنے لگی — اب دل کرتا تھا، اس پاگل سی، انوکھی سی لڑکی سے ملا جائے — میں تبسم کے گھر پہنچا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر آواز لگائی اور سر پر دوپٹہ ڈالے ایک دبلی سی، مہربان چہرے والی لڑکی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی — میں بولتا رہا، بولتا رہا، وہ چپ چاپ سنتی رہی — مجھے یاد ہے، پہلی بار میں اس نے میرے سامنے بہت کم مکالمہ ادا کیا تھا۔

خیر، چند ملاقاتوں میں ہی تبسم کے اندر کی باغی سرکش لڑکی مجھے صاف صاف نظر آنے لگی — تب بھی، جب تبسم کے گھر آنے جانے سے ہمارے تذکرے کچھ زیادہ ہی زور پکڑنے لگے اور میں نے آنا جانا کم کر دیا — تو ایک روز وہ مجھ پر بہت بری طرح ناراض ہوئی — اس طرح تو تم دوسروں کو اور شہہ دے رہے ہو — یہاں بیٹھ کر تو ہم گھنٹوں ادب کی ہی بات کرتے ہیں۔ اس میں غلط کیا ہے — تمہاری کہانیوں کے سارے ہمت ور کردار ایسے موقعوں پر کہاں کھو جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے کہنے دو، تم جھوٹ لکھتے ہو......'

یہ وہ دور تھا جب تبسم کو اپنی کہانیوں میں اتارتا ہوا میں بچھو کہانی لکھ رہا تھا...... سچ کیا ایسا ہوتا ہے؟ وہ سونے کا تاج کہاں ہے؟ وہ کمخواب اور مخمل کا بستر کہاں ہے اور تبسم غصے میں کہتی ہے...... ''نہیں تم ہارنے لگے ہو'' — (بچھو کہانی)

بیشک میں زندگی میں کئی مقام پر ہارا۔ کئی مقام ایسے بھی آئے جب ہارتے ہارتے بچا ہوں — اور ایسے ہر مقام پر سوچتا ہوں تبسم کا ساتھ نہ ملا ہوتا تو شاید کمرے کی ویرانی اور اپنے اندر کی خاموشی سے سمجھوتا کر چکا ہوتا — امی کے انتقال کے بعد ہر موڑ، ہر منزل پر تبسم میرے لیے ایک مضبوط چٹان کی مانند سہارا دینے کو تیار رہی ...... تب کی تبسم اور تھی — میری تحریروں پر ہر آن فدا ہونے والی، قصیدہ پڑھنے والی۔ لیکن یہ کل کی بات تھی — جب ہم ہمیشہ کے لیے ایک نہیں ہوئے تھے — اور زندگی کی اہم ترین سرد و گرم جنگ لڑ رہے تھے — اور یہاں بھی سارے مضبوط فیصلے تبسم نے ہی کیے۔ ہاں اس زمانے میں جب اس

نے لکھنا شروع کیا تھا، وہ بار بار اپنی تحریروں پر ناراض ہو جایا کرتی...... ''ایسا کیوں ہے مشرف، ان میں جان نہیں آ پا رہی ہے۔ سمجھ نہیں پاتی ہوں۔ اس زبردست چنگاری کی میرے یہاں کہاں کمی رہ جاتی ہے'' — وہ خود کو ٹٹولتی تھی، اپنا محاسبہ کرتی تھی۔ اس زمانے میں اس نے کئی نظمیں لکھیں۔ بہت پیاری، جذباتی بھی ...... وہ نظموں میں مجھے زیادہ پسند تھی۔ اس لیے جب کہانی کی بات آتی تو میں اس کے سامنے ایک سخت نقاد بن جاتا — ''نہیں تبو، یہ نہیں چلے گا — تم اچانک زندگی سے دور کیوں ہو جاتی ہو؟''

میری تنقید اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک طرح سے تبسم کہانی سے کنارہ کش ہوتی چلی گئی۔ نہیں۔ آپ غلط سمجھے۔ اس نے لکھنا بند نہیں کیا۔ وہ زبردست آگ کی منتظر رہی۔ وہ اس سلگتی چنگاری کے انتظار میں رہی اور اب بھی ہے — جو اسے ایک شاندار کہانی دے جائے — اس درمیان اس نے نظمیں کتنی جاری رکھیں۔

شادی کے بعد ہم دلی آ گئے۔ ظاہر ہے اب ذمہ داریاں بڑھی تھیں اور اپنے وسائل کو مزید پھیلانا ضروری تھا۔ دلی کی اس چار سالہ زندگی میں تبسم میرے لیے ایک ایسی ڈھال ثابت ہوئی جو بھیانک سے بھیانک طوفان کا مقابلہ کر سکنے کی ہمت رکھتی ہو۔ اس نے دوردرشن کے لیے فلمیں لکھیں — ڈاکومینٹری بنائی، خود ہدایت بھی دی۔ گھر پر وہ ایک بہترین دوست تھی، ایک لاجواب ساتھی تھی اور میری کہانیوں کی زبردست نقاد — کبھی کوئی چیز میں مسلمانوں کے فیور میں لکھ ڈالتا تو وہ غصہ ہو کر کہتی — آخر ہو نا کیمونل — تم لوگ صحیح سوچ ہی نہیں سکتے۔

ایک دلچسپ بات بتاؤں ۶ دسمبر ۹۲ء بابری مسجد ٹوٹنے کے بعد میں نے ایک کہانی لکھی — میرا ملک گم ہو گیا ہے — یہ کہانی میں نے ایک ادبی رسالہ کے مدیر کو بھیجی تو تبسم نے فوراً ہی مدیر کو میرے خلاف خط بھیج دیا کہ اسے شائع مت کیجئے گا۔ میرے ایک عزیز ترین دوست کے سامنے بھی مجھ پر بری طرح خفا ہو گئی کہ آخر تم نے کشمیر سے ہجرت کیے ہوئے ہندوؤں پر کیوں نہیں لکھا؟

تبسم تخلیقی اور عملی دونوں زندگیوں میں توازن کی قائل ہے۔ میں کس کس کا ذکر کروں۔ میں تو مجسم تبسم کا فین ہوں اور سچ کہوں تو تبسم کو میں نے بیوی کبھی سمجھا ہی نہیں۔ ایک پیاری پیاری سی دوست سمجھا — ہمیشہ — مجھے یاد ہے، ایک بار ہمارا بھانجہ پٹنہ سے دلی آیا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بولا — ''ماما آپ لوگ تو میاں بیوی لگتے ہی نہیں......''

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تبسم میری کہانیوں کی محرک ضرور ہے لیکن میں تبسم کے لیے کبھی محرک ثابت نہیں ہوا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کہتی ہے — تم نے اتنی تنقید کی کہ میرا لکھنا کم ہو گیا — وہ جب موڈ میں ہوتی ہے تو زیادہ تر نظمیں ہی لکھتی ہے۔

نعرۂ مستانہ خوش می آیدم
تا ابد جاناں چنیں می بایدم

اے محبوب، میں تو اس نعرۂ مستانہ پہ فدا ہوں اور قیامت کے روز تک اسی وارفتگی پر نثار کہ عشق ہر بار مجھے زندگی دیتا ہے۔ اور یہ عشق ہے جو اسی ایک نام سے شروع اور اسی ایک نام پر ختم بھی ہے۔ ☆☆

قصہ دِلّی کی ایک خوش جمال شاعرہ اور چار شاعروں کی دیوانگی کا

(۱)

قریباً ۲۵ سال قبل دہلی میں ایک خوش شکل، خوش عقل، خوش آواز اور آفتِ جاں شاعرہ کا بول بالا تھا۔ اکثر شعراء اس شاعرہ کے در دولت پر اس امید میں سلام کے لئے حاضری دینے جاتے تھے کہ شاید اسی بہانے اس زہرہ جمال۔ سراپا غزل کی ایک جھلک نظر آ جائے۔ یہ شاعرہ قوم کی پٹھان، بات کی دھنی، دوستوں پر جان دینے والی اور جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی دل کی صاف بھی تھی۔ تلون مزاجی حسن کا خاصہ ہے۔ خودستائی، خودنمائی ہمیشہ حسن کی کنیزیں رہی ہیں۔ خوشامد اور تعریف حسن اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ اس شاعرہ کی مقوی حسن مسکراہٹ پر اکثر شعراء سر مشاعرہ کلام سناتے سناتے اپنی یادداشت کھو بیٹھے تھے۔ مرحوم شنکر لال، جناب شنکر پرشاد آئی سی ایس (ریٹائرڈ) سابق چیف کمشنر دہلی، جناب جوش، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، مرحوم ڈاکٹر کاٹجو (اس وقت کے ہوم منسٹر)، ساحر ہوشیار پوری، بچا سیٹھ پریم نارائن اور دیگر کئی سخنور، سخن شناس، اور سرکردہ حضرات اس شاعرہ کی قدر کرتے تھے۔ غرضیکہ یہ صاحبہ اس وقت دہلی کی ادبی محفلوں کی جان تھیں۔

حکیم خلیل الرحمن ناؔر دہلی کانگریس کی ناک تھے، الیکشن میں یہ محترمہ حکیم صاحب کے مقابلہ میں کھڑی ہو گئیں۔ ظاہر تھا کہ کانگریس حکیم صاحب کی شکل میں پٹ جاتی۔ ہر ممکن ترکیبیں کی گئیں کہ کسی طرح اس شاعرہ کو حکیم صاحب کے حق میں بٹھا دیا جائے مگر بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ پولنگ سے صرف ایک روز پہلے دلّی کانگریس کے کارکنان کو ایک ترکیب سوجھی اور وہ رات کے ایک بجے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی کوٹھی پر پہنچے۔ اور ان سے درخواست کی کہ اگر آپ اس شاعرہ سے کہیں گے تو وہ الیکشن سے کنارہ کش ہو جائیں گی۔ کنور صاحب اس وقت مجسٹریٹ تھے۔ لہٰذا انہوں نے کانگریس کے اس وفد کے زور دینے پر اپنے ڈرائیور کو گاڑی دے کر رات کے دو بجے ان صاحبہ کے ہاں بھجوایا کہ ان سے کہئے کہ ایک نہایت ضروری کام ہے اسی وقت تشریف لائیے۔ یہ خدا کی بندی رات کے 2½ بجے کنور صاحب کی کوٹھی پر پہنچیں تو ڈرائنگ روم میں دہلی کے سکہ بند کانگریسیوں کو دیکھا اور انہیں میں سے اپنے الیکشن حریف کو بھی۔ غصہ سے ان کا حسن اور بھی چمک اٹھا۔ کنور صاحب نے نہایت معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے ان سے کہا کہ یہ میری خواہش ہے کہ آپ الیکشن نہ لڑیں۔ یہ صاحبہ اپنی روایتی مقوی حسن اور حکیم نار کے لئے مقوی الیکشن مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگیں' کنور صاحب! اگر

آپ ایسا چاہتے ہیں تو میں الیکشن پر لعنت بھیجتی ہوں۔ لائیے کاغذ تا کہ لکھ دوں کہ میں مقابلہ سے دستبردار ہوتی ہوں۔ کانگریسی وفد کے سربراہ کے لٹکے ہوئے چہرے کی یکدم کایا کلپ ہوگئی۔ اس وفد کے سربراہ نے کرنسی نوٹوں کی ایک گڈی ان صاحبہ کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے جو اخراجات وغیرہ ہوئے ہیں وہ قبول کر لیجئے۔ بس اتنا کہنا تھا کہ یہ پٹھانی جلال میں آگئیں اور کہنے لگیں۔ اگر کرنسی نوٹوں سے سودا کرنا تھا تو پھر میرے محسن کنور صاحب کے ہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تم میری نہیں کنور صاحب کی توہین کر رہے ہو اور نوٹوں کی گڈی وفد کے ارکان کے منہ پر مارتی ہوئی یہ جا وہ جا۔ اسی ایک واقعہ سے اس پٹھان نژاد شاعرہ کی بلند اخلاقی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

شاعر جتنا زیرک اور بلند پرواز خیالات کا مالک ہوتا ہے عشق کے معاملہ میں اتنا ہی غیر معاملہ فہم، جلد باز اور اناڑی ہوتا ہے مگر سمجھتا یہی ہے کہ دنیا کی ہر لڑکی اور عورت اس پر مرتی ہے۔ آیئے کچھ ایسے شعرائے کرام کے پُر لطف ذکر سے لطف اندوز ہوجئے جو اس شاعرہ سے ہوائی عشق فرماتے رہے۔

مرحوم بسمل سعیدی ان شاعرہ پر بری طرح عاشق ہوگئے حالانکہ ان دونوں کی عمر کا فرق پچیس تیس سال سے زائد کا تھا۔ بسمل صاحب ان کا نام لے کر روتے تھے اور ہر وقت ان کے نام کا ورد کرتے کرتے ایسے ایسے بے پناہ شعر فرمانے لگے کہ بسمل واقعی بسمل ہوگئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس واردات قلبی کے دور میں بسمل صاحب نے جو غزلیں کہیں وہ ان کے سارے کلام میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ دہلی کالج میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں یہ تخصیص رکھی گئی تھی کہ ہر شاعر اپنا کلام سنانے سے پہلے اپنے نظریہ شاعری سے متعلق چند حرف کہے۔ چنانچہ جب بسمل سعیدی صاحب مائک پر تشریف لائے تو گلزار دہلوی اپنی روایتی چرب زبانی سے مجبور ہوکر چلا کر کہنے لگے۔ بسمل صاحب آپ کا نظریہ شاعری تو فلاں صاحبہ ہیں۔ اس پر ایک زور کا قہقہہ لگا اور بسمل صاحب ہائے کہہ کر غزل کے دو چار اشعار سنا کر بیٹھ گئے۔ مگر یار لوگوں نے ان محترمہ سے اس واقعہ کی تفصیل اور بھی نمک مرچ لگا کر بیان کی۔ مرحوم لالہ دیش بندھو گپتا مالک ''تیج'' کی کوٹھی پر جشن جمہوریت کا مشاعرہ تھا۔ وہاں یہ شاعرہ بھی مدعو تھیں اور بدقسمتی سے گلزار دہلوی بھی۔ اپنے بھانجے سے مخاطب ہوکر فرمانے لگیں...... اتار دے چینٹ اس مرغی والے کی۔ اہل خانہ اور دوسرے اصحاب نے بیچ بچاؤ کرایا اور معاملہ رفع دفع کرا دیا گیا۔ مگر کچھ دنوں بعد اردو بازار جامع مسجد مولوی سمیع اللہ مرحوم کی دوکان پر ایک مجمع دکھائی دیا۔ دیکھا تو واقعی ان صاحبہ نے اپنے بھانجے سے گلزار صاحب کی چینٹ اتروادی تھی۔ دیکھتے ہی کہنے لگیں۔ سرور صاحب ایمان سے کہنا اس نے دہلی کالج کے مشاعرہ میں کیا کہا تھا۔ معاملہ کی نزاکت۔ ان صاحبہ سے نہایت قریبی تعلقات۔ سچائی کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھی غرضیکہ کئی مصیبتوں میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پاکر ان صاحبہ کو نہایت نرمی سے سمجھایا کہ اب اسے معاف کردیں۔

ایک مشہور شاعر یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ یہ صاحبہ ان پر دل و جان سے مرتی ہیں۔ حالانکہ ان شاعر صاحب کی اپنی بیوی کو یہ شکایت رہی کہ یہ حضرت ازدواجی زندگی کو خوش اسلوبی سے نبھانے کے قابل نہیں ہیں مگر یہ ایک

خاصہ ہے کہ جنسی طور کمزور مرد اپنی مردانگی کے خودساختہ افسانے سنانے میں کسی پیشہ ور قصہ گو سے کم نہیں ہوتا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ان شاعر صاحب اور ان کی بیوی میں یہ معاہدہ قرار پایا ہے کہ جنسی طور پر دونوں آزاد ہیں۔ راقم الحروف نے اس شاعرہ سے جب ان شاعر صاحب کے اس ون وے ٹریفک قسم کے عشق کا ذکر کیا تو فرمانے لگیں۔ آج شام کو گھر آنا ان شاعر صاحب سے اپنے جوتے اٹھوا کر دکھاؤں گی۔ چنانچہ شام کو خلاف معمول جب اڈیٹر "شانِ ہند" ان محترمہ کے گھر گیا تو ڈرائنگ روم میں ان شاعر صاحب کو تشریف فرما پایا جو اپنے اس نیاز مند کو دیکھ کر اچانک چونکے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ محترمہ غسل فرما رہی ہیں۔ اس دوران شاعر صاحب سے ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پون گھنٹے کے بعد یہ صاحبہ نہا کر ایوننگ ان پیرس میں بسی ہوئی سفید ساڑھی میں —— بادِ بہاری بنی غسل خانہ سے برآمد ہوئیں تو بناوٹی طور پر بڑی حیرت سے دریافت کرنے لگیں۔ سرور صاحب کیسے تشریف لانا ہوا۔ عرض کیا آج کل آپ کے عاشقوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ سوچا ہم بھی قسمت آزمائی کر کے دیکھیں۔ یہ سنتے ہی ان صاحبہ نے جو مسلسل قہقہے لگائے ہیں۔ وہ غمازی کر رہے تھے کہ وہ ان ہوائی عاشقوں کی حماقت سے بخوبی واقف ہیں۔ ملازم کو چائے لانے کا حکم دے کر جوتوں کے اسٹینڈ پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ان شاعر صاحب سے نہایت التفات سے کہنے لگیں ...... آج تو ہم آپ کی نظر انتخاب کا امتحان لیں گے۔ لہٰذا فرمایئے اس لباس کے ساتھ ہم کون سا جوتا پہنیں۔ یہ اعزاز پانے پر شاعر صاحب نے اسٹینڈ پر رکھے پچاسوں مختلف قسم کے جوتوں پر یوں محققانہ نظر ڈالی جیسے ڈاکٹر اقبال پر ریسرچ کر رہے ہوں۔ کم وبیش دس منٹ کی گہری دیکھ بھال کے بعد شاعر صاحب ایک سینڈل کی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے فرمانے لگے: بیگم صاحبہ مجھے مشکل سے مشکل زمین میں بھی غزل کہتے ہوئے اتنی فکر کی ضرورت نہیں ہوئی جتنی آج آپ کے اس لباس سے میچ کرتے ہوئے جوتے کے انتخاب کے لئے۔ بیگم صاحبہ نے ان شاعر صاحب کے حسنِ انتخاب کی داد دیتے ہوئے زہد شکن انداز میں فرمایا۔ ذرا اسے اسٹینڈ سے اٹھا کر ہمیں دے دیجئے۔ عشق نے حسن کا یہ فرمان پا کر کشاں کشاں یہ سینڈل اٹھا کر حسن کے قدموں کے قریب لا کر رکھ دی اور حسن نے اپنی غزالی آنکھوں کو گھماتے ہوئے مجھے دیکھا اور میں ان شاعر صاحب کے اس سینڈلی ریسرچ اور ہوائی عشق پر دل ہی دل میں ہنستا ہوا لپٹن گرین لیبل چائے کی خوشگوار چسکیاں لینے لگا۔ یہ صاحب ان صاحبہ کا عطا کردہ رومال ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے اور فخریہ رومال کو دکھایا کرتے تھے۔

ایک اور شاعر جو خدا کے فضل سے ایک دو نہیں سینکڑوں قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا رہتے ہیں ان صاحبہ سے دل ہی دل میں عشق کرنے لگے اور ہر روز وقت مقررہ پر ان کے ہاں حاضری دینا ان کا معمول بن گیا۔ یہ صاحب تشریف لاتے اور گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے۔ اگر بیگم صاحبہ کے فرمان پر ملازم نے چائے لادی تو انہوں نے شکریہ کے ساتھ پی لی۔ اگر کسی دن چائے کے ساتھ مٹھائی یا بسکٹ مل گئے تو یہ شاعر صاحب دل ہی دل میں سمجھتے کہ ان کی

خاموش دن دے محبت اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ کچھ دنوں بعد بیگم صاحبہ کو شرارت سوجھی تو انہوں نے ملائمت سے پوچھا اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو بیئر پیش کی جائے۔ شاعر صاحب نے سمجھا حسن پر عشق کا جادو چل گیا ہے۔ فرمانے لگے: جو آپ کا دل چاہے پلا دیجئے۔ شاعر صاحب بیئر تو کیا جس زمانے میں جانی واکر سولہ روپے کی بوتل ملا کرتی تھی تب سے پینے پلانے کے آداب سے واقف تھے۔ بیئر کا گلاس جو سامنے آیا تو فرمانے لگے اگر اسمیں تھوڑی سی وسکی بھی ڈال دی جائے تو بیئر کاک ٹیل کا مزہ دے جائے گی۔

بیگم صاحبہ کی چھٹی حس پھڑکی، اور انہوں نے یکے بعد دیگر چار پیگ وسکی کے پلا دئے ان شاعر صاحب کو۔ اور جب شراب کے نشے کے باعث شاعر صاحب کے کالے رنگ میں اور گہرا پن آنے لگا تو بیگم صاحبہ نے کسی قدر دلکش انداز میں دریافت فرمایا...... صاحب آپ ہر روز تشریف لاتے ہیں۔ کوئی بات تک نہیں کرتے۔ اگر کوئی ضرورت ہو اور میں آپ کے کام آسکوں تو حکم کیجئے میں حاضر ہوں۔ شاعر صاحب نے موقع غنیمت جانا اور مینا کی سی نرم اور لطیف زبان میں گذارش کی ''مجھے آپ اچھی لگتی ہیں''۔ بیگم صاحبہ نے یہ سنا تو اپنے غصہ کو بڑی مشکل سے احاطۂ ضبط میں رکھتے ہوئے ملازم سے بولیں۔ ان کو باہر کا راستہ دکھا دو اور کہہ دو پھر یہاں بھولے سے بھی تشریف نہ لائیں۔

(۲)

......اتنا تو میرؔ نے دیکھا

مرحوم رسالہ ''شعلہ و شبنم'' کے مدیر مسئول جناب گوہر دہلوی بھی اپنے دل و دماغ کے اکثر گوشوں میں ان بیگم صاحبہ کے تئیں مختلف زاویوں سے عشق کی منازل طے کر رہے تھے مگر ایک تو جینی ہونے کے ناطے ان میں یہ ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ اپنے عشق کا اظہار کھل کر سکتے۔ دوسرے ان کی صرافی کی دوکان تھی اور یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر بیگم صاحبہ پر ان کے جینیانہ عشق کا راز فاش ہو گیا تو صرافی کی جگہ شاید مونگ پھلی بیچنی پڑے۔ اس لئے یہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے عشق کا گلا دباتے رہے۔ مگر برا ہو شاعرانہ مزاج کا کہ وہ انہیں کسی نہ کسی بہانے بیگم صاحبہ کی بارگاہ حسن تک لے ہی جاتا۔ تخلص تو ان کا گوہرؔ ہے مگر شاعری کے لحاظ سے گوبر تھے۔ گوہر صاحب ہر سال مہاویر جینتی کے مبارک موقع پر ایک مشاعرہ بھی کراتے ہیں۔ لہٰذا اس مشاعرہ میں بطور خاص ان بیگم صاحبہ کو مدعو کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ گوہر صاحب بیگم صاحبہ کے لئے سی آئی ڈی کا کام بھی کرتے تھے یعنی 'تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے' کے مصداق انہوں نے بیگم صاحبہ کے ہاں اکثر و بیشتر اوقات حاضری دینے کا یہ طریقہ نکالا کہ انہیں سچ یا جھوٹ یہ اطلاعات بہم پہنچاتے کہ کس شاعر نے بیگم

صاحب کے خلاف کیا کچھ کہا۔ ازل سے آج تک کسی بھی ایسی عورت نے جنم نہیں لیا جو خوشامد پسند نہ ہو۔ یا اپنے بارے میں عوامی رائے جاننے کی متمنی نہ ہو اور عورت کی یہ فطری فضیلت تا ابد قائم رہے گی۔ چنانچہ گوہر صاحب کی سی آئی ڈی سے بیگم صاحبہ خوش تھیں اور انہیں اس خدمت کے صلہ میں چند قہقہے، دو چار پرکشش مسکراہٹیں اور گھٹیا شعروں پر بڑھیا داد کا مل جانا ہی ان کے اندرونی عشق کی کافی حد تک تکمیل کر دیتا تھا۔ چنانچہ گوہر صاحب اپنی خبر رسانی کے دوران کئی مرتبہ ایڈیٹر شانِ ہند کے خلاف بھی بیگم صاحبہ کے کان بھرتے رہے۔ جس کی اطلاع ایڈیٹر شانِ ہند کو بھی مل جاتی تھی۔ اس وقت تک راقم الحروف نے ان بیگم صاحبہ کو دیکھا تک نہ تھا مگر دہلی کی ادبی دنیا میں ان بیگم صاحبہ کے حسن تغزل اور ترنم کا سکۂ حسن شاہی یوں چل رہا تھا کہ جس کے سامنے حکومتِ ہند کا سکہ ماند پڑ رہا تھا۔ چنانچہ اس طلسم ہزار داستان کو دیکھنے کے لئے مہادیو جینتی کے مشاعرہ میں نیاز مند بھی شریک ہوا۔ اور دیدہ و دانستہ اسٹیج پر بیٹھا تاکہ اس آفتِ جاں کو قریب سے دیکھ سکوں۔ مشاعرہ شباب پر تھا کہ بیگم صاحبہ نصف شب کے قریب پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئیں۔ جینتی حضرات بظاہر مہذب اور پروقار انداز میں مشاعرہ سن رہے تھے۔ مگر شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہوگی جو ان بیگم صاحبہ کے حور وش انداز کی داد نہ دے رہی ہو۔ بیگم صاحبہ عالمِ رویا میں تھیں۔ آتے ہی گوہر صاحب سے اشارتاً کہا کہ ابھی پڑھوا دو۔ جو شاعر کلام سنا رہے تھے ان کی غزل اور ترنم ویسے ہی بیگم صاحبہ کے آتے ہی دم توڑ چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مقطع پڑھا اور بیٹھ گئے۔ گوہر صاحب نے مائک

266

سنبھالا اور بیگم صاحبہ کے تعارف میں اپنی تمام چرب زبانی ختم کرنے کے بعد انہیں کلام سنانے کی عاجزانہ درخواست کی۔ شاعری، شراب اور ترنم کی یہ تثلیث مائک پر آئی تو ہزارہا سامعین کا مجمع مبہوت ہو کر رہ گیا۔ غزل کا ہر شعر دل و دماغ کو چھونے والا۔ ترنم ایسا کہ اگر داؤد سن لے تو اپنی لحن بھول جائے۔ اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے گوہر صاحب نے اشاروں سے بیگم صاحبہ کو یہ بتا دیا تھا کہ سرور تونسوی یہ ہیں۔ یہ اندازہ مجھے بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ بیگم صاحبہ ابھی کلام سنا ہی رہی تھیں کہ میں چپکے سے اسٹیج سے اتر رکشا لے چاندنی محل کی طرف چل دیا کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ مشاعروں کی روداد میں جن شعراء کی پول کھولی جاتی ہے وہ چاہتے ہیں کہ بیگم صاحبہ سے سرور تونسوی کی بےعزتی کرائی جائے اور اس کی تصدیق بعد میں بیگم صاحبہ نے فرمائی۔

ہارڈنگ لائبریری میں مشاعرہ تھا۔ میں اور نقش صحرائی صاحب ٹکٹ خرید کر سامعین میں جا بیٹھے۔ مشاعرے کی روداد کے لئے میں مختصراً نوٹ لکھ رہا تھا کہ یکدم ہال میں سناٹا چھا گیا۔ جو شاعر کلام سنا رہے تھے وہ بھی خاموش ہو گئے۔ دیکھا تو یہ آفتِ جاں تشریف لائی ہیں۔ امریکی جارجیٹ کی سفید نُراق ساڑھی، گیسو تراشیدہ، آہو چشم، سرخ و سفید رنگ، ہونٹوں پر مشہور زمانہ 'ٹانگولپ اسٹک' کا سرخ رنگ چغلی کھا رہا تھا کہ جیسے ابھی کسی عاشق زار کا خون پی کر آئی ہوں۔ چال ایسی کہ ہر قدم پر ہزاروں دل فرشِ راہ بننے کی تمنا رکھیں۔ متشرع داڑھیاں ہلنی شروع ہو گئیں۔ نقش صحرائی فرمانے لگے...... سرور صاحب، یہ کون ہیں؟ عرض کیا کہ یہی وہ طلسم ہزار داستان ہے جنہیں نکہت باد

بھاری بھی اپنا حریف سمجھتی ہے۔ اس مشاعرہ کی روداد جب 'شانِ ہند' میں شائع ہوئی تو اس روداد میں اس شاعرہ کا ذکر جس پیرائے میں کیا گیا تھا اسے اتنا سراہا گیا کہ 'نرالی دنیا' اور دیگر کئی رسائل و جرائد نے اس حصۂ روداد کو شائع کیا جس پر حاسدوں نے بیگم صاحبہ کے کان بھرے کہ سرور تونسوی آپ کو اتنا بدنام کر رہا ہے کہ اب دوسرے رسائل و جرائد بھی سرور تونسوی کی وہ تحریر شانِ ہند سے اخذ کر کے شائع کر رہے ہیں۔ جس میں آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ مگر ان بدبخت حاسدوں کو نسوانی خاصیت کا تجربہ ہی نہ تھا کہ خدا نے آج تک ایسی عورت پیدا ہی نہیں کی جو اپنی تعریف سے خوش نہ ہوتی ہو یا اپنے آپ کو خوبصورت نہ سمجھتی ہو۔ چنانچہ یہ حاسد شانِ ہند کی روداد بیگم صاحبہ کو پڑھ پڑھ کر سناتے اور وہ دل ہی دل میں اپنے حسن، اپنے سراپا، اپنے کلام، اپنے ترنم اور فراخدلی کی تعریف سن سن کر ایڈیٹر شانِ ہند کی مداح بنتی گئیں۔

غالباً لال قلعہ کا ہی مشاعرہ تھا کہ جونہی یہ بیگم صاحبہ تشریف لائیں۔ بجلی فیل ہو گئی۔ جب شانِ ہند میں اس مشاعرہ کی روداد شائع ہوئی تو لکھا گیا کہ جونہی ...... صاحبہ مشاعرہ میں جلوہ افروز ہوئیں بجلی کے قمقمے ان کے حسن جہاں تاب کی جلوہ سامانی نہ دیکھ سکے اور انہوں نے ندامت سے اندھیرے میں منہ چھپا لیا۔ ہائے ظالم میرؔ نے اسی موقع کے لئے تو کہا تھا:

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

یار لوگ شانِ ہند لے کر بیگم صاحبہ کے پاس پہنچے اور انہیں سنایا کہ دیکھئے سرور تونسوی نے آپ کو کس انداز میں ...... بدنام کیا ہے۔ مگر بیگم صاحبہ کے دل و دماغ میں ایڈیٹر شانِ ہند کے لئے اور بھی جگہ بن گئی۔ چنانچہ انہوں نے ایک بہت بڑے افسر کو ایک پارٹی میں بتایا کہ جب کچھ کتے سرور تونسوی کے خلاف مجھے بھڑکانے آتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ ان کے منہ نوچ لوں اور افسر نے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر بیگم صاحبہ کو سنایا:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

تو دونوں نے قہقہے لگاتے ہوئے اپنے اپنے جام ہونٹوں کو لگا لئے۔

یہ حاسد حضرات ادھر تو بیگم صاحبہ کو میری تحریروں کو دکھا دکھا کر میرے خلاف بھڑکاتے اور ادھر مجھے روداد کے انداز تحریر پر داد دیتے ہوئے بیگم صاحبہ کے بارے میں لکھی گئی سطور پر کچھ اس انداز میں تبصرہ کرتے کہ جس سے وہ کچھ اور میری زبان سے سن کر وہاں آگ لگا سکیں۔ مگر میں اس سلسلے میں ہمیشہ محتاط رہتا ہوں کہ لکھتے وقت رعایت کرنا گناہ ہے اور زبانی طور پر جاہل مطلق کی بھی دل شکنی نہیں کرتا۔

(۳)

لیکن تو چیز دیگری

اوّلین جشنِ جمہوریت ۱۹۵۰ء میں لال قلعہ میں تین دن تک منایا گیا۔ یہ جشن اپنی نوعیت کا ایک یادگاری جشن تھا۔ اس جشنِ جمہوریت کے مشاعرہ میں مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو، ان کی ہمشیرۂ محترمہ مسز وجے لکشمی پنڈت، مسز پنڈت کی بھانجی رِینا پنڈت بھی تشریف لائے تھے۔ اس جشن کی مفصل روداد راقم الحروف نے لکھی جو اس وقت کے ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے اردو صحافت میں اپنا انفرادی مقام رکھنے والے ہفت روزہ 'ریاست' کی تین مسلسل اشاعتوں میں شائع ہوئی۔ 'ریاست' کے مدیر سردار دیوان سنگھ مفتون مرحوم ان دنوں سر شنکر لال آف دہلی کلاتھ ملز (مرحوم) اور جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ سے ناخوش تھے۔ سردار صاحب کی سرشت میں یہ خاصیت تھی کہ وہ اپنے کسی بھی اصلی یا مفروضہ دشمن کے دوستوں کو بھی اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ لہٰذا مجھے یہ ہدایت کی گئی کہ جشنِ جمہوریت کی روداد میں کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ چنانچہ یہ روداد اس انداز سے لکھی گئی کہ روداد نگاری میں نئے باب کا اضافہ ہوا۔

مجھ پر کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے احسانات تھے۔ اور کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ اس جشنِ جمہوریت کے مشاعرہ کی روداد میں کنور صاحب، سر شنکر لال صاحب اور ساحرؔ ہوشیار پوری صاحب اور دیگر کئی سرکردہ حضرات کے بارے میں ایسے ایسے ریمارکس تھے کہ جسے یار لوگوں نے مزے لے کر پڑھا۔ سردار صاحب نے میری گزارش پر یہ کرم ضرور فرمایا کہ یہ روداد میرے نام سے شائع نہیں کی۔ مگر جبکہ انھیں ملک کے ہر حصے سے اس روداد کی پسندیدگی کے بارے میں سینکڑوں خطوط موصول ہوئے تو انہوں نے 'ریاست' میں اعلان فرما دیا کہ یہ روداد سرور تونسوی ایڈیٹر شانِ ہند، دہلی کی لکھی ہوئی ہے۔ سردار صاحب نے یہ تمام تعریفی خطوط میرے پاس بھجوا دئے جنہیں پڑھتے ہوئے ایک خاص قسم کی خوشی محسوس ہو رہی تھی مگر اس کے ساتھ ہی میروں خون خشک ہو رہا تھا کہ کیسے کیسے لوگ سرور تونسوی کے دشمن ہو چکے تھے۔ ان دنوں اس آفتِ جاں شاعرہ اور جناب ساحر ہوشیار پوری کے تعلقات بادی النظر میں شکوک کی حدوں سے بھی آگے سمجھے جاتے تھے۔ ویسے شعرائے کرام ایسی باتوں میں غلط قافیے ملانے میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ تاہم ساحر ہوشیار پوری اور ان صاحبہ کے جو بے تکلفانہ تعلقات تھے، ان سے ہر صاحبِ نظر یہی اندازہ لگانے میں حق بجانب تھا جو عام طور پر مشہور تھا۔ اس مشاعرہ کے بعد ساحرؔ صاحب کاروباری سلسلے میں کلکتہ تشریف لے گئے۔ دو سال کے بعد ان کا مکتوبِ گرامی اڈیٹر شانِ ہند کو ملا کہ سرور تونسوی مشاعروں کی روداد لکھتے وقت دیوان سنگھی سیاست کا شکار ہو چکا ہے۔ لہٰذا جب تک میں آپ سے ملاقات نہ کرلوں یہ سلسلۂ روداد نگاری ملتوی رکھا جائے —— ساحر صاحب سے اس وقت یونہی واجبی سے

تعلقات تھے۔ مگر انہوں نے جس ہمدردانہ انداز میں خط لکھا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دل میں سرور تونسوی کے لئے واقعی دوستانہ بلکہ برادرانہ جذبہ رکھتے ہیں —— چنانچہ ساحر صاحب کے حکم کی تعمیل کی گئی —— دو ماہ بعد ساحر صاحب کا فون آیا کہ وہ دہلی تشریف لے آئے ہیں اور کراؤن ہوٹل فتحپوری میں قیام پذیر ہیں۔ لہٰذا شام کے چھ بجے کراؤن ہوٹل میں پہنچ جاؤں۔ رات کا کھانا ان کے ساتھ کھانا ہوگا۔

ان دنوں ساحر ہوشیار پوری صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، رات کا ڈنر شراب کے بغیر بے مزہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ کراؤن ہوٹل میں پہنچتے ہی بیئر سے معاملہ شروع ہوا اور اس کے بعد وسکی —— ہندوستان کی اردو صحافت —— اردو شاعری اور مشاعروں کی روداد پر جی بھر کر تبادلۂ خیال کیا۔

ساحر ہوشیار پوری، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے متعلق ایڈیٹر شان ہند کو تفصیل سے بتا رہے تھے دوستی، فراخدلی، مشکل کے وقت کام آنا، ایسی خوبیوں کا دوسرا نام کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ہے کہ اتنے میں یکا یک کمرے کا دروازہ اس انداز سے کھلا کہ جیسے آندھی کے زوردار جھونکے نے اپنی پوری طاقت سے دروازے کے پٹ چوپٹ کر دئے ہوں —— دیکھا تو سامنے حسن و شباب کا ایک پیکر اپنی پوری دلربانہ رعنائیوں کو اپنے جلو میں لئے معنوی حسن مسکراہٹ کے ساتھ دعوت نشاط دیتا ہوا نظر پڑا۔ شراب کے نشے میں مرد کی جمالیاتی حس باقی تمام حواس خمسہ پر غالب رہتی ہے۔ اور اس عالم میں عورت خواہ مٹی کی ہی کیوں نہ ہو روناً لیلیٰ نظر آتی ہے۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ راقم الحروف نے ان بیگم صاحب کو اس وقت سے پہلے اور پھر اس کے بعد اتنے حسین اور دلکش سراپے میں کبھی نہیں دیکھا۔ جوانی کے دنوں میں ساحر ہوشیار پوری کی مسکراہٹ بھی اپنا ایک ایسا ساحرانہ زاویہ رکھتی تھی کہ اکثر و بیشتر حسن سرکش نے اپنا سب کچھ اس مسکراہٹ کی نذر کر دیا۔ لہٰذا ساحر صاحب اپنی اسی ساحرانہ مسکراہٹ سے اس آفت جاں کا استقبال کر رہے تھے اور راقم الحروف کے کانوں میں کسی فلمی گانے کے اس گھٹیا مصرع

'یوں تو ہم نے لاکھ حسیں دیکھے ہیں تم سا نہیں دیکھا' کی آواز سے سنائی دیتی ہوئی ایسے معلوم ہوئی جیسے اس گھٹیا مصرع کے خالق نے سرور تونسوی کی طرف سے اس مجسمۂ حسن کی تشریف آوری پر نذر عقیدت کا گلدستہ پیش کر دیا ہو۔

ساحر صاحب ساحرانہ انداز سے اٹھے، عشق نے نذرانہ عقیدت پیش کیا اور دنیا کی تمام مسکراہٹوں کا یہ مرکز ادائے قاتلانہ کے ساتھ ایک کرسی پر تشریف فرما ہوا۔ ایوننگ ان پیرس کی خوشبو شراب کے نشے کے سرور کو اور بھی خوشگوار بنا رہی تھی۔ ساحر صاحب نے بڑے اہتمام سے پیگ بنا کر حسن کے حضور...... پیش کرتے ہوئے کہا...... انہیں تو آپ جانتی ہی ہوں گی —— فرمانے لگیں...... نہیں —— پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ ان سے واقف ہیں...... عرض کیا کہ واقف تو نہیں البتہ ایک دو مشاعروں میں دیکھا ہے...... کچھ تو یہ آفتِ جاں پہلے ہی عالم رویا میں تھیں۔ دو چار پیگ اور نوش فرما چکیں تو نہایت متانت سے فرمانے لگیں...... سرور صاحب میں آپ سے بہت اچھی

طرح واقف ہوں۔ آپ مشاعروں کی روداووں میں میرے بارے میں جو کچھ لکھتے رہے ہیں وہ بھی حرف بہ حرف مجھے یاد ہے۔ مجھے کوئی موقع میسر ہی نہیں آتا تھا کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرسکتی۔ آج ساحر صاحب سے دن میں ملاقات ہوئی تو یہ پروگرام بنایا گیا کہ ساحر صاحب آپ کو بلائیں اور آپ کو معلوم نہ ہونے دیا جائے کہ میں بھی یہاں آرہی ہوں کیونکہ اس کا خدشہ تھا شاید آپ میری وجہ سے آئیں ہی نہیں۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ نے مشاعروں کی روداد کو ایک الگ اور دلچسپ انداز میں لکھنے کی تعریف ایسے انداز میں فرمائی کہ شاید ہی کسی ادیب یا شاعر نے ایسی تعریف کی ہو۔ میں نے اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا تو بیگم صاحبہ نے چھٹا پیگ ختم کرتے ہوئے ان حاسدانِ کرام کی کرم فرمائیوں کی داستان سنانا شروع کی جو ایڈیٹرشانِ ہند کے خلاف بیگم صاحبہ کے کان بھرا کرتے تھے۔ ان شعرائے کرام نے بیگم صاحبہ کے عشق میں جو دلچسپ حماقتیں کی تھیں ان کی تفصیل بیگم صاحبہ نے اس دلکش انداز میں سنائی کہ ہنستے ہنستے رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ یہ تمام دلچسپ حقیقتیں آپ انہیں صفحات میں پڑھ سکیں گے۔

راقم نے اپنی زندگی میں دو عورتوں کو ایسا پایا کہ پوری بوتل وسکی پی جانے پر ان کے ہوش وحواس میں اور بھی تازگی آجائے۔ ان میں سے ایک یہ آفتِ جاں تھیں اور دوسری کا ذکر یہاں مناسب نہیں —— بارہ بجے تک کھانا ختم ہوا اور یہ محفل ختم ہوئی —— بیگم صاحبہ کا باقاعدہ تعارف اسی محفل میں ساحر صاحب کے طفیل ہوا۔

محولہ بالا واقعات سے آپ کسی حد تک غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہوں گے۔ اس لئے یہ واقعہ بھی سنتے جایئے کہ جناب ساحر ہوشیار پوری کی بیگم صاحبہ تشویشناک حد تک علیل ہوکر نرسنگ ہوم میں داخل ہوئیں تو یہی بیگم صاحبہ ایک تجربہ کار نرس کی طرح کئی دنوں تک بیگم ساحر کی تیمارداری میں اپنے آپ کو بھول گئیں اور یہ حقیقت ہے کہ جس اپنائیت اور نیک نیتی سے بیگم صاحبہ نے یہ تیمارداری کی اس کی تعریف ان کے دشمنوں نے بھی کی —— غرض کہ ان بیگم صاحبہ کو قدرت نے کچھ ایسی خوبیاں بھی عطا کی تھیں کہ آج جبکہ وہ ان کا ہوش ربا حسن وشباب سفید بالوں اور جھریوں میں تبدیل ہوگیا ہے اور مخمل واطلس کے بستر پر سونے والی یہ بلبل ہزار داستان آج ایک آستانے کے حجرے میں مقیم ہے، انہیں انتہائی عزت واحترام کے ساتھ سلام کرنے کو سر جھک جاتا ہے۔

(۴)

اے روشنیِ طبع تو برمن بلا شدی

جناب دھرم پال گپتا وفا ایڈیٹر ہفت روزہ 'تیج' ان بیگم صاحبہ کے ہاں آنے والوں میں 'حاضر باش' قسم کے ذہنی طور پر عشقیہ مریضوں میں سے تھے۔ وفا صاحب اپنے جلو میں فتح چند نسیم اور اسی قسم کے دو چار دیگر حواری ٹائپ کے جی حضوریوں کو بھی لئے رہتے تھے تاکہ بیگم صاحبہ کے ہاں کچھ دیر شعر وشاعری کی آڑ میں اپنے ذوقِ جمال کو دہلوی شرافت کے دائرہ میں تسکین پہنچا سکیں۔ جناب گوپال متل نے اپنی مشہور تصنیف 'لاہور کا جو ذکر کیا' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ...... لاہور کی ایک گانے والی طوائف نے اپنے ہاں آنے والے حضرات میں سے ایک مشہور، متین، اور شریف شاعر کے بارے میں کہا تھا کہ یہ صاحب تحریک کا جذبہ تو ہمارے ہاں سے لیتے ہیں اور اس پر عمل گھر جا کر کرتے ہیں۔ بالکل یہی کیفیت جناب وفا کی تھی۔

بیگم صاحبہ اب ایک دوسرے محلے میں مکان تبدیل کر آئی تھیں اور اس محلے کے مسلمان پرانی دہلوی تہذیب وتمدن کے دلدادہ تھے۔ اس زمانے میں متوسط درجے کی مسلمان عورتوں میں ساڑھی باندھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب جو اس محلے والوں نے ایک مسلمان نوجوان اور اس پر آفتِ جان چلتی پھرتی قیامت کو بغیر برقعہ کے ساڑھی میں ملبوس آتے جاتے دیکھا اور اس پہ طرہ یہ کہ اکثر و بیشتر شعرائے کرام کوئی گاندھی ٹوپی سر پر رکھے، کوئی شیروانی میں بنا سنورا، کوئی نفیس سوٹ پہنے تو کوئی شرعی پاجامہ کے باعث ٹخنے دکھاتا اس نووارد خاتون کے مکان پر تانتا باندھ کر آنے لگے تو محلے والوں نے ان صاحبہ کے بارے میں ادھر اُدھر سے دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اتفاقاً راقم الحروف کا مکان بھی اسی محلے میں تھا۔ ایک دو بار مجھے ان محترمہ کے ہاں آتے جاتے دیکھ کر محلے کے کچھ بڑے بوڑھوں (جن میں ہندو، مسلمان دونوں شامل تھے) نے ان صاحبہ کے بارے میں دریافت کیا تو انہیں سمجھایا گیا۔ آپ ایک مشہور شاعرہ ہیں، الیکشن کے جلسوں میں اچھی تقریریں کر سکتی ہیں۔ اس لئے برقعہ وغیرہ سے بے نیاز ہیں اور ان کے ہاں آنے والے حضرات سے آپ قطعاً مطمئن رہئے۔ وہ محلے کی بہو بیٹیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ پہلے ہی اپنی ذہنی غلط کاریوں کے باعث محض شعر کہنے تک ہی کی الٹی سیدھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میرے سمجھانے پر محلے کے مسلمانوں کی بے چینی کسی حد تک کم ہوگئی۔ مگر یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ اور پانچ چھ ماہ تک ان صاحبہ سے میری ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ ۱۹۵۲ء کی ایک دوپہر کو میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے کہ فلاں بیگم صاحبہ نے آپ کو دریا گنج کے تھانہ میں بلایا ہے۔ کچھ کریدنے پر پتہ چلا کہ محلے کے باشندگان نے بیگم صاحبہ کے بارے میں افسرانِ اعلیٰ کو شکایت کی ہے کہ یہ مسلمان ہو کر ایک خالص مسلمان محلے میں بغیر پردہ کے رہتی

ہیں جس سے ہماری بہو بیٹیوں میں برقعہ سے نجات حاصل کرنے کے جراثیم
پھیل رہے ہیں اور ان صاحبہ کے ہاں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا
ہے۔ دراصل ان صاحبہ کے مالک مکان مرحوم سردار پٹیل کی وزارت میں
انڈر سکریٹری تھے اور وہ ان سے مکان خالی کرانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے
محلے والوں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہا تھا کیونکہ یہ
مالک مکان ہوم منسٹری میں تھے اس لئے پولیس کی مدد بھی انہیں آسانی سے
حاصل ہونے کی راہیں موجود تھیں لہٰذا ان کی انگیخت پر محلے والوں کی
درخواست پر افسران اعلیٰ نے ایک ڈی۔ایس۔پی کو یہ معاملہ سپرد کر دیا کہ وہ
تحقیقات کے اصل معاملے کا پتہ لگائے۔ لہٰذا یہ ڈی۔ایس۔پی تھانہ دریا گنج
میں تحقیقات کے لئے آئے ہوئے تھے۔

معاملے کی نوعیت کا اچھی طرح سے پتہ چلنے کے بعد میں تھانہ دریا
گنج پر پہنچا تو میرے محلے کے سب ہندو مسلمان، بڑے بوڑھے لمبی لمبی
داڑھیوں سمیت خاصی تعداد میں موجود تھے اور ایک کرسی پر یہ محترمہ تشریف
فرما تھیں جس پر تعجب ہوا بقول:

برے ساتھ جو ڈوبنا چاہتے تھے
کنارے سے ہی کر گئے وہ کنارا

لیکن ان صاحبہ کے سینکڑوں مفروضہ اور ذہنی عاشقوں اور
ہمدردوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈی۔ایس۔پی صاحب سے میں
نے اپنا تعارف کرایا تو وہ کہنے لگے کہ یہ سب حضرات ان صاحبہ کے خلاف دی
گئی درخواست کے حق میں گواہی دینے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اور یہ
صاحبہ کہتی ہیں کہ میں اس محلے میں صرف ایک ہی شخص کو جانتی ہوں اور وہ ہیں
آپ۔ لہٰذا آپ ہی ان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں۔ ڈی۔ایس۔پی کی
گفتگو خلاف توقع پولیس کی مخصوص زبان کی بجائے قدرے ادیبانہ بلکہ
شاعرانہ قسم کی محسوس ہوئی تو میں نے اپنے محلے والوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر
ڈالی۔ جب ان میں بابو عیوض علی (مرحوم) اور دینا جاٹ چودھری کو دیکھا تو
احتراماً ان سے علیک سلیک کے بعد میں نے ڈی۔ایس۔پی صاحب سے کہا کہ
میں اس سلسلے میں طرفین کی غیر موجودگی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس
پر انہوں نے سب حضرات سے کہا کہ آپ لوگ باہر چلے جائیں۔ جب کمرہ
خالی ہوا تو میں نے ڈی۔ایس۔پی کو بتایا کہ اس عورت کا صرف قصور یہ ہے کہ

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

یہ عورت وطن پرست ہے۔ خوش مزاج اور خوش ذوق ہے۔ سوشل
تعلقات بہت زیادہ رکھتی ہے۔ بدقسمتی سے شاعرہ ہے اور شاعروں، ادیبوں نیز
صحافیوں کی خاصی تعداد محض مفت کی چائے پینے اور اس کی خوبصورتی سے
آنکھیں سینکنے کے لئے اس کے ہاں آتی جاتی ہے جسے محلے والے جو قدامت پسند
ہیں ان باتوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور مالک مکان محض اس وجہ سے کہ وہ سردار
پٹیل کی ہوم منسٹری میں ایک انڈر سکریٹری ہیں اس لئے انہوں نے محلے والوں کو
بہکا کر اس قسم کی درخواستیں دلوائی ہیں۔ کیونکہ اسے یہ یقین ہے کہ ہوم منسٹری
میں ہونے کے باعث مقامی پولیس اس کی ناجائز طور پر مدد کرے گی۔

ڈی۔ایس۔پی انگریزی حکومت کا بنایا ہوا ڈی۔ایس۔پی تھا۔ اس لئے وہ سارے معاملے کو میرے ان چند الفاظ کو سننے کے بعد سمجھ گیا اور انہوں نے محلے والوں سے کہا کہ آپ صاحبان چلئے میں ابھی موقع دیکھنے آرہا ہوں۔ اصل معاملہ ڈی۔ایس۔پی جان ہی چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے افسران بالا کو اصل حالات سے آگاہ کر دیا اور یہ معاملہ ختم ہونے کے بعد ذہنی مریضوں کی آمدورفت پھر شروع ہوگئی۔

(۵)

یادش بخیر جناب گوپال متل صاحب مدیر ماہنامہ ''تحریک'' انتہائی سلیقہ مند، اچھے شاعر، قابل قدر صحافی، اوورکلیور اور امریکن نواز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ بامذاق، خوش طبع، حاضر جواب اور کسی حد تک ''آگ لگا کر جمالو دور کھڑی'' کی صفات کے مالک ہیں۔

جب گوپال متل صاحب روزنامہ ''تیج'' کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں کام کرتے تھے تو ان دنوں آپ کا بیگم صاحب کے ہاں آنا جانا تھا۔ گوپال متل صاحب میں بظاہر کوئی ایسی کشش نہیں کہ کوئی عورت اور پھر بیگم صاحب ایسی سیماب صفت خاتون ان سے عشق کر سکے۔ آجکل تو خدا کی نظر کرم اور امریکن نواز ہونے کے باعث گوپال متل صاحب کی مالی حالت صحافی حلقوں میں قابل رشک حد تک ہے مگر ان دنوں آپ محض زندگی کی گاڑی چلانے تک ہی کما پاتے تھے۔ اور یہ ناممکنات میں سے تھا کہ بیگم صاحب ایسی فراخ دل اور فضول خرچ خاتون پر ان کی مالی آسودگی اثر انداز ہو سکتی کیونکہ ان کی مہینہ بھر کی تنخواہ کے برابر تو بیگم صاحب کے ہاں ایک روز میں ہی اٹھ جاتا تھا۔ مگر گوپال متل بھی اہل دل ہیں۔ انہیں بھی کسی سے عشق کرنے کا حق حاصل ہے خواہ وہ ون وے ٹریفک کے مصداق ہی کیوں نہ ہو۔

گوپال متل صاحب نے ایک دو ملاقاتوں میں ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ بیگم صاحب کو شاعر مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کے کلام سے والہانہ لگاؤ ہے اور

بیگم صاحبہ کو اقبالؔ کے سینکڑوں اشعار یاد ہیں۔ بیگم صاحبہ کی اقبالؔ شناسی ہی
انہیں ڈاکٹر کاٹجو مرحوم (جو ان دنوں ہوم منسٹر حکومت ہند تھے) کے نزدیک
سے نزدیک تر لائی۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ جامع مسجد کے میدان
(جگت ٹاکیز کے سامنے) ایک مشاعرہ ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر کاٹجو فرما
رہے تھے اور ڈاکٹر کاٹجو کو اقبالؔ کی نظم ع ''سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ
مانے'' بہت پسند تھی۔ منتظمین مشاعرہ صدر صاحب کی پسندیدگی اور خوشنودی
کے لئے یہ چاہتے تھے کہ مشاعرہ کا آغاز اقبال کی اس نظم سے ہو۔ بیگم صاحبہ
شاعرہ کی حیثیت سے اس مشاعرہ میں مدعو تھیں۔ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
کی موقع شناس نظروں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ وہ اقبال کی اس نظم سے مشاعرہ
کا آغاز فرمائیں۔ بیگم صاحبہ کا ترنم، حسن اور چائے کی کیتلی میں کوکا کولا ملی
شراب کے دو چار فنجان پیٹ میں جانے کے باعث ہلکا سرور، موسیقی، حسن اور
شراب کی اس تثلیث نے وہ قیامت ڈھائی کہ ڈاکٹر اقبالؔ کی روح بھی جھوم کر
رہ گئی ہوگی۔ ڈاکٹر کاٹجو کا یہ حال تھا کہ ہر مصرع پر لمبی لمبی پلکوں سے ڈھکی ہوئی
آنکھوں کو بار بار اٹھا کر بیگم صاحبہ کو دیکھتے اور زبان سے تو ڈاکٹر اقبال کے
کلام کی داد دے رہے تھے۔ مگر آنکھوں اور دل کی گہرائیوں میں بیگم صاحبہ کی
تصویر اتار رہے تھے۔ بیگم صاحبہ نظم سنا کر اور ہزار ہا دلوں پر بجلی گرا کر مائک
سے الگ ہوئیں تو ڈاکٹر کاٹجو نے انہیں اپنے پہلو میں بڑی عزت و تعظیم سے
بٹھایا اور جی بھر کر داد دی۔ اس کے بعد ڈاکٹر کاٹجو ہوم منسٹری میں اپنے دفتر
میں ہوں یا اپنی رہائش گاہ پر بیگم صاحبہ بلا جھجک اور بغیر وقت ملاقات مقرر کئے
ڈاکٹر کاٹجو کے ہاں جانے لگیں۔

جب گوپال متل صاحب کو بیگم صاحبہ کی اس اقبالؔ پسندی کا یقین
ہوگیا تو انہوں نے ڈاکٹر اقبالؔ کے کلام کو تقریب بہر ملاقات کا ذریعہ بنالیا اور
بیگم صاحبہ کے ہاں ان کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ اور یہ سلسلہ قریباً ایک سال
تک رہا۔ اس عرصہ میں گوپال متل صاحب کا یہ ''اقبالی'' عشق محض بیگم صاحبہ
سے اشعار پر بحث، آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کے سرور تک محدود رہا۔ ان کی
بدقسمتی سے اخبار ''تیج'' کے مالکان میں سے ایک صاحب دل مالک جناب
دھرم پال گپتا وفاؔ کا بیگم صاحبہ کے ہاں روز آنا جانا تھا۔ آندھی یا طوفان ہو،
بارش ہو رہی ہو۔ مگر کیا مجال کہ وفاؔ صاحب بیگم صاحبہ کے ہاں عین وقت مقررہ
پر حاضری نہ دیں۔ مالک اور ملازم میں رقابت پیدا ہوگئی۔ دھرم پال گپتا وفا
کو گوپال متل صاحب کا بیگم صاحبہ کے ہاں آنا جانا دخل در معقولات محسوس
ہو رہا تھا۔ اور ویسے بھی وفاؔ صاحب گوپال متل کے مقابلے میں ادبی اور شعری
لحاظ سے ایک صفر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ اور گوپال متل
گھنٹوں کلام اقبال پر گفتگو کرتے رہتے۔ اور وفاؔ صاحب اس گفتگو کو محض بکواس
سمجھتے تھے اور وہ جس طرح دلی کے شرفا کی طرح خاموش عشق کے خواہاں
تھے۔ گوپال متل کی شاعرانہ گفتگو، اس میں سدِّ راہ تھی۔ لہٰذا دھرم پال گپتا وفا
نے بیگم صاحبہ سے پُرزور استدعا کی کہ کسی طرح گوپال متل صاحب کا اپنے
یہاں آنا بند کردیں ورنہ ان کا دل و دماغ جذبۂ رقابت سے بیکار ہو جائے
گا۔ اس پر ایک روز بیگم صاحبہ نے گوپال متل صاحب سے کہا کہ اچھا متل

صاحب آپ یہ بتایئے کہ میں آپ کو کیسی لگتی ہوں۔ لیلیٰ مجنوں سے یہی پوچھتا تو مجنوں کا جو حال ہوتا عین وہی حال گوپال متل صاحب کا تھا۔ (تعریفی کلمات پوری طرح زبان ادا نہیں کر پا رہی تھی) ایک تو ویسے ہی متل صاحب کی لکنت سے بولتے ہیں اس پر حسن کی یہ نوازش جس سے متل صاحب کی لکنت اور بھی بڑھ گئی۔ جب متل صاحب لغات کے تمام تعریفی الفاظ بیگم صاحبہ کی تعریف میں ختم کر چکے تو بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی شاگردہ بن جاؤں کیونکہ کامل قریشی صاحب کی اصلاحیں بے جان ہیں۔ اور میں کسی اچھے استاد کی تلاش میں تھی۔ آپ سے بہتر استاد نہیں مل سکتا۔ لہٰذا میری یہ گزارش قبول فرمایئے۔ اس کے ساتھ ہی بیگم صاحبہ نے یہ بھی فرمایا کہ استاد اور شاگردہ کے تعلقات باپ بیٹی کے ہوتے ہیں۔ اس لئے آئندہ ہمارے اور آپ کے تعلقات ایسے ہی ہوں گے۔ بیگم صاحبہ کا یہ کہنا تھا کہ گوپال متل صاحب ایک لمحہ میں ساری شیریں گفتار بھول گئے اور ڈاکٹر اقبال انہیں جگن ناتھ آزاد محسوس ہونے لگے۔ بیگم صاحبہ کے ایک جملے نے ہی گوپال متل صاحب کے دل کے ہزار ٹکڑے کر دیئے تھے۔ اور وہ فوری طور پر وہاں سے چلے آئے۔ اور اس کے بعد بیگم صاحبہ کے ہاں نہیں گئے۔

ایک شاعر تھے۔ غالباً ان کا تخلص جوہر تھا۔ آج کل یہ صاحب گیسو اور داڑھی بڑھائے پیری مریدی کا دھندا نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ تعویذ گنڈے بھی دیتے ہیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے ہندو تھے۔ بعد میں اسلام قبول کر کے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان صاحب کا یہ ایمان تھا کہ بیگم صاحبہ کے ہاں ہر روز گھنٹوں حاضری دیتے۔ دل کی باتیں تو خدا ہی جانتا ہے مگر بظاہر یہ صرف چائے اور کھانے کے لالچ میں ہی آتے تھے اور ان کا بیگم صاحبہ سے یہ مطالبہ اکثر رہتا تھا کہ انہیں مشاعرے دلوائے جائیں۔ بیگم صاحبہ کا طوطی بول رہا تھا۔ کوئی مشاعرہ ان کے بغیر مشاعرہ نہیں کہلاتا تھا۔ لہٰذا منتظمین مشاعرہ کو ان کا ایک اشارہ ہی جوہر صاحب کی شرکت کے لئے کافی تھا۔ بیگم صاحبہ نے صرف کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو ہی کہہ کر سینکڑوں مشاعرے جوہر صاحب کو دلوائے ہوں گے۔ ایک دن کسی کام کے باعث ایڈیٹر شان ہند بیگم صاحبہ کے ہاں دوپہر کو گیا تو دیکھا کہ جھوٹے برتنوں کا ایک ڈھیر ہے جسے جوہر صاحب نہایت چابکدستی سے صاف کر رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ سے راقم الحروف نے اشارے سے جوہر صاحب کے اس فنکارانہ مظاہرے کا سبب پوچھا تو فرمانے لگیں۔ سرور صاحب میرا ملازم کل سے نہیں آیا۔ گھر کی صفائی وغیرہ کرنے والی مائی بھی بیمار ہے۔ دو دنوں سے جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ ابھی جوہر صاحب آئے تو میں بیئر کے نشے میں تھی۔ ان سے کہا کہ مرغی کے مشاعرہ تو روزانہ مانگتے ہو آج ذرا ان برتنوں کو صاف کر دو۔ لہٰذا انہوں نے سعادتمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اور جس بہتر انداز میں یہ برتن صاف کر رہے ہیں اس سے میرا دل خوش ہوا ہے۔ اور میں انہیں آج ہی ایک اچھا مشاعرہ دلواؤں گی جہاں سے انہیں کم از کم ایک سو روپیہ مل جائے گا (ان دنوں سو روپیہ کافی اہمیت رکھتا تھا) برتن صاف کرتے ہوئے جوہر صاحب نے جھینپ مٹانے کے لئے کہا "سرور صاحب بیگم صاحبہ کے گھر کو میں اپنا ہی گھر سمجھتا

ہوں۔ لہٰذا اپنے گھر کا کام کرنے میں کیا شرم ہے۔'' میں نے دعائیں دیتے کہا کہ خدا آپ کو ایسا ہی سعادتمند اور برخوردار بنائے رکھے۔

بیگم صاحب کے ہاں ایک صاحب ثروت صاحب جنہیں بیگم صاحب اپنا بہنوئی کہا کرتی تھیں، رہتے تھے۔ بیگم صاحب کی ایک ملازمہ جو بچپن کے بعد جوانی کی حد میں داخل ہو چکی تھی۔ بڑی طرار اور عشووں اور غمزوں کا مظاہرہ کرتی رہتی تھی۔ ایک دن سننے میں آیا کہ بیگم صاحب اور ان کے مبینہ بہنوئی کو اس ملازمہ کے اغوا میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ فوری طور پر بیگم صاحب اور ان کے بہنوئی کی ضمانت ہو گئی۔ اور مقدمہ عدالت میں آ گیا۔ جناب ڈھلوں صاحب ایس۔ ڈی۔ ایم دہلی کے ہاں یہ مقدمہ چل رہا تھا۔ (ڈھلوں صاحب کو بعد میں فیروز پور میں ان کے لڑکے نے ہی گولی سے سوتے میں ہلاک کر دیا تھا) کشمیری گیٹ رٹز سینما کے عقب میں ان دنوں دلی کی فوجداری عدالتیں تھیں۔ ہر پیشی پر راقم الحروف عدالت میں مقدمہ کی کارروائی سننے جاتا۔ اور پیشی کے بعد بیگم صاحب کے ساتھ ہی ان کے دولت کدہ پر جاتا اور مقدمہ کے بارے میں صلاح و مشورہ کیا جاتا۔ ایک شام سردار دیوان سنگھ مفتوںؔ کے ہاں سردار ڈھلوں ایس، ڈی، ایم تشریف لائے۔ سردار صاحب نے پاس بیٹھے دو چار شعراء کو ڈھلوں صاحب سے متعارف کرایا تو ڈھلوں صاحب فرمانے لگے کہ ایک شاعرہ پر مقدمہ تو میری عدالت میں چل رہا ہے — ڈھلوں صاحب باتوں باتوں میں کہہ گئے کہ مقدمہ کے سب گواہان استغاثہ نے فرضی پیش کئے ہیں اور کہ مقدمہ میں کوئی جان نہیں ہے۔ چونکہ یہ بات سردار صاحب کے مکان پر ایک ایس، ڈی، ایم کی زبان سے نکلی تھی۔ اب اگر یہ بات باہر جاتی ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس وقت جو حضرات سردار صاحب کے ہاں موجود تھے انہی میں سے کسی نے یہ بات باہر پہنچائی۔ باقی شعراء کو تو اس مقدمہ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ البتہ راقم الحروف کو اس معاملہ میں گہری دلچسپی تھی۔ لہٰذا میں نے یہ بات بیگم صاحب کو بھی نہ بتائی کیونکہ اگر انہیں بتا دیا جاتا تو وہ شراب کے نشے میں کسی وقت بھی یہ راز اگل دیتیں اور میرا سردار صاحب کے ہاں آنا جانا ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا اور دشمنی مفت میں ہو جاتی۔ یہ مقدمہ دو سال تک چلتا رہا۔ آخر فیصلے کا دن آ پہنچا۔ مجھے تو یہ معلوم ہی تھا کہ بیگم صاحب اور ان کے بہنوئی دونوں باعزت بری ہوں گے۔ لہٰذا میں نے چاندنی چوک سے گلاب کے پھولوں کے دو ہار خریدے۔ اور انہیں اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ اور سیدھا ڈھلوں صاحب کی عدالت میں پہنچا۔ بیگم صاحب سراسیمگی کے عالم میں تھیں۔ اتنے میں پتہ چلا کہ غازی آباد اور مراد نگر کے درمیان ایک ہوائی جہاز گر گیا ہے۔ جس کی تفتیش کے لئے ایس، ڈی، ایم صاحب موقع پر تشریف لے جا رہے ہیں۔ عدالت کے چپراسی سے ریڈر تک کو بیگم صاحب نے کرنسی نوٹوں سے خوش کر رکھا تھا۔ ڈرائیور کو بھی پانچ کا نوٹ بیگم صاحب نے دیا۔ چند منٹ بعد ڈھلوں صاحب، ریڈر اور اسٹینوگرافر کو ہمراہ لئے جائے واردات کی طرف روانہ ہو گئے۔ قریباً چار بجے ڈھلوں صاحب تشریف لائے۔ اس درمیانی وقت میں بیگم صاحب ان کے بہنوئی، وکیل اور میں کارلٹن ہوٹل کشمیری گیٹ میں بیٹھے کھاتے پیتے رہے۔ جوں ہی چپراسی نے ہوٹل میں

آ کر اطلاع دی کہ صاحب آ گئے ہیں۔ ہم سب فوری طور پر عدالت کے باہر جا کھڑے ہوئے۔ ڈرائیور نے اتنا بتایا کہ صاحب نے راستہ میں فیصلہ لکھوا دیا ہے۔ اور اسٹینو گرافر اسے ٹائپ کر رہا ہے۔ بیگم صاحبہ نے تمام انتظامات کر رکھے تھے۔ اگر عدالت نے سزا سنا دی تو ضمانت کی درخواست دی جا سکے۔ اور اگر عدالت ضمانت نامنظور کر دے تو فوراً ٹیکسی پر وکیل سیشن جج کے ہاں جا کر ضمانت کی درخواست پیش کر سکے۔ مگر یہ سب انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ کیونکہ پانچ بج چکے تھے اور دیگر سب عدالتیں بند ہو رہی تھیں۔ پانچ بجکر پانچ منٹ پر عدالت کے چپراسی نے ملزمان کے نام پکارے تو بیگم صاحبہ کچھ ورد کرتی ہوئی عدالت میں داخل ہوئیں۔ میں بھی عدالت کے کمرہ میں فیصلہ سننے گیا۔ ڈھلوں صاحب نے بڑے وقار کے ساتھ حکم سنایا کہ جایئے آپ دونوں کو باعزت بری کیا جاتا ہے۔ بس پھر کیا تھا بیگم صاحبہ نے دعاؤں کی بھرمار کر دی۔ خدا آپ کو ڈپٹی کمشنر بنا دے، یہ کر دے وہ کر دے۔ ڈھلوں صاحب مسکراتے رہے۔ ایڈیٹر شانِ ہند نے بریف کیس سے دونوں ہار نکالے ایک بیگم صاحبہ کے گلے میں اور دوسرا ان کے بہنوئی کے گلے میں ڈال دیا۔ ڈھلوں صاحب کرسیٔ عدالت سے اٹھ کر اندر چلے گئے۔ اور بیگم صاحبہ نے پرس کھول کر پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کی بارش کر دی۔ عدالت کا ہر اہلکار ان نوٹوں کو جھپٹ رہا تھا۔ یہ ہنگامہ ختم ہوا تو کشمیری گیٹ بس اسٹینڈ پر ایڈیٹر شانِ ہند نے بیگم صاحبہ کو پھر مبارکباد دیتے ہوئے رخصت چاہی تو بیگم صاحبہ فرمانے لگیں ارے آپ کہاں جا سکتے ہیں۔ سرور صاحب میرے حسن اور جوانی پر لوگوں نے منوں پھول نچھاور کیے ہوں گے مگر خدا کی قسم آج عدالت میں آپ کے گلاب کے پھولوں کے ہار نے جو مزہ دیا اُس ایک ہار پر منوں پھول نچھاور۔ آپ کارلٹن ہوٹل چلیے اور گھر پر فون کر دیجئے کہ آج رات آپ گھر نہیں آئیں گے بلکہ میرے ہاں جشن میں شریک ہوں گے''۔ کارلٹن ہوٹل سے بیگم صاحبہ نے وسکی اور بیئر کی بوتلوں سے ٹیکسی کی ڈگی بھروالی۔ اور مجھے' اپنے بہنوئی اور وکیل کو ساتھ لے کر اپنے مکان پر آ گئیں۔ رات بھر جو جشن منایا گیا اس کی تفصیل پھر کبھی لکھوں گا۔ کس کس شاعر نے کیا کیا حرکتیں کیں، آپ پڑھیں گے تو اپنے ملک گیر شہرت رکھنے والوں شاعروں کی اصلیت سے واقف ہو سکیں گے۔

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

۸۔ پیار آنکھوں سے نہیں دیکھتا بلکہ دماغ سے دیکھتا ہے اور اس لئے پروں والے کیوپڈ کو تصویر میں اندھا بتایا گیا ہے۔

A Midsummer Night's Dream - Act 1, Scene 1

۹۔ میری روح کو بات کرتے سنو۔ جس پل میں نے تمہیں دیکھا کیا میرا دل اُڑ کر تمہاری خدمت میں جا پہنچا تھا۔

The Tempest - Act 3, Scene 1

۱۰۔ جس نے پہلی نظر میں محبت نہیں کی اس نے محبت کب کی؟۔

As You Like It - Act 3, Scene 5

اگلے ابواب

قدیم، متوسط اور جدید عہد کے

مختلف زبانوں کے ادبا، شعرا اور مفکرین کے بارے میں

سوانحی تذکروں اور تحقیق پر

مشتمل ہیں.

مالوہ کا کوی راجہ بھرتری ہری:
پریم سے تیاگ تک

راجہ بھرتری ہری (یا بھرتری) کا نام ہندوستان میں بہت مشہور ہے۔ عظیم مفکر شاعر محمد اقبال نے "بالِ جبریل" کے آغاز سے پہلے ایک صفحہ پر اُس کے ایک خیال کو اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

بھرتری ہری اپنا راج پاٹ تیاگ کر یوگی بن گیا تھا۔ وہ مالوہ کا راجہ تھا جسکی راجدھانی آونتیکا (آج کا اُجین) تھی۔ اس کے سنگھاسن ترک کے بعد اس کے چھوٹے بھائی وکرم آدتیہ (چندرگپت ثانی) نے 1076ء سے 1126ء تک حکمرانی کی۔ ہندوستان کی تاریخ میں وکرم نام کے دو راجہ گزرے ہیں۔ دونوں کے دور میں ایک ہزار سال کا فرق بتایا جاتا ہے۔ پہلا وکرم آدتیہ اپنی کلنڈر کی ایجاد "وکرم سموات" کے لئے مشہور ہے۔ دوسرا وکرم آدتیہ چندرگپت ثانی تھا۔

بعض روایتوں کے مطابق راجہ بھرتری ہری ناتھ پنتھی تھا۔ رانی مینا وتی اس کی بہن تھی جس کا بیٹا راجہ گوپی چند بھی ناتھ پنتھی سلسلے کی نام آور شخصیت تھا۔ کہتے ہیں بھرتری ہری کی کئی بیویاں تھیں۔ لیکن اس کی سب سے چہیتی بیوی پنگلا تھی۔

راجہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے سنسکرت میں کچھ کتابیں لکھی تھیں جن کا شمار قدیم ہندوستان کے شاہکار ادب میں ہوتا ہے۔ تین کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ویراگیہ شتک، نیتی شتک اور شرنگار شتک۔ تینوں کتابیں ایک جلد میں شتک ترییا کے نام سے موسوم ہیں۔ بعض تحقیقات کی رُو سے گرامر کی کتاب واکیہ پدیہ بھی اُسی کی کتاب ہے۔ کچھ اور کتابیں بھی اپنے عہد کی مقامی بھاشا میں اس نے لکھی تھیں۔

بھرتری ہری ناتھ پنتھی تھا۔ اُس نے اِس شدت کا بیراگ اختیار کیا کہ بھرتری ہری بیراگ یا بیراگ پنتھ اس کی وجہ سے موسوم ہوگیا۔ مشہور ہے کہ اجین کا راجہ بھرتری ہری گرو گورکش ناتھ کا شاگرد تھا۔ اس نے راج پاٹ چھوڑا اور یوگی بن گیا۔ بہت پڑھا ہوا آدمی تھا۔ اس کی تین کتابوں میں سے ویراگیہ شتک میں تیاگ پر ایک سو نظمیں تھیں [شتک کے معنی ایک سو]۔ شرنگار شتک میں سندرتا اور پریم پر سو کویتائیں تھیں اور نیتی شتک میں سیاست کے فن پر ایک سو کویتائیں تھیں۔ اس کے ترک سنگھاسن کے بارے میں یعنی کیسے اور کیوں اس نے دنیا تیاگ دیا تین الگ الگ قصے پائے جاتے ہیں۔ کسی قصہ میں یہ کام اس نے گرو گورکش ناتھ کے زیر اثر کیا، کسی میں گرو بنا کیا۔ کہیں وہ ناتھ سدھوں میں

سے ایک سدھ وکار ناتھ بتایا گیا ہے۔ گوتم بدھ کے زمانے سے اس کے ترک کی کہانی پائی جاتی ہے۔ یعنی بھرتری ہری کے تاریخی ماخذ و آثار میں کئی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک چینی بدھ راہب آئی تسنگ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جب اس نے ہندوستان کا سفر کیا تو وہاں ایک راجہ تھا جو اپنا تخت چھوڑ کر بدھ راہب بن گیا اور بعد میں کم سے کم سات مرتبہ اپنی گھریلو زندگی میں لوٹا۔ مورخ راجہ بھرتری ہری کو دسویں گیارہویں صدی میں نمودار بتاتے ہیں۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے پنتھ کا بانی نہ رہا ہو بلکہ اُس کے بعد اس پنتھ کو اُس کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہو۔ بھرتری کی ویراگیہ شتک جو مکمل ترک و تیاگ کے بارے میں ہے، اُس کا نہ تو ناتھ پنتھ کی روایت سے براہ راست کوئی تعلق ہے اور نہ گورکش ناتھ کا اس میں کوئی حوالہ ملتا ہے۔ بلکہ اس کی کسی کتاب میں گورکش ناتھ کا تذکرہ نہیں پایا جاتا اور نہ ناتھ فرقہ کے پیرو ہونے کے باوجود اس عقیدے کے عمل و اصطلاحات کا ذکر موجود ہے۔ بھرتری ناتھ پنتھی تھا یہ خیال عہد متوسط میں ظاہر ہوا۔ کبیر اور گورو نانک کی بانیوں میں اس کا ذکر ناتھ یوگی کے طور پر آیا ہے جو گورکش ناتھ کا معتقد تھا۔ صرف اس کی ویراگیہ شتک میں ایسی زندگی کی جانب بلاواسطہ حوالے ملتے ہیں جو ناتھ جوگیوں کے جیون کے طرز پر گذاری جاتی ہے۔

جب راجہ بھرتری ہری ناتھ مسلک یا سمپردایے میں داخل ہوا اور گورکش ناتھ کا مرید ہوا تو بدھ وکار ناتھ کے نام سے موسوم ہو گیا اور یہاں سے بھرتری ہری ویراگ پنتھ کا بانی قرار پایا جو ناتھ مسلک کی موجودہ بارہ شاخوں میں سے ایک ہے۔

بھرتری ہری کی زندگی کی داستان کئی طرح بیان کی گئی ہے جو گیتوں، ناٹکوں اور کتابوں کے ذریعہ ترتیب پائی ہے۔ مجموعی طور پر دو خاص اختلافات کے ساتھ اس کی جیون کتھا بیان کی جاتی ہے۔ دونوں میں اس کے سنگھاسن تیاگ کے اسباب سے ہی سروکار رکھا گیا ہے۔ پہلی کتھا میں گرو گورکش ناتھ کے زیر اثر اس کی جیون بانی ہم تک پہنچتی ہے۔ دوسری کہانی اس سے الگ ہے اور وہ بھی دو تضاد کے ساتھ ہے۔ ایک میں بھرتری ہری اور گورکش ناتھ کے تعلق کا ذکر آتا ہے، دوسری اس ذکر سے بالکل خالی ہے۔ اول قصہ جو لوک گاتھوں اور یوگیوں کی بانیوں سے مرتب ہوا ہے دو حصوں میں منقسم ہے۔ ان میں سے پہلی روایت وہ ہے جب گورکش ناتھ بھرتری ہری سے جنگل میں ملتا ہے۔ دوسری روایت کے مطابق گورکش ناتھ کی ملاقات بھرتری ہری سے اُس کی پتنی کی موت کے بعد ہوئی جب راجہ اس کا سوگ منا رہا تھا۔

پہلی روایت - گورکش ناتھ - حصہ اول

گورکش ناتھ تورن مل پہاڑ کی چوٹی پر سادھنا کر رہا تھا۔ اسی وقت راجہ بھرتری ہری اس علاقے کے جنگل میں شکار کی غرض سے پہنچا۔ وہاں اُس نے ایک ہرن کو ٹھیک اس مقام پر مار ڈالا جہاں گورکش ناتھ سادھنا میں مشغول تھا۔ گورکش نے یہ شکار ہوتے دیکھا۔ ہرن جس کا شکار ہوا، اپنی ہرنی کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اور جب راجہ اپنے شکار کو رسی سے اپنے گھوڑے سے باندھ کر کھینچ لے جانے لگا تو غمگین ہرنی دور سے یہ دیکھ رہی تھی۔ یوگی نے راجہ کو اس ظلم کے لئے پھٹکارا اور کہا کہ تجھے اس ہرن کو مارنے کا کوئی ادھیکار نہ تھا کیونکہ تو اسے زندہ

نہیں کر سکتا۔ یوگی کی جھڑکی سن کر راجہ نے اُس سے حجت شروع کر دی۔ انجام میں گورکش ناتھ نے مردہ ہرن کو دوبارہ زندہ کر دیا اور جنگل کو چلا گیا۔ راجہ بھرتری ہری اس بات سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے دنیا کو ترک کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اور یوگی سے التجا کی کہ وہ اسے اپنا مرید بنا لے۔ گورکش ناتھ نے کہا پہلے تُو اپنے محل جا اور اپنی بیوی سے اس بات کی اجازت لے۔ اس سمجھاؤ کے بعد دونوں جدا ہو گئے۔ گورکش ناتھ پہاڑ کی چوٹی پر چلا گیا اور راجہ اپنی راجدھانی لوٹ گیا۔

حصہ دوم

ان میں اول روایت کے مطابق بھرتری ہری مالوہ کا راجہ تھا جسکی راجدھانی اجین تھی۔ راجہ ذہین اور طاقتور تھا۔ کہا جاتا ہے اس کی ایک ہزار بیویاں تھیں۔ اس میں پنگلہ سب سے چہیتی تھی۔ ایک بار راجہ نے اسے اپنی ایک خادمہ سے یہ کہتے سنا کہ وہ راجہ کو اتنا پیار کرتی ہے کہ اس کے بغیر ایک پل نہیں جی پائے گی۔ راجہ نے فیصلہ کیا کہ وہ آزما کر دیکھے گا کہ پنگلہ اسے واقعی اتنی محبت کرتی ہے یا نہیں۔ لہٰذا ایک بار جب وہ شکار کے لئے جنگل گیا تو اس نے ایک قاصد اپنے محل میں اس خبر کے ساتھ بھیجا کہ ایک شیر نے اُسے مار ڈالا ہے۔ پیامبر اپنے ساتھ راجہ کے کپڑے بھی لے گیا تھا جو خون میں رنگے ہوئے تھے۔ حالانکہ وہ خون ایک تازہ شکار کئے گئے بارہ سنگھا کا تھا لیکن رانی کو پیامبر کی بات پر یقین آ گیا۔ یہ خبر سنتے ہی اس نے زہر پیا اور مر گئی۔ جب راجہ محل لوٹا تو اسے اپنی خطا پر انتہائی پشیمانی ہوئی۔ ایسا صدمہ ہوا کہ وہ کسی کام کے لائق نہ رہا۔ بس

ہر وقت شمشان گھاٹ پر بیٹھا رانی کی موت کا سوگ کرتا رہتا۔ اس کے بے پناہ غم میں اس کے کئی خواص بھی شریک رہنے لگے۔ جب وہ وہاں بیٹھا ''ہے پنگلہ، ہے پنگلہ، ہے پنگلہ'' کراہ رہا تھا تب گورکش ناتھ قریب آیا اور ایک مٹی کا پیالہ ہاتھ سے گرا کر راجہ سے بھی اونچی آواز میں رونے لگا ''ہائے میرا مٹی کا برتن، ہائے میرا مٹی کا برتن''۔ راجہ جو غم سے بھرا ہوا تھا اس نے گورکش ناتھ کو بری طرح روتے دیکھا تو اُس سے اِس غم کا سبب پوچھا۔ گورکش ناتھ نے جواب دیا میں اپنے بھیک کے پیالے کا سوگ منا رہا ہوں۔ راجہ کو یوگی سے یہ جواب سن کر شرم محسوس ہونے لگی کہ یہ شخص اپنے ایک مٹی کے پیالے کے ٹوٹنے پر اتنی شدت سے رو رہا ہے۔ بھلا یہ کوئی مصیبت ہے؟ اُس نے کہا ''تم اس مٹی کے پیالہ کے لئے مت رو اور مجھے اور دکھی نہ کرو۔ میں تمھیں ایسے سونے برتن دیدوں گا، بلکہ اس سے بہتر دوں گا۔ لیکن تم رونا چھوڑ دو''۔

یوگی مانا نہیں۔ وہ زار و قطار روتا رہا۔ اور زندگی آواز میں بولا ''مجھے تمہارے برتنوں کی ضرورت نہیں، مجھے تو صرف میرا پیالہ چاہئے جسے میں بیحد چاہتا ہوں۔'' راجہ بولا ''کیا بے وقوفی کی بات کرتے ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو چیز برباد ہو چکی ہو وہ واپس لا دی جائے؟''

گورکش ناتھ نے رونا بند کر کے کہا ''اے بدھیمان راجہ۔ جب تُو یہ جانتا ہے تو خود اپنی رانی کے لئے کیوں آنسو بہا رہا ہے جو ہمیشہ کے لئے جا چکی ہے؟ کیا تیرا رونا اُسے واپس لے آئے گا؟ تیرے پاس اتنی رانیاں ہیں پھر اُس ایک کے لئے کیوں روتا ہے؟''

راجہ بولا ''رانی کے لئے جو پیار ہے اس کا مقابلہ مٹی کے ایک برتن کی محبت سے نہیں کیا جا سکتا۔''

گورکش ناتھ بولا ''دونوں میں کوئی انتر نہیں۔ مٹی کا برتن ہو یا انسان کا جسم۔ دونوں مٹی سے بنے ہیں۔ اور جو مٹی سے آیا ہے اسے ایک دن مٹی میں ہی لوٹنا ہوگا۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ اور مان لے اگر میں اپنی یوگ شکتی سے تیری رانی کو دوبارہ سامنے لا دوں تو کیا تو اسے پہچان لے گا؟''

''ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔'' راجہ نے کہا۔

یہ سن کر گورکش ناتھ نے ایک سو رانیاں پنگلہ کی شکل کی تخلیق کر ڈالیں اور راجہ سے کہا ''اب تم ان میں سے چنو۔ تمہاری رانی کون ہے''۔

راجہ شرمسار ہوا۔ وہ اپنی رانی کو اُن میں سے نہیں چن سکا۔ تب اس نے اپنی راج گدی چھوڑ دی اور گرو گورکش ناتھ کا چیلا بن گیا۔

دوسری روایت

مذکورہ روایت میں گورکش ناتھ کا تعلق راجہ بھرتری ہری کے بیراگ سے براہ راست ہے۔ لیکن دوسری روایت دو اختلافات ہیں۔ ایک میں گورکش ناتھ کا حوالہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ملتا ہے۔ دوسرے قصہ میں گورکش ناتھ بالکل ناپید ہے۔ دونوں حکایتوں کا بنیادی موضوع ایک ہی ہے، نتیجے قدرے مختلف ہیں۔ اس لئے اب وہ داستان سنئے جس میں گورکش ناتھ کوئی وجود نہیں رکھتا۔

بھرتری ہری مالوہ کا راجہ تھا جو راجپوتانہ (جدید مدھیہ پردیش) کے خطے میں واقع تھا۔ مالوہ کی راجدھانی اُجینی یا اُونتی (نیا نام اُجین) تھا۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی وکرم تھا جو بعد میں وکرم آدتیہ نام کا مشہور راجہ بنا۔ اس نے کئی جنگیں جیتیں اور اپنے نام سے ایک کلنڈر ایجاد کیا جو ہندوستان میں آج بھی رائج ہے، خصوصاً علم نجوم میں۔ بھرتری ہری دو بھائیوں سے بڑا تھا اس لئے اولاً راجہ اُسے بنایا گیا۔

بھرتری ہری کی کئی بیویاں تھیں۔ لیکن وہ کسی سے تشفی نہیں پاتا تھا۔ اس لئے اس نے ایک اور شادی کر لی۔ پنگلہ سے۔ وہ نوخیز اور بہت حسین تھی۔ راجہ کا دل اُس سے خوب لگ گیا۔ وہ اس سے اپنی تمام خواہشات پوری کر سکتا تھا اور جلد اُس کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا۔ وہ جتنی باہر سے خوبصورت تھی اتنی اندر سے نہ تھی۔ دراصل وہ ایک عیار اور خود پسند عورت تھی۔ اس کا کردار ناقص اور دوہرا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے راجہ کے ایک درباری سے ناجائز تعلق قائم کر لیا۔ اس کی بدچلنی نے محل کے لوگوں میں انتشار اور حکومت میں بدامنی پیدا کر دی لیکن راجہ اس کی محبت میں اندھا تھا اور اصلیت ذرا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جو کچھ وہ اُسے دکھاتی بس وہی وہ دیکھتا اور اگر کوئی اس کی شکایت کرتا تو راجہ اسے سخت سزا دیتا۔ اس طرح پنگلہ محل اور حکومت میں مطلق العنان بن گئی۔ جب ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا تو راجہ کو اس کے چھوٹے بھائی وکرم نے چوکنا کیا اور پھر دونوں بھائیوں میں ٹھن گئی۔ بھرتری ہری نے اپنے چھوٹے بھائی کو محل سے باہر نکال دیا اور ساری ذمہ داریاں اس سے واپس لیں۔

ایک دن محل میں کوئی برہمن آیا (یوگی تھا یا گورکش ناتھ؟)۔ اس نے

راجہ کو ایک پھل پیش کیا، یہ کہکر کہ جو اسے کھائے گا امر ہو جائے گا۔ راجہ اپنی رانی
پنگلہ کو اپنی جان سے بڑھکر چاہتا تھا، اُس نے وہ پھل اُسے دیدیا۔ رانی چونکہ
راجہ کے ایک درباری کی محبت میں گرفتار تھی اس نے محبت سے وہ پھل اُسے پیش
کر دیا۔ وہ درباری ایک رنڈی کی چاہت میں مبتلا تھا، اُس نے وہ خاص پھل
اُس رنڈی کو دیدیا۔ رنڈی فکر میں مبتلا ہو گئی۔ اُس کی نظر میں راجہ اس پھل کا سب
سے زیادہ مستحق تھا۔ اس کا خیال تھا راجہ کو بقا ملنی چاہیئے۔ سو وہ پھل لے کر محل گئی
اور راجہ کو پیش کیا۔ راجہ اس بات پر سخت حیران ہوا کہ جو پھل صبح اُس نے
پنگلہ کو دیا تھا وہ رنڈی کے ہاتھوں میں کیونکر پہنچ گیا۔ جب اُس بازاری
عورت نے اُسے بتایا کہ وہ پھل اسے کیسے ملا تو سارا بھید کھل گیا۔ راجہ کی سمجھ میں
آیا کہ ابتک پنگلہ پر لگائے گئے الزامات غلط نہ تھے۔ اور یہ کہ وہ رانی کی محبت
میں اندھا ہو گیا تھا۔ وہ بے وفا اور بدکردار عورت تھی۔

ایک پل میں زندگی کی خوبصورت تصویر شیشے کی کرچیوں میں تبدیل
ہو گئی۔ راجہ کو لگا اُس کی زندگی اپنے سارے رنگ کھو بیٹھی ہے۔ اور اچانک
کڑواہٹ اور نا امیدی سے بھر گئی ہے۔ سورگ کی اونچائی سے وہ سیدھا نرک کی
آگ میں آگرا ہے۔ فرار کی ہر راہ اس کے لئے بند تھی۔ نہ وہ پنگلہ کے بنا جی سکتا
تھا اور نہ اس کے ساتھ جینا اب اس کے لئے ممکن تھا۔

الم وحسرت بھری اس صورت حال میں اس کے حواس نے پلٹا کھایا۔
اس نے آناً فاناً اپنا راج تیاگ دیا اور یوگی بن گیا تاکہ جیون کا ایک نیا ارتھ تلاش
کرے۔ کہتے ہیں یہ کویتا اُس نے اپنے اس گہرے اور تلخ تجربے کے بعد لکھی:

وہ، جس کے خیالوں نے مجھے دیوانہ بنایا، مجھے نہیں چاہتی بلکہ کسی اور
مرد کی آرزو کرتی ہے۔ وہ آدمی کسی دوسری (عورت) کی محبت میں پڑا ہے جو کسی
اور کی (یعنی میری) تمنائی ہے۔ شرم کرے وہ (رانی) اور وہ (مرد)! لعنت
اس عاشق پر (سب پر بہت اور سمبندھوں پر)! اُس (رنڈی) پر اور مجھ پر۔

نیتی شتک، ویراگیہ شتکم سے ایک کویتا دیکھئے۔ کتنی معنی خیز ہے:

(۱)

کھانے کے لئے میسر آتا ہے دن میں ایک
بار بے ذائقہ کھانا، بھیک مانگنے کے بعد۔ بچھونے کی جگہ
ملتی ہے زمین، اور میرا اپنا بدن ہے میرا خدمت گار۔
لباس کی بجائے ہے ایک کمبل سیکڑوں نمدوں سے بنا ہوا۔
اور افسوس، اس کے باوجود حسی خواہشات میرا پیچھا نہیں
چھوڑتیں!

اس کویتا سے مجوی ایک کہانی ناتھ یوگیوں میں گردش کرتی ہے:

بھرتری ہری ایک راہ سے گذر رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ اندھیرا
آہستہ آہستہ بڑھا آرہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا راستے پر کوئی چیز ہیرے کی
طرح چمک رہی ہے۔ وہ وہاں سے گذر گیا اور چلتا رہا۔ پھر اس کے دماغ میں
خیالات کی جنگ شروع ہو گئی۔ ''وہ اگر ہیرا تھا تو یقیناً بہت قیمتی رہا ہوگا اور اس کی

بدولت میں اپنی پسند کی کئی چیزیں حاصل کر سکتا ہوں''۔ لیکن یوگی کے لئے پتھر اور
سونا ایک برابر ہے۔ اور جب میں نے راج پاٹ چھوڑ دیا تو ان باتوں کے پیچھے
کیوں پڑوں''۔ ''لیکن یہ ایک اچھا موقع ہے، اسے تُو چھوڑتا کیوں ہے۔ شاید
یہ تیرے لئے بھگوان کا تحفہ ہو''۔ خواہش اور تجسس سے وہ پلٹ آیا۔ اور اُس چیز کو
اٹھالیا۔ جو چیز اسے ہیرا دکھائی دے رہی تھی وہ کسی کے چبا کر پھینکے ہوئے نوالے
میں کھانے کا کوئی ٹکڑا تھا۔ راجہ بھرتری ہری کو افسوس ہوا، یہ اُس نے کیا کیا۔

گیارہ سو سال قبل ایک شُدر عورت سے جما راجہ بھرتری ہری ایک
ایک ایسا منجھا ہوا انسان اور دانا و بینا شاعر تھا جس کی مثال نہیں ملتی۔ عشق اُس
کی زندگی کا ایک تجربہ تھا جس نے اسے بیراگ اور تیاگ تک پہنچا دیا۔ بھوگ اور
سنجوگ کے علاوہ بھی دنیا کے اَن گنت گہرے مشاہدات اُس کی شاعری میں جلوہ
گر ہیں۔ یہاں ہم صرف اپنے موضوع سے وابستہ 'شرنگار شتک' سے اُس کی چند
نظمیں پیش کر رہے ہیں:

--اس کا چہرہ چاند نہیں ہے' نہ اُس کی آنکھیں جڑواں کنول ہیں۔
اُس کی بانہیں خالص سونے سے نہیں بنی ہیں۔
وہ گوشت اور استخواں کا مجموعہ ہے۔
شاعروں نے صرف جھوٹ کہا ہے!۔ لیکن آہ!
ہم اُس حسینہ کو چاہتے ہیں' ہم جھوٹ کا یقین کرتے ہیں۔
--نظاروں میں سب سے ارفع کون ہے؟۔
ایک آہو چشم حسینہ کا چہرہ جو محبت سے خوش دکھائی دے۔

خوشبوؤں میں؟۔ اُس کے سانس کی مہکاس۔
آوازوں میں؟۔ اُس کی آواز گفتار۔
ذائقوں میں؟۔ اُس کے غنچہ صفت لبوں کا شہد۔
بناوٹ میں؟۔ اُس کا تن گداز۔
عاشق کی نگاہ و توجہ سے زیادہ قیمتی اور کیا ہے؟۔
شباب کھلنے کے وقت معشوق کا محبت میں انتشار خیال پیدا کرنا۔

-- اُس کے بالوں میں سفید چنبیلی
اُس کے چہرے کی نیم خوابیدہ جھلک
صندل میں زعفران ملا ہوا' اُس کے دلکش جسم پر
گناہ پر اُکسانے کا کمزور بہانہ لئے' اُس کا سینہ
ایک بہشت ہے گویا' سب سے اونچے مقام پر۔

-- ایک عارض' چاند کا رقیب
آنکھیں' کنول کے پھولوں کا مذاق اُڑاتی
رنگت' سونے کی چمک کو گہناتی
گھنیری زلفیں' شہد کی سیاہ مکھیوں کو شرماتی
پستان' ہاتھی کے اُبھرے حصوں کی مانند اُبھرواں
کولہے نمایاں
ایک آواز مسحور کُن' اور رسیلی۔۔۔
دوشیزاؤں میں آرائش فطری ہی ہوتی ہے!۔

بنگال کا پہلا شاعر چنڈی داس

پُران ہمیں بتاتے ہیں کہ کرشن کی ماں کا نام دیوکی اور باپ کا نام واسدیو تھا۔ اور یہ واسدیو ورشنی نسل کا کنور تھا جس کا قیام متھرا کے قرب و جوار میں تھا۔ اس کے علاوہ پُرانوں ہی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کرشن کا ایک بھائی بلدیو بھی تھا۔ پہلی صدی قبل مسیح تک واسدیو اور بلدیو کی پوجا دیوتاؤں کے طور پر ہوتی رہی اور ان کے پجاریوں کو بھاگوت یا بھگت کہا جاتا رہا۔ ان پجاریوں کے اصولِ مذہبی کو ایکانتک دھرم کہا جاتا تھا، اور اس دھرم کی بنیاد اس بھاگود گیتا پر تھی جس کے متعلق آج تک مشہور ہے کہ اس کی تعلیم کرشن واسدیو نے اپدیشوں کی صورت میں دی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ ایکانتک دھرم وشنو اور نارائن کے مروجہ مذہب میں گھل مل گیا اور یوں وشنو نارائن اور کرشن کے ناموں میں ایک بنیادی تعلق پیدا ہو گیا۔ ہندوستان میں مذاہب اور ان کے تصورات کی نشو ونما افسانہ از افسانہ می خیزد کی مصداق بنی رہی ہے۔ کئی صدیاں گزر گئیں اور اس اجلے، سانولے، ملے جلے مذہب میں ایک اور پہلو پیدا ہو گیا اور یہ پہلو ہمارے ادبی نقطۂ نظر سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پہلو کرشن کے بچپن کا بیان ہے۔ جس میں اس کے بعض حیرت ناک کارہائے نمایاں اور گوپیوں سے اس کے تعلقات کا ذکر ہے۔ پُران، مہابھارت، چاند گیک، اپنشد، ان تمام ماخذوں میں کرشن کے بچپن اور گوپیوں کا کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے ہم یہی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پہلی صدی عیسوی تک گوکل میں کرشن کے لڑکپن کا تصور ابھی قائم نہ ہوا تھا۔ اور بھاگوت پُران میں بھی اس لڑکپن کا صرف ذکر ہی ہے، لیکن باقی وہ لوازم موجود نہیں جو بعد میں شامل ہوئے۔ مثلاً رادھا کا وہاں نام تک نہیں ہے۔ وشنو پُران میں بھی رادھا کا کوئی ذکر نہیں۔ حالانکہ وشنو پُران وشنومت کی ایک مستند کتاب ہے۔ ابتدائی وشنو ادب میں وشنو دیوتا کی نسائی قوت (پراکرتی) کا نام سری لکشمی اور کملا تو ہے، لیکن رادھا نہیں ہے۔ جنوبی ہندوستان میں رامانج نے وشنومت کا احیاء کیا لیکن وہ بھی رادھا کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ نارائن کی "رفیقہ" کے طور پر لکشمی، بھو اور لیلا ہی کے نام لیتا ہے۔ رادھا کے تصور کی تخلیق بارھویں صدی عیسوی میں ہوتی ہے۔ اس زمانے میں نمبارک نے کرشن اور رادھا کے تصور کو نمایاں اہمیت دی۔ اس کے بعد ولبھ شاعر نے جنوبی ہندوستان میں اس کی پیروی کی اور پھر سولہویں صدی میں بنگال کے صوفی چیتن دیو نے کرشن کے لڑکپن اور اس کی محبوب رادھا کے تصورات کو فروغ دیا اور یوں بعد کے وشنومت میں رادھے شیام کی پوجا سب سے زیادہ امتیاز اور اہمیت حاصل کر گئی۔ اور ادب میں آ کر ان

تصورات نے سج دیو، ودیاپتی، چنڈی داس اور دوسرے بیشار شعراء کے جوہر خداداد کو چمکایا۔

لیکن چنڈی داس نہ صرف رادھے شیام کا نغمہ خواں تھا بلکہ وہ اس فرقے کا سب سے بڑا ترجمان تھا جس کی تخلیق رادھے شیام کی پوجا سے ہوئی۔ اس فرقے کا نام سہجیہ مسلک تھا۔

دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں بدھ مت کا ایک مشہور عالم کانھو بھٹ گزرا ہے۔ یہی عالم بنگالی زبان میں سہجیہ مسلک کے عشقیہ گیتوں کا سب سے پہلا نمائندہ تھا۔ جس عشق کا ذکر اس کے گیتوں میں کیا گیا ہے اسے سماج کی رضامندی حاصل نہ تھی۔ اپنی بیوی کی محبت سہجیہ والوں کے خیال میں انسان کو تکمیل کے اونچے درجے تک نہیں پہنچا سکتی۔ کانھو بھٹ کے گیتوں میں ایسے مقام بھی آتے ہیں جو عریانی سے بڑھ کر فحاشی کے درجے تک پہنچے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں تصوف کی ایک ایسی روحانی اہمیت موجود ہے جن کی شرح و وضاحت ایک بلند روحانیت کی حامل بھی ہو سکتی ہے۔

سہجیہ مسلک کے اصولوں کی اشاعت کے سلسلے میں چنڈی داس نے جو گیت لکھے ہیں ان میں بعض جگہ ابہام یا استعاروں کا عام الجھاؤ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ بعض باتیں پہیلیاں بن کر رہ گئی ہیں، اور یہ خصوصیت سہجیہ کے دوسرے ادب میں بھی نمایاں ہے لیکن چنڈی داس کے ایسے گیت ابہام کے باوجود اس کے اپنے اعتقادات کی پوری شرح کر رہے ہیں۔ ایک جگہ لکھتا ہے:

''احساسات اور خواہشات پر قابو پانے اور ضبط نفس کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں کرنے ہی سے انسان مکتی حاصل کر سکتا ہے''۔

چنڈی داس کے قول کے مطابق سہجیہ مسلک کے لحاظ سے جو لوگ تربیت نفس کرنا چاہیں انھیں اپنے مرکز محبت کے انتخاب میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ طرفین کے اخلاق راسخ دل صاف اور طبعی رجحان روحانیت کی طرف مائل ہونے چاہئیں۔

محبوب کے انتخاب کے بارے میں بھی سہجیہ ادب کی ایک کتاب ''گپت سادھن تنتر'' میں لکھا ہے:

> ''ناچنے والی عورت، کپالی ذات کی عورت، رنڈی، دھوبن، نائی کی بیٹی، برہمن عورت، شودر عورت، گوالن، مالاکر ذات کی عورت — یہ نو قسمیں تانترک لحاظ سے محبوب بنائی جا سکتی ہیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ ہوشیار ہوں وہ تربیت نفس اور روحانی نشو و نما کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہو سکتی ہیں۔ دوشیزائیں جو حسین ہوں، خوش قسمت ہوں، جوان اور خوش طبع ہوں ان کی پرستش بہت احتیاط سے کرنی چاہئے اور اسی ذریعے سے مکتی حاصل کی جا سکتی ہے''۔

چنڈی داس اس عقیدے کا زبردست پیرو تھا کہ جنسی محبت ہی سے خدا کی طرف دھیان لگایا جا سکتا ہے۔

عشق حقیقی اور عشق مجازی کے بارے میں یہ چنڈی داس کے خیالات تھے۔ لیکن ان خیالات کی نشوونما دو وجھوں سے ہوئی۔ ایک تو ہجیہ مسلک کے اصول اور دوسرے شاعر کی محبوبہ راتی دھوبن کے لئے اس کی محبت۔ لیکن ایک بات کا ہمیں خیال رکھنا چاہئے کہ چنڈی داس ایسی غیر معمولی ہستی نے ممکن ہے کہ ہجیہ اصولوں کے ماتحت رامی دھوبن کی پرستش کے ذریعے مایا جال سے مکتی حاصل کر لی ہو۔

یہاں پہنچ کر اگر ہمارے دل میں اس بات کی جستجو پیدا ہو جائے کہ ہم چنڈی داس کی زندگی کے حالات معلوم کریں تو بے جا نہ ہوگی۔ ہندوستان میں ہمیں بڑے لوگوں کے سوانح حیات اور خصوصاً شعرا کی زندگی کے افسانے بہت ہی اجمالی صورت میں ملتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ڈی۔ سی سین کی تحقیقات نے چنڈی داس کے متعلق کافی مواد بہم پہنچایا ہے۔ ان کے قول کے مطابق بنگال کا پہلا شاعر بیر بھوم کے ضلع کے چھتنا گاؤں میں پیدا ہوا اور ابتدائی زندگی ہی میں قریب کے گاؤں نانور میں اس نے اقامت اختیار کر لی۔ یہ گاؤں ایسٹ انڈیا ریلوے کے اسٹیشن بول پور سے دس میل جنوب مشرق کی سمت واقع ہے۔ وہ جگہ جہاں چنڈی داس کا مکان تھا اب صرف ایک شکستہ ٹیلے کی صورت میں موجود ہے۔ اسی گاؤں میں واسولی دیوی کا وہ مندر بھی تھا جہاں چنڈی داس پروہت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ یہ مندر امتداد زمانہ سے ڈھے پڑا تھا لیکن بعد ازاں اسی مقام پر ایک نئی عمارت تعمیر کر دی گئی تھی، جہاں اب بھی واسولی دیوی کی پوجا ہوتی ہے۔ چنڈی داس کی زندگی کے افسانے کا خاکہ تو سیدھا سادا سا ہے۔ وہ مندر کا پروہت تھا۔ رامی دھوبن (رامونی) سے اسے محبت ہوئی۔ اس جرم کی بنا پر (کیونکہ وہ خود برہمن تھا) اسے ذات سے خارج کر دیا گیا اور کفارہ ادا کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ لیکن رامی کی محبت نے کفارہ کی رسموں کو تکمیل تک نہ پہنچنے دیا۔ چنڈی داس رامی کو ساتھ لے کر ترک وطن کر گیا۔ ترک وطن کے بعد وہ رادھے شیام کے گیت لکھتا رہا۔ اور پھر اسی جلا وطنی میں مر گیا— یہ خاکہ ہے لیکن اس میں روایات و حکایات کی رنگ آمیزی بھی ہے۔ مثلاً رامی سے اس کے عشق کا آغاز کیوں کر ہوا۔

کہتے ہیں کہ ایک روز وہ منڈی میں مچھلی خریدنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ مچھلی بیچنے والی سے اس کا سودا نہیں بن رہا تھا۔ اتنے میں اس نے کیا دیکھا کہ مچھلی بیچنے والی نے اس کی بہ نسبت زیادہ مقدار کی مچھلی اس سے کم قیمت پر ایک اور گاہک کو دے دی ہے۔ وجہ پوچھی تو مچھلی والی کہنے لگی کہ یہ تو معاملہ ہی اور ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے اس لئے میں نے اسے کم قیمت پر مچھلی دی ہے۔ اس واقعے نے چنڈی داس کو محبت کے موضوع میں الجھا دیا اور وہ سمجھنے لگا کہ ایک جذبہ انسان کے چلن کو کیونکر تبدیل کر سکتا ہے۔ اسی دن رامی دھوبن سے اس کا سامنا ہوا۔ رامی ایک جوان اور حسین دوشیزہ تھی، اور چنڈی داس اس محبت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ محبت کے مختلف خیالات اور اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ رامی کو مخاطب کر کے عشقیہ گیت لکھنے لگا اور مندر کی تکمیل میں کوتاہی برتنے لگا۔ اگرچہ چنڈی داس اپنے گیتوں میں لکھتا ہے کہ رامی کے لئے اس کی محبت محض ایک ذہنی اور روحانی احساس تھی

جس میں جسمانی باتوں کو کوئی دخل نہ تھا۔ لیکن دنیا ان باتوں کو کب سنتی ہے؟
دنیا صرف اسی بات کی اجازت دیتی تھی کہ رامی چنڈی داس برہمن کے پاؤں
کی دھول کو چھو سکتی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اگر شاعر نے
اپنے ایک گیت میں اپنی محبوبہ کو "ماں" کے لفظ سے بھی مخاطب کیا ہے اور اس
بات کا تحریری ثبوت دے دیا ہے کہ اس کے جذبۂ دل میں کوئی ایسا جزو شامل
نہ تھا جسے لوگ پست سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اسے برادری سے خارج کر دیا گیا۔
اور واسولی دیوی کے مندر سے معزول کر کے بیانگِ دہل اس بات کا اعلان کر
دیا گیا کہ چنڈی داس اب برہمن نہیں رہا، کیوں کہ اس نے اپنی ذات سے
کہیں نیچ ایک دھوبن سے محبت کی ہے۔

چنڈی داس کا ایک بھائی نکل بھی تھا جسے برہمنوں میں بہت قبولیت
حاصل تھی۔ اس کی انتھک کوششوں سے برہمن اس بات پر راضی ہو گئے کہ اگر
چنڈی داس پرائشچت کے طور پر انہیں ایک دعوت دے اور آئندہ اپنے طرزِ عمل
میں محتاط رہنے کا حتمی وعدہ کرے تو اسے دوبارہ ذات میں لے لیا جائے گا۔
نکل نے دعوت کا انتظام کیا اور تمام برہمن وہاں جمع ہو گئے، تا کہ چنڈی داس
کے پرائشچت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اطمینان کر لیں۔ لیکن اس دوران میں
اس رسمِ کفارہ کی اطلاع رامی کو بھی مل چکی تھی۔ جب اس نے یہ خبر سنی تو بیہوش
ہو گئی۔ ہوش میں آئی تو رونے لگی اور روتی ہی چلی گئی۔ دکھ درد کی اس انتہائی
کیفیت میں وہ اس مقام پر گئی جہاں سے وہ اکثر چنڈی داس کو دیکھا کرتی تھی،
لیکن وہاں پہنچ کر بھی اسے اپنے آپ پر ضبط حاصل نہ ہو سکا۔ دل تھمنے ہی میں نہ
آتا تھا۔ آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی آخر وہ اس مقام پر جا پہنچی جہاں تمام برہمن
جمع تھے۔ اور جہاں چنڈی داس رامی کو بھول کر (؟) پرائشچت پر تیار کھڑا تھا۔
رامی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہہ رہی تھی اور وہ چپ چاپ اپنے
شاعر کی طرف تک رہی تھی۔ چنڈی داس اس منظر کو دیکھ کر بھاگا۔ اب اسے
احساس ہوا کہ وہ کس حماقت کا مرتکب ہوا چاہتا تھا۔ برہمنوں کی موجودگی اپنے
پیارے بھائی کی امیدوں اور کفارہ کے خیال کو یک قلم فراموش کر کے وہ ایک
پجاری کی مانند بڑھا اور رامی کے قدموں پر جھک کر اس سے معافی کا خواست
گار ہوا۔ روایت ہے کہ اس موقع پر چند منتخب برہمنوں نے دیکھا کہ رامی کے
پیچھے پیچھے اس پر سایہ کئے کائنات کی دیوی کھڑی ہے۔ لیکن باقی برہمن اس
جلوے کو نہ دیکھ سکے۔ اور چنڈی داس کے اس اقدام پر پہلے سے بڑھ کر
ناراض ہو گئے۔ چنڈی داس پہلے کی طرح پھر ایک ذات سے خارج شدہ
انسان تھا۔ اس نے کھلے بندوں رامی کو جو محض ایک دھوبن تھی گیاتری کہہ کر
پکارا۔ یہ گستاخی برہمنوں کی نظروں میں ناقابلِ معافی تھی۔ گیاتری جسے
ویدوں کی ماں کہا جاتا ہے اسے ایک معمولی نیچ عورت سے کیا نسبت۔ لیکن
چنڈی داس کے دل کی گہرائیوں میں جو باتیں تھیں انہیں کون سمجھ سکتا تھا۔ اس
کے جذبۂ عشق میں سرشار دل کے لئے ہر شئے یکساں تھی۔ ذات پات کوئی چیز
نہ تھی۔ ایک برہمن اور ایک دھوبن ایک ہی درجے کے مالک تھے بلکہ وہ تو ہمہ
اوست کا قائل تھا۔

چنڈی داس اپنا گاؤں چھوڑنے کے بعد قریب کے ایک گاؤں

کرتا ہر میں جار ہا اور یہیں جب وہ ایک روز کچھ لوگوں کو اپنے گیت سنا رہا تھا تو مکان کی چھت کے گرنے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔

یہ تو شاعر کے انجام کے بارے میں ڈاکٹر سین کا بیان ہے۔ لیکن رومیش چندر دت بنگالی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اسی روایت کو ذرا تبدیلی کے ساتھ لکھتا ہے بلکہ وہ اس کی زندگی کے چند واقعات میں بھی تغیر دیکھتا ہے۔ کالی، چنڈی، درگا اور شکتی — یہ سب ایک ہی دیوی کے نام ہیں۔ اس لئے آر۔ سی۔ دت کی نظر میں چنڈی داس ہی کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ شکتی کا پجاری تھا۔ چنانچہ نوجوانی کے زمانہ میں وہ شکتی کی اس مورت کی پرستش کرتا تھا جسے بشالکشمی کہا جاتا تھا اور اسی نام سے شاعر نے اکثر اپنے کلام میں دیوی کو مخاطب کیا ہے۔ چنڈی داس کے شاکتا سے ویشنو ہو جانے پر کئی حکایتیں رائج ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن وہ دریا پر اشنان کو گیا تو سطح آب پر اس نے ایک بہت ہی خوبصورت پھول تیرتے دیکھا۔ وہ یہی پھول لے کر بشالکشمی کی پوجا کو جا پہنچا تا کہ ایک اچھی چیز دیوی کی مورت تک پہنچ جائے۔ پوجا کے سے دیوی بنفس نفیس اس کے سامنے آئی۔ اور اس نے شاعر سے وہ پھول مانگا تا کہ وہ اسے اپنے سر پر رکھ سکے، اور اس نے دریافت کیا کہ اس پھول میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے دیوی کو یوں بنفس نفیس ظاہر ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور اب وہ بجائے اس کے کہ پجاری اسے اس کے قدموں کی بھینٹ کر دے، چاہتی ہے کہ اپنے سر کی زینت بنائے؟

دیوی نے جواب دیا۔ ''نادان، مورکھ بالک! اس پھول سے تو میرے مالک، میرے ناتھ کی پوجا ہو چکی ہے۔ میرے پانو اس کے لائق نہیں۔ مجھے اسے اپنے سر پر رکھنے دو''۔ شاعر نے پھر دریافت کیا۔ ''اور دیوی! تیرا ناتھ، تیرا مالک کون ہے؟'' اور دیوی نے اس کے جواب میں صرف ایک لفظ کہا ''کرشن —!'' اس روز سے چنڈی داس نے دیوی کی پوجا چھوڑ کر کرشن کو اپنا معبود بنا لیا۔

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس بات کا بہت امکان ہے کہ چنڈی داس کی تبدیلیِ مذہب ہی سے تحریک لے کر بعد کے مصنفوں نے شکتی کے پیروؤں پر وشنومت کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے یہ روایت گھڑ لی ہو۔

اسی طرح رامی سے اس کے پہلے آمنے سامنے کے بارے میں بھی آر۔ سی۔ دت ایک اور روایت لکھتا ہے، جس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ چنڈی داس نے رامی کی محبت سے پہلے نہ صرف وشنومت اختیار کر لیا تھا بلکہ وہ وکیہ کے اصول کی پیروی بھی کر رہا تھا، اور جب اسے پتہ چلا کہ وہ وکیہ مسلک میں اس وقت تک سادھن کی رسم پوری نہیں کر سکتا جب تک کہ ایک خوبصورت عورت اس کی محبوبہ نہ ہو۔ نیز نہ تو یہ عورت اس کی بیاہتا بیوی ہو، نہ روپے پیسے کے لالچ سے محبت کرے بلکہ یہ ایک ایسی عورت ہو جس کی طرف اس کا دل پہلی نگاہ میں ہی بے ساختہ راغب ہو جائے۔ اب شاعر کو ایسی ہی عورت کی تلاش تھی اور جلد ہی یہ کام پورا ہوا۔

ایک روز دریا کے کنارے پر چنڈی داس کی نظر ایک دھوبن پر

---

[1] یعنی شکتی کا پجاری۔

بڑی جو کپڑے دھو رہی تھی۔ چنڈی داس کو اس کی طرف پہلی نگاہ میں ہی بے ساختہ رغبت ہوئی اور وہ ہر روز اس مقام پر مچھلی پکڑنے کے بہانے سے جانے لگا۔ اور یوں وہاں بیٹھ کر اپنی محبوبہ کو دیکھتے رہنا اس کا معمول بن گیا۔ رفتہ رفتہ بات چیت بھی ہونے لگی اور دونوں طرف برابر کی آگ بھڑک اٹھی اور پھر شاعر نے اپنے ماں باپ اور گھر بار کو چھوڑ دیا اور رامی ہی کے ساتھ رہنے لگا۔
موت کے متعلق بھی دت کی روایت میں اختلاف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

> ''چنڈی داس ایک مشہور راگی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز وہ پاس ہی کے ایک گاؤں ماتی پور میں رامی کے ساتھ گانے کے لئے گیا۔ اور جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر لوٹ رہے تھے تو راہ میں ایک مکان میں ٹھہر گئے۔ اتفاق سے اس مکان کی چھت گر گئی اور دونوں عاشق ایک دوسرے کی آغوش میں مر گئے۔ دت یہ بھی لکھتا ہے کہ شاید اس روایت کی بنیاد حقیقت پر نہیں ہے''۔

رامی کا لکھا ہوا جو نوحہ ہمیں ملتا ہے اس میں چنڈی داس کی موت کا ایک اور ہی بیان ہے لیکن اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔ ان واقعات کے علاوہ جو اوپر بیان ہو چکے چنڈی داس کی زندگی میں ایک اور بھی قابلِ ذکر واقعہ ہے۔ یہ واقعہ ودیاپتی سے اس کی ملاقات ہے۔ دت کے بیان کے مطابق اس ملاقات کا حال ہمیں روایات کے علاوہ بہت سی نظموں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ بنگال کی وشنو شاعری کی یادگار اور سب سے مشہور مجموعے ''پودوکال چترو'' میں ایک نظم ہے جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ نظم اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔

> ''چنڈی داس نے ودیاپتی کی قابلیت کا حال سنا اور اس کے دل میں اس سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ودیاپتی نے چنڈی داس کی قابلیت کا حال سنا اور اس کے دل میں بھی اس سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ دونوں کے دلوں میں تجسس جاگ اٹھا۔ ودیاپتی روپ نارائن کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ چنڈی داس بھی رک نہ سکا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں دونوں شاعر ایک دوسرے کی تعریف کے گیت گاتے چلے اور ان کے دل ایک دوسرے کے لئے بیتاب ہو گئے۔ اچانک ان کا آمنا سامنا ہوا لیکن وہ ایک دوسرے کو پہچانتے تو تھے نہیں، جب انہوں نے ایک دوسرے کا نام سنا تو جانا''۔

بعض روایات کے مطابق یہ ملاقات گنگا کے کنارے ہوئی اور بعض کے مطابق بھاگیرتی کے کنارے۔

ہندوستان کے پرانے شعرا کے سوانح حیات کے علم کی کمی کے باعث ان کے کردار کی خصوصیت کا اندازہ بھی زیادہ تر ان کے کلام ہی سے ہو سکتا ہے۔ چنڈی داس کے افسانۂ حیات کی اگرچہ تفصیلات معلوم نہیں لیکن بنیادی طور پر اس سے ایک مکمل کہانی ضرور حاصل ہو جاتی ہے اور روایات کو

بھی چھان بین کے بعد ہم اس جائزے میں شامل کر سکتے ہیں۔ اس کہانی اور ان روایات ہی سے ہم کسی حد تک اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی زندگی میں ایک معین صورتحال کو دیکھتے ہوئے ایک معین روش اختیار کی، وہ کردار کے لحاظ سے کن خصوصیات کا مالک ہوگا۔ مثلاً برہمنوں کے مقابلے میں اس کی ثابت قدمی اور قوت ارادی اس کی نمایاں خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ اور اگرچہ ایک بار وہ کفارہ پر رضامند ہو کر اس استقلال میں لغزش کھا جاتا ہے لیکن اس کی تاویل اس کے بھائی نکل کو قرار دے سکتے ہیں۔

اُس کے کلام کی سادگی اور خلوص سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ طبعاً بھی ایک سیدھا سادا انسان تھا جو ہوا کے رخ کو اپنے مخالف دیکھ کر ہوا کا رخ بدلنے کی بجائے اپنا رخ بدل لینا بہتر سمجھتا تھا، گویا اس کے خیالات اور جذبات میں احساسِ محبت کے علاوہ اور کوئی بات تندی و تیزی کی حامل نہ تھی، اور اس فطری مناسبت ہی کی وجہ سے وشنومت اس کے طبعی رجحان کے عین مطابق تھا، اور اسی لئے اس نے مخالف عناصر سے محض اپنے کلام اور اپنے آدرش ہی کے ذریعے سے جنگ کرنے کو ترجیح دی۔

آجکل کے ماہرین قیافہ نیلے رنگ کی پسند کو فنکارانہ رجحان سے نسبت دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ چنڈی داس کا محبوب ترین رنگ نیلا ہی تھا اس کا اظہار اس کے ان گیتوں سے بخوبی ہو رہا ہے جو اس نے رادھے شیام کے متعلق لکھے ہیں۔ ان گیتوں میں رادھا کی ساڑی کا رنگ وہ عموماً نیلا ہی بتاتا ہے۔ ممکن ہے "یہ نیلگوں فریفتگی" سانولے سلونے شیام کے رنگ کا ہی ایک عکس ہو۔ لیکن ہمیں تو کچھ اور شک ہوتا ہے کہ رامی کے ملبوس کا جادو اس رغبت میں کارفرما ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے روز جب چنڈی داس نے اسے دیکھا وہ اسی رنگ کی ساڑی باندھے ہو یا ممکن عموماً وہ اسی رنگ کی ساڑی استعمال کرتی ہو یا ممکن ہے جب وہ نیلی ساڑی زیب تن کرتی ہو تو وہ چنڈی داس کو غیر معمولی طور پر حسین دکھائی دیتی ہو۔ اس کے علاوہ جب ہم رادھا کے اس بناؤ سنگار اور بالوں کے گوندھنے کے انداز پر غور کرتے ہیں جس کی تفصیل شاعر ایک قسم کے ذاتی مشاہدے کے طور پر نظم کر رہا ہے تو ہمیں شک سا ہوتا ہے کہ کہیں یہ رادھا کے پردے میں بھی رامی دھوبن کے گن تو نہیں گا رہا ہے۔ اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے کیوں کہ چنڈی داس کے کلام میں اس کے اپنے جذبات کا درد اور خلوص موجود ہے۔ موازنے کے طور پر بھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ وڈیاپتی ایک ایسا فنکار تھا جو سنسکرت کی ادبی روایات کے ماتحت اپنے فن کے ذریعے سے رادھا کرشن کے استعارے کو ایک زندہ چیز بناتا ہے تو ہمیں آسانی سے بھائی دے جاتا ہے کہ چنڈی داس اپنے ذاتی تجربے کو ہی رادھا کرشن کے استعارہ میں ایک ہمہ گیر صورت دے رہا ہے کیوں کہ وہ انسان پہلے ہے اور فنکار بعد میں۔

اس کی غیر معمولی جبلت کے اظہار کے لئے صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ اس کی عصمت اور خلاف معمول رویئے ہی کی وجہ سے اس کے زمانے

ـ مغربی بنگال کی موجودہ وزیر اعلیٰ شاعرہ مصورہ ممتا بنرجی کی خاص پسند نیلا رنگ ہے۔
(ف۔س۔اعجاز)

میں لوگ اسے ''پگلا چنڈی'' کہتے تھے۔ اور اس کے بعد اب تک مشرقی بنگال
میں لوگ عصبی مزاج کے افراد کو ''پگلا چنڈی'' ہی کہا کرتے تھے۔

زیادہ تر محقق، شاعر کی موت کا سبب کسی مکان کی چھت کے گر جانے
کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن رامی کے نوحے سے ایک اور ہی کہانی ملتی ہے۔ اس
لئے ہمارے سامنے دو صورتیں ہیں یا تو ہم اس نوحے کو رامی کا کہا ہوا نوحہ نہ
سمجھیں یا شاعر کے انجام کو اس نوحے کے مطابق قرار دیں۔ ڈاکٹر سین ایسے
محقق نے بھی اس نوحے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ نیز چنڈی داس کی موت کا سبب
مکان کی چھت کے گرنے کو قرار دیا ہے۔

اگرچہ چنڈی داس اپنی زندگی ہی میں اپنی داستان عشق کی وجہ سے
مشہور اور اپنے گیتوں کی وجہ سے کافی مقبول ہو چکا تھا اور اس کی شہرت اور
مقبولیت بنگال سے باہر بھی پہنچ چکی تھی۔ لیکن اپنے زمانے کے بعد سے تو وہ
ویشنو شاعری کا ایک ستون مان لیا گیا ہے۔ بعد کے شعراء نے اپنے کلام میں
اکثر اسے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مثلاً ایک شاعر لکھتا ہے:

''مرحبا جے دیو کو جو شاعری کے شہزادوں کا سب سے چمک
دار ہیرا ہے۔ مرحبا ودیاپتی کو جو نفیس جذبات کا مخزن ہے۔
اور مرحبا چنڈی داس کو جو نازک احساسات کی انتہائی بلندی کو
حاصل کئے ہوئے ہے، جو اس دنیا میں اپنی مثال آپ ہے''۔

اس سے زیادہ تعریف اور کیا ہو سکتی ہے — ہاں، اگرچہ ودیاپتی کا
زیادہ رجحان ملاقات اور اس کی مسرتوں کی طرف ہے۔ اس کے کلام میں
خوشگوار تشبیہات اور ایک ایسا زور ہے جو ہمہ گیر ہے۔ اور اس کے تصورات
ایک تازگی سے لبریز ہیں۔ چنڈی داس کا خاص میدان فراق اور اس کی شدید
تکالیف ہیں۔ اور اس کے گیتوں میں سادہ اور دلکش تصورات ہیں جن میں
پُر تکلف تزئین و آرائش کلام کو دخل نہیں ہے۔ ودیاپتی کے کلام میں محبت کی
تازگی اور گرم جوشی ہے۔ اور چنڈی داس کے کلام میں محبت کی گہرائی اور
شدت۔ البتہ روحانی پہلو سے دونوں کا کلام یکساں ہے اور نغمگی کے لحاظ سے
بھی ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے گیت گانے کی بہترین تخلیقات ہیں۔ ودیاپتی
ایک عالم تھا اور چنڈی داس ایک عاشق۔ اور اسی لحاظ سے ان کے کلام میں
بھی ان کی طبعی خصوصیات نمایاں ہیں۔ اس کی ایک عام مثال دونوں کے کلام
سے رادھا کے تصور کی دی جا سکتی ہے۔ ودیاپتی کی رادھا ایک حسن کار کا سنہرا
خواب ہے جو انسانی جسم میں دکھائی دے رہا ہے۔ اور چنڈی داس کی
رادھا — اس کی اپنی محبوب عورت رامی ہی کا عکس ہے۔

انگریزی: گیتا ہری ہرن　　　　اردو ترجمہ: ف۔ س۔ اعجاز

متوسط عہد کے اسپین کی دو شاعرات ولّادہ اور حفصہ

ذرا ایک عام سی بات' عورت کی جیون کہانی پر سوچئے۔ عورت گھر میں گھری عمر بھر خدمت پر مامور یا کم سے کم ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے جس میں اپنی پسند کے اسے محدود اختیارات ملتے ہیں۔ یا تو وہ جاہل ہے یا جو تعلیم اس نے پائی ہے اسے استعمال کرنے کے مواقع اسے نہیں ملتے۔ جہاں تک ان شاندار آزادیوں کا تعلق ہے جن سے زندگی میں تھوڑا ایڈونچر پیدا ہوسکتا ہے' مثلاً اپنے لئے سوچنے کی آزادی' اپنی پسند کی کوئی بات کہنے یا لکھنے یا اکیلے جینے یا شادی کئے بغیر رہنے کا اختیار' من پسند شوہر یا محبوب چننے کا حق یہ سب آزادیٔ نسواں کے افق پر نمودار نہیں ہوتا۔

بدقسمتی سے یہ کہانی دقیانوسی زمانے کے کسی نادر کردار کی نہیں ہے۔ یہ کہانی جن عورتوں کی ہے وہ ہمارے عہد کی ہیں۔ وہ دنیا کے مختلف مقامات کے مختلف معاشروں کے منظرناموں کو آباد کرتی ہیں۔ وہ عورت کی ایک ایسی شبیہ کے بارے میں انتہا پسندی کے ساتھ سوچتی ہیں جو شاعری کرتی ہے' شادی نہ کرنے کا جسے اختیار ہے' جسے چاہے اُس سے پیار کرنے کے لیے آزاد ہے۔ شاعروں' محبت کرنے والوں اور کھوجیوں کی ہمیں ضرورت ہے تاکہ وہ ہمیں بتاسکیں کہ ذرا خطرہ مول لے کر' زندگی جی جائے تو کیسی ہوسکتی ہے۔ دو عورتیں ایسی تھیں عہد متوسط کے اسپین میں ولّادہ بنت المستکفی اور حفصہ بنت الحنی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب یورپ اپنی ثقافتی آزادی کے زرّیں دور میں تھا۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ مختلف زمانوں نے ایک پیچیدہ اور سوفسطائی کثیر الثقافت معاشرے کی پرورش کی ہے۔ الاندلس میں خواتین کا سماجی مرتبہ بھی اسکالروں کے لیے باعث دلچسپی تھا۔ عورتوں کا سماجی مقام و مرتبہ دیکھ کر ہی علماء نے الاندلس کو عہد متوسط کے یوروپ اور مشرقی اسلامی خطوں کی سرزمین سے الگ اور مختلف ایک مقام قرار دیا تھا۔ اسلامی اسپین میں عورتوں کی ایک ایسی تعداد تھی جو سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں میں عملی حصہ لیتی تھی۔ بالخصوص امراء کی جماعت میں سے کچھ عورتیں تھیں جنھیں ایسی ذاتی آزادی حاصل تھی جو اس عہد کی دیگر جدید سوسائیٹیوں کی خواتین میں قابل رشک سمجھی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ ان عورتوں نے تاریخ کے اس خاص وقت اور خطے میں مسلمانوں سے وابستہ ایک ملی جلی تہذیب کی صورت گری کی۔

ولّادہ بنت المستکفی جو ولّادہ اُمیہ یا صرف ولّادہ کے نام سے بھی موسوم ہے قرطبہ (Cordoba) میں گزری ہے۔ غالباً ۱۰۰۱ء سے ۱۰۸۰ء اس کا زمانہ تھا۔ وہ خلیفہ کی بیٹی تھی۔ لیکن خود کو قابل میراثِ پدر ثابت

کرنے کے لئے اسے ایک مخصوص معاشرے کی ضرورت تھی اور قرطبہ پر حکمرانی کا اہل ثابت کرنے کے لیے بھی اسے معلقتوں کا سہارا لینا تھا۔ فرانس کی داستانی شخصیت مادام دے ریمبوئیلے کے ادبی مناظروں سے صدیوں پہلے ولادہ شاعروں' موسیقاروں اور مصوروں' مرد اور عورتوں دونوں کے لیے ادبی محفلیں منعقد کرچکی تھی۔ ولادہ اپنے گرد اندلس کے بہترین شعرا اور موسیقار جمع کرلیتی تھی جو اس کے چاروں طرف قالیچوں اور نمدوں پر جلوہ افروز ہوا کرتے اور لوت (Lute) اور چھ تارے (Zither) کی دھنوں پر فی البدیہہ گیت اور رزمیہ نظمیں موزوں کیا کرتے تھے۔ وہ خود ایک شاعرہ تھی اور عربی میں لکھتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بالکل آزاد تھی۔ شادی نہ کرنے کا فیصلہ اس نے کرلیا تھا حالانکہ اس کے کئی عاشق تھے۔ شاعر ابن زیدون کے ساتھ اس نے برسر عام محبت کی تھی۔ ابن زیدون قرطبہ اور سیویلے (Seville) کے درباروں میں ایک نمایاں ہستی تھا۔ وہ شہزادی ولادہ کے ساتھ محبت کے اسکینڈل کی وجہ سے اپنے عہد کے لوگوں میں ممتاز ہوگیا تھا۔ ولادہ نے اعلیٰ طبقے کے بعض سماجی رواجوں مثلاً حجاب کو بھی چیلنج کیا۔ وہ اپنی آستینوں پر کڑھی ہوئی عبارتوں کے لیے خاصی مشہور ہوگئی تھی۔ ایسی ایک عبارت اس کی آستین پر اس طرح کڑھی ہوئی تھی" میں اونچے مرتبوں کے لئے بخدا بالکل موزوں ہوں اور فخریہ اپنی راہ پر چلتی ہوں"۔ ایک پر یہ عبارت کاڑھی گئی تھی: "میرے عاشق کو میرا رخسار چھونے کی اجازت ہے اور اسے میں اپنا بوسہ عطا کرتی ہوں جو اس کے لیے تڑپتا ہے"۔

صرف ۹ نظمیں ولادہ کی محفوظ رہ پائی ہیں۔ ان میں سے پانچ طنزیہ بلکہ تلخی آمیز ہیں۔ بہترین مصرعے اپنی جان حیات ابن زیدون کے لیے لکھے تھے لیکن وہ سب عشقیہ نہیں تھے۔ ان کی محبت طوفانی اور متنازع تھی۔ اور اس کے بعض سخت طنزیہ شعروں کا مخاطب ابن زیدون ہی تھا۔ اس کے باوجود آج بھی یہ غیر روایتی جوڑا "losenamorados" کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ قرطبہ کے ایک پلازہ کی دیواریں عہد قدیم کی بنی ہوئی ہیں' وہاں ایک مجسمہ پر یہ عبارت کندہ ہے۔ مجسمہ میں دو ہاتھ ہیں۔ ہر ہاتھ آرزومندی سے دوسرے کو تھامنے کے لیے آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

حفصہ بنت الحجی موسوم بہ الرکنیہ ۱۱۳۵ء کے قریب گرینیڈا میں پیدا ہوئی اور ۱۱۹۱ء کے آس پاس مراقش میں اس کا انتقال ہوا۔ اپنی پیش رو ولادہ کی طرح حفصہ بھی اونچے طبقہ سے متعلق تھی۔ وہ گرینیڈا کے ایک شریف بربر خاندان کی بیٹی تھی۔ اس نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ ولادہ کی طرح وہ بھی شاعرہ تھی اور ایک شاعر کی محبوبہ تھی۔ اس کی کئی نظمیں ایسے مکالموں میں تبدیل ہوگئی ہیں جن میں وہ اپنے عاشق سے گفتگو کرتی ہے۔ مثلاً وہ اپنے محبوب ابوجعفر ابن سعید کو لکھتی ہے:

"کیا تم میرے پاس آؤ گے یا میں تم تک جاؤں گی؟
میرا دل جہاں تم چاہو وہاں جائے گا
تم اگر مجھے بلاؤ گے تو پیاسے نہیں رہو گے
نہ دھوپ تمہیں جلائے گی
میرے لب ایک شفاف میٹھا چشمہ ہیں

میرے بال گھنا سایہ پھیلاتے ہیں۔۔۔"

اس کی شاعری میں بزدلی یا اظہار میں روایت پرستی کے خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ عاشق اس کے جواب میں کہتا ہے:

"مجھے اگر کوئی راستہ ملتا ہے تو میں تمہارے پاس جاؤں گا
تمہارا مرتبہ نہیں کہ تم مجھ تک آؤ
باغ جنبش نہیں کرتا لیکن بادِ صبا کے جھونکے وصول کرتا ہے"۔

جعفر کہنا چاہتا ہے کہ باغ اپنی خوشبوؤں اور سرگوشیوں سے پیار کرنے والوں کے وصال کو فرحت بخش دیتا ہے۔ وہ ان باتوں سے حفصہ میں خواہش کو بیدار کر دیتا ہے۔ وہ کہتی ہے ممکن ہے باغ رشک سے جھومنے لگتا ہو نہ کہ تمہاری ستائش سے۔

گرچہ حفصہ کی معلوم شدہ ۱۹ نظموں میں سے بعض طنزیہ یا مدحیہ یا قصیدہ کی نوعیت کی ہیں لیکن اس کی بیشتر شاعری عشقیہ نظموں پر مشتمل ہے۔ ولادہ کی طرح حفصہ بھی وادیٔ محبت سے بخیریت نہیں گزر پائی۔ اس کا عاشق گورنر کا سکریٹری تھا اور شاعروں کا سرپرست ابو سعید عثمان بھی حفصہ پر دل و جان سے فدا تھا۔ عثمان نے جعفر کا قتل کروا دیا۔ حفصہ کے لیے اس پر تبصرہ کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ پھر بھی اس نے اپنے غم کا ان لفظوں میں برملا اظہار کیا:

"وہ دھمکی دیتے ہیں مجھے کہ میں اپنے محبوب کا غم نہ کروں
جسے انھوں نے تلوار سے قتل کر ڈالا
اللہ اس (انسان) پر رحم کرے جس کا دل اس کے آنسوؤں پر موم ہو گیا ہو
یا اس کی چیخوں کو سن کر اُس کا دل پگھل گیا ہو
کیونکہ وہ اپنے محبوب کے لیے بین کر رہی ہے جسے اس کے
حاسدوں نے قتل کروا ڈالا
اور خدا کرے یہ (رونے والی) جہاں کہیں جائے
دوپہر بعد کے بادلوں کے برسنے سے وہاں کی زمین بھیگ جائے"۔

زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ آخر اس نے اپنے محبوب کے قتل کے بعد اپنی زندگی کے ساتھ کیا کیا۔ جس درباری زندگی کی چمک دمک کی وہ عادی تھی اُس نے اسے تج دیا۔ اُس نے دربار چھوڑ دیا۔ شاعری ترک کر کے تدریس کے میدان میں آ گئی۔ بعد کی زندگی اُس نے مراکش میں گزار دی۔ وہاں خلیفہ یعقوب المنصور نے اسے اپنی بیٹیوں کی تعلیم کے لیے بلا لیا تھا۔

ولادہ اور حفصہ اور حفصہ کی ایک ہمعصر گرینیڈا کی ایک خاتون نزھون بنت القلاعی کا اندلس کی سب سے زیادہ مانی ہوئی شاعرات میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی شاعری ہمارے نزدیک اس متمول زندگی کا جشن ہے جسے اختیار کرنے کی انھیں اپنے دور میں کامل شخصی آزادی حاصل تھی۔ اس کے علاوہ ان کے اندر وہ تحمل اور تصنع تھا جو ایک صحیح کثیر الثقافت سماج کی پہچان ہوتا ہے اور لاتعداد قدیم تعصبات جن کا نفاذ موجودہ عہد میں دوبارہ کیا جانے لگا ہے ان عورتوں کا خاصہ نہیں تھے۔ ان کی خوبیاں ان امکانات کی یاد دلاتی ہیں جو کسی ایک صنف، ایک جماعت یا دنیا کے کسی ایک خطے میں محدود نہیں ہوتے۔

اسیم کاویانی
Mob:+9322154702
Email:aseemkavyani@gmail.com

مغلیہ دور کے چند مشہور شاہی رومان

مدیر 'انشا' ف س اعجاز صاحب بھی عجیب آدمی ہیں۔ ابھی 'سلور جوبلی۔ ٹیگور نمبر' کا ہنگامہ فرو نہیں ہوا تھا کہ 'ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ نمبر' (اشاعتِ ثانی) کا ڈول ڈال دیا۔ ان کے اردو کے عشق اور کام کے جنون کو دیکھ کر وہی الفاظ یاد آتے ہیں جو کبھی شبلی نے حسرت کے تعلق سے کہے تھے: 'تم آدمی ہو یا جن!'

خیر، مجھ سے عرض کیا گیا کہ سلاطینِ مغلیہ کے عشقیہ افسانوں کی بازیافت کروں اور ایک مضمون لکھوں۔ میں نے متعجب ہو کر عرض کیا۔ 'ع بزمِ ادبا میں سلاطیں کا گزر کیا معنی!' کہنے لگے، 'کیوں نہیں! تزکِ بابری، تزکِ جہانگیری ہمایوں نامہ اور رقعات و وقائع عالم گیری جیسی کتابوں کے مصنف اور مؤلف بیگانۂ ادب تو نہیں کہے جا سکتے! ان کی تاریخ کے جو مشہور رومان ہیں، انہی پر ایک مضمون لکھ دیجیے'۔ میں نے جو غور کیا تو اعجاز صاحب کے اشاروں میں بڑی تفصیل پنہاں تھی!۔ ان کی نکتہ آفریں طبیعت نے عشقیہ ادب کا ایک نیا پہلو ڈھونڈ نکالا تھا۔ یہ مضمون ان کی اسی فرمائش کی تکمیل میں لکھا گیا ہے۔

اس مضمون میں مغل عہد کے وہ چند تاریخی رومان بیان کیے گئے ہیں جن کا تذکرہ عہدِ مغلیہ کی تواریخ سے لے کر مابعد کے زمانے کی تحقیقی و تاریخی کتابوں تک میں کہیں اشاروں کنایوں میں تو کہیں بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا رہا ہے۔ ان قصوں کے کردار و مقامات اور واقعات کے تعین زمانہ کے لیے مختلف تاریخی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی قارئین کی دلچسپی کے لیے چند متعلقہ حکایتوں اور مکالموں کو جو روایت در روایت چلی آ رہی ہیں، شامل تحریر کر لیا گیا ہے۔

مشہور ہے کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے، جہاں آگ لگی ہوتی ہے۔ اس بنا پر ان تاریخی قصوں کو مکمل طور پر بے بنیاد و مہمل نہیں کہا جا سکتا، البتہ عشق و محبت کے تاریخی افسانوں میں یہ معلوم کرنا بڑا دشوار کام ہے کہ تاریخ کہاں پر ختم ہوتی ہے اور افسانہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ آج کے سائنسی دور میں بھی مستقبل کے امکانات جتنے یقین کے ساتھ ظاہر کیے جا سکتے ہیں، ماضی کے انکشافات پر اتنے ہی ظن و تخمین اور وہم و گمان کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ شاید اسی بنا پر دانش ور تاریخ کو بھی افسانہ قرار دیتے ہیں۔ ایسا افسانہ جس میں صرف کرداروں اور مقامات کے نام حقیقی ہوتے ہیں۔ اگر آپ بھی تاریخ کی اس تشریح کے قائل ہیں تو اس قلم فرسائی کو 'افسانہ از افسانہ می خیزد' سمجھ کر پڑھیے۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ یہ جہانِ رنگ و بو حسن کی دل کشی اور عشق کی سرمستی سے قائم ہے اور جی چاہتا ہے کہ اسی طرح دائم رہے۔

(اسیم کاویانی)

نورجہاں اور جہانگیر

شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں تہران کے ایک معزز خاندان کا شخص مرزا غیاث الدین گردش روزگار سے مجبور ہو کر اپنی حاملہ بیوی کے ساتھ ہندستان آ رہا تھا کہ اس غربت میں قندھار کے مقام پر اس کی بیوی نے ایک بچی کو جنم دیا، جس کا نام مہرالنسا رکھا گیا۔ آگرہ پہنچنے کے بعد ملک مسعود نامی ایک تاجر کی وساطت سے غیاث الدین کی دربار اکبری میں رسائی ہوئی۔ عہدہ پایا، اور اپنی قابلیت کی بدولت رفتہ رفتہ اس نے بادشاہ کی نظر میں اعتبار اور دربار میں وقعت حاصل کر لی۔

مہرالنسا نے غربت و کلفت میں آنکھیں کھولی تھیں، لیکن وہ عیش و راحت کے گہوارے میں پروان چڑھی۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ شہزادہ سلیم کا لڑکپن میں اُس کے ساتھ قصہ کتنا ہی پرانا سہی، یہاں دہرائے بغیر دل نہیں مانتا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے لفظوں میں:

'...... ایک دن مینا بازار میں پھرتی تھی۔ جہانگیر کہ ان دنوں شہزادہ تھا، دو کبوتر ہاتھ میں لیے ہوئے روش پر جا نکلا۔ اس وقت سرور کے عالم میں تھا۔ مہرالنسا کا البیلے پن سے چمن میں پھرنا بہت بھایا۔ آپ پھول توڑنے لگا اور اس سے کہا: ''بی لڑکی! ذرا ہمارے کبوتر تو لیے رہو۔'' مہرالنسا نے کبوتر اس کے ہاتھ سے لے لیے۔ اتفاقاً ایک کبوتر پھڑک کر ہاتھ سے نکل گیا۔ جب شہزادہ ادھر متوجہ ہوا تو پوچھا: ''ہیں! میرا کبوتر کیا ہوا!'' اس نے کہا ''صاحب عالم وہ تو اُڑ گیا''۔ شہزادے نے کہا: ''کیوں کر؟'' اس نے دوسرا بھی اڑا دیا کہ حضور اس طرح اڑ گیا۔ (قصص ہند' ص:100,101)

لڑکپن کی اس پرلطف مڈبھیڑ سے دونوں ہی مسرور ہوئے ہوں گے۔ اگرچہ اس قصے کا تذکرہ کسی معاصر تاریخ میں نہیں ملتا۔ البتہ یہ روایت طے ہے کہ جہانگیر کے کتب خانے کے مہتمم شیخ عاقل نے اسے ایک مثنوی میں بیان کیا تھا، اور وہیں سے بات چل پڑی۔ اس مثنوی کا ایک شعر ہے:

دو کبوتر داد او را شاہ زادہ
بہ پروا تو کبوتر دل نہادہ

[ترجمہ: شہزادے نے اسے دو کبوتر دیے (اور) کبوتر کے اڑ جانے (کے واقعے) سے (اُسے) اپنا دل دے بیٹھا۔]

اس قصے کا اگلا موڑ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، ذہن قبول نہیں کرتا کہ اکبر نے سلیم کو مہرالنسا کی طرف ملتفت ہوتے دیکھا تو اس نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور شہزادے کی پیش قدمی روکنے کے لیے اس نے مہرالنسا کی شادی علی قلی استجلو سے کرا دی۔ ایرانی نژاد مہرالنسا حسین و ذہین ہونے کے ساتھ ایک معزز خاندان سے بھی تعلق رکھتی تھی، اگر کتخدائی کی عمر ہوتی اور سلیم کا اس کی طرف میلان ہوتا تو اکبر بخوشی اس کی شادی مہرالنسا سے کر دیتا۔

جب مہرالنسا 17 سال کی ہوئی تو اکبر کی ہدایت پر اس کی شادی ایک ایرانی سردار علی قلی استجلو سے کرا دی گئی۔ اسی علی قلی کا 1599ء میں

شہزادہ سلیم کے عملے میں تقرر کر دیا گیا۔ ایک دفعہ شکار کے دوران علی قلی نے نہتے ہونے کے باوجود بڑی بہادری سے ایک شیر کو ڈھیر کر دیا۔ جس پر سلیم نے اسے 'شیر افگن' کا خطاب عنایت کیا۔ جب اکبر کی وفات کے بعد سلیم تخت نشین ہوا تو اس نے علی قلی کو بردوان (بنگال) کا حاکم بنا دیا۔ اس دور کی تواریخ سے آشکار ہوتا ہے کہ چند برس کے بعد شیر افگن کی خودسری اور بغاوت کی خبریں ملنے پر جہانگیر نے وہاں اپنے کوکا (رضاعی بھائی) قطب الدین کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا، لیکن شیر افگن نے اسے قتل کر دیا، پھر قطب الدین کے سپاہیوں سے جھڑپ میں وہ خود بھی مارا گیا۔

قصہ نویسوں نے شیر افگن کی ہلاکت کو جہانگیر کے ذریعے اپنے رقیبِ روسیاہ کو ٹھکانے لگانے سے تعبیر کیا ہے تاکہ وہ اپنی معشوق کو حاصل کر لے، لیکن یہ بات اس لیے حقیقت سے بعید معلوم ہوتی ہے کہ شیر افگن کی ہلاکت کے بعد شہنشاہِ ہند کے لیے اپنے ایک حاکم کی بیوہ کو اپنے حرم میں داخل کر لینا کوئی دشوار کام نہ تھا، لیکن اس نے شیر افگن کی بیوہ مہرالنسا اور بیٹی لاڈلی بیگم کو ملکۂ رقیہ سلطانہ (جہانگیر کی سوتیلی ماں) کی مصاحبت اور سرپرستی میں سونپ دیا، اور چار برس تک بے نیاز رہا۔

یہ 1611ء کی بات ہے۔ چونتیس برس کی عمر میں بھی مہرالنسا حسنِ نسوانی کا شاہکار تھی۔ تہذیب و نفاست کی حامل، شیریں کلام اور شعر و سخن کی دلدادہ۔ یورپین مورخ تو اسے رقص و غنا سے بھی آراستہ بتاتے ہیں۔ مارچ 1611ء میں موسمِ بہار کے فینسی بازار میں اتفاقاً جہانگیر کی اس سے آنکھیں لڑ گئیں۔ (2) لڑکپن میں پہلی بار آنکھیں چار ہونے کا واقعہ بھی مینا بازار میں پیش آیا تھا، پس اس دور کی معصوم چاہت کے نقوش ابھر آئے اور پھر اس گل رعنا نے اپنے انداز و ادا اور سلیقے و ہنر سے جہانگیر کو اپنا فریفتہ بنا لیا۔

منشی کالے خاں اکبرالہ آبادی کی تالیف 'تاریخِ عماراتِ شاہانِ مغلیہ' میں شہنشاہ جہانگیر کا مہرالنسا کے نام رقعہ، مہرالنسا کا جواب رقعہ شامل ہے اور ایک حکایت بھی درج ہے، جس سے مہرالنسا کے دل کا میلان ظاہر ہوتا ہے۔ ذیل کی تفصیل وہیں سے منقول ہے:

جہانگیر کا رقعہ:

مہر روشن، آہوئے شیر افگن!

کشیدۂ زرکار کہ بر حریرِ رومی است، ملاحظہ گشت۔

خوب است۔ نماز حیلۂ نیاز چرا باشد؟ حجاب از عصمت بہتر نیست۔

سخن ہائے قدسی بیگم را آویزۂ گوش باید کرد۔ (3)

؎ با مہر و مہ کہ حسن بجاگیر دادہ اند
مہرت بقلبِ شاہ جہانگیر دادہ اند

(چاند اور سورج کے ساتھ جس طرح حسن کی جاگیر دی گئی ہے۔ اسی طرح تیری محبت جہانگیر کے دل کو دی گئی ہے۔)

<u>مہرالنسا نے جہانگیر کے رقعے کے جواب میں لکھا تھا:</u>

''مہر در سایۂ ظل اللہ است و آہوئے شیر افگن در حسرتِ نخچیر بیک پلۂ تیر در حریم شاہ۔ عصمت بے پردہ چوں شمع بے فانوس است و جواب قدسی

غیر عصمت نباشد۔ باقی پردہ پوش مہر سایۂ ظل اللہ بس، مہر تا درخانۂ قطب است
از جا مجید۔

؎ خورشید را کہ نور بجاگیر دادہ اند
با مہر آستانِ جہانگیر دادہ اند

(آفتاب کو جو روشنی کی جاگیر دی گئی ہے۔ آستان
جہانگیر کی عنایت سے دی گئی ہے۔)

حکایت ہے کہ اسی زمانے میں نور جہاں نے ایک گلدستۂ نرگس
بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جس کے ساتھ یہ مصرعہ ایک تختی پر لکھا ہوا تھا:

ع نیست نرگس، چشمِ قدرت کردشوقِ روئے تو

[(یہ) نرگس نہیں ہے بلکہ چشم قدرت کو تیرے چہرے
کے دیدار کا شوق ہوا ہے۔]

جہانگیر نے اس تختی پر نیچے لکھ دیا:

ع کاش باشد 'نور' ہم در نرگسِ دل جوئے تو

[کاش نرگس دل جو (کی آنکھوں میں) نور بھی ہوتا!
(دھیان رہے کہ جہانگیر کا نام 'نورالدین' ہے)]

حاضر جواب مہرالنسا نے بادشاہ کو یہ شعر لکھ کر بھیج دیا اور اپنے دل کا
میلان بھی ظاہر کر دیا:

؎ نور را در چشم از روز ازل جا دادہ اند
چشم اندر پردہا پنہاں جمالِ روئے تو

[نور کو (تو) روز ازل ہی سے آنکھوں میں جگہ دے
رکھی ہے، اور میں پردہ (ہائے چشم میں) پنہاں تیرے روئے زیبا
کو دیکھتی رہتی ہوں۔]

آخر مئی 1611ء میں جہانگیر نے مہرالنسا کو حبالۂ عقد میں لے لیا۔
گرچہ جہانگیر کی کم از کم اٹھارہ منکوحہ بیویاں موجود تھیں لیکن مہرالنسا کے حسن و
زیبائی، فراست و دانائی اور خوش مزاجی و سخن فہمی نے اسے جہانگیر کی محبوب ملکہ
بنا دیا۔ جہانگیر نے اسے پہلے 'نورمحل' بعدازاں 1616ء میں 'نورجہاں' کے
خطاب سے نوازا، اور اسی نام سے وہ تاریخ میں مشہور ہوئی۔ اس کی معاملہ فہمی
اور تدبر نے اسے امورِ سلطنت میں اس قدر دخیل اور بااثر بنا دیا تھا کہ مغلیہ
تاریخ میں کسی اور ملکہ کو ایسا امتیاز حاصل نہ ہوا۔ شاہی سکوں پر جہانگیر کے
ساتھ نورجہاں کا نام بھی کندہ ہونے لگا:

؎ بحکمِ شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنامِ نورجہاں بادشاہ بیگم زر

[زر، شاہ جہانگیر کے حکم سے سو طرح سے آراستہ ہوا،
جب (وہ) نورجہاں بادشاہ بیگم کے نام سے (مزین) ہوا۔]

وہ ایک بہت اچھی نشانے باز بھی تھی۔ 'تزکِ جہانگیری' میں نور
جہاں کے شوقِ شکار میں اپنی بندوق سے تریشہ (ایک طرح کا خوش رنگ

پرندہ) سے لے کر شیر تک کا شکار کرنے کا حال ملتا ہے۔ نور جہاں کے عشق قدر اندازی اور جہانگیر کی نور جہاں سے فریفتگی ہی نے اس قصے کو جنم دیا کہ ایک دفعہ جب نور جہاں اپنے محل کی مہتابی پر ٹہل رہی تھی تو اس نے کسی راہرو کو مہتابی کی طرف دیکھتا ہوا پایا۔ نور جہاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نشانہ سادھا اور اسے ڈھیر کر دیا۔ جہانگیر کا دور اس کی انصاف پسندی کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔ نور جہاں ملزموں کی طرح دربار میں پیش کی گئی۔ مفتیوں نے مقتول کے وارثوں کو ایک لاکھ درہم خوں بہا دے کر معاملہ نپٹایا اور نور جہاں کی گلو خلاصی ہوئی۔ جہانگیر نے محل سرا میں اس کے پہلو میں سر جھکا کر جو کہا تھا، اسے شبلی نے یوں لکھا ہے:

ع تو اگر کشتہ شدی، آہ چہ می کردم من؟

[تو اگر ہلاک ہو جاتی (تو) آہ میں اپنا کیا کرتا!]

نور جہاں نے بھی ایک بار اپنے محبوب جہانگیر کی زندگی خطرے سے بچائی تھی اور حکومت بھی۔ 1626ء میں جب جہانگیر کشمیر سے کابل کا قصد کر کے دریائے جہلم عبور کر رہا تھا، تب مہابت خاں نے سازش کر کے بادشاہ کو اپنی حراست میں لے لیا تھا اور اس بدسرشت کا ارادہ دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کا تھا۔ اس نازک موقع پر نور جہاں نے اپنی دلیری اور دانائی سے جہانگیر کو اس مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ اس نے جہانگیر کی بلانوشی کی عادت کو بھی قابو میں کیا تھا۔

جہانگیر اور نور جہاں کے عشق کی بہت سی حکایتیں مشہور ہیں۔ بادشاہ اپنی ملکہ پر پروانہ وار فدا تھا۔ اکثر اپنے شوقِ وصل کے اظہار میں اسے نور جہاں کے وقفۂ ایام کا خیال بھی نہ رہتا تھا۔ ایسے میں وہ حسنِ معذرت میں کوئی بامعنی شعر موزوں کر کے جہانگیر کو اپنی کیفیت سے مطلع کر دیا کرتی تھی۔ اس طرح کے درج ذیل شعر اسی سے منسوب ہیں:

ع ظاہرم منگر گرچہ سرسبزم
ولیک باطنِ من چوں حنا پُر از خون است

(میری ظاہری حالت نہ دیکھ، گو کہ میں سرسبز ہوں، لیکن میرا باطن حنا کی طرح خون سے بھرا ہوا ہے۔)

دست ز گل چیدنم امشب بدار
می چکد از برگِ گُلم آبِ نار

[آج کی رات میرے (گلزارِ حسن) کی گل چینی سے ہاتھ اٹھا لے۔ (اس لیے کہ) میرے پھول کی پنکھڑی سے مائع سرخ ٹپک رہا ہے۔ (لغت میں 'آبِ نار' کے معنی شرابِ سرخ ملتے ہیں۔ 'نار' مخفف انار بھی درج ہے۔)]

بخونِ من اگر شاہا دلت خوشنود می گردد
بجانِ من ولے تیغ تو خود آلودہ می گردد

(اے بادشاہ اگرچہ میرا خون بہانے سے تیرا دل خوش ہوتا ہے، لیکن میری جان کی قسم! تیری تیغ خود آلودہ ہو جائے گی۔)

ایک دن بادشاہ نے جو قبا پہنی تو اس میں لعل کی گھنڈیاں لگی ہوئی

تھیں۔ نور جہاں نے اسے دیکھ کر یہ شوخ شعر پڑھا:

؎ ترا نہ تکمۂ لعل است در لباسِ حریر
شد است قطرۂ خونِ منت گریباں گیر

[تیرے لباسِ حریر میں یہ لعل کی گھنڈی نہیں ہے، (بلکہ)
میرا خون (کا قطرہ) گریباں گیر ہوا ہے۔]

ایک مرتبہ جب ماہِ رمضان کا آخری دن تھا، جہانگیر نور جہاں کو پہلو میں لیے باغ میں ٹہل رہا تھا، تب یکلخت عید کا چاند ظاہر ہوا۔ جہانگیر نے نور جہاں کی طرف دیکھ کر کہا:

ع ہلالِ عید بر اوجِ فلک ہویدا شد

[آسمان کی بلندی پر عید کا چاند نمایاں ہوا۔]

نور جہاں نے برجستہ گرہ لگائی:

ع کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود، پیدا شد

[گویا مے کدے کی کنجی جو گم ہو گئی تھی، ظاہر ہو گئی۔
(ہلالِ عید کے ظہور سے کلیدِ میکدہ پانے میں یہ کنایہ ہے کہ رمضان میں میکدہ بند تھا یا شراب کا امتناع تھا، جواب نہیں رہا۔)]

اگرچہ فارسی نور جہاں کے خمیر میں شامل تھی لیکن مؤلف "تذکرۂ جلوۂ خضر" کے بقول وہ اردو میں بھی شعر کہتی تھی۔ انھوں نے نور جہاں کے اردو اشعار بھی نقل کیے ہیں، جو محققین کی نظر میں ناقابلِ اعتبار ہیں۔

جہانگیر نے 1627ء میں 58 برس کی عمر میں وفات پائی۔ لاہور میں تدفین ہوئی۔ جہاں پر بعد میں نور جہاں نے ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔

اگرچہ نور جہاں جہانگیر کی وفات کے بعد اٹھارہ برس تک حیات رہی، لیکن اس نے ساری زندگی سفید پوشاک پہنی، بناؤ سنگھار ترک کر دیا اور عیش و مسرت کی محفلوں سے کنارہ کر لیا۔ 1646ء میں نور جہاں کا انتقال ہوا تو اس کی تدفین جہانگیر کے مقبرے کے قریب خود اس کے بنوائے ہوئے مزار میں ہوئی۔ اس کی لوحِ مزار پر چند دردناک شعر درج ہیں، جن میں سے ایک مشہور شعر جو تجلی کاشانی کا ہے، اور جسے لوگوں نے نور جہاں سے منسوب کر دیا ہے، یہ ہے:

؎ بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد، نے صدائے بلبلے

[ہم غریبوں کے مزار پر نہ کوئی چراغ روشن ہے نہ کوئی پھول کھلا ہے (اس لیے) نہ کوئی پروانہ نثار ہوتا ہے، نہ کسی بلبل کی صدا ہے!]

اورنگ زیب اور زین آبادی

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جوانی کی منزل پار کر چکا تھا اور پینتیس برس کی عمر میں تین یا چار بیویوں کا شوہر اور چھے بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ ذکر ہے محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کا۔

1653ء کی بات ہے جب اورنگ زیب دکن کی مسافت طے کر رہا تھا، جہاں اسے دوسری بار صوبیداری سونپی گئی تھی۔ اثنائے راہ میں اس کا

گزر برہان پور (خاندیش) کے نواح میں زین آباد نامی بستی میں ہوا۔ اس زمانے میں برہان پور میں شاہ جہاں کا ہم زلف مظفر خاں میر خلیل خاں زماں ناظم الامور تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی خالہ (ملکہ بانو بیگم) کے یہاں قیام کا قصد کیا۔ اس کی خالہ کی من کی مراد بر آئی کہ ع اے آمدنت باعث آبادی ما!

زین آباد کے ایک دلکش باغ میں شہزادے کا شاندار استقبال کیا گیا۔ شاہی خیمہ نصب ہوا۔ قدرے آرام اور طعام کے بعد خالہ بیگم دیگر خواتین حرم کے ساتھ شہزادے کو لے کر آہو خانے کی سیر کو نکلی۔ اسی سیر کے دوران میں ناگاہ کیا ہوا کہ خواتین کی جھرمٹ میں سے ایک نوخیز گلبدن بجلی کی طرح نکلی، آموں کے پاس لدے ایک پیڑ کے پاس جست لگائی اور ایک آم توڑ لیا۔ اس کی شوخی و بے باکی سب کو گراں گزری، سوائے شہزادے کے۔ ملکہ بانو بیگم کی تیوریاں چڑھتی دیکھ کر اس حسینہ نے اس جھرمٹ سے جدا ہو جانا ہی مناسب سمجھا اور شہزادے کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر ایک ہاتھ سے اپنی پشواز سنبھالے اٹھلاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس کی یہ نگاہ ایسی قیامت کی تھی کہ جس کے لیے شاعر نے کہا ہے۔

ع تکبیر کا وار تھا دل پر پھڑ کنے جان لگی

اور سب تو سیر چمن کرتے رہے۔ ادھر شہزادے کی نگاہ میں جیسے اس غزال رعنا کی جست کا منظر اور اس کا حشر خیز جوبن منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ اس آہو خانے میں شہزادے کے خرمن ہوش و خرد پر بجلی گرانے والی وہ ہرنی، ہیرا بائی تھی۔ خان زمان زنان حسین اور موسیقی کا رسیا تھا' ہیرا بائی اس کی داشتہ

اور مطربہ تھی جس پر وہ جان چھڑکتا تھا۔

اگر چہ مؤلف 'احکام عالم گیری' ہیرا بائی کی مدھر آواز سن کر اورنگ زیب کے کھنچے چلے آنے اور اس حسن و موسیقی کی مورت کو دیکھ کر غش کھا کے گر جانے کا حال بیان کرتا ہے، لیکن مضمون نگار اورنگ زیب کو اتنا نازک تو باور کرنے میں متامل ہے۔ میری چشم تصور میں مذکورہ واقعہ دوسری ملاقات کے طور پر یوں نمودار ہوتا ہے کہ .... اس دن کی سیر کے بعد ہیرا بائی شہزادے کے ہوش و حواس پر چھا گئی تھی۔ دوسرے دن وہ اپنے شاہی خیمے سے تنہا ہی نکل کر آہو خانے کی سیر کو نکل پڑا۔ دفعتاً کسی کے گانے کی دل نواز صدا اس کے کانوں میں پڑی اور پھر جیسے اس آواز نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال کر اپنی سمت کھینچنا شروع کر دیا ہو۔ شہزادہ اسی لے کی سمت چل پڑا۔ کچھ دور جا کر کیا دیکھتا ہے کہ وہی نو بہار ناز ایک پیڑ کے نیچے ہاتھ میں ساز لیے نغمۂ بہار گا رہی ہے۔ شہزادہ ایک درخت کی آڑ سے اسے ٹکٹکی باندھے نہارتا رہا۔ اس مطربہ کی ہر لے پر اس کا دل ڈول رہا تھا۔ جب نغمہ تھما تو نہ جانے کتنے یگ بیت گئے تھے۔ شہزادے کو ہوش تب آیا جب اس کی سماعت سے یہ نقرئی آواز ٹکرائی 'صاحب عالم'!

اس نے وہم و خیال کی دنیا سے باہر آ کر پوچھا ''تم نے ایسی نوائے دل نواز کہاں سے پائی؟''

''جہاں سے ستاروں نے چمک، گل نے بو، پانی نے روانی پائی''۔ ہیرا بائی نے ہنس کر کہا۔ شہزادے کو اور کچھ نہیں سوجھا تو اپنے گلے سے

موتیوں کا ہار نکالا اور اس کی صراحی دار گردن میں ڈال دیا۔ ہیرا بائی نے مسکرا کر اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر ایک قاتلانہ نگاہ ڈالی جیسے کہہ رہی ہو "ہیرے کے لیے موتیوں کا ہار! یہ ہیرا بائی تو جوہری کو اپنے مول میں لے کے رہے گی"۔

ع پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ہیرا بائی ایسی گئی کہ کئی دنوں تک پلٹ کر نہ آئی۔ غالباً اسے خان زمان کی خدمت میں بلا لیا گیا تھا۔

شہزادے کا جی کسی بات میں نہ لگتا تھا۔ طبیعت مضمحل ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آب و خور سے ہاتھ اٹھا لیا۔ حکیم اور وید آنے لگے، لیکن اسے کوئی افاقہ نہ ہوتا تھا۔ خالہ گھبرائی گھبرائی پھر رہی تھی کہ یہ بیٹھے بٹھائے بھلے چنگے شہزادے کو کیا ہو گیا؟ وہ ایک دن طبیعت کا حال جاننے کے لیے آئی ہوئی تھی اور کوئی وہاں پر موجود نہیں تھا، تب شہزادے نے خالہ کا ہاتھ تھام کر کہا "میرا علاج حکیموں اور ویدوں کے پاس نہیں! ہاں اگر تم میری مدد کرو تو میں اچھا ہو سکتا ہوں"۔

خالہ نے حیران ہو کر کہا "میری سو جانیں تم پر قربان! بلا تردد کہو کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں، بلکہ مجھے شکایت ہے کہ اگر کوئی بات میرے حیطۂ امکان میں ہے، تو تم نے مجھ سے اب تک کیوں نہیں کہی!

تب شہزادے نے اسے بتایا کہ وہ ہیرا بائی کے عشق کا بیمار ہے اور اس بیماری کی دوا بھی ہیرا بائی ہی ہے، اور وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ملکہ بانو بیگم شہزادے کی فرمائش سن کر سنانے میں آ گئی۔ ہیرا بائی محض مطربہ ہی نہیں میر خلیل کی دل پسند مدخولہ بھی تھی، جس سے دست بردار ہونا وہ کسی طرح گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اگرچہ ہیرا بائی ملکہ کی چھاتی پر مونگ دل رہی تھی اور ملکہ دل سے چاہتی تھی کہ وہ دفان ہو، لیکن اس کا بوتا نہ ہوتا تھا کہ خان زماں سے اس کی محبوب مطربہ اورنگ زیب کو سونپ دینے کی بات کہہ پاتی۔ ملکہ نے اپنی بے بسی ظاہر کی تو اورنگ زیب کی آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ اس نے یہ کہہ کر رخصت لی کہ "ہیرا بائی کے بغیر میں نہیں جی سکتا، میرے پاس اور بھی وسیلے ہیں"۔

اپنے مستقر پر آ کر اورنگ زیب نے اپنے رازدار دیوان مرشد قلی خراسانی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور پوچھا کہ ہیرا بائی کے حصول کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟۔ وہ نمک خوار تلوار سونت کر بولا "آپ کے اشارے کی دیر ہے' خان زمان کو راہیِ ملکِ عدم کیے دیتا ہوں اور پھر ہیرا بائی آپ کے پہلو میں ہوگی"۔

اورنگ زیب نے اپنے وفادار کے تیور دیکھ کر کہا کہ "خان زمان ہمارا قرابت دار ہے۔ اس کی جان لینا مجھے گوارا نہیں، یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔ افہام و تفہیم سے کام لو۔ عوض و معاوضہ جو بھی اسے مطلوب ہو دیا جا سکتا ہے"۔ کچھ سوچ کر اورنگ زیب نے ع پھر وہ کہا جو لائق اظہار بھی نہیں! اس نے خان زمان کے لیے ہیرا بائی کے عوض میں اپنی بیگم دل رس بانو

بیگم (رابعہ درانی) تک کو دینے کی پیش کش اپنے دیوان کے گوش گزار کر دی۔

(4)

خراسانی نے خان زماں سے ملاقات کر کے اسے شہزادے کے احوال سے مطلع کیا۔ شہزادے (اور مستقبل کے شہنشاہ) کی دوستی اور دشمنی کے نفع و ضرر کو سمجھایا اور پھر شہزادے کی پیش کش بھی سامنے رکھ دی۔ خان زمان اپنی متاعِ حسن کے چھننے کے تصور سے بے چین ہو گیا۔ اس نے خراسانی کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ اسے سوچ بچار کرنے کے لیے موقع دیا جائے اور وہ کل شہزادے کے پاس اس کی خالہ کے ذریعے اپنا جواب پہنچا دے گا۔

اس سارے معاملے کی اونچ نیچ پر غور کرنے کے بعد دوسرے دن اس نے یہ مسئلہ ملکہ بانو بیگم کے سامنے رکھا اور یہ عندیہ ظاہر کیا کہ 'جاہِ شاہانہ میں اس کی منکوحہ دل رس بانو بیگم کا خواستگار نہیں ہو سکتا۔ یوں بھی وہ میری بہو ہوتی ہے، البتہ کنیز کا تبادلہ کنیز سے ہو سکتا ہے۔ میری نظر میں ہیرا بائی کی اہمیت، اورنگ زیب کی چہیتی اور منہ لگی چتر بائی سے کم نہیں۔ تم اپنے بھانجے سے جا کر کہہ دو کہ ہیرا بائی کا تبادلہ صرف چتر بائی سے ہو سکتا ہے' اس کے دل میں کہیں یہ خیال بھی دبا ہوا تھا کہ اورنگ زیب شاید اپنی محبوب ترین کنیز (چتر بائی) کو اپنے سے جدا کرنا پسند نہ کرے اور اپنے ارادے سے باز آ جائے۔

یہاں ملکہ بانو بیگم کے دل میں یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ اب ہیرا بائی سے پنڈ چھوٹے گا، لیکن اپنے شوہر کی فرمائش سن کر اس کے دل سے ایک آہ نکلی۔ ع پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی! (سوز)

اپنے شوہر کے سامنے اس کی دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ بالآخر اس نے اورنگ زیب کے پاس جا کر اسے خان زمان کے جواب سے مطلع کر دیا۔ اورنگ زیب کو اپنا گلِ مقصود اتنی آسانی سے حاصل ہو جانے کی توقع نہیں تھی، اس نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا ''اس (ہیرا بائی) کی خاطر (صرف) ایک کنیز! آپ چتر بائی کو ابھی پالکی میں اپنے ساتھ لے جائیے۔''

چتر بائی آ گئی اور خان زمان کے لیے مفر کی کوئی راہ نہ بچی تو ناچار ہو کر اس نے ہیرا بائی اورنگ زیب کو سونپ دی۔ اس واقعے سے پرے نظیری نے سچے عشق کی تعریف میں کیا کہا ہے، وہ بھی دیکھیے:

ے نظیری کوئے عشق است، نہ شاہد بازی و رندی
کہ گر یارے رود از دستِ کس، یارے دگر گیرد

[نظیری (یہ) کوئے عشق ہے۔ شاہد بازی و رندی نہیں ہے کہ اگر ایک معشوق کسی کے ہاتھ سے چھوٹتا ہے تو کوئی دوسرا اسے جا لیتا ہے۔]

اب اورنگ زیب کا وہی معمول ہو گیا جو کبھی بابر کا تھا کہ

ع بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ہیرا بائی، زین آبادی بیگم، (5) کہلانے لگی۔ اورنگ زیب دنیا و مافیہا سے بے خبر عشق کی سرمستیوں میں کھو گیا۔ یہاں تک کہ جرعہ بھر بھر کر شراب اس مستِ شباب کو پلاتا تھا۔ جب ایک دن اس زہد شکن نے ساقی بن کر اسے پیالۂ شراب پیش کیا تو اس کے پرستارِ حسن کو 'زعمِ دین داری' کے باوجود انکار

کی مجال نہ ہوئی۔ اورنگ زیب پیالۂ شراب منہ سے لگانے ہی کو تھا کہ اس ساحرہ نے کرم کیا اور یہ کہہ کر پیالۂ شراب لے لیا کہ ع اک چھیڑ تھی وگرنہ مراد امتحاں نہیں!

ایں گلِ دیگر شگفت کہ اس عشق کے افسانے کو اورنگ زیب کے حریفِ ازلی دارا شکوہ نے نمک مرچ لگا کر شاہ جہاں کے کانوں تک پہنچا دیا۔ اورنگ زیب نے معافی و معذرت کا خط لکھ کر بات نبھانے کی کوشش کی۔ قدرت کو اس کی بربادی منظور نہ تھی، شاید اسی لیے زین آبادی بیگم 1654ء میں جواں مرگی کا شکار ہوگئی۔ (یہ بھی کہا گیا ہے کہ دل رس بانو بیگم نے سوتیا ڈاہ میں اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا)۔ اور اس طرح اورنگ زیب کی محفلِ عیش درہم برہم ہوئی۔ زین آبادی کی موت کے صدمے کا اورنگ زیب پر جو اثر ہوا، اسے ''غبارِ خاطر'' میں مولانا آزاد نے اپنے اثر انگیز اسلوب میں یوں بیان کیا ہے:

''اورنگ زیب نے صدمے کی زیادتی سے شکار کی جانب توجہ فرمائی، میر عسکری عاقل خاں ہمراہ تھا۔ تنہائی پا کر اس نے عرض کی۔ ''کیا اس حالت میں شکار کی جانب متوجہ ہونا بہتر ہو گا؟'' شہزادے نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

نالہ ہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست
در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

[گھر میں نالہ وزاری کرنے سے دل کو تسلی نہیں ہوتی (البتہ) بیابان میں خاطر خواہ فریاد کی جا سکتی ہے۔]

عاقل خان نے موقع کی مناسبت سے یہ شعر پڑھا:

عشق چہ آساں نمود، آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود، یار چہ آساں گرفت

[عشق کتنا آسان نظر آتا ہے (لیکن) آہ وہ کس قدر دشوار ہے۔ جدائی کتنی کٹھن ہوتی ہے (لیکن) یار نے اسے کتنا سہل جانا ہے یا معمولی سمجھا ہے۔]

شہزادہ بے اختیار رونے لگا''۔

اورنگ آباد میں تالاب کلاں کے پاس زین آبادی بیگم کا مقبرہ بنایا۔ منوچی کے بموجب ایک زمانہ گزر جانے کے بعد اورنگ زیب نے اقرار کیا تھا کہ ''یہ خدا کی رحمت تھی کہ زین آبادی مرگئی، جس کے باعث ایسے گناہ سرزد ہوئے کہ جو اگر قائم رہتے تو ہرگز مجھ میں حکمرانی کی قابلیت نہ رہتی۔'' اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ زین آبادی کی موت کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ اس نے زندگی بھر شراب کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھائی اور اس پر قائم رہا، یعنی اس سانحے سے پہلے اسے شراب نوشی سے گریز نہ تھا۔

اورنگ زیب کی عشقیہ داستان کا ذکر پہلے پہل اسی کے ایک معتمد افسر اور اس دور کے حالات کے شاہد حمید الدین خان نے اپنی کتاب 'احکامِ عالم گیری' میں کیا تھا، جو اس نے اورنگ زیب کے انتقال کے بعد لکھی تھی۔ شاہ نواز خان کی 'مآثر الامرا' میں بھی یہ قصہ موجود ہے۔ شاہ نواز خان (جو اپنے

آخری دور میں نواب ناصر جنگ بہادر صوبہ دار دکن کا وزیر تھا) کے پُرکھے شہنشاہ اکبر کے دور سے مغلیہ حکومت کی خدمت بجالاتے رہے تھے اور شاہ نواز خان کی مآثر الامرائے تیموریہ کو اس دور کے امرا کے حالات کا اہم ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کے بیسویں صدی کے مایۂ ناز محقق جدوناتھ سرکار کو بھی اس قصے کی صداقت سے انکار نہیں ہے۔ پھر بھی ہمارے کچھ مورخین اورنگ زیب کی اسلامیت سے اتنے متاثر ہیں کہ تاریخی حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے ہر باب میں خطا وعصیاں سے پاک اور معصوم قرار دینا چاہتے ہیں۔ ان کے اس رویے پر ایک بار نیاز فتح پوری نے بڑا پر لطف تبصرہ کیا تھا:

''رہا اورنگ زیب کا واقعۂ تعشق، سو اگر وہ غلط بھی ہو تو بھی جی یہی چاہتا ہے کہ اسے غلط نہ سمجھا جائے۔ کوئی تو انہونی بات اس سے بھی سرزد ہو جانے دیجیے کہ وہ عالمِ ملکوت سے ہٹ کر انسانی برادری میں شامل ہو جائے''۔

('نگار پاکستان' جنوری 1965ء)

زیب النسا اور عاقل خان

زیب النسا، اورنگ زیب کی پہلی اولاد تھی۔ جس زمانے میں وہ پہلی بار دکن کا صوبیدار بنایا گیا تھا اور دولت آباد میں مقیم تھا، وہیں اس کی زوجۂ اول دل رس بانو بیگم نے 1638ء میں زیب النسا کو جنم دیا تھا۔ بچپن ہی سے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کی قرآن اور دینیات کی تعلیم عنایت اللہ خاں نیشاپوری کی والدہ حافظہ بیگم کے سپرد کی گئی تھی اور اس کے بعد عربی و فارسی کی تدریس کے لیے ملا جیون مامور ہوئے تھے۔ وہ بلا کی ذہین تھی اور علم و ادب کا ذوقِ صحیح رکھتی تھی۔ اکیس برس کی عمر میں وہ تحصیل علم کر چکی تھی۔ اس کے نجی کتب خانے میں سیکڑوں اہم اور قیمتی کتابیں موجود تھیں۔

شہزادی زیب شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتی تھی، اپنے زمانے کے مشہور شاعر ملا سعید اشرف سے اصلاح لیا کرتی تھی۔ اگرچہ عالم گیر ایک شعر بیزار شخص تھا، لیکن شہزادی کا حد سے بڑھا ہوا ذوق دیکھ کر وہ تعرض نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ نجی طور پر منتخب روزگار شعرا کی شعر و سخن کی محفلیں بھی آراستہ کرتی تھی۔

زیب النسا کا تخلص مخفی تھا اور 'دیوانِ مخفی' اسی سے منسوب ہے۔ بعض محققین اس دیوان کو زیب النسا کا باور کرنے میں متامل ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کلام ایک ایرانی شاعر مخفی گیلانی کا ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں ان کے پاس قوی دلائل نہیں ہیں، وہیں اس دیوان کی ایک غزل کا مقطع ان کے اس خیال کی تردید کرتا ہے:

؎ دخترِ شاہم و لیکن رو بہ فقر آوردہ ام
زیب و زینت بس ہمی نم، نامِ من زیب النساست

(میں بادشاہ زادی ہوں لیکن فقر و قناعت کو اختیار کر لیا ہے، زیب و زینت صرف اس لیے ہے کہ میرا نام زیب النسا

ہے۔)

زیب النسا کا کلام اپنے دور کے لحاظ سے عمدہ اور پختگی کا حامل ہے، اس پر حافظ کا اثر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ چند شعر ہیں:

بلبل از گل بگذرد در چمن بیند مرا
بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

(بلبل اگر چمن میں مجھے دیکھ لے تو پھول کو بھلا بیٹھے اور اگر برہمن مجھے دیکھ لے تو بُت پرستی سے جاتا رہے۔)

باغبان منتِ مہتاب مکش در شبِ تار
شمعِ گلزار شود نرگسِ مستانۂ من

(باغباں! اندھیری رات میں چاند کا احسان نہ لے، میری نرگسِ مستانہ شمعِ گلزار ہو گئی ہے۔)

براُفگن برقعے از رُخ بآئینِ شہنشاہی
تسلّی کن بدیدارت تمامی داد خواہاں را

[شہنشاہی کے دستور کے مطابق (اپنے) رخ سے نقاب اٹھا دے (اور) اپنے دیدار سے سب فریادیوں کی ڈھارس بندھا۔]

در سخن پنہاں شدم مانندِ بُو در برگِ گل
ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا

(میں اپنی شاعری میں اسی طرح پوشیدہ ہوں جس طرح پھول میں خوش بو۔ جو کوئی بھی میرے دیدار کا مشتاق ہو، میرا کلام دیکھ لے۔)

مشہور فرانسیسی تذکرہ نویس میسیو دتاسی نے لکھا ہے کہ زیب النسا کے کلام کی اردو بیاض اس کی نظر سے گزری تھی۔ بلگرامی مرحوم نے بھی اپنے 'تذکرۂ جلوۂ خضر' میں کسی قدیم بیاض سے زیب النسا کا اردو کلام درج کیا ہے، لیکن ان سے قبل کے تذکروں میں کہیں زیب النسا کے اردو کلام کی سند نہیں ملتی۔

زیب النسا اور عاقل خاں کے عشق کی ابتدا یوں ہوئی کہ 1662ء میں اورنگ زیب اپنی علالت کے سبب تبدیلِ آب و ہوا کے لیے تمام خواتینِ حرم کے ساتھ لاہور آیا ہوا تھا، جہاں اس وقت عاقل خان گورنر تھا۔ عاقل خان خود بھی ایک اچھا شاعر تھا۔ شاہ برہان الدین رازِ الٰہی کا مرید تھا اور اسی نسبت سے اس نے اپنا تخلص رازی اختیار کیا تھا۔

ایک دن قصرِ شاہی میں ایک چھت پر اس نے زیب النسا کو عنابی پوشاک میں جلوہ فگن دیکھا، بے اختیار اس کے لبوں پر یہ مصرعہ چلا آیا۔

ع سرخ پوشے بہ لبِ بام نظر می آید

(ایک سرخ پوش چھت کے کنارے نظر آتا ہے)

زیب النسا نے اسے دیکھا، اس کی جرأت کو درگذر کیا اور جواب میں اس کے مصرعے پر گرہ لگائی:

ع نہ بزوری، نہ بزاری، نہ بزری آید

(جو کہ زور، زاری اور زر یعنی کسی طور سے بھی ہاتھ نہیں
آتا)۔

زیب النسا کے جواب سے عاقل خاں کے دل میں امید کی کلیاں چٹکنے لگیں۔ ہم ذوقی نے ملاقاتوں کے حیلے فراہم کیے اور ان دونوں میں شعروں کا تبادلہ ہونے لگا۔ زیب النسا غالباً اپنے ایک شعر کے لحاظ سے اس خیال کی قائل تھی کہ

؎ مرد عاشق پیشہ را دیوانگی تہمت بُوَد
نوری بخشد محبت دیدۂ ادراک را

[مبتلائے عشق مرد کے حال کو دیوانگی سے نسبت دینا ایک بہتان ہے۔ (سچ تو یہ ہے کہ) 'محبت' دیدہ ور کو نور بخشتی ہے۔]

عالم گیر دہلی لوٹا، لیکن شہزادی کو لاہور پسند آ گیا تھا اور اس نے وہاں اپنے لیے ایک باغ (6) کی تعمیر شروع کر دی تھی، اس لیے وہ اس کی تکمیل کے لیے وہاں رکی رہی۔ شاید اس نہال خوبی کا مقصود اپنے باغ آرزو کو بہار ساماں کرنا بھی رہا ہو!

جب عالم گیر تک شہزادی اور عاقل خان کی ملاقاتوں کی خبریں پہنچیں تو اس نے زیب النسا کو طلب کیا اور تدبر سے کام لیتے ہوئے اتنا ہی کہا کہ اب اسے اپنی شادی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔ زیب النسا نے انتخاب کا حق مانگا تو عالم گیر نے اس کے سامنے چند ممکنہ رشتے پیش کیے، ان میں عاقل خان کا نام بھی شامل تھا۔ شہزادی کے من کی مراد بر آئی۔ اس نے عاقل خان کے نام پر صاد کیا۔ عالم گیر نے قاصد کو لاہور دوڑایا کہ وہ اسے دہلی میں طلبی کا پیغام پہنچائے۔

وہاں شومیِ قسمت کا مارا عاقل خان اس فکر میں غلطاں تھا کہ چونکہ عالم گیر کو اس کے عشق کا پتا چل گیا ہے، اس لیے اب اس کی خیر نہیں۔ اس پر مستزاد اس کے ایک ضرورت سے زیادہ محتاط فکر دوست نے اسے ڈرایا کہ اگر وہ دہلی چلا گیا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اسی کے کہنے پر عاقل خان نے (1669ء میں) لاہور کی گورنری سے اپنا استعفا دہلی بھیج دیا اور سات برس تک روپوش رہا۔ اس کے اس عاجلانہ اور ناعاقبت اندیشانہ اقدام سے اس کا شمار عالم گیر کے مفسدوں کی فہرست میں ہونے لگا۔ واقعات ایسی کروٹ بھی لے سکتے ہیں، یہ شہزادی کے سان گمان میں نہ تھا۔ بالآخر اس نے اپنی شادی کا ارادہ ترک کر دیا۔

کچھ مدت کے بعد زیب النسا کے عشق کا مارا عاقل خان چھپتے چھپاتے دہلی آ پہنچا اور کسی سبیل سے پوشیدہ طور پر شاہی باغ میں شہزادی سے ملنے جا پہنچا۔ دونوں میں حرف و حکایت اور شکوہ و شکایت کا دور چل رہا تھا کہ اتنے میں شہزادی کی رازدار کنیز امامی نے آ کر خبر دی کہ بادشاہ اسی سمت چلا آ رہا ہے۔ ہڑبڑی میں عاقل خان کو وہیں پڑی ایک دیگ میں چھپا کر اسے ڈھانک دیا گیا۔ عالم گیر نے آ کر ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد پوچھا کہ اس دیگ میں کیا ہے؟ زیب النسا نے جواب دیا کہ 'پانی گرم کرنے کے لیے رکھا

ہوا ہے۔' بادشاہ نے یہ کہتے ہوئے کہ 'پھر دیر کیوں ہے؟' خدام کو حکم دیا کہ دیگ کے نیچے آگ سلگائی جائے۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔ شہید محبت عاقل خان نے شہزادی کی ناموس کی خاطر آہ تک نہ کی اور جل کر مر گیا۔ زیب النسا جرمِ عشق کی پاداش میں (1681ء میں) سلیم گڑھ کے قلعے میں محصور کر دی گئی، اور اس کی چار لاکھ روپے سالانہ کی پینشن بند کر دی گئی۔

کچھ مورخین اگرچہ عاقل خان کے دیگ میں جل کر مرنے کے حادثے کو افسانہ قرار دیتے ہیں، لیکن وہ عاقل خان اور زیب النسا کے عشق کو حقیقی سمجھتے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب زیب النسا سلیم گڑھ کے قلعے میں قید تھی تو شہزادہ اکبر نے اپنی بہن کو ایک خط میں لکھا تھا کہ:

''...... چونکہ بادشاہ نے حکم دے دیا تھا کہ ایسی کوئی تحریر جس پر عاقل خاں لکھا ہو، اندر نہ جانے پائے، اس لیے میں اب زیادہ احتیاط سے کام لوں گا۔''

نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مضمون میں تاریخی حوالوں سے عاقل خان کی ملازمت کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے اس عشقیہ داستان کو حقیقی تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ عالم گیر کے خلاف ناخلف شہزادہ اکبر نے راجپوتانے میں علمِ بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ چونکہ زیب النسا کی ہم دردی اس کے ساتھ تھی، اس لیے اسے سلیم گڑھ کے قلعے میں محصور کیا گیا تھا اور شہزادی کے نام اپنے مکتوب میں شہزادہ اکبر نے جس عاقل خان کا ذکر کیا تھا، وہ اس دور کے مشہور فقیہہ ملا محمد عاقل تھے، جن سے زیب النسا فقہی مسائل میں مراسلت کیا کرتی تھی۔ آخر میں اس مراسلت پر بھی اس بنا پر پابندی عاید کر دی گئی کہ ملا محمد عاقل بھی شہزادہ اکبر کے طرف داروں میں تھے، لیکن نیاز کی یہ دلیل کہ سلیم گڑھ کی محصوری کے زمانے میں زیب النسا کی عمر چالیس اور عاقل خان رازی کی عمر پچاس سے متجاوز ہو چکی تھی، اس لیے ان کے درمیان عشق کا جاری رہنا غیر ممکن ہے، ذہن تسلیم نہیں کرتا، اس لیے کہ عشق سن و سال نہیں دیکھا کرتا۔

طویل عرصے تک قید میں رہنے کے بعد زیب النسا رہا ہوئی تو زیادہ نہ جی سکی اور کچھ عرصے بعد قیدِ زندگی سے رہا ہو گئی۔ سرسید اور مولانا محمد حسین آزاد نے اس کے مدفن کے دہلی میں ہونے کی نشان دہی کی تھی۔

کچھ مزید:

شاہانِ مغلیہ کے لیے شہزادیوں کی شادی اس اعتبار سے ہمیشہ ایک ٹیڑھا مسئلہ بنی رہی کہ انھیں اپنے شایانِ شان کوئی رشتہ نہ ملتا تھا اور اپنے سے کم مرتبہ کو وہ رشتے داری کا اہل نہیں سمجھتے تھے، اس طرح مغل شہزادیوں کی شادی کی عمر نکل جاتی تھی۔ ایسے میں زیب النسا اور جہاں آرا کی طرح کوئی شہزادی اپنی پختہ عمری میں صوفیانہ مزاج کی حامل بھی ہو جاتی تھی اور شادی کا ارادہ ترک کر دیتی تھی۔

اکبر نے اپنی ایک دختر کی شادی ایک معتمد امیر سے کی تھی، مغل دامادوں کا منصب و مرتبہ بھی کسی طرح مغل شہزادوں سے کم نہیں ہوتا تھا، اور ان سے بغاوت کا خطرہ بھی رہتا تھا۔ اس امیر نے بھی کچھ عرصے بعد تخت کی

ہوس میں بغاوت کی سازش رچی اور مارا گیا۔ اس تلخ تجربے کے بعد سے سلطنتِ مغلیہ کے وارثوں نے شہزادیوں کی شادی کے معاملے میں گریز اور بے توجہی کا رویہ اختیار کر لیا۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ دارا شکوہ اپنی بہن جہاں آرا کا عقد نجابت خان سے کرانے کا متمنی تھا، جو بلخ کے شاہی خاندان سے تھا اور شاہی فوج کا ایک سپہ سالار تھا، لیکن شاہ جہاں نے دارا شکوہ کی درخواست رد کر دی، اسے امیر الامرا ابو طالب شایستہ خان نے متنبہ کیا تھا کہ چونکہ نجابت خان کے شاہی خاندان سے بندگانِ عالی کے معرکے ہو چکے ہیں، اس لیے اس سے شہزادی کا رشتہ مناسب نہیں ہوگا۔

جنسی تقاضوں کی تکمیل کی آرزو ایک طبعی وفطری امر ہے، جو ہر عام وخاص انسان میں پایا جاتا ہے۔ اس تناظر میں مغل شہزادیوں کی بے بسی اور محرومی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مغلیہ سلاطین کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلیہ تخت کے وارثوں کے جھگڑوں میں اکثر شہزادیوں نے اپنے اس بھائی کی ولی عہدی کی حمایت کی، جس نے اس سے پیمان کیا کہ وہ اسے اس کی شادی کے حق سے محروم نہ کرے گا۔

نفسانی جذبات کا رخ موڑنا اور انسانی جبلت کو دبانا ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ انسان عموماً اپنے جذبات کی آسودگی کے جائز یا ناجائز وسائل مہیا کر لیا کرتا ہے۔ امرد پرستی اور Lesbian کے جنسی تجربوں سے بھی کسی زمانے میں کوئی معاشرہ خالی نہیں رہا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر ان مورخین کی سادگی پر ہنسی آتی ہے، جو یہ ثابت کرنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے رہتے ہیں کہ شاہانِ مغلیہ کی خواتین کی جوانیاں کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی تھیں اور ہمارے ملوک 'ظلِ الٰہی' سے کم بالکل نہیں تھے، جب کہ بزمِ شاہی میں وسائل کا مہیا ہونا قطعی دشوار نہ تھا۔ منوچی دارا کے چہیتے ملازموں میں سے ایک تھا اور اس کی رسائی شاہی محلوں میں تھی۔ وہ برنیر کی طرح متعصب بھی نہیں تھا۔ اس کے عہد اورنگ زیب و دارا کے مشاہدات کو مکمل طور پر کسی نے مسترد نہیں کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ 'چوں کہ عموماً مغل شہزادیوں کی شادیاں نہیں کی جاتی تھیں اس لیے وہ پوشیدہ طور پر اپنی تفریح کا سامان کر لیا کرتی تھیں'۔

جہاں آرا کے سلسلے میں اس نے لکھا ہے کہ جہاں آرا کی ایک مغنیہ کا لڑکا بڑا طرح دار اور خوش الحان تھا۔ نغمہ سرائی کے لیے محل سرا میں بلا لیا جاتا تھا، جہاں آرا نے اسے 'خانہ زاد' بنا لیا۔ چند برس بعد وہی اس کا آشنا بن گیا اور 'دُلارا' کہلانے لگا۔ اسے امرا کی طرح ماہی و مراتب اور رسالہ عطا کیا گیا۔ (7)

جب وقت نے پلٹا کھایا اور جہاں آرا شاہ جہاں کے ساتھ داخلِ زنداں کر دی گئی (یا اس نے شاہ جہاں کی خدمت گزاری کے لیے خود ہی اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔) تو بھی دلارا جو عیش وعشرت اور تفریح وشراب کا رسیا ہو چکا تھا، نئے قدردانوں کی تلاش میں شہزادہ مراد بخش کے فوجیوں کے پاس چلا گیا۔ انھوں نے اسے قیمتی شراب دی تو وہ نشے میں یہ بھول بیٹھا کہ وہ اس وقت جہاں آرا کا سامانِ دل نہیں ہے، اس نے فوجیوں کی تحقیر شروع کر

دی۔ انھوں نے طیش میں آ کر اسے پکڑا، اس کا پاجامہ اتارا اور اس کے مقعد میں شمع رکھ کر اسے روشن کر دیا، جو اس وقت تک جلتی رہی جب تک کہ اس نے معافی نہیں مانگ لی۔ بعد ازاں اسے زدوکوب کر کے نکال باہر کیا گیا۔ اس ذلت کے بعد 'دلارا'' اپنے گھر سے نہ نکلا، اس کی لاش ہی نکلی۔

کئی شاہان مغلیہ امرد پرستی کے شکار رہے۔ بابر کی امرد پرستی مشہور ہے۔ اس کی اسی علت کی بنا پر اس کی پہلی بیوی نے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ جہاں گیر بھی کچھ مدت تک اس مذاق کا گرفتار رہا۔ اس کی ولی عہدی کے زمانے میں جب اس کا ایک معتمد محل کے ایک خوبرو لڑکے کو لے بھاگا تو جہاں گیر کی بے چینی اور برہمی دیکھ کر درباریوں کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لڑکا ولی عہد کا 'منظور نظر' تھا۔ جہانگیر کے حکم پر دونوں کو ڈھونڈ نکالا گیا اور جہانگیر نے اپنی نظروں کے سامنے دونوں کی زندہ حالت میں کھال اتروا دی۔ جب اکبر کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے تڑپ کر کہا'' اللہ اللہ شیخو جی! ہم تو بکری کی کھال بھی اترتے نہیں دیکھ سکتے، تم نے یہ سنگ دلی کہاں سے سیکھی!'' اورنگ زیب کے بعد مغلیہ دور کے عہد زوال میں تو اکثر بادشاہ اور شہزادے امرد پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔

حواشی :

(1) چغتائی ترکی زبان کے 'بابر نامہ' (تزک بابری) میں شہنشاہ بابر نے اپنے وقائع بیان کرنے میں بڑا بے تکلف، رواں اور دل آویز اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس دور کے تاریخی جغرافیائی اور تمدنی مشاہدات و تجربات پر بے لاگ تبصروں کے ساتھ ساتھ اس کتاب سے بابر کی زیرکی، مردم شناسی اور خوش طبعی کے پہلو بھی روشن ہوتے ہیں۔ بقول 'فواد کوپرولو' کے 'بابر نامہ' صرف چغتائی زبان ہی کا نہیں بلکہ پورے ترکی ادب کا شاہکار ہے ● جہانگیر نے اپنے عہد سلطنت کے سترھویں سال کے وسط تک کے حالات اپنی خود نوشت میں پیش کیے تھے۔ 'تزک جہانگیری' اسے تاریخ و تہذیب اور معاشرت پر گہری نظر رکھنے والے اور اعلا مذاق کے حامل مصنف کی حیثیت سے پیش کرتی ہے ● مغلیہ عہد کے تاریخی حالات میں محمد ہاشم خافی خاں کی 'منتخب اللباب' خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں خافی خاں نے ملکۂ نور جہاں کی شعر گوئی کا ذکر کیا ہے، جو مخفی تخلص رکھتی تھی اور مثالاً اشعار بھی پیش کیے ہیں ● جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ 'اورنگ زیب فارسی زبان میں ایک زبردست اسلوب کا مالک تھا' جو طغرے بھی مصنف تھا۔ ● زیب النسا کے عالمہ و فاضلہ ہونے پر سب مورخ یک زبان ہیں اور اس کی ادب پروری اور سخن وری کے معترف بھی۔ ● جہاں آرا کے ذوق ادب کی آبیاری ستی النسا بیگم نے کی تھی، جو عہد جہانگیر کے مشہور شاعر طالب آملی کی ہمشیرہ تھی

(2) 'اقبال نامہ' اور 'مآثر جہانگیری' کے حوالوں سے ڈاکٹر بینی پرشاد نے 'تاریخ جہانگیر' (ص: 135) میں یہ واقعہ لکھا ہے۔

(3) تاریخی کتابوں میں آیا ہے کہ جہانگیر نے مہرالنسا کو نکاح کے لیے آمادہ کرنے کے لیے ملکہ سلیمہ بیگم کو مامور کیا تھا ہوسکتا ہے کہ قدسی بیگم کو بھی اسی کام کے لیے متعین کیا گیا ہو۔

(4) شاہ نواز خان صفوی کی دختر دل رس بانو بیگم سے اورنگ زیب کی شادی 8/مئی 1637ء کو ہوئی تھی اور یہ اس کی پہلی بیوی تھی۔ ہمارے مسلم مورخین نے اورنگ زیب کو رحمۃ اللہ علیہ بنا رکھا ہے اور کسی نے تو اس کو 'زندہ پیر' تک قرار دے دیا ہے۔ اس لیے وہ اس باب میں 'احکام عالمگیری' اور جدوناتھ سرکار کے ترجمے کی اس عبارت کا حوالہ حذف کر دیتے ہیں، جس میں اورنگ زیب کی طرف سے ہیرا بائی کے عوض میں اپنی منکوحہ دل رس بانو بیگم کو دینے کی پیش کش کی گئی ہے۔

"What harm is there in it? I have no need for {Aurangzeb's} Begum, the daugther of Shah Nawaz Khan. Let him send me Chattar Bai, his won concubine {harm}, that she may be exchanged {for Hira Bai}

(Anecdotes of Aurangzeb, By J. Sarkar)

(5) زین آباد ہیرا بائی کا مولد تھا، اس لیے وہ 'زین آبادی بیگم' کہلانے لگی۔ مغل بادشاہ کبھی کبھی اپنی بیگموں کے مولد یا وطن کے لحاظ سے انھیں نام دے دیا کرتے تھے، جیسے کہ شاہ جہاں کی ایک ملکہ قندھاری بیگم کہلاتی تھی، چوں کہ وہ قندھار میں پیدا ہوئی تھی۔

(6) اس باغ کے چار مینار تھے، اس لیے یہ 'چوبرجا باغ' کہلاتا تھا۔

(7) ایک دور ایسا آیا کہ جب جہاں آرا تصوف کی طرف مائل ہوگئی تھی اور شاہ جہاں کی موت کے بعد تو اس نے اپنی زندگی قطعی طور پر درویشانہ بسر کی تھی۔ اس کی وفات ہوئی تو اس نے تین کروڑ روپے چھوڑے تھے اور وصیت کی تھی کہ یہ سب روپے حضرت نظام الدین کی درگاہ کے خدام کو دے دیے جائیں، جن کے طفیل مقدس روضے میں اسے مدفن کے لیے جگہ ملی تھی، لیکن عالمگیر نے انھیں ایک کروڑ روپے ہی دیے کہ شرعاً ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت کا حکم نہیں ہے۔

مصادر:

☆ 'توزک جہانگیری' مترجم سلیم واحد سلیم، مطبوعہ: مجلس ترقی ادب، لاہور ☆ 'قصص ہند' مولانا محمد حسین آزاد، مطبوعہ: مجلس ترقی ادب، لاہور ☆ 'اورنگ زیب کی داستانِ معاشقہ۔ حقیقت یا افسانہ' از: اکبر رحمانی ☆ 'خواتین' (مجموعۂ مقالات) مرتبہ مولانا محمد اسلم جیراج پوری ☆ تاریخ عمارات شاہانِ مغلیہ' از منشی کالے خاں اکبرآبادی (مطبوعہ: آگرہ) ☆ 'تاریخ جہانگیر' از ڈاکٹر بینی پرشاد ☆ 'فسانۂ سلطنت مغلیہ' از نیکولاؤ منوچی (ترجمہ) ☆ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (تاریخ) ☆ مقالہ 'زیب النسا' از نیاز فتح پوری، مشمولہ 'نگار' جون 1922ء ☆ 'دیوان مخفی' ☆ 'گگن میگزین' 'ہندستانی مسلمان نمبر' ☆ 'بیگمات خاندان تیموریہ کی سوانح عمریاں' از: سید ظہورالحسن وغیرہ۔

اورنگ زیب کے عشق کی کہانی
مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی

اورنگ زیب عالمگیر نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ صاحب قلم بھی تھا۔ اس کا نام ذہن میں آتے ہی اس کی مذہبیت، اس کا زہد، اس کی فنون لطیفہ سے بیزارگی اور حسن وعشق سے بے تعلقی کا خیال بھی ساتھ ہی آتا ہے۔ اورنگ زیب کی تصور میں جو تصویر ابھرتی ہے وہ حد درجہ بے رنگ وسادہ ہوتی ہے۔ جس میں کوئی رنگینی ہوتی ہے نہ رنگ آمیزی۔ اس بے رنگی وخشکی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ بات نظر نہیں آتی جس کے بغیر گلستاں کی بات رنگین ہوتی ہے نہ مے خانہ کا نام ـــــ یعنی اورنگ زیب کی شخصیت پر نہ تو حسن کی اثر آفرینی نظر آتی ہے نہ ہی عشق کی اثر پذیری۔ حسن وعشق کی داستان ہی انسانی زندگی کا رنگین ترین پہلو ہے، یہ انسان کی زندگی میں رنگ ونور بھرتا ہے اور یہی چیز اورنگ زیب کی زندگی میں بظاہر کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن حقیقت ایسی نہیں ہے۔ اورنگ زیب کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا۔ جب اس نے اپنی ساری مذہبیت اور زہد کو حسن کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ اور حسن کی کڑی سے کڑی آزمائش پر پورا اترنے کے لئے دین ومذہب کی بازی لگادی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی مشہور کتاب ''غبار خاطر'' میں اورنگ زیب کے عشق کی کہانی بیان کی ہے۔ اورنگ زیب کے معاشقہ کا دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ اورنگ زیب کو عشق ہوا بھی تو ایک مغنیہ سے ہوا جس کے لئے ناچ گانا ہی سب کچھ تھا۔ اورنگ زیب کے خالو خان زماں کو فن موسیقی سے بہت دلچسپی تھی اور انہی کے دربار سے اورنگ زیب کی معشوقہ وابستہ تھی جیسا کہ مولانا نے ''ماثر الامرا'' کے حوالہ سے لکھا ہے:

> ''صاحب مآثر الامرا نے خان زمانی کے حال میں لکھا ہے کہ وہ فن موسیقی میں پوری مہارت رکھتا تھا اور کاروبار منصب کے اہتمام کے ساتھ راگ ورنگ کی مشغولیتیں بھی برابر جاری رہتی تھیں۔ پری چہرگان خوش آواز اور مغنیات عشوہ طراز اس کی سرکار میں جمع رہتی تھیں۔ انہی میں زین آبادی بھی تھی''۔

پھر مولانا زین آبادی کے متعلق لکھتے ہیں اور اورنگ زیب کے عشق کی داستان کو یوں شروع کرتے ہیں:

> ''برہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آباد کے نام سے بس گئی تھی۔ اسی زین آباد کی رہنے والی ایک مغنیہ تھی جو زین آبادی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے نغمہ وحسن کی

تیر افگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانہ شہزادگی میں زخمی کیا''۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے اورنگ زیب کو محبت ہوئی تھی تو کس سے ہوئی۔ شاید اورنگ زیب کے لئے قدرت نے یہ خاص انتظام کیا تھا۔

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

مولانا اورنگ زیب کی کہانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اورنگ زیب کے اس معاشقے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا لیکن ایک زمانے میں گوشت پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ ع

گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی''

اورنگ زیب خود ہی محبت کے جال میں پھنس گیا۔ وہ برہان پور جاتا ہے اور وہاں زین آبادی کی صرف ایک نگاہ جو بظاہر نگاہ سے بھی کم تھی اورنگ زیب پر بجلی کی طرح گرتی ہے اور اس کے خرمن ہوش و آگہی کو پھونک کر رکھ دیتی ہے۔ یہ بھی عجیب لطف کی بات ہے کہ اس لوہے اور پتھر کے انسان کو پگھلا دینے کے لئے ایک گرم نگاہ کافی ہوئی۔ زین آبادی نے اورنگ زیب کو مسحور کرنے کے لئے کوئی اہتمام نہیں کیا تھا جیسا کہ مولانا اس حسین تاریخی حادثہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خان زمان کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ ہوتی تھی۔ ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا اور خان زمان کی بیوی یعنی اس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لئے آئی ہوئی تھی۔ خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی جو نغمہ سنجی میں سحر کار اور شیوۂ دلربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سایہ میں سے گزرا جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے۔ جونہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا۔ زین آبادی نے نہ تو شہزادے کی موجودگی کا پاس و لحاظ کیا نہ اس کی خالہ کا۔ بے باکانہ اچھلی اور ایک شاخ بلند سے ایک پھل توڑ لیا۔ خان زمانی کی بیوی پر یہ شوخی گراں گزری اور اس نے ملامت کی تو زین آبادی نے ایک غلط انداز نظر شہزادے پر ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اس نے شہزادے کا کام تمام کر دیا اور صبر و قرار نے خدا حافظ کہا''۔

اب اورنگ زیب ہر ممکن طریقہ سے زین آبادی کو حاصل کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ زین آبادی کو حاصل کر لینا اورنگ زیب کے لئے کونسی ایسی بڑی بات تھی۔ خالہ کی منت و سماجت کرنے پر زین آبادی کی ساری عشوہ طرازیاں اورنگ زیب کے لئے مخصوص ہو گئیں۔ اورنگ زیب کی دین و دنیا زین آبادی بن چکی تھی۔

محبت کی حقیقت ہے محبت کا یہ افسانہ
دو عالم کا سمٹ کر ایک ہستی میں سما جانا

مولانا صاحب مآثرالامرا کے حوالے سے اورنگ زیب کی محبت کی
''حقیقت'' یوں واضح کرتے ہیں:

''بڑی منت والحاح کرکے اپنی خالہ سے زین
آبادی کو حاصل کرلیا اور باوجود اس زہدِ خشک اور خالص تقویٰ
کے جس کے لئے اس عہد میں مشہور ہو چکا تھا اس کے عشق و
شیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہوگیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا
پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالم نشہ وسرور کی رعنائیاں دیکھتا''۔

عشق پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ عشق کا زور سب پر چلتا ہے۔ عاشقی میں
تو عزتِ سادات بھی جاتی ہے۔ عشق سب کچھ کروا سکتا ہے ع

کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

اورنگ زیب نے عشق میں ''کیا کیا نہ کیا'' کی تفصیل تو آپ دیکھ
ہی چکے ہیں۔ اب اس کا ''کیا کیا نہ کریں گے'' والا حوصلہ بھی دیکھئے۔ زین
آبادی کو جب یوں اورنگ زیب کی محبت کا 'جام' ملنے لگا تو اسے شبہ ہوا کہ ع

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

کیونکہ اورنگ زیب کی بزمِ مے میں جام شراب کی یہ ارزانی زین
آبادی کو فریب نظر معلوم ہوئی۔ اس نے بھی اورنگ زیب کی محبت کا امتحان لینے
کی ٹھان لی۔ اس کے لئے زین آبادی نے اورنگ زیب سے مطالبہ کیا کہ اپنی
عزیز شے یعنی ''زہدِ خشک'' کو ''آتشِ سیال'' میں جھونک دے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''ایک دن زین آبادی نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز
کرکے اورنگ زیب کو دے دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے
لگالے''۔

اورنگ زیب کے لئے یہ امتحان بڑا صبر آزما تھا لیکن ع

اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل

کفر و ایمان کی کشمکش شروع ہوگئی۔ دونوں اپنی اپنی جانب اورنگ
زیب کا دامنِ دل کھینچ رہے تھے۔ اورنگ زیب کیلئے یہ منزل بڑی کٹھن تھی۔
وہ ''طرز کہن'' کا پابند تھا اس لئے محبت کا یہ ''آئین نو'' اختیار کرنا اس کے
لئے بہت مشکل تھا۔ وہ عشق کی وادی میں چلا تو آیا تھا لیکن ''فکر حصول'' کے
لئے یہاں دین وایمان کے بوجھ کو سر سے اتارنا تھا۔ اس جرأت رندانہ کے
بعد ہی وہ اس وادی میں آگے بڑھ سکتا تھا۔ اورنگ زیب کیلئے جان و دل کی
بازی لگا دینا آسان تھا اور اس نے یہ بازی لگا بھی دی تھی لیکن دین و مذہب
سے ہاتھ دھونا اس کے لئے بہت دشوار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کونسا
راستہ اختیار کرے ع

کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں

اورنگ زیب جانتا تھا کہ دامن کو حریفانہ کھینچنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا
اس لئے اس نے کوشش کی کہ عجز و نیاز سے زین آبادی کو راہ پر لے آئے۔
مولانا لکھتے ہیں:

''شہزادے نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ التجائیں کیں کہ میرے
عشق و دل باختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو''

ے حاجت نیست مستیم را
در چشم تو تا خمار باقیست''

زین آبادی دیکھنا چاہتی تھی کہ اورنگ زیب کس حد تک اپنی محبت میں ثابت قدم ہے۔ اور اس آگ کے دریا میں سے ڈوب کر جانے کی تاب رکھتا بھی ہے یا نہیں۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اورنگ زیب کہاں تک 'حریفِ مے مرد افگن عشق' ہوسکتا ہے۔ اسی لئے وہ اورنگ زیب کی منت وزاری اور التجاؤں سے پسیجی نہیں ہے۔ اورنگ زیب کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی ـــــ

''لیکن اس عیار کو رحم نہ آیا

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد
مسلمانی بیا موز آں دو چشم نا مسلماں را

اورنگ زیب جانتا تھا کہ امید وبیم کی حالت میں انسان دوراہے پر ہی مارا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں دیر وحرم تو دور کی بات ہے گھر کا راستہ بھی نہیں ملتا۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سونا ہونے کا دعویٰ ہے تو بار بار تپایا جانا ضرور ہے اس لئے

''ناچار شہزادے نے ارادہ کرلیا کہ پیالہ منہ سے لگالے''۔

لیکن زین آبادی کا مقصود اپنے دامِ محبت کی مضبوطی کو دیکھنا تھا۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اورنگ زیب کی وفاداری بشرط استواری ہے بھی یا نہیں۔ جب وہ اس کی استواری کی طرف سے مطمئن ہوگئی اور اورنگ زیب کی اصلِ ایمان کو جان لیا تو اسے اس بات کی فکر نہ رہی کہ یہ برہمن کعبہ میں رہتا ہے یا بت خانہ میں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''لیکن جوں جوں اس فسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بے بس ہوکر پینے کے لئے آمادہ ہوگیا ہے فوراً پیالہ اس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا ''غرض امتحانِ عشق بود نہ کہ تلخ کامی شما'' (مقصود امتحان تھا ستانا تیرا نہیں)

ایں جور دیگر ست کہ آزار عاشقاں
چنداں نمی کند کہ بہ آزار خو کنند''

اب ہر طرف اورنگ زیب کے عشق کا چرچا ہونے لگا۔ اس کا زہد
تقویٰ اس کی محبت کو اور مطعون کر رہا تھا۔ بات اس قدر شہرت پا جاتی ہے کہ
شاہجہاں کو بھی اس کی خبر ہوجاتی ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہجہاں تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں کے فردوں میں بھی اس کی تفصیلات آنے لگیں۔ داراشکوہ نے اس حکایت کو اپنی شکایت وغمازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا ''ببینید ایں مزوّر ریائی چہ صلاح وتقویٰ ساختہ است'' (دیکھئے اس نے ریاکاری پر صلاح وتقویٰ کا کیسا آہنی جامہ پہن رکھا ہے)

چہ دست سے بری اے تیغ عشق اگر دوست
بُبر زبانِ ملامت گرِ زلیخا را''

لیکن افسوس ہے کہ یہ غنچۂ محبت کھلنے سے پہلے مرجھا گیا۔ معلوم نہیں اگر یہ
داستانِ حسن وعشق دراز ہوتی تو کیا صورت اختیار کرتی۔ اورنگ زیب کی شخصیت

کس سانچے میں ڈھالتی۔ لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ اگر زین آبادی کو قضا وقدر نے مہلت دی ہوتی تو اورنگ زیب کی شخصیت وہ نہیں ہوتی جو آج ہمارے سامنے ہے اور اورنگ زیب کی بدلی ہوئی شخصیت ہندوستان کی تاریخ پر کس حد تک اور کس رنگ میں اثر انداز ہوتی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بہر کیف مولانا لکھتے ہیں:

''نہیں معلوم اس قضیے کا غنچہ کیونکر گل کرتا لیکن قضا و قدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا یعنی عین عروج شباب میں زین آبادی کا انتقال ہوگیا۔ اورنگ آباد میں بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے۔

خود رفتہ ایم و کنج مزارے گرفتہ ایم
تا بار دوش کس نشود استخوان ما''

اورنگ زیب پر اس حادثہ کا اثر بڑا شدید ہوا۔ وہ تپش عشق کی اس مہلک نشتر زنی سے بے تاب ہوگیا اور ہر ممکن طریقے سے اپنے آپ کو اس نے سنبھالنے کی کوشش کی۔ مولانا نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

''آپ نے عاقل خاں رازی کے حال میں یہ واقعہ پڑھا ہوگا کہ زمانۂ شہزادگی میں اورنگ زیب کو ایک پرستار خاص کی موت سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن اسی دن شکار کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔ اس بات پر وابستگان دولت کو تعجب ہوا کہ سوگواری کی حالت میں تفریح اور شکار کا کیا موقع تھا۔ جب اورنگ زیب شکار کے لئے محل سے نکلا تو عاقل خاں نے کہ میر عسکر تھا۔ تنہائی کا موقعہ نکال کر عرض کیا'' اس غم و اندوہ کی حالت میں شکار کے لئے نکلنا کسی ایسی مصلحت پر مبنی ہوگا جس تک ہم ظاہر بینوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی''۔ اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا۔

نالہ ہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست
در بیابان می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

اس پر عاقل خاں کی زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکل گیا۔

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

اورنگ زیب پر رقت کا عالم طاری ہوگیا۔ دریافت کیا یہ شعر کس کا ہے؟ عاقل خان نے کہا اس شخص کا ہے جو نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو زمرۂ شعراء میں محسوب کرائے۔ اورنگ زیب سمجھ گیا کہ خود عاقل خان کا ہے۔ بہت تعریف کی اور اس دن سے اس کی سرپرستی اپنے ذمے لے لی۔ اس حکایت میں جس پرستار خاص کی موت کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مقصود یہی زین آبادی ہے''۔

لیکن زمانے نے اورنگ زیب کی زندگی کا یہ رنگین ورق کچھ اس طرح پلٹ دیا ہے کہ آج بہت کم نگاہیں اس تک پہنچ سکتی ہیں۔ اور پھر یہ کہ اورنگ زیب کی کتاب زندگی سادہ اور بے رنگ اوراق سے اس درجہ بھری پڑی ہے کہ وہ بہت ہی مشکل سے نظر آتا ہے۔

میر کی حیاتِ معاشقہ: چند اشارے

حقیقت اور ادب میں جیسا رشتہ بالعموم سمجھا جاتا ہے، ویسا نہیں ہوتا۔ حقیقت دراصل وہ ہوتی بھی نہیں جو دکھائی دیتی ہے، اور جو دکھائی دیتی ہے اس حقیقت میں، اور جو حقیقت ادب میں بیان کی جاتی ہے، یعنی ادبی حقیقت یا شعری حقیقت (خواہ ہم اسے لاکھ 'حقیقت بیانی' کہیں) بڑا فرق ہوتا ہے۔ لیکن شعری حقیقت کو اگر کوئی روزمرہ کی حقیقت کا من وعن عکس سمجھتا ہے تو وہ ادب کے تفاعل کو پوری طرح نہیں جانتا۔ شاعر یا فنکار بھلے ہی آپ بیتی بیان کرے، یا اپنے مشاہدے یا تجربے کا بیان کرے، اگر وہ بیان ''ادبی'' یعنی ''تخلیقی'' ہے، تو اس میں حقیقت کی بازیافت ناگزیر ہے۔ گویا شعروادب میں حقیقت نہیں، حقیقت کا التباس پیدا کیا جاتا ہے۔ فکشن یا فسانہ اصطلاحیں ہی اس پر دال ہیں کہ ادب میں حقیقت کو 'افسانایا' جاتا ہے۔ داستان، ناول، افسانے کی حد تک تو یہ تاثر عام بھی ہے کہ اس میں جو کچھ بیان ہوا ہے، یا جیسا وہ بیان ہوا ہے، وہ حقیقت کی ضد بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ شاعری کے بارے میں افسانویت یا حقیقت کی بازیافت کے عمل کی نوعیت شاعری میں بھی وہی رہتی ہے جو داستان وناول وافسانہ میں۔ یعنی یہاں بھی حقیقت کی قلب ماہیت ضرور ہوتی ہے۔ جب زندگی کے عام تجربات اور مشاہدات کا یہ عالم ہے تو حیاتِ معاشقہ تو بہرحال فنکار کی سوانح کا جز ہے۔ کوئی ایک واقعہ یا واقعات کا سلسلہ، یا سانحہ، یا واردات، جب ادبی یا شعری سطح پر بیان ہوگی تو اس کی ضمانت کون دے سکتا ہے کہ یہ سو فیصد سچ ہے، یعنی ویسا سچ ہے جس کو ہم سچ سمجھتے ہیں۔ اس کی کچھ نہ کچھ قلب ماہیت تو ضرور ہوتی ہے۔ اور اس کی ایک وجہ وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی، یعنی تخلیقی عمل میں حقیقت کی بازیافت کے لئے تخیل کی کارفرمائی اور جذبے کی فراوانی۔ ایک دوسری وجہ خالص موضوعی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کوچے میں کون ہے جو خودنمائی اور خود پرستی سے بچ سکا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ سے لے کر جوش ملیح آبادی تک حیاتِ معاشقہ کی جو جھلکیاں ملتی ہیں، ان کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں عشق پیشگی، وفا طلبی اور جسم وجمال کی رنگینی کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا گیا۔ اس وضاحت سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ادبی سوانح میں حیاتِ معاشقہ کے دعووں یا اشاروں کو بالکل سچ سمجھنے سے پہلے ان امور کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

زیرِ نظر مختصر تحریر مدیر ''انشاء'' کی تعمیلِ ارشاد میں لکھی جا رہی ہے۔ میر تقی میر کی حیاتِ معاشقہ کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنا نہ تو مقصود ہے اور نہ ہی چند

صفحوں میں ممکن۔ ایسا اس لئے بھی ممکن نہیں کہ میر کی واردات سے تو خدائے
سخن کی پوری شاعری روشن ہے۔ کون نہیں جانتا کہ میر دل پُر خوں کی اک گلابی
سے عمر بھر شرابی رہے۔ آہوں کا دھواں کہاں نہیں ہے۔ میر کی آنکھوں کی سیلابی
تو کولہوں اور کمر تک پہنچی ہے۔ جی کے تڑپنے، جان کے گھلنے اور جگر کے لوہو
ہونے کے پیچھے کوئی ذہنی محرک تو رہا ہوگا۔ سردست غزل کے اس سارے
سرمائے سے قطع نظر صرف دو مثنویوں کا ذکر کرنا مطلوب ہے۔ ایک مثنوی
واقعاتی ہے۔ دوسری تخیلی۔ واقعاتی مثنوی یعنی خواب وخیال کے بارے میں
بالعموم معلوم ہے کہ اس میں سوانح کا عنصر ہے۔ دوسری شعلۂ عشق سرتاسر تخیلی
مثنوی ہے، جس میں اگرچہ حیات معاشقہ کا کوئی ذکر نہیں لیکن اس کی کیفیات کا
کچھ نہ کچھ سلسلہ تخلیقی اعتبار سے خواب وخیال سے جڑ جاتا ہے۔ یہاں تفصیل
میں جائے بغیر کچھ اشارے کئے جائیں گے۔

مثنوی خواب وخیال کے بارے میں داخلی اور خارجی دونوں
شہادتوں کی بنا پر معلوم ہے کہ اس میں معاشقے کا عکس آگیا ہے جو میر کو نوعمری
میں اکبرآباد میں پیش آیا تھا اور جس کی وجہ سے یا جس کے فوراً بعد میر کو آگرہ
چھوڑنا پڑا۔ یہ ساری مثنوی دردِ محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ صاف معلوم ہوتا
ہے کہ میر کو کم عمری میں بھی ایسا چرکا لگا کہ اس کا اثر پورے وجود میں سرایت کر
گیا، ان اشعار کو نظر میں رکھنا خالی از لطف نہیں۔

گئی کب پریشانی روزگار
رہا میں تو ہم طالع زلف یار

جدائی نے آوارہ چاہا مجھے
مری بے کسی نے نباہا مجھے

دل اک یار سو بے قرار بتاں
غبار سر رہ گزار بتاں

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشم حسرت پڑی

کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جور گردوں سے خوں ہوگیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہوگیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام
لگی رہنے صحبت مجھے صبح و شام

یہ وہم غلط کار یاں تک کھنچا
کہ کار جنوں آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پر گر پڑی
تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی

بہ چار وہ کار آتش کرے
ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خور و خواب میں

اگرچہ کہ پرتو سے مہ کے ڈروں
ولیکن نظر اس طرف ہی کروں

جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے
نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے

وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا
تصور مری جان کے ساتھ تھا

اگر ہوش میں ہوں وگر بے خبر
وہ صورت رہے میرے پیش نظر

اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ
وہی ایک صورت ہزاروں جگہ

نگہ گردش چشم سے فتنہ ساز
طرہ آفت روزگار دراز

عجب رنگ پہ تاب رخسار کا
کہ تھا وہ آئینہ گلزار کا

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

کہیں مہ کا آئینہ در دست ہے
کہیں بادۂ حسن سے مست ہے

کبھو یک بیک یار ہو جائے وہ
کبھو دست بردار ہو جائے وہ

گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو
طرح دشمنی کی نکالے کبھو

غلط کاری وہم کچھ کم ہوئی
وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی

وہ صورت کا وہم اور دیوانگی
لگی کرنے در پردہ بیگانگی

پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی
نہ دو دوپہر منہ لگانے لگی

نہ دیکھے مری اور اس پیار سے
غریبانہ سر مارے دیوار سے

کہیں تک تسلی کہیں بے قرار
کہیں شوق سے میرے بے اختیار

کبھی واسطے میرے روتی ہے خوں
کبھی دست زیرِ زنخ ہے ستوں

کبھی بے دماغانہ سرگرمِ ناز
کبھی آتشِ شوق سے جاں گداز

کبھی مجھ سے کہتی ہے رخصت مجھے
کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے

کبھی لب پہ وہ شکوۂ خوں چکاں
کہ پیدا کرے جس سے آزارِ جاں

کبھی وہ نگہ جس سے یہ پایئے
کہ یہ دردِ دل ہے تو مر جایئے

کبھی وہ سخن جو جگر خوں کرے
کبھی طرز ایسی کہ مفتوں کرے

کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے
کہ شرمِ محبت سے محجوب ہے

غرض نا امیدانہ کر اک نگاہ
وہ نقشِ توہم گیا سوئے ماہ

نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح
نہ دیکھا اسے جلوہ گر اس طرح

مگر گاہ سایہ سا مہتاب میں
کبھو وہم سا عالمِ خواب میں

دلِ خو پذیرِ وصالِ دوام
رہے خواب میں روز و شب صبح و شام

اگر وصل خوابی فراموش تھا
ولیکن وہی خواب کا جوش تھا

جو بیٹھا ہوں خواب گراں ہے مجھے
وہ غفلت جہاں در جہاں ہے مجھے

خیال اس کا آوے کہ ٹک ہو رہوں
تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں

مجھے آپ کو یوں نہیں کھوتے گئی
جوانی تمام اپنی سوتے گئی

دکھایا نہ اس مہ نے رو خواب میں
نہ دیکھا پھر اس کو کبھو خواب میں

بہت بے خود و بے خبر ہو چکا
ہم آغوشِ طالع بہت سو چکا

نہ دیکھا کبھو میرؔ پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

ذکرِ میر میں میر نے جہاں بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر ان کی ایذا دہی کا ماجرا تفصیل سے بیان کروں تو دفتر ہو جائے، وہاں یہ بھی لکھا ہے — ''میرا دکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہو گیا''۔ مثنوی خواب و خیال میں جو کیفیات ذہنی بیان ہوئی ہیں، اور مہتاب میں چہرہ دیکھنے کا جو ذکر آیا ہے، ذکرِ میر کے اس حصہ سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے جس میں میر نے اپنے ''جنون'' کا ذکر کیا ہے۔ ''میر کی آپ بیتی'' (ترجمہ ذکرِ میر) از نثار احمد فاروقی (۱۹۵۷ء) سے یہ سطور ملاحظہ ہوں:

''چاندنی رات میں ایک حسین پیکر، اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کرۂ قمر سے میری طرف آتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا، جدھر بھی آنکھ اٹھتی اسی رشکِ پری پر پڑتی، جس طرف دیکھتا، اسی غیرتِ حور کا تماشا کرتا، میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورقِ تصویر ہو گئے تھے۔ یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا (چہرہ) نظر آتا، کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے، کبھی سیر گاہِ دل میں محوِ خرام! اگر گلِ مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو جان اور بھی بے قرار ہو جاتی۔ ہر رات اس پری پیکر سے ملاقات ہوتی اور ہر صبح اس کی جدائی میں وحشت، جب سفیدۂ سحر نمودار ہوتا، دل سے ٹھنڈی آہیں نکلنے لگتیں! یعنی دل مچلتا اور چاند کی طرف لپکتا، تمام دن یہی جنون سوار رہتا اور دل اس (شکلِ مہتابی) کی یاد میں خوں ہوتا، میں دیوانہ وحشت کی مانند منہ میں کف بھرا ہوا، ہاتھوں میں پتھر لئے گرتا پڑتا، اور لوگ مجھے دیکھ کر بھاگتے''۔ (میر کی آپ بیتی ص۔ ۹۵)

میر کی مثنویوں میں ''مثنوی شعلۂ شوق'' خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اس مثنوی اور اس کے مآخذ سے راقم الحروف نے اپنی کتاب ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' میں بحث کی ہے۔ تفصیل وہاں دیکھی جا سکتی ہے (ملاحظہ ہو صفحات ۱۹۳-۲۰۵)۔ یہاں یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ میر کی سائیکی کو ایسی کیفیت سے کچھ خاص مناسبت تھی، کچھ تو افتادِ طبع کی بدولت یا نو عمری کی اس واردات کی وجہ سے جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اس نظر سے دیکھئے تو میر کی تمام مثنویوں میں ''شعلۂ شوق'' انتہائی دردناک مثنوی ہے۔ اس میں پرس رام اور اس کی بیوی کا اندوہ ناک قصہ بیان کیا ہے۔ پرس رام کی بیوی کی موت ہو جاتی ہے، اور اس کا کچھ ایسا اثر پرس رام پر ہوتا ہے کہ اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جگر غم میں یک لخت خوں ہو گیا
رکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا

ایک دن ایک ماہی گیر نے پرس رام کو بتایا کہ رات کو دریا کے کنارے ایک شعلہ اترتا ہے اور 'پرس رام' 'پرس رام' پکارتے ہوئے کناروں پر دوڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ دوستوں کے ساتھ پرس رام رات کو کشتی کی سیر کے بہانے دریا پہنچا۔ تھوڑی دیر کے بعد دریا کے دوسرے کنارے پر روشنی نمودار

ہوئی۔ پرس رام بیتابانہ اس کی طرف لپکا۔ دونوں ملے، پورا دریا بقعۂ نور بن گیا۔ پھر یہ جا وہ جا۔ نہ پرس رام کا پتہ چلا نہ شعلے کا۔

شوق نے اس قصے کو ''یادگارِ وطن'' میں بیان کیا ہے۔ شمیم رضوی کے حوالہ سے بھی لکھا گیا ہے کہ عاشق نے دریا میں اترنے سے پہلے اپنی صدری کی جیب میں ایک تحریر چھوڑی تھی جسے میر کے ایک ہم عصر تائید عظیم آبادی نے اپنے خط کے ساتھ شہزادہ جہاندار کو بھیج دیا تھا۔ خود شوق نیموی نے اس قصہ کو اپنی ''مثنوی سوز و گداز'' میں بیان کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے ''یہ قصہ کچھ فرضی نہیں اصلی ہے''۔ قاضی عبدالودود نے ذکر کیا ہے کہ میر سے پہلے کی لکھی ہوئی ایک فارسی مثنوی ''تصویرِ محبت'' میں بھی اس واقعہ کا بیان ملتا ہے۔ میر کے یہاں نام پرس رام ہے۔ فارسی مثنوی میں نام رام چند ہے۔ قصہ دونوں کے یہاں ایک ہی ہے۔

ظاہر ہے میر کے زمانہ میں یہ عشقیہ لوک روایت خاصی مقبول رہی ہوگی۔ تبھی تو میر نے اس کو ''شعلۂ شوق'' میں جی لگا کر بیان کیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ''شعلۂ شوق'' میں میر کو ایک مثالی عاشق کا پیکر نظر آتا ہوگا۔ میر کے شعری مزاج اور افتادِ ذہنی کی روشنی میں معلوم ہے کہ وہ خود اپنی ذات کو عشق کے مثالی پیکر سے ہٹ کے نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان دونوں مثنویوں میں ربط ڈھونڈنا بظاہر بے جوڑ سی بات لگتی ہے، لیکن اگر خارجی اور داخلی تمام شہادتوں پر نظر رکھی جائے اور شعری محرکات کے سرچشموں پر بھی غور کیا جائے، تو یہ بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ عشقیہ واردات کی وہ ''مثالیت'' جس کی تکمیل ''خواب و خیال'' میں نہیں ہوتی، ''شعلۂ شوق'' میں وہ اپنی انتہا کو پا لیتی ہے۔ میر ایک دنیا دار آدمی تھے، نو عمری کی واردات کے بعد کچھ مدت تک جنون کی کیفیت سے نبرد آزما رہے۔ پھر اسی خون کے دریا کو پار کر گئے۔ 'زخم گر دب گیا لہو نہ تھما'۔ شروع جوانی میں وجود جس طرح سے ''مشتعل'' ہو اٹھا تھا، پھر یہ اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ واقعاتی سطح پر ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن تخیل کی سطح پر جو ''مثالیت'' کی سطح ہے، اس عشق پیچاں کی تکمیل ''شعلۂ شوق'' میں ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جہاں میر، پرس رام ہے اور پرس رام، میر!

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

۱۱۔ پیار ایک دھواں ہے جو آہوں کی دھونی سے بنا ہے۔

Romeo & Juliet - Act 1, Scene 1

۱۲۔ الفاظ جتنے مضمون کے حامل ہوں .... اس سے زیادہ میں تمھیں پیار کرتا ہوں۔
بینائی سے، ہر گنجائش اور آزادی سے زیادہ قیمتی ہے میری محبت۔

King Lear Act 1, Scene 1

۱۳۔ پیار ایک بچے کی طرح ہوتا ہے جو ہر اس شے کے لئے بے تاب ہو اٹھتا ہے جو اس کے آگے آ جائے۔

The Two Gentlemen of Verona - Act 3, Scene 1

۱۴۔ پیار کرنے والوں کی جھلک انھیں غذا پہنچاتی ہے جو محبت کرتے ہیں۔

As You Like It - Act 3, Scene 4

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

کلاسیکی شعراء کے معاشقے

قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے عشق اور افضل کی
پریم کہانی کے علاوہ چند دیگر اردو کلاسیکی شعراء کے ارضی
اور واقعاتی عشق کے تذکرے

عشق انسانی زندگی کا ایک بنیادی عنصر اور لافانی جذبہ ہے جو اپنے تمثیلی اظہار اور تخلیقی عمل کے ذریعہ انسانی زندگی کو ایک دلچسپ کہانی بنا دیتا ہے۔ تمام تخلیقی فنون کی جہت طلبی اور معنی یابی کا سرچشمہ عقل و عشق کی آویزش اس کی معنوی تعبیرات اور حسی توجیہات ہیں۔

دنیا کی کوئی بھی قابل ذکر زبان شاید ایسی نہیں جس میں جذبۂ عشق کی ترجمانی اور حسن کی پیکر آرائی کے دل آویز نمونے نہ ملتے ہوں اور ان کی توسیع و تعبیر کی رنگا رنگی کی ہزار صورتیں سامنے نہ آتی ہوں۔ اردو اور فارسی کی شاعری کی تمام تر نقش آرائی نفس، مذہب و اخلاق، تصوف و روحانیت غرض ذہن و زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس میں اس پُرکشش جذبہ کی سحرکاری و دل آسائی نہ ملتی ہو۔

داستان سے لے کر غزل اور مثنوی سے لے کر رباعی تک جو کچھ اور جتنا کچھ اس زبان میں کہا گیا ہے اس کے ایک بہت بڑے حصہ پر وہی جذبہ اپنی بوقلمونیوں کے ساتھ چھایا ہوا ہے اور تخلیقی فکر کے لئے نشاط کاری کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

ہماری کلاسیکی شاعری میں عاشقانہ جذبات کی جو ترجمانی اور تصویرکشی ملتی ہے اس میں تخیلی اور تہذیبی انداز نظر کی پرچھائیاں بھی موجود ہیں جن کا تعلق بات کہنے کے سلیقہ طریقہ سے بھی ہے اور تشبیہ و استعارہ کے اس عمل سے بھی ہے جہاں سر دلبراں کو حدیث دیگراں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ مطلب چاہے ناز و غمزہ ہو لیکن بات دشنہ و خنجر کے بغیر نہیں بنتی اور مشاہدہ حق کی گفتگو بھی بادہ و ساغر کی جانی پہچانی لیکن معنی خیز علاقوں ہی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

عام طور پر اردو شاعری میں عشقیہ جذبات کی جو مصوری سامنے آتی ہے اس پر ایک معنوی عشق کی تخیلی ترجمانیوں کا دھوکا ہوتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ بات صرف فکری بھول بھلئیوں یا ذہن و خیال کی طلسم کاریوں کی ہی نہیں ہے، اس حقیقت کی بھی ہے جو اپنے اسلوب اظہار میں ''تار حریر دو رنگ'' کی سی نوعیت رکھتی ہے اور آج بھی تخلیقی عمل کی اس صورتحال سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کسی بھی جذبہ کی نمو پذیری اور جہت آفرینی کے ساتھ اس پر اظہار خیال

کی سطح اور اس کی تعبیر کی صورت بدل جاتی ہے۔فن کی روایت تو اپنی سادہ صورت میں عالم و عامی سبھی کے ذہن و زندگی کا جز بنتی ہے لیکن فن کی روایت کو ''عصری حسیت'' کے ساتھ برتنے اور تخلیقی پرجوشی کو نئے آرٹ کے سانچہ میں ڈھالنے کی صلاحیت تو سب میں نہیں ہوتی اور یکساں درجہ پر نہیں ہوتی۔ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی اپنے ذاتی تجربوں کو اس انداز نظر اور ان اسالیب اظہار کے ساتھ پیش نہیں کرسکتا کہ دوسروں کے لئے بھی قابل ستائش اور لائق پذیرائی ہوں۔

ہر انسانی چہرہ کے سامنے اپنا آئینہ ہوتا ہے اور اسی کے مطابق وہ اپنے شخصی اظہار اور اپنی معنوی شناخت پر قادر ہوتا ہے۔اردو شاعری میں جذبۂ عشق کی معنی یابی کی کاوش ایک دوسرے معنی رکھتی ہے اور اس کا انسانی تجربہ اپنی ایک جداگانہ معنیاتی سطح کے ساتھ ابھرتا ہے۔اسی لئے ہمارے یہاں وہ شاعر بھی ہیں جنھوں نے واقعتاً عشق کیا ہے چاہے اچھی عشقیہ شاعری نہ کی ہو اور وہ بھی جنھوں نے اعلیٰ درجہ کی عشقیہ شاعری کی چاہے وہ زندگی میں عشق و ہوس کے ہنگاموں سے دور رہے ہوں۔ان میں وہ شاعر بھی مل جائیں گے جن کا دل کسی پر ٹوٹ کر آیا اور ان کی زندگی کو قصۂ آدم کی طرح رنگین کر گیا اور وہ بھی جن کا دل کسی پر آیا اور آکر ٹوٹ گیا۔بقول میر۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

عشق جنسی جذبے سے رشتہ ضرور رکھتا ہے لیکن اس کی مادی قدروں کا سرتا سر پابند نہیں۔

ہمارے بہت سے شعرا نے عشق کے جذبہ کی جو تعبیریں پیش کی ہیں اور جن تعریفات کے ساتھ اس کا ذکر جمیل چھیڑا ہے ان سے گوناگوں اور رنگ در رنگ معنیاتی سطحیں ابھرتی ہیں اور ٹھہرے ہوئے پانی میں پھینکی ہوئی کنکری کی طرح نت نئے آبی دائرے بنتے چلے جاتے ہیں۔خود میر تقی میر کے یہاں نظم ونثر دونوں میں ہم عشق کے مادی اور روحانی تصورات کی دھوپ چھاؤں اور ذہن وزندگی کی ان بھول بھلیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ان کا شعر ہے۔

عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

اس تصور کی فروغ پذیری ہمیں اقبال تک پہنچا دیتی ہے اور کہیں بات بس عاشق کے زرد رنگ، اشک گرم اور ٹھنڈی سانسوں تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔

تخیل وتمثیل کے ان حریری نقابوں کے پیچھے ہمیں بہت سے شعرا کی زندگی کے وہ کوائف وواقعات بھی مل جاتے ہیں جہاں ان کا عشق روحانیت کی نہیں مادی روحانیت کی دین ہے۔وہ ''سچا'' عشق ہے یا نہیں، یہ بتانا تو مشکل ہے لیکن اس کا تعلق ان شعرا کے یہاں ارضی حسن کی کشش اور مادی جذبۂ عشق سے بہرحال ہے۔ان کا محبوب مجازی ہے اور ان کی اپنی زندگی کے مادی ماحول سے تعلق رکھتا ہے اور اس پر حیرت نہ ہونی چاہئے کہ محمد قلی قطب شاہ سے لے کر ولی وسراج تک اور میر ودرد سے لے کر داغ وحسرت تک اس کی دلربائیوں اور انبساط آفرینیوں کا سلسلہ مختلف شعرا کی زندگی میں برابر ملتا چلا

جاتا ہے اور اس میں راجہ رنگ، فقیر اور ہزاری بزاری بھی شامل ہیں ع

کیا پوچھتے ہو عشق میں تم ذات کے تئیں

محمد قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں، ان کی دراصل بارہ محبوبائیں ہیں جن کے نغمہ و رقص ہی سے نہیں، ان کے حسن و جمال کے لمس و اہتزاز سے بھی وہ برابر لطف اندوز ہوتا رہا۔ بارہ پیاریاں صرف آسمان کے بارہ بروج یا بارہ اماموں ہی کی نسبت اس کے دیدہ و دل سے قریب نہ تھیں۔ وہ سال کے بارہ مہینوں میں بھی اس کی جلوت و خلوت کی شریک رہتی تھیں۔ موضع چچلم کی رقاصہ کے ساتھ اس کے عشق کی داستان بھی کافی شور انگیز اور دلچسپ ہے جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ شہزادہ نے اپنے عنفوان شباب میں اس کافر ادا سے ملنے اور اپنی اس محبوبۂ دلنواز کی انجمن ناز تک پہنچنے کے لئے ایک انتہائی طوفانی رات میں اس وقت موسیٰ ندی کو پار کرنے کی کوشش کی جبکہ اس ندی میں بے طرح سیلاب آیا ہوا تھا اور اس کی طغیانیاں سفینۂ نوح کو غرقاب کر دینے پر آمادہ تھیں۔

موضع چچلم کی اس رقاصۂ جمیل کا نام بھاگ متی تھا۔ بادشاہ ہو کر محمد قلی قطب شاہ نے اسے اپنے دل کی ملکہ اور اپنے راج محل کی مہارانی بنایا۔ جہاں وہ رہتی تھی اس چھوٹے سے قریہ کو ایک بڑا شاہی شہر بنا دیا۔ اس کے نام بھاگ متی کی مناسبت سے اس شہر حسین کا نام پہلے "بھاگ نگر" رکھا اور پھر جب اسے حیدر محل کا خطاب دیا تو بھاگ نگر کو بھی حیدرآباد کے نام سے موسوم کیا۔ اور جس گوشے میں اس رقاصۂ دکن کی اپنی رہائش تھی وہاں چار مینار جیسی شہرۂ آفاق عمارت اس کی یادگار کے طور پر بنائی جو اپنے حسن تعمیر اور منصوبہ کار کے لحاظ سے ایک عجیب و غریب شاہی تعمیر اور تاریخی یادگار ہے۔

محمد قلی نے اپنی عیش و عشرت کی زندگی اور اس کی نشاط انگیزیوں پر خدا کا شکر ادا کیا اور اس کو نبی و علی کا صدقہ قرار دیا ہے۔

اس کے دربار کے معروف دکنی شاعر ملا وجہی کی مثنوی قطب مشتری کے لئے بھی اس کے ایک فاضل نقاد و مقدمہ نگار، خان رشید نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس میں محمد قلی کی اپنی حیات معاشقہ کی جھلکیاں موجود ہیں۔ (ملاحظہ ہو اردو کی تین مثنویاں)

شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا افضل جھنجھانوی کی شعری تخلیق "بکٹ کہانی" سے ہوتی ہے۔ افضل کا ترجمہ والہؔ داغستانی صاحب "عیار الشعراء" کے یہاں موجودہ روایتوں میں سب سے قدیم ہے۔ والہ نے افضل کی روداد عشق کو بھی اس کی بعض دلنشیں تفصیلات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہاں اسے نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

افضل ایک صاحب فضل و کمال شخص تھے۔ اپنا زیادہ تر وقت طالبان علم کی تربیت اور درس و تدریس میں صرف کرتے تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں علم کے شائقین کا ہجوم رہتا تھا، کہ اچانک ایک ہندو عورت کے عشق میں ایسے مبتلا ہوئے کہ مجنوں کی طرح اس سنگدل معشوق اور اس کافر ادا محبوب کی ہوائے شوق میں اپنی متاع صبر و قرار کو ایک گل خود رو کی خوشبو کی طرح بکھیر دیا۔

اس کے فراق میں عاشقانہ غزلیں کہتے اور دیوانہ وار اس کی گلیوں کا طواف کرتے۔

اگرچہ ہندوؤں میں پردے کی رسم نہیں ہے لیکن اسے اس حد تک چھپا کر رکھا گیا کہ وہ کبھی تیج تہوار اور مذہبی پوجا پاٹ کے موقع پر بھی گھر سے باہر نہ آتی اور کبھی اپنی چشم سیاہ کے ساتھ اس گرفتہ دل کی طرف چشم التفات نہ کرتی۔ جب اس عاشق مجبور اور دیوانہ مجبور نے یہ حال دیکھا تو اپنی وارفتگیوں کے ساتھ دل پُرخوں کا یہ تقاضہ پورا کیا کہ اس کے سایۂ دیوار میں جا بیٹھے۔

اس معشوق بے پرواہ کے عزیزوں نے جب یہ حال دیکھا تو اسے رسوائی و بدنامی سے بچانے کے لئے محافہ میں بٹھا کر وہاں سے دور متھرا قصبہ میں اس کے عزیزوں کے یہاں بھیج دیا اور یہ سمجھا کہ اس طرح یہ شخص جھک مار کے اس سودائے عشق سے باز آجائے گا۔ جب افضل نے دیکھا کہ وہ ماہ چہار دہ اس گھر کی چار دیواری میں بھی نہیں چمکتا تو ان کا دل تڑپ اٹھا۔

شدہ شدہ یہ معلوم ہو گیا کہ اس محبوبۂ گل اندام کو متھرا بھیج دیا گیا ہے۔ یہ سن کر افضل نے دل بے تاب اور چشم پُر آب کے ساتھ متھرا کا رخ کیا اور اس دیار بتاں میں پہنچ کر اس سنگدل حسینہ کی تلاش شروع کر دی۔ ایک دن اس حور وش لیلےٰ کو کچھ ہندو عورتوں کے جھرمٹ میں شامل کہیں آگے جاتے دیکھا تو بے اختیار اس کے آگے جا کر یہ شعر پڑھا۔

خوشا رسوائی و حال تباہے   سر راہے و آہے و نگاہے

اس جفا شعار و تلخ گفتار نے اپنے اس عاشق زار کو پہچان لیا تو بڑی ترش روئی سے کہا۔ اے مولوی تجھے شرم بھی نہیں آتی، مجھ ایسی عورت سے عشق کرتا ہے۔ اپنی اس محبوبۂ دلنواز کے شیریں لبوں سے یہ تلخ باتیں سن کر انہیں خیال آیا کہ اب کیا کیا جائے اور اس آہوئے رم خوردہ کو کیسے رام کیا جائے۔

اپنی داڑھی مونچھیں صاف کرا دیں۔ زنار باندھا۔ قشقہ کھینچا اور دیر میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہندوؤں کی بھات اور پوجا پاٹ کے آداب و رسوم سیکھے اور بڑے پروہت کے سیوا داروں میں رفتہ رفتہ وہ مرتبہ حاصل کر لیا کہ جب مندر کے اس بڑے پجاری کا آخری وقت آیا تو آئندہ کے لئے اس نے افضل کو اپنا قائم مقام بنا دیا۔

اس کے بعد وہ سنہری موقع بھی آ گیا جب افضل کیلئے حصول مراد کی راہ کھل گئی جس کا ذکر والہ نے بڑے دلکش انداز میں کیا ہے کہ دیر پرستوں کے اس دیار کی رسم کچھ ایسی تھی کہ سال بھر میں ایک بار عورتیں مندر کے بڑے پروہت کے درشن کے لئے آتی تھیں اور اس کے دیدار کو حصول آرزو کا وسیلہ تصور کرتی تھیں۔ چنانچہ جب وہ دن آیا اور ہندو عورتیں جوق در جوق اپنے اس بڑے پروہت کے قدم چھونے کے لئے آئیں تو وہ کافرہ بھی آئی اور عقیدت کے جذبے کے ساتھ قدموں کو چھونے لگی تو افضل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا اے حسین آنکھوں والی، کیا تم مجھے پہچانتی ہو۔

اس نے غور سے دیکھا تو افضل کے عشق اور بے تابی محبت کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ بے اختیار قدموں کو بوسہ دے کر کہنے لگی۔ مجھ ایسی معمولی عورت کے لئے تم نے یہ ساری تکلیفیں اٹھائیں۔ ارے توبہ، اب میں آپ کی داسی بن کر اپنی زندگی گزاروں گی۔ جس کے بعد کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہو گئی اور افضل صنم پرستی کے اس طلسم جمیل کو توڑ کر پھر واپس آ گئے۔

قصبہ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر میں یہ روایت اب بھی مشہور ہے۔ اس کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے:

''یہ آپ بیتی جگ بیتی ہے۔ اسے کسی استعارہ یا تمثیلی جواب کی ضرورت نہیں۔ یہ افضل کی داستان عشق ہے۔ یہ گوپال کی پریم کہانی ہے''۔ [۱]

افضل کی اس حیات معاشقہ کا کوئی ماخذ والہ کی روایت میں موجود نہیں۔ ممکن ہے یہ کہانی مشہور رہی ہو اور عوامی روایت ہی سے والہ نے اسے اخذ کیا ہو۔ بعض اہل تذکرہ نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ افضل گوپال نامی کسی ہندو بچہ پر عاشق تھے لیکن ان کی اس پریم کہانی کا ''امرد'' سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے اپنی حیات معاشقہ کے دوران یہ نام البتہ اختیار کیا تھا۔

بیاد دلربا خوش حال می باش   کہے افضل کہ گوپال می باش

ممکن ہے ان کی اس دلربا کا نام گوپال وتی یا گوپال وئی رہا ہو۔ ویسے اردو میں امرد پرستانہ عشق کی روایتیں بھی مشہور رہی ہیں اور اٹھارہویں صدی عیسوی کی سوانحی روایتوں میں تو ان کی طرف جگہ جگہ اشارے بھی ملتے ہیں۔ ولی کے یہاں ''بت کی بھجن ہاری'' کے ساتھ ساتھ ان کے کسی محبوب ''امرت لال'' کا بھی ذکر جمیل موجود ہے۔ ع

شمع بزم وفا ہے امرت لال

ان کے ایک اور محبوب فقیر اللہ آزاد کا بھی ذکر آتا ہے جن کا جمال صورت ولی کے لئے تسکین دل و جاں کا سبب تھا۔ یوں بھی ولی ایک جمال پرست شاعر ہیں اور ان کی یہ جمال پرستی اور حسن پسندی سرتا سر روحانی نہیں

ہے۔ اس میں ارضیت و واقعیت کا پرکشش پہلو بھی موجود ہے۔ وہ خود عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی کے بھی قائل تھے۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں، عبدالحی تاباں کی تاب رخسار پر شیفتہ و فریفتہ تھے۔ ان کے جمال جہاں آرا کا تذکرہ اس زمانہ کے کئی تذکرہ نگاروں کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے اور خود عبدالحی تاباں صلاح الدین پاکباز نام کے ایک صاحب جمال فرد کو اپنا معشوق بنائے ہوئے تھے۔ انعام اللہ خاں یقین کو اس کے باپ اظہر الدین نے کہا جاتا ہے کہ اس پاداش میں قتل کر دیا کہ وہ خود اپنی کسی بہن پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ یقین کا شمار حضرت مرزا مظہر کے بہت ہی چہیتے شاگردوں میں ہوتا ہے اور بعض اہل تذکرہ نے تو چشم سخن سے یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ وہ مرزا صاحب کے منظور نظر تھے۔

میر نے خاکسار نامی ایک شاعر کا ذکر کرتے ہوئے یہ فقرہ کسا ہے کہ اس نے اپنے ''معشوق چہل سالہ'' کے نام سے ایک تذکرہ لکھا ہے۔ خود میر بھی زندگی بھر آلام عشق میں گرفتار رہے۔ انہوں نے اس کا ذکر خود بھی کیا ہے کہ انہیں اپنی کسی عزیزہ سے عشق ہو گیا تھا جس کے بعد یہ نوبت پہنچی ''مجھے رفتہ رفتہ جنوں ہو گیا'' اور چاند میں اس ماہ دو ہفتہ کی تصویر نظر آنے لگی۔

ان کے یہاں تصور عشق کی جو وضاحتیں ملتی ہیں ان پر عشق کی روحانی تعبیرات غالب ہیں لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کی عمر ساٹھ برس ہو چکی ہے اور وہ صوفیانہ افکار کی تبلیغ میں معروف ہیں۔ شروع میں کیفیت یوں نہ رہی

---

۱ بکٹ کہانی ص۔ ۳۸

ہو گی۔ ان کی مثنوی ''معاملات عشق'' کا مطالعہ اس کا داخلی ثبوت مہیا کرتا ہے۔

خواجہ میر درد ایک صوفی شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں تغزل و تعشق کی فضا سرتاسر غیر مادی نہیں ہے۔ انہوں نے مجازی عشق بھی کیا اور کسی ارضی محبوب سے ان کا والہانہ رشتہ بھی رہا۔ سچ پوچھیے تو بعض خانقاہ نشین شعرا کا عشق بھی صرف خانقاہی حدود کا پابند نہیں۔ خواجہ میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' اس کی بہترین مثال ہے۔ شاید اسے تمثیلی حجاب کی ضرورت بھی نہ تھی۔

ممتاز اسی دور کے ایک اور شاعر ہیں جن پر نزاکت نامی کوئی کنیز بری طرح عاشق تھی اور ایسا سچا عشق کرتی تھی کہ یہ راز کھلنے پر اس کی مالکہ نے اسے سخت سزا دی، شکنجہ میں کھنچوایا لیکن اس کے جذبہ عشق و وفاداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ پروانہ وار اس چراغ آرزو پر اپنے آپ کو فدا اور فنا کرتی رہی جسے ''عشق ممتاز'' کہنا چاہیے۔ قائم نے ممتاز کے ترجمہ میں اس کا ذکر جمیل بھی چھیڑا ہے اور ممتاز کے لئے بڑے معنی خیز انداز میں کہا ہے کہ اس کا انداز شعر کوئی ''نزاکت'' سے خالی نہیں ہے۔

یہ باتیں سب کے لئے زبان قلم پر نہیں آئیں ورنہ بہت سے شعرا کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری کے پردۂ زنگاری میں کوئی معشوق موجود رہا ہے۔

میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' کے محرکات میں میر حسن کی وہ عشق ورزیاں اور چہل بازیاں شامل ہیں جن کا تعلق فیض آباد و نوابی محلات کی پرتعیش فضا سے تھا۔

جرأت تو دیدہ بازیاں کیا ہی کرتے تھے اور ان کی شاعری میں معاملہ بندی کا جو شوخ رنگ ملتا ہے اس کے بارہ میں میر نے کہا تھا ''میاں تم شعر کہنا کیا جانو اپنا چوما چاٹا کہہ لیا کرو'' اب یہ الگ بات ہے کہ کسی کا عشق پرستش کے دائرہ میں آ جائے اور کسی کا عشق صرف خواہش و کاہش کی حدود سے وابستہ رہے۔ نشتر ناول کے مصنف جو ہمارے کلاسیکی شعرا میں سے ہیں۔ ان کی عشق کی تو ایک بہت ہی دلآویز کہانی بیان کی گئی ہے۔ ان کی زہرہ جمال معشوقہ کسی ڈیرے دار طوائف کی نوچی تھی اور بے حد والہانہ جذبے کے ساتھ اپنے اس محبوب کو چاہتی تھی جس نے اس داستان معاشقہ کو ایک حسین و رنگین کہانی کے روپ میں فارسی زبان میں لکھا اور پھر اس کا ترجمہ اختصار کے ساتھ اردو میں کیا گیا۔

مثنوی زہر عشق بھی نواب مرزا شوق کی اپنی واردات عشق ہی کی ایک شعری تمثیل ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس سر دلبراں کو حدیث دیگراں بنا دیا گیا۔ اس کے محرکات پر بحث کے ضمن میں اس کا یہ پہلو سامنے آ چکا ہے۔

مرزا غالب کی محبوبہ جس کو وہ چودھویں بیگم کہتے تھے، ایک مغنیہ تھی اور نواب مصطفےٰ خاں کی معشوقہ رنجو ایک طوائف۔

مومن کے یہاں تو بہت سی پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں۔

فریاد داغ، نواب مرزا داغ کے منی بائی حجاب کلکتہ والی طوائف سے ان کے والہانہ عشق ہی کی منظوم داستان ہے جسے کسی اور حجاب سے بے نیاز سمجھنا چاہیے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے بہت سے شعرا کا عشق فرضی نہیں، ارضی اور واقعاتی بھی ہے۔ اس میں شبلی اور اقبال جیسے نابغے بھی شریک ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

مومن اور عشقِ پردہ نشیں

مومن خان مومن کی زندگی اور سیرت کا بغور مطالعہ کیجئے تو ایک عجیب تضاد نظر آئے گا۔ یہ تضاد ان کی کمزوری بھی ہے اور طاقت بھی۔ ایک طرف وہ رند شاہد باز ہیں اور دوسری طرف حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ارادت مندوں میں ہیں۔ ایک طرف عشق و محبت میں اپنے آپ کو فنا فی المحبوب کئے ہوئے تو دوسری طرف جذبۂ جہاد دل میں موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے دن خانقاہ میں گزرتے ہیں اور راتیں کسی بتکدہ کی نذر ہوتی ہیں۔ محبوب سے محبت کرتے ہیں مگر اپنی انا میں فرق نہیں آنے دیتے۔

کس میں ہے مومن وہ کافر صنم
بس اب پاسبانی دیں ہو چکی

اس وقت ہمارا موضوع مومن کی 'پاسبانی دیں' نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی کے اس رنگین باب کا ذکر مقصود ہے جس کے لئے مومن نے خود لکھا تھا:

تھے برس ہم شمارۂ افلاک
کہ ہوا پائمال صورتِ خاک
کھو دیا چین ایک مہ رو نے
شب سیہ کی ہلالِ ابرو نے

مومن خاں خوبصورت اور رنگین طبع تھے۔ فکر معاش سے آزاد۔ دنیاوی جاہ و جلال کی خواہش نہیں تھی۔ عشق کے لئے دلّی جیسا حسن خیز شہر پایا۔ طلب نے بارگاہ حسن کے لئے راستہ بنایا۔ وہ صرف عاشق ہی نہیں بنے بلکہ محبوب بھی ہوئے۔ محبوبوں کے بھی ناز اٹھائے اور کبھی خود ناز و ادا کا اظہار کیا۔

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری
واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

مومن نے متعدد عشق کئے اور ہر عشق کی داستان ان کے یہاں مثنوی کی صورت میں موجود ہے۔ اگر مومن کا یہ بیان درست ہے کہ ع ''تھے برس ہم شمارۂ افلاک'' تو آغاز عشق سات یا نو برس ماننا پڑے گا۔ ان کی پہلی مثنوی جو ان کے عشق کی داستان ہے وہ ۱۸۱۵ء/۱۲۳۱ھ میں لکھی ہے جب ان کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ جب اس محبت کے چرچے ہونے لگے تو بدنامی کے خیال سے یہ سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ مگر اس جدائی کا اثر تھا کہ محبوبہ بیمار ہوگئی اور اسی بیماری میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

بہر تسکین شدت خفقان
ٹھہری گلگشت روضۂ رضوان

رشک سے خضر پائمال ہوا
ملک الموت سے وصال ہوا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مومن کے کلیات میں جس محبوبہ کا مرثیہ ہے وہ اسی محبوبہ کے مرنے کا ہے۔ ان اشعار سے شدت جذبات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے
کیا جانے اس کی زلف پریشاں کو کیا ہوا
شبنم کو پھر ہے حجاب خورشید التفات
شرمندہ ساز مہر درخشاں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو
اس چشم رشک فتنۂ دوراں کو کیا ہوا
کرتا ہے سینہ چاک رخ ماہ دیکھ کر
اس روئے غیرت مہ تاباں کو کیا ہوا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مومن کا یہ پہلا عشق سچا تھا۔ پہلی مثنوی اور یہ مرثیہ شاعرانہ اعتبار سے خواہ بلند نہ ہو مگر اظہار جذبات میں خلوص اور بے ساختگی ہے۔ آہستہ آہستہ غم ہلکا ہوتا گیا اور اسی دوران ایک دوسری لڑکی ان کی زندگی میں داخل ہوگئی۔

دیکھتا کیا ہوں ایک زہرہ جبیں
جلوہ افروز ہے سر بالیں

سال عمر اب تھے ہم شمارہ بروج
کہ ہوا اختر بلا کا عروج

مگر یہ محبت بھی راس نہ آئی اور احباب کے سامنے راز محبت فاش ہوگیا۔ گھر میں طلبی ہوئی مگر کم عمری کے باعث لوگوں کو یقین ہوگیا کہ یہ محض الزام محبت ہے۔

جھوٹی اک آدھ جب قسم کھائی
سمجھے سچ ہے یہ من و شیدائی
صاف طوفان اس کو جان گئے
دشمن جان اس کو جان گئے

مومن کی ایک غزل میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے کہ راز محبت فاش ہوجانے پر احباب کا ردعمل کیا تھا۔

مجھ پہ طوفاں اٹھائے لوگوں نے
مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
کر دیے اپنے آنے جانے کے
تذکرے جائے جائے لوگوں نے
وصل کی بات کب بن آئی تھی
دل سے دفتر بنائے لوگوں نے

اگرچہ احباب نے اس واقعہ کو تہمت خیال کیا مگر پھر بھی مومن پر نظر رکھی جانے لگی۔ ایک دن جب دونوں باہم یک جا تھے تو کسی نے شکایت کر

دی۔ وصال نے ہجر کی صورت اختیار کرلی۔ کافی عرصہ تک محبوبہ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ محبوبہ کے دل میں بدگمانی پیدا ہوگئی کہ ایسے ہرجائی کا کیا اعتبار۔ اس کے بعد جب مومن ملنے گئے تو

بات کہنے میں اس نے کام کیا
قصۂ دوستی تمام کیا

لیجئے دوسرے عشق کی داستان بھی تمام ہوئی۔ پہلے عشق کی پوری کہانی اپنی مثنوی ''شکایت ستم'' میں اور اس عشق کی روداد مثنوی ''قصۂ غم'' میں بیان کی ہے۔

تیسرے عشق کی کہانی مثنوی ''قول غمیں'' کا موضوع ہے۔ ایک دن سیر کو جارہے تھے کہ گھر کے غرفہ سے کسی نے اشارہ کیا۔

راہ میں طرفہ تماشا دیکھا
غرفۂ بام دل آرا دیکھا

یہ ملاقات غیر متوقع تھی۔ خود مومن کو حیرت تھی کہ یہ عورت کون ہے؟ اگر آزاد ہے تو بے تکلفی سے گھر میں کیوں نہیں بلاتی۔ اور پابند ہے تو بلانے کا سبب کیا ہے۔ آخر ایک دن ملنے کی راہ مل ہی گئی اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب مومن کی عمر بیس برس تھی اور یہیں ان کی ملاقات امت الفاطمہ بیگم سے ہوئی۔ امۃ الفاطمہ اپنے علاج کی غرض سے آئی ہوئی تھیں۔ یہاں مومن کا طب کا علم کام آیا اور امۃ الفاطمہ کے علاج میں مصروف ہوگئے۔ مریض اچھا ہوتا گیا اور طبیب بیمار۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امۃ الفاطمہ نے مومن کے مشورہ سے ''صاحب'' تخلص رکھا اور شعر کہنے لگیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مومن کی کسی محبوبہ کا نام نہیں معلوم۔ صرف امۃ الفاطمہ کا راز شیفتہ نے فاش کیا۔ امۃ الفاطمہ کے بارے میں تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ یہ لکھنؤ کی رہنے والی کوئی طوائف تھی۔ ان کے حسن و جمال کی طرف مومن نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے۔ اور تذکرہ نویسوں نے اس کی تائید کی ہے۔

صاف صندل سے زیادہ وہ ہاتھ
نرم مخمل سے زیادہ وہ ہاتھ

مگر فصیح الدین رنج نے وضاحت سے لکھا ہے:

''ایسی حسین نازک اندام عنبریں مو تھی کہ ہر پیچ زلف پرخم کا حلقہ دام بلا تھا۔ آئینہ روئے درخشاں مرآت حیرت افزا تھا''۔

صاحب جی کے مسلک کے بارے میں یہ بات صاف ہے کہ وہ شیعہ تھی۔

منہ کو مومن سے چھپاتا کافر
یہ تقیہ تو نہ بھایا مجھ کو

مومن نے غزلیات میں بھی صاحب جی سے اپنی محبت کا جا بجا اظہار کیا ہے۔

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

ایک پوری غزل 'صاحب' ردیف کے ساتھ لکھی ہے۔ قیاس یہ ہوتا

ہے کہ صاحب سے مراد امۃ الفاطمہ بیگم ہیں۔

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب
کہیں سایہ مرا پڑا صاحب
ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب
غیر اور تم بھلے بھلا صاحب

جب یہ بھی راز محبت فاش ہوا تو صاحب جی واپس لکھنؤ چلی گئیں۔

مومن کے بعض اشعار کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے جن میں رامپور اور سہسوان اور بدایوں کا بھی ذکر ہے۔

بدایوں میں مجھے جوش جنوں لایا ہے دلّی سے
یہ کیوں کر چارۂ چند خردمنداں کا ہوش آیا

رامپور کے لئے لکھتے ہیں:

دلّی سے رامپور میں لایا جنوں کا شوق
ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

سہسوان کے سفر کے لئے لکھتے ہیں:

چھوڑ دلّی کو سہسوان آیا
ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

اور اپنے سفر کا مقصد واضح طور پر لکھتے ہیں:

کوئی پہنچا دو میرے صاحب تک
کہ غلام گریز پا ہوں میں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رامپور کا سفر نواب محمد سعید سے ملنے کی خاطر کیا مگر نواب صاحب اس وقت رامپور کے نواب نہیں ہوئے تھے اور شاہی ریکارڈ میں بھی مومن کی آمد کا ذکر نہیں ہے۔

صاحب کے جانے کا غم تازہ تھا کہ ایک شادی میں شرکت کے لئے مومن کو جانا پڑا۔ اس شادی میں ایک حسینہ کو دیکھا۔ شادی کے دوران ملاقاتوں نے محبت کا رنگ اختیار کرلیا۔ جب شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو محبوبہ نے بھی رخت سفر باندھا اور مومن کو ہدایت کی کہ ملنے کی کوشش نہ کریں اور نہ کوئی خط لکھیں اس لئے کہ میرے گھر تک کسی کا پیغام پہونچنا ممکن نہیں ہے۔ مومن کے لئے یہ انکار ذہنی وارفتگی کا سبب بنا اور اسی غم میں بیمار پڑ گئے۔ ان کی مثنوی 'تف آتشیں' اسی داستان عشق کی ناکامی کی روداد ہے۔ مگر یہ دلچسپ واقعہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد جب مومن اس محبت سے دستبردار ہو چکے تھے کہ اس محبوبہ کا خط آیا اور اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا۔ ملاقات تو جاری ہوگئی مگر دل نہ مل سکا۔

اس محبوبہ سے ملاقات تو محض اپنے جذبات کی تسکین تھی مگر اسی دوران ان کی ملاقات ایک اور حسینہ سے ہوگئی۔ یہاں مومن کا ماہر نجوم ہونا کام آیا۔ محبوبہ نے بہانہ بنایا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ نجوم سے معلوم کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے

وہ زبوں طالع کہ ہے اختر شناس
آئے تو تم بھیج دینا میرے پاس

مگر جب اس محبت کی خبر پہلی محبوبہ کو ملی (جس کا ذکر گزشتہ مثنوی 'تف آتشیں' میں گزرا) تو اس نے اس محبوبہ کے کان بھر دیئے۔ اور یہ داستان محبت بھی ناکامی پر ختم ہوگئی۔ اب شاید خود مومن کا دل بھی محبت کی سودے بازی سے بھر گیا تھا۔ اس لئے اس مثنوی 'حنین مغموم' ان کے عشق کی آخری داستان ہے۔ اس وقت مومن کی عمر اٹھائیس برس تھی۔

اس کے بعد ان کی مثنوی 'آہ و زاریٔ مظلوم' کسی عشق کی داستان نہیں بلکہ محبت سے تائب ہونے کی کہانی ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ ۱۸۳۰ء میں بالاکوٹ کا حادثہ پیش آیا جس میں حضرت سید احمدؒ اور حضرت اسمٰعیلؒ شہید ہوگئے۔ اس واقعہ نے مومن کو تعلقات دنیا سے بیزار کر دیا۔ محبوبوں کی بے وفائی نے ان کو محبت سے متنفر کر دیا۔

ادائے آرزو کا کس میں حال اب
کروں عرض تمنا کیا مجال اب
الٰہی مومن اتنا ناتواں ہے
کہ ذکر اس سنگ دل کا بھی گراں ہے
سخن رفت از تواں خاموش گشتم
کشیدم نالہ و بے ہوش گشتم

یہ تھی مومن کی حیات معاشقہ! مومن کے عاشقانہ مزاج کی جھلکیاں ان کے فارسی خطوط میں بھی جا بجا مل جاتی ہیں۔ محبوبہ کی بے وفائی کی داستان خود محبوبہ سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اے وہ جس نے عمر بھر ظلم سے میرا امتحان لیا۔ اے وہ جس نے مدتوں میری مہر و وفا کو آزمایا۔ اے مہربانیوں پر مہربان کرنے والی۔ اے دشمن جاں۔ اے آفت ایماں...... اے وہ کہ سو غم و ملال کے باوجود میرے سر میں تیرا سودا ہے''۔

مومن کو بیتے ہوئے لمحات بھی یاد آتے ہیں:

''جب سے تو نے میرا ہاتھ تھاما۔ کبھی میں اس کو آنکھوں پر رکھتا ہوں اور کبھی سر پر۔ جب تو نے اپنی انگوٹھی ہاتھ سے میری انگلی میں پہنائی۔ کبھی انگلی کو بوسہ دیتا ہوں اور کبھی انگوٹھی کو۔ وہ محبت کی باتیں کیا ہوئیں اور وہ حدیث وفا کہاں گئی''۔

مومن کی غزلوں میں جس 'پردہ نشیں' کا ذکر ملتا ہے وہ بھی محبت کے اس ذکر کا کردار ہے۔

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے
بس کہ اک پردہ نشیں کے عشق میں ہے گفتگو
بات بھی کرتے نہیں جز صنعت ایہام ہم
اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں
تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے
مرگ نے ہجراں میں چھپایا ہے منہ
لو منہ اسی پردہ نشیں کا کیا

غزلوں میں یوں تو جابجا یادوں کا لطیف سلسلہ مل جائے گا۔ مگر یہ چند اشعار پڑھیے جن میں معاملہ بندی کی پوری تصویر سامنے آجائے گی۔ واردات محبت کی صداقت اور اسلوب بیان نے جو لطافت پیدا کی ہے اس نے فضا کو دلکش بنا دیا ہے:

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نبھانے کا تو ذکر کیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مگر اس داستان عشق کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مشغلے کے طور پر تو کاروبار عشق کو اپنایا مگر ان کی مذہبیت نے عاشق کا ہو رہنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ درست ہے کہ ان کا عشق شاہدانِ بازاری سے بھی تھا۔ مگر انہوں نے اپنے کو کبھی رسوا سر بازار نہیں ہونے دیا۔ شاید یہ تاریخ شعر کا انوکھا واقعہ ہے کہ مومن نے محبوبہ سے برابری کی نبھائی۔ اگر ادھر محبت میں کمی دیکھی تو خود بھی التفات سے دستبردار ہو گئے۔ خود ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود نیاز مندی کے بے احتیاج۔ اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا ہی کو چھوڑ بیٹھتا ہوں اور اگر میری تمنا حاصل نہیں ہوتی تو اس تمنا ہی سے دستبردار ہو جاتا ہوں، میں عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرتمند اور بندۂ حق گزار ہوں لیکن خریدار پسند...... میرا یوسف زلیخا کا غلام نہیں ہوتا کہ وہ اس کو زندان بلا میں ڈال دے اور میرا فرہاد عشق شیریں کی تلخی نہیں سہتا کہ وہ (شیریں) اپنے لب شیریں پرویز کے لئے وقف کر دے''۔

مجھے احساس ہے کہ اقتباس طویل ہو گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ پورا خط مومن کی سیرت اور افتادِ طبع کا مرقع ہے۔

اگر محبوباؤں کے کردار کا تجزیہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ یہ سب کسی گھٹے ہوئے ماحول کی پروردہ ہیں جو باہر دیکھنے کی کوشش کر رہی ہیں اور جب ان کی زندگی میں کوئی متلون مزاج مرد داخل ہو جاتا ہے تو بے پردگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس قید سے آزاد ہو کر جنسی جذبہ کی تسکین چاہتی ہیں۔ محبوبہ کی خود بینی کے لئے یہ اشعار شاہد ہیں۔

آئینہ کو رکھتی ہے آگے لا کر
اور کہتی یہ منہ سے منہ ملا کر
لو دیکھو ذرا خود کرو انصاف
ہم دونوں میں کس کا رنگ ہے صاف
ہے دونوں میں کون خوبصورت
ہے دونوں میں کون ماہ طلعت
دیکھو تو بغور چشم بددور
یوسف کہ وہ ہے جہاں میں مشہور

کیا اس کی بھی صورت ایسی ہی تھی
کیا اس کی بھی طلعت ایسی ہی تھی
کیا اس کے بھی ایسے ہی تھے گیسو
خمدار و سیاہ و عنبریں مو
یہ چشم سیاہ تو نہ ہوگی
یہ گرمی گفتگو نہ ہوگی

(قصۂ غم)

مومن کی مثنویات ان کے عشق کی آئینہ دار ہیں۔ ان داستانوں کا مرکزی کردار خود شاعر کی ذات ہے۔ محبوبہ اور رقیبہ کی حیثیت ضمنی ہے۔ چوں کہ یہ مومن کی اپنی زندگی کی واردات ہے اس لئے اس میں جذبات بھی ہیں اور خلوص بھی ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو مثنوی کے تمام لوازمات اپنی پوری رعنائی کے ساتھ موجود ہیں۔ (ختم)

سلومیجا نیرس   مترجم: ف۔ س۔ اعجاز

آؤ مجھے جلاؤ

آؤ، ہڈیوں کے الاؤ پر
مجھے ایک جادوگرنی کی طرح جلاؤ
ہاں مجھے ریزن☆ کی تازہ ٹہنی کی طرح جلا دو
اذیت؟
(نہیں، اذیت کیسی؟)

میں تو یوں کھڑی رہوں گی
جیسے اپنی گویائی کھو چکی ہوں
اور میری ایک بھی نس نہیں پھڑکے گی۔

میں صرف جانبِ آفتاب دیکھتی رہوں گی
دھوں دھوں جلتی ہوئی
ختم ہونے تک اپنا چہرہ دھوپ کی تمازت
کو دیتی رہوں گی
تم بھی نہیں سمجھو گے۔ میں کیوں مسکراتی ہوئی مر گئی
اور کیوں رخصت ہوتے ہوئے میں نے
خاموشی سے تمہیں معاف کر دیا۔
آسمان نے نرم کرنوں کے ذریعہ
زمین کو چوم لیا
اور اس نے ...... ایک ہونے والی دلہن نے ....
مسرت کے خواب دیکھے۔
ستارۂ شب نے زندگی کی خوشیوں کو اُجال دیا۔
اور جواب میں ہماری آنکھیں فرطِ مسرت سے پگھل گئیں۔
اب مجھے آگ میں جلا دو ایک جادوگرنی کی طرح
جہاں زمین اور آسمان
ایک ساتھ آگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔
تمہارا جسم میں تمہارے لئے چھوڑتی ہوں،
تمہاری خواہش ہے تو تم اس میں رہو
میری جنت تو میرے ساتھ راکھ میں تبدیل ہو جائے گی۔

(☆[Resin] گندہ بیروزہ۔ چیڑ یا صنوبر کا پیڑ جس سے تارپین کشید کرتے ہیں۔)

غالبِ بے وفا اور وفا

زیرِ نظر مضمون کے مشمولات تمام تر غالب کی حیاتِ معاشقہ سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتے۔ لیکن فاضل تذکرہ نگار اور محقق و ناقد ظ۔ انصاری نے بڑی دیدہ ریزی سے اس مضمون کو ترتیب دیا ہے۔ غالب کی حیاتِ معاشقہ کا ذکر انہوں نے اس مضمون میں دانستہ کافی بعد میں چھیڑا ہے۔ پہلے غالب کی تحلیلِ نفسیات کی کئی گرہیں اپنے ناخنِ تدبیر سے کھولی ہیں۔ اوّلاً غالب پر عائد بے وفائی کے الزامات کو ٹھیک ٹھیک LOCATE کیا گیا ہے۔ لفظ "بے وفا" یا "وفا" جس پر ایک عاشقیہ معاملے کا سارا دارومدار ہوتا ہے (اور یہ رونا ہنسنا وفا ہی کے ہونے یا نہ ہونے پر تو منحصر ہوتا ہے) کی اصل اور فرع، اس کے ظاہری اور باطنی مضمرات کو سمجھا اور سمجھایا گیا ہے۔ اس کے بعد غالب کے عشق (معاشقہ) سے اس بحث کے ڈانڈے ملائے گئے ہیں۔ اور ایک بہت صحیح اور مناسب مقام پر غالب کے ایک ترک خاتون سے تعلق کی طرف اشارے کئے ہیں جس کا ذکر ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے۔

باکمال مصنف نے اپنے مضمون میں محبوب اور رقیب کی سوچوں اور مزاجی کیفیتوں کو بھی جابجا ضبطِ تحریر میں لیا ہے۔ ایسے مضامین لکھنے کے لئے کم از کم ایک زندگی کا ریاض درکار ہوتا ہے۔
یہ مضمون کسی کے فن کو زندگی کے پس منظر میں دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کے ایک طریقے (METHODOLOGY) کا جنم داتا ثابت ہوگا۔

(ف۔ س۔ اعجاز)

دیوانِ اردو کے پہلے اڈیشن (۱۸۳۵ء) کے شروع کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

نصاب کی کتاب میں آجانے کے سبب اور بار بار کان پڑنے کے کارن یہ اتنا مشہور ہوا کہ اس کی معنویت دھندلی پڑ گئی۔ حالاں کہ اگر غالب کے پورے کلامِ اردو و فارسی کو، ان کی زندگی کے اوّل و آخر کو اور گہری سوچ بچار کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھئے تو اس شعر کی پوری صداقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم اسے ان کا پہلا شعر اور آخری شعر بھی کہہ سکتے ہیں۔

"نقشِ وفا" ضرور "شرمندۂ معنی" ہوا لیکن ہوا یوں کہ ہر ایک صورتِ حال، ہر ایک سطح اور سلسلے میں اس کے معانی بدلتے گئے۔ اس درجہ بدلتے گئے کہ عام مفہوم میں وہ بے وفائی سے بغل گیر ہوگیا۔ اور بالآخر پتہ چلا کہ سوالیہ علامتوں (؟) کے حصار میں، اور ان کی صحبت میں ایک عمر بسر کرنے والا ہمارا یہ دانش ور شاعر "وفا" کے طے شدہ، کہن سال تصور سے بے نیاز اور بیزار ضرور گزرا ہے۔ اس کو "وجہِ تسلی" شمار نہیں کرتا۔

آگے کی غلط فہمی یا الجھاؤ سے بچنے کی خاطر یہاں یہ واضح رہے کہ "وفا" کو نہ لفظ لائلٹی (Loyalty) پورا پڑتا ہے، نہ Faithfulness نہ پوری سپردگی یا تکمیل، Devotion یا Total commitment البتہ یہ ان کے مجموعی مفہوم پر حاوی ہے۔ بے وفائی کا مطلب غداری یا بے ایمانی بھی نہیں

ہے۔ نہ یہ فکری سطح پر بے ایمانی کے مرادف ہے۔ بلکہ یہ ایک رویّہ ہے فرماں برداری اور سعادت مندی کے برعکس۔ مان لینے اور تسلی پانے کے برخلاف، اس میں خیال اور برتاؤ کا مسلسل تغیر، لگاتار ادل بدل، ترمیم اور ردّ وقبول کی پے در پے کشمکش شامل ہے۔

یوں دیکھئے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ بے وفا شخص، ایک بے وفا شاعر، بے وفا فنکار ہے۔ زندگی کی آزمائش میں پورا اترنے کے سوا اس کے نزدیک ''وفا'' کا کوئی تصور نہیں، وفاداری کو وہ آدمی کے زندہ، توانا اور دانا وجود کے لئے بے معنی قرار دیتا ہے۔

وراثت میں

آگرے میں آنکھ کھولی تو باپ، چچا اور نانا سب کے سب فوجی افسر تھے۔ باپ آج شاہ عالم کی گتی فوج میں رسالداری کر رہے ہیں، کل حیدر آباد جا کر نظام الملک کے ہاں تین سو سواروں کے افسر، تین برس بعد مہاراجہ الور کی فوج میں — اور وہیں مارے بھی گئے۔

''در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار''

— (قصیدہ: ۵۸)

چچا کا حال بھی معلوم ہے۔ مرہٹا راج کی طرف سے آگرے کے صوبیدار ہیں، اور جیسے ہی دیکھتے ہیں کہ جنرل لارڈ لیک کا فوجی پلہ بھاری ہے، وہ شہر کو دشمن کے حوالے کر کے اپنا منصب بچا لیتے ہیں۔

آگرے پر لارڈ لیک کے طوفانی حملے سے پہلے وہاں کے ایک کشمیری رئیس غلام حسین (جنھوں نے اپنی بیٹی مراٹھوں کے مقتل صوبیدار نصر اللہ بیگ کے بھائی سے بیاہ دی تھی) خود بھی پہلے مغلوں سے، پھر مراٹھوں سے اور پھر فوراً انگریزوں سے معاملہ کر لیتے ہیں۔ وہ مراٹھوں کی طرف سے کمیدان (Commandant) مقرر رہے تھے، بعد میں انگریزوں نے ان کی جاگیر بحال رکھی۔ یہ وہ نانا ہیں جن کے گھر میں عبداللہ بیگ کا یتیم اسد اللہ بیگ پلا بڑھا۔

ننھیال، ددھیال، سسرال

جن لڑکوں کے ساتھ غالب کا اٹھنا بیٹھنا، پتنگیں لڑانا، چوسر بڑھانا معمول تھا ان میں مہاراجہ بنارس، چیت سنگھ کے جلاوطن وارث، کنور بلوان سنگھ شامل ہیں، جن کے بزرگوں نے شاہ اودھ کے زیر سایہ رہتے ہوئے اندرخانہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاملہ کر لیا تھا، یہاں تک کہ آگے چل کر، جب وارن ہیسٹنگز کے چھوٹے سے لشکر کو اہل بنارس نے مار پیٹ کر ختم کر دیا تو ہیسٹنگز کو بمشکل زندہ سلامت رکھا بلکہ ایک بڑی رقم سے خفیہ طور پر مدد بھی کی۔

ننھیال اور ددھیال اور ہم عمر عزیزوں کی حویلیوں میں یتیم، مگر نازوں کا پروردہ اسد اللہ یہ سب دیکھتا، سنتا اور سوچتا ہوگا، اثر لیتا ہوگا۔ جس خاندان میں شادی ہوئی، وہاں بزرگ خاندان مغل شاہی منصب دار فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں اپنی چھوٹی سی میواتی ریاست سنبھالنے کی خاطر انگریز کمپنی کے جنگ جو مہم پسندوں سے معاملہ کر لیتا ہے اور حملہ آوروں کے اشارے بلکہ سپورٹ سے بھرت پور ریاست پر اچانک حملہ کر دیتا ہے۔ بھرت پور کی لوٹ اور حصے بخرے میں اسے بھی جاگیر انعام ملتی ہے۔ کمپنی دہلی کے نواح میں اپنے

ایک طاقت در مخالف، راجہ بھرت پور کو گھل ڈالتی ہے۔

سسرال کا یہ سب سے باعزت امیر خود اپنے قریبی رشتہ دار عبداللہ بیگ اور نصراللہ بیگ کے وارثوں کے نام کی جاگیر صاحب ایجنٹ سے مل کر اپنی جاگیر میں ملا لیتا ہے۔ اور لڑکوں لڑکیوں کا حق مارنے میں دریغ نہیں کرتا —— وہ بھی جب کہ اسداللہ کا اس کی بھتیجی سے رشتہ طے ہو چکا ہے۔

چودہ پندرہ برس کی عمر سے، شادی کے بعد غالب کا مستقل ٹھکانا سسرالی عزیزوں، یا لوہارو والوں میں ہو گیا۔ ان کا منجھلا برادر نسبتی، جو بیوی کا سوتیلا بھائی تھا، نواب شمس الدین، ظاہر ہے کہ یوں ہی دوسرے بھائیوں سے بگڑا ہوا تھا، مرزا نوشہ کو کیا خاطر میں لاتا جو باپ دادا کے گھر سے کوئی جاگیر بھی نہ رکھتے تھے اور اپنا حق جتاتے تھے۔ سسرال میں اولین دشمن انہیں وہی نظر آیا۔ اور یہ ذاتی دشمن ایسا تھا کہ ایک طرف سپرنٹنڈنٹ ولیم فریزر کو اپنے باپ فخرالدولہ کے رشتے سے چچا کہتا رہا، دوسری طرف اس کے قتل کی سازش کی اور قتل کرا دیا۔ جس کی سرگوشیاں قریب کے عزیزوں میں ہوتی ہوں گی۔ غالب کے کان تک بھی ضرور پہنچی ہوگی۔ اور پھر انہی دنوں انگریز سٹی مجسٹریٹ کا لوہارو والوں کے داماد مرزا نوشہ کے گھر آنا جانا۔ عجب نہیں کہ دلی والوں میں جو افواہ غالب کے مخبر ہونے کی پھیلی، اس میں کسی قدر سچائی بھی ہو۔ اس زمانے میں وہ اپنے حصے کی جاگیر کا روپیہ کمپنی کے سرکاری خزانے سے طلب کر رہے تھے۔

اسی وسیع اور پیچیدہ منظر میں تو عمر اسداللہ، اور بعد کے مرزا نوشہ کی اٹھان کا زمانہ اور ماحول بنی ہوئی وفاداریوں، بدلتی ہوئی وفاداریوں سے پارہ پارہ ہے۔ جوان امیرزادے کے پاؤں تلے ریتیلی زمین ہے، اور جدھر نظر اٹھتی ہے ادھر بار بار سرکتا ہوا، بدلتا ہوا منظر۔ اوروں کی طرح، اپنی پائدار حیثیت اور ہم چشموں میں عزت آبرو بنائے رکھنے کی خاطر مرزا نوشہ کو وفاداری کے مقررہ تصور میں ضرور جھول نظر آتا ہوگا۔

وفا کیسی؟

''وفا'' پہلے قبائلی اور پھر جاگیرداری نظام کا کلیدی لفظ رہا ہے۔ وفا کس سے؟ خاندان سے، قبیلے سے، جس کا نمک کھایا اس سے، جس ذات یا برادری، یا جاتی میں جنم لیا، پلے بڑھے، اس سے۔ جس دھرتی کو بویا جوتا اس سے۔ جو مذہب، عقیدہ یا سنسکار اوپر سے ملا اس سے؟ رہن سہن، پیشہ و توشہ، طور طریقے سے وفا؟۔ ایک حال پر صدیوں چلنے والے سماج کے لئے یہ وفاداری بیچ کی کیلی تھی جس نے اپنے بندھن کچے پکڑے تھے۔ لیکن وقت کی رفتار نے جب چال بڑھائی، ہندوستان بھی وسطی دور سے نکل کر مرکنٹائل رشتوں کی طرف بڑھا اور لپکا اور پھر اس نے بورژوازی کے اقتدار کے لئے راہ بنانی شروع کی تو ذات برادری، گاؤں گراؤں کے رشتے ڈھیلے پڑے۔ رعیت اور مزارع شہری کاروبار کی جانب پاؤں نکالنے کو آزاد ہوئے۔ پچھلی دو صدیوں کی معاشی، سماجی سرگرمیوں کا چارٹ دیکھ ڈالئے تو یہ عقدہ کھلے گا کہ وفاداریوں کی گٹھریاں ڈھیتی چلی گئیں اور کمرشیل دولت اندوزی کے انڈسٹریل پیداوار میں لگنے سے وفا کا تصور ایسا بدلا کہ ٹھیک ایسے وقت جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی زبان کا علاقہ جنگ آزادی کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا،

بمبئی، کلکتہ اور مدراس کی پریسی ڈینسیوں میں کارخانے اور کالج کھولے جا
رہے تھے اور یونیورسٹیاں قائم ہو رہی تھیں۔ ہندوستانی سرمایہ کھلے بندوں
ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرمائے اور سرگرمی سے ہم آغوش ہو رہا تھا اور اس بالکل
شروع کی Multinational سرمایہ کاری میں کوئی شرم کی بات بھی نہ تھی۔

یہ صرف موٹی سی مثال ہے۔ وفا کے مقررہ اور قدیم تصور کی
ہولناک شکست کی۔ ۵۷ء کے بعد کے چالیس پچاس برس بعد تک جو ہوتا رہا وہ
کل کی سی بات ہے۔ بزرگوں کی نظر اور کالج کے ڈر نے ہمیں اس کا جو علم دے
رکھا ہے اسے بھی نظر میں رکھئے۔

۳۰ برس کے غالب دلی سے نکلتے ہیں۔ لکھنؤ ٹھیرتے ہیں۔ منزل
کلکتہ کا گورنر جنرل سکریٹریٹ ہے لیکن ٹھٹھکتے ہوئے جا رہے ہیں۔ لکھنؤ میں
صفات کا وہ مجموعہ جسے ''مشرقی'' کہتے ہیں کن کن صورتوں میں ان صفات کے
مجموعے سے متصادم بنا رہا تھا جسے ''مغربی'' کے لیبل سے پہچانا جاتا ہے۔ کمپنی نے
نواب سعادت علی خاں کے زمانے سے لے کر ۱۸۲۷ء یا غالب کی آمد تک
غازی الدین اور نصیرالدین حیدر کی برائے نام ''شاہی'' حکومت سے
کروڑوں روپیہ ہی سودی قرض نہیں لے رکھا تھا بلکہ کاریگری دستکاری اور
فنکاری کو بھی متاثر کیا تھا۔ (اس پہلو پر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے)

لکھنؤ کی اس دھوپ چھاؤں فضا اور طاقت کی دوعملی نے بھی یقیناً
غالب کو کافی کچھ سمجھایا ہوگا۔ پھر بنارس ''عبادت خانۂ ناقوسیاں اور کعبۂ
ہندوستاں'' کا تفصیلی نظارہ، پھر باندہ کی طرز ادا اور سست رفتار نوابی، جو ۵۷ء
میں باغیوں کی چھاؤنی بنی (اور نواب کو پھانسی دی گئی) عظیم آباد پٹنہ تو
۱۷۶۱ء-۱۷۶۵ء کے معاہدوں میں ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے راج دلاروں کی
شکارگاہ بن چکا تھا۔ اور بالآخر کلکتہ، جہاں گورنر جنرل کے محل کے سامنے ایران
کا سفارت خانہ اور مدرسۂ عالیہ براجمان تھے۔ کلکتے سے غالب کے جوان، اث[ر]
پذیر اور زود رنج ذہن نے کیا سیکھا، کیا سمجھا، اس پر اوروں نے کافی لکھا ہے۔
ڈھائی برس کا یہ غرضمندانہ بلکہ آرزومندانہ سفر جو ''تن کا سفر'' ہی نہیں، ''من'' [کا]
کا سفر بھی تھا، جسمانی نہیں، ذہنی سفر بھی ثابت ہوا، اور اس نے نئے قسم کے
ایڈمنسٹریشن کی بے دردی اور وفا کے ہر تصور سے ناآشنائی ان پر روشن کر دی۔

یہاں برسبیل تذکرہ ان کے دو غیر معروف شعر نقل کرنا بے محل نہ ہوگا ۱؎

آں کہ جوید از تو شرم و آں کہ خواہد از تو مہر
تقویٰ از مے خانہ و داد از فرنگ آرد ہمی

یا کلکتہ کے تاثرات پر ان کا قطعہ (۱۰) جو یوں ختم ہوتا ہے۔

گفتم از بہر داد آمدہ ام
گفت بگریز و سر بسنگ مزن ۲؎

غالب ۱۸۳۰ء میں بکھرے ہوئے اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ یہاں
انگریزی تعلیم کی شروعات ہے۔ انگریزی علم و دانش کا چرچا اور اس کے

۱؎ وہ، جسے تجھ میں شرم و حیا کی تلاش ہو، اور وہ جو تیری طرف سے محبت کا طلبگار ہو، وہ ایسا ہے
جیسے شراب خانے سے پرہیزگاری کا، اور انگریزی عملداری سے انصاف کا امیدوار۔
۲؎ میں نے ہاتف غیبی سے کہا کہ میں یہاں کلکتے میں انصاف طلب کرنے آیا ہوں، اس نے
جواب دیا۔ بھاگ جاؤ پتھر پر سر نہ مارو۔

خلاف علوم قدیمہ سے وفاداری کا محاذ گرم ہے۔ ادھر سے زمین کے گول ہونے اور زمین کے گھومنے کی خبر گھوم رہی ہے، ادھر مولوی فضل حق خیرآبادی، غالب کے بزرگ دوست ''ابطال حرکۃ الارض'' تصنیف فرما رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہی مجاہدین کی جماعت میں فدائیوں کی سروسامان کی اور چندے کی رقموں کی ریل پیل ہے۔ وہ تحریک جس کی موجودہ صورت کو آجکل بنیاد پرستی ("FUNDAMENTALISM") کہا جاتا ہے، غالب کے کئی ہم عصر اور ہم سر اس تحریک کے ہمدرد ہیں یا اس تحریک کے ہموا ہیں، مثلاً حکیم مومن خاں، اس کے سیاسی پہلو سے ہمدردی، مگر ذہنی اور نظریاتی پہلو سے شدید اختلاف رکھتے ہیں مثلاً مفتی صدرالدین آزردہ، غالب کو مولوی فضل حق اپنے پروپیگنڈے کا ایک ہتھیار بنانا چاہتے ہیں، مروت میں غالب پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں، لیکن نتیجے میں الٹی بات کہہ جاتے ہیں۔ ڈانٹ سن کر پھر اسے سیدھا کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ دانستہ یا نادانستہ ذہن ''غیر مقلدوں'' کی طرف جاتا ہے یا نسبۃً آزادانہ بھٹکتا ہے۔

اتنی بڑی مذہبی سماجی تحریک جو دینی عقائد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اندادھند معاشی لوٹ کا توڑ کرنے کے لئے اٹھی تھی، پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف کس ہوشیاری سے موڑ دی گئی اور پھر دو تین سال میں خود ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوگئی۔ یہ غالب کی جوانی کے زمانے کا، ان کی دہلی کا، ان کے طبقے کا اور ماحول کا اتنا زبردست ہیجان انگیز واقعہ تھا جو کم وبیش دس برس دہلی سے کلکتے تک گونجتا رہا مگر ان کے ہاں اس سے نہ وابستگی ملتی ہے، نہ نابستگی۔ دور از کار چند اشارے ہیں، مثلاً

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

ان دنوں اپنے بیان کے مطابق، وہ پچاس ہزار کے مقروض ہیں۔ گھر بیچا، زیور بیچا، اور کیا بیچا، کیسے قرض ادا کیا، کیا بھی یا نہیں، ہمیں نہیں معلوم، صرف یہ معلوم ہے کہ ایک بار مقروض ہونے کی بنا پر گرفتار ہوئے، دوسری بار خلاف قانون جوا کھیلنے اور جوا کھلانے کی علت میں قید خانے پہنچے۔ اس حالت میں وہ ایک اس دربارِ بے بہار سے چلاتے چلاتے کچھ نچوڑ لینے کی فکر میں ہیں جہاں ان کے ذوقِ سخن کی سچی داد دینے والا کوئی نہیں، دوسری طرف ہر ایک آئندہ و روند انگریز عہدہ دار سے رشتہ جوڑنے میں، جس کے متعلق کچھ امید ہے کہ اگر شاعری کی نہیں تو کم از کم رئیسی شان کی ہی قدر کرے گا۔ قصیدے اور قطعے لکھ لکھ کر دونوں سمتوں میں رواں کرتے ہیں، اس خیال سے کہ ایک دربار دار شاعر کے پاس کلام منظوم کے علاوہ نذر کرنے کو اور ہے بھی کیا! وہ ''رسن تابی آواز'' کو قیدِ حیات کی ایک مشقت اور وفاداری کے اظہار کو محض ایک سلسلہ جنبانی شمار کرتے ہیں۔

وفا بیزاری

یہی بیس برس ہیں۔ (۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۰ء تک) جب وہ تمام وفاؤں اور وفاداریوں سے قطعی بدگمان اور اگلے پچھلے تمام بندھنوں سے بد

عہد ہو کر محض اپنی تکمیل میں لگ جاتے ہیں ("ترک صحبت کردم و در بند تکمیل خودم") عین پختگی کے زمانے میں وہ اب اس مقام پر کھڑے ہیں، جہاں کعبہ ان کے پیچھے ہے اور کلیسا ان کے آگے۔ دونوں سے رشتہ ہے اور دونوں سے آزادگی۔ چناں چہ بے قراری اور بے یقینی کے بخشے ہوئے اس قرار نے انہیں فارسی شعر گوئی میں اور اپنے کلام کی ترمیم و تصحیح میں لگا رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اتفاق سے ان پر شاہ اودھ اور لال قلعے کی نظر التفات پڑتی ہے۔ اور وہ زمانے کی اس شوخی کا مجبوراً استقبال کرتے ہیں۔ نتیجہ ان کے اردو خطوط اور اردو کلام میں ظاہر ہے۔ جو یقیناً تب تک کے رونے سے بنی ہوئی بات تھی۔

غالب اپنے گھر میں ہیں۔ ملنا جلنا، آنا جانا، محفلیں اور مجلسیں کرنا موقوف۔ اخبار اور کتاب سے سروکار ہے۔ محل سرا میں صرف ایک بار دم بھر کو کھانا کھانے جاتے ہیں۔ دن بھر مردانے میں رہتے ہیں۔ یہ کون سی ازدواجی زندگی ہے؟

نوجوانی تک، جب انہیں ننھیال اور ددھیالی عزیزوں کی شفقت میسر تھی، جیسی بھی لا اُبالی زندگی گزاری ہو، لیکن گھر بار سنبھالنے کے بعد سے انہیں نئی ذمہ داریوں کا احساس ہو گیا اور جہاں تک بن پڑا ادھر سے غفلت نہیں برتی۔ غفلت تو نہیں، البتہ "بے وفائی" ضرور کرتے رہے۔ شادی شدہ زندگی میں ازدواجی بے وفائی کے دو واقعے ایسے ہیں جن کا اقرار خود غالب نے کیا ہے اور چوں کہ دونوں کا انجام جان لیوا حادثوں پر ہوا — غالب کی بیوی امراؤ بیگم کو ضرور ان کی خبر تھی۔ (ملاحظہ ہو چراغ دیر مثنوی میں "زتو نالاں و لے در پردۂ تو")۔

ایک وہ تعلق جو رئیسانہ شان میں شامل تھا۔ خوش مذاق مگر پابند قسم کی طوائف مغل جان کے مکان پر حاضری، دل لگی، اور خوش وقتی۔ ایک اور خوبرو، خوشحال جوان حاتم علی مہر پہلے وہیں آتے جاتے رہے ہوں گے۔ اس خاتون نے مہر کا ذکر تعریفی لفظوں میں غالب سے بھی کیا جس سے ان میں رقابت نہ سکی۔ تعلق کی نوعیت ظاہر ہے۔ مغل جان کے انتقال پر حاتم علی مہر نے درد دل غالب کو لکھا تو وہ تسلی دے رہے ہیں، درد میں شریک ہیں مگر اس واقعے کو دل پر نہیں لیتے، بلکہ الٹا سمجھاتے ہیں کہ ان کا تو شروع سے کسی بزرگ کی نصیحت پر عمل رہا ہے کہ "زہد و ورع ہمیں منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، ...... مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو" یہ بات غالب نے کئی بار کہی ہے، مثلاً

درد ہر قرو رفتۂ لذت نتواں بود
بر قند، نہ بر شہد نشیند مگس ما

مغل جان کے واقعے کو افسانوی حقیقت مل گئی۔ غالب ویسے ہی بے وفائی میں بدنام تھے، اس واقعے نے کچھ کمی بیشی نہ کی ہو گی۔

دوسرا واقعہ کسی خاندانی خاتون کا ہے۔ جن کی پوری تصویر، غالب کے ایسے اشعار میں ملتی ہے جنہیں محض تخئیلی تجربہ یا دور کا جلوہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہم سب یکساں طور پر جانتے ہیں کہ کسی بھی فنکار کا ہر ایک نقش اس کے ذاتی

تجربے کا نشان مند نہیں ہوا کرتا۔ لیکن ایسے اشعار اور اشاروں سے کہاں تک نظر چرایئے جو صاف صاف چلتی پھرتی تصویریں دکھاتے اور غالب کی ذہنی کیفیت سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ مثلاً بیوی سے بے وفائی کا یہ دوسرا واقعہ، جو سایۂ دیوار میں ایک زمانے تک چھتار ہا، سلگتا رہا۔

کشیدہ قامت، تیکھے نقوش، گورے رنگ، برق چشم، دراز گیسو اور نازک مزاج کوئی ہم قبیلہ نوجوان خاتون تھیں جنہیں ذوقِ سخن بھی میسر تھا اور غالب کو اپنا کلام بغرضِ اصلاح بھیجا کرتی تھیں۔ حمیدہ سلطان نے اپنی نانی کی زبانی اس خاتون کا تخلص ''ترک'' بتایا ہے۔ موصوفہ نے اس خاتون کو دیکھا بھی ہوگا۔ اگر انہوں نے نہیں دیکھا، صرف سنا تو ہم نے غالب کی زبانی سنا اور اس کے کلام میں ''ترک بیگم'' کو دیکھا بھی، کیوں کہ ہم نے غالب کے زخمِ جگر کو دیکھا۔

''ترک'' نام یا تخلص کی کسی شاعرہ کا کلام آج تک دیکھنے میں نہیں آیا، عین ممکن ہے یہ استادی شاگردی شاعرانہ اور برائے بیت ہو اور اس پردے میں غالب خاندان کی کسی معزز خاتون سے ایسے ٹوٹ کر ملے ہوں، ملتے رہے ہوں کہ گھر والوں کو خبر ہوگئی۔ نہ صرف اس اختلاط کی خبر، بلکہ اس کے نتیجے کی بھی۔ خود غالب کے دئے ہوئے اشاروں سے، ایک مدت بعد جب افواہ سرد ہو چکی، وہ غزل، جس میں واقعی شاعر نے پورے حادثے کا ماتم کیا ہے، ''ہائے ہائے'' کی ردیف کے ساتھ انجام سنا دیتی ہے۔ اردو فارسی کے کوئی چودہ ہزار اشعار میں یہ واحد غزل ہے جس میں محبوبہ کی موت کا انہوں نے ایک (MONUMENT) مونومنٹ، نصب کیا ہے اور وہ بھی اپنے مزاج کے خلاف ''ہائے ہائے'' کی صدا پر۔

اس غزل اور اس سے رشتہ رکھنے والے چند فارسی اشعار کو غور سے پڑھنے والوں پر یہ جتانا کچھ ضروری نہیں کہ غالب سے اس خاتون کے تعلقات یہاں تک بڑھے کہ بالآخر وہ حاملہ ہوگئی اور چونکہ معاملہ ایک معزز خاندان کی بیٹی کا تھا، اور غالب نے غالباً اپنی ذمہ داری میں اضافہ قبول کرنے سے پہلو تہی کی ہوگی۔ اس نے خاموشی سے جان دے دی اور اس جواں مرگی پر معاملہ دب گیا۔ حمیدہ سلطان لکھتی ہیں کہ جب اس شاعرہ کا انتقال ہوا، غالب بیمار پڑ گئے تھے۔ ہاں ایسا ہی ہوگا۔ غالب کو البتہ اس بیماری سے کبھی شفا نہ ہوئی کیوں کہ سالہا سال ان کے ضمیر میں اس کی وفا اور اپنی بے وفائی کا کانٹا کھٹکتا رہا، ورنہ ان اشعار کا کیا مطلب؟

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

وفا میں مثلث

بہتر ہوگا کہ ہم وفا اور بے وفائی کے اصل مفہوم کی جڑ تک پہنچیں یا اپنے طور پر اس کو DEFINE کرنے میں کسی قدر غالب کے اشعار سے بھی کام لیتے چلیں۔

ان کی ایک فارسی غزل ہے جسے قریب کے لوگ بھی پوری طرح نہ سمجھ پائے تھے اور خود شاعر کو مطلع کا مفہوم بیان کرنا پڑا۔

من بہ وفا مُردم و رقیب بدر زد

ہمہ نقش انگبین و ہمہ شکر زد ۱

وفا اور رقیب کے ساتھ شہد اور مصری کے تلازمے یہاں بھی دہرائے گئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ شاعر نے وفا میں جان دینا اپنے لئے اور مصری کی ڈلی چکھ کر اڑ جانا رقیب کے لئے فرض کر لیا ہے۔ یہ بات انہوں نے دوسرے طریقے سے ایک آدھ بار کہی ضرور ہے۔

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے!

کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں!

یہاں رقیب وفا نہیں کرتا، وفا کا فریب دیتا ہے اور محبوب وفا کے ہر دعوے سے منکر ہے اس لئے وہ رقیب کے فریب میں بھی نہیں آنے والا۔ رقیب اور وفا کے سارے تلازمے اور متعلقات کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھئے تو کھلے گا کہ یہ خود غالب ہیں جن سے وفا کی امید نہیں کی جاتی اور ان کے ہر دعوائے وفا کو فریب وفا شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود وفا کی اصلیت سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔

وفا، محبوب اور رقیب کے مثلث کو انہوں نے روشنی اور تاریکی کے زاویے بدل بدل کر دیکھا ہے۔ کوئی گوشہ چھوڑا نہیں۔

۱۸۴۷ء میں دہلی دروازے کے باہر جیل میں ہیں اور عام مجرموں کے ساتھ رکھے گئے ہیں۔ جان عذاب میں ہے۔ عزیزوں نے بدنامی کے خوف سے منہ پھیر لیا ہے، کوئی خبر گیری تک کا روادار نہیں (سوائے مصطفےٰ خاں شیفتہ کے) غضب کا "ترجیع" لکھا ہے جو پہلے ہی بند میں شکایت سے شروع ہوتا ہے۔

ہلہ دزدانِ گرفتار وفا نیست بشہر

خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم ۲

قصیدہ (۳۹) در مدح فرمان روائے اودھ میں تشبیب ہی میں وفا کی جنس ناروا کا رونا ہے۔

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا

رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم ۳

مشہور و مقبول غزل ہے جسے ایرانی موسیقار (ضیا پرتوی) نے بھی گایا ہے۔

ز ما گسستی و با دیگراں گرو بستی

بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا ۴

اور اس کا یہ ضرب المثل شعر۔

---

۱ میں تو وفا کرنے میں مارا گیا اور رقیب (بچ کر) صاف نکل گیا۔ کیا اس محبوب کا ایک لب شہد کا تھا، دوسرا مصری کا؟؟

۲ اے مجرم قیدیو، سنو کہ شہر میں وفا نام کی کوئی شے باقی نہیں۔ میں خود کو (اب) تمہارا ہمدم و ہمراز بنائے لیتا ہوں۔

۳ دنیا کے بازار میں وفا کا چلن نہیں تھا۔ (چنانچہ جس دوکان میں مجھے بٹھایا تھا) دوکان کی رونق بن کر (جو پہلے ہی جا چکی تھی) اس دوکان کی قسمت سے نکل گیا۔

۴ ہم سے (رشتہ) توڑا اور غیروں سے جوڑا — کیوں؟ کوئی بات نہیں۔ عہد وفا مضبوط نہیں ہوتا، (توڑ کر) آجاؤ۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

ہزار بار بَرو، صد ہزار بار بیا ۱

رفتہ رفتہ ایسا وقت آ گیا ہے کہ غالب نہ محبوب سے وفا کے طالب ہیں، نہ احباب سے، نہ زمانے سے۔

نہ آں بُوَد کہ وفا خواہد از جہاں غالبؔ

بدیں کہ پُرسد و گوید ہست، خُرسندست ۲

"جو منکرِ وفا ہو" والا خیال ایک بار سے زیادہ دہرایا گیا ہے اور وفا کے مثلث میں خود شاعر کا رویّہ یا تصور ہم پر روشن ہوتا ہے۔

خوشم کہ دوست خود آں مایہ بے وفا باشد

کہ در گماں نسگالم امید گاہ کسش ۳

حد ہو گئی کہ ایک غزل میں "غلط بود غلط" کی ردیف رکھ کر وفا کے ہر ایک تصور کو اس تار میں پرو دیا ہے۔

تکیہ بر عہد زبانِ تو غلط بود غلط

کایں خود از طرزِ بیانِ تو غلط بود غلط

دل نہادن بہ پیامِ تو خطا بود خطا

کام جُستن زلبانِ تو غلط بود غلط

آخر اے بوقلموں جلوہ کجائی؟ کا تجا

ہر چہ دادند نشانِ تو غلط بود غلط

وفا کا منتشر مفہوم غالب کے لئے زندگی کے ہر حال، ہر مرحلے، ہر ماحول میں جگہ چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ حُسن (محبوب) کی وفا سے بھی ان کی تسلی نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ ان کا مقصود نہیں۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں!

تیرے سوا بھی ہم پہ ہزاروں ستم ہوئے / بہت سے؟

اور خود اپنی وفا سے دست بردار ہوتے ہیں۔

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھیرا

تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!

یہ ان کا عملی نقطہ نظر ہے، زندگی اور فن کے بارے میں ایک سوچا سمجھا، نپا تلا رویّہ ــــ ایک مستحکم، قائم بالذات اپروچ:

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

عین ممکن ہے کہ یہاں، ہمارے خیال کو رد کرنے کے لئے غالبؔ کا کوئی پرستار اس قسم کے اشعار یاد دلائے جو پہلے سے کافی مشہور ہیں اور وفا کی

---

۱ رخصت اور ملاقات دونوں کی لذت جدا جدا ہوتی ہے۔ ہزار بار رخصت ہو، لاکھ بار پھر چلے آؤ۔

۲ غالب اس دنیا سے وفا کا طلبگار یا امیدوار نہیں، اتنا بھی بہت ہوا کہ لوگ بتا دیں، ہاں۔ وفا کا وجود ہے۔

۳ خوشی اس بات کی ہے کہ دوست کے پاس وہ جیسی کوئی شے ہی نہیں۔ اب یہ گمان بھی نہیں رہا کہ وہ کسی کا امید گاہ بن جائے (اور اس سے وفا کر بیٹھے)۔

عظمت جتاتے ہیں، مثلاً

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

......یا......

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

غور کیجئے تو یہاں بھی انہوں نے وفا کے اس تصور کو، اس کے انتہائے کمال کو شیخ و برہمن کے سپرد کر کے اپنی جان چھڑائی ہے۔ برہمن اگر اپنی وفا میں استوار ہے تو اسے صلہ دیجئے۔ اوّل تو برہمن گاڑا نہیں، جلایا جاتا ہے، پھر کعبے میں کسی کو دفن نہیں کرتے۔ برہمن کو وہاں دفن کیجئے کیوں کہ وہ اپنی آزمائش میں ''زنار کے پھندے کی گرفتاری'' میں سارا جیون بتا گیا ہے۔ یعنی وہ عمل اس سے سرزد ہوا ہے جسے لوگ وفا کی استواری کا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ جو لوگ وفا کی عظمت کے ایسے ہی قائل ہیں اب وہ برہمن کی ارتھی چتا کے لئے نہیں دفنانے کے لئے تیار کریں۔ اور وہ بھی کہاں؟ تو پھر غالب اپنے لئے کیا پسند کرتے ہیں؟ بے وفائی؟ بدعہدی؟ مصری کی مکھی بن کر لذت چکھنا اور اڑ جانا؟ نہیں — وہ زندگی کو اس سے زیادہ گہرائی کے ساتھ جدلیاتی (Dialectical) تجزیے کے ساتھ دیکھتے ہیں اور رنگا رنگ تقاضوں کی للک میں دیکھتے ہیں۔ ہم یہاں وفا کے اس پہلو کو اشارۃً عرض کریں گے۔

فنکار، دانشور اور وفا

پڑھنے والوں میں، جو حضرات فلسفے اور عمرانیات کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں، ان کے سامنے خیال اور عمل کے دیرینہ اور باہمی تعلق پر روشنی ڈالنا کچھ ضرور نہیں۔ خیال اور عمل میں کون اوّل ہے، یہ وہی مسئلہ ہے کہ Being وجود اور Thinking شعور میں کون فیصلہ کن ہے۔ سائنسی مادیت کا نظریہ ماننے والے عمل کو خارجی حالات (پیداواری طرز و تعلقات) یا ماحول کے عمل کو انسان کے ذہن و شعور پر حاوی بلکہ ان کا راہنما مانتے ہیں۔ اسی سبب سے ہم نے غالب اور وفا کے تصور میں خارجی حالات کو پس منظر کے طور پر پیش کیا۔ اب خود خیال اور عمل کے رشتے سے دانشور فنکار کا وطیرہ بھی دیکھئے۔

اوّل یہ کہ ''رچا'' (रिचा) اور Ritual (رسوم) میں دونوں دست و گریباں ہیں۔ ''رچا'' یا خیال، بلکہ دستوئیفسکی کے طرزِ فکری نظام میں "Idea" ہے جو کسی شخص اور سماج کی روح میں رواں رہتا ہے۔ آئیڈیا اپنی شناخت کے ساتھ عملی رسوم کی شناخت طلب کرتا ہے اور اسے جنم دیتا ہے۔ جب کوئی ''رچا'' بڑھ کر ''ری چوئل'' میں نشو و نما پاتا ہے تو نظریہ سماجی عمل میں ڈھلنے، فرد اور جماعت کو ہم آہنگ اور ہموار رکھنے کے لئے وفا پر زور دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ وفا کے مشروط تصور کے بغیر کوئی ''رچا'' پھیل کر ''ری چوئل'' نہیں بنتا، نہیں

بن سکتا۔ اور جو نظریے کسی سماجی نظام کو جنم دے کر یہ اصرار کرتے ہیں کہ Monolithic پارٹی یا Monolithic (یک پیکری) سڈول سوسائٹی ان کا مقصود ہے، وہ فرد کو قانونی حقیقت دے دیتے ہیں، جو اقبال کے لفظوں میں:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

آپ نے دیکھا یا برتا ہوگا کہ خیال کی لچک یا عقیدے کی آوارگی سے بے مروتی برتنے والے سماجی نظام اپنے مرتد کو سنگسار اور Dissentor کو Ex-communicate (ذات باہر) کر دیتے ہیں۔ عمل کی اجتماعی نوعیت کی خاطر انہیں اصرار ہوتا ہے کہ خیال کے سوتے سے پھوٹا ہوا اور زمانے بھر کی آلائشیں لپیٹے ہوئے جو عقیدہ طے شدہ ہے اسے جوں کا توں قبول یا تمام تر رد کر دیا جائے۔ اسے وہ ''وفاداری بشرطِ استواری'' یعنی غیر مشروط وفا قرار دیتے ہیں۔ جبکہ خیال بجائے خود غیر مشروط ہے اور بے وفائی کی روح لیے توانا اور تازہ دم نہیں رہتا۔

اب ذرا غالب کا وہ مشہورِ زمانہ شعر پڑھ کر سوچیے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

''ترکِ رسوم'' دراصل ایک معنی میں ترکِ وفا ہے۔ کیوں کہ رسوم ہی تو ہیں جو عمل میں وفا کا اظہار کرتی ہیں یہ ''رچا'' نہیں ''ری چول'' کا مجموعہ ہیں۔ فنکار دانشور اور نظریہ پرست میں یہیں آ کے انتر پڑتا ہے۔ فنکار اپنے عہد اور ماحول میں سانس لے کر ''ہر رنگ میں بہار کے اثبات'' پر زور دیتا ہے۔ وہ ایسا دانشور ہے جو پوری دیانت داری کے باوجود، بلکہ دیانت داری کے ساتھ کسی بھی مسلّمہ عقیدے، طے شدہ سانچے، یا طاقتِ فرماں روا سے، وقت کے عام چلن سے، پابستگی رسم و رہِ عام'' سے جزوی یا کلی، عارضی یا مستقل بے وفائی کرنے پر مجبور ہے۔ وہ خود اپنے سود و زیاں سے غافل یا بے نیاز بلکہ ذاتی مفاد کا کھلا دشمن ہو کر بھی وفا کے معمول سے بگڑ بیٹھتا ہے اور راہِ صواب کے بجائے بھٹکنے اور تلاش کرتے رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ خود کو بالآخر اپنا غیر فرض کر لیتا ہے جیسا کہ غالب نے اپنے بارے میں ایک آٹو بائیوگرافیکل (سوانحی) بے تکلف خط میں لکھا ہے۔ وہ جب کہتا ہے۔

عیش و غم در دل نمی استد خوشا آزادگی
بادہ و خونابہ یکسانست در غربالِ ما [1]

ب ایماں بہ غیب تفرقہ ہا رفت از ضمیر
ز اسما گزشتہ ایم و مسمّٰی نوشتہ ایم [2]

تو اُس ''آزادگی'' کے خدوخال ابھارتا ہے جو خیال کے بدلتے ہوئے بھاؤ (भाव) کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ وہ ''اسما'' یا Rituals کی پوٹلی دریا کنارے چھوڑ کر خیال کے گرداب میں اترتا ہے اور مسمّٰی کی تلاش جاری

---

[1] واہ، کیا آزادگی ہے کہ دل (کی چھلنی) میں نہ عیش ٹھیرتا ہے نہ غم۔ شراب ہو یا پگھلا ہوا لہو، دونوں اس ہماری چھلنی سے چھن کر ایک جیسے نکل جاتے ہیں۔

[2] غیب پر ایمان لانے کی بدولت ہمارے ضمیر پر سے سارے تفرقے دھل دھلا گئے۔ اسموں سے ہم گزر گئے (ان کی جگہ) صاحبِ اسم کو درج ضمیر کر لیا ہے۔

رکھتا ہے۔ اس کی وفا صرف اپنی فکر کے تقاضوں سے ہوتی ہے۔ جو گلوب کی طرح گردش کرتی اور روشنی و تاریکی کے عالم میں مبتلا اور متحرک رہتی ہے۔

فنکار اپنی عصری سطح سے بلند تبھی ہوگا جب وہ دانشوری میں قدم رکھے اور اپنے وقت کے دانشور وہ ہوتے ہیں جن کی وفا اپنی دانش کے تقاضوں سے برقرار رہے۔ ان تقاضوں سے جو کسی عہد کے، ایک دور اور سماجی ارتقا کے ہر ایک مرحلے میں تغیر پسند اور ''بے وفا'' رہے ہیں۔ جسے غالبؔ کے متعلق اس سلسلے میں کچھ کلام ہو وہ ان کے قصیدوں کی تشبیبیں دیکھے، بعض مثنویاں دیکھے جہاں اس دانشور فنکار نے اپنا سوچا سمجھا رویہ یا Attitude ایک تسلسل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، مثلاً ''بینند'' کی ردیف والا قصیدہ (نمبر ۲۶)

دل نہ بندند بہ نیرنگ و دوریں دیر دو رنگ

ہرچہ بینند بہ عنوانِ تماشا بینند [1]

خود تصوف کا نظریہ، جس میں غالبؔ نے فقیہوں کی بحث بحثی سے بچنے کے لئے پناہ لی تھی، ان کے ہاں ایک مکمل عقیدہ یا اعتقادی نظام نہیں، بلکہ ایک اخلاقی برتاؤ ہے۔ اپنے خطوں میں یہ راز افشا بھی کر دیا ہے۔ کسی کو بھی مشورہ نہ دیا کہ تم تصوف اختیار کرو، کھل کر کہہ دیا کہ 'تصوف و نجوم' انہوں نے بس یوں ہی لگا رکھا ہے۔ ورنہ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔

''بے وفائی'' کے اس برتاؤ میں ہمارا دانشور فنکار اس مقام کو پہنچ جاتا ہے جہاں فرانس کے روسو اور والٹیر جیسے انسائیکلوپیڈسٹ اپنے وقتوں میں پہنچے تھے۔ وہ صرف قافیہ پیمائی کی خاطر نہیں کہتا کہ

با من میاویز اے پدر، فرزندِ آزر را نگر

ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد [2]

یہاں پدر ہیچ کا پدر نہیں بلکہ رسوم اور سکہ بند عقائد کے پاسبان یا کوتوال ہیں جو پہلے رسمی مذاہب کی تقدیر میں لکھے تھے اب ''ازموں'' کے حصے میں آ رہے ہیں۔

کفر و دیں چیست، جز آلایشِ پندار وجود

پاک شو پاک کہ ہم کفرِ تو دینِ تو شود [3]

غالبؔ کے اس ''بے وفایانہ'' تصور اور برتاو میں کفر و دیں کے تمام مروجہ تصورات کی دیواریں دھنس گئی ہیں اور مادر پدر آزاد انسانی تفکر سر بلند ہو جاتا ہے۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال

ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

---

[1] اولتے بدلتے رنگوں کے اس منظر سے دل بستگی اختیار نہیں کرتے۔ (اہلِ نظر) اس دور کے صنم خانے میں جو کچھ دیکھتے ہیں تماشا سمجھ کر دیکھتے ہیں۔

[2] اے والد بزرگوار، مجھ سے نہ الجھئے۔ آزر (آزر) کے بیٹے (ابراہیم خلیل) پر نظر کیجئے۔ وہ جسے بصیرت نصیب ہو وہ بزرگوں اور بڑھوں کے دین سے تسلی نہیں پاتا۔

[3] کفر اور دین کی حقیقت کیا! وجود کے وہمی پندار (Fantasy) کا کوڑا کرکٹ ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اس ''آلائش'' کو دھو ڈالو، بالکل صاف کر دو تا کہ تمہارا کفر بھی دین ہو جائے۔

داغ اور منی بائی حجاب

نواب مرزا خاں داغ چاندنی چوک دہلی کے ایک معزز خاندان میں ۲۵ رمئی ۱۸۳۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو زبان قلعۂ معلی تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔ مسلمان تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے حالات کے شکار تھے۔ لیکن داغ اس انقلاب سے بے نیاز قلعہ میں پرورش پا رہے تھے جہاں ان کے لئے ساری رنگینیاں، مستیاں اور شوخیاں شباب پر تھیں شرافت، متانت اور عظمت کے آثار بچپن سے ہی نمایاں تھے۔ ان کی تعلیم نہایت قابل اور لائق اتالیق شاہی کی صحبت میں پروان چڑھی تھی۔ اردو تو ان کی مادری زبان تھی ہی، فارسی اور عربی پر بھی انہیں قدرت حاصل تھی۔ اس زمانے میں دہلی کی فضا گلہائے شعر و سخن کی خوشبو سے معطر تھی۔ قصر شاہی میں بھی بہت دھوم دھام سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ غالب اور ذوق کے علاوہ دیگر شہرۂ آفاق شعرا موجود تھے اور ان کے کلام اہل دہلی کی زبان پر مچلتے رہتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر فن شعر و سخن میں ذوق کے شاگرد تھے۔ داغ بھی سن تمیز کو پہنچ کر ذوق کے تلامذہ میں داخل ہو گئے اور استاد ہی کی بدولت قلعہ معلی کے مشاعرے میں شریک ہونے لگے تھے۔ داغ نے قلعہ معلی میں سب سے پہلے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع یہ تھا۔

نکال اب تیر سینے سے کہ جان پُر الم نکلے
جو یہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

داغ کے کلام سے بہادر شاہ ظفر بہت محظوظ ہوئے تھے اور کافی تعریف کی تھی۔ داغ شاعری کے میدان میں آگے بڑھتے گئے اور ساتھ ہی ان کے مزاج کی شوخی بھی ان کا پیچھا کرتی رہی۔ ان کے کلام میں شوخی، شرارت اور اٹکھیلیاں انگڑائیاں لیتی ہیں لیکن سلیقے سے — حسن و عشق کی شاعری میں زبان و بیان کی بھرپور چاشنی ملتی ہے۔ داغ کی شاعری دعوت فکر بھی دیتی ہے اور داغ دل کا پتہ بھی — یہ حقیقت ہے کہ داغ حسن پرست اور عاشق مزاج تھے۔ حسن پرستی و سرمستی ان کی گھٹی میں شامل تھی۔ وہ حسین صورت دیکھ کر بے قابو ہو جاتے تھے۔ لیکن فطرتاً رند بے ریا اور دل کے صاف تھے۔ نماز کے پابند تھے۔ اور روزہ بھی رکھتے تھے۔ ان کے یہاں نازک مزاجی کے ساتھ مستقل مزاجی بھی تھی۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ جاذب نظر نہ تھے۔ مگر اس کے باوجود حجاب ان کی طرف مائل تھیں۔ اور ان کی شاعری کی مداح تھیں۔ عیش پسندی اور تماش بینی داغ کا مشغلہ تھا۔ اس لئے ان کا مطمح نظر تھا کہ کسی نہ کسی خوبرو معشوق سے وہ اپنا دل بہلایا کریں۔

خلد آشیاں نواب کلب علی خاں والی رامپور کے عہد میں ''باغ بے نظیر'' کے نام سے ایک پُر فضا باغ تھا جہاں ہر سال ایک شاندار میلے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس میلے کی خصوصیت یہ تھی کہ ہندستان کے ہر خطے سے کاروباری شریک ہوتے تھے۔ خود نواب صاحب مشاہیر ہند کو میلے میں شرکت کی دعوت دیتے تھے۔ یہ میلہ اردو ادب میں 'بے نظیر' کے نام سے زندۂ جاوید ہوگیا۔ کیوں کہ اسی میلے سے فصیح الملک داغ دہلوی نے عشق کی ابتدا کی اور اپنی بے مثل مثنوی ''فریادِ داغ'' کہکر بے نظیر کے میلے کو لافانی بنا دیا۔ یہ مثنوی داغ اور حجاب کے معاشقے پر مبنی ہے جسے داغ نے صرف دو دن میں مکمل کیا تھا۔

''جلوۂ داغ'' میں سید احسن مارہروی سے داغ نے لکھوایا— ''زود گوئی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ''فریادِ داغ'' جیسی بے مثل مثنوی صرف دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے''—

— ''منی بائی حجاب کلکتہ کی ایک مشہور مغنیہ ہی نہیں بلکہ علم موسیقی کی ماہر اور تعلیم یافتہ تھی۔ قدیم اور جدید تذکروں سے ثابت ہوتا ہے کہ منی بائی شاعرہ تھی، اور حجاب تخلص کرتی تھی۔ ابتدا میں شوکت علی، پھر الفتح اور آخر میں مشہور استاد داغ سے مشورۂ سخن کیا۔ ایک چھوٹا سا دیوان بھی ترتیب دیا ہے۔ طرز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی طرح دار کو دل بھی دیا ہے۔ حجاب نہ صرف شاعرہ تھی بلکہ استادی کا مرتبہ بھی رکھتی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن نقاب اسی سے مشورۂ سخن کرتی تھی—''

(بحوالہ تذکرۂ مشاہیر نسواں، تذکرۃ النساء نادری، تذکرۂ ماہ درخشاں، تذکرۂ نشاط افزا)

یٰسین علی خاں جنھوں نے ماہ منیر عرف منی بائی حجاب کو دیکھا تھا' نے حجاب کا حلیہ یوں بیان کیا ہے:

''کوئی ۴۰۔۴۵ کا سن ہوگا۔ رنگ صاف' آنکھیں بڑی بڑی' ناک اونچی' بالوں پر خضاب چڑھا ہوا' پتلے پتلے لب' میانہ قد' اونچی پیشانی' ماتھا چپٹی چپٹی سی' تنگ اطلس کا پاجامہ مغزی لگا ہوا لانبا کرتا اور اس پر سفید اوڑھنی' پاؤں میں دہلی کی جوتی اور دونوں ہاتھوں کی پتلی پتلی انگلیوں میں انگوٹھیاں۔''

بحوالہ ماہنامہ ''نگار'' جنوری 1953ء

مثنوی 'فریادِ داغ' کے پڑھنے سے داغ کے سوزِ عشق کا پتہ چلتا ہے۔ جس میں انہوں نے سچے احساسات اور دلی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

عشق نعمت ہے آدمی کے لئے — عشق جنت ہے آدمی کے لئے
دل اسی سے جوان رہتا ہے — مرتوں کا نشان رہتا ہے
عشق کیا کیا بہار دیتا ہے — یہ دلوں کو ابھار دیتا ہے
بزدلوں کو دلیر کرتا ہے — یہ دلیروں کو شیر کرتا ہے
عشق کا درد راحت جاں ہے — عشق کا زہر آبِ حیواں ہے
عشق سے دل گداز ہوتا ہے — ناز میں بھی نیاز ہوتا ہے
عشق سے آدمیت آتی ہے — آدمی کو مروت آتی ہے
عشق سب بل نکال دیتا ہے — عشق سانچے میں ڈھال دیتا ہے
عشق ایمان ہے خدا رکھے — یہ مری جان ہے خدا رکھے

رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے۔

''مثنوی 'فریادِ داغ' میں اپنے عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور رنڈی منی بائی حجاب کے ساتھ ان کو تھا اور رامپور کا بے نظیر کا میلہ دیکھنے کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کے بہت سے اشعار اعلیٰ درجہ کے ہیں اور سادگی اور روانی و عمدگی ان کی قابل داد ہے۔ علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے مخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں''۔

تاریخ ادبیات اردو، صفحہ ۴۳۱

مثنوی 'فریادِ داغ' کے سلسلے میں علامہ سر عبدالقادر فرماتے ہیں۔

''حجاب نے ان (داغ) پر واضح کر دیا تھا کہ ان کی سیہ فامی کے باوجود ان کی شاعری کی وہ مداح اور شیدا ہے۔ چونکہ داغ نہ تو خوش رو تھے اور نہ نوجوان۔ اس لئے کوئی نازنین ان کو محبت کی نظر سے کیوں دیکھتی؟ واقعہ یہ ہے کہ حجاب ان کی ظاہری شکل و شباہت پر نہیں بلکہ ان کی شاعری، نام آوری اور دولت پر مٹی ہوگی۔ داغ اس قصے کو اس سادگی سے بیان کرتے ہیں کہ دل ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر شعر حشر جذبات اور واردات قلبی کا نچوڑ ہے —''

علامہ سر عبدالقادر، ماہنامہ شمع آگرہ بابت ۱۹۲۶ء

مارچ ۱۸۸۱ء کے بے نظیر کے میلے نے داغ کے قلب و جگر میں تلاطم برپا کر دیا۔ میلے میں ایک پری شمائل سے داغ کی نگاہیں چار ہوئیں۔ پہلی نظر میں داغ اپنا دل ہار بیٹھے۔ جذبۂ عشق نے دونوں کو کچے دھاگے میں باندھ دیا۔ حجاب کچھ دنوں تک داغ کے ساتھ رامپور میں رہیں۔ میلے کا اختتام جدائی کا پیغام لایا۔ جدائی کے خیال نے داغ کو از خود رفتہ بنا دیا۔ دونوں میں عہد و وفا کے پیمان بندھے۔ خط و کتابت کے قول و قرار ہوئے۔

آگئی ہجر کی گھڑی سر پر — یہ بلا جھیلنی پڑی سر پر
حسرت آلود وہ نگاہیں تھیں — شرر آمیز میری آہیں تھیں
رسم الفت کے ہو گئے اقرار — خط کتابت کے ہو گئے اقرار

حجاب کو بھی رامپور چھوڑنے کا غم تھا۔ داغ کی ہمت بندھاتے ہوئے حجاب نے کہا۔

جی نہیں چاہتا ہے جانے کو — پر چلے ہیں قلق اٹھانے کو
ہم تو بھوکے ہیں آدمیت کے — آدمیت کے ساتھ الفت کے
ایسے دیسوں سے جی نہیں ملتا — داغ سا آدمی نہیں ملتا
آتے جاتے ہیں سب خدائی میں — مر نہ جانا مری جدائی میں
جان سی چیز یوں نہیں کھوتے — اس قدر پھوٹ کر نہیں روتے
دل سے نزدیک ہم ہیں دور نہیں — اس قدر دور رامپور نہیں

حجاب کلکتے چلی آئیں۔ داغ آتشِ فراق میں جلنے لگے۔ دوستوں سے ان کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ بہت اصرار پر داغ نے اپنی محبوبہ کا سراپا بیان کیا۔

عشق نے تازہ روپ بدلا تھا — میں بھی میلے میں اک تماشا تھا

میلے والوں میں دھوم تھی میری	خوش جمالوں میں دھوم تھی میری
ہوش آیا تو میں نے کیا دیکھا؟	اک پری چہرہ خوش ادا دیکھا
رخ سے ظاہر تھا نور کا عالم	اور اس پر غرور کا عالم
جتی جتی بھوؤں کی وہ تحریر	کیوں نہ دل اس لکیر پر ہو فقیر؟
گردن اس کی ہے وہ صراحی دار	ہو صراحی بھی دیکھ کر سرشار
ایسے پتھر وہ دونوں قبۂ نور	شیشۂ دل ہو جن سے چکنا چور
گات بانکی بدن سڈول تمام	فتنہ قد، فتنہ چشم، فتنہ خرام
اف رے عہد شباب کی مستی	بے پیے ہے شراب کی مستی
جس طرف اٹھ گئی وہ شوخ نگاہ	شور اٹھا کہ بس خدا کی پناہ

داغ نے حجاب کے نام کئی خطوط لکھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے—

''دلدار دلنواز! کیا غضب ہے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی تمہاری نگاہیں پھر گئیں۔ وہ سب قول وقرار ایک لخت فراموش کر دیے۔ خط روانہ کیا تھا۔ وہاں کی دلچسپیوں میں اتنی محو کہ جواب دینا محال ہو گیا، میرے سینے میں دل نہیں یا دل میں تڑپ نہیں؟ کیا بے قرار ہونا مجھے نہیں آتا؟ کیا تلملانا میں نہیں جانتا؟ اس خط کا جواب جلد سے جلد نہ آیا تو بازار سے جا کر زہر لاؤں گا اور بے موت مر کر دکھا دوں گا! تم سے وعدہ لیا تھا، اور تم وعدہ کر کے گئی تھیں کہ روز نہیں تو ہفتے میں دو بار خط ضرور لکھا جائے گا، آج دس دن ہو گئے، خیر ہے نہ خبر! اور کچھ اگر نہ لکھتیں تو خیریت سے ہی اطلاع دے دیتیں۔ یہاں تو جس روز سے گئی ہو جان پر بنی ہے۔ کوئی بات اچھی نہیں لگتی۔ جب تک تمہارا خط نہ آئے دل کو کیسے چین آئے—''

۱۰۳/۵، بلا تاریخ

منقول از مسودۂ خطوط داغ

حجاب کے فراق میں داغ نیم جان ہو کر رہ گئے۔ خط کا جواب نہ پا کر مضطرب ہو جاتے۔ کلکتے کا کوئی مہمان جب رامپور وارد ہوتا تو اس وقت ان کی کیفیت عجیب ہو جاتی۔

کوئی مہماں جو میرے گھر آیا	میں نے جانا پیامبر آیا
لیں بلائیں ہزار ہا میں نے	دیں دعائیں ہزار ہا میں نے
اس کو باتوں میں کھوتا تھا میں	خط کر میں ٹٹولتا تھا میں
سنتے ہیں داستان غم کہ نہیں	یاد آتے ہیں ان کو ہم کہ نہیں

اس طرح ۳۶۵ دن داغ نے انگلیوں پر گن کر گزار دیے۔ ۱۸۸۱ء ختم ہو گیا۔ جدائی کے ایام گزر گئے۔ داغ نے حجاب کو بے نظیر کے میلے کی دعوت دی اور بڑی وقت سے رامپور بلایا۔ لہٰذا ۱۱ مارچ ۱۸۸۲ء میں حجاب دوبارہ رام پور تشریف لے گئیں۔

جا کے عہد شباب کا آنا	تھا دوبارہ حجاب کا آنا
نکہت گل ادھر پلٹ آئی	عمر رفتہ مگر پلٹ آئی
تھا یہ اس رشک حور کا آنا	چشم اعمیٰ میں نور کا آنا
میں نے پایا جو اپنے دلبر کو	آب حیواں ملا سکندر کو
پھر وہی ساعت سعید آئی	کہ برس دن کے بعد عید آئی

مگر داغ اور حجاب کا معاشقہ بعض لوگوں کی نظر میں کانٹا بن کر کھٹکنے

لگا۔ کچھ لوگ رقابت کے شکار ہوکر دراندازی پر اتر آئے۔ چہ جائے بھڑکانے کی کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ حجاب کے کان بھر دیئے گئے۔

چار دن میں یہ اتفاق کی بات — ان سے ایسی ہوئی نفاق کی بات
پیش آئی جو امتحاں میں نہ تھی — وہ پڑی شکل جو گماں میں نہ تھی
دل شکایت سے ٹوٹ جاتا ہے — جی محبت سے چھوٹ جاتا ہے
اس شکایت نے ہی قباحت کی — کہ بوجھیں رنجشیں قیامت کی
کسی جانب سے تھا ملال انہیں — کسی جانب سے انفعال انہیں

دو ہفتے تک حجاب منہ پھلائے رہیں۔ پھر داغ نے انہیں رام کرلیا۔

حجاب کا رامپور میں دو ماہ تک قیام رہا۔ اس کے بعد کلکتے چلی آئیں۔ اس طرح ماہ و سال گزرتے رہے۔ مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ داغ آتش فراق میں جلتے رہے۔ کلکتے میں بھی کچھ لوگ رقابت اور دراندازی پر اتر آئے اور حاشیہ برداروں نے حجاب کے کان بھر دیئے۔

بنئے خوبی مرے نصیبوں کی — کہ بن آئی وہاں رقیبوں کی
اپنے بیگانے گھیرتے ہیں اسے — میرے رستے سے پھیرتے ہیں اسے
ہوئے دس بیں رخنہ گر پیدا — کئے سو فتنے لاکھ شر پیدا
دیکھیں کیسے ہیں چاہنے والے — رسم الفت نباہنے والے
کتنے پانی میں ہیں ذرا دیکھو — وہ نہ آئیں گے تم بلا دیکھو
چاہتے ہیں تو اڑ کے آئیں گے — ورنہ ہر طرح ہچکچائیں گے

حجاب نے داغ کو کلکتہ آنے کی دعوت دی۔ وہ اس سنہرے موقع کو کب چھوڑنے والے تھے، فوراً سفر پر آمادہ ہوگئے رامپور سے دہلی، لکھنؤ اور عظیم آباد ہوتے ہوئے جون ۱۸۸۳ء میں داغ کلکتہ پہنچے۔ اور ناخدا مسجد کے روبرو کرائے کے مکان میں ٹھہرے گرچہ داغ کے اس سفر کا سلسلہ عاشقی سے ملتا ہے لیکن اہل کلکتہ نے داغ کی خوب پذیرائی کی۔ اور حجاب کی رفاقت نے شب و روز کو دو آتشہ بنا دیا۔ تین ماہ کے بعد بادل نخواستہ داغ کلکتہ سے رامپور چلے آئے پھر وہی اگلی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

کسی کروٹ سے کل نہیں آتی — نہیں آتی اجل نہیں آتی
جی بہلتا نہیں کسی صورت — دم نکلتا نہیں کسی صورت
چشم نمناک ہے تو دل غمناک — سینہ صد پارہ و جگر صد چاک
ضعف سے قلب تھرتھراتا ہے — درد بھی اٹھ کے بیٹھ جاتا ہے
چبھتی ہے کوئی شئے کلیجے میں — ہوک سی اٹھتی ہے کلیجے میں
دل کی حالت بری ہے سینے میں — سانس چلتی چھری ہے سینے میں
دل سے پہروں کلام کرتا ہوں — زندگی کو سلام کرتا ہوں

۲۳ / مارچ ۱۸۸۷ء کو خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کا انتقال ہوگیا۔ ان کی ذات سے رامپور کی انجمن روشن تھی۔ وہاں کے زندہ دلان اور شرفاء نے ایک ایک کرکے داعی اجل کو لبیک کہا۔ داغ کو گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اس لئے ۲۸ / دسمبر ۱۸۸۷ء میں رامپور کو خیرباد کہہ دیا۔ اس طرح حیدرآباد سے دہلی اور دہلی سے ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد آکر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کے ہاتھوں داغ ایسے پریشان ہوئے کہ

حجاب کو وقتی طور پر بھول گئے۔ لیکن اندر ہی اندر حجاب کا عشق گیلی لکڑی کی طرح سلگتا رہا۔

۱۸۹۹ء میں حضور نظام نے ذاتی سلسلے میں کلکتے کا سفر کیا۔ چونکہ وہ داغ کو بہت چاہتے تھے۔ اس لئے داغ بھی شریک سفر ہو گئے۔ داغ نے کلکتے میں حجاب کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ حجاب نے کسی مولوی سے نکاح کر لیا ہے اور بالکل صوم وصلوٰۃ کی پابند ہو گئی ہے۔ داغ حجاب سے ملنے میں ناکام رہے۔ حجاب کے قریبی حاشیہ نشینوں میں ایک صاحب قاضی عبدالحمید تھے۔ انہوں نے داغ کی اضطرابی کیفیت اور وارفتگی دیکھی تو حجاب کو مجبور کیا کہ موجودہ شوہر سے طلاق لے کر داغ سے عقد کرے۔ اس سلسلے میں داغ نے قاضی عبدالحمید کو کئی خطوط لکھے۔ چنانچہ داغ لکھتے ہیں۔

"معدن لطف وکرم جناب قاضی صاحب! السلام علیکم۔ آپ کا تحریر فرمانا کہ حجاب آنا چاہتی ہیں لیکن دوسرے مانع ہیں دل کو نہیں لگتی۔ بھلا کوئی دل سے چاہے اور پھر بھی موانعات حائل ہوں سمجھ میں نہیں آتا۔ انہیں شاید کچھ تردد اور تکلف ہے۔ مجھے ذرا تفصیل سے لکھئے کہ ان کا مدعا کیا ہے۔ میری جو حالت ہے آپ پر ظاہر ہے۔ سب بتا چکا ہوں۔ نہ میں وہ رہا اور نہ اب وہ پہلے جیسی رہیں۔ ایک قدیم خلش ہے جو بے چین بنائے ہوئے ہے وہ چلی آئیں تو وقت خوش گزرے گا۔ ان سے کہہ دیجئے کہ گو میں بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن ان کی لگن ویسی ہی تروتازہ ہے۔ میں انہیں امکان بھر ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ مجھے یقین ہو جائے کہ وہ خود بھی دل سے میرے پاس آنا چاہتی ہیں۔ ہر رکاوٹ دور ہو سکتی بعد قرب ہو سکتا ہے اگر وہ چاہیں"۔

(مسودۂ خطوط داغ)

قاضی عبدالحمید کے نام ایک دوسرے خط میں داغ رقمطراز ہیں۔

—"آپ نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ کوئی بات ہی تو ہے جو داغ اس عمر میں ان کے لئے گھلا جاتا ہے۔ جس وقت گزرا ہوا زمانہ تصور میں جمتا ہے قیامت گزر جاتی ہے۔ قاضی صاحب! شاید آپ اس کیفیت کو محسوس نہ کریں جو عاشق مزاج ازلی ہو جو حسن وجمال کو دیکھ کر جیتا ہو اس سے یہ نہ پوچھئے کہ حجاب کے لئے کتنا اشتیاق اپنے دل میں رکھتا ہے۔ میں چشم براہ ہوں۔ جلد یہ لکھ کر خوش کیجئے کہ وہ اب آیا چاہتی ہیں، آخر یہ دیر کیا ہے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ بیک بینی ودوگوش چلدیں۔ بہرحال اور ہر رنگ میں ان کا منتظر ہوں"۔

(مسودۂ خطوط داغ)

اسی کے ساتھ داغ نے حجاب کو بھی ایک خط لکھا — "ہائی جی! غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو پاس ہوتیں تو سیر ہوتی۔ تمہارے گرد گھومتا اور شعلۂ جوالہ بن جاتا۔ کبھی تمہیں شمع قرار دیتا اور پتنگا بن کر قربان ہو جاتا۔ کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے ہو جاتا۔ خدا کے واسطے یا جلد آؤ یا تاریخ آمد مقرر کر کے اطلاع دو۔ میں تمہارے لئے بلبلا رہا ہوں۔ یہ خوفناک کالی کالی راتیں اور تنہائی، کیا کہوں کیوں کر تڑپ کر صبح کی صورت دیکھتا ہوں یقین جانو ایسے تڑپتا ہوں جیسے بلبل قفس میں — میرے دونوں خطوط کے جواب آنا ضرور ہیں —"

(مسودۂ خطوط داغ)

ساڑھے ۱۹ سال کے عرصہ میں داغ اور حجاب کی ملاقات تین بار ہوئی۔ حجاب نے داغ کو ایک خط میں لکھا۔۔۔ ''منہیات سے تائب ہوگئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ کسی کے عقد میں آکر پردہ نشیں ہو جاؤں۔۔۔''

(اقتباس از روزنامچۂ داغ، بلا تاریخ)

ایک دوسرے خط میں حجاب رقمطراز ہیں۔۔۔ ''جب تک نکاح نہیں کرلوں گی تمہارے سامنے نہ آؤں گی۔ میں نے یہ تمام جھگڑے اس لئے نہیں کئے ہیں کہ شرعی باتوں سے قطع نظر کرلوں۔ تم اس بھروسہ میں نہ رہنا کہ میں تمہارے سامنے آجاؤں۔ میرے لئے علیحدہ مکان لینا اسی میں اتروں گی اور جب تک قاضی نکاح نہیں پڑھائیں گے اس وقت تک تم میری صورت دیکھنے کے مجاز نہ ہوگے۔۔۔''

(اقتباس از روزنامچۂ داغ ۸ر جنوری ۱۹۰۲ء)

حجاب سن رسیدہ ہوگئیں تو داغ سے ملنے حیدرآباد آئیں اس وقت داغ کی عمر تقریباً ستر برس ہوچکی تھی۔

۔۔۔ ''خدا خدا کر کے ۱۸ر یا ۱۹ر جنوری ۱۹۰۲ء کو حجاب حیدرآباد پہنچیں۔ ۳ر جولائی ۱۸۸۲ء کو داغ نے حجاب کو کلکتہ میں اس کے گھر پر خدا حافظ کہا تھا اور اب ساڑھے ۱۹ سالہ طویل عاشقی لوگوں کو عشق صادق کا یقین دلاتی ہے مگر یہ صرف وضع داری اور دل لگی تھی۔ اس جذبۂ تفریح کو محبت سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ دونوں طرف ایک ہی جذبہ کارفرما تھا۔ داغ اپنی دولت، ثروت اور عزت و امارت کے نقش حجاب کے دل پر بیٹھانا چاہتے تھے اور حجاب داغ کی دولت بٹورنا چاہتی تھی۔۔۔''

(اقتباس از مقدمہ مثنوی فریادِ داغ۔ از تمکین کاظمی)

حجاب حیدرآباد آئیں تو ضرور لیکن برقعہ اوڑھے ہوئے۔ داغ سے بھی پردہ کرنے لگیں۔ داغ ششدر رہ گئے۔ حجاب کو داغ نے شہر کے ایک مکان میں ٹھہرا دیا۔ اور سارا خرچ اپنے سر لے لیا۔ آخری عمر میں حجاب صوم و صلوٰۃ کی پابندی ہوگئی تھیں۔ انکا بیشتر وقت وظیفے میں گزرتا۔ ایک طوائف کی دنیا ہی بدل گئی۔ داغ کے ایک بے تکلف دوست نے ازراہِ مذاق پوچھا کہ کیوں صاحب! آپ کا سن یہ ہے کہ منہ میں بتیسی لگی ہوئی ہے، داڑھی اور سر کے بال خضاب و مہندی سے سیاہ و سرخ کئے جاتے ہیں۔ آخر کس برتے پر آپ حجاب سے نکاح کرنے مائل ہیں؟ داغ نے برجستہ کہا۔۔۔ ''اس عمر میں مجھے بیوی سے زیادہ ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلی بیوی بیوی ہوتی ہے دوسری بیوی رفیق ہوتی ہے اور تیسری بیوی درحقیقت جان کا جنجال۔۔۔''

داغ حجاب سے عقد کے لئے بالکل تیار تھے۔ لیکن بیٹی، داماد اور ان کے قریبی دوستوں نے ہر طرح سمجھایا کہ حجاب نے آپ پر احتساب قائم کر دیا ہے اور عقد کے بعد تو بری طرح حاوی ہو جائے گی۔ داغ جہاں دیدہ انسان تھے۔ حالات کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ گئے۔ لہٰذا عقد سے پہلو تہی کرتے رہے۔ اس پر حجاب برافروختہ ہوگئیں۔ اور دونوں کے درمیان تلخی کی بنیاد پڑ گئی۔ حجاب یہ سوچ کر حیدرآباد آئی تھیں کہ شاہ دکن کی جانب سے داغ کو بھاری رقم ماہوار ملتی ہے۔ اس پر وہ قابض ہو جائیں گی۔ لیکن وہ اپنے

مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ داغؔ کی مالی حالت پہلی جیسی نہیں تھی۔ اس لئے احتیاط سے خرچ کرنے لگے۔ یہ بات حجابؔ کو ناگوار گزری۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ داغؔ ہر ماہ حجابؔ کو خرچ کے لئے مقررہ رقم دیتے تھے۔ لیکن حجابؔ کے دس پندرہ متعلقین کلکتے سے وارد ہو گئے۔ جس سے خرچ میں مزید اضافہ ہوتا گیا جو داغؔ کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ حجابؔ پریشان رہنے لگیں۔ دونوں کے درمیان حد فاصل کھنچتی گئی۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ دونوں ایک دوسرے سے متنفر ہو گئے۔ حجابؔ کلکتہ واپس ہو گئیں اور داغؔ کا معاشقہ اسی ٹریجڈی پر ختم ہو گیا۔ مثنوی فریاد داغ ان اشعار پر ختم ہوتی ہے۔

ہائے جیتے ہیں ہم نہ مرتے ہیں   کس قیامت کے دن گزرتے ہیں
خانۂ عیش لٹ گیا کیسا   مجھ سے معشوق چھٹ گیا کیسا
رات دن جی رہے ہیں مر کر ہم   صحبت یار ہو گئی برہم
یا الٰہی نجات غم سے ملے   وہ سراپا حجابؔ ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے   اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

حجابؔ چلی گئیں لیکن داغؔ کے دل میں ایک چبھن سی رہ گئی جو ہر وقت کانٹا بن کر کھٹکتی رہتی تھی۔ تماش بینی حزن و ملال میں بدل گئی۔ معمولات زندگی میں کافی فرق آ گیا۔ شب و روز بے کیفی سے گزرتے رہے۔ ستمبر ۱۹۰۴ء سے مستقل بیمار ہو گئے اور پانچ چھ ماہ مسلسل بیمار رہ کر ۱۵ر فروری ۱۹۰۵ء کو ابدی نیند سو گئے۔ ۱۵ فروری کو تاریخی مکہ مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور درگاہ یوسفین میں ان کی اہلیہ کی قبر کے پہلو میں انہیں دفنایا گیا۔

مستزاد از مدیر انشاء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مضمون ''داغ کی حیات معاشقہ'' میں اس پہلو کو زیادہ واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''بظاہر داغؔ کا یہ زخم محبت ناسور بن گیا تھا۔ اس لئے کہ داغؔ نے ''فریاد داغ'' لکھنے کے بعد بھی حجابؔ سے تعلقات قائم رکھے اور پورے بیس سال بعد ۱۹۰۲ء میں حجابؔ پھر داغ کے پاس حیدر آباد پہنچ گئیں لیکن اب معاشقے کی صورت وہ نہ تھی دونوں میاں بیوی بننے پر رضامند بھی ہو گئے تھے۔ داغؔ آخر دم تک پیمان وفا نبھانے کی کوشش بھی کرتے رہے لیکن یہ سب وضعداری کی باتیں تھیں۔ جسے لگاؤ کہتے ہیں نہ وہ پہلے تھا اور نہ بیس سال بعد پیدا ہو سکا جو باہمی جھجک رد و کد۔ شکر رنجی اور فاصلہ شروع میں تھا وہ آخر تک باقی رہا۔ گویا اس معاشقے میں لگاؤ کم اور لاگ زیادہ تھی اس لئے دونوں ایک دوسرے سے برابر دھوکے کھاتے رہے۔ نہ داغؔ کبھی حجابؔ سے مطمئن رہے اور نہ حجابؔ داغؔ سے کبھی دل کھول کر ملیں ظاہر ہے ایسے موقعوں پر محبت نہیں ہوتی صرف محبت کا شوق ہوتا ہے اور شوق بھی وہ جو فرزانگی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ خود داغؔ کو اس کا پورا احساس تھا چنانچہ انہوں نے ۷ار جون ۱۹۰۲ء کے روزنامچہ میں خود لکھوایا کہ ''مرزا صاحب اب عمر ایسی نہیں کہ وہ عاشقانہ غمزوں اور نخروں کے متحمل ہو سکیں۔ یہ سب جوانی دیوانی کے کرشمے ہوتے ہیں'' سر عبدالقادر کا یہ خیال بہت درست ہے کہ ''داغؔ اپنی حسن پرستی

اور نغمہ دوستی کی وجہ سے اس کے گرویدہ ہو گئے۔ ان دنوں داغ کی عمر پچاس سال سے زائد ہو چکی تھی۔ جنسی اعتبار سے یہ عمر عشق و عاشقی کی نہ تھی اور پھر اعصابی امراض میں مبتلا بھی تھے۔ ان وجوہ سے ان کی عاشقی کسی جنسی یا نفسیاتی خواہش کی بنا پر نہ تھی بلکہ حسن و نغمہ اس کا محرک تھا۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ داغ کو حجاب سے عشق نہیں بلکہ بعض اوصاف کی بنا پر وہ ان کے پسند خاطر ہو گئی تھیں۔ خود فریاد داغ کے مرتب کا بھی یہی خیال ہے۔ لکھتے ہیں ''لوگ یہ نہ سمجھیں کہ داغ واقعی حجاب کے عشق میں مبتلا تھے۔ اس کو بلانے کے لئے بے چین تھے۔ یہ صرف دل لگی تھی ورنہ انہیں فقط خوش گزارنی مقصود تھی''

حجاب کو یہ خط لکھوائے چار روز بھی نہ گزرے تھے کہ نوح ناروی الہ آباد سے آئے اور آتے آتے ایک خوبصورت طوائف کی تصویر لائے جو داغ کی نذر کی۔ اسے دیکھتے ہی داغ بے چین ہو گئے چنانچہ داغ نے ایک خط کے ذریعہ پیغام محبت بھجوایا۔ اس سے پہلے عین اس وقت جبکہ دل و دماغ پر حجاب بڑی حد تک چھائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مشہور طوائف ملکہ جان اور اس کی بیٹی گوہر جان پر ڈورے ڈالنے شروع کئے تھے۔ مگر یہ عمر کامیابی کی نہ تھی۔ ناکام رہے۔

''یوں سمجھ لیجئے کہ داغ کا معاشقہ بے وقت کی شہنائی تھی — ہیرو اور ہیروئن دونوں میں سے کوئی بھی اس لائق نہ تھا کہ جو صحیح معنوں میں داد عاشقی دے سکتا۔ داغ نے تو خیر حجاب سے جو وعدۂ محبت کیا تھا حسب مقدور اسے نبھاتے رہے اور وضعداری میں فرق نہ آنے دیا لیکن محبوبہ کے کردار میں بھی کوئی کشش نہیں ہے۔ حجاب کلکتہ کے بازار کولوٹولہ میں ڈیرہ دار طوائف تھیں یہ منی بائی عرف جھلی کے نام سے مشہور تھیں۔ موسیقی میں کمال رکھتی تھیں اور علوم مروجہ سے واقف ہونے کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتی تھیں۔ چڑھتے سورج کی پوجا ان کا شیوہ تھا۔ آج اس پاس کل اس کے ساتھ۔ جان چھڑکنے والوں کی کمی نہ تھی۔ بڑے بڑے راجہ نواب اور نوجوان طرحدار اس پر جان دیتے تھے۔ اسے کونسی ایسی ضرورت تھی کہ وہ باون سالہ بوڑھے داغ پر اپنی متاع حیات نثار کر دیتی اور زندگی کے عیش و نشاط سے ہاتھ دھوتی۔ داغ سے اس نے کہنے کو کہدیا کہ۔

ہم تو بھوکے ہیں آدمیت کے   آدمیت کے ساتھ الفت کے
ایسے دیسوں میں جی نہیں لگتا   داغ سا آدمی نہیں ملتا

لیکن عملی طور پر معاشقے میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ داغ سے چار دن بھی نہ نبھ سکی۔

چار دن میں یہ اتفاق کی بات   ان سے ایسی ہوئی نفاق کی بات
پیش آئی جو امتحان میں تھی   وہ بڑی شکل جو گمان میں تھی

حجاب خود کو داغ کا دلدادہ و گرویدہ بھی ظاہر کرتی تھیں لیکن ان کی بے روح محبت کا یہ عالم تھا کہ داغ کے دل جلانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ جب تک داغ نے خوشامد کو شعار نہیں بنایا اور حجاب پر دوسروں سے دباؤ نہیں ڈلوایا، وہ خود کبھی داغ کے پاس نہیں آئیں۔ اور آئیں بھی تو داغ کے قابو میں نہیں رہیں۔ ضد اور نخرہ ان کے مزاج میں تھا اور داغ کا لحاظ

خیال کئے بغیر جوان کے دل میں آتی کرتی رہیں۔ ضد کا یہ عالم تھا کہ۔

منہ سے جس بات پر نہیں نکلی دل سے پھر عمر بھر نہیں نکلی

اور ناز و غرور کی یہ کیفیت تھی کہ داغ سے صاف کہہ دیتی تھیں۔

ہم جو آئے یہ دل ہمارا تھا ورنہ کیا آپ کا اجارہ تھا

حجاب کا کردار دراصل ایک تجربہ کار اور عیار طوائف کا کردار ہے وہ ہوسناکی وعیش کوشی کے سوا محبت کے کسی جذبے سے آشنا نہیں ہے وہ بظاہر ہر ایک پر جان نثار کرنے کو آمادہ ہے حقیقتاً اسے کسی سے لگاؤ نہیں ہے پیرانہ سالی میں بھی ان کے تکلف کی کیفیت تھی کہ داغ کے اصرار کے باوجود ان کے ساتھ تصویر کھچانے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئیں۔ ادھر داغ سے بات ہو رہی ہے۔ پیمان محبت کی تجدید کی جا رہی ہے۔ ادھر دوسروں سے ملنے جلنے کا سلسلہ بھی جاری ہے چنانچہ اس تعلق کے زمانے میں بھی حجاب کئی کے ساتھ پابند ہو کر رہیں۔ اس کے بعد حسے نامی کسی شخص سے نکاح بھی کر لیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ بیچ میں داغ کی حالت سنبھل گئی ہے۔ وہ شاہ دکن کے استاد ہیں۔ اور ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ روزانہ نذرانے ان سے گزرتے ہیں تو آخری عمر میں وہ پھر داغ کی طرف مائل ہوئیں۔ ظاہر ہے اس میں فرزانگی کے سوا دیوانگی کا کوئی پہلو نہ تھا۔ یہ خیال کرنا کہ حجاب کو داغ سے محبت تھی، درست نہیں، داغ کو تو خیر وضعداری کا پاس تھا وہ تو اپنے عجز بس کو کسی طرح نکالے رہے۔ لیکن حجاب ڈیرہ دار طوائف تھیں۔ اس وضع کی پابند نہیں رہ سکیں۔ آ ئے

۱؎ فریادِ داغ ص-۱۲

۲؎ تذکرۃ الخواتین مرتبہ عبدالباری آسی

دن تو تو میں میں ہوتی رہتی اور دوسروں کو صلح کے لئے مداخلت کرنی پڑتی۔ ظاہر ہے یہ معاشقہ نہ تھا ایک تفریحی مشغلہ تھا جو آخر آخر داغ کے لئے دردِ سر بن گیا"۔

نگار، پاکستان، مئی ۱۹۶۵ء، ص-۱۴-۱۵

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

۱۵۔ نور کیا ہے اگر سلویا کو دیکھا نہ جا سکے۔ مسرت کیا ہے اگر سلویا پاس نہ ہو؟۔

The Two Gentlemen of Verona - Act 3, Scene 1

۱۶۔ محبت اندھی ہوتی ہے اور پیار کرنے والے دیکھ نہیں سکتے۔ خوشنما غلطیاں اپنے آپ ہو جاتی ہیں۔

The Merchant of Venice - Act 2, Scene 6

۱۷۔ کیوپڈ ایک بے ایمان چھوکرا ہے عورتوں کو پاگل بنا دینے والا۔

A Midsummer Night's Dream Act 3, Scene 3

۱۸۔ جیسا بھی غم ہو آئے۔ وہ مسرت کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک مختصر لمحے اس کی نگاہ میں لے جاتا ہے۔

Romeo & Julliet - Act 2, Scene 6

شبلی کی حیاتِ مُعاشقہ

نوٹ: علامہ شبلی کی حیات معاشقہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ وحید قریشی کا یہ طویل مقالہ اپنے زمانے میں بڑا ہنگامہ خیز مانا گیا۔ اس پر کافی بحثیں ہوئیں جن کا مصنف نے جواب بھی دیا۔ یہ مقالہ مکتبہ جدید، لاہور نے ۱۹۵۰ء میں کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ یہاں ہم نے اختصار کی خاطر اس کے بعض حصے حذف کر دئے ہیں۔ (ف۔س۔اعجاز)

ابتدائیہ

یہ مقالہ اب سے چار سال اُدھر ''حلقہ اربابِ ذوق'' میں پڑھا گیا تھا۔ اس کے بعد اسی سال ''کتاب'' اور پھر ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا۔ اب اسے ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کی اشاعت سے میرا مقصد بعض نے یہ فرض کر لیا اور اسی پیش خیالی کے ساتھ انہوں نے اس مضمون کا جائزہ لیا اور گمنام خطوط اور دھمکیوں سے اس بات کا اعلان کیا کہ میں علامہ شبلی کی عظمت کو کم کرنے کے درپے ہوں میں ان بزرگوں کے خطوط کا کوئی جواب نہیں دونگا۔ جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء سے پہلے کی یہ پود جن کے فتوے مجھ تک پہونچے اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی مجبور ہے کیوں کہ مشرق و مغرب کے تمدن کی آویزش میں جس چیز کا پلہ بھاری رہا وہ اخلاقی قدروں کی ظاہری پابندیوں سے ایک ان کہی اور ان بوجھی محبت تھی جس میں عقل سے زیادہ جذبات کو دخل ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ جھنجلاہٹ میں حق بجانب ہیں۔ اب یہ حضرات زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں اگر کسی اصلاح کی ضرورت ہو بھی تو اسے تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اس گروپ میں کچھ ادھیڑ عمر کے لوگ بھی شامل ہیں۔ یہ پچھلے گروہ کا منطقی نتیجہ تھے۔ اتفاق سے ان کی سوجھ بوجھ نے دلائل کا سہارا بھی لینا شروع کر دیا ہے۔

لہٰذا ان کے اقتباسات کا مضمون کے آخر میں جواب دینا مناسب سمجھا گیا ہے

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے شبلی کی حیات معاشقہ سے بڑے خلوص اور ہمدردی کا اظہار کیا اور میرے بیانات کی تائید کی لیکن ان کی تائید، تائید سے آگے نہ جا سکی۔ یہی اس مضمون کا افسوسناک پہلو ہے جس نے آج مجھے یہ دوبارہ شائع کرنے پر مجبور کیا ہے۔

میں علامہ شبلی کی عظمت کا معترف ہوں۔ اگر آپ مجھے زیادہ مجبور کریں گے تو میں انھیں Genius بھی کہہ دوں گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس

لفظ میں کسی تنقیدی رجحان کا مطلق کوئی پتہ نہیں چلتا۔ میں ان کی تاریخ دانی کا بھی قائل ہوں۔ میں انھیں ایک واجب الاحترام نقاد بھی تسلیم کرتا ہوں۔ عین ممکن ہے آپ کو مجھ سے ان کی ان خوبیوں کے سلسلے میں اختلاف ہو۔ وہ اچھے شاعر بھی تھے اور یہی میرے مضمون کا نقطۂ آغاز ہے۔

ان کی شاعری پر تبصرے کے دو انداز میرے سامنے تھے۔ ایک تو یہ کہ میں سلاست روانی، جوش بیان کے چوکھٹے لگا کر اس بے روح تنقید کا مظاہرہ کرتا جسے حالی اور شبلی کے فوراً بعد آنے والے تاریخ ادب کے مصنفوں نے پیش کیا اور اپنے احترام کی خاطر اسے قابل فخر بھی سمجھا۔ اس طریق تنقید میں جدت عموماً یہ ہوتی تھی کہ غالب کو گوئٹے، نظیر اکبرآبادی کو شیکسپیئر اور حالی کو شیخ سعدی سے ٹکرا دیا جاتا تھا جس سے لکھنے والے اپنے ضمیر کی ملامت سے تو بچ جاتے تھے لیکن تنقید کا میدان ۱۹۴۰ء تک چٹیل رہ گیا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی روشنی میں ان کی شاعری کا رنگ دکھاتا۔ اسی انداز کو میں نے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ مویدین شبلی کے کردار میں تضاد تو دیکھنے لگ گئے اور لذت کے پہلوؤں پہ ان کی نگاہیں تو جم گئیں لیکن شبلی کی شاعری جسے بجا طور پر اس مضمون کے بعد موضوع گفتگو ہونا چاہئے تھا۔ پس پشت ڈال دی گئی۔

اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ تطاول خم زلف دراز کی بات حرم سرا کی دیواروں تک پہونچ گئی اور خود محترمہ فیضی کو میدان میں اترنا پڑا۔ بہر حال "ادیبوں کے اس مشغلے" کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ عطیہ بیگم کے رد عمل کا ہمیں علم ہو گیا اور ہم اپنے موضوع کے تمام گوشوں کو بے نقاب دیکھ رہے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ عطیہ صاحبہ نے اپنے نام علامہ اقبال کے خطوط بھی پبلک کے حوالے کر دیئے اور اپنی ذاتی ڈائری شیخ اکرام کے ہاتھ میں دے دی۔ اس عمر میں ادب کی یہ خدمت گذاری بڑے دل گردے کا کام ہے۔

اس بحث میں عطیہ بیگم کے علاوہ شیخ اکرام (شبلی نامہ) عبد الرزاق (یاد ایام) خالد حسن قادری (رسالہ نگار) نیاز فتحپوری (رسالہ نگار) امین زبیری (شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق) قاضی عبد الغفار (اخبار پیام) عبد الماجد دریا آبادی (اخبار اصلاح) مولوی احمد مکی (رسالہ ہماری کتابیں) اور بمبئی کے بعض ہفتہ وار اخباروں نے حصہ لیا۔ میں ان سب کا ممنون ہوں۔ اور اس مضمون کی ترمیم میں ان کی نگارشات سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ شیخ اکرام صاحب کا میں خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میری دو ایک تاریخی غلطیوں کی اصلاح فرمائی۔

مولانا صلاح الدین صاحب کا بھی شکر گذار ہوں جو محترمہ عطیہ بیگم سے ایک ایسا مضمون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے بغیر یہ موضوع یقیناً تشنہ رہ جاتا۔ قیوم نظر بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ اس مضمون کی اولین اشاعت میں انھوں نے نہ صرف میری زبان بلکہ شرر اور مہدی حسن کے بعض اقتباسات کی زبان بھی درست فرمائی۔ یہ میری جہالت ہے کہ میں ان اقتباسات کو دوبارہ ان کی اصلی حالت میں شائع کر رہا ہوں۔

وحید قریشی۔ یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔ ۱۲۔ جنوری ۱۹۴۹ء

حالاتِ زندگی

شبلی کے عشق کو ہم اتفاقی حادثہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کے حالات پیدا ہو گئے تھے جو اس امر کے متقاضی تھے کہ شبلی کو ایک فرار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انسانی مزاج کے بنانے اور ڈھالنے میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شبلی کی شخصیت کن ادوار سے گذری۔ انھوں نے ہر دور سے کیا اثر قبول کیا اور بمبئی پہنچ پہنچ ان کی طبیعت نے کون سا رنگ اختیار کیا۔ اسی لئے ہمیں ان کی تمام گذشتہ زندگی کو دیکھنا ہوگا۔

علامہ شبلی اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ گھر میں ان کی یہ پوزیشن ان کے طرزِ حیات کی طرف کھلا اشارہ کرتی ہے۔ لیکن ان کی نشوونما ایک سیدھے خط میں نہ ہو گی۔ اس لئے ان کے Character Trait میں ہمیں ظفر مندی کے وہ آثار نہیں ملتے جو انہیں امن و اصلاح کا محافظ بنا سکتے۔ ان کی زندگی ایک مستقل جدوجہد رہی جس میں فتحیں کم اور شکستیں زیادہ تھیں۔ اپنی شکستوں کا شمار وہ ابتدائے حیات سے کرتے رہے ہیں۔ اس لئے اگر ان کی نرگسیت کو نیز حافظ تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے ان کے تعلقات شروع ہی سے کچھ اچھے نہیں رہے۔ اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ نفرت زیادہ نمایاں ہوتی گئی۔

ان کی تعلیم مشرقی طرز پر ہوئی۔ اس کے بعد باپ کی توجہ انگریزی کی طرف ہوگئی اور ان کے چھوٹے بھائیوں کی تربیت کا طرز انگریزی ہوا۔ اس میں انھیں اپنے بھائی میں عظمت کے وہ آثار نظر آنے لگے جن میں علامہ کو اپنی شکست نظر آئی تھی۔ مہدی کے ولایت جانے نے تو ان کے ''غم و غصے کو اور گہرا کر دیا تھا''۔ ۱۸۷۰ء میں مہدی نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور شبلی اس میں بھی فیل ہو گئے۔

واقعات کی ان کڑیوں سے نرگسیت کی اس اعصاب زدہ ہیئت کی بنیاد پڑ گئی جو بعد میں طرح طرح سے ظاہر ہوئی۔ وہ شدید احساسات کے انسان ہو گئے ''جس چیز کے حق میں ہوتے اسے آسمان پر پہونچا دیتے اور جس کی مخالفت شروع کرتے بعض اوقات اعتدال اور انصاف سے آنکھیں بند کر لیتے۔''

اس ابتدائی زندگی میں ہمیں ان کے کردار کا ایک اور خط واضح طور پر نظر آتا ہے۔ وہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ان کے والد نے دوسری شادی کر لی تھی جس سے وہ اپنی ماں کے طرفدار ہو گئے تھے اور بعض اوقات تو انہیں اپنے والد کے خلاف کلمے بھی کہنے پڑے۔ ایک عرصے تک (باپ کی وفات تک) باپ بیٹے کے تعلقات کشیدہ رہے۔ ''انھیں اپنی ماں سے محبت تھی''۔ ان کی والدہ کی موت سوتیلی ماں کی آمد کے غم ہی سے ہوئی۔ اس لئے شبلی نے تمام عمر سوتیلی ماں سے بات نہ کی اور باپ سے نفرت کرتے رہے۔

ماں کی محبت ان کے کردار کا ایک خاص پہلو ہے۔ باپ کی مخالفت اور بھائی کی مخالفت' انہیں دو انتہاؤں میں علامہ شبلی تمام عمر بھٹکتے رہے۔ تاہم ان کے لئے سب سے اہم خود ان کی ذات ہوگئی۔ شبلی کی نرگسیت اپنے اندر

انتہا پسندی اور کٹر روخوم کے آثار لئے ہوئے ہے۔ اور اس مرکز سے ان کی ان کی زندگی کا ہر گوشہ صاف دکھائی دیتا ہے۔

''مولانا نے جن درس گاہوں میں تعلیم پائی اور جن اساتذہ سے پڑھا ان کی صحبت نے ابتدا ہی میں انہیں سخت حنفی بنا دیا تھا۔ اسی شوق میں انھوں نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی کا لفظ لکھنا شروع کر لیا جس کی وجہ سے بعض ناواقف لوگوں نے انہیں اپنی غلط فہمی کی بنا پر نسبا نعمانی یعنی امام اعظم ابو حنیفہ کوفی کی نسل میں خیال کر لیا مگر اس کی کوئی اصلیت اور حقیقت نہیں ہے۔ وہ متشدد حنفی تھے۔ اور حنفیت میں اپنے آپ کو اوروں سے ممتاز ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس جوش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ امام صاحب کی سوانح عمری انھوں نے سیرۃ النعمان لکھی اور علی العموم گروہ محدثین کے اصول سے اختلاف کیا کرتے''۔

اس وقت تک مولانا نے جس فضا میں پرورش پائی تھی اس کا اقتضا یہ بھی تھا کہ مقلدی اور غیر مقلدی کی معرکہ آرائی میں مولانا بھی تیر و آزمائی کریں۔ مولانا خود حنفی تھے اور مولانا فاروق چریا کوٹی اور مولوی احمد علی کی شاگردی نے جوشیلا حنفی بنا دیا تھا۔

چنانچہ غیر مقلدی کی تقلید میں مولانا نے خوب زور قابلیت صرف کیا۔ وہابیت کی تردید میں کئی رسالے اردو، فارسی اور عربی میں لکھے۔'' اس زمانے میں مولانا لڑکوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے وہ اس وقت تند مزاج مولوی کے مکمل نمونے تھے۔ تارکین صلوٰۃ پر انتہائی تشدد کرتے۔ بعض لڑکوں کو دو دو گھنٹے تک اس لئے پیٹا کرتے کہ نماز پڑھنے کا مستحکم وعدہ کریں۔''

ان آخر کے جملوں کو ذرا ذہن میں رکھئے کیونکہ اپنی شخصیت منوانے کا یہ جذبہ جو اس کی تہ میں کام کر رہا ہے آگے چل کر مولانا کی زندگی مختلف شکلوں میں نمایاں ہوگا۔

اس کے بعد مولانا نے اپنے گاؤں میں زمینداری شروع کی۔ لیکن یہ درد سر کہاں اور مولانا کی مولویت کہاں؟ چھوڑتے ہی بنی۔ پھر مولانا وکیل ہوئے۔ لیکن یہ پیشہ اور اس کی چالیں مولانا کو مناسب نظر نہ آئیں اور محکمۂ امانت میں ملازم ہو گئے۔'' یہ زمانہ رمضان کا تھا لیکن مولانا دیانتدار اور فرض شناس آدمی تھے اس لئے شدید گرمی میں گھوڑے پر سوار گاؤں گاؤں پھرا کرتے۔ روزہ منہ میں ہوتا تھا مگر فرض مستعدی سے ادا کرتے تھے۔''

ایک مہینہ جوں توں کر کے بسر ہوا اور آخر مولانا نے نوکری چھوڑ مصلے میں پناہ لی۔

جس شدت سے مولانا پر مذہبی رنگ چڑھا تھا اسی شدت سے علی گڑھ آنے کے بعد اس کا ردعمل شروع ہوا۔ سر سید کی تحریک نے ملک میں ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ مولانا بھی اس گروہ میں شامل ہوئے اور خوب داد شجاعت دی۔ کہیں مثنوی صبح امید اور سر سید کے قومی تھیٹر کے مسدس کی بنیاد ڈالی۔ کہیں پینی ریڈنگ کے جلسے میں قصیدہ پڑھا۔ (جس کے ساتھ قومی نظمیں پڑھنے کا ایک خاص انداز رائج ہوا۔

اس موقعے پر ان کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان

کر دینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا۔ سرسید دراصل غیر مقلد اور اہل حدیث کے گروہ میں تھے۔ لیکن مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے غیر مقلد سے ایک بڑی حد تک انہیں معتزلی بنا دیا تھا۔ سید صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہونا غیر ممکن تھا۔ مگر اہل حدیث کی طرف سے ان کے دل میں جو بھڑک تھی وہ بھی ممکن نہ تھا کہ انہیں نعمانیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی۔ لہٰذا بغیر اس کے کہ غیر مقلدی کا کچھ رنگ بھی چڑھنے پائے وہ بلا واسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں۔

علی گڑھ کے طلباء میں ''شبلی عموماً غیر ہردلعزیز تھے۔ ان کو طلباء خشک اور مغرور سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ علی گڑھ کے قیام میں نرگسیت نے بعض اختلافی صورتیں بھی اختیار کیں۔ '' سید صاحب کی صحبت علی گڑھ کی مرجعیت اور ان کی ذاتی قابلیت نے انھیں ابتداءً اس حیثیت سے پبلک میں انٹرو ڈیوس (متعارف) کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمرکاب حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو ایک پختگی حاصل ہوگئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خودداری اس حیثیت کو اپنی شان سے بہت کم بلکہ اپنی ذلت اور سبکی تصور کرتی تھی۔

چنانچہ بقول مہدی حسن جب انھوں نے علم الکلام لکھی تو سرسید کا نام تک نہ لیا حالانکہ علم الکلام کے سلسلے میں سرسید نے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ ایک مانی ہوئی بات ہے۔ مہدی حسن کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

'' یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہ تھی۔ شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا۔ ''

اپنی ان تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت (یعنی سرسید کی طرفداری) کو آشکارا کر چکے تھے لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلماء کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجے تک پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔

سرسید کی صحبت سے شبلی کے سخت دینی عقائد لچیلے ہوگئے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شبلی کی اپنی شخصیت منوانے کی خواہش ایک طرف تھی اور سرسید کی انگریزی تعلیم کا اثر دوسری طرف۔ ایک طرف وہ پرانی تعلیم کے حق میں تھے اور دوسری طرف قدیم تعلیم کی ابتری سے بیزار بھی تھے۔ چنانچہ ندوۃ العلماء میں انھوں نے جو تحریک چلانی چاہی وہ یہ تھی کہ '' عربی کی مکمل تعلیم اور انگریزی بقدر ضرورت۔ ''

ایک طرف مولانا روشن خیال۔ ایک طرف حصول جاہ کی خواہش نے ندوہ کے بکھیڑوں میں ڈال دیا اور دوسری طرف آزادخیالی نے اور ہی گل کھلائے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شبلی میں کوئی تضاد یا ثنویت تھی۔

کیونکہ ان کی نرگسیت ان کے دینوی مشاغل، علمی مشاغل، شاعری اور عورتوں کے عشق۔ لڑکوں کے عشق سب میں کارفرما نظر آتی ہے اور کہیں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ سب کا عمل ایک ہی ذہنی افق کا کرشمہ ہے۔

اس وقت علامہ کا رجحان یہ تھا کہ وہ سرسید کے برابر نام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے وہ اس تعلق کو جو انہیں سرسید سے تھا اور جس سے وہ ادبی نیز سیاسی محفلوں میں متعارف ہوئے تھے۔ اپنے آپ کو الگ کر کے ظاہر کرانا چاہتے تھے۔ تیسرے ان کی طبیعت جس پر ان کی تعلیمی دلچسپیوں کا اثر تھا۔ اپنے نظام میں دینی رجحانات کو زیادہ جگہ دینا چاہتی تھی۔ اس کی ایک صورت یہی ہو سکتی تھی کہ وہ اس گروہ کی حمایت حاصل کریں جو مشرق وسطیٰ کی سیاسی تبدیلیوں کے زیر اثر عام مسلم بیداری کی شکل میں ابھر رہا تھا۔

یہ ان کے مشاغل کا ایک دائرہ تھا جس میں وہ مجلسی مقام اور لیڈری کے خواہاں تھے۔ دوسری طرف ان کی نرگسیت جس سے تنگ نظری کا غلاف سر سید کے زیر اثر اتر چکا تھا، حسن وعشق کی رنگینیوں میں راستہ تلاش کر رہی تھی۔ اس رجحان کے ابتدائی آثار قیام حیدرآباد اور اس کے بعد اعظم گڑھ میں نظر آتے ہیں جس کے تین مرکز تھے۔ ایک ابوالکلام کی ذات، دوسرے عطیہ بیگم اور تیسرے مدارس کی کوئی ہستی (اس کی تفصیلات ابھی منظر عام پر نہیں آسکیں)۔ البتہ ان دو طرح کے عشقوں کی نوعیت میں اتنا فرق ضرور ہے کہ لیڈرانہ مواقع اور قومی وملی کاموں میں اس کا اہم عنصر جاہ کی خواہش ہے اور افراد کی محبت میں خاص پہلو جنسی ہے اگرچہ دونوں کا محرک قوی اپنی ذات ہے۔

جب مولانا حیدرآباد گئے تو یہ زنجیریں (دینی عقائد کی) اور ڈھیلی ہوگئیں۔ اب وہ داغ وغیرہ کی صحبت میں غزل سرائی کرتے۔ گاہے گاہے بمبئی بھی جاتے لیکن اسی زمانے کے مشاغل رنگین کسی صراحت سے صفحۂ قرطاس پر ثبت نہیں ہوئے۔ اس لئے ان کی نسبت جو کچھ لکھا جائے گا وہ قیاس آرائی سے زیادہ نہیں۔ بعض خطوط میں مبہم اشارات ہیں جو خدا معلوم کس بات کی نسبت ہیں۔ ایک خط میں نواب حبیب الرحمن شروانی کو جو ان کے محرم راز اور دوست تھے لکھتے ہیں:

"مدراس ضرور تشریف لایئے مجاز قنطرۃ الحقیقت ہے۔"

اس کے کوئی تین چار ہفتے بعد جب مولانا شروانی مدراس ہو کر واپس گئے اور وہاں سے شاید ان مشاغل مدراس کی نسبت کچھ لکھا تو شبلی جواب میں کہتے ہیں:

"میں نے مدراس میں نئی وادی میں قدم نہیں رکھا۔ بلکہ یہ پرانا کوچہ تھا جس کی مدتوں خاک چھانی ع ما ہم از مستان این مے بودہ ایم۔ زمانہ کے ہاتھوں دوسروں کے لئے اپنی جگہ خالی کرنی پڑی تھی۔"

"از جہاں بزم کہ جز من دگری راہ نداشت
بایدم رفت کہ بر دگراں جا باشد"

ہوسکتا ہے اس کا اشارہ انہیں خاتون کی طرف ہو جن سے مولانا ۱۹۰۰ء کے قریب اپنی پہلی بیوی کی وفات پر شادی کے خواہاں تھے۔ اور جس

کی تفصیل امین زبیری صاحب نے یوں بیان کی ہے:

''بیوی کے انتقال کے بعد انہی جگڑ بندیوں کے خوف سے انھوں نے عقد ثانی نہیں کیا اور جب بزرگوں اور دوستوں کے مجبور کرنے پر راضی ہوئے تو خاندان کی قید کو توڑ کر مولانا محمد علی مرحوم ناظم ندوہ نے اپنے ایک ہم سبق دوست کی لڑکی تجویز کی جس کو خدا نے صوری ومعنوی خوبیاں عطا کی تھیں اور جس نے فارسی کی اچھی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن مولانا ہی کے احباب میں ایک ذی ثروت و مرتبت دوست اس جنس نفیس کے خریدار بن گئے۔''

بہر حال روئے سخن جس کسی کی طرف بھی ہو مولانا کی دوسری شادی ۱۹۰۰ء میں ہی ایک خاتون سے ہوگئی جو انہی خاتون کی طرح عمر میں مولانا سے بہت چھوٹی تھیں۔ اتنی چھوٹی کہ مولانا اس بات پر راضی تھے کہ شادی کے بعد کچھ وقت تجردی میں گذار دیں۔

معلوم نہیں انہوں نے شادی کے بعد کا زمانہ تجردی میں گذارا یا نہیں۔ یا اپنے ڈاکٹر مصطفی خان صاحب کے مشورے پر عمل کیا ہو۔ تاہم یہ خاتون ۱۹۰۵ء میں چل بسیں اور مولانا پھر خالی رہ گئے۔

اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور عطیہ بیگم سے بیک وقت محبت کا آغاز ہوتا ہے جس کی تفصیل اگلے صفحوں میں آئے گی۔ فی الحال اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ مولانا کا مزاج ان دنوں بڑا رومانی تھا۔ ندوے کے چندے کی خاطر اور بعض دوسرے کاموں کے لئے مولانا کو اب بمبئی بھی جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ ان کے کلیات سے پتہ چلتا ہے کہ ستمبر ۱۹۰۶ء کو وہ بمبئی میں تھے اور مولانا بمبئی اور اس کے کاروان ہائے عشق کو آنکھیں کھول کر دیکھ سکتے تھے۔ بمبئی اور اس کی رونقیں اکثر مولانا کو گرمیوں میں وہاں کھینچ لے جاتیں۔'' چنانچہ ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک مولانا نے جو غزلیں کہیں ان کا محرک شہر بمبئی کا قیام تھا۔ وہاں کی خوشگوار آب وہوا اور دلکش نظارے، دل آویز تفریح گاہیں اور اس سے بڑھ کر وہاں کی رنگین اور دلچسپ صحبتیں، یہ سب محرکات ایسے تھے کہ جنھوں نے ان کی شاعری کے سمند ناز پر تازیانے کا کام کیا۔ ان کے تغزل کا دور صحیح معنوں میں اس بلدۂ حسن وموسیقی اور اسی دیار حسین و رنگین سے شروع ہوتا ہے۔'' چنانچہ ستمبر ۱۹۰۶ء کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نورا
طراز مسند جمشید و فر تاج خسرو را
بہر سو از ہجوم دلبران شوخ و بے پروا
گذشتن از سر راہ مشکل افتاد است رہرو را
فغان از گرمی ہنگامہ خوبان زر دشتی
بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را
''بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت''
کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را

شبلی کے عشق کا جہاں تک اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت کم وبیش جنسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی احمد میاں جونا گڑھی کو کہنا پڑا کہ ان کی غزلیں گرما گرم ہیں اور حالی یوں گویا ہوئے۔

''کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کا ہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم و ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے یہ غزلیں بہت زیادہ گرم ہیں۔''

چنانچہ ۱۹۰۶ء میں لکھے ہوئے اشعار ملاحظہ ہوں:

مست و پر عربدہ تنگش بکشم در آغوش
تحفۂ وصلم و تا کی بہ محابا باشم
من فدائے بت شوخی کہ بہ ہنگام وصال
بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را
گویا دشمن ہم از ذوقش نصیبے بردہ است
بادۂ وصلش چشیدم از مذاق افتادہ بود
گرچہ من مرد ہوسناکی و رندی نیستم
ایں چنیں ہم گاہ گاہ ہم اتفاق افتادہ بود

•

خیال بوسۂ آں لعل نوشیں دوش می بستم
ہنوزم لب ز ذوق آں شکر باراست پنداری

اور پھر ۱۷۔ اپریل ۱۹۰۷ء کو الٰہ آباد میں بیٹھے ہوئے تھے تو ان کے ذہن نے کمال ہی کر دیا ہے:

شب وصل است حیا گر بگذاری چہ شود
یک دم تنگ در آغوش فشاری چہ شود
تو بدیں حسن تو نگر چہ زباں برداری
ایں دو بوسہ تو اگر خود نشماری چہ شود
از تو باید گرہ بند قبا وا کردن
اگر ایں عقدہ بمن باز سپاری چہ شود

یہاں اس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب کی منزل میں تھا تو اس کے ساتھ ہی اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ہی سے نمایاں تھا۔ ہم فارسی شاعری کے سارے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اور مولانا کے کلام کو غور سے پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ اشعار سوچ بچار کے لمحوں میں مولانا کے تخیل کا اعجاز ہیں اور ان کے تخیل کی بے باکی پر دال۔ ورنہ وہ تو خود کہتے ہیں:

غمگین مباش گر سخن از مدعا نرفت
شبلی ہنوز اول راز و نیاز بود

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اپنی عمر کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا راز عشق افشا کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی:

محتسب دست بداماں من و من سرمست
دست در دامن آن شوخ خود آرا باشم

دامن عیش زدستم نہ رود تا شبلی
دامن بمبئی از کف ندہم تا باشم

بلکہ اپنے عشق کی ابتدائی منزلیں کامیابی سے طے کرنے پر بھی ان کو ''تسلی نمی شوم'' کا گلہ رہا۔

در یافتم کہ مستی ذوق وصال را
ایں نشہ ہم ز حوصلۂ ماز یاد نیست

جب تک یہ سلسلہ قائم رہا ان کے اشعار میں مستی اور والہانہ پن موجود رہا۔ جب تک بمبئی اور اس کے قرب و جوار میں رہتے۔ عمدہ شعر نکالتے۔ لیکن جب لکھنؤ جاتے تو کچھ نہ کہہ سکتے۔

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی
حالیا شبلی شدم رند غزلخواں نیستم

یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کا عشق کامیاب ہو چکا تھا۔ بمبئی آتے تو مس عطیہ فیضی کا آستانہ ہوتا لیکن سرسید بننے کی خواہش انھیں کب دم لینے دیتی تھی۔ ندوہ کے خشک کاموں میں الجھتے اور بُری طرح الجھتے اور ایسے وقت میں شعر کیا خاک ہوتے۔ ۲۶۔نومبر ۱۹۰۸ء کو مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

''بمبئی کا مہمان آج کل حسن اتفاق سے یہاں ہے۔ یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جز کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ ندوے کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے مواقع سے بھی فائدہ☆ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ وقت نہ دماغ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ افسوس غیرت اور محبت کی کشمکش تھی ورنہ آپ بھی دیکھتے جو میں کہتا ہوں۔''

ایک خط میں ۱۸۔فروری ۱۹۰۸ء کو مولانا حبیب الرحمان شروانی کو لکھتے ہیں:

''عین اس وقت کہ چمن زار بمبئی کی گلگشت نے عالم طلسم میں پہنچا دیا تھا۔ بھاول پور کے عہدے داروں کا خط پہنچا کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کے معائنہ کو آتے ہیں۔ اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے۔ بالکل ایسی حالت میں بمبئی سے نکلا جس طرح مرحوم شداد نے عدن کو خیر باد کہا تھا۔''

اس کے بعد پھر ۲۶۔فروری کو لکھتے ہیں:

''اب کے بمبئی میں عجیب صحبتیں رہیں لیکن عین عالم لطف میں ندوہ کی فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا۔ لیکن آنکھوں میں ابتک وہ تماشا پھر رہا ہے۔ خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خواہش کو قوم اور مذہب پر نثار کر سکتا ہوں۔ اور بے تکلف کر سکتا ہوں۔''

مولانا کی دوہری محبت بڑی مرکب سی ہے۔ ندوہ کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد میں دلچسپی اور پھر عطیہ بیگم کے ساتھ لگاؤ۔ آزاد کی محبت اور اس کے ساتھ ہی عطیہ بیگم سے محبت۔ عطیہ کے عشق کی تفصیل بھی دلچسپ ہے۔ اگر ایک طرف انھیں ندوہ عزیز ہے تو دوسری طرف عطیہ۔ لیکن آپ دونوں کو ساتھ ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ ایک طرف ان کے اشعار سے جنسیت کی بو آتی ہے۔ تو دوسری طرف وہ عطیہ کے ساتھ جانماز کا تعلق پیدا کرنے کے خواہشمند

☆ معلوم نہیں مرحوم کی فائدے سے کیا مراد تھی؟

ہیں۔ کبھی اسے دینی باتوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں کبھی حج کی تلقین کرتے ہیں۔

بے موقعہ نہ ہوگا اگر میں اس جگہ یہ عرض کردوں کہ علامہ شبلی کے اشعار کا مطالعہ کرتے وقت ہم ایک الجھن سے دوچار ہوتے ہیں۔ اشعار کی جنسی نوعیت کے علاوہ ان کے ہاں بار بار شراب اور ساغر کا ذکر آتا ہے۔ شراب محض مل بیٹھنے اور باتیں کرنے تک محدود تھی لیکن ساغر زدن کہیں کہیں دو قدم آگے چلتا نظر آتا ہے۔ شراب کے بارے میں مہدی حسن لکھتے ہیں:

''شراب منہ سے نہ لگی تھی صرف زبان پر چڑھی تھی لیکن انھوں نے چھلکتا ہوا جام دفعتاً خالی کر دیا۔

چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی''

اور خود شبلی بھی تو کہتے ہیں:

شبلی خراب کردۂ چشم خراب اوست
تو در گماں کہ مستی او از شراب بود''

۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۲ء

سلطان حیدر جوش کے خیال میں شبلی کی حیات معاشقہ کی ابتداء حادثۂ گزند پا کے بعد شروع ہوئی۔ چنانچہ کہتے ہیں:

''زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بمبئی والا قلبی ہیجان مولانا کے تیور بن جانے کے بعد رونما ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ کے دماغی ہیجان کا مرکز سرسید کی صحبت تھی تو بمبئی کے قلبی ہیجان کی جان مس عطیہ فیضی کی ذات۔ اس لذت والے درد یا درد والی لذت کی اچھی خاصی جھلک ایم مہدی حسن کے چند خطوں میں نظر آتی ہے۔ مگر خطوطِ شبلی کی چھوٹی سی آرسی تو اس معاملے میں آئینہ خانہ ہے۔''

ہمارے نزدیک جوش صاحب کا یہ بیان کسی غلط فہمی کی بنا پر ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شبلی کی افتاد کا اندازہ صرف خطوط سے لگایا ہے۔ اگر وہ اس سلسلے میں شبلی پر بھی نظر رکھتے تو شاید یوں نہ کہتے کیوں کہ ستمبر ۱۹۰۶ء میں لکھے گئے اشعار جس بات کی غمازی کرتے ہیں اس کو حادثہ گزند پا (جو ۱۹۰۷ء میں ہوا) کے بعد کی بات بتانا صحیح نہیں۔ مثلاً اس زمانے کی دو تین غزلوں کے مندرجہ ذیل اشعار سنئے:

چند بیہودہ بہ بند غم دنیا باشم
زیں سپس با قدح و بادہ و مینا باشم
جبہ سائی حرم کعبہ چہ بودم یک چند
بہ در بتکدہ ہم ناصیہ فرسا باشم
ای خوشا روز کہ رازم کند از پردہ برون
دست در دامن آں شوخ خود آرام باشم
دامن عیش ز دستم نرود تا شبلی
دامن بمبئی از کف ندہم تا باشم (ستمبر ۱۹۰۶ء)

• • •

غمزہ ات طرح نہدم رسم جفا کوشی را
جلوہ یادت دہد از خویش فرا موشی را
بنگر معجزۂ حسن کہ آں نرگس مست
بہم آمیختہ ہشیاری و مدہوشی را

* * *

ساغر زندگیم حیف کہ جز درد نداشت
جز ہمیں جرعۂ آخر کہ بہ پایاں زدہ ام
اندکی نیز بہ کام دل خود ہیں باشم
روزگاری خودم از دانش و عرفاں زدہ ام
ساغر چند بیاد رخ رنگین خوردم
قدحے چند در آغوش گلستاں زدہ ام

از پریشانیء ایام میندیش کہ من
دست در حلقۂ آں زلف پریشاں زدہ ام
آن نگار عجمی چہرہ بد انساں افروخت
کاتش آوردم و در خرمن ایماں زدہ ام
آن شد اے دوست کہ آرا ستی پیکر فن
نقش زیبا صنمی بر ورق جاں زدہ ام

آن شد اے دوست کہ در ندوہ بہ بینی بازم
کہ دم از صحبت آں دشمن ایماں زدہ ام
ہاں دہاں دست بدارید زمن ای احباب
کہ بہ زیبا صنمی دست بہ پیماں زدہ ام
ہر یک از تشنہ گران عرب و ہند و عراق
یم حسن است و من دل زدہ طوفاں زدہ ام
کس چہ داند کہ بہ خلوت گہ آں ماہ تمام
زدہ ام ساغر و بر یاد حریفاں زدہ ام
جای آں ست کہ گلشن دمد از کنج لبم
بوسہ ہا بسکہ بر آں عارض خنداں زدہ ام
صد چمن لالہ و گل جو شدم از جیب و بغل
قرعۂ فال ہم آغوشی جاناں زدہ ام
تا دگر آن بت خود کام زیادم نہ برد
گرہے چند در آں زلف پریشاں زدہ ام
سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبد گرداں زدہ ام
پے تواں برد کہ ایں زمزمہ پے چیزے نیست
شبلی ایں تازہ نواہا نہ چو مستاں زدہ ام

* * *

(ستمبر ۱۹۰۶ء)

۲۶ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

''اب کے مخزن میں میری ایک غزل شائع ہوئی ہے البتہ جا بجا غلط چھپی ہے۔'' کافروں'' کا ذکر اس میں بھی ہے۔''

اس کے بعد ۱۳ دسمبر ۱۹۰۶ء کو بانکی پور سے پھر مہدی حسن ہی کو لکھتے ہیں:

''مخزن کی غزل تو ضرور نظر سے گذری ہوگی۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی داخلی ثبوت ہوسکتا ہے؟''

بیگم صاحبہ جنجیرہ کے خاندان سے مولانا کے دوستانہ تعلقات قسطنطنیہ کے زمانے میں قائم ہوئے تھے جو مئی ۱۸۹۲ء کا واقعہ ہے۔ اور غالباً اس وقت عطیہ ایک آدھ برس کی بچی تھی۔ یہ خاندان بمبئی کے پرانے خاندانوں میں سے تھا۔ ۱۹۰۶ء تک عطیہ بیگم کے والد مر چکے تھے۔ البتہ والدہ زندہ تھیں۔ خود عطیہ بیگم اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''مولانا شبلی کی جب ہم سے پہلی ملاقات ہوئی تو ہمارے درمیان کوئی اجنبیت نہ تھی۔ وہ ۱۸۹۲ء میں جب استنبول گئے تھے تو میرے والد مرحوم حسن آفندی صاحب نے جو بارگاہ سلطانی میں کافی رسوخ اور ارکانِ سلطنت پر بہت کچھ اثر رکھتے تھے ان کی بہت خاطر تواضع کی تھی اور علی گڑھ کے پروفیسر کی حیثیت سے خاص حلقوں سے ان کا تعارف بھی کرایا تھا۔

ایک مدت بعد والد مرحوم کا انتقال ہو گیا اور ہمارے خاندان کا مستقل قیام بمبئی میں ہوا۔ ایک مرتبہ ہم بہنوں کو لکھنؤ جانے کا موقع ملا۔ یہاں شیخ مشیر حسین قدوائی بارایٹ لا تعلقہ دار گدیہ کے دولت خانے پر مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی جن کی علمی شہرت ہم سن چکے تھے۔ ہم بہنیں ان کی باتوں سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئیں اس وقت وہ ایک پرانے خیال کے مولوی معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد مولانا بمبئی آئے۔ ہم سب نے بزرگ و عالم سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ عزیزوں کی طرح ان کا استقبال کیا اور جب واپس ہوئے تو سلسلۂ خط و کتابت جاری ہو گیا۔ اس اولین ملاقات کے وقت جو یقیناً ۲۷ ستمبر ۱۹۰۶ء سے پہلے ہوئی ہوگی۔ عطیہ ہنوز پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئی تھی۔ خود کہتے ہیں:

غنچہ نشگفتہ جنوں تا سخن آورد بہ من
تا دگر از اثر باد بہاری چہ شد

(اپریل ۱۹۰۷ء)

دل بہ آں نو بر حسن ار ندھم خود چکنم
دلم از صحبت پیران ریا ساز گرفت

عشق شروع ہوا۔ فارسی میں غزلیں کہی گئیں۔ دوستوں کو اطلاع دی گئی۔ ۲۶ر ستمبر کو بمبئی سے واپس گئے تو ان چند حسین لمحو[illegible] کی یاد بھی ساتھ تھی جو کسی کے ساتھ گزارے گئے تھے۔ چنانچہ جب الہ آباد [illegible] وہاں کہے ہوئے اشعار After Effects کی بڑی اچھی مثالیں ہیں:

من کہ در سینہ دلی دارم و شیدا چہ کنم
میل با لالہ رخاں گر نکنم تا چہ کنم

من نہ آنم کہ بہ ہر شیوہ دل از دست دہم
لیک باآں نگہہ حوصلہ فرسا چہ کنم

جہاں بزمی ست برہم گشتہ از آشوب خیزی ہا
ہنوز آں چشم پرفن بر سر کارست پنداری

فریب لطف گفتار بود خود کام را نازم
سخن می گوید از انکار و اقرار است پنداری

خیال بوسۂ آں لعل نوشیں دوش می بستم
ہنوزم لب ز ذوق آں شکر بار است پنداری

من در انجام رہ عشق گرفتم در پیش
خنک آنکس کہ ہم ایں شیوہ ز آغاز گرفت

چہ عجب جلوہ گہ دوست شود دیدۂ من
کہ ز خاک درش این آئینہ پرداز گرفت

ہر کہ یک بار نظر بر رخ خوب تو کشاد
بایدش دیدہ ز دیدار جہاں باز گرفت

* * *

ہر جا کہ روئے روشن تو جلوہ ساز بود
ہر ذرہ را نظر بہ جمال تو ساز بود

جانان زبان و لب نہ شود ترجمان شوق
مارا امید ہا زنگہ ہای راز بود

* * *

پیکر آرای ازل طلعت زیبای ترا
نقش می بست و ہم از ذوق تماشای کرد

(اپریل ۱۹۰۷ء)

* * *

اپریل ۱۹۰۷ء میں عطیہ یورپ میں تھیں اور علامہ اقبال سے ان کا میل جول شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی تخاطب My dear Miss Fyzee تک محدود تھا۔ یورپ سے عطیہ ستمبر ۱۹۰۷ء میں لوٹیں اور دوسرا سفر یورپ اپریل ۱۹۰۸ء کے آخری دنوں میں کیا اور اسی سال اُسے اپنی والدہ کی بیماری کے باعث لوٹنا پڑا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اپریل ۱۹۰۷ء میں شبلی گھر لوٹے اور حادثہ گزند پا ظہور پذیر ہوا۔ یہ ۱۷رمئی ۱۹۰۷ء کو رات کے دس بجے ہوا۔ اور اس کی پوری تفصیل مکاتیب میں صفحہ ۱۶۸ پر خود شبلی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ پاؤں کا غم مولانا کو بہت تھا۔ خود کہتے ہیں:

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ
جیتے جی مردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

جون اور جولائی میں مولانا چلنے پھرنے سے معذور رہے اور اعظم گڑھ میں قیام کیا۔ پاؤں ۹۔ جنوری ۱۹۰۸ء تک بھی نہ بن سکا۔ مولانا ۲۱ر جنوری کو بمبئی آئے اور یہاں لکڑی کا پاؤں بنوایا۔ بہت سی پرجوش غزلیں لکھیں اور پھر ۶رفروری کے بعد اس چمن زار کو شداد کی طرح خیر باد کہا۔ اس زمانے میں عطیہ بمبئی میں موجود تھیں۔

شیخ اکرام ناقل ہیں'' بمبئی میں دو مسلم خواتین کا ایک لیکچر تھا۔ ہر دو میں شمس العلماء شبلی نعمانی شریک جلسہ تھے اس کے بعد ان خواتین نے (بحوالہ عطیہ کی خاندانی ڈائری) ایک تاریخی تماشا (TABLEAU ٹابلو) کرنا چاہا تو تاریخی معلومات شبلی نے فراہم کیں لیکن افسوس کہ تماشے کے انعقاد سے پہلے انہیں بمبئی چھوڑنا پڑا۔''

اس صحبت نے شعر پیدا کئے تو کیسے؟

بے حاصلی نگر کہ باین دوری از رخش
صد جائے بہر بوسہ نشاں کردہ ایم ما

صرف یہی نہیں بلکہ ۲۶ فروری ۱۹۰۸ء کے خط میں حبیب الرحمان خاں شروانی کو لکھتے ہیں۔

''اب کے بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں۔ آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے۔

چنانچہ اپنے ذوق نظر کی تسکین کے لئے مولانا اگلے مہینے دوبارہ بمبئی جانا چاہتے تھے۔ لیکن ندوہ کی زمین اور بعض اور نہایت اہم معاملات میں الجھے رہے کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ البتہ اب کے قیام بمبئی میں عطیہ سے کچھ ایسے تعلقات استوار کر آئے تھے کہ اس سے خط و کتابت جاری رکھی۔ ابتدا کے دو ایک رسمی خطوط سے ان کی سیری نہ ہوئی اور دوسرے ہی خط میں اسے لکھتے ہیں۔ معاف کیجئے گا میں آپ کی بجائے تم کا لفظ استعمال کروں گا۔ آپ کے لفظ میں بیگانہ پن ہے''

(۲۴ فروری ۱۹۰۸ء)

اس زمانے میں مولانا نے عطیہ بیگم سے کھلنے کی کوششیں کیں۔ وہ ولایت جانے کی تیاری میں مشغول تھیں۔ اور وہ بار بار اس سے روانگی کے متعلق پوچھتے تھے۔ پھر بھی کہتے'' چاہتا ہوں کہ بمبئی آؤں اور روانگی سے پہلے کہیں اور چلا جاؤں۔'' یا پھر یہ کہ'' میرا ارادہ قطعی تھا کہ روانگی کے وقت بمبئی میں موجود ہوں گا اور تمہیں خدا حافظ کہہ سکوں گا لیکن پھر خیال آتا ہے کہ ایک عزیز اور دوست کی رخصت کے وقت کا میں تحمل نہیں کر سکتا۔''

خدا حافظ والی نظم میں تو مولانا نے کمال ہی کر دیا ہے یعنی وہی نظم جو انھوں نے چند سال پہلے اپنے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم کی روانگی یورپ کے موقع پر لکھی تھی تھوڑے تصرف کے ساتھ اسے بھیج دیتے ہیں۔ یعنی ایک عزیز☆ چیز کو عزیز تر چیز کے لئے قربان کر دیا ہے۔ لیکن اس پر بھی جب وہ کچھ نہیں سمجھتی تو اگلے خط میں لکھتے ہیں:

می روی و گریہ می آید مرا
ساعتی بنشین کہ باراں بگذرد

(اپریل ۱۹۰۸ء)

اس زمانے میں مولانا کی شاعری کا رنگ بھی دیدنی تھا۔ ایک غزل دیکھئے:

امشے نمانہ خلوتیاں حجاز را
دیدے تقا دل خم زلف دراز را
ذوقی دگر بود بہ تماشہ گہ وصال

☆ عزیز اس لئے کہ مرنے کے بعد مہدی حسن بھی باپ کی طرح مولانا شبلی کو عزیز ہو گیا تھا۔

چشمی بخواب در شدہ نیم باز را
ہر گاہ یکے و خوبی و رعنائی تو نیست
ما دیدہ ایم کج کلہان طراز را
بے چارہ نکتہ دان ادا ہای عشق نیست
ضائع مکن بہ غیر نگہ ہائے راز را
ما از بلند و پست جہاں در گزشتہ ایم
از بسکہ دیدہ ایم نشیب و فراز را
ہر چند جود نیز ز معشوق خوش بود
ما بندہ ایم دلبر عاشق نواز را
چیزی ز لطف نیز بیا میختہ در ستم
تا اعتدال داد ہی تند ناز را
آور برم کہ کار ز اندازہ در گزشت
دست دراز کشتہ آغوش باز را
من خود نخواہم اینکہ بر افتد حجاب راز
اما چہ چارہ کلک حقیقت طراز را

اسی زمانے میں، مارچ ۱۹۰۸ء میں، عطیہ بیمار ہو جاتی ہے۔ مولانا سمجھتے ہیں کہ ناراض ہے اس لئے خطوں کا جواب نہیں دیتی۔ چنانچہ زہرا کو لکھتے ہیں" میرے خط کا جواب عزیز موصوف نے نہیں لکھا۔ شاید کسی بات سے ناراض ہو گئی ہو یا جلد جلد خط و کتابت کرنا خلاف شان سمجھا ہو۔ بہر حال میں بھی پیش دستی نہیں کرتا۔

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں" ہاں آپ نے پہلے خط میں صغریٰ اور فاطمہ کو بہن لکھا تھا۔ عزیزانہ تعلق تو قطعی ہے لیکن یہ رشتہ صحیح نہیں۔ حسین صاحب مرحوم عمر اس وقت صرف پچاس برس کی ہے۔ اتنا بڑا رشتہ میرا حق نہیں۔''

اس کے بعد جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے عطیہ بیگم یورپ کے سفر پر روانہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن زہرا اور ان کی والدہ بمبئی ہی میں رہتی ہیں۔ یہ واقعہ اپریل ۱۹۰۸ء کے آخر کا ہے☆۔ اسی دوران میں دستہ گل طبع ہو گیا۔ ۲ رمئی کو زہرا کو لکھتے ہیں:'' میرا چھوٹا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں اور میں نے برعکس نہند نام زنگی کافور۔ ان کانٹوں کا نام دستہ گل رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں لیکن زیادہ شوخ اور آزاد شعر قلم سے نکل گئے ہیں اس لئے ان کا پردے میں ہی رہنا مناسب ہے۔'' پھر ۲۲ رمئی کو لکھتے ہیں" دیوان تو نہ بھیجوں گا لیکن وقتاً فوقتاً معتدل غزلیں نکال کر بھیجتا رہوں گا۔ ندوے کا جھگڑا نہ ہوتا تو میں بمبئی کو گھر بنا لیتا۔ مسز لقمانی صاحب نے بھی دستہ گل مانگا تھا۔ میں نے ان سے بھی انکار کر دیا ہے۔ کالائے بد بہ ریش خاوند۔'' اس دوران میں مولانا کے حوصلے بہت بڑھ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ ایک رومال چکن کا جس پر عطیہ کا نام کاڑھا گیا ہو، یورپ بھیجیں۔ جو بقول ان کے حسب مرضی نہ بنا اس لئے نہ بھیجا گیا۔

عطیہ یورپ سے واپس آئی جس کی مبارکباد مولانا نے ۷ راکتوبر ۱۹۰۸ء کو اس طرح پیش کی:

☆ سیر یورپ ۳ (شائع کردہ، مرغوب ایجنسی، لاہور)۔ سیر یورپ ۲۵ راپریل ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر ۷ راکتوبر ۱۹۰۸ء کو ختم ہوا۔ (ایضاً ۳۰۷)

''ایک بے ریا دل۔ایک مخلص دل وفا شعار دل کی طرف سے سفر
سے مراجعت کی مبارکباد قبول ہو۔''

صرف یہی نہیں بلکہ اسے لکھا:

تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے جس کے ساتھ ایک اور حقیر ہدیہ
ہے۔کیا ان دونوں چیزوں کو قبول کر سکتی ہو!''

اور وہ حقیر ہدیہ کیا تھا۔اس کی تفصیل بھی خود مولانا کی زبانی سنئے:

''اپنی تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے......اتفاق سے ہاتھ آ گئی
ہے،بھیجتا ہوں وہ میری قائمقامی کرے گی۔''

افسوس دوسری طرف سے بقول مولوی عبدالحق صاحب کوئی
اشتیاق نہ ظاہر کیا گیا۔

نومبر مہینے میں عطیہ کا لکھنؤ آنے کا ارادہ ہوا۔مولانا نے مولوی مشیر
حسین قدوائی سے سن پایا کہ وہ ان کی مہمان ہوں گی چنانچہ مولانا ۷ر نومبر
۱۹۰۸ء کے خط میں یوں خفا ہوتے ہیں:''اگر آپ لکھنؤ آ کر کسی اور کی مہمان
ہوں گی تو اس زمانے میں لکھنؤ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد عطیہ،شبلی سے کچھ
دور دور ہو گئی تھیں۔اس لئے لب ولہجہ کا مولانا نے یوں گلہ کیا ہے:

''یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بہت بالاتر کر دیا ہے۔
اس لئے یہ توقع کہ آپ اسی طرح ہم سے ملیں یا ان اطراف کا قصد کریں جیسا
کہ وعدہ کیا تھا اب صحیح نہیں۔خط کی تحریر بھی بہت روکھی اور خوددارانہ ہے۔''

اسی زمانے میں علامہ اقبال کے عطیہ کے نام خطوط میں قدم قدم پر خلوص،
ہمدردی اور رنگینی بڑھتی نظر آتی ہے۔

شبلی عطیہ کے مشیر حسین صاحب کے ہاں قیام کا گلہ اپنی اس زمانے
کی غزلوں میں بھی کرتے ہیں:

شاہداں در باغ در ہجر تو زار افتادہ اند
این قیاس از نرگس بیمار می بایست کرد
شیوہ ہائے دلبری را خوب می دانند ولی
آنچہ با کرد با اغیار می بایست کرد

(۲۵ر اکتوبر ۱۹۰۸ء)

ان قدر محو تماشای جمالش بودم
کہ نگہ را خبر از لذت آزاد نماند
کار آں نرگس مستانہ بود ایں کہ بمن
تنہی کرد کہ با ہیچ کسم کار نماند
یا جگر کاوئ آں نشتر مژگاں کم شد
یا کہ خود زخم مرا لذت آزاد نماند
فتنۂ حسن تو از بسکہ جہاں برہم زد
درمیاں تفرقۂ سبحہ و زنار نماند

(۲۷ر اکتوبر ۱۹۰۸ء)

بسکہ رنجوری این خستہ ز تیمار گذشت
عیسی آخر زعلاج دل بیمار گذشت

بی سبب نیست کہ یوسف ز بہا افتاد است
دلبر شوخ من از خانہ بہ بازار گذشت

آہ جاں سوز کہ در سینہ ام آرام گرفت
این ہماں است کہ از گنبد دوار گذشت

داد ازیں پیری بی صرفہ کہ نا خواندہ گذشت
آہ ازاں عہد جوانی کہ بہ ناچار گذشت

(۲۷/اکتوبر۱۹۰۸ء)

یک سر و صد گونہ سودائی نہانی داشتم

یاد آں روزی کہ پنہاں از حریف بدگماں
آشتی ہائے نہاں با پاسبانی داشتم

یاد آں روزی کہ دست افشاں گذشت از حرم
از غرور آنکہ من ہم آستانی داشتم

شبلیا آں جلوۂ نیز نگاہئ بمبئی
بود تا وقتے کہ من خواب گرانی داشتم

(یکم نومبر۱۹۰۸ء)

از بسکہ طفل بودہ و کار آشنا نبود
جوری کہ کردہ است بطور جفا نبود

دل را باین فریب تسلی دہم کہ یار
با ما ازاں نساخت کہ زود آشنا نبود

آن بزم ناز بسکہ زلیخا نہ پر شداست
دیدم کہ جائے یک نگہہ آشنا نبود

محروم ماندہ ایم ہنوز از شمیم زلف
وین شکوہ از تو بود ز باد صبا نبود

(یکم نومبر۱۹۰۸ء)

می رنجم اگر وفا نہ کند
یار زود آشنا چنین باشد (۳/نومبر۱۹۰۸ء)

حرف انکار ز خوباں ہمہ از دل نبود
کہ کہ ایں کار بہ آئین حیا نیز کنند

(۵/نومبر۱۹۰۸ء)

عطیہ کچھ کچھ الگ ہی رہی۔ اگرچہ بمبئی کا مہمان جب آیا اور انھیں کے ہاں ٹھہرا تو مہدی حسن کو ۲۶/نومبر ۱۹۰۸ء کو لکھتے ہیں:

''آج کل بمبئی کا مہمان حسن اتفاق سے یہیں ہے۔ یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جزو کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہ ہوا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر بدتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ وقت نہ دماغ' حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ ان صحبتوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلو

نظر سے گذر رہے تھے۔ آنچہ عالم ہمہ را داشت تو تنہا داری۔ افسوس غیرت
اور محبت کی کش کش تھی ورنہ تم دیکھتے جو میں کہتا ہوں۔"

اور مولانا کیا کہتے تھے؟ وہ تو بار بار یہی کہتے تھے کہ:

خنک آں کس کہ بہ ذوق نظری قانع شد
وای برمن کہ صد اندیشۂ باطل دارم

مہدی حسن کو اگلے خط مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۸ء میں لکھتے ہیں:

"مجھ ندوے کے بدمزہ اشغال نے دل اور آنکھوں کو اپنا کام
کب کرنے دیا کہ کچھ دیکھتا دکھاتا۔ اب تک تو وہ خمار نہیں اترا۔ سو طرح چاہتا
ہوں اس (ندوہ) دام سے دو دن کے لئے چھوٹ سکوں لیکن اور زیادہ الجھ
جاتا ہوں.......ٹرکی کی ارتقائی حالت کی نسبت سلطان جہاں کی رائے بالکل
عام دنیا سے مختلف ہے یہاں بھی یکتائی کی شان ہے۔"

مگر اس کے باوجود جب ان کے پاس آیا تو ان کی شاعری میں وہ
گرمی پیدا نہ کر سکا۔ اس لئے کہ حرف انکار درمیان میں تھا۔ اس زمانے کی
غزلوں کے بارے میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

"بوئے گل کی نسبت اہل نظر کی رائے ہے کہ دستۂ گل اور اس میں
جذب وسلوک کا فرق ہے۔ واقعی دونوں کی شان نزول اس قدر مختلف ہے۔"

ایک شعر میں خود یہ راز کھل گیا ہے:

یا جگر کاوئ آں نشتر مژگاں کم شد
یا کہ خود زخم مرا لذت آزاد نماند

تاہم مولانا کا عشق اپنے عروج پر تھا۔ ۱۹۰۹ء کا سارا سال ان کی
زندگی کا کامیاب دور ہے۔ چنانچہ ۲۲ مئی ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں:

"عطیہ خدا ایسا موقع لائے کہ چند روز جنجیرہ میں رہ سکوں یا بمبئی
میں ماؤنٹ روڈ پر لیکن کیا اس کی توقع ہے؟"

اس زمانے میں مولانا کا عشق جنون کی حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔ کبھی
عطیہ کو نورجہاں بنا کر اشعار میں ذکر کی وجہ تلاش کرتے، کبھی اپنے اشعار کی
تشریح کر کے موقع ومحل پیدا کرتے کبھی اسے موسیقی کی تلقین کرتے اور اس کے
انداز تحریر کی داد دیتے:

"ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت
دو کہ لوگ تم کو پوجیں۔ وانا اول العابدین۔"

حالانکہ مقصود صرف انا اول العابدین ہی تھا۔ یہاں یہ نہ بھولنا چاہئے
کہ عطیہ بیگم جیسا کہ خود شبلی کے بیانات اور عطیہ کی اپنی تحریرات (دیباچہ خطوط
اقبال) سے ظاہر ہوتا ہے، بڑی ذہین عورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ علامہ شبلی
کو جو بات سب سے زیادہ دلکش نظر آئی وہ اس کی مردانہ صفات ہیں۔ چنانچہ
اسی خط میں آگے جا کر لکھتے ہیں:

"عورتوں کے متعلق تمہاری رائے یہ ہے کہ دینی اور معاشی علوم
کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں لیکن
یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی
دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو

پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی کا گالا ہونا چاہئے۔ جمال اور حسن، نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی دلیری، دیو پیکر اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔ مرد نما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔''

اس کے بعد پھر اسی موضوع پر اگلے خط میں لکھتے ہیں:

''عورتوں کی دیو پیکری پر تم نے اس قدر طولانی تقریر لکھی۔ لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ تو علم ہے کہ صحت کے لئے، تندرستی کے لئے، جسم کی موزونی کے لئے، جامہ زیبی کے لئے مردانہ ورزشیں مفید ہیں۔ جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حسن میں فرق آتا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہو جاتا ہے۔ پر میری رائے نہیں، بڑے بڑے اہل نظر کا یہی فیصلہ ہے۔''

اس طرح شبلی ''سلطان جمال'' کو اشارے کنائے سے سمجھاتے رہے اور اس میں ان مردانہ صفات کا سراغ لگاتے رہے۔ ایک دفعہ تو کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف بھی کر گئے۔ عطیہ کی مردانگی ان کی نرگسیت کے باعث محبت پر مجبور ہوتی رہی۔ مولانا نے بقول ''حالی'' گرما گرم اشعار کی تشریح عطیہ کو ایک خط میں لکھی اور یوں رقمطراز ہیں: ''مردانہ تعلیم میں میں ہارا اور تم جیتیں۔ لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے اور عطیہ میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ پاتا ہوں گو تم اس کو اپنی توہین سمجھو۔ مجھ کو بے انتہا مسرت ہوئی کہ تم نے میری تشریح اشعار کو اور خود اشعار کو پسند کیا۔ ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کو حق ہے۔''

اس آخری فقرے میں نہ جانے کتنی آرزوئیں دبی ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں عطیہ کے نام اقبال کا پہلا خط Dear Miss Attya کے القاب سے آتا ہے جس کی تاریخ ۱۳ر جنوری ۱۹۰۹ء ہے۔ پھر ۱۷ر اپریل ۱۹۰۹ء کو My Dear Miss Attya ہو جاتی ہے۔ اور علامہ اقبال اپنے گھریلو واقعات اور اپنی بیوی کے بارے میں اسی سے ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد پر خلوص خطوط کا یہ سلسلہ ۱۷ر اپریل ۱۹۱۰ء پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

اقبال اپنی شادی کے مخالف تھے۔ اس دوران میں وہ ملک چھوڑ جانا چاہتے ہیں۔ عطیہ کو اپنا غم گسار جانتے ہوئے دل کھول کے رکھ دیتے ہیں۔ اور یہ ان کی دریا دلی کا ثبوت تھا۔

اس موقع پر ان خطوط میں ایک فقرہ آتا ہے "You should be more careful" معلوم نہیں اس کا یہاں کیا موقع تھا۔ کیونکہ اوپر کے پیرے اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ ہے۔

بہر حال شاید عطیہ مولانا شبلی پر دلنوازی کا حق کچھ زیادہ ہی جتانا چاہتی ہے۔ وہ فرمائش کرتی ہے لیکن ایسی نہیں کہ مولانا کے بس کا روگ نہ ہو۔ وہ خود کو شہرت دوام دینے کے لئے اپنے نام ایک تصنیف کو معنون کرانے کی خواہش کرتی ہے۔ مولانا کے دل میں نہ جانے کتنی انگلیں چٹکیاں لیتی ہیں مگر ''میں اور اندیشہ ہائے دور دراز'' کے مصداق وہ اس بات کو کسی موزوں تر وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں:

"عطیہ تم سے زیادہ مجھے خوشی ہوگی۔ اگر میں کوئی کتاب تمہارے نام معنون کرسکوں۔ یہ وقت ضرور آئے گا۔ لیکن کب آئے گا؟ اس کا فیصلہ آج نہیں کرسکتا۔"

لیکن بات کل پر ٹال دینے سے وہ اپنے دل کی آواز دبا نہیں سکے۔ پھر کہتے ہیں:

"عطیہ بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کوئی چیز طلب کرو اور میں یہاں سے بھیجوں۔ لکھنؤ میں کوئی چیز تمہارے قابل نہیں۔"

۱۹ راگست ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں "شعرا اور اہل ادب عموماً کنایہ سے نام لینا متانت، بلاغت اور لطافت خیال کرتے ہیں جو لوگ جہانگیر بادشاہ کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے، عموماً نورجہاں بیگم کا نام لیتے تھے اس اصول پر میرا شعر ہے:

نازم کہ ایں عطیۂ فیض امیرہ ایست
کا وازۂ سخاش بہ عالم رسیدہ است

اور یوں تو سراسر تمہارے لئے دوا عیہ غزل خیر مقدم وغیرہ لکھ چکا ہوں اور عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے۔"

یہ کتنے کھلے ہوئے اشارے تھے۔ چنانچہ عطیہ نے لکھا جنجیرہ آؤ اور جب چاہو واپس جاؤ۔

لیکن بعض ناگزیر حالات کی بنا پر مولانا نہ جاسکے۔ عطیہ نے ان کے اس فعل پر طعنہ دیا جس کے جواب میں مولانا اسے لکھتے ہیں:

"تم تو کہتی ہو میں بدہمت ہوں میری زندگی کے دو حصے ہیں۔ پرائیوٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کرسکتیں۔" (۱۹ راگست ۱۹۰۹ء)

لیکن یہ بات انھیں کھٹکتی رہی چنانچہ ۲۸ راگست ۱۹۰۹ء کو انہیں آخر یہ کہتے ہی بنی:

زودی آیم و ایں ہم دیر است

واحسرتا کہ اب کے پھر نہ جاسکے۔ مگر تا بکے۔ آخر ندوہ کے کاموں سے وقتی رہائی پائی۔ چنانچہ ماہ اکتوبر کو بمبئی سے جنجیرہ پہونچے۔ ان وقتی مصروفیات ایک مصروفیت یہ تھی کہ ان کی لڑکی فاطمہ سخت بیمار تھی اور بالغرض علاج لکھنؤ میں آئی ہوئی تھی۔ اور مولانا اسے واپس گھر بھیجنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ بیٹی کو شک ہوگیا اور اس نے خط لکھا جس کے جواب میں مولانا کہتے ہیں:

"فاطمہ! نہ میرا پہلے خیال تھا نہ اب ہے کہ تم کو جلد رخصت کروں۔ تمہارا علاج سب سے مقدم ہے۔ تم نے خود ہی لکھا تھا کہ مجھ کو دو چار دن میں جانے دیجئے۔ اس پر میں نے لکھ دیا تھا۔

میری طبیعت اب تک اچھی نہیں ورنہ تم سے خود آکر یہ باتیں کہتا۔"

(یہ رقعہ دفتر سے مکان پر بھیجا گیا) ۲۹ رجولائی ۱۹۰۹ء۔

مئی کو دوسرا خط انھوں نے جنجیرے سے لکھا تھا جس میں ذکر کیا تھا کہ چند روز ابھی سفر میں گزریں گے۔

اب مولانا کا عشق کامیابی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا۔ اس کی یادگار یہ قطعہ ہے:

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہو گی تو کیوں ہو گی
خیالِ روزہ و فکرِ وضو ہو گی تو کیوں ہو گی
جو دو دن بھی بسر کرلے گا اس قصرِ معلّی میں
اسے خلدِ بریں کی آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی
ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکرِ مے و جام و سبو ہو گی تو کیوں ہو گی
جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو
کس شئے کی جو دل میں آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی
کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستاں
عطیہ تم کو یادِ لکھنؤ ہو گی تو کیوں ہو گی

اس قیام کی تفصیل عطیہ بیگم اپنی خاندانی ڈائری میں (بحوالہ اکرام) یوں دیتی ہیں:

''آخر مولانا شبلی صاحب اور مشیر حسین قدوائی صاحب یہاں تشریف لائے۔ مدتوں سے وعدہ تھا۔ مگر ہمارے شکر کہ اجرا ہوا۔ اکتوبر کو یہاں آئے اور ہفتہ بھر ٹھہرے۔ مولوی صاحب نے یہاں پہنچتے ہی چند اشعار اس جگہ کے متعلق کہے... کسی کو یاں الخ۔'' اس کے دو دن بعد ےار اکتوبر کو مولانا بمبئی پہنچے اور ذیل کا قطعہ لکھا:

یادِ صحبت ہائے رنگیں جو جزیرے میں رہیں
وہ جزیرے کی زمیں تھی یا کوئی میخانہ تھا
لطف تھا ذوقِ سخن تھا صحبتِ احباب تھی
مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا
سبزہ و گل سے بھرا تھا دامنِ کہسار سب
غیرتِ خلدِ بریں ہر گوشۂ ویرانہ تھا
غنچہ و گل کا تبسم تھا ہر اک دم برق ریز
عندلیبوں کی زباں پر نالۂ مستانہ تھا
نشۂ آور تھی نگاہِ مست ساقی اس قدر
خود بخود لبریز ہے ہر ساغر و پیمانہ تھا
اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطفِ سخن
''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا''

اس دوران میں مولانا کی عدم موجودگی میں فاطمہ فوت ہو گئی۔ اب عطیہ کی طرف سے ردِ عمل شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ عطیہ نے خط کے ذریعہ کنایہ والے شعر پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس پر مولانا لکھتے ہیں:

''اچھا ہوا کہ میں نے ان سطروں کے معنی تم سے دریافت کئے ورنہ ممکن تھا کہ میں تمہارا نام اسی طرح کسی موقع پر لاتا اور تم کو رنج ہوتا۔ لیکن مجھ کو حیرت ہے کہ تم یہ کیوں کر سمجھتی ہو کہ وہ تمہارا نام ہے۔ عطیہ کے معنے داد و دہش اور انعام کے ہیں اور اسی معنی میں استعمال کرتا ہوں یہ دوسری بات ہے کہ

تمہارا نام لیا۔ اس لئے تم کو رنج کرنے کی کیا وجہ — بہر حال آئندہ نہ لکھوں گا۔''

اس کے بعد اگلے دنوں میں جا بجا مولانا جزیرے کی صحبت کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً اس خط میں آگے چل کر عطیہ کو لکھتے ہیں:

''جزیرے کا خواب بیداری میں بھی نظر آتا ہے۔''

(۱۷ اکتوبر ۱۹۰۹ء)

اس کے بعد مولانا ندوہ کے کاموں میں مصروف ہوئے۔ بنیادی پتھر نازلی بیگم (عطیہ کی بہن) سے رکھوانا چاہا۔ ملاؤں نے مخالفت کی تو چپ ہو رہے۔ علی گڑھ کا سوال اٹھایا۔ مولانا نے جلسوں میں بہت کچھ کہا۔ عطیہ کو یہ بھی برا معلوم ہوا۔ اس نے غضب آلود خط لکھا۔ جنوری ۱۹۱۰ کو مولانا لکھتے ہیں:

''امید ہے کہ آپ خط کے بعد غیظ وغضب کو دور فرمایئے گا۔ اور قدیم مراسم قائم رہیں گے۔''

یاد رہے کہ اس خط میں القاب بجائے عزیزی یا قرۃ العینی کے خاتون محترم لکھا ہے۔

اس کے بعد مولانا نے کئی خط لکھے۔ عطیہ نے جواب نہ دیا۔ آخر اکتوبر میں اس نے ایک خط لکھا۔ مولانا جواب میں لکھتے ہیں۔

''مدت کے بعد تم نے یاد کیا۔ دفعتاً بہت سے مردہ خیالات زندہ ہو گئے۔''

جب مولانا کو یہ چشمہ سراب بنتا نظر آیا تو انہوں نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ نگاہ بار بار ابوالکلام اور مہدی حسن کی طرف اٹھتی تھی۔

دسمبر ۱۹۰۹ء کو ابوالکلام سے شبلی کے تعلقات خراب ہو گئے تھے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب بقول خود ابوالکلام آزاد کے ان کی عمر اکیس بائیس سال کی تھی۔ مولانا انہیں ایک مختصر خط میں لکھتے ہیں۔

''میں سمجھتا تھا کہ آپ نے میری نیازمندی کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن
جب طلبی کے آرام سے ثابت ہوا کہ
خود غلط بود آنچ۔ یہ بھی بار بار لکھنے کی بات تھی؟''

مولانا ندوہ میں اس بار تو رہ گئے لیکن ''آزاد کے ساتھ تعلقات میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا اور انہیں کئی معذرت آمیز خط لکھنے پڑے۔''

مہدی حسن سے انھوں نے لاکھ کہا کہ وہ انھیں اپنے گھر بلائیں اور اپنی نئی بیوی سے متعارف کرائیں لیکن وہ بدک گئے تھے۔ اس لئے کہ عطیہ والے معاملے میں رازدار وہی تھے۔ مہدی حسن صاحب ایسے ''نفوس قدسیہ بنے ساٹھ سال کی عمر میں'' بیوی کو پردہ کرانے پر مصر رہے۔ عطیہ بھی بیزار رہیں۔

اس سال کے آخر میں (۱۹۱۰ء) رسمی مراسم کا سلسلہ اگرچہ استوار ہو گیا اور ابوالکلام سے جس رسمی تعلق ہی پر اکتفا کا ارادہ ظاہر کیا تھا عطیہ کے بارے میں سچ ثابت ہوا۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کو الٰہ آباد میں نمائش تھی۔ عطیہ وہاں تھیں مولانا شبلی بھی پہنچ گئے۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ عطیہ اس کا تذکرہ طنزیہ

انداز میں اپنی خاندانی ڈائری میں یوں کرتی ہیں:

'' ان ایام میں مولانا شبلی بھی تشریف رکھتے تھے اور اکثر ہماری ملاقات کے لئے آتے تھے۔ اور بلاناغہ ایک خوان عمدہ اور اعلیٰ پکوان کا بھیجتے تھے۔ بیچارے بڈھے میاں گو کہ پرانی وضع کے ہیں مگر خیالوں میں وسعت ایسی ہے کہ کاش آج کل کے نئی روشنی والوں میں ذرہ سی یہ بات ہوتی۔''

بڈھے میاں کی اس پھبتی میں عمر کا جو فرق قائم کیا گیا ہے وہ اس سے پہلے کے کسی خط میں نہیں۔ مولانا شبلی کو اس انداز نظر کا تھوڑا بہت احساس تھا۔ چنانچہ ۱۲ اپریل ۱۹۱۱ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''نہیں معلوم کہاں جاؤں۔ جزیرے کی کشش میں ذرا شبہ ہو گیا۔''

دراصل مولانا نے احتیاط سے کام لے کر شبہ کا لفظ استعمال کیا تھا ورنہ معاملہ زیادہ ہی بگڑ گیا تھا۔

مہدی حسن بھی بیگم صاحب کو بچا گئے۔ ابوالکلام بھی گئے اور عطیہ بھی گئیں۔

نے ذوق نگاہی و نہ ہنگامۂ عشق
اے وائے بہ شہری کہ درو فتنہ گری نیست

یہ مولانا کا اسی زمانے کا شعر ہے۔

عطیہ والے معاملے نے بہت جلد انتہائی شکل اختیار کرلی۔ ۷ر جولائی ۱۹۱۱ء کو علامہ اقبال کے خطوں کا القاب بھی مائی ڈیئر عطیہ کی جگہ مائی ڈیئر مس فیضی ہو گیا اور ایک منحوس صبح کو مولانا کو معلوم ہوا کہ عطیہ کسی اور کی ہو گئی ہے۔

اس نے ایک یہودی سے شادی کرلی۔ کون جانتا ہے اس وحشت ناک خبر سے ان پر کیا گذری ہوگی۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

''قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل و خوار بنا دیئے گئے۔ لیکن کیا ۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے بعد بھی جس دن کہ... ایک یہودی کے ہاتھ آئی۔ مشہور کیا گیا کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ اس لئے تو نہیں ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا خیر۔
سبحہ را زنار کردست و کند

(۱۳ر دسمبر ۱۹۱۲ء)

اور پھر عطیہ کو لکھا:

بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہو گیا

وہ خوش نصیب یہودی ایک مشہور آرٹسٹ رحمین تھا۔ اس کے بعد مولانا فیضی خاندان سے ملتے تو رہے لیکن جذبات کا وہ طوفان جو چند سال قبل کی فارسی غزلیات میں موجزن تھا اب تھم چکا تھا۔ مولانا شعر اب بھی کہتے تھے لیکن:

شب وصل است حیا گر بہ گذاری چہ شود
یک دم تنگ در آغوش فشاری چہ شود
بوسہ ہا بر لب نوشین تو وام است مرا
وام من ہم بہ من از باز سپاری چہ شود

ایسے اشعار کی جگہ اب ان کی زبان پر کچھ اس قسم کے اشعار ہوتے تھے:

بس کہ غارت گر حسن تو جہان بر ہم زد
یوسف از خانہ بروں جست و بیازار افتاد
شیوۂ عجز خوباں نتواں داشت طمع
کہ مرا کار بایں طائفہ بسیار افتاد

یہاں عطیہ ایک عورت نہیں رہتی بلکہ تمام دنیا کی عورتوں کے لئے ایک جنسی علامت بن جاتی ہے جس کی شادی بازار میں بک جانے کے مترادف ہے۔ از خانہ بروں جست، گھر سے نکل کر بازار میں آ جانا۔ اس طرف مولانا کا ہندوستانی ذہن کیوں گیا ہے؟ غور فرمایئے۔

اس شکست کے ساتھ ندوہ کے میدان میں بھی آخر عمر میں مولانا کو شکست ہوئی اور شیخ الکل بننے کے جو خواب وہ دیکھا کرتے تھے رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔

''نتیجہ یہ ہوا کہ گو انھوں نے ندوہ کو بے حد فائدہ پہونچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا مگر آخر میں ندوہ والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے جس کا ان کے دوستوں کو بے حد ملال ہوا اور خود بھی اپنی محنت کے اکارت جانے پر کف افسوس ملتے ہوئے مرے۔''

ندوے کی بساط پر انھوں نے سماجی، معاشی، اقتصادی، سیاسی ہر طرح کے مہرے پھیلائے لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ اس زمانے کی سیاسی شاعری میں طنز کے نشتر ہیں جو لازماً اپنی تمام تر ناکامیوں کا نتیجہ تھے۔ اردو میں ان کے اشعار کا یہی پہلو انہیں اپنے معاصر شاعروں سے الگ کرتا ہے۔ ان اشعار کی برش اور تیزی سے بڑے بڑے سورما کترانے لگے کیونکہ امرت زہر میں تبدیل ہو چکا تھا اور زیر شاخ گل بلبل نہیں بلکہ افعی سوتے تھے۔

ایسی عظیم شخصیت کا نوحہ ایسی طنزیہ شاعری ہی ہو سکتی تھی۔ شبلی ناکام جئے اور ناکام مرے۔ یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ۔

اعتراضات اور ان کے جواب

اس مضمون کی پہلی اشاعت کے بعد ادبی حلقوں میں بڑا ہنگامہ ہوا۔ خود محترمہ عطیہ بیگم کو ایک مضمون بعنوان ''شبلی اور خاندان فیضی'' لکھنا پڑا۔ بعد ازاں کوئی نوے صفحات کا مضمون میرے خلاف خالد حسن صاحب قادری نے نگار میں شائع کرایا۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیاز فتحپوری نے سید سلیمان ندوی کی خوب خوب خبر لی۔ اور ان گہرے زخموں کا حساب چکایا جو اکثر موقعوں پر مذہب کے معاملے میں سید صاحب نے نیاز صاحب پر لگائے تھے۔ نیاز صاحب نے ایک اور فائدہ بھی اٹھایا۔ شبلی کی زندگی کے اس پہلو پر طویل بحث کی اور ایک ٹریبونل بھی بٹھایا جس کا فیصلہ بھی نگار میں چھپا۔ یاد ایام کے سلسلے میں علامہ کی زندگی کے اس پہلو پر سید سلیمان ندوی کا خط بھی نگار میں چھپوایا گیا اور امین زبیری صاحب کی طرف سے بھی اس پر کچھ اضافے کیے گئے۔ امین صاحب کا مضمون بعد ازاں ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں

چھپا جن پر بعض لوگوں نے تبصرے کئے۔ ان میں سے قاضی عبدالغفار مصنف لیلیٰ کے خطوط۔ عبدالماجد دریا آبادی۔ مولوی احمد مکی صاحب کے تبصرے قابل ذکر ہیں۔ شیخ اکرام نے بھی شبلی نامے میں اس پر لکھا۔ اس سلسلے میں جو اعتراضات ہوئے ان کا جواب یہاں فرداً فرداً دیا جاتا ہے:

خالد حسن صاحب قادری لکھتے ہیں:۔

''ہم فاضل مقالہ نگار وحید قریشی کے اس جذبے کو مستحسن نگاہ سے نہیں دیکھتے جو شبلی کو دوسرا سید بننے کی ایک بے چین خواہش اور عطیہ بیگم کے ساتھ ایک رنگین معاشقے کا اتہام عائد کرنے میں کارفرما ہے۔''

یہ لکھنے کے بعد فاضل معترض نے اتنا بھی نہیں کیا کہ سرسید بننے کی خواہش کے خلاف ایک آدھ دلیل یا کم از کم ایک آدھ ثبوت مہیا کر دیتے۔ میں نے اس کی بنیاد شرر کے دیباچہ نظم شبلی اور مہدی حسن کے شبلی کی ''معاصرانہ چشمکیں ☆ رکھی تھی۔

مہدی حسن کا اصل فقرہ یہ تھا: ''یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہ تھی۔ شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ لیا۔''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقرہ خالد حسن صاحب کے پیش نظر بھی تھا۔ اسی لئے تو وہ سرسید کے گروپ سے شبلی کے تعلقات سے بچ بچا کر نکلتے ہوئے مولانا شبلی اور خودی کے موضوع پر لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس مضمون میں آخر تک پتہ نہیں چلتا کہ فاضل مقالہ نگار کا خودی سے مقصود وہی احساس خودداری ہے جس کا ذکر مہدی حسن نے کیا ہے یا اس سے مراد اقبال کا فلسفۂ خودی ہے (یاد رہے مؤخر الذکر میں موسیقی کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔)

اور شبلی بقول خالد اس لحاظ سے بے عیب ہیں کہ ان کے کردار میں کوئی خامی ہو سکتی ہے۔ خیر تضاد کو چھوڑیئے آگے چل کر خالد حسن لکھتے ہیں:۔

''بات اصل یہ ہے کہ محبت مجازی بھی انسان کی طبیعت کو دردمند بنا دیتی ہے اور اس کی طبیعت میں ایک قسم کا سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے... قلب میں ایک تجاذبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے... غرض عشق مجازی سے دل میں لطف اور سچے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور قلب کے اندر صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں کہ اس کے اندر صفات الٰہیہ کی تجلیات منعکس ہو سکیں... (تجاذبی کیفیت کے ساتھ) انفعالیت۔ سپردگی۔ سوز و گداز۔ رقتِ قلب بھی پیدا ہونی ضروری ہے اور یہ محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ خواہ انسان کی محبت ہو یا خدا کی۔''

اقبال کے فلسفۂ خودی اور عام تصوف کی شاہراہ میں جو بنیادی فرق ہے وہ قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ البتہ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ شبلی صوفی تھے یا نہیں۔ میرے خیال میں علامہ کی تحریر و تقریر سے کہیں سے بھی ان کے صوفی ہونے کی شہادت بہم نہیں پہنچائی جا سکتی۔ البتہ ان مذہبی تحریکات کے زیر اثر اور احیاء مذہب کے طور پر شبلی بھی اپنے معاصرین کی طرح سائنس اور مذہب میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لئے ان کی نگاہ انتخاب معتزلہ پر پڑی اور اس طرح وہ اس نئی معتزلی تحریک کے بانی ہوئے جو انہیں

☆ یادِ ایام کا اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے

کے ساتھ ختم ہوگئی۔ انھیں صوفی سمجھنا یقیناً ان کی توہین ہے۔

خودی، عشق مجازی، آئیڈیل عورت، اس طرح کے تصور پیش کرنا جن میں آپس میں تضاد ہو یقیناً علامہ کے بارے میں کسی قطعی رائے پر نہ پہنچ سکنے کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے متذکرہ بالا اصطلاحات کا مفہوم بھی معترض کے ذہن میں متعین نہیں۔ انھیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ شبلی، اقبال کے مرد مومن تھے یا نیٹشے کے فوق البشر یا نسفی کے انسان کامل۔

خالد حسن صاحب شبلی کو صوفی ماننے کے بعد ان کے موسیقی سے شغف کو آسانی سے جائز قرار دے سکتے تھے۔ حیرت ہے انھوں نے اس موقع پر ان پہ دوعملی کا الزام کیوں لگایا اور ان کا یہ کہنا کہ شبلی عطیہ والے خطوط میں لئے دیئے سے رہتے ہیں اور بھی حیرت انگیز ہے۔ کوئی کھلی ہوئی بات سے انکار کردے تو میں اس شخص کو تو صوفی مان سکتا ہوں لیکن اس کے پیرو کے بارے میں جب بھی مجھے اختلاف رہے گا۔

وہ شبلی کو صوفی کے علاوہ ریفارمر بھی مانتے ہیں۔ یہاں وہ دبے لفظوں میں شبلی کو پیغمبر بنانا چاہتے ہیں کیوں کہ ''صوفی وہ ہے جو ذہنی ارتقاء کی منزلیں طے کرکے واپس نہیں آتا اور پیغمبر وہ ہے جو روحانی بلندیاں حاصل کرکے واپس آتا ہے اور خدمت خلق پہ کمربستہ ہوتا ہے۔''

میرے خیال میں فلابیئر کی طرح ان کی محبت مادی تھی۔ اور مادام x کے مقابلے میں انھوں نے عطیہ اور ابوالکلام آزاد کا آئیڈیل تراشا تھا جو خود انہی کی ذات کا ایک پرتو ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کی اس افتاد کو

خامی تصور کرنا صحیح نہیں۔ خامی تضاد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مولانا کی شخصیت میں کہیں تضاد نہیں۔ ان کا ہر فعل ان کی ہر بات ایک ہی مرکزی نقطے سے متعلق ہے۔ اگر آپ ان کی زندگی کے مختلف واقعات کو ایک دوسرے کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں گے تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے۔

خالد حسن صاحب کے بگڑنے کی وجہ تو صرف اتنی سی ہے کہ وہ شبلی میں ایک ایسی بات دیکھنا نہیں چاہتے تھے جو ان کے اپنے اخلاق کے تصور کے خلاف ہو اس لئے جب جنس کا لفظ استعمال کیا گیا تو خالد صاف بگڑ گئے۔ انھوں نے میرے مضمون کا یہ فقرہ نقل کیا تھا:

''یہاں پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا۔ اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب میں تھا تو اس کے ساتھ ہی جنسی پہلو ابتدا ہی سے نمایاں تھا......''

پورا پیراگراف یوں ہے!

''یہاں اس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب کی منزل میں تھا تو اس کے ساتھ ہی اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ہی سے نمایاں تھا۔ ہم فارسی شاعری کے سارے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اور مولانا کے کلام کو غور سے پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اشعار سوچ بچار کے لمحوں میں مولانا کے تخیل کا اعجاز ہیں اور ان کے تخیل کی بے باکی پردال۔ ورنہ وہ تو خود کہتے ہیں......'' (رسالہ ادبی دنیا۔ مئی ۱۹۴۵ء، ۷۰)

اس موقعہ پر جیسا کہ قارئین کو معلوم ہو گیا ہوگا میں نے جنس کا لفظ مباشرت کے معنوں میں قطعاً استعمال نہیں کیا اور اس گرمی جذبات کو تخیل ہی کا

اعجاز کہا ہے۔

جنس کا لفظ نفسیات میں جنسی فعل کے معنوں میں کبھی نہیں آتا۔ البتہ اس بات کا خالد صاحب کو گلا اب بھی ضرور ہونا چاہئے کہ تخیل کی معجزہ کاری کو میں نے دسمبر ۱۹۰۸ء تک برقرار جاتا ہے اور اس کے بعد کہیں بھی جنس کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

شیخ اکرام شبلی نامہ میں (ص ۱۵۱) لکھتے ہیں:

''اس قسم کے اشعار کو دیکھ کر مسز عبدالوحید قریشی جنھوں نے شبلی کی حیات معاشقہ پر رسالہ کتاب بابت اپریل ۱۹۳۵ء میں ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے رقمطراز ہیں'' اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب کی منزل میں تھا تو اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ہی سے نمایاں تھا''۔ ہمارا خیال ہے اس قسم کے اشعار کو شبلی کے لکھنوی مذاق شعر کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ انھوں نے کئی چشموں سے فیض حاصل کیا تھا۔ اور آخیر میں عام طور پر ان کا مذاق بیحد سلجھ گیا تھا لیکن ان کی ابتدائی تربیت اودھ پنچ اور پیام یار کے صفحات سے ہوئی تھی۔ اور یہ اثر اخیر تک کچھ نہ کچھ قائم رہا چنانچہ ذیل کے اشعار سے شبلی کی محبت کے جنسی یا غیر جنسی پہلوؤں پر رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ ان میں وہ فقط ہماری شاعری کی بعض سقیم اور مبتذل روایات کو نباہ رہے ہیں.....''

یہاں فاضل معترض نے پیرے کا ابتدائی حصہ نقل کیا ہے حالانکہ دیانت داری یہ تھی کہ سارا پیراگراف لکھا جاتا۔ اکرام صاحب نے جو اشعار پیش کر کے مجھ پر الزام لگایا ہے اگر وہ غور سے دیکھیں تو مضمون کے اندر ہی انھیں اس کا جواب مل جائے گا۔ میرے اور ان کے بیانات میں مطلق کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ اشعار سارے کے سارے جن پر اپنے اعتراض کی بنیاد انھوں نے رکھی ہے ''دستۂ گل'' سے مستعار ہیں اور ''بوئے گل'' سے نہیں۔

کج بحثی کی ساری خرابیاں جنس کے لفظ سے پیدا ہوئی ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر معترضین Sex کے لفظ کے لئے فرائیڈ سے رجوع کریں کیونکہ اس کا صحیح مفہوم نائٹ لٹریچر Night literature میں نہیں بلکہ نفسیات کی کتابوں میں ملے گا۔

شیخ اکرام صاحب نے ۱۵۵ پر ارشاد فرمایا ہے:

''ہمارے خیال میں عطیہ بیگم صاحبہ کے اس اظہار کو بغیر کسی تامل و تردد کے درست مان لینا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ خطوط شبلی اور غزلیات بمبئی میں ایک آگ کو شعلہ زن رکھنے کی عطیہ بیگم صاحبہ نے کوئی بھی کوشش کی تھی۔''

ہم نے اپنے مضمون میں یہ کہیں نہیں کہا کہ عطیہ بیگم صاحبہ نے اس آگ کو شعلہ زن رکھنے کی کوشش کی۔ بلکہ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ انھوں نے مولانا کو ۱۹۱۰ء سے پہلے تک Discourage نہیں کیا اور مولانا کو شاعری میں کھل کھیلنے کا موقع دیا۔ اشعار کی تشریح سنی اور نہ صرف ان اشعار کی شرح کو پسند کیا بلکہ اشعار کی داد بھی دی۔ اور اس داد کو جواباً وصول بھی کیا جو شبلی نے ان کی داد پر دی۔ ''ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کو حق ہوگا۔'' اور پھر اسی خط میں ''عطیہ بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کوئی چیز طلب کرو اور میں یہاں سے بھیجوں۔ کیا لکھنؤ میں کوئی چیز تمہارے قابل نہیں۔''

اب بتایئے۔ ہم یہ کیسے مان جائیں کہ عطیہ بیگم علامہ شبلی کی آتش

عشق سے بے خبر تھیں۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

"اب تھوڑا عرصہ ہوا میرے علم میں آیا کہ اسی زمانہ میں مولانا شبلی کے شاگرد اور جانشین سید سلیمان ندوی نے بھی ان کے خطوں کا ایک مجموعہ مکاتیب شبلی کے نام سے شائع کیا تھا۔ اور اس میں بعض خطوط کے ساتھ رابطہ اور سلسلہ ہے اور میری ذات وشخصیت کے متعلق اشارے ہیں۔ ان خطوں سے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کو بھی ایک بڑا مواد اور مشغلہ ہاتھ آگیا ہے۔ ریڈیو پر تقریریں ہوئی اور اردو رسائل میں مضامین شائع کیے گئے۔ اگرچہ ہمارے خطوں میں تو کوئی بات ایسی نہ تھی۔ البتہ مکاتیب شبلی کے خطوں کے ساتھ پڑھنے سے بے شک یہ مواد ملتا ہے۔ مولانا ایک شریف گھر میں ایک عالم، ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح جاتے ہیں جہاں بڑی عزت سے استقبال ہوتا ہے۔ لیکن ان کے دل میں اور ہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کو ایسے رازدار دوستوں کے خطوں میں ظاہر کرتے ہیں جو مہذب، تعلیم یافتہ اور عالم بھی ہیں اور یہ بزرگ ان خطوں کو اشاعت کے لئے نذر کر دیتے ہیں اور ان کے جانشین بھی جو علم واخلاق اور ادب کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتے ہیں، ان کو شائع کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس طرح وہ لائبل کے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ کیا اسی معیار شرافت پر ان عالموں اور فاضلوں کو ناز ہے؟ ان کو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہئے تھا کہ اگر ان کے خاندان کی خواتین اس پوزیشن میں ہوتیں تو وہ ایسے خطوط کی اشاعت گوارا کرتے؟ انھوں نے یہ بھی غور کیا ہوتا کہ خود مولانا شبلی کے اخلاق کے متعلق دنیا کیا رائے قائم کرے گی.... ہم نے ان کے خطوں کو جو ہمارے نام آتے تھے ہمیشہ معصومانہ روشنی میں دیکھا.... واقعی سعدی کا یہ قطعہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے کہ:

انسان کے علم کا اندازہ تو ایک دن میں ہو جاتا ہے لیکن نفس کی خباثت برسوں میں بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اور ہم اس علم ولاعلمی میں رہے۔"

(ادبی دنیا۔ جولائی اگست، ۱۹۳۶ء)

اس اقتباس میں دلائل سے زیادہ جذبات کا استعمال ہوا ہے۔ اور مولانا شبلی کی ذات پر بعض نازیبا اور ناواجب حملے کیے گئے ہیں۔ شبلی جذباتی آدمی ضرور تھے لیکن "خبیث" نہ تھے۔ باقی رہے سید سلیمان ندوی تو خطوط کی اشاعت کی جتنی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے اتنی ہی امین صاحب پر ہوتی ہے۔ ہم نے یہ کبھی نہیں کہا اور نہ اب کہتے ہیں کہ اس معاشقے میں عطیہ بیگم صاحبہ کا قصور تھا۔ خطوط واشعار اکثر شبلی کی داخلی کیفیات ہیں — ہاں اتنا ضرور ہے کہ متذکرہ بالا اقتباس میں لاعلمی پر جو ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے ہمیں سوچنے پر ضرور مجبور کر دیتا ہے۔ اور ہم علامہ شبلی اور علامہ اقبال کے ان جملوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں جن میں عطیہ صاحبہ کو ذہین وفطین کہا گیا ہے۔

امین زبیری صاحب جن کا شکریہ محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے اپنے مضمون میں ادا کیا ہے۔ ان کی کتاب تبصرۂ حیات شبلی یعنی شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریاآبادی مدیر صدق لکھتے ہیں۔

"یہ تبصرہ شبلی کی زندگی کے رنگین پہلو پیش کرتا ہو یا نہ کرتا ہو لیکن خود تبصرہ نگار کے مذاق طبیعت کی غمازی یقیناً کر رہا ہے۔"

اس طرح قاضی عبدالغفار مدیر پیام (مصنف لیلیٰ کے خطوط و مجنوں کی ڈائری) اپنے فکاہی کالم میں رقمطراز ہیں۔

سرِ راہ

علی گڑھ کے کوئی محمد امین زبیری صاحب شاید وہی جنھیں ہم جانتے ہیں!! ان بزرگ نے چو ورقہ (جس کی قیمت ۶ آنہ ہے) شائع فرمایا ہے۔ اس کا عنوان ''تبصرۂ حیات شبلی'' ہے اور اس عنوان کی توضیح یوں فرمائی گئی ہے کہ ''یعنی مولانا شبلی کی زندگی کا رنگین پہلو''۔ اس تبصرے میں حسن و عشق کے کچھ قصے مرحوم مولانا شبلی کی سوانح حیات سے منسوب کئے گئے ہیں۔ علی گڑھ کے ''بالشتیوں کی بستی'' میں امین زبیری صاحب (اگر یہ وہی ہیں جنھیں ہم جانتے ہیں) بہت بڑے سوانح نگار اور مؤرخ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ہمیں آج تک معلوم نہ تھا کہ اس چو ورقہ کی اشاعت کے بعد جس کی قیمت ۶ آنہ ہے، اب تو ہمیں جناب زبیری صاحب کی عریانیات کا خیر مقدم کرنا ہی پڑے گا۔!! کیا بہتر نہ ہوگا کہ مورخ علی گڑھ اپنی سوانح نگاری کے مساعی کو اپنے گھر کے قریب یعنی اپنے محلے ہی سے شروع فرمائیں۔ ہم انھیں بتا سکتے ہیں کہ ان کی علمی کاوشوں کے لئے بہت کافی مواد علی گڑھ ہی میں موجود ہے۔ اگر یہ وہی زبیری صاحب ہیں جنھیں ہم کسی زمانے میں ایک مصنف اور مؤلف کی حیثیت سے جانتے تھے تو وہ بیچارے تو اب ایک ضعیف العمر بزرگ ہوں گے۔ اس بڑھاپے میں حسن و عشق کی وقائع نگاری کا یہ شوق حسرت ناک ہے۔!!

.... تبصرہ نگار کے مذاق اور افتادِ طبیعت کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی بجائے ہم تو صرف اتنی بات عرض کریں گے کہ کچرے اور غلاظت کی سوداگری (چار ورق چھ آنے میں) — علی گڑھ کے ماحول میں ذرا بھی تعجب انگیز نہیں! 'تاریخ بھوپال' اور 'تذکرہ وقار' کے مؤلف کی یہ افتاد اگر ان کے ماحول کی بوڑھی رنگینی افکار کا نتیجہ سمجھی جائے تو وہ ہماری رائے میں مذمت اور تنقید سے بالاتر ہے!!! گولر کی شاخوں میں انجیر کیوں تلاش کیجئے!! — ثقافت اسلامی (فی الہند!) کے مرکز پر جب اس قسم کی رنگینیاں ڈیڑھ آنے کے حساب سے بک رہی ہوں تو پھر ان پھولوں سے ہی اس چمنستان کی بہار کا اندازہ کر لیجئے۔

زبیری صاحب کی روایت و درایت کا رخ ذرا بدل دیجئے تو یہ سلسلہ علی گڑھ کے کیسے کیسے مقامات اعلیٰ تک پہونچتا ہے!! — جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔

(روزنامہ پیام ۶ جون ۱۹۴۶ء)

یہ تو اچھا ہوا کہ گالیاں دینے والے ان علمائے کرام نے شبلی کی زندگی میں اس واقع کے ہونے کا اقرار کر لیا۔ عین ممکن تھا وہ اس سے بھی انکار کر جاتے۔ اب ممکن ہے کہ یہ لوگ شبلی کو صوفی ثابت کریں۔ اور ہم سب ان کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیں۔ مولوی احمد مکی صاحب لکھتے ہیں:-

''میں نہیں سمجھتا کہ حسن پرستی یا بالفاظ دیگر اچھی اور خوبصورت چیز کو بہ نظر پسندیدگی دیکھنا کونسی بری بات ہے جو علامہ سلیمان اس طرح کانوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں۔ جبکہ خود ارشاد باری یہ ہے کہ اللہ جمیل و یحب

الجمال۔ اگر ہمارے خیالات میں پاکیزگی، ہماری روح میں صفائی اور ہماری نظر میں تقدس ہو تو حسن مجازی کے پردے پر حسن حقیقی کا پرتو دکھائی دیتا ہے اور جب جبین نیاز میں سجدے تڑپتے ہیں تو حقیقت منتظر لباس ہی میں دیکھنے کی تمنا ہوتی ہے۔ میں مولانا شبلی کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے ان کی رنگین مزاجی اور حسن پرستی کو ایک فعل محمودہ سمجھتا ہوں۔ اور ان کا یہ ذوق لطیف ہی انہیں دوسرے ملاؤں حتیٰ کہ خود سلیمان ندوی سے بھی ممتاز اور قابل عظمت بناتا ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ان کی نگاہیں حسن مجازی کے ظاہری عشوہ و انداز میں پھنس کر معصیت عمل تو کجا معصیت خیال کی بھی مجرم نہ بن گئی ہوں گی۔

(ہماری کتابیں اگست ستمبر ۱۹۴۶ء)

— یقولون بالسنتھم مالیس فی قلوبھم —

(وہ زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا)۔

ضمیمہ

عبدالرزاق مصنف البرامکہ کی یاد ایام کا مسودہ جب سید سلیمان ندوی صاحب کے پاس پہنچا تو انھوں نے انھیں ایک خط لکھا جو نگار اکتوبر ۱۹۴۵ء سے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس خط میں مولانا کے آغاز شباب کے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یاد ایام (مطبوعہ دسمبر ۱۹۴۶ء) میں ان کا سوائے آخری سطر کے کوئی سراغ نہیں ملتا:

۳۶ دارالمصنفین اعظم گڑھ — مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۲ء

مکرمی السلام علیکم

یاد ایام کی اصل اور کاپیاں واپس مرسل ہیں۔

میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا شبلی کے حال میں نہایت بے تکلفی سے بعض واقعات نقل کئے ہیں جو احباب کے لئے اور وہ بھی آغاز شباب کے لئے ہوتے ہیں۔ ''دور جوانی افتد چناں کہ تو دانی'' مگر اب وہ اواخر عمر میں ایک مقدس کام کے بانی ہوئے تو ان کا تذکرہ کرنا اور لکھنا بالکل نامناسب ہے۔ گناہ کا ستر چاہئے نہ کہ تشہیر۔ اس لئے ازراہ عنایت بلکہ اس دوستی کے واسطے سے جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی۔ یہ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات پر پردہ ڈالئے تاکہ ان کا نیک نام ضائع نہ ہو اور یوں بھی عیب و گناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمان کے لئے زیبا نہیں۔ والسلام

سید سلیمان

آپ کا یہ فرمانا کہ عطیہ بیگم کی علمی قدردانی نے مولانا کی فارسی شاعری میں نئی روح پھونک دی تھی بالکل غلط واقع ہے۔ غزلوں کا آغاز ۱۹۰۵ء سے ہوا ہے اور خطوط و ملاقات کا سلسلہ ۱۹۰۸ء سے ہے۔

ضمیمہ

مولانا (عرفان) آگے آگے تھے۔ میں پیچھے پیچھے۔ اب ہم ایک کشادہ اور شاندار ہال میں پہنچے۔ استقبال کے لئے سفید لباس میں ملبوس ایک کہن سالہ خاتون آگے بڑھیں۔ بال سفید، چہرہ ضعیفی کا آئینہ دار، لیکن اداؤں میں شوخی۔ انداز گفتگو میں بیباکی، حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کی انفرادیت۔ مولانا نے ان سے میرا تعارف کرایا'' یہ خلافت کے ایڈیٹر جعفری صاحب۔'' پھر مجھ سے فرمایا'' یہ ہیں عطیہ بیگم فیضی۔'' عطیہ بیگم — کتنا دلآویز نام اور اس نام کے ساتھ کتنی رنگین حکایتیں اور کتنی ہوشربا کہانیاں اور کتنی دلچسپ داستانیں وابستہ تھیں — یہ بوڑھا مجسمہ جس میں آج نہ کوئی رعنائی ہے نہ زیبائی۔ نہ دلکشی ہے نہ سحر طرازی۔ اپنے زمانے میں کیا کچھ نہیں تھا۔ یہ بے رس آنکھیں جس کی طرف اُٹھ جاتی تھیں قتل عام شروع ہو جاتا تھا۔ میں اپنے حافظہ پر تاریخِ ماضی کے اوراق اُلٹ رہا تھا کہ عطیہ بیگم نے تپاک کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ تو آج پہلی بار ہمارے ہاں آئے ہیں۔ آیئے میں آپ کو اپنے مکان کی سیر کراؤں۔''

رئیس احمد جعفری

(دید و شنید ص ۵۷۲۔۵۷۳)

جزر

ف۔س۔ اعجاز

''نہیں تم سے اب مجھ کو الفت نہیں ہے''
میں جب یہ کہوں تم بھروسہ نہ کرنا
سمندر کے پانی کا سطحِ مقرر سے نیچے اترنا
تلاطم کو کھونا
بہت عارضی ہے
بھلا کیا ہے اس میں اچنبھے کی بات
سمندر میں کیا جزر آتے نہیں ہیں؟
سمندر کی لہریں ابھی سرنگوں ہیں
مگر جلد ہی سر اُٹھانا پڑے گا
یہ پھر جوش میں اپنی سطحِ مقرر کو چھونے لگیں گی
نہانے لگے گی کناروں کی ریت
پگھلنے لگیں گے چٹانوں کے دل
بہکنے لگیں گے ہوا کے قدم
پھڑکنے لگیں گے بھرے ہونٹ پھر
''نہیں تم سے اب مجھ کو الفت نہیں ہے''
دوبارہ کہوں تو بھروسہ نہ کرنا
محبت میں حیرت بہت عارضی ہے!۔

سید شہاب الدین دسنوی

مولانا شبلی کے ''عشق'' کی حقیقت

مولانا شبلی نعمانی کے قیام بمبئی کے دنوں کے تعلق سے جو رنگین داستان مرتب کرنے کی کوشش کی گئی اس کی ابتدا ''خطوط شبلی'' کے مرتب مولوی محمد امین زبیری اور اس کے مقدمہ نگار مولوی عبدالحق سے ہوئی۔ اس کے بعد شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر وحید قریشی کی تصنیفات نے اسی مواد کو لے کر اس میں مزید رنگ آمیزی کر کے ''سیرۃ النبی'' اور ''الفاروق'' کے مصنف شبلی کو اچھا خاصا قیس بنا دیا جو اپنی لیلیٰ کی تلاش میں بار بار سواد بمبئی کی کوچہ نوردی میں مشغول رہا۔ اس چٹپٹی داستان نے کچھ ایسی مقبولیت حاصل کی کہ اچھے اچھے ناقدین نے بھی اور کچھ نہیں تو اسے تقاضائے بشری سمجھ کر بلا چوں وچرا تسلیم کر لیا۔

شبلی بے شک عالم دین تھے لیکن ان کا مزاج خانقاہی ہرگز نہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ وہ ''نرے خشک مولوی نہ تھے۔'' وہ جمالیاتی ذوق اور حس لطیف کے حامل تھے۔ اچھے حساس دل کے غزل گو شاعر کی حیثیت سے ان میں جذبات کا جوش تھا۔ ان کے سب سے معتبر سوانح نگار مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تو صاف صاف لفظوں میں یہاں تک لکھ دیا ہے۔ ''اس اظہار میں بھی کوئی پردہ نہیں کہ مولانا (شبلی) میں وہ پابندی اور مذہبی تورع وتقدس جو علمائے دین کا خاصا ہے، نہیں تھا۔'' لیکن ان سب سے وہ نتیجہ اخذ کر لینا جو ان کے معاندانہ ناقدوں نے کیا۔ حقیقت اور انصاف سے دور ہے۔!!

شبلی کی شگفتگی طبع، حسن مزاح اور شوخی تحریر دیکھنی ہوں تو ''مکاتیب شبلی'' کی دو جلدوں میں ان کے بے تکلف دوستوں کے نام خطوط دیکھنا چاہئیں۔ یہی بات ان کے اشعار میں بھی پائی جاتی ہے۔ خصوصاً فارسی غزلوں میں اور جو یہ نہ ہوتی تو وہ ''شعر العجم'' اور موازنہ انیس و دبیر کے مصنف کیسے بنتے۔ ان کی شاعری کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے۔ ''غزل میں تو یقیناً مولانا (شبلی) کے یہاں غالب سے کہیں زیادہ سرجوشی و کیفیت ہے''۔

مولانا حسرت موہانی نے غزل کی تین قسمیں بتائی ہیں۔ عاشقانہ، صوفیانہ اور فاسقانہ، انھوں نے خود تینوں قسم کی شاعری کی لیکن کسی نے ان کی زندگی کی تطبیق ان تینوں قسم کی شاعری سے نہیں کی۔ اسی طرح شبلی کی غزلوں کو سامنے رکھ کر ان سے سباق وسیاق تیار کرنا اور ان کی زندگی سے تطبیق کر دینا دعوے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ شبلی نے بعض گرما گرم اشعار بھی کہے مگر ان کی پشت پر وہی حقیقت تھی جو اردو اور فارسی شاعری کی روایت میں داخل ہے۔ یعنی مبالغہ آمیزی اور پرواز تخیل۔ شبلی کا شعر ہے۔

من فدائے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال

بمن آموختی خود آئین ہم آغوشی را

ہم اس میں چونک پڑتے ہیں۔ ایک عالم دین کا کہا ہوا ایسا شعر! مگر جب طالب آملی کا یہ شعر پڑھا جاتا ہے۔

بہ سوئے خویشتن از لطف گستاخانہ کش دستم

کہ من بسیار محجوبم کہ ہم آغوش نمی دانم

تو اسے پھڑکتا ہوا شعر مان کر مسکرا دیتے ہیں اور بس! مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی ثقہ عالم، ریاست حیدرآباد میں صدر یار جنگ تھے۔ خواجہ آصفی کے مطلع پر ان کی ایک غزل ہے۔ جس میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں:

زچشم مست تو مستم شراب راچہ کنم

زتاب حسن تو سوزم کباب راچہ کنم

نہ کرد جلوہ بت شوخ و باختم دل و دیں

اگر براگلند از رخ نقاب راچہ کنم

فارسی اور اردو کے دواوین ایسے اشعار سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن ان سے لطف اٹھانے کے سوا ذہن کسی اور طرف نہیں جاتا ہے۔ مگر شبلی کے بعض نقادوں نے ان کے اشعار کو بنیاد بنا کر طرح طرح کے گل کھلائے اور انہیں ایک ''دل پھینک عاشق بنا دیا''

یہ صحیح ہے کہ شبلی بمبئی کے ایک نہایت تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاندان سے متاثر رہے۔ بدرالدین طیب جی (سلیمانی بوہرہ) کا خاندان انیسویں صدی کے وسط ہی سے مغربی تعلیم، مغربی آداب و معاشرت اور مغربی افکار سے متاثر ہو چکا تھا۔ ان کی لڑکیاں بھی ایسے زمانے میں اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم تھیں۔ جبکہ خصوصاً شمالی ہندوستان میں شرفا تک کی لڑکیاں کلام پاک ناظرہ پڑھ لینا اور اردو میں لکھے ہوئے خط صرف پڑھ لینے کی حد تک تعلیم کی انتہا سمجھتی تھیں۔ طیب جی کے خاندان کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ وہ مغربی تہذیب کے ساتھ مشرقی اقدار کا بھی پوری طرح حامل تھا۔ عطیہ بیگم، بدرالدین طیب جی کی بیٹی اسی خاندان کی فرد تھیں۔ جن سے شبلی ۱۹۰۳ میں متعارف ہوئے دونوں کی عمر میں بیس سال کا فرق تھا۔ شبلی خود بھی فراخ دل (لبرل) اور روشن خیال عالم تھے، عورتوں کی تعلیم اور حقوق کے علمبردار تھے۔ وہ اس کے بھی قائل تھے کہ عورتیں خود کفیل ہوں کیوں کہ اس کے بغیر وہ مردوں کی استبدادی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتی تھیں۔ ایک خط میں عطیہ کو لکھتے ہیں:

''عورتیں خود کمائیں اور کھائیں'' شبلی نے عطیہ کو جس نگاہ سے دیکھا وہ غور کرنے کی بات ہے۔ وہ مورخ، سیرت نگار، انشاپرداز اور شاعر ہونے کے علاوہ قومی اور تعلیمی معاملات سے بھی وابستہ تھے۔ گو عملی سیاست سے دور رہے لیکن تعلیمی اور ملی تحریکوں سے بہت قریب تھے۔ وہ ایسے جلسوں میں بھی شرکت کرتے رہے جن میں مردوں کے دوش بہ دوش غیر مسلم عورتیں بھی حصہ لیتی تھیں۔ شبلی ایک طرف ان عورتوں کو اور دوسری طرف اپنی ملت کی صنف نسواں کو دیکھتے جو اپنے معاشرے، ملک اور سماج کی ستائی ہوئی بہنوں

بیٹیوں کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہیں بول سکتی تھیں۔ یہی وہ خیالات تھے جس نے شبلی کو عطیہ سے اس امید پر قریب کر دیا کہ ''اس خاکستر میں دبی ہوئی چنگاری دکھائی دی'' جب وہ پہلی بار ملے تو شبلی کی عمر ۴۶ اور عطیہ ۲۴ سال کی تھیں۔ اس کے کئی سال بعد ان دونوں میں مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا جو ۱۹۱۱ تک جاری رہا۔ ''خطوط شبلی'' میں ۵۵ خطوط عطیہ کے نام اور ۴ خطوط ان کی بہن زہرا بیگم کے نام ہیں جو نواب جنجیرہ سے بیاہی تھیں۔ یہ خطوط شیخ محمد اکرام کے لفظوں میں، ''ارمان بھرے قلم'' اور ''محبت بھرے دل'' سے لکھے گئے تھے۔ لیکن ان ''محبت ناموں'' کی حقیقت ملاحظہ ہو۔ شبلی عطیہ کو لکھتے ہیں۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ (عطیہ) ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرر بن جائیں جو انگریزی اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے صرف مشق کی ضرورت ہے''

تقریر کی مشق کے لئے ہدایت کرتے ہیں:

''اردو تقریر میں اصل مضمون کی خوبی سے زیادہ طرز ادا کی خوبی کا لحاظ چاہئے۔ بمبئی کے جلسے میں مسز نائیڈو اگرچہ نہایت عمدہ بولیں۔ ڈلیوری بھی اچھی تھی لیکن تصویر کی طرح غیر متحرک تقریر میں تمام اعضا کو زبان کا ساتھ دینا چاہئے۔''

تعلیم پر اپنے خیالات اس طرح انہیں لکھتے ہیں:۔

''نصاب تعلیم کے متعلق میں سرے سے اس کا مخالف ہوں کہ عورتوں کے لئے الگ نصاب ہو۔ یہ ایک اصول غلطی ہے جس میں یورپ بھی جتنا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہئے کہ ان دونوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہو جائے نہ کہ بڑھتا جائے اور بات چیت، گفتار، نشست برخاست، مذاق، زبان سب الگ ہو جائیں۔''

شبلی، عطیہ کے خطوں میں زبان کی غلطیوں کی اصلاح کرتے ہیں۔ بعض اشعار کے معنی سمجھاتے ہیں، مطالعے کے لئے معیاری کتابوں کے نام بتاتے ہیں۔ مغل اور راجپوت مصوری میں جعلی اور اصلی کا فرق بتاتے ہیں۔ عملی مسائل کے جواب دیتے ہیں۔ تاریخی معلومات بہم پہنچاتے ہیں، یہاں تک کہ فن موسیقی میں بھی ضرور ہدایتیں دیتے ہیں۔ شبلی کی آرزو یہ بھی تھی کہ وہ عطیہ کی بہن زہرا کو فارسی کے کسی دیوان یا خود اپنے کلام کے کچھ حصے پڑھا سکتے تاکہ ان بہنوں کا فارسی کا ذوق نکھر آتا، نکات اور محاورات پر بھی نظر پڑ جاتی، اور اس طرح فارسی، شاعری کی خوبیاں ذہن نشیں ہو جاتیں۔

شبلی کی ان کوششوں کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ سب وہ اس لئے کرتے رہے تاکہ عطیہ ایک نہایت شائستہ اور عملی شخصیت بن کر ان کے ''نکاح ثالث'' میں آ جائیں جیسا کہ شیخ محمد اکرام نے ''یادگار شبلی'' میں باور کرانے کی کوشش کی ہے؟ اگر یہ بات ہوتی تو ۲۵ دسمبر ۱۹۱۲ کو عطیہ کی شادی فیضی رحمین کے ساتھ ہو جانے پر تو ''نامراد عاشق'' کو تیشے سے سر پھوڑ لینا تھا۔ یا دشت و بیاباں کی راہ لینی تھی۔ اس کے بجائے شبلی ایک دلچسپ قطعہ لکھ کر انہیں بھیجتے ہیں:

عطیہ کی جو شادی پر کسی نے نکتہ چینی کی
کہا میں نے کہ جاہل ہے یا احمق ہے یا ناداں ہے

بتانِ ہند کافر کرلیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

فیضی رحمین نسلاً یہودی تھے لیکن نکاح سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔

پھر شبلی از زبان رحمین کہتے ہیں:

ایک مدت سے مجھے شوق ہے تصویروں کا
اس سے بڑھ کر کوئی تفریح کی تدبیر نہیں
تھی عطیہ کی بھی خواہش کہ مرقع میں برے
اور سب کچھ تھا مگر حسن کی تصویر نہ تھی

کیا یہ اشعار شبلی کے ''دلِ حسرت زار'' کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ یا صرف تفریحی تعلق؟

شیخ محمد اکرام نے عطیہ کی شادی کی خبر کو شبلی کے لئے منحوس صبح کی ''وحشتناک خبر'' سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ان کی نظر دو ہفتہ بعد کے لکھے مکتوب بنام ایم۔ مہدی افادی پر نہیں پڑتی ہے جس میں شبلی کا یہ پھڑکتا ہوا فقرہ ہے:

''قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل و خوار بنائے گئے، لیکن کیا ۲۵ دسمبر ۱۹۱۲ کے بعد بھی جس دن.....ایک یہودی کو ہاتھ آئی۔

مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا اس لئے تو نہیں کہ
میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا''

شبلی کے معاندانہ ناقدوں نے ان کے سفر بمبئی کی تاویل نہایت ہی رومانی انداز میں کی ہے۔ شیخ محمد اکرام کے خیال میں شبلی کا بار بار بمبئی جانا اس لئے ہوتا کہ انھیں عطیہ کے ''آستانۂ محبت'' پر جبہ سائی کا موقع ملا کرتا تھا۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں۔

''انھوں نے (شبلی) نے لکھنؤ سے بہت دور ایک آستانہ ڈھونڈ لیا جہاں ایک حسن پرست شاعر کے دل کی ساری حسرتیں پوری ہوئیں۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''اپنے ذوق نظر کی تسکین کے لئے مولانا اگلے ماہ دوبارہ بمبئی جانا چاہتے تھے''

یہ بھی لکھا:

''(شبلی) بمبئی آتے تو مس عطیہ فیضی کا آستانہ ہوتا''

اور یہ بھی فرماتے ہیں:

''(شبلی) بمبئی یا جزیرہ جاتے تب بھی ان کا معمول تھا کہ اپنے عزیز میزبانوں سے اس وقت ملتے جب صبح صبح اپنے ''وظیفۂ عملی'' سے فارغ ہو جاتے اور اپنا تصنیفی کام ختم کر لیتے''

جبکہ شبلی کا یہ حال تھا کہ محمد امین زبیری کے نام خط میں لکھا:

''بمبئی میں سارا دن کام کے لئے ملتا ہے۔ دن بھر کوئی جھانکتا نہیں۔''

پھر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھا:

''سیرت کے اہتمام کے لئے یہیں (بمبئی) کی خاموشی اور سکون درکار ہے۔ دن بھر کوئی جھانکتا تک نہیں اس لئے ارادہ تو یہ ہے کہ جلد اول یہ

ہر جہت تمام کر کے اٹھوں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی تاریخی اور تحقیقی راز کھلتا ہے اور بعض مشکلات حل ہو جاتی ہیں''

شیخ محمد اکرام کافی عرصہ تک بمبئی میں رہ چکے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ ناگپاڑہ اور اپالو کے علاقے سے عطیہ بیگم کی قیام گاہ ''ایوان رفعت'' کا فاصلہ ۵۔۶ کلومیٹر سے کم نہیں۔ پھر ان دنوں جبکہ مالا بار ہل تک نہ ٹرام تھی۔ نہ بس سروس، نہ رکشا نہ ٹیکسی کی آج کی طرح کثرت، تو شبلی لکڑی کے ایک پیر کے سہارے آستانہ عطیہ تک ہر روز کیسے پہنچتے ہوں گے؟ ''خطوط شبلی'' میں تو کئی ایسے خط بھی ہیں جو مولانا شبلی نے بمبئی ہی میں بیٹھ کر عطیہ کو لکھے تھے۔ شیخ صاحب کے اخذ کئے ہوئے بے بنیاد نتیجوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شبلی کو معاندانہ رنگ میں پیش کرنے میں کس قدر آگے تھے۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ شبلی کے بمبئی جانے کا اصلی سبب کیا تھا؟ گزشتہ پا کے واقعہ کے بعد لکڑی کا پیر بنوانے کی غرض سے شبلی بمبئی گئے۔ وہاں کی آب و ہوا انھیں پسند آئی۔ وہ شمالی ہندوستان کی سرگرمی سے پریشان ہو جاتے اور اکثر کسی ٹھنڈے مقام پر چلے جایا کرتے۔ بمبئی سمندر کے ساحل پر واقع ہے۔ یہاں دن کے وقت سمندر کی ٹھنڈی ہوائیں چلا کرتی ہیں۔ شبلی اپنے تحقیقی اور علمی کاموں کے لئے ایسی ہی جگہ چاہتے تھے۔ مکاتیب شبلی کی دونوں جلدیں دیکھ جانے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے لکھے سارے خطوط مئی یا جون کی تاریخوں میں لکھے گئے ہیں۔ عطیہ سے ملاقات کا شوق انھیں کسی اور ماہ میں بمبئی کیوں نہ لے گیا؟ سردیوں میں تو بمبئی کا موسم نہایت خوشگوار ہوتا ہے!

بمبئی میں شبلی یا تو کسی ہوٹل میں مقیم ہوتے یا کمرہ کرایہ لے کر۔ کبھی و
کسی کے مہمان نہیں بنے اور یہی ان کے علمی اور تصنیفی کاموں کے لئے مناسب بھی تھا۔ ان کے پیش نظر سیرۃ النبی اور شعرالعجم، دو بڑی اہم کتابوں کا منصوبہ تھا۔ جس کے لئے انھیں ذہنی اور دماغی سکون کی ضرورت تھی۔ چنانچہ موسم کی مناسبت اور سکون ذہنی کے لحاظ سے انھوں نے بمبئی کا انتخاب کیا اور اس بات کا ذکر اپنے عزیزوں اور احباب کے نام خطوں میں اس طرح کرتے رہے۔

''یا تو سموم لکھنؤ میں جھلس رہا تھا یا یہاں بہشت کی ہوائیں آرہی ہیں۔ تمام دن رات اس قدر ہوا کے جھونکے آتے ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔''
(سید سلیمان ندوی)

''وہاں آگ برس رہی ہے اور یہاں نسیم کے جھونکے چل رہے ہیں۔ نہایت اطمینان سے کام ہو رہا ہے''
(مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی)

''سیرۃ النبی کے لئے بمبئی آیا ہوں، یکسوئی سے کام ہو رہا ہے''
(ایم مہدی حسن)

''میں یہاں بالکل سکون کی حالت میں ہوں۔ اگر ذرا بھی انتشار ہوا تو سیرت کے کام میں خلل پڑ جائے گا۔''
(نواب سید علی حسن خاں)

''ہاں بہتر ہے، یہاں آجاؤ، یہاں نہایت عمدہ موسم ہے۔ گرمی نام کو نہیں، تفریح بھی ہو جائے گی۔'' (مولوی مسعود علی ندوی)

ان اقتباسات سے کیا ظاہر ہوتا کہ بمبئی میں بیٹھ کر شبلی رومان کا تانا بانا تیار کر رہے تھے یا یہ کہ وہ ایسے تصنیفی کام میں مشغول رہے جس میں ایک ایک لفظ پوری تحقیق اور ذمہ داری کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ مترجم ہوتے، اسٹاف ہوتا اور کتابوں کا صندوق جو ان کی متحرک لائبریری بھی تھا۔ وقت اور جن حالات کے تحت شبلی نے جس طرح کام کیا وہ آج کے حالات سے کس قدر مختلف تھے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن ان کے معاندانہ ناقدین کو لے دے کر اتنا ہی بھائی دیا کہ شبلی نے تفریح طبع کی خاطر دو ایک بے تکلف دوستوں کو تفریحی جملے لکھے۔ دس بارہ شوخ اشعار کہے اور کبھی کبھار عطیہ کی صلاحیت اور ان کے مذاق سے خوش ہو کر بے تکلف انداز میں تعریف بھی کر دی تو گویا یہ سب حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں تھیں۔

میں نے اپنی کتاب شبلی (معاندانہ تنقید کی روشنی میں) کے اخیر میں جو لکھا ہے اسی پر یہ مضمون ختم کرتا ہوں۔

''سچ تو یہ ہے کہ چاہے شبلی ''معصوم'' رہے ہوں یا نہ رہے ہوں ''مظلوم'' ضرور ہوئے۔''

☆ ٹیگور کا ایک پریم گیت۔ ایسا لگتا ہے کہ ارجینٹینا کی وکٹوریا او کامپو تھی جسے ٹیگور نے ''وجیہ'' کا نام دیا تھا۔ بنگال میں یہ گیت بہت مقبول ہے۔ ستیہ جیت رے نے اپنی فلم ''چارو لتا'' میں اسے فلمایا تھا۔ رابندر سنگیت سے اردو میں اصل دھن پر ترجمہ: ف۔ س۔ اعجاز

پریم ☆

''بنگلہ مکھڑا: آمی چینی گو چینی تُو مارے او گو بد یشنی
تُمی تھلکو سندھو پارے او گو بد یشنی

I know you,I know you,O lady from distant land!
You live beyond the sea.O lady from distant land.

میں جانوں، جانوں، جانوں تجھے اے بدیشنی
رہتی ندی کے پار تُو ہے اے بدیشنی

تجھے صبح میں نے دیکھا جب رُت خزاں کی تھی
تجھے دیکھا میں نے شب میں، تھی وہ رات مدھ بھری
تجھے دیکھا من میں اپنے میں نے اے بدیشنی

تُو نے جو بھی گنگنائے، تو نے جو بھی گائے گیت
میں نے آسماں سے کان لگا کر سنے وہ میت
میں نے سونپ دی ہے جان تجھے اے بدیشنی

ساری زمیں گھوم لی، تب آیا ہوں یہاں
میرے لئے یہ دیش نیا، ہے نیا جہاں
مہمان تیرے دوار پہ ہے اے بدیشنی

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

اقبال کی ذاتی زندگی کا ایک گوشہ

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا عشق
اتنی نادانی تو دنیا بھر کے داناؤں میں تھی

——اقبال

مبارک ہے ادارۂ ''انشاء'' جس نے ''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' خصوصی نمبر شائع کرنے کا ابتکار حاصل کیا ورنہ موضوع ارتکاز پر توجہ مشکل تھی۔ مملکتِ اردو تنقید میں ہمیشہ مارشل لا نافذ رہا ہے۔ کلیم الدین احمد مرحوم کی یہ صاف گوئی کہ ''اردو میں تنقید کا وجود معشوق کی موہوم کمر ہے یا اقلیدس کا فرضی نقطہ'' ابھی تک بار خاطر بنی ہوئی ہے۔ غزل کو نیم وحشی صنف شاعری قرار دینا اور یہ کہہ ڈالنا کہ اقبال عالمی شاعر نہیں سمجھے جا سکتے در آنحالیکہ انتقادی نکات ہیں مگر ادبیات نا آشنائی کو یہ سب کچھ کیسے برداشت ہوسکتا تھا۔ ایک ذات گرامی نے تو پوری کتاب ہی لکھ ڈالی مگر وہ آج تک ''عالمی ادب'' کی تشریح نہیں کر سکے ہیں۔ کلیم الدین احمد پر ہنوز کوئی خصوصی نمبر نہیں نکالا جا سکا ہے کیوں کہ دشنام طرازی نیز اعراب نگاری سے بھرپور مضامین ہی خصوصی نمبر نکالنے والے مدیروں کو موصول ہوئے۔ یہ سب کچھ خرافات کے تحت نہیں لیا جا سکتا کیوں کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اردو تنقید کی کیسی درگت بنی ہوئی ہے۔

یہی صورتحال اقبالیات کی ہے۔ اقبال پر ۱۹۷۷ء سے لے کر اب تک نہ جانے کتنے سیمناروں کا انعقاد ہو چکا ہے۔ میری شرکت عالمی سیمناروں میں ہوئی ہے، ذاتی تجربہ یہ ہے کہ نومبر ۱۹۷۷ء میں منعقد عالمی سیمنار (وگیان بھون، نئی دہلی) اور فروری ۱۹۸۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقد عالمی سیمنار ہی معیاری کہے جا سکتے ہیں۔ ورنہ اقبال پر قصیدہ خوانی ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیا بغیر بحث وتمحیص اقبالیات یا کسی دیگر موضوع کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے؟ اقبال کو مضرات ذہنی وقلبی کے تحت پیش کرنا حقیقت میں اقبال سے بے اعتنائی برتنے کے مترادف ہے۔ اس ضمن میں ایک اور بات بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید مظفر حسین برنی وہ ماہر اقبالیات ہیں جنھوں نے بعد اسرار و افکار اقبال کو ہندوستانی پس منظر میں پیش کیا بالتفصیل بالتشریح پیشکش کے باوجود ان پر بالواسطہ چھینٹا کشی شروع ہوگئی۔ جس کا جواب باصواب صرف میں نے دیا۔ یہ سب کچھ بتانا اس لئے ناگزیر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اقبال

کو اقبالیات کی روشنی میں دیکھنے والے بہت کم ہیں۔ تحقیق کا نقطۂ آغاز ''شک'' سے ہوتا ہے، باطل پرستی سے نہیں۔ مثلاً ع

برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ان کے آبا و اجداد برہمن نہیں تھے، درزی تھے جو پیشہ ان کے والد بزرگوار شیخ نتھو پر ختم ہوا۔— ''برہمن زادہ'' سے ابھرنے والا ذم کا پہلو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مزید تفصیلات بہت دور پہنچا سکتی ہیں۔ اس موضوع پر ڈاکٹر حیدری کشمیری، عظیم فیروز آبادی اور میں نے بہت کچھ لکھا، جو 'ہماری زبان' میں شائع ہوا۔

آمدن برسر مطلب، اقبال فی الواقع دل ریش رہے۔ ان کی زندگی کی داستان عمر بھر کی داستان ہے۔ چھوٹی عمر میں شادی کر دی گئی تھی اور آگے چل کر وہ اپنی عمر سے قدرے بڑی عمر کی شریک حیات سے مطمئن نہیں رہے۔ سیالکوٹ میں علامہ اقبال ایف۔ اے (F.A) یعنی انٹرمیڈیٹ کلاس تک زیر تعلیم رہے۔ علامہ کے والد غریب ضرور تھے مگر ان کا کردار بے داغ تھا اور اقبال کی والدہ ماجدہ بھی اپنے شوہر کی طرح اسلامی عقائد کی پابند تھیں۔ اقبال کے گھر کا ماحول ہر اعتبار سے اور ہر سطح پر مقلدانہ اسلامی تھا۔ مگر جب اقبال ایم۔ اے کرنے کی غرض سے لاہور آئے تو ان کے جذبات تاثیر حسن سے، چشم نیم باز سے، زلف گرہ گیر سے، خرام ناز وغیرہ سے کیوں کر محفوظ رہ سکتے ہیں۔

اس مسئلے پر اقبال سنگھ نے اپنی تصنیف Ardent Pilgrim جس کو اورینٹ لانگ مین (Orient Longman) نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا، میں لکھا ہے کہ:

''اقبال سے متعلق عام طور پر حسن و عشق کی داستانیں مشہور ہیں۔ اقبال بالعموم اپنی شامیں طوائفوں کے کوچے میں گزارا کرتے تھے، وہ کوچہ جہاں حسن و شباب سے بھرپور لڑکیاں اپنے خریداروں کو حرارتِ قلبی نیز لذت ہم آغوشی سے نوازا کرتی تھیں''۔

(ترجمہ)

اس کی تصدیق ''ذکرِ اقبال'' مصنفہ سالک سے بھی ہوتی ہے۔ سالک کی درج ذیل تحریر سے اقبال سنگھ کی بات کی تائید ہوتی ہے:

''رنگ رلیوں کا ذکر آ گیا تو یہ بھی سن لیجیے کہ اقبال عنفوانِ شباب میں اپنے عہد کے دوسرے جوانوں سے مختلف نہ تھے۔ بلاشبہ وہ مصری ہی کی مکھی بنے رہے، شہد کی مکھی کبھی نہیں بنے اور آج بھی ان کے دیرینہ احباب اس گذرے ہوئے زمانے کی رنگین مجلسوں کی یاد اپنے دلوں سے لگائے ہوئے ہیں''۔

اقبال سنگھ کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ ایک بات کا انکشاف انہوں نے

اپنے ایک مضمون میں کیا تھا جو Organiser (آرگنائزر) ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء
کے کسی شمارے میں مشمول تھا۔ اقبال سنگھ انارکلی بازار سے ملحق ایک کوٹھے
والی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقبال نے ایک طوائف کا گلا داب ہی دیا
تھا۔ اگر اس کو بچانے والے دو دلال نہ آ جاتے تو وہ اس کوٹھے سے قبرستان
پہنچ گئی ہوتی۔

عنفوانِ شباب میں اس نوعیت کی لغزشیں سرزد ہو جانا درآں حالیکہ
معمولی قرار نہیں دی جا سکتیں مگر بیسویں صدی کی اولین دو تین دہائیوں کے
دوران تماش بینی کا شمار گناہ کبیرہ کے تحت نہ ہوتا تھا۔ آداب وضع سیکھنے کے
لئے شرفاء اپنے لڑکوں کو طوائفوں کے ہاں بھیجا کرتے تھے مگر اقبال جس
خاندان کے چشم و چراغ تھے اس کو زمینداروں اور جاگیرداروں کی سطح پر نہیں
دیکھا جاتا تھا۔ بہرکیف معیوب بات معیوب ہی ہوتی ہے، بس یہی کہا جا سکتا
ہے کہ "جوانی دیوانی ہوتی ہے"۔

اب ذرا آگے چل کر دیکھا جائے۔ اقبال کی نوٹ بک جو بعنوان
My Stray Reflections ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی، اقبال کے تاثرات کی
آئینہ دار ہے۔ دو اندراجات ملاحظہ ہوں:

SIN AND PIETY

At least in one respect sin is better than piety. There is an imaginative element in the former which is lacking in th latter. (p.108)

VIRTUOUS PEOPLE

Sin has an educative value of its own. Virtuous people are very often stupid. (p.109)

گناہ و زھد

"کم از کم ایک اعتبار سے گناہ کو زہد پر برتری حاصل ہوتی ہے۔
گناہ کرنے کے لئے تصور کا عنصر بہت ضروری ہے اور یہ عنصر زہد میں سرے
سے ناپید رہتا ہے"۔

متقی اشخاص

"گناہ میں ایک تعلیمی پہلو ہوتا ہے۔ بسا اوقات متقی لوگ بالکل بے
وقوف ہوتے ہیں، نرے بودم ہوتے ہیں"۔

اقبال زندہ جذبات کے نوجوان تھے۔ سیالکوٹ کی رنگ رلیوں کا
علم "خدوخالِ اقبال" کے ذریعہ ہوتا ہے مگر مشمولات و مرویات کے ذرائع
کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ لاہور کا ذکر آ ہی چکا ہے۔ اقبال نے ۱۹۰۵ء میں
تھرڈ ڈویژن میں ام۔ اے کی ڈگری فلسفہ میں حاصل کی تھی۔ ۲۶-۲۷ سال

(؟) کی عمر تھی۔ یعنی دس سال لاہور میں گزارے، ۴ سال زیر تعلیم رہے اور ۶ سال اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ شاعری میں اور اپنی طرز زندگی میں بھی اقبال نے راہبانہ طرز و طریق کو کبھی پسند نہیں کیا۔ ''رموز بیخودی'' میں اعتراف بھی ملتا ہے۔

مدتی بالالہ رویاں ساختم عشق با مرغولہ مویاں ساختم
بادہ با ماہ سیمایاں زدم بر چراغ عافیت داماں زدم
برق ہا گردید گرد حاصلم رہزناں بردند کالائے دلم

الغرض اقبال ''متقی'' نہ تھے، زندہ دل نوجوان تھے۔ لاہور میں البتہ ''تصور'' کی ضرورت نہ تھی مگر یورپ میں ''تصور'' درکار تھا بالخصوص عطیہ بیگم سے روابط کو قربت کی سطح پر لانے کے لئے۔ غالباً یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ Iqbal's Letters to Attiya Begum یعنی مکاتیب اقبال بنام عطیہ بیگم ۱۹۴۷ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئے، عطیہ بیگم نے حیدر آباد ریاست کے امیر پایگاہ نواب حسن یار جنگ کے اصرار پر اقبال کے خطوط شائع کرائے۔ اقبال کے بڑے بھائی کے نور چشم جناب اعجاز احمد نے جو قادیانی سلسلہ میں بیعت ہیں، اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں عطیہ کے خطوط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی طباعت نازیبا رہی ہے مگر طباعت کیوں گراں خاطر ثابت ہوئی۔ اس پہلو پر انہوں نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ بایں ہمہ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اگر مکاتیب ہذا کو پس پردہ ہی رکھا جاتا تو اقبالیات میں معاشقے شامل نہ ہوتے۔ عطیہ بیگم نے اقبال کے خطوط کیوں شائع کرائے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے دامن پر کوئی داغ کیوں کر گوارا کر سکتی تھیں۔ عطیہ معمولی خاندان کی فرد نہ تھیں اور ان کی شادی شاہی خاندان میں ہوئی۔ چونکہ موصوفہ کی دریچہ بند ماحول میں پرورش نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ زندہ دل و دماغ کی حامل رہیں۔ مولانا شبلی، یہاں مرحوم کا ذکر ناگزیر سا ہو گیا ہے، بجائے دل پھینک انسان تھے اور وہ بھی دل و جان سے عطیہ پر فدا تھے۔ اکثر و بیشتر اپنا اردو فارسی کلام عطیہ بیگم کو پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ بمبئی کا ذکر ملتا ہے۔ دیکھئے ایک وہ شعر جو مولانا شبلی نے عطیہ بیگم کو پیش کیا تھا۔

رسم و آئین ہم آغوشی نمی دانم کہ چیست
دست گستاخ آنچہ فرمودہ ست من آں کردہ ام

یعنی ''ہم آغوشی'' کے دوران کیا ملحوظات پیش نظر رہنا چاہئیں میں نہیں جانتا۔ البتہ میں نے ''وہ'' کیا ہے جو میرے ''دست گستاخ'' کا حکم تھا۔ فارسی میں ''دست گستاخ'' ماہرانہ کارکردگی کو بھی کہتے ہیں۔ مگر اس ترکیب کا یہ معنوی رتبہ بالعموم بہت کم فارسی داں ہی جانتے ہوں گے۔ عام مفہوم میں یا خاص معنی میں، دونوں اعتبار سے شعر ہذا ایک لڑکی کو پیش کیا جائے، بڑی نازیبا بات معلوم ہوتی ہے۔

اقبال مولانا نہیں تھے، وہ Clean shave نوجوان تھے لہٰذا اقبال نے عطیہ بیگم کو لکھے گئے خطوط میں بجائے محتاط رویہ پیش نظر رکھا، جو فی الواقع ان کی معاملہ فہمی پر دلالت کرتا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ ''عشق و مشک

پیچھے نہیں رہ سکتے۔''

اقبال کے جملہ خطوط انگریزی میں ہیں، اور ان تحریروں کے عکس Iqbal's Letters to Attiya Begum میں مشمول ہیں۔ من حیث المجموع، اقبال نے کئی خطوط میں اپنی غمزدگی کا ذکر کیا ہے کہ ان کی شادی میں ان کی رائے والدین نے لینا غیر واجب سمجھا ہوگا۔ ہر ایک کو مسرت حاصل کرنے کا حق ملنا چاہئے، اگر سماج سے یہ سب کچھ دستیاب نہیں ہوسکتا تو..... ''اس کے لئے یہی ایک رائے ہے کہ میں ایسے بدقسمت ملک کو خیر باد کہہ دوں یا اپنے غم کو شراب نوشی میں غرق کرنے لگوں، جو خودکشی کو آسان ترین بناسکتی ہے۔''

جرمنی سے ''دورافتادہ'' اقبال نے یہ نظم عطیہ بیگم کو ارسال کی۔

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے [1]
میرے پہلو میں دلِ مضطر نہ تھا سیماب تھا
ارتکابِ جرمِ الفت کے لئے بے تاب تھا
از نفس در سینہ خوں گشتہ نشتر داشتم
زیرِ خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتم
غازۂ الفت سے یہ خاک سیہ آئینہ ہے
اور آئینے میں عکس ہمدمِ دیرینہ ہے
تو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کردی و آداب فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاک مرا واسوختی

(صفحہ ۳۱)

ایک دوشیزہ کے دل میں اترنے کے لئے یہ اچھے جذبات ہیں۔ تنظیم نفسیات میں بھی Love approach (رسائی الفت کے لئے اقدامات) پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگر موضوع پر پیش کردہ خیالات کی تلخیص پیش کی جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ بالعموم دوشیزائیں اپنی تعریف وتوصیف سے خوش ہوتی ہیں مگر اس تعریف وتوصیف سے جس کا تعلق ایسے اوصاف سے ہو جن کی وہ حامل ہوں ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے ؏

سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

اس ضمن میں یہ بھی بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دل جیتنے کی کوشش بڑی ہوشیاری کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس میں طالب ومطلوب دونوں کی ساجی

---

[1] نہ معلوم کیوں عطیہ نے گل کے عنوان سے بانگ درا میں مشمول اشعار کا ذکر نہیں کیا۔ اعجاز احمد نے ''مظلوم اقبال'' میں لکھا ہے کہ یہ نظم بھی عطیہ کو پیش کی گئی تھی۔ پہلا شعر ہے ۔

جب دکھاتی ہے سحر عارض رنگیں اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینۂ زرزیں اپنا

عطیہ نے یہ خط کیوں نہیں شامل کیا۔ غالبًا کوئی راز ہوگا۔ ناشنیدہ نغمات شنیدہ نغمات سے زیادہ شیریں ہوتے ہیں۔ — (رشتوگی

اور نفسیاتی سطح بہت بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ اقبال تعلیمی و ذہنی اعتبار سے خاصی وقیع سطح کے حامل ہو چکے تھے۔ وہ پہلے اردو شاعر تھے جو یورپ کو تحصیل علم کے لئے گئے۔ مگر سماجی پوزیشن کے لحاظ سے عطیہ بیگم کا درجہ اقبال سے بلند و برتر تھا۔ مزید برآں خواتین کو سماجی وقعت و فوقیت کا پاس و لحاظ رہتا ہے۔ یہ احساس مردوں میں اتنا شدید نہیں ہوتا۔ لاہور سے پوسٹ کئے گئے ایک مکتوب سے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

"..........I generally make up my mind to do a certain thing and then give myself up to circumstances leaving them to carry me whither they will. You are not conscious of what good you have done me......this is true and bitter too. You could not have been conscious of it, but cannot give an expression to it.

Let us drop the subject. It would be futile on my part to describe the indescribable, and then you say you are not open to conviction..............you say I have no regard for your wishes!! This is indeed strange for I always make it a point to obey your wishes....................."

(pp.46-52)

یعنی۔ "...... بالعموم میں کسی کام کو انجام دینے کا پہلے تو ارادہ کرتا ہوں اور پھر اس کے بعد خود کو حالات کے حوالے کر دیتا ہوں، اس سے لاتعلق ہو کر کہ حالات کہاں لے جائیں گے۔ تم نہیں جانتیں کہ تم نے مجھ پر کیا کرم کیا ہے، یہ حقیقت ہے، ساتھ ہی تلخ حقیقت بھی ہے۔ میں اس "کرم فرمائی" کو الفاظ نہیں دے سکتا۔ اچھا یہی ہے کہ اس موضوع کو یہیں ختم سمجھا جائے۔ ناقابلِ بیان کو کس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور تم کہتی ہو کہ اس پر اعتماد نہیں رکھتیں...... کیا کہا، میں تمہاری خواہشات کا لحاظ نہیں رکھتا۔ بڑا عجیب الزام ہے جبکہ میں "خواہشات کا لحاظ" نہ رکھنے کو حکم عدولی کے مترادف سمجھتا ہوں...."

خط خاصا طویل ہے۔ اقبال کبھی کبھی دل چیر کر دکھانے کو تیار نظر آتے ہیں مگر ہوش مندی ان کو مابعد الطبیعاتی پہلو کی جانب مائل کر دیتی ہے یعنی ع

چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

عطیہ بیگم (ملحوظ رہے، اس دوران وہ عطیہ فیضی تھیں) نے خطوط کے ساتھ اپنے مشاہدات و تاثرات بھی قلمبند فرمائے ہیں۔ انھوں نے اقبال

کے تحقیقی مقالے کا بھی ذکر کیا ہے۔ تحقیقی مقالہ The Development of Metaphysics In Persia یعنی ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' یہ موضوع ہی ہے جس پر اقبال کو Certificate of Research یعنی تحقیق میں مشغول ہونے کی سند کیمبرج یونیورسٹی نے دی تھی۔ جرمنی آ کر اقبال نے مس ویگ ناسٹ اور مس سی شیل کی نگرانی میں اسی موضوع پر دوبارہ نظرثانی کی اور میونخ یونیورسٹی (Munich University) سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بطور جملہ معترضہ، اقبال کی تصانیف میں اس تصنیف کو بجا طور کمزور سمجھنا چاہیے۔ غالباً ہندوستان کی کسی یونیورسٹی نے بھی ایسے کام کو درخور اعتنا نہ سمجھا ہوتا۔ گمان غالب یہ ہے کہ اقبال بھی اس حقیقت سے ناآشنا نہ تھے کیونکہ جب ایک صاحب نے تصنیف ہذا کا اردو ترجمہ کرنے کی اجازت طلب کی تو اقبال نے اجازت تو دے دی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا کہ اب اس موضوع پر بہت کچھ کام کیا جا چکا ہے۔ یہ نکتہ جو بظاہر یہاں بے محل سا معلوم ہوتا ہے خاصا وقیع ہے، مگر بھرپور توجہ دینے پر۔ مس ویگ ناسٹ اور مس سی شیل (Profs Frau Wegnast & Fraulein Seneschal) کے تبحر علمی اور حسن و جمال نے اقبال کو بالکل مسحور کر رکھا تھا۔ فلسفہ پر دونوں پروفیسروں کو بھرپور عبور بھی تھا اور دونوں وسیع ترین معنویت کے ساتھ فلسفیانہ نکات پر روشنی ڈال سکتی تھیں۔ انگلینڈ میں اقبال کے مزاج میں ترش روئی نیز منکرانہ رجحان (Cynic, P-24) نے گھر کر لیا تھا جرمنی کے ماحول نیز حسن کے جھرمٹ میں اقبال بدل ہی گئے۔

عطیہ کے ساتھ اقبال متعدد پارٹیوں میں شریک ہوئے۔ اقبال، سر عبدالقادر اور عطیہ کے ساتھ سید علی بلگرامی سے نیاز حاصل کرنے پہنچے، سید موصوف ان دنوں کیمبرج (برطانیہ) میں اقامت پذیر تھے (ملحوظ رہے، سید بلگرامی ہی نے اقبال کے والد ماجد کو سنگر سلائی مشین خرید کر دی تھی اور شیخ نتھو نے برقعے کی ٹوپیاں فروخت کرنے کا کام بند کر کے خیاطہ کا پیشہ اختیار کر لیا)۔ اقبال نے سر عبدالقادر سے عطیہ وغیرہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"If ever I faced the prospect of courting a failure in life, it was with Miss Faizi, who out of sheer CNSIDERATION FOR you saved me by not declining your invitation" (P.16)

اقبال نے یہاں اعتراف شکست تو کیا ہے مگر اس اعتراف شکست کا سرچشمہ مس فیضی یعنی عطیہ بیگم کو تاکہ ان کے دل میں گھر پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔ نفسیاتی جائزہ اسی پر منتج ہوتا ہے کہ اقبال کو عطیہ فیضی کی رفاقت بھی حاصل تھی، اور ان کی ہمدردی اقبال کو اپنے دائرے میں بھی کھینچ چکی تھی۔ مگر یہ رفاقت کبھی اختلاط کی منزل پر نہیں پہنچ سکی۔ اقبال اس محبت میں ''جمع انداز'' ثابت نہ ہو سکے۔ مابعد الطبیعات بسا اوقات منزل سے دور پھینک دینے والی تنظیم ثابت ہوئی ہے۔

یوروپ سے اقبال کیمبرج یونیورسٹی سے Certificate of Research) ریسرچ سرٹیفکیٹ)' بیرسٹری کی ڈگری لے کر اور پی۔ ایچ۔ ڈی

ہوکر ہندوستان واپس آگئے مگر اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اگر عطیہ کو مانوس کرنے میں ناکامیاب نہ ہوئے ہوتے تو تعدد ازدواج سے بچ گئے ہوتے۔ یہی نہیں بلکہ مغرب کی ثقافتی و مفکرانہ اقدار کے خلاف شاعرانہ محاذ بھی قائم نہ ہوا ہوتا۔

ـ فکر او از تاب مغرب روشن است
ظاہرش زن، باطن او نازن است

ـ جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

ـ ایں گل از بستان ما را رستہ بہ
داغش از دامان ملت شستہ بہ

ـ فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

ـ کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟
مرد بیکار و زن تہی آغوش

کیا اس نوعیت کے اشعار وہ عطیہ کو پیش کر سکتے تھے؟ عورت کا تصور اقبالیات کے وسیع دامن کو داغ داغ کرتا نظر آتا ہے۔ محبت میں ناکامی ان کی عاشق مزاج طبیعت پر اثر انداز ہوئی۔ دیکھئے اقبال کی بابت ان کے دوست کے۔ ایل۔ گابا (K.L.Guaba) صاحب کیا کہتے ہیں مگر اس کے پیشتر گابا صاحب کا تعارف پیش کرنا بھی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ کنہیالال گابا پنجاب کے ایک کروڑ پتی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم و تربیت یوروپ میں ہوئی مگر تھے بہت دل پھینک شخص۔ ایک لڑکی سے شادی کرنے کے چکر میں پھنس گئے اور اقبال کے مشورہ پر حلقہ بگوش اسلام ہونے پر راضی ہو گئے۔ اقبال نے ان کا اسلامی نام خالد لطیف گابا تجویز کیا، جو کنہیالال صاحب نے بھی پسند فرمایا۔ گابا صاحب قلم تھے۔ کیتھرین میو کی تصنیف Mother India (مادر ہند) کا بھرپور جواب گابا ہی نے دیا۔ ان کی تصنیف کا نام ہے Uncle Sam چچا سیم، موخرالذکر لفظ امریکی کردار کی علامت، عالمگیر علامت ہے)، جو کلاسیکی معیاری تصنیف تصور کی جاتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد گابا صاحب دہلی چلے آئے۔ ان کی آخری تصنیف کا نام ہے:

K.L. Gauba: FRIENDS & FOES
(New Delhi, Indian Book Company, 1947)

اقبال کے بارے میں مندرجہ ذیل اقتباسات قابل توجہ ہیں:

".........Iqbal was a disappointed man......... not a happy domestic life:..........serious differences with his son who was a very brilliant youth......... Iqbal had married a girl much younger to him and so had serious problems ....Died lonely and disappointed...........He should be judged as a poet, than as a lawyer........"

(Ph. 104, 105, 164, 165)

گاہا نے بڑا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اقبال کا بڑا لڑکا آفتاب اقبال جس کو عاق کر دیا گیا تھا ذی علم و دانش نوجوان تھا۔ اقبال نے ایک کم عمر کی لڑکی سے شادی کر لی تھی جس سے شدید ازدواجی مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ اقبال کی موت ایک اکیلے ناامید آدمی کی موت تھی یعنی علامہ اپنی آخری منزل میں الگ تھلگ پڑ گئے تھے اور ان پر ناامیدی کا گہرا سایہ تھا۔

۴۷ء کے اواخر میں گاہا صاحب کی تصنیف چڑانا نگہ کالج ٹانگہ (آسام) میں جب میں وہاں پرنسپل تھا، لائبریری کے لیے منگوائی گئی۔ اس کتاب کو پڑھ کر دل میں یہ آرزو کروٹ لینے لگی کہ اگر دہلی جانا ہوا تو میں گاہا صاحب سے نیاز حاصل کروں گا۔ کچھ ہی عرصہ بعد غالباً مارچ ۴۸ء میں یو۔ جی۔ سی کے کام پر دہلی پہنچا اور بہ مشکل تمام گاہا صاحب تک رسائی حاصل کی۔ گفتگو خاصی طویل رہی۔ اقبال کی علالت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اقبال مقویات وہبیات کے عادی ہو گئے تھے۔ کیونکہ بڑھاپے میں یعنی ۵۲/۵۱ سال کی عمر میں ایک بہت کم سن لڑکی سے شادی کر چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اعضائے رئیسہ جواب دے گئے نیز صوتی نلی بھی بری طرح متاثر ہو گئی۔ گاہا صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر (میں نام بھول رہا ہوں، کوئی ہندو تھے) سے انھیں یہ معلوم ہوا کہ اقبال وی ڈی (V.D) جیسی علامات رکھنے والے مہلک مرض کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں۔ بالآخر اپریل ۱۹۳۸ء کے ایک منحوس دن کو واصل بحق ہو گئے۔

عطیہ بیگم نے اقبال کے خطوط کے ساتھ اپنے تاثرات بھی سپردِ قلم کیے ہیں۔ کتاب اس پیراگراف پر ختم ہوتی ہے۔ پیراگراف کے کچھ حصے حذف کر دیے گئے ہیں۔

"The social custom in India..... are held in paramount in India, and one is forced to abide by the will, wishes and dictates of the family. This method has caused the ruin of a number of men and women of genius, and Iqbal's instance is a most cruel tragedy, caused by such family obstinacy Iqbal as I knew him in Europe was never the same personality in India,.........In India his brilliance was bloted out, and as time went on this blot permeated his entire consciousness. He moved and lived dazed and degrded in his own mind, for he knew what he might have been.........."

(P 87 A. Begum: IQBAL'S Letters To Attiya Begum)

غالباً، عطیہ صاحبہ کو پہلی شادی ہی کی بابت علم تھا، جو واقعی والدین نے اپنی مرضی سے کی تھی مگر دوسری اور تیسری بیگمات کو اقبال ہی نے پسند کیا تھا۔ بات غالباً یہ ہے کہ

خشت اول در نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

قدم بھی ڈگمگا گئے۔ یوروپ پہنچ کر انھیں ایسی خواتین ملیں جو حسن صورت کے ساتھ ساتھ زیبائی علم و دانش کی بھی حامل تھیں۔ الغرض دوسری اور تیسری شادیاں بھی اقبال کے مزاج کو توازن نہ بخش سکیں۔ ہندوستان واپس آ کر اقبال یوروپ والے اقبال نہیں رہے۔ ان کے تمام تر شعور و لاشعور پر کسمپرسی طاری ہو گئی۔ غالباً اسی وجہ سے ان کے کلام میں بھی جارحیت سی پیدا ہو گئی۔ مگر یہ امور نفسیاتی تجزیہ کے تحت آتے ہیں، جو یہاں پیش کرنا غیر ضروری ہے۔

بایں ہمہ، مستخرج یہ ہے کہ لاہور آ کر اقبال کی ذہنی و نفسیاتی بلوغیت خیالات و تصورات کی جانب رواں دواں ہونا شروع ہوئی۔ یوروپ پہنچ کر ایک نئے وسیع افق و شفق خیالات و تصورات کے اجالے ان کے چشم و دل میں بھرپور طور پر سما گئے۔ پری پیکر، ذی علم و دانش نیز جلوہ کار خلوت و جلوت دوشیزائیں اقبال کو یوروپ ہی میں ملیں۔ اقبال نے عطیہ سے بے پناہ محبت کی، زیر لب اس کا اظہار بھی کیا اور مکاتیب میں بالواسطہ طور پر بہت کچھ لکھا بھی۔ مگر عطیہ کے دل میں وہ جذبات ترحم ہی بیدار کر سکے۔ ہندوستان واپس آ کر انھیں ایسا ضرور محسوس ہوا کہ جنت بدر کر دئے گئے ہیں۔ نفسیاتی ناآسودگی نے مسرت اور تلذذ احساسات سے اقبال کو محروم و دل شکستہ کر ڈالا۔ اور یہ کیفیت یعنی احساس محرومی آخر تک مسلط رہی۔

ہزاراں سال با فطرت نشستم
باو پیوستم و از خود گسستم
ولیکن سرگذشتم این دو حرف است
تراشیدم، پرستیدم، شکستم

عاشق مزاج اقبال ہی ایسے شعر کہہ سکتا تھا۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوند دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر
یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہر پیمان محبت نیست سوگند دگر

ے ساقی بیار بادہ و بزم شبانہ ساز
مارا خراب یک نگہ محرمانہ ساز

ے چناں پیش حریم او کشیدم نغمۂ دردے
کی دادم محرماں را لذت سوز جدائی ہا

ے من درون سینہ خود سومناتی ساختم
آستان کعبہ را دیدم جبیں فرسودہ بود

(نوٹ: یہ شعر اقبال کا ہے درآں حالیکہ کسی مجموعۂ کلام میں مشمول نہیں ہوا)۔

اقبال کے شاعرانہ کردار کو پیش عشق ہی نے عظمت بکنار کیا۔

اقبال غزل خواں را کافر نتواں گفتن
سودا بہ دماغش زد از مدرسہ بیروں بہ

غالباً، بے علیہ ہی وہ شعری عطیات حاصل کر سکے۔ وہ ذوق
حضوری میں داستاں در داستاں محو گفتار رہے۔ مگر اپنے دل کی بات نہ کہہ سکے

بہ حرفی می تواں گفتن تمنائے جہانی را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانی را

حوالے:

(۱) Stray Reflections۔ (۲) کلیاتِ اقبال فارسی و اردو

(۳) Iqbal Letters to Attiya Begum

(۴) Friends & Foes۔ (۵) مظلوم اقبال

(۶) حالات گزیدہ و عمر رسیدہ حافظ۔ (۷) Ardent Pilgrim

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

فتنۂ حسن

ف۔س۔ اعجاز

شام کے زرد سورج سے بچھڑی ہوئی
اک سنہری کرن
بند کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا گئی
دیر تک رقص میں ایک شعلہ رہا
میں بہت محو تھا
اس سے تھا بے خبر
کب وہ جانی کرن
سوئی بن کر میرے دل کو بر ما گئی
جب ہوئی اک چبھن
میں نے سسکی بھری
سارے دن کی کھلی دھوپ سے تمتمائے ہوئے
میرے دیوار و در
مجھ پہ ہنسنے لگے
طنز کرنے لگے اور کہنے لگے
''اب وہ دل میں چھپی ہے تو کیا حال ہے؟''۔

علامہ اقبال۔۔۔ایک محبوبہ' تین بیویاں' چار شادیاں

سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اردو زبان و ادب کا نہ تو کوئی محقق ہوں اور نہ ہی سکالر۔ میں نفسیات کا طالب علم ہوں اور اپنے کلینک میں ایک نفسیاتی معالج Psychiatrist کے طور پر کام کرتا ہوں۔ میں ایک طویل عرصے سے تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں Creative Personalities کے بارے میں تحقیق کر رہا ہوں۔ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ شاعر' ادیب اور فنکار عام لوگوں کی نسبت نفسیاتی مسائل کا زیادہ شکار ہوتے ہیں اور اگر ان کا بر وقت نفسیاتی علاج نہ ہو تو وہ ارنسٹ ہیمنگوے Ernest Hemingway اور سلویا پلاتھ Sylvia Plath کی طرح خودکشی کر لیتے ہیں۔ میں نے اپنی تحقیق میں پہلے مغربی فنکاروں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کیا جن میں ورجینیا وولف Virginia Woolf اور ونسنٹ وین گو Vincent Van Gogh کے علاوہ کئی اور فنکار بھی شامل تھے۔

مغربی فنکاروں کی زندگیوں کے مطالعہ کے بعد میں نے مشرقی ادیبوں اور شاعروں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ اور تجزیہ کیا اور مندرجہ ذیل مضامین لکھے

۔۔میر تقی میر کا فن اور پاگل پن

۔۔مصطفیٰ زیدی اور تخلیقی خودکشی Mustafa Zaidi and Creative Suicide

۔۔ساقی فاروقی کا نفسیاتی تجزیہ Saqi Phenomenon

علامہ اقبال کے بارے میں مضمون اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

اقبال کی شخصیت کا ایک پہلو فلسفیانہ اور شاعرانہ ہے جس کے بارے میں میں ایک مضمون اقبال۔۔۔ایک مسلم ریفارمر لکھ چکا ہوں۔ اس دفعہ میں ان کی شخصیت کے رومانوی اور نفسیاتی پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔ میری نگاہ میں ہر فنکار کی شخصیت کے دونوں پہلو اہم ہوتے ہیں۔ ماہرینِ فن ایک پہلو پر اور ماہرینِ نفسیات دوسرے پہلو پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ میری نگاہ میں فنکار اس لیے نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ وہ غیر روایتی افکار اور کردار رکھتے ہیں۔ عارف عبدالمتین کا شعر ہے

میری عظمت کا نشاں' میری تباہی کی دلیل
میں نے حالات کے سانچوں میں نہ ڈھالا خود کو

مجھے امید ہے آپ میرے مضمون کو ادبی اور اخلاقی حوالے سے نہیں' نفسیاتی حوالے سے پڑھیں گے۔ ہوسکتا ہے اس میں آپ کا علامہ اقبال کی ذات

کے چند نئے پہلوؤں سے تعارف ہو۔

میں نے ایک دفعہ احمد فراز سے پوچھا تھا کہ آپ نے اپنی سوانح عمری کیوں نہیں لکھی تو وہ فرمانے لگے' آدھا سچ میں لکھنا نہیں چاہتا اور پورا سچ سننے کے لئے ابھی ہماری قوم تیار نہیں ہوئی' امید ہے آپ پورا سچ سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

خالد سہیل

اقبال کا شعر ہے

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اور جب دل تنہا رہ جاتا ہے تو عجب نفسیاتی معجزے اور رومانوی کرامات دکھاتا ہے اور آج میں آپ کے سامنے ان ہی معجزوں اور کرامات کی کہانی لے کر حاضر ہوا ہوں۔

جب ہم شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ حساس دل' ذہین دماغ اور پرکشش شخصیت رکھنے کے باوجود بہت سے رومانوی تضادات کا شکار رہے ایسے تضادات جو ان کی خوشیوں کی راہ میں کانٹے بوتے رہے اور وہ عمر بھر ایک داخلی کرب اور اذیت کو برداشت کرتے رہے۔

علامہ اقبال کی شخصیت کے ڈھکے چھپے نفسیاتی تضادات اس وقت ابھر کر سامنے آئے جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایشیا سے یورپ تشریف لے گئے۔ علامہ اقبال جب مشرق کی رومانوی گھٹن کی شکار فضا کو چھوڑ کر مغرب کی آزاد فضا میں داخل ہوئے تو انہیں یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ان کی شخصیت اس قدر مقناطیسیت کی حامل تھی کہ مختلف ثقافتوں کی حسین و جمیل عورتیں ان پر فریفتہ ہونے کے لئے تیار تھیں۔ موہن داس گاندھی تو لندن آ کر بھی گوشت' شراب اور عورت سے مجتنب رہے لیکن اقبال نے مغرب کی نعمتوں سے پوری طرح استفادہ کیا اور نجی دوستیاں بنانے اور نبھانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ ان دوستیوں میں مغرب کی حسین دوشیزائیں بھی شامل تھیں اور مشرق کی دختران خوش گل بھی اور ان دختران خوش گل میں سے ایک عطیہ فیضی تھیں۔

اقبال اور عطیہ فیضی کے رشتے نے قلیل عرصے میں قربتوں کا طویل فاصلہ طے کر لیا اور ان کے راہ و رسم اتنے بڑھ گئے کہ شام کو مل کر کھانا کھانے کے بعد دیر تک چہل قدمی کرنا اور زندگی کے اسرار و رموز کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا ان کا معمول بن گیا۔ اقبال عطیہ فیضی کے حسن و جمال کے ہی نہیں ان کی ذہانت اور قابلیت سے بھی متاثر تھے۔ وہ عطیہ کی رائے کا اتنا احترام کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسس کے بارے میں ان کی قیمتی رائے مانگی تھی۔

جب ہم عطیہ فیضی کی ڈائری پڑھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا رشتہ اس موڑ تک پہنچ چکا تھا جہاں دوستی اور محبت آپس میں بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ عطیہ لکھتی ہیں کہ ایک دن جب وہ اقبال کے دوستوں اور اساتذہ کے ہمراہ ان کے گھر گئیں تا کہ انہیں پکنک کے لئے لے جا سکیں تو سب نے اقبال کو مرا

میں مستغرق پایا۔ وہ نجانے کب سے دنیا و مافیہا سے بے خبر عالم بے خودی میں کھوئے ہوئے تھے۔ دوستوں نے بہت کوشش کی لیکن وہ اقبال کو ہوش میں نہ لا سکے۔ آخر عطیہ فیضی نے باقی دوستوں کو باہر بھیجا اور اپنی بے تکلفی اور اپنائیت کا سہارا لیتے ہوئے انہیں اتنا زور زور سے جھنجوڑا کہ وہ ہوش میں آ گئے۔ اس ایک واقعہ سے اقبال اور عطیہ کی خصوصی دوستی اور چاہت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عطیہ کی ڈائری سے اندازہ ہوتا ہے جیسے وہ اپنے دوست کی بجائے اپنے محبوب کی کہانی سنا رہی ہوں۔ (حوالہ ۱)

۱۹۰۸ء میں جب اقبال تعلیم ختم کر کے ہندوستان لوٹے تو انہیں ایک نفسیاتی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنے روایتی ماحول اور ناگفتہ بہ حالات سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ گھر اور ملک سے بھاگ جانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ ان دنوں انہوں نے عطیہ فیضی کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے اپنا حال دل رقم کیا ہے۔ اس خط کا ذکر عبدالمجید سالک نے اقبال کی سوانح حیات 'ذکر اقبال' میں بھی کیا ہے کیونکہ وہ خط کئی حوالوں سے بعد میں اقبال کا مشہور ترین اور بدنام ترین خط ثابت ہوا۔ اس خط میں اقبال نے اپنی زندگی سے بیزاری اور غصے کا اظہار کیا ہے۔ اس خط میں انہوں نے اپنی ذہنی اذیت کا کچھ حد تک ذمہ دار اپنی بیوی کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ انکے والد نے نوجوانی میں ان کی زبردستی شادی کر دی تھی اور وہ بندھن ان کے پاؤں کی زنجیر بن گیا تھا کیونکہ اقبال اپنی بیوی سے ذہنی مطابقت محسوس نہ کرتے تھے۔ اقبال نے یہ بھی لکھا کہ کبھی کبھار وہ سوچتے ہیں کہ اپنے تمام دکھوں کو شراب میں گھول کر پی جائیں کیونکہ شراب خودکشی کو آسان بنا دیتی ہے۔ اقبال اپنے ۹ اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں رقم طراز ہیں 'میں بیوی کو نان نفقہ دینے پر آمادہ ہوں لیکن میں اسے اپنے پاس رکھ کر اپنی زندگی کو عذاب بنانے کے لئے تیار نہیں۔ ایک انسان کی حیثیت سے مجھے مسرت کے حصول کا حق حاصل ہے۔ اگر معاشرہ یا فطرت میرے اس حق سے انکار کریں گے تو میں دونوں کے خلاف بغاوت کروں گا۔ میرے لئے صرف ایک ہی چارہ ہے کہ میں اس بد بخت ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں یا مے خواری میں پناہ ڈھونڈوں جس سے خودکشی آسان ہو جاتی ہے۔ کتابوں کے یہ مردہ بے جان اور بنجر اوراق مسرت نہیں دے سکتے اور میری روح کے اعماق میں اس قدر آگ بھری ہوئی ہے کہ میں ان کتابوں کو اور ان کیساتھ ہی معاشرتی رسوم و روایات کو بھی جلا کر خاکستر بنا سکتا ہوں'۔ (حوالہ ۲ صفحہ ۹۵)

(جو لوگ اقبال کو اپنی خاک وطن کا پرستار اور مشرق اور اسلامی روایات کا علمبردار سمجھتے ہیں ان کے لئے 'بد بخت ملک' کے الفاظ اور ان روایات کو 'جلا کر خاکستر' بنانے کا تصور ضرور لمحہ فکریہ ہو گئے)۔

اس خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال ان دنوں ایک شدید ذہنی بحران سے گزر رہے تھے اور ان کی ذات کی گہرائیوں میں اپنی بیوی' روایتی خاندان اور فرسودہ روایات پر مبنی معاشرے کے خلاف چھپا ہوا غصہ سطح پر آ رہا تھا جسے وہ اپنی دوست اور محبوبہ کو بتا رہے تھے۔ عطیہ فیضی نے اس دکھ بھرے خط کا نہایت ہمدردانہ جواب دیا اور مشورہ دیا کہ وہ اپنے قریبی دوستوں سے رجوع کریں اور ان سے نفسیاتی مدد مانگیں۔

جب ہم اقبال کی زندگی کے اس دور کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یورپ سے واپسی پر اقبال ایک دوراہے تک آ پہنچے تھے۔ وہ اپنی شادی سے ہی نہیں' اپنی ثقافت' اپنے مذہب اور اپنی روایات سے بھی بددل ہو گئے تھے۔ وہ ایک شدید نفسیاتی تضاد کا شکار تھے ایک طرف انہیں خاندانی ذمہ داریوں کا احساس تھا اور دوسری طرف وہ یورپ کی آزاد زندگی کے گرویدہ ہو گئے تھے جس میں اور کئی معاشرتی اور رومانوی نعمتوں کے ساتھ ساتھ عطیہ فیضی کی دل موہ لینے والی قربت بھی شامل تھی۔

عین ممکن ہے وہ دل کے نہاں خانوں میں عطیہ فیضی کو اپنانا چاہتے ہوں لیکن اتنی جرأت رندانہ نہ رکھتے ہوں کہ کھل کر اس کا اظہار کر پائے ہوں۔ انہوں نے اشارتاً تو لکھا کہ وہ اپنی بیوی سے ناخوش ہیں لیکن عطیہ فیضی بھی ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ عورت تھیں۔ وہ ایک دکھی شاعر' رنجیدہ فلاسفر اور پریشان حال شوہر کو اپنا شریک سفر نہ بنانا چاہتی تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس کے محبوب کو دوسری بیوی سے زیادہ ایک ماہر نفسیات کی ضرورت تھی۔ عطیہ فیضی اقبال کی مداح تو تھیں لیکن سادہ لوح نہیں تھیں۔

اقبال کو جب اندازہ ہو گیا کہ عطیہ فیضی انہیں اپنا شریک حیات نہیں بنانا چاہتیں اور وہ اپنی پہلی بیوی کے ساتھ رہ کر اپنی زندگی جہنم نہیں بنانا چاہتے تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ انسانی نفسیات کے طالبعلم ہونے کے ناطے میں اس تکلیف دہ حقیقت سے بخوبی واقف ہوں کہ جب انسان نفسیاتی بحران کا شکار ہو اور اس کے اندر غصے اور نفرت کا لاوہ روشن ہو تو وہ جو جذباتی اور رومانوی فیصلے کرتا ہے وہ دانشمندانہ نہیں ہوتے اور یہی حال اقبال کا ہوا۔ انہوں نے اس بحران سے نکلنے کے لئے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کسی کے مشورے پر سردار بیگم سے نکاح کر لیا۔ نکاح کے بعد ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ انہیں گمنام خطوط موصول ہونے شروع ہو گئے جن میں سردار بیگم کے کردار پر کیچڑ اچھالا گیا تھا۔ اقبال ان خطوط سے اس قدر بددل ہوئے کہ انہوں نے سردار بیگم کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ابھی اقبال ان نفسیاتی اور رومانوی تضادات کی کیچڑ سے باہر نہ نکلے تھے کہ انہیں لدھیانے سے ایک اور رشتہ آ گیا اور وہ رشتہ وہاں کے مشہور ڈاکٹر سبحان علی کی بیٹی کا تھا۔ اقبال کی بہن کریم بی بی نے
(جو ان کی پہلی بیوی کی ہم نام تھیں) لدھیانے جا کر دلہن دیکھنے کا مشورہ دیا تو اقبال مان گئے۔

کریم بی بی نے دلہن کی خوبصورتی کی اتنی تعریف کی کہ اقبال نے دلہن دیکھے بغیر بڑے جوش و خروش سے مختار بیگم سے شادی کر لی۔ جب دلہن لاہور آئیں اور اقبال نے انہیں قریب سے دیکھا تو وہ حواس باختہ ہو گئے۔ مختار بیگم بالکل خوبصورت نہ تھیں جس طرح کہ ان کی بہن نے ذکر کیا تھا۔ مختار بیگم سے مل کر اقبال کے خوابوں کے شیش محل چکنا چور ہو گئے۔ جب حالات کی تفتیش کی گئی تو پتہ چلا کہ اقبال سے دھوکہ ہوا تھا۔ دلہن کا نام مختار بیگم تو تھا لیکن وہ ڈاکٹر سبحان علی کی بیٹی نہیں بھانجی تھیں۔ اقبال کو جب حقیقت کا پتہ چلا تو پانی سر سے گزر چکا تھا کیونکہ وہ مختار بیگم کے ساتھ شب عروسی گزار چکے تھے۔

ابھی اقبالؔ اس نفسیاتی اور رومانوی دھچکے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ انہیں دوسری بیوی سردار بیگم کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ وہ اس دن کا انتظار کر رہی ہیں جب وہ آ کر انہیں اپنا شریکِ حیات بنا کر لے جائیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو وہ ساری عمر شادی نہ کریں گی۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ اقبالؔ نے سنی سنائی باتوں اور افواہوں پر اعتماد کر کے جذباتی فیصلے کیے تھے جن کی انہیں ایک ذہین شاعر اور دانشور سے توقع نہ تھی۔ سردار بیگم کا خط پڑھ کر اقبالؔ احساسِ گناہ کا شکار ہو گئے۔ سالک ان کی سوانح 'ذکرِ اقبالؔ' میں لکھتے ہیں کہ اقبالؔ کو جب اس حقیقت کا پتہ چلا کہ وہ گمنام خطوط ایک مقامی وکیل نبی بخش نے لکھے تھے جو اپنے بیٹے کا رشتہ سردار بیگم سے کرنا چاہتے تھے تو وہ اور بھی نادم ہوئے۔ اقبالؔ نے جب کچھ اور دوستوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ سردار بیگم اور ان کے خاندان کو جانتے ہیں اور سردار بیگم ایک صاحبِ کردار خاتون ہیں۔ اقبالؔ کو اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر جلد بازی میں دوسری اور تیسری شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ احساسِ گناہ اور ندامت سے مغلوب ہو کر اقبالؔ سردار بیگم کو گھر لانا چاہتے تھے لیکن اس فیصلے کے بعد وہ ایک اور نفسیاتی تضاد کا شکار ہو گئے۔ اقبالؔ جانتے تھے کہ وہ اپنے دل میں سردار بیگم کو طلاق دے چکے تھے۔ اقبالؔ کو مذہبی دوستوں نے بتایا کہ اسلامی شریعت کا ایک اصول حلالہ ہے جس کے تحت اگر کوئی مسلمان مرد اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہ اس سے اس وقت تک دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا جب تک وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے اور دوسرے شوہر سے طلاق نہ لے۔ اقبالؔ حلالے کے تصور سے اور بھی ذہنی طور پر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے ایک مولانا سے مشورہ کیا۔ مولانا نے فتویٰ دیا کہ اقبالؔ پر حلالے کا شرعی قانون لاگو نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے سردار بیگم کے ساتھ شبِ عروسی نہ گزاری تھی۔ مولانا کے فتوے کے بعد بھی اقبالؔ کا ضمیر نہ مانا وہ اس قدر احساسِ گناہ کا شکار تھے کہ ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہونے کے لئے انہوں نے سردار بیگم کو گھر لانے سے پہلے ان سے ایک دفعہ پھر نکاح کر لیا اس طرح سردار بیگم سے دو دفعہ نکاح ہوا اور وہ ان کی دوسری اور چوتھی بیوی بنیں۔ اس طرح دو سالوں کے وقفے کے دوران اقبالؔ کی زندگی میں تین شادیوں اور دو بیویوں کا اضافہ ہوا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جب اقبالؔ نے اپنی دوسری بیگم اور تیسری بیگم کو یکجا کیا تو ان کی پہلی بیگم کریم بی بی نے بھی سیالکوٹ سے اپنے بچوں آفتاب اور معراج کے ہمراہ لاہور آنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ایک وہ دور بھی تھا جب اقبالؔ لاہور میں اپنی تین بیویوں اور دو بچوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔

شاعرِ مشرق کا یہ کثرتِ ازدواج کا نظام جو نفسیاتی حوالے سے نہایت تکلیف دہ اور غیر حقیقت پسندانہ تھا زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ آخر ایک دن کریم بی بی کی والدہ تشریف لائیں۔ انہوں نے اقبالؔ کو نہایت غیر ذمہ دار داماد قرار دیا اور اس قدر برہم ہوئیں کہ غصے میں اپنی بیٹی اور اس کے بچوں کو لے کر واپس چلی گئیں۔ (حوالہ ۳ ص ۸۰)

اقبالؔ کی سوانح عمریوں سے یوں لگتا ہے جیسے اپنی تینوں بیویوں میں سے وہ اپنی بیوی سردار بیگم پر سب سے زیادہ مہربان تھے۔ وہ تینوں بیویوں میں سے خوبصورت بھی سب سے زیادہ تھیں۔ ایک عرصے تک وہ ان کی پسندیدہ بیگم

رہیں۔ اس رشتے سے ان کے دو بچے جاوید اور منیرہ پیدا ہوئے لیکن آہستہ آہستہ اس شادی کی محبت کی آگ بھی سرد پڑنے لگی۔ وہ خاندانی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآنہ ہو سکے۔ سردار بیگم کو اندازہ ہو گیا کہ علامہ اقبال ایک کامیاب شاعر اور فلسفی تو تھے لیکن ایک ناکام اور غیر ذمہ دار شوہر تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سردار بیگم کے خوابوں اور تمناؤں پر اوس پڑنے لگی اور وہ ناراض اور برہم رہنے لگیں۔ علامہ اقبال کے چھوٹے بیٹے جاوید اقبال نے اپنی سوانح 'اپنا گریباں چاک' میں والدہ اور والد کے رشتے کی نقشہ کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

'میری والدہ کا اصرار تھا کہ والد باقاعدگی سے وکالت کریں کیونکہ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ نیز کرایہ کی کوٹھی میں رہنے کی بجائے اپنا گھر بنوائیں۔ یہ منظر اب تک میری نگاہوں کے سامنے ہے کہ والدہ میرے والد کے ذاتی کمرے میں کھڑی انہیں کوس رہی ہیں اور روتے روتے کہہ رہی ہیں کہ میں اس گھر میں ایک لونڈی کی طرح کام کرتی ہوں اور ساتھ ہی پیسے بچانے کی کوشش میں لگی رہتی ہوں۔ دوسری طرف آپ ہیں کہ بجائے نیک نیتی سے کچھ کرنے کے بستر پر دراز شعر لکھتے رہتے ہیں اور جواب میں میرے والد لیٹے ہوئے بغیر کچھ منہ سے بولے کھسیانی ہنسی ہنس رہے ہیں' (حوالہ ۴ صفحہ ۲۰)۔

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کے عظیم شاعروں' سیاست دانوں اور دانشوروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والا شخص اپنی بیوی کے اعتراضات کا تسلی بخش جواب دینے سے قاصر تھا۔ وہ بیوی اپنے آپ کو ملکہ محسوس کرنے کی بجائے لونڈی محسوس کرتی تھی۔ اگر پسندیدہ بیوی کا یہ حال تھا تو ہم تصور کر سکتے ہیں کہ دوسری بیویوں کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔

علامہ اقبال تین بیگمات کے ساتھ ہندوستان میں زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اپنی دوست اور محبوبہ عطیہ فیضی کو متواتر خط لکھتے رہے۔ اقبال کی رومانوی زندگی ایک حوالے سے کئی اور مشرقی شاعروں سے مختلف نہ تھی جن کی محبوبہ کبھی ان کی بیوی نہ بن سکی اور بیوی کبھی محبوبہ نہ بن سکی۔

اقبال کبھی ہندوستان چھوڑ کر بقیہ زندگی گزارنے یورپ تو نہ گئے لیکن ساری عمر یورپی خواتین سے متاثر رہے اور وہ بھی ان کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوتی رہیں اور دور دور سے ان سے ملنے آتی رہیں۔ اقبال بھی ان سے بڑے تپاک سے ملتے اور اپنے انداز تکلم سے ان کا دل موہ لیتے۔ جاوید اور منیرہ کی والدہ کی وفات کے بعد بھی انہوں نے کسی ہندوستانی خاتون کی بجائے ایک جرمن نژاد خاتون کو گھر میں رکھا تھا تاکہ وہ بچوں کی نگہداشت کر سکے۔ وہ خاتون جرمن' انگریزی اور اردو سے واقف تھیں اور بچے انہیں آنٹی ڈورس کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بچوں سے نہایت شفقت سے پیش آتی تھیں۔ نفسیاتی طور پر یوں لگتا ہے جیسے ڈورس بچوں کو محبت مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کی یورپ کی نوسٹلجیا کی ضرورت بھی پوری کرتی تھیں۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اقبال نے اپنے فرزند ارجمند جاوید کے لئے بچپن میں ایک یورپی ماں تلاش کی لیکن جوانی میں ان سے شکایت کی

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

جاوید اقبال نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ ایک ہندوستانی عورت ان کا

اور ان کی بہن کا والدہ کی وفات کے بعد خیال رکھنا چاہتی تھیں لیکن وہ اقبال سے شادی بھی کرنا چاہتی تھیں۔ اقبال نے اس عورت کی دعوت کو قبول نہ کیا تھا۔

سالک 'ذکرِ اقبال' میں لکھتے ہیں کہ ایک ہندو عورت بھی اقبال کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ وہ ایک صاحب ثروت ڈپٹی کمشنر کی بیٹی تھیں جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہندو مردوں کی نسبت مسلمان مردوں میں زیادہ رومانوی دلچسپی رکھتی ہیں۔ انہوں نے اقبال سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی اور رشتہ بھیجا لیکن اقبال نے انکار کر دیا۔

علامہ اقبال کی بہو رشیدہ نے' جن کی شادی ان کے بڑے بیٹے آفتاب سے ہوئی تھی' اپنے شوہر آفتاب اقبال اور سر محمد اقبال کی سوانح میں اپنے سسر کی زندگی کے بہت سے رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے عبدالمجید سالک کے بیان' کہ علامہ اقبال کو سردار بیگم کے بارے میں خطوط نبی بخش وکیل نے بھیجے تھے' کو غلط ثابت کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ وہ خطوط اقبال کی بہن کریم بی بی کی سازش تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بھائی دوسری شادی کرے۔ انہیں ایک عورت ہونے کے ناطے دوسری عورت سے ہمدردی تھی (نفسیاتی طور پر اقبال کی بہن کا اقبال کی پہلی بیوی سے identify کرنا اس لئے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ان کی ہم نام بھی تھیں) چنانچہ انہوں نے اقبال کی بیٹی معراج سے خط لکھوائے اور انہیں کسی اور شہر سے ٹکٹ لگوا کر پوسٹ کروائے تا کہ اقبال کو شک نہ ہو۔ کافی عرصہ بعد اقبال کو اپنی بیٹی معراج کا ایک خط ملا تو انہیں پرانے خطوط کی یاد آ گئی جن کی لکھائی اس سے ملتی تھی۔ اقبال کو شک ہوا تو انہوں نے سیالکوٹ جا کر بیٹی سے سچ جاننا چاہا۔ بیٹی نے اقرار کر لیا۔ پھر انہوں نے بہن سے پوچھا تو انہوں نے بھی اس سازش کا اقرار کر لیا۔ اس طرح برسوں کا راز بے نقاب ہو گیا۔

راز کہاں تک راز رہے گا منظرِ عام پہ آئے گا
جی کا داغ اجاگر ہو کر سورج کو شرمائے گا

اقبال کی بہن نے جب حالات بگڑتے دیکھے تو انہیں سنبھالا دینے کے لئے اقبال کے لئے لدھیانہ جا کر دلہن تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے حالات بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہو گئے۔

اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال اور ان کی بہن دونوں نفسیاتی طور پر جلد باز تھے اور رومانوی رشتوں کے بارے میں زیادہ دانشمند نہیں تھے۔

اس ٹریجڈی کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ جب اقبال کی بہن کریم بی بی اور ان کی بیٹی معراج ایک خفیہ سازش کا شکار تھیں ان کی پہلی بیوی کریم بی بی کو اس سازش کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ ان حالات سے بے خبر اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہتی تھیں۔

اقبال کی مختلف سوانح عمریاں پڑھنے کے باوجود یہ راز نہیں کھلتا کہ اقبال کے ساتھ جو دھوکہ ہوا اور لدھیانے سے جو غلط عورت بیوی بن کر آ گئی تھی اس کا ذمہ دار کون تھا۔ کیا اقبال کی بہن کریم بی بی کو غلطی ہوئی یا ڈاکٹر سبحان علی نے جان بوجھ کر ایک عورت کو دکھا کر دوسری ہم نام عورت کو لاہور بھیج دیا۔ اقبال جن مشرقی روایات سے ساری عمر برسرِ پیکار رہے۔ ان روایات میں سے ایک روایت arranged marriages کی بھی ہے جس میں دلہا دلہن

ایک دوسرے کو شادی سے پہلے دیکھ تک نہیں پاتے اور بعض دفعہ شب عروسی کے بعد اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی غلط انسان کے ساتھ ہم بستری کر چکے ہیں۔ مغرب کے نوجوان مرد اور عورتیں جو محبت کی شادیاں کرتے ہیں کبھی اس کا تصور ہی نہیں کر سکتے کہ انسان ایک ایسے شخص سے ازدواجی تعلق قائم کرے جس سے وہ محبت نہ کرتا ہو۔

ایک نفسیات کے طالب علم ہونے کے ناطے میں یہ جان کر بہت حیران ہوا کہ وہ شاعر مشرق جو ساری قوم کے مسائل کا حل پیش کرتا رہا اپنی رومانوی' جنسی اور ازدواجی زندگی کے مسائل کا ساری عمر کوئی تسلی بخش حل نہ تلاش کر سکا۔ میرے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ انہوں نے پہلی بیوی کریم بی بی سے سولہ برس شادی کے بعد علیحدگی اختیار کر لی اور ان کے بچوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ دوسری بیوی سردار بیگم کو گمنام خطوط پڑھ کر طلاق دے دی' تیسری بیوی مختار بیگم سے ہمبستری کرنے کے بعد جانا کہ وہ غلط مختار بیگم تھی اور سردار بیگم سے دوسری دفعہ نکاح کرنے سے پہلے کسی مولوی سے حلالہ کے بارے میں رجوع کیا' فتویٰ لیا اور پھر اس فتویٰ پر عمل بھی نہ کیا۔

میں کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ ان سادہ لوح خواتین کے دلوں پر کیا بیتی ہوگی جن کے حقوق کا مشرقی روایات کے نام پر استحصال ہوتا رہا اور سارا معاشرہ اسکا تماشا دیکھتا رہا۔ میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اقبال کا کیا ردعمل ہوتا اگر ان کی کوئی بیوی مغربی ادیبہ اینائس نن Anais Nin کی طرح دو شادیاں کر کے دو شوہر رکھنے کا فیصلہ کرتی۔ کیا اقبال بھی اینائس نن کے شوہروں کی طرح اسے دوسرا شوہر رکھنے کی اجازت دے دیتے یا ان کی مشرقی انا آڑے آجاتی۔

اقبال کو اپنی زندگی کے تلخ رومانوی تجربات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کامیاب شاعر بننا آسان ہے لیکن کامیاب شوہر بننا مشکل اور تین بیویوں کا شوہر بننا اور بھی مشکل خاص طور پر جبکہ ان کے دل میں ایک پری زاد محبوبہ بھی بسی ہوئی تھی۔ اقبال کو اندازہ ہو گیا تھا کہ الفاظ کا احترام کرنا آسان ہے لیکن عورتوں کا خلوص دل سے احترام کرنا مشکل۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا' کردار کا غازی بن نہ سکا

حوالہ جات

۱۔ عطیہ فیضی کے خطوط اور ڈائری
ترجمہ۔ ضیاء الدین احمد برنی۔۔ اقبال اکیڈمی کراچی پاکستان ۱۹۶۹ء

۲۔ عبدالمجید سالک۔۔۔ ذکر اقبال
چمن بک ڈپو اردو بازار دہلی انڈیا

۳۔ رشیدہ آفتاب اقبال۔۔ علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال
فیروز سنز کراچی پاکستان ۱۹۹۹ء

۴۔ جاوید اقبال۔۔۔ اپنا گریباں چاک سنگ میل پبلشرز لاہور پاکستان ۲۰۰۲ء

سلمٰی کا عاشق اختر شیرانی

یہ اختر شیرانی کے ہمراز نیر واسطی کی کتاب ''سلمٰی سے دل لگا کر'' (مطبوعہ ۱۹۸۰ء) کی تلخیص ہے۔

اختر شیرانی کے عشق کی ابتداء سلمٰی کے ایک مکتوب محبت سے ہوئی جو اس نے اُس کی اس تصویر سے متاثر ہو کر لکھا تھا جس میں اختر فکر شعر میں ایک عجیب عالم محویت میں بیٹھا نظر آتا تھا۔ اختر کو اپنی عمر میں پہلی بار اس طرز کا نامۂ شوق ملا تھا۔ وہ اس خط کو پڑھ کر دیوانہ ہو گیا۔ اسے اپنے اندر ایک بالکل نئی تحریک اور کیفیت جاگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ عجیب لذت سے ہمکنار اور مسرت سے سرشار ہو گیا۔ اس نے سلمٰی سے اپنی محبت کی جو پہلی غزل کہی اس کا مطلع یہ تھا۔

لے آئے انقلاب سپہر بریں کہاں
اللہ ہم کہاں وہ ثریا جبیں کہاں

لیکن سلمٰی نے اپنے پہلے خط میں اپنا پتہ نہیں لکھا تھا۔ بڑی مشکل سے ڈاک کی مہر سے اختر کو معلوم ہوا کہ خط اسی لاہور کی ایک بستی سے آیا ہے جس میں اختر بستا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سلمٰی کا اصل نام کچھ اور تھا اور سرزمین گجرات سے اس کا تعلق تھا۔ بہرحال سلمٰی کی نادیدہ چاہت کا جادو اختر شیرانی کے سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ ادھر ایک عرصہ تک سلمٰی نے اختر کی نظموں میں اپنے لئے محبت، ہجر کے نالے محسوس کئے تو اگلے خط میں اپنا پورا پتہ بھی تحریر کر دیا۔ جس کے بعد عاشق و معشوق کے درمیان خط و کتابت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اختر اور سلمٰی کے مجموعۂ مکاتیب میں اختر نے نثر میں جو رومانی شاعری کی ہے وہ اردو کے رومانی ادب میں ایک لازوال حیثیت رکھتی ہے۔

ایک بار سلمٰی کو ایسا لگا کہ اب اس کا عاشق سرمست اپنی تحریروں میں خاص جذباتی اشارات کرنے لگا ہے تو اس نے اختر کو اشارے کنائے میں یوں تنبیہ کی کہ

ضبط اے عشق اس افسانے کو یوں عام نہ کر

اس کے جواب میں اختر کو لکھنا پڑا کہ۔

شعر میں ذکر کسی کا دلِ ناکام نہ کر
اس نے لکھا ہے کہ تو یوں ہمیں بدنام نہ کر
غیرتِ حسن کو منظور نہیں رسوائی
ضبط اے عشق اس افسانے کو یوں عام نہ کر

اختر کی موت کے بعد جب اس کے عزیزوں کے روبرو اس کی ایک
ٹوٹی پھوٹی صندوقچی کو کھولا گیا تو چند مسودوں اور حسینوں کے خطوط کے سوا اور
کچھ نہ نکلا۔ اور ان مسودوں میں سب سے پہلے یہ شعر درج تھا۔

بہت تڑپائے گی دل کو ہماری داستاں اِک دن
کرے گا یاد رو رو کر ہمیں سارا جہاں اِک دن

خیر معاملہ آگے بڑھا اور اختر نے اپنی محبوبہ سے تصویر کی فرمائش کی تو
مصر لاہور کی اس حسین قلوپطرہ سلمٰی نے اپنی تصویر اسے روانہ کر دی جس کے
بعد شاعر کا یہ عالم ہوا کہ

آنکھوں کے آگے جھومتا میخانہ آ گیا

سلمٰی سے پہلی بار ملنے کے بعد اختر کی وارفتگی کا عجیب عالم تھا۔ سلمٰی
خود بھی شاعرہ تھی اس لئے اختر کے جذبات کا ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ دوسری ملاقات
کی آرزو شاعر نے ان اشعار میں کی۔

تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے
شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے
نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
کبھی جو اٹھی ہو گیسو سنوارنے کے لئے
تو آئینے نے تمہیں ہمکنار دیکھا ہے
سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سر جوئبار دیکھا ہے
نسیم باغ نے زیب النساء سمجھ کے کبھی!
تمہیں بہ گلکدۂ شالامار دیکھا ہے
مگر مری نگہ شوق کو شکایت ہے
کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے
دکھا دو ایک جھلک اور بس نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

اس کا جواب سلمٰی نے اپنی نظم میں کچھ اس طرح دیا تھا کہ۔

کسی کی چشم ہوس آشکار کیوں دیکھے
کسی کو یوں کوئی گستاخ وار کیوں دیکھے

بہر حال دوسری ملاقات کا پس منظر یہ تھا کہ سلمٰی گجرات جا رہی تھی
اور اس نے اختر کو اپنی سرزمین وطن کی سیر کی دعوت دی۔ اختر نے گجرات
جانے کا وعدہ کر لیا اور گجرات چلا گیا۔ اور گجرات کا ہی عاشق ہو گیا۔ اختر کا
کلام گجرات کے ذکر سے معمور ہے۔

گجرات کی اس یادگار ملاقات کے بعد اختر و سلمٰی کی رنگین ملاقاتوں

کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ ایک شب شاعر کو محبت کی نشانی وہ انگوٹھی حاصل ہوئی جسے اس نے ہمیشہ لوگوں کی آنکھوں سے چھپائے رکھا۔ یہ انگشتری درحقیقت اس کے دل کا آئینہ اور سلمٰی کی یادگار تھی۔ اس خاتم گوہر نگار پر اختر نے ایک دلپذیر نظم لکھی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

چھپاؤں کیوں نہ دل میں خاتمِ گوہر نگار اس کی
یہی لے دے کے میرے پاس ہے اک یادگار اس کی
مری سلمٰی کو اس نے شاد اور ناشاد دیکھا ہے
کبھی مسرور گاہے، مائلِ فریاد دیکھا ہے
شب تنہائی میں اس نے اسے بیدار پایا ہے
اور اکثر دیدۂ سرشار کو خونبار پایا ہے!
اسے معلوم ہے وہ کس طرح مغموم رہتی تھی
کسی کے غم میں لطفِ زیست سے محروم رہتی تھی
مرا خط پڑھ کے وہ کس ناز سے مسرور ہوتی تھی
پھر اپنی بے بسی پر کس طرح رنجور ہوتی تھی
یہ شاہد ہے کہ اس کی شامِ غم کیونکر گذرتی تھی
یہ شاہد ہے کہ وہ رو رو کے کیونکر صبح کرتی تھی
وہ جب دل تھام لیتی تھی ہجومِ غم سے گھبرا کر
تو یہ کرتی تھی اس کی غمگساری اس کے پاس آکر
اسے معلوم ہے جو درد تھا اس پاک سینے میں
بسی ہیں اس کے دل کی دھڑکنیں اس کے نگینے میں
پہنچتی ہیں شعاعیں اس کی جس دم چشم حیراں تک
تصور مجھ کو لے اڑتا ہے سلمٰی کے شبستاں تک
جہاں سلمٰی کے اور میرے سوا ہوتا نہیں کوئی
انگوٹھی کھوئی جاتی ہے مگر کھوتا نہیں کوئی

اختر و سلمٰی کے عشق و محبت کا افسانہ حسن و عشق کی ایک سرتاسر پاکیزہ داستان ہے اور سلمٰی کے آستانہ جمال پر اختر کی حضوری عبارت ہے صرف اس نماز شوق سے جو عشق حسن کے حضور میں کمال خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ ایک رات اس کہانی کا ایک باب صرف اسی طرح ختم ہوا کہ سلمٰی ساری رات اختر کے سامنے ٹپ ٹپ آنسو گراتی رہی اور اختر سوز وساز عشق کے آنسوؤں کے دریا میں بہتا رہا۔ اس رات کی آنسوؤں کی یہ دلگداز کہانی اختر نے اپنی ایک نظم میں اس طرح ادا کی ہے۔

میرے پہلو میں جو بہہ نکلے تمہارے آنسو
مینہ کی بوندوں کی طرح ہو گئے سستے کیوں آج
موتیوں سے کہیں مہنگے تھے تمہارے آنسو

اختر کی عیش کوشی، رندی مستی۔ اقربا واعزا سے لاتعلقی اور ہروقت کی شعر نوازی نے اس کے والد کے دل میں اس کے خلاف سخت غم وغصہ اور رنج ونفرت کے احساسات پیدا کردیئے تھے۔ یہ احساسات اس وقت اور بھی شدید ہو گئے جب انھیں معلوم ہوا کہ اختر سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو جانے

کے باوجود باہر کہیں عشق کے دھندوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی
کے دیگر لوگ اور بعض احباب اختر کے کردار پر نکتہ چینی اور طعنہ زنی کرنے
لگے۔ صورت یہ کہ گھر اختر سے تنگ تھا اور وہ گھر سے بیزار۔ بارہا گھربار چھوڑ
کر دوستوں کے یہاں رہنا پڑا۔ لوگ سمجھا کر بھی گھر لے آتے۔ رات جب گھر
دیر سے لوٹتے تو اختر کے والد پروفیسر محمود شیرانی مکان کے اندر سے زینے کے
دروازہ کو لگا دیا کرتے مگر ماں بیٹے پر محبت چھڑکنے کے لئے مجبور تھیں۔

دوسری طرف سلمیٰ کو بھی اس کے گھر کے خاص لوگ شک وشبہ کی
نظر سے دیکھنے لگے یہاں تک کہ اسے اپنی زندگی ایک ناقابلِ برداشت بوجھ
محسوس ہونے لگی۔ شاعر کے غم میں دن رات مغموم ومحزوں رہتے رہتے وہ
بیمار پڑ گئی اور ایک دن تنگ آکر اس نے خودکشی کا ارادہ کرلیا۔ شاعر نے اس
وقت کے حالات اور کیفیات کو اپنی ایک نظم "اے عشق ہمیں برباد نہ کر" میں
کچھ ایسے رومانی انداز میں نظم کیا ہے جس سے اس دور کے تمام حالات پر
روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً اس نظم کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

جس دن سے ملے ہیں دونوں کا سب چین گیا آرام گیا
چہروں سے بہار صبح گئی آنکھوں سے فروغ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگین نہ بنا ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

ایک دن اختر کو پتہ لگا کہ سلمیٰ کی کہیں شادی کی جارہی ہے جبکہ وہ

اپنی زندگی سے بیزار ہو چکی ہے۔ اختر کی حالت غیر ہوگئی۔ ایک مرتبہ اس نے
چھت کی بلندی سے گر کر مرنے کی سعی کی کہ اسے پکڑ لیا گیا۔ سلمیٰ نے کسی
صورت اختر کو بلایا اور اسے محبت کا واسطہ دے کر خودکشی کی کوشش سے باز
رکھنے کی تلقین کی۔ لیکن اختر نے بوقتِ رخصت کہا "سلمیٰ اگر تم مجھے نہ ملیں تو
میں زندگی کو مختلف طریقوں سے تباہ کرلوں گا۔ بعد میں اختر نے ایسے اشعار
لکھے۔

دل و دماغ کو رو لوں گا آہ کرلوں گا
تمہارے عشق میں سب کچھ تباہ کرلوں گا
اگر مجھے نہ ملیں تم تمہارے سر کی قسم
میں اپنی ساری جوانی تباہ کرلوں گا
تمہاری یاد میں میں کاٹ دوں گا حشر سے دن
تمہارے ہجر میں راتیں سیاہ کرلوں گا
کسی حسینہ کے معصوم عشق میں اختر
جوانی کیا ہے میں سب کچھ تباہ کرلوں گا

بہرحال سلمیٰ کی شادی کردی گئی اور وہ اپنے گھربار کی ہوگئی۔ سلمیٰ
کے غم مفارقت اور گھر کی تلخی نے اختر کو کئی مرتبہ خودکشی کے لئے آمادہ کیا
اور کثرتِ مے نوشی کا جلا کردیا جو بالآخر اس کی موت پر منتج ہوئی۔ اختر جگہ جگہ
مسرت اور سکون ڈھونڈتا پھرا لیکن اس زمین میں یہ چیزیں عنقا تھیں۔
سلمیٰ کی مفارقت کے بعد سب سے پہلے عذرا کچھ مدت تک اس کی

باقیماندہ زندگی کی دلچسپیوں کا مشغلہ بنی رہی جس کے لئے اس نے کئی سفر کئے
اور جس کے انتظار میں اس نے ایک مدت تک ایک پہاڑ پر رہ کر ایک پہاڑ
سے دن کاٹے۔ عذرا شادی سے پہلے لاہور میں مقیم تھی۔ بعد ازاں اس نے
ایک جگہ اٹک پار اپنی بستی بسائی۔ ایک رومانی غزل کے یہ اشعار عذرا سے
مخاطب ہو کر اختر نے کہے تھے۔

یاد آؤ مجھے للہ نہ تم یاد کرو
اپنی اور میری جوانی کو نہ برباد کرو
بستیاں اپنی اٹک پار بسانے والو!
کبھی راوی کے کنارے کو بھی آباد کرو
خیبر اور اس کے نواحی میں کھیلنے والو!
کبھی لاہور کے لارنس کو بھی آباد کرو
سرحد اور اس کے مناظر ہیں طربناک مگر
کبھی پنجاب کے سینے کو بھی آباد کرو

اس کے علاوہ اختر نے ایک نظم ”چند لمحے عذرا کے ساتھ“ کہی تھی
جس میں ایسے اشعار تھے۔

کوئی مہ جبیں جلوہ دکھلا گئی
مرے گھر پہ شام بہار آ گئی
وہ ابریشمیں بال کرنوں کے ہار
وہ چوٹی کہ ناگن سی بل کھا گئی
بدن جیسے معصوم کلیوں کا خواب
کمر یا کوئی شاخ لہرا گئی
یہ افسانہ ہے مختصر اس طرح!
کہ اختر کے پہلو سے عذرا گئی

عذرا کے بعد سندھ کی زلیخا، لکھنؤ کی ایک ماہ لقا، امرتسر کی ایک نور
بہار ناز، ریحانہ، زہرہ، پروین، ثریا، نسرین، ناھید، لالہ رخ، شمسہ، لیلیٰ اور
سب سے آخر میں شیریں اختر کے بتکدۂ تصور اور اس کی منظوم داستانوں کی
زینت بنیں۔ مگر یہ سب آوارگی کا روپ تھا۔ درحقیقت سلمیٰ کے عشق میں ناکامی
کے بعد جو چیز اسے جہانِ رنگ و بو میں جگہ جگہ لئے پھر رہی تھی وہ سلمیٰ ہی کے
جمال دلفروز کی جستجو تھی۔

کثرت بادہ نوشی اس پر سلمیٰ کا غم، اپنے بچے کی موت، گھر والوں
کا عتاب اور دوستوں کی سرد مہری نے اختر کو نڈھال کر دیا۔ ملازمت ختم کر
کے اختر کے والد حافظ محمود خاں شیرانی اپنے تمام خاندان مع اختر اور اس
کے اہل و عیال لاہور سے اپنے وطن ٹونک چلے گئے جہاں کچھ عرصہ بعد ہی
ان کا انتقال ہو گیا۔ ایک دن ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء اختر کی والدہ، گھر والوں،
اختر کی بیٹی اور داماد جن کی شادی کو ابھی چالیس دن ہی گذرے تھے، کوٹلے
کے باغ میں سیر تفریح منانے گئیں جہاں نہر بیاس میں اختر کا داماد نظیر الدین
(بی۔ ایس۔ سی) بہہ کر ہلاک ہو گیا۔ ان اسباب وعوامل نے اختر کے جسم
میں زندگی کے لئے قوتِ مقاومت کو باقی نہ چھوڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ سلمیٰ کی

مفارقت کے بعد سے عنفوانِ شباب میں ہی شاعرِ رومان نے موت کا انتظار شروع کر دیا تھا۔

لاہور سے جدا ہو جانے کے بعد اختر کئی سال تک ٹونک میں رہا۔ تقسیم ہند کے بعد اپنے انتقال سے چھ ماہ پیشتر اختر دوبارہ لاہور جانے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اور اپنے ہمراز یعنی اس کتاب کے مصنف نیر واسطی کے یہاں مقیم ہوا۔ آخری عمر میں اسے اپنے بیوی بچوں کے لئے کچھ نہ کرنے کا بڑا ملال تھا اور اپنے اعزاء و اقرباء کے لئے اس کے دل میں محبت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ لیکن رات دن پینے کا مشغلہ اور دن بھر گھر سے غائب رہنے کی عادت نہ گئی۔ کبھی کبھی عالمِ نشہ و بے خودی میں سلمیٰ کے محلہ کی گلیوں کی طرف نکل جاتا اور کوچۂ جاناں کی خاک چھان کر واپس آ جاتا۔ دراصل اسے پتہ چلا تھا کہ ان دنوں سلمیٰ لاہور آئی ہوئی ہے۔

مرنے سے چند دن پہلے اختر شیرانی نے شراب ترک کر دی (کبھی کبھی پہلے بھی وہ بادہ نوشی ترک کر دیا کرتا تھا)۔ لہٰذا ترکِ شراب کے بعد اس پر ردِ عمل کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جس میں وہ بے خوابی، بے چینی، اختلاج اور اضطراب محسوس کرتا تھا۔ ڈاکٹر کے مشورے پر اسے اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو اس کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ اور انتقال ہو گیا۔ انتقال کے بعد اس کی ماں اور بیوی لاہور پہنچیں۔

اختر کا جنازہ قبرستان کی طرف رواں تھا کہ ایک برقع پوش خاتون نمودار ہوئی۔ یہ سلمیٰ تھی۔ اس نے جنازے کو رکنے کا حکم دیا۔ جنازہ رکا اور سب لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ پھر وہ اس کے قریب آئی۔ چہرہ سے نقاب الٹا۔ دیر تک منہ دیکھا اور دل سے دل کی زبان میں جو کچھ اس کو اس سے کہنا تھا کہا۔ عشق کے اس انجام پر لوگ ششدر رہ گئے۔ تدفین کے بعد سلمیٰ اختر کی قبر پر بھی پہنچی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اختر نے یہ اشعار اسی دن کے لئے کہے تھے۔

جب میری قبر پر وہ پھول چڑھانے آئے
موت کی نیند کے ماتوں کو جگانے آئے
کوئی اس وعدہ فراموش سے اتنا کہنا
آپ اب کس لئے روٹھوں کو منانے آئے
آبسے شہر خموشاں میں ملے خاک میں ہم
آپ کیوں خاک کو پھولوں سے بسانے آئے
شمع کی طرح جلاتے تھے ہمیں فرقت میں
اب مری قبر پہ کیوں شمع جلانے آئے
ایک دن تھا کہ مجھے در سے اٹھا دیتے تھے
اب دعا کے لئے کیوں ہاتھ اٹھانے آئے
جب میں روتا تھا مرے رونے پہ ہنس دیتے تھے
اب مری یاد میں کیوں اشک بہانے آئے
تم تو اک دن مرے شکوے بھی نہ سن سکتے تھے
اب مجھے کیوں غمِ دل اپنا سنانے آئے

ایک نوٹ

مختار ٹونکی کا ایک مضمون ''ایوان اردو'' دہلی کے دسمبر 2009ء کے شمارے میں ''اختر شیرانی کی سلمیٰ'' عنوان سے چھپا تھا جس میں مصنف نے نیر واسطی کے بھانجے سید ذہانت حسین کے ایک مضمون سے کئی حوالے دے کر نیر واسطی کی باتوں کی تائید کی ہے۔ نیر واسطی صاحب ذہانت حسین کے ماموں تھے۔ ذہانت صاحب اس وقت امریکہ میں رہتے ہیں۔ جب اپنے والد محمود شیرانی کے انتقال کے بعد اختر شیرانی 1948ء میں ہجرت کرکے لاہور پہنچے اور اپنے دوست حکیم نیر واسطی کے مکان ''نیر منزل'' میں قیام پذیر ہوئے وہاں ذہانت صاحب پہلے سے مقیم تھے۔ ذہانت صاحب اور اختر شیرانی تقریباً چھ ماہ ایک ساتھ رہے۔ اختر شیرانی نے ذہانت صاحب کو درج ذیل باتیں بتائیں: ''میں لاہور میں 'خیالستان' رسالے کا ایڈیٹر تھا۔ دوستوں اور ساتھیوں اور قارئین کے اصرار پر ایک شمارے میں اپنی تصویر چھاپ دی۔ اس کو دیکھ کر سلمیٰ نے جو خط لکھا' ایسا خط نہ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد بھی کسی نے لکھا۔ وہاں سے ہماری عشق کی ابتدا ہوئی۔۔۔۔ میری شاعری میں جتنے بھی دوسرے نام آتے ہیں وہ سلمیٰ ہی کے مختلف عکس ہیں۔۔۔۔ ہمارا یہ عشق خالصتاً ملکوتی تھا اور آج بھی ہے۔ ذاتی مجبوریوں اور دنیاوی بندشوں نے ہمیں ایک دوسرے کا ساتھی نہیں ہونے دیا۔ میری شادی ایک کزن سے ہوگئی اور سلمیٰ کی شادی گجرات کے ایک مقتدر شخص سے کردی گئی۔ سلمیٰ نے تو ناکامی محبت کے زہر کو بڑے حوصلے سے پی لیا لیکن میں اتنا کم حوصلہ اور پست ہمت نکلا کہ بدلے ہوئے نامساعد حالات سے کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کرسکا۔ تم نے ایک دن پوچھا تھا کہ شراب کیوں پیتا ہوں تو اب تمہاری سمجھ میں آسانی سے آجائیگا کہ میں شراب نہیں پیتا بلکہ شراب مجھے پی رہی ہے۔ یہ ایک طرح کا Long term suicide ہے جو میں کر رہا ہوں۔۔۔۔''

ذہانت صاحب نے ایک دن اختر شیرانی سے کہا'' آج حکیم (نیر واسطی) صاحب کو اطلاع ملی ہے کہ آپ کی 'سلمیٰ' گجرات والی سلمیٰ اب available ہیں' بس آپ کی ہاں کی ضرورت ہے باقی کام حکیم صاحب خود کرلیں گے۔ اس طرح آپ کو خود کا شراب میں گھولنے کا عمل بھی ختم ہو جائے گا اور سلمیٰ کو پھر سے تمام دنیا کی خوشیاں اور راحتیں مل جائیں گی''۔ یہ سن کر اختر شیرانی بدحواس ہوگئے اور بولے ''بھیا! یہ تم نے کیا کہہ دیا' کیا خبر شادی۔۔۔۔ میرے جسم ناتواں میں اب اتنی سکت کہاں کہ میں سلمیٰ کے لمس کی تاب لاسکوں۔۔۔۔ میں اب اس حسن بے محابا کے جلووں کو برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتا''۔

محبوبِ غم فانی بدایونی

(۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء تا ۲۶۔ اگست ۱۹۴۱ء)

فانی بدایونی کو ایک غم دوست اور نشاط دشمن انسان بتاتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے اپنی سوانح عمری ''یادوں کی بارات میں'' لکھا ہے:

''معاشقہ و معاش کی پیہم ناکامیوں نے فانی کو عالمِ ہستی سے اس حد تک بدگمان کر دیا تھا کہ اگر وہ کسی مچھر کو اپنی طرف آتا دیکھ لیتے تو کہتے تھے کہ ہو نہ ہو یہ ملیریا کا مچھر میرے کسی رفیقِ دیرینہ نے اس لئے بھیجا ہے کہ یہ مجھے کاٹ لے۔''

فانی شوپنہار کی طرح غم پرست اور میر کی طرح قنوطیت پسند تھے۔ فانی نے ایک عشق کیا تھا جس کی کوئی خاص تفصیل یا معتبر حوالہ ناپید ہے۔ البتہ جوش نے ''یادوں کی برات'' میں ان کے بارے میں اس قدر لکھا ہے:

''میں سب سے پہلے ان سے لکھنؤ میں ملا تھا۔ جہاں وہ اس طرح وکالت کرتے تھے کہ ہفتے میں بمشکل دو ایک بار عدالت جاتے۔ زیادہ وقت محبوبہ کے گھر میں کھپاتے اور فرصت کے اوقات میں مقدمات کی مسلیں دیکھنے کے عوض مجھ کو اپنی معشوقہ کی تصویر دکھاتے اور پہروں اس کی داستانیں سناتے تھے۔ میں بھی اسی دور میں، خیر سے عاشق تھا۔ اس لئے گھنٹوں ان کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ ان کی محبوبہ لکھنؤ چھوڑ کر جب آگرے چلی گئی تو وہ بھی ''وکالت'' کرنے آگرے چلے گئے۔ اور میرے حالات نے مجھ کو حیدر آباد دکن پہنچا دیا.... کچھ روز کے بعد وہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے ستائے ہوئے حیدر آباد آئے۔ مہاراجہ سے ملا کر میں نے ان کی ملازمت کی سبیل نکال دی اور وہ کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔''

فانی کے عشق کی اتنی روداد ہمیں تحریر میں ملتی ہے۔ لیکن فانی کی شاعری میں ان کے محبوب کا پرتو جہاں کہیں کہیں نظر آتا ہے، جو ان کے شوقِ دید کے مقابل کھڑا ہے۔ صرف چند اشعار دیکھیں:

اک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

دل پہ آتے ہوئے شرماتے ہیں
اپنے جلوؤں میں چھپے جاتے ہیں

پائے دنیا وہ تری سرمہ تقاضا آنکھیں
کیا، مری خاک کا ذرہ، کوئی بیکار نہیں

تم پہ مرنا جنہیں نہیں آتا
زندگی کا انھیں شعور نہیں

تیرے بغیر باغ میں پھول نہ کھل کے ہنس سکے
کوئی بہار کی سی بات اب کے بہار میں نہیں

جن میں تمہارا نور رہا تھا ان میں اندھیرا رہتا ہے
جب سے گئے ہو آنکھوں میں آنسو تو بہت ہیں نور نہیں

اچھا حجاب ہے کہ جب آتے ہیں خواب میں
پھر پھر کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

اس قسم کے کئی اشعار کلیات فانی میں مل جاتے ہیں جن سے فانی کی حسن سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تمام اشعار تخیل آفرینی، ندرت بیان و ادائیگی اور جذبہ کی خالصیت کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن ان اشعار سے ہمیں صرف شاعر کی پسندیدگی حسن کا پتہ چلتا ہے۔ جب وہ آرزو کرتا ہے کہ محبوب کی ،سرمہ تقاضا آنکھیں، اس جیتی جاگتی دنیا کو مل جائیں جو حسن سے عاری ہے تو اس کے دل میں یہ جذبہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ سرمہ بن کر زمین کی آنکھوں کی خوبصورتی میں اضافہ کرے۔ محبوب کی طرح دنیا کی نظر التفات اسے حاصل ہو جائے تو وہ دنیا کا ہی عاشق بن جائے۔ اس وارفتگی میں شاعر اپنے وجود کے ذرات تولنے لگتا ہے جنہیں سرمہ بطور معشوق (دنیا) کی آنکھوں میں لگا کر حسن کے تقاضے کو پورا کر سکے۔ اور عشق کے فریضہ سے عہدہ برآ ہو جائے۔

لیکن فانی کے تخیل کی یہ رفعتیں اور نازک رومانی خواہشیں ان کی شاعری کے ساتھ بہت دور تک نہیں جا سکیں۔ حسن کی پسندیدگی تک شاعر بالکل نارمل انسان نظر آتا ہے لیکن عشق کے اظہار کے لئے لب کھولتے کھولتے اس کے محسوسات بہت کچھ بدل جاتے ہیں۔ کیونکہ حسن پرستی اور ذوق جمال کو فانی نے غالب کی طرح اپنے وجود کی خوبصورتی اور عالم ہست و نیست کے جلوے دیکھنے۔ میر کی طرح اداس ہو جانے یا اقبال کی طرح جذبۂ خودی سے سرشار ہو جانے اور اس جذبے سے طاقت حاصل کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ صرف غمزدہ ہو جانے اور شاعری میں محبوب کی پیکر سازی کے بجائے غم محبوب کی تجسیم کے لئے استعمال کیا ہے۔

حسن کی ستائش فنکار کا نقطۂ آغاز ہوا کرتی ہے۔ عشق تکمیل کی آرزو کا نام ہے اور اس منزلِ آرزو کے راستے میں دو مسائل آتے ہیں۔ ایک نشاط کا، دوسرا غم کا۔ جب تک فنکار ان سے نہیں نمٹتا عشق کے بارے میں اس کے نظریات متشکل اور واضح نہیں ہو پاتے۔ چند ہی فنکار ایسے ہوں گے جنھوں نے صرف مسرت یا صرف الم کا منہ دیکھا ہوگا۔ مسرت اور غم فطرت انسانی میں ایک نہ ایک تناسب میں باہم پائے جاتے ہیں۔ فن کا سفر دونوں انتہاؤں کے بیچ جاری رہتا ہے۔ لیکن فانی کی شاعری کی روح ایک نہج پر چلتی نظر آتی ہے

اور یہ نیچ غم کی نہیں بلکہ شدت غم کی ہے۔

غم نہیں، نشاط دشمنی

فانی کی شاعری میں جتنا جتنا اترتے جایئے غم کی مصوری ہوتی ہوئی ملے گی۔ فانی کا گوشت پوست والا محبوب ہم پر ظاہر نہیں ہے مگر اس کے ظاہر ہونے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی جاتی۔ کیوں کہ فانی نے محبوب کو پردے میں ضرور رکھا ہے مگر ان کی خواہشات بے پردہ ہیں۔ شاعر نے معشوق کے بجائے غم معشوق کو اپنے ذہن پر اتنا حاوی کرلیا ہے کہ اس (معشوق) کا حقیقی تو کیا مجازی روپ بھی ہمیں 'غم' نظر آتا ہے۔ فانی معشوق کے انسانی پیکر اور نقوش دلآویز کو بھول کر غم کو محبوب بنا بیٹھے ہیں۔ وہ حسن کی نہیں بلکہ غم کی پرستش میں کمال حاصل کرنے کے درپے ہیں۔

فانی کی غم پرستی اور نشاط دشمنی کا احوال سنیے حضرت جوش سے:

''ایک بار ہم لوگ شغل کررہے تھے۔ میں نے کہا ارے فانی، کبھی کبھار تو ایک آدھ پیگ پی لیا کرو۔ خدا جانے وہ اس وقت کس موڈ میں تھے۔ انھوں نے ایک گلاس پی لیا۔ لیکن جب میں نے ان کے گلاس میں دوسرا پیگ ڈال دیا تو انھوں نے کہا بس۔ میں نشاطی کیفیت کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ گئے۔ اشارے سے مجھے بلایا۔ کہا، ذرا سا جھک کر میری بات سنو، اور جب میں اپنے کان ان کے لبوں کے قریب لے گیا تو انھوں نے بڑے پیغمبرانہ انداز میں بڑی آہستگی سے کہا۔ دیکھو جوش، تم شراب پی کر غم غلط کرتے ہو۔ غم اللہ کی بخشی ہوئی ایک بہت بڑی دولت اور ایک گراں قدر امانت ہے اور اس کو غلط کرنا کفران نعمت ہے۔ حشر کے دن یہاں تک تو ہوسکتا ہے کہ اللہ مشرکوں تک کو بخش دے لیکن یہ ہو نہیں سکتا کہ غم غلط کرنے والوں کو معاف فرمادے۔''

(یادوں کی برات، ۴۸۹)

فانی کے فلسفۂ غم کے بارے میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''فانی کی زندگی کے دو پہلو ہمیشہ نمایاں رہے ہیں۔ میری مراد اُن کے غم دوراں اور غم جاناں سے ہے۔ غم جاناں کے تصدق میں زمانے کا غم فراموش تو نہ کرسکے مگر اس کی بدولت ان کا ذہنی بوجھ ہلکا ہوگیا۔ فانی کو زندگی میں 'عشوہ و ناز و ادا' سے بھی واسطہ پڑا۔ خوبانِ روزگار کے ستم بھی برداشت کیے مگر انھوں نے اپنی محبت کا کبھی سودا نہیں کیا۔ کسی سے اس کا نظریۂ محبت دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ ''محبت صرف محبت کے لئے کرنا چاہئے۔''

تا عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

''فانی کی محبت بے لوث اور بوالہوسی سے پاک تھی۔ تعجب یہ ہے کہ جس کوچے میں جرأت و مومن اور داغ بدنام ہوگئے وہاں سے فانی اپنا دامن بچا کر لے آئے۔ مجازی عشق کے باوجود انھوں نے مجازی آلودگیوں سے دامن کو ملوث نہ ہونے دیا۔ مولوی وحید احمد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''راوی معتبر یہ کہتا ہے کہ پاک محبت تھی اور مجھے اس میں ذرا بھی تامل نہیں۔ اگر پاک محبت نہ ہوتی تو یہ سوز و درد نہ ہوتا۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں کو فانی نے گوارا کیا۔''

(یادِ ایامِ عشرت فانی۔ وحید احمد، علی گڑھ میگزین فانی نمبر)

عشق خواہ مجاز کے رنگ میں ہو یا حقیقت کے ان کی شاعری کا سب سے بڑا محرک تھا۔ اس عشق نے ان کی شخصیت کی تکمیل کی اور اسی کے ذریعے ان میں یہ احساس پیدا ہوا جس کو جمالیاتی حُسن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عشق کی بدولت ان میں یہ پاکیزگی اور لطافت پیدا ہوئی جو اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔ وہ غم کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکتے تھے اگر محبت کا جذبۂ لطیف اس کو ہلکا نہ کر دیتا۔ جب مجازی عشق کی قوت کا یہ حال ہے تو عشق حقیقی کی گیرائی اور گہرائی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی فانی کی انفرادیت ہر ہر قدم پر دامنِ دل کھینچتی ہے۔

(مضمون: ''فانی کی شخصیت'' / فانی کی شاعری ۱۶۔۱۷)

یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ فانی کو اپنے دورِ شباب میں ایک گوشت پوست کا انسان بطور معشوق ملا تھا جس سے ان کے تعلقات عارضی رہے۔ مگر انھوں نے محبوب کی تجسیم ایک پیکرِ غم میں کر ڈالی اور اپنے مجازی محبوب کے بشری نقوش سے غافل ہو کر اس ''غم ساختہ'' خیالی پیکر کو سجدہ کرتے رہے جس کا کوئی مادی وجود نہیں تھا۔ انھوں نے غم کو ایک مستقل حیثیت دے ڈالی اور حسن، خدا اور اپنے اختیار کو اسی فرضی اوٹ سے دیکھتے رہے۔

میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا
اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

طے ہے کہ مجازی محبوب کی فرضیت کو فانی تصوف کی ڈگر پر لے گئے۔ ان کے برعکس میراجی کی غنا کی جذبۂ شہوانی (Eroticism) کی کسی چمکدار یا کہر آلود جھلک پر ختم ہوتی ہے۔ جبکہ دونوں شعرا کا دل ایک ایک معشوق کے غم سے آباد تھا۔ دونوں میں سے کسی کا تعلق بھی اپنے معشوق سے دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ دونوں شاعر غم پرست ہیں مگر جہاں فانی نے غم کی چاہت اور گرویدگی میں معشوق کے ظاہری رنگ، روپ، چہرے، بشرے اور قامت کو فراموش کر دیا وہاں میراجی کے غم نے اس کے معشوق میرا سین کے جسمانی نقوش کو اس کے تخیل میں زیادہ صاف، روشن اور واضح کر ڈالا۔ جس کی بنا پر میراجی ارضی لذتوں کا اسیر بن کر رہ گیا بلکہ لذت کو ہی اس نے تصورِ محبوب بنا ڈالا۔ میراجی اپنے تصور میں ہمیشہ اپنی محبوبہ میرا سین کی چھب بٹھائے رکھتا تھا۔ اس کے برعکس فانی نے خود کو ارضی لذتوں سے دور رکھنا پسند کیا اور وہ خیال کی آلائشوں سے بچتے بچاتے تصوف کی سمت گامزن ہو گئے جہاں تجلی پردہ بن جاتی ہے اور پردہ تجلی۔ ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''انھوں نے جہاں عشق یا معشوق کا ذکر کیا ہے وہاں ٹھہرے اور سلجھے ہوئے بلکہ پاکیزہ اور بلند جذبات کی ترجمانی کی ہے اگرچہ وہ باقاعدہ صاحبِ حال و قال نہیں نہ ان کو کسی خانوادۂ تصوف سے بیعت واردات کا تعلق

حاصل ہے۔ وہ جس ماحول میں پلے بڑھے تھے وہاں تصوف کا زیادہ چرچا بھی نہ تھا۔ ان کے والد عقیدتاً اہلحدیث تھے اس لئے بیعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ فانی کو ذاتی طور پر تصوف سے روحانی لگاؤ تھا۔ ان کے جذبات واقعی اور ان کا عشق صادق تھا۔''

(ماخوذ از ''فانی کا غم اور عشق'' / فانی کی شاعری ۵۷)

غالباً یہی وجہ ہے کہ کہیں شعوری اور کہیں غیر شعوری طور سے فانی نے صوفی شعراء، مثلاً صاحب مثنویؒ مولوی معنوی مولانائے روم کی حکایات اور پیغامات سے زبردست تحریک حاصل کی ہے۔ خصوصاً ان چند حکایات کے مرد اور عورتوں سے جنہیں مولانائے روم نے عشق حقیقی کے اظہار کے لئے انسانی کرداروں کے روپ میں اپنی مثنوی میں تخلیق کیا اور مجازی محبت کا اسیر دکھایا۔ مثال کے طور پر فانی کا ایک مطلع ہے جو مولانائے روم کی ایک حکایت کے غم انگیز انجام سے متاثر معلوم ہوتا ہے، کہ مُردوں سے عشق ناپائیدار ہوتا ہے، محبوب مرجائے تو اس کے لئے دلِ عاشق میں وہ تڑپ وہ اضطراب کہاں رہتا ہے جو اس کے جیتے جی پایا جاتا ہے۔ فانی کا وہ مطلع یہ ہے۔

مر کر مریضِ غم کی وہ حالت نہیں رہی
یعنی وہ اضطراب کی صورت نہیں رہی

یا یہ چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں جن کی اندرونی فضا غم کی ہے لیکن جن کا ماخذ مروجہ متصوفانہ خیالات ہیں۔

وہ شمع ہے تو جس نے اس آئینہ خانے میں
اپنی ہی تجلی کو پروانہ بنا ڈالا

خدا کی دین نہیں ظرف خلق پہ موقوف
یہ دل بھی کیا ہے جسے درد کا خزانہ ملا

ظہور جلوہ کو ہے ایک زندگی درکار
کوئی اجل کی طرح درد آشنا نہ ملا

ہمیں تیری محبت میں فقط دو کام آتے ہیں
جو رونے سے کبھی فرصت ہوئی خاموش ہوجانا

کہتا ہے غم یار میں ہوں جانِ تمنا
دنیا ہے مری عالم امکانِ تمنا

کیفیت ناکامی، دل کیا کہوں فانی
دل ٹوٹ گیا توڑ کے پیمانِ تمنا

نہ چاہا حسن کی فطرت نے کوئی داغ دامن پر
رہا محشر میں اپنا خونِ ناحق اپنی گردن پر

خود حسن کمالِ حسن ہے یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے
اور عشق تمالِ عشق ہے یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں

فیض اک لمحۂ دیدار سلامت فانی
غم ہر ہے روز بڑھتی ہوئی دولت میری

دل اور ہوائے سلسلہ جنبائی نشاط
کیوں پاسِ وضعِ غم تجھے غیرت نہیں رہی

دشوار تو نہیں غم ہستی کا خاتمہ

ان کی خوشی نہیں ہے تو ان کی خوشی نہیں

یہ اشعار محبت کے علاقہ میں چھائی ہوئی غم کی فضا کی تصویر کشی کر رہے ہیں۔ ان سے فانی کی فسردہ نوائی کے اسرار بھی کھلتے ہیں اور ان کے شوقِ دید کا پتا بھی چلتا ہے جو غم بن کر شاعر کا اپنا ہو گیا ہے۔ لیکن محبوب غم بننے میں تصوف کے لگاؤ سے زیادہ فانی کی خود پرستی ان کے کام آئی۔

معشوق سے برتاؤ: فانی کا معشوق کے ساتھ برتاؤ دیگر شعراء سے مختلف ہے۔ ایک اندورنی چنچل پن جو اکثر کلاسیکی شعراء کو نصیب رہا ہے فانی کے مزاج میں داخل نہیں ہو سکا۔ کلام فانی میں محبوب مزاجاً خود شوخ و طرار نہ رہا ہو۔ لیکن جلوہ اور جلوہ نمائی کی داد دینے کی اہلیت عاشق کی اپنی ہوتی ہے۔ عاشق میر، غالب یا مومن لطفِ وصال کی خاطر شوخیِ طبع اور بذلہ سنجی کی مدد سے رنجیدہ محبوب کو ہموار کرنے کا گُر جانتے ہیں۔ غالب کے اس شعر کے نفسیاتی پس منظر پر غور کیجئے۔

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا

تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

اسی طرح مومن کے اس شعر کو دیکھئے جس میں ایک خوبصورت بلکہ پُر فریب شوخی کے ساتھ محبوب کو زیر کیا جا رہا ہے۔

ہے روئے مثل ابر نہ نکلا غبار دل

کہتے تھے ان کو برق تبسم ہنسی سے ہم

یا پھر غالب ہی کا ایک اور شعر دیکھا جائے۔

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے

کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں[1]

فانی کا عشق ایسی صورتحال سے دوچار نہیں ہوتا۔ اگر کلامِ شاعر شاعر کے کردار، طبعی میلان اور ذہنی رجحان کا آئینہ ہو سکتا ہے تو اس بات کو ماننا پڑے گا کہ فانی کی فطرت میں شوخی اور مذاق کا عنصر بہت کم تھا۔ میر جیسے قنوطی عاشق نے بھی محبوب کو چھیڑ چھاڑ کی چھوٹ دے رکھی تھی۔ فانی کے عشق کی خاص نفسیات جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ انھیں حسن معشوق سے حیران کن انبساط کبھی حاصل نہیں ہوا۔ وہ صوفی شعرا اصغر گونڈوی یا بیدم کی

---

۱) غالب محبوب کے خنجر سے مرنے کے لئے تیار نہیں۔ محبوب نے دھوکے سے وار کرنے کے لئے جو خنجر اپنی کمر کی پٹی کے اندر اڑس رکھا ہے اسے باہر نکلوانے کے لئے غالب ایک چالاک حسن پرست کے انداز میں اس سے ہمکلام ہوتے ہیں اور اس کی پتلی کمر کی تعریف شروع کر دیتے ہیں کہ شاید اس طرح بات معانقہ تک جا پہنچے تو کمر تک ہاتھ پہنچنا بھی ممکن ہو جائے اور غالب ہتھیار اچک لیں۔ اس میں ایک تدبیر کا پہلو اور بھی ہے کہ شاید معشوق شاعر کی نیک گمانی اور تعریف سے خوش یا نادم ہو کر اپنا ہتھیار غالب کو سونپ دے۔ یہاں حسن پر عشق حاوی ہے۔ فانی اس مسئلے سے دوسری طرح نمٹتے ہیں۔ ان کا ایک مطلع ہے۔

ادا سے آڑ میں خنجر کی منھ چھپائے ہوئے

مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

غالب کے برعکس فانی نے اپنی موت کو محبوب کے ہاتھ میں خنجر دیکھتے ہی تسلیم کر لیا۔ اور وہ زیرِ خنجر لیٹ جانے کے لئے تیار ہو گئے کہ موت دلہن بن کر آئی ہے، مر رہو۔ یہاں بھی صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی کی یہ فکر کارفرما نظر آتی ہے کہ عاشق موت کا جام خوشی خوشی پی لیتے ہیں جب انھیں محبوب اپنے ہاتھوں سے پیش کرے۔ ان دو اشعار کے

طرح محبوب کے جلووں میں مست اور گم نہیں ہو سکے۔ بے پناہ حسن دیکھ کر آدمی سرشار اور خوش ہوتا ہے۔ اس کے برعکس معشوق کا حسن فانی کو زبردست غم میں مبتلا کر دیا کرتا تھا۔ اس کا سبب وہی ان کی ''نشاط دشمنی'' ہے۔ وہ عالم حسن کو نظرانداز کر دینے کی ایک مطلق العنان، خودسر اور حقی خواہش کے عذاب میں مبتلا تھے۔ ان کی انا کی کمان کو بے پناہ حسن بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ فانی خارجی حسن کو اپنے محبوب کے روپ میں بھی بہ یک نظر رد کر دیا کرتے تھے۔ ان کے شیوۂ حسن کا اندازہ کچھ اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔

دل سراپا نظر، وہ حسن تمام
بند کر آنکھ دیکھتا کیا ہے

ایک طرف وہ محبوب کے ہونٹوں پر آئی ہوئی ہنسی کو طور پر چمکنے والی بجلی سے تشبیہ دیتے ہیں اور موجِ برق کے پہلو میں چمکنے والے بادل کو محبوب کی الٹی ہوئی آستین سے جھلکنے والی گوری بانہہ سے ملا دیتے ہیں۔

عجب عالم ہے موجِ برق کے پہلو میں بادل کا
تری الٹی ہوئی سی آستیں معلوم ہوتی ہے

لیکن دوسری طرف وہ معشوق سے یکطرفہ سپردگی کے خواہشمند ہیں۔ ان کی خود پسندی کا یہ عالم ہے کہ یار کا سراپا دیکھ کر خود سے کہتے ہیں ع بند کر آنکھ دیکھتا کیا ہے جبکہ عاشق کا مسلک شیوہ یہ ہے کہ وہ محبوب کو دیکھ کر بھی محظوظ اور خوش ہوتا ہے۔ بقول مومن۔

موازنہ سے دو شاعروں کی طبیعتوں کا تضاد واضح ہوتا ہے۔ ایک حسن کو فتح کرنا چاہتا ہے، اس کا نام غالب ہے۔ دوسرا حسن سے مغلوب ہونے پر آمادہ ہے اس کا نام فانی ہے۔ دونوں اسم با مسمیٰ نظر آتے ہیں۔ دونوں کی فطرت کا اپنا اپنا عنصر ان کے شعری کمالات سے اجاگر ہے۔ اس فکری تضاد کی ترجمانی یوں بھی ہوتی ہے:

مے نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا: غالب
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ: فانی

دونوں کے برخلاف میر کی تو طبیعت انھیں اپنے محبوب کو رام کرنے کے شغل سے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ مگر ہاں رام کرنے کی کوشش میں لگائے رکھتی ہے۔ واضح رہے کہ میر نے اپنے کلام میں 'رام کرنا' کا محاورہ بکثرت اور اثر انگیز طریقے سے استعمال کیا ہے۔ میر کی مایوسی کا کارن محبوب کی سخت گیری، شقاوت اور تناؤ ہے۔ ظاہر ہے آدمی کسی سخت گیر اور ضدی کو ہی رام کرتا ہے۔ اس ضمن میں میر کا صرف ایک شعر یہاں کافی ہوگا۔

تجھ سے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

روپ رس اور جمالیات کے شاعر فراق گورکھپوری کا رویہ حسن و عشق میں دونوں کو ایک برابر دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ عاشق اور معشوق دونوں میں سے کسی ایک کو ہارا ہوا یا جیتا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اگرچہ نیرنگیٔ حالات اور اپنی متقلب طبیعت کا اعتراف کئی دیگر شعراء کی طرح فراق نے بھی کیا ہے، مثلاً اس شعر میں

ایک عالم پر نہیں رہتی ہیں کیفیات عشق
گاہ ریگستاں بھی دریا گاہ دریا بھی سراب

لیکن حالات اور طبیعت کے تغیر کے امکانات سے الگ جہاں حسن و عشق میں آمنا سامنا (Confrontation) ہو وہاں فراق کا ایک ہی واضح اور مسلم نظریہ ہے، یعنی برابری کا، جس کا جواز یہ شعر بھی ہے۔

حسن وہ جو اک کر دے معنی فتح و شکست
رہ گئی سو بار جھک کر نگاہِ کامیاب

لب لباب یہ کہ غالب رومان میں اہانت یا ترغیب کو، میر اصرار کو، فانی شکست خوردگی (سپردگی نہیں) کے اعتراف کو اور فراق برابری کے تقاضے کو مقدم رکھتے ہیں۔ (ف-س-ا)

ہاتھ شاید کہ وہ سرمایۂ حسن آجاوے
کچھ نہ کچھ فائدہ ہے جی کے زیاں ہونے تک

(اور یہ جی کا زیاں 'دیکھنے' ہی سے تو ہوتا ہے۔ یہ زیاں لذتِ دید کے عوض ہی تو قبول ہوتا ہے!)

یا بقول غالب ۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

غالب کی دلدادگی حسن کا یہ عالم تھا کہ وہ بت سیم تن کے پاؤں دھونے کو اپنی کسرِ شان نہیں سمجھتے جبکہ محبوب کے ہتھیار سے ہلاک ہونے پر آمادہ ہونے کے باوجود نشاط دشمن فانی کسی کی زلف کا اسیر ہونے پر متاسف ہیں۔ کہتے ہیں۔

جنسِ دل مفت پھنسا کر کوئی دیوانہ بنے
زلفِ جاناں سے بنا ہے کوئی سودا نہ بنے

فانی کے عشق میں یہ ایک مقامِ انکار ہے۔ ان کی شاعری میں سپردگی کے لمحات بہت کم آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں محبت کے آرٹ میں پوری مہارت حاصل نہیں ہے۔ ان کی خود پسندی، سپردگی کے عمل میں مانع تھی جبکہ حسن سپردگی کے لئے عشق سے پہل کی امید رکھتا ہے۔ لیکن حسن کے متعلق فانی کا فوری اور مستقل ردعمل عام لوگوں سے جدا ہے۔ درج ذیل اشعار اس نقطۂ نظر سے اہمیت کے حامل ہیں کہ فانی اپنی انا اور خود پسندی پر اس درجہ فریفتہ تھے کہ ان کا محبوب ان کا مطلوب نہیں رہ گیا تھا بلکہ وہ اپنے تئیں (یعنی خود کو) معشوق کا مقصود سمجھنے کے فریب میں مبتلا رہنا پسند کرتے تھے۔ ان کی زبردست انا نے انھیں بجائے بلبل کے گل بنا ڈالا تھا۔ ان اشعار کو فانی کی داخلی جمالیات پسندی کا مظہر کہا جا سکتا ہے۔

۔ جلوہ بے چشم آشنا کیا ہے
میں ہی میں ہوں مرے سوا کیا ہے

۔ حیرت نے مجھے تیرا آئینہ بنایا ہے
اب تو مجھے دیکھا کر اے جلوۂ جاناں نہ

۔ تیری تجلیوں سے کسی طرح کم نہیں
دل کی تجلیوں کو کبھی آزما کے دیکھ

۔ اس عالمِ تصویر کو دیکھا تو یہ دیکھا
میری ہی نظر محو ہے میری ہی نظر میں

اس طرح اپنی نظر کو اپنے آپ میں محو رکھ کر فانی نہ صرف محبوب مجازی بلکہ محبوب حقیقی سے بھی چشم پوشی کر لیتے ہیں (بند کر آنکھ دیکھتا کیا ہے)۔ اور یہ بات عاشق کی شریعت کے خلاف ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی یہ رائے کہ "فانی کو ذاتی طور پر تصوف سے روحانی لگاؤ تھا۔ ان کے جذبات واقعی اور ان کا عشق صادق تھا" اپنا کچھ نہ کچھ وزن ضرور کھو دیتی ہے۔ فانی کی شاعری قابلِ تعریف ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں لیکن عشق کے حوالے سے ان کے کلام کا تجزیہ یہی کہتا ہے کہ تصوف کی ڈگر پر چلنے کے باوجود تصوف سے

ان کا لگاؤ روحانی نہیں بلکہ بناوٹی تھا۔ ان کے سر میں سودا ضرور تھا مگر دل میں تمنا نہیں تھی۔ ٹی ایس ایلیٹ جیسے جدید شاعر اور نقاد نے اپنی نظم "The Waste Land" میں عشق کی وضاحت یوں کی ہے کہ سچی انسانی محبت میں ایک ابدی شعلے کا پایا جانا لازم ہے کیونکہ انجام کار انسانی محبت خدا کی محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور غم کی انتہا میں محویت اور حسن کی پسندیدگی میں شوخی و زندہ دلی انسانی محبت کو دیرپا و سلامت رکھتے ہیں۔

فانی کے جس کلام کی نسبت عموماً تصوف سے جوڑ دی جاتی ہے وہ دراصل محبوب مجازی اور دنیاوی تعلقات سے ناکام نباہ کا نتیجہ ہے اور شاعر کی انا کی پسپائی کا منظوم اظہار ہے جس میں غم کو تصوف اور غیر تصوف کے بین بین فلسفیانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فانی کو غمِ محبوب سہہ کر نہیں بلکہ محبوبِ غم بن کر ایک انوکھی اور مکمل تسکین حاصل ہوتی ہے۔ ایک قطعہ میں کہتے ہیں۔

آنکھوں سے جو خونِ دل بہے، بہنے دے
تخفیف نہ چاہ، دل کو غم سہنے دے
غم میں یہ تصرّف ہے خیانت، فانی
غم اس کی امانت ہے یونہی رہنے دے

اگرچہ ان کا غم ایک ایسی طاقت بن کر نہیں ابھر سکا جسے ناقدین تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہیں تاہم فانی نے اپنے غم کو رقت انگیز نہیں ہونے دیا یہ بڑی بات ہے ورنہ ان کی الم پسندی اختر شیرانی کی سطحی اور جذباتی حسن پرستی کی طرح جلد اپنا اثر زائل کر دیتی۔

رسول حمزتوف — مترجم: ف۔س۔اعجاز

تاوقتیکہ............

یوں ہی جلاتے ہو حسد سے تم
سارے الزام نامناسب ہیں
یوں مری ذات پر یہ طعنہ زنی
جذبۂ شوق نوردی کو جگا دیتی ہے

ایک عورت کہ جس کے نام پہ تم
آج بھی اشک بہا دیتے ہو
کوئی آوارہ وکردہ نہیں ہے، سچ ہے
پر مرے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں سوچتی ہے
بس اک اس وقت......... کہ جب.........
اس کو بھی میری طرح ٹھیس لگے!

●●

پروفیسر قمر رئیس

پریم چند کی زندگی میں رُومان

منشی پریم چند کی وفات کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ ان کے بعض رفیق اور معاصر ابھی زندہ ہیں۔ ان میں سے بعض نے ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کے بارے میں قابل قدر معلومات بہم پہونچائی ہیں۔ اردو اور ہندی میں (زیادہ تر ہندی میں) ان کے فن اور زندگی کے بارے میں چند معیاری اور مستند تصانیف بھی ملتی ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کے بیشتر ناقد اور سوانح نگار سماجی نظریۂ تنقید کے حامل ہیں۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ ان کے تنقیدی زاویۂ نظر اور مطالعہ میں ایک طرح کی یکسانیت پیدا ہوگئی ہے بلکہ انھوں نے پریم چند کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے سماجی، سیاسی اور فکری پہلوؤں پر اتنا زور دیا ہے کہ ان کی شخصیت اور فن کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو دب کر رہ گئے۔ ان تحریروں میں پریم چند ہمارے سامنے بحیثیت انسان سادگی، دردمندی اور شرافت نفس کا مجسمہ بن کر آتے ہیں اور بحیثیت دانشور یا ادیب ایک سماجی مصلح، گاندھی وادی، قوم پرست اور انقلابی——

اس میں شک نہیں کہ یہ حقائق جو ہمارے سامنے آئے ہیں، علمی حیثیت سے بہت اہم اور گراں قدر ہیں لیکن اس خاکہ میں پریم چند کی حیات اور ان کے تخلیقی کارناموں کی مکمل تصویر نہیں ابھرتی۔ ہمیں ان کے فن سے مانوس ہونے کے لئے ان کی زندگی سے کچھ اور قریب ہونا ہے۔ اپنے افسانوی ادب کے اس معمار کو ہم ذرا اور نزدیک سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک گوشت پوست کے انسان کی صورت میں، جس کی رگوں میں خون اور خون میں انسانی جذبات کی لہریں گردش کرتی ہیں۔ اس کی فطری سادگی، خود اعتمادی، زندہ دلی، رجائیت اور انتھک محنت نے ہمیں زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ اس کے سماجی آدرشوں اور اس کے فکر و شعور کی رفعت نے ہمیں زندگی اور زمانے کے کچھ حقائق کا عرفان بخشا ہے۔ لیکن اس کی کمزوریاں اور ذاتی محرومیاں، اس کے جذباتی مرحلے اور روحانی سفر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ ان کا انکشاف صرف ہماری جستجو کی خلش کو آسودہ نہیں کرے گا بلکہ ایک طرف اگر یہ ہمیں ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دے گا تو دوسری طرف یہ ہماری زندگی کی بہت سی الجھنوں کو سلجھانے اور ذہن و فکر کے دھندلکوں میں روشنی پیدا کرنے کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

پریم چند کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اور خود پریم چند نے اپنے متعدد خطوں اور سوانحی مضامین میں اپنی زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی زندگی رومان سے عاری تھی۔ ایک سنسان ویران اور ہموار میدان کی طرح جس میں نہ حسن و عشق کی

شادمانیاں ہیں اور نہ جنسی جذبات کے تند و تیز یا سبک خرام دھارے۔ ڈاکٹر اندرناتھ مدان کو پریم چند نے ایک خط میں لکھا ہے:

''میری زندگی میں عشق و محبت کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ زندگی اتنی مصروف اور زندگی گذارنا اتنا کٹھن کام تھا کہ اس میں رومانس کے لئے گنجائش نہیں تھی۔''

گویا ان کی زندگی میں کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا جو عشق و محبت کے جذبات کی غمازی کرتا ہو۔ ان کے مزاج کی شگفتگی کا مظہر ہو۔ نہ ہی ان کی زندگی کی کہانی میں دنیا کی رعنائیوں اور مادی حسن کی برنائیوں سے لطف اندوز ہونے کے لطیف اور نازک احساسات کا سراغ ملتا ہے۔ پریم چند کے ایک دوست فراق گورکھپوری نے بھی اپنے ایک مضمون اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے اور اسے ایک معمہ کہا ہے۔ ایک بار موصوف دہلی آئے تو میں نے ایک صحبت میں یہ موضوع چھیڑا۔ یہ سوچ کر کہ پریم چند کی زندگی کے اس پہلو سے انھیں بھی دلچسپی ہوگی اور بے تکلف دوست ہونے کی حیثیت سے وہ کچھ ضرور جانتے ہوں گے لیکن ان کی گفتگو سے بھی مایوسی ہوئی۔ موصوف نے بتایا کہ پریم چند اس معاملہ میں بہت شرمیلے، محتاط اور کم حوصلہ تھے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فراق صاحب نے کہا کہ ایک بار میں پریم چند کے گاؤں لمہی گیا۔ وہاں ان کے گھر قیام کیا۔ صبح کے وقت یا شام کو (میں بھول رہا ہوں) ہم دونوں باتیں اور چہل قدمی کرتے ہوئے گاؤں سے باہر ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ وہاں سامنے ایک نوخیز الھڑ دیہاتی لڑکی گھاس چھیل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں نے پریم چند سے پوچھا— ''کبھی ادھر بھی رخ کرتے ہو۔'' شرماتے ہوئے بولے— ''بس یونہی دور سے''— سوال یہ ہے کہ کیا واقعی صنف لطیف سے پریم چند کا رشتہ دور کا رشتہ تھا۔ مجھے ان کی متعدد کہانیاں اور ناولوں کے بعض حصے پڑھ کر اکثر یہ محسوس ہوا کہ محض تخیل یا کتابی مطالعہ کے سہارے عشقیہ واردات اور نوجوانوں کے جنسی معاملات کی ایسی حقیقت پسندانہ مصوری ممکن نہیں ہے۔ ان کی واقعیت اور شدت، تجربات کی رنگ آمیزی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہاں مجھے ہنری جیمس کی یہ بات بھی یاد آتی ہے کہ ناول نگار کے بعض حقیر اور معمولی تجربات اس کے فن کے تخلیقی عمل میں دبے قدموں آکر اپنے نئے امکانات کی صورت پاکر— فن میں بڑی گہرائی اور حسن پیدا کردیتے ہیں اور نہ صرف ناظرین کے لئے بلکہ خود اس کیلئے زندگی کے کسی نہ کسی دور میں ایسے تجربات سے ضرور دوچار ہوئے ہوں گے لیکن اس جستجو کو آگے بڑھانے سے قبل چند باتوں کی وضاحت ضرور ہے۔

پریم چند متوسط طبقہ کے ادیب تھے۔ وہ ایک مزدور یا کسان کے گھر میں نہیں بلکہ ایک ملازمت پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا منشی گر سہارے لال ایک کھاتے پیتے پٹواری تھے اور والد منشی عجائب لال سرکاری کلرک۔ ان کی نصف سے زیادہ تصانیف متوسط طبقہ کی زندگی اور اس کے مسائل سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ محنت کش طبقہ سے ہمدردی رکھنے کے باوصف متوسط طبقہ کی نفسیات اس کی ذہنیت اور مفاہمانہ مسلک سے آخر وقت تک پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی تصانیف میں انھوں نے متوسط طبقے

کے فرسودہ رسم و رواج، اس کی نمائش پسندی، جھوٹی وضعداری اور قول و عمل کے تضاد پر بار بار ضرب لگائی ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ وہ خود اپنی زندگی میں اسی طلسم کے اسیر رہے۔ دوسری بات اس سلسلہ میں قابل ذکر یہ ہے کہ پریم چند کی شخصیت کی تعمیر میں اخلاقی تعلیم کا خاص دخل رہا ہے۔ حقیقت کے مادی اور سماجی رشتوں کو سمجھنے کے باوجود وہ فرد کے اخلاقی تزکیہ یا اصلاح میں اعتقاد رکھتے تھے۔ شیخ سعدی، دویکانند، مہاتما گاندھی، وکٹر ہیوگو اور ٹالسٹائی جیسے عظیم اخلاقی مفکروں اور ادیبوں سے انھیں والہانہ عقیدت رہی۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو ہمیشہ ایک باوضع اخلاقی انسان بنانے اور ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی اگرچہ اس کے لئے انھیں بڑی اذیتوں اور آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ ایک خط میں منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں:

''ایسے موقعے بھی آئے ہیں جب دوستوں کی خاطر اپنے اوپر انتہائی جبر کرنے پڑے لیکن میں نے اپنی اصلی حالت کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور انھیں یہ بھرم رہا کہ میں کوئی متمول آدمی ہوں۔ فضول خرچی سے مجھے آشنائی نہیں لیکن تمول کا اظہار مجھے پنپنے نہیں دیتا۔''

یہ پردہ داری صرف افلاس تک محدود نہیں تھی۔ پریم چند کی زندگی میں کچھ ایسے حادثات کا سراغ بھی ملا ہے جن کو انھوں نے ہمیشہ راز بنائے رکھا یہاں تک کہ اپنے بے تکلف دوستوں پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور اگر کسی نے اصرار یا استفسار کیا تو، اصل واقعات پر پردہ ڈالنے کے لئے جھوٹ بولنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس لئے کہ ان کا انکشاف زندگی کے اس آدرش اور زندگی گذارنے کے اس اخلاقی تصور کے منافی تھا جس کی وہ تبلیغ کر رہے تھے اور جسے وہ عملی زندگی سے ہم آہنگ بنا کر دکھانا چاہتے تھے۔ اپنے طبقہ کی اس ذہنیت سے پریم چند اس لئے بھی پیچھا نہیں چھڑا سکے کہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ مدرسی کا پیشہ کرتے ہوئے گذرا جو انسان کو تہذیب اور اخلاق کے مصنوعی ضابطوں میں جکڑ دیتا ہے اسے گھر سے باہر کی زندگی میں ضبط و احتیاط کا زاہدانہ بہروپ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ پریم چند بھی اس کا شکار ہوئے اور اپنی نوجوانی کی بعض طرب آگیں لغزشوں کو ہمیشہ دنیا سے چھپاتے رہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کو خط لکھتے ہوئے قلم کی روانی اور بے اختیاری میں ایک آدھ اشارہ کر دیا ہے لیکن ان اشاروں کا ابہام بھی ضبط و احتیاط کی غمازی کرتا ہے۔ مثلاً اپنے ایک دوست بنارسی داس چترویدی کو لکھتے ہیں:

''جوانی بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک صحت بخش اور دوسری جنون انگیز... جنون انگیز شباب میں آدمی اندھا رہتا ہے۔ اپنی قابلیت کے متعلق مبالغہ آمیز خیالات رکھتا ہے اور ارمانوں کی تکمیل کے شاندار خواب دیکھا کرتا ہے۔ میں بھی کبھی کبھی خواب دیکھتا ہوں اور بعض اوقات ناعاقبت اندیشی بھی کر بیٹھتا ہوں مگر افراط و تفریط سے بچا رہتا ہوں۔''

اس طرح ڈاکٹر اندر ناتھ مدان نے ایک بار پریم چند سے سوال کیا کہ آپ کی زندگی میں کبھی کوئی محبت کا حادثہ پیش آیا یا نہیں تو اس کے جواب میں لکھا:

"کچھ بہت ہی معمولی قسم کی باتیں ضرور ہوئیں لیکن انھیں عشق ومحبت نہیں کہہ سکتا۔"

اس میں شک نہیں کہ بچپن ہی سے پریم چند کی زندگی جن آزمائشوں اور محرومیوں سے دوچار ہوئی اس نے انھیں اپنی فطری خواہشات کو دبانے اور کچلنے کا عادی بنا دیا تھا۔ علم وادب کے سنجیدہ مطالعہ نے وقت سے پہلے ان کے خیالات میں ایک خاص پختگی اور متانت پیدا کردی تھی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانہ ہی میں آریہ سماجی تحریک سے متاثر ہوکر اصلاح معاشرت اور وطن پرستی کے رنگ میں رنگ گئے تھے چنانچہ ان کی ابتدائی تصانیف میں بھی ان کی شخصیت کے ان اوصاف کا واضح عکس ملتا ہے۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ ان کی جوانی دیوانی نہیں تھی لیکن یہ کہنا کہ ان کی جوانی اپنے جذبات کے وفور اور جنون انگیزی کی علامات کے ساتھ کبھی ظاہر ہی نہیں ہوئی۔ جنس لطیف کے کافر حسن کا جادو ان پر چلا ہی نہیں۔ کام دوہن کی لذتوں اور حیات کی رنگینیوں کی طرف کبھی وہ بڑھے ہی نہیں۔ ان کی زندگی پر ایک صریح الزام ہے۔

پریم چند کی جوانی بھی ایک عام انسان کی جوانی تھی۔ ان کا دل ایک فنکار کا نازک دل تھا۔ جو حسن کی ہلکی سی آہٹ پر بھی دھڑک اُٹھتا تھا۔ انھوں نے حسن پرستی بھی کی ہے اور والہانہ محبت بھی۔ ان کی تصانیف میں عشق کا تصور خواہ کتنا ہی افلاطونی اور ماورائی ہو لیکن ان کی جوانی کا عشق ارضی اور حقیقی ہی نہیں جنسی ہے۔ انہوں نے ایک عام نوجوان کی طرح سب سے پہلے حسن کو عورت کے روپ میں دریافت کیا۔ اسے اپنے جذبات کے خلوص اور دل کی وارفتگی سے چاہا۔ اس کی پرستش کی اور جیسے بھی ہو سکا اسے پالیا۔ اپنی جنسی خواہشات اور جمالیاتی احساسات کی تسکین اور آسودگی کے لئے انھوں نے اپنے اخلاقی اور سماجی آدرشوں کی بھی پرواہ نہیں کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں وہ ان حوادث پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔

پریم چند کی شادی ان کی سوتیلی ماں اور ماموں کی کوششوں سے پندرہ سولہ سال کی عمر میں زمیندار گھرانہ کی ایک لڑکی سے ہوگئی اور جیسا کہ انھوں نے اپنے ایک سوانحی مضمون میں لکھا ہے شادی کے دن وہ بہت خوش تھے۔ عورتوں کے ہنسی مذاق سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اس لئے کہ اس دن عورت کے روپ میں وہ رنگ دیو، کے ایک پیکر کو اپنا رہے تھے۔ اس کے تصور ہی سے وہ پھولے نہ سما رہے تھے۔ لیکن ان کے ارمانوں کا یہ فروغ شاد کام نہ ہوسکا۔ رخصتی کے بعد گھر آکر جب انھوں نے اس کی صورت دیکھی تو ان کے خوابوں کا یہ رنگ محل ایک پل میں مسمار ہوگیا۔ خود پریم چند کے الفاظ یہ ہیں:

"میں نے ان کی صورت دیکھی تو خون خشک ہوگیا۔"

اس لئے کہ ان کی بیوی بدصورت تھی۔ جسمانی طور پر بے ہنگم تھی۔ ان کے سارے ارمان اور تمام آرزوئیں اور امیدیں خاک میں مل گئیں۔ پریم چند ایسی بدصورت لڑکی کو اپنی شریک حیات بنانے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے۔ لیکن سماج کے خوف اور والدین کی لاج کے احساس نے ان کی زبان بند کردی۔ تاہم انھوں نے اپنی بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ وہ اپنی تعلیم اور

پھر ملازمت کے سلسلہ میں زیادہ تر شہر میں رہے۔ ان کی بیوی سوتیلی ماں کے ساتھ گاؤں میں رہتی تھی۔ پریم چند اس سے بیزار تھے اس لئے کہ وہ نسائی حسن اور دلکشی سے محروم تھی۔ جیسا کہ پریم چند ہندی کے ایک ناقد ڈاکٹر اندر ناتھ مدان کو لکھتے ہیں:

''وہ دیکھنے میں ذرا بھی اچھی نہیں تھی اور میں اس سے مطمئن نہیں تھا۔''

کیا ایک خوش مذاق فنکار کی زندگی کے اس المیہ نے اس کی شخصیت اور فن کو متاثر نہیں کیا ہوگا؟۔ ایک دو نہیں پریم چند کی متعدد کہانیوں اور ناولوں میں اس تلخ اور اذیت ناک سانحہ کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہاں میں پریم چالیسی کی صرف ایک کہانی ''دیوی'' کے چند اقتباسات پیش کروں گا۔ اس کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''چن بابو کے لئے عورت دنیا کی سب سے حسین شے تھی ان کے شاعرانہ تخیل کے لئے نسوانی حسن اور شباب کا ذکر ہی سب سے دلآویز مشغلہ تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا تب ہی سے انھوں نے اس حسینہ کا تصور کرنا شروع کیا جو ان کے دل کی رانی ہوگی۔ اس میں طلوع سحر کی شگفتگی ہوگی۔ پھول کی نزاکت، کندن کی چمک، بسنت کی فرحت، کوئل کی آواز، وہ سارے شاعرانہ اوصاف سے مزین ہوگی۔ وہ اسی تصور کے دلدادہ تھے اور ہمیشہ اسی خیال میں مست رہتے تھے۔ وہ دن بھی آگیا جب ان کی آرزوئیں ہرے بھرے پتوں سے لہرائی گئیں۔ اس باغ میں بہار کے دن آگئے۔ شادی طے ہوگئی۔ چن بابو نے عروس کو ایک نظر دیکھنے کی بہت ضد کی لیکن جب ان کے ماموں نے یقین دلایا کہ لڑکی نہایت حسین ہے تو خاموش ہوگئے۔ دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ دلہن جو زیوروں سے لدی ہوئی تھی۔ منڈپ میں لائی گئی۔ دوسرے دن رخصتی ہوگئی۔ چن بابو دیدار کے لئے بیقرار تھے۔ بار بار اپنے گھوڑے کو دلہن کی پالکی کے پاس لاتے تھے لیکن درشن نہ ہوتے تھے۔ پالکی پر موٹا پردہ پڑا ہوا تھا۔ چلتے چلتے دوپہر ہوگئی۔ کہاروں نے ایک درخت کے سائے میں پالکی اتار دی۔ چن کو منہ مانگی مراد ملی۔ چپکے سے دلہن کے پاس جا پہونچے۔ وہ پالکی سے نکالے گھونگھٹ ہٹائے باہر جھانک رہی تھی۔ چن نے اسے دیکھا اور سر پیٹ لیا۔ نفرت، غصہ اور مایوسی نے جیسے ان کے دل کو کچل دیا ہو۔ یہ وہ حسن و نزاکت کی دیوی نہ تھی جس کی وہ برسوں سے پرستش کر رہے تھے۔ یہ ایک چوڑے منہ، چپٹی ناک اور پھولے ہوئے رخساروں والی مکروہ صورت عورت تھی جس پر صنف نازک کا کسی طرح بھی اطلاق نہ ہو سکتا تھا۔ چن کی ساری مستی رخصت ہوگئی۔ آہ اس بھاگوان کو میرے ہی گلے پڑنا تھا۔ میں اس عورت سے کیسے بولوں گا۔ کیسے اس کے ساتھ یہ زندگی بسر کروں گا۔ اس کی طرف تو تاکتے ہی سے نفرت ہوتی ہے۔ ایسی مکروہ صورتیں بھی دنیا میں ہیں۔''

یہاں افسانے کے ہیرو چن بابو خود پریم چند ہیں۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ نوجوانی کی اس شدید محرومی نے پریم چند کے ارمانوں کی پیاس کو کچھ اور بڑھا دیا۔ انھیں سرکاری ملازمت بھی مل گئی تھی اور اس طرح ایک عمر کے معاشی ترددات سے انھیں کسی حد تک چھٹکارا حاصل ہو گیا تھا۔ اس

بے فکری نے ان کے جذبات اور داخلی خواہشات کی طنابیں کچھ اور ڈھیلی کردیں۔ جوانی رنگ لائی اور وہ کھیل کھیلے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی نجی زندگی میں وہ اسی مسلک کے پیرو ہیں یعنی اگر کسی شے کو حاصل کرنے کی خواہش سچی ہے تو آنے والے کل کی فکر میں اس کا گلا نہ گھونٹو۔ چنانچہ اس دور کا ایک واقعہ خود ان کی زبان سے سنئے جب صرف پانچ روپے ماہانہ کی ٹیوشن میں ان کو اپنا اور اپنے گھر کا خرچ چلانا ہوتا تھا اور جب مہینہ میں اکثر انہیں فاقے بھی کرنے پڑتے تھے۔

''جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے تھے میری قوت ارادی کی باگ ڈھیلی ہو جاتی۔ للچائی آنکھیں حلوائی کی دوکان کی طرف کھینچ لے جاتیں اور دو تین آنے کے پیسے ختم کیے بغیر واپس نہ آتا پھر اسی دن گھر جاتا اور دو ڈھائی روپے دے آتا۔ دوسرے دن سے پھر اُدھار لینا شروع کر دیتا۔''

جو شخص ایسی مفلسی کے عالم میں بھی اتنی ادنیٰ خواہشات پر قابو نہ پاسکے اور ذرا سی آسودگی جس کی قوت ارادی کی باگ ڈھیلی کر دیتی ہو وہ اپنی جوانی کی فطری خواہشات کی ہیجانی شدت میں بہہ کر اگر ان کی آسودگی کا کوئی راستہ دریافت کرلے تو ایسی تعجب کی بات نہیں چنانچہ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں پریم چند ایک خاتون کی والہانہ محبت کے اسیر ہوئے اور اس طرح انھوں نے اپنی جذباتی محرومیوں کا دل کھول کر انتقام لیا۔ یہ رومان، ان کی زندگی کا سب سے رنگین حادثہ ہے۔ لیکن یہ ان کے ناولوں کے عام رومانوں سے بہت مختلف ہے۔ ان کی تخلیق اکثر تخیل کی گذرگاہوں میں ہوتی ہے۔ یہ اسی دنیا کی چیز ہے۔ وہ دو انسانوں کے باطنی مرحلے اور روحانی سفر ہوتے ہیں۔ یہ دو بے چین جسموں کا باہمی اتصال ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ وہ خواب ہے۔ پریم چند نے اس دور طرب آگیں میں اپنی بدصورت بیوی سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کرلیا۔ اسے اس کے گھر بھیج دیا اور پھر تمام زندگی اس کی صورت نہیں دیکھی۔ ان کے ارمان اور آرزوئیں بچپن سے جس پیکر لطیف کی تلاش میں سرگرداں تھیں وہ شاید انھیں مل چکا تھا۔ اس دور میں وہی ان کا شریک حیات اور ان کے ذوق جمال کی تسکین کا سہارا تھا۔ اس لڑکی سے پریم چند کے عشق کی صرف اتنی ہی روداد ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ کون تھی؟ کس طبقہ سے تعلق رکھتی تھی؟ پریم چند کے قصر نشاط میں چند سال گذارنے کے بعد کہاں روپوش ہوگئی؟ پریم چند نے اس سے شادی کیوں نہیں کی؟ ان تمام سوالوں کا جواب مشکل ہے۔

پریم چند کے ایک معتبر سوانح نگار مدن گوپال نے (جو خیر سے حیات ہیں) پریم چند کی زندگی میں ہی ان پر تحقیقی کام شروع کردیا تھا۔ پریم چند کے بارے میں ان کی پہلی انگریزی کتاب ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اردو، ہندی اور انگریزی میں پریم چند پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ بنارس اور الٰہ آباد میں رہنے والے پریم چند کے بعض قریبی دوستوں سے بھی ملے تھے اور ان سے پریم چند کی زندگی کے بارے میں اہم معلومات حاصل کی تھیں۔ میں نے ایک بار پریم چند کے اس معاشقہ کے بارے میں گفتگو کی تو انھوں نے پریم چند کے دوستوں سے حاصل ہونے والی معلومات کی بنیا

پر چند اہم باتیں بتائیں۔ ان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہوگا:

پریم چند کا یہ عشق ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۷ء میں شروع ہوا۔ تقریباً سولہ سال کی عمر میں ۱۸۹۵ء جب ان کی پہلی شادی ہوئی تو وہ بنارس کے کوئنس کالج کی نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ایک سال کے اندر ہی انہوں نے اپنی بیوی کو ہمیشہ کے لئے اس کے مائکہ بھیج دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ غریبوں کی ایک بستی میں ایک کچی کوٹھری میں رہتے تھے اور صرف پانچ روپیہ ماہانہ کی ٹیوشن پر گذر بسر کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں نچلی ذات کی کسی غریب مسلمان عورت یا لڑکی سے ان کا عشق شروع ہوا۔ ان کی دوسری شادی کے بعد بھی عشق کا یہ سلسلہ جاری رہا (جیسا کہ آگے ذکر آئے گا) اگر وہ خاتون مسلمان نہ ہوتی تو شاید پریم چند اس سے شادی کر لیتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شدید جنسی اور جمالیاتی محرومی کے نتیجہ میں پریم چند کی یہ محبت ابتداً ایک انتقامانہ جسمانی آسودگی کا ذریعہ رہی ہو اور اس لڑکی سے شادی کا خیال بھی ان کے دل میں نہ آیا ہو۔ اس خیال کو تقویت اس طرح بھی پہنچتی ہے کہ اس زمانہ میں (جب اس سے ان کا تعلق استوار تھا لیکن شاید جذباتی ہیجان کم ہو چکا تھا) پریم چند کو ایک ایسی لڑکی کی تلاش ہوئی جو صحیح معنوں میں ان کی شریک حیات بن سکے۔ جسے وہ اپنے تخیلی ڈھانچہ میں ڈھال سکیں جو ایک آدرش ہندو عورت کی طرح ان کے گھر کو سنوارے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا وجود ان کے اندر جاگتے ہوئے ایک آرٹسٹ کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق کو تسکین کا سہارا بھی دے۔ یہاں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اس عہد میں پریم چند اصلاح معاشرت کی تحریکوں سے متاثر تھے اور ایک سچے سدھارک کی طرح اپنی عملی زندگی میں بھی وہ اس مسلک کو اختیار کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں بیواؤں کی شادی اور ایسے ہی دوسرے مسائل پر خاص طور سے زور دیا جا رہا تھا۔ پریم چند نے بھی اپنے اصلاحی مسلک سے فائدہ اٹھایا اور ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ایک سولہ سال کی بیوہ شورانی دیوی سے شادی کر لی۔ شورانی دیوی ایک بال بیوہ تھیں۔ ان کی پہلی شادی گیارہ سال کی عمر میں ہوئی تھی اور شادی کے چند ماہ بعد ان کی لاعلمی میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ شورانی دیوی پریم چند کے لئے ایک آدرش بیوی ثابت ہوئیں۔ پریم چند کی زندگی کے معاشقہ یا رومان کا واقعہ ہمیں انہیں کے وسیلے سے معلوم ہوا۔ محترمہ شورانی نے پریم چند کی گھریلو زندگی سے متعلق ہندی میں ایک سوانحی کتاب شائع کی ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ پریم چند نے اپنی موت سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل جب وہ زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ اپنی بیتی ہوئی زندگی کی بعض ایسی چوریوں اور ایسے سربستہ رازوں کا اعتراف اور انکشاف کیا جنہیں وہ اپنے سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں دفنائے ہوئے تھے۔ ان ہی انکشافات میں پریم چند کی نوجوانی کے رومان کا یہ واقعہ ہے۔ شورانی دیوی نے بجنسہٖ وہ مکالمے لکھ دیئے ہیں جو اس موضوع پر ان کے اور پریم چند کے درمیان ہوئے۔ ملاحظہ ہو:

''آپ بولے — ''اچھا ایک اور چوری سنو۔ میں نے اپنی پہلی استری کے جیون کال ہی میں ایک اور استری رکھ چھوڑی تھی۔ تمہارے آنے پر بھی اس سے میرا سمبندھ رہا۔''

میں بولی — ''مجھے معلوم ہے۔''

یہ سن کر وہ میری اُور دیکھنے لگے۔ اس دیکھنے کے بھاؤ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرے منہ کو پڑھ لینا چاہتے ہوں۔ میں نے اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر نگاہ نیچی کر لی۔ بار بار میرے دل کے اندر یہ خیال ہو رہا ہے تھا کہ ان بیتی باتوں کے کہنے کا رہس کیا ہے؟'' (پریم چند گھر میں۔ ص ۳۵۴)

پریم چند نے تیس سال کی مدت کے بعد پہلی بار شورانی دیوی کے سامنے اپنی نوجوانی کے اس سانحہ پر سے رازداری کا نقاب اٹھایا تھا لیکن وہ بھی ایسے محتاط اور بے روح الفاظ میں جو واقعہ کے صحیح جذباتی اور رومانی پس منظر کو سامنے نہیں لاتے اور تفصیلات نہیں بتاتے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ان کی اس کمزوری کو شورانی دیوی انسانی عظمت کے شایان شان سمجھ کر دنیا کے سامنے پیش کر دیں گی اور اس طرح اہل نظر واعظ کے اندر چھپے ہوئے رند کو پہچان لیں گے۔

پریم چند کا فن صرف ان کے عہد کی قومی تحریکوں اور اصلاح معاشرت کے خارجی محرکات کا مرقع نہیں ہے بلکہ اس آئینہ میں قدم قدم پر ہمیں ان کی شخصیت کی داخلی ہلچل اور ان کی زندگی کے سوز و ساز کا عکس بھی ملتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کا ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' (جون ۱۹۰۶ء کے قریب لکھنؤ سے شائع ہوا تھا) ان کی نوجوانی کے بعض حالات و حوادث کی سچی تصویر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول سے ہمیشہ انھیں ایک خاص جذباتی انس اور وابستگی رہی ہے۔ ان کے ایک مخلص دوست پیارے لال شاکر نے لکھا ہے کہ انہیں یہ ناول عزیز تھا اور انھوں نے مجھے اس کی غرض و غایت بھی بتائی تھی۔ شاکر صاحب نے اس کے اظہار سے اجتناب کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ غرض و غایت اس ناول کی تصنیف کے داخلی اور نجی محرکات سے متعلق ہو گی۔ کیونکہ جہاں تک ناول کی سماجی اور اصلاحی غایت کا تعلق ہے وہ اس کے ہر لفظ اور ہر صفحہ میں بے حجاب ہے۔ پریم چند کے اس جذباتی تعلق کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اگرچہ اس ناول کے پلاٹ میں کوئی تازگی اور دلآویزی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس ناول کو انھوں نے ۱۹۰۴ء سے ۱۹۳۲ء تک اصلاح و ترمیم کر کے چار مختلف ناموں سے شائع کرایا۔ ہندی میں پریما اور پرتگیا اور اردو میں ''بیوہ'' فی الاصل یہی ناول ہے۔ پریم چند نے اپنے ایک صاحبزادے کا نام بھی اس ناول کے ہیرو کے نام پر امرت رائے رکھا ہے جو آج ہندی کے نامور ادیب اور اردو کے دشمن ہیں۔

''ہم خرما و ہم ثواب'' کے ہیرو 'امرت رائے' کا کردار اس کے مشاغل، اس کے خیالات، اس کی علمی سرگرمیاں اور داخلی حشر خیزیاں پریم چند کی نوجوانی کی یاد دلاتی ہیں۔ امرت رائے ایک نوجوان وکیل ہے۔ پریم چند کی زندگی کا نصب العین بھی اس وقت وکالت پاس کر کے وکیل بننا ہی تھا۔ وہ علمی اور ادبی کتابوں کا رسیا ہے اور ہر نئی تصنیف اس کے زیر مطالعہ رہتی ہے۔ پریم چند کو بھی اس دور میں مطالعہ کا جنون تھا۔ اور جو کتاب بھی ان کے ہاتھ آتی پڑھ ڈالتے۔ امرت رائے فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ پریم چند نے بھی اس زمانہ میں مصوری وغیرہ پر ماہنامہ ''زمانہ'' میں متعدد

مضامین لکھے تھے۔ وہ آریہ سماجی ہے اور اصلاح مذہب و معاشرت پر ایمان رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی زندگی کو اپنے اصلاحی تصورات کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ پریم چند کا مسلک بھی یہی تھا۔ لیکن بایں ہمہ امرت رائے بنیادی طور پر ایک رومانی نوجوان ہے۔ وہ شہر کی ایک خوبصورت لڑکی پریما سے والہانہ عشق کرتا ہے بلکہ اپنے دل میں اس بت کافر کی پرستش کرتا ہے اور جیسا کہ ذکر آچکا ہے۔ پریم چند نے بھی اس دور میں ایک ایسی ہی کافرہ سے عشق کیا ہے۔ امرت رائے کچھ تو اپنے آدرشوں کے تحفظ میں اور کچھ بعض دیگر خارجی (مذہبی وسماجی) رکاوٹوں کی بناء پر پریما سے شادی نہیں کرپاتا۔ پریم چند بھی شاید کچھ ایسے ہی وجوہ کے تحت اس لڑکی سے بیاہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے جس سے انھوں نے پہلا عشق کیا تھا۔ امرت رائے اب پریما کی موجودگی اور اس سے محبت کرنے کے باوصف اپنی جذباتی اور جمالیاتی آسودگی کے لئے ایک خوبصورت نازک اندام اور نوجوان بیوہ کو منتخب کرتا ہے اور اس سے شادی کرلیتا ہے۔ اس طرح وہ ''خرما'' کی شیرینیوں سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور ایک جرأت مندانہ اصلاحی قدم اٹھا کر ثواب کا مستحق بھی۔ پریم چند بھی کچھ ایسے ہی حالات اور محرکات میں ایک بیوہ سے شادی کرتے ہیں۔ اس طرح اس ناول کا پلاٹ خود پریم چند کے عہد شباب سے تراشا ہوا ایک ٹکڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی رومانی زندگی کا یہ مرقع پریم چند کو کتنا عزیز ہوگا۔

میں نے پچھلے اوراق میں کہیں لکھا ہے کہ پریم چند اپنی زندگی کے جذباتی پہلوؤں پر پردہ ڈالنے کے لئے کبھی کبھی دروغ بیانی سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی عمر کے آخری دور میں جب ترقی پسند افکار کی بصیرت انھیں مروجہ اخلاق کی کھوکھلی قدروں سے منحرف کرچکی تھی اور جب وہ ادیب کی حق گوئی کے منصب اور معیار سے آشنا ہوگئے تھے ان میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اپنی زندگی کے اس پہلو کو بے نقاب کرتے۔ چنانچہ ۷ ستمبر ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں ڈاکٹر مدان کو لکھتے ہیں:

''میری ازدواجی زندگی میں بھی کوئی رومانس نہیں ہے۔ میری پہلی بیوی ۱۹۰۴ء میں مرگئی۔ وہ ایک بدنصیب عورت تھی۔ وہ دیکھنے میں ذرا بھی اچھی نہیں تھی اور میں اس سے مطمئن نہیں تھا۔ پھر بھی جیسے سبھی شوہر کرتے ہیں، بغیر کسی قسم کے شکوہ شکایات کے اس کے ساتھ نباہ کرتا رہا۔ جب وہ مرگئی تو میں نے ایک بال بیوہ کے ساتھ شادی کی۔''

پریم چند کا یہ بیان امرواقعہ کے خلاف ہے۔ نہ تو ۱۹۰۴ء میں ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا نہ ہی جیسے سبھی شوہر کرتے ہیں اس طرح انھوں نے اس کے ساتھ نباہ کیا۔ اور یہ بھی صحیح نہیں کہ اس کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسری شادی کی۔ شورانی دیوی سے ان کی شادی ۱۹۰۷ء کے لگ بھگ ہوئی تھی لیکن ان کی پہلی بیوی ۱۹۱۴ء کے بعد تک زندہ رہی۔ پریم چند دوسری شادی کے بعد نو سال تک شورانی دیوی کو بھی یہ یقین دلاتے رہے کہ وہ مرچکی ہے لیکن بالآخر ۱۹۱۴ء میں یہ راز کھل ہی گیا۔ اس انکشاف کی روداد شورانی دیوی کی زبان سے سنئے:

''ایک دن کا واقعہ ہے کہ دروازے پر ان کے پہلے سالے بیٹھے تھے۔ آپ (پریم چند) انھیں سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنی بہن کے بارے میں آپ سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ دکھی بھی تھے۔ اتفاق سے میری دو سال کی لڑکی کملا رینگتی ہوئی دروازے پر چلی گئی۔ میں اسے دیکھنے کے لئے دروازہ کی طرف آئی۔ میں نے دیکھا لڑکی ان کے سالے صاحب کی گود میں تھی۔ وہ بڑے پیار سے چمکار رہے تھے۔ اسی درمیان میں اداس لہجہ میں بولے۔ اگر ہمارا رشتہ بھائی چارہ کا بھی ہوتا تو کیا میری بہن اسے پیار نہ کرتی۔ اس پر آپ خاموش تھے۔ وہ اپنی بہن کے بارے میں بہت سی باتیں کہتے رہے۔ میں بڑے دھیان سے ان کی باتیں آڑ میں سنتی رہی۔ میرے بھی بدن کا خون گرم ہو رہا تھا۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔ آپ لڑکی کو لیکر اندر آئے۔ وہی پہلا دن تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ (پہلی بیوی) ابھی زندہ ہے۔ مجھے تو دھوکا دیا جاتا رہا کہ وہ مر گئیں۔'' (پریم چند گھر میں ص ۳۳)

اس کے بعد شورانی دیوی نے ضد کی کہ اس مظلوم کو بھی اس گھر میں بلا کر رکھا جائے لیکن پریم چند اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ تب شورانی دیوی نے خود ہی اسے کئی خط لکھے اور بلایا۔ اس نے بڑی محبت سے ان خطوط کا جواب دیا۔ انھیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ جب تک میرے پتی مجھے لینے نہیں آئیں گے میں نہیں آؤں گی۔ وہ ایک خوددار عورت تھی۔

بعض حضرات شاید یہ اعتراض کریں کہ پریم چند جیسا ادیب جس نے ہندوستانی سماج میں عورت کی کس مپرسی اور پامالی کے خلاف اپنی تخلیقات میں بڑے خلوص اور جوش وخروش سے آواز بلند کی، اس نے خود اپنی بیوی کے ساتھ یہ ظلم کیوں روا رکھا۔ یا پریم چند نے بے میل شادی کے مسئلے کو جس طرح خود اپنی زندگی میں حل کیا ہے، اس حل کو عملی اور سماجی کہا جا سکتا ہے۔ کیا دوسروں کے لئے یہ معیار یا مثال بن سکتا ہے؟ دراصل اس طرح سوچنا اور ایک ادیب سے اس طرح کا مطالبہ کرنا صحیح نہ ہوگا۔ پریم چند کے اس فعل کی ذمہ داری جس کے نتیجہ میں ایک معصوم لڑکی کی زندگی برباد ہوئی بنیادی طور پر ان کے والدین پر عائد ہوتی ہے جیسا کہ پریم چند نے شورانی دیوی سے کہا تھا:

''میں نے شادی نہیں کی تھی میرے باپ نے کی تھی۔'' (پریم چند گھر میں ص ۳۴)

پریم چند کے سامنے یہ سوال تھا کہ باپ کی اس غلطی کو کس طرح نبھایا جائے۔ انفرادی اور عقلی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو پریم چند نے اس مسئلہ کو جس طرح حل کیا وہ بہترین امکانی حل تھا۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے شادی کے پہلے روز سے وہ اس لڑکی کو شریک حیات تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس لئے کہ وہ ان کے تصور کی لڑکی سے ذرا بھی مطابقت نہ رکھتی تھی اور ان کے دل میں بھی جگہ نہ پیدا کر سکی۔ ذہنی اور جمالیاتی طور پر وہ انھیں کسی طرح کی آسودگی دینے کے بجائے ایک بار بنی رہی۔ سماج کے خیال سے وہ جس کے خورد ونوش کے ذمہ دار تھے۔ ان کے درمیان باطنی اتصال اور قربت کا وہ رشتہ پیدا نہ ہو سکا جو شادی کا اصل محرک ومدعا ہوتا ہے اور جسے پریم چند نے اپنی متعدد کہانیوں اور ناولوں میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک شادی بھانورے

پڑنے یا مقدس آیتیں پڑھنے کا لازمی نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ اصل شادی دو بے چین روحوں، دو دلوں اور دو جسموں کی والہانہ سپردگی کا نام ہے یہ مذہر ملن کسی مروجہ ظاہری رسم کا پابند نہیں ہوتا۔ پریم چند نے اپنے اس تصور کو "پردہ مجاز" کی لونگی کے کردار میں بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔

بہر حال یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اس صورتحال میں جس کا ذکر کیا گیا اگر پریم چند اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھتے تو فطری طور پر اس کی زندگی کی الم نصیبی میں کمی کے بجائے کچھ اور اضافہ ہو جاتا اس لئے کہ ہر ساعت شوہر کی بے دلی اور اس کی محبت سے محرومی اس کی زندگی کو اور بھی تلخ بنا دیتی اور ظاہر ہے کہ اس طرح پریم چند کی اپنی زندگی میں بھی قدم قدم پر نئی الجھنیں، اذیتیں اور مشکلات پیدا ہوتیں۔ ازدواجی زندگی کی یہ فتنہ خیزیاں دونوں کے لئے عذاب جان ہو جاتیں۔ ایک غلطی نہ جانے کتنی غلطیوں کو جنم دیتی۔ اس سے بچنے کے لئے پریم چند نے اُسے ہمیشہ کے لئے اس کے گھر بھیج دیا۔ ان کی شادی شادی نہیں چار آدمیوں کے سامنے ادا کی جانے والی ایک فرسودہ رسم کا منطقی لیکن مصنوعی نتیجہ تھا جس کی ظاہری پابندی پریم چند پر صرف اتنی تھی کہ وہ تمام زندگی اس کی کفالت کا بار اٹھاتے رہے اور پریم چند نے اس کی زندگی میں اس بار کو اٹھانے کی ذمہ داری سے انحراف نہیں کیا۔

یہ مختصری روداد ہے پریم چند کے عہد رومان کی۔ اس میں تلخیاں بھی ہیں اور شیرینیاں بھی۔ بوالہوسی بھی اور پاکیزگی بھی۔ ان کی زندگی کے اس پہلو کو دکھا کر میرا مقصد ان کی شخصیت کی عظمت کو کم کرنا نہیں بلکہ انہیں فرشتوں کی صف سے نکال کر انسانوں کے درمیان لاتا ہے تا کہ انہیں قریب سے دیکھ کر ان کے دل میں جھانک کر ہم ان سے کچھ اور مانوس ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی محرومیوں اور شادکامیوں میں شریک ہو کر اور اپنے احساسات کو ان کے جذباتی تموج سے ہم آہنگ کر کے ہمارے دل میں ان کی شخصیت کا نقش کچھ اور گہرا اور دیرپا ہو جائے گا۔ ادیب اور قاری کے درمیان باہمی خلوص، یگانگت اور قربت کا رشتہ جتنا استوار ہوگا اتنا ہی اس کے فن کی قدر و قیمت کا صحیح تعین ہو سکے گا۔ یہ تو ممکن ہے کہ ہم کسی ادیب کی تخلیقات کو پڑھے بغیر اس کی زندگی اور اس کی شخصیت تک رسائی حاصل کر لیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ کسی ادیب کی شخصیت اور اس کی زندگی کے پیچ و خم سے گذرے بغیر ہمیں اس کی تخلیقات اور اس کے فن کے رموز کا عرفان حاصل ہو سکے۔

اضافہ از ف۔ س۔ اعجاز

ڈاکٹر قمر رئیس سے مانک ٹالہ کا اختلاف

ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر میں اس مضمون کی اشاعت کے بعد ادبیات منشی پریم چند کے ماہر جناب مانک ٹالہ نے مدن گوپال صاحب سے رابطہ کیا اور قمر رئیس صاحب کی بعض باتوں کی تصدیق چاہی۔ مدن گوپال صاحب نے ان باتوں سے قدرے اختلاف کیا۔ مدن گوپال کے جواب کی نقل کے ساتھ مانک ٹالہ صاحب نے قمر رئیس سے تعرض کرتے ہوئے انہیں خط لکھا۔ قمر رئیس صاحب نے مانک ٹالہ کے اظہار اختلاف کو ان کا حق سمجھتے ہوئے وہ تحریر انشاء میں شائع کروادی۔ پھر مانک ٹالہ صاحب نے "پریم چند

کی داشتہ'' عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا اور اپنی ایک کتاب میں شامل کیا۔
''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' کے اس نئے ایڈیشن میں ''پریم چند کی داشتہ''
مضمون سے اہم اقتباسات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

''ڈاکٹر قمر رئیس نے مدن گوپال کے حوالے سے جو اطلاع مہیا کی
ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ واقعہ دھنپت (پریم چند) کے والد کی وفات سے
تقریباً ایک' ڈیڑھ سال بعد کا ہے' جب فیس معاف نہ ہوسکنے کے باعث کالج
میں داخلہ نہ لے پائے اور بنارس میں پانچ روپے ماہوار کی ٹیوشن پکڑلی تھی۔
اس رقم میں سے تین روپیہ ماہوار گھر میں دے آیا کرتے تھے۔ باقی کے دو
روپیوں میں اپنا مہینے بھر کا گزارہ چلاتے تھے۔ اور اکثر و بیشتر ادھار پر گزر بسر
ہوتی تھی۔ مفلس عورت کسی کی داشتہ بننے پر تب راضی ہوتی ہے جب کوئی اس
کی کم سے کم ضروریات کی کفالت کے قابل ہو۔!

مدن گوپال نے اس واقعہ کا ذکر تحریر فرمایا ہے لیکن اس میں نہ تو اس
مفلس و نادار ''مسلمان'' خاتون کا ذکر فرمایا ہے اور نہ ہی اس واقعے کا تعلق
بنارس سے جوڑا ہے۔ بلکہ اس بات کا تعلق وہ الہ آباد سے منسوب کرتے ہیں۔
موصوف تحریر فرماتے ہیں:

''پریم چند کی رکھیل شائد الہ آباد کی کوئی عورت ہوگی۔ بعد میں
موقعہ ملتے ہی وہ الہ آباد جاتے۔ رکھیل کو کچھ رقم بھیجتے رہے ہوں گے۔ دوسری
شادی کے بعد بھی۔ یہ بھی شورانی دیوی سے چوری سے۔ مئی ۱۹۱۰ء میں دیا

442

نرائن نگم کو کل پہاڑ سے لکھے ایک خط میں طویل مضامین کے لیے دگنی رقم مانگتے
ہوئے کہا۔ ''یہ میں اب پھر کہتا ہوں اور پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ مگر کسی وجہ سے
وہ ریمارک آپ نے نظر انداز کردیا کہ یہ مبلغات میں اپنے تصرف میں نہیں
لاؤں گا۔ یہ ایک مرحوم دوست کے پسماندگان کی نذر ہوں گے۔ اس لیے
آپ کو بھول کر مجھ پر کمینہ پن' خود غرض اور طمع کا الزام نہ عائد کرنا چاہیئے''۔

درج بالا تحریر میں مدن گوپال صاحب اس معاملے کا تعلق الہ آباد
سے جوڑتے ہیں۔ یہ بات ہے بھی قرین قیاس۔۔ دھنپت رائے (پریم چند)
جب الہ آباد میں جونیر ٹیچرس ٹریننگ کے سلسلہ میں (۶؍جولائی ۱۹۰۲ء سے
۳۰؍اپریل ۱۹۰۶ء تک) مقیم تھے' ان ہی دو سالوں میں ان کے تعلقات کسی
مفلس نچلے طبقے کی خاتون سے استوار ہوگئے ہوں گے۔ کیوں کہ وہ اس
زمانے میں نصف تنخواہ میں سے سات روپے گھر میں دینے کے بعد بقیہ تین
روپے اور ٹیوشن کے پانچ روپے ملاکر کل آٹھ روپے میں اپنے گزارے کے
ساتھ ساتھ اس عورت کی کفالت بھی کرسکتے تھے۔

بہرحال میں نے مدن گوپال صاحب سے اس سلسلے میں رجوع کیا
تھا۔ چنانچہ میرے استفسار کے جواب میں موصوف نے اپنے ۲۰؍مارچ
۱۹۹۱ء کے انگریزی خط میں جو جواب دیا اس کا متعلقہ اقتباس پیش خدمت
ہے:

''قمر رئیس ایک پرانے دوست ہیں۔ تیس سال سے بھی زیادہ
عرصہ ہوا کہ ہماری اس موضوع پر گفتگو ہوئی تھی..... میں نے اس وقت قمر رئیس

کو بتلایا تھا کہ میں پریم چند کے خطوط کی تلاش میں ہوں۔ اور (اس بارے میں) مختلف حضرات کے ساتھ تبادلۂ خیال بھی کیا تھا۔ (اور) جہاں تک مجھے یاد ہے ان میں لیڈر پریس کے ایک صاحب بھی تھے۔ ''میں اس عورت کو کھوج نکالنے کا خواہاں تھا کہ شائد اس سے کچھ خطوط حاصل کرسکوں جن سے پریم چند کی زندگی کے اس نامعلوم پہلو پر کچھ جانکاری مل سکے۔ لیکن میں ناکام رہا''۔

''ان صاحب کا بھی یہ تاثر تھا کہ وہ عورت ان دنوں الہ آباد ہی میں ہوگی جب پریم چند وہاں ٹیچرس ٹریننگ اسکول میں ٹریننگ حاصل کررہے تھے''۔

اس خط کے نفسِ مضمون سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس واقعہ کا تعلق کسی بھی حالت میں پریم چند کے بنارس کے زمانہ رہائش سے نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

روبیرت روزدستونسکی

مترجم: ف۔س۔اعجاز

صرف اِک بات

رات بچے کی طرح ننگی ہے
سانس لینے کو ہوا کافی ہے
جتنی بھی ہے فضا کافی ہے
ایک سرگوشی اندھیرے کو جلا دیتی ہے

کانپتے، چھیدتے الفاظ ادا ہوتے ہیں
''مجھ سے اک بات کہو اچھی سی! .....
ہاں کوئی بات کرو اچھی سی!
آسمانوں کو فقط تاروں سے بھر جانے دو
عمر برباد ہی کردوں گا تمہاری خاطر
صرف اک بات کہو اچھی سی
عمدہ الفاظ ہوں

ماضی کی طرح دائمی ہوں
کیا بڑے بوسوں کی قیمت ہی نہیں ہے کچھ بھی؟
تم کو معلوم ہے کیا لفظ ادا کرتے ہیں۔
میں نے تم سے بھی زیادہ تو نہیں چاہا ہے ——
اس لئے بات کچھ اچھی سی کہو
جھوٹ کہنے پہ بھی تم نے نہیں اُکسایا
حوصلہ جس سے کہ بے عقل محبت کا بڑھے
جس سے عورت کے ذرا دیر کو غنچے کھل جائیں
اس لئے واقعی اک بات کہو اچھی سی
تم، کہ بے حال سی عورت ہو
بہت لاپرواہ
ایک خاتون زلیخہ جیسی
جانے کیا چاہتی ہو؟
جھوٹ کہ سچ؟''

آخر عورت نے یہ سرگوشی کی
''کہو کیا کہتا ہے!
صرف اک بات کہو
واقعی جو کہ بہت اچھی ہو........''

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

ٹیگور کی داستانِ محبت[1]

ایک تو ''عشق پر زور نہیں'' اور اس پر شاعر کا دل — کہتے ہیں وہ ''لڑکپن سے عاشقانہ'' ہوتا ہے۔ ایک شاعر جو حسن کا پجاری ہو، وہ زندگی بھر عشق و محبت سے دور رہا —! یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟۔ لیکن تاریخ ادب میں چند فنکار ہیں جن کے عشق سے ہم آگاہ نہیں ہیں۔ عموماً ایسے فنکار جن کو اپنی ''بزرگی'' کا خاص خیال رہا ہے، انہوں نے ایسے سب نقوش مٹا ڈالے جن سے ان کی ''بزرگی'' پر کوئی آنچ آ سکتی ہو، داغ لگ سکتا ہو۔ ربندر ناتھ ٹیگور کی داستانِ عشق پر بھی کئی پردے پڑے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کے اس پہلو کا عموماً کوئی ذکر پایا نہیں جاتا، حالانکہ ٹیگور کی نظموں، گیتوں، کہانیوں، ڈراموں، ناولوں، سفرناموں اور خطوط وغیرہ میں عشق و محبت سے بھرپور بے شمار رنگ برنگی تصویریں ہیں۔ تو کیا یہ سب محض ہوائی قلعے ہیں؟ — نہیں — لیکن ہوا یہ ہے کہ ان کی بزرگی نے ان کی عظمت نے، ان کے ''گرو دیو'' ہونے نے، ان کو ایک شاعر سے زیادہ ''رشی'' بنا دیا ہے۔ لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمالیہ کی بلند چوٹی پر بیٹھے ہوئے ایک مہان رشی ہیں جو تمام تر انسانی فطری تقاضوں سے، انسانی کمزوریوں سے بری ہیں، پاک ہیں — لہٰذا ہم بھول جاتے ہیں کہ ربندر ناتھ بھی انسان تھے، گوشت پوست کے انسان اور یہ کہ کبھی وہ بھی جوان تھے اور انہوں نے بھی محبت کی ہے — جبکہ مزے کی بات تو یہ ہے کہ ٹیگور کی زندگی پر ذرا گہری نظر ڈالنے سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ عشق کے معاملے میں وہ ''مسلمان'' نہیں تھے اور غالباً آخری عمر تک وہ اس سلسلے میں ''مسلمان'' ہونے کے قائل بھی نہیں رہے ہیں۔ ان کا دل بار بار مچل مچل اٹھا اور کسی نہ کسی انداز میں محبت نے ان کے دل میں انگڑائیاں لی ہیں۔

ربندر ناتھ کی زندگی میں اتھل پتھل مچانے والی پہلی حسینہ ہونے کا شرف ''انا'' کو حاصل ہے۔ انا شہر بمبئی کے ایک نامور رئیس پانڈورنگ ترکھڈ کی دختر نیک تھی۔ دلکش رنگت، سڈول بدن، روشن آنکھیں، موہنی صورت، چنچل فطرت اور جدید انگریزی تعلیم یافتہ —— پانڈورنگ جی، ستیندر ناتھ ٹیگور[2] کے دوست تھے۔

۱۸۷۸ء۔ ان دنوں ربندر ناتھ ۱۷ برس کے تھے۔ ستیندر ناتھ

---

[1] اس مضمون کیلئے میں نے زیادہ تر مدوشری ج ربندر ناتھ کے ایک بڑے بھائی۔ اجیا بھ چودھری کی بنگلہ تصنیف ''اکثر سے ربندر ناتھ'' سے لی ہے۔

[2] ہندوستانیوں میں اولین آئی۔ سی۔ ایس۔ ولادت ۱۸۸۴ء، وفات ۱۹۲۲ء

ٹیگور ان کو ولایت روانہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ربندر ناتھ کو لندن روانہ کرنے سے پہلے انہوں نے فیصلہ کیا کہ انگریزی زبان، طرز زندگی اور چال چلن سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ان کو ایک ایسے گھرانے میں کچھ دنوں کے لئے رکھیں جہاں سب ہی ولایتی ہوا سے مانوس ہوں۔ اس لئے لندن جانے سے پہلے ربندر ناتھ کو بمبئی کے پانڈورنگ گھرانے میں مہمان ہونا پڑا۔

ربندر ناتھ کتنے حسین تھے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کون ہے جس نے ان کی کوئی نہ کوئی تصویر نہیں دیکھی۔ وہ نہ صرف شاعر اور گیت کار تھے بلکہ ان کی آواز میں بھی جادو تھا۔ ایسے نوجوان سے قریب آنے کے لئے کوئی حسینہ بیاکل کیوں نہ ہو؟۔ انا نے نوجوان ربندر ناتھ کو دیکھا اور وہ دل دے بیٹھی۔ بہت جلد وہ ایک دوسرے سے قریب ہو گئے، قریب نہایت قریب۔ ٹیگور نے لکھا ہے— ''وہ مجھ سے ملنے اکثر آتی اور مختلف بہانوں سے میرے اطراف منڈلاتی پھرتی''۔

بمبئی میں یہی انا، ربندر ناتھ کی ساتھی تھی۔ پڑھنے کے کمرے میں، کھانے کے ٹیبل پر، باہر باغ میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے، گیت گاتے ہوئے۔ ہر وقت انا اور ٹیگور، ٹیگور اور انا— باتیں ہی باتیں گیت ہی گیت— ٹیگور کہتے ہیں:-

''میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے اچھی طرح محسوس ہوتا تھا کہ ہونے کے لائق کچھ ہوا ضرور ہے۔ لیکن افسوس، اس ہونے کو پروان چڑھانے کی نہ میں نے کوشش کی اور نہ ان دنوں میں اپنے آپ کو اس لائق سمجھتا تھا—''

انا، عمر میں ربندر ناتھ سے کچھ بڑی تھی۔ لہٰذا بقول شاعر انا نے ہی عشق میں پہل کی تھی۔ ٹیگور نے کتنی انگریزی سیکھی تھی کہنا مشکل ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ انا نے ٹیگور سے بنگلہ سیکھی تھی۔ بنگلہ زبان کے گیت اور شاعری سے وہ دلچسپی لینے لگی تھی۔ جب ٹیگور گاتے تو وہ دل لگا کر سنتی اور پیار بھری نظروں سے ٹیگور کو دیکھتی رہتی۔

ایک شام، ٹیگور اکیلے کمرے میں ٹیبل پر جھک کر بیٹھے ہوئے ''کوبی کاہنی'' پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انا کو شرارت سوجھی۔ ایسے میں انا دبے پاؤں کمرے میں آئی اور پیچھے سے آ کر ٹیگور کی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے بند کر کے بولی— ''کہو تو کون ہے؟''— انگلیوں کے لمس سے ٹیگور نے جان لیا اور انا کھلکھلا کر ہنس پڑی— ''آج کوئی کام نہیں، صرف تمہاری شاعری سنوں گی— ''وہی نظمیں جو ٹیگور کئی بار سنا چکے تھے پھر سے سناتے رہے اور ٹیگور کے اشعار اور ترنم میں انا کھو گئی۔

انا چاہتی تھی کہ ٹیگور اسے کوئی نیا نام دے اور ٹیگور نے اس کا نام ''نلنی'' رکھا تھا۔ صرف نام ہی نہیں بلکہ اس نام پر انہوں نے گیت بھی لکھے ایک گیت کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:-

''نلنی سنو، آنکھیں کھولو
کیا ابھی نیند نہیں ٹوٹی—؟
دیکھو، تمہارے در پر

ساتھی رَبّی آ کھڑا ہے''

۱۷ برس کی عمر میں شاعر کا دل انا کی وجہ سے بہت بڑی حد تک جوان ہو چکا تھا۔ اس نے انا کے سلسلے میں کئی نظمیں اور گیت لکھے۔ جو باتیں وہ اس عمر میں اپنی زبان پر نہیں لا سکتے تھے اسکو انہوں نے اشعار میں ڈھال کر پیش کیا۔ مثلاً

''حسن تو بے شمار آنکھوں میں ہے
حسین آنکھیں اور بھی ہیں
لیکن تیری آنکھوں میں بسا ہوا ہے، پریم رس
نلنی او نلنی ''

نلنی ٹیگور کی پہلی محبوبہ تھی اور اس نام سے انہیں زندگی بھر پیار رہا ہے۔ نہ صرف ان کی کئی تخلیقات میں ہم پاتے ہیں بلکہ ٹیگور نے اپنی شریک حیات کا نام بھی نلنی کی مناسبت سے ''برنالنی'' رکھا تھا۔

ایک دن دونوں کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیگور گا رہے تھے اور نلنی سن رہی تھی۔ گیت ختم ہونے پر نلنی بولی— ''رَبّی تم کبھی داڑھی مت پالو، تمہارا یہ حسین چہرہ داڑھی کی آڑ میں چھپ جائے گا— '' ٹیگور انا کی یہ بات رکھ نہیں پائے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انا کے انتقال کے برسوں بعد ہی ٹیگور داڑھی پالنے لگے تھے۔

بارہا ایسا ہوا ہے کہ ٹیگور اپنے کمرے میں اکیلے ہیں۔ انا آئی، دونوں دیر تک کھیلتے رہے۔ طرح طرح کے کھیل، چھیڑ چھاڑ، مذاق، اٹکھیلیاں۔ کبھی وہ بستر پر لیٹ جاتی، کبھی ٹیگور کی گود میں گر پڑتی۔ ٹیگور کو پریم کہانیاں سناتی— لیکن اس کے آگے بھی کچھ ہوا ہے یا نہیں، کون جانے؟ کون کہے؟۔

ولایت روانہ ہو جانے کے بعد انا سے پھر کبھی ٹیگور کی ملاقات نہیں ہوئی۔ ٹیگور ولایت گئے، لوٹ آئے، پھر گئے، پھر لوٹے۔ وہ نامور شاعر ہوئے، نوبل انعام پایا۔ شاعر جہاں کہلائے— لیکن افسوس کہ انا یہ سب کچھ جان نہ سکی، دیکھ نہ سکی۔ ٹیگور کے ولایت جانے کے بعد ایک اسکاچ پروفیسر سے انا کی شادی ہوگئی اور وہ میاں بیوی اڈنبرا چلے گئے تھے جہاں چند سال بعد انا چل بسی۔

ٹیگور بڑھاپے میں بھی اپنی اولین ناکام محبت کو بھلا نہیں پائے تھے۔ انہوں نے دلیپ کمار رائے سے کہا تھا— ''اس لڑکی کو بھول نہیں پایا۔ اس کی قدر ہمیشہ کرتا رہا ہوں۔ اور آج بھی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں...... ہر عورت کا پریم، چاہے وہ کسی قسم کا پریم ہو، ہمارے دل کے بن میں کسی نہ کسی کلی کو کھلا کر پھول بنا دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ پھول بعد میں مرجھا کر گر جائے، لیکن اس کی خوشبو باقی رہتی ہے— ''

انا، ربندر ناتھ ٹیگور کے دل کو محبت سے آشنا کرنے والا پہلا پھول تھی۔ وہ مرجھا گئی، گر گئی، فنا ہوگئی لیکن اپنی یاد کی خوشبو ہمیشہ کیلئے چھوڑ گئی۔

(۲)

پھر پہلی بار انگلستان میں— غالباً یہی کہنا درست ہے کہ تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ وہ ٹیگور ولایتی سماج میں ناچ رنگ اور پارٹی پکنک کی محفلوں

میں کھو گئے تھے۔ ۱۸ برس کا یہ نوجوان، کبھی لندن، کبھی برائٹن اور کبھی شہر نار کی میں گھومتا پھرا، اور ولایتی حسیناؤں کی باہوں میں باہیں ڈال کر رقص کی محفلوں میں رقص کرتا رہا۔ گیت گا کر اس نے کئی حسیناؤں کا دل جیت لیا تھا۔ اس پہ دولت کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ دل کھول کر لٹاتا رہا۔ بمبئی میں ابا کے ہاں جو شرمیلا نوجوان تھا وہ ولایت میں بالکل ہی بدل گیا۔ انہوں نے ان دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

''جب انجانی لڑکیوں کے ساتھ اگر پاگل کی طرح
گھومنے پھرنے میں دل نہ بھی لگتا تو اتنا ضرور تھا کہ جن سے
تعلقات قائم ہوئے تھے ان کے ساتھ رقص کرنے میں مجھے
لطف آتا۔۔۔''

''سفرنامہ یورپ'' میں ناچ گھروں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے مزید لکھا:۔

''بڑا ہال، گیس کی تیز روشنی سے جگمگاتا ہوا، چاروں طرف بجتے ہوئے باجے۔ چھ، سات سو مرد، عورتیں...... جس طرف قدم بڑھاتا ہوں میم صاحبہ کے گاؤن ہی گاؤن۔ جس طرف نظریں اٹھاؤں، نگاہیں جھلس جاتی تھیں...... سب چہروں پر مسکراہٹیں۔ دل پر فتح پانے کے لئے جتنے ہتھیار ہو سکتے ہیں یہاں کی حسینائیں وہ سب ہی بے کھٹکے برساتی ہیں...... ناچ گھروں کے آس پاس جو برآمدے ہیں یا جہاں کہیں دو چار درخت ہیں وہاں ایک دو لکڑی کے بنچ ہیں۔ ان باغوں کو عاشقوں کا باغ بھی کہہ سکتے ہیں۔ رقص سے تھک کر یا رقص کے شور وغل سے ہٹ کر نوجوان جوڑے یہاں محبت کی باتوں میں مشغول رہ سکتے ہیں۔۔۔''

اس طرح کی محفلوں میں ٹیگور نے کئی حسیناؤں کے دل جیتے تھے۔ حالانکہ ٹیگور کا کوئی ایسا واضح بیان کہیں پایا نہیں جاتا جس سے یہ کہا جا سکے کہ انہوں نے ان باغوں میں حسیناؤں سے لطف اٹھایا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ رقص کے لئے حسیناؤں کا خوب انتخاب کرتے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

''مس فلاں کے ساتھ میرے اچھے تعلقات تھے۔ وہ دیکھنے میں خوب تھی۔ اس کے ساتھ ''گیلپ'' رقص میں حصہ لیا تھا...... مجھے ایک بار ایک حسین پارٹنر ملی تھی۔''

ٹیگور نے یہ بیان نہیں کیا ہے کہ وہ کسی کے دام محبت میں پھنسے تھے یا نہیں لیکن جس انداز میں انہوں نے ناچ رنگ کی محفلوں، باغوں میں محبت کرنے والوں، تجارتی انداز محبت کی گفتگو، معشوقانہ شوخیاں چھیڑ چھاڑ اور کورٹ شپ وغیرہ کا تفصیلی بیان قلم بند کیا ہے اس سے یہ خیال کرنا زیادتی نہیں ہوگا کہ عملی تجربے کے بغیر اس طرح کی تفصیلات سے آگاہی اگر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ضرور ہے۔

ہاں، اس سلسلے میں ایک اہم نام مس مولی کا آتا ہے۔ حالانکہ ٹیگور کے کسی بیان سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ مس مولی کے وہ عاشق تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ مس مولی کو ٹیگور سے محبت ہو گئی تھی۔ مولی ان کو .Mr. T کہتی اور ٹیگور کے علاوہ نہ وہ کسی اور کے ساتھ رقص کرنا پسند کرتی اور نہ ساتھ گھومنے

جانا چاہتی تھی۔ ٹیگور کے دیر سے گھر لوٹنے پر وہ ناراض ہوتی اور گہری رات تک
وہ اس بنگالی نوجوان کی آواز میں انگریزی گیت سنا کرتی۔ ٹیگور کہتے ہیں:-

''رات ½11 بجے گھر لوٹ کر دیکھتا ہوں کہ مس مول سوئی نہیں
ہے۔ اس کے ساتھ کچھ دیر گپ شپ رہی۔ باتوں باتوں میں وہ بولی I am
glad of it. I hate having sister. اس ملک میں بہن سے بہن کا عشق
میں مقابلہ ہوتا ہے۔ غالباً دونوں میں جھگڑے ہوتے ہیں—''

مس مول ربندر ناتھ کو Robin Adair کہہ کر بلاتی۔ بہت رات
تک ناچ گانے کی محفل یا شعر و شاعری کی محفل سے لوٹنے کے بعد جب ٹیگور
Good night کہتے تو وہ کان میں چپکے سے Good night, beloved
کہہ جاتی۔

راج نارائن نامی ایک اور ہندوستانی مس مول کا عاشق تھا۔ اس
لئے مس مول کے ضد کرنے پر بھی ٹیگور اس کے ساتھ ''کین سنگٹن گارڈن'' یا
''Q گارڈن'' کی سیر کرنے نہیں جاتے تھے۔ چونکہ وہاں راج نارائن سے
سامنا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ پھر بھی مس مول ٹیگور کو چھوڑتی نہیں تھی۔ ٹیگور جتنا
پیچھے ہٹتے وہ اتنا ہی آگے بڑھتی۔ آخر ٹیگور نے سیر تفریح کو چھوڑ کر صرف
گیتوں تک اپنے کو محدود کر لیا۔ مس مول کا پسندیدہ گیت تھا— ''الی، بار بار
پھرے جائے''۔ یعنی ''بھونرا بار بار لوٹ جاتا ہے—'' یہاں یہ ذکر دلچسپی
سے خالی نہیں کہ لفظ ''الی'' بنگلہ میں ایک ذومعنی لفظ ہے۔ عام معنی ''بھونرا''
ہے لیکن ایک اور معنی ''پہرے دار، محافظ یا نگراں'' کے بھی نکلتے ہیں۔ اس
طرح گیت میں لفظ ''الی'' سے جہاں ''بھونرا'' یا ''عاشق'' کے معنی نکلتے ہیں
وہاں ''پہرے دار، یا رقیب'' کے معنی بھی۔ مس مول گیت سنتی اور کہتی "It is
sweetly pretty, so pathetic with its minor tones".

ٹیگور حاضر جواب تھے اور طنز بھی کر سکتے تھے۔ اس کی ایک مثال
پیش کرتا ہوں۔ ایک بار وہ تصاویر کی ایک نمائش میں گئے۔ وہاں ان کی ایک
اور چاہنے والی مس وسوالڈ سے ملاقات ہوگئی۔ لیکن ٹیگور کے ساتھ اس وقت
مس مول چپکی ہوئی تھی اور ٹیگور کی کمر میں ہاتھ ڈال کر مسکراتی گھوم رہی تھی اور
چونکہ مس وسوالڈ سے پہلے وہ ٹیگور کو اپنے قبضے میں کر چکی تھی۔ اس لئے مسکراتی
ہوئی بولی "I am quick to forget everything"
اور ٹیگور نے فوراً کہا "Quick to forget?"۔

لیکن سامنے ہی خطرہ تھا۔ ٹیگور نے دیکھا کہ سامنے سے راج
نارائن آ رہا ہے اور اس کا چہرہ حسد کی آگ میں جل رہا ہے لہٰذا وہ پیچھے ہٹ
گئے ان کو اس دن کی بات یاد آ گئی جس دن مس مول پیانو بجا رہی تھی اور راج
نارائن سامنے کھڑا سن رہا تھا۔ وہ نادان یہ سمجھ رہا تھا کہ مس مول اسے ہی پیانو
بجا کر سنا رہی ہے۔ لیکن بغل کے کمرے میں رہ کر ٹیگور سمجھ پا رہے تھے کہ یہ سُر
کس کے لئے ہے؟۔ اس سُر کا مقصد کیا ہے؟۔ لیکن وہ ڈرائنگ روم میں نہیں
آئے۔ دیر تک ٹیگور کے نہ آنے پر مس مول، راج نارائن سے مخاطب ہوئی
"Mr. Tagore ought I wonder"
راج نارائن نے غصہ سے جواب دیا "No evidently your

signal has not attracted him".

اس دن راج نارائن کا جواب سن کر ٹیگور نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ مس مول سے تعلقات نہیں بڑھائیں گے۔ آخری بار مس مول سے بچھڑتے ہوئے ٹیگور نے مول کو اس کا پسندیدہ گیت سنایا تھا Remember me اور مس مول نے کانپتی آواز میں کہا تھا "Mr. T. I shall remember you".

(۳)

ایک بس مول کو چھوڑنے سے کیا ہوا۔ کئی اور ''مس'' تھیں۔ مس لانگ، مس ویویان وغیرہ وغیرہ۔ گویا ان دنوں عشق کے معاملے میں ٹیگور بھی اس کے قائل تھے — ''تو نہیں اور سہی''—

ٹیگور نے کئی بار ولایت کا سفر کیا اور صرف ولایت نہیں بلکہ انہوں نے دنیا بھر کا سفر کیا ہے۔ ان کے سفرناموں اور بے شمار خطوط میں کئی حسیناؤں کے نام ہیں۔ جن کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ٹیگور سے مختلف وجوہات کی بنا پر وہ خواتین قریب آئی تھیں اور ان میں سے کئی نے ٹیگور کے دل پر عارضی طور پر ہی کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ اثر کیا تھا، اور چند وہ بھی ہیں جن کی یادیں بار بار ٹیگور کے دل میں لہروں کی طرح آتی جاتی اور دل کے ساحل سے ٹکراتی رہی ہیں۔ یہ ناممکن نہیں کہ ٹیگور کے ہاں بھی کئی ''تصویر بتاں'' اور ''حسینوں کے خطوط'' رہے ہوں، جن کا علم حیات ٹیگور پر تحقیق کرنے والے محققین حاصل نہیں کر سکے۔

اتنا یقیناً درست ہے کہ ٹیگور کسی کے دام محبت میں پھنس کر نہیں رہے۔ لیکن جو بھی خاتون قریب آئی، اس کو انہوں نے پرے دھکیل بھی نہیں دیا ٹیگور نے ایسے چند واقعات کا ہلکا ہلکا ذکر کیا ہے۔

''وہ سندری، جو مجھے بے حد پسند تھی، میں نے دیکھا کہ پچھلے کئی دنوں سے وہ میرے قریب آنے کی کوشش کر رہی ہے وہ خود کل رات آکر بولی "Aren't you going to sing?"

میں نے مختصراً کہا "Yes, I"

اور گانے لگا۔ آج صبح اس سے گفتگو ہوئی۔ اس کے چہرے پر شانت سنجیدگی تھی...... ایسی حسین آنکھیں، ناک اور لب، مجھے بے حد پسند ہیں اور غالباً وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے—''

لندن کے دوسرے سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''اس بار لندن پہونچتے ہی میں نے میرے سب سے زیادہ جانے پہچانے گھر پر جا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ جو خادمہ باہر نکل آئی وہ نئی تھی۔ اس سے پوچھا— وہ کہاں ہیں؟۔ وہ بولی— اس نام کی یہاں کوئی نہیں ہے— پھر سوال کیا— کہاں رہتی ہیں؟ وہ بولی— میں نہیں جانتی۔ آپ اندر آکر تشریف رکھئے۔ میں پوچھ آتی ہوں— پہلے جس کمرے میں ہم کھاتے پیتے تھے اس کمرے میں جا کر دیکھا کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ وہاں ٹیبل پر اخبار اور کتابیں ہیں۔ یہ کمرہ اب ڈرائنگ روم بنا ہے۔ کچھ دیر بعد خادمہ ایک کارڈ لے

آئی۔ بچے کا کارڈ۔ وہ اب لندن کے باہر کہیں اور رہتی ہے۔ دل اداس
ہوگیا۔ اس گھر سے باہر نکلا۔ ایسا لگا جیسے مرنے کے ایک مدت بعد پھر سے دنیا
میں آیا ہوں...... دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ اتنے میں اس گھر کا مالک باہر
نکلا پوچھا— تم کون ہو؟۔ میں نے بعد آداب کے کہا— ''جی، کوئی نہیں،
ایک پردیسی ہوں— '' کیسے بتاؤں کہ یہ گھر بھی میرا تھا، ہمارا— ''

ٹیگور جس کا گھر تلاش کررہے تھے وہ کوئی اور نہیں لوسی
اسکاٹ تھیں۔ پہلی بار لندن آکر جب ٹیگور کا دل اتا کی یاد میں کھویا کھویا تھا۔
تب وہ اسکاٹ گھرانے کے مہمان تھے۔ گھر میں مسٹر اسکاٹ، مسز اسکاٹ، چار
لڑکیاں، دو لڑکے، تین خادمہ، اور ''ٹوبی'' نامی ایک کتا تھا..... ڈاکٹر اسکاٹ
اور مسز اسکاٹ دونوں ان کو چاہتے تھے اور چار بیٹیوں میں سے دو کو ان سے
محبت ہوگئی تھی۔ ایک ساتھ دو بہنوں کی محبت سے ربندرناتھ پریشان ہوگئے
تھے۔ ایک پر زیادہ توجہ دینے سے دوسری روٹھ جاتی۔ دل لگا کر ایک سے ایک
گیت سننے پر دوسری سے کم از کم دو گیت سننا ضروری تھا۔ ایک کو لے کر چھت
پر اکیلے میں کچھ دیر باتیں کرنے پر، دوسری کے ساتھ باغ میں سیر کے لئے جانا
پڑتا۔ ٹیگور کو اس میں لطف بھی آیا اور جلد وہ اس طرز عشق سے مانوس ہوگئے۔

دونوں بہنوں سے ٹیگور عشق فرماتے رہے لیکن ان دونوں میں جسے
وہ اپنے دل سے زیادہ قریب پاتے تھے وہ لوسی تھی— پھر ٹیگور کے وطن لوٹ
آنے کے دن آگئے اور جس دن وہ اس گھر سے لوٹنے لگے تب مسز اسکاٹ
روتے روتے بولی تھیں۔ ''جب اس طرح چلا ہی جانا تھا، تو چند دنوں کے لئے
تم آئے کیوں تھے؟''۔ یہ صرف مسز اسکاٹ کی بات نہیں تھی، ٹیگور کا دل بھ
بھر آیا تھا اور وہ دو بہنیں بھی رومال سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی تھیں۔

پھر کبھی ٹیگور کی ملاقات ان دو بہنوں سے نہیں ہوئی لیکن ان کی
یادیں ہمیشہ ٹیگور کے دل کے ایک گوشہ میں محفوظ رہی ہیں۔ ٹیگور کی چند نظمو
اور خاص کر نظم ''دو دن'' میں ان میں سے ایک بہن کی تصویر نمایاں ہے۔ چن
اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

''ایک چہرہ ابھر آتا ہے
ایک گیت کے چند بول
ایک دو سُر
چند یادیں

....

....

انسانی دل کیسا پتھر ہے؟۔
وہ سب کچھ برداشت کرلیتا ہے
رفتار وقت کے ساتھ ساتھ
انسان، سب کچھ بھول جاتا ہے

....

....

افسوس، میں دو دن کے لئے یہاں آیا تھا— اور ایک کومل دل کو

توڑ گیا''

جس ''کومل دل'' کو وہ توڑ آئے تھے اس کی باتیں اور اس کی بہن کی حسد کی باتیں ٹیگور کو بعد میں بھی ستاتی رہی ہیں۔ ''یادیں'' میں انہوں نے لکھا:-

''اب اس ڈاکٹر گھرانے کے افراد میں سے کون زندہ ہے اور کون نہیں، کون اس دنیا کے کس کونے میں ہے اس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ لیکن وہ گھر آج بھی میرے دل میں بسا ہوا ہے''۔

تقریباً نصف صدی بعد کا ذکر ہے۔ ۱۹۲۹ء۔ ٹیگور ملک کناڈا میں تھے۔ شانتی نکیتن میں ایک انجانے انگریز کا خط آیا۔ دیگر باتوں کے علاوہ اس انگریز نے ٹیگور کو لکھا تھا کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اس کی خالہ لوسی سے شاعر کے گہرے تعلقات تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس کی خالہ لوسی آج بھی غیر شادی شدہ ہے اور آج بھی وہ ٹیگور کی باتیں کہتی ہے اور کبھی کبھی یاد ماضی کا ذکر کرتے کرتے اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ لیکن ہائے قسمت — آج لوسی صرف بوڑھی نہیں بلکہ عرصہ سے بیمار ہے۔ اس کے پاس نہ دولت ہے اور نہ ہی اب رہنے کا کوئی ٹھکانہ۔ شاعر سے اس زمانے کے تعلقات کا واسطہ دیتے ہوئے خط لکھنے والے نے ٹیگور سے التجا کی تھی کہ وہ لوسی کو ایک خط لکھیں اور اگر ممکن ہو تو کچھ امداد بھی کریں۔ لیکن خط لکھنے والے نے یہ صاف لکھ دیا تھا کہ کسی طرح لوسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ انہوں نے امداد کے سلسلے میں شاعر کو خط لکھا ہے۔

یہ معلوم نہیں کہ اس انگریز کا خط شانتی نکیتن سے کناڈا میں ٹیگور کو روانہ کیا گیا تھا یا نہیں، یا یہ کہ ٹیگور کے لوٹ آنے کے بعد ان کو وہ خط دیا گیا تھا یا نہیں۔ کون جانے، ٹیگور نے لوسی کو کوئی جواب دیا تھا یا نہیں۔ یہ سب باتیں آج بھی پردے میں ہیں۔

(۳)

پریم کے روپ نرالے — محبت نے ٹیگور کے دل پر کئی طرح وار کیا اور ہر وار پر وہ تڑپ تڑپ گئے — ایک اور محبت، جس میدان محبت میں ٹیگور سب سے دور، بالکل الگ تھلگ، محبت کی ایک نرالی دنیا بسائے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ محبت جس نے ٹیگور کو ٹیگور بنانے میں غالباً سب سے اہم حصہ لیا ہے۔

ولایت کی رنگین دنیا میں ڈوبے رہنے کے باوجود جس کی محبت کو ٹیگور فراموش نہیں کر پائے تھے۔ اور جس محبت کی یادیں تاحیات ان کے دل میں رہی ہیں۔ وہ ہے کادمبری دیوی سے ان کی محبت۔ کادمبری بھی ان کو اپنے دل کی تمام تر گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ یہ کادمبری کون ہے؟۔ یہ کوئی اور نہیں، گھر سے باہر کی کوئی خاتون نہیں، بلکہ جیوتندر ناتھ ٹیگور کی شریک حیات یعنی ربندر ناتھ ٹیگور کی بھابی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ کادمبری حسن میں اپنی مثال آپ تھی۔ وہ ادیبہ اور شاعرہ بھی تھی۔ یہ شاعرہ بھابی، جو بے اولاد تھی نے اپنی تمام تر محبت کو ٹیگور پر نچھاور کر دیا تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے پیارے دیور کو دل و جان سے چاہا تھا۔

وہ دیور جس کے سر پر سے لڑکپن ہی میں ماں کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ یہی ممتا بھری کادمبری دیوی ربندر ناتھ کی زندگی میں وہ جھلملاتا ستارہ ہے جس کو ٹیگور آخری سانس تک بھلا نہ سکے۔ صرف نو برس کی عمر میں بہو بن کر کادمبری ٹیگور گھرانے میں آئی تھی اور ان دنوں ربندر ناتھ صرف آٹھ برس کے تھے۔ اس طرح یہ دونوں دیور بھابی بچپن سے کھیل کود کے ساتھی رہے۔

ٹیگور کے ولایت سے لوٹنے پر سب سے زیادہ خوشی غالباً کادمبری کو ہوئی تھی کہ اسے اپنا لاڈلا دیور، کھیل کود کا ساتھی مل گیا۔ کھیلنے کے دن لوٹ آئے۔ نظمیں اور کہانیاں سننے سنانے کے دن لوٹ آئے۔ بھیا جیوتی پیانو بجاتے، ربی گیت گاتا اور سنتی کادمبری۔ بھابی کادمبری اس عہد کے نامور بنگالی شاعر بہاری لال کی نظمیں پڑھتی اور سنتے دیور ربی۔ بھیا جیوتی نے ڈرامہ ''مان مئی'' لکھا تو اروشی بنی کادمبری اور مدن کا رول ربی نے ادا کیا۔

ربندر ناتھ نے بارہا اپنی اس بھابی کا ذکر کیا ہے اور صاف لکھا ہے کہ یہی بھابی وہ عورت ہے جس کی محبت نے ان کو ایک فنکار بننے میں بڑی مدد کی ہے، اکسایا ہے، ابھارا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

''بھابی کا برتاؤ بالکل برعکس تھا وہ کسی طرح نہیں مانتی تھی کہ میں کبھی شاعر بنوں گا۔ وہ صرف تنقید کرتی اور کہتی کہ تم بہاری لال چکرورتی کی طرح شعر نہیں کہہ سکتے۔ اور میں اداس ہو جاتا—''

ایسی تنقیدوں نے ٹیگور کو سنوارا ہے۔ وہ بھابی کا دل جیتنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے اور بہتر سے بہتر اشعار کہنے لگے۔ ٹیگور کی کئی تخلیقات ان کے اسی چہیتی بھابی کے نام ہیں۔ جن دنوں ربندر ناتھ بھرپور جوان تھے، دن رات تخلیقات میں مست تھے، ان ہی دنوں قدرت نے ان کے دل پر بھرپور وار کیا اور ربندر ناتھ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ برسوں کے گہرے تعلقات اچانک ٹوٹ گئے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ بچپن اور جوانی کے کھیلوں کی ساتھی بھابی کادمبری نے خودکشی کر لی۔

کیوں؟ کس لئے؟ جوڑاسانکو کے رئیس ٹیگور گھرانے کی اس بہو نے بھرپور جوانی میں کیوں خودکشی کر لی تھی کا درست جواب دینا مشکل ہے لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ کادمبری کی موت ٹیگور کی زندگی کا وہ المناک حادثہ ہے جس نے ان کو تقریباً دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس بھیانک واقعہ سے صرف چار ماہ پہلے ٹیگور نے شادی کی تھی۔ لیکن کادمبری کے غم میں وہ سب کچھ بھول گئے تھے۔ انہوں نے کھانا پینا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ غالباً بیوی ٹیگور کو بھلا سکتی تھی۔ لیکن وہ تو ان دنوں صرف ۱۱ برس کی تھی۔ ٹیگور بے چینی میں گھر کی چھت پر ٹہلتے پھرتے، اس جگہ جہاں بیٹھ کر وہ اپنی بھابی سے کھیلتے رہے، گیت اور کہانیاں سنتے سناتے رہے۔ رات رات بھر وہ جاگتے۔ ان کا دل خون کے آنسو روتا۔ جس طرف دیکھتے، جس چیز کو دیکھتے، ان کو بھابی یاد آ جاتی۔ اس جان لیوا غم سے نڈھال ہو کر ربندر ناتھ کی جو حالت ہوئی تھی اس سے پورا گھر فکرمند ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ ٹیگور کی صحت کے سلسلے میں جب ان کے والد کو خبر ملی تو انہوں نے ربندر ناتھ کو لکھا:-

''تم بیمار ہو، کمزور ہو گئے ہو۔ تم ایک ذہنی اور دلی تکلیف میں ہو۔ تم

نے صحت بخش غذائیں کھانا بالکل بند کر دیا ہے اسی وجہ سے تمہاری یہ کمزوری ہے، بیماری ہے۔ گوشت مچھلی نہیں کھانے پر جسم میں طاقت کیوں کر آئے گی — ''

لیکن فوری طور پر والد کی نصیحت بھی کارآمد نہیں ہوئی — عرصہ بعد ٹیگور نے اپنی بھابی کی یاد میں عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے لکھا:۔

'' پہلے تمہیں جس طرح گیت سناتا تھا، اب کیوں سنا نہیں پاتا ہوں۔ یہ سب تخلیقات تمہارے لئے کر رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میری آواز کو بھول جاؤ، انجانے میں راہ چلتے ہوئے جب اچانک تم سے میری ملاقات ہوگی، تب ایسا نہ ہو کہ تم مجھے پہچان نہ سکو۔ اسی لئے ہر روز تمہاری یاد میں کہتا ہوں۔ کیا تم سن نہیں رہی ہو؟۔ ایک دن وہ آئے گا جب اس دنیا میں میری باتوں میں سے ایک بات بھی کسی کے دل میں نہیں رہے گی۔ لیکن کیا تم بھی ان باتوں میں سے ایک دو باتوں کو پیار سے یاد نہیں رکھو گی؟۔ تم جب میری تخلیقات کو اتنے پیار سے سنتی تھیں، میری تخلیقات کا تم سے گہرا لگاؤ ہے — تم ذرا پرے ہٹ گئی ہو، چھپ گئی ہو، کیا صرف اسی لئے تم سے ان تخلیقات کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اتنی جانی پہچانی تخلیقات میں سے کیا ایک لفظ بھی یاد نہیں رہے گا؟۔ کیا تم ایک اور دیس میں، ایک اور نئے شاعر کی شاعری سن رہی ہو؟۔ ''

ٹیگور کی مختلف تخلیقات سے کادمبری کے سلسلے میں اتنے اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں کہ وہ خود ایک کتاب ہو جائے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں وقت بڑا بلوان ہے۔ وقت کے دھارے میں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غم ہلکا ہو جاتا ہے، غم کے پہاڑ کٹ جاتے ہیں۔ اور انسان زندگی کی جدوجہد میں مشغول ہو جاتا ہے۔

(۵)

ضلع کھلنا موضع دکھن ڈیہی، محلہ پھول تلا کی پھوتی۔ یہ علاقہ ٹیگور گھرانے کی زمینداری کے تحت تھا اور پھوتی کے والد اسی زمینداری کے تحت ایک ملازم تھے یعنی ٹیگور گھرانے کے ایک ملازم۔

پھوتی ایک عام دیہاتی لڑکی تھی لیکن اس کا حسن لاجواب تھا۔ وہ جو کہانیوں میں کہا جاتا ہے کہ دور دیس سے ایک راجکمار آیا اور گاؤں کی حسینہ کو لے گیا۔ بس یہ بھی ویسی ہی کہانی ہے۔ رابندر ناتھ کے والد نے اسی پھوتی سے ٹیگور کی شادی طے کی اور ۹ دسمبر ۱۸۸۳ء کو ۲۲ سالہ ٹیگور سے ۱۱ سالہ پھوتی کی شادی ہو گئی۔ ٹیگور گھرانے میں پھوتی کا نام ''بھب تارینی'' رکھا گیا تھا لیکن جیسا کہ کہہ چکا ہوں ٹیگور نے ''مرنی'' یعنی اماں کی یاد میں پھوتی کا نام ''مرنالینی'' رکھا تھا اور پھوتی اسی نام سے جانی بھی گئی۔

یہی مرنالینی، ٹیگور کی زندگی میں پھر سے بہار لانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ شادی کے دو چار سال بعد ٹیگور نے جو گیت گائے ان میں ''روحانی پریم'' یا عشق حقیقی ہی نہیں بلکہ ''جسمانی پریم'' کی خواہشیں بھی کھل کر سامنے آئی ہیں۔ مثلاً یہ اشعار:۔

'' اتار پھینکو، لباس اتار پھینکو
دوری کو ختم کرو، سرحد کو توڑ ڈالو
پہن لو عریاں حسن کا لباس ''

یا پھر ———

"دل کا ملن
جسمانی ملاپ کا طالب ہے"

یا یہ اشعار ———

"حیا لے لو
لباس لے لو
نوخیز لطیف بدن کو
چرا لو ———"

اور پھر ———

"کھول دو
سکھی کھول دو
باندھے ہوئے بانہیں، کھول دو"

ربندر ناتھ دکھ کے ساگر سے نکل کر رفتہ رفتہ مرنالینی کے دامن میں آ گئے اور مرنالینی میں کھو گئے۔ مرنالینی گاؤں کی معمولی لڑکی بہت جلد غیر معمولی جیون ساتھی بن گئی۔ وہ بہت جلد رئیس گھرانے کی ضرورتوں کو جان لینے اور اپنے آپ کو وقت کی ضرورت کے مطابق ڈھال لینے میں کامیاب ہو گئی۔ ربندر ناتھ نے ذاتی دلچسپی لے کر مرنالینی کو بہت کچھ سکھایا۔ جو اس گھر کے لئے خاندان کے لئے رئیس سماج کے لئے اور جدید دنیا کو جاننے کے لئے ضروری تھا۔ ربندر ناتھ کے والد مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور نے خاص کر مرنالینی کی تعلیم کا انتظام کیا۔ مرنالینی نے نہ صرف گھر گرہستی کے کاموں کو بہ حسن وخوبی انجا دینا سیکھا بلکہ ساتھ ہی اس نے انگریزی بنگلہ اور سنسکرت زبانوں کی ضروری تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر گھر کے باہر ملک کے کونے کونے میں جہاں جہاں ٹیگو نے چاہا مرنالینی ساتھ گئی اور اس طرح وہ ٹیگور کے دل پر حکمرانی کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

عورت ذات سے کیا ممکن نہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ نہ صرف شوہر کی جنسی خواہش کو مٹا سکتی ہے، گھر سنسار کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے بلکہ شوہر کو عظیم انسان بنانے میں بھی اس کی سب سے بڑی اور نیک ساتھی ہو سکتی ہے۔ مرنالینی کی زندگی اس سلسلے میں ایک عظیم مثال ہے۔

شانتی نکیتن کے قیام میں بھی مرنالینی کا بڑا ہاتھ رہا ہے لیکن وہاں کی ہوا اسے راس نہیں آئی۔ وہ بہت جلد بیمار پڑ گئی اور شانتی نکیتن سے مرنالینی کو کلکتہ لایا گیا۔ لیکن افسوس، صرف ۲۸ سال کی عمر میں وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔ ٹیگور نے رات رات بھر جاگ کر تیمارداری کی لیکن موت کے ظالم ہاتھوں سے اسے بچا نہ سکے۔

ایک اور گہرا زخم۔ شاعر جہاں ٹیگور نے دل پر وہ چوٹ کھائی کہ پھر سے وہ غم کے ساگر میں ڈوب گئے۔ انہوں نے پھر سے نہ صرف گوشت مچھلی بلکہ مٹھائی تک کھانا بند کر دیا۔ کئی دنوں تک تو کھانا بھی نہیں کھایا۔ صرف بھیگے ہوئے چنے یا مونگ پر وہ دن گزارتے رہے۔ ٹیگور کی چند نظموں کا تعلق اسی دور غم سے ہے۔ مثلاً۔

''تم — بالکل خالی ہاتھوں گئے
اس گھر سے کچھ بھی تو نہیں لے گئے
بیس سال کے سکھ دکھ کا سب بوجھ
مجھ پر لاد کر چلے گئے — ''

ٹیگور نے جو خطوط مختلف مقامات سے مرنا لنی کے نام لکھے ان سے صاف ہے کہ مرنا لنی ٹیگور کے دل کو قابو میں کر چکی تھی۔ ایسی شریک حیات کو بھلانا آسان نہیں اور ٹیگور اسے بھلا بھی نہ سکے۔

(۶)

غالباً شاعر کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، چاہے عمر کچھ بھی ہو — حیات اور کلام ٹیگور کے مطالعے سے اور کئی تصویر بتاں کے دھندلے دھندلے نقوش ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس تخلیق کے پردے میں کوئی حسینہ پوشیدہ ہے۔ لیکن وہ کون ہے، کہنا دشوار ہے۔ کہاں، کس بت سے ٹیگور کی ملاقات ہوئی تھی، کتنے دنوں تک اس کا ساتھ رہا، عشق نے کتنی منزلوں کو پار کر لیا تھا۔ کون جانے — !

ٹیگور کی بعض نظموں میں ایک اور محبوبہ کی تصویر پائی جاتی ہے۔ دھندلی دھندلی سی ایک دلرُبا تصویر، جیسے کوئی خواب کی پری ابر آلود دھند لکے میں آنکھ مچولی کھیل رہی ہو۔ اس سے ایک اور پری وش کا بیان ممکن ہے۔ یہ ۱۹۲۴ء کا ذکر ہے۔ ٹیگور ۶۳ برس کے ہو گئے تھے۔ اچانک اس عمر میں انہوں نے چند ایسی نظمیں کہی ہیں جن سے یہ راز کھلتا ہے کہ شاعر کا دل پھر سے جوان ہو گیا ہے۔ دل نے پھر انگڑائی لی ہے۔ کہیں دور دیس سے کسی نے ان کو آواز دی — کون؟۔ کس نے؟ کہاں سے؟۔

شاعر جنوبی امریکا کے سفر پر جا رہے تھے۔ ساتھ سکریٹری لیانارڈ المہارسٹ بھی تھے۔ ارجن ٹینا پہنچ کر شاعر بیمار پڑ گئے اور ان کو مجبوراً ایک ہوٹل میں رہنا پڑا۔ یہیں ایک پری وش جس کا نام وکٹوریہ وکامپو ہے سے شاعر کی ملاقات ہو گئی۔ وکامپو ایک نامی گرامی رئیس گھرانے کی دختر، عمر صرف ۳۳ برس یعنی شاعر سے تیس (۳۰) برس چھوٹی۔

وکامپو شاعر کو ہوٹل سے اپنے ساتھ لے گئی۔ شہری ماحول سے دور اپنے ایک رشتہ دار کے گھر۔ پہاڑی صحت بخش مقام، ندی کا کنارا، اطراف پھولوں کا باغ اور اس باغ میں ایک آشیانہ — نام ''مرالریۓ — ''

اسی وکامپو نے ''گیتانجلی'' کا فرانسیسی ترجمہ کیا ہے۔ وکامپو کا نام ٹیگور نے ''وجیا'' رکھا تھا۔ وکامپو اور ٹیگور کے تعلقات کی کوئی بھرپور تصویر کھینچنا ممکن نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلقات نہایت گہرے تھے۔ خاص کر نظم ''پردیسی پھول'' کے اشعار اس سلسلے میں غور طلب ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

''اے، پردیسی پھول
جب تمہیں سینے سے لگا کر — سوال کیا — ؟
''کہو، کہو — مجھ سے کہو

کہاں رہتی ہو تم—"؟
تب تم—
مسکرا کر گردن ہلا کر بولیں
"معلوم نہیں، معلوم نہیں"—!
ہاں تب سمجھا—
یہ جان کر کیا فائدہ— کہ
تم کس دیس کی ہو—!
حقیقت تو صرف اتنی ہی ہے کہ
جو تمہیں سمجھ پاتا ہے
تمہیں پیار کرتا ہے
تم اسی دل میں بستی ہو
وہی دل تمہارا گھر ہے
کہیں اور نہیں، کہیں اور نہیں—"

وکاتپو کے ساتھ ٹیگور دو ماہ تک رہے۔ ٹیگور کے صحت مند ہونے کے بعد وطن لوٹنے کا پورا خرچ اور سارا انتظام بھی وکاتپو ہی نے کیا تھا۔ جہاز میں آرام سے سفر کے لئے وکاتپو نے ایک خاص آرام کرسی کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ آج بھی یہ کرسی شانتی نکیتن میں وکاتپو کی یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔

۱۹۳۰ء میں پھر ایک بار وکاتپو، ٹیگور سے شہر پیرس میں جا کر ملی تھی جہاں ان دنوں ٹیگور کی تصاویر کی نمائش ہوئی تھی۔ اس نمائش کا سارا انتظام اور خرچ بھی

وکاتپو ہی نے کیا تھا۔ پیرس میں ملاقات کے بعد غالباً پھر کبھی شاعر سے وکاتپو کی ملاقات نہیں ہوئی لیکن دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا ہے۔

ایک اہم بات جو حیات ٹیگور کے مطالعے سے واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ "عشق" نے ٹیگور کو کبھی "بکما" نہیں کر دیا تھا۔ لہٰذا زندگی میں عشق کرتے ہوئے اور بارہا ٹھوکریں کھانے کے باوجود ان کے قدم میدان عمل میں کہیں نہیں رکے۔ ہر ٹھوکر کے بعد وہ سنبھلے اور پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی سے میدان عمل میں دل و جان سے لگ گئے۔ کہتے ہیں کہ بڑوں کی ہر بات نرالی ہوتی اور یہ بھی نرالی بات ہے کہ ہر عشق کے بعد ٹیگور زیادہ "کام کے آدمی" بنتے گئے اس میں بھی ان کی عظمت پوشیدہ ہے۔

مجاز کا رومان

مجاز نے اپنا ایک مجموعۂ کلام چار دوستوں کو معنون کیا اس انتساب پر اور اس انتساب کی عبارت پر انہیں ناز تھا۔

فیض اور جذبی کے نام جو میرے دل و جگر ہیں
سردار اور مخدوم کے نام جو میرے دست و بازو ہیں

ناز کی وجہ یہ تھی کہ ان چاروں کی شاعری اور شخصیت کے مزاج کی طرف اس انتساب میں واضح اشارے موجود تھے، فیض اور جذبی انقلابی شاعری کے جمال اور سردار و مخدوم اس کے جلال یا یوں کہیے اس کے عملی پہلو کے نمائندہ تھے۔ خیر سے ان میں دو ابھی بقید حیات ہیں۔ مجاز کے رومان پر لکھنے کا پہلا حق انہیں دونوں کا ہے۔ میرا شمار مجاز کے نیاز مندوں میں ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ مجاز آخری زمانے میں جب تک لکھنؤ رہے تقریباً روز ہی ان سے ملاقاتیں اور طویل ملاقاتوں کا شرف مجھے حاصل رہا ہے۔

مجاز نے اپنے ایک مجموعہ کلام کا انتساب عصمت، کے نام کیا ہے جسے غلطی سے عصمت چغتائی کے نام سمجھ لیا گیا حالانکہ واوین صاف بتا رہے ہیں کہ یہ لفظ نام نہیں کسی اور بات کی طرف اشارہ ہے یعنی اس خاتون کی طرف جسے عصمت اتنی عزیز تھی کہ وہ ہمیشہ دامن کش رہی۔ یہی خاتون مجاز کی محبوبہ ہیں۔

عشق اور رومان بڑے بدنام لفظ ہیں کیونکہ ان سے جو مطلب لیا جاتا ہے وہ بڑا مختلف ہے۔ تھوڑی دیر کی لذت یا محض جسمانی آسودگی کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتے ہیں (گو پرانے لوگ یہ مفہوم ''ہوس'' کے لفظ سے ادا کیا کرتے تھے) اور اگر کسی سے ایسا تعلق خاطر ہو جائے کہ رات دن وہ شخص آنکھوں میں سما جائے تو اسے بھی عشق اور رومان ہی کہتے ہیں مگر یہ کیفیت سب کو حاصل نہیں ہوتی۔

سچ پوچھیے تو ہم میں سے اکثر عشق کرنے کی صلاحیت تو کیا اس کے تصور سے بھی نابلد ہیں۔ جس عشق کی بات ہو رہی ہے وہ آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود کسی ایک شخص کے اس طرح دل میں سما جانے کا نام ہے کہ ایک لمحہ بھی بھلایا نہ جا سکے ایک ایسی کیفیت جو آپ کی پوری شخصیت پر حاوی ہو جائے اور آپ کے افکار و اعمال پر چھا جائے۔ اب اس سے بحث نہیں کہ وہ شخص بھی آپ کو چاہتا ہے یا نہیں یا آپ اس کا قرب حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ بے خودی اور بے اختیاری ایک عجیب کیف رکھتی ہے اور پوری زندگی کو نیا رنگ و آہنگ دیتی ہے شعر و شاعری سے تو اس کی مثالیں بہت دی جا سکتی ہیں مگر شاید سب سے بلیغ استعارہ اس والہانہ عشق کا سرت چندر چٹرجی کے ناول

''دیوداس'' میں ملتا ہے جہاں پارتی کے عشق نے دیوداس کو اس طرح اسیر کر لیا کہ آخر جان کی قیمت چکانی پڑی۔ اور یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ مجاز کا دور قلم دیوداس کا دور تھا۔ اور یہ دور تھا اختر شیرانی کا جو اردو شاعری میں پہلی بار عورت کو عشق حقیقی اور شاہدان بازاری کے سائے سے آزاد کر کے گوشت پوست عطا کر رہے تھے اور ہماری اپنی دنیا اور ہمارے اپنے سماج کی رہنے بسنے والی کے طور پر بیان کر رہے تھے اور عشق والہانہ بھی تھا ارضی بھی تھا اور شریفانہ بھی۔ اس میں وصل کے نام کی وہ شہوت ناکیاں نہ تھیں جن سے جرأت سے لیکر داغ تک کا کلام بھرا پڑا تھا۔

مجاز۔ اسرار الحق مجاز۔ پیدا ہوئے ردولی ضلع بارہ بنکی کے ایک چودھری گھرانے میں مگر وہ گھرانہ اس دور کے معیار سے خاصہ جدید تھا (یوں بھی اتنا یاد دلانا بیجا نہ ہوگا کہ اردو شاعری اور نثر کو جتنا اس گھرانے سے ملا ہے شاید ہی کسی دوسرے ایک گھرانے سے ملا ہو مراد ہے مجاز کی شاعری، صفیہ اختر کے خطوط کی نثر اور پھر جاں نثار اختر کی شاعری)۔ مجاز کے والد چودھری سراج الحق شاید پورے علاقے کے پہلے گریجویٹ تھے۔ عدالت میں رجسٹرار ہوئے۔ مجاز کی والدہ پڑھی لکھی نہ تھیں اور ٹھیٹھ دیہاتی بول چال کی زبان میں گفتگو کرتی تھیں مگر اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو جدید تعلیم دلانے میں وہی پیش پیش تھیں۔ بہرحال مجاز والد کے ساتھ مختلف جگہوں پر تعلیم حاصل کرتے رہے پہلے ردولی، پھر آگرہ کے سینٹ جانس کالج میں اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی اے کے طالب علم رہے۔ یہیں ان کی ملاقات ٹینس کھیلتے ہوئے سردار جعفری سے ہوئی اور دونوں نے ٹینس کے جال کے اوپر ہاتھ ملائے۔ یہیں ملاقات ہوئی آفتاب ہاسٹل کے کسی کمرے میں اختر حسین رائے پوری سے جنہوں نے مجاز کو شاعری کا ترقی پسندانہ زاویہ دیا۔ یہیں ملاقات ہوئی حیات اللہ انصاری سے جنہوں نے قوم پرستانہ نظریے سے متاثر کیا، یہیں ملاقات ہوئی سعادت حسن منٹو سے جس نے زندگی کے ایک دوسرے رخ سے متعارف کرایا کہ خود کو مٹانے میں بھی ایک عجیب لذت ہے یا بقول شاعر۔

لذت نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کیا خضر و مسیحا نے جینے کا مزا جانا

غرض یہ اسرار الحق مجاز تھے جو علی گڑھ سے دلی پہنچے۔ آل انڈیا ریڈیو کا دلی اسٹیشن نیا نیا شروع ہوا تھا۔ فیلڈن سربراہ تھے۔ غالباً رشید احمد صدیقی کی وساطت سے فیلڈن تک رسائی ہوئی اور مجاز دلی میں آل انڈیا ریڈیو کے اردو جریدے ''آواز'' کے مدیر مقرر ہوئے جس کا نام بھی انہیں کا تجویز کردہ تھا۔

مرحوم فرحت اللہ انصاری بتاتے تھے کہ ان دنوں لکھنؤ ریڈیو کے اردگرد بھی ایک رومانی حلقہ بننے لگا تھا۔ ریڈیو کے آغاز کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا اب تک تعلیم یافتہ مہذب اور ماڈرن نوجوانوں کے لئے خواتین اور خاص طور پر پڑھی لکھی خواتین سے ربط وضبط بڑھانے کے مواقع بہت کم تھے۔ طوائفیں اور گانے والیاں بھی ریڈیو اسٹیشن آنے لگیں اور مردوں عورتوں کے درمیان رابطے کا ایک نیا مرکز ریڈیو اسٹیشن بن گئے۔

لکھنؤ میں اس زمانے میں ایک خاتون گوہر سلطان کے حسن کی دھوم تھی

اور ان پر جان دینے والے مجاز کے اس زمانے کے بھی احباب تھے۔ فرحت اللہ انصاری بھی اور وہ خاصے کامیاب بھی تھے۔ حفیظ جاوید اس زمانے میں لکھنؤ ریڈیو کی اہم شخصیت تھے۔ وہ بھی ان کے جاں نثاروں میں تھے فرحت اللہ انصاری کا بیان تھا کہ مجاز گو ہر سلطان پر فدا تھے مگر گوہر سلطان کا قرب حاصل نہ ہو سکا۔

دلی آ کر انہوں نے بقول فرحت اللہ انصاری، اس کی تلافی کر دی۔

ہوا یوں کہ بیگم حمیدہ سلطان اس زمانے کی معروف ادبی شخصیتوں میں تھیں۔ بسنت دھوم دھام سے مناتی تھیں اور سارے ادیبوں اور شاعروں کو جمع کرتیں کبھی جمنا میں کشتیوں پر مشاعرے کا رنگ جماتیں کبھی اپنے مکان پر مجمع لگاتی تھیں۔ انہی جلسوں میں سے کسی ایک میں مجاز کی ملاقات ہوئی ایک ایسی ماڈرن خاتون سے جو مجاز کے بھی آدرشوں پر پوری اترتی تھیں۔ قوم پرست ایسی کہ ہندوستان کی آزادی کی خاطر لڑنے والے خاندان کی چشم و چراغ۔ جدید ایسی کہ پردے سے نکل آئیں اور دقیانوسیت کو ترک کر کے جدید تعلیم حاصل کی۔ لہذا مجاز کے دل میں اتر گئیں اور اس طرح کہ پھر زندگی بھر بھلائے نہ بھلائی جا سکیں۔

یہ کیونکر ہوا اس کی تفصیل معلوم نہیں لیکن ایک ادا جس کا ذکر مجاز کی زبانی اکثر سنا البتہ یاد ہے۔ ایک واقعہ۔

جدید طرز معاشرت کا گھرانا تھا۔ شام کے سایے گھنے ہو کر رات میں تبدیل ہو چکے تھے۔ محفل خاتمے پر تھی۔ کچھ گنے چنے دوست باقی رہ گئے تھے۔ مجاز نے علی گڑھ میں پرانے تاریخی قلعے کی ایک محفل میں پہلی بار بیئر چکھی تھی۔ دہلی آئے تو نشاط و کیف کے طور پر شراب نوشی کا چسکا باقی رہا۔ شراب ابھی زندگی نہیں بنی تھی مگر اس رات محفل میں شراب چلی اور خوب چلی۔ مجاز نے بھی کئی جام بھرے اور خالی کئے۔ سامنے من چاہا محبوب ہو تو شراب کی کیفیت چارگنی ہو جاتی ہے رات ڈھلنے لگی ایک اور جام بھر کر منہ کو لگایا ہی تھا کہ زہرہ نے سرگوشی میں کہا:

''مجاز مت بھولو، تمہیں جانا بھی ہے''

یہ ادا مدتوں ستاتی رہی اور آخر ایک نظم کی محرک بنی:۔

''مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر''

شاید یہی محفل ہو یا اس سے پہلے کی کوئی محفل جس میں مجاز کو پہلی بار معلوم ہوا کہ زہرہ کی منگنی ہو چکی ہے شادی ہونے والی ہے اور وہ بھی مجاز ہی کے ایک عزیز دوست سے۔ گویا زہرہ ہمیشہ کے لئے مجاز کی زندگی سے دور ہونے والی ہیں۔ اگر جذبہ والہانہ نہ ہو تو ذہن جھٹک کر آگے بڑھ جائے مگر جب ذہن جذبے کی گرفت میں ہو تو آگے بڑھنا آسان نہیں ہوتا۔ اسی لمحے کو فراق نے بیان کیا ہے:۔

کیا ہے کارگہہ زندگی میں رخ جس سمت
ترے خیال سے ٹکرا کے رہ گیا ہوں میں

مجاز کا رومانی المیہ شروع ہو چکا تھا جس نے ان کی پوری زندگی کو المیہ بنا دیا۔ مجاز جیسی مروتوں اور محبتوں والے کے لئے دوست سے غداری ممکن تھی نہ محبوب سے بے وفائی۔ نہ عشق سے دامن چھڑانا ممکن تھا نہ کسی اور کو دل میں بٹھانا۔ اور جب خیال و خواب میں کوئی بسا ہوا ور یہ یقین ہو چکا ہو کہ اب وہ کبھی نہیں ملے گا تو اس مستقل کرب کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ آیئے اس

پیکر کو ذرا مجاز کی شاعری میں دیکھیں۔ صرف چند جھلکیاں:

اس نے جب کہا مجھ سے گیت اک سنا دو نا
سرد ہے فضا دل کی آگ تم لگا دو نا
کیا حسین تیور تھے کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو تھی حسرت تھی حکم تھا تقاضا تھا
گنگنا کے مستی میں ساز لے لیا میں نے
چھیڑ ہی دیا آخر نغمۂ وفا میں نے
یاس کا دھواں اٹھا بربطِ شکستہ سے
آہ کی صدا نکلی ہر نوائے خستہ سے

آپ نے دیکھا مرکزی لفظ ہے نغمۂ وفا۔ اور یہ وفا کس سے ہے
اس کا پیکر کچھ اس طرح نمایاں ہوا ہے

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکرِ حسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اس کی
زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اس دنیا سے اکثر اس قدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اس کی

ان دو بندوں میں بھی دو مرکزی لفظ آئے ہیں عصمت و تقدیس اور
یہ دونوں صفات وہ تھیں جو مجاز اور زہرہ کے درمیان حائل رہیں۔ ان کا کیف
اور ان کا کرب دونوں مجاز کی شاعری اور ان کی زندگی میں اتر آیا تھا۔ پہلے
کیف کی دو جھلکیاں ملاحظہ ہوں اور پھر کرب کی:۔

کیف ایسا:۔

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فرازِ آسماں پر کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اٹھتی تھی اس کی چشمِ خنداں میں
خمستانِ فلک سے نور کی صہبا چھلکتی تھی

یا سالگرہ کی تصویر:۔

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
چہرے پہ حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

یا ایک اور تصویر:۔

سرشار نگاہوں میں حیا جھوم رہی ہے
ہیں رقص میں افلاک زمیں گھوم رہی ہے
شاعر کی وفا بڑھ کے قدم چوم رہی ہے

یہاں بھی وفا اور حیا کے تصورات اہم ہیں اور یہی دو لفظ ہیں جو مجاز
کی شاعری اور زندگی کی کلید ہیں۔ اس حیا نے کبھی قربت میسر نہ ہونے دی۔

عصمت کے تصور پر اس لئے مجاز نے پوری نظم لکھی۔

نگاہوں کی دعوت کو پامال کرتا
مذاقِ لطافت کو پامال کرتا
تقاضائے فطرت کو پامال کرتا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

مگر زہرہ کے ہاتھ سے عصمت کا دامن نہ چھوٹا

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا

''آج کی رات'' نظم میں تخیل محبوبہ کو شاعر سے قریب اور قریب لے آتا ہے مگر نظم کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

شوق سے موقع شناسی کی توقع بھی غلط   میں نے انکی شکل بھی مشکل سے پہچانی ہے آج

یہ تو ہم شاعری کے کوچے میں نکل آئے۔ زندگی کو ان لمحوں کا نشاط بہت کم ملا۔ کرب کہیں زیادہ ملا۔ مجاز کے ہاں عصمت اور وفا کے ہی دو تصورات حاوی نظر آتے ہیں۔

جی میں آتا ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

نظم ''اعتراف'' میں بار بار تکرار ہوئی ہے۔

میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز نے اس وفا سے زندگی بھر منہ نہیں موڑا اور اس کے نہایت خطرناک نتائج نکلے۔ وہ اپنے خیال و خواب زہرہ کو سونپ چکے تھے اور خود بقول ان کے

مری وفا کا ترا حسن بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں

ہوا یوں کہ زہرہ سے دوری مقدر ہوئی تو پھر زندگی ایک کرب مسلسل بن گئی۔ روزگار سے جی ہٹا۔ ملازمت سے دور ہوئے۔ دہلی کی ہارڈنگ لائبریری میں کچھ دنوں ملازم رہے اور یہاں سے ٹوٹ اور بکھر کر لکھنؤ چلے گئے۔ زہرہ کی چاہت پیچھا کرتی رہی۔ اس ایک چہرے کو دھندلانے کے لئے شراب سہارا بنی اور آخرکار شراب ہی زندگی ٹھہری۔ دوسرے چہروں میں بھی زہرہ کے چہرے کی تلاش ہوئی اور اسی کشمکش میں اعصاب جواب دے گئے۔

اعصاب شکنی کا پہلا دورہ ۱۹۴۳ء کے آس پاس لکھنؤ ہی میں پڑا۔ پہچان اس کی یہ تھی کہ مجاز جو عام طور پر سنجیدہ اور خاموش تھے اچانک بہت زیادہ بولنے لگتے تھے اتنا زیادہ کہ کسی دوسرے کو بولنے نہ دیتے تھے۔ دوسری پہچان یہ تھی کہ کرتے یا واسکٹ کی جیب سے چھوٹی سی ڈائری بار بار نکالتے تھے۔ پتہ نہیں ایسے موقعوں میں یہ ڈائری کہاں سے ان کے پاس آجاتی تھی اور جیسے ہی کوئی ٹیلی فون دکھائی دیتا وہ لپک کر نمبر ملانے لگتے تھے اور بہت دیر تک

اپنے خیال میں زہرہ سے ٹیلی فون کے دوسری طرف یا کوئی فرضی نمبر ہوتا تھا یا
سرے سے کوئی موجود ہی نہ ہوتا تھا۔

اب آگے کی داستان صرف یہ لکھ کر ختم کردوں کہ شاعر کا دل ٹوٹ
گیا اور شاید شراب میں وہ اس کھوئے ہوئے چہرے کو زندگی بھر تلاش کرنے
میں لگا رہا جو اس کے خیال وخواب کی دنیا میں بسا ہوا تھا تو بات پوری ہو جائے
گی مگر اس درد اور کرب کا اندازہ کیونکر لگایا جا سکے گا جس سے مجاز کی پوری
زندگی عبارت تھی۔ یوں تو یہ پوری داستان خود مجاز نے اپنی نظم اعتراف میں
بے کم وکاست بیان کردی ہے۔

ٹوٹ جانا در زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی حلیف مہ کنعاں نہ بنی

یہاں در زنداں زہرا کی شادی کی علامت ہے زلیخا زہرہ کی اور
مہ کنعاں شاعر کی۔

غرض اعصاب شکنی کے اس عالم میں بھی جب مجاز متبادل کی تلاش
میں سرگرداں تھے زہرا کا خیال برابر ان کا پیچھا کرتا رہا۔ شراب کی محفلوں میں
بھی، جہاں شراب مجاز کے لئے کیف کا سامان نہیں خود فراموشی کا وسیلہ بن چکی
تھی اور ایک وقت وہ بھی آیا جب قنوطیت اور بیزاری کو رد کرنے والا شاعر مجاز
رات بھر شراب نوشی میں گزارنے کے بعد خوف کے ساتھ دہراتا تھا۔

''یار۔ اب پھر صبح ہوگی''

یعنی ہر آنے والا دن ایک اور نئے عذاب، ایک اور نئے کرب کا
سامان کرے گا۔

۱۹۴۴ء یا ۱۹۴۵ء کا قصہ ہے۔ مجاز لکھنؤ آ چکے تھے اور یونیورسٹی
کے قریب ہی نیو حیدرآباد کے علاقے میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے۔
لکھنؤ میں لڑکیوں کے مشہور کالج آئی ٹی کالج کے سامنے ایک صاحب نے
ریستوراں کھولا۔ ان صاحب کا نام تھا مہدی تخلص تھا نظمی۔ بعد کو شاعر، مرثیہ
نگار اور صحافی کی حیثیت سے بڑا نام کمایا۔ سرخ سفید، بڑے خوش مزاج اور
سلیقہ مند۔ یعنی پیسے کمانے کے علاوہ سب ہنروں میں یکتا۔ لکھنؤ کے مشہور شیعہ
مجتہد للن صاحب کے صاحبزادے۔

اس ریستوراں سے آئی ٹی کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں لڑکیوں
کے ہوسٹل کیلاش کے لئے بھی کھانے پینے کا سامان جایا کرتا تھا۔ نوجوان چھو
کرا تھا محمد احمد۔ وہ یہ سامان لیکر اکثر کیلاش ہوسٹل جاتا۔ فارسی میں ایم اے
کرنے والی ایک بلند وبالا خاتون ثریا کے لئے محمد احمد سامان لے کر جا رہا تھا۔
مجاز ریستوراں میں بیٹھے تھے انھوں نے پنسل سے چند شعر لکھ کر پرچے میں رکھ
دیئے اور محمد احمد سے کہا کہ ثریا کو یہ پرچہ دے دیا جائے۔ یہ اشعار اب محفوظ
نہیں صرف ایک شعر یاد ہے مگر اس شعر کے ہر لفظ پر مجاز کے طرز کلام کی مہر ہے۔

بھری محفل میں چھلکایا ہے جام آتشیں میں نے
زمیں سے اڑ کے چومی ہے ثریا کی جبیں میں نے

اس پرچے کا تو نہ جانے کیا حشر ہوا مگر وائی او اوسی (یو اون
کیف) کے منیجر مہدی نظمی کے چھوٹے بھائی میاں حسنی کو جو دل لگی سوجھی تو

انہوں نے پنسل سے اس منظر کی ڈرائنگ تیار کی کہ مجاز زمین سے اڑ کر بلند قامت ثریا کی جبیں کی طرف مائل پرواز ہیں۔ مجاز نے لطف لیا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ ڈرائنگ کی طرف متوجہ ہوں۔ اسی ایک ڈرائنگ اور اس ایک مشورے کی برکت ہے کہ میاں شمسی آج دنیا کے اچھے گڑیاں بنانے والے فن کاروں میں ہیں۔

ثریا نام کی بھلی تھیں چہرہ مہرہ بس غنیمت تھا۔ مجاز کو ان سے دلچسپی تھی مگر یوں ہی سی اور یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھا۔

مگر ایک اور سلسلہ تھا جو بہت دور تک اور بہت دیر تک جاری رہا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے طلباء نے ایک بے تکلف سی ادبی انجمن بنائی تھی حلقۂ احباب۔ اس کے صدر تھے سید احتشام حسین جو شعبۂ اردو کے استاد تھے۔ اسی انجمن میں ایم اے (اردو) کی ایک طالبہ علم فیروز جبیں ہندی کی شاعرہ مہادیوی ورما پر اردو میں مقالہ پڑھنے والی تھیں انہی کے ساتھ ایک اور مقالہ بھی پڑھا جانا تھا اور وہ مقالہ تھا پروفیسر کالی پرشاد کا جو فلسفہ اور نفسیات کے شعبے کے صدر تھے اور اردو اچھی جانتے تھے۔ مجاز لکھنؤ نئے نئے آئے تھے انہیں بھی مدعو کیا گیا تھا۔

وقت مقررہ سے کچھ پہلے پہنچ گئے، بارش ہو رہی تھی کلاس روم کے برآمدے میں لمبا سا اوور کوٹ اور اپنی نرم بالوں والی گوالیاری ٹوپی ''پریم وی'' پہنے بے تکان طلباء کے مجمع سے باتیں کر رہے تھے۔ جلسہ شروع ہوا تو بھی بیچ بیچ میں باتیں کرتے رہے اتنے میں شعبۂ فلسفہ کی لڑکیوں کا غول داخل اور ایک صاحب کنیز عطاء اللہ نامی ٹھیک مجاز کے مقابل آکر بیٹھ گئیں۔ مجاز ان پر فریفتہ ہو گئے۔ کالی پرشاد صاحب کا مقالہ ختم ہوا تو لڑکیوں کا یہ غول اچانک اٹھ کھڑا اور واپس جانے لگا۔ مجاز نے احتشام صاحب کو مخاطب کیا احتشام سنو۔ ابھی ابھی ایک شعر ہو گیا ہے۔

کون اٹھ کر چلا یہ محفل سے
جس طرف دیکھئے اندھیرا ہے

بعد کو یہ پوری غزل مکمل ہوئی

اس کے بعد چند مہینوں تک کنیز کا چرچا رہا۔ مجمعوں میں محفلوں میں کافی ہاؤس میں حضرت گنج کے شراب خانوں میں۔ یوں بھی سنا کہ کیلاش ہوسٹل میں مشاعرہ ہوا جس کی صدارت کیلاش ہوسٹل یونین کی صدر کی حیثیت سے کنیز عطاء اللہ نے کی۔ مجاز بے خود و سرشار تھے شاعروں کے کلام سنانے کے دوران بار بار کچھ نہ کچھ بولنے کی کوشش کرتے مگر ہر بار کنیز عطاء اللہ ایک ادائے دل نوازی کے ساتھ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتیں۔

کیلاش ہوسٹل والی سڑک پر ایک تانگہ چلا جا رہا ہے اور اس تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہیں مجاز اور ان کے ساتھ ڈاکٹر رشید جہاں جو اردو ادیبوں میں صحیح معنوں میں شاید پہلی آزاد خیال خاتون تھیں۔ نہایت صاف گو اور بڑی ہمدرد اور انسان دوست۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رشید جہاں کو مجاز عطاء اللہ کنیز سے ملوانے لائے تھے اور انہوں نے صاف صاف بات کر لی تھی کہ ''دیکھو کنیز اگر مجاز سے شادی کرنے کا ارادہ ہو تو میں پیام لیکر آئی ہوں۔

شادی کا ارادہ نہ ہو تو شاعر کے دل سے ہرگز نہ کھیلنا۔'' یہ بھی سنا کہ کنیز نے ہامی بھر لی مگر شرط یہ لگائی کہ مجاز کنیز کو بدنام نہ کریں اور ان کے نام کا ہر جگہ چرچہ نہ کریں، یہ بھی سنا کہ بات تقریباً طے ہوگئی ہے۔ سب نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو شاہین زیرِ دام آ ہی گیا۔ مگر ہوا بالکل الٹا۔ اس دن سے مجاز نے کنیز عطاء اللہ کا تذکرہ دوگنا چوگنا کر دیا۔ ہر محفل میں یہی ذکر، ہر مجمع میں یہی تذکرہ۔ اسی زمانے کی نظم ہے اعتراف۔

تم مرے پاس اب آئی ہو تو کیا آئی ہو

قصہ یہ تھا کہ پرانے سارے زخم ہرے ہو چکے تھے اور عہد وفا پھر گلے کا ہار بن رہا تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ اعصاب شکنی اور وارفتگی بقول میر:۔

اس فصل میں کہ پیرہن گل بھی تھا ہوا
دیوانہ ہوگیا سو بہت باشعور تھا

جب کبھی کوئی اور دامن ہاتھ میں آیا مجاز کے عہد وفا نے انہیں پھر زہرا کی طرف واپس بھیج دیا اور یہ یاد، یہ مستقل درد و کرب، یہ کبھی نہ مٹنے والا تعلق خاطر ایسا تھا جسے مجاز نے مرمر کر نباہا۔۔

☆☆☆

رسول حمزہ توف

مترجم: ف۔س۔اعجاز

تو بہتر یہی ہے............

اگر میری الفت بھری ہر نظر
اگر میرا چاہت بھرا ہر خیال
ملا ہوتا مکھڑا کسی گیت کا
تو جتنے بھی موضوع ہیں پیار کے
ہوئی ہوتی اُن کے حوالے سے شاید
سخن کی یہی سب سے لمبی کتاب
مگر یہ کتاب آج تک مختصر ہے
اور اک بات اس میں بہت پُر خطر ہے
کہ جو کچھ بھی تحریر میں کر رہا ہوں
نیا کچھ نہیں ہے
تو بہتر یہی ہے
کہ جو شاعری کے لئے ہیں میسر
وہ لمحے ترے ساتھ مل کر گزاروں۔

ہندوستانیات کے شاعر

میرا جی کی عشقی پیچیدگیاں

(شاہد احمد دہلوی' منٹو اور وزیر آغا کے مضامین سے مرتب کیا گیا مضمون)

میرا جی اردو کے بہت اہم، مشہور اور رسوا شاعر گزرے ہیں۔ ان کی شاعری کے تجزیے کیلئے ان کی رومانی زندگی کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔

میرا جی کی شاعری ان کی زندگی تھی۔ وہ اگر شاعر نہ ہوتے تو دنیا انہیں ایک ذہنی مریض قرار دے سکتی تھی کیوں کہ ان کے عشق کے ظاہری عمل نہایت پے چیدہ اور عام فہم سے بالاتر تھے۔

شاہد احمد دہلوی میرا جی سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ میرا جی کی نسبت لکھتے ہیں:

''حرمنگ کی طرف میرا جی کا گھر تھا۔ اسکول سے طبیعت اچاٹ ہو جانے کے بعد انہوں نے چاہا تو یہ تھا کہ کہیں سے مفت کی بہت سی دولت ہاتھ لگ جائے مگر کوڑی بھی نہیں ملی۔ پیسے والوں کو دیکھ کر کلستے تھے۔ ان کا تو کچھ بگاڑ نہ سکے۔ ہاں اپنی سیرت بگڑتی چلی گئی۔ عنفوان شباب میں ایک بہت بری عادت نے جڑ پکڑ لی جس نے ان کی ساری زندگی کو نفسیاتی الجھنوں کا ڈھیر بنا دیا۔ ان کا جسم انہیں نیچے کی طرف کھینچ رہا تھا اور روح اوپر کی طرف۔ لہٰذا وہ اپنے جسم کو اپنی بری عادت سے تسکین پہنچاتے رہے اور روح کے تقاضے کو پورا کرنے کیلئے کتابیں پڑھنے لگے۔''

میرا جی کے مطالعہ میں ہندوستانیات، فرائیڈ اور ہیوی لاک ایلس کا ادب اکثر رہا کرتا تھا۔ ایڈگر ایلن پو اور چارلس بودلیئر ان کے دماغ پر بری طرح سوار تھے۔

میرا جی کا تعارف شاہد احمد دہلوی اپنے مضمون ''میرا جی'' میں اس طرح کراتے ہیں:

''میرا جی کا پورا نام ثناء اللہ ڈار تھا۔ مگر ایک بنگالی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو کر انہوں نے میرا سین کے نام پر اپنا نام میرا جی رکھ لیا تھا۔ میرا جی کے ایک ہم جماعت کا مکان کنارڈ کالج لاہور سے ملا ہوا تھا۔ صرف ایک دیوار بیچ میں تھی۔ میرا جی اور ان کے چند ہم جماعت اس گھر میں جمع ہوتے، چیچے چلاتے اور دیوار میں ایک سوراخ کر کے اس میں سے کالج کی لڑکیوں کو تکا کرتے۔ انہیں لڑکیوں میں میرا سین بھی تھی جس پر میرا جی لوٹ ہو گئے۔ اکثر یہ بھی کرتے کہ جب وہ لڑکی کالج سے اپنے گھر جاتی تو میرا جی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے لگے رہتے۔ یہاں تک کہ اسے گھر تک پہنچا دیتے۔ جب تک وہ لڑکی لاہور میں رہی ان کا یہی معمول رہا۔ صرف ایک دفعہ بڑی ہمت کر کے انہوں نے اس سے کہا۔ ''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' اس نے پلٹ کر ان کی

طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔ نہ خوش ہوئی نہ ناراض۔ خاموش اپنے گھر چلی گئی۔ بس یہ تھا میراجی کا پہلا اور آخری عشق۔

''میراجی کے پاس میراسین کی ایک تصویر خدا جانے کہاں سے آ گئی تھی اسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ جب انہیں میراسین کی یاد بہت ستاتی تو اس تصویر کو سامنے رکھ کر دیکھتے رہتے، پھر فرش پر زور زور سے اپنا سر پٹختے، یہاں تک کہ بے حال ہو جاتے۔

اس افلاطونی عشق کے بعد میراجی نے اپنی ساری عمر میں پہلا اور آخری جنسی معاملہ کیا۔ لاہور کی ہیرامنڈی میں کسی کے یہاں پہنچ گئے۔ اس نے انہیں اپنی یاد دلانے کے لئے آتشک کا تحفہ دیا۔ یہ تحفہ میراجی کے پاس آخری دم تک رہا۔ میراجی ہومیوپیتھی بھی جانتے تھے۔ اپنا علاج خود کرتے رہتے تھے اور دوائیں کھاتے رہتے تھے۔ اس واقعے کی یادگار ان کی ایک نظم ''۱۴ مئی ۱۹۳۲ء کی رات'' ہے۔ جو کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے:

جو دھن تھا پاس وہ دور ہوا

مٹی میں ملا، کچھ بھی نہ رہا

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اس سانحے کے بعد میراجی جنسی لحاظ سے کھوکھ ہو گئے تھے اور ان کی لاشعوری الجھنیں اور بھی زیادہ ہو گئی تھیں

مثلث: میراجی کے عشق کی نفسیاتی کی گتھی کھولتے ہوئے ان کے ہمعصر اور بے تکلف دوست سعادت حسن منٹو اپنے مضمون ''تین گولے'' میں لکھتے ہیں:

''اس کے (میراجی کے) شعر کا ایک مصرع ہے:

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

مسافر کو رستہ بھولنا ہی تھا، اس لئے کہ اس نے چلتے وقت نقطۂ آغاز پر کوئی نشان نہیں بنایا تھا۔ اپنے بنائے ہوئے دائرے کے خط کے ساتھ ساتھ گھومتا وہ کئی بار ادھر سے گذرا مگر اسے یاد نہ رہا کہ اس نے اپنا یہ طویل سفر کہاں سے شروع کیا تھا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ میراجی یہ بھول گیا تھا کہ وہ مسافر ہے، سفر ہے یا راستہ۔ یہ حیثیت بھی اس کے دل و دماغ کے خلیوں میں دائرے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

''اس نے ایک لڑکی میرا سے محبت کی اور وہ ثناء اللہ سے میراجی بن گیا۔ اسی میرا کے نام کی رعایت سے اس نے میرابائی کے کلام کو پسند کرنا شروع کر دیا۔ جب اسے اپنی محبوبہ کا جسم میسر نہ آیا تو اس نے کوزہ گر کی طرح چاک گھما کر اپنے اپنے تخیل کی مٹی سے شروع شروع میں اسی شکل و صورت کے جسم تیار کرنے شروع کر دیئے لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس جسم کی ساخت کے تمام محویات، اس کی تمام نمایاں خصوصیتیں، تیز رفتار چاک پر گھوم گھوم کر نت نئی ہیئت اختیار کرتی گئیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ میراجی کے ہاتھ، اس کے تخیل کی نرم نرم مٹی اور چاک متواتر گردش سے بالکل گول ہو گئے۔ کوئی بھی ٹانگ میرا کی ٹانگ ہو سکتی تھی، کوئی بھی چیتھڑا میرا کا پیرہن بن سکتا تھا۔ کوئی بھی رہ گذر میرا کی رہگذر میں تبدیل ہو سکتی تھی اور انتہا یہ ہوئی کہ تخیل کی نرم نرم مٹی کی سوندھی باس سڑاند بن گئی اور وہ شکل دینے سے پہلے ہی اس کو چاک

سے اتارنے لگا۔

''پہلے میرا بلند بام محلوں میں رہتی تھی۔ میراجی ایسا بھٹکا کہ راستہ بھول کر اس نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ اس کو اس گراوٹ کا مطلقاً احساس نہ تھا، اس لئے کہ اترائی میں ہر قدم پر میرا کا تخیل اس کے ساتھ ساتھ تھا جو اس کے جوتے کے تلووں کی طرح گھستا گیا۔ پہلے میرا عام محبوباؤں کی طرح بڑی خوبصورت تھی لیکن یہ خوبصورتی ہر نسوانی پوشاک میں ملبوس دیکھ دیکھ کر کچھ اس طور پر اس کے دل و دماغ میں مسخ ہو گئی تھی کہ اس کے صحیح تصور کی المناک جدائی کا بھی میراجی کو احساس نہ تھا۔ اگر احساس ہوتا تو اتنے بڑے المیے کے جلوس کے چند غیر مبہم نشانات اس کے کلام میں یقیناً موجود ہوتے جو میرا سے محبت کرتے ہی اس کے دل و دماغ میں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔

حسن، عشق اور موت۔ یہ تکون پچک کر میراجی کے وجود میں گول ہو گئی تھی۔ صرف یہی نہیں دنیا کی ہر مثلث اس کے دل و دماغ میں مدغم ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ارکان ثلاثہ کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے کہ انکی ترتیب درہم برہم ہو گئی تھی۔ کبھی موت پہلے، حسن آخر اور عشق درمیان میں۔ کبھی عشق پہلے، موت اس کے بعد اور حسن آخر میں اور یہ چکر نامحسوس طور پر چلتا رہتا تھا۔

''کسی بھی عورت سے عشق کیا جائے، مثلث ایک ہی قسم کا بنتا ہے۔ حسن، عشق اور موت — عاشق، معشوق اور وصل۔ میرا سے ثناء اللہ کا وصال جیسا کہ جاننے والوں کو معلوم ہے، نہ ہوا یا نہ ہو سکا۔ اس نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کا ردعمل میراجی تھا۔ اس نے اس معاشقے میں شکست کھا کر اس حیثیت کے ٹکڑوں کو اس طرح جوڑا تھا کہ ان میں ایک سالمیت تو آ گئی تھی مگر اصلیت مسخ ہو گئی تھی۔ وہ تین نوکیں جن کا رخ خطِ مستقیم میں ایک دوسرے کی طرف ہوتا ہے دب گئی تھیں۔ وصالِ محبوب کیلئے اب یہ لازم نہیں تھا کہ محبوب موجود ہو۔ وہ خود ہی عاشق تھا، خود ہی معشوق اور خود ہی وصال۔

منٹو اپنے مضمون ''تین گولے'' میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اقلیدس میں مثلث بہت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری اشکال کے مقابلے میں یہ ایسی کٹر اور بے لوچ شکل ہے جسے آپ کسی اور شکل میں تبدیل نہیں کر سکتے لیکن میراجی نے اپنے دل و دماغ اور جسم میں تکون کو جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کچھ اس طرح دبایا کہ اس کے رکن اپنی جگہوں سے ہٹ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آس پاس کی دوسری چیزیں بھی اس تکون کے ساتھ مسخ ہو گئیں اور میراجی کی شاعری ظہور میں آئی۔

''پہلی ملاقات ہی میں میری اس کی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے دہلی میں بتایا تھا کہ اس کی جنسی اجابت عام طور پر ریڈیو اسٹیشن کے اسٹڈیوز میں ہوتی ہے۔ جب یہ کمرے خالی ہوتے تھے تو وہ بڑے اطمینان سے اپنی حاجت رفع کر لیا کرتا تھا۔ اس کی یہ جنسی ضلالت ہی جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس کی مبہم منظومات کا باعث ہے، ورنہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، عام گفتگو میں وہ بڑا واضح دماغ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس پر بیتی ہے اشعار میں بیان ہو جائے مگر مصیبت یہ تھی کہ جو مصیبت اس پر ٹوٹی تھی اس کو اس

نے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے جوڑ کر اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا تھا۔ اس کو
اس کا علم تھا۔ اس ضمن میں وہ اپنی بے چارگی اچھی طرح محسوس کرتا تھا لیکن
عام آدمیوں کی طرح اس نے اپنی اس کمزوری کو اپنا خاص رنگ بنانے کی
کوشش کی اور آہستہ آہستہ اس نے میراکو بھی اپنی گمراہی کی سولی پر چڑھا دیا۔''

میراجی کا ہندوصنمیات کے فلسفے سے ایک گہرا تعلق تھا۔ اس تعلق کی
پرتیں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون ''میراجی دھرتی پوجا کی ایک مثال'' میں
بخوبی اتاری ہیں۔ وزیر آغا میراجی کے ہندوصنمیات سے روحانی اور ذہنی تعلق
کو مانتے ہوئے میراجی کی شاعری کو دھرتی پوجا میں مشغول دیکھتے ہیں۔ وہ
رقمطراز ہیں:۔

''اردو نظم کے اس پس منظر میں میراجی کی نظمیں دھرتی پوجا کی ایک
انوکھی مثال پیش کرتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہوگا کہ اردو نظم میں میراجی
وہ پہلا شاعر ہے جس نے محض رسمی طور پر ملکی رسوم، عقائد اور مظاہر سے
وابستگی کا اظہار نہیں کیا اور نہ مغربی تہذیب سے رد عمل کے طور پر اپنے وطن کے
گن گائے ہیں بلکہ جس کی روح دھرتی کی روح سے ہم آہنگ اور جس کا
سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز قدیم ملکی روایات، تاریخ اور اساطیر سے مملو
ہے، دوسرے لفظوں میں میراجی نے ایک بھگت، درویش یا جان ہار پجاری کی
طرح اپنی دھرتی کی پوجا کی ہے۔ محض رسمی طور پر وطن دوستی کی تحریک کا ساتھ
نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں کی روح، فضا اور مزاج، ارض وطن کی
روح، فضا اور مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور اس خاص میدان میں
اسے کسی حریف کا سامنا نہیں۔

''میراجی کے اس انوکھے رجحان کے بارے میں عام روایت یہ
ہے کہ جوانی کے آغاز میں اس نے ایک بنگالی لڑکی میرا سین کو دیکھا اور اس
کے عشق میں اس درجہ اسیر ہوا کہ اس نے نہ صرف اپنی ہیئت تبدیل کرلی نہ
صرف ثناء اللہ سے میراجی بن گیا بلکہ محبوبہ کی ہر شے حتیٰ کہ اسکی زبان، مذہب
اور مذہبی روایات بھی اسے عزیز ہو گئیں۔ یہ بات تو شاید ذہن قبول کرلے کہ
میرا سین سے اس نے عشق کیا اور اس عشق میں اپنا نام تبدیل کرلیا۔ بال بڑھا
لئے اور گلے میں مالا ڈال لی۔ لیکن یہ کہنا کہ ہندو دیومالا، قدیم روایات اور
ملکی مظاہر سے اس کی وابستگی محض اس جذبۂ عشق کی رہین منت تھی، کچھ ایسا صحیح
نہیں۔ اول تو یہی سوال قابل غور ہے کہ میراجی نے عشق میں مبتلا ہو کر ایسے
عجیب وغریب رد عمل کا اظہار کیوں کیا کہ محبوبہ کے علاوہ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ
محبوبہ سے کہیں زیادہ اس کے مذہبی اعتقادات، رسوم اور فضا کو اپنی ذات سے
ہم آہنگ کرلیا۔ میری رائے میں میرا سین زیادہ سے زیادہ ایک تحریک تھی جس
نے میراجی کے ہاں اس چنگاری کو ہوا دی تھی جو ایک مدت سے اس کے دل،
روح بلکہ خون میں سلگ رہی تھی۔ ینگ کے انکشافات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا
ہے کہ میراجی چونکہ اس دھرتی کا باسی تھا اور اس کا خون، گوشت، پوست
اور مزاج اس دھرتی کے نمک، ہوا، پانی اور مٹی سے تشکیل ہوا تھا، اس لئے یہ
غیر اغلب نہیں کہ اس کے اجتماعی لاشعور (Collective
Unconscious) میں بھی ماضی اور ماضی کی روایات کے وہ سارے نقوش

موجود ہوں جو روشنی میں آنے کیلئے بیتاب تھے۔ میراسین کی ہستی محض اس لاشعوری رجحان کو جنبش میں لانے کا موجب بنی اور میراجی نے اپنی نظم کے وسیلے سے اس صدیوں پرانی وابستگی اور پوجا کے رجحان کو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بچپن کے حالات و واقعات بالعموم باقی زندگی پر اثر انداز ہوتے اور اس کی ایک خاص ڈھب سے تشکیل کرتے ہیں۔ میراجی کا بچپن گجرات کاٹھیاواڑ میں گزرا تھا اور وہ ایک طویل عرصے تک دوارکا کے قریب بھی رہا تھا۔ دوارکا نہ صرف کرشن مہاراج کے نام سے منسلک ہے، بلکہ ساری فضا بھی قدیم ہندوستانی فضا سے مماثل تھی۔ یہاں جنگل تھے، برسات تھی اور پھر پربت بھی تھے اور ان میں سے ایک پربت پر کالی کا مندر بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں نے میراجی پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہوں گے۔ بیشک میراجی نے اپنی نظموں کے مجموعے میں اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ:

"ایک ہی بار مشرقی ہندوستان کی ایک عشرت انگیز سورت (یعنی میراسین) کی طرف توجہ کی، ہزیمت کا منہ دیکھا...... اور ذہنی تلخی کو کم کرنے کیلئے اپنی شکست کے احساس سے رہائی حاصل کرنے کیلئے میرا ذہن ادبی تخلیقات میں مجھے بار بار پرانے ہندوستان کی طرف لے جاتا ہے۔ مجھے کرشن کنھیا اور برندابن کی گوپیوں کی ایک جھلک دکھا کر وشنومت کا پجاری بنا دیتا ہے"۔

میراجی کی نظمیں!!

"لیکن شاید خود شاعر اپنے بعض غیر شعوری رجحانات کا صحیح ناقد نہیں ہوتا۔ میراجی نے پرانے ہندوستان سے اپنی وابستگی کو میراسین کی عطا سمجھا (اور بیشتر نقادانِ ادب نے میراجی کی اس بات کو استخراجِ نتیجہ کیلئے بنیاد قرار دے لیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس رجحان کی جڑیں میراجی کی اپنی روح کی گہرائیوں میں بہت دور تک اتری ہوئی تھیں۔ ورنہ یہ رجحان اس شدت اور زور کے ساتھ بھی ظاہر نہ ہوتا۔ نظموں کے اسی دیباچے میں خود میراجی کے قلم سے غیر شعوری طور پر ایک ایسی بات بھی نکل گئی ہے جو اس حقیقت کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"میرے آباؤ اجداد آریہ نسل کے انسان تھے۔۔۔۔وہ آریہ جو وسط ایشیا سے چل کر جب جنوب کی طرف روانہ ہوئے تو ان کا سفر کہیں رکنے میں نہیں آتا تھا۔ انہی کی ذہانت، انہی کا حافظہ، اور انہی کی طبیعت نسل در نسل مجھ تک پہنچی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میرا ذہنی سفر بھی پنجاب سے جنوب کی طرف رہا ہے۔"

میراجی کی نظمیں!!

اس انکشاف کی روشنی میں یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہو کہ پرانے ہندوستان کی طرف میراجی کا رجحان ایک بنیادی رجحان تھا۔ حتیٰ کہ میراسین سے محبت بھی دراصل اس رجحان ہی کا ایک نتیجہ تھا۔"

جگدیش چندر ودھاون۔ ایم۔ اے

منٹو کا عشق

منٹو دق کا شکار ہوئے تو ڈاکٹروں اور اعزا و اقارب نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ کسی صحت افزا کوہستانی علاقے میں برائے علاج چلے جائیں تاکہ جلد صحت یاب ہو سکیں۔ جموں سری نگر قومی شاہراہ پر بانہال کے اس طرف بٹوت ایک پر فضا اور خوشگوار مقام ہے جہاں دق کے مریضوں کے لئے سینی ٹوریم بھی ہے اور جہاں کی آب و ہوا میں آبِ حیات کی تاثیر ہے۔ میدانی علاقوں سے دق کے مریض دور دور سے بٹوت میں کھوئی ہوئی صحت کی تلاش میں آتے ہیں۔

منٹو بٹوت میں تقریباً تین مہینے رہے اور انہیں اپنی زندگی کا پہلا اور آخری عشق وہاں ہوا جو بقول ان کے ''ناپختہ'' تھا۔ لیکن اس کی یاد وہ تا عمر نہیں بھولے اور اپنی کئی کہانیوں .... مثلاً ''بیگو''، ''موسم کی شرارت''، ''لالٹین''، ''ایک خط''، ''مصری کی ڈلی'' میں ان دنوں کا ذکر انہوں نے اس انداز سے کیا ہے گویا کسی بہشتِ گم گشتہ کی یاد تازہ کر رہے ہوں۔

''شہر میں مجھے صرف ایک کام تھا......... اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے گھپ اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنا اور بس۔ مگر بٹوت میں اس تاریکی کے اندر روشنی کی ایک شعاع تھی۔ وزیر کی لالٹین''۔[2]

منٹو شہر میں تھے تو انہیں اپنی سونی سونی زندگی میں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ ان کا ماضی تلخ اور ترش تھا۔ حال ویران اور مایوس کن اور مستقبل غیر یقینی اور تاریک۔ انسان امیدوں کے سہارے جیتا ہے، منٹو کو حدِ نظر تک یاس اور ناامیدی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا چنانچہ انہوں نے لکھا ہے:

میرا قیام بٹوت میں گو مختصر تھا لیکن گوناگوں روحانی مسرتوں سے پر۔ میں نے اس صحت افزا مقام میں جتنے دن گزارے ہیں۔ ان کے ہر لمحہ کی یاد میرے ذہن کا ایک جزو بن کے رہ گئی ہے جو بھلائے نہ بھولے گی......... کیا دن تھے؟ بار بار میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بلند ہوتی ہے اور میں کئی کئی گھنٹے اس کے زیرِ اثر بے خود اور مدہوش رہتا ہوں''۔[1]

منٹو نے اپنی محبوبہ کو جو ایک پہاڑی چرواہی لڑکی تھی، کئی پیارے پیارے نام دیئے ہیں۔ بیگو، وزیر، بیگم وغیرہ لیکن درحقیقت ان سب پر ایک ہی کردار کی مہر ثبت ہے۔

---

[1] منٹو......... ''لالٹین'' مجموعہ ''دھواں''، ساقی بک ڈپو دہلی۔ ص ۹۶ تا ۱۰۳

[2] منٹو......... ''لالٹین'' مجموعہ ''دھواں''، ساقی بک ڈپو دہلی۔ ص ۱۵۳

وزیر یا بیگو (ایک ہی بات ہے) ان کی تاریک زندگی میں یوں چمکی جیسے کالی گھٹاؤں میں بجلی کوند جاتی ہے۔ وزیر جسمانی لذتوں کی دلدادہ تھی۔ جب کہ منٹو کا عشق جنسی جذبات سے عاری یعنی روحانی یا افلاطونی تھا۔ لیکن منٹو کا عشق بے غرض نہ تھا۔ وہ اپنی سنسان اور اجاڑ زندگی میں دلچسپی اور رنگینی پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس لحاظ سے وہ اپنی محبوبہ کے ممنون تھے کہ اس نے ان کی فرسودہ اور خشک زندگی کو تازگی اور توانائی بخشی، رونق اور جلا دی۔ پُر امیدی اور خود اعتمادی عطا کی۔ گویا انکی زندگی کی خالی جگہوں کو قوس قزحی رنگوں سے پُر کر کے اسے صحیح معنوں میں زندگی بنا دیا۔ ان کی محبوبہ نے منٹو کے ذہن وقلب پر گہرے نقوش چھوڑے جن کا مٹانا وقت کی دسترس سے باہر تھا۔

منٹو نے لکھا ہے کہ...... اس کی اور میری حالت بعینہٖ ایک جیسی تھی، ہم دونوں ایک ہی منزل کی طرف جانے والے مسافر تھے جو ایک لق و دق صحرا میں ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ اسے میری ضرورت تھی اور مجھے اسکی، تا کہ ہمارا سفر اچھی طرح کٹ جائے۔

تجسس کا تقاضا ہے کہ ہم یہ جانیں کہ منٹو کی محبوبہ کی شکل وصورت اور قد وقامت کیسی تھی جو ایک بار ان کے دل میں جاگزیں ہوکر ہمیشہ کیلئے وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ خیال رہے کہ منٹو ابھی نوخیز و نوعمر تھے۔ ان کی رگوں میں گرم خون رواں دواں تھا اور ان کی محبوبہ حسن کشمیر کا بہترین نمونہ تھی۔ فضا جنت نظیر کہساروں، آبشاروں اور چناروں کی رنگینیوں سے معمور تھی۔ انداز بیان منٹو کا ہے:

''وہ جوان تھی۔ اس کی ناک اس پنسل کی طرح سیدھی اور ستوان تھی جس سے میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ اسکی آنکھیں........ میں نے اس جیسی آنکھیں بہت کم دیکھی ہیں۔ ان میں پہاڑی علاقے کی ساری گہرائیاں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ پلکیں گھنی اور لمبی تھیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزری تو دھوپ کی ایک لرزاں شعاع اسکی پلکوں میں الجھ کر رہ گئی۔ اس کا سینہ مضبوط اور کشادہ تھا۔ اس میں جوانی سانس لیتی تھی۔ کاندھے چوڑے، بانہیں گول اور گدراہٹ سے بھر پور۔ کانوں میں چاندی کے لمبے بندے تھے۔ بال دیہاتیوں کی طرح سیدھی مانگ نکال کر گندھے ہوئے تھے۔ جس سے اسکے چہرے میں وقار پیدا ہو گیا تھا''۔[1]

منٹو نے اس حسن کی مورت، چاندی صورت کو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ اپنی سُدھ بُدھ بھول گئے۔ چھلا، لانبا قد۔ بھرا پُرا بدن۔ چمکتا دمکتا چہرہ۔ دُھلی دُھلی اجلی اجلی آنکھیں۔ منٹو کے سازِ دل کے سوئے ہوئے تار جھنجھنا اٹھے، ایک موسیقی ان کے رگ وپے میں جاگ اٹھی۔ ایک ایسا کیف وسرور جس سے انکی روح ابتک ناآشنا تھی۔ ایک خوابیدہ جذبہ ان کے دل میں آنکھیں ملتا، انگڑائیاں لیتا ہوا اٹھا اور ان کی ہستی پر چھا گیا۔ یہ ان کی اپنی محبوبہ سے پہلی ملاقات تھی جس کی لذت، ندرت اور شیرینی کو وہ پھر کبھی نہیں

---

[1] منٹو...... ''موسم کی شرارت'' مجموعہ ''بانجھ'' ساقی بک ڈپو، دہلی۔ ص۔ ۱۷۰، ۱۷۱

بھولے اور جواں کی زندگی کا انوٹ حصہ بن گئی........ ایک الھڑ جوانی نے
اب کے تاریک خانۂ دل میں دیا سا جلا دیا۔ منٹو لکھتے ہیں۔

"اس کی جوانی بتوت کی فضا پر پوری شدت کے
ساتھ جلوہ گر تھی۔ سبز لباس میں ملبوس وہ سڑک کے درمیان کسی
کا ایک دراز بوٹا معلوم ہو رہی تھی۔ چہرے کے تانبے ایسے
تابان رنگ پر اس کی آنکھوں کی چمک نے عجیب کیفیت پیدا
کر دی تھی۔ جو چشمے کے پانی کی طرح صاف اور شفاف
تھیں...... میں اس کو کتنا عرصہ دیکھتا رہا یہ مجھے معلوم نہیں لیکن
اتنا یاد ہے کہ میں نے دفعتاً اپنا سینہ موسیقی سے لبریز
پایا...... اس کا سینہ چشمے کے پانی کی طرح دھڑک رہا تھا۔
میرا دل بھی میرے پہلو میں انگڑائیاں لے رہا تھا...... آہ
یہ پہلی ملاقات کس قدر لذیذ تھی۔ اس کا ذائقہ ابھی تک میرے
جسم کے رگ و پے میں موجود ہے"۔ [1]

منٹو کی وزیر جب اپنی بکری کو "اے" کہہ کر آواز دیتی تو منٹو کو اس
مانوس اور دلنواز آواز میں روح کو مسرور کرنے والا نغمہ سنائی دیتا۔ جونہی یہ
آواز منٹو کی سماعت سے مس ہوتی، انہیں معلوم ہوتا کہ پہاڑ کی چھاتی میں سے
صدیوں کی رکی ہوئی آواز نکلی اور سیدھی آسمان تک پہنچ گئی ہے۔ "اے" بالکل
دھیمی آواز میں اور "بکری بکری" بلند اور فلک رس سروں میں ایک لحہ کیلئے یہ
نعرۂ شباب پہاڑیوں کی سنگین دیواروں میں گونجتا، ڈوبتا، ابھرتا، تھرتھراتا اور
رباب کے تاروں کی لرزش کی طرح کانپتا فضا میں گھل جاتا۔ وزیر مرقع حسن و
شباب جھولا جھول رہی تھی۔ بازو پر اٹھانے کے باعث اس کی کھلی آستینیں نیچے
ڈھلک آئیں تو اس کے بازو کندھوں تک عریاں ہو گئے۔ بڑی خوبصورت بانہیں
تھیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کے دو بڑے دانت اوپر کو اٹھ گئے ہوں۔ بے
داغ، ہموار گدرائے ہوئے زندگی سے بھرپور...... منٹو سحر زدہ اسے
جھاڑیوں کے عقب سے چھپ کر دیکھ رہے تھے۔ جب وہ یک لخت وزیر کے
سامنے آ گئی تو وہ سٹپٹائی۔ اس کی آنکھوں میں حیا کے گلابی ڈورے ابھر آئے۔
سرخ گال اور سرخ ہو گئے۔ اور وہ لجا، شرما کر سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ دونوں
بازوؤں کی مدد سے اس نے سینے کی شوخیاں چھپالیں۔ وزیر قریب آئی تو اس
کے ہونٹ کچھ اس انداز سے کھلے کہ منٹو کے اپنے ہونٹوں میں سرسراہٹ سی
ہونے لگی۔ انہوں نے وزیر کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ ڈھلک کر ان کی گود
میں آ گئی۔ منٹو نے ہونٹ جھکائے تو وہ چھڑا کر الگ ہو گئی۔ اور منٹو کے ہونٹوں
کی تحریر نامکمل رہ گئی۔ اور وہ نامکمل بوسہ ہمیشہ کیلئے ان کے ہونٹوں پر اٹکا رہا۔

منٹو کے کانوں میں بیگو کی آوارگی اور اخلاق باختگی کی اڑتی اڑتی
خبر پہنچی تو انہیں دھکا سا لگا۔ اور وہ بیگو پر برس پڑے۔ بیگو نے کمال سادگی اور
معصومیت سے منٹو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ مجھ پر ناراض مت ہوجیے۔
اللہ کی قسم میں بالکل پاک و صاف ہوں، بے گناہ ہوں۔ لوگ مجھ سے پیار
کرتے ہیں۔ وہ مجھے کہتے ہیں...... بیگو تیری آنکھیں اتنی خوبصورت ہیں کہ جی

---

[1] منٹو........ "بیگو" مجموعہ "بانجھ پن" ساقی بک ڈپو، دہلی۔ ص ۱۸۰، ۱۸۱۔

چاہتا ہے کہ انہیں دیکھتے ہی رہیں۔ بگو تیرے ہونٹ اتنے پیارے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ انہیں چومتے ہی رہیں۔ اب آپ ہی بتائیے میں ان کو کیا جواب دوں۔ آپ نے بھی تو مجھے یہی کہا تھا...... پھر میں تو اپنا منہ ان کے منہ کے پاس نہیں لے جاتی، وہ خود ہی فرطِ شوق سے آگے بڑھ کر مجھے چوم لیتے ہیں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں اپنی بھینس ''چھلاں'' کو بھی تو ہر روز چومتی ہوں، پیار کرتی ہوں۔ کیا یہ بری بات ہے..... بولو نا؟ میں تو آج تک اسے ہی محبت سمجھتی رہی ہوں۔ کیا میں غلط سمجھتی تھی۔ کیا محبت کوئی اور چیز ہے۔ خدارا مجھے سمجھاؤ نا۔ میں ان پڑھ کیا جانوں۔ آپ تو آخر پڑھے لکھے ہیں۔ یقین کیجئے، آپ مجھ سے خفا ہوئے تو میں نے سب سے ملنا چھوڑ دیا۔ اب میں دودھ بیچنے بھی نہیں جاتی۔ ''چھلاں'' کو اب میری چھوٹی بہن چراتی ہے۔ میں گھر پر ہی رہتی ہوں...... آپ تو اوروں سے بالکل مختلف ہو۔ قطعاً انوکھے ہو۔ چلو میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ غصہ تھوک دو۔ میں تمہارے لئے حقہ تازہ کروں گی...... محبت کی کرن آخر بگو کے دل میں پھوٹی۔ وہ محبت جس سے وہ آج تک بالکل ناآشنا تھی انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوگئی۔

تہذیب انسان پر ملمع چڑھا دیتی ہے۔ اس میں تصنع اور بناوٹ پیدا کر دیتی ہے۔ قدرت کی گود میں پلی شباب کا پیکر بگو اپنی فطرت میں اب بھی کس قدر معصوم، سادہ اور پاکیزہ تھی۔ وہ ابھی تک نمائشی اور اوپری محبت کو ہی حقیقی عشق اور سچا پیار سمجھے ہوئے تھی۔ تہذیب کا ہاتھ ابھی اس کے جسم سے ہوتا ہوا اس کی روح تک نہیں پہنچا تھا۔ منٹو نے بگو کو ایک نادر اور انوکھے جذبے سے روشناس کرایا اور اس کی روح میں سچی محبت کی شمع جلا دی۔

ایک روز منٹو کی نظر بگو کے کرتے کی جیب پر پڑی جس میں اس نے کچھ ٹھونس رکھا تھا۔ منٹو نے پوچھا کہ اس کی جیب میں کیا ہے۔ تو بگو نے بتانے میں پس و پیش کی۔ منٹو مصر ہوئے تو بگو نے اور تو سب چیزیں دکھا دیں لیکن ایک چیز پھر بھی چھپائے رکھی۔ جب منٹو نے خفگی کا اظہار کیا تو بگو وہ چیز جو اس کی نظروں میں بہت خاص چیز تھی، نکال کر دکھا دی.......... یہ تو مصری کی ڈلی تھی

برسوں بعد بمبئی میں جب منٹو کے عصمت چغتائی سے دوستانہ مراسم ہوئے تو محبت کے مسئلہ پر ان دونوں میں اکثر تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن وہ کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچے...... اب عصمت چغتائی کے الفاظ میں پڑھیے:

''وہ یہ کہتا

''محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنے زری کے جوتے سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچویں بیوی سے محبت ہے۔''

''میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے ہو جاتا ہے''۔

''ہاں میں سمجھ گیا''۔ منٹو نے دور ماضی کے دھندلکوں میں کچھ ٹٹول کر سوچتے ہوئے خود سے کہا:

''کشمیر میں ایک چرواہی تھی''۔

''پھر؟'' میں نے داستان سننے والوں کی طرح ہنکارا دیا۔

''پھر کچھ نہیں''۔ وہ ایک دم بچاؤ کے لئے تن گیا۔

''آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شرما رہے ہیں''۔

''کون گدھا شرما رہا ہے''— منو نے واقعی شرما کر کہا.....

بڑی مشکل سے اس نے بتایا:

''بس جب وہ مویشی ہانکنے کیلئے اپنی لکڑی اوپر اٹھاتی تھی تو اس کی سفید کہنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں بیمار تھا، روز ایک کمبل لیکر پہاڑی پر جا کر لیٹ جایا کرتا تھا اور سانس روکے اس لمحے کا انتظار کرتا تھا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو آستین سرک جائے اور مجھے اس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے''۔

''کہنی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا:

''ہاں— میں نے سوائے کہنی کے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی۔ اس کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کہنی کی جھلک دیکھنے کیلئے لپکتی تھیں۔

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر ایک دن کمبل پر لیٹا تھا۔ وہ مجھ سے تھوڑی دور آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ مجھے دکھاؤ، تو شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا اور بولی کچھ نہیں۔ بس مجھے ضد ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔ وہ روہانسی ہو گئی مگر میں ضد پر اڑ گیا۔ اور آخر کو بڑی رد و کد کے بعد اس نے مٹھی کھول کر میرے سامنے کر دی۔ اور خود شرم سے گھٹنوں میں منہ دے لیا۔

کیا تھا اس کی ہتھیلی پر''۔ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''مصری کی ڈلی! اسکی گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی''۔

''پھر آپ نے کیا کیا''۔

''میں دیکھتا رہ گیا''۔ وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

''پھر؟''

''پھر وہ اٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دور سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیض کی جیب میں پڑی رہی۔ پھر میں نے اسے دراز میں ڈال دیا۔ اور کچھ دنوں بعد چیونٹیاں کھا گئیں''۔

''اور وہ لڑکی؟''

''کون سی لڑکی؟'' وہ چونکا۔

''وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی دی تھی''۔

''اسے میں نے پھر نہیں دیکھا''۔

''کس قدر پھسپھسا ہے آپ کا عشق!''

میں نے ناامیدی سے چڑ کر کہا۔ ''مجھے تو بڑے شعلہ بداماں قسم کے عشق کی امید تھی''۔

''قطعی پھسپھسا نہیں''۔ منٹو لڑ پڑا۔

''بالکل رذی، تھرڈ ریٹ، مرگھلا عشق، مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے۔ بڑا تیر مارا''۔

''تو اور کیا کرتا۔ اس کے ساتھ سو جاتا۔ ایک حرامی بچّا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں ڈینگیں مارتا''۔ وہ بگڑا۔[1]

کیا یہ وہی منٹو تھے جنہیں کوتاہ بین نقادوں نے فحش نگار، گندہ ذہن، غلاظت پسند اور دہریہ قرار دیا؟ کیا یہ وہی منٹو تھے۔ جنہوں نے ''بو''۔ ''ٹھنڈا گوشت''۔ ''کالی شلوار''۔ ''دھواں''۔ ''ممی''۔ ''شاردا'' جیسے افسانے لکھے؟ کیا یہ وہی منٹو تھے جنہیں فحاشی کے الزام میں برسوں کچہریوں کی خاک چھاننا پڑی اور مجسٹریٹوں کے حضور میں صبح تا شام سراپا بندگی بن کر کھڑے رہنا پڑا!........ کتنا بڑا تضاد ہے اس گوشت پوست کے مطہر اور پاک دل انسان میں اور اس منٹو میں جو حقیقت نگار ہوتے ہوئے سماج کی غلاظتوں کثافتوں اور آلائشوں پر سے نہایت بے دردی سے تہہ در تہہ پردے ہٹاتا چلا جاتا ہے۔

منٹو لکھتے ہیں:

''اگر تم میری تحریروں کو پیش نظر رکھ لیتے تو تمہیں یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہوتی کہ میں کشمیر کی ایک سادہ لوح لڑکی سے کھیلتا رہا ہوں۔ میرے دوست تم نے مجھے صدمہ پہنچایا ہے''۔[2]

''اس پہاڑی لڑکی سے جو جسمانی لذتوں کی دلدادہ تھی۔ میرے تعلقات صرف ذہنی اور روحانی تھے''۔

یہ تھا منٹو کا عشق، اپنے حقیقی روپ میں۔ منٹو نے اپنے ''ناپختہ'' عشق کو ہمیشہ مقدس جانا اور جہاں تک ہو سکا اس بارے میں اپنی زبان پر تالا لگائے رکھا۔ یہاں تک کہ اپنے ہم نوالہ ہم پیالہ دوستوں سے بھی اس کے متعلق کھل کر بات نہیں کرتے تھے بلکہ محبت کا تذکرہ چھڑتے ہی جھنجلا جاتے تھے۔

منٹو کے لنگوٹیے دوست ابو سعید قریشی نے منٹو کے اس عشق کے بارے میں لکھا ہے:

> ''وہ اس کی باتیں کرتا تو اس پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ہم نے اسے ''بیگو'' کے نام سے چھیڑنا شروع کیا۔ اوچھے سے اوچھے ہتھیار استعمال کئے گئے کہ وہ کھل کر بات کرے''۔

---

[1] عصمت چغتائی — ''منٹو میرا دوست میرا دشمن'' (خاکہ)

[2] منٹو...... ''ایک خط'' مجموعہ ''چغد'' مکتبہ شعر و ادب، لاہور۔ ص ۱۶

''عشق کے لفظ سے وہ چڑھتا تھا''۔

''ہم نے کہا: تجھے بیگو سے عشق ہو گیا ہے''۔ اس
نے کہا؟'' بکواس بند کرو''۔

اس نے اپنے سینے کے دریچے ہم پر بند کر دیے۔
ہم جو اس کے ہم مشرب اور ہم راز تھے۔ اس نے اس خزانے
کو جو اسے راستے میں پڑا ہوا ملا تھا۔ ہماری نظروں سے بھی
چھپا لیا۔ وہ اس جذبے کو بھی جو اس کے دل میں ابھی ابھی
بیدار ہوا تھا۔ رُسوا نہیں کرنا چاہتا تھا''۔ [۱]

منٹو بھی اپنی محبوبہ کو نہیں بھولے۔ انہوں نے اس کی حسین یاد کو ہمیشہ
اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ یہ ان کا اپنے پہلے اور آخری پیار کو خراج عقیدت تھا۔
منٹو لکھتے ہیں:

''وہ ایک دیہاتی لڑکی تھی...... جس نے میری
کتابِ زندگی کے کچھ اوراق پر چند حسین نقوش بنائے ہیں''۔
''مجھے وہ اکثر یاد آتی ہے— کیوں؟ اس کے
رخصت ہوتے وقت اس کی سدا متبسم آنکھوں میں دو چھلکتے
آنسو بتا رہے تھے کہ وہ میرے جذبہ سے کافی متاثر ہو چکی
ہے۔ اور حقیقی محبت کی ایک ننھی سی شعاع اس کے سینے کی
تاریکی میں داخل ہو چکی ہے۔...... کاش میں وزیر کو محبت کی
عظمتوں سے روشناس کرا سکتا اور کیا پتہ ہے کہ یہ پہاڑی لڑکی
مجھے وہ چیز عطا کر دیتی جس کی تلاش میں میری جوانی بڑھاپے
کے خواب دیکھ رہی ہے۔ [۲]

کرشن چندر نے جب منٹو کا افسانہ ''لالٹین'' پڑھا تو انہوں نے بھی
یہی تاثر لیا کہ اس کا تعلق منٹو کے رومان سے ہے۔ دراصل بٹوت میں اپنے
قیام کے دوران منٹو نے جتنے رومانی افسانے لکھے ان سب کا تعلق منٹو کی ذات
سے ہے۔ چنانچہ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''میں نے اس کا افسانہ ''لالٹین'' پڑھا، جو بٹوت
سے متعلق ہے۔ جہاں منٹو غالباً شدید علالت کے دوران میں
رہا۔ مجھے تو اس افسانے کا بیشتر حصہ منٹو کی سوانح سے متعلق
معلوم ہوتا ہے۔ اس کی جزئیات میں اور حرف آخر میں جو
حزن وملال جھلکتا ہے۔ وہ خود رومانی منٹو کی زندگی کا حصہ
معلوم ہوتا ہے۔ [۳]

درحقیقت منٹو کے اس عشق کو ہم صحیح معنوں میں عشق نہیں کہہ سکتے کیوں
کہ یہ مدعی سست اور گواہ چست والا معاملہ تھا۔ جب دوسری طرف آتشِ شوق
بھڑکی تو منٹو نے پسپائی اختیار کر لی۔ منٹو صرف روحانی عشق فرما رہے تھے۔ جو
عنفوانِ شباب میں کوئی عشق نہیں ہوتا۔ یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ منٹو بھی

---

[۱] ابو سعید قریشی— ''منٹو'' ص ۵۲
[۲] ''چغد'' مکتبہ شعر و ادب، ص ۴۳
[۳] کرشن چندر— سعادت حسن منٹو (خاکہ)

عشق میں گرفتار نہیں ہوئے۔ وہ نہ کبھی کسی زلف گرہ گیر کے جال میں پھنسے اور نہ کسی آفتِ جاں، زہد شکن کی قربت میں آئے۔ انہوں نے عشق کا روگ سرے سے پالا ہی نہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ فطرتاً تعجیل پسند اور پارہ صفت تھے اور عشق کے صبر آزما اور جاں گداز جھمیلوں میں پڑنے کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ منٹو خود ہی اس بارے میں اپنے افسانے ''بلونت سنگھ مجیٹھیا'' میں لکھتے ہیں:

''منٹو صاحب! یہ عاشق ہونا بھی ایک عجیب لعنت ہے''۔

''یہ سن کر میں مسکرا دیا: ''آپ ٹھیک فرماتے ہیں شاہ صاحب۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اس لعنت میں ابھی تک گرفتار نہیں ہوا'' [1]

گھریلو عورتوں سے بھی منٹو ہمیشہ دور دور رہے۔ انہیں وہ قابلِ عزت و توقیر سمجھتے تھے۔ ان کی حرمت اور ناموس کے قائل تھے۔ اس لئے انہوں نے کبھی کسی گھریلو عورت سے جسمانی قربت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کرشن چندر اس بارے میں واضح طور پر لکھتے ہیں:

''وہ عورت کی عزت کا، اس کی عصمت کا اور اس کے گھریلو پن کا جس قدر قائل ہے کوئی دوسرا مشکل سے ہوگا۔ اسلئے جب وہ عورت کی عزت کو جاتے دیکھتا ہے تو وہ بے قرار ہو جاتا ہے''۔ [2]

منٹو خود اس سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''میں نے اپنی زندگی میں ایک بھی گالی کسی کو نہیں دی۔ کسی کی ماں بہن کو بُری نظروں سے نہیں دیکھا''۔ [3]

منٹو فلمی دنیا کے معصیت پرور اور اخلاق سوز ماحول میں برسوں رہے۔ وہاں انہوں نے خوب روپیہ پیسہ کمایا اور نام پایا۔ وہ جوان اور خوبرو تھے۔ وہاں ان کی کئی شوخ و شنگ، عشوہ طراز، پیکرِ حسن و شباب ایکٹرسوں سے گہری دوستانہ وابستگی رہی، لیکن ان کا کسی سے معاشقہ نہیں ہوا۔ ان کی قربت، ذہنی قربت ہی رہی، جسمانی نہیں۔ مثال کے طور پر پارو دیوی سے انکی خوب دوستی رہی۔ وہ ہنس مکھ، خوش طبع اور گل مٹو ہو جانے والی ایکٹریس تھی۔ منٹو اس کی شائستگی، پسندیدہ آداب و خصائل، ستھرا پن اور صاف شفاف جلد کے گرویدہ تھے۔ گورا گورا رنگ، متناسب بھرا بُرا جسم، چکنی جلد جو دیودار لکڑی پر رندہ پھیرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر وقت اجلی اجلی، تر و تازہ اور شگفتہ دکھائی دیتی تھی۔ منٹو نے جب عصمت چغتائی کے شوہر شاہد لطیف کو بتایا کہ پارو کی جلد انہیں پسند ہے تو انہوں نے مسکرا کر کہا: ''جلد پسند ہے ٹھیک ہے۔ لیکن تمہیں کیا معلوم اندر کتاب کیسی ہے۔ مضمون کیسا ہے۔'' حقیقت یہ ہے کہ منٹو کو اندر کی کتاب اور مضمون سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پدما دیوی سے بھی منٹو کے گہرے مراسم تھے۔ وہ بہت حسین اور جاذبِ نظر ایکٹریس تھی۔ منٹو اس سے اپنے

---

[1] منٹو۔ ''بلونت سنگھ مجیٹھیا'' مجموعہ ''سرکنڈوں کے پیچھے''۔ مکتبہ شعر و ادب لاہور ص ۱۳
[2] کرشن چندر۔ ''سعادت حسن منٹو'' (خاکہ)
[3] منٹو۔ ''خدا اور اسکا جواب'' مجموعہ ''برقعے''۔۔۔۔۔ ص ۳۶

تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں.... ''میرے اس کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔ لیکن اس کا صحیح جسمانی تعلق بابو راؤ پٹیل سے تھا....''[۱] منٹو کا جگری دوست شیام کلدیپ کور سے، جو ایک ویمپ کا رول ادا کرتی تھی، عشق کی پینگیں بڑھا رہا تھا۔ شیام کے ہمراہ منٹو بھی اکثر اس سے بلاتکلف ملتے جلتے تھے۔ لیکن منٹو کے الفاظ میں.... کلدیپ کور سے ان کی ''کچھ رسمی ملاقات سی رہی''۔[۲] فلم ایکٹریس نیلم کو جب منٹو نے پہلی بار دیکھا تو ان کی نظر صرف نیلم کے پاؤں پر پڑی.... ''میں پیشہ ور عورتوں کو چور آنکھ سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ اگر کوئی عورت ایک دم میرے سامنے آجائے تو مجھے اس کا کچھ نظر نہیں آتا''۔[۳] منٹو کی نیلم سے جلد ہی گہری چھننے لگی۔ جس کی وجہ بقول منٹو نیلم کی عجیب وغریب انفرادیت۔ اس میں اپنی ہم پیشہ عورتوں کے اوچھا پن کی جگہ سنجیدگی اور متانت تھی۔ منٹو دل ہی دل میں اسکی دلچسپ شخصیت اور حسن وجمال کے معترف تھے — لیکن اس سے آگے انہوں نے کبھی پیش رفت نہیں کی — منٹو نے درحقیقت فلمی دنیا کے لیل ونہار دیکھے تو حیران رہ گئے۔ اخلاق باختہ خاوند اور بیویاں کھلم کھلا اوروں سے عشق لڑاتے پھرتے تھے:

''عجیب سلسلہ تھا کہ محسن عبداللہ سنیہہ پربھا پردھان کے عشق کے چکر میں تھا۔ اس کی بیوی پر احمد اپنا سکہ جمائے ہوئے تھا۔ اُدھر احمد کی بیوی سبط حسن سے رومان لڑا رہی تھی۔ اور ان کے پہچاننے والوں میں بھی اسی قسم کا سلسلہ جاری تھا.... میں نے جب یہ سلسلہ دیکھا تو بڑا چکرا گیا''۔[۴]

فلمی دنیا میں منٹو اس طرح کی بے لگام شہوت پرستی اور اخلاق باختگی دیکھتے تو ان کے دل میں کراہت اور حقارت پیدا ہوتی۔ لیکن فلمی دنیا میں رہتے ہوئے، اس کے ماحول سے مفر ممکن نہ تھا۔ منٹو نے اپنے افسانے ''سنترپنچ'' میں فلم ایکٹریسوں سے اپنی جسمانی بے تعلقی اور غیر وابستگی کا ذکر کیا ہے:

''میں شرط بدنے کو تیار ہوں کہ تم کبھی دنیا تیاگ نہیں سکتے۔ جس دنیا میں ہر قسم کی شراب ملتی ہے۔ اور خوبصورت عورتیں بھی....''۔

''میں نے چڑ کر کہا: ''عورتیں جائیں جہنم میں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بمبئی کے ہر اسٹوڈیو میں جہاں میں نے کام کیا۔ ان سے دور ہی رہا''۔[۵]

دراصل منٹو کبھی مرض عشق میں مبتلا نہیں ہوئے اور گھریلو عورتوں اور ایکٹریسوں سے بھی انہوں نے زیادہ واسطہ نہیں رکھا۔ گو منٹو نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان کی زندگی میں دو تین معمولی راہ چلتی عورتیں آئیں، ٹکرائیں اور چلی گئیں — یعنی ان سے کوئی مستقل جسمانی تعلق قائم نہیں ہوا — چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

---

۱ منٹو۔ ''بابو راؤ پٹیل'' (خاکہ) مجموعہ ''گنجے فرشتے''۔ ساقی بک ڈپو دہلی ص ۲۹۱
۲ منٹو۔ ''کے کے'' (خاکہ) مجموعہ ''لاؤڈ اسپیکر'' آزاد بک ڈپو، امرتسر۔ ص ۲۸۱
۳ منٹو۔ ''میرا نام رادھا'' مجموعہ ''چغد'' مکتبہ شعروادب لاہور۔ ص ۱۵۳۔۱۵۴
۴ منٹو۔ ''پُر اسرار نینا'' مجموعہ ''لاؤڈ اسپیکر'' آزاد بک ڈپو، امرتسر ص ۱۹۲
۵ منٹو۔ ''سنترپنچ'' مجموعہ ''بغیر اجازت'' مکتبہ شعروادب، لاہور ص ۶۵

میری زندگی میں دو تین لڑکیاں ضرور آئیں مگر وہ
نوکرانیاں تھیں۔ ان سے میرا تصادم ایسے ہی ہوا تھا جیسے سڑک
پر راہ چلتے دو اندھے آپس میں ٹکرائیں۔ اور چٹکیوں میں اس
تصادم سے فراغت حاصل کر کے اپنی اپنی راہ لیں''۔ [۱]

واضح ہو کہ گو منٹو عشق میں مبتلا نہیں ہوئے لیکن جب کبھی انہیں موقع ملا تو ''تصادم'' سے چوکے بھی نہیں — یوں دیکھا جائے تو جہاں تک جنسی تعلق کا واسطہ ہے۔ مہترانی، نوکرانی یا مہارانی میں فرق ہی کیا ہے۔ اس میدان میں سب برابر ہیں۔ کوئی اونچ نیچ نہیں کہ جسمانی تعلق باہمی خواہش اور رضامندی سے پیدا ہوتا ہے۔

منٹو کا میدان دراصل مختلف تھا — وہ میدان جس سے ان کے افسانوں کا تعلق ہے امرتسر کے کوچہ گھنیاں، لاہور کی ہیرا منڈی، دہلی کی جی، بی، روڈ۔ (شردھانند مارگ) اور بمبئی کی فارس روڈ کی انہوں نے جی بھر کر سیر کی۔ پونہ میں بھی وہ ایسی ہی جگہوں کی زیارت کرتے رہے۔ اس دنیا کے لوگوں میں گھل مل کر انہوں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا، جانچا، پرکھا اور اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ''کالی شلوار'' کی سلطانہ — ''ہتک'' کی سوگندھی — ''خوشیا'' کی کانتا — ممی اور اس کی کرسچین لڑکیاں، یہ محض خیالی کردار نہیں۔ یہ جیتے جاگتے، چلتے پھرتے، سانس لیتے کردار ہیں۔ تخیل کی چاشنی کے ساتھ ان میں حقیقت کا گہرا رنگ بھرا ہے۔ اور یہ حقیقت منٹو کی شخصیت اور فن کا اٹوٹ جزو ہے۔ اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، بلونت گارگی اور شورش کاشمیری، سبھی نے منٹو کے خاکوں میں اس امر کی تائید کی ہے۔ اس سلسلے میں کرشن چندر ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

''جب میں شالیمار پکچرز میں ملازم تھا۔ تو بمبئی میں
ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے آیا
تھا۔ اچانک میری ملاقات منٹو سے ریل گاڑی میں ہوگئی۔ کوئی
دس پندرہ منٹ تک ہم لوگ اکٹھے رہے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں
کے بعد منٹو نے یکایک مجھ سے پوچھا:

''بھئی۔ میں نے پونہ میں ایک لڑکی ''ش''
صاحب کے پاس بھیجی تھی۔ ایکٹرس بننے کی خواہش مند تھی۔
اس کا کیا ہوا؟''

''میں نے کہا: وہ لڑکی تو ''پ'' صاحب کے پاس
ہے'' پھر میں نے پوچھا: تم نے اس کا مطالعہ کیا ہوگا؟''

منٹو نے نہایت سنجیدگی سے کہا: ''لاحول ولا
قوۃ...... میں صرف طوائفوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میں شریف
لڑکیوں کے نزدیک نہیں پھٹکتا''۔ [۲]

منٹو نے طوائفوں کا ''مطالعہ'' لاہور ہی میں شروع کر دیا تھا جہاں وہ اپنے آبائی شہر امرتسر سے روزگار کی تلاش میں آئے تھے۔ ہیرا منڈی کی سیر

---

۱ منٹو — ''میری شادی'' مجموعہ ''اوپر نیچے اور درمیان'' ص ۵۰

۲ کرشن چندر — ''سعادت حسین منٹو'' (خاکہ)

میں باری علیگ اکثر ان کے ہمراہ ہوتے تھے جو نہ صرف منٹو کے ادبی گرو بلکہ ہم نوالہ اور ہم پیالہ بھی تھے، پھر ان کو کچھ احباب اس قبیل کے مل گئے جنہوں نے ان کی آتش شوق کو ہوا دی اور منٹو اس رو میں بری طرح بہہ گئے۔ والد کا سایہ سر پر نہیں تھا۔ دونوں بڑے بھائی ان سے بات تک کرنے کے روادار نہیں تھے۔ گویا گھر میں کوئی بزرگ نہیں تھا جو انہیں نوعمری میں بے راہ روی سے روکتا۔ منٹو کے دوست شورش کشمیری اس بارے میں لکھتے ہیں:

''میں انہیں تب سے جانتا ہوں جب وہ پہلے پہل لاہور آئے اور باری علیگ کیساتھ چنگڑ محلہ میں لدھیانہ لانڈری کے اوپر تین یا چار روپے ماہانہ میں کوٹھری میں رہنے لگے یہ ان کے کھلنڈر پن کا زمانہ تھا۔ اردو بک اسٹال کے یعقوب الحسن پیر مغان تھے۔ انہوں نے اس چنڈال چوکڑی کی معیت ہی میں شاہد وشراب کے تجربے شروع کئے اور بمبئی پہنچ کر تو ان کے ہو گئے''۔[1]

مشہور ادیب اور منٹو کے دوست بلونت گارگی نے ''منٹو کے بارے'' اپنے خاکے میں ایک واقعے کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے جس کے مطابق منٹو اور باری علیگ، بلونت گارگی کو بھی اپنے ہمراہ لاہور کے بازار حسن ہیرا منڈی لے گئے، منٹو کی طرف سے باری صاحب نے رنڈیوں کے دلال سے بھاؤ تاؤ کے بعد معاملہ طے کیا۔ منٹو نے یکے بعد دیگرے چار رنڈیاں دیکھیں اور کسی نہ کسی وجہ سے ہر ایک کو رد کر دیا۔ بالآخر رنڈیوں کی دلالہ ہی ان کو بھا گئی — منٹو، باری اور بلونت گارگی تینوں ناؤنوش میں شامل ہوئے لیکن دادِ عیش صرف منٹو نے دی۔

اقتباس پیش ہے:

''ہم تینوں ایک اعلیٰ پشاوری تانگے میں بیٹھے۔ میں اور باری اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ اور منٹو عادت کے مطابق زری والی جوتے پہنے ہوئے پچھلی سیٹ پر ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔

تانگہ مال روڈ پر دوڑنے لگا۔ بڑے ڈاک خانہ کو پار کر کے رکا اور باری نیچے اترا۔ منٹو نے بٹوا نکالا اور اس میں سے ایک سبز نوٹ اسے دیا۔ باری شری بھولا ناتھ کی دکان پر گیا۔ ہم دونوں تانگے ہی میں بیٹھے رہے۔ دس منٹ گزر گئے۔ منٹو نے پنجابی سے کہا: یہ جاہل میرا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اتنی دیر؟ کیا ہیرے خرید رہا ہے؟ بکواس! — اتنے میں باری نظر آیا۔ وہ بھاری تیز قدموں سے چلتا ہوا تانگے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں جانی واکر کی بوتل کا لمبا ڈبہ تھا۔

منٹو نے پوچھا: ''ٹھیک ہے؟''

باری بولا: ''ہاں''۔

تانگہ پھر سرپٹ دوڑنے لگا۔ ہم میوزیم اور گورنمنٹ کالج کے سامنے سے ہو کر راوی روڈ پر جا رہے تھے۔

---

[1] شورش کاشمیری ''چند یادیں'' (مضمون)

کیا یہ لوگ بوٹنگ کیلئے جا رہے تھے؟ شام ڈھل چکی تھی۔ بتیاں
جل چکی تھیں۔ یہ کہاں جا رہے تھے؟ مجھے بالکل پتہ نہیں تھا کہ
ان کی منزل ہیرا منڈی ہے جہاں طوائفوں کے چکلے تھے۔

شاہی مسجد کے نزدیک بازار میں تانگا رکا۔ باری نے
تانگے والے کو پیسے دیے اور ہم تینوں حسن کے بازار میں داخل
ہوئے۔ میں اس سے پہلے کبھی ادھر نہیں آیا تھا۔ اس کی وجہ کوئی
اخلاقی پابندی نہیں تھی۔ مجھے یونہی رنڈیوں اور دلالوں کے کسی
ماحول سے ڈر لگتا تھا۔۔۔ لیکن اس وقت منٹو میرے ساتھ تھا اس لئے
مجھے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی مگر مچھ کی پیٹھ پر دریا کی سیر کرے۔

بازار میں چہک اور گہما گہمی تھی۔ سیخ کباب، پان،
پھولوں کے ہار اور تماش بینوں کی رونق۔ اس گہما گہمی میں
عجیب سر سراہٹیں خاموش اشارے اور گھورتی ہوئی نظریں
تھیں سودے بازی کا کام خاموشی سے چل رہا تھا۔ پٹھان کے
مہندی رنگے مچھے دکھائی دیے پھر وہ دونوں ہمارے پاس
آئے اور باری نے رنڈی کا ریٹ طے کرنے کی بات کی۔

منٹو غصہ سے بولا۔ ''تو خود ہی معاملہ سیٹل کر۔
بیوقوف جا''۔ منٹو کو اس قسم کی سودے بازی بری لگتی تھی۔

اتنے میں باری اور پٹھان آگئے۔

پٹھان بولا: ''چلو اس کوٹھے پر بہت چنگا مال ہے۔

ہم چاروں سیڑھیاں چڑھ گئے۔ بالکنی لانگھ کر کمرہ
میں داخل ہوئے تو ایک پٹھان رنڈی بیٹھی ہوئی تھی۔ ۳۵ رسال
کے لپیٹے میں تھی۔ چہرے کے نقش موٹے۔ اس کے بالوں میں
تیل لگا ہوا تھا اور ان میں چمکیلی کلیاں۔۔۔ گھٹیا ریشم کی نیلے رنگ
والی قمیض، ساٹن کی شلوار اور منہ میں پان کا بیڑا۔

''آؤ بیٹھو''۔

پٹھان بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس کا گل مچھوں والا
سخت چہرہ نرم لگنے لگا۔ وہ بہت حلیم تھا اور حکم کا بندہ، وہ چکلے
کے اس اڈہ کی رنڈیوں کا چیف دلال تھا۔

منٹو نے ایک نظر سے ہی اس رنڈی کے تھل تھل
کرتے ہوئے جسم کو دیکھا۔

ایک نوکر آیا اور اس نے تین گلاس رکھ دیے۔

منٹو بولا: ''سوڈا منگواؤ اور کھانے کیلئے تکے و
کباب۔۔۔ تو کیا کھائے گا؟''

میں ان دنوں میٹ نہیں کھاتا تھا۔ دو ایک مرتبہ میٹ
کھانے کی کوشش کی تھی لیکن چبایا تو ربڑ جیسا لگا۔ میں نے کہا: میں
آملیٹ کھاؤں گا''۔ منٹو نے جیب میں سے دس دس روپے کے تین
کرا کے نوٹ نکالے اور پٹھان کو دیے۔ دس منٹ بعد وہ اور اس کا
نوکر میٹ، کباب، اور آملیٹ کی پلیٹیں لے کر اوپر آگیا۔ ساتھ ہی

سوڈے کی بوتلیں اور برف۔ ایک پلیٹ میں لیموں اور پیاز۔۔
اس نے باقی پیسے واپس کیے تو منٹو نے کہا: "رکھ لے انہیں"۔

باری نے بوتل کھولی اور تین گلاسوں میں شراب ڈال کر سوڈا اور برف ڈالی۔

میں نے کہا: "میں نہیں پیتا"۔

باری کے سانولے چہرے پر مسکراہٹ آئی: "بھئی شراب تو پینے کی چیز ہے، پی لے"۔

منٹو بولا: "یہ نہیں پیتا"۔

پھر وہ رنڈی کے پٹ (ران) پر دھپا مار کر بولا: "تو پی لے میری جان"۔

رنڈی نے ترچھی آنکھوں سے منٹو کی طرف دیکھا اور موٹی مسکراہٹ چھینکی۔ پھر گلاس اٹھا کر پینے لگی۔

منٹو اور باری نے فوراً ہی اپنے گلاس خالی کر دیئے۔ پھر ڈبل پیگ تیار کیے۔

گھونٹ بھر کر منٹو نے کہا: "اب مال دکھاؤ"۔

رنڈی نے پٹھان کو اشارے سے کچھ کہا۔ پٹھان تھوڑی دیر بعد ایک پتلی دبلی رنڈی اندر لے آیا۔

وہ سامنے بیٹھ گئی۔ منٹو نے اسے غور سے دیکھا۔ میں بھی اسے بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ پتلی دبلی، چہرہ پر گلال تھپا ہوا۔ آنکھوں میں بہت زیادہ کاجل۔ جارجٹ کی جامنی ساڑی۔ اس نے مسکرا کر پوچھا:

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" "تیری ماں کے گاؤں سے"۔ منٹو بولا: "تو کہاں کی ہے؟" منٹو نے دو تین سوالوں کے بعد رنڈی رد کر دی۔

پٹھان کے اشارے سے وہ چلی گئی۔ اس کے بعد وہ دوسری لایا۔ پھر تیسری۔ تینوں ہی منٹو کو پسند نہ آئیں۔ پھر چوتھی رنڈی آئی۔ تیکھے نقش، چہرے پر پھیکی مسکراہٹ اور آنکھوں پر کالا چشمہ۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی، جیسے نماز پڑھتے ہیں۔۔ منٹو کو اس کا یہ پوز اور اسٹائل اچھا لگا۔ دو چار سوال کیے جس کے رنڈی نے نخرے کے ساتھ جواب دیئے۔ منٹو کی دلچسپی بڑھی لیکن ساتھ ہی ایک اور جذبہ بھی کام کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا: "یہ کالا چشمہ رات کے وقت کیوں لگا رکھا ہے میری جان؟"

اس نے کہا: "آپ کے حسن سے میری آنکھیں کہیں چندھیا نہ جائیں"۔

منٹو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:
"میری جان تیرے ساتھ بہشت میں بڑا مزہ آئے گا۔ لیکن پہلے دیکھ تو لوں تو ہے کیا؟"

یہ کہہ کر اچانک اس کا کالا چشمہ اتار لیا۔ رنڈی نے
آنکھیں جھپکیں۔ ایک آنکھ بھینگی تھی۔

منٹو بولا: ''اگر تو چشمہ کے بغیر ہوتی تو میں ضرور تجھ
سے محبت کرتا۔ تیری اس بھینگی آنکھ پر قربان ہو جاتا۔ لیکن
چوری میں برداشت نہیں کر سکتا''۔ یہ رنڈی بھی رد کر دی گئی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میٹ، کباب اور
آملیٹ تین بار آ چکے تھے۔ منٹو پانچ پیگ پی چکا تھا۔ اس کی
آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ لیکن اس کی باتوں میں وہی
تخیل اور رنگینی تھی۔

وہ چھٹا پیگ ڈالنے لگا تو رنڈی نے کہا۔ ''اور نہ
پیئو۔'' اس کے انداز میں ہمدردی تھی۔

منٹو نے بوتل اٹھائی تو رنڈی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا:
''تمہیں میری قسم اور نہ پیو''۔ یہ ٹھیک کہتی ہے — اس کو
ہمدردی ہے۔

وہ بولا: ''ہمدردی۔ سالی چار پیگ بچانا چاہتی
ہے۔ اپنے دلال کیلئے۔ اگر صاف کہہ دے تو میں اس کیلئے
بوتل منگوا سکتا ہوں۔ یہ حرامزادی ڈھونگ رچاتی ہے''۔

اس نے پیگ بھرا اور گھونٹ کا مزہ لینے لگا۔

''اللہ جانتا ہے تم بہت اچھے لگتے ہو''۔

منٹو نے اس کے پیٹ پر دھپ مارا: ''میری جان: تو
دنیا کی سب عورتوں سے حسین ہے۔ تو کلوپیٹرا ہے۔ ہیلن ہے......''

......منٹو کی روح میں عجیب ویرانگی تھی۔ وہ رنڈیوں
کی دنیا میں رہتا ہوا بے تعلق تھا۔ لیکن وہ ان چھلکوں میں چھپی
ہوئی انسانیت اور رنڈی کے دل میں بسی عورت کو دیکھتا تھا۔ وہ
روح کا بیوپاری تھا''۔[1]

منٹو وہیں رہ گئے۔ باری اور بلونت گارگی واپس
چلے آئے۔ منٹو نے اپنے نوٹوں کا بٹوا احتیاطاً بلونت گارگی کو
دے دیا جو انہوں نے اگلے روز منٹو کو آل انڈیا ریڈیو کے
آفس میں لوٹا دیا۔

اقتباس طویل سہی، لیکن یہ منٹو کی جنسی زندگی پر بصیرت افروز روشنی
ڈالتا ہے۔ آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ منٹو کو اپنے معاشرے کے اس طبقے سے
لگاؤ تھا جسے ہمارا سماج نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر منٹو اس
طبقے کے شب و روز اور کیف و کم سے آگاہ نہ ہوتے۔ اگر وہ ''رنڈی میں
عورت اور عورت میں رنڈی'' کی تلاش نہ کرتے تو بلاشک وشبہ ان کے بہت
سے شاہکار معرضِ وجود میں نہ آتے ''ہتک''۔ ''کالی شلوار''۔ ''ممی''۔
''خوشیا''۔ وغیرہ سب اس بات کا بین ثبوت ہیں۔

---

[1] بلونت گارگی 'سعادت حسن منٹو' مجموعہ ''حسین چہرے''۔
روزنامہ ہند سماچار' جالندھر' ۶؍ اپریل ۱۹۸۶ء

رئیس الدین فریدی ۔

جگر مراد آبادی کے مُعاشقے

مدیر انشاء اعجاز صاحب اپنے رسالے میں جو جدتیں کر رہے ہیں ان میں ان کا ساتھ دینا مجھ جیسے بوڑھے کے لئے بڑا مشکل کام ہے مگر ان کا اصرار ہے کہ اس ادبی جدت میں حصہ لینا ضروری ہے۔ لہٰذا قلم اٹھانے پر مجبور ہونا ہی پڑا۔ لیکن یہ معذرت بھی ضروری ہے کہ میں اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھ سکتا کیونکہ میرا بچپن مذہبیت کی سخت جکڑ بندیوں میں گزرا۔ ذرا ہوش آیا تو روٹی کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ وہ بھی اس طرح کہ رات بھر جاگنا، دن بھر سونا۔ ایسا آدمی تو خواب میں بھی عشق نہیں کر سکتا۔ ایک معقول بیوی ضرور ملی مگر وہ بھی اپنی تین ماں بہنوں کی کوشش سے۔ بیوی سے عشق ہو بھی تو اسے عشق نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ گھر کی مرغی دال برابر۔ اور کھینچ تان کر عشق کہہ بھی لیں تو اس کا انجام غیر عاشقانہ ہی ہوتا ہے۔ بقول حضرت اکبرالہٰ آبادی۔

عاشقی قیدِ شریعت میں جب آجاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

لہٰذا اہل دل اہل نظر اور اہل عقل عشق اسی کو کہتے ہیں جو جلوۂ کثرت اولاد سے خالی ہو اور اس کو عشق آزاد کہا جاتا ہے۔ اور اس کی تائید میں بڑی باریک دلیلیں دی جاتی ہیں۔ مثلاً عیسائیت کا یہ اصول کہ خدا محبت ہے اور محبت خدا ہے۔ اور یہ حدیث قدسی بھی پیش کی جاتی ہے کہ اللّٰہ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَال۔ آگے چلیں تو ہمہ اوست کا فلسفہ سامنے آتا ہے اور کائنات کی ہر چیز سے عشق لازم آجاتا ہے جس میں عورت بھی یقیناً شامل ہے۔ کیونکہ اسے صانع قدرت کی سب سے حسین تخلیق کہا جاتا ہے۔ اور آگے چلیں تو عشق حقیقی اور عشق مجازی میں دامنِ عقل الجھ جاتا ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو مجازی، حقیقی پر غالب نظر آتا ہے۔ حافظ شیرازی عشق کرتے ہیں تو پہلی منزل میں ہی کہہ اٹھتے ہیں۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اس کے سیکڑوں برس بعد اردو کے ایک استاد نے کہا۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

خیر، ان شاعرانہ خیالات کو تو کھینچ تان کر عشق حقیقی کے خانے میں پہونچانا ممکن ہے مگر اردو شاعری میں اس کے برعکس مثالوں کی بھی کمی نہیں۔ یہ

انیس نے بڑی احتیاط سے کام لیا پھر بھی یہ کہنے سے نہ چوکے۔

خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو
درود کیوں نہ پڑھیں دیکھ کر حسینوں کو

مگر ٹوٹے ہوئے باندھ کے پانی کو کون روک سکتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

؎ خدایا کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں
کہ ہر صورت کلیجے سے لگا لینے کے قابل ہے

؎ اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

؎ جو آیا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اور حضرت غالبؔ نے تو کمال ہی کر دکھایا۔

؎ دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اور جب امیر مینائی جیسے پاکباز انسان پر عشق کا غلبہ ہوا تو کیا کہا۔

؎ باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہے ایک کم سن کے لئے

اور اردو پر ہی کیا موقوف ہے سارا مشرقی ادب جس میں ہندی، عربی، فارسی بھی شامل ہے اسی قسم کے خیالات اور جذبات کا حسین گلدستہ نہیں بلکہ چمن نظر آتا ہے اور ہر جگہ عشق مجازی کے پھول نظر نواز ہوتے ہیں۔ اور لفظوں ہی پر کیا موقوف ہے عمل کی جاں نواز مثالیں بھی کچھ کم نہیں۔ جیسے ع

جاگیں ہم اور ان کو جگائیں تمام رات

الغرض عشق مشرقی زندگی کی جان ہے اور وہ زیادہ تر عشق مجازی ہی ہوتا ہے۔ ادیبوں کے لئے تو عشق جلائے ذہن وطبیعت اور آسودگی جان کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اس معاملے میں مجھ جیسے بدقسمت شاذ و نادر ہی ہوں گے۔ میں عشق سے بھلے ہی دور رہا مگر عاشق مزاج ادیبوں کے قریب ضرور رہا۔ اس لئے کس کس کے نام گناؤں اور کس کس کا پردہ فاش کروں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب انشاء نے ان کو خود ہی اپنے رازہائے درون پردہ فاش کرنے کے لئے آمادہ کرلیا ہو۔ دیکھنا چاہئے۔ ع

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

میں نے جو کچھ دیکھا یا مانند دیدہ سنا اس کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ ڈاکٹر محمد اشرف، سبط حسن، سلیمان اریب، کرشن چندر، ساغر نظامی۔ مرحومین میں اور ظ۔ انصاری، کیفی اعظمی، حسینی شاہد، وشوامتر عادل جام جہاں کے بادہ نوشوں میں سے ان ہی میں شامل ہیں۔ بزرگان سلف میں بھی کئی نام نمایاں ہیں جیسے حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، مولانا شبلی، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر اقبال۔ مگر ان سب کی نجی زندگی پر ڈاکہ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ نہ معلومات مکمل ہونے کا دعویٰ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے جگر صاحب کے متعلق کچھ لکھنے کی ہمت کی ہے وہ بھی اس وجہ سے کہ معلومات بھی کچھ زیادہ ہیں۔ اور

ان کا بیشتر حصہ خود جگر صاحب کا بیان کیا ہوا ہے۔ جب کسی بے تکلفی یا گستاخی کے عالم میں ان سے کچھ پوچھا جاتا تھا وہ دبے دبے لفظوں میں کچھ نہ کچھ بتا دیا کرتے تھے۔ ویسے ان کے متعلق حسینوں کے عشق کے کئی جھوٹے افسانے بھی لکھے اور چھپوائے گئے ہیں مگر ان سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ میں وہی لکھوں گا جس کا جگر صاحب کے قریبی عقیدتمندوں کو ذاتی طور پر علم ہے اور یہ علم ان ہی کا ودیعت کیا ہوا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان کے سارے ادیب مرض عشق میں مبتلا نہیں پائے گئے۔ ان میں ایک نہایت محترم نام سجاد ظہیر کا بھی ہے جو زندگی بھر نہایت محتاط رہے۔ چاہے قیام ہندوستان میں ہو یا سبل الحصول عشق کے مرکز انگلستان میں۔ حالانکہ ان کی شخصیت بڑی ہی دلکش تھی۔ اس کی گواہ کوئی اور تو کیا ان کی قابل قدر اہلیہ رضیہ باجی بھی تھیں۔ اور ان دونوں کا یہی حال تھا کہ ع

قدر گوہر شہ بداند یا بداند جوہری

عمر خیامؒ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو

آں کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو

میرے خیال میں سجاد ظہیر ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے خیام کے اس سوال کو غلط ثابت کر دکھایا۔

خیر۔ آمدم بر سر مطلب۔ حضرت جگر مرادآبادی ادام اللہ فیضہ' کو اگرچہ قدرت نے حسن ظاہری عطا کرنے میں انتہائی بخل سے کام لیا تھا مگر ان کے دل و دماغ اور روح میں حسن خیال، حسن تخیل، حسن بیان اور حسن پرستی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اپنی شاعری کی امتیازی خصوصیت کیا ہو سکتی ہے تو انہوں نے حسب عادت شرماتے لجاتے اور الفاظ کو ناپ تول کر ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں حسن و عشق کی توہین کو گوارا نہیں کرتا۔ ان کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہوں۔ یہاں تک کہ رقیب کا ذکر بھی اہانت کے ساتھ نہیں کرتا ہوں۔ ان کا یہ بیان ان کے کلام کی کسوٹی پر بھی پورا اترتا ہے۔ انہوں نے اظہار عشق و محبت والہانہ اور جذباتی انداز میں کیا ہے مگر بازاری انداز اختیار کرنے سے پرہیز اور احتیاط ملحوظ رکھی ہے۔ جگر صاحب کے کلام پر کوئی تبصرہ اس وقت میرے دائرۂ تحریر سے باہر ہے اس لئے صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

عشق ہی تنہا نہیں آشفتہ سر میرے لئے

حسن بھی بے تاب ہے اور کس قدر میرے لئے

جگر صاحب نے پہلا عشق نوجوانی ہی میں مرادآباد کی ایک انتہائی حسین طوائف سے کیا تھا۔ جو عرف عام میں پنجابن کہلاتی تھیں۔ وہ زیادہ دنوں نہیں چلا کیونکہ یا تو وہ مرادآباد سے چلی گئیں یا جگر صاحب کی شاعری کی بڑھتی ہوئی شہرت اور سارے ملک خصوصاً اتر پردیش کے مشاعروں میں شرکت اور چشمہ فروشی کے کام کی وجہ سے وہ مرادآباد میں بندھ کر نہ بیٹھ سکے۔ پھر بھی ابتدائی کلام میں جو والہانہ جذبات حسن و عشق پائے جاتے ہیں وہ بڑی حد تک پنجابن ہی کی دین معلوم ہوتے ہیں۔

جب وہ چشمے کے کاروبار کے سلسلے میں آگرے میں مقیم ہوئے تو
وہاں ایک طوائف سے باقاعدہ نکاح بھی کرلیا۔ اور واقف حال لوگوں کا بیان
ہے کہ جگر صاحب نے شعر پڑھنے کی جو دھن اختیار کی وہ راگ اساوری میں
ہے اور اس کی مرتبہ یہی صاحبہ تھیں۔ ابتدا میں یہ تعلق بھی نشیب و فراز سے
دوچار ہوا۔ بیچ میں ناچاقی ہوئی تو جگر صاحب نے ایک نظم ہلال عید لکھی جس
میں ہجر کی بیقراری کا اظہار ہے۔ انہی دنوں ایک غزل میں بھی اس واقعے کا
ذکر کیا جس کا مطلع ہے:

دیکھا جو ان کے ہاتھ میں دشمن کا ہاتھ ہے
کچھ سوجھتا نہیں مجھے دن ہے کہ رات ہے

ان کے مجموعۂ کلام ''شعلۂ طور'' میں بھی اسی سلسلے کی ایک غزل ہے
جس پر انہوں نے حسب ذیل نوٹ بھی لکھا ہے:
''یہ مسلسل غزل یا نظم میری حیات معاشقہ کے ایک اہم اور بہت ہی
دردانگیز واقعے سے متعلق ہے''۔
اس کے چند شعر۔

اف یہ تیغ آزمائیاں توبہ — اس کی نازک کلائیاں توبہ
غیظ سے ابروؤں پہ وہ شکنیں — دل پہ زور آزمائیاں توبہ

مگر اس کے بعد کے اشعار میں ''تیغ آزمائیوں'' سے گریز بھی
موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے بعد صلح بھی ہو رہی ہے۔
وہ کہتے ہیں۔

ناگہاں آمد آمد محبوب — غم کی بے انتہائیاں توبہ
یک بیک آنکھ چار ہو جانا — دیر تک رونمائیاں توبہ
پھر وہی چشم دست و جام بدست — پھر وہی نغمہ زائیاں توبہ

مگر یہ سلسلہ دراز ہے۔
جب موصوفہ سے باقاعدہ نکاح ہوگیا تو ایک اور غزل میں بھی اس کا
ذکر کیا جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اف وہ روئے تابناک وہ چشم تر میرے لئے
ہائے وہ زلف پریشاں تاکمر میرے لئے
حیف وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم میری طرف
ہائے وہ دزدیدہ دزدیدہ نظر میرے لئے
سامنے آتے ہی آتے وہ تنفس تیز تیز
سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لئے
اف وہ کہنا اس کا پھر بانہوں میں بانہیں ڈال کر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

جگر صاحب کی اس خانہ آبادی کی مدت دراز نہیں رہی کیونکہ ان
کی اہلیہ کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سانحے کا انہوں نے
اپنے اشعار میں کس طرح ذکر کیا۔ کیا تو ضرور ہی ہوگا۔
جگر صاحب کا قیام جن مقامات پر رہا ان میں مین پوری بھی شامل
ہے۔ وہاں وہ ایک وکیل صاحب کے گھر پر قیام کیا کرتے تھے جو صبح سے شام

تک عدالتوں میں رہتے تھے جس سے جگر صاحب کا سارا دن بے لطفی میں گزرتا تھا۔ اس لئے وکیل صاحب نے ایک دن ان کا تعارف ایک طوائف سے کرا دیا تاکہ وہ وہاں غم غلط کرتے رہیں۔ اس طرح اس طوائف سے بھی کافی راہ و رسم ہوگئی اور شکوہ و شکایت کی نوبت بھی آتی رہی۔ یہ سلسلہ کافی دنوں چلا۔ جگر صاحب نے اس کوٹھے کا نام طور رکھ چھوڑا تھا اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کا مجموعہ ''شعلۂ طور'' یہیں مرتب کیا اور اسی وجہ سے اس کا نام 'شعلۂ طور' رکھا۔

کمال عشق: جگر صاحب شراب کے رسیا تھے۔ اس لئے خود ہی کہا ہے۔

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

جن لوگوں کو جگر کے شعروں نے مارا ان میں ملک کے ایک بڑے ذی علم، صوفی منش اور میرے نزدیک مومن کے طرز کے بہترین غزل گو اصغر گونڈوی بھی تھے جو الہ آباد میں ہندوستانی اکادمی میں کام کرتے تھے۔ جب جگر صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے ان کو شراب کی مار سے نجات دینے کی سعی بلیغ شروع کی۔ یہاں تک کہ اپنی حسین و جمیل اور نہایت سلیقہ شعار سالی نسیمہ خاتون سے ان کا نکاح بھی کر دیا۔ وہ جگر کو لاابالی زندگی سے مہذب زندگی میں اور ان کی شاعری کو جذباتی اور مقبول عوام شاعری کی دلدل سے نکال کر معیاری اور تعمیری راہ پر ڈالنا چاہتے تھے۔ جگر صاحب کو نسیمہ صاحبہ سے بے انتہا محبت تھی۔ اس کی وجہ ان کی خوش روئی کے علاوہ خوش خلقی، خوش سلیقگی اور صبر و تحمل کی عادت بھی تھی۔ اس شادی کے بعد ہی جگر صاحب گونڈے کے ہوگئے تھے مگر نسیمہ کی محبت اور گھریلو ذمے داریاں بھی ان کو شراب کے عذاب سے نجات نہ دے سکیں۔ حالانکہ خود انہی کا بیان ہے کہ جب میں نسیمہ کو بڑی مشکل سے دال روٹی پکانے کا انتظام کرتے' کپڑوں اور بستروں میں پیوند لگاتے دیکھتا تھا تو میرا دل بھر آتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ میں شراب خود نہیں پیتا تھا۔ میرے شعروں کے رسیا پلا دیتے تھے اور ہمیشہ بھی نہیں پیتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے دورے پڑتے تھے۔ اور ہفتوں غرق رہتا تھا۔ ایک دن جب میں نے ان سے سوال کیا کہ کیا شراب چھوڑنے سے آپ کی شاعری متاثر ہوئی ہے تو ان جواب یہ تھا کہ ذرہ بھر بھی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں شراب کے نشے میں شعر کہتا ہی نہیں تھا۔ شعر ہمیشہ بسلامتی عقل و ہوش کہتا تھا۔ کچھ غزلیں ایسی ضرور ہیں جو نشے کی حالت میں لکھیں اور ان میں سے ایک وہ بھی ہے جس کا ایک شعر ہے۔

اے محتسب نہ پھینک میرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

یہ بھی ایسے عالم میں جب محبوبہ مجھے شراب پینے سے روکنے پر بضد تھی۔

جگر صاحب کے کلام کا بڑا حصہ ان کی زندگی کے واقعات، سانحات اور تجربات پر مشتمل ہے مگر اسے مرتب کرنے میں دشواری یہ ہے کہ انہوں نے کلام کے ضبط تحریر میں لانے کے مقامات تو لکھ دیئے ہیں مگر تاریخیں

اڑا گئے ہیں۔ اگر یہ کمی نہ ہوتی تو ان کے کلام سے ان کے حالات زندگی مرتب کرنے میں بڑی مدد ملتی۔

جگر صاحب کی طبیعت میں تضاد بھی تھا۔ ایک طرف وہ رند بلانوش اور حسن کے دیوانہ وار پرستار تھے تو دوسری طرف ان میں روحانیت کا عنصر بھی موجود تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ سرمستی اور وارفتگی کے عالم میں بھی بزرگان دین کے بڑے عقیدتمند رہے۔ غزلوں کے ساتھ نعت بھی بڑی پر اثر لکھتے تھے۔ اپنے مرشد قاضی سید عبدالغنی منگوری کے بھی بڑے گرویدہ تھے اور غزلوں میں بھی ان سے اظہار عقیدت کرتے رہتے تھے۔ ان کے انہی اوصاف نے حضرت اصغر کو بھی خوش عقیدہ اور ان کا مطیع ومعتقد بنا دیا تھا جس کا اظہار ان کے بہت سے شعروں میں بھی موجود ہے۔

کیا دن تھے جگر وہ دن جب صحبت اصغر میں
سرور طبیعت تھی مسرور مرا دل تھا

خیر۔ جب حضرت اصغر کی نسیمہ کے ذریعے جگر کو سدھارنے کی ترکیب ناکام ہوئی تو انہوں نے آخری وار کرنے کی ٹھان لی۔ جگر صاحب سے یہ کہہ کر کہ تم نسیمہ کے لائق نہیں ہو اُن سے طلاق دلوا دی اور اپنی اہلیہ کو طلاق دے کر خود نسیمہ سے نکاح کر لیا۔ اس طرح جگر کا دل چور چور ہو گیا مگر کیا کرتے۔ اپنے مربی اور سرپرست کے سامنے بے بس تھے پھر بھی شراب نہ چھوٹی۔ اس واقعے کو برسوں گزر گئے۔ یہاں تک کہ اصغر صاحب کا آخری وقت آ پہنچا۔ اور وہ یہ وصیت کر گئے کہ جگر جب بھی شراب سے توبہ کر لیں نسیمہ سے ان کا نکاح کر دیا جائے۔ اب جگر صاحب کے اندر کا انسان بھی جاگ اٹھا اور انہوں نے شراب ہی کیا ساری برائیوں سے توبہ کر لی اور پھر نسیمہ سے نکاح بھی ہو گیا۔

وثوق کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ نسیمہ کی جدائی کے بعد انہوں نے کوئی نظم یا غزل کہی یا نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ غزل اسی وقت کی ہو سکتی ہے۔

یاد ہیں اب تک جگر وہ بیقراری کے مزے
درد پیہم کی لگاوٹ زخم کاری کے مزے
وہ جبین شوق اپنی وہ کسی کے پائے ناز
سجدہ ریزی کی لطافت اشکباری کے مزے
حُسن کی سرشاریاں خواب جوانی کی بہار
عشق کی بے تابیاں شب زندہ داری کے مزے

(تا آخر)

اور یہ غزل بھی جس کے چند اشعار ہیں:

آنکھوں میں بس کے دل میں سما کر چلے گئے
خوابیدہ زندگی تھی، جگا کر چلے گئے
میری حیات عشق کو دے کر جنون شوق
مجھ کو تمام ہوش بنا کر چلے گئے
لب تھرتھرا کے رہ گئے لیکن وہ اے جگر
جاتے ہوئے نگاہ ملا کر چلے گئے

تجدید نکاح کے بعد جو غزل کہی وہ تو تجدید ملاقات کے عنوان سے معروف و مشہور ہے اور اس کے چند شعر ہیں:

مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم
خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم
نظروں سے وہ معصوم محبت کی تراوش
چہرے پہ وہ مشکوک خیالات کا عالم
تا صبح وہ تصدیق محبت کے نظارے
تا شام وہ پھر فخر و مباہات کا عالم

اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ اصغر صاحب نے نسیم سے نکاح نہیں کیا تھا بلکہ جگر سے الگ کر کے اپنے گھر مقیم کر لیا تھا اور اس کا ثبوت یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کی پہلی اہلیہ اس کے بعد بھی انہی کے ساتھ رہیں۔ اگرچہ بظاہر ''خادمہ'' کی حیثیت سے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آخری دنوں میں جگر صاحب کو صرف دو ہی فکریں رہا کرتی تھیں۔ ایک گونڈے کے اصغر میموریل کالج کے لئے سرمایہ فراہم کرنا۔ دوسرے نسیم کے لئے کچھ سہارا چھوڑ جانا۔ پتہ نہیں وہ ان ذمے داریوں کو کس حد تک پورا کر سکے۔

490

سلویجا نیرس

مترجم: ف۔س۔ا

بیس روپے ☆

جب کہ بستی میں آچکی ہے خزاں
تیری خاطر میں لائی گلدستے
تجھ کو ڈھیروں گلاب پتیوں کی
بیس روپیوں کی اک رقم کے لئے

سرخ ہیں اور کچھ سفید بھی ہیں
سب کے سب خوشنما بڑے پیارے
تھک گئی، بھوک سے نڈھال ہوں میں
بیس روپیوں کی اک رقم کے لئے

آنسوؤں سے پونچھ لیتی ہوں
چند نمکین اشک کے قطرے
اپنی آواز فروخت کرتی ہوں
بیس روپیوں کی اک رقم کے لئے

راستہ چلتے لوگ بھی چپ ہیں
بجھ گئے میری آرزو کے دیے
صبح سے میں بھٹک رہی ہوں یہاں
بیس روپیوں کی اک رقم کے لئے

بھاری پلکیں اٹھا نہیں سکتی
اس اذیت کا کیا پتہ تھا مجھے
زندگی تجھ سے ہو رہی ہوں جدا
بیس روپیوں کی اک رقم کے لئے

محمد عابد شمس مراد آبادی

روشن فاطمہ اور جگر مراد آبادی

زیر نظر مضمون میں جگر صاحب کی جو داستانِ محبت بیان کی گئی ہے وہ بعض لوگوں کو چھوڑ کر باقی تمام قارئین کے لئے بالکل نئی ہوگی۔ رئیس المتغزلین حضرت جگر مراد آبادی کے جاننے والے تو بہت ہیں لیکن سید علی سکندر جگر کے جاننے والے بہت ہی کم ہیں۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب حضرت جگر مراد آبادی ''رئیس المتغزلین'' کی حیثیت سے دنیا کے سامنے نہیں آئے تھے۔ شمس صاحب جگر صاحب کے ہم وطن ہی نہیں ہم محلہ بھی ہیں۔

(مرسلہ: وہاب تسنیم، بیلاور)

اب آپ جگر صاحب کی داستانِ عشق سنئے، جو میں نے اپنی ایک بزرگ خاتون (جن کا پندرہ سال پہلے کم و بیش سو سال کی عمر میں انتقال ہوگیا) سے سنی۔ انہوں نے کہنا شروع کیا:

عابد، ہم عورتیں جب کسی کی خوبصورتی کا ذکر کرتی ہیں تو یوں کہتی ہیں: سینکڑوں میں ایک۔ ہزاروں میں ایک۔ لاکھوں میں ایک۔ روشن فاطمہ کے بارے میں کیا بتاؤں۔ ایسی حسین عورت ہم نے آج تک نہیں دیکھی۔ ہاں کہانیوں میں ضرور سنا ہے۔ جگر کی محبوبہ روشن فاطمہ سچ مچ ایک حور تھی۔ جگر کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ (بعد کو کثرت شراب نوشی نے رنگ کو بجھا کر کالا کر دیا تھا)، تیکھے نقوش اور طبیعت کا ایک عجیب عالم۔ وہ اس زمانہ میں، ایس۔ یم عاقل اینڈ سنز کا ایجنٹ (ٹریولنگ ایجنٹ) تھا۔ روشن فاطمہ آگرہ کے ایک روشن خیال گھرانے کی لڑکی اور ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی بیٹی تھی۔ جگر کو دیکھا اور دل ہی دل میں اس کی پوجا کرنے لگی۔ جگر کے شاعرانہ انداز اور جادو بھری آواز کا جتنا بھی اثر ہوتا وہ کم تھا۔ کچھ دن گزرے تھے کہ روشن فاطمہ کے دل میں محبت کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑکنے لگی۔ دنیا کو ہمیشہ ایسے ملاپ سے بیر رہا ہے۔ آخر لوگوں نے دونوں کے درمیان جدائی کی دیواریں کھڑی کرنا شروع کیں۔ لیکن ان دیوانوں کے آگے کسی ایک کی نہ چل سکی۔ اور جب خاندان والے روشن فاطمہ کو کسی طرح بھی جگر سے وابستہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو جگر کی پگلی محبوبہ نے اپنے محبوب کی خاطر ہمیشہ کے لئے گھر کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ جگر کی ذات میں گم ہوگئی تھی۔ اسے دنیا اور دنیا والوں کا ہوش نہ تھا۔ محبت کرنے والی ہو تو ایسی ہو۔ وہ جگر کی ذات، اس کی شاعری، اس کی آواز، اور اس کے انداز پر جان دیتی تھی۔ آخر روشن فاطمہ تمام بندھن توڑ کر اور سب کچھ چھوڑ کر جگر کی باہوں میں آکر چھپ گئی اور یہ دونوں گھومتے پھرتے ریاستِ

خیرآبادی کے گھر پہنچے۔ وہاں انہوں نے چار دن بھی سکون سے گزارے تھے کہ ریاض خیرآبادی کو تمام حالات کا علم ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ معاملہ پولیس تک پہنچ گیا ہے۔ آخر انہوں نے بلطائف الحیل اس جوڑے کو رخصت کر دیا۔ اب ان دونوں نے مرادآباد کی راہ لی اور یس۔ یم عاقل کو اپنا رازدار بنا کر ان سے مدد چاہی۔ انہوں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ اپنے گھر کے دروازے ان کے لئے وا کر دیئے۔ یہ مکان جس میں اس وقت یس۔ یم عاقل رہتے تھے، محلہ رفعت پورہ میں روشن صدیقی صاحب کے مکان کے بالکل قریب واقع ہے۔

بزرگ خاتون نے مجھ سے کہا۔ جگر بڑا ہی معصوم تھا۔ وہ تو اب بھی اتنا ہی معصوم ہے۔ وہ سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ جس پر اعتماد کیا، وہی شخص کا آستین سانپ ہو گا۔ یہی حال روشن فاطمہ کا تھا۔ وہ معصوم لڑکی یہی سمجھ رہی تھی کہ ہم ایک محسن کی پناہ میں ہیں۔ اور یہ شخص میرے محبوب کا مخلص دوست ہے۔ اس نے آنے والے دنوں کے لئے نئے نئے خاکے بنائے تھے۔ زندگی کے حسین ترین خواب دیکھے تھے۔ وہ زندگی جب اس کا محبوب، اس کا سرتاج اور سب روٹھے ہوئے عزیز اس کا قصور معاف کر کے اسے گلے لگا لیں گے۔ لیکن معصوم لڑکی کو کیا معلوم تھا کہ حالات کیا سازش کرنے والے ہیں۔

عاقل صاحب نے جب روشن فاطمہ کو دیکھا تو اس پر فدا ہو گئے۔ آدمی ''تاجر'' واقع ہوئے تھے۔ اگرچہ ان کی شادی ہو چکی تھی مگر سوچا کہ اچھی چیز پر کیوں نہ قبضہ جمایا جائے۔ مطلب حاصل کرنے کے لئے ایک منصوبہ بنایا اور اس پر عمل کیا یعنی یہ کہ روشن فاطمہ کے والدین کو ایک خط لکھا کہ ''آپ کی بیٹی میری حفاظت میں ہے۔ آپ باعزت لوگ ہیں۔ پولیس تک بات پہنچانا مناسب نہیں۔ اس میں بے وجہ رسوائی ہو گی۔ آپ یہاں تشریف لے آئیں اور خاموشی کے ساتھ لڑکی کو لے جائیں''۔

یہ دونوں بدنصیب دنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم تھے کہ ایک دن ناگہاں عاقل کے مکان کے سامنے ایک تانگہ آ کر رکا۔ کسی نے اندر آ کر کہا کہ کوئی صاحب آگرہ سے تشریف لائے ہیں۔ یہ روشن فاطمہ کے بڑے بھائی تھے۔ اس کے بعد عاقل صاحب نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جگر کو جن کے وارنٹ آگرہ سے جاری ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا — ''اغوا'' کے جرم میں پولیس کے سپرد کر دیا۔

عاقل صاحب نے روشن کے بھائی کو کئی دن اپنے یہاں مہمان رکھا اور انہیں بتایا کہ ان کی بہن کچھ دن بعد ماں بننے والی ہے۔ اور اپنے آپ کو روشن کے لئے پیش کیا تاکہ مزید رسوائی نہ ہو۔ اور اس حادثہ پر پردہ پڑ جائے۔ روشن کے بھائی ظاہر ہے کہ اس بات کو جانتے تھے کہ عاقل صاحب نے تو ان کے خاندان پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔ یہ تو ان کا ایثار تھا۔ ورنہ اب روشن کو کون قبول کرتا۔ چنانچہ روشن فاطمہ کو عاقل صاحب کے حوالہ کر دیا گیا۔ اب عاقل اپنے دوست کی محبوبہ کے شوہر تھے۔

جگر صاحب سزا بھگت کر باہر آئے تو اس سانحے نے ان کو ہوش سے بیگانہ کر دیا، دنیا ان کی نگاہ میں تاریک ہو گئی۔ باحال تباہ عاقل کے یہاں

اپنی محبوبہ کی خبر لینے آئے۔ وہ منظر بڑا دردناک تھا...... جب علی سکندر جگر دیوانہ وار عاقل کے دروازے سے اپنا سر ٹکرا رہے تھے۔ آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ رات بھر کے جاگے ہوئے، کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ سر کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا جو لکیر کی شکل میں جم گیا تھا۔ اب شراب کے علاوہ اس غم کا کوئی اور علاج نہیں تھا۔ تماشائیوں کا ایک ہجوم ساتھ ہوتا۔ وہ شراب میں دھت کبھی شعر کہتا[1] اور کبھی اس مکان کی دیواروں سے سر پھوڑتا[2]۔ یہ تھا فخر ہندوستان، جگر۔ ایک زمیندار جگر کے اس حالِ زار پر رحم کھا کر اسے اپنے گاؤں لے گیا۔ غالباً سر سید رضا علی مرحوم اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔

بہر حال ادب نواز زمیندار نے جگر کو اپنی ایک وظیفہ خوار طوائف کے سپرد کر دیا جو فن موسیقی میں مہارت ہی نہ رکھتی تھی بلکہ انتہائی خوش گلو بھی تھی۔ یہیں سے جگر نے ان مسحور کن دھنوں میں غزلیں پڑھنا سیکھیں جنہیں سن کر سامعین کو اپنا ہوش نہیں رہتا۔ اور مشاعرے "الٹ" جاتے ہیں۔

روشن فاطمہ — اس نصیبوں جلی کی زندگی ہی کیا؟ جس کی زندگی تباہ کر دی گئی ہو۔ اور فریاد بھی نہ کر سکتی ہو۔ وہ اپنے بھائی کی آمد اور جگر کے خلاف عاقل صاحب کی سازش سے پہلے گلاب کی طرح تر و تازہ تھی۔ اور پھر اس کا بے مثال حسن...... لیکن اب روشن فاطمہ وہ پہلی سی روشن فاطمہ نہ رہی تھی۔ کھانا پینا چھوٹ چکا تھا۔ آنکھیں روتے روتے خشک ہو گئی تھیں۔ اب تو وہ نہ زندوں میں تھی نہ مُردوں میں۔

عاقل ایک معصوم......[3] بن کر دھوکہ دینے میں تو ضرور کامیاب ہو گئے لیکن اپنے فریب خوردہ اور تباہ حال دوست کی محبوبہ کو شکست دے دینا ان کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ انہوں نے روشن کو اپنی بیوی بنا لیا۔ ٹھیک ہے لیکن وہ انہیں شوہر نہ بنا سکی۔ عاقل نے اس حقیقت سے بظاہر سرسری گزرنے کی کوشش کی لیکن ان کے ضمیر کو شکست کا اعتراف کرنا ہی پڑتا تھا۔

روشن نے ایک دن عاقل صاحب کو بلا کر پاس بیٹھنے کو کہا۔ عاقل صاحب اس طرز عمل پر پریشان اور حیران تھے۔ جو قریب بیٹھ گئے۔ روشن نے بڑی سنجیدگی اور ملائمت سے کہا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب میں یہ چاہتی ہوں ترکِ دنیا کر کے خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری کی درگاہ چلی جاؤں۔ اس صورت میں ازدواجی رشتے کو برقرار رکھنے سے کیا فائدہ۔

عاقل صاحب نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا اور انہوں نے ہار مان لی تھی۔ وہ طلاق دینے پر آمادہ نہ ہوئے لیکن انہوں نے روشن کو اجمیر جانے کی اجازت دے دی اس شرط کے ساتھ کہ علی سکندر جگر کو خبر نہ ہو۔ جو دنیا اور اس کے علائق چھوڑ کے ایک گوشۂ تنہائی میں جا رہا ہو اسے سفر کی تیاری ہی کیا کرنا تھی۔ لوگوں نے سنا — روشن فاطمہ اجمیر چلی گئی۔ دن گزرتے رہے اور ایک دن خبر آئی کہ وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔

یہ تھی رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی کی عورت، حور محبوبہ اور جاں نثار روشن فاطمہ!

---

۱ و ۲ یہ نقل مطابق اصل۔ ۳ کاغذ پھٹا ہوا ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی

شاد عارفی کے معاشقے اوران کا تخلیقی ردِّعمل

ساتھ کھیلے کی محبت بڑھ کے بن جاتی ہے عشق
اس سے زائد عشق کا اے شاد میں قائل نہیں

شاد عارفی نے دو بار عشق کیا اور دونوں مرتبہ ناکامی کا منہ دیکھا۔ پہلا عشق بلوغت سے قبل شروع ہوا اور اس کا سلسلہ دس سال جاری رہا۔ لڑکی ان کے ننہال کی طرف سے دور کی رشتے دار تھی، لیکن خاندانی اعتبار سے ہم مرتبہ نہ تھی اور شاد عارفی اس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں ان کے بڑے بھائی ایک ساقط النسب عورت کے ساتھ دوسری شادی کرنے کے جرم میں خاندان سے علیحدہ کر دیئے گئے تھے، لہٰذا شاد کو اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں مل سکی اور وہ دوسری جگہ بیاہ دی گئی۔ عشق میں اس ناکامی نے ان کے ذہن پر بہت گہرا اثر چھوڑا اور تقریباً تین سال تک ان پر جنونی کیفیت طاری رہی۔ اس کیفیت سے گزر چکنے کے تقریباً تین سال بعد انہیں دوسرا عشق تارا نام کی ایک لڑکی سے ہوا جس کے پڑوس میں شاد بچوں کو پڑھانے جاتے تھے لیکن یہاں بھی شاد عملاً ناکام رہے کیونکہ مذہب آڑے آتا تھا اور انہیں اس امر کا شدید احساس تھا کہ ان کے کسی غلط اقدام سے مسلمانوں پر ہندوؤں کو اعتماد نہ رہے گا۔ اس دوسرے عشق میں ناکامی نے شاد کی رہی سہی سکت چھین لی۔ اب ان کی مایوسیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ طرّہ یہ کہ اس دوہرے احساسِ شکست کو تاعمر زندہ و تازہ رکھنے کے لئے شاد کی دونوں محبوبائیں ان کے انتقال تک رامپور ہی میں مقیم رہیں۔

ان معاشقوں کی کچھ تفصیل شاد عارفی کے مکتوب بنام علی حماد عباسی میں بیان ہوئی ہے۔ اس خط کا متعلقہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"بات یہ ہوئی تھی کہ مجھے اپنے دور کے خاندان میں سے (جہاں ہماری بیاہ شادی ممنوع تھی) بہ اعتبارِ قومیت وہ گھٹیا قوم کی لڑکی تھی اور ہم لوگ خالص افغانی رزڑ، ڈوڈال، اور آفریدی — ایک لڑکی سے (نام نہیں بتاؤں گا) بچپن ہی میں محبت ہوگئی۔ جو ساتھ کھیلنے کا نتیجہ تھی۔ اس پر میں نے ایک غزل میں مقطع یوں کہا تھا:

ساتھ کھیلے کی محبت بڑھ کے بن جاتی ہے عشق
اس سے زائد عشق کا اے شاد میں قائل نہیں

نتیجہ تو وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی وہی جو میری نظم "فسانۂ ناتمام" سے ظاہر ہے جس کو تفصیل سے میں نے اپنی نظم "سماج" میں بیان کر دیا ہے۔ اس محبت نے مجھے جو نظمیں دیں وہ یہ ہیں "فسانۂ ناتمام"، "خط کی چوری"، "سماج"، "جنازہ"، "مفارقت" اور ایک آدھ نظم جواب یاد نہیں آرہی ہے۔ غزلوں میں بھی کچھ زیادہ مواد اس لئے فراہم نہیں ہوسکا کہ ا

محبت میں نہ تو فراق کا سوال تھا نہ رقیب کا ڈر۔ وہ لوگ (لڑکی والے) خدا سے چاہتے تھے کہ میں پھنس کر شادی کرلوں تا کہ میرے خاندانی غرور کا سر نیچا ہو، اس لئے وہ (اس کے ماں باپ) مجھے زیادہ سے زیادہ موقع دیتے رہے کہ میں خوب گھل مل جاؤں۔ اب ہم جوان تھے۔ ایک روز مجھے ''اُدمات'' لگا۔ اُدمات کو یعنی جوشِ جوانی میں آپے سے باہر ہو جانا— مگر ایمان کی بات ہے کہ وہ لڑکی آڑے آگئی۔ کہنے لگی میں تم سے باہر نہیں ہوں مگر اس کے بعد محبت ختم ہو جائے گی اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں۔ مجھے فوراً ہوش آگیا۔ عرب معشوقہ بثینہ اور اس کے عاشق جمیل کا واقعہ یاد آگیا۔ یہ قصہ بھی سن لو۔ یہ قبیلے بھی آپس میں بیر رکھتے تھے مگر ان دونوں میں محبت ہوگئی۔ چھپ چھپ کر ملتے رہے۔ ایک دن جبکہ یہ قبیلے تلاشِ آب و سبزہ میں اپنے اپنے گلّے لے کر مختلف سمتوں میں جانے والے تھے گویا صبح کو روانہ ہوں گے تو بثینہ نے جمیل سے کہلا بھیجا کہ رات کو میں خیموں کے پیچھے روشنی کردوں گی تم اسے دیکھ کر چلے آنا۔ میں وہیں ملوں گی۔ چنانچہ اس نے یہی کیا اور جمیل وہاں پہنچ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جمیل نے اظہارِ مطلب ''خواہشِ وصل'' کا اظہار کیا تو بثینہ نے اپنی کمر سے خنجر نکال لیا۔ اور کہا کیا تم ایسا ارادہ کر کے یہاں آئے تھے۔ کیا اسی کو عفیف عشق کہتے ہیں۔ چلے جاؤ میرے سامنے سے ورنہ ابھی خنجر سے تمہارا کام تمام کردوں گی۔ جمیل اس پر بجائے بگڑنے کے مسکرایا اور اپنا پیش قبض (خاص قسم کا خنجر) کھینچ لیا اور کہا اگر تو وصل کا اقرار کر لیتی تو میں اسی خنجر سے تیرا کام تمام کر دیتا۔ خاندانی اختلاف کی بناء پر ان میں شادی تو نہ ہوسکی مگر بثینہ جب دوسری جگہ بیاہ کر چلی گئی تو وہ فقیر کے بھیس میں وہاں پہنچا اور آخر وقت تک اس کے دروازہ پر فقیر بن کر پڑا رہا اور مر گیا۔

ہاں تو اس کے سمجھانے سے میں سنبھل گیا۔ یہ محبت گیارہ سال رہی پھر اس کی شادی ہوگئی۔ اب میرے اوپر جدائی کے یہ تین سال قیامت بن کر گزر گئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دیوانہ ہو جاؤں گا۔ مجبوراً میرے استاد حکیم غلام حیدر صاحب، جن سے میں نے فارسی، اردو وغیرہ پڑھی تھی، جو جید طبیب بھی تھے، ان کے پاس پہنچا اور پوری حقیقت بیان کی۔ انہوں نے کہا اس کا علاج یہی ہے کہ کہیں اور محبت کرو۔ ''یہ کیسے ممکن ہے''۔ میں نے عرض کیا ''محبت آپ ہوتی ہے، محبت کی نہیں جاتی''۔ تو پھر انہوں نے کہا تم پتنگیں اڑایا کرتے تھے؟ میں نے کہاں ہاں۔ کہا پتنگ بازی شروع کردو اور اپنے آپ کو اس میں کھو دو۔ چنانچہ بھتیجے حماد! میں نے ساڑھے پانچ برس تک اس بری طرح پتنگ بازی کی کہ شہر بھر میں میرا شہرہ ہوگیا۔ لوگ مجھے دیکھنے کو آنے لگے کہ کون ماسٹر ہے (میں شہر میں ٹیوشنیں کرنے کی وجہ سے ماسٹر بھی مشہور تھا اور اب بھی ہوں) جو اتنا بہتر پتنگ لڑاتا ہے۔ حکیم صاحب کا یہ علاج کارگر پڑا۔ اب میں اسے ایک حد تک بھلا چکا تھا مگر مکمل طور پر آج بھی نہیں (ابھی وہ زندہ ہے) پھر میں ایک جگہ ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ اس مکان سے سڑک پار کر کے ایک مکان میں ایک لڑکی ''تارا'' نامی رہتی تھی۔ وہ اسکول جا رہی تھی اور میں پڑھا کر پلٹ رہا تھا کہ اس کا سامنا ہوا اور وہی کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے——

عجیب الجھن اور دشواریوں کا سامنا رہا۔ میں مسلمان وہ ہندو۔ مگر زیادہ تر اس طرف سے، کچھ اس طرف سے ایسے حالات بنے یا بنائے گئے کہ خط و کتابت اور ملاقاتیں آسان ہوگئیں۔ یہ محبت پانچ برس رہی اور پھر سماج اور اختلافات مذہب کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اس کی تفصیل کافی دلچسپ ہے مگر پھر یہ فسانہ طویل ہو جائے گا۔ خط نہیں رہے گا۔ رامپور آؤ تو زبانی کہوں گا۔

اب میری عمر کافی زائد ہو چکی تھی۔ اس محبت نے کئی اچھی نظمیں دیں۔ ''جہاں میں تھا''، ''ہولی''، ''دیوالی''، ''دسہرہ شنان'' وغیرہ۔ ادھر گھریلو حالات یہ تھے کہ میرے جس بھائی نے شادی کی وہ والد کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا (ہم تین بھائی تھے)۔ دوسرے بھائی کی شادی ہوئی، وہ بھی جورو کے غلام نکلے (زن مرید کہیں کے)۔ بڑے بھائی نے دو شادیاں کیں اور دونوں ناکام یعنی والدہ سے متنفر۔ اب ۳۸ سال کی عمر میں جب والدہ نے مجھے شادی کرنے کو کہا تو میں نے عرض کیا کہ دو بھائیوں نے آپ کی کونسی خدمت کی جو آپ مجھ سے اتنی توقع رکھتی ہیں کہ میں آپ کا فرمانبردار رہوں گا۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا اور کہا نہیں، مجھے تجھ پر بھروسہ ہے۔ پھر بھی میں ٹالتا رہا۔ مگر ایک دن (ہونے والی بات) والدہ صاحبہ نے جن کی عمر ۸۰ سال تھی اس وقت (موصوفہ نے ۱۰۵ سال کی عمر میں وفات پائی) ایک روز بھنڈیاں پکائیں۔ بھنڈیاں بنانے کے بعد چاقو بھی چنگیر میں بند کر کے رکھ دیا اور پکاتے وقت نہ تو انہیں یاد رہا اور سوچا چنانچہ چاقو بھنڈیوں کے ساتھ پک گیا۔ میں عموماً ٹیوشنیں کرنے کے بعد ۱۰ بجے رات کو گھر پلٹتا تھا۔ اس واقعہ سے میری خالائیں وغیرہ بہت متاثر ہوئیں اور میں نے بھی سوچا کہ والدہ کی خدمت کے لئے کوئی نہ کوئی ضروری ہے۔ نوکرانی کو نہ تو محبت ہوگی اور نہ ضرورت کہ وہ میرے پیچھے ان کی حسب منشاء کام کرے اور نہ ساز و سامان سے ہمدردی۔ چنانچہ مجبوراً یہ شادی کی۔ یقین کرو کہ اب جنسی بھوک کا کوئی خیال نہیں تھا۔ صرف والدہ کی خدمت مدنظر تھی۔ چنانچہ وہ شادی رچا دی گئی۔ مرنے والی میں عموماً اچھائیاں دیکھی گئی ہیں اس لئے وہ بھی بڑی شوہر پرست اور خدمت گزار ثابت ہوئی۔ میری والدہ کی خدمت اپنا فرض سمجھتی رہی۔ کچھ یہ بھی تھا کہ وہ میرا منشاء پا گئی تھی۔ اس معاملے میں عورت بہت چالاک ہوتی ہے۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ والدہ کے سلسلے میں مجھے ٹٹولا مگر میرا اثر نہ لینا اسے ''پند نامۂ شوہر'' ثابت ہوا اور پھر کوئی ایسی بات نہ کی جس سے میری والدہ کو تکلیف کا احساس ہوتا''۔

ان معاشقوں کا ردِ عمل شاد عارفی کے اشعار میں اسی طرح نظر آتا ہے:

میرے ہاں وہ اور کبھی میں اس کے گھر
اک قدم پھولوں پہ، اک تلوار پر

سانولا رنگ کشیدہ قامت
نہ پری ہے نہ کوئی حور ہے وہ

بھرا گھر جس کی شوخی اور طرّاری کا قائل ہے
مجھے دیکھا کہ اس پر ہوگئی سنجیدگی طاری

لائے ہیں تحریف تکیوں پہ دلائی ڈال کر
حسن اور اس درجہ بے خوف و خطر میرے لئے

راتیں گزر گئی ہیں مجھے جاگتے ہوئے
تکیوں سے اب تو اس کے پسینے کی بُو نہ آئے

چھپ چھپ کے جو مصروفِ دعا میرے لئے ہے
شاید وہ بُت ہوشربا میرے لئے ہے

مسکرا دیں گے، برا نام کوئی لے دیکھے
وہ کسی فکر میں بیٹھے ہوں، کسی کام میں ہوں

کھنچے رہئے تو سو سو طرح نظارے لٹائیں گے
بُتوں سے آپ کو بھی واسطہ اکثر رہا ہوگا

کہیں پڑوس، نہ در تک، نہ بام پہ جائیں
جو ہم پہ ہوں یہی پابندیاں تو مرجائیں

آپ یا میں' سوچئے' الفت جتاتا کون ہے
انجمن میں آنکھ ملتے ہی لجاتا کون ہے

جذبۂ محبت کو تیر بے خطا پایا
میں نے جب اسے، دیکھا، دیکھتا ہوا پایا

''حسیں ہو تم''، ''آپ کی بلا سے''''پری ہو تم''، ''آپ کی دعا سے''
جواب ملتا ہے سخت لہجے میں ان سے جو بات پوچھتا ہوں

بھیجا ہے اس لحاظ سے شاد اس کو آئینہ
کیا حال ہوگیا ہے محبت چھپا کے، دیکھ

ان شعروں کی تخلیق آج سے پچاس پچپن سال قبل کی گئی تھی۔ عہد حاضر کے قاری اور اس زمانے کے پڑھنے والوں کے مزاجی فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو واضح ہوگا کہ ممکن ہے آج اس قسم کے اشعار کہنے والا غزل کا باغی نہ سمجھا جائے لیکن اس عہد میں اساتذہ نے شاد عارفی کو ضرور 'ناشاعر' قرار دیا ہوگا۔ اس زمانے میں اس نہج کی جدت اور اختراعیت کا کیا مفہوم تھا، اس کا صحیح اندازہ آج بمشکل ہی کیا جاسکتا ہے۔ ان اشعار کی روشنی میں شاد عارفی کا یہ دعویٰ کچھ ایسا غلط بھی نظر نہیں آتا کہ انہوں نے خوبصورتی کے ساتھ واقعیت کو مصور کرنے کی کوشش کی ہے۔ صاف دکھائی پڑتا ہے کہ غزل میں ان کی محبوبہ متوسط طبقے کی ایک ہندوستانی لڑکی ہے جو ذہین اور تیز وطرار بھی ہے، الھڑ اور معصوم بھی۔ یہ محبت یکطرفہ نہیں ہے۔ شاد کی محبوبہ ان کی خاطر بال سکھانے چلے چلے آنگن ناپتی ہے، وہ محبت سے بےچین ہوکر روتی ہے اور اسے چھپانے کے

لئے در و دیوار کی آڑ لیتی ہے، راہ میں جہاں شاد رکتے ہیں، وہ 'برقِ سرو قد' بھی ٹھہر جاتی ہے۔ انہیں رجھانے کے لئے مسلسل انگڑائیاں لیتی ہے۔ صرف شاد ہی اس کے گھر نہیں جاتے وہ بھی سماجی پابندیوں کی تلوار پر چل کر ان کے گھر آتی ہے، وہ روایتی غزل کے فرضی محبوب کی طرح پری یا حور نہیں، اسی جیتی جاگتی دنیا کی ایک کشیدہ قامت، سانولی رنگت کی حقیقی لڑکی ہے۔ عام طور پر شوخ و طرار لیکن شاد کو دیکھتے ہی وہ مصنوعی سنجیدگی اختیار کر لیتی ہے، تکیوں پر دُلائی ڈال کر گھر سے بے خوف و خطر ان سے ملاقات کرنے آجاتی ہے۔ شاد کے تکئے اس کے پسینے کی بُو سے رچ بس گئے ہیں۔ وہ ان کے لئے چھپ چھپ کر دعائیں مانگتی ہے اور کتنی ہی فکر مند یا مصروف ہو، شاد کا نام سن کر مسکرا دیتی ہے۔ شاد کھنچے کھنچے رہتے ہیں تو سو طرح نظارے لٹا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس پر بھی پابندیاں عاید ہیں کہ پڑوس، در یا بام پر نہ جائے، وہ شاد سے آنکھ ملتے ہی لجا کر الفت کا اظہار کرتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ شاد سے خفا ہو کر پیار کی باتوں کے جواب میں 'آپ کی بلا سے' اور 'آپ کی دعا سے' قسم کا بظاہر سخت لیکن بباطن پیار بھرا لہجہ اپناتی ہے پھر بھی شاد جب اسے دیکھتے ہیں، اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتے ہیں، اس کے سامنے پہنچ کر وہ جانے کا تصور بھی نہیں کر پاتے۔ ان کی محبوبہ تابِ ہجر نہ لا کر اس حالت کو پہنچ جاتی ہے کہ شاد کو بطور ہمدردی آئینہ بھیجنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی حالت سدھار سکے۔

سادہ سادہ سے واقعات ہیں لیکن زندگی، حسن اور حرارت سے کتنے بھر پور۔ شاد عارفی کے علاوہ پوری اردو شاعری میں غزل اس حد تک سچ بولتی ہوئی صرف حسرت کے ہاں نظر آتی ہے۔ حسرت اردو غزل کے امام کہے جاتے ہیں کہ انہوں نے تجدیدِ غزل کا سامان کیا۔ امام کے لئے مقلدین ضروری ہوتے ہیں لیکن نگاہِ غور بیں سے حسرت کے فوراً بعد آنے والی نسل کا جائزہ لیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ کلامِ حسرت نے اس حد تک اگلی نسل کو متاثر نہیں کیا جتنا کہ شاد عارفی کی شاعری نے نئی نسل پر اپنا اثر قائم کیا ہے۔ یہ بحث آگے آئے گی، فی الحال یہ عرض کرنا تھا کہ ہر چند کہ شاد عارفی نے کہا ہے۔

دس پانچ برس حضرتِ حالی کی طرح شاد
مجھ کو بھی جنونِ لب و رخسار رہا ہے

لیکن یہاں ان کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ حالی کی طرح عاشقانہ شاعری سے مقصدی شاعری کی طرف آئے ہیں ورنہ ان کی عشقیہ شاعری دس پانچ برس کا نہیں چوتھائی صدی کا احاطہ کرتی ہے اور ان کی 'ریشمیں غزلوں' پر کہیں بھی حضرت حالی کی عشقیہ غزلوں کے سپاٹ پن کا سایہ نہیں پڑا ہے نہ انہوں نے غزل میں حالی سے اثر قبول کیا ہے البتہ حسرت کے اثرات ان کی عاشقانہ غزلوں میں اس حد تک ضرور پائے جاتے ہیں کہ وہ اپنی داستانِ عشق میں سچ بولتے ہیں اور ان کا عشق بھی حسرت کی مانند دونوں طرف آگ لگاتا ہے۔ انہوں نے بھی حسرت کی طرح خاندان کی لڑکی سے عشق کیا اور اپنی شاعری میں عرب کے شعرائے جاہلیت سے اثر قبول کرنے کے علاوہ 'جبِ عمؓ' سے عشق کرنے میں عربی روایت پر بھی عمل پیرا ہوئے۔ ان کی شاعری میں احساس کی جتنی شدت ہے اتنی ہی محسوسات کی صداقت بھی ہے لیکن حسرت اور شاد کی عشقیہ شاعری میں بہت

فرق بھی ہے۔ حسرت کا عشق، ایک سیدھے سادے مولوی نما نوجوان کا عشق ہے اور ان کی محبوبہ بھی واجبی سی شوخی کے ساتھ ایک سادہ لوح دیہاتی لڑکی ہے۔ پھر حسرت نے روداد عشق کے بیان میں کوئی خاص ندرت نہیں برتی اور نہ کوئی مخصوص اسلوب اختیار کیا۔ ان کے اشعار میں عاشق و محبوب کے نفسیاتی تجزیے بھی نظر نہیں آتے، وہ جیسا ان کے ساتھ عشق میں پیش آتا ہے اتنا کچھ ہی سچ سچ بیان کردینے پر قناعت کرلیتے ہیں۔ یہ سپاٹ سچ بھی ان کی غزلوں کے بھی اشعار میں نظر نہیں آتا، اکثر غزلیں خالصتاً روایتی گل و بلبل والی شاعری کا نمونہ ہیں اور بیشتر غزلوں میں ان کے مخصوص 'سچ' کے ساتھ روایتی رنگ کے اشعار ملے جلے ہیں۔ برخلاف اس کے، شاد عارفی کے ہاں ہمیں حسن و عشق کی پیچیدہ کیفیات کے دائرہ در دائرہ عکس بھی واضح نظر آتے ہیں اور سچ بولنے میں بھی وہ حسرت سے میلوں آگے ہیں۔ ان کی عشقیہ غزل میں روایتی موضوعات پر مبنی اشعار بہت کم نظر آتے ہیں، بقول آل احمد سرور:-

''شاد کے یہاں صرف سماج کی خرابیوں پر طنز ہی نہیں ہے، محبت اور نفسیات انسانی کی بچی تصویریں بھی ہیں اور انھیں ایک ایسے تیور اور بانکپن سے پیش کیا گیا کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں''۔[1]

شاد کا کہنا ہے۔

شریکِ راہِ محبت ہے طبعِ موزوں شاد
ہر ایک شعر مرا حسبِ حال ہوتا ہے

اور:-

دوسروں کے واقعاتِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

ان کے پاس دو کامیاب معاشقوں کے ٹھوس اور حقیقی تجربات ہیں۔ وہ حسرت کی طرح مسکین طبع نہیں، رام پوری پٹھان ہیں۔ ان کی محبوبہ بھی گھریلو عورت ہونے کے باوجود ایک زندہ دل، حاضر دماغ، ذی فہم، باشعور، چنچل اور ذہین دوشیزہ ہے۔ پھر شاد کی ندرت ادا سونے پر سہاگے سے کم نہیں، چنانچہ:-

تغافل، تجاہل سے آتا ہے عاجز
مرا کچھ نہ کہنا بھی حسنِ طلب ہے

تو وہ انداز جیسے میرا گھر پڑتا ہو رستے میں
پئے اظہارِ ہمدردی وہ جب تشریف لائے ہیں

اے تُو! کہ شرارت سے نہیں پاؤں زمیں پر
تھوڑی سی عنایت بھی کسی خاک نشیں پر

گدگدائے نہ بنے، ہاتھ لگائے نہ بنے
بن کے لیٹی ہو جوانی تو اٹھائے نہ بنے

---

[1] میرا صفحہ — آل احمد سرور (ہفت روزہ ''ہماری زبان'' علیگڑھ ۸ راپریل ۱۹۶۸، ص ۱۲)

مری بے بسی ہو کہ بیکسی تری بے رخی ہو کہ دلبری
کوئی کہہ رہا تھا کہ بیٹھ ابھی تری بزم سے میں جہاں اٹھا

دیکھ کر مجھ کو مسکرا دیں آپ
اس قدر احتیاط کافی ہے

مجھ پہ اس حیا خو کی ہر نظر ادھوری ہے
پھر بھی مدعا کامل، پھر بھی بات پوری ہے

بھولی سی ہم مکتب کوئی، کوئی سہیلی خالہ زاد
ان کے ہاتھوں خط بھجواتے میں ڈرتا ہوں لیکن وہ

عتاب کی نگاہ سے جھلک رہی ہیں شوخیاں
کسی بھی فن میں ہو مگر کمال بھی تو چاہئے

نقاب کی یہ جنبشیں، حجاب کے یہ زاویے
جو اس سے چاہتا ہوں میں اسے سمجھ رہا ہے وہ

آپ اس کو اتفاقی بات کہتے ہیں، مگر
سامنے آجائے وہ دیوانہ وار، آساں نہیں

کام کی شے ہیں کروٹن کے یہ گملے اے شاد
وہ نہ دیکھے مجھے، میں اس کا نظارا کر لوں

لکھ کر میرا نام اے شاد
اس نے بھیجا ہے رومال

بہ پاسِ احتیاط آرزو یہ بارہا ہوا
نکل گیا قریب سے وہ حال پوچھتا ہوا

نگاہِ اشتیاق میں وہ زلف و رخ کے زاویے
کبھی سلام ہو گیا، کبھی پیام مل گیا

بھاگتا ہے جیسے جنگل میں شکاری سے ہرن
وہ ادھر ذر پہ نظر آیا ادھر روپوش تھا

خط غلط تقسیم ہو جاتے ہیں اکثر، تم نے بھی
کہہ دیا ہوتا یہ کس کا خط مرے نام آگیا

کیا لکھ رہے ہو میری طرف دیکھ دیکھ کر
میں نے دیا جواب غزل کہہ رہا ہوں میں

رفتہ رفتہ میری 'الغرضی' اثر کرتی رہی
میری بے پروائیوں پر اس کو پیار آتا گیا

میں اس کو دیکھ رہا ہوں اس احتیاط کے ساتھ
ابھی تو جیسے محبت کی ابتدا بھی نہیں

آپ نے دیکھا۔ شاؔد کے یہ عشقیہ اشعار، ہماری، عام اردو غزل کے عاشقانہ اشعار سے بشمول حسرت، کتنے ہٹے ہوئے ہیں۔ ان کے عاشق نے محبوب کے آگے سر تسلیم اس لئے نہیں خم کر رکھا ہے کہ بے زبانی روایتی شاعری کے عاشق کا شیوہ ہے۔ اس کی خاموشی دراصل حسن طلب ہے کیونکہ وہ صنف نازک کی اس فطرت سے واقف ہے کہ اس کے تغافل کا جواب تجاہل سے ملے تو خود کھنچی ہے۔ عاشق محبوب کی ایک ایک ادا کا مزاج داں ہے چنانچہ اظہار ہمدردی کے لئے تشریف لانے والی محبوبہ کی اس بناوٹ کو بھانپ لیتا ہے جو ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ راہ سے گزرتے ہوئے وہ یوں ہی عاشق کے گھر بھی آنکلی ہے، ادھر شوخ اور چنچل محبوبہ ہے کہ اس کے پاؤں شرارت سے زمین پر نہیں پڑتے، بن بن کر لیٹ جاتی ہے کہ تہذیب عاشق کو نہ گدگدانے دیتی ہے نہ ہاتھ لگانے کی ہمت پڑتی ہے۔ شاعر کو صحبت یار سے اٹھنا ہے لیکن طبیعت نہیں چاہتی، وہ تجزیہ نہیں کر پاتا کہ اسے اپنی بے بسی اور بیکسی سے تعبیر کرے یا محبوبہ کی بے رخی یا دلبری کو اس کا سبب سمجھے۔ محبوبہ ضرورت سے زیادہ محتاط ہے اور عاشق کا مشورہ ہے کہ بہر حال اسے دیکھ کر مسکرا دینے میں افشائے راز کا احتمال نہیں ہے۔ حیا خو محبوبہ اسے نگاہ بھر کر نہیں دیکھتی لیکن عاشق کا مدعا تکمیل پالیتا ہے کیونکہ وہ محبوبہ کی محتاط طبیعت اور زمانے کی سرشت کو پہچانتا ہے۔ وہ محبوبہ کی ذرا ذرا سی بے اعتدالیوں پر اسے متنبہ کرتا ہے، کبھی کسی خاص خالہ زاد سہیلی کے ذریعے اور کبھی کسی بھولی بھالی ہم مکتب سے نامہ بر کا کام لیا جاتا ہے تو وہ محبوبہ کی رسوائی کے ڈر سے کانپ جاتا ہے۔ محبوبہ محبت کو عاشق سے بھی چھپاتی ہے اور جواباً اسے آئینہ بھیجا جاتا ہے کہ دیکھ خود تیرا سراپا محبت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ محبوبہ کے نقاب کی ایک ایک جنبش اور حجاب کا ایک ایک زاویہ عاشق کے لئے سہولتیں فراہم کرتا ہے۔ وہ دیوانہ وار عاشق کے سامنے بھی آتی ہے تو ایسی ذہانت کے ساتھ کہ لوگ اسے ایک اتفاقی بات سمجھیں لیکن حقیقت عاشق پر روشن ہے۔ کروٹن کے گملوں کی آڑ سے چھپ چھپ کر اس طرح نظارہ کر لیا جاتا ہے کہ محبوبہ کو پتہ نہ چل پائے دوسری طرف سے رومالوں پر شاؔد کے نام کاڑھ کر بھیجے جاتے ہیں۔ یہ اور ایسے ہزاروں معاملات شاؔد عارفی کی عشقیہ غزل میں بھرپور شاعرانہ کیفیات کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے ہندوستانی، مسلم متوسط طبقے کے عاشق و معشوق کی ان باریک نفسیاتی کیفیتوں پر اردو کے کسی شاعر کی نگاہ اس طرح نہیں پہنچ سکی جس طرح کہ شاؔد انکے غماز ہیں۔ یہاں نہ محبوب میرؔ کے عہد کا ہے نہ عاشق قرون وسطیٰ سے تعلق رکھنے والا۔ شاؔد عارفی کی شاعری جس طرح ان کی شخصیت کے لئے نقاب نہیں بلکہ آئینے کا کام دیتی ہے بالکل وہی فریضہ ان کی عشقیہ غزل ان کے محبوب کے

لئے انجام دیتی ہے اور یہ فریضہ ہماری شاعری میں کم کم ہی ادا کیا گیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

''کلاسیکی اردو غزل میں مجموعی طور پر محبوب کا تصور گھٹا گھٹا، بھنچا بھنچا ہے۔ دکنی شاعروں کو چھوڑ کر صرف میر اور مصحفی کے ہاں تصورِ حسن کا ہندوستانی روپ ملتا ہے، دہلوی شعراء سے لے کر حالی اور حسرت تک اردو غزل میں جس محبوب کی کارفرمائی ملتی ہے اس کی ارضیت سے انکار نہیں لیکن اس کی جمال آرائی ٹھیٹھ ہندوستانی انداز سے نہیں کی گئی''۔ ؎

شاد عارفی کی عشقیہ غزل ایسے چیستے ہوئے حقیقت آمیز اعتراضات کے سامنے استثناء کی حیثیت رکھتی ہے۔

شاد عارفی کی عشقیہ غزل، سلیم احمد کے الفاظ میں، اردو شاعری میں ایک 'پورے آدمی' کے عشق کی داستان ہے جس کا لہجہ عام عشقیہ شاعری کے انفعالی لہجے سے علیحدہ اور منفرد ہے۔ اس آواز میں جو مردانہ پن ہے۔ وہ غزل کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کرتا ہے۔ حالی کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر لکھنؤ اسکول کی بھونڈی مبتذل خارجیت کو ترک کر کے غزل میں میر جیسی داخلیت کا دوبارہ زور دورہ تو ہوا لیکن چونکہ اس داخلیت کو شعوری طور پر اپنایا جا رہا تھا اور اسے برتنے والوں میں کوئی میر کی سی خلاقانہ صلاحیتوں کا عظیم فنکار نہ تھا اس لئے اپنی انتہا کو پہنچ کر اس نے فانی کی قنوطیت کی شکل اختیار کر لی۔ جدید تر غزل کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کہتے ہیں:

''بعض شعراء کا خیال تھا کہ غزل ضرورت سے زیادہ داخلی ہو جانے کی وجہ سے انفعالیت کا شکار ہو گئی ہے اس لئے اسے مردانہ لہجہ اور صلابت عطا کرنے کے لئے خارجیت کو بھی ایک حد تک اپنانا چاہئے۔ یگانہ اور شاد عارفی نے اس عنصر کو ایک بار پھر اپنی غزل میں جگہ دی۔ یگانہ اور شاد دونوں زبان و فن پر بڑی قدرت رکھتے تھے اور ان کے یہاں ایک طرح کی تلخی اور طنزیاتی روح ان کے مزاج کا فطری عنصر معلوم ہوتی ہے اس لئے انہوں نے اس خارجیت سے خاصہ کام لیا''۔ ؎

یہی وجہ ہے کہ شاد عارفی کی غزل پر کہیں کہیں آتش کے رنگ کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ بے باک لہجہ اور بے تکلف انداز گفتگو اور محبوب کے سامنے بھی سپاہیانہ بانکپن کے ساتھ آنا، آتش کی نمایاں خصوصیت ہے۔ شاد کے ہاں بھی ہمیں آتش کی طرح شوخ لہجے کے ساتھ احساس کی گرمی، محبوب کے جسم کی آنچ، حسن کی چلتی پھرتی تصویر اور عشق کی حقیقی کیفیات کی عکاسی ملتی ہے لیکن آتش کی پوری شاعری اس پایے کی نہیں ہے اور بیشتر مقامات پر وہ بری طرح لکھنوی رنگ کا شکار ہو گئی ہے جبکہ شاد کی تقریباً تمام عشقیہ غزلیں ان خصوصیات کی حامل

؎ جوش اور فراق کا جمالیاتی احساس ——— پروفیسر گوپی چند نارنگ (ماہنامہ ''شاہکار'' الہ آباد فراق نمبر ص ۸۵)

؎ عشقیہ غزل ——— ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی (سہ ماہی ''فنون'' لاہور، جدید غزل نمبر حصہ اول ص ۱۷۶)

ہیں۔ اور ان کے ہاں یہ رنگ کافی نکھر کر اوپر آیا ہے۔ ان کے اشعار میں عاشق و محبوب کی انسانی فطرت اور نفسیات کے ایسے متحرک عکس نظر آتے ہیں جو پڑھنے والے کو دیرپا مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں احساسی شاعری اور لمسیت کی اتنی اچھی اور ایسی مثالیں، جن کے لئے انگریزی ادب میں کیٹس مشہور ہے، اردو میں شاد عارفی کے ہاں بکثرت ملتی ہیں۔ ثبوت میں کچھ شعر ملاحظہ فرمایئے:

انگلیاں اس کی مرے ہاتھ میں ہیں جام کے ساتھ
ہاتھ کھینچے نہ بنے، جام گرائے نہ بنے

دیکھ پاتے ہیں جو ہم کو درمیانِ کوئے دوست
کھڑکیوں سے جھول جاتے ہیں بتانِ کوئے دوست

کھل رہے ہیں لب شگفتہ پہ اس طرح بے صدا دلاسے
چمن میں جس طرح مل رہی ہوں گلاب کی پتیاں ہوا سے

وہ چشم نیم خواب، وہ زلفیں گری ہوئی
صبح بہار ایک ہی انگڑائی کی ہوئی

شب مہتاب وہ پھولوں کا زیور منتشر زلفیں
بقول رازداں کیا خوشنما منظر رہا ہوگا

وہ قریب سے گزرا، بن کے صبح کا جھونکا
اس طرح کہ چپکے سے حرف مدعا کہہ دوں

وہ زبان بے زبانی سے ابھی واقف نہیں
ہاتھ رکھنا پڑ رہا ہے بارہا دل پر مجھے

ابھی ہنگامہ آرا دل میں ہے اک عشرت رفتہ
ابھی تک تیری خوشبو آ رہی ہے میرے بستر سے

شاد عارفی نئی بات کہتے ہیں یا عام سی بات کو اس زاویے سے کہتے ہیں کہ وہ نئی ہو جاتی ہے۔ انہوں نے پرانے لفظوں کو نئی فضا اور معنویت بخشی۔ یہی نہیں کہ ان عشقیہ غزلوں میں محاکات، معاملہ بندی اور واقعہ نگاری ایک ایسے انوکھے انداز سے کی گئی ہے جو ان سے قبل ناپید تھا بلکہ وہ عشق کے تاثرات اور واردات قلب کو بھی اسی ندرت ادا کے ساتھ بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے موضوعات کو ادراک و احساس کا لمس بھی دیا۔ شاد کی عشقیہ غزل میں بڑی حلاوت اور جذباتی آسودگی پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھئے:-

سوتے ہی اپنے بستر پہ
میں ہوتا ہوں اس کے گھر پہ

ذرا خاموش رہنے دے کہ ذہنی طور پر ہمدم
ابھی واپس نہیں آیا ہوں میں اس کے شبستاں سے

لرز رہا تھا میں کہیں کھنک نہ جائے انجمن
وہ انجمن میں آج اس قدر بچا بچا رہا

جیسے کسی حسین کے ہونٹوں پہ سرد آہ
پھولوں کی پتیوں پہ کرشمے ہوا کے دیکھ

حیرت جلوۂ محبوب بتاؤں
ڈر رہا تھا کہ کہیں جاگ نہ جاؤں

چارہ گر الفت کی نفسیات سے واقف نہیں
لے کے نام اس کا کوئی دیکھے مرے چہرے کا رنگ

حسن ہر حال میں ڈرتا ہے ہوسناکوں سے
پھول کھلتا ہے تو ہر سو نگراں ہوتا ہے

دھیمی بے چال، بھینی خوشبو، ہلکی دستک جاری ہے
یا وہ ہے، یا صبحِ بہاراں، یا ذہنی گلکاری ہے

مجھ بِن مرا مذاق اُڑانے کے واسطے
ہر مہ جبیں نقاب اُٹھا کر نکھر گئی

بتائیں کیا کہ کسی بُت کو ہم نے کیوں چاہا
یہ فیصلہ تو ہماری نگاہ پہ رکھئے

جہاں سے اس نے چشمِ غلط نظر ڈالی
وہیں سے کنگرۂ آرزو بلند ہوا

جاڑے کی وہ بھیگی راتیں، گرمی کے یہ جلتے دن
یادوں کے دانتوں سے ناخن کاٹ رہا ہوں لیکن وہ

اپنی جانب سے نہیں ممکن جو ان کو خطِ شوق
بھیج دیں چاہئے میری غزل لکھ کر مجھے

بڑھ جاتی ہے اس روز مناظر کی اُداسی
جب اس سے ملاقات کا امکاں نہیں ہوتا

شاذؔ صاحب جو قطعے پڑھتے ہیں ہر بات میں آپ
آج وہ ہوشربا آپ کا مہماں تو نہیں

مخاطب ہے وہ ایسے زاویے سے
جسے دیکھو مرا منہ تک رہا ہے

دلنوازی جو بھرے گھر میں نہیں بن پڑتی
رُخ محبوب پہ گیسو ہی بکھر پڑتا ہے

ڈاک سے بھیجنی خوشبو والے خط پر خط آئے تو اِک دن
پوچھے گا خط لانے والا بابو! یہ خط کس کا ہے؟

شاد عارفی کی عشقیہ غزلوں میں فطری سادگی، شوخی اور لہجے کا انوکھا پن ہے۔ ان میں جوانی کی تازگی، متوسط طبقے کے نوجوان کو پیش آنے والے واقعات کی سرشاری اور زندگی کی حرارت ہے جسمیں محاکاتی پہلوؤں کے ساتھ ایک خوشگوار سا کھرا پن، واقعیت، خلوص اور بے جھجک قسم کا مکالماتی طرز (جسے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ حقیقی شاعری کا جزو اعظم قرار دیتا ہے) طرفہ کاری، تنوع، واشگاف مخاطبت اور ابلاغ کا براہ راست انداز ہے۔ ہرچند کہ اس میں حیات و کائنات کے متعلق کوئی خاص نظریہ یا زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے گہرے تجربات کا عکس اور فلسفیانہ تفکر نہیں ہے (جسے حقیقی عشق کے بیان میں ہونا بھی نہ چاہئے)۔ لیکن اپنے جدید اسلوب اور مخصوص رنگ و آہنگ کے لحاظ سے اس غزل کی ایک جداگانہ اور منفرد اہمیت ہے۔ دراصل شاد عارفی نے روایتی غزل کے مروّجہ علائم و رموز سے روگردانی کرتے ہوئے غزل کی مخصوص رمزیت اور اشاریت سے دانستہ پہلو تہی برتی اور موضوع کی براہ راست ترجمانی کا فن اختیار کیا۔ اس طرح وہ بڑی فراخدلی کے ساتھ غزل کی مروجہ علامتوں، تمثیلوں، کنایوں اور ان کے ساتھ وابستہ ذہنی متعلقات اور تصوراتی لوازمات سے دست بردار ہو گئے۔ نتیجے کے طور پر ان کی غزل کسی حد تک ان لوازمات کی پیدا کردہ پہلوداری اور اس پس منظر کے ایک حصے سے محروم بھی ہو گئی جو غزل کی روایت عام اشعار کو فراہم کرتی ہے، نیز وہ شے بھی ان کے ہاں کم نظر آتی ہے جسے اساتذہ خالص تغزل کا نام دیتے ہیں۔

ان غزلوں کے گہرے مطالعے سے اس حیرتناک حقیقت کا انکشاف بھی ہوتا ہے کہ اس کھلے کاروبار عاشق میں کہیں جنسی کثافت کی کھوٹ نہیں ہے شاد جیسا کھل کر بات کہنے والا شاعر کہیں محبوب یا تصور محبوب کے ساتھ کھل نہیں کھیلا۔ نازک سے نازک تر مقام پر بھی انہوں نے احترام حسن کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ وہ بے باک اور حق پرست تو تھے، لیکن ان کے دل و دماغ پر مذہب کا جو اثر قائم ہو چکا تھا، اس نے عام زندگی میں بھی انہیں محبوب کے جسم سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیا حتیٰ کہ ان کے دونوں معاشقے اس اعتبار سے ناکام رہے کہ وہ اپنے محبوب سے شادی نہ کرسکے لیکن اس جذبے نے عشقیہ غزلوں میں جہاں انہیں شدت احساس سے مالا مال کیا، وہیں انہیں دوسرا جرأت ہونے سے بچالیا ورنہ ان کا مزاج حقیقت کو نقاب پہنا کر سامنے لانے کا عادی نہ تھا۔ اس سلسلے میں ان کے خیالات کا اندازہ ان

اشعار سے ہو سکتا ہے۔

عشق باندھیں مروڑنے میں نہیں
شاعری پھول توڑنے میں نہیں

ساتھ کھیلے کی محبت بڑھ کے بن جاتی ہے عشق
اس سے زائد عشق کا اے شاد میں قائل نہیں

احترام جلوہ چینی یہ بھی کچھ تھوڑا نہیں
آنکھ نے جس پھول کو دیکھا اسے توڑا نہیں

خوشنما پھولوں کو چھونا کفر تھا میرے لئے
گدگدا سکتا تھا ورنہ بارہا پہلوئے دوست

ہم ہی کچھ احترام کرتے ہیں
ورنہ دامن چھڑا کے بھاگ نہ پاؤ

ذکرِ قربِ دوست ہی میرے لئے کافی ہے شاد
جبکہ اربابِ غزل کہتے وہ ہم آغوش تھا

حسرت جیسے مہذب انسان اور پاکباز شاعر کے ہاں بھی کافی اشعار میں دھول دھپے والی وہ کیفیت مل جاتی ہے جسے خود انہوں نے 'فاسقانہ شاعری' کا نام دیا ہے لیکن شاد کی غزلوں میں تلاشِ بسیار کے بعد بمشکل دو تین اشعار اس قسم کے ملیں گے۔

پھانس نکلوانے کے کارن دے دیتا ہوں ہاتھ میں ہاتھ
موقع پا کر ران میں چٹکی بھر لیتا ہوں، لیکن وہ

اک بھینی بے نام سی خوشبو
شامل ہے ہونٹوں کے رس میں

یہ گدگدانا، یہ بوسۂ لب اسی کا ردِ عمل سمجھئے
ابھی جو ارشاد ہو رہا تھا کہ ہم سے کیوں کوئی بولتا ہے

اپنی شاعری کی جنسیت اور ارضیت کے باوجود وہ عشق اور ہوسناکی کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ عملاً ہجر نصیب شاعر ہونے کے باوجود حرماں نصیبی کی فضا، چند اشعار کے استثنا کے ساتھ، شاد کی عشقیہ غزلوں میں نہیں پائی جاتی۔ انہیں خود بھی اعتراف ہے کہ:

''میرے ہاں غمِ جاناں کا ذکر بہت کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں محبت میں خودداری کو ہاتھ سے دینے کا قائل نہیں ہوں''۔

ان کی پوری عشقیہ شاعری دیکھ جائیے۔ بہت کم اشعار اس روایتی انداز میں ملیں گے جس میں ہمارے غزل گو محبوب کو ستم پیشہ اور غارت گر قرار دے کر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ہیں، اور دشنامِ یار کی طبع حزیں

پر گراں نہ گزرنے کا اعلان فرماتے ہیں۔ غالب کی طرح شادؔ بھی اس معاملے میں بے حد غیور اور خوددار عاشق ہیں۔ محبوبہ کو جی جان سے چاہتے ہیں لیکن اس کے ہاتھ اپنی عزت نیلام نہیں کرتے۔

محبت میں خودی کی موت بھی دیکھی نہ جائے گی
اگر میں بارِ خاطر ہوں تو اٹھ جاؤں ترے در سے

جھٹک کے ہاتھ سے دامن کو جانے والے، بس
ترے خیال کا دامن بھی چھوڑتا ہوں میں
کس طرف روئے سخن ہے، نام اس کا لیجئے
بن بلائے آپ کی محفل میں آتا کون ہے

یہ تو محسوس ہونے دیجئے
اجنبی ہیں آپ کی محفل میں ہم

اردو غزل میں امتحان وفا محض عاشق دیتا آیا ہے۔ شادؔ کی غزل محبوب کا امتحان بھی لیتی ہے۔

دیر سے پہنچے پہ بحث تو ہوئی لیکن
اس کی بے قراری کو حسب مدعا پایا

اسی لئے شادؔ جورِ محبوب کا شکوہ بہت کم کرتے ہیں۔

شادؔ غیر ممکن ہے شکوۂ بتاں مجھ سے
میں نے جس سے الفت کی اس کو باوفا پایا

ان کی شاعری میں بڑی باوقار اور توانا ارضیت ہے۔ عام بول چال کی زبان میں، اس قدرت ادا کے ساتھ، جو صرف انہیں سے مخصوص ہے، حقیقت پر مبنی واقعاتِ عشق کو بعینہٖ غزلوں میں منعکس کر کے شادؔ عارفی نے عشقیہ شاعری میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی عشقیہ غزلیں غیرضروری آرائش کے عناصر سے بالکل پاک ہیں اسی لئے تغزل پسند طبیعتیں غزل کے مروجہ معیاروں کی روشنی میں ان کی غزلوں کی صحیح قدر نہیں کر پاتیں۔

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

۱۹۔ ستارے انگارے ہیں، شک کر لینا۔ سورج اپنے مداوتین کو گردش میں سے آتا ہے شک کر لینا۔ مان لینا کہ سچائی مکار ہے۔ لیکن کبھی شک نہ کرنا کہ میں تمہیں محبت نہیں کرتا۔

Hamlet - Act 2, Scene 2

۲۰۔ دنیا میں کسی رفیق کی تمنا میں نہیں کروں گا سوائے تمہارے۔

The Tempest - Act 3, Scene 1

۲۱۔ میری دعا ہے تم میری محبت میں کبھی نہ پڑو۔ کیونکہ میں ان ارادوں سے بڑھ کر جھوٹا ہوں جو شراب کے نشے میں باندھے جاتے ہیں۔

As You Like It - Act 3, Scene 5

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

محبت اور بغاوت: قاضی نذرالاسلام کی چوٹیں

جب آسمان پر سورج جگمگاتا ہے تب اس کی تیز روشنی کے سامنے دیگر ستاروں کی چمک دمک دم توڑ دیتی ہے اور ان سینکڑوں جگمگ کرتے ہوئے ستاروں کا احساس تک باقی نہیں رہتا جو رات بھر بھیانک تاریکی کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال دنیائے ادب میں اس وقت ہوتا ہے جب کوئی عظیم فنکار آفتاب کی طرح آسمان ادب پر ابھر آتا ہے۔ اس وقت آسمان ادب کے دیگر ستارے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور وہ دور اس عظیم فنکار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بنگلہ ادب میں ربندر ناتھ ٹیگور آفتاب بن کر ابھرے اور اس دور کو ہم عہد ٹیگور کہتے ہیں۔ یقیناً اس دور میں بھی دیگر کئی فنکار رہے ہیں لیکن ان سب کی چمک دمک ٹیگور کے سامنے ماند پڑ گئی۔ صرف ایک نام ہی ایسا ہے جو ٹیگور کے ہوتے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکا اور وہ نام ہے شاعر بغاوت قاضی نذرالاسلام کا، جس ابھرتے ہوئے فنکار کا خود ٹیگور نے میدان ادب میں سواگت کیا تھا۔

نذرلؔ انقلابی تھے، باغی تھے۔ انہوں نے سماج کے کئی بندھنوں اور روایات کی بہت سی فرسودہ زنجیروں کو توڑ دیا اور ایسی بغاوت کا نعرہ بلند کیا کہ لوگوں نے انہیں باغی شاعر تسلیم کر لیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بغاوت کا محبت سے کیا تعلق؟ ایک باغی ''محبت'' کے جال میں کیوں کر پھنس سکتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ''محبت'' میں ناکامی نے شاعر کو ''باغی'' بنا دیا؟۔ یا یہ کہ ''محبت'' سے انہوں نے ''بغاوت'' کی — ؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں باغی شاعر قاضی نذرالاسلام کی زندگی میں ڈوب کر دیکھنا ہوگا۔ احساس محبت، دوام محبت، محبت اور ممتا، ناکامی عشق، محبت اور احساس خودی، قید محبت اور جذبۂ آزادی وغیرہ ایسے سینکڑوں سوالات، جن کی پرچھائیاں ہم کلام نذرلؔ میں جگہ جگہ پاتے ہیں کا ان کی حقیقی زندگی سے کیا اور کیسا تعلق ہے۔؟

اردو کے نامور ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین اور بنگلہ زبان کے باغی شاعر نذرالاسلام کی زندگی میں ایک عجیب ملن ہے۔ مخدوم بچپن ہی سے ماں کی محبت سے محروم رہے۔ وہ صرف پانچ سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی ماں نے دوسری شادی کر لی اور مخدوم چچا کے زیر سایہ پرورش پانے لگے۔ نذرالاسلام آٹھ برس کے تھے کہ ان کے والد قاضی فقیر احمد کا انتقال ہو گیا اور ماں زاہدہ خاتون نے بھی دوسری شادی کر لی۔ اس طرح ماں کی ممتا کے وہ بھی بھوکے تھے۔ والد کے انتقال اور ماں کی دوسری

شادی کے بعد مخدوم کی زندگی میں تاریکی چھا گئی۔ چچا نے ان کی پرورش لاپروائی سے کی اور لڑکپن ہی سے مخدوم کو محنت کرنی پڑی۔ ان سے مسجد میں بیگار کا کام تک لیا جاتا رہا۔ نذرل کو بھی لڑکپن سے محنت مزدوری کر کے اپنی روٹی کمانی پڑی۔ وہ ایک ریلوے گارڈ کے گھر کھانا پکانے پر نوکر ہوئے اور پھر آسنسول کی ایک پاؤ روٹی کی دکان پر کام کرتے رہے۔ اس طرح بچپن ہی سے ہمارے دونوں شعراء کے دل ماں کی ممتا اور لاڈ و پیار کے لئے تاعمر بیتاب رہے ہیں۔ مخدوم کو غالباً ماں کی محبت کسی دوسری عورت سے نہیں ملی لیکن اس سلسلے میں نذرل خوش نصیب ہیں کہ ان کو زندگی میں ایسی دو عورتیں ملی تھیں۔ جنہوں نے تن من دھن سے اُن کی خدمت کی اور بھرپور پیار دیا جو ایک ممتا بھری ماں ہی دے سکتی ہے۔

مخدوم کی داستانِ عشق کا مجھے درست علم نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ محض سنی سنائی باتیں ہیں۔ چوں کہ میری ابتدائی جوانی کا ایک حصہ شہر حیدرآباد اور سکندرآباد میں گزرا۔ اس لئے میں نے مخدوم کو دیکھا ہے، ملا بھی، اور ان کو مشاعروں میں کلام پیش کرتے ہوئے سنا بھی ہے اگر کلام کا کچھ تعلق شاعر کی حقیقی زندگی سے ہو تو یقیناً مخدوم نے محبت کی ہے۔ ورنہ کوئی شاعر اتنی بیباکی سے ایسے اشعار کہہ نہیں سکتا۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

نئی دلہن کی تھرتھری بن کر
اس کے ہونٹوں کی کپکپی بن کر
میرے دل میں سما گیا کوئی
میری ہستی پہ چھا گیا کوئی

اور نہ جانے وہ ''تلنگن'' کون تھی جس کے گیت سن کر مخدوم نے کہا:-

ہاں تلنگن گائے جا
بانکی تلنگن گائے جا

خیر ——— اب میں نذرل کی داستانِ عشق کو مختصر طور پر بیان کرتا ہوں۔

نذرل ان دنوں ۲۲ سال کے تھے اور تب تک شاعری اور نغمیت کی دنیا میں ان کا ایک حلقہ وجود میں آ گیا تھا۔ وہ مشہور نہ سہی لیکن جانے پہچانے شاعر ضرور ہو گئے تھے۔ یہ مارچ یا اپریل ۱۹۲۱ء (بنگلہ ماہ چیت ۱۳۲۷) کی بات ہے جب وہ علی اکبر خان کے ساتھ ضلع کومِلا (مشرقی بنگال) گئے تھے۔ اس سے چند ماہ پہلے ہی کلکتے میں علی اکبر خان سے ان کی جان پہچان ہوئی تھی۔ یہ علی اکبر خان بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کرتے تھے اور مختلف اسکولوں میں ان کو چلانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی ان کا کاروبار تھا۔ وہ شاعر وادیب تو نہیں تھے۔ لیکن کچھ لکھ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایسی ہی چند نظمیں نذرل کو سنائی بھی تھیں۔ ایک بار نذرل نے یوں ہی ان کے لئے بچوں کی

ایک نظم "اپنی چوڑ" لکھ دی تھی۔ اس نظم کو پا کر خان بہت خوش ہوئے۔ نذرل کی یہ نظم بہت پسند کی گئی تھی اور یہی وہ نظم ہے جس سے علی اکبر خان نے نذرؔل کو ہمیشہ کے لئے اپنے جال میں پھانس لینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ انہوں نے نذرؔل کو دعوت دی کہ وہ ایک بار ان کے ساتھ ان کے گاؤں کومِلا جائیں اور نذرؔل نہ معلوم کیسے ان کی میٹھی میٹھی باتوں میں آگئے اور کومِلا روانہ ہو گئے۔

نذرؔل کو لے کر علی اکبر خان پہلے شہر کومِلا میں اندر کمار سین گپت کے مکان پر پہونچے۔ اندر کمار، ترپورہ ضلع کورٹ آف وارڈس کے ایک انسپکٹر تھے۔ جن کا بیٹا بریندر کمار، کومِلا ضلع اسکول میں بھی علی اکبر خاں کا ہم جماعت تھا اور اسی طرح اندر کمار کے گھر علی اکبر خان کا آنا جانا تھا۔ اور بریندر کی ماں

برجا سندری دیوی اپنے بیٹے کے اس دوست کو چاہنے بھی لگی تھی۔ علی اکبر خان بھی برجا سندری دیوی کو ماں کہتے تھے۔ طالب علمی کا دور ختم ہونے کے بعد بھی اندر کمار سین گپت کے گھر سے علی اکبر خان کے تعلقات اٹوٹ تھے۔ حالانکہ یہ گھرانہ کوئی رئیس گھرانہ نہیں تھا لیکن اس گھرانے کے افراد کو ادب اور سنگیت سے کافی لگاؤ رہا ہے۔

نذرؔل کا اس گھر میں اپنوں کی طرح سواگت کیا گیا تھا۔ ان کو پا کر اس گھر کے سب افراد خوش ہوئے تھے۔ نذر الاسلام کے اندر کمار سین گپت کے گھر آنے کی جان کر شہر کومِلا کے علم و ادب دوست نوجوانوں کی ان کے گھر پہ بھیڑ لگ گئی۔ شاعری اور گیتوں کی محفلیں جمنے لگیں اور خود شاعر نذر الاسلام اس گھر کے ایک فرد کی طرح قبول کر لئے گئے۔

برجا سندری دیوی اور اندر کمار کی ایک بیوہ بہن گری بالا دیوی کے پیار اور محبت اور خدمات نے شاعر کا دل جیت لیا تھا جیسے کہ نذرل کو اس گھر میں ایک کے بدلے دو دو مائیں مل گئی ہوں۔ وہ برجا سندری کو ماں کہہ کر ہی پکارا کرتے تھے۔ پرمِیلا اسی بیوہ گری بالا دیوی کی اکلوتی بیٹی تھی اور وہ بھی اسی گھر میں رہتی تھی جس طرح برجا سندری کی بیٹی یعنی بریندر کمار کی اپنی بہن کہلاتی تھی۔

پہلی بار علی اکبر خان کے گاؤں دولت پور جاتے ہوئے نذرؔل اندر کمار کے گھر چار پانچ دن مہمان تھے۔ جس کے بعد وہ علی اکبر خان کے ہمراہ دولت پور چلے گئے۔ دولت پور میں نذرؔل تقریباً دو ماہ تھے۔ علی اکبر خان کی ایک بیوہ بہن کی ایک بیٹی تھی۔ محبت کب ہوئی ہے، کیسے ہوئی ہے؟ ان سوالات کا جواب غالباً کوئی نہیں دے سکتا۔ بس محبت ہو جاتی ہے اور ہوا بھی یہی تھا۔ اسی دو ماہ کے عرصے میں نذرؔل نے علی اکبر خان کی بیوہ بہن کی بیٹی کو دل دے دیا تھا اور شادی کی تاریخ ۳/آساڑھ (انگریزی ۱۸/ یا ۱۹/ جون ۱۹۲۱ء) مقرر ہو گئی تھی۔ شادی کے دعوت نامے تقسیم کئے جا چکے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ لیکن اچانک ہی یہ شادی ٹوٹ گئی۔ کامریڈ مظفر احمد نے "قاضی نذر الاسلام کی یادیں" نامی اپنی مشہور بنگلہ تصنیف میں اس شادی کے ٹوٹ جانے کا مفصل ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اچانک جون کے آخری ہفتہ میں ان کے نام نذر الاسلام کا خط آیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ علی اکبر خان نے ان کو دھوکا دیا ہے اور ان کی بے عزتی کی ہے۔ اور وہ اس بے عزتی سے بیمار ہو گئے ہیں۔ ان کو روپیوں کی سخت ضرورت ہے لہذا چند روپے

فوراً بھیج جائیں۔ یہ خط شہر کوملا کے اندر کمار سین گپت کے گھر سے نذرل نے لکھا تھا۔ مظفر احمد کے بقول انہوں نے ایک دوست سے بیس روپیہ قرض لے کر فوراً ہی منی آرڈر کر دیا تھا۔

اس کے بعد کلکتے میں نذرالاسلام کے چاہنے والوں نے ایک جلسہ کیا اور فیصلہ ہوا کہ نذرل کو کلکتہ لے آنے کے لئے کوئی فوراً کوملا جائے اور یہ ذمہ داری بھی مظفر احمد پر پڑی۔ مظفر احمد نے تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ کس طرح کلکتہ سے کوملا گئے۔ ۶ر جولائی ۱۹۲۱ء کو انہوں نے جا کر دیکھا کہ اندر کمار کے گھر والوں کی محبت اور خدمت سے نذرالاسلام نے نئی زندگی پائی ہے۔ اس سلسلے میں شہر کوملا کے نوجوانوں کی خدمات بھی قابل داد ہیں کہ ان لوگوں نے نذرل کو اتنا مشغول رکھا کہ وہ اپنا غم غلط کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

نذرل کا اولین عشق اور اس کی ناکامی کے سلسلے میں کامریڈ مظفر احمد نے جو کچھ قلم بند کیا ہے۔ وہ مختصر طور پر یوں ہے۔ دولت پور میں علی اکبر خان کے گھر میں نذرل کا سواگت کیا گیا تھا۔ علی اکبر خان کے گھر کے قریب ہی ان کی ایک بیوہ بڑی بہن کا گھر تھا۔ اس بیوہ بہن کی شادی کے لائق ایک بیٹی تھی۔ اس گھرانے کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ صرف ایک بیٹا تھا جو جہاز میں ملازمت کرتا تھا۔ بیوہ غریب بہن کی آخر کیا قدر و قیمت۔ لیکن نذرل کے جانے سے وہ بھی بیٹی کے ساتھ نذرل کو دیکھنے آنے جانے لگی تھیں۔ نذرل نہ صرف شاعر تھے بلکہ گیت کار بھی تھے اور گاتے بھی خوب تھے اور اپنے گیتوں کی وجہ سے وہ عام اَن پڑھ لوگوں کے بھی پیارے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی رات میں وہ بانسری بھی بجایا کرتے تھے۔ ایک دن اس دوشیزہ نے آ کر پوچھا "کل رات کیا آپ نے بانسری بجائی تھی۔ میں سنتی رہی"۔ بس یہی ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ان دونوں میں دیکھتے ہی دیکھتے میل ملاپ نہایت تیزی سے بڑھا۔ اس دوشیزہ کا نام سعیدہ خاتون تھا اور نذرل نے اسے نرگس کا نام دیا تھا۔ بقول مظفر احمد نرگس میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی۔ وہ نہ پڑھی لکھی تھی اور نہ علم و ادب کا ذوق رکھتی تھی۔ وہ نہ گا سکتی تھی۔ اور نہ علم موسیقی سے اسے کوئی لگاؤ تھا۔ پھر بھی وہ جو کہتے ہیں — عشق پر زور نہیں — نذرل نرگس کو دل دے بیٹھے تھے۔

اس کے بعد سے علی اکبر خان کی اداکاری شروع ہوتی ہے اور وہ میدان میں کود پڑتے ہیں۔ غریب بیوہ بہن نرگس کی ماں کی وہ خوشامد کرنے لگ جاتے ہیں کہ وہ قسمت والی ہے۔ نرگس اب زیادہ تر ماموں کے گھر رہنے لگی۔ ایک طرف علی اکبر خان نرگس کو تعلیم دینے اور اس میں کچھ ادبی ذوق پیدا کرنے میں دن رات لگ گئے تو دوسری طرف وہ شادی کی تیاریاں کرنے لگے۔ شادی ان کے گھر میں ہوگی اور وہی سب کچھ انتظام کریں گے۔ آخر وہ نرگس کے ماموں ہیں۔ شادی کے سلسلے میں علی اکبر خان نے کوملا کے اندر کمار سین گپت گھرانے کے افراد کو بھی دعوت دی تھی اور خود نذرالاسلام نے بھی برجا سندری دیوی کو لکھا تھا — "ماں اگر تم نہ آؤ تو میری طرف کا کوئی نہیں ہوگا تمہیں آنا ہی پڑے گا" — اور وہ سب لوگ گئے بھی تھے۔

لیکن جس طرح یکا یک ایک معمولی ملاقات سے اس داستانِ عشق

کی ابتداء ہوئی تھی اسی طرح ایک جھٹکے سے یہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی اور شادی ٹوٹ گئی۔ علی اکبر خان چاہتے تھے کہ نذرالاسلام یہ اقرار کرے کہ شادی کے بعد وہ نرگس کو لے کر دولت پور سے کہیں اور نہیں جائیں گے یعنی نذرل دولت پور ہی کے ہو کر رہیں گے۔ یہی وہ شرط تھی جسے نذرالاسلام نے قبول نہیں کیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح علی اکبر خان نذرالاسلام کو اپنا قیدی بنا لینا چاہتے تھے اور ان کی تمام تر تخلیقات کے مالک بننا چاہتے تھے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، نذرل نے کسی پابندی کو ماننے سے انکار کر دیا اور عقد ہونے سے رہ گیا۔ باغی شاعر نے محبت سے بغاوت کر دی اور اپنی آزادی پر اپنی محبت کو قربان کر دیا۔

لیکن جب تک نذرالاسلام پاگل نہیں ہوئے تھے تب تک وہ اپنی اس پہلی محبت کو بھلا نہیں سکے۔ نذرل کے کئی گیتوں اور نظموں میں ہم اس محبت کی پکار پاتے ہیں۔ ٹوٹے دل کی پکار — اس سلسلے میں ان کا ایک گیت نہایت مشہور و مقبول ہے جسے گراموفون کمپنی نے شری سنتوش کمار سین گپت کی آواز میں ریکارڈ کیا ہے۔ گیتوں کا ترجمہ کرنا دوبھر ہوتا ہے پھر بھی ابتدائی بول کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

''جسے کوئی اپنے ہاتھوں سے مالا نہیں پہنا سکے
اسے کیوں یاد رکھتے ہو — ؟
بھول جاؤ، اسے بھول جاؤ، بالکل ہی بھول جاؤ''۔

تعجب یہی ہے کہ عشق میں ناکامی سے نذرل کا دل مرجھا نہیں گیا۔ نرگس سے عشق کے دوران دولت پور میں نذرل نے کوئی نظم نہیں لکھی، کوئی گیت نہیں گایا۔ یہ عجیب بات ہے۔ عموماً شعراء زمانہ عشق میں زیادہ سے زیادہ اشعار کہتے ہیں لیکن نذرل دوران عشق خاموش رہے اور نرگس سے بچھڑنے کے بعد گویا ان کی شاعری نے نئی زندگی پائی اور شہر کومِلا میں اندر کمار سین گپت کے گھر لوٹنے کے بعد وہ یکے بعد دیگرے نظموں اور گیتوں کی تخلیق کرنے لگے اور حیرت ہے کہ ان میں عشق سے گھائل دل کی کوئی پرچھائیں تک پائی نہیں جاتی بلکہ یہ گیت اور نظمیں وقت کی آواز ہیں۔ انہوں نے ان دنوں نہ صرف انقلابی گیت اور نظمیں کہی ہیں بلکہ عملی طور پر بھی سیاسی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ان کی سب سے مشہور نظم جس کی وجہ سے وہ باغی شاعر کہلائے یعنی نظم ''باغی'' اسی دور کی تخلیق ہے (دسمبر ۱۹۲۱ء)۔ اس سے صاف ہے کہ عشق میں ناکامی نے شاعر کو باغی شاعر بنا دیا۔

شاعر کے ٹوٹے دل کو جوڑنے میں، شاعر کو نئی زندگی عطا کرنے میں کماری پرمیلا سین گپت آخر کار کامیاب ہوئی تھی۔ یہی وہ عشق ہے۔ جو کامیابی کی منزل تک پہنچ پایا۔ جب کومِلا میں گری بالا دیوی کی بیٹی پرمیلا سے نذرل کی ملاقات ہوئی تھی، ان دنوں پرمیلا ۱۴ برس کی تھی اور شاعر ۲۳ سال کا۔ عرض کر چکا ہوں کہ پرمیلا، گری بالا دیوی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ گری بالا جو اندر کمار سین گپت کی بیوہ بہن تھی اور کومِلا میں اندر کمار کے گھر ہی میں رہتی تھیں جس گھر کے افراد نے شہر کومِلا میں شاعر کو بالکل اپنوں کی طرح قبول کیا تھا۔ اس گھر کے مختلف افراد کے سلسلے میں نذرل نے چند نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جن سے اس گھر

والوں سے ان کی محبت نمایاں ہے۔ اس گھر کے افراد پڑھے لکھے تھے۔ اور ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ برجا سندری دیوی اور گری بالا دیوی دونوں میں ادبی ذوق تھا اور دونوں نے بیٹے کی طرح نذرلؔ کو اپنا لیا تھا۔

لیکن پرمیلا سے شادی میں کئی رکاوٹیں تھیں اور سب سے بڑی رکاوٹ تھی مذہب۔ لیکن گری بالا دیوی کی ہمت کو اس سلسلے میں داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ایک ماں جس نے نہ صرف نذرلؔ کو اپنے بیٹے کی طرح چاہا بلکہ جس نے بہ خوشی تمام تر رکاوٹوں کا مقابلہ کر کے اپنی اکلوتی بیٹی پرمیلا کا ہاتھ نذرالاسلام کے ہاتھوں میں تھما دیا اور وہ خود شادی کے لئے اپنی بیٹی کو لے کر کلکتہ چلی آئی تھی۔

شادی میں ایک اور رکاوٹ بھی پیش آئی تھی اور وہ نذرلؔ کی طرف سے۔ نذرلؔ ہمیشہ آزاد خیال رہے۔ وہ کسی بندھن کو نہیں مانتے تھے، چاہے وہ سماجی ہو یا مذہبی۔ اس کے باوجود شادی کو تو کوئی شکل دینی پڑے گی ورنہ شادی قانونی کیوں کر ہو لیکن نذرلؔ پرمیلا کو مذہب تبدیل کرانے کے حق میں نہیں تھے۔ نذرلؔ یہ خواب و خیال میں بھی نہیں لا سکتے تھے کہ شادی کے لئے پرمیلا کو مذہب بدلنا پڑے اور پھر گری بالا دیوی یا پرمیلا بھی مذہب کی تبدیلی پر راضی کیوں ہوں؟ ان دنوں شادی کی رجسٹری کے لئے ۱۸۷۲ء کا نمبر ۳ آئین لاگو تھا۔ اس کے مطابق شادی کے وقت دونوں کو اقرار کرنا ہوتا کہ وہ ہندو، مسلمان، عیسائی، بودھ، جین یا پارسی نہیں ہیں۔ چونکہ یہ قانون برہمو سماج کے رہنما کیشب چندر سین کی جدوجہد سے عمل میں آیا تھا اور ان دنوں برہمو سماجی اپنے آپ کو ہندو نہیں مانتے تھے۔ لہٰذا اقرار نامہ میں یہ کہا نہیں جاتا تھا کہ وہ برہمو نہیں ہیں۔ اس آئین کو سیول میرج ایکٹ ۱۸۷۲ کہا جاتا تھا اور عام طور پر یہ ۱۸۷۲ کا نمبر ۳ آئین کہلاتا تھا۔ اس آئین کے مطابق بھی اگر رجسٹری ہو جائے تو شادی کامیاب ہو سکتی تھی۔ لیکن اس میں ایک اور رکاوٹ بھی تھی۔ ان دنوں (اپریل ۱۹۲۴ء) پرمیلا ۱۶ برس کی تھی اور ۱۶ برس کی لڑکی کی شادی رجسٹر نہیں ہو سکتی تھی۔ دلہن کے لئے کم از کم عمر ۱۸ سال ہونا ضروری تھا۔ اب یہ سب قانون بدل چکا ہے۔

بہر حال پرمیلا اور نذرلؔ کی شادی ۱۸۷۲ء کے نمبر ۳ آئین کے مطابق نہیں ہو سکتی تھی لیکن کوئی راستہ تو نکالنا ہی تھا۔ جو ''اہل کتاب'' تسلیم کئے جاتے تھے وہ دلہن کے مذہب کو بدلے بغیر شادی کر سکتے تھے۔ دلہن اپنے مذہب کی پابندی کر سکتی تھی۔ مغل شہنشاہوں کی کئی بیگمات ہندو رہی ہیں۔ وہ اندر محل میں اپنے اپنے مذہب کو مانتی رہی ہیں' پوجا پاٹ کرتی رہی ہیں اور مذہبی رسوم ادا کرتی رہی ہیں' لہٰذا ہندو بھی ''اہل کتاب'' ہیں۔ یہی قرار دے کر نذرالاسلام اور پرمیلا کی شادی ۲۴ راپریل ۱۹۲۴ء کو کلکتہ کے نمبر ۶ حاجی لین کے مکان پر انجام دی گئی اور عقد پڑھانے کا فرض جناب معین الدین حسین نے انجام دیا۔

اس شادی سے برہمو سماج کے لوگ خاص کر ناراض ہوئے تھے۔ ماہنامہ ''پرباسی'' اور ہفتہ وار ''سنی بار پرچیٹھی'' میں اس سلسلے میں چند مضامین شائع بھی ہوئے تھے۔ ماہنامہ ''پرباسی'' جس میں نذرالاسلام کی نظمیں خاص

طور پر شائع ہوتی تھیں اور جس رسالے سے ان کو حق محنت بھی معقول ملا کرتا تھا، اس نے نذر الاسلام کی تخلیقات کو شائع کرنا تک بند کر دیا تھا۔ لیکن تمام تر مخالفت کے باوجود ہندوؤں میں نذر آل کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آنے پائی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے دل بدل جاتے ہیں۔ خیالات بدل جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ جس طرح عام لوگ اپنی بہن کے گھر جاتے آتے ہیں۔ اس طرح بریندر کمار سین گپت بھی نذر آل کے گھر آنے جانے لگے۔ برجا سندری دیوی، نذر آل کو بیٹے کی طرح چاہتی تھی۔ وہ بھی کومِلا سے کلکتہ نذر آل کو دیکھنے آئیں۔ بعد میں وہ کلکتہ ہی میں رہنے لگی تھیں۔ نذر آل ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ ہی میں برجا سندری انتقال کر گئی۔ اور اس وقت بھی نذر الاسلام موجود نہیں تھے۔ نذر آل برجا سندری کو ماں کی طرح چاہتے تھے۔ انہوں نے مجموعہ کلام ''سربا ہارا'' میں نذر عقیدت کے طور پر برجا سندری دیوی کے نام ایک طویل نظم لکھی ہے۔ اس نظم سے صاف ہے کہ نذر آل کے دل میں برجا سندری دیوی کو کتنا بلند مقام حاصل تھا۔

پرمیلا اور گری بالا دیوی جیسی عورتیں دنیا میں نایاب ہی ہیں۔ ان کے کردار کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ گری بالا دیوی نہ صرف لکھی پڑھی خاتون تھیں بلکہ ادبی ذوق بھی رکھتی تھیں اور کبھی کبھی لکھتی بھی تھیں۔ وہ نذر آل کی ہر تخلیق کے سلسلے میں جانتی تھیں۔ اگر نذر آل چند دنوں کے لئے بھی باہر ہوتے تو لوٹنے کے بعد اس نے ان دنوں میں کیا کچھ لکھا ہے وہ سب سنتی اور خوش ہوتی تھیں۔ اس عظیم ماں کا ذکر کرتے ہوئے مظفر احمد نے لکھا— ''یہ عظیم خاتون سماج کے تمام بندھنوں کو توڑ کر اپنی اکلوتی اولاد پرمیلا کا ہاتھ پکڑ کر، ایک دن اپنے دیور کے گھر سے نکل آئی تھی۔ آوارہ نذر الاسلام کے سنسار کو جوڑنے کے لئے۔ نذر آل کی شاعری اور وطن دوستی نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں سوچا کہ نذر آل مسلمان ہے۔ اطراف کی تمام تر مخالفت، بدنامی اور دشواریوں کو وہ جھیلتی رہی، سہتی رہی—''

ہگلی میں نذر الاسلام جب بیمار پڑے تھے اور جس بیماری سے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ان دنوں اس کی دن رات کی خدمت ہی سے نذر آل صحت مند ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ کرشن نگر میں بھی بیمار پڑے اور پھر ۱۹۴۲ء سے نذر آل اپنی یادداشت ہی کھو بیٹھے تب سے ۱۹۴۶ء تک گری بالا دیوی نے نذر آل کے لئے جو کچھ کیا وہ وہی لوگ جانتے ہیں جن لوگوں نے ان حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اسے نہ صرف نذر آل کی تیمارداری کرنی پڑی بلکہ اس کی اپنی بیٹی پرمیلا نے بھی بستر پکڑ لیا تھا۔ فالج سے پرمیلا کے جسم کا نچلا حصہ لگ گیا تھا اور وہ بستر پر پڑی رہتی تھی۔ داماد اور بیٹی کی تیمارداری ہی نہیں بلکہ دونوں ننھے بچوں کی پرورش کرنا بھی اسی کا کام تھا۔ اور پھر غریبی کا مقابلہ کرنے کے لئے اسے نذر آل کے دوستوں کے در در بھٹکنا بھی پڑا۔ اس طرح گری بالا دیوی کی پوری زندگی رنج و غم کی ایک طویل داستان ہے۔ غالباً آخر میں وہ اس زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔ اگست ۱۹۴۶ء میں وہ ایک دن کسی سے کچھ نہ کہہ کر، پرمیلا اور نذر الاسلام کو چھوڑ کر نہ معلوم کہاں چلی گئی۔ پھر کبھی

اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ لوگ کہتے ہیں وہ دیوانی ہوگئی تھی۔ بعض کا کہنا ہے کہ زندگی سے تنگ آکر وہ بنارس چلی گئی اور بعض کا خیال ہے کہ اس نے خودکشی کرلی۔ لیکن حقیقت کیا ہے، کون جانے ——؟

پرمیلا کی زندگی کی ایک اور درد بھری کہانی ہے۔ بیٹے بلبل کا انتقال۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں فالج کا حملہ جس سے اس کے جسم کا نچلا حصہ لگ گیا۔ اس کے بعد وہ برسوں صرف بستر پر پڑی رہی۔ اپنی زندگی میں پھر کبھی کھڑی نہیں ہوسکی۔ اس پر نذرالاسلام کا پاگل ہوجانا اور آخرکار ۱۹۴۶ میں ماں گری بالا دیوی کی گمشدگی۔ اس طرح پے در پے وہ دکھ پر دکھ جھیلتی رہی۔ گری بالا دیوی کے چلے جانے سے نذرل اور پرمیلا کی خدمت کیلئے کوئی نہ رہا۔ گری بالا دیوی ہی تو سب کچھ کیا کرتی تھی۔

دکھیاری پرمیلا بھی کتنی عظیم عورت تھی۔ ماں کے اس طرح گھر سے چلے جانے کے بعد وہ بستر پر لیٹی لیٹی گھر سنسار سنبھالتی رہی ہے۔ بستر پر لیٹے لیٹے ہی وہ نذرل کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ نوکر چاکر سے تمام کام کرواتی۔ بستر پر لیٹے لیٹے بازار سے سودا منگواتی، پکوان کی دیکھ بھال کرتی، سب کو کھلاتی پلاتی۔ بستر پر کسی طرح بیٹھ کر وہ ترکاری اور مچھلی کاٹتی۔ روپے پیسوں کا حساب رکھتی۔ لڑکے تو عموماً گھر پر نہیں ہوتے تھے۔ کتنے لوگ ہر روز شاعر کو دیکھنے آتے۔ ان لوگوں کی آؤ بھگت بھی وہی کرتی۔ لیکن آخر اس کے دن بھی پورے ہوگئے اور ۳۰ رجون ۱۹۶۲ء کو وہ بھی چل بسی۔

سانیٹ　　　　　　ف۔س۔ اعجاز

من وتو

بارہا خود سے یہ پوچھا ہے ترا کون ہوں میں
روز و شب دل تری چاہت میں بکھرتا کیوں ہے
مرے جذبات کا طوفان گذرتا کیوں ہے
اجنبی درد کی آہٹ کے سوا کون ہوں میں

قہقہوں کا یہ ترنم ہے اگر میرے لئے
میرے سینے میں یہ آہوں کا دھواں سا کیا ہے
میری پلکوں پہ کوئی اشک رواں سا کیا ہے
یہ دل آویز تبسم ہے اگر میرے لئے

مدتیں بیت گئیں اپنی شناسائی کو
جب بھی دیکھا ہے تجھے دل مرے پہلو سے گیا
پر لگا کر یہ اُڑا اور مرے قابو سے گیا
ضبط میں لا نہ سکا میں دلِ سودائی کو

اے خیالوں سے لپٹتی ہوئی رنگیں خوشبو
مرے کانوں میں یہ کہہ دے کہ مری کون ہے تو

ڈاکٹر معصوم شرقی

چند بنگالی ادیبوں کی داستانِ معاشقہ

پریوجنیر پریوتما (PRIOJONER PRIOTOMA) کے عنوان سے پارتھو جیت گنگو پادھیائے نے ایک کتاب ترتیب دی ہے جسے "چترا پرکاشنی" کلکتہ نے شائع کیا ہے۔ میں نے اپنے مضمون کو سپردِ قلم کرتے وقت اس کتاب سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان ہستیوں سے بھی ذاتی طور پر ملا ہوں جن کا متعلقہ بنگالی قلم کاروں سے تعلق خاص رہا ہے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مضمون کے تمام واقعات حقائق پر مبنی ہیں۔ (م ش)

کہتے ہیں کہ عشق سے دنیا کا وجود ہے۔ یہ عشق ہی ہے جس کا جلال و جمال نہ صرف دنیا کی زندہ یادگاروں میں موجود ہے بلکہ عالمی ادب کی شاہکار تخلیقات بھی اس کے جلووں سے روشن وتابندہ ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی ادب اس سے خالی نہیں۔ بیشتر ادیبوں اور شاعروں کا یہ محبوب موضوع رہا ہے اور اس کی کرشمہ سازیاں ہر دور میں عالمی ادب کو مسحور کرتی رہی ہیں۔

یہ عشق ہی کی برکت ہے کہ اس کی جن داستانوں کو دنیا کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جو لازوال و بے مثال ہیں اور صدیاں گذرنے کے بعد بھی زندہ دلوں کو اپنی تجلی سے منور کررہی ہیں۔

شبلی جیسے اہلِ قلم نے 'الغزالی' 'المامون' اور 'الفاروق' جیسی گراں مایہ کتابیں تصنیف کیں تو عطیہ فیضی کو عشقیہ خطوط بھی لکھے۔ داغ جس نے اردو شاعری کے دامن کو گلہائے رنگارنگ سے بھرا تو منی بائی حجاب کو بے شمار عشقیہ خطوط بھی تحریر کیے۔ گوئٹے، کیٹس، شیلی، براؤننگ، گورکی، بائرن، ٹالسٹائے اور برنارڈ شا نے اپنی معرکۃ الآرا تصانیف سے انگریزی ادب کو فروغ بخشا مگر عشق کی اثر انگیزی نے ان سے عشقیہ خطوط بھی لکھوائے۔

ہندی کے ادبا و شعرا کی حیاتِ معاشقہ سے ادب کے صفحات خالی نہیں۔ گھنانند اور سجان کا معاشقہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سجان کی محبت میں گھنانند نے "سجان چرتر"، "عشق لتا" اور "بیوگ بیل" جیسی بیش بہا کتابیں لکھیں۔ سترہویں صدی میں داراشکوہ کے درباری شاعر پنڈت راج جگن ناتھ نے لونگی نامی ایک خوبصورت لڑکی سے عشق کیا اور اپنی لافانی تخلیق "گنگا لہری" بطور یادگار چھوڑی۔ شیاما اور بھگوتی نام کی طوائفوں سے جے شنکر پرساد کا رومان ہندی ادب میں مشہور ہے۔ اس سلسلے میں جے شنکر پرساد کی تصانیف "کامائنی"، "لہر"، "آنسو" اور "جھرنا" اہمیت کی حامل ہیں۔

ہندی کے مایہ ناز شاعر سُمترا نندن پنت اور کالا کانکر کے شاہی گھرانے کی لڑکی سے عشق کا تذکرہ مختلف لوگوں نے دبے لفظوں میں کیا ہے۔

بنگالی زبان کے بعض ادبا و شعرا کی حیاتِ معاشقہ ادب میں موضوعِ بحث رہی ہے۔ مشاہیر اہلِ قلم نے اپنی گراں قدر تخلیقات سے بنگلہ ادب کو عالمی ادب کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ان کی داخلی زندگی میں عشق کارفرما رہا جس کی بدولت اعلیٰ اور معیاری تصانیف منظرِ عام پر آئیں۔ چونکہ اس مقالے کا تعلق بنگالی ادبا و شعرا کی حیاتِ معاشقہ سے ہے اس لیے میں یہاں چند مشاہیر اہلِ قلم کی داخلی زندگی اور ان کی حیاتِ معاشقہ کے چند اہم واقعات پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔

قاضی نذر الاسلام

نذر الاسلام کی شہرہ آفاق نظم ''بدروہی'' (باغی) جنوری ۱۹۲۲ء میں بنگلہ ماہنامہ ''بجلی'' اور ''مسلم بھارت'' میں شائع ہوئی جسے ہندوستان کے عوام و خواص نے پڑھا۔ یہی نظم عشق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ کومِلا مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) میں ایک لڑکی سے نذرؔل کی ملاقات ہوئی جو ان کی شاعری کی پرستار و مداح تھی۔ رفتہ رفتہ ملاقات عشق میں بدل گئی۔ اس کا اصل نام تھا ''آشالتا سین گپتا'' لیکن نذرؔل نے اسے ایک نئے نام ''پرمیلاؔ'' سے سرفراز کیا۔ ۶ حاجی لین' کلکتہ میں ۲۴ راپریل ۱۹۲۴ء کو نذرؔل اور پرمیلاؔ کی شادی ہوگئی۔ ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار و کامیاب تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کی۔ ۳۰ رجون ۱۹۶۲ء میں پرمیلاؔ نے آخری سانس لی۔ اس کی آخری خواہش تھی کہ نذرؔل کی پیدائشی جگہ چُرولیا ضلع بردوان میں اسے دفن کیا جائے۔ درج ذیل عبارت پرمیلاؔ کی لوحِ تربت پر درج ہے۔

> ''جو لوگ نسلی امتیاز کے قائل ہیں وہ نذرؔل اور پرمیلاؔ کے بارے میں سوچیں گے اور اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ محبت کی کوئی ذات نہیں ہوتی اور انسانیت سے بڑا کوئی مذہب نہیں ہوتا''۔

لیکن پرمیلاؔ سے قبل نذر الاسلام نے نرگس بیگم نام کی ایک لڑکی سے جذباتی طور پر محبت کی تھی جسے انہوں نے ''حاصلِ زندگی'' سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ عقد بھی ہوا لیکن رخصتی سے قبل نرگس بیگم کے ماموں علی اکبر اندرونی اختلافات کے سبب چٹان بن کر حائل ہو گئے۔ انجام کار عقد ٹوٹ گیا۔ نذرؔل کی زندگی کے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر نذرؔل کی زندگی میں نرگس بیگم نہیں آتی تو شاید وہ اپنی شہرۂ آفاق تصانیف ہرگز خلق نہیں کر پاتے۔ یوں تو نذر الاسلام نے نرگس بیگم سے علاحدگی اختیار کر لی' دوسری شادی کر لی لیکن نرگس کی یاد ان کے دل سے کبھی محو نہ ہو سکی۔ ان کا جذبۂ عشق سلامت رہا۔ ان کی محبت دل میں جاگزیں رہی۔ نرگس بیگم سے علاحدگی کے تقریباً سولہ سال بعد یکم جولائی ۱۹۳۷ء کو نرگس کے ایک خط کے جواب میں نذر الاسلام نے لکھا تھا:

میری عزیز!

جس دن تمہارا خط ملا اس دن نئی برسات کی ابتدا ہوئی تھی اور صبح کا چہرہ دھلا ہوا تھا۔ اس دن بادل آسمان سے بے شمار بوندیں برسا رہا تھا۔ پندرہ سال قبل اسی طرح اساڑھ کے مہینے میں موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ تمہیں بھی یاد ہو شاید!! اساڑھ کے نئے بادلوں کو میرا سلام کہہ دینا۔ کالی داس کے زمانے میں بھی میگھ دوت ہجر کے مارے دھن دیوتا کا پیغام ریوا ندی کے کنارے مالویکا کے دیش میں اس کی محبوبہ کے پاس لے گیا تھا۔ یہ گھنگھور گھٹائیں میری زندگی میں شدید رنج و غم کا احساس جگا دیتی ہیں۔ یہ اساڑھ کا مہینہ مجھے میرے تخیل کی جنت سے باہر کھینچ کر غم و اندوہ کے دھارے میں بہا دیتا ہے۔ بہر حال' تمہارے سوالوں اور شکایتوں کا جواب حاضر ہے۔ تم یقین مانو! میں جو کچھ تحریر کر رہا ہوں وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ لوگوں کی باتیں سن کر اگر تم نے میرے بارے میں کوئی اندازہ لگایا تو یہ تمہاری غلطی ہو گی اور وہ جھوٹ ہو گا۔ میرے دل میں تمہارے خلاف کوئی کدورت نہیں ہے۔ یہ میں تمہیں اپنے دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں۔ میرا خدا جانتا ہے کہ تمہارے لیے میرے دل میں کتنا گہرا زخم اور کتنا شدید درد پوشیدہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی اس غم کی آگ میں جلو جس میں میں جل رہا ہوں۔ اگر تم مجھے اس آگ کے لمس کی روشنی نہ بخشتیں تو میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ ضبط تحریر میں نہیں آتا۔ تمہارے غم اور چوٹ کی وجہ سے آج دنیا والے مجھے دمدار ستارے کی مانند جان رہے ہیں۔ میں نے اپنی نوجوانی میں پہلی بار جو تمہاری پیاری صورت دیکھی تھی' جس صورت کو میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار محبت کا تقدس بخشا تھا وہ صورت آج بھی میرے دل میں جنت کے پھول کی طرح شاداب و شگفتہ ہے۔ اندر کی آگ باہر کے اس پھول کے بار کو مس نہیں کر سکی ہے!!

تمہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ میں ایک شاعر ہوں۔ میں ضرب بھی لگاتا ہوں تو پھولوں سے ضرب لگاتا ہوں۔ بدصورتی اور کریہ المنظری کی مجھے کوئی آرزو نہیں۔ میری ضرب وحشیوں اور بزدلوں کی ضرب کی طرح سنگدل نہیں ہے۔ میرا خدا گواہ ہے (تم نے کیا سنا ہے اور تمہیں کیا کچھ معلوم ہوا ہے مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے) مجھے اپنے خلاف کوئی شکایت آج بھی نہیں ہے' کوئی سوال نہیں ہے' کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ میں نے کبھی تمہارے پاس کسی پیغامبر کو نہیں بھیجا۔ ہمارے درمیان جو وسیع خلیج حائل ہے اس کو پل بنا کر پاٹنا تو خیر انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ خود خدا کے لیے بھی ممکن ہو گا یا نہیں' مجھے شک ہے۔ میرا یقین کرو' میں نے ان کمینوں کی باتوں پر کبھی یقین نہیں کیا۔ کرتا تو خط کا جواب نہ دیتا۔ میں پھر کہتا ہوں میرے دل میں تمہارے خلاف کوئی جذبہ نہیں ہے۔ تمہارے اوپر میرا کوئی حق بھی نہیں ہے۔ گرچہ میں گراموفون کمپنی کے ٹریڈ مارک "کتے" کی خدمت کرتا ہوں لیکن کسی کے تعاقب میں کتے نہیں چھوڑتا۔ تمہارے ہی ڈھاکہ کے کتے نے ایک بار بے خیالی میں مجھے کاٹ کھایا تھا۔ لیکن طاقت رکھنے کے باوجود میں نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ انہیں زک پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ تم نے لکھا ہے انہیں کتوں کے ڈر سے ڈھاکہ جانے کی میری ہمت نہیں ہوتی۔ تمہارا یہ جملہ پڑھ کر

مجھے ہنسی آ گئی۔ تم تو جانتی ہو کہ لڑکے سب مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ میری ہی
درخواست پر میرے چاہنے والوں نے انہیں معاف کر دیا تھا ورنہ روئے زمین
پر ان کا نشان بھی باقی نہ رہتا۔ مجھے پہچاننے کا تمہیں کچھ زیادہ موقع نہیں ملا۔
اسی لیے تم نے ایسی باتیں لکھی ہیں۔ خیر جانے دو' تم حسین ہو' دولت مند ہو'
بہترین اوصاف کی حامل ہو۔ اس لیے تمہارے امیدواروں کی کوئی کمی نہ
ہوگی۔ اگر تم اپنی مرضی سے اپنا سوئمبر رچانا چاہو تو اس میں مجھے کیا اعتراض
ہوسکتا ہے۔ تمہیں منع کرنے یا حکم دینے کا مجھے کیا حق پہنچتا ہے؟ اس بے رحم
تقدیر نے مجھے تمام حقوق سے آزاد کر دیا ہے۔

آج تمہاری صورت کیسی ہے مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو صرف تمہاری
دوشیزگی کا چہرہ یاد ہے جسے میں نے دیوی کی مورتی بنا کر اپنے دل کے تخت پر
لازوال محبت اور لازوال احترام کے ساتھ بٹھانا چاہا تھا۔ اس دن تم نے وہ
تخت قبول نہیں کیا تھا۔ پتھر کی دیوی کی طرح تم نے درد کے تخت کا انتخاب
کر لیا۔ زندگی بھر اسی جگہ میری پوجا کی آرتی جاری ہے۔ آج تم میرے لیے
ایک سراب ہو۔ بیکار سی شئے ہو۔ اس لیے تمہیں پانے کی مجھے کوئی آرزو نہیں
ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا' ممکن ہے تمہارا چہرہ دیکھ کر میری بے قراری میں اضافہ
ہو جائے۔ میرے درد کی شدت میں زیادتی آ جائے۔ اسی لیے اسے قبول
کرنے میں مجھے تامل ہوتا رہا ہے۔

گرد و غبار سے اٹی ہوئی اس دنیا میں ملاقات نہیں بھی ہوئی تو کیا۔
مگر گرد و غبار میں محبت کے پھول ماند پڑ جاتے ہیں' داغدار ہو جاتے ہیں'
بدصورت ہو جاتے ہیں۔ تم اگر سچ مچ مجھ سے محبت کرتی ہو' مجھے چاہتی ہو تو مجھے
وہیں سے پالو گی۔ لیلیٰ کو مجنوں نہیں ملا' شیریں کو فرہاد نہیں ملا پھر بھی ان دونوں
کی طرح کسی نے بھی اپنے محبوب کو نہیں پایا۔ خودکشی گناہ عظیم ہے۔ یہ بہت
پرانی بات ہے۔ پھر بھی حقیقت یہی ہے۔ روح غیر فانی ہے۔ اسے کوئی بھی قتل
نہیں کر سکتا۔ محبت کی سونے کی کاٹھی کا لمس اگر تم نے پا لیا ہے تو پھر تم جیسا خوش
قسمت اور کون ہو سکتا ہے؟۔ اس کی فریفتگی کے لمس سے تمہارا ابھی کچھ جگمگا اٹھے
گا۔ اسی کی روشنی سے سب کچھ منور ہو جائے گا۔ غم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ایک
گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہو جانے سے غم کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ انسان اگر
چاہے تو اپنی ریاضت اور اپنی تپسیا سے اپنی بھول کو پھول کی شکل میں کھلا سکتا
ہے۔ اگر تم نے اپنی زندگی میں کوئی غلطی کی ہے تو اس کا ازالہ اسی زندگی میں
کرنا ہوگا جبھی تمہیں خوشی ملے گی' نجات ملے گی اور سارے غم کا خاتمہ ہو جائے
گا۔ خود کو سربلند کرنے کی کوشش کرو۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔ میں دنیادار
ہوں پھر بھی دنیاوی رکاوٹوں کو پھلانگ کر اسی بلندی تک جا پہنچتا ہوں جہاں
دنیا کا سارا ادھورا پن' ساری خطائیں عفو و درگذر کی خوبصورت نگاہوں میں
تحلیل ہو جاتی ہیں' خوبصورتی کے قالب میں ڈھل جاتی ہیں۔

خط لکھتے ہوئے اچانک پندرہ سال پہلے کی بات یاد آ گئی ہے۔ تمہیں
بخار آ گیا تھا۔ بڑی ریاضتوں کے بعد میری تشنہ دونوں ہتھیلیاں تمہاری
خوبصورت روشن پیشانی کو چھو سکی تھیں۔ تمہاری گرم پیشانی کا وہ لمس میں آج
بھی اپنی ہتھیلیوں میں محسوس کرتا ہوں۔ تم نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تھا

کیا؟ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہاتھوں میں تمہاری خدمت کرنے کی بیقرار آرزو اور دل میں تمہاری صحت یابی کے لیے خدا سے دردمندانہ التجا تھی۔ مجھے آج بھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ استدادِ زمانہ بھی مجھ سے ان دنوں کی یادوں کو چھین نہیں سکا ہے۔ ان دنوں محبت کا جذبہ کتنا شدید تھا اور کتنی شدید بے چینیاں تھیں۔ ساری ساری رات میری آنکھوں میں نیند نہیں ہوتی۔ بہر حال' آج میں زندگی کے بیتے دنوں کی آخری کرن کا سرا پکڑ کر جزر کی موجوں کے ساتھ چل پڑا ہوں۔ تمہاری طاقت نہیں ہے کہ مجھے اس راستے سے لوٹا سکو۔ اب اور اس کی کوشش بھی مت کرنا۔ تمہارے نام میرا لکھا ہوا یہ پہلا اور آخری خط ہے۔ میں جہاں بھی رہوں گا یقین کرو میری نیک تمنائیں اور نیک دعائیں تمہارا احاطہ کیے ہوئے ہوں گی۔!!

نذرل

سرت چندر چترجی

سرت چندر چترجی رنگون میں جہاں اقامت پذیر تھے مالک مکان حد درجے کا شرابی تھا۔ اس کی ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کا نام شانتی تھا۔ ایک دن شانتی کے باپ نے نشے کی حالت میں ایک بوڑھے سے پیشگی رقم لے کر شانتی کا رشتہ طے کر دیا۔ بوڑھے نے شانتی کو اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا۔ بات بڑھ گئی۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ہنگامے کے دوران شانتی سرت چندر کے کمرے میں جا چھپی۔ جب سرت چندر واپس آئے تو اسے دیکھ کر پریشان ہوئے۔ شانتی نے تمام واقعہ بیان کیا۔ سرت چندر نے اس کے باپ کو بہت سمجھایا مگر لاحاصل۔ غصے میں آکر انہوں نے شانتی سے شادی کر لی۔ دونوں کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب تھی۔ شادی کے دو سال بعد ہی رنگون میں طاعون کی بیماری پھیلی اور شانتی سرت چندر کو داغ مفارقت دے گئی۔ اس غم نے سرت چندر کو از خود رفتہ بنا دیا۔ وہ حواس باختہ ہو گئے۔ کافی دنوں کے بعد زندگی معمول پر آئی۔ سرت چندر نے شانتی کی یاد میں بہت سے ناول لکھ ڈالے اور بنگلہ ادب کو بے شمار مختصر کہانیاں دیں۔

شانتی سے پہلے سرت چندر نے ہیرن موئی دیوی کو دل ہی دل میں پسند کر لیا تھا۔ یک طرفہ محبت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ہیرن موئی دیوی اپنے والدین کے ہمراہ کلکتہ سے رنگون سیر و تفریح کے لیے گئی تھی۔ شانتی کے انتقال کے بعد ہیرن موئی دیوی کی محبت عود کر آئی۔ لہٰذا وہ کلکتہ آئے اور ہیرن موئی دیوی سے شادی کر لی۔ سرت چندر نے ہیرن موئی دیوی سے جذباتی طور پر عشق کیا تھا۔

مائیکل مدھوسودن

اصل نام مدھوسودن دت۔ چونکہ کرسچن مذہب اختیار کر لیا تھا اس لیے نام کے ساتھ مائیکل لکھنے لگے لیکن بنگلہ ادب میں مدھوسودن کے نام سے شہرت پائی۔ ڈرامہ' ناول' نظمیں' مختصر کہانیاں اور بنرجی ابنا کی محبت مدھوسودن کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ ابتدائی تعلیم کلکتہ اور ہوڑہ میں پائی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے۔

مدھوسودن کا پہلا عشق کلکتے میں دیوکی نام کی ایک لڑکی سے ہوا لیکن شرابی طبیعت کی بنا پر دیوکی کے والد کرشن موہن بنرجی شادی سے انکار کر گئے

اور مدھوسودن کا عشق ادھورا رہ گیا۔ بسلسلۂ ملازمت انھیں مدراس جانا پڑا' وہاں انھوں نے اپنا مشہور ناول CAPTIVE LADY انگریزی میں تصنیف کیا۔ یہ ناول دوسری محبت کا محرک ثابت ہوا۔ مدراس میں ایک امریکن لڑکی ریبکا میکا ناوس سے نگاہیں چار ہوئیں۔ دونوں ایک دوسرے کے بے حد قریب آگئے۔ لیکن لڑکی والے بیچ میں حائل ہوگئے۔ مدراس کے ایک ایڈوکیٹ جنرل نارٹن کی کوششوں سے رکاوٹ ختم ہوگئی۔ رجسٹری شادی کی فیس مدھوسودن کی تنخواہ سے زیادہ تھی اس لیے دوستوں اور عزیزوں کے درمیان شادی کی قسمیں کھائی گئیں۔ اس طرح شادی کی رسم انجام کو پہنچی۔ ریبکا میکا ناوس مدھوسودن کی زندگی میں آگئی' دونوں نے ایک نئی زندگی شروع کی۔ مدھوسودن نے اپنے ایک قریبی دوست کو ذاتی خط میں لکھا تھا۔

"She is a fine girl"۔!!

مدھوسودن نے ریبکا سے ٹوٹ کر محبت کی تھی اور اس کی محبت کے زیر اثر انھوں نے شاہکار تخلیقات پیش کیں لیکن مدھوسودن کی تلون مزاجی نے ریبکا پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مدراس میں ہی پریسی ڈنسی کالج کے پروفیسر کی بیٹی ہنری اینا سے پیمانِ وفا باندھنے لگے۔ دونوں کا عشق پروان چڑھتا رہا۔ آخرکار دسمبر ۱۸۵۵ء میں ریبکا سے خلع حاصل کرکے ہنری اینا سے قانونی طور پر شادی رچالی۔

ریبکا نے دوسری شادی نہیں کی بلکہ اپنے چار چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ زندگی گذارنے لگی' اس طرح سینتیس (۳۷) سال گذر گئے۔ مدھوسودن کی موت کے تقریباً بیس سال بعد ریبکا کا انتقال ہوا۔

ہنری اینا اگرچہ کرسچن تھی لیکن بنگلہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ادب سے گہرا شغف رکھتی تھی، وہ مدھوسودن کی شریک حیات کے ساتھ شریک قلم بھی ثابت ہوئی۔ اس نے پیرس سے بہت ساری کتابیں لاکر مدھوسودن کو دیں جن میں مدھوسودن کے محبوب شاعر ملٹن کی کتاب PARADISE LOST بھی تھی۔ وہ ملٹن سے اس قدر متاثر تھے کہ اپنے بیٹے کا نام بھی فریڈرک مائیکل ملٹن رکھا۔

ہنری اینا اپنے شوہر پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ مشرقی تہذیب میں بالکل رنگ گئی اور مشرقی تہذیب کی بڑی دلدادہ تھی۔ مدھوسودن اور ہنری اینا کا عشق بنگلہ ادب میں کافی مشہور ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب گذری لیکن مدھوسودن اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ کثرت شراب نوشی سے دن پر دن صحت گرتی چلی گئی۔ شوہر کی اس حالت سے ہنری اینا نے بہت گہرا اثر قبول کیا اور وہ بری طرح بیمار پڑگئی۔ مدھوسودن کا ایک قریبی دوست مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوا تو ہنری اینا نے کہا۔'' آپ میری فکر نہ کیجیے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ اگر آپ سے ہوسکے تو میرے شوہر کو بچالیجیے!!''

۲۶ رجون ۱۸۷۳ء کو ہنری اینا کا انتقال ہوا اور لوئر سرکلر روڈ کلکتہ میں اس کی سمادھی بنائی گئی۔ بیوی کی جدائی کا غم مدھوسودن کے لیے جاں گسل ثابت ہوا۔ موت کی خبر سن کر مدھوسودن نے کہا تھا۔'' اے خدا! ہم دونوں کی قبریں ایک جگہ اور ایک ساتھ کیوں نہ بنیں۔'' خدا نے اس کی دعا قبول کرلی

اور ٹھیک اس کے تین روز بعد مائیکل مدھوسودن کا انتقال ہو گیا۔

سمریس باسُو:

بنگلہ ادب کے محبوب افسانہ نگار سمریس باسُو کا نام سنہری حروف میں لکھا جاتا ہے جس کی سینکڑوں کہانیاں اور ناول قرطاسِ ادب پر پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض کہانیوں پر معیاری فلمیں بھی بنائی جا چکی ہیں۔ اس عظیم فنکار کی زندگی عجیب و غریب گذری ہے۔ اس کی زندگی پر ہمیشہ غم کے بادل چھائے رہے لیکن گورتی دیوی کی محبت نے زخموں پر مرہم کا کام کیا۔

سمریس باسو بچپن ہی سے حوصلہ مند تھے۔ عمدہ گاتے اور بانسری اچھی بجاتے تھے۔ لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنے والوں کے وہ کٹر مخالف تھے۔ سڑک چھاپ نوجوانوں کی حرکت پر وہ ہندی فلموں کے ہیرو کی طرح مار پیٹ شروع کر دیتے تھے۔ بڑوہ برج نئی ہٹی کا واقعہ ہے کہ سمریس باسو نے تنہا کئی نوجوانوں کی خوب جم کر پٹائی کر دی تھی جسے دیکھ کر پولس اور مقامی لوگ ششدر رہ گئے تھے۔ اسی زمانے میں ہیلو (HELOO) نام کی ایک لڑکی سے نئی ہٹی میں سمریس باسو کو عشق ہو گیا۔ وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو کر خوابوں کے محل بنانے لگے مگر وہ لڑکی بے وفا نکلی اور ایک مسلم نوجوان سے شادی کر لی۔ اس صدمۂ جانکاہ نے سمریس کو نیم پاگل بنا دیا۔ وہ صدمے کی تاب نہ لا سکے اور شدید بیمار پڑ گئے۔ رفتہ رفتہ یرقان کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔

گورتی دیوی سمریس باسو کے دوست دیوشنکر چٹرجی کی بہن تھی جو پڑوس ہی میں رہا کرتی تھی۔ وہ شادی شدہ تھی مگر اس کا شوہر شرابی تھا اس لیے وہ اپنے بھائی کے پاس چلی آئی تھی۔ سمریس باسو کی گرتی ہوئی حالت گورتی دیوی سے دیکھی نہ گئی اور ان کی تکلیف میں برابر کی شریک ہو گئی۔ گورتی دیوی کو ہیلو کی بے وفائی کا علم تھا اس لیے جی جان سے ان کی خدمت اور تیمارداری میں لگ گئی۔ مرض میں کچھ افاقہ ہوا تو گوری دیوی نے اپنے زیورات بیچ کر سمریس باسو کو تبدیلی آب و ہوا کے لیے غازی پور بھیج دیا اور چند ماہ کے بعد وہ تندرست ہو کر نئی ہٹی آ گئے۔ گورتی نے سمریس باسو کا دل جیت لیا تھا۔ وہ بھی گورتی کی طرف کھنچے چلے گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے۔ آس پاس کے لوگوں نے ان کے تعلق کو طشت از بام کرنا شروع کر دیا مگر انھوں نے اس کی کوئی پروانہ کی اور شادی کا فیصلہ کر لیا۔ مگر یہ شادی نئی ہٹی میں ممکن نہیں تھی اس لیے بھاگ کر آدپور (جگدل) چلے آئے۔ سمریس باسو کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ گذارے کے لیے آفیسر کالونی میں انڈے بیچنے لگے۔ یہاں کے لوگوں نے بھی اس واقعے کو اچھالنا شروع کر دیا اور پیچھے پڑ گئے۔ سمریس باسو تنگ آ کر طرف دار پاڑہ (آدپور) منتقل ہو گئے۔ وہاں کا ماحول قدرے بہتر تھا لیکن مقامی لوگ آوازے کسنے لگے۔ سمریس باسو نے گوری دیوی کے لیے کافی اذیتیں اٹھائیں۔ ایک روز پولس آ دھمکی۔ ان پر لڑکی بھگانے کا الزام عائد کیا گیا۔ سمریس باسو نے زیورات گروی رکھ کر بارکپور کورٹ سے رجسٹری شادی کر لی۔ پریشانیاں ختم ہوئیں۔ برسوں تک سمریس اور گورتی محبت کے گہوارے میں زندگی کا سفر طے کرتے رہے لیکن آسودہ حال زندگی پر اچانک غم کے بادل چھا گئے۔ گوری دیوی کی

چھوٹی بہن دھرتری دیوی سے سریس باسو محبت کی پینگ بڑھانے لگے۔ دھرتری دیوی بھی سریس کی طرف جھکنے لگی۔ دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ رفتہ رفتہ راز افشا ہو گیا۔ گوری دیوی پر جب یہ عشق واضح ہوا تو اس پر بجلی گر پڑی۔ سمجھانے کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ سریس کی زندگی مثلث بن چکی تھی۔ اس سے نکلنا ان کے لیے محال تھا۔ آخرکار مارچ ۱۹۶۷ء میں کلکتہ جا کر دھرتری دیوی سے شادی کر کے دوسری دنیا آباد کر لی' ادھر گوری دیوی نئی دہلی میں بچوں کے ساتھ زندگی کے دن پورے کرنے لگی۔

سریس باسو قلم کے مزدور تھے۔ لکھنا پڑھنا ان کا معمول تھا اور ادب ان کی گھٹی میں شامل تھا۔ کمیونزم سے وابستگی کے سبب رائفل فیکٹری اچھا پور میں ایک اچھی ملازمت مل گئی تھی لیکن جیل سے رہا ہونے کے بعد یہ نوکری بھی جاتی رہی مگر ہر حال میں انھوں نے قلم کا سفر جاری رکھا۔ گوری دیوی کی آواز بہت سریلی تھی۔ وہ بہت عمدہ گانے گاتی تھی۔ موسیقی سے اسے بے حد شوق تھا۔ ماہر موسیقی اندو بالا اور کیکا بندوپادھیائے سے موسیقی کی تعلیم پائی تھی۔ گوری دیوی شاعری بھی کرتی تھی۔ اس کی بیشتر نظمیں غم سے عبارت ہیں۔ سریس کی یاد گوری کے دل سے نہ جا سکی۔ وہ ہمیشہ اپنے شوہر کی خبر گیری کرتی رہتی تھی۔ محبت کوئی کمزور شیشہ نہیں کہ ذرا سی چوٹ لگے اور ٹوٹ جائے۔ کئی سال گذرنے کے بعد سریس باسو کو گوری کی یاد ستانے لگی۔ احساسِ ندامت نے ملنے پر مجبور کر دیا۔ حالات معمول پر آ گئے۔ سریس نے نئی دہلی آنا جانا شروع کر دیا۔ ہر ہفتے نئی دہلی آتے اور دو تین روز گوری کے ساتھ گذارتے۔ سریس کی مثلث نما زندگی میں ایک بار پھر ہم آہنگی پیدا ہو گئی لیکن گوری کی صحت روز بروز خراب ہوتی گئی اور جولائی ۱۹۸۰ء میں اس وفا کی دیوی کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ اس کے آٹھ سال بعد سریس باسو کا انتقال ۱۲ر مارچ ۱۹۸۸ء میں نئی دہلی میں ہوا۔

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

۲۲۔ اس کے جذبات خالص محبت کے بہترین اجزاء کے سوا کسی شئے سے نہیں بنے ہیں۔

Antony & Cleopatra - Act 3, Scene 5

۲۳۔ چاہنے والے خود اپنی خوبصورتیوں سے اپنی عاشقانہ رسمیں ادا کر سکتے ہیں۔

Romeo & Julliet - Act 3, Scene 2

۲۴۔ محبت نے مجھے ایک پالتو سانپ بنا دیا ہے۔

As You Like It - Act 4, Scene 3

۲۵۔ وہ مجھے ان خطرات کے لئے پیار کرتی تھی جو میں جھیل چکا اور میں اسے اسلئے چاہتا تھا کہ اُسے اُن کا افسوس تھا۔

Othello - Act 1, Scene 3

۲۶۔ او محبت کی یہ بہار کیسی ہے۔ اپریل کے ایک دن کی غیر یقینی چمک جیسی جو ابھی سورج کی تمام خوبصورتی کو عیاں کرتی ہے اور ابھی ایک بادل جیسی جو اس ساری خوبصورتی کو چھین لیتا ہے۔

The Two Gentlemen of Verona - Act 1, Scene 3

۲۷۔ قسم مجھ سے نہ لی جائے لیکن محبت مجھے شتر مرغ میں تبدیل کر سکتی ہے۔

Much Ado About Nothing - Act 2, Scene 3

چلم لیلا

تلگو کے ایک عظیم فنکار چلم کی حیات معاشقہ

جدید تلگو ادب میں گڈی پاٹی وینکٹ چلم جو عام طور پر چلم کے نام سے مشہور ہے ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس کی قلمی کاوشیں ہی نہیں، اس کی زندگی کے نشیب و فراز بھی عجیب و غریب رنگ و آہنگ رکھتے ہیں۔

ادبی زندگی کے ابتدائی دور ہی سے اس کی زندگی اور ادب کو عورت اور عورت کی خوشبو نے اپنی مدھر انگڑائیوں کے ساتھ معطر بنا دیا تھا۔ نفسیاتی طور پر، چلم رمنا مہرشی کا ہم خیال تھا۔ ''جیو آتما'' اور ''پرماتما'' کے درمیان جو روحانی تعلق ہو سکتا ہے، وہی چلم اور مہرشی بھگوان کے درمیان بھی تھا۔ اس کے ادبی رجحانات اور سماجی روایات کے درمیان جو تضادات متوقع ہو سکتے ہیں وہی چلم کی ادبی زندگی کی تقدیر بن گئے۔

چلم کے لئے عورت ایک لذت بخش ذریعہ انبساط تھی۔ مگر عورت کی ذات، اس کے لئے زندگی کی ایک حقیقت بھی تھی، جیسی دوسری حقیقتیں ہیں۔ عورت سے اس کی محبت اس زاویے میں محدود ہو کر رہ گئی۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سی عورتوں سے ذاتی اور جسمانی تعلقات رکھے۔ مگر وہ کسی کا بھی نہ بن سکا۔ ابتدائی دور میں وہ ناستک تھا۔ من سوجی قسم کا آدمی تھا۔ مذہبی معتقدات سماجی روایات اور اخلاقی ہدایات اس کے لئے بے معنی چیزیں تھیں۔ بلکہ وہ ان کا سخت مخالف تھا۔

شروع میں رت نما (RATNAMMA) نامی ایک لڑکی سے چلم کے تعلقات استوار ہوئے۔ یہ تعلقات بالش و بستر کی منزل پر بھی لے گئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جبکہ وہ برہمو سماج کا معتقد تھا۔ کسی عورت سے ناجائز تعلقات کی بات تو دور کی چیز ہے کسی غیر محرمہ کا تصور بھی اس سماج کے اقدار کے خلاف تھا۔ مگر چلم کے اعصاب پر عورت اس بری طرح سوار تھی کہ اس نے نہ اپنے مذہبی معتقدات کی پرواہ کی اور نہ برہمو سماج کے اقدار کا پاس و لحاظ رکھا۔

چلم اپنی ''خودنوشت سوانح عمری'' کے صفحہ ۴۹ پر رقم طراز ہے کہ کسی عورت سے ملوث ہونا کیا کوئی گناہ ہے؟ اس قدر لذت انگیز وصال، کیا گناہ ہو سکتا ہے؟ بیوی سے متمتع ہونا جب کوئی جرم نہیں تو ایک اور عورت سے حصول لذت جرم کیسے گردانا جائے گا؟ کیا ایشور نے واقعی جنسی فعل کو گناہ سے تعبیر کیا ہے؟ یا صنفی لذت سے ناواقف لوگوں کا گھڑا ہوا یہ ایک جھوٹ ہے۔ اور وہ بھی اس لئے کہ سماج میں ایک بیوی کا تصور عام ہے اور اس کے آگے جو

کچھ ہے پاپ ہے...... عورت سے جنسی وابستگی اگر حرام ہے تو پھر وہی عورت
عقد کے دو بول کے بعد حلال کیوں ہو جاتی ہے؟ ...... یہ اور اس قسم کے شکوک و
شبہات میرے دل و دماغ میں سر اٹھانے لگے۔ اور انہیں کے باعث میں برہمو
سماج سے نہ صرف کٹ کر رہ گیا بلکہ اس کا مخالف بھی بن گیا۔

چلم کی ادبی زندگی میں ایک اور عورت لیلا ٹھنڈی پسی ہوئی
بجلیوں کی طرح آئی اور دل و دماغ کو جھلسا دینے والے شعلے کی طرح اپنا کام
کر گئی۔ جب وہ اپنے زاہد فریب حسن اور نشۂ دوشیزگی لئے، چلم کے سامنے
آئی تو وہ از خود رفتہ ہو گیا۔ چلم کی زندگی میں لیلا کے کردار نے وہی رول ادا
کیا جو بنگالی ناول نگار سرت چندر کے ''سری کانت'' میں راجیہ لکشمی نے ادا کیا
تھا۔

جوتشیوں نے اس سے کہا کہ عین عالم بہار میں ایک شہزادی تمہاری
زندگی میں آئے گی ...... اور لیلا اپنی دوشیزہ رعنائیوں کی بہار لئے چلم کی زندگی
میں آ گئی۔ ''گورے پاٹی ونکٹ سبیا'' نے ''چلم کی زندگی اور ادب'' میں صفحہ
۱۰۶ پر چلم سے متعلق لیلا کے دلی جذبات کو لیلا ہی کے الفاظ میں اس طرح پیش
کیا ہے۔

''میں نے آپ کی تصانیف کو تیرھویں سال ہی میں
پڑھا۔ پڑھتے پڑھتے مجھے یہ گمان ہو چلا ...... نہیں نہیں ...... یقین
ہو چلا کہ یہ کتابیں آپ نے صرف اور صرف میرے لئے لکھی
ہیں۔ آپ ان کتابوں کی طباعت اور اشاعت بھی کرتے
ہیں۔ آہ۔ میرے لئے یہ ایک روح فرسا تصور ہے۔ یہ مقدس
کتابیں جب زمین پر گرتی ہیں تو میں دوڑ کر مقدس صحیفہ کی طرح
انہیں اپنے سر پر اٹھا لیتی ہوں۔ سوچتی ہوں کیا دوسرے بھی
ایسا ہی کرتے ہوں گے؟ اور میں دل مسوس کر رہ جاتی ہوں۔

آپ کی کتابیں گاہے گاہے میرے مطالعہ میں آتی
رہیں۔ پٹھاپورم میرا شہر ہے۔ اور کرشنا شاستری آپ کے
دوست ہونے کے ناتے آپ کے بڑے مداح ہیں۔ ان کی
وساطت سے آپ کی تخلیقات کے چند مسودات دیکھنے کا شرف
مجھے بھی حاصل ہوا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ فن سے زیادہ فنکار
کی شخصیت بدرجہا پرکشش اور باوقار ہے۔ اس کے باوجود
آپ کے فن کی جو عظمت میرے دل میں ہے وہ مجھے یہ لکھنے پر
مجبور کرتی ہے کہ میں آپ سے پوچھوں کہ کیا آپ کا قاری
آپ کے ایمائی انداز کو سمجھ سکتا ہے؟ اپنی کتابیں ان لوگوں
کے ہاتھوں میں دینا کیا اپنے قلم کی بے حرمتی کرنا نہیں ہے؟
آپ کے اسلوب کی دلکشی، آپ کے انداز بیان کی شگفتگی اور
ترسیل کا ایمائی انداز۔ کیا آپ کے عام قاری پر بھاری نہ پڑ
جائے گا؟''

اپنی پرستار لیلا کے بارے میں چلم اپنے ایک دوست دکشت کو لکھتا
ہے:

"مجھے اپنی ارضی زندگی ہی میں جنت ماوئی کے
مزے لوٹنے کے لئے بھگوان نے لیلا کو میرے پاس بھیجا ہے۔
میں اس سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ کیا کہا؟۔ مطمئن ہوں۔
نہیں ابھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے اور تجربات سمیٹنے
کی ضرورت ہے۔ ایسے تجربات، جن تک حیات کے ہاتھ نہ پہنچ
سکیں میں ایک ایسی روشنی کا متلاشی ہوں جو صرف میرے لئے ہو
اور میں اس میں گم ہو جاؤں۔ میں ایک گلشن نا آفریدہ کی طرف
نگراں ہوں...... لیلا کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں تو اس چمن کی
مہک سے میرا سراپا معطر ہو جاتا ہے"۔

لیکن چلم کی یہ ساری سپردگی...... بوالہوسی میں، عشق حقیقی کی متلاشی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ لیلا کے جذبات اور چلم کے نظریات، ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ چلم اپنی خودنوشت سوانح میں اس جانب واضح اشارے کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ لیلا کسی حالت میں اپنا جذباتی مورچہ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی۔ وہ میرے بارے میں لکھتی ہے۔

"آپ کسی طرح میرے نہ ہو سکے۔ میں سمجھتی
ہوں کہ آپ کسی عورت کے بھی نہیں ہو سکتے۔ کوئی عورت بھی
نہ آپ سے متفق الرائے ہو سکتی ہے اور نہ مطمئن۔ عورت سے
اکتساب لذت آپ کا مطمع نظر نہیں۔ زندگی میں کسی جاندار کی
کوئی تکلیف آپ سے دیکھی نہیں جاتی۔ اپنی راحتوں سے
زیادہ دوسروں کی تکالیف دور کرنے میں آپ کو روحانی
کیف وسرور ملتا ہے۔ مجھ جیسی حسین وجمیل عورت اپنی زلفیں اگر
کسی کے بازو پر پریشان کر دے تو وہ خود کو بہشت بریں کی حورو
قصور کے درمیان عیش کرتے ہوئے محسوس کرے گا...... مگر آپ
کو...... کسی سے بھی...... کہیں بھی آسودگی نہیں مل سکتی۔ آپ نہ کسی
سے وفاداری کر سکتے ہیں اور نہ کسی کے شکرگزار رہ سکتے ہیں"۔

لیلا ایک شعلہ جوالہ کی طرح چلم کی زندگی میں آئی۔ لیکن چلم کی تلون مزاجی نے اسے بہت کچھ ٹھنڈا کر دیا۔ چلم کے قلم کی شعلگی نے لیلا کے رگ و پے میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ مگر چلم کی راہ وروش نے اسے افسردہ خاطر بنا دیا۔ اپنی محبت کی چاندنی میں چلم کو نہلا دینے والی لیلا...... چلم کے مزاج اور اس کے قلم کے منہاج سے خود کو وابستہ نہ کر سکی۔ یہ بات دوسری ہے کہ چلم کے دل میں لیلا کے لئے ایک نرم گوشہ ضرور موجود تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"لیلا کی نظر اپنی انفرادی خوشی اور ظاہری بناؤ سنگار
پر تھی جبکہ میری نظر زندگی کے اصول تجربات پر تھی۔ اس کا مطمع نظر
ارضی لذتوں اور راحتوں سے اپنا حصہ بٹور لینا بلکہ چھین لینا تھا۔
جبکہ میری بصارت آسمان سے بھی پرے...... دنیائے ممکنات کی
بصیرت کی متلاشی تھی۔ (چلم کے خطوط، صفحہ ۶۰ سے)

وہ ایک جگہ لیلا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"لیلی۔ جب میں تم سے قریب ہو کر کسی موضوع پر

بات کرتا ہوں تو تم جانتی ہو کتنے نئے خیالات کتنے نئے
تصورات میرے دل میں موجزن ہو جاتے ہیں۔ تمہاری
قربت سے میرے لاشعور میں چھپی ہوئی تمنائیں۔ شعور کی سطح
پر ابھر آتی ہیں...... جب ہم دونوں کسی گوشۂ تنہائی میں، ایک
جڑواں وجود کی طرح بیٹھتے ہیں تو ہماری خاموشیاں کتنے ہی
دلکش موضوعات سے بوجھل ہو جاتی ہیں۔

''میں عالم تنہائی میں جب قلم سنبھال لیتا ہوں تو
تمہاری محبت بھری خلل اندازیاں کس قدر شیریں ہو جاتی
ہیں۔ تم میرے دل سے پوچھ سکتی ہو۔ میری راہ روش حیات پر
تمہاری پیار بھری انگشت نمائیاں۔ میرے لئے سامانِ صد
ہزار نمکداں ہی سہی۔ مگر میں تمہارے لئے انہیں بخوشی انگیز کر
لیتا تھا۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ میری ہی ہم سفر میرے ادبی
رجحانات اور قلبی واردات پر گرفت کر رہی ہے تو میں حالات
کو ایک نیا موڑ دیدیتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ کیا میں اس طرح
تمہیں اپنی محبت کا یقین دلا سکوں گا؟ کیا تمہاری خوشنودی
حاصل کر سکوں گا''۔

لیلا اور چلم کا ساتھ صرف سات سال رہا۔ اور ان سات سالوں
میں صرف دو سال کا وقفہ ہی ایسا تھا جبکہ دونوں ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے۔ لیلا
۱۹۴۹ء میں چلم سے جدا ہوگئی۔ وہ دل برداشتہ جدا ہوئی تھی۔ اور آخری سانس
تک دل تفتہ ہی رہی۔ ۱۹۵۶ء میں اس نے اپنی جان شیریں، جانِ جاں
آفریں کے سپرد کر دی۔ لیلا کی موت سے چلم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ
اپنے ایک دوست چنا راؤ کو اپنے ایک خط میں لکھتا ہے۔

''لیلا میری زندگی میں بادِ بہار بن کر آئی۔
میرے ساتھ اس نے جو لمحات گزارے ہیں ان پر مجھے آج
بھی فخر ہے۔ میری تخلیقات نے لیلا کو میری گرویدہ بنا دیا تھا۔
ان دنوں جبکہ ابھی اس پر دوشیزگی کی آمد آمد تھی اسے جب
میرا پیار ملا تو وہ کس قدر خوش نظر آئی تھی۔ آہ۔ اس کی
دوشیزگی پر کیسی رنگین بہار چھا گئی تھی۔ پھر وہ میری شخصیت
سے متاثر ہو گئی۔ اب وہ میری تخلیقات سے زیادہ میری
شخصیت میں دلچسپی لینے لگی''۔

''اس قدر پر لطف زندگی شاید ہی کسی فنکار کو میسر آئی ہو۔ اس
زمانے میں...... اس زمین پر میری آنکھوں کے سامنے جب جنت کی یہ نعمتیں
مجھے ملیں تو میرے قلم کی جولانیاں بھی بڑھیں۔ میرے اسلوب پر کیف اور
رنگینی چھا گئی۔ مجھے میری اپنی تصنیفات سے چاہے کوئی فائدہ نہ ملا ہو مگر یہ کیا کم
ہے کہ ایک دلبران کی وجہ سے مجھے مل گئی تھی۔ قلم کی یہ سحر سامانی مشکل ہی سے
کسی فنکار کو نصیب ہوئی ہوگی۔

زندگی کی حسین زنجیریں جب یکے بعد دیگرے پگھلنے لگیں تو چلم کو
اپنی زندگی کا برف بھی پگھلتا محسوس ہوا۔ اسے اپنی ذہنی آسودگی کے لئے

پناہوں کو تلاش کرنا پڑا۔ وکشت کے نام اپنے ایک خط میں وہ لکھتا ہے۔

''اپنی لیلا کی ہر ہر ادا پر جان دینے والا، عورت
کی محبت کے نغمے سنانے والا، محبت کا پجاری، چلم اب عشق
حقیقی کی طرف ہجرت کر گیا ہے۔ وہ کسی ایک عورت کی محبت
کی قید میں بند نہ رہ سکا—— عورت میرے لئے ایک حقیقت
ہے۔ اور اس کے مسائل بھی اپنا حقیقی وجود رکھتے ہیں......
عورتوں کے مسائل...... سماج میں ان کی مشکلات ان کی
تکلیفیں۔ ان کی گھریلو پریشانیاں۔ اور ان کی آنکھوں سے
بہتے ہوئے آنسوؤں کو...... میں کیسے بھلا دوں...... لیلا میرے
لئے ایک نمائندہ عورت ہے۔ اسے اپنے دل و دماغ میں لئے
ہوئے میں نے عورتوں کے سماجی مسائل کو اپنا موضوع سخن بنا
لیا ہے''۔

ضلع کرشنا کی ایک نیم پاگل برہنہ عورت اُوَدھوتا الا منچا کے ایک
لمس کی بدولت چلم اتنا متغیر ہو گیا کہ لوگ اس کے اس قلب ماہیت پر انگشت
بدنداں رہ گئے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔

ہم چلے جا رہے ہیں
چلے جا رہے ہیں
بھگوان کے گھر سے
بھگوان کے گھر تک

زندگی کا سفر
اور سارے ہم سفر
ایک منزل کی جانب
چلے جا رہے ہیں

چلم کی منزل۔ اروناچلم میں اپنے روحانی پیشوا رمنا مہرشی کا آشرم
تھی۔ ۱۹۷۳ء میں چلم فالج زدہ ہو گیا اور ۱۹۷۹ء میں اپنے بھگوان رمنا مہرشی
کے بازو میں پیوند خاک ہو گیا۔

(چلم آندھرا میں ''تلگو کی روشنی چلم'' اور ''چلم ساجیم'' نامی تلگو
کتابوں سے آزاد استفادہ کے ساتھ یہ مضمون لکھا گیا ہے)۔

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

۲۸۔ تیری نوجوانی میں ایک سچا عاشق تھا جو ہمیشہ آدھی رات کو تکیے پر کراہتا تھا۔

As You Like It - Act 2, Scene 4

۲۹۔ محبت کرنے والا ایک دل۔ اور اس دل میں وہ ہمت کہ ہمیں محبت سے آشنا کر دے۔

Macbeth - Act 2, Scene 3

۳۰۔ کہ تو جہاں ہے وہاں دنیا خود موجود ہے۔ اور جہاں تو نہیں ہے تباہی ہے۔

Henry IV Part 2 - Act 3, Scene 2

۳۱۔ تم اسے عشق نہیں کہہ سکتے کیونکہ تمہاری عمر میں جوبن خون میں پلنے لگتا ہے۔

Hamlet - Act 3, Scene 4

اوم کرشن راحت

معاشقوں کا جادوگر ـــــ ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی کو معاشقوں کا جادوگر میں کہہ سکتا ہوں یا پھر جناب ہرکرشن۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ساحر لدھیانوی کے معاشقوں کے بارے میں جس قدر مصور ہرکرشن اور مجھے معلوم ہے شاید کسی اور کو نہ معلوم ہو لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہرکرشن اور میں بہت عرصے تک ساحر کے قریب رہے تھے اور جب ساحر صاحب ایک معاشقے کے سلسلے میں لدھیانہ گورنمنٹ کالج سے نکال دیے گئے اور انہوں نے دیال سنگھ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا تو میں اور ہرکرشن صاحب تقریباً ہر ہفتے یا پندرہ دن کے بعد لاہور پہنچ جاتے تھے اور بعد ازاں بمبئی میں بھی ہم ساتھ ساتھ رہے تھے۔ کئی لوگ ساحر صاحب کی لدھیانہ کی زندگی، لاہور کی زندگی اور بمبئی کی زندگی کے بارے میں ضرور ہم سے بھی زیادہ جانتے ہوں گے لیکن تینوں جگہوں پر ان سے ملتے رہنے کا موقع ہم دونوں ہی کو نصیب ہوا تھا۔ ہاں وہ عرصہ جو انہوں نے پاکستان میں گزارا اس کے بارے میں اللہ جانتا ہے یا یارانِ مملکتِ خداداد۔

میں تو ۱۹۵۲ء میں بمبئی سے لوٹ آیا تھا لیکن جناب ہرکرشن بمبئی میں ہی رہے اور آج تک وہیں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ ساحر صاحب کے بارے میں اور ان کے معاشقوں کے بارے میں جانکاری رکھتے ہیں لیکن وہ کچھ لکھیں گے نہیں۔ ویسے میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ ساحر صاحب کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں اپنے ساتھ ہی لے کر مر جاؤں گا لیکن بھلا ہو تونسوی صاحب (مرحوم) کا جنہوں نے مجھے یہ سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ ''ساحر کے بارے میں تمہاری جانکاری سچ پر اور حقائق پر مبنی ہے اور اب یہ قوم کا اثاثہ ہے۔ ہر آدمی کی اپنی کمزوریاں ہوتی ہیں اور اس کے بارے میں تمہارا کچھ نہ لکھنا تمہاری کمزوری بنتی چلی جائے گی''۔

اس کے جواب میں میں نے فکر صاحب سے کہا تھا ''فکر بھائی لدھیانہ کا ہر دوسرا آدمی ساحر لدھیانوی کا لنگوٹیا بنا پھرتا ہے۔ میں کچھ لکھوں گا تو لوگ یہی کہیں گے کہ ایک اور لنگوٹیا پیدا ہو گیا''۔

''تم نے کرشن ادیب کی کتاب جو اس نے ساحر کے بارے میں لکھی ہے، پڑھی ہے''۔ فکر نے پوچھا۔

''دیکھی ہے'' میں نے فکر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اسے پڑھو۔ بقول تمہارے کرشن ادیب ۱۹۵۲ء تک تمہیں بھی نہیں جانتا تھا اور وہ ساحر کا ذکر یوں کرتا ہے جیسے وہ ساحر کا ان دنوں سے واقف تھا جب ساحر لنگوٹی بھی نہیں پہنا کرتا تھا''۔ فکر نے اپنے رنگ میں کہا۔

بات آئی گئی ہو گئی لیکن فکر کی تجویز بہت دیر تک میرا پیچھا کرتی رہی اور جب ''انشاء'' نے ''ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ'' نکالنے کا اعلان کیا اور ف۔س۔ اعجاز صاحب کا خط موصول ہوا تو پہلے میں نے اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالی اور جب اسے کورے کاغذ کی طرح پایا تو ساحر کے بارے میں لکھنے کے لئے خود کو آمادہ کر ہی لیا۔

ساحر معاشقوں کے معاملے میں سنجیدہ تھے یا نہیں اس کے بارے میں کوئی دو رائیں ہیں ہی نہیں۔ وہ اس سلسلے میں قطعی سنجیدہ نہیں تھے۔ میری ان سے ملاقات تو ۱۹۳۹ء میں ہو گئی تھی لیکن ان سے دوستی ۱۹۴۰ء میں ہوئی تھی جب میں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ وہ مجھ سے دو سال آگے تھے۔ لیکن پڑھائی میں بالکل میری طرح نالائق۔ انہیں پڑھائی سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ ہرکرشن اور ساحر کی تاریخ پیدائش اور پیدائش کا سال ایک ہی ہے مگر ہرکرشن ۱۹۴۰ء میں بی۔اے کرنے کے بعد کالج چھوڑ چکے تھے اور ساحر اب بھی کالج میں جلوہ افروز تھے۔ وہ غزلیں لکھتے تھے اور اپنی عمر کے مطابق اچھی غزلیں لکھتے تھے کہ ناگاہ انہوں نے نظم کی طرف رجوع کیا اور اپنی افتادِ طبع کے مطابق اس میں کامیاب ہی نہیں بہت کامیاب ہوئے۔ ان کی شہرتِ کردار کے بارے میں لوگ باتیں کرتے ہیں۔ وہ کچھ کہانیاں اپنے بارے میں مشتہر کروایا کرتے تھے۔ کالج میں اور شہر میں وہ ہمیشہ موضوعِ گفتگو بن کر رہے۔ اس کے لئے وہ ایک حربہ اور بھی استعمال کیا کرتے تھے — پانچ چھ دوستوں کے ہمراہ چلے جا رہے ہیں۔ گپیں چل رہی ہیں۔ ہٹلر کو گالیاں دی

جا رہی ہیں۔ ہندوستان میں کمیونسٹ نظریہ کے پہنچنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور ہو رہا ہے۔ وہ ساتھ چلنے والے کسی ایک دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک طرف لے جا کر چلنا شروع کر دیتے اور رازدارانہ لہجے میں گردن جھکا کر (ان کا قد لمبا تھا) فرضی عشق کی داستانیں کہنا شروع کر دیتے۔ اس سے ان کو دو فائدے ہوتے۔ ایک تو وہ دوست یہ سمجھنے لگ جاتا کہ ساحر اسے اپنے بہت قریب سمجھتے ہیں اور وہ دوسرے دن بہت فخر سے دوسرے احباب کو اس من گھڑت قصے کو چٹخارے لے لے کر اپنے ذاتی مشاہدات کا حوالہ دے دے کر سنانا شروع کر دیتا۔ دوسرے ساحر رومانس کی دنیا کے ہیرو گردانے جانے لگے۔ وہ ایک دن میں یہ عمل ایک ہی دوست پر کیا کرتے تھے۔ دوسرے دن ان کا ہاتھ کسی اور دوست کے کندھے پر ہوتا تھا۔

لدھیانہ کے معاشقے

ساحر کے معاشقوں کی اس کی اپنی من گھڑت یا سچی سی داستانیں بہت ہیں لیکن ان میں سے کچھ اہم معاشقوں کا ذکر ہی ٹھیک رہے گا۔ ساحر کا پہلا عشق جو انہوں نے مجھ پر افشا کیا ہمارے کالج میں پڑھنے والی ایک لڑکی پریم چودھری سے تھا۔ قصہ ان کے عشق کا یوں تھا کہ ایک شام ہانپتے ہوئے میرے گھر پہنچے اور بولے ''راحت بھائی — چلو، جلدی چلو۔ میرے ساتھ چلو'' (وہ کسی بھی عشقیہ مہم پر اکیلے نہیں جاتے تھے) میں نے ان سے نہیں پوچھا کہ کہاں چلنا ہے۔ میں ابھی کالج سے لوٹا تھا لیکن آوارگی کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ ساحر آوارہ گردی پیدل کیا کرتے تھے۔ سو ہم پیدل چل پڑے۔ گھر

سے نکلتے ہی انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور پریم چوہدری کے
بارے میں گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ اپنا ہاتھ میرے کندھے سے صرف
سگریٹ سلگانے کے لئے اٹھاتے تھے۔ میں ہمہ تن گوش ان کی جادو بیانی کے
سحر میں پھنستا چلا گیا اور دل ہی دل میں حسد اور رشک کے ملے جلے جذبات
میں غرق، کبھی سنجیدہ اور کبھی زیادہ سنجیدہ ہو جاتا۔ اس سحر کا طلسم اس وقت ٹوٹا
جب ہم چوڑا بازار میں پریتم بک اسٹال پر پہنچ گئے۔ (پریم کو ان سے نہیں ملنا
تھا بقول ان کے) اب وہ بار بار گھنٹہ گھر کی طرف دیکھ رہے ہیں کیونکہ پریم
کے مکان کا راستہ بھی وہی تھا اور وقت کا پتہ بھی گھنٹہ گھر کی گھڑیوں ہی نے بتلانا
تھا۔ پریم کو نہیں آنا تھا وہ نہیں آئی۔ وہ مجھے لے کر اس کے محلے میں جا پہنچے اور
ہم نے کئی گھنٹوں تک اس کے گھر کے چکر لگائے لیکن پریم نظر نہیں آئی۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت ساحر اپنے کسی اور دوست کو ساتھ
لے کر پریم کے محلے میں گھومتے نظر آئے تھے اور وہاں انہوں نے سگریٹ بیچنے
والے کی ایک دکان بھی ڈھونڈ لی تھی کیوں کہ اس محلے میں گھومنے یا رکنے کا کوئی
بہانہ بھی تو چاہئے تھا۔ اب ساحر صاحب کالج آتے تو اسی محلے میں سے ہو کر
حالانکہ اس کے لئے انہیں بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔

کچھ دنوں بعد سارے کالج میں اسی معاملے کا چرچا تھا۔ جب دیکھو
ساحر کسی لان میں، کسی برآمدے میں دوستوں میں گھرے سگریٹ پی رہے
ہیں۔ سگریٹ پلا رہے ہیں۔ کالج کی کینٹین میں یاروں کو سموسے کھلا رہے ہیں
اور عشق کے بارے میں سرگوشیاں چل رہی ہیں۔ جب دوست احباب آپس
میں باتیں کرنے لگ جاتے تو ساحر سنجیدہ سا منہ بنا کر فضا میں گھورنا شروع کر
دیتے۔ اور پھر کسی دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے اور — میں وثوق سے
کہہ سکتا ہوں کہ ساحر اور پریم کی کبھی ملاقات ہوئی ہی نہیں تھی۔ بس ایک ہوائی
عشق تھا جو کالج سے باہر شہر بھر کا بھی چرچا بن گیا تھا۔

ایک شام میرے ہاں تشریف لائے تو بہت اداس دکھائی دے رہے
تھے۔ روہانسی سی شکل، بال بکھرے ہوئے مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گئے اور
رونے لگے۔ میں پریشان ہو گیا کہ ان کو چپ کراؤں تو کیسے۔ میں نے بہتیرے
ان کے گال تھپتھپائے۔ بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ لیکن وہ روئے چلے جا رہے تھے۔
تھوڑی دیر کے بعد ان کی ڈھارس بندھی۔ میں نے اسی اثنا میں ایک بیئر کی بوتل
اور دو بوتلیں روز (سوڈا) کی منگوا لیں تھیں۔ ٹھنڈی بیئر کا گھونٹ پی کر ٹھنڈی
سانس بھر کر بولے ''راحت بھائی، پریم کو دق ہو گیا ہے'' اور پھر وہ بسورنے
لگے۔ میں نے گلاس اٹھا کر ان کے ہونٹوں کو لگایا تو وہ غٹ سے پی گئے۔

اس کے بعد وہ کالج میں دوستوں کے جھنڈ سے علیحدہ کسی پیڑ کے
تنے سے چپکے یا کسی جھاڑی کی اوٹ میں اکیلے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے نظر
آنے لگے تھے۔ اب ان کا یہ کام تھا کہ کسی بھی دوست کو ساتھ لے کر شام کے
وقت ایک ہسپتال کے چکر کاٹتے دکھائی دیتے جہاں ان کے خیال کے مطابق
پریم زیر علاج تھی۔ پھر ہمیں خبر ملی کہ پریم اللہ کو پیاری ہو گئی اور ساحر صاحب
اس کی یاد میں ایک نظم لکھنے میں محو ہیں۔ دو ایک ہفتے کے بعد وہ سب دوستوں کو
اپنی نظم ''مرگھٹ کی سرزمین'' (جو تلخیاں کے پہلے اڈیشن میں تھی اور مجھے علم

نہیں کہ وہ بعد کے اڈیشنوں میں شائع ہوتی رہی کہ نہیں) سنا رہے ہیں اور داد حاصل کر رہے ہیں۔ پھر ساحر کسی دوسرے معاشقے کے لئے تیار ہو گئے۔

لدھیانہ میں ساحر صاحب کا دوسرا اہم معاشقہ ان کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اس کی وجہ سے انہیں لدھیانہ گورنمنٹ کالج چھوڑ کر لاہور جانا پڑا۔ جو ان دنوں ادب کا بہت بڑا مرکز تھا، دوسرے ان کی دھوم چار دانگ پھیل گئی۔ وہ لاہور میں ایک رومانٹک ہیرو کی شکل میں وارد ہوئے۔ وہ اپنی عشق کی داستان ساتھ لے کر وہاں پہنچے تھے۔

ان کا دوسرا معاشقہ ہمارے ساتھ پڑھنے والی ایک خوبصورت لڑکی ایشر کور سے متعلق ہے ساحر کا یہ معاشقہ پچھلے معاشقوں سے مختلف تھا کیونکہ یہ یک طرفہ نہیں تھا۔ اس میں اس نازک اندام لڑکی کا ہاتھ بھی تھا جو بظاہر بہت شرمیلی، معصوم اور الھڑ دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اس معاشقے میں ساحر کا مقصد وہی تھا یعنی اشتہار۔ صبح سویرے کالج کے ہوسٹلوں میں۔ دن میں کالج کے برآمدوں اور کینٹین میں شام کی محفلوں اور رات کو آوارگی کے دوران اسی عشق کے چرچے ہونے لگے تھے۔ ساحر کے دوستوں کا حلقہ اب اور بھی وسیع ہو گیا تھا اور وہ خود بھی کبھی دوستوں کی ایک ٹولی میں کھڑے ہیں کبھی دوسرے گروپ میں۔ کچی پکی جھوٹی ملاقاتوں کا ذکر چل رہا ہے اور وہ ایک ہیرو کی طرح کالج کے بڑے بڑے وسیع میدانوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے۔ کبھی وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتے اور کبھی سنجیدہ ہو کر اپنے عشق کے انجام پر احباب کی رائے حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے کیونکہ یہ دو مذاہب کا معاملہ بھی تھا کیوں کہ ان دنوں لوگوں کے ذہن اتنے کھلے نہیں تھے۔ ویسے بھی ساحر ڈرپوک واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنے سکھ ہم مکتبوں سے بہت خائف تھے کیونکہ وہ ساحر سے کہیں زیادہ توانا اور مضبوط تھے۔

معاملہ اپنی رنگینیوں کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ طرح طرح کی افواہوں کا سلسلہ جو خود ساحر پھیلا دیا کرتے تھے اس معاملے کو اور طلسمی بناتا چلا گیا۔ ان کے پاس نیلے اور گلابی رنگ کے لفافوں میں ملفوف کچھ خط بھی تھے جن سے خس کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی آتی تھی۔ خط گورمکھی میں لکھے ہوئے تھے کیوں کہ ساحر نے خالصہ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اس لئے انہیں تھوڑی بہت گورمکھی آتی تھی۔ ہم باقی دوست اس زبان سے بے بہرہ تھے اس لئے وہ خود ہی خطوط پڑھ کر ہمیں سنایا کرتے تھے۔ وہ خط واقعی خط تھے۔ لفافوں پر ٹکٹ اور ڈاکخانے کی مہریں بھی لگی ہوتی تھیں لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ خطوط ایشر کور کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ کالج گرمیوں کی تعطیلات کے لئے بند ہو گیا تھا۔ کالج کے لان سنسان تھے۔ ساحر، میں اور مرتضےٰ (ہمارے دوست جو پاکستان میں مجسٹریٹ ہو گئے تھے) ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے تھے۔ ہمارے کالج میں ایک کمرہ طالبات کے لئے مخصوص تھا اس میں ایشر کور بیٹھی تھیں۔ ساحر کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مرتضےٰ انہیں دلاسا دے رہے تھے۔ میں اپنی بزدلی کے مدنظر ساحر اور مرتضےٰ کو گھر چلنے کے لئے بار بار کہہ رہا تھا۔ مرتضےٰ کامیاب ہو گئے اور ساحر اپنی ہمت بٹور کر مستورات کے کمرے کے پچھواڑے والے

برآمدے میں پہنچ ہی گئے۔ سڑک کے ایک طرف مرتضے اور دوسری طرف میں
پہرہ دینے لگے۔ میں کبھی کبھار آگے بڑھ کر دیکھ آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ دو بار تو
میں نے دونوں کو ذرا فاصلے سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ تیسری بار جو میں
آگے بڑھا تو ایشر کور رو رہی تھی اور ساحر اس کے آنسو پونچھ رہے تھے۔ چوتھی
بار میں اس طرف گیا تو — پرنسپل کی کوٹھی کی طرف سے آنے والی سڑک جو
برآمدے کے بالکل سامنے تھی ہمارے کالج کے وائس پرنسپل سردار شوچرن سنگھ
آتے دکھائی دیے۔ وہ اتنے قریب آ چکے تھے کہ ہم ساحر کو اس کی اطلاع بھی
نہیں دے سکتے تھے۔ میں اور مرتضے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے
اور ساحر صاحب دھر لئے گئے۔ شام تک یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی
طرح پھیل گئی۔ ساحر کالج سے نکال دیے گئے۔ ان دنوں لڑکیوں سے بات کرنا
بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ معاملہ بات کرنے سے کہیں زیادہ آگے بڑھ چکا
تھا۔ دوسرے شوچرن سنگھ صاحب کٹر بھی تھے اور ڈسپلن کے پابند بھی۔ ساحر کی
طرف سے کالج کے حکام تک بہت سفارشیں پہنچائی گئیں لیکن سردار صاحب اپنی
ضد پر اڑے رہے۔ ساحر صاحب کو مجبوراً لدھیانہ کالج چھوڑ کر دیال سنگھ کالج
لاہور میں داخلہ لینا پڑا اور وہ نئے معاشقوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔

اس معاشقے کا کلائمکس بہت سالوں بعد بمبئی میں ظہور پذیر ہوا۔ ساحر،
پاکستان سے دہلی اور دہلی سے بمبئی پہنچے تو ان دنوں میں بمبئی میں تھا۔ میرے قیام
تک ایشر کور بمبئی میں نہیں تھی۔ وہ کب اپنے خاوند اور بچوں سمیت بمبئی پہنچی اور
کیسے ساحر سے پھر راہ و رسم قائم ہوئی یہ تو ہرکرشن ہی بتا سکتے ہیں کیونکہ مجھے اس کا
علم نہیں۔ ساحر فلموں میں ایک بہت کامیاب گیت کار ہو کر ابھرے اور وہ اس
وقت تک ادبی دنیا میں بھی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں جب لدھیانہ
گورنمنٹ کالج کی گولڈن جبلی کے موقعے پر ہرکرشن اور ساحر کو اعزازات سے
نوازا گیا تو ہم لدھیانہ میں اکٹھے ہوئے اور محفل نائو نوش میں ہرکرشن نے بتایا کہ
کیسے ساحر پھر ایشر کور کے ہاں جانے لگے تھے اور ایشر کور کے خاوند بھی پہلے پہل
چپ رہے کہ ناگاہ ایک شام کو ساحر کو اپنی کار میں بٹھا کر دور بہت دور سمندر کے
کنارے لے گئے اور ساحر سے بولے "ساحر یا تو تم ایشر کو اپنے ہاں لے جاؤ،
مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں یہ روز روز کا تمہارا آنا جانا برداشت نہیں کر
سکتا"۔ انہوں نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا تھا — ساحر پیدائشی ڈرپوک تو
تھے ہی۔ پھر جیتے جی انہوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔

لاہور میں ساحر کے دو معاشقے قابل ذکر ہیں۔ دونوں ہی معاشقے
ادیب خاتونوں سے متعلق ہیں۔ ایک روز میں اور ایک دوست ایم خورشید
(جو پاکستان میں ڈاک اور تار کے محکمے میں اعلیٰ ترین افسر بنے) ساحر کو
ڈھونڈتے ہوئے شورش کاشمیری کے چوبارے میں جو پیسہ اخبار اسٹریٹ
لاہور میں تھا پہنچے تو ساحر ایک گورمکھی میں لکھی ہوئی نظم کا ترجمہ اردو میں کر رہے
تھے (جو "تلخیاں" کے بعد کے ایڈیشنوں میں شامل تھا) پوچھنے پر اپنے پرانے
رازدارانہ انداز میں دھیرے سے بولے "کامریڈ — دیکھو گے تو تڑپ جاؤ
گے — شعر بھی کہتی ہے — اور کاغذ سمیٹ کر بولے چلو — جلتی دوپہر — مئی
کا مہینہ، وہ ہمیں لے کر دیار حبیب کی طرف چل دیے۔ اس کی کوٹھی کے کئی چکر

کانے لیکن اس ماہ جبیں کے دیدار نہیں ہوئے۔ پسینے میں شرابور جب ہم انار کلی پہنچے تو ساحر نے کابن چند کی دکان سے فالسے کا بہت ٹھنڈا شربت پلایا تب جا کر جان میں جان آئی۔ شربت پلانے کے بعد وہ ہمیں اس کمرے میں لے گئے جو انہوں نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے سب وہ قصے پھر دہرائے جو وہ دوپہر کو کوٹھی کے چکر کاٹتے ہوئے سنا چکے تھے اور ہم نے سنتے ہوئے بھی نہیں سنے تھے۔

شام کو ساحر کے کمرے پر کئی ادیب، شاعر، آوارہ مزاج دوست اور ادیبوں اور شاعروں کے عاشق جمع ہوا کرتے تھے۔ کئی لوگ تو صبح و شام وہیں پڑے رہا کرتے تھے جن میں سے ایک گوپال متل بھی تھے۔ ساحر جب مزے لے لے کر اس خاتون کا ذکر کرتے تو بقول غالبؔ

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ان منچلوں میں سے کئیوں کو میں نے بعد میں اس کوٹھی کے چکر کاٹتے دیکھا تھا جن میں دیویندر ستیارتھی، رام پرکاش اشک (جو شاعر بالکل نہیں تھے لیکن ساحر نے انہیں تخلص سے نواز رکھا تھا— وجہ کچھ اور تھی) مجید لاہوری— وغیرہ وغیرہ۔ دیویندر ستیارتھی پتہ نہیں اس خاتون سے مل بھی آئے تھے کہ نہیں لیکن ساحر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قصے کہانیاں بہت سناتے تھے۔ آہیں بھرتے میں نے بھی انہیں دیکھا تھا۔ وہ خاتون تھیں امرتا پریتم جنہوں نے بعد میں اس معاشقے پر رسیدی ٹکٹ بھی چھپاس کرلیا تھا تاکہ سند رہے۔ انہوں نے بھی ساحر صاحب سے یہ گر سیکھ لیا تھا کہ اپنے بارے میں کچھ پروپیگنڈہ ضرور ہوتا رہنا چاہئے۔ خوبصورت عورت ہو، شاعرہ ہو، بات چیت کا ڈھنگ آتا ہو کہ کیا بات کرتے کرتے شرما جاتا ہو کب بے باک ہو جانا ہو تو مشہور ہونے میں دیر ہی کہاں لگتی تھی — ساحر سے شاعر جب اس کی کئی نظموں کو یاروں کی محفل میں جھوم جھوم کر پڑھا کرتے تھے۔

ترقی پسند خیالات کی تھیں، اس لئے انہوں نے بڑی بے باکی سے اپنی کتاب میں ساحر سے انسیت کا ذکر کر ڈالا ہے۔ کاش یہ جرأت انہوں نے لاہور میں کی ہوتی تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ساحر میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ہوتے کیوں کہ وہ عاشق تو تھے لیکن ڈرپوک قسم کے۔ وہ ذمہ داری سے ڈرتے تھے۔ وہ ترقی پسند ضرور تھے لیکن انقلاب کا لفظ صرف شاعری تک ہی استعمال میں لاکر خوش ہو جاتے تھے۔ ان کا معاشقہ کہانیوں، کوٹھی کے چکر کاٹنے، افواہیں اڑانے، محترمہ کی نظمیں ترجمہ کر کے احباب میں سنا سنا کر داد حاصل کرنے تک ہی محدود تھا۔ ان سے ملاقاتیں بھی رہتی ہوں گی لیکن وہ ملاقاتیں خالصتاً ادبی گفتگو تک ہی محدود تھیں۔ بعد میں کوئی کیسے بھی ان معاملات میں سنجیدگی کا اظہار کرے لیکن حقیقت وہی تھی جو اوپر لکھ گیا ہوں اور جس کی گواہی کے لئے گوپال متل اور دیویندر ستیارتھی ابھی زندہ ہیں۔

اس معاشقے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ابھرتی ہوئی افسانہ نگار خاتون کی طرف رجوع ہوئے۔ دو بہنیں تھیں، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور— پہلے پہل تو وہ دونوں ہی سے عشق فرماتے رہے لیکن جب خدیجہ مستور کچھ سنجیدہ ہوگئی اور قدرے

ساحر بھی پرانے معاشقوں کے اثرات سے نکلے تو معاملہ شادی تک پہنچ گیا۔

ایک شام کو ساحر لدھیانہ آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ راستے میں وہ خدیجہ کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے ان کی گھبراہٹ کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ ادھر میں حیران تھا کہ ساحر نے کس طرح بات اتنی کھینچ لی کہ نوبت شادی تک پہنچ گئی تھی۔ گھر پہنچے تو مقدمہ ساحر صاحب کی والدہ محترمہ کے روبرو پیش تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ساحر پیچھے ہٹ جائیں گے لیکن جس طرح معاملے کے پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور ہو رہا تھا میرا یقین بھی ڈانواڈول ہوا جا رہا تھا۔ آخر فتح میرے یقین کی ہوئی۔ اندر سے آ کر مسکراتے ہوئے بولے، ''راحت بھائی، ان کی طرف سے یعنی خدیجہ کے رشتہ داروں کی طرف سے مہر کا تقاضہ ہے۔ امی نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ جہیز کے حق میں تو نہیں ہیں لیکن اگر وہ لوگ مہر پر بضد ہیں تو ہم بھی جہیز لیں گے۔ کامریڈ، اماں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ ان کی بات بالکل واجب ہے۔ اور راحت تجھے پتہ ہے کہ امی میری کتنی بڑی کمزوری ہے۔ میں اس کی بات نہیں ٹال سکتا، نہیں ٹال سکتا''۔ پھر وہ رونے لگے۔ میں انہیں تسلی بھی دیتا رہا اور جی ہی جی میں ہنستا بھی رہا۔ ہم دونوں مل کر کہنہ رواجوں کو گالیاں بھی دیتے رہے، بیئر بھی پیتے رہے۔ یہ معاملہ بہت خوش اسلوبی سے ٹل گیا ورنہ ساحر کو پیچھے ہٹنے کے لئے پتہ نہیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے۔

لاہور میں ساحر اکیلے رہتے تھے کیونکہ ان کی والدہ محترمہ ساتھ نہیں گئی تھیں اس لئے انہیں آوارگی اور نت نئے عشق فرمانے کے مواقع بلا روک ٹوک میسر تھے۔ لاہور میں وہ بطور شاعر تو مشہور ہو ہی چکے تھے اور طالبات میں ان کی نیم سیاسی، نیم رومانٹک شاعری مقبول بھی بہت تھی۔ اس لئے جب بھی کوئی لڑکی ان سے ہنس کر بات کرتی ساحر عشق کی داستانیں بنانا اور سنانا شروع کر دیا کرتے تھے۔

پاکستان سے آ کر جب وہ دہلی میں رہے اور غم روزگار نے انہیں ستایا تو عشق کا بھوت سر سے اتر گیا تھا ورنہ ہر نیا سورج نئے عشق کی داستان لئے اگا کرتا تھا۔ یہ عالم بمبئی کے شروع شروع کے دنوں میں بھی رہا۔ جبکہ وہ اپنے پاؤں فلم انڈسٹری میں جمانے کی کوشش میں رہے۔ ادھر ان کی فلم 'بازی' کے گانے مقبول ہوئے ادھر انہوں نے کھل کھیلنا شروع کر دیا۔ شہرت اور بعد میں پیسے کی بھرمار نے ان کے لئے عشق کے وہ وہ راستے کھولے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ایک بار ایک رسالہ ہاتھ میں لئے مجھے فیمس اسٹوڈیو میں ملے اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسٹوڈیو کی کینٹین کی کونے والی سیٹ پر بٹھا کر اور اچھے خاصے ناشتے کا آرڈر دے کر انہوں نے وہ رسالہ میز پر بچھا دیا۔ انگریزی فلمی رسالہ تھا جس کے سرورق پر مدھو بالا کی پورے سائز کی تصویر تھی اور اس کے ہاتھ میں ساحر کی کتاب ''تلخیاں'' تھی —— وہ اپنی آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کچھ اس معصومیت اور بھولے پن سے مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھنے لگے کہ مجھے بھی اپنے ہونٹوں پر داد سے پُر ہنسی لانا پڑی جس کا مطلب تھا ''واہ ساحر واہ'' اور انہوں نے میرے یہ ان کہے الفاظ میری آنکھوں میں تیرتے ہوئے دیکھ لئے تھے۔ پھر ایک لمبی داستانِ عشق شروع ہوگئی۔ شام تک مجھے اور رسالہ ہاتھ میں لئے گھومتے پھرے۔ جو جانکار ملتا اسے دکھاتے اور داد طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ ساری بمبئی میں ایک اشتہار بن کر گھومتے

پھر دوسرے دن جب مجھے ملے تو بہت سنجیدہ تھے۔ بہت پچکار پچکار کر ان کی سنجیدگی کا سبب پوچھا گیا لیکن وہ لب بستہ سگریٹ پر سگریٹ پئے جا رہے تھے۔ اور خلا کو گھورے جا رہے تھے۔ شام کو کہیں جا کر انہوں نے لب کھولے — بڑی مشکل سے ہم نے کہیں سے ریس میں دوڑنے والے گھوڑوں کو پلائی جانے والی شراب کی ایک بوتل حاصل کر لی تھی۔ ان دنوں مہاراشٹر میں مرار جی بھائی کی حکومت تھی اور شراب آب حیات کی طرح کھوجنی پڑتی تھی۔ پانچ چھ دوست اکٹھے بھی ہو گئے تھے لیکن پینے کے لئے جگہ کی پرابلم کھڑی ہوئی تھی۔ کہاں پئیں۔ میں جس دوست کے پاس رہتا تھا وہ ایک کٹر قسم کا کمیونسٹ تھا اور اس نے سب معاملات انقلاب کی آمد تک ملتوی کر رکھے تھے۔

ساحر ان دنوں چار بنگلہ اندھیری میں کرشن چندر کے پاس رہتے تھے جو وہاں سے بہت دور تھا۔ بڑی مشکل سے ایک تہہ خانہ جہاں کبھی کمیونسٹ پارٹی کا خفیہ پریس لگا تھا، ملا اور ہم نے اس گھٹیا قسم کی Crude شراب کے دو دو پیگ پئے اور ساحر پیتے ہی پھر سنجیدہ ہو گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''راحت، یار ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ صبح سے پریشان ہوں۔ تم ہی بتاؤ کہ اب میں عشق ''مدھوبالا'' سے کروں یا ''نرگس'' سے''۔

میں بھونچکا سا رہ گیا — مدھوبالا'' والی بات تو سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس نے ''تلخیاں'' ہاتھ میں لے کر تصویر کھنچوائی تھی اور فلمی رسالے کے سر ورق پر چھپی ہوئی میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ لیکن یہ ''نرگس'' کہاں سے بیچ میں آ گئیں۔ پھر پتہ چلا کہ کچھ روز پہلے نرگس انہیں کسی اسٹوڈیو میں ملی تھیں اور انہوں نے ساحر کی شاعری کی تعریف جی کھول کر کی تھی۔ بہت مشکل سے ہر کرشن نے انہیں سمجھایا کہ ساحر بھائی، ضروری نہیں کہ جو آپ کی شاعری کو پسند کرے وہ آپ سے عشق بھی کرنے کو تیار ہو جائے گی۔ ساحر کو شاید یہ بات پسند نہیں آئی تھی اور وہ دونوں سے ہوائی عشق فرماتے رہے۔

پھر ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ میں لدھیانہ لوٹ گیا۔ جب بھی ہر کرشن بمبئی سے لدھیانہ آتے تو اپنے ساتھ ساحر کے معاشقوں کی داستانیں جھولی بھر کر لاتے لیکن میں اس بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا کیونکہ میں ہر کرشن کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ ان کے معاشقوں میں کئی چوٹی کی اداکارائیں اور بہترین نئی اور پرانی گلوکارائیں بھی رہی تھیں۔ ان کے مطابق سب ان پر عاشق تھیں۔ وہ یہ بات کہتے ہوئے بھی نا سمجھ بنے رہتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ وہ اپنے گیتوں کی وجہ سے سب میں مقبول بنے رہے اور بس۔

ساحر نے عمر بھر شادی نہیں کی تھی کیونکہ وہ آخری وقت یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ شادی کی جائے تو کس سے۔ یہ فیصلہ لینا ان کے لئے اتنا آسان بھی نہیں تھا کیونکہ وہ ایک ڈرپوک آدمی تھے اور ذمہ داری سے بہت گھبراتے تھے۔

نوٹ: اس مضمون سے میرا مقصد ساحر صاحب اور ان ہستیوں سے جن کا ذکر اس میں آیا ہے داستان کو زیب دینا نہیں تھا۔ اگر کہیں بات گستاخی کی حد تک پہنچ گئی ہو تو معذرت خواہ ہوں —— (راحت)

اظہر جاوید

ساحر لدھیانوی کے ناکام معاشقے

ساحر لدھیانوی کے دل پر جس عشق نے پہلی دستک دی، وہ پریم چودھری تھی، اُس کی ہم جماعت۔ پریم چودھری لدھیانہ کے قریبی گاؤں کی رہنے والی، ایک بڑے زمیندار کی بیٹی۔ سمٹی سمٹائی، کم گو اور اندر ہی اندر سلگنے والی۔ وہ ساحر سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی مگر یقیناً اُسے یہ بھی احساس تھا، یہ سنجوگ کبھی نہیں ہو سکتا۔

کبھی کبھی قسمت چاہنے والوں کا ساتھ دے دیتی ہے۔ ساحر محبوبہ کے گاؤں پہنچا تو پریم حویلی کی چھت پر ٹہل رہی تھی۔ دونوں طرف سے محبت کی لہریں اُبھریں، آپس میں ٹکرائیں اور جسم و جاں میں ہلچل سی مچا گئیں۔ پریم نے فوراً کسی نوکرانی کو بھجوایا، اور کہلوایا، اُلٹے پاؤں لوٹ جاؤ۔ باپو آ گئے تو اسی دہلیز پر تمہارے ٹکڑے پڑے ہوں گے۔ پریم کی کسک اپنی جگہ ساحر کی خلش بھی تو شرر فشاں تھی۔ اُس نے درشن کر لیا تھا، جی شانت ہو گیا اور ایک فی البدیہہ قطعہ ہو گیا جو بعد میں کسی اور وسیلے سے پریم تک پہنچایا گیا۔ یہ ساحر کے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں۔ ظاہر ہے، ابتدائی شاعری سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہوگا

سامنے اک مکان کی چھت پر   منتظر ہے کسی کی، اک لڑکی
مجھ کو اس سے نہیں تعلق کچھ   پھر بھی سینے میں آگ سی بھڑکی

یہ ''نہیں تعلق کچھ'' والا منفی رویہ بے بسی اور بے چارگی کی دلیل بھی ہے اور شاعرانہ گریز بھی۔ پھر یوں ہوا، گھلتے گھلتے پریم، پران چھوڑ گئی۔ یہ خبر ساحر کے لئے بھی صدمے اور المیے سے کم نہیں تھی۔ اضطراب اور بے چینی میں اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے۔ اُس نے پریم کی ایک سکھی اور اپنی ہم جماعت شیلا کی منت سماجت کی، کسی طرح پریم کی تصویر لا دو۔ شیلا کے لئے بھی یہ کڑا امتحان تھا۔ موت والے گھر میں جہاں ہر طرف سوگ کا دھواں پھیلا ہو، وہ کیسے کسی سے تصویر مانگے گی؟۔ بہر حال شیلا نے کسی طور ساحر کی خواہش کی تکمیل کر ہی دی۔ ساحر وارفتگی میں یہ کہتا پھرا، وہ لاہور جا کر کسی بڑے اچھے فوٹو گرافر سے اسے انلارج کروائے گا اور اپنے کمرے اور اپنی زندگی کا حصہ اس تصویر کو بنا لے گا۔ پھر ساحر نے آنسوؤں اور آہوں کو ایک نظم میں پرو دیا ''مرگھٹ کی سرزمین پر''

میرے تصوراتِ کہن کی امیں ہے تو
مرگھٹ کی سرزمیں، مقدس زمیں ہے تو

◆

مجھ سے ایک حسینہ نے خود اعتراف کیا تھا، لڑکیاں مشہور یا کسی حد تک بدنام شخص سے متاثر ہوتی ہیں اور ان کی جانب راغب بھی۔ ساحر

لدھیانوی انقلابی سٹوڈنٹ لیڈر اور شاعر کے طور پر مشہور تو ہو ہی چکا تھا پھر
پریم چوہدری کے قصے نے اُسے افسانوی اور رومانوی ہیرو بھی بنا دیا۔ ساحر
کالج کی بزم ادب کے صدر بھی منتخب ہو گئے۔ انہیں پتا چلا، کالج کی لڑکی ایشر
کور کی آواز بہت اچھی ہے اور ترنم سے پڑھے تو سماں باندھ دیتی ہے۔ ساحر
نے ایشر کور سے کہا، وہ بزم ادب میں آئے اور بھرپور حصہ لے۔

پہلی ملاقات بس اتنی سی تھی۔ بات کیسے بنی اور کس طرح بڑھی اس
کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ایشر کور بھی امیر گھرانے کی تھی۔ گاؤں دور تھا،
اس لئے ہوسٹل ہی میں رہتی تھی۔ پرانی کہاوت ہے عشق اور مشک چھپے نہیں
رہتے۔ اور پھر جب دونوں طرف آگ برابر لگی ہو تو چرچا ہوتا ہی تھا۔ یہ ناتا
بھی 'سکینڈل' بن گیا۔ مگر اُس زمانے میں سکینڈل آج جتنے بکھرے ہوئے نہیں
ہوتے تھے۔ چہ میگوئیاں، سرگوشیاں اور دوستوں اور سہیلیوں کے چٹکلے —
لڑکیاں کچھ بھی ہوں، ان کا نسائی رویہ تو مستقل اور ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔
ایشر کور۔ سوچوں اور فکروں کے گرداب میں پھنس گئی۔ کیا ہوگا، کیا کرنا
چاہیے؟۔ ایسے میں وہ بجھی بجھی اور اداس رہنے لگی۔ ساتھیوں کی فقرے
بازی سے بچنے کے لئے اس نے ساحر سے بھی گریز شروع کر دیا۔ ساحر،
معاملے کو سمجھتا تھا، ایسی کیفیت کے اندر اُتر سکتا تھا۔ اُس نے ایشر کور کو اس
حالت میں دیکھا، تو ایک نظم ہو کر آئی۔ عنوان تھا ''کسی کو اداس دیکھ کر''۔

تمہیں اُداس سی پاتا ہوں میں کئی دن سے
نہ جانے کون سے صدمے اُٹھا رہی ہو تم

عشق کی اس کہانی کا آغاز اور انجام بھی عجیب ہوئے۔ ایشر کور ہوسٹل
سے گھر گئی ہوئی تھی۔ شاعر بے تاب محبوب کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ بہت کچھ کہنا
چاہتا تھا۔ اس نے ایشر کی سہیلیوں سے منت سماجت کی، کسی طرح ایشر سے ملا دو۔
محبت میں وارفتہ تو جوان یہ بھول جاتے ہیں، حاسد اور رقیب بھی قدم قدم ساتھ
چلتے ہیں اور ایسے جن کے بارے میں شک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر لڑکیاں ایشر کور
کو لے کر ہوسٹل میں آ گئیں۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ وقت تھم گیا یا اُڑتا چلا گیا۔
رقیبوں نے پرنسپل کو خبر کر دی۔ وہ آئے، انہوں نے جو دیکھا، اُن کے لئے ناقابل
برداشت تھا۔ کھڑے کھڑے دونوں کو کالج بدری کا حکم دے دیا۔ ساحر تو پہلے ہی
معتوب تھے، ایشر کور عشق کی آگ میں جلنے اور پگھلنے سے پہلے ہی ماری گئی۔

پھر یوں ہوا۔ عشق کی آگ کا الاؤ بنا اور ایشر کور گھر بار چھوڑ کر ساحر
کے پاس پہنچی۔ علامہ اقبال نے کہا تھا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عشق میں عقل کا کیا کام۔ جذبوں کو کون سے بند بھی روک سکے
ہیں۔ ایشر کور کی جذباتیت مثالی تھی، مگر اُس وقت ساحر اور اُن کی والدہ نے
دانائی سے کام لیا اور ایشر کور کو سمجھا بجھا کر واپس گھر بھیج دیا۔ جب ساحر کے
والد فضل دین کو سن گن ہوئی تو وہ انا پرست، تومند اور مضبوط جثے والا
زمیندار گھوڑے پر سوار ہو کر ساحر کے گھر پہنچا۔ تعلقات کی کشیدگی کے
باوجود باپ بیٹے کا رشتہ تو برقرار تھا۔ فضل دین صاحب نے عبدالحئی (ساحر)
کو مخاطب کیا ''لڑکی بھگائی ہی تھی تو کسی مسلمان لڑکی کا انتخاب کرتے۔ میں خود

جا کر، گھوڑے پر بٹھالاتا''۔

پھر المناک انجام یہ ہوا، ایشر کور نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ وہ بمبئی چلی گئی۔ کسی نامعلوم شخص سے شادی کر کے گم نام ہوگئی۔

◆

لدھیانہ کالج سے نکلنے کے بعد ساحر لدھیانوی لاہور آگئے۔ یہاں کب اور کیسے ساحر اور امرتا پریتم ایک دوسرے کے ہوئے، اور کیسے یہ عشق ادبی اور ابدی حیثیت اختیار کر گیا۔ امرتا پریتم نے ساحر سے عشق کی کیفیت میں بہت کچھ لکھا۔ نظموں کے علاوہ کئی افسانوں میں بھی ساحر صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ امرتا شادی شدہ تھی، اپنے حُسن کے بانکپن کے ساتھ اُسے موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ ریڈیو سٹیشن لاہور پر کئی پروگرام کرتی تھی۔ اُن دنوں اور لمحوں کی یادوں اور محبتوں کو امرتا پریتم نے اپنے ایک پنجابی ناول ''ایک تھی انیتا'' میں پرو دیا ہے۔ اس میں ہیرو ساحر، ساحر بن جاتا ہے۔ بعد میں یہ ناول اردو میں بھی چھپا۔ ''ایک تھی انیتا''۔ اس کے علاوہ امرتا کی آپ بیتی ''رسیدی ٹکٹ'' نے تو ادبی حلقوں کو چونکا دیا۔

یہ 1944ء کے قریب کا زمانہ ہے۔ لاہور اور امرتسر کے درمیان ایک غیر آباد جگہ کو صوفی سنت سردار گوربخش سنگھ نے بسایا اور اس کا نام پریم نگر رکھا۔ سردار جی مذہبوں، فرقوں اور عقیدوں سے بلند ہو کر انسانیت اور محبت کا پیغام دیتے تھے۔ نوجوان نسل ان سے بہت متاثر ہوئی۔ حوالہ ملتا ہے، وہیں پریم نگر میں ساحر اور امرتا کی ملاقات ہوئی۔ پھر سردار گوربخش سنگھ جی نے اپنے مسلک کا آرگن ''پریت لڑی'' کے نام سے شروع کیا۔ ساحر، کچھ دیر اس رسالے کے ایڈیٹر رہے اور امرتا پریتم بھی شاملِ ادارت رہیں۔ ساحر کی بہت سی نظموں اور فلمی نغموں میں امرتا کی کسک سموئی ہوئی ہے۔

جب امرتا پریتم دلی چلی گئیں، تو ساحر بھی لاہور چھوڑ گئے۔ ہجرت صرف ہجر کی وجہ سے نہیں تھی۔ طالع آزما لوگوں نے، جن میں آغا شورش کاشمیری کا نام زیادہ لیا جاتا ہے، ساحر کے گرد افواہوں کا جال بُن دیا اور اُسے یقین دلایا، خفیہ پولس تمہاری نگرانی کر رہی ہے۔ تم گرفتار ہو جاؤ گے۔ بہتر ہے، لاہور سے بھاگ جاؤ۔

◆

لاہور سے جانے کے بعد، ساحر جب بمبئی میں تھے، تو اردو کی ممتاز ادیبہ ہاجرہ مسرور اُن کی زندگی میں آئیں۔ ساحر کے نہایت قریبی دوست حمید اختر نے انکشاف کیا تھا، ان دونوں کی منگنی ہوئی اور ساری رسمیں ادا ہوگئیں[1]۔ منگنی ٹوٹنے کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ ساحر پنجابی تھا اور ہاجرہ لکھنوی — ساحر نے کسی مشاعرے میں جانے سے پہلے ہاجرہ سے ایک لفظ کا تلفظ پوچھا — ہاجرہ نے جو بتایا، ساحر نے مشاعرے میں ویسے ہی پڑھ دیا جوش ملیح آبادی کہاں ٹلنے والے تھے انھوں نے برملا ساحر پر طنز کی۔ ساحر یہ وار تو سہہ گیا، مگر واپس آ کر اُس نے جھنجھلا کر منگنی توڑ دی — کھوج لگایا جائے، تو ساحر کی شاعری میں

۱۔ اوم کرشن راحت جو ساحر کے دوست تھے ان کے مضمون میں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کا ذکر کچھ مختلف ہے (ف۔س۔اعجاز)

اس واردات کی بھی بہت سی جھلکیاں مل جائیں گی۔

◆

ساحر جب مشہور اور مقبول ہوتے گئے اور ممبئی کی دنیا میں، اور فلم کے حلقوں میں بھی اُنکے پاؤں جم گئے، تو لتا منگیشکر اور وہ آپس میں گھل مل گئے۔ اُن دونوں کے درمیان شادی بھی طے پا گئی تھی اور لتا اکثر ساحر کے گھر چلی جاتیں، اور ان کی رسوئی سنبھال لیتیں —— ساحر کی والدہ پرانی معاشرت کی روایت پرست خاتون تھیں اور ساحر کے لئے اُن کا کہا، قول سدید ہوتا تھا۔ والدہ محترمہ نے شرط لگائی، لتا سے کہو، مسلمان ہو جائے، تو شادی کر لینا —— ساحر خود اس ''تقسیم اور تفریق'' کے قائل نہیں تھے، وہ بھلا لتا سے کیا کہتے۔ اور یوں یہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ 'تلخیاں' میں شامل 'تیری آواز' لتا ہی کے لئے لکھی گئی تھی۔

◆

لتا کے بعد بھی ساحر کی زندگی میں اور لڑکیاں آئیں، کس کے لئے کیا لکھا، اس کی خبر نہیں ملتی۔ علی سردار جعفری صاحب نے مجھے بتایا تھا —— حیدر آباد دکن میں ایک شادی شدہ خاتون ساحر کی دیوانی تھی۔ وہ لڑکی علی سردار جعفری اور سلطانہ کے یہاں ساحر سے ملنے آئی۔ اُس کے ساتھ اُس کا شوہر بھی تھا —— دونوں وجیہہ اور خوب صورت تھے۔ لڑکی پر تو نظر نہیں ٹکتی تھی۔ اُس نے شوہر کی موجودگی میں ساحر سے اپنے عشق کا اظہار کیا اور اُس کے ساتھ بمبئی چلنے کو تیار ہوئی۔ وہ خاتون اور ساحر بہت دیر تک علیحدگی میں بھی ملے۔ کچھ گھنٹوں بعد اس کا شوہر بھی آ گیا اور طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ طلاق نامہ تیار کرنے کے لئے وکیل کی ضرورت تھی۔ ساحر بھی پورے رضامند تھے۔ اُس شام وکیل نہ مل سکا۔ دوسرے دن بمبئی واپسی کے لئے ریل کے ٹکٹ لے لئے گئے۔ ساحر بے چینی سے گاڑی چلنے تک پلیٹ فارم پر ٹہل کر انتظار کرتے رہے۔ پتا نہیں کیا ہوا، کیوں اُس خاتون کا ارادہ اور وعدہ بدل گیا —— ساحر پر مایوسی کے سائے چھائے، وہ ٹوٹا پھوٹا اور نہ جانے کس کس نغمے میں اُس نے یہ غم انڈیلا ہوگا۔

◆

امرتا کے لئے برسوں بعد جو نظم کہی، اس کا پس منظر بھی انوکھا ہے۔

امرتا پریتم اُس وقت آرٹسٹ امروز (اندر جیت) کی بانہوں میں لڑھک چکی تھی۔ دونوں اکٹھے رہے تھے۔ بہت سے قریبی لوگوں کی گواہی ہے، انہوں نے رسمی طور پر شادی بیاہ نہیں کیا تھا۔ ساحر بمبئی سے دلی گئے۔ امرتا کو فون کیا۔ ملاقات کی خواہش کی یا ممکن ہے، امرتا نے خود ایسا اظہار کیا ہو —— مگر ستم یہ ہوا، امرتا، امروز کو ساتھ لے کر ہوٹل پہنچی۔

برسوں بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ ساحر تنہائیوں کا ڈسا ہوا اور چھوڑ جانے والوں (چھٹ جانے والوں) کے کرب میں تھا۔ امرتا اکیلے میں ملتی تو نہ جانے ساحر کیا کچھ کہتا۔ کیا کیا کچھ کہتا۔ کوئی زندگی کا مثبت فیصلہ ہو جاتا۔ لیکن امرتا تو اپنی زندگی میں سکون بھر چکی تھی۔ اُس نے کہا تھا'' ساحر میرا خواب تھا، اور امروز تعبیر ہے''۔ آپ 'رسیدی ٹکٹ'' پڑھیں —— ''ایک تھی انیتا'' دیکھیں۔ امرتا کی وارفتگی میں ڈوبی ہوئی نظمیں سامنے رکھیں، تو صاف پتا چلتا ہے، امرتا نے بعد میں جھوٹ کہا تھا۔ بات پھیل جائے ، میں اُدھر نہیں جاتا۔

ملاقات کے تھوڑی دیر بعد ہی امرتا، امروز کو لے کر چلی گئی۔ اُدھر امرتا گھر پہنچی ہوگی، اِدھر ساحرؔ کا فون پہنچا: 'تم چلی گئی ہو ــــ تمہارے بعد میں دیر تک کبھی تمہارے گلاس میں، کبھی اپنے گلاس میں شراب ڈال کر پیتا رہا۔ پھر یہ نظم ہوگئی۔ سنو.....

محفل سے اٹھ جانے والو، تم لوگوں پر کیا الزام
تم آباد گھروں کے باسی، میں آوارہ اور بدنام
میرے ساتھی خالی جام

دو دن تم نے پیار جتایا، دو دن تم سے میل رہا
اچھا خاصا وقت کٹا اور اچھا خاصا کھیل رہا
اب اس کھیل کا ذکر ہی کیسا، وقت کٹا اور کھیل تمام
میرے ساتھی خالی جام

تم نے ڈھونڈی سکھ کی دولت، میں نے پالا غم کا روگ
کیسے بنتا، کیسے نبھتا، یہ رشتہ اور یہ سنجوگ
میں نے دل کو دل سے تولا، تم نے مانگے پیار کے دام
میرے ساتھی خالی جام

تم دنیا کو بہتر سمجھے، میں پاگل تھا، خوار ہوا
تم کو اپنانے نکلا تھا، خود سے بھی بیزار ہوا
دیکھ لیا گھر پھونک تماشا، جان لیا اپنا انجام
میرے ساتھی خالی جام

بعد میں یہ نظم فلم 'دوج کا چاند' میں شامل ہوئی۔ آپ اس نظم کے کینوس کو دیکھیں، اس میں ساحرؔ کی خواہشیں اور حسرتیں، ساحر اور امرتا کے گزرے دنوں کی عکاسی، اور سارے ماضی اور حال کی تصویر سامنے آجائے گی اور امرتا پر یہ تم اگر اب ہاتھ بڑھاتیں تو مستقبل بھی مکمل ہوسکتا تھا۔

◆

ساحرؔ لدھیانوی کے معروف معاشقوں کے علاوہ اور بھی کئی یک طرفہ عشق تھے۔ یک طرفہ، ایسے کہ لڑکیوں نے ساحرؔ کو ٹوٹ کر چاہا۔ بہت سے ایسے واقعات ہیں اُن کا کیا ذکر کریں۔ مگر بھارت کی مشہور قوالہ شکیلہ بھوپالی نے تو ایک طرح سے زبردستی ساحرؔ سے سمبندھ بنا لیا تھا۔ پہلے اُس نے ساحرؔ کی فلمی قوالی ..... یہ عشق عشق ہے ...... کو اپنایا اور اپنا سکہ جمایا۔ پھر ساحرؔ سے نیا کلام لینے کے بہانے ملاقاتیں کرتی رہی۔ لگتا ہے، بات بنی نہیں تھی ــــ لیکن اس روکھے پھیکے تعلق نے شکیلہ بھوپالی کو اور زیادہ مشہور کردیا۔

◆

پھر ساحرؔ کی زندگی میں سدھا ملہوترا آئیں۔ خوب صورت، سلیقہ شعار اور تہذیبی رکھ رکھاؤ والی۔ یہ شاید ساحرؔ کا آخری عشق تھا۔ اس کے بعد کچھ مایوسیوں نے، کچھ والدہ کی وفات کے بعد ٹوٹ پھوٹ جانے سے ساحرؔ میں بھی ایک ٹھہراؤ سا آگیا۔ دل کے عارضے نے بھی نڈھال کر رکھا تھا۔ مجھے ساحرؔ کی ماموں زاد بہنوں انور سلطانہ اور سرور شفیع نے بتایا۔ بھائی جان (ساحرؔ) کا 1982ء میں ارادہ تھا، فلموں کے لئے بہت لکھ لیا، اب تھک گیا

ہوں، جلد بمبئی اور بمبئی کی دنیا چھوڑ چھاڑ کر الٰہ آباد آپ لوگوں کے ساتھ جا
بسوں گا۔ اس بات کا بلونت گارگی نے بھی حوالہ دیا ہے۔

ساحر اور سدھا ملہوترہ کے عشق نے بھی فلمی دنیا کیا پورے
ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا۔ اس عشق کا انجام بھی ناکامی ٹھہری — شادی کیوں
نہ ہو سکی یہ عقدہ نہیں کھلا۔ میں جب بمبئی گیا تو صابر دت زندہ تھا۔ اُس کا ایک
الگ مزاج تھا۔ بات کو یوں اُڑا دینا اس کی عادت تھی۔ اس کا جواب تھا
''..... بس، نہیں کی ساحر نے شادی — !''۔ اب کوئی کیا بات بڑھائے۔
حمید اختر نے بتایا ہے سدھا ملہوترا نے تعلق ٹوٹنے کے بعد ساحر کو بہت بدنام کیا
تھا۔ کیا کہا تھا یہ انہوں نے بھی نہیں کھولا۔

عشق کی سرمستی کے دنوں میں ساحر نے ایک گیت لکھا، جسے سدھا ہی
نے گایا تھا۔ اس میں کون کون سا دبا جذبہ اُبھر آیا تھا ملاحظہ کریں:

مجھے گلے سے لگا لو، بہت اداس ہوں میں
غمِ جہاں سے چھڑا لو، بہت اداس ہوں میں
یہ انتظار کا دُکھ اب سہا نہیں جاتا
تڑپ رہی ہے محبت، رہا نہیں جاتا
تم اپنے پاس بلا لو، بہت اداس ہوں میں
بھٹک چکی ہوں بہت زندگی کی راہوں میں
مجھے اب آ کے چھپا لو تم اپنی بانہوں میں
برا سوال نہ ٹالو، بہت اداس ہوں میں
ہر ایک سانس میں ملنے کی آس چلتی ہے
سلگ رہا ہے بدن اور روح جلتی ہے
بچا سکو تو بچا لو، بہت اداس ہوں میں
مجھے گلے سے لگا لو، بہت اداس ہوں میں

یہ اُداسی، بے بسی اور بے ثباتی یقیناً سدھا ملہوترا ہی کی حالت کی
گواہ ہے۔ ساتھ ساتھ ساحر کی بے چارگی بھی گندھی ہوئی ہے۔ اور آخر وہی
ہوا، جو ہوتا آیا تھا۔ سدھا ملہوترا کی شادی کی خبر نکلی، منگنی ہو گئی، تو کچھ اہل دل
نے ایک عمارت کی ٹیرس پر شامِ ساحر منانے کا اہتمام کیا۔ اس میں آخری بار
سدھا ملہوترا بھی شامل ہوئی تھیں۔ کچھ لوگوں نے اظہار خیال کیا۔ موسیقاروں
اور گلوکاروں نے ساحر کے نغمے الاپے اور خود سدھا ملہوترا نے بھی ساحر کے
گیت سنائے۔ آخر میں ساحر لدھیانوی نے تازہ نظم سنائی ''خوبصورت موڑ''
.... چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں۔

اُس شام کا احوال بیان کرنے والوں کا کہنا ہے، محفل میں موجود ہر
محبت نواز فرد کی آنکھیں نم تھیں۔ سدھا ملہوترا بھی اپنے آنسوؤں اور جذبات کو
سنبھالنے میں ناکام رہی۔ بے اختیاری میں اُٹھی، چپ چاپ، آنچل میں
اشکوں کے ستارے ٹانکتی ہوئی فلیٹ کی سیڑھیاں اُتر گئی۔ ساحر بھی بے قراری پر
قابو نہ پا سکے۔ اُٹھے، نہ بات کی، نہ آنکھیں ملائیں اور سیڑھیاں اُتر گئے۔ محفل
والوں کا کہنا ہے، سدھا اپنی کار میں اور ساحر اپنی کار میں بیٹھے اور سارے
ماحول اور ساری محفل کو اجنبی بنا کر اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو گئے، پھر

بھی نہ ملنے کے لئے ۔۔۔!

بظاہر یہ سارے عشق، ساری محبتیں ناکام رہیں، مگر اردو شاعری کو اتنا سرمایہ دے گئی ہیں، اس کا دامن یوں بھر گئی ہیں، جب تک اردو سے محبت کرنے والے زندہ رہیں گے، محبتوں کا حاصل یہ شاعری، عشق کے فلک سے ٹوٹے یہ چاند سورج دلوں کو گرماتے رہیں گے۔ نئی محبتوں اور سندر کومل جذبوں کو اُکساتے رہیں گے۔

●●

نظم

ف۔س۔اعجاز

تمہارے ہونٹوں کو پڑھ رہا ہوں

تمہارے ہونٹوں کو پڑھ رہا ہوں
تمہارے ہونٹوں کو پڑھ رہا ہوں
اک ادھ کھلی سی کتاب کوئی
گلاب کوئی
میں اپنے سینے پہ رکھ کے سویا کہ جاگتا ہوں
تمہارے ہونٹوں کو پڑھ رہا ہوں
ہر ایک سلوٹ میں اک فسانہ چھپا ہوا ہے
کہ زیر محراب کوئی مصرع لکھا ہوا ہے
تمہی بتاؤ
کہ شوخ افسانے اور نظمیں
تمہارے ہونٹوں پہ کس نے لکھے؟
میں نے لکھے؟!
نئی نئی سی تمہارے ہونٹوں کی چپ ہے قاتل
اسے سمجھنا بہت ہے مشکل
تمہارے ہونٹوں پر ایک تحریر میری تحریر سے جدا ہے
مرے لبوں نے جو لکھا تھا وہ سچ لکھا تھا
سچ لکھا تھا
میں اپنا لہجہ تمہارے ہونٹوں کو دے چکا تھا
مگر یہ کیا ہے کہ آج ان پر
اک ایسا مضمون لکھا ہوا ہے
کہ جس کا ہر لفظ اجنبی ہے
کہ جس کی تحریر سرمئی ہے
تمہارے ہونٹوں پہ آشنائی کی قوس پھیلے
تو کشتی دل رواں دواں ہو
مجھے یہ حق دو کہ میں پرانی کہانیوں میں
نئی کہانی تلاش کر لوں
چلو سفر پر پھر آج نکلیں
یہ پیاس اک بادبان کھولے
تمہیں سمندر پکارتا ہے
تمہارے ہونٹوں سے لفظ کوئی گرے تو چن لوں
تمہارے ہونٹوں کو ساتھ لے کر میں گھر سے نکلوں
تمہارے ہونٹوں کی ایک جنبش کا منتظر ہوں
اسی لئے تو تمہارے ہونٹوں کو پڑھ رہا ہوں!

●●

اُس کی یادوں کے لمس

جس چہرے کی روشنی میں سب سے پہلے دل کی تہوں میں درد جاگتے دیکھا وہ اس مذہب کا تھا جس مذہب کے ماننے والوں کے لئے گھر میں برتن بھی الگ رکھے جاتے تھے۔

یہی وہ چہرہ تھا جس نے میرے اندر انسانیت کی وہ جوت جگائی کہ ملک کی تقسیم کے وقت، تقسیم کے ہاتھوں تباہی سے دوچار ہو کر بھی جب میں نے اس حادثے کے بارے میں قلم اٹھایا تو دونوں گروہوں کی زیادتیاں بغیر کسی رعایت یا ریزرویشن کے قلمبند کر سکی۔ یہ چہرہ نہ دیکھا ہوتا تو میرے ناول ''پنجر'' کی تقدیر نہ جانے کیا ہوتی۔

میں اکیس برس کی تھی جب اپنے خوابوں میں بسا ہوا یہ چہرہ اس دھرتی پر دیکھا اور زبان پر بیساختہ کسی کا یہ شعر آ گیا

تمہاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل
تمہاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

کافی برس بعد اس پہلی ملاقات کی تفصیل میں نے آخری خط میں بیان کی تھی۔ اس کے بعد ایک آگ کا دریا تھا جس سے میں دن رات گزرتی رہی۔

یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء میں جب مجھے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا تو فون پر یہ خبر ملتے ہی میں سر سے پاؤں تک تپنے لگی۔ خدایا یہ ''سنہڑے'' میں نے کسی انعام کے لیے تو نہیں لکھے تھے۔ جس کے لئے لکھے تھے اس نے تو انہیں پڑھا ہی نہیں اب ساری دنیا بھی پڑھے تو مجھے کیا۔ اس شام ایک پریس رپورٹر آیا۔ فوٹوگرافر ساتھ تھا۔ وہ میری تصویر لینا چاہتا تھا۔ جس میں نظم لکھتی ہوئی نظر آؤں۔ میں سامنے میز پر کاغذ اور قلم ہاتھ میں لے کر کاغذ پر کوئی نظم لکھنے کے بجائے کسی ارادے کے بغیر اس کا نام لکھنے لگی۔ جس کے لیے میں نے سنہڑے لکھے تھے۔ ساحر، ساحر، ساحر، ساحر۔ سارا کاغذ بھر گیا۔

پریس کے لوگ چلے گئے تو اکیلے بیٹھے ہوئے مجھے خیال آیا، صبح اخباروں میں یہ تصویر چھپے گی تو میز پر پھیلے ہوئے کاغذ پر ساحر کے نام کی گردان نظر آئے گی...... اوہ خدایا!

مجنوں کے لیلیٰ لیلیٰ پکارنے والی کیفیت کا تجربہ ہوا مجھے اس روز لیکن کیمرے کا فوکس میرے ہاتھ پر کاغذ پر نہیں۔

اس لیے دوسرے دن کے اخباروں میں کاغذ پر کچھ بھی نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ یہ تسلی ہونے کے بعد ایک کسک ایک چبھن اس میں شامل ہو گئی۔ کاغذ خالی نظر آ رہا تھا، مگر خدا شاہد ہے کہ وہ خالی نہیں تھا۔

ساحر کی میں نے تھوڑی سی اپنے ناول ''اشرو'' میں تصویر کشی کی ہے۔

پھر "ایک تھی انیتا" میں اور پھر "پھروتی کی کلیاں" میں ساگر کے روپ میں۔

نظمیں بہت سی لکھی ہیں۔ سنہرے سب سے لمبی نظم اور دوسری کئی نظمیں اور آخر میں نظم آج کی بات لکھ کر محسوس ہوا کہ اب چودہ برس کا بن واس پورا کر کے آزادی کی طرف لوٹ آئی ہوں۔

لیکن بیتے ہوئے ماہ و سال بدن کے لباس کی طرح نہیں ہوتے۔ یہ داغوں کے نشان کی طرح ہوتے ہیں، کہتے کچھ نہیں لیکن جسم سے الگ نہیں ہوتے۔ کئی برس بعد، بلغاریہ کے جنوب میں وارنا کے ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی جہاں ایک طرف سمندر تھا دوسری طرف جنگل اور تیسری جانب پہاڑ۔ وہاں ایک رات ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر کی طرف سے ایک ناؤ آتی ہے اور اس میں سے اتر کر کوئی کھڑکی کی راہ سے میرے کمرے میں آگیا۔

خواب اور حقیقت ایک ہو گئے تھے اس رات کی نظم لکھی "تیری یادیں"۔ بہت دنوں ساحر سے میری اور امروز (مصنفہ کے لیے آئیڈیل) کی ایک ساتھ ملاقات ہو چکی ہے۔ پہلی بار وہ اداس تھا۔ ہم تینوں نے ایک ہی میز پر بیٹھ کر جو کچھ پیا تھا اس کے خالی گلاس میرے اور امروز کے وہاں سے اٹھ کر چلے آنے کے بعد بھی ساحر کی میز پر پڑے رہے۔ اس رات اس نے ایک نظم لکھی تھی۔

میرے ساتھی خالی جام

تم آباد گھروں کے باسی

اور یہ نظم اس نے مجھے اس رات کوئی گیارہ بجے فون پر سنائی اور بتایا کہ وہ باری باری تینوں گلاسوں میں وہسکی ڈال کر پی رہا ہے۔ لیکن بمبئی میں جب دوبارہ ہماری ملاقات ہوئی تو اس وقت امروز کو دوا دلوائی۔ یوں تو میرے اندر کی عورت، ہمیشہ میرے اندر کی فنکارہ سے پیچھے رہی ہے دوسرے نمبر پر۔ خود اپنے کو دھیان دلایا ہے۔ صرف فنکارہ کا روپ اتنا روشن رہا کہ میری اپنی آنکھوں کو بھی میری پہچان اسی میں ملتی ہے۔

لیکن زندگی میں تین وقت ایسے آئے ہیں جب میں نے اپنے اندر کی صرف عورت کو جی بھر کر دیکھا ہے۔ اس کا روپ اتنا ابھرا ہوا تھا کہ میرے اندر کی "فنکارہ" کا وجود میرے لئے محو ہو گیا وہاں کوئی خلا نہیں تھا جو اس کی یاد دلاتا، یہ یاد صرف اب کر سکتی ہوں۔ کئی برس کی دوری پر کھڑی ہو کر۔

پہلی بار اپنے اندر کی عورت کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب میری عمر ۲۵ برس ہو گئی تھی۔ اور میری گود بچے سے خالی تھی۔ تقریباً ہر رات مجھے ایک بچے کا خواب آتا۔ ایک ننھا منا چہرہ تراشے ہوئے نین نقوش، ٹکر ٹکر میری طرف دیکھتا ہوا۔ اور بار بار خواب دیکھتے دیکھتے مجھے اس بچے کے چہرے کی پکی پہچان ہو گئی۔ خواب میں وہ مجھ سے باتیں بھی کرتا تھا، روزانہ ایک سی باتیں۔ میں اس کی آواز بھی پہچاننے لگی تھی۔ خواب میں میں پودوں کو پانی دے رہی ہوتی تھی اور اچانک ایک گملے میں پھول کی جگہ ایک بچے کا چہرہ کھل اٹھتا تھا۔

میں چونک کر پوچھتی تھی تو کہاں تھا؟ میں تجھے ڈھونڈتی رہی اور وہ معصوم چہرہ ہنس پڑتا تھا۔ میں یہاں چھپا ہوا تھا اور میں جلدی سے گملے سے

بچے کو اٹھا لیتی تھی۔ لیکن جاگنے پر میں ویسی ہی ہوتی۔ سونی ویران اور اکیلی۔ صرف ایک عورت، جو اگر ماں نہیں بن سکتی تھی تو جینا بھی نہیں چاہتی تھی۔

دوسری بار یہ مشاہدہ میں نے تب کیا جب ایک دن ساحر آیا تھا اور اسے ہلکا سا بخار تھا۔ اس کے گلے میں درد بھی تھا اور سانس میں کھنچاؤ کی سی کیفیت تھی۔ اس دن اس کے گلے اور چھاتی پر میں نے وکس ملی تھی۔ کتنی دیر ملتی رہی تھی اور تب محسوس ہوا تھا۔ اسی طرح پیروں پر کھڑے کھڑے پوروں سے، انگلیوں سے اور ہتھیلیوں سے اس کی چھاتی کو ہولے ہولے ملتے ہوئے میں اپنی پوری عمر گزار سکتی ہوں۔ میرے اندر کی عورت کو اس وقت دنیا کے کسی کاغذ قلم کی ضرورت نہیں تھی۔

اور تیسری بار یہ ''عورت'' میں نے تب دیکھی تھی جب اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے امروز نے اپنا پتلا سا برش اپنے کینوس کے اوپر سے اٹھا کر اسے ایک بار لال رنگ میں ڈبویا تھا اور پھر اس برش سے میرے ماتھے پر بندی لگا دی تھی۔

تقسیم ملک سے پہلے میرے پاس ایک چیز تھی جسے میں سنبھال کر رکھتی تھی۔ یہ ساحر کی نظم ''تاج محل'' تھی جو اس نے فریم کرکے مجھے دی تھی۔ آج تقسیم کی بربادی کے برسوں بعد اپنی الماری کا اندرونی خانہ ٹٹولنے لگی تو کسی دبے ہوئے خزانے کی طرح کچھ ظاہر ہو رہا ہے۔ ایک پتہ ہے جو میں تالستائی کی قبر پر سے اٹھا لائی تھی اور ایک کاغذ کا گول ٹکڑا ہے جس کے ایک طرف چھپا ہوا ہے۔ ایشین رائٹرز کانفرنس اور دوسری طرف ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ ''ساحر لدھیانوی'' یہ وہ بیج ہے جو کانفرنس کے موقع پر تمام مندوبین کو دیا گیا تھا، میرے نام کا بیج میرے اپنے کوٹ پر لگا ہوا تھا اور ساحر کے نام کا ساحر کے کوٹ پر لگا تھا۔ ساحر نے اپنا بیج اتار کر میرے کوٹ پر لگا دیا اور میرا بیج اتار کر اپنے کوٹ پر لگا لیا۔ اور آج کاغذ کا یہ ٹکڑا تالستائی کی قبر سے اٹھائے ہوئے پتے کے پاس پڑا ہوا مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ بھی میں نے ایک پتے کی طرح اپنے ہاتھ سے خود اپنی قبر پر سے اٹھایا ہے۔

پاس ہی ویت نام کی بنی ہوئی ایک ایش ٹرے ہے جو آذربائیجان کی راجدھانی باکو میں وہاں کی شاعرہ مختارو خانم نے مجھے دی تھی یہ کہتے ہوئے کہ جب جب تمہارے الہام کا دھواں تمہارے سگریٹ کے دھوئیں سے مل جائے مجھے یاد کر لینا۔

برسوں اس دھوئیں میں چہرے ابھرتے مٹتے رہے ہیں۔ صرف اوروں کے لئے نہیں اپنا چہرہ بھی۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا چہرہ بھی۔ پگھلتا اور کانپتا ہوا۔ حقیقت میں تبھی دیکھا ہے جب کوئی نظم لکھی ہے۔

''کے اس کاگذ اتے عشق ترے انگوٹھا لایا'' کون حساب چکائے گا۔ اس نظم کی شان نزول یہ تھی کہ ایک بار ایک اردو مشاعرے کے موقع پر لوگ ساحر سے آٹوگراف لے رہے تھے۔ لوگ کچھ ادھر ادھر ہوئے تو میں نے ہنس کر اپنی ہتھیلی اس کے آگے کر دی اور کہا آٹوگراف۔ ساحر نے ہاتھ میں لیے ہوئے قلم کی سیاہی اپنے انگوٹھے پر لگا کر انگوٹھا میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ جیسے میری ہتھیلی جس پر اپنے دستخط کیے' اس پر کیا لکھا ہوا تھا یہ سب ہواؤں کے

حوالے ہے۔ اس پر کیا لکھا ہوا تھا اسے نہ خود اس نے کبھی پڑھا نہ زندگی نے۔ اس لیے میں کہہ سکتی ہوں، ساحر ایک خیال تھا۔ ہوا میں چمکتا ہوا۔ شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا ایک ساحرانہ عکس، لیکن امروز کے ساتھ بتائی ہوئی زندگی، شروع کے کچھ برسوں کو چھوڑ کر ایک بے خودی کے عالم تک پہنچ گئی ہے۔

اور امروز جانتا ہے کہ میں نے ساحر سے محبت کی تھی۔ لیکن یہ جانکاری اپنی جگہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس سے آگے جا کر امروز کی بڑائی یہ ہے کہ اس محبت میں میری ناکامی کو امروز اپنی ناکامی سمجھتا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرا بیٹا میرے جسم کی آس بنا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے آخری دنوں کی بات۔

اخباروں اور کتابوں میں کئی بار پڑھا تھا کہ ہونے والی ماں کے کمرے میں جس طرح کی تصویریں بھی ہوں یا اس کے خیالوں میں جو چہرہ بسا رہے بچے کی صورت اسی پر جاتی ہے اور میرے دل نے جیسے دنیا سے چھپ کر سرگوشی میں مجھ سے کہا اگر میں ساحر کو ہر لمحے اپنے خیالوں میں رکھوں تو میرے بچے کی شکل میں اس کی شباہت آ جائے گی۔ جسے زندگی میں نہیں پا سکی تھی، اسے خوابوں میں پا لینے کی ایک کرشمہ ساز کوشش، خدا کی طرح صورت آفرینی کی خلاقانہ کوشش، جسم کا ایک آزادانہ عمل۔

صرف روایت ہی سے آزادی نہیں خون اور نسل کی گرفت سے بھی رہائی۔

دیوانگی کے اس عالم میں جب ۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو بچے کا جنم ہوا اور پہلی بار اس کی شکل دیکھی تو اپنی خلاقی پر یقین آ گیا اور بچے کے واضح ہوتے ہوئے خدوخال کے ساتھ اپنا تصور واقعی متشکل ہوتا نظر پڑا۔ میرے بیٹے کی صورت سچ مچ ساحر سے ملتی ہے۔

خیر دیوانگی کی آخری چوٹی پر پاؤں رکھ کر ہمیشہ کھڑا نہیں رہا جا سکتا۔ پاؤں ٹکانے کے لیے زمین کا کوئی ٹکڑا چاہیے اس لیے آئندہ برسوں میں اس واقعے کا ذکر میں اس طرح کرنے لگی جیسے یہ پریوں کے دیس کی کوئی کہانی ہو۔

ایک بار میں نے یہ بات ساحر سے بھی کہی، اپنے آپ پر ہنستے ہوئے۔ اس پر کیا ردعمل ہوا۔ مجھے علم نہیں۔ میں نے تو بس اتنا دیکھا کہ ساحر ہنسنے لگا اور بولا ''ویری پوورٹیسٹ'' ساحر کی زندگی کا ایک بڑا بلکہ یہ کہوں گی سب سے بڑا کمپلیکس یہ ہے کہ وہ اپنی نظر میں خوبصورت نہیں ہے اس لئے اس نے یہ بات کہی۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ایک دن اس نے میری لڑکی کو اپنی گود میں بٹھا کر کہا تھا۔ ''تمھیں ایک کہانی سناؤں'' اور جب میری لڑکی کہانی سننے کے لئے تیار ہوئی تو ساحر کہنے لگا۔ ایک لکڑہارا تھا، وہ دن رات جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتا تھا، پھر ایک دن اس نے جنگل میں ایک راجکماری کو دیکھا، بہت خوبصورت۔ لکڑہارے کا جی چاہا کہ وہ راجکماری کو لے کر بھاگ جائے۔

پھر؟ میری لڑکی کی عمر ابھی کہانیوں پر ہنکارے بھرنے کی تھی، اس لیے وہ بڑے دھیان سے کہانی سن رہی تھی۔

میں پاس بیٹھی صرف، ہنس رہی تھی، کہانی میں دخل نہیں دے رہی
تھی۔

ساحر کہہ رہا تھا ''مگر وہ تھا تو لکڑہارا، وہ راجکماری کو صرف دیکھتا
رہا۔ دور ہی سے کھڑے کھڑے اور پھر لکڑیاں کاٹنے لگا۔ سچی کہانی ہے نا؟

''ہاں''۔ میں نے دیکھا تھا۔ بچی نے نہ جانے یہ کیوں کہا۔ ساحر
ہنستے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔ دیکھو! یہ بھی جانتی ہے اور بچی سے اس نے
پوچھا۔ تم وہاں تھیں جنگل میں؟۔

بچی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

ساحر نے پھر گود میں بیٹھی ہوئی بچی سے پوچھا۔ تم نے اس لکڑہارے
کو بھی دیکھا تھا نا؟ وہ کون تھا؟ بچی کو شاید اس وقت الہام ہو رہا تھا، بولی
''آپ''۔

ساحر نے پھر پوچھا ''اور وہ راجکماری کون تھی؟

''ماما'' بچی ہنسنے لگی۔

ساحر، مجھ سے کہنے لگا۔ دیکھا، بچے سب کچھ جانتے ہیں۔ پھر کئی
برس گزر گئے۔ ۱۹۶۰ء میں جب میں بمبئی گئی تو راجندر سنگھ بیدی بڑے مہربان
دوست تھے۔ اکثر ملتے تھے۔ ایک شام بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک
انہوں نے پوچھا پرکاش پنڈت کی زبانی ایک بار سنا تھا کہ نوراج (مصنفہ کا
بیٹا) ساحر کا بیٹا ہے؟

اس شام میں نے بیدی صاحب کو اپنی دیوانگی کا وہ قصہ سنایا اور

کہا۔ یہ تصوراتی سچائی ہے واقعاتی نہیں۔ انہی دنوں ایک دن نوراج
(Navraj) نے بھی پوچھا۔ اس وقت اس کی عمر کوئی تیرہ برس کی تھی۔ ''ماما''
ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتاؤ گی؟''

''پوچھو''۔ ''میں ساحر انکل کا بیٹا ہوں؟'' ''نہیں''۔

''لیکن اگر ہوں تو بتا دو۔ مجھے ساحر انکل اچھے لگتے ہیں''۔

''ہاں۔ بیٹا! مجھے بھی وہ اچھے لگتے ہیں، لیکن اگر ایسا ہوتا تو میں نے
تمہیں ضرور بتا دیا ہوتا''۔ سچائی کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ لہذا میرے
بچے کو میری بات پر یقین آ گیا۔

سوچتی ہوں۔ خیال کا سچ چھوٹا نہیں تھا۔ لیکن وہ صرف میرے لئے
تھا۔ اتنا ذاتی کہ ساحر بھی اس میں شریک نہیں تھا۔ لاہور میں جب بھی
ساحر ملنے کے لیے آتا تو میری ہی خاموشی میں کا ایک ٹکڑا سا کرسی پر بیٹھا لگتا۔
کچھ دیر بیٹھ کر چلا جاتا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا صرف سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ لگ
بھگ آدھا سگریٹ پی کر راکھ دان میں بجھا دیتا تھا، پھر نیا سگریٹ۔ سگریٹوں
کے بڑے بڑے ٹکڑے کمرے میں رہ جاتے تھے۔ کبھی بھی بس ایک بار اس کے
ہاتھ چھونا چاہتی تھی۔ لیکن میرے سامنے رواجوں کی ایک دوری تھی جو طے نہیں
ہو پاتی تھی۔ تب بھی تصور کا سہارا لیا تھا، اس کے جانے کے بعد اس کے
چھوڑے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑوں کو سنبھال کر الماری میں رکھ لیتی اور پھر
ایک ایک ٹکڑے کو اکیلی بیٹھ کر جلاتی تھی اور جب انگلیوں میں اسے پکڑتی تھی تو
محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا ہاتھ چھو رہی ہوں۔ سگریٹ پینے کی عادت مجھے بھی

پہلی بار پڑی تھی۔ ہر سگریٹ کو سلگاتے ہوئے لگتا تھا کہ وہ پاس ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں میں وہ جیسے جن کی طرح نمودار ہو جاتا ہے۔ پھر برسوں بعد اپنے اس تجربے کو میں نے اپنے ناول ''ایک تھی انیتا'' میں کاغذ پر اتارا۔ لیکن ساحر شاید ابھی تک میری سگریٹ نوشی کی اس تاریخ سے ناواقف ہے۔

سوچتی ہوں۔ خیال کی یہ دنیا صرف اس کی ہوتی ہے جو اس کی تخلیق کرتا ہے۔ خدا جیسا خلاق بھی اکیلا ہی ہے۔ آخر جس مٹی سے یہ جسم بنا ہے اس مٹی کی تاریخ میرے لہو کی گرمی میں شامل ہے۔ تخلیق کے آغاز میں جو آگ کا ایک گولا ہزاروں برس پانی میں تیرتا رہا تھا، اس میں سے ہر گناہ کو بھسم کر کے جو جاندار باہر نکلا تھا وہ اکیلا تھا، اسے نہ اکیلے پن کا خوف تھا نہ اکیلے پن کی خوشی۔ پھر اس نے اپنے ہی بدن کو چیر کر آدھے کو مرد بنا دیا آدھے کو عورت اور اسی سے اس نے دنیا کی تخلیق کی۔ دنیا کا یہ تصور محض دیومالا نہیں ہے، نہ صرف زمانہ قدیم کی تاریخ ہے۔ یہ ہر دور کی تاریخ ہے خواہ چھوٹے چھوٹے سے انسانوں کی چھوٹی چھوٹی سی تاریخ ہی سہی۔

میری بھی ....

نظم

ف۔س۔اعجاز

کبھی شاید

اداکاری تو اچھی ہے!
تبسم جو لبوں پر تم نے چپکایا ہے
اُس سے لوگ خوش ہیں، مطمئن ہیں
مجھے اچھی طرح معلوم ہے لیکن
تمہارے گھر کی بنیادوں میں سیلن ہے
نمی ہے
اور دیواروں کے سینے جل رہے ہیں
جو روشندان آنکھوں کے کھلے ہیں
دھوئیں کے داغ سے دھندلا رہے ہیں
یہ اک رومال جو اچھے دنوں کی یاد سے مہکا ہوا ہے
نذر کرتا ہوں
اسے تم پرس میں رکھ لو
کہ شاید اتفاقاً قہقہوں کی شوخ محفل سے
فسردہ شام کی گہری اداسی
نسبتاً خاموش گوشے میں تمہیں لے جائے، تم رو دو
کسی کی آنکھ پڑ جائے
تو کاجل کی سیاہی کو بچا کر
بھیگی پلکیں پونچھنا چاہو
کبھی تو قہقہوں کی زد پہ آنسو آہی جاتے ہیں

انگریزی: ڈاکٹر خالد سہیل   اردو ترجمہ: ف۔س۔اعجاز

فیض، خواتین اور حسد

فیض ایک رومانی شاعر تھے اور کئی دیگر شعرا کی طرح وہ خوب صورت چیزوں، خوب صورت لوگوں خصوصاً خوب صورت عورتوں کو پیار کرتے تھے۔ عورتوں سے ان کی رغبت زندگی بھر رہی۔ ان میں سے بعض ان کے لیے فنون لطیفہ کی دیویاں بن گئیں جنھوں نے فیض کو بعض شاہکاروں کی تخلیق کے لیے تیار کیا۔

فیض جب بچے تھے تو کئی خواتین ان کی دیکھ بھال کرتی تھیں جن میں ان کی ماں اور سوتیلی مائیں بھی تھیں۔ ان کے باپ خود ایک بگڑے رومان پسند تھے جن کی کئی بیویاں تھیں۔ کم سنی میں کئی عورتوں کے ہاتھوں پرورش نے فیض کی شخصیت کے فروغ میں ضرور خاص رول ادا کیا ہوگا۔

عنفوان شباب میں فیض پہلی بار ایک پرکشش عورت کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ باہمی احساسات ایک جیسے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے اور ایک دوسرے کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن روایتی اور دقیانوسی خاندانوں کا معاملہ تھا جہاں محبت کی شادیوں پر ارینجڈ شادیوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ لہٰذا دونوں کی شادی نہیں ہوسکی۔ جب فیض کی پہلی محبوبہ گھر والوں کے شادی کرانے پر ایک اجنبی کی بیوی بن گئی تو فیض کا دل ٹوٹ گیا۔ ایک تخلیق کار ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنے دکھوں کو محبت اور تنہائی کی نظموں میں ڈھال دیا۔ ان میں ایک نظم کا عنوان ہے ''تنہائی''۔ نظم ہے:

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

جب فیض اپنی عمر کی تیسری دہائی میں تھے انھیں ترقی پسند ادیبوں اور مارکسی ادب سے متعارف کرایا گیا۔ اس تعلق نے ان کے سماجی اور سیاسی

شعور کو بلند کیا اور وہ تحریک آزادی اور عوامی طبقاتی جدوجہد میں ملوث ہوگئے۔ انھوں نے محبت کے تصور کو وسعت دی اور مادر وطن اور انقلاب کے ساتھ دائمی محبت میں پڑ گئے۔ جب وہ اپنی عمر سے بڑے سوشلسٹ لیڈروں سے میل جول قائم کر رہے تھے تبھی ان کی ملاقات ایک دراز قد، دلآویز انگریز عورت ایلس (Alys) سے ہوئی جو اپنی بہن سے ملنے ہندوستان آئی تھی۔ ایلس فیض کے قریبی دوست ڈاکٹر تاثیر کی سالی تھی۔ جب فیض اور ایلس ملے اور اپنے خیالات کا تبادلہ کیا تو دونوں دوست بن گئے اور ملنا جلنا شروع کر دیا۔ وہ ملاقاتیں جتنی رومانی تھیں اسی قدر فلسفیانہ یا خیال انگیز بھی تھیں۔ ان کی کورٹ شپ چند برس یونہی چلتی رہی کیونکہ فیض کو اپنے قدامت پرست خاندان کو اس بات کے لیے تیار کرنا تھا کہ وہ ایک ایسی خاتون سے شادی کرنا چاہتے ہیں جس کا ملک، تہذیب اور مذہب یکسر جدا ہے اور مادری زبان بھی الگ ہے۔ بالآخر اس شرط پر گھر والے آمادہ ہوئے کہ وہ عورت مسلمان بن جائے اور باقاعدہ نکاح انجام پائے۔ گرچہ ایلس کمیونسٹ تھیں لیکن انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور فیض کے ساتھ رہنے کے لیے اسلامی نام کلثوم ان کے لیے پسند کیا گیا۔ ایلس کی جانب سے یہ بڑی قربانی تھی کیونکہ وہ خود کو منوا کر رہنے والی، بے جھجک بولنے والی فیمنسٹ خاتون تھیں۔ میاں بیوی کو معاشی اور سماجی طور پر بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ اس کلچر میں رہنے کے لیے ایلس نے اردو بولنی سیکھی اور ہندوستانی لباس اختیار کیا۔

فیض اور ایلس کے دو بیٹیاں ہوئیں۔ سلیمہ اور منیزہ۔ فیض حیرت انگیز طور پر بچوں کی پرورش کرنے والے باپ تھے۔ انھوں نے بیٹیوں کی تربیت میں بڑا رول ادا کیا۔ ایلس ان بچوں کی نگہداشت کرتیں اور جب فیض چند برسوں تک حراست میں رہے انھوں نے صحافت کے پیشے کو ذریعۂ معاش بنایا۔ اپنی قید کے اس زمانے میں فیض کا شوہر اور باپ کا رول منقطع ہوگیا اور انھوں نے ایلس کو بڑے حیرت انگیز عشقیہ خطوط لکھے۔

جس قدر فیض مشہور ہوتے گئے اور ان کی شاعری مقبول ہوتی گئی، اسی قدر خوبصورت اور تخلیقی خواتین کی ان میں دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ نہ صرف فیض کو پسند کرتیں بلکہ ان کی چاہت پرستش کی حد تک پہنچ گئی۔ خواتین چاہنے والیوں کی ایک طویل فہرست فیض کے پاس تیار ہوگئی۔ ایک وقت تھا جب فیض ماسکو کی سڑکوں پر چلتے اور عورتیں دوڑ کر ان تک آجاتیں اور انھیں ایک گلاب پیش کر کے واپس چلی جاتیں۔ فیض کو کئی عورتوں نے چاہا۔ بعض نے اپنی چاہت کو راز میں رکھا جبکہ دیگر نے مضامین لکھ کر اپنی چاہت کو دوسروں سے شیئر کیا یا فیض، ایلس، لدمیلا وسیلیووا اور بیگم سرفراز اقبال کے بارے میں کتابیں لکھیں جن سے فیض کے بارے میں ان کی پسندیدگی اور ستائش کا اظہار ہوجائے۔

فیض ایک مہربان، پروا کرنے والے، چاہنے والے آدمی کی طرح ان سبھوں کی محبت کا جواب محبت سے دیا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ جب کوئی ایک سے زیادہ کو پیار کرے تو کیوں نہ کئی کو پیار کرے۔ ایسا کرنے سے محبت بٹ نہیں جاتی۔ بہرحال محبت کے روشن پہلو

کے ساتھ ایک تاریک پہلو بھی تھا جو حسد کے روپ میں دیکھا گیا۔ وہ حسد ایک دو دھاری تلوار ثابت ہوا جس نے فیض کو چاہنے والوں کے دل کاٹ ڈالے۔ ایک طرف ایلس فیض کو چاہنے والی دوسری عورتوں سے حسد میں مبتلا ہو گئیں اور دوسری طرف حاسد شوہر تھے جو فیض پر اپنی بیویوں کے نچھاور ہونے سے پریشان تھے۔

بیشتر رشک و حسد کے معاملات معصوم اور بے ضرر تھے لیکن بسا اوقات وہ دکھ بھرے اور خطرناک ہو جایا کرتے تھے۔۔ اس کی ایک مثال وہ واقعہ ہے جو فیض کے سفر ماسکو میں در پیش ہوا۔ ایک نوعمر صحافی انور عظیم نے ایک حاسد شوہر کی کہانی سنی جو "ماسکو میں ایک رات" (A Night In Moscow) نامی ایک مضمون میں لکھی گئی تھی۔ اس نے لکھا تھا

"برف گر رہی تھی۔ وہ ماسکو میں ایک پر اسرار رات تھی۔ ہماری کار اُچارینا ہوٹل سے نتاشا کے گھر تیزی سے رواں تھی۔ زمین پر تازہ تازہ برف گری ہوئی دیکھی جا سکتی تھی۔ نتاشا اور فیض پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ اس کے لیے گھنگھریالے بال اس کے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ نتاشا فیض کی شاعری اور شخصیت کے سحر میں گم تھی۔ چونکہ فیض چند دنوں بعد اپنے وطن لوٹنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ نتاشا نے اس شام اپنے گھر پر ایک پارٹی کا اہتمام کر رکھا تھا تاکہ فیض اس کے خاندان کے لوگوں' دوستوں اور پرستاروں سے مل لیں۔

"جب نتاشا کا شوہر گھر پہنچا تو اس نے مہمانوں کا شان دار استقبال کیا۔ اس نے کھانا اور مشروبات پیش کیے اور تصاویر کھینچیں تاکہ اپنے ہندوستانی اور پاکستانی مہمانوں کی یادیں محفوظ کر لے۔ ہم لوگ نتاشا کی میزبانی سے متاثر تھے۔ وہ ایک ذہین عورت تھی اور اس کی اپنی چمک سے اس کا رخ جگمگا اٹھا تھا۔

"ڈنر اور کافی کے بعد جب نتاشا گاڑی میں ہمیں ہوٹل چھوڑنے جا رہی تھی میں نے ذرا چٹکی لی" اب تو کافی رات ہو گئی اور برف گر رہی ہے۔ تمہارا شوہر یقیناً شریف ہوگا جس نے تمہیں ہمارے ساتھ آنے دیا"۔

"آپ لوگوں کو چھوڑ کر میں سیدھی اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ وہ تھوڑی دیر انتظار کر سکتا ہے"۔ اس نے اپنے شوہر کے بارے میں شرارتی انداز میں کہا۔

فیض نے مداخلت کی اور اس سے نرم لہجے میں کہا" ہوشیار رہنا نتاشا۔ تمہارا شوہر تمہیں مار ڈالے گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خون اترتے دیکھا ہے"۔

نتاشا ہنسی۔ اس نے سنجیدگی سے اس بات کو نہیں لیا۔

"چند روز بعد فیض وطن لوٹ گئے۔ میں ماسکو میں رہا اور نتاشا سے رابطہ رکھا۔ اس نے کہا" فیض کی ایک نظم روسی میں ترجمہ ہوئی ہے اور وہ واقعی خوبصورت نظم ہے۔"

"جب میں نتاشا سے ملا' اس نے کہا فیض ایک عجیب آدمی ہیں۔ اس لیے شاعر بھی عجیب ہیں۔ کچھ دنوں بعد مجھے ایک فون ملا۔ اچانک فون

نتاشا کی کسی دوست نے کیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ایک صدمے کی خبر شیئر کی۔

''میں اس پر یقین نہیں کر سکتا''۔ میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے اس پراسرار رات کی بات بتائی جب برف گر رہی تھی اور فیض نے نتاشا سے کہا تھا ''ہوشیار رہنا' تمہارا شوہر تمہیں مار ڈالے گا''۔

اور نتاشا کے شوہر نے واقعی اپنی خوبصورت بیوی کا قتل کر دیا!۔

اس کا علم نہیں ہو سکا کہ جب فیض کو یہ معلوم ہوا کہ ان کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی ہے تو ان کا کیا ردعمل رہا۔ فیض نے ایک حاسد شوہر کی آنکھوں میں خون دیکھ لیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ فیض نے وہ پہلا حاسد شوہر نہیں دیکھا تھا زندگی میں۔ جتنی عورتوں نے فیض کو چاہا انہیں قربانیاں دینی پڑیں۔ بعض کو دیگر سے زیادہ۔

آخر میں میں ایک مکالمہ سناتا ہوں جو نامور پنجابی شاعرہ امرتا پریتم اور فیض کے درمیان ہوا جس سے فیض کے مختلف عورتوں سے رومانی ساتھوں کا پتہ چلتا ہے۔ امرتا پریتم نے لکھا ہے ''فیض نے کہا'' ''سب سے پہلے میں 18 سال کی عمر میں محبت میں پڑا۔ ''نقش فریادی'' کی میری ساری نظموں نے اسی محبت سے شہ پائی''۔

''تم نے اس کے ساتھ زندگی کیوں نہ بتائی؟''۔

''ہم دونوں میں اتنی ہمت نہ تھی۔ اس کی شادی ایک زمیندار سے ہوئی۔ میری دوسری محبت ایلس تھی۔ یہ محبت پہلی محبت کے دس سال بعد ہوئی''۔

''وہ اب تمہاری بیوی ہے''۔

''ہاں' ہے۔ میرا خیال ہے ایلس سے شادی کر کے میں نے صحیح کام کیا۔ کوئی دوسری عورت میری زندگی میں آنے والی سختیاں اور اونچ نیچ نہیں سہہ سکتی تھی خاص طور پر اس وقت جب میں کئی سال جیل میں رہا''۔

''اور کوئی محبت؟''۔

''میں ایک نوجوان لڑکی کو پسند کرتا تھا۔ پھر وہ لڑکی عورت بن گئی۔ میں اسے بے حد چاہتا تھا لیکن اس نے ایک نوجوان آفیسر سے شادی کر لی۔ وہ محبت اور اس سے وابستہ درد سے ڈر گئی تھی''۔

''تم نے ایک نظم لکھی تھی ''رقیب''۔ کیا وہ اس کے بارے میں تھی؟''۔

''نہیں وہ میری پہلی محبت کے بارے میں تھی''۔

''اور کچھ محبتیں؟''۔

''جب میں جیل میں تھا تو ایک اسپتال میں بھرتی کیا گیا۔ وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر میری محبت میں پڑ گئی''۔

''کیا ایلس کو تمہارے سب معاملات کی خبر ہے؟''۔

''ہاں اسے پتہ ہے۔ وہ صرف میری بیوی نہیں میری دوست بھی ہے۔ اسی لیے ہم دونوں اتنی مدت ایک ساتھ رہ سکے۔ پیار میں دکھ ہوتا ہے'

دوستی میں امن''۔

یہ سب کہہ کر فیض نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال دیا اور سنجیدہ ہو گئے۔ ایک توقف کے بعد بولے ''اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کبھی کسی عورت کی محبت میں نہیں پڑوں گا۔ میں اسے دوست بنا لوں گا بشرطیکہ وہ دوستی کے لائق معلوم ہو''۔

حوالے:

1۔ بیگم سرفراز اقبال: ''دامنِ یوسف''۔ ماورا پبلشرز' لاہور' پاکستان' 1988ء

2۔ داؤد کمال: "Selected Poems Of Faiz in English"۔ پاکستان پبلشنگ ہاؤس' کراچی' پاکستان' 1984ء

3۔ اشفاق حسین: ''فیض کے مغربی حوالے''۔ جنگ پبلشرز' پاکستان 1992ء

4۔ لدمیلا وسیلیوا: ''پرورش لوح و قلم''۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس' کراچی' پاکستان' 1992ء

5۔ شیمہ مجید: ''باتیں فیض سے''۔ الحمد پبلی کیشنز' لاہور' پاکستان' کراچی' 1993ء

نظم

ف۔س۔ اعجاز

کس کے لئے؟

یہ سورج' چاند' تارے
زمرد و زحل و مریخ
مشتری' سرطان پیارے
سبھی اپنی جگہ پر ہیں
مگر تم سے مجھے یہ پوچھنا ہے
یہ دل بائیں طرف کیوں ہے؟
محبت اور نفرت
ایک ہی جانب سے حملہ کس پہ کرتے ہیں؟
کبھی تم سارے کانٹوں کو ہٹا کر
اس گلابِ دل کو پڑھو سوتو
سمجھ میں آئے
یہ کس کے لئے تھا؟

زمرد=Emerald۔ زحل=Saturn۔ مریخ=Mars
مشتری=Jupiter

ڈاکٹر افغان اللہ خاں

فراقؔ گورکھپوری کے الٹے سیدھے معاملات

اتنی وحشت اتنی وحشت صدقے اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرن ہو میں نہ شکاری، دور اتنا کیوں بھاگو ہو

فراق نے اپنی زندگی کی ناکامیوں اور مایوسیوں کا ذکر جس قدر تفصیل سے کیا ہے، اسی قدر تفصیل سے انہوں نے اپنی عشقیہ زندگی کے بارے میں نہیں لکھا۔ اگر انہوں نے بھی جوشؔ کی طرح اپنی خودنوشت لکھی ہوتی تو شاید ان کی عشقیہ زندگی کی تفصیلات کھل کر سامنے آگئی ہوتیں، ویسے بھی ان کی حیات کے سلسلے میں جو ہماری معلومات ہیں وہ ان کے بیانات اور مضامین اور خطوط سے ماخوذ ہیں، ان مضامین اور خطوط کی روشنی میں یہ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے زندگی میں متعدد عشق کیے۔ اور ہر بار ناکام رہے۔ ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک کا زمانہ ان کی زندگی کا عشقیہ دور تھا۔ طفیل احمد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرے عشق کا زمانہ آپ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۵ء تک سمجھ سکتے ہیں۔ کسی سے کچھ ہو جانے یا معمولی طور پر پینگ بڑھ جانے کا جہاں تک تعلق ہے ایسے معاملات بہت ہیں، لیکن یہ محض ہوس تھی اور جلد ہی بات آئی گئی ہو جاتی تھی۔ جہاں تک میری زندگی اور مزاج کا تعلق ہے ہوس عشق میں ناکامی کا نتیجہ تھی۔ میرے لئے تو ہوس پرستی عشق کی تلاش تھی اور اسی لئے میں ہوس کا ذرا احترام کرتا ہوں۔

میرا ایک شعر ہے

کھوج کس کی ہے مجھے ہجر اسی کا ہے نام
وصل کیا ہے اسی عقدہ کا وا ہو جانا''

فراق کے عشق اور ہوس میں زیادہ فرق نہیں ہے یا یوں سمجھا جائے کہ وہ ہوس کو عشق سے علیحدہ اور کوئی شے نہیں سمجھتے۔ ان کے یہاں اس ہوسناک عشق کی بھی دو قسمیں ہیں۔ پہلی تو ''ہوس'' جس کے پورے ہونے پر یا اس جذبے کے ختم ہو جانے پر انہیں احساسِ ہجر نہیں ہوتا۔ یعنی ایسے معاملات میں اتنی شدت نہیں ہوتی تھی کہ نہ ملنے پر ہجر کی کیفیت پیدا ہو۔ دوسرا عشقیہ جذبہ وہ تھا کہ محبوب سے نہ ملنے کی وجہ سے ہجر کی کیفیت اپنی پوری شدت کے ساتھ طاری ہوتی۔ دراصل فراق اسی دوسری صورت حال کو عشق کا نام دیتے ہیں، لیکن عشق تک پہنچنے کے لئے فراق جو راستہ اختیار کرتے ہیں وہ ہوس ہی کی گلی سے ہو کر گزرتا ہے۔ ہوس کے راستے سے عشق کی منزل تک پہنچنے کا راستہ

بڑا پیچ اور دشوار ہے لیکن فراق اسی راستے سے ہو کر گزرے۔ فراق نہ تو ہوس ہی کو برا سمجھتے ہیں اور نہ شہوت کو۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ شہوانی جذبات دو سطحوں پر پرکھتے اور دیکھتے ہیں۔ فراق کے نزدیک جنسی جذبے یا شہوت میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے تو وہ عشق کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ ہاں اگر شہوت، جنسی ملاپ کی لذت کشی لمحاتی اور وصال تک محدود ہوتی ہے تو وہ عشق نہیں ہوتا۔ بقول فراق ہی کے

''شہوت بری چیز نہیں ہے۔ شہوت جب چھچھلی ہوتی ہے یا جب شہوانی جذبات میں شعوری گہرائی نہیں ہوتی تو اس وقت گندگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ شہوت میں شدت، نرمی اور استقلال اسے عشق میں تبدیل کر دیتا ہے''۔

ایک دوسرے مقام پر وہ عشق و ہوس میں فرق کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تھوڑی بہت سمجھ والا آدمی بھی اتنا جانتا ہے کہ جنسی کشش کا صرف لذت کشی کے وقفوں تک محدود رہنا محض ہوس کاری ہے۔ اور اگر کشش میں استقلال پیدا ہو جائے (جو صرف اچھے آدمی کی زندگی میں ہو سکتا ہے) تو جنسیت عشق کی منزل تک بڑھتی نظر آئے گی''۔

اسی سلسلے میں وہ مزید فرماتے ہیں:

''جب جنسیت میں استقلال پیدا ہوگا تو عاشق کے شعور میں جمالیاتی قدریں آئینہ ہونے لگیں گی۔ معشوق کے متعلق خیالات میں اور معشوق کی یاد میں ایک چکار پیدا ہونے لگے گی اور جنسی جذبے میں خیر و برکت کے عناصر سرایت کرنے لگیں گے''۔

فراق عشق کے معاملے میں بھی جنسی تفریق کے قائل نہیں تھے وہ تو امرد پرستی کو بھی قابل اعتراض اور قابل مذمت نہیں سمجھتے تھے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ فراق امرد پرستی کے جواز میں بہت سی دلیلیں پیش کرتے ہیں اور دنیا کو قائل کرنے کی کوششیں بھی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ دنیا کے تمام بڑے مشاہیر امرد پرست تھے، فرماتے ہیں:

''خواہ آپ اسے (امرد پرستی کو) غیر فطری کہیں خواہ مکروہ و ذلیل۔ خواہ آپ تعزیرات ہند کا سہارا لیں، لیکن یہ یاد رہے کہ جو لوگ امرد پرستی کے مرتکب ہیں وہ نہ تو جرائم پیشہ ہوتے ہیں نہ رذیل نہ ذلیل نہ کمینے نہ عام طور سے خراب آدمی ہوتے ہیں۔ بلکہ امرد پرست تو اخلاق اور تمدن اور روحانیت کی تاریخ کے مشاہیر رہے ہیں۔ جیسے سقراط، بیزر، مائیکل انجلو، سرمد، شیکسپیئر اور دنیا بھر میں لکھوکھا آدمی جو امرد پرست رہے وہ نہایت شریف رہے ہیں''۔

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

''ادبی کتابوں میں لکھے تو شعراالہند میں خسرو اور

حسن یا غزنوی اور ایاز کی محبت کا ذکر ملے گا۔ اتنا ہی نہیں خسرو
کو حسن سے محبت کرنے کی اجازت حضرت معین الدین چشتی
نے دی''۔

فراق اپنے دلائل کی روشنی میں اس فعل کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مزید یہ کہ یہ کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام بڑے لوگ اس فعل کے مرتکب رہے ہیں۔ انہوں نے بزرگانِ دین کی مرد سے مرد کی محبت کی اجازت دینے کی روایت کو صرف اسی لئے پیش کیا ہے کہ وہ کسی صورت امرد پرستی کو جائز قرار دے سکیں۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ دو مردوں کی محبت یا دوستی صرف جنسی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ اس میں جنس کا گزر یا تصور بھی نہیں ہوتا۔ فراق نے خسروؔ، علامہ حسن اور حضرت معین الدین چشتیؒ کے حوالے سے جو بات کہی ہے وہ غلط ہے کیونکہ حضرت خسروؔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے زمانے میں تھے اور ان کے خاص مرید تھے نہ کہ خواجہ اجمیری کے زمانے میں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے فراق کے ان بیانات پر بنیادی سوالات اٹھائے اور انہوں نے فراق سے دریافت کیا کہ:

''فراق کے پاس کیا ثبوت ہیں کہ امرد پرست
عام طور سے خراب آدمی نہیں ہوتے۔ کیا انہیں دورِ حاضر کے
تمام امرد پرستوں کی نجی زندگی کے حالات معلوم ہیں۔ اگر
نہیں معلوم تو پھر اس قسم کے سوالات اٹھانے کی ضرورت کیا
ہے اور اس سے کیا فائدہ؟''

کلیم الدین احمد فراق سے دریافت کرتے ہیں کہ

''کیا امرد پرستی اچھا مذہب اور اچھا اخلاق ہے جو
ہمیں رذالت، جرائم اور کمینہ پن سے یک قلم بچاتا ہے۔ کیا
دنیا کے سارے لوگ امرد پرست ہو جائیں تو دنیا کی ساری
برائیاں ختم ہو جائیں گی''۔

دراصل فراق امرد پرستی کے جواز میں ایک غلط دلیل دے کر پھنس گئے۔ کیونکہ دنیا کے تمام بڑے مشاہیر کی عظمت کی وجہ ان کے کارنامے تھے نہ کہ ان کی امرد پرستی۔ دراصل فراق نے امرد پرستی کی موافقت میں جو کچھ کہا وہ صرف ان کی امرد پرستی کے جواز میں تھا۔ انہوں نے ایک قبیح اور مذموم فعل کو بڑے لوگوں سے منسوب کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جب اتنے بڑے بڑے لوگ اس فعل کے مرتکب تھے تو انہیں کیوں غلط ٹھہرایا جائے، لیکن وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ فنکار کی عظمت ان کی نظری اور فکری اور فنکارانہ صلاحیتوں میں ہوتی ہے نہ کہ عمل و کردار میں۔ پھر بھی فراق کی اس معاملے میں اتنی تعریف تو کی ہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنی امرد پرستی سے انکار نہیں کیا اور نہ اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی بلکہ امرد پرستی کی ایک نئی نفسیاتی توجیہ کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی کو قائل اور متاثر نہ کر سکے۔ (اس موقع پر فراق کی نفسیاتی توجیہہ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے)۔ فرماتے ہیں:

''بڑی حد تک امرد پرستی یا ہم جنسوں سے جنسی
محبت ایک بغاوت ہے۔ اس ماحول کے خلاف جس کے اثر

سے عورت میں مردانہ صفات کی نشوونما نہیں ہونے پاتی۔ جس
کے کارن وہ مردوں کی ہم نفس وہم خیال اور جیون ساتھی صحیح
معنوں میں نہیں بن سکتی اسی طرح ایک عورت کا دوسری عورت
پر جنسی جذبات کے ساتھ عاشق ہونا اس معیار کی تلاش ہے جو
مردوں میں صحیح اور مناسب نسبت پیدا کرے گا۔ غیر امرد
پرستانہ محبت یا مرد کا عورت سے اور عورت کا مرد سے عشق
(محض رسمی وازدواجی نہیں) اس حالت کے خلاف بغاوت
ہوتی ہے جس کے زیر اثر جنسیت دیرپا لطافت اور استعجاب و
حیرت ہو کر رہ جاتی ہے''۔

فراق کی عشقیہ زندگی میں عشق کی مختلف وارداتیں ہیں۔ اپنے ایک
خط میں فرماتے ہیں:

''یوں تو میرے رومان سیکڑوں رہے ہیں، لیکن
شدید عشق تین ہی چار اشخاص سے رہے۔ پہلا عشق دسمبر
۱۹۱۷ء میں ہوا۔ چند ہفتوں کی خوشگواریوں کے بعد ہی ناقابل
برداشت ناکامی میں تبدیل ہو گیا۔ پہلا عشق مجھ پر دس بارہ
سال تک مسلط رہا۔ دوسرا عشق ڈیڑھ دو برس تک رہا۔ پھر بغیر
کسی ان بن کے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہو جانا پڑا۔
تیسرا عشق کئی برس بعد ہوا۔ جو اندازاً سال بھر تک چلتا رہا۔
اس کے تین برس بعد ایک زبردست عشق ہوا۔ جس میں اندازاً
سال بھر خوش رہ کر آٹھ آٹھ آنسو رونے کی نوبت آئی۔ پھر
سال کے عرصے کے بعد ایک زبردست عشق ہوا جو پانچ چھ ماہ
تک خوشگوار رہ کر ایک مستقل عذاب بن گیا۔ ''شام عیادت''
نظم اسی کی دین ہے۔ اس کے بعد میرا موجودہ رومان ۱۹۵۰ء
میں شروع ہوا۔ اور یہ رومان شدید ہونے کے بجائے گہرا اور
خاموش ہے اور یہ جذبہ محبت بہت مستقل اور متوازن ہے''۔

فراق کے اس بیان کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی
عشقیہ زندگی میں عشق کی مختلف وارداتیں ہیں۔ لیکن سبھی کو فراق نے عشق سے تعبیر
نہیں کیا ہے۔ ان کے وہ رومان جو شدید ترین جذبات سے مملو تھے، تین یا چار
ہیں۔ فراق نے اپنے کسی مضمون، خط یا گفتگو کے حوالے سے ان ہستیوں کا نام
نہیں لیا جو ان کے محبوب رہ چکے تھے، ممکن ہے انہیں رسوا کرنے کے لئے تیار نہیں
تھے، یا اسے غیر ضروری اور غیر مناسب تصور کرتے تھے۔ بہرحال ان کی زندگی
میں بقول انہیں کے تین یا چار شدید قسم کے عشق ہوئے۔ اور آخری عشق تو کافی
گہرا اور خاموش تھا۔ جس کے اثرات ان پر بہت دنوں تک قائم رہے۔

عشق میں ناکامی فراق کا مقدر تھی۔ کیونکہ وہ شادی شدہ تھے۔ اس
لئے محبوب کو عارضی طور پر پالینا ہی ان کی کامیابی تھی۔ غالباً فراق اس حقیقت
سے خوب واقف تھے کہ کوئی شخص مستقل طور سے ان کے محبوب کی حیثیت سے عمر
بھر ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ محبوب کو وقتی طور پر پالینا ہی ان کی کامیابی تھی۔ یہ
جزوی کامیابی ہی انہیں نصیب ہو سکتی تھی۔ غالباً اسی لئے وہ عمر بھر ایک ہی محبوب

پر قانع نہیں رہے۔ ایک عشق کے بعد دوسرا عشق کرتے رہے۔ یہی دوسرا عشق
پہلے عشق کی ناکامی کا تدارک کرتا تھا۔

فراق کی زندگی کا ایک واقعہ تو کافی دلچسپ ہے جو ۱۹۴۵ء اور
۱۹۴۶ء کے درمیان پیش آیا۔ دلی کے کسی صاحب نے کماری شیلا کے فرضی
نام سے انہیں خطوط لکھے اور فراق سے اپنے کلام پر اصلاح چاہی۔ اس طرح
فراق صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ استاد اور
شاگردی کا رشتہ محبت میں تبدیل ہوگیا۔ یہ کاغذی محبت (خطوط کے ذریعے)
کچھ دنوں تک برقرار رہی۔ چونکہ کماری شیلا کسی شخص کا ذہنی اختراع تھا۔ جس
کا مقصد صرف فراق کو دھوکہ دینا تھا۔ اس لئے وہ فراق کو رومان انگیز خطوط
لکھتا رہا ۔۔۔ اور فراق اس معاملے میں سنجیدہ سے سنجیدہ تر ہوتے چلے گئے۔
فراق کے عشقیہ خطوط کو بنیاد بنا کر حکیم راغب حسین مراد آبادی نے فراق کے
خلاف ''نگار'' میں ایک زبردست مضمون لکھا۔ رفتہ رفتہ یہ معاملہ ایک بحث کی
صورت اختیار کر گیا۔ سید افسر حسین نے نگار کے مدیر نیاز فتح پوری کو لکھا کہ
دلی کی کسی خاتون نے خواہش ظاہر کی کہ وہ (فراق) ان کے کلام کو بہ نظر
اصلاح دیکھ لیا کریں (یہ سلسلہ ۱۵/اگست ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک
چلا)۔ ایک طرف تو فراق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف شاعری بلکہ نثر
کے ذریعے بھی ہمیشہ شرافت اور نیکی کی ترغیب دیتے ہیں۔ دوسری طرف
جب وہ ایک خاتون کو خط لکھتے ہیں تو ایک اوباش سے زیادہ کچھ
نظر نہیں آتے۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے فراق کے خطوط سے چند
اقتباسات پیش کیے جو یوں ہیں (فراق لکھتے ہیں:)

''آپ کے خط نے میرے اندر وہ طوفان اٹھا دیئے ہیں جن سے
میں بہت ڈرا ہوا ہوں۔ بجائے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے شکایت کرنے کو جی
چاہتا ہے۔ سننے میں کتنا ہی بڑا اور مشہور شاعر اور آدمی سہی۔ اور عشقیہ شاعری
کا سب سے بڑا پیغمبر سہی۔ بلند ترین تعلیم پیشہ اور کافی فارغ البال سہی۔ لیکن
میری زندگی ایک عذاب ہے جس کا تجربہ میں اپنے دشمن کو بھی
نہیں چاہتا کہ ہو۔ زندگی میں مجھے سب کچھ ملا، جیون ساتھی کوئی نہیں ملا۔ اگر
کوئی جیون ساتھی بن کر میری صلاحیتوں سے فیض یاب ہونا چاہے تو اسے
آسمان ادب کا سب سے درخشندہ ستارہ بنا سکتا ہوں۔ ارے یہ میں کیا کہہ
گیا۔ کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے''۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''کبھی مجھ سے میری شاعری و شہرت کو بھلا کر بھی
ملنا چاہو گی۔ تم نے مجھے خط لکھا ہی کیوں۔ تم میری عالمگیر
شہرت کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہو۔ ہم لوگ ملیں گے بھی نہ
جدا ہونے کے لئے''۔

ایک دوسرے خط سے چند سطریں ملاحظہ ہوں، فرماتے ہیں:

''اچھا تو سنو۔ پہلی یا دوسری اکتوبر ۱۹۴۵ کو اگر
میں دلی پہنچ جاؤں تو کیا تم وہاں مجھ سے مل سکو گی۔ میں
تمہارے گھر پر پہلی ملاقات نہیں کروں گا۔ بلکہ میں جہاں

ٹھہروں گا وہیں یا کسی اور جگہ۔ تمہارے گھر کے سوا، ملاقات
کرنے کو تیار ہوں۔ میں اپنے ساتھ شائع شدہ کتابیں لیتا
آؤں گا اور اپنے ہاتھ سے تمہیں دوں گا — اس کے بدلے
میں مجھے کیا ملے گا''۔

ان خطوط کو بنیاد بنا کر منصور حسین نے نگار میں لکھا کہ

''فراق نے کس قدر بدتمیزی سے اپنی تعریف کی
ہے اور کس مکاری سے اس لڑکی کو پھسلانا چاہا ہے''۔

نیاز فتح پوری نے اس بحث میں نہ صرف کھل کر حصہ لیا بلکہ فراق کا
بھرپور ساتھ دیا۔ نیاز نے لکھا کہ

''جو خطوط کماری شیلا کے نام سے فراق کو بھیجے گئے
وہ کسی مرد کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک
سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہے۔ فراق کو بدنام کرنے کی
یہ سوچی سمجھی سازش تھی''۔

نیاز نے لکھا کہ ایک مخصوص گروپ کے لوگوں کی حرکت ہے جو
آئندہ منظر عام پر آ جائے گی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ

''میں نہیں کہتا کہ فراق فرشتہ ہیں اور ان کا کردار
بہت پختہ ہے۔ ان کی شاعری اور شاعرانہ مرتبے پر اس طرح
کی باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ فراق کسی مندر یا آشرم کے
مہنت نہیں اور نہ کوئی سیاسی لیڈر ہی ہیں کہ ان باتوں کا کوئی
اثر ان پر پڑے''۔

نیاز فتح پوری نے یہ بھی لکھا کہ فراق صاحب نے مجھے کماری شیلا کا
ایک خط پڑھنے کو دیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد میرے تمام شبہات یقین میں تبدیل
ہو گئے کہ یہ فراق کو بدنام کرنے کی سازش تھی۔ فراق صاحب سے معلوم ہوا کہ
انہیں کماری شیلا کے دس بارہ خطوط ملے جو شدید تر ترغیبات سے معمور تھے۔
جواباً انہوں نے کماری شیلا کا وہ خط بھی 'نگار' میں شائع کر دیا جو درج ذیل ہے:

''شفقت فرمائے شیلا!

آداب و نیاز

مزاج گرامی!

محبت نامہ موصول ہو گیا تھا۔ میں اب بیمار اور زندگی سے بیزار ہوں
لیکن بقول کسے۔

موت پر قابو مصیبت میں نہ امکان حیات
عذر کرتی ہوں کہ انساں کس قدر مجبور ہے

یہ سلسلہ تو نہ جانے کب ختم ہو گا۔ فی الحال تو قدرت
کی ستم ظریفیوں اور نیرنگیوں کو دیدۂ عبرت نظر سے دیکھ رہی
ہوں اور شعبدہ بازی کے کمال فن کو داد دے رہی ہوں جہاں
تک میری یادداشت ساتھ دیتی ہے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ میں
ابھی زیب النساء کے اسٹیج میں ہوں اور آئندہ رہنا بھی پسند
کرتی ہوں۔ مستقبل کا علم کس کو ہے۔ لہٰذا آپ کا یہ خیال کہ

ایک تو زیب النساء کے اسٹیج میں اب تک بھی رہنے کی اجازت
آپ کے والدین نے دے رکھی ہے اور مناسب جیون ساتھی
سے وابستہ ہو جانے میں رکاوٹ بھی ان کی طرف سے ہو رہی
ہے، صحیح نہیں ہے۔ آپ نے میرا خط شاید بغور نہیں پڑھا ورنہ
یہ خیال پیدا نہ ہوتا۔ میری خواہش محض اس وجہ سے ہے کہ کسی
نااہل سے وابستہ ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ زندگی صبر و شکر
سے اسی طرح گزار دی جائے۔ لیکن انتہائی خوش قسمتی سمجھوں
گی اگر مجھے کسی باکمال انسان سے وابستہ کر دیا جائے۔ اگر
پرماتما کو منظور ہوا تو جلد یا بدیر آپ کی قدم بوسی کا شرف ضرور
حاصل ہوگا۔ میں عنقریب شرط صحت و زندگی ملنے کی صورت
پیدا کروں گی۔ بقول سعدی ''اگرچہ تلخ ست ولیکن شیریں
دارد'' میں نے '' آجکل'' میں حضور کی چند کتابوں کا اشتہار
دیکھا ہے۔'روح کائنات' اور'زاویئے'۔ روح کائنات کے
بارے میں تو یہ پتہ چلا ہے کہ ابھی اشاعت پذیر نہیں ہوئی۔
لیکن زاویئے دہلی میں نہ مل سکی۔ اگر آپ کے پاس ہو یا اگر
کسی بک سیلر سے بھجوا سکیں تو میں گرانباری احسان ہوں گی۔
بذریعہ وی پی بھجوا دیجئے گا۔ میں جواہر پارے حاصل کرنے
کے لئے بے چین ہوں۔ حضور کے پاکیزہ اشعار کے متعلق
اظہار خیال صریحاً بے ادبی ہے۔ لہٰذا بعد معذرت اتنا عرض
کرتی ہوں کہ ایک ایک شعر'' کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاں
ایں جاست'' کا مصداق ہے۔ پرماتما حضور کو صد سال
سلامت رکھے اور جملہ مکروہات سے رفع فرمائے۔ ضعف کی
وجہ سے زیادہ لکھنے سے معذور ہوں لہٰذا آج اسی پر اکتفا کرتی
ہوں۔ اشعار بغرض اصلاح مرسلہ خدمت ہیں۔

آپ کی شیلا سوشیل کماری

اشرف منزل، جانسن روڈ

قرول باغ۔ دہلی۔ ۱

مندرجہ بالا تحریر پر غور کرنے کے بعد کوئی بھی یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ فراق اس سلسلے میں کافی سنجیدہ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کماری شیلا ایک فرضی نام تھا اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فراق سے خط و کتابت کی گئی تاکہ انہیں خطوط کو بنیاد بنا کر انہیں رسوا کیا جا سکے۔ لیکن فراق کا معاملہ بالکل اس کے برعکس تھا۔ انہوں نے پوری سنجیدگی سے کماری شیلا کو جیون ساتھی بنانا چاہا۔ اگر کماری شیلا فرضی نام نہ ہوتا تو آج نوعیت دوسری ہوتی، اور فراق کی زندگی میں بھی گل و بوٹے کھلے ہوتے، ممکن ہے ان کی شاعری پر بھی نئے اثرات مرتب ہوئے ہوتے، لیکن ایسا کچھ نہیں ہو سکا۔ اور فراق عمر بھر کسی ہمدم، کسی دوست کی تمنا کرتے رہے۔

شام میں کسی کو مانگتی ہیں آج بھی فراق
ویسے تو زندگی میں ہمیں کچھ کمی نہیں

سلمیٰ شاہین

ساغر نظامی کا عہدِ رومان

ساغر نظامی رومانوی مزاج کے شاعر تھے۔ بیحد حساس اور حسن پرست تھے ان کی اپنی شخصیت میں بھی بڑی کشش اور بانکپن تھا۔ نوجوانی میں وہ بڑی نفاست سے زندگی بسر کرتے تھے۔ گندمی رنگ، دراز قد چوڑیدار پائجامہ' علی گڑھ تراش کی شیروانی اور سر پر خوبصورت اونچی باڑ کی قراقلی ٹوپی اور پیروں میں خوبصورت سے سیاہ شوپا سنہرے کام کے پشاوری چپل اور یہ نہیں تو پھر سلیم شاہی انداز کے بے پوری جوتے۔

ان کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں جن میں اکثر ریشم جیسے سرخ ڈورے جھلاتے' ان کی آنکھوں کو زیادہ پرکشش بناتے تھے۔ اسی نسبت سے ان کے بال بھی گھنگریالے خمدار اور چمکیلے تھے۔ ان کی یہ سج دھج آخری عمر تک باقی رہی اور سچ تو یہ ہے کہ بہت کم لوگ اپنے بڑھاپے میں اتنے دلآویز لگتے ہیں جیسے ساغر صاحب نظر آتے تھے۔

ساغر صاحب کی شخصیت کے ان ظاہری خدوخال سے ہٹ کر جب ہم ان کی شاعری کی طرف آتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ شروع ہی سے وہ ایک رومان پسند اور جذباتی شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے عشقیہ اشعار میں جس طرح صنفِ نازک کا ذکر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے جنسِ جمیل کو صرف اپنے خیالات ہی کا مرکز نہیں بنایا بلکہ وہ ان کی والہانہ طبیعت اور زندگی کے اس ''حال'' کی بھی ترجمان رہی جس کے روز و شب زلفوں کے سائے میں گزرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

اردو میں عشقیہ جذبات اور واردات کا اظہار تخلیقی اور تمثیلی طور پر بھی ہوتا رہا ہے لیکن ساغر صاحب کے یہاں اسے صرف تخیل یا تمثیل نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ان کی رومانی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ساغر صاحب نے اپنے زمانے کی ایسی کئی حسیناؤں سے عشق کیا ہے جو خود بھی انہیں بیحد پسند کرتی تھیں۔ اس کا اظہار ساغر صاحب کی نظموں سے تو ہوتا ہی ہے، ایسے خطوط سے بھی ہوتا ہے جو ان کی زندگی میں اور بالخصوص ان کے دورِ شباب میں انہیں لکھے گئے اور انہوں نے دوسروں کو لکھے۔ اس بات کے حق میں عصری شہادتیں موجود ہیں کہ اس وقت کے مشہور و معروف شاعروں کو ایسی خواتین بہت پسند کرتی تھیں جنہیں خود بھی شاعری سے شوق و دلچسپی تھی۔ بعض خواتین میں یہ جرأت بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ بچتے بچاتے ہی سہی اپنی پسندیدگی اور دلچسپی کا اظہار ان شعراء سے کر دیتیں جو ان کے محبوب شاعر تھے۔ مجاز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس وقت کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں ان کی تصویر اپنے تکیوں کے نیچے رکھتی

تھیں۔ اور ان کے اشعار کی مالائیں بھی دل میں سجاتی تھیں۔

ہمارے دور کی ایک مشہور مصنفہ ''امرتا پریتم'' نے ساحر لدھیانوی کے بارے میں اسی طرح کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ساغر صاحب کے معاصر شعراء، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، شکیل بدایونی، الطاف مشہدی وغیرہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ جوش صاحب نے تو خود بھی ایسی خواتین کا بے تکلف ذکر کر دیا ہے جو مختلف وقتوں میں ان کی محبوبائیں رہیں۔

ساغر صاحب نے اپنی حیات معاشقہ کے بارے میں جوش صاحب کی طرح کوئی ریکارڈ تو نہیں چھوڑا لیکن بہت سے رومانی تعلقات اور عاشقانہ رشتوں کی شبیہیں اور شاعرانہ پیکر سجائے ہیں۔ انہوں نے شگفتگا کے دیباچے میں ''سوما'' گاؤں کی ایک دوشیزہ کو جس طرح یاد کیا ہے وہ صرف ان کا کوئی افسانہ خیال نہیں ہو سکتا بلکہ تذکرہ حال ہے۔ اس کا ذکر ان کے الفاظ میں سنئے:-

[1] ''اور پھر میں اپنی شاعری میں ساری عمر تڑپتا رہا کہ میں اپنی بچپن کی ساتھی ''اوشا'' کو کہیں دیکھ سکوں، پا سکوں، کبھی سپنے ہی میں وہ نظر آ جائے''۔

''شگفتگا'' اور ''انارکلی'' میں والہانہ فکر کی جو نقش گری اور عاشقانہ افتاد کی جو مصوری ملتی ہے وہ تخیل کی بلند پروازی ہی کا حصہ نہیں، یہ ان کے دل کی واردات ہے اور ان کی حیات معاشقہ کا کوئی نہ کوئی ایسا ٹکڑا ہے جنہیں وہ اپنے رومانی پیکر میں ڈھالتے رہے۔

ساغر صاحب نے ''رنگ محل'' میں بعض نظموں کے شروع میں کچھ ''نوٹس'' بھی دیئے ہیں۔ یہ تعارفی تحریریں مختصر سہی مگر بالکل مبہم نہیں ہیں ان کی اصل مخاطب وہی خواتین ہیں جن کے لئے یہ نظمیں لکھی گئی ہیں۔ جنکا ساغر صاحب کی زندگی سے گہرا جذباتی رشتہ ہے۔ اور ان نظموں میں وہ جھلکیاں موجود ہیں جنہیں آپ بھی محسوس کر سکتے ہیں۔

نگاہ صبر آزما سے دل کو دیکھ بھال کر
سنبھل کے اور کاسنی دلائی کو سنبھال کر
نظر ملا کے اور مرے گلے میں ہاتھ ڈال کر
کلیجہ رکھ تو دو ذرا اسی طرح نکال کر
وہی کہو تو پھر ذرا کہ تم بہت حسین ہو

''بے نام تقاضہ'' یہ نظم اپنی شان نزول کے اعتبار سے تو اس خط میں محفوظ ہے جو ساغر صاحب نے ذکیہ صاحبہ کو لکھا:

عید کے روز امیدوں کا جہاں ہے روشن
یہ جہاں ہاں یہ اندھیروں کا مکاں ہے روشن
جانے کس نور سے پنہاں و عیاں ہے روشن
آج کیوں میرا یہ خانۂ جاں ہے روشن
مدتوں سے یہ دیا میں نے جلایا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں کو تمہیں چاہا بھی نہیں

---

[1] شگفتگا 19

یہ تصویر واہمی اور خیالی نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف ایک نظم ہی نہیں ہے واقعہ بھی ہے۔ ساغر صاحب نے اپنے ایک خط میں ذکیہ صاحبہ کو اس نظم کے سننے کی باقاعدہ دعوت دی ہے اور فرمائش کی تھی کہ وہ ضرور سنیں۔ ان واقعات کی کھوج جو ایسی نظموں اور شاعرانہ فکر فرمائیوں کا سبب بنی ہیں ساغر صاحب کی سوانح حیات کے اس حصے میں کی جا سکتی ہے جو ان کے خطوط میں محفوظ ہے اور جنہیں وہ چہرے بے حجاب نہ سہی بے نقاب نظر آتے ہیں۔ جن کا عکس ساغر صاحب کے آئینۂ خیال پر پڑ رہا ہے۔

لکھنؤ کی ایک خاتون تھیں جو وہاں کے ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ان کے بارے میں بیگم ساغر نے بتلایا کہ وہ خاتون ایک زمانے تک ساغر صاحب سے محبت کرتی رہیں اور ساغر بھی دل و جان سے ان کو چاہتے رہے۔ وہ کہتی رہتیں کہ تم کب تک خاندانی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہو گے اور ان کو پورا کرنے کے لئے گوناگوں آلام و مصائب برداشت کرو گے۔ تم میرے ساتھ آجاؤ میری دولت تمہیں ہر طرح کی فکر معاش سے آزاد کر دے گی۔ لیکن ساغر صاحب نے ان سے گہرے تعلقات اور قربتوں کے باوجود یہ منظور نہ کیا اور اس لئے نہ کیا کہ وہ بیوی کی دولت کا سہارا لیکر اپنی پوری زندگی کو جد و جہد سے خالی کر دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ان کے جذبات کو نہیں ٹھکرایا، ہاں ان کی اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔

ساغر صاحب کے معاشقے یا عشقیہ دلچسپی اور رومانی تعلقات اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب وہ شادی شدہ نہیں تھے۔ شادی تو انہوں نے اچھی خاصی عمر یعنی ۳۸-۳۹ سال کی عمر میں جا کر کی۔ عشق پیشہ اور حسن پرست وہ شروع ہی سے تھے اور ان کی شاعرانہ مقبولیت نے ان کے معاشقوں کو بھی ناکام نہیں ہونے دیا، اس لئے کہ ان کے پاس وہی خواتین آتی تھیں جو ان کی شاعری اور شاعرانہ شخصیت سے متاثر ہوتی تھیں۔ اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ساغر صاحب ان کے دل سے بہت قریب ہوتے تھے۔ جس کا اندازہ ہم ''سعیدہ اختر'' صاحبہ کے اس خط سے بھی کر سکتے ہیں جو انہوں نے ساغر صاحب کو بڑی اپنائیت اور بے تکلفی کے انداز میں لکھا ہے اور ان پر اپنا حق جتایا ہے۔

''مجھے تمہاری دلی ہمدردیوں سے پہلے تمہاری شرکت مشاعرہ کی ضرورت ہے اور میں تمہیں کسی حالت میں ''سرتابی'' کی اجازت دینا نہیں چاہتی۔ تم کو ہی نہیں تمام مردوں کو عورتوں کی عزت کرنی چاہیئے اس لئے کہ تمام ''مرد'' عورتوں ہی کی کاوش و محبت کا نتیجہ ہیں...... دوسری چیز یہ کہ میں عورت ہی نہیں ''شاعرہ'' بھی ہوں یعنی خالق مرد ہی نہیں خالق ''شاعر'' بھی۔ بہرحال تمہارے حسین خط کا شکریہ...... ساغر وقت بہت کم ہے اس کا لحاظ ہی نہیں ''احساس'' کرو، تم جانتے ہو کہ ''آل انڈیا مشاعرہ'' کرنا کوئی سہل چیز نہیں — جب تک کسی مشاعرے کی مخالفت نہ ہو مشاعرہ کامیاب نہیں ہوتا، جن لوگوں نے تم کو خطوط لکھے ہیں

میں تمہارے ذریعہ سے ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ رہا
میری بے پردگی کا سوال تو اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہہ دینا
چاہتی ہوں۔

ع رہتی نہیں ہے کوئی حقیقت حجاب میں

تم میرے چہرے پر نقاب نہیں ڈال سکتے۔ یہ بالکل صحیح کہا اس لئے
کہ۔

برنگ بادۂ رنگیں، بہ طرز نکہت گل
کسی سے راز حقیقت چھپائے جاتے ہیں

بنگلور

یکم نومبر ۱۹۳۲ء

اس کے علاوہ راجہ حانی کی ایک معزز خاتون ہیں جن سے ساغر
صاحب کے کافی زمانے تک ذہنی اور دلی روابط رہے۔ ساغر صاحب کے
ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ انہیں رومانی رشتوں کی مختلف کڑیوں کا سا درجہ رکھتا
ہے۔ ان محترمہ نے جو اردو کی مشہور ادیبہ بھی ہیں، ساغر صاحب کو جو خط لکھے
ہیں ان میں دلی جذبات کا اظہار بہت سی تہذیبی رنگ آمیزیوں کے ساتھ کیا
ہے اور جابجا وہ اس حقیقت پر پردہ ڈالتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ ساغر صاحب سے
ایک ادیبانہ اور شاعرانہ رشتے کے علاوہ ان کا کوئی اور بھی ذہنی تعلق تھا۔ لیکن
خطوں کے بین السطور سے یہ بات بالکل ظاہر ہو جاتی ہے کہ ساغر صاحب ان
کی محبوب شخصیت تھے وہ خود بھی ساغر صاحب کی منظور نگاہ تھیں اور اس میں
شک نہیں جوانی میں بیحد حسین تھیں۔ ان محترمہ نے شادی نہیں کی اور غالباً ساغر
صاحب کی خوشگوار اور حسین یادوں کے سہارے ہی زندگی گزارنے کا فیصلہ
کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ دونوں کی شادی اس لئے نہیں ہوسکی کہ یہ محترمہ کافی تیز
مزاج اور زود رنج تھیں۔ اور ساغر صاحب یہ سمجھتے تھے کہ ان سے ازدواجی
رشتے میں منسلک ہو کر شاید خوشگوار اور پرمسرت زندگی نہ گزار سکیں۔ ساغر
صاحب کے نام ان کے بہت سے مکتوبات تھے جن کو انہوں نے اپنی آخری
علالت کے زمانے میں نکلوایا۔ سب کو یکجا کیا اور کہا کہ میری وفات کے بعد یہ
سب خطوط ان کو واپس کر دیئے جائیں۔ ان میں سے دو چار خط جو باقی رہ گئے
اور جن تک میری رسائی ہوئی وہ بھی تعلقات کے مدوجزر کو سمجھنے کے لئے کافی
ہیں۔ یہاں ایک خط کا مختصر اقتباس درج ہے:-

''عید کے دن آپ کو میرے باعث ملال ہوا اس کا
مداوی کرنے کے لئے میں تیار ہوں۔ آپ جو چاہیں میں
کروں..... میری یہ چیز سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ اس قدر
رنجیدہ کیوں ہوگئے۔ جہاں تک میرا خیال ہے آپ رنجیدہ
پہلے سے تھے۔ حالاں کہ آپ نے اپنے اس رنج کو شاعرانہ
مناعی سے چھپانے کی کوشش کی ہے تاہم میں آپ سے
معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی شاعرانہ حس کو مجروح کیا.....
اتنے دن کی باہمی مخلصانہ دوستی کے بعد یقیناً مجھے یہ حق آپ پر
ہے کہ آپ کو یہاں آنے کے لئے مجبور کروں۔ میں جہاں کہیں

بھی رہوں آپ کو آنا ہوگا''

پریم نواس
یکم جنوری
(سن درج نہیں)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

''مرض دق قبول کرنے کی صلاحیت مجھ میں بہت زیادہ ہے اس لئے تھوڑے دن کی تکلیف اور گوارا کر لیجئے۔ تمہید سے میرا مقصد یہ ہے کہ پھر میرے اصلی گھر یعنی قبر پر فاتحہ پڑھنے آجایا کیجئے گا۔ شعر سننے کا شوق شاید مرنے کے بعد بھی رہے گا...... آپ کی وہ تازہ نظم جو آپ نے عید کے روز سنائی تھی مجھے بہت پسند آئی۔ دراصل میری پوزیشن اتنی نازک ہے کہ میں داد دینا بھی چاہتی ہوں مگر میں مجمع میں دے بھی نہیں سکتی۔ پہلے ہی ساغر نوازی کا الزام مجھ پر عام ہے''۔

(تاریخ تحریر درج نہیں)

ساغر صاحب کی حیات معاشقہ کی آخری کڑی، بیگم ساغر سے ان کے تعلقات ہیں جو اس زمانے کی یادگار ہیں جب وہ ساغر صاحب کی منگیتر بھی نہیں تھیں۔ خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا ''ایشیا'' میں ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے اور ساغر صاحب دھیرے دھیرے ان کے قریب آتے جا رہے تھے۔ اس وقت ٹیلی ویژن تو تھا نہیں ریڈیو پر آواز سنی جا سکتی تھی۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ساغر صاحب نے ان کو بعض مواقع پر یہ دعوت دی ہے کہ وہ ان کی یہ ''نظم'' سنیں جو دراصل وہ انہیں کو سنانا بھی چاہتے تھے۔ ''رنگ محل'' میں ''شاعرہ و محبوبہ'' کے نام سے جو نظم ہے اس میں محبوبہ کوئی خیالی یا فرضی خاتون نہیں خود بیگم ساغر ہیں۔

شادی سے پہلے کبھی دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی لیکن تعلقات میں جو ایک فکری سرجوش کی سی کیفیت نمودار ہوتی ہے وہ ساغر صاحب کے مکتوبات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان مکتوبات میں جو بیگم ساغر کو لکھے گئے۔ ایک مکتوب تو صرف شادی سے ایک ہفتہ پہلے لکھا گیا۔

''میری جان گھبرا رہی ہو اور وہ گھبراہٹ تلخی و لذت کا ایک ایسا آمیزہ ہے جس کی چاشنی محبت بھرے دل ہی کی قسمت ہے...... میری نازک اندام محبوبہ ضرور یاد آتا ہوں گا۔ اب دن کہاں ہیں میری جان آج سے صرف سات دن ہیں اور جب تمہیں یہ خط ملے گا تو صرف تین دن رہ جائیں گے...... میرا جسم، میری کمر، میری آنکھیں میرے بال میرا سارا وجود، جان کچھ ایسا نہیں کہ تم اس قدر سراہو۔ مگر کیوں کہ تم میری روح سے محبت کرتی ہو، میں تمہیں پیارا لگتا ہوں۔ تم بھی خوش نصیب ہو پیاری اور میں تم سے زیادہ خوش نصیب کہ تم جیسی شریف حسین، نفیس نازک اور محبت کوش بیوی زندگی میں ملی۔ میں بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ میرا آئیڈیل مجھے محبت کر رہا ہے۔ زندگی کے اک موڑ پر دل و جان سے مجھ پر قربان

ہو جائے گا''

''پونا''

۲۲ رمئی ۱۹۴۳ء

ذکیہ سلطانہ نیر صاحبہ سے غائبانہ محبت کے تعلقات دو تین سال تک رہے۔ شروع میں جو تکلف تھا وہ دھیرے دھیرے کم ہوا خطوط کا لہجہ بدل گیا اور ذہنی رشتوں میں قربت کے پہلو برابر نمودار ہوتے رہے۔ کچھ اور خطوط کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

''میرے تخیل کی ملکہ! میری تصور کی رانی، میرے عزائم اور ارادوں کی حقیقت، پیاری ذکیہ! جانِ ساغر — تم مجھے بڑا شرمندہ کرتی ہو تمہارے اندازِ تخاطب میں تمہارے دل کا خون جھلکتا ہے تمہارے لفظ لفظ میں، حرف حرف میں ایک بے پایاں محبت موجیں مارتی ہے اور میں اس میں ایک کشتی کی طرح بہہ رہا ہوں...... میری بھی یہ کم خوش قسمتی نہیں کہ تم میری رفیقۂ حیات بنیں۔ تم ہی جیسی ذی روح لڑکی چاہتا تھا۔ جس کے سینے میں دل ہو اور جس کے پاس شعور، تم جذبات اور حکمت کا ایک نادر امتزاج ہو اور یہ امتزاج میرے مقدر کی زینت ہے۔ پیاری وہ دن دور نہیں جب ہم تم ہمیشہ کے لئے مل جائیں گے۔ پھر ایک ابدی مسرت ہوگی۔ ہم اور تم آرام کی زندگی بسر کریں گے۔ اور ہمارے پاس ایک معیارِ حیات ہو کہ ہم ظاہر پرست دنیا کو بتا سکیں کہ اس لحاظ سے ہم تم سے افضل ہیں''

''پونا''

۷ رفروری ۱۹۴۳ء

اسی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''اس وقت میری امید کا مرکز صرف تم ہو ورنہ ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے جس کا مقابلہ میں اتنی دور بیٹھ کر نہیں کر سکتا۔ تم سپر ہو اور تمام حملوں کو روک رہی ہو۔ میری بہادر بیوی! تم ایک تاریخی لڑکی ہو میرے دل میں محبت کے ساتھ تمہاری عزت بھی ہے..... میں تمہارے عزیزوں، والدین اور ان کے دوستوں کی عزت کرتا ہوں میں ان کے دروازے سے خالی ہاتھ چلا آؤں لیکن تمہیں یا خود کو میں ان سے انتقام نہیں لینے دوں گا''۔

''پونا'' ۷ رفروری ۱۹۴۳ء

یہ اس وقت کی بات ہے جب رشتے کے سلسلے میں اختلاف چل رہا تھا اور ساغر صاحب بہر حال اس سے متاثر تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مستقلاً انکار ہو جائے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی خوشدامن کو خط میں ایک شعر بھی لکھا تھا۔

سجدے مری جبیں کے نہیں اس قدر حقیر
کچھ تو سمجھ رہا ہوں ترے آستاں کو میں

ساغر صاحب کے ایک دوسرے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"میرے اصرار پر آپ نے یہ خط ذرا بڑا لکھا۔
محتاط تو آپ بہت معلوم ہوتی ہیں — زیادہ طوالت کا مجھے کوئی حق بھی نہیں؟" کیوں میرے خیال سے "ان دونوں کو" خط لکھنے اور طویل خط لکھنے کا ضرور حق ہے جو "ایک" ہونے کے لئے قدم اٹھا چکے ہیں...... خیر آپ طویل خط لکھنے کا حق تسلیم کر لیں...... میرے اچھے ہونے کا خیال آپ کو "اپنے مزاج لطیف" سے زیادہ ہے۔ شکریہ مگر انصاف سے کہئے ان حالات میں کوئی اچھا رہ سکتا ہے"۔

(تاریخ تحریر درج نہیں)

ساغر صاحب کا یہ خط اس زمانے کا معلوم ہوتا ہے جب تعلقات ابتدائی مراحل میں تھے۔ ساغر صاحب کے یہاں تو جذبات کی فراوانی اپنی جگہ لیکن جس والہانہ انداز سے انہوں نے باتیں کی ہیں ان میں انشا پردازانہ رنگ بھی ہے اور جذباتی پرتو بہرحال موجود ہے ہی۔

ان خطوط کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب سے نصف صدی پہلے کی لڑکیاں اور جوان العمر عورتیں شاعروں کو آسمانی مخلوق سے کم نہیں سمجھتی تھیں وہ ان کے بارے میں خواب دیکھتیں اور خوابوں ہی کی طرح ان سے والہانہ رشتہ اور ذہنی قربت محسوس کرتی تھیں۔ یہ صورتحال ساغر صاحب کی زندگی میں بھی پیش آئی۔

بلنڈا اگنڈ مین

مترجم: ف۔س۔اعجاز

نیشِ عقرب

Sting of the Scorpion

تمہاری سرد منجمد آواز نے ستاروں کو بجھا دیا
اُس نے میرے دل کو توڑ چھوڑ دیا،
اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے
اُف! سائبیریا کے جاڑے کی طرح تمہارا ٹھنڈا لہجہ!!

لیکن میں جلد بھلا دینے کا وعدہ کرتی ہوں
اُس معاہدے کو جو میرے اور تمہارے درمیان تقریباً طے پا چکا تھا
تمہیں برابر کا جواب ملے گا...... تم دیکھنا......
بس ذرا میرا خواب مرجھانا شروع ہو جائے
پھر دیکھنا
میں تمہیں ایک نام نہاد مہربانی اور ایک اتفاقیہ، دوستانہ جھلک
میں ڈبا کر چھوڑوں گی

تمہارے اندھے پن کا میں تصور کر سکتی ہوں
بس اس موقع کی تاک میں ہوں کہ میں کب
اچانک...... ظالمانہ طریقے سے تمہیں یہ محسوس کرا دوں
کہ تمہیں چھوڑ دینا میرے لئے کس قدر آسان تھا۔

نعیم کوثر

جاں نثار اختر اور خدیجہ

اپنے وقت کے قادر الکلام شاعر اور قانون داں مضطر خیر آبادی کے فرزند جاں نثار اختر ۸/ فروری ۱۹۱۴ء کو گوالیار میں پیدا ہوئے تھے۔ وہاں وکٹوریہ کالج میں لیکچرار رہے۔ اس کالج میں اردو کے ممتاز دانشور خواجہ احمد فاروقی بھی مدرس تھے۔ فاروقی مرحوم نے اختر صاحب کے بارے میں لکھا ہے:

''وہ حسن کی اداؤں کو پہچانتے ہیں۔ چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہ ارمان بھی ہے کہ محبوب کی زلفیں ان ہی کے بازوؤں پر پریشان ہوں اور وہ سچے عاشق کی طرح ان ہی پر ساری مہربانیاں صرف کردے۔۔۔ انہوں نے دل دیا بھی ہے اور لیا بھی ہے''۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے صاف گوئی سے اعتراف کیا ''ان کی ابتدائی نظمیں اور غزلیں چپکے سے بتا دیتی ہیں کہ اچھے گھر کے نوخیزوں پر جن درختوں کے دانے چھونے کی مناہی ہوتی ہے' ان کی شاخوں میں وہ پہلے ہی جھولا ڈال چکے تھے اور کچھ کچے پکے پھل چکھ چکے تھے''۔ راشد آذر کی نظر میں جاں نثار اختر ایک عاشق اور حسن پرست تھے''۔

ان کی نظم ''گرلس کالج کی لاری''، ''بگولے'' اور ''کون سا گیت سنو گی انجم'' اس سمت اشارہ کرتی ہیں۔ مدھیہ پردیش کے معروف طنز و مزاح نگار جہانقدر چغتائی مرحوم نے بھی گوالیار میں تعلیم پائی۔ وہ جاں نثار اختر کے عزیز دوست تھے۔ یاد رہے جاں نثار اختر کا بھوپال کی خدیجہ ہارون سے عقد ثانی کے بعد چغتائی صاحب اور جاں نثار اختر ہم زلف بن گئے تھے۔ چغتائی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اگر مسلمان تیغوں کے سائے میں پل کر جوان ہوئے ہیں تو جاں نثار اختر زلفوں کے سائے میں پلے ہیں۔۔۔ علی گڑھ نے شاعری پر مزید پالش کردیا۔ غزل نے نظم کا جامہ اختیار کرلیا۔ ان کی شاعری میں ایک نیا چہرہ ''ناہید'' کا نظر آنے لگا۔ لیکن ناہید کا چہرہ جاں نثار اختر کے لیے نیا ہرگز نہ تھا۔ لڑکپن کا زمانہ اس چہرے سے واقف تھا۔ گھر میں' صحن میں' کمرے اور دالان میں اس کی آوازیں گونج چکی تھیں۔ معصوم شرارتیں بجلیاں کوندا چکی تھیں۔ جاں نثار اختر کی نظموں نے شہر بھر میں ناہید کے نام کا ڈنکا پٹوایا۔۔۔ نتیجہ میں محرومی کے سوا جاں نثار اختر کے ہاتھ کچھ نہ لگ سکا۔ پھر انجم کا ظہور ان کی نظموں میں ہوا۔ کچھ دن بعد یہ ستارہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا''۔

چغتائی صاحب نے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے کہ جاں نثار اختر کو تلاش تھی ایک چارہ سازی' غم گساری کی۔ گوالیار میں جاں نثار اختر کے گھر کے قریب ایک اور گھر تھا جہاں حکیم مومن خاں مومن کی نواسی فاطمہ زبیر رہتی تھیں۔ وہی تنہا جاں نثار اختر کے ہمدم و دمساز تھیں۔ انہی فاطمہ زبیر نے ''حرف آشنا'' کا دیباچہ لکھا ہے۔ یہ دونوں ایک عرصہ تک مخلص دوست اور ہمدرد بنے رہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ فاطمہ زبیر سے جاں نثار اختر کا پہلا باضابطہ عشق شروع ہوا۔ وہ ایک معلمہ تھیں۔ شعر و ادب میں ان کی کسی طرح کی کوئی شناخت نہیں تھی۔ پھر بھی ''حرف آشنا'' کا دیباچہ لکھنا یقیناً اختر کا بے پناہ التفات ہی تھا۔۔۔۔۔ ''ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ زبیر اور فاطمہ زبیر کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ قدرتی طور پر اختر اور فاطمہ زبیر کا درمیانی فاصلہ کم سے کم تر ہوگیا''۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور خواجہ احمد فاروقی کی بات مانیں تو یہ صاف ظاہر ہے کہ جاں نثار اختر کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ ان کی نظموں میں کلاسیکی رومانوی شاعری کا لب و لہجہ عشقیہ ہے۔ جہاں قدر چغتائی صاحب نے تو سارا راز افشاء کر دیا۔ یہی حالات تھے جب جاں نثار اختر کی والدہ نے ضد کی' اصرار کیا اور جس کے نتیجہ میں مرحومہ نے اپنی مرضی سے اختر کی شادی مجاز کی بہن صفیہ سے کر ہی دی۔ صفیہ اختر کا انتقال جنوری ۱۹۵۳ء میں ہوا تھا۔ اہل شعر و ادب نے صفیہ اختر کے خطوط ''زیر لب'' پڑھے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ صفیہ نے جاں نثار اختر کے شعری افکار پر زبردست اثر ڈالا۔ اختر کے دو شعری مجموعوں ''خاک دل'' اور ''خاموش آواز'' پر صفیہ اختر کی محبوب شخصیت کا بھرپور اثر ہے۔ ان کی رحلت کے بعد جاں نثار اختر بالکل تنہا رہ گئے۔ ان کے صاحبزادگان جاوید اختر اور سلمان اختر اپنے ننھیال میں تھے۔ کیونکہ بھوپال میں وہ کئی برس صفیہ کے ساتھ رہے اور یہاں کے ادبی ماحول سے کافی متاثر تھے اس لیے بمبئی سے آنا جانا زیادہ ہوگیا۔ اسی دوران ان کا دل علمی اور مذہبی خاندان کی تعلیم یافتہ خاتون خدیجہ ہارون کی طرف مائل ہوگیا جن کے شوہر انہیں چھوڑ کر پاکستان گئے تو پھر کبھی پلٹ کر نہیں آئے۔ خدیجہ ہارون کے ایک صاحبزادے شاہد اختر بھی ماں کے پاس رہ گئے۔ خدیجہ دلکش نقش و نگار کی سنجیدہ خاتون تھیں۔ ان کے اور جاں نثار اختر کے درمیان محبت ناموں اور سلام و پیام کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجہ میں ۱۹۵۶ء میں دونوں کا عقد ثانی ہوگیا۔ ظ۔ انصاری نے لکھا ہے:

''بھوپال کے بار بار کے دوروں میں انہیں پھر سے خانہ آبادی کے مزے آنے لگے اور اس کی سبیل بھی پیدا ہونے لگی۔ ایک فنکار گھرانے کی سنجیدہ باوقار بیٹی خدیجہ نے اس زخم کو رفو کرنے کی تدبیر کی جو صفیہ کے بعد سے برابر رستا رہا تھا''۔

جاں نثار اختر کی نظم (۱۹۵۵ء) ''تمہارے شہر میں'' خدیجہ سے اظہار محبت کا بین ثبوت ہے۔ اس زمانے کی کئی نظموں میں اختر اور خدیجہ کی وصال محبت کی ساعتوں کا تذکرہ ہے۔ بعد کی ازدواجی زندگی کے دکھ سکھ' باہمی رفاقت' پیار و محبت کا گہرا راز ہے۔ درحقیقت صفیہ اور خدیجہ کی اختر سے شادی اور رفاقت نے اردو شاعری میں رومانوی نظموں کے ایک یادگار سلسلہ کو جنم

دے دیا۔ شفیقہ فرحت کا قلم بھی اس نئے رشتے کا تذکرہ کرتا ہے۔

''گوری سی دھان پان خاتون۔ آنکھوں میں سیاہ بادل' تیرتے اور ڈوبتے ہوئے۔ شانوں پر ساون کی گھٹائیں جھومتی ہوئی۔۔۔۔۔۔ خدیجہ کے لیے اگر اختر صاحب کے دل میں پسندیدگی اور آنکھ میں لگاوٹ تھی تو خدیجہ کے دل میں شعلے لپک رہے تھے اور نگاہوں میں سینکڑوں سجدے تڑپ رہے تھے۔ یہ جاں نثار اختر کی خوش قسمتی تھی اور اختر (شاعر) کی بدقسمتی تھی کہ وہ عاشق بننے سے پہلے پھر محبوب بنا دیا گیا۔ صفیہ آپا کی طرح خدیجہ نے بھی اختر صاحب سے بے محابہ عشق کیا ہے۔ انہیں کی طرح اختر صاحب کی پرستش کی ہے۔ انہیں کی طرح روئیں روئیں سے ایک سانس سے ان کی عبادت کرتی ہیں۔ دیوانوں کی طرح خدمت کرتی ہیں اور فرزانوں کی طرح خود کو مٹا کے انہیں بنا رہی ہیں''۔

''جاں نثار اختر کے گھر آنگن کو صفیہ نے بنایا تھا اور خدیجہ نے اس شکستہ گھر آنگن کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اپنے سلیقہ اور پیار سے نیا رنگ عطا کیا۔ ان کی زندگی کو ترتیب و توازن سے روشناس کرایا''۔

عصمت چغتائی نے کہا:

''پھر سنا انہوں نے شادی کر لی۔ ایسا لگا وہ صفیہ پر سوت لے آئے۔ بڑے بڑے وہم اور کدورتیں لے کر میں پہلی بار خدیجہ سے ملی۔ ایسا لگا صفیہ لوٹ آئی۔ دل کو بہت سمجھایا مگر خدیجہ سے مفر ممکن نہ ہوئی جیسے میں برسوں سے اسے جانتی ہوں۔ برسوں سے سر جوڑ کر اس سے باتیں کی ہیں۔ ویسے ہی نگوڑوں مسکراتے نازک چہرے اور کھلے دل کی لڑکی''۔

اس موقعہ پر جہانقدر چغتائی کہہ اٹھے:

''۱۹۵۶ء میں جاں نثار اختر زلف کے پھندے میں پھنس کر میرے ہم زلف بن گئے۔ تب سے ہم دونوں یا تینوں رشتہ بخوبی نباہ رہے ہیں''۔

راقم الحروف نے خدیجہ باجی کو خوب دیکھا اور سنا۔ وہ حقیقت میں سخن پذیر دل رکھتی تھیں اور دل پذیر سخن سے عشق کرتی تھیں۔ ان کا جاں نثار اختر سے عشق اسی جذبہ کے تحت پروان چڑھا جس میں نفسانی خواہشات کی ذرا بھی جھلک نہیں تھی۔ اس دوران جاں نثار اختر کی نظموں میں رومان کے نئے نئے زاویے ابھرے۔ ان کی رباعیوں کے مجموعہ ''گھر آنگن'' کا انتساب خدیجہ کے نام اس طرح کیا گیا:

''خدیجہ کے نام جو میرے لیے صفیہ کا دوسرا روپ ہے''۔

''گھر آنگن'' متوسط طبقہ کے ایک ہندوستانی گھرانے کے دکھ سکھ کی منظوم جھانکی ہے۔ صنف رباعی میں جاں نثار اختر نے گیتوں کی تھرتھراہٹیں جگانے کا ایک ایسا خوبصورت تجربہ کیا ہے جو اردو کے شعری ادب میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا''۔

حالانکہ خدیجہ اور اختر کے رومانوی دور میں اختر کی شاعری نے راز کو راز نہیں رکھا اور کئی نظموں میں خدیجہ کی چاہت کا اظہار کیا۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی نظم ''تیرے شہر میں'' خدیجہ کی طرف ذہنی اور قلبی پیش رفت تھی۔ وہ کہتے رہے:۔

میں تم سے دور رہتا ہوں تو میرے ساتھ رہتی ہو
تمہارے پاس آتا ہوں تو تنہا سا ہو جاتا ہوں

میں چاہے سچ ہی بولوں ہر طرح سے اپنے بارے میں
مگر تم مسکراتی ہو تو جھوٹا سا ہو جاتا ہوں

☆

سینے پہ پڑا ہوا ہے یہ دوہرا آنچل
آنکھوں میں یہ لاج کا لپکتا آنچل
تہذیب کی تصویر حیا کی دیوی
ہے سج پہ کتنی شوخ کتنی چنچل

☆

سیکھے کوئی کاش تجھ سے حسنِ گفتار
ہر بات کا ایک خوبصورت اظہار
یہ رنگ ادب کا' یہ روایت کا رچاؤ
جملوں میں سلیقے سے پروئے اشعار

☆

جب چار پہر رات گزر جاتی ہے
خود شمع کی لو آپ سے تھراتی ہے
ہاتھوں میں کھلی کتاب کے صفحہ پر
اکثر تری تصویر ابھر آتی ہے

☆

جذبوں کی گرہ کھول رہی ہو جیسے
الفاظ میں رس گھول رہی ہو جیسے
اب شعر جو لکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے
تم پاس کھڑی بول رہی ہو جیسے

''تیرے شہر میں'' اختر نے خدیجہ اور بھوپال کو یوں بیان کیا ہے:

تمہیں بتاؤ تمہارے حسین باغوں میں
یہ بات کیا ہے جواں قہقہے بلند نہیں
یہ بات کیا ہے کہ کتنے ہی لوگ رہتے ہیں
کہ ان کو کوئی بھی تہوار ہو پسند نہیں
میں تم سے پوچھ رہا ہوں جواب دو مجھ کو
تمہارے شہر کو کیوں ظلمتوں نے گھیرا ہے
میں تم سے پوچھ رہا ہوں جواب دو مجھ کو
تمہارے شہر میں تم ہو تو کیوں اندھیرا ہے

نظم ''آج کی رات'' اختر نے صرف خدیجہ کے نام کہی:

ایک طغیان طرب ہے مرے کاشانے میں
اک صنم آ ہی گیا دل کے صنم خانے میں
شہر میں ایک قیامت ترے اقدام سے ہے
آج کی رات تو منسوب ترے نام سے ہے

دل میں اک شوق کا طوفان بپا رہنے دے
اپنا سر تو مرے شانے پہ جھکا رہنے دے
عشق بیتاب سہی حسن تو آرام سے ہے
آج کی رات تو منسوب ترے نام سے ہے

''اندیشہ'' نظم میں بھی خدیجہ کے لیے وہ نچھاور ہیں۔

تیرا یہ لوچ' یہ نرمی' یہ لطافت یہ جمال
صرف فن دے کے کہیں فکر و نظر چھین نہ لے

جیسا تذکرہ کیا گیا کہ جاں نثار اختر اور خدیجہ ہارون کے درمیان سلام و پیام کا سلسلہ جاری تھا اور اختر کی شاعری میں رومانیت کی قوس وقزح دمک رہی تھی۔ کچھ خطوط میں وہ صفیہ اختر کی ذہنی' فکر و شعور اور عادات و اطوار کا بھی اظہار خدیجہ سے کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک خط میں لکھتے ہیں (''زیر لب'' کے حوالے سے)

''تم اس کے خطوط کو بہت غور و خوض سے پڑھنا۔ تمھیں نئی عورت کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد ملے گی۔ میں تم سے اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے صفیہ کا تذکرہ نکال لیتا ہوں۔ بہرکیف اس کے لیے میں تم سے معذرت نہیں کروں گا۔ یہ تو میری زندگی کا راز ہے۔ شاید تمھیں چاہنے کا راز بھی یہی ہو کہ تمہاری بعض باتیں مجھے صفیہ کی یاد دلاتی ہیں۔ تم اس راز کو جانتی ہو یہ مجھے معلوم ہے۔ تم اپنی اور میری باہمی زندگی میں ایک خفیف سے لمحے کو بھی اس راز کو بھلا نہ دینا ورنہ تم اسی لمحہ مجھے کھودوگی''۔

جاں نثار اختر سے خدیجہ کی دو بیٹیاں عنیزہ اور البنا پیدا ہوئیں۔ نظم ''آخری لمحہ'' اختر بھائی نے عنیزہ کے لیے خصوصی طور پر لکھی تھی۔ ایک بند قابل مطالعہ ہے۔ یاد رہے اس وقت وہ بستر علالت پر تھے۔

تم ایک ایسے گھرانے کی لاج ہو جس نے
ہر ایک دور کو تہذیب و آگہی دی ہے
تمام منطق و حکمت تمام علم و ادب
چراغ بن کے زمانے کو روشنی دی ہے
جلا وطن ہوئے آزادیٔ وطن کے لیے
مرے تو ایسے کہ اوروں کو زندگی دی ہے

اس نظم میں درج بالا حصہ کی اپنی ایک داستان ہے۔ مجاہد وطن علامہ فضل حق خیرآبادی کی صاحبزادی سعید النساء حرماں خود شاعرہ تھیں اور جاں نثار اختر کی دادی تھیں۔ فضل حق خیرآبادی سے مرزا غالب نے اپنا دیوان مرتب کرایا تھا۔ انگریزی حکومت نے بغاوت کی تحریک میں ملوث پائے جانے پر فضل حق خیرآبادی کو کالے پانی کی سزا دی تھی۔ انڈمان نکوبار میں وہ انتہائی لرزہ خیز حالت میں رحلت پا گئے تھے۔ ان کے صاحبزادے رہائی کا حکم لے کر پہونچے لیکن علامہ سپرد خاک کیے جا چکے تھے۔ جنوری ۲۰۱۰ء میں ساہتیہ اکادمی نے انڈمان نکوبار میں محفل افسانہ اور مشاعرہ کا انعقاد کیا تھا۔ ڈاکٹر گوپی چند

نارنگ' عنبر بہرائچی' اطہر پرویز' شہزاد انجم' چندر بھان خیال' ف۔س۔اعجاز' صادق نواب سحر اور راقم الحروف اس پروگرام میں شامل ہوئے تھے۔ انڈمان چھوڑنے سے قبل ان سب حضرات نے مجاہد وطن کے مزار پر اشکبار خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ (پورٹ بلیئر کا مفصل سفرنامہ بطور رپورتاژ ف۔س۔اعجاز صاحب نے قلمبند کرکے ''انشاء'' میں اہتمام سے شائع کیا تھا)۔ اس نظم میں جاں نثار اختر نہ صرف اپنے ددھیال بلکہ اپنی سسرال کی علمی و ادبی کامرانیوں سے متعارف کراتے ہیں بلکہ علامہ خیرآبادی کی وطن کے لیے جان قربان کرنے کا بھی اشارہ دیتے ہیں۔

صفیہ اختر کی وابستگی نے جاں نثار اختر کو جو کچھ دے وہ سب کچھ مرحومہ کے خطوط کے مجموعہ ''زیر لب'' کے لفظ لفظ سے عیاں ہے۔ لیکن خدیجہ سے عشق و محبت نے نہ صرف ان کی بے کیف اور ویران تنہائی کو نغمگی سے معمور کر دیا' بلکہ ان کی شاعری میں رنگا رنگ کیف آگینیاں اجاگر ہوئیں۔ رومانوی حقیقت پسندی اور تاثیر شامل ہوئی۔ تخیل اور جذباتی کشمکش میں ایک خاص کیف اور لطیف ہیجان پیدا ہوا۔ خانگی سکون نصیب ہوا تو فلموں میں نغمہ نگاری کے کثرت سے مواقع نصیب ہوئے۔ مالی طور پر اتنے مضبوط ہو گئے کہ ''بہو بیگم'' میں سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ فلم پٹ گئی اور جاں نثار اختر جسمانی طور پر بری طرح ٹوٹ گئے۔ ان حالات میں بھی خدیجہ نے ان کی ایسے ایثار اور لگاؤ سے خدمت کی جو ہندوستانی معاشرہ کی روشن مثال ہے۔

☆☆☆☆☆

گیت

ف۔س۔اعجاز

تم کیا ہو میری جاں؟

تم آگ نہیں ہو' آسمان میں اُڑتا ہوا ہو دھواں
بادل سے الگ
بارش سے جدا
تم کیا ہو میری جاں

تم آگ اگر ہوتیں تو میری چاہت لو دیتی
بادل ہوتیں تو پہلو میں بجلی سی تڑپ اٹھتی
بارش ہوتیں تو آنکھوں میں تھوڑی تو نمی ہوتی
کچھ بولو ہاں یا ناں
تم کیا ہو میری جاں

میں انگاروں پر ننگے پاؤں چلنے کو تیار
آوارہ ہوا بن کر پربت پر اُڑ سکتا ہوں میں یار
میں تیروں گا اور کر لوں گا بارش میں دریا پار
پاگل کے سو ارماں
تم کیا ہو میری جاں۔۔۔

ساحر ہوشیار پوری

ساحر (ہوشیار پوری) صاحب نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ مہاراجہ بھوپندر سنگھ والیٔ پٹیالہ کے بچوں کے اتالیق بھی رہ چکے ہیں۔ لیکن اس مختصر سی ملازمت کے بعد اپنے آبائی کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے۔

جوں جوں ساحر صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ یہاں تک کہ کوئی ہی دن ایسا ہوا ہوگا جو ہم کہیں نہ کہیں کسی کھانے پر نشست میں یا سر راہ نہ ملے ہوں۔ ایک بار تین چار یوم متواتر ساحر صاحب غائب رہے۔ میں قدرے پریشان رہا کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو یا اور کوئی بات ایسی نہ ہو گئی ہو جو مجھ تک پہنچ نہیں سکے۔ ان کا کوئی پیغام بھی نہیں آیا۔ میں نے پتہ لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا وہ دفعتاً ہوشیار پور چلے گئے ہیں۔ چوتھے یا پانچویں روز میں شام کو کلب میں بیٹھا ہوا تھا کہ دور سے ساحر صاحب آتے دکھائی دیئے۔ مجھے دیکھتے ہی زار و قطار رونے لگے اور اس قدر روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ میں حیران تھا کہ ان کو کون سا ایسا صدمہ پہنچا ہے جو یہ اپنا سارا توازن کھو بیٹھے ہیں۔ ذرا اور دم لیا تو کہنے لگے۔ میری زندگی اور موت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اگر چاہیں تو میں زندہ رہ سکتا ہوں ورنہ موت تو ہے ہی۔ میں نے پوچھا آخر قصہ کیا ہے کچھ بتایئے تو سہی۔ کہنے لگے مجھے ایک مسلم خاتون سے محبت ہے اور وہ ہوشیار پور سے اپنے کنبہ کے ساتھ پاکستان جا رہی ہے بلکہ اسے لے جایا جا رہا ہے وہ نہیں جانا چاہتی۔ اسے بھی مجھ سے محبت ہے اور اگر زبردستی لے گئے تو وہ خودکشی کر لے گی۔ میں نے کہا کہ اگر وہ لڑکی بالغ ہے اور اپنی خوشی سے آپ کے پاس رہنا چاہتی ہے تو اس کا معقول بندوبست ہو جائے گا۔ آپ کل میری عدالت میں زیر دفعہ 100 ضابطہ فوجداری وارنٹ جاری کرنے کی درخواست دیجئے۔ اس ضابطہ کے تحت اگر درخواست دی جائے کہ فلاں فلاں مرد یا عورت کو فلاں فلاں شخص اس کی مرضی کے خلاف اپنے گھر میں روکے بیٹھا ہے تو عدالت اسے اپنے سامنے بلوا کر اس کا بیان قلمبند کرتی ہے کہ وہ مرد یا عورت حبس بے جا میں تو نہیں ہے اور اس کا منشا کہاں جانے یا رہنے کا ہے۔ وارنٹ جاری ہونے پر پولیس کو حکم دیا جاتا ہے کہ اسے عدالت کے روبرو پیش کیا جائے اور جب وہ عدالت میں پیش ہو تو اسے اس کی مرضی کے مطابق جہاں چاہے جانے کی قانونی اجازت دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ ساحر صاحب اگلے ہی دن وہ درخواست لے کر میری عدالت میں حاضر ہوئے۔ میں نے ان کے اور دو گواہوں کے بیان قلمبند کر

کے بعد زیر دفعہ 100 ضابطہ فوجداری اس لڑکی کے والد کے خلاف وارنٹ جاری کر دیا اور پولیس کو حکم دیا کہ اسے میری عدالت میں پیش کیا جائے۔ شام کو ساحر صاحب پھر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ نے بطور مجسٹریٹ تو مدد کر دی۔ اب بطور دوست اور مدد کیجئے اور وہ یہ کہ مجھے اپنی موٹر گاڑی میں لے کر خود ہوشیار پور چلئے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کہئے کہ وہ اس وارنٹ کی فوراً تعمیل کرائے کیونکہ کل یا پرسوں تو وہ لڑکی اپنے والدین کے ساتھ وہاں چل پڑے گی۔ چنانچہ میں نے ساحر صاحب کو اپنے ساتھ لیا اور اسی شام دھرمسالہ سے ہوشیار پور آ گیا۔ وہاں پہنچ کر ساحر صاحب کہنے لگے کہ آپ ابھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کچھ نہ کہیں میں لڑکی کے والد سے خود بات کرتا ہوں کہ میرے پاس اس طرح کا وارنٹ ہے اور اگر آپ لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف لے جانا چاہیں گے تو مجھے مزید قانونی کارروائی کرنی پڑے گی۔ یہ کہہ کر ساحر صاحب چلے گئے اور ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے۔ چہرے پر بشاشت اور کامرانی ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ اس قدر خوش تھے کہ پاؤں زمین پر نہیں ٹکتا تھا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے کہ لڑکی کے خاندان والے بھی رضامند ہو گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر لڑکی تم سے محبت کرتی ہے تو ہم اسے زبردستی لے جا کر بھی کیا کریں گے چنانچہ میں تو اسی شب پھر دھرمسالہ لوٹ آیا اور ساحر صاحب بھی اپنی محبوبہ کو لے کر تیسرے دن دھرمسالہ پہنچ گئے۔ ان کا کاروباری ہیڈ کوارٹر گرد و قصبہ میں تھا جہاں وہ پھر سے اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ جب ساحر صاحب کے والد اور خاندان کے دیگر افراد کو پتہ چلا تو انہوں نے حتمی طور پر ساحر صاحب کو عاق کر دیا۔ ساحر صاحب بلا حیل وحجت تمام کاروبار سے دست بردار ہو گئے۔ اتنے میں مجھے پنڈت نہرو کے حکم سے پھر دہلی بلا کر سٹی مجسٹریٹ لگا دیا گیا۔ دھرمسالہ سے رخصت ہوتے وقت ساحر صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی تو میں نے دیکھا کہ خاندان سے منقطع ہونے کے بعد ان کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے لیکن عشق تو تخت وتاج تک چھڑا دیتا ہے۔ دو چار دس لاکھ کی بساط ہی کیا ہے۔ میں نے ساحر صاحب سے کہا کہ میں دہلی جا رہا ہوں آپ بھی وہیں آ جائیے۔ جو روکھی سوکھی ہو گی مل کے کھا لیں گے۔ چنانچہ میرے پہنچنے کے فوراً ہی بعد ساحر صاحب بھی دہلی آ گئے اور ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا جس کا مالک ان کا عزیز دوست تھا۔

دلی ان دنوں اجڑ چکی تھی۔ تقسیم وطن کے بعد جو فسادات ہوئے ان سے لاکھوں کنبے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے۔ تمام تجارتی کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔ ایک افراتفری کا عالم سب پر طاری تھا۔ دہلی آنے پر چیف کمشنر نے بہت سا کام میرے حوالے کر دیا۔ بعض اوقات تو گھر پر سونے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا مگر ان سب باتوں کے باوجود ساحر صاحب کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ جب دہلی کا نظم ونسق گرفت میں آیا تو میں نے سرکاری کام کے علاوہ سوشل اور ادبی سرگرمیوں کی طرف بھی توجہ دی۔ ان ادبی سرگرمیوں میں ساحر صاحب میرے معاون رہے ہیں۔ اولین جشن جمہوریت منعقدہ ۱۹۵۰ء کی انتظامیہ کمیٹی کا میں جنرل سکریٹری تھا اور ساحر

صاحب بطور سکریٹری اپنے فرائض بہ حسن و خوبی ادا کیے تھے۔ ایک دن میں
عدالت میں مقدمات کی سماعت کر رہا تھا کہ ساحر صاحب آئے اور کہنے لگے کہ
میری زندگی میں دوسرا نازک مرحلہ درپیش ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا
کروں۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ان کی نئی بیگم صاحبہ کے ہاں بچہ ہونے
والا ہے اور وہ کہتی ہیں کہ میں یہ بچہ اپنے میکے یعنی لاہور جا کر جنوں گی۔ آپ
کی کیا رائے ہے۔ میں نے ساحر صاحب سے کہا کہ یہ آپ کے اپنے اعتماد اور
اعتبار کی بات ہے میں اس میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔ اس پر ساحر صاحب
آبدیدہ ہو گئے اور کہنے لگے میں اور کس سے مشورہ کروں۔ میں نے انہیں
اداس دیکھ کر اپنے پاس بٹھایا اور کہا کہ اگر آپ میری ذاتی رائے جاننا چاہتے
ہیں تو وہ یہ ہے کہ آپ کی بیگم صاحبہ اگر پاکستان چلی گئیں تو وہ غالباً واپس نہیں
آئیں گی لیکن ان کی وفا و محبت آزمانے کا یہ ایک موقعہ بھی ہے۔ اس لئے کہ
جب آپ سے انہوں نے شادی کی تھی تو آپ ایک کروڑپتی باپ کے سب سے
بڑے بیٹے تھے۔ اب انہوں نے آپ کو عاق کر دیا ہے۔ اور آپ کی بیگم جو
نقدی یا زیور اپنے والدین کے گھر سے لائی تھیں وہ بھی بک چکا ہے۔ ایسی
صورت میں امکان یہی ہے کہ وہ پاکستان جا کر واپس نہیں آئیں گی۔ ساحر
صاحب یہ سن کر اور اداس ہو گئے اور کہنے لگے کہ آج شام ہوٹل میں جہاں میں
ٹھہرا ہوا ہوں وہاں آ جیئے۔ میری بیگم اور میں آپ سے ضروری باتیں کرنا
چاہتے ہیں۔ چنانچہ شام کو میں ان کے ہاں پہنچا۔ بیگم ساحر کہنے لگیں کہ آپ نے
جو ساحر صاحب سے کہا ہے وہ میں نے سن لیا ہے اور اگر ساحر صاحب کا بھی یہی
خیال ہے تو میں میکے نہیں جاتی مگر اتنا ضرور کہنا چاہتی ہوں کہ جس کے لئے میں
نے اپنے ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کو خیر باد کہہ دیا اب اگر اسے بھی
چھوڑ دوں گی تو میرا اور کون سا ٹھکانہ ہو سکتا ہے؟ یہ کہہ کر وہ رونے لگ
پڑیں۔ ساحر صاحب تو پہلے ہی بہت اداس تھے وہ بھی رونے لگے اور میں جو
ناصح مشفق بن کر گیا تھا میری آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔ اگلے دن
پھر ساحر صاحب میرے پاس آئے۔ میں نے ان سے کہا آپ اپنی بیگم کو لاہور
جانے دیجئے۔ میری رائے اب بھی یہی ہے کہ وہ واپس نہیں لوٹیں گی لیکن اگر
واپس آ گئیں تو آپ کو ساری عمر ان کی پوجا کرنی چاہئے۔ چنانچہ بیگم ساحر
لاہور گئیں اور بچے کی ولادت کے بعد کچھ دن وہاں رہ کر واپس آ گئیں۔ ان
کی آمد پر ساحر صاحب نے پھر مجھے اپنے ہاں بلایا۔ بہت ہی خوش تھے۔ میں بھی
ان کی مسرت میں شریک ہوا۔ بیگم ساحر واقعی بہت ہی باوفا اور شوہر پرست
عورت ثابت ہوئیں۔ آج کل دہلی میں وہ اپنا ذاتی کاروبار کر رہے ہیں اور
رہائش فرید آباد میں اختیار کر لی ہے۔ ساحر صاحب کامیاب شاعر ہیں۔ اچھا
وقت گزر رہا ہے۔ لیکن ساحر صاحب عیال داری میں الجھ سے گئے ہیں۔ ملنے
میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں۔ صحت بھی پہلے جیسی نہیں رہی لیکن کلام پر اب بھی
ماشاءاللہ شباب طاری ہے۔

از: ''یادوں کا جشن''

شوکت کیفی

میرے ہمسفر کیفی اعظمی

کیفی نے پہلا مشاعرہ لکھنؤ میں پڑھا۔ جس میں ان کے کلام کو سنا تو گیا مگر داد نہیں ملی۔ یہی صورت حیدرآباد کے مشاعرہ میں بھی پیش آئی۔ مشاعرے کے بعد سروجنی نائیڈو ان کو اپنے ہمراہ لے گئیں۔ اور ان کے ترنم کو ٹیپ کرکے انہیں سنوایا اور کہا کہ تم ترنم سے کلام پڑھنا چھوڑ دو۔ تحت اللفظ پڑھا کرو۔ یہاں سے کیفی مشہور ہونا شروع ہوئے۔ پارٹی نے کیفی کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''جھنکار'' چھاپا جو ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ پھر ہندو مسلم فسادات پر چھوٹا سا کتابچہ ''خانہ جنگی'' چھاپا۔ اب یہ ہندوستان کے تمام شہروں میں مشاعروں کے لئے مدعو کئے جاتے اور خوب داد پاتے۔

اس زمانے میں ان کی انقلابی نظم ''عورت'' بہت مشہور ہوئی۔ یہ ناممکن تھا کہ کیفی کسی مشاعرے میں شرکت کریں، اور 'عورت' نظم سنائے بغیر واپس آجائیں۔

اور پھر یہ وجیہہ جوشیلا نوجوان شہر شہر گھومتا ہوا ۱۹۴۷ء میں مشاعرے کے سلسلے میں حیدرآباد پہونچا۔

اس زمانے میں اختر حسین حیدرآباد کے روزنامہ پیام کے ایڈیٹر تھے۔ وہ خود بھی ترقی پسند خیالات کے حامی اور اچھے شاعر بھی تھے۔ ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی بے حد خاطر کرتے۔ کیفی، سردار جعفری، سلطانہ آپا اور مجروح سلطانپوری ان ہی کے مہمان ہوئے۔

حیدرآباد میں خاص طور پر زنانہ کالج میں کیفی کی تصویریں لڑکیوں میں بکا کرتی تھیں۔ کیفی لڑکیوں کے بہت محبوب شاعر تھے۔

مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ سامنے صوفے پر ایک دبلی پتلی سی لڑکی اپنے بڑے بھائی خورشید علی خاں اور بہنوئی اختر حسن کے ساتھ سحر زدہ سی بیٹھی اس نوجوان کی گرجدار آواز سن کر حیران رہ گئی۔

اس زمانے میں نظام سرکار کا راج تھا، کسی کی ہمت نہ تھی کہ نظام کو اعلیٰ حضرت کے علاوہ کسی اور خطاب سے مخاطب کر سکے۔ اور یہ نوجوان گرج گرج کر نظام کے خلاف ''تاج'' نظم سنا رہا تھا۔

یہ وہ کشکول گدائی ہے جو بھرتا ہی نہیں

('جھنکار' میں بھی چھپی ہے)

نظم ختم ہوئی تو بھائی جان نے اپنی چھوٹی بہن کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا ''اتنی سی عمر میں یہ ہمت''۔

[illegible] کیفی [illegible] لڑکیوں نے گھیر لیا آٹو گراف کے لئے۔

کیفی [illegible] وقت کی پوزیشن کسی ہیرو سے کم نہیں تھی اور جب یہ [illegible] کے ساتھ ان کے آگے [illegible] بڑھی تو کیفی نے شرارت [illegible] بہت [illegible] آٹو گراف بک پر لکھ دیا۔ اس لڑکی کی خودداری کو بہت ٹھیس [illegible] اور جب یہ [illegible] بڑھی تو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے شکایت کی۔ [illegible] آپ نے ہماری آٹو گراف بک پر اتنا برا شعر کیوں لکھا؟''

کیفی مسکرائے اور [illegible] لہجے میں بولے ''آپ نے سب سے پہلے ہم سے آٹو گراف [illegible]'' (کیونکہ اس لڑکی نے سردار جعفری اور مجروح سلطانپوری سے [illegible] آٹو گراف لیا تھا) دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ آنکھوں نے آنکھوں سے [illegible] کیفی کی اس نظم کی طرح۔

[illegible] نگاہوں کا اچانک وہ تصادم مت پوچھ
[illegible] جھکتے ہی اڑا عشق شرارہ بن کر
[illegible] کے پہلے انہیں جھکتی ہوئی نظروں میں رکا
نرم، معصوم، حسیں، مست اشارہ بن کر
پھر نگہ سے عرق آلود جبیں پر چھلکا
پنکھڑی، پھول، گہر، لعل ستارہ بن کر

اور ان دو نگاہوں کے تصادم نے گھر والوں میں ایک ہنگامہ خیز تصادم پیدا کر دیا، مخالفت، جھگڑے، رونا دھونا، ماں کہتیں کل وقتی سیاسی رکن ہے، پینتالیس روپے تنخواہ پاتا ہے، بیوی کو کیا کھلائے گا؟'' بڑی بہن کہتیں ''ایک پیر باہر ایک پیر جیل میں، بیوی کو رکھے گا کہاں؟''

اور آخر کار محبت کو فتح ہوئی۔ لڑکی کے ابا جو بہت ہی معقول ذہن کے آدمی تھے یہ کہہ کر بمبئی لے آئے ''زندگی اس کو گذارنی ہے''۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہ چلنے دیا۔ کیفی کے مرجھائے ہوئے دل میں جان آ گئی۔ سجاد ظہیر اور رضیہ آپا نے مجبور کر کے اپنے گھر بلا لیا۔ اور تمام ترقی پسندوں، ادیبوں اور شاعروں کی موجودگی میں اس لڑکی کا نکاح کیفی سے پڑھوا دیا۔

مشکل یہ تھی کہ لڑکا شیعہ تھا اور لڑکی سنی۔ نکاح کے لئے بھی دو قاضیوں کی ضرورت تھی جن کا بلانا مشکل تھا۔ جب قاضی نے پوچھا لڑکے کا مذہب، بنے بھائی مسکرا کر بولے ''حنفی المذہب''۔ نکاح ہو گیا۔ چاروں طرف سے مبارک مبارک کی آوازیں آنے لگیں۔ اور نہایت ہی دلچسپ مشاعرہ شروع ہو گیا۔ جوش، مجاز، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مسعود علی وجد، سب نے اپنی اپنی خوبصورت نظمیں اور غزلیں سنائیں اور شادی کی محفل کامیاب ہوئی۔

اس زمانے میں کیفی کی نظموں کا نیا مجموعہ ''آخر شب'' چھپ رہا تھا۔ سردار جعفری نے شادی کے تحفہ کے طور پر ایک کاپی بہت خوبصورت جلد میں جلدی سے بنوا کر لڑکی کو پیش کی۔ اندر سردار جعفری نے لکھا تھا ''موتی کے نام''۔ (میرا گھریلو نام تھا):

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں

اُڑنے لکھنے میں ہے تہمت خمِ گیسو میں نہیں
جنت ایک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

اور دوسرے صفحے پر لکھا تھا:

''ش کے نام''

''میں تنہا اپنے فن کو آخر شب تک لا چکا ہوں تم آجاؤ تو سحر ہو جائے''۔ کیفی

چنانچہ سحر ہوگئی اور ''ش'' شوکت بن کر ان کی زندگی میں آگئی۔

☆☆☆

الکساندر بلوک (روسی شاعر)

مترجم: ف۔س۔اعجاز

طمانیت

وہ چودہ برس کی تھی۔ اس کی آرزو پوری ہونے دی جاتی
تو وہ میری منگیتر بن سکتی تھی۔
جب ایک مسکراہٹ کے ساتھ میں نے اس کو اپنا ہاتھ پیش کیا
وہ ہنسی اور لوٹ گئی۔

یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ اُس وقت سے اتنے سال بیت چکے
کہ اب ان کے شمار کی مجھے فکر نہیں رہی۔

کبھی کبھار ہم ملتے، بہت کم ایک دوسرے سے کچھ کہتے
اور اس کے باوجود ہماری خاموشیاں ہوا کرتی تھیں گہری، بہت گہری۔

اپنے اندر کی سچائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ جاڑے کی ایک رات میں
میں کھچا کھچ بھرے، روشنیوں سے معمور ہال سے باہر نکل آیا
جہاں چہروں پر ظالمانہ نقاب لگائے لوگ کرخت آواز میں ہنس رہے تھے
اور جہاں میں نے اپنی مشتاق نگاہوں سے اس کا تعاقب کیا تھا۔
اور اس کے بعد وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی، سپردگی کے انداز میں۔
یہ جانے بغیر کہ عنقریب کیا ہونے والا تھا۔
صرف شہر کی اونچائی پر بسی گھور کالی رات نے دیکھا
ایک دولہا اور دولھن کو گزرتے اور غائب ہوتے ہوئے۔

ہم ایک گرجا کے اندر ملے جب ہر سمت خاموشی تھی،
وہ اداس، چمکیلی دھوپ اور مسرت بھرا ایک دن تھا
ہم جانتے تھے کہ ہمارے وہ خاموش ماہ و سال ضائع نہیں ہوئے تھے:
ان میں جس طمانیت کی تکمیل ہوئی بڑی اونچائی پر ہوئی۔

میرا نغمات بھرا دل تجسس اور مسرتوں کی
ان طویل کہانیوں سے اٹا پڑا ہے
اُن سب گیتوں سے میں نے ایک عمارت کھڑی کر لی ہے۔
دوسرے گیت میں کسی اور وقت سناؤں گا۔

ف۔س۔اعجاز

مہاتما گاندھی

۲ راکتوبر ۱۸۶۹ء تا ۳۰ رجنوری ۱۹۴۸ء

موہن داس کرم چند گاندھی مغربی ہندوستان کی چھوٹی سی ریاست پور بندر کے ادھیڑ عمر وزیر اعظم کی چوتھی بیوی سے جنے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بچے تھے۔ وہ تنہائی پسند، شرمیلے اور سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ اپنے والدین خصوصاً ماں جو ایک دھارمک عورت تھیں، کے ساتھ نفسی خوشی رہا کرتے تھے۔ ۱۳ سال کی عمر میں ہندو رسم کے مطابق ان کی شادی ان کے بچپن کا بہت اہم موڑ تھی۔ دوسرا اہم واقعہ تھا شادی کے تین سال بعد ان کے باپ کا انتقال۔ اس وقت گاندھی اپنی حاملہ دلہن کی دیکھ بھال بھی کر رہے تھے۔ اس بات نے انھیں تا زندگی ایک جنسی جرم کے ارتکاب کے احساس میں مبتلا رکھا اور اسی بات نے سیاست میں انھیں بہت اونچے مقام تک پہنچا دیا۔

۱۸ سال کی عمر میں انھوں نے عہد کیا کہ وہ شراب، عورت یا گوشت کو نہیں چھوئیں گے۔ اس کے بعد وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے تین سال کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ یہ ان کی عمر کا تشکیلی دور تھا۔ اہم بات یہ کہ برطانوی سبزی پکوان کھا کر اپنی بھوک مٹانا ان کے لیے باعث تکلیف تھا۔

گاندھی ۱۸۹۳ء میں ایک مسلم قانون پیشہ کمپنی میں وکیل کی حیثیت سے جنوبی افریقہ پہنچے۔ ۲۱ سال انھوں نے جنوبی افریقہ میں گزارے اور وہاں ہندوستانیوں کے لیڈر بن گئے۔ انھوں نے فطری علاج اور طبقاتی زندگی کے ساتھ تجربہ کرنا شروع کیا۔ ۳۷ سال کی عمر میں انھوں نے برہماچاری رہنے کا عہد کیا تاکہ وہ سیاسی اور مذہبی لیڈر شپ کے لیے آزاد ہو جائیں۔ گاندھی کا سیاسی فلسفہ سچائی اور طاقت کا آمیزہ تھا۔ اس سے مربوط تھی اُن کی انفعالی مزاحمت یا عدم تشدد کی پالیسی۔ سول نافرمانی تحریک اور دیگر علامتی احتجاجات اور بعد میں ڈرامائی مرن برت وغیرہ کے ذریعہ انھوں نے طاقت کا جواب صداقت سے اور برائی کا جواب نیکی سے دے کر شہ زور سامراج کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک کمزور آدمی کی قوت کو تسلیم کرے۔

۱۹۱۵ء میں گاندھی ہندوستان لوٹے تاکہ کلونیلزم (نوآبادیات) کی سازش سے نبرد آزما ہو سکیں۔ تمام مغربی اثرات کو رد کر کے انھوں نے ایک سادہ، کٹر طرز زندگی اپنے آشرموں میں اختیار کیا۔ یہ گویا اپنے فرقے میں ان کی واپسی تھی۔ انھوں نے روایتی خود استعدادی کی علامت کے طور پر چرخہ کاتنے کا شغل اپنایا۔ درآمد شدہ کپڑے کے متبادل کے طور پر خود چرخہ کاتا۔

انھوں نے برطانوی سامراج کے خلاف کئی علامتی احتجاج کیے جو ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کی صورت میں نتیجہ خیز ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں امن قائم کرنے کے سلسلے میں ایک ہندو بنیاد پرست کے ہاتھوں ان کا قتل ہو گیا۔

ان کا سراپا متوجہ کرتا تھا۔ کوتاہ اور ناتواں جسم محض ایک لنگوٹی میں ڈھکا رہتا تھا۔ ناک اور کان زیادہ بڑے تھے۔ دھات کے فریم کا چشمہ آنکھوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے سبھی بنیادی مسائل کا سامنا کیا۔ روایت اور جدت کاری' نوآبادیت اور قومیت' عقیدے کے ساتھ تشخص ہر بات ان کے سامنے ہوئی۔ صرف ایک سوال جس کا حل وہ نہیں ڈھونڈ پائے اور جو ضعیفی میں بھی ان سے طے نہ ہو سکا وہ تھا جنس کا معاملہ۔ تیرہ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ اس کے بارے میں گاندھی نے اپنا حافظہ دہراتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ایسا ہی تجربہ تھا جیسے ''ایک اجنبی لڑکی سے کھلونے کی طرح کھیلنا''۔ اس کا یہ بھی مطلب تھا کہ کوئی ہندو شوہر کی روایتی حیثیت کو تسلیم کرلے جس کے تحت وہ اپنی دلہن پر حکمرانی کرنے کا مجاز ہو۔ لیکن کستوربا مانگی ایک ضدی اور مضبوط قوت ارادی کی عورت تھی۔ شادی کے وقت اس کی عمر بھی ۱۳ سال تھی۔ اس نے اپنی شادی کے ابتدائی دو سالوں میں سے نصف مدت اپنے میکے میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ گزاری۔ وہ سپردگی کے لیے تبھی راغب ہوتی تھیں جب نوبت جنسی عمل تک پہنچ جائے۔ گاندھی جن کی تربیت ان کی بھابھی نے کی تھی' کے نزدیک شادی جنسی معاملے میں ملوث ہونے کا آغاز تھی۔ شہوانی خواہشات میں گھرے رہنے کے سبب سے گاندھی کی اصول کی پڑھائی متاثر ہونے لگی۔ کستوربا ان پڑھ رہتیں۔ محبت کے بے اختیار جذبے نے کچھ سیکھنے کی انھیں مہلت ہی نہ دی۔ گاندھی ذہنی رفاقت کے لیے کسی متبادل کی جستجو میں لگ گئے۔ وہ نظام ہضم' اخراج اور قوت حیات سے متعلق (مادہ تخلیق) کی پوجا کے ہندوانہ تصور میں غرق رہنے لگے کیونکہ اس عقیدے کے مطابق اس کے نقصان سے شریر اور مستک کمزور ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عمر دراز ہندو مردوں میں تجرد کوئی خاص بات نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن گاندھی جب ۳۵ سال کے تھے ان کی جنسی قوت کافی تیز تھی۔ انہیں خود پر قابو رکھنا واقعی مشکل تھا۔ تدارک کے لیے انھوں نے بہت سی باتوں پر غور کیا۔ آخر انھوں نے ٹھان لیا کہ اجتناب (abstinence) واحد اخلاقی راستہ ہے برتھ کنٹرول کا۔ پانچ بیٹیوں کے بعد وہ مزید کوئی اولاد نہیں چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی باقی توانائی وہ قوم کی خدمت کے لیے بچا رکھیں۔

گاندھی کے نزدیک جنسی اور سیاسی استحصال میں فرق تھا۔ انھوں نے لکھا ہے ان کا انفعالی مزاحمت کا فلسفہ جیلی پتنی کستوربائی کا اسکایا ہوا ہے ''میری خواہش کے خلاف اس کی پختہ مزاحمت نے مجھے خود سے شرمسار کر دیا اور مجھے اس احمقانہ خیال کے روگ سے نجات دلا دی کہ میں اس پر راج کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا''۔ تجرد دو مخالف جنسوں کے مابین عدم تشدد کی ایک بہتر راہ تھی۔ لیکن کستوربائی نے ۱۹۴۴ء میں اپنی موت آنے تک ان عورتوں پر شک کرنا نہ چھوڑا جو گاندھی کے اطراف خدمت پر مامور رہا کرتی

تھیں۔ اُن دنوں' میاں بیوی دونوں سول نافرمانی کے سلسلے میں جیل میں تھے۔
گرچہ روایتی ہندو عقیدے کے مطابق جنس سے گریز ہی قرین مصلحت تھا۔ لیکن گاندھی عورتوں کے پرستار تھے اور وہ ان کی تحریک میں معاون تھیں۔ جنوبی افریقہ میں ۱۷ سالہ سونجا شلیسن (Sonja Schlesin) سے آغاز کرتے ہوئے انہیں کئی سکریٹری نرسیں ملیں جو اُن کی بڑی عقیدت مندانہ اور غلامانہ خدمت کرتی تھیں۔ سالوں تک اُن عورتوں نے گاندھی سے ڈکٹیشن لینے کے علاوہ ان کی مالش' نہلانے حتیٰ کہ ان کے ساتھ سونے کے فرائض بھی خود کو سونپے رکھے۔ گاندھی میں ایسی کشش تھی کہ عورتیں ان کے لیے دور دراز سے خود آجاتی تھیں۔ لیکن مخالف جنس کے ساتھ گاندھی کے تمام رشتے افلاطونی نہیں کہے جاسکتے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جنسی طور پر خالص رہنے کی جدوجہد ''تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہوتی ہے''۔
انہیں رات میں کپکپی کے دورے پڑتے۔ لہٰذا وہ اپنے اندرونی حلقوں میں رہنے والی نوعمر عورتوں' کنواریوں یا نئی دلہنوں سے کہتے کہ وہ انھیں اپنے جسموں سے گرمادیں۔ ان میں سے بعض کے لیے یہ ایک متخالف محسوسات کی ہم وجودیت (یعنی co-existence of opposing feelings) کا تجربہ ثابت ہوتا۔ آبھا گاندھی' ان کے ایک رشتے کے بھائی کے پوتے کانو کی بیوی تھی۔ اس نے مہاتما کے ساتھ سونا شروع کیا۔ تب اس کی عمر ۱۶ برس تھی۔ اس کا شوہر اس قدر پریشان ہوا کہ اس نے بوڑھے آدمی کو اپنے جسم سے حرارت پہنچانے کی پیشکش کردی۔ لیکن گاندھی نے اس کی پیشکش ٹھکرادی۔
گاندھی کی پسندیدہ لڑکیوں میں سے بعض ایک دوسری سے حسد میں مبتلا ہوگئیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ وہ گاندھی کے التفات سے محروم نہ ہوجائیں۔ مَنو گاندھی ایک دور کے رشتے سے بہن ہوتی تھی۔ وہ ۱۹ سال کی عمر سے گاندھی کے پہلو میں رہتی آرہی تھی۔ گاندھی جب باہر جاتے مَنو اور آبھا کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر چلتے تھے۔ وہ دونوں گویا ان کی 'بیساکھیاں' (Walking Sticks) بنی ہوئی تھیں۔ اپنے برت میں بھی ان کا یہی شعار تھا۔ مَنو ان کے خاص افعال کی نگرانی کرتی اور قبض دور کرنے کے لیے انھیں انیما(enema) دیتی تھی۔ گاندھی کے ایک شاگرد کے بقول وہ دونوں جتندرا اپنے آپ پر قابو رکھنے کی کوشش کرتیں اور اپنی جنسی خواہشات کو دباتیں اتنی ہی پُرقوت اور حساس ہوجاتی تھیں۔ سچ یہ ہے کہ جنسی اور سیاسی معاملات میں مہاتما گاندھی اپنے اصول خود لکھا کرتے تھے۔
گاندھی کی شخصیت کا طلسم ہے کہ اس کے ہر پہلو پر ہر زاویے سے تحقیق کی جاتی رہی ہے۔ خود گاندھی نے اپنی زندگی اور افکار کو کتابوں میں سمو دیا ہے جو سابرمتی آشرم' احمد آباد میں محفوظ ہیں۔ وہ دنیا کے پہلے لیڈر تھے جس نے سیاست کے پلیٹ فارم سے عدم تشدد کا پیغام دیا اور ان کا یہ پیغام مذہبی بلندی کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ سچائی کے ساتھ ان کے تجربات اور مذاہب کی صداقتوں کا اعتراف جو انھوں نے اپنی کتابوں میں کیا اور فرقہ واریت کے خلاف اپنے جہاد کے کلائمکس میں ایک متعصب جنونی ہندو کے ہاتھوں ان کا

قتل' ان باتوں نے انہیں ایک سنت کا درجہ دیدیا۔ سب کچھ اتنا کھلا ہے' ان کی آشرم کی زندگی اور سادھنا آج بھی نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک بھی تحقیق کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ وقفے وقفے سے ان کے بارے میں مغربی اسکالرز کتابیں لکھ رہے ہیں جو منظر عام پر آتے ہی کسی نئی بحث کو جنم دیتی ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں ''نیویارک ٹائمز'' کے سابق ایڈیٹر جوزف لیلی ویلڈ نے گاندھی کی سوانح عمری شائع کی ہے'' گریٹ سول: مہاتما گاندھی اینڈ ہز اسٹرگل وتھ انڈیا'' (Great Soul: Mahatma Gandhi And His Struggle With India)۔ اس کتاب پر مغربی اور ہندوستانی پریس میں کئی تبصرے شائع ہوئے۔ لیلی ویلڈ نے گاندھی کے ایک جرمن یہودی باڈی بلڈر ہرمن کلن باش (Hermen Kallenbach) سے پیچیدہ مراسم کو ظاہر کیا ہے۔ ۲۰۱۰ء میں Tad Adams نے اپنی کتاب "Gandhi: Naked Ambition" میں سیکس کے ساتھ گاندھی کے تجربات کو موضوع بنایا تھا۔ تھومس ویبر کی کتاب "Going Native" میں گاندھی کے مغربی خواتین سے تعلقات کو طشت از بام کیا گیا تھا۔

دراصل گاندھی کے جنسی رویّوں کو لے کر ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات سامنے آتی رہی ہے۔ نرمل بوس ایک گاندھی وادی تھے۔ انھوں نے گاندھی کی زندگی میں ہی ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ بعد میں ایک کتاب لکھی "My Days With Gandhi"۔ اس میں انھوں نے تحریر کیا کہ گاندھی کے جنسی تجربوں نے بعض دوسروں پر سوالیہ نشان لگا دیا حالانکہ وہ ایسی اخلاقی حیثیت کے حامل نہ تھے۔ گاندھی نے اپنے معترضین کو یہ کہکر جواب دیا'' اگر میں منو کو اپنے ساتھ سونے نہ دوں' حالانکہ میں بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ ایسا کرے' تو کیا یہ میری اندرونی کمزوری کی علامت نہ سمجھی جائے گی؟''۔

سچ یہ ہے کہ گاندھی میں کج رویاں بھی تھیں لیکن اپنے بارے میں سچ بولنے میں وہ ہچکچاتے نہیں تھے۔ روایتی اور مڈل کلاس طبقے کو یہ باتیں صدمہ پہنچاتی ہیں۔ لیلی ویلڈ نے اپنی تحقیق کے لیے بہت سارے حوالے جن کتابوں سے اخذ کیے ہیں وہ بہ آسانی مل جاتی ہیں۔ معروف انگریزی ادیب' ناول نگار شوبھا ڈے نے اپنے ایک کالم میں ٹائمز آف انڈیا میں ایک کتاب "The Collected Works Of Mahatma Gandhi" Supplementary Volume-5 کا ذکر کیا ہے جو سابرمتی آشرم کے آرکائیوز میں دستیاب ہے جس میں کلن باش اور گاندھی کی بابت کچھ حوالے جابجا پائے جاتے ہیں۔ لیلی ویلڈ کی کتاب ہندوستان میں انگریزی اور دیگر مین اسٹریم میڈیا نے مشہور تو خوب کر دی لیکن گجرات میں نریندر مودی نے اس کتاب کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ ہاں باقی کہیں اس پر پابندی نہیں لگائی گئی۔ گاندھی خاندان کے دانشوروں نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں جتایا۔ مختصر یہ کہ جس قدر باتیں سامنے آئی ہیں انھوں نے چاہے سنسنی ہی کیوں نہ پھیلائی ہو لیکن کچھ خردمندانہ نکات گاندھی کے نظریے اور تجربے سے برآمد کیے جا سکتے ہیں جن سے صرف نظر اپنی ہی فہم و آگہی کی کسر کو ثابت کرے گا۔

کلن باش اور گاندھی پہلی بار ۱۹۰۳ء میں جوہانس برگ' جنوبی

افریقہ میں ملے تھے۔ کلن باش' یہودی باڈی بلڈر کے قطعۂ زمین پر ہی گاندھی نے ستیہ گرہیوں کا آشرم بنایا تھا اور باش کی ہی تجویز پر اس کا نام ٹالسٹائی آشرم رکھا گیا تھا۔ گاندھی جی اس وقت تک مہاتما نہیں کہلائے گئے تھے۔ جوزف لیلی ویلڈ کی کتاب دو نکات سامنے لاتی ہے۔ کستوربا سے بچے پیدا ہونے کے بعد بھی گاندھی اندر سے ناآسودہ رہتے تھے۔ لیکن باش کستوربا کی بجائے ان کی محبت بن گیا۔ شوبھا ڈے رقمطراز ہیں' اگر گاندھی جی نے لکھا کہ ''میں مردوں اور عورتوں کے مابین اختلاط سے زیادہ بھدا کسی اور عمل کو نہیں تصور کرسکتا'' تو اپنی رائے قائم کرنے کا انہیں حق ہے''۔

گاندھی کی وطن پر شہادت کے ۶۵۔۶۰ سال بعد اب اہل مغرب ان کی جنسی آسودگی پر فلسفہ آرائی فرمارہے ہیں۔ ان کے اپنی بیوی کستوربا سے تعلق کو لے کر کافی باتیں ہو چکی ہیں۔ آکشیا مکل نے ٹائمز آف انڈیا (کلکتہ) کے ۳۱؍مارچ ۲۰۱۱ء کے ایڈیشن میں صفحہ ۱۰ پر ایک خبر فراہم کی ہے کہ کلن باش کے نام مہاتما نے اپنے ایک خط میں کستوربا کی شکایت لکھی ہے جس سے گاندھی کے غصے کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہ ان کے مہاتما بننے سے پہلے کا ذکر ہے۔ جنوبی افریقہ میں میاں بیوی میں ایک لڑائی ہوئی۔ گاندھی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے باوجود انھوں نے بیوی سے معافی مانگ لی تھی۔ گرجا کمار نے اپنی کتاب "Brahmacharya Gandhi and His Women Associates" میں گاندھی اور باش کے خطوط سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ گرجا کمار نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دونوں کی محبت بھگتی اور صوفی شاعری کی واپسی سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ لیلی ویلڈ نے اپنی کتاب میں اس تعلق کے ساتھ بہت دور تک سفر کرڈالا ہے۔ مغربی محققین یوں تو نتیجہ خیز کارنامے انجام دیتے ہیں لیکن ان کے کارنامے ان کے مالی مفادات سے ضرور جڑے ہوتے ہیں۔ اور ہندوستان کے نام نہاد آزاد خیال انگریزی ادیب اور دانشور بھی اب تیزی سے اسی راہ پر گامزن ہیں چاہے پڑھا لکھا عام معاشرہ ان کے بارے میں جیسی بھی رائے قائم کرے۔

☆☆☆☆☆

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

۳۲۔ تم اسے پیار نہ کرو گے تو وہ مرجائے گی۔ اور اگر وہ اپنی محبت کو افشا کردے گی تو بھی مرجائے گی۔

Much Ado About Nothing - Act 2, Scene 3

۳۳۔ لوگ وقتاً فوقتاً مرتے رہے ہیں اور کیڑوں نے انھیں کھایا ہے لیکن محبت کے سبب سے نہیں

As You Like It - Act 4, Scene 1

۳۴۔ مردوں کے عہد عورتوں کے لئے دغاباز ثابت ہوتے ہیں۔

Cymbeline - Act 3, Scene 4

۳۵۔ افسوس وہ محبت۔ اپنے نظریہ میں وہ اتنا نرم۔ ثبوت میں کیا اسے اتنا ظالم اور سخت ہونا چاہئے؟۔

Romeo & Juliet - Act 1, Scene 1

رتن بائی اور محمد علی جناح

محمد علی جناح کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ چھپا ہے مگر ان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بہت کم ملتا ہے۔ یوں بھی محمد علی جناح اپنی زندگی کے بارے میں بہت کم اظہار خیال کرتے تھے۔

محمد علی جناح کی پہلی شادی جنوری 1892ء میں ہوئی اس وقت محمد علی جناح کی عمر 16 برس تھی اور وہ میٹرک میں زیر تعلیم تھے۔ اس شادی کا پس منظر یوں ہے کہ ان کے والد نے اپنے بیٹے محمد علی جناح کو کاروباری سلسلے میں لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا تو ان کی والدہ پریشان ہو گئیں۔ نوجوان محمد علی جناح کبھی بمبئی سے باہر جاتے تو وہ فکرمند ہو جایا کرتی تھیں اور لندن کا سفر بہت طویل تھا اور واپسی بھی تقریباً دو سال بعد ہونا تھی مگر جب ان کی شنوائی نہ ہوئی تو اس شرط پر آمادہ ہو گئیں کہ وہ شادی کر کے جائیں تاکہ وہاں سے کوئی میم نہ لے آئیں۔ یوں اس مشرقی ماں کے دل میں خدشہ تھا کہ بڑا بیٹا ہے نہ جانے واپسی پر اس کی صورت دیکھنے کو نصیب ہو یا نہ ہو۔ نوجوان محمد علی نے سعادت مند بیٹے کی طرح ماں کی خواہش کو تسلیم کر لیا۔ گویا یہ شادی حالات کا نتیجہ تھی اور یہ اسکول کے ریکارڈ میں درج ہے کہ وہ شادی پر چلے گئے۔ یہ شادی والدہ کے دور کے ایک رشتہ دار خاندان کے فرد کھیم جی کی بیٹی امر بائی جسے ایمی بائی بھی کہا جاتا ہے سے قرار پائی تھی۔ محمد علی جناح نے والدہ کی رضا کو تسلیم کر لیا۔ کھیم جی کا تعلق کاٹھیاواڑ کی ریاست گونڈل کے گاؤں ہریانہ سے تھا جو جام نگر سے سولہ میل دور ہے۔ یہ شادی خاندان کے رسم و رواج کے مطابق ہوئی۔

گاؤں کے مولوی صاحب نے رسم نکاح ادا کی۔ قرآن پاک سے چند آیات تلاوت کی گئیں اور یہ دونوں میاں بیوی بن گئے۔

جنوری 1893ء میں محمد علی جناح لندن روانہ ہو گئے اور 1896ء میں واپس بمبئی آئے۔ محمد علی کے کراچی سے لندن روانہ ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ایمی بائی کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ محمد علی جناح نے اپنی کمسن دلہن کے ساتھ زیادہ عرصہ نہیں گزارا تھا، انہوں نے والدین کے کہنے پر شادی کی تھی اس لئے انہیں اہلیہ کے انتقال پر بہت زیادہ صدمہ نہ ہوا۔ جب محمد علی جناح 1896ء میں لندن سے واپس بمبئی آئے تو محمد علی جناح کے والد پونجا جناح بھی بمبئی منتقل ہو چکے تھے اور محمد علی جناح کی اہلیہ بھی ان کے ہمراہ خوجہ محلہ میں رہتی تھیں۔ اس سال طاعون کی وباء سے انتقال کر گئیں۔

لندن سے واپسی پر محمد علی جناح نے تجرد کی زندگی گزاری۔ وہ

وکالت کرتے اور قومی معاملات میں سرگرم رہتے۔ اس دوران انہوں نے نیٹ کلب کی بطور مہمان رکنیت حاصل کرلی۔ اس کلب میں ہی ان کی ملاقات سرڈنشا پٹیٹ سے ہوئی جو اپنے وقت کی معروف سماجی وامیر وکبیر شخصیت تھے اور عقیدۃً پارسی تھے۔ قانون ساز اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ ڈنشا پٹیٹ کے دادا 1785ء میں سوات سے بمبئی آئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں بطور شپنگ کلرک ملازم ہوگئے۔ ان کے بیٹے مانک جی نے بمبئی میں پہلی کاٹن مل قائم کی جو پھیل کر مانک جی مل کمپلیکس اینڈ تانز دیوی کی شکل اختیار کرگئی۔ انیسویں صدی کے آخر تک یہ خاندان بمبئی کے روساء میں شمار ہونے لگا۔ اس دوران محمد علی جناح ایک ذہین اور کامیاب وکیل کے طور پر خاص شہرت حاصل کرچکے تھے اور تعلیم یافتہ حلقے میں ان کی بڑی پذیرائی ہوتی تھی۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاست میں فعال تھے اور 1913ء سے مسلم لیگ کے بھی ممبر تھے۔ ڈنشا پٹیٹ ان کے جذبۂ قوم پرستی سے بہت متاثر تھے اور اکثر اکٹھے نیٹ کلب جاتے جہاں تمام مذاہب کے لوگ مذہبی تعصبات سے بالاتر ہوکر سماجی میل جول رکھتے۔ محمد علی جناح اور سرڈنشا پٹیٹ جلد ہی قریب آگئے۔ یہاں تک کہ ڈنشا پٹیٹ اور ان کی اہلیہ لیڈی پٹیٹ محمد علی جناح کے بہت مداح ہوگئے اور تعلقات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ ڈنشا پٹیٹ اور ان کی اہلیہ اکثر اپنے گھر میں سماجی تقریبات منعقد کرتے۔ محمد علی جناح ہمیشہ ان میں مدعو ہوتے۔ یہاں ہی محمد علی جناح کی ملاقات ڈنشا پٹیٹ کی صاحبزادی رتن بائی سے ہوئی۔ رتن بائی اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ وہ 25 فروری 1900ء کو پیدا ہوئیں۔

بچپن ہی سے بہت خوبصورت، انتہائی ذہین، غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال اور ہر خوبی سے بہرہ ور تھیں۔ ادب، آرٹ، انسانی ہمدردی ان کے مزاج کا حصہ تھے۔ شعر و شاعری میں بھی دلچسپی لیتی تھیں۔ جب وہ گیارہ سال کی تھیں تو ان کے والد نے انہیں نامور شاعر لارڈ ٹینی سن کا مکمل سیٹ لا کر دیا اور سرورق پر تحریر کیا "پیاری رتی کے لئے" جب کہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں وہ شیلے، بائرن، براؤننگ اور کیٹس جیسے شعراء کے علاوہ ڈراموں اور ناولوں کا مطالعہ کرچکی تھیں۔ خوبرو اور متاثر کن رتی سیاست میں بھی دلچسپی لیتیں اور سیاسی تقریبات میں شرکت کرتیں۔ سماجی بہبود اور خواتین کے حقوق کی جدوجہد میں بھی نمایاں تھیں۔ اپنے گھر پر ہونے والی سماجی تقریبات میں بحث و مباحثہ کرتیں۔ محمد علی جناح سے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ ان تقریبات میں شروع ہوا۔ ممبر اور ینٹ کلب میں ملاقاتیں ہوتیں اور مختلف سیاسی و سماجی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ محمد علی جناح اس وقت سیاست اور قانون کے میدانوں میں ملک میں صف اول میں جگہ پاچکے تھے۔

ڈنشا پٹیٹ کا معمول تھا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیاں کسی صحت افزا مقام پر گزارتے تھے۔ یہ 1916ء کا واقعہ ہے کہ جب محمد علی جناح سے ان کے تعلقات بہت بڑھ چکے تھے اور انہوں نے محمد علی جناح سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ان کے ہمراہ دارجلنگ چلیں۔ محمد علی جناح نے یہ دعوت قبول کرلی اور وہ ڈنشا پٹیٹ کے خاندان کے ہمراہ دارجلنگ چلے گئے جہاں دونوں

خاندانوں کو ایک دوسرے کے قریب رہ کر جاننے کا موقع ملا۔ محمد علی جناح کو گھوڑ سواری کا شوق تھا اور رتن بائی کو بھی۔ دونوں اکثر گھوڑوں پر بیٹھ کر دور تک نکل جاتے۔ اس طرح دونوں خاندانوں میں تعلقات بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کے مواقع بھی ملے۔ دارجلنگ میں ڈنشا پیٹٹ کا سرمائی محل تھا۔ محمد علی جناح نے یہاں دو ماہ قیام کیا کہ اس دوران ایک سرد شام جب محمد علی جناح اور رتن سیر کے بعد ماؤنٹ ایورسٹ ویو کے کھلے صحن میں خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک محمد علی جناح کی ذات موضوع بحث بن گئی تو رتن بائی نے سوال کر دیا کہ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ کیا اس لئے تو نہیں کہ پورے ہندوستان میں کوئی لڑکی آپ کے معیار کی نہیں؟۔

رتن یہ سوال کر کے سہم گئی تو محمد علی جناح نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر بڑے اطمینان سے جواب دیا'' کم از کم مسلمانوں میں کوئی لڑکی مجھے اپنے معیار کی دکھائی نہیں دی۔''

اس وقت بات آئی گئی ہوگئی۔ رتن بائی نے جو اپنے آئیڈیل کے بارے میں سوچ رہی تھیں اندازہ کر لیا کہ محمد علی جناح کا دل جیتنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ واپسی پر بمبئی میں رتن بائی نے محمد علی جناح سے ملاقات میں اسلام کے بارے میں لٹریچر طلب کیا جس پر انہوں نے بمبے کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبداللہ بخاری کی خدمات حاصل کیں اور منتخب کتابیں رتن بائی کو بھیج دیں۔ رتن بائی نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں جس طرح شاعری اور ناولوں کا مطالعہ کر لیا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے آئیڈیل کے بارے میں سوچتی تھیں۔

رتن بائی نے اسلام کے بارے میں کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد محمد علی جناح کو اپنانے اور مسلمان ہونے کا حتمی فیصلہ کر لیا تو اس سے نہ صرف اپنے والدین کو آگاہ کر دیا بلکہ اپنے اس فیصلے پر بضد ہو گئیں۔ ڈنشا پیٹٹ آزاد خیال انسان تھے مگر اس کے باوجود رتن کا یہ فیصلہ سن کر ان کو سخت دھچکا لگا کیونکہ وہ رتی کی شادی اپنے خاندان میں ہی کرنے کے خواہش مند تھے چنانچہ انہوں نے اس کی بھرپور مخالفت کی اور رتن کو باز رکھنے کی سعی کی۔ انہوں نے رتی کو بتایا کہ اس کا یہ فعل پارسی برادری کے لئے کسی المیہ سے کم نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ مسٹر جناح کی عمر 41 سال ہے جب کہ تمہاری عمر صرف 16 سال ہے۔ وہ تمہارے سامنے بوڑھا دکھائی دیتا ہے مگر رتی اپنی ضد پر قائم رہی اور پارسی برادری کی بھی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ محمد علی جناح کے لئے یہ بڑی آزمائش کا مرحلہ تھا لیکن وہ ہر آزمائش سے نکلنا جانتے تھے چنانچہ انہوں نے ایک مناسب موقع پر محمد علی جناح کے وکیل ایم سی چھانگلہ نے سر ڈنشا پیٹٹ سے پوچھا'' مختلف فرقوں میں باہمی شادیوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

سر ڈنشا پیٹٹ بولے'' اس سے قومی یکجہتی میں بہت مدد ملے گی۔''

اس پر محمد علی جناح نے دل کی بات کہہ دی۔

'' میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں''۔ سر ڈنشا پیٹٹ ہکا بکا رہ گئے اور سیخ پا ہو کر بولے یہ شادی نہیں ہو سکتی۔

ان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ جس بات کو یکطرفہ معاملہ سمجھ رہے تھے وہ

اتنا سادہ نہیں تھا چنانچہ وہ عدالت کا فیصلہ لے آئے کہ رتی اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے شادی نہیں کر سکتی اور اولین قدم کے طور پر رتی پر محمد علی جناح سے ملاقات پر پابندی لگا دی۔ ڈنشا پیٹ نے رتی کو بہت سمجھایا مگر رتی کو سمجھانا اب آسان نہ تھا۔ رتی نے آخر فیصلہ سنا دیا۔ جسے سن کر سب خاموش ہو گئے
''اگر آپ شادی سے انکار کر دیں گے تو ڈیوڑھی میں جان دے دوں گی۔''

ڈنشا پیٹ کا خیال تھا کہ ایک ڈیڑھ سال میں جذباتی محبت کا جذبہ سرد پڑ جائے گا مگر رتن نے انتہائی صبر و وقار کے ساتھ اپنی عمر کے اٹھارہ سال ہونے کا انتظار کیا۔ یقیناً یہ صبر آزما انتظار تھا حتیٰ کہ عمر اٹھارہ سال ہو گئی۔ ہجر کی طوالت نے چاہتوں کو اور شدید کر دیا تھا اور ملاقات کے لئے بے قراری نے محبت کے ایقان کو مستحکم کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ قانون اور سماج ان کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں رہ سکتا اور پاکیزہ محبت کے فیصلے کی گھڑی آن پہنچی۔ رتن نے اپنے والدین کے گھر کو خدا حافظ کہا اور محمد علی جناح کے ہاں پہنچ کر 18 اپریل 1918ء کو جامع مسجد بمبئی کے خطیب مولانا نذیر احمد کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لیا۔ ان کا اسلامی نام مریم رکھا گیا۔ اس موقع پر متعدد علماء کے علاوہ راجہ صاحب محمود آباد، عمر سبحانی، محمد علی منیر، مولانا ابو الہاشم نجفی وغیرہ موجود تھے۔ مولانا نذیر احمد مسلم لیگ کے رکن تھے بعد میں تحریک خلافت میں سرگرم رہے۔ پھر اگلے روز 19 اپریل کو ساؤتھ کورٹ نامی بنگلے میں اسلامی طریقہ کے مطابق رسم نکاح سے دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ نکاح کے لیے ایک اثنا عشری قاضی کا اہتمام محمد علی جناح کے دوست شریف دیو جی نے کیا۔ دلہن کو شادی کی انگوٹھی راجہ صاحب آف محمود آباد کی طرف سے تحفہ تھی۔ مولانا حسن نجفی نے بطور وکیل دلہن اور شریعت مدار آقائے حاجی عبد الہاشم نجفی نے بطور وکیل دولہا کے نکاح نامہ پر دستخط کیے۔ نکاح کے گواہان شریف دیو جی، عمر سبحانی، راجہ محمد علی آف محمود آباد اور غلام علی تھے۔ یہ 16 رجب کی تاریخ تھی۔ اس روز انگریزی اخبار اسٹیٹسمین نے لکھا ''سر ڈنشا پیٹ کی اکلوتی بیٹی مس رتن بائی نے کل مولانا نذیر احمد کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ آج عزت مآب ایم اے جناح سے ان کی شادی ہو گئی۔''

لاہور کے پیسہ اخبار نے 21 اپریل 1918ء کی اشاعت میں لکھا ''مشہور پارسی نواب سر ڈنشا کی بیٹی رتن بائی 18 اپریل کو مشرف بہ اسلام ہوئیں اور 19 اپریل کو مشہور بیرسٹر محمد علی جناح سے ان کی شادی ہوئی۔ نکاح نامہ فارسی زبان میں لکھا گیا۔ حق مہر 1001 روپے باندھا گیا۔ مسٹر جناح نے دلہن کو ایک لاکھ 25 ہزار روپے تحفے میں دیے''۔ درحقیقت یہ انگوٹھی کی مالیت ہے جو مسٹر جناح نے تحفہ میں دی تھی۔

راج موہن گاندھی اپنی کتاب Understanding the Muslim Mind میں لکھتے ہیں: ''محمد علی جناح کی شادی ان کی عالیشان رہائش گاہ مالا بار ہل ہاؤس میں ہوئی۔ مالا بار ہل قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ مہمان خواتین رتی کی خوبصورت سازی کی تعریف اور اس آئیڈیل جوڑی پر رشک کر رہی تھیں۔''

رتن سے شادی کے بعد محمد علی جناح کی ازدواجی زندگی کے

لائق ہیں کہ ان سے محبت کی جائے۔ وہ بھی رتی سے محبت کرتے ہیں اور یہ لئے دیئے اور اپنی ذات میں مگن رہنے والے شخص کی فطرت کا ایک حقیقی، انسانی اور اصلی جذبہ ہے۔''

سروجنی نائیڈو ایک روز ڈنشا پیٹٹ کے ہاں مہمان تھیں۔ وہ جب رخصت ہو کر ان کے گھر کی سیڑھیاں اتر رہی تھیں تو اپنے ایک واقف کار سے کہنے لگیں ''بوڑھے کا دماغ چل گیا ہے''۔

محمد علی جناح اور مریم (رتی) شادی کے ایک ماہ بعد ہنی مون منانے کے لئے نینی تال والے بنگلے جو راجہ صاحب آف محمود آباد کی ملکیت اور سطح سمندر سے ایک میل بلندی پر تھا روانہ ہو گئے۔ راستہ میں راجہ صاحب محمود آباد کی لکھنؤ والی کوٹھی میں ٹھہرے۔

نینی تال میں محمد علی جناح اور مریم جناح راجہ صاحب آف محمود آباد کے بنگلے میں ٹھہرے۔ وہاں مریم جناح نے اپنی شادی کی یادگار کے طور پر Myritle کا پودا لگایا۔ یہاں دونوں خوب گھوڑ سواریاں کرتے۔ ہنی مون منانے کے بعد نو بیاہتا جوڑا دہلی آیا اور لال قلعہ کے قریب سنڈ وِز ہوٹل میں قیام کیا۔ یہ شاندار ہوٹل مغلیہ طرز کے باغات کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ مکمل مغربی طرز کا یہ ہوٹل محمد علی جناح کے محبوب ترین ہوٹلوں میں سے تھا۔ دہلی سے یہ خوبرو جوڑا بمبئی آیا اور ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر محمد علی جناح کے گھر اقامت پذیر ہوا۔ مریم جناح نے بنگلے کو نئے سرے سے آراستہ کیا جس سے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ مریم اپنے شوہر کی طرح انتہائی باذوق، خوبصورت، نفیس مزاج رکھنے والی خاتون تھیں۔ مریم نے گھر کی سجاوٹ کے لئے نوادرات، آرٹ کے قیمتی نمونے خریدے اور گھر کو اپنے شوہر کے مزاج کے مطابق شایان شان بنا دیا۔ مریم نے اس مکان کو جنت ارضی میں بدل دیا بلکہ لاء کورٹس میں اپنے شوہر کے کمرے کو بھی شوخ رنگ روغن، عمدہ فرنیچر اور پھولوں سے سجا دیا۔ مریم خود بھی انتہائی خوبرو اور نفیس خاتون تھیں۔ ان کے بارے میں خواجہ حسن نظامی نے خوب لکھا ہے کہ ''پورے ہندوستان میں بے پردہ خواتین میں سے کوئی بھی ان سے بڑھ کر خوبصورت نہیں ہے۔ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ زندہ دلی، خوش لباسی، بذلہ سنجی، ذہانت، فطانت اور جرأت بھی ان کے کردار میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔''

مریم جناح کے حسن و جمال کا شہرہ تھا۔ لوگ انہیں فلاور آف بمبئی کہتے تھے۔ ہیکٹر بولیتھو نے لکھا ہے ''رتن چمنستان بمبئی کا پھول تھیں''۔ سر محمد شفیع کی اہلیہ بیگم جہاں آرا شاہنواز لکھتی ہیں۔ ''رتی بہت متحرک اور زندگی سے بھرپور رہتی تھیں۔ وہ پرکشش تھیں۔ ان کے ہاتھ خوبصورت تھے اور ان کی حرکات و سکنات بہت پیاری تھیں۔ وہ پرکشش تھیں۔'' سر اکبر حیدری کی صاحبزادی بیگم خاتم بھائی طیب جی نے ایک انٹرویو میں کہا ''وہ محبت کئے جانے کے لائق تھیں۔ وہ بہت حسین، مہذب، تعلیم یافتہ، پروقار اور اچھی مقرر تھیں۔ جناح کے لئے اپنی اہلیہ کا متبادل کوئی خاتون ہو ہی نہیں سکتی تھی۔''

سٹینلے والپرٹ کے بقول ''رتی کے بالوں میں تازہ پھول گندھا ہوتا، ان کا جسم سرخ، سنہری، پیلے، نیلے اور گلابی رنگوں کی ساڑھی میں لپٹا

ہوتا۔ ان کے ہیڈ بینڈ میں ہیرے، لعل اور زمرد سجے ہوتے۔ ان کی لگاتار ہنسی کی موسیقی کانوں میں رس گھولتی اور ان کی موجودگی کا احساس دلاتی۔''

سری نگر کے پارسی تاجر چنان جی نے بتایا کہ ''جناح اپنی اہلیہ پر جس طرح پیسے خرچ کرتے اس سے اندازہ ہوتا تھا انہیں اس خاتون سے کس قدر محبت ہے۔ مریم نے سری نگر میں اپنی ہاؤس بوٹ سجانے کے لئے تین ماہ میں 50 ہزار روپے خرچ کئے۔ جناح اپنی حسین اور فرض شناس اہلیہ کی خاطر ہر بل بخوشی ادا کرتے۔''

مریم کے احساس ذمہ داری نے محمد علی جناح کو اس حد تک اسیر کر لیا کہ اب محمد علی جناح عدالت سے گھر آتے تو دونوں میاں بیوی کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں گھنٹوں نشست کرتے۔ اس دوران محمد علی جناح ان کو اہم مقدمات کی روداد سناتے۔ مریم ان کو دلچسپی سے سنتیں۔ شام کو محمد علی جناح کے دوست اور سیاستدان آتے۔ مریم ان کی خاطر مدارات کرتیں اور ان کے ساتھ قومی مسائل پر تبادلہ خیال میں حصہ لیتیں۔

مریم جناح کا جرأت مندانہ کارنامہ

مریم جناح کی جرأت اور پامردی کے حوالے سے 10 دسمبر 1918ء کا یہ واقعہ زبان زد خاص و عام ہے۔ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ 10 جون 1918ء کو بمبئی میں پراونشل اور کونسل کا اجلاس ہوا جس کی صدارت گورنر بمبئی لارڈ ولنگڈن نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں لارڈ ولنگڈن نے ''ہوم رول لیگ'' کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ہوم رول لیگ ہندوستان کی آزادی کے لئے فعال تھی۔ محمد علی جناح ہوم رول لیگ (حکومت خود اختیاری لیگ) کے سرگرم رہنما تھے۔ محمد علی جناح لارڈ ولنگڈن کے خطاب پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر حکومت جنگ کے لئے بھرتی کرنا چاہتی ہے تو اسے پڑھے لکھے لوگوں کو یقین دلانا ہوگا کہ وہ ذی وقار شہری اور بادشاہ کے برابر کے رعایا ہیں۔''

10 دسمبر 1918ء کو بمبئی کی پارسی برادری نے لارڈ ولنگڈن کے لیے ٹاؤن ہال میں الوداعی دعوت کا اہتمام کیا جو ان کی خدمات کے اعتراف میں تھی۔ محمد علی جناح نے اس تقریب کے خلاف زبردست مہم شروع کر رکھی تھی۔ محمد علی جناح اور ان کے ساتھی وقت مقررہ سے گھنٹوں قبل پہنچ گئے۔ جوں ہی تقریب کے ہال کا دروازہ کھلا تو محمد علی جناح کے ساتھی اگلی نشستوں پر قابض ہو گئے۔ دوپہر کو مریم جناح سینڈوچ سے بھرے ٹفن لے کر پہنچ گئیں کیونکہ نشستوں پر براجمان محمد علی جناح کے ساتھی سیٹوں کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے تاکہ ولنگڈن کے حامی نشستوں پر قبضہ نہ کر لیں۔ شیریف بمبئی کے اجلاس شروع کرنے سے قبل سر جمشید علی جو پارسی برادری کا رہنما تھا، نے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے تقریر شروع کر دی جس پر ہال میں شور مچ گیا۔ جمشید علی نے شور و غوغا میں قرارداد پڑھ دی۔ ادھر باہر مریم جناح کی قیادت میں لوگ نعرہ بازی کر رہے تھے۔ پولیس نے ان پر پانی پھینکا مگر مریم خطاب کرتی رہیں اور پولیس کو جل دے کر ہال میں داخل ہو گئیں۔ مریم نے ٹاؤن ہال لائبریری کی بالکونی میں ایک سائیڈ بکس پر چڑھ کر زبردست نعرہ بازی کی اور کہا کہ ''ہم

غلام نہیں'' ہال میں شور مچ گیا تھا کہ ہنگامہ آرائی شروع ہوگئی۔ کمشنر نے ہال خالی کرنے کا حکم دیا۔ محمد علی جناح اور مریم کو بھی باہر نکال دیا گیا۔ اس ہنگامے میں محمد علی جناح اور مریم کو چوٹیں آئیں مگر لارڈ ولنگڈن کو سپاسنامہ پیش کرنے کی نوبت نہ آسکی اور فتح محمد علی جناح کی ہوئی۔ وہ ہیرو بن کر اُبھرے اور شہریان بمبئی نے ولنگڈن میموریل ہال کی بجائے پیپلز جناح ہال کی تعمیر کا فیصلہ کیا جو بعد میں تعمیر کیا گیا اور آج بھی پی جے ہال کے نام سے بمبئی میں موجود ہے۔ اسی شام محمد علی جناح نے اپالو اسٹریٹ میں عوام سے خطاب فرمایا اور کہا کہ'' 11 دسمبر بمبئی کی تاریخ میں ایڈیٹرڈے ہے۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ بیوروکریسی اور آٹوکریسی آپ کو ڈرا نہیں سکتی۔''

جدوجہد آزادی میں کردار

مریم جناح سیاسی شعور سے بہرہ ور تھیں۔ قوم پرست ہونے کے ناطے وہ سامراج کی مخالف تھیں اور اپنے جذبات کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ وہ محمد علی جناح کی سیاسی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک اور معاون تھیں۔ 1918ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو دہلی میں ہوا، محمد علی جناح اور بیگم مریم جناح جن کی شادی نئی نئی ہوئی تھی دونوں اکٹھے شریک ہوئے۔

دینا کی پیدائش

اپریل 1919ء میں محمد علی جناح اور مریم جناح دونوں لندن گئے۔ مریم حاملہ تھیں۔ ریجنٹ پارک کے قریب ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کر لیا گیا تاکہ مریم کو مکمل آرام مل سکے۔ یہاں قیام کے دوران 14 .15 اگست کی درمیانی شب محمد علی جناح کی بیٹی دینا جو ان کی واحد اولاد ہے، نے جنم لیا۔ دینا کی پیدائش پر ماں باپ بہت خوش ہوئے۔ نومبر 1919ء میں دونوں میاں بیوی خوش و خرم اپنی نومولود بیٹی دینا کے ہمراہ واپس بمبئی آگئے اور مسرت واطمینان سے زندگی گزارنے لگے۔

بمبئی میں دونوں میاں بیوی مطمئن اور مسرور زندگی گزار رہے تھے۔ بیگم مریم جناح محمد علی جناح کے ساتھ سرگرمیوں میں شریک ہوتیں۔ انہی دنوں رولٹ ایکٹ آرہا تھا جس کی محمد علی جناح سخت مخالفت کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا:

''میرا پختہ عقیدہ ہے کہ کسی شخص کی عدالتی آزادی ایک منٹ کے لئے بھی نہیں چھینی جا سکتی۔''

مارچ 1920ء میں رولٹ ایکٹ منظور ہوگیا تو محمد علی جناح نے بطور احتجاج امپیریل لیجسلیٹو کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ پھر جب مئی 1919ء میں بمبے کرانیکل کے ایڈیٹر بارنی مون کی حکومت پر تنقید کے باعث جلاوطنی ہوئی تو بمبئی میں جو احتجاجی جلسہ ہوا اس میں بیگم مریم جناح نے پرجوش خطاب کیا۔ مریم جناح نے اکتوبر 1920ء کو آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسہ میں شرکت کی۔ اس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی جب کہ اسٹیج پر بحیثیت مہمانان خصوصی جواہر لال نہرو، این ایم جوشی، بی پی واڈیا، دیوان چمن لال، ایس اے بریلوی اور کانجی دوارکا داس بیٹھے تھے۔ مریم جناح ایک

جس میں فروکش تھیں۔ ان کی طرف سے ہورنیمین (Horniman) کی
جلاوطنی پر قرارداد سامنے آئی نیز انہوں نے پانچ منٹ تک مسلسل صاف اور
واضح انگریزی زبان میں خطاب کیا مریم جناح کی کسی عوامی جلسہ میں یہ پہلی
اور آخری تقریر تھی۔

دسمبر 1920ء کے آخری ایام میں ناگپور میں کانگریس کا سالانہ
اجتماع ہوا جس میں گاندھی نے قرارداد پیش کی کہ آزادی کے لئے تمام جائز
اور پرامن ذرائع کو بروئے کار لایا جائے گا مگر محمد علی جناح نے اس کی بھرپور
مخالفت کی اور کہا کہ پوری تیاری کے بغیر آزادی کے لئے عدم تعاون ناقابل
عمل اور خطرناک ہے مگر گاندھی نے اکثریت کے بل بوتے پر قرارداد منظور
کرالی۔ محمد علی جناح کی تقریر میں آوازے کسے گئے، توہین آمیز نعرے لگائے
گئے۔

جب محمد علی جناح نے گاندھی کو مسٹر گاندھی کہہ کر مخاطب کیا تو کہا گیا
کہ مسٹر نہیں مہاتما کہو۔ مریم جناح اس اجلاس میں محمد علی جناح کے ساتھ تھیں۔
یہی وہ موڑ ہے جب محمد علی جناح سیاست سے مایوس ہوگئے۔ ناگپور اجلاس کے
بعد وہ مریم جناح کے ہمراہ واپس آگئے۔ جس ٹرین سے واپس بمبئی آرہے تھے
اس میں مولانا شوکت علی بھی سوار تھے۔ ایک اسٹیشن پر جب ٹرین رکی تو
استقبالی ہجوم نے مولانا شوکت علی سے کہا کہ اس ٹرین میں فرسٹ کلاس میں
بیٹھے محمد علی جناح کے خلاف شرم شرم کے نعرے لگاؤ۔ اس واقعہ کی مذمت کرتے
ہوئے مریم جناح نے ٹائمز آف انڈیا کو مراسلہ تحریر کیا جس میں صورتحال کا
تجزیہ کرنے کے بعد مولانا شوکت علی کو مخاطب کر کے کہا گیا جناب والا! اس قسم
کی باتیں عدم تعاون کی نفی کرتی ہیں جن کی روح عدم تشدد پر ہے۔

مریم جناح باضابطہ سیاست تو نہ کرتیں تاہم سیاست میں دلچسپی ضرور
لیتیں اور ہر مرحلہ پر محمد علی جناح کے ساتھ ساتھ ہوتیں۔

17 نومبر 1921ء کو پرنس آف ویلز ہندوستان کے دورہ پر آئے۔
ان کے خلاف بمبئی میں شدید ہنگامے ہوئے جن میں 53 افراد مارے گئے اور
کئی زخمی ہوئے۔ محمد علی جناح تشدد کے مخالف تھے۔ انہوں نے مریم جناح کے
ہمراہ پرنس وڈ ورڈ سے ملاقات کی۔ اس پر الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ
کے استاد پروفیسر شبروک ایمز نے محمد علی جناح کی سیاسی دوراندیشی کی داد
دیتے ہوئے تحریر کیا'' جناح بجا سمجھتے ہیں کہ ولی عہد کا بائیکاٹ ہندوستان کی
نیک نامی کے لیے نقصان دہ ہوگا۔'' قبل ازیں گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون
کے مخالف ہونے کی وجہ سے مولانا محمد علی جوہر نے ان کے خلاف سلسلۂ مضامین
شروع کیا تھا تو مریم جناح نے دفتر اخبار جا کر ایڈیٹر کے ذریعے مولانا سے
درخواست کی تھی کہ وہ یہ سلسلہ روک دیں۔ مولانا جوہر نے یہ درخواست مان
لی۔ جب ایڈیٹر نے فون پر محمد علی جناح کو یہ بتایا تو وہ سخت ناراض ہوئے اور کہا
کہ'' مریم کا اس سے کیا تعلق؟ مولانا محمد علی سے کہہ دیں کہ وہ اپنا سلسلہ جاری
رکھیں۔ میں ان سے خوفزدہ نہیں ہوں۔''

محمد علی جناح اب وکالت پر بھرپور توجہ دینے کے ساتھ ساتھ قومی
معاملات میں بہت سرگرم تھے۔ 1923ء اور 1926ء کی قانون ساز کونسل

کے انتخابات میں انہوں نے حصہ لیا۔ مریم جناح نے ان کی انتخابی مہم میں بھرپور حصہ لیا اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس 1923ء لاہور میں محمد علی جناح کے ہمراہ شریک ہوئیں اور دسمبر 1925ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چوتھے کانووکیشن میں محمد علی جناح کے ہمراہ تھیں۔ مریم جناح ستمبر 1922ء میں اپنے پالتو جانوروں کے ہمراہ

لندن روانہ ہوگئیں اور وہاں سے کانجی دوارکاداس کو خط لکھا جس میں دیگر کئی باتوں کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا:

''ہاں ایک بات اور یاد آگئی۔ جناح کے پاس جائیں۔ ان سے ملاقات کرکے مجھے لکھیں کہ وہ کیسے ہیں۔ میں اپنے آپ کو جان بوجھ کر مصروف رکھنے اور پریشان کرنے کے لئے ان کے پاس موجود نہیں ہوں گی تو ان کی حالت پہلے سے بھی بری ہوجائے گی۔''

مریم جناح نے لندن سے واپسی پر محمد علی جناح پر زیادہ توجہ دینا شروع کردی۔ 1923ء میں جب وہ قانون ساز کونسل کے انتخابات میں حصہ لے رہے تھے تو اس میں ان کے ساتھ ساتھ تھیں اور جب بھی موقع ملتا آزادی کی امنگ کا اظہار بھی کرتی تھیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ ہے کہ دہلی میں لارڈ چم فورڈ کی دعوت میں عمائدین ملک موجود تھے جن میں مسٹر اینڈ مسز جناح بھی تھے۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب وائسرائے اور وائسرائن کی ضیافت میں آمد کا اعلان ہوتا تو سب باادب کھڑے ہوجاتے۔ وائسرائے اور وائسرائن ایک طرف کھڑے ہوجاتے۔ تمام مہمان مرد اور خواتین باری باری اپنے میزبانوں کے سامنے آتے اور جھک کر آداب بجالاتے جیسے بادشاہوں کے آداب بجالانے کا طریقہ ہے۔ جب مریم جناح کی باری آئی تو انہوں نے جھک کر آداب بجالانے کی بجائے سلام کیا۔ جس طرح ہم پلہ لوگوں کو کیا جاتا ہے۔ وائسرائے اور وائسرائن کے چہرے کانوں تک بدل گئے۔ اے ڈی سی پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اس وقت وائسرائے بات پی گئے۔ مہمان کھانے میں مشغول ہوگئے تو وائسرائے نے مریم جناح کو بلایا اور کہنے لگے مسز جناح آپ کے خاوند بڑے قابل ہیں۔ اُن کے سامنے بڑا شاندار مستقبل ہے۔ آپ کا طرز عمل مزید شاندار بنا سکتا ہے یا اس کو گھٹا سکتا ہے۔ سو آپ کو اپنے خاوند کے مستقبل کا خیال رکھنا چاہئے۔ وائسرائے نے مزید کہا کہ ایک کہاوت ہے کہ اگر آپ روم ہیں تو روم والوں کا طریقہ اپنائیں۔ آپ وائسرائن کی لائن میں آئی ہیں تو آپ کو یہاں کا مروجہ طریقہ اپنانا چاہئے۔ جس پر مریم جناح گویا ہوئیں'' میں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو مجھے اختیار کرنا چاہئے۔ آپ ہندوستان میں ہیں سو میں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو یہاں کی خواتین ملنے جلنے پر بجالاتی ہیں۔''

بعدازاں جب لارڈ ریڈنگ وائسرائے بنے تو انہوں نے کوشش کی کہ مسٹر جناح کو سر کا خطاب دیں یا پھر جج یا ایگزیکٹیو کونسل کا ممبر بنا دیں مگر محمد علی جناح نے انکار کردیا جس پر لارڈ ریڈنگ نے مریم جناح سے کہا اگر آپ لیڈی سر جناح ہوجائیں تو کیسا رہے گا۔ اس عظیم آزادی پسند خاتون نے جواب دیا ''اگر میرے شوہر سر جناح ہوجائیں تو میں مسز جناح رہنا پسند نہیں کروں گی۔''

اس طرح ایک دعوت میں مریم جناح اتفاق سے لارڈ ریڈنگ کے پاس بیٹھی

تھیں کہ ریڈنگ نے اپنے ماضی کے ایام کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ سوچ کر کتنا دکھ ہوتا ہے کہ میں اب قوانین کے باوجود جرمنی نہیں جا سکتا۔ آخر کیوں یور ایکسی لینسی؟'' وائس رائے نے مزید کہا ''جرمنی کے لوگ جنگ کے بعد ہمیں ناپسند کرتے ہیں۔''

جس پر مریم جناح نے فوراً کہا ''تو یور ایکسی لینسی! پھر آپ ہندوستان کیسے آ گئے؟''

مریم جناح زندہ دل، جانوروں سے محبت کرنے والی اور کتابوں کی رسیا خاتون تھیں مگر اس کے باوجود محمد علی جناح کی دلچسپی اور توجہ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنی تمام فطری خوبیوں اور صلاحیتوں سے کام لیا۔ محمد علی جناح وکالت کے ساتھ ساتھ قومی کاموں میں بھرپور دلچسپی لیتے۔ محمد علی جناح کی مصروفیات کے باعث اور مریم جناح کی فلسفہ دین میں دلچسپی کے باعث دینا گھر میں نانی کی نگرانی میں رہتی۔ چھ سال کی عمر میں اسے بمبئی کے کانوینٹ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے گورنس کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ کانجی دوارکا داس نے مشورہ دیا کہ اسے مسز اینی بیسنٹ کے تھیوسوفیکل اسکول میں داخل کرا دیا جائے مگر محمد علی جناح نے اس کی اجازت نہ دی۔

1926ء میں محمد علی جناح اور مریم جناح اکٹھے لندن، پیرس، کینیڈا اور امریکہ کے دورے پر گئے۔ یہ چار ماہ کا دورہ تھا جو سینڈ ہرسٹ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے دیگر دو ممبران کے ہمراہ کیا۔ مقصد ہندوستان میں ملٹی کالج کے قیام کے لیے جائزہ لینا تھا۔ اس دورے پر روانگی سے قبل مریم نے اپنے فیملی دوست کانجی دوارکا داس کو خط لکھا اور خوبصورت نیلم تحفہ میں دیا۔ محمد علی جناح اور مریم اگست میں واپس آ گئے اور آ کر بتایا کہ محمد علی جناح ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے اور تعویذ گنڈے کا مذاق اڑاتے تھے۔

محمد علی جناح کی مصروفیات بہت بڑھ چکی تھیں آل انڈیا مسلم لیگ سائمن کمیشن پر شفیع لیگ اور جناح لیگ میں تقسیم ہو گئی۔ ان کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی اور گھر پر وقت دینے کے لئے نہ تھا۔ ادھر مریم جناح کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی اور ان کے فطری جذبے جوان تھے۔ اپنے شوہر کی طرف سے کم وقت ملنے پر تنہائی کا احساس رہنے لگا۔ اس کا سبب عمروں کا واضح فرق تھا۔ اس دور کے بارے میں محمد علی جناح کے ایک قانونی معاون کی روایت ہے۔ ''مزاج کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے کی ضد تھے۔ جناح ہر روز اپنے مقدمات کی تیاری میں کھوئے رہتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار چیمبر میں کوئی کانفرنس کر رہے تھے۔ اس دوران رتی (مریم) اندر آئی۔ وہ اپنے طریقے سے خوب بنی ہوئی تھی جسے جدید معیار کے لحاظ سے بہت آگے کہا جا سکتا ہے۔ وہ جناح کی میز پر جھک گئی۔ اپنے پاؤں ہلانے لگی اور بے چینی سے کانفرنس ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی تاکہ اکٹھے گھر جا سکیں۔ جناح نے اُف تک نہ کی اور بدستور اپنے کام میں لگے رہے جیسے سرے سے وہاں کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ اس نے ابھی تک بھوتوں کی دنیا میں رہنا نہیں سیکھا تھا۔ رتی (مریم) جو کسی زمانے میں باپ کی کل کائنات تھی اس دنیا سے نکالے جانے

کے بعد شوہر سے اس کے مطالبات دوگنا ہو گئے تھے۔" قائد کی زیادہ توجہ وکالت اور قومی مسائل پر تھی۔ رات گئے تک دوستوں سے نشست کرتے۔ ان میں ہوم رول لیگ کے سکریٹری جمنا داس، دوارکاداس کانجی اور ایک پرانے رفیق بیرسٹر تھے۔ دوارکاداس سماجی بہبود کے کاموں میں حصہ لیتا تھا۔ محمد علی جناح اس کی معاونت کرتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

مریم جناح نے بہت سی بلیاں پال رکھی تھیں۔ وہ جانوروں سے بہت محبت کرتی تھیں اور ساتھ ہی اپاہج جانوروں کے ادارے میں دلچسپی لیتی تھیں۔ دوارکاداس کانجی اور مریم جناح اس قدر مشترک کے حوالے سے مقاصد کی یکسانیت رکھتے تھے۔ دوارکاداس کانجی نے بازار حسن میں رہنے والی خواتین پر تحقیق کی اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا پوری طرح کھوج لگایا۔ پھر محمد علی جناح اور دوارکاداس کانجی نے مل کر ان مظالم کے خلاف تحریک چلائی اور اسی تحریک کے نتیجے میں 1927ء میں ایک ضابطہ بنا جس کی رو سے اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں اور بچیوں کو غیر صحت مند ماحول سے نکالنا ممکن ہو سکا۔ مریم جناح تنہائی اور اپنی خواہشات کی تکمیل نہ ہونے پر روحانی مظاہروں کی طرف مائل ہو گئیں اور جے کرشنا مورتی اور دوارکاداس کانجی جو روحانی عملیات کے ماہر اور علم رکھتے تھے کے زیر اثر آنا شروع ہو چکی تھیں۔ وہ کانجی سے رہنمائی لیتیں۔ یوں ان دونوں میں ملاقاتیں بڑھ گئیں۔

مریم جناح نے بہت کوشش کی کہ ان کے شوہر مسٹر جناح بھی ان باتوں میں دلچسپی لیں۔ اسی حوالے سے وہ دوارکاداس کانجی کو اپنے خط میں تحریر کرتی ہیں:

"میں آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر جناح کی توجہ اس جانب مبذول کرا رہی ہوں، کبھی دھونس اور کبھی بہلا پھسلا کر اسے کتاب پڑھ کر سناتی ہوں، جناح کی صلح پسند روح کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ غیر معمولی اور ناقابل تردید ہے۔ یہ کہانی ایک غریب باورچن کے گرد گھومتی ہے جسے لندن سے پھانس کر بوسکوب لے جایا گیا اور وہاں قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کی تفصیلات بڑی ہولناک ہیں۔ یہ جرم شہوت پرستی کے تحت کیا گیا۔ مجرم کی ہوشیاری و چالاکی نے پولیس کو چکر میں ڈال دیا اور وہ بدحواس ہو گئی تھی۔ آپ یقین کر سکتے ہیں کہ انہوں نے حلقہ حاضرات پر قابو پانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بہرحال انہوں نے مطلوبہ سراغ لگا لیا۔ شہادت اس نوعیت کی تھی کہ بدقسمت شخص کو پھانسی ہو گئی۔ جناح اس مقدمہ میں کوئی سقم نہیں پا سکے۔"

مریم جناح کا اب زیادہ وقت کتوں، بلیوں کی نگہداشت اور روحانی علوم کے مطالعہ میں گزرتا کیونکہ دینا اسکول جانا شروع ہو چکی تھی۔ واپسی پر اپنی سہیلیوں کی طرف جاتی۔ ان ہی ایام میں ایک روز مریم جناح اپنے کپڑوں کے لیے ایک دکان پر آئیں۔ جب وہ باہر نکل رہی تھیں تو ایک مراٹھن خاتون ان کی طرف بڑھی۔ اس کے سر پر پھلوں کی ٹوکری تھی۔ اس نے ٹوکری دوکان کے سامنے فٹ پاتھ پر رکھ دی اور مریم سے کچھ خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس دوران ایک پولیس آفیسر آ گیا اور امراء کے علاقے میں بھکارن نما خاتون کو دیکھ کر گالیاں دینے لگا اور ٹوکری کو ٹھوکر مار دی جس

سے سڑک پر پھل بکھر گئے۔ مریم جناح اس منظر کو دیکھ کر غصہ میں آ گئیں اور پولیس آفیسر سے مخاطب ہو کر کہا ''تم کو لوگوں سے ایسے سلوک کا ہرگز حق نہیں ہے۔ مناسب یہی ہے کہ پھل اٹھاؤ اور اکٹھے کر کے بوڑھی عورت کو دو تا کہ وہ چلی جائے ورنہ تم کو شرمندگی ہوگی۔'' پولیس آفیسر مریم کے تحکمانہ لہجہ سے ڈر گیا اور پھل اکٹھے کر کے ٹوکری میں رکھے۔ مریم جناح نے اس بوڑھی عورت کو پانچ روپے دیئے اور رخصت کر دیا۔

اگست 1927ء میں مریم جناح اپنے شوہر کے ہمراہ شملہ میں تھیں جہاں قانون ساز کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہی کلکتہ گئے جہاں جنوری 1928ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کلکتہ سے واپس بمبئی آنے پر دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔ مریم جناح ماؤنٹ پلیزنٹ والا گھر چھوڑ کر تاج محل ہوٹل میں رہنے لگیں۔ ہوٹل میں ان کے ہمراہ ذاتی خادمہ اور ان کی پالتو بلیاں تھیں۔ انہوں نے محمد علی جناح کو آئیڈیل کے طور پر قبول کیا تھا مگر اب ان کی سیاسی مصروفیات ان کی خانگی زندگی پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ محمد علی جناح کو اس بات کا احساس تھا مگر مسلمانان ہند کے مفاد میں ان کا قومی و سیاسی سرگرمیوں سے الگ رہنا ممکن نہ تھا۔ ان دنوں انہوں نے اپنے ایک دوست سے کہا:

''یہ میرا قصور ہے۔ ہم دونوں کو افہام و تفہیم کی ضرورت ہے۔ جس کا مظاہرہ ہم نہیں کر رہے۔''

مریم جناح اپنے خاندان سے پہلے ہی کٹی ہوئی تھیں ادھر محمد علی جناح بھی وقت نہیں دے پا رہے تھے لیکن ان کی محبت پہلے روز جیسی تھی۔

اب مریم جناح وقت گزارنے کی تدبیریں کرتیں۔ اس کیفیت میں مریم خوابوں کی دنیا میں رہنے لگیں اور روحانی دنیا کی متلاشی تھیں۔ جہاں تک محمد علی جناح اور مریم کی علاحدگی کا تعلق ہے اس حوالے سے دوارکا داس کانجی کہتے ہیں:

''میں ان کی علاحدگی کے لئے کسی اور کو قصوروار نہیں ٹھہراتا جو ان کے مزاجوں کے اختلاف اور عمروں کے فرق کے باعث عمل میں آئی۔ میرے ذاتی علم میں ہے کہ آج بھی رتی کے دل میں جناح کی محبت موجود ہے۔''

یہ تاثر ان ایام کا ہے جب مریم جناح تاج محل ہوٹل میں قیام پذیر تھیں۔ ان دنوں ایک پارسی دوست نے مصالحت کی کاوش کی۔ وہ دوست تاج محل ہوٹل گئے اور مریم سے کہا ''اگر آپ الگ رہیں تو جناح کے سیاسی کیریئر کو نقصان پہنچے گا۔ مریم نے جواب دیا ''اگر مجھے یقین ہو کہ وہاں مجھے خوش آمدید کہا جائے گا تو میں واپس جانے کے لئے تیار ہوں۔'' پھر وہ دوست محمد علی جناح کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ میں ایک ذاتی بات کرنا چاہتا ہوں۔ جناح نے پوچھا ''اپنی یا میری ذات سے متعلق''۔ دوست نے جواب دیا ''آپ کے متعلق''۔ جس پر محمد علی جناح نے جواب دیا ''مجھے اس موضوع پر بات نہیں کرنی۔ یہ باب بند ہو چکا ہے۔'' یہ مریم جناح کے گھر چھوڑ کر چلے جانے پر خاموش ردعمل تھا۔

مریم جناح کی صحت خراب رہنے لگی۔ کبھی ذہنی دباؤ اور اعصابی تناؤ

کے باعث دورے پڑتے۔ ان کے مزاج میں تلخی آگئی۔ کبھی بے ہوش ہو جاتیں۔ ادھر محمد علی جناح سائمن کمیشن کی آمد کے باعث مسلسل مصروف تھے کہ انہی ایام میں اپریل 1928ء میں مریم تبدیلی آب و ہوا کے لئے اپنی والدہ کے ہمراہ پیرس روانہ ہوگئیں۔

ایک ماہ بعد مئی 1928ء میں محمد علی جناح، سری نواز آئنگر اور دیوان چمن لال انگلینڈ کے لئے روانہ ہوئے۔ چمن لال جنیوا میں آئی ایل او کے اجلاس میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ اس سفر کا حال دیوان چمن لال نے اس طرح بیان کیا ہے: ''جناح دنیا کے تنہا ترین انسان لگ رہے تھے۔ وہ شدید مایوسی کے عالم میں تھے۔''

انگلینڈ پہنچ کر محمد علی جناح نے لارڈ ریڈنگ، سر میکڈونلڈ اور پرانے لبرل ساتھیوں سے ملاقات کی اور ڈبلن، آئر لینڈ چلے گئے جب کہ چمن لال جنیوا سے پیرس چلا گیا جہاں اسے معلوم ہوا کہ مریم جناح ہسپتال میں ہیں۔ وہ کیپ ایلسی کلینک پہنچے۔ دیوان چمن لال تحریر کرتے ہیں:

''میں فوراً ہسپتال گیا۔ میں ہمیشہ سے رتن کا قدرداں رہا ہوں آج دنیا میں کوئی ایک خاتون بھی ایسی نہیں جو حسن و دلیری میں اس کے سامنے اپنا چراغ جلا سکے۔ وہ بنیادی طور پر لاڈ پیار کی بگڑی ہوئی ایک بچی تھی اور جناح اس کو سمجھنے کے لئے بنیادی طور پر نا قابل تھے۔ وہ بستر میں تھی اور اسے ایک سو چھ درجے کا بخار تھا۔ مشکل سے حرکت کر سکتی تھی۔ پھر بھی ایک کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کتاب مجھے دی اور کہا ''مجھے پڑھ کر سناؤ''۔ میں نے کتاب اس سے لے لی۔ یہ آسکر وائلڈ کی نظموں کا مجموعہ تھا۔ رتن نے نہایت دھیمے لہجے میں اپنی بات دہراتے ہوئے کہا ''چمن! مجھے پڑھ کر سناؤ۔'' چنانچہ میں پڑھنے لگا۔ جب میں اس آخری شعر پر پہنچا۔ اور اس لمبی گلی کے اندر صبح اپنی پہلی روشنی اور سینڈلوں والے پاؤں کے ساتھ ایک خوفزدہ لڑکی کی طرح چپکے سے داخل ہوئی۔'' تو میں نے دیکھا کہ رتن سکتے میں ہے۔ میں دوڑ کر باہر آیا اور ڈاکٹرز کو اپنے ساتھ لایا۔

چمن لال نے پیرس سے ڈبلن (آئر لینڈ) فون کیا اور محمد علی جناح کو مطلع کیا۔ محمد علی جناح فوراً پیرس پہنچے اور چمن لال جو جارج پنجم ہوٹل میں مقیم تھے کے پاس جا کر کہا۔ آیئے۔ ہمیں رتی کی جان بچانا ہے۔'' جناح تقریباً تین گھنٹے ہسپتال میں رہے جبکہ چمن لال باہر کافی شاپ پر بیٹھے رہے۔ محمد علی جناح نے مریم کی تشویشناک حالت کے پیش نظر ایک اور کلینک کا بندوبست کیا اور ان کے لئے نیا میڈیکل ایڈوائزر چنا۔ مریم کی والدہ سے بات کی۔ محمد علی جناح جب واپس آئے تو ان کے چہرے سے بے چینی کے آثار ختم ہو چکے تھے۔ ڈاکٹرز اور کلینک بدل دیا گیا۔ مریم اب صحت یاب ہونے لگیں۔ دیوان چمن لال پیرس سے لندن آگیا اور اسے یقین تھا کہ دونوں میں صلح ہوگئی۔

دیوان چمن لال لکھتے ہیں:

''میں چند ہفتوں بعد دوبارہ پیرس آیا اور ایک دن مسز جناح کے ساتھ گزارا اور میں اس بات پر حیران ہوا کہ وہ تنہا کیوں ہیں۔ شام کے وقت میں نے ان سے پوچھا رتن کہاں ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہمارا جھگڑا ہوگیا

تھا۔ وہ واپس بمبئی چلی گئی ہے۔ یہ بات انہوں نے اس فیصلہ کن انداز میں کہی کہ مزید مجھے بات کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

مریم واپس آکر بھائی کے ہاں مقیم ہوئیں جب کہ محمد علی جناح اگست میں واپس آئے اور مریم کو دیکھنے گئے۔ ہیکٹر بولتھیو کے مطابق وہ تاج محل ہوٹل میں مقیم ہوئیں۔ مریم صرف دوارکا داس کانجی سے کچھ بات کرتی اور بہت کم باہر نکلتی تھیں۔ اختلافات کم نہ ہوئے تاہم محمد علی جناح سے ان کی محبت بھی کم نہ ہوئی جیسا کہ 28 اکتوبر 1928ء کو محمد علی جناح کے نام خط میں لکھا:

''ڈارلنگ مجھے تم سے محبت ہے...... شاید میں نے تم سے قدرے کم محبت کی۔ مجھے تمہارے ساتھ رہنا چاہئے تھا۔ مائی ڈارلنگ...... میں نے تم سے اتنی محبت کی کہ کم ہی قابل محبت مردوں سے ویسی محبت کی جاتی ہے۔ میں التجا کرتی ہوں کہ ہمارا المیہ جو محبت سے شروع ہوا، محبت کے ساتھ ختم ہو۔

ڈارلنگ! گڈ نائٹ اینڈ گڈ بائی۔''

اب محمد علی جناح روزانہ ملنے جاتے۔ اختلافات کم ہونے لگے مگر کینسر کی وجہ سے مریم کی صحت روز بروز گر رہی تھی۔ غشی کے دورے پڑتے۔ محمد علی جناح دیر تک ان کے پاس رہتے۔ اس دوران محمد علی جناح کو متحدہ جماعتوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے کلکتہ اور پھر بجٹ اجلاس میں دہلی جانا پڑا۔ ایک روز دیوان چمن لال ویسٹرن کورٹ دہلی میں محمد علی جناح سے باتیں کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے کوئی کہہ رہا تھا کہ مسٹر جناح سے بات کراؤ۔ چمن لال نے ریسیور انہیں دے دیا۔

فون سننے کے بعد انہوں نے آہستہ سے کہا'' یہ ٹیلی فون کال میرے سسر کی تھی جنہوں نے شادی کے بعد مجھ سے پہلی بار بات کی ہے۔ رتی شدید بیمار ہے۔ میں آج رات روانہ ہو رہا ہوں۔'' محمد علی جناح تیز رفتار ٹرین سے بمبئی پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

19 فروری کو غشی کا شدید دورہ پڑا اور 20 فروری 1928ء کو مریم اپنی 29 ویں سالگرہ پر اس دنیا کو چھوڑ گئی۔ محمد علی جناح اپنی رفیقہ حیات کی رحلت پر بہت غمزدہ تھے اور اپنے جذبات پر قابو پا کر ان کی آخری رسومات تدفین میں شریک ہوئے۔

رتن (مریم) کو بمبئی کے شیعہ قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ محمد علی جناح نے سب سے پہلے اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی۔ دفناتے وقت ان کا جذبات پر قابو ختم ہوگیا اور وہ بلک بلک کر روئے۔ انہوں نے اس صدمے کو شدت سے محسوس کیا۔ دوارکا داس کانجی جو محمد علی جناح سے اسٹیشن پر آملے تھے اور راستے میں قائل کرنے کی کوشش کی کہ رتی لاش جلانے کے حق میں تھی مگر محمد علی جناح نے ان کی نہ سنی اور اسلامی طریقہ سے تدفین کی۔ دفن کرتے وقت مسٹر ایم سی چھاگلہ بھی موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں'' واقعی ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے جناح کو اس قسم کی انسانی کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔'' انگلستان کا ایک نوجوان طالب علم مسٹر جناح جن ایام میں شیکسپیئر کے ڈرامے رومیو جولیٹ کے دورے سے گزر رہا تھا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی محبت کا انجام اس قدر دردناک ہوگا۔

کانجی دوارکاداس کہتے ہیں:

''تدفین کے بعد میری ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی جو دو گھنٹے تک جاری رہی۔ انہوں نے اپنا دل نکال کر باہر رکھ دیا۔ میں نے ایسا غمزدہ انسان نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ اور رنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔''

تمام اخبارات نے مریم جناح کے انتقال کی خبر نمایاں طور پر شائع کی مگر ماہنامہ تبلیغ نسواں فروری 1929ء میں خواجہ حسن نظامی نے مریم کے انتقال کا ذکر اس طرح کیا:

''نہایت قابل افسوس اور غمگین کرنے والی خبر آئی کہ بمبئی میں بیگم جناح کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم پارسی فرقہ کے ایک کروڑپتی خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ ہندوستان کی بے پردہ خواتین میں سے سب سے زیادہ خوبصورت مانی جاتی تھیں۔ انہوں نے بیرسٹر جناح سے شادی کی تھی اور شادی سے قبل مسلمان ہوگئی تھیں۔ ان کی تربیت اعلیٰ درجے کی ہوئی تھی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے شوہر و والدین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔''

محمد علی جناح ایک انتہائی خوددار، باوقار اور محبت کرنے والے شوہر تھے مگر داماد اور سسر میں تعلق نہ ہونے کے سبب کوئی غلط فہمیاں کم کرنے والا نہ تھا۔ دینا جناح جو اپنی والدہ کی طرح اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی، محمد علی جناح کو بہت پیاری تھی۔ محمد علی جناح نے اس کے لئے تعلیم کا اعلیٰ انتظام کیا مگر ننھیال کے باعث اس پر پارسی رنگ غالب آگیا۔ جب دینا نے نوجوان ہو کر اپنے عظیم باپ کی مرضی کے برعکس نیول واڈیا سے شادی کی تو محمد علی جناح کو شدید دھچکا لگا اور کچھ روز گم سم رہے اور سگار پر سگار لیتے رہے۔ محمد علی جناح نے بیٹی کے اس قصور کو کبھی معاف نہیں کیا اور ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کرلیا اور پھر ایک ہی دفعہ ملاقات ہوئی۔ 11 ستمبر 1948ء کو جب باپ کی نظریں دیکھنے سے انکار کرچکی تھیں اور دینا باپ کی میت کے قریب کھڑی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ محمد علی جناح نے رتن کا اسلامی نام مریم رکھا پھر شادی کی۔ جب بیٹی نے غیر مسلم سے ناطہ جوڑا تو اس سے رشتہ توڑ لیا۔

محمد علی جناح کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ''قیام پاکستان کے موقع پر جس روز محمد علی جناح پاکستان روانہ ہوئے تو اس صبح تنہائی میں خاموشی کے ساتھ صبح کی پہلی روشنی میں بمبئی کے ایک مسلم قبرستان میں واقع پتھر کی ایک قبر کی طرف گئے اور اشارتی عمل (دعا) کیا جو آنے والے دنوں میں ان لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کو اس کارنامے کی وجہ سے کرنا پڑا جو انہوں نے سر انجام دیا۔ پاکستان روانہ ہونے سے قبل اس قبر پر آخری بار پھولوں کا ہار چڑھایا جسے وہ ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کے آرہے تھے۔ یہ قبر ان کی اہلیہ مریم (رتی) کی تھی۔''

اگرچہ اختلاف کی حقیقی وجوہ تو ہمیشہ راز ہی رہیں گی مگر قرین قیاس یہ ہے کہ عمروں کے فرق اور مزاج کے اعتبار سے دونوں کی پسند و ناپسند کے معیار الگ الگ تھے اور یہی علاحدگی کے اسباب بنے۔ محمد علی جناح کے سامنے ایک مقصد تھا جب کہ مریم نوعمر، تفریح کی شوقین اور بھرپور زندگی کی خواہش مند تھیں۔ محمد علی جناح کی اصل معروفیات تو حصول آزادی کی خاطر سیاسی

جدوجہد کے ایک واضح نصب العین سے ہو چکی تھی اور اس عظیم سیاسی جیلہ کے مقابل ان کے جنسی احساسات پیچھے رہ گئے۔ وہ مریم کی وفات کے بعد تمام عمر تجرد سے رہے۔

محمد علی جناح کی زندگی کا یہ المناک اور کربناک لمحہ تھا جب وہ پاکستان آنے سے قبل آخری بار اپنی محبوبہ اہلیہ کی قبر پر خدا حافظ کہنے گئے۔ وہ روئے بھی ہوں گے اور کہا ہوگا ''اے میری رفیقہ حیات! دیکھو آج میں نے اپنی جدوجہد کا ثمر پاکستان حاصل کرلیا ہے۔ اگر تمہارے ساتھ محبت میں کچھ غفلت ہوئی ہو تو معاف کردینا''۔ محمد علی جناح کئی بار ٹوٹے، سنبھلے اور ان کے درد سگریٹ کے دھویں بن کر فضا میں تحلیل ہوتے رہے۔ مریم جناح نے ابتداء میں قائد کے سفر میں ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک عظیم خاتون تھیں مگر ان کی زندگی نے ان کا ساتھ نہ دیا اور یوں قائد اپنی ازدواجی زندگی سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ اہلیہ کی جدائی کا قلق انہیں شدید تھا اور اس زخم نے انہیں توڑ دیا مگر وہ عزم و ہمت کا پہاڑ بن کر قیام پاکستان کے لئے وقف رہے۔ وہ رتی کی جدائی کا صدمہ کبھی فراموش نہ کر سکے جب کہ بیٹی کی علاحدگی کا صدمہ مزید تکلیف دہ تھا۔ بی الانہ کہتے ہیں:

''محمد علی جناح اس صدمے کو زندگی بھر فراموش نہ کر سکے۔ وہ مریم کے انتقال اور دینا کی شادی کے بعد رات کے پچھلے پہر صندوق کھول کر ان کے کپڑے اور استعمال کی اشیاء دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے مگر انہوں نے اپنے اس غم کا کبھی اظہار نہ کیا۔''

مریم جناح تحریک آزادی کے ہیروز میں سے ہیں۔ انہوں نے بیگم جناح کی حیثیت سے بھی محمد علی جناح کے معاون کا کردار ادا کیا مگر افسوس کہ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ مریم جناح کی آخری آرام گاہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ مظہر ایم جتوئی نے قریب تین سال قبل ان کی قبر پر حاضری دی جس کی روداد ڈان 21 دسمبر 2009ء سنڈے میگزین میں شائع ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں۔

''قبرستان کا خادم مجھے قبروں اور ان کی سنگی تختیوں کی بھول بھلیوں میں گزار کر رتی کی قبر پر لے گیا۔ سال خوردہ سنگ مرمر کی تقریباً چار فٹ اونچی لحد کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ ایک سوال پر اس نے بتایا کہ یہاں زیادہ لوگ نہیں آتے۔ پاکستان سے آنے والے یا کبھی کبھار کوئی مقامی ادھر آنکلتا ہے۔ دور نزدیک کا کوئی رشتہ دار نہیں آتا۔ ان میں کئی پارسی برادری کے خوشحال اور صنعت کار لوگ شامل ہیں۔ دینا کی واڈیا فیملی میں شادی ہوئی تھی اور ان سے محمد علی جناح کا نواسہ سانیس بمبئی میں مقیم ہے۔

مریم جناح کی سنگ مرمر کی لحد پر پھول دار بیلیں کندہ ہیں۔ مستطیل لحد کے چھوٹے چھوٹے ستون آج بھی اس لئے نمایاں ہیں کہ اردگرد کی پرانی قبریں بہت ہی خستہ حالت میں ہیں۔ قبر کی لوح پر یہ عبارت کندہ ہے۔ ''رتن بائی محمد علی جناح...... پیدائش 20 فروری 1900ء وفات 20 فروری 1929ء''۔

یہ کتبہ انگریزی اور گجراتی زبان میں ہے۔ محمد علی جناح نے ان کی وفات کے بعد اٹھارہ برس بمبئی میں گزارے۔ ان کا معمول تھا کہ بمبئی میں ہونے کی صورت میں وہ جمعرات اپنی اہلیہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جاتے۔

دلچسپ اتفاق ہے کہ جناح کا پاکستان بھی اس روز یعنی دینا کی پیدائش کے ٹھیک 28 سال بعد معرض وجود میں آیا۔ دینا اپنے والد کی چہیتی تھی، والدین کی پیاری تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اسکول کے ہاسٹل میں رہتی تھی۔ اس طرح والدین کے ساتھ بہت کم وقت گزارنے کا موقع ملا۔ شکل وصورت واجبی جب کہ مسکراہٹ ماں کی طرح تھی۔ محمد علی جناح اس کی تربیت اسلامی تعلیمات کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بہن فاطمہ جناح سے کہا کہ وہ دینا کو قرآن پاک اور دین کی تعلیمات دیا کریں۔ محمد علی جناح کے لیے وہ سخت مشکل مقام تھا جب دینا نے ایک غیر مسلم کے ساتھ شادی کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس وقت جناح کے ایک معاون محمد علی چھاگلا کے مطابق جناح اس فیصلے کے سخت مخالف تھے۔ اس موقع پر انہوں نے دینا سے کہا کہ ہندوستان میں لاکھوں مسلمان لڑکے ہیں۔ شادی کے لئے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرسکتی ہے۔ اس پر دینا نے کہا کہ انڈیا میں لاکھوں مسلمان لڑکیاں موجود تھیں پھر آپ نے ایک غیر مسلم (رتی) کا انتخاب کیوں کیا؟ جناح نے جواب میں کہا کہ وہ مسلمان ہوگئی تھی۔ مگر دینا نے والد کی خواہش اور مرضی کے برعکس ایک انڈین پارسی نوجوان نیویل واڈیا کے ساتھ شادی کرلی۔ جب جناح کو پتہ چلا تو انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ آج سے ان کی بیٹی نہیں ہے۔ اور زندگی میں ہی بیٹی کو عاق کردیا۔ جناح جو کہتے تھے کر دکھاتے تھے۔ انہوں نے جذباتی جملہ نہیں کہا تھا بلکہ ایسا کر دکھایا۔ جب تک زندہ رہے بیٹی کی شکل نہ دیکھی۔ دینا کو جناح نے عاق کردیا تھا اگر وہ کبھی خط لکھتیں تو جوابی خط میں جناح انہیں مسز واڈیا کہہ کر مخاطب کرتے۔ دینا نے شادی کے بعد پہلی اور آخری بار باپ کو کفن میں لپٹے ہوئے دیکھا جب انہیں دفن کیا جارہا تھا۔ یوں جناح پاک سرزمین پر ابدی نیند سوگئے۔ جب کہ دینا اپنے شوہر کے ساتھ بمبئی میں رہائش پذیر ہوگئیں۔ ان کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے جو بمبئی کی کامیاب اور معروف کاروباری شخصیتیں ہیں۔ جب کہ دینا کے دو پوتے بھی ہیں اور دینا آج کل نیویارک میں قیام پذیر ہیں۔ مارچ 2004ء میں دینا نے پاکستانی کرکٹ کنٹرول بورڈ کی دعوت پر اس شرط کے ساتھ پاکستان کا دورہ کیا تھا کہ انہیں میڈیا اور عوام سے دور رکھا جائے گا۔ ان کا یہ دورۂ پاکستان جس کے بانی ان کے والد تھے۔ ایک غیر ملکی شہری کی حیثیت سے تھا۔ انہوں نے اپنے والد کی قبر پر حاضری دی اور روزیٹر بک میں لکھا کہ ''میرا یہ وزٹ اداس مگر بھرپور رہا۔''

دینا جناح اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہیں کہ ان کی شادی کے بعد 1946ء میں اپنے والد محمد علی جناح سے بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ وہ میرے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور نسلی واڈیا کو جناح کیپ دی۔ دینا میڈیا سے دور ہی ہیں تاہم کچھ عرصہ قبل ان کا نام بھارتی میڈیا میں اس وقت سنا گیا جب انہوں نے ہندوستانی وزیر اعظم کو خط لکھا کہ وہ جناح کی حقیقی وارث ہیں اور بمبئی کا مالا بار ہاؤس ان کی ملکیت ہے۔ محمد علی جناح جب انگلستان سے واپس آئے اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تو اپنی رہائش بمبئی میں اختیار کی جہاں ایک عالی شان بنگلہ تعمیر کرایا جو ڈھائی ایکڑ پر مشتمل تھا اور اس زمانے میں اس کی تعمیر پر دو لاکھ روپے کی رقم صرف ہوئی تھی جو آج تقریباً پانچ ارب

سے زائد کی ملکیت کا ہے۔ حکومت پاکستان نے بھی اس مالا بار ہاؤس کا کلیم کیا تھا مگر ہندوستان کی حکومت نے مسترد کر دیا۔ پاکستان یہاں پر اپنا سفارتخانہ قائم کرنا چاہتا تھا جب کہ دینا نے بھی جائیداد کی حقیقی وارث ہونے کے ناتے کلیم کیا مگر ہندوستان کی حکومت نے اسے بھی مسترد کر دیا۔

بمبئی ہائی کورٹ نے تحقیقات کے بعد فیصلہ دیا کہ جناح نے اسے زندگی میں ہی فاطمہ جناح کے نام کر دیا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد بھی یہ بنگلہ خالی پڑا رہا جس کی وجہ سے یہ حکومتی تحویل میں لے لیا گیا لہٰذا اب اس جگہ پر کسی رشتہ دار کا کوئی کلیم نہیں بنتا۔ محمد علی جناح ایک اصول پسند شخص تھے۔ جب دین اسلام کا معاملہ آیا تو انہوں نے بے دین رشتے کو زندگی سے ہی نہیں وراثت سے بھی خارج کر دیا۔ جناح کے وارث اب مسلمانان پاکستان ہیں، وہ پاکستان جس کے حصول کے لئے جناح نے دنیاوی رشتوں کو پس پشت ڈال کر اپنے خون جگر سے جنگ لڑی اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے۔ آج بھی پاکستانی ان کی روحانی اولاد ہیں۔

غرقاب

ف۔س۔اعجاز

ابھی اک نور سا پانی سے ابھرا تھا
چمک اٹھا تھا ساحل سرخوشی میں
اُچھلتی موج کی پازیب چھن سے بول اُٹھی تھی
یہ گوری پنڈلیاں لے کر یہاں سے کون گذرا تھا
چمکتی اور ٹھنڈی ریت پر پاؤں جمائے
کون آیا تھا
سمندر ایک اُجلے سے دوپٹے کی طرح اُڑ کر
سیہ شب میں
میری گردن سے آ کر اس طرح لپٹا
لگا تم ہو
ہیولیٰ کس کا تھا
میں کس سے باتیں کر رہا تھا؟
یہاں کتنے ہی پورے چاند
اپنے عکس لہرا کر
بدن مل کر نہائے ہیں
مگر ساحل کی گولائی میں
بکھری ریت پر
میں نے ہزاروں نام لکھ ڈالے
جنھیں موجوں نے چوما سُرخرو ہو کر
سمندر کا کبھی کچھ بھی نہیں بگڑا
اگر ڈوبا تو میں ڈوبا!۔

نہرو کے عشقیہ معاملات

پہلی وائسرائن جسے جواہر لال نہرو نے اپنا گرویدہ کیا لیڈی یوجینی ویول تھیں۔ مگر چونکہ وہ معمر، موٹی اور ماں جیسی تھیں اس لئے اس کا کوئی چرچا نہیں ہوا۔ ۲ رجولائی ۱۹۴۵ء کو ویول سے طویل گفتگو کے بعد جواہر لال ''کیو'' (Q)، آرچی جان اور عملہ کے دیگر لوگوں کے ساتھ چائے پینے کے لئے رک گئے تھے۔ وہ بھی لوگ ان کو پسند کرتے تھے۔ (ویول کے جرنل کے مطابق وہ اپنی بیوی کو ''کوئینی'' کہا کرتے تھے اس لئے کیو (Q) سے مراد لیڈی یوجینی ویول ہیں)۔ ویول کے زمانے میں نہرو وائسرائے کے محل میں کبھی کبھار تیراکی بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن سرگوشیاں صرف اس وقت شروع ہوئیں جب لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے بھی نہرو کے ساتھ تیراکی میں حصہ لینا شروع کیا۔ نہرو ماؤنٹ بیٹن جوڑے سے بہت زیادہ بے تکلف تھے اور ان کی ذاتی دوستی کے سلسلے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس لئے یہاں اس کو دہرانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی ہر شخص اس بڑے سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ایڈوینا اور جواہر لال کا رشتہ افلاطونی تھا یا نہیں؟ ماؤنٹ بیٹن کے پسندیدہ مصنف لاری کولنس اور ڈومینک لاپیئر اپنی کتاب ''فریڈم ایٹ مڈنائٹ'' (۱۹۷۶) میں اس معاملے کو جان بوجھ کر گول کر گئے ہیں حالانکہ دوسرے لوگوں کے تعلقات کا انہوں نے مزے لے لے کر ذکر کیا ہے۔ ایڈمیرل ماؤنٹ بیٹن کے مقرر کردہ سوانح نویس فلپ زیگلر نے اپنی معیاری کتاب ''ماؤنٹ بیٹن'' (۱۹۸۵) میں پردہ پوشی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے نہرو اور ایڈوینا کے تعلقات کے بارے میں بہت محتاط انداز میں لکھا ہے — ''نہرو کے ساتھ لیڈی ایڈوینا کا قریبی تعلق اس وقت شروع ہوا جب ماؤنٹ بیٹن جوڑا ہندوستان سے واپس جانے والا تھا''۔ زیگلر نے یہ اہم نکتہ اٹھایا ہے کہ اقتدار کی منتقلی کی سیاست ان کے نجی تعلقات سے برائے نام متاثر ہوئی تھی۔

زیگلر نے نہرو اور ایڈوینا کی دوستی کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی بیان کی ہے جو انہوں نے روسی مودی سے سنی تھی۔ روسی مودی سر ہومی مودی کے فرزند ہیں۔ سر ہومی مودی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک اتر پردیش کے گورنر رہے۔ روسی مودی ٹاٹا اسٹیل کی عظیم الشان تجارتی سلطنت کے طاقتور منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی شاندار انتظامی صلاحیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ روسی مودی کا کہنا ہے کہ اگرچہ وہ جواہر لال نہرو سے تین بار ملے تھے لیکن انہیں ان سے بات چیت کرنے کی سعادت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ پہلی ملاقات

اس وقت ہوئی جب نہرو اسٹیل فیکٹری دیکھنے کیلئے جمشید پور گئے۔ ایک جونیئر افسر کی حیثیت سے روسی مودی نہرو کا استقبال کرنے والے افسروں کی صف کے آخری سرے پر تھے اور جواہر لال نہرو خاموشی سے ان سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گئے تھے۔ ملاقات کا دوسرا موقع اسی روز کھانے کے وقت ملا۔ نہرو وی آئی پی میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور روسی مودی دیگر جونیئر افسروں کے ساتھ مہمانوں کو کھانا پیش کر رہے تھے۔ انہوں نے نہرو کے قریب جا کر پوچھا کہ کیا وہ مزید چکن (مرغی) لینا پسند کریں گے۔ نہرو نے جن کا منہ بھرا ہوا تھا، سر ہلا کر خاموشی سے ان کا شکریہ ادا کیا اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ملاقات کا تیسرا موقع نینی تال میں ملا۔ اس وقت روسی مودی کے والد سر ہومی مودی اتر پردیش کے گورنر تھے۔ وزیر اعظم نہرو مختصر چھٹی منانے پہاڑیوں پر گئے تھے۔ اور گورنر کے پاس ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سر ہومی وقت کے بڑے پابند تھے۔ رات کے آٹھ بجے انہوں نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی کہ وہ وزیر اعظم کے بیڈ روم میں جا کر کہہ دیں کہ ڈنر تیار ہے۔ روسی مودی نے (دستک دیئے بغیر) جب بیڈ روم کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ جواہر لال اور ایڈوینا ہم آغوش تھے۔ جواہر لال نہرو نے روسی مودی کو دیکھ کر منہ چڑھا دیا۔ روسی مودی جھٹ دروازہ بند کر کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر بھی دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ مگر ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم اور ہندوستان کی آخری وائسرائن جھٹ پٹ ڈنر کی میز پر پہنچ گئے۔

ماؤنٹ بیٹن جوڑے کے دہلی آنے سے پہلے ہی ان کی ازدواجی زندگی جھگڑے کا شکار ہو گئی تھی۔ دہلی میں کام کے بوجھ سے بھی اس صورتحال میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ علاوہ ازیں ایڈوینا کو شوق تھا کہ وائسرائن کی حیثیت سے وہ بھی اسی طرح سرگرم کار رہیں جس طرح وائسرائے کی حیثیت سے ان کے شوہر تھے۔ دونوں ہی کی خواہش تھی کہ وہ بہت اچھا نقش چھوڑ کر واپس جائیں۔ ہندوستان آنے کے بعد انہوں نے جو اولین کام کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے اپنے دسترخوان پر پیش کی جانے والی اشیاء خوردنی کی تعداد میں کمی کر دی کیوں کہ اس وقت ہندوستان قحط کی گرفت میں تھا۔ یہ ایک ایسا خیال تھا جو ویول کے قریب بھی نہیں پھٹکا تھا۔ انہوں نے اپنے مہمانوں کی فہرست میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھا دی۔ اپنے آنے کے دو ہفتہ کے اندر ہی انہوں نے ارونا آصف علی کو چائے پر مدعو کیا۔ ارونا آصف علی شدید طور پر برطانیہ مخالف تھیں اس لئے دعوت کی منظوری کے لئے گاندھی جی کو وسیلہ بنایا گیا۔ مگر ایڈوینا سے ملاقات ہوتے ہی دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ ماؤنٹ بیٹن جوڑے نے جناح کو بھی رجھانے کی کوشش کی مگر ابتدائی جواب ہی سرد مہری پر مبنی رہا۔ اس کے برعکس دونوں نے جواہر لال کو خوش کلام، گرمجوش اور نرم مزاج پایا۔ جواہر لال نہرو ماؤنٹ بیٹن جوڑے کی سیاسی سوجھ بوجھ اور شخصی احترام سے، جس کا مظاہرہ انہوں نے سنگاپور میں کیا تھا، کافی متاثر تھے۔ دہلی میں یہ تعلقات ایسی حقیقی دوستی میں تبدیل ہو گئے جس نے ہر قسم کے شکوک و شبہات کو جنم دیا۔ ان کے تعلقات کا بہترین ثبوت اس فوٹوگراف میں نمایاں ہے جسے ہنری کارٹیر بریسن نے ۱۹۴۸ء میں دہلی میں لیا

تھا۔ ماؤنٹ بیٹن سر سے پیر تک ایڈمیرل کے سفید یونیفارم میں بے حس و حرکت کھڑے ہیں جبکہ ان سے ایک قدم پیچھے جواہر لال اور ایڈوینا کسی باہمی مذاق پر زوردار قہقہہ لگا رہے ہیں۔ ایڈوینا کا قہقہہ برطانوی متانت میں کسی قدر لپٹا ہوا ہے مگر جواہر لال دل کھول کر ہنس رہے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے فطری طور پر جھک گئے ہیں مگر ان کی نظر برابر ایڈوینا کے چہرے پر جمی ہوئی ہے۔

یہ الزام بار بار دہرایا گیا ہے کہ دونوں کی دوستی سیاسی واقعات پر بھی اثر انداز ہوئی۔ یہ سلسلہ جناح نے شروع کیا۔ انہوں نے نجی اور عوامی طور پر کہا کہ ماؤنٹ بیٹن جوڑے کا جھکاؤ نہرو کی طرف ہے۔ کانگریس کے کچھ حلقوں سے بھی الزام لگایا گیا کہ معاملے کو جلد از جلد طے کر ڈالنے اور تقسیم کا سہل ترین راستہ اپنانے کے لئے نہرو اور ماؤنٹ بیٹن نے آپس میں سازش کر رکھی ہے تاکہ ڈھلتی عمر والے کانگریسی کچھ دن اقتدار میں گزار لیں۔ کم از کم کانگریس کی طرف سے ہونے والی مخالفت میں یقیناً کچھ حصہ مرد اور عورت کے تعلقات کے معاملے میں مغربی طرز عمل کی نزاکتوں کو سمجھنے سے محرومی کا بھی تھا۔ نہرو، گاندھی جی کی طرح لذت کشی کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ جنسی اخلاق کو نہیں مانتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کملا کے انتقال کے بعد کچھ عورتوں سے ان کے قریبی تعلقات رہے۔ خاص طور پر پدماجا کو لکھے ہوئے ان کے عشقیہ خطوط دل کو چھو لینے والے اور صحیح معنوں میں جذباتی ہونے کے باوجود بوالہوسی سے دور تھے۔

۲ رمارچ ۱۹۳۸ء کو نہرو نے لکھنؤ سے پدماجا کو لکھا — تم نے خط لکھنے کے لئے مجھ سے وعدہ کرانا چاہا ہے۔ اس سادگی کی بھی کوئی حد ہے۔ کیا وعدہ کرنا ضروری ہے یا وعدے کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ بغیر کسی خواہش کے میں صرف ایفائے وعدہ کے لئے تمہیں خط لکھا کروں؟ تمہیں مجھے خط لکھنے کا حکم دینے اور مجھے تمہارے حکم کو تسلیم کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ اگر مجھے تم کو خط لکھنے کی خواہش ہوگی تو کیا تم مجھے ایسا کرنے سے روک سکتی ہو؟ میں تمہیں خط لکھتا ہی رہوں گا جیسا کہ ماضی میں لکھتا رہا ہوں خواہ تم نے جواب بھلے ہی نہ دیا ہو۔ چونکہ میں خود غرض اور خود پسند ہوں اس لئے میں اپنی خوشنودی کے لئے تمہیں لکھتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ اس طرح میں تمہیں خوشی فراہم کرتا ہوں۔ اگر تم مجھے لکھنا نہ چاہو تو بتا دو۔ شاید تم مجھے اس لئے خط لکھنا نہیں چاہتی ہو کہ مبادا کوئی ایسی بات نہ لکھ دو جس سے مجھے تکلیف پہونچے۔ بلاشبہ تمہاری بات تکلیف پہونچانے کی قوت رکھتی ہے۔ لیکن کیا تم نے کبھی اس درد کا بھی خیال کیا ہے جو تمہارے کچھ نہ لکھنے سے پیدا ہوتا ہے؟ کیا تم نے میری اس تنہائی کا تصور کیا ہے جو میری تقدیر بن چکی ہے؟ کیا تم نے اس خول کے بارے میں سوچا ہے جس میں میں بند ہوں، سب سے الگ تھلگ اور جس سے بھاگنے کے لئے میں خود کو مصروف رکھتا ہوں؟''

''تم کو میرا پیار'' پر ختم ہونے والے اس محبت نامے میں بعد از تحریر کے طور پر شاعرانہ فقرہ بھی ہے — ''پھول بہار دکھا رہے ہیں اور تم کو تہنیت بھیج رہے ہیں''۔ پدماجا کے ایک طویل ذاتی ٹیلی گرام کے جواب میں لکھے

گئے نہرو کے خط کا ابتدائیہ ہی لاجواب ہے — میری پیاری، تمہارا ٹیلی گرام مجھے موصول ہوا ہے۔ لیکن یہ کس قدر حماقت خیز، نسوانیت کا مظہر اور فضول ہے۔ کیا یہ سبھاش سے محبت کرنے پر ایک قسم کا پرائچت یا اظہار معذرت ہے؟''۔ ظاہر ہے کہ دو ادھیڑ عمر کے ہیرو، نہرو اور سبھاش چندر بوس، سیاست کے علاوہ دوسرے میدانوں میں بھی ایک دوسرے کے رقیب تھے۔

نہرو ۱۹۳۷ء میں پچاس برس کے قریب پہنچنے کے باوجود اپنے خاندان کی دوست سروجنی کی بیٹی کی محبت میں دیوانہ وار گرفتار تھے۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۳۷ء کو انہوں نے الہٰ آباد سے پدماجا کو لکھا — اجنتا کی شہزادی، تم اس وقت سے کس قدر شدید طور پر ہر وقت میری جان کا حصہ بنی ہوئی ہو۔ جب سے تم نے میرے کمرے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ میں جب بھی اس کی طرف نظر اٹھاتا ہوں مجھے تمہاری یاد آجاتی ہے۔ اب تمہاری عمر کیا ہے؟ بیس سال؟ ہائے میری پیاری، عمر کے ماہ و سال کے دبے پاؤں ہمارے اوپر سے گزرتے چلے جانے کے باوجود ہم کس قدر نوعمر ہیں۔ میں تمہاری پیاری صورت دیکھنے کے لئے کتنا بے چین ہوں''۔

یہ بیس سال والی بات تو ظاہر ہے کہ مذاق میں لکھی گئی تھی کیونکہ پدماجا ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ ۲۹ر ستمبر ۱۹۳۷ء کو نہرو نے پدماجا کو ہدایت کی تھی کہ وہ ان کے نام اپنے خطوط پر ''ذاتی'' لکھ دیا کریں تاکہ ان کے سکریٹری انہیں نہ پڑھ سکیں۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہا اور وقت کے ساتھ پختہ ہوتا رہا۔ ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو نہرو نے پدماجا کو لکھا — تمہیں دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ روز بروز جوان ہوتی چلی جاؤ اس طرح ان کی تلافی کرتی رہو جو بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں''۔ ۲۰ر جون ۱۹۴۶ء کو جب وہ شیخ عبداللہ کی مدد کرنے کے لئے سیاسی مشن پر کشمیر گئے تو جہلم اور کشن گنگا کے سنگم پر واقع دومیل سے انہوں نے اپنی ''پیاری بی بی'' کو یاد کیا۔

نہرو کے بوڑھا ہو جانے کے بعد کئی اور عورتیں بھی ان کی زندگی میں داخل ہوئیں مگر ان میں سے اکثر نے اس اعزاز کا فقط خالی خولی دعویٰ کیا جبکہ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ سب سے زیادہ مبالغہ آمیز دعویٰ نہرو کے متنازع اسپیشل اسسٹنٹ ایم۔ او۔ متھائی نے اپنی غیر مربوط یادداشتوں میں کیا جو فروری ۱۹۴۶ء میں ان سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۵۹ء میں رقم خرد برد کرنے کے الزام کی بنا پر استعفیٰ دینے پر مجبور ہوئے۔ نہرو کے انتقال کے برسوں بعد ۱۹۷۸ء میں جب ان کی بیٹی اندرا گاندھی مختصر عرصہ کے لئے اقتدار سے محروم ہو گئیں تو متھائی نے ایک کتاب ''نہرو کے زمانے کی یادداشتیں'' شائع کی جس میں انہوں نے الزام لگایا کہ ۱۹۴۸ء میں وارانسی کی ایک حسین عورت نے، جو سنیاسن ہونے کا دعویٰ کرتی تھی اور اپنے آپ کو ''شردھا ماتا'' کہتی تھی، نہرو کو فریفتہ کر لیا تھا اور پُراسرار طور پر غائب ہونے سے پہلے اس نے نہرو سے ایک ناجائز بیٹا بھی پیدا کیا تھا۔ مگر اس خاتون نے (جواب تارک سنیاسن ہے) مشہور ناول نگار، صحافی اور مورخ خوشونت سنگھ کو ۱۹۷۹ء میں انگریزی ماہنامہ ''نیو دہلی'' کے لئے انٹرویو دیتے ہوئے نہرو

کے ساتھ اپنے جنسی تعلقات کی سختی سے تردید کی تھی۔ اس نے شرماتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ نہرو سے کئی بار ملی تھی۔ نہرو اس سے کافی متاثر تھے اور اسے یقین تھا کہ اگر کبھی نہرو کے دل میں دوسری شادی کا خیال آتا تو وہ اسی سے شادی کرتے۔

دراصل کسی بھی دلکش شخصیت کی شہرت اس کی زندگی میں شاذ و نادر ہی محفوظ رہتی ہے اور اس کے انتقال کے بعد کوئی بھی پاجی اشاروں کنایوں اور زیر لب مسکراہٹ کی جانی بوجھی چالوں کے ذریعہ اس کی شہرت کو داغدار کر سکتا ہے۔ چونکہ اس قسم کی کہانیاں نہرو کی داستانِ حیات کا حصہ بن گئی ہیں اس لئے ان کے سوانح نگار کو ان کہانیوں کو نظر انداز کرنے کے سہل ترین طریقہ کو اپنانے کے بجائے ان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں تین نکتے قابل غور ہیں۔ پہلا یہ کہ نہرو عیار نہیں تھے۔ انہوں نے اس حقیقت کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ نظامِ زندگی کے ان اقدار پر یقین رکھتے ہیں جن کے مطابق جنسی تعلق اخلاقی گناہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ گاندھی جی نے، جو واقعات کو بھانپنے کا خاص ملکہ رکھتے تھے، اس آدمی سے، جس کی وہ اپنے جانشین کے طور پر تربیت کر رہے تھے، کبھی برہمچاریہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کا سبب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ گاندھی جی کو یقین تھا کہ جواہر لال اپنی نجی زندگی کو اپنی عوامی زندگی میں دخل اندازی کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ تیسرا یہ کہ ہندوستانی عوام نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ نہرو کے ''معاملات'' کا پروپیگنڈا ان کے دشمنوں نے (جو باہر سے زیادہ کانگریس کے اندر موجود تھے) ۱۹۳۷ء کے الیکشن کے وقت اور اس کے بعد بھی عوام کو ان کے خلاف بھڑکانے کی غرض سے کیا۔ مگر عوام نے اس طرح کی کہانیوں پر کوئی توجہ نہ دے کر الزام تراشی کرنے والوں کے منصوبے کو ناکام کر دیا۔ جواہر لال نہرو نے ۱۹۳۷، ۱۹۴۵-۴۶، ۱۹۵۲، ۱۹۵۷، اور ۱۹۶۲ کے پانچ انتخابات میں کانگریس کی قیادت کی۔ چوتھائی صدی تک وہ اپنی کبھی بہتر اور کبھی کم تر کارکردگی، شاندار اور حیران کن کامیابیوں اور دل برداشتہ ٹریجڈی کے دوران بھی اپنے ملک اور عوام کی محبت اور اعتماد سے محروم نہیں ہوئے جن کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی عوام اپنے ہیرو کے دوستوں سے بھی محبت کرنے لگے تھے جس کا اندازہ ماؤنٹ بیٹن جوڑے کو ہندوستان سے رخصتی کے وقت ہوا۔

(''نہرو: دی میکنگ آف انڈیا'' کا ایک باب)

☆☆☆

ایک نوٹ

ہندوستان کے صدر مسٹر آر وینکٹ رمن نے ہندوستانی خواتین کی بیداری کے سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تعاون کو سراہا ہے۔ مجاہدہ آزادی ارونا آصف علی کی ''ایک عوامی شخصیت کا نجی چہرہ'' نامی کتاب کے دیباچہ میں مسٹر وینکٹ رمن نے تحریر کیا کہ نہرو نے جس جوش وخروش کے ساتھ ہندو کوڈ بل پیش کیا اس سے ہندوستانی عورتوں کے متعلق نہرو کی سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۸۸ کو نئی دہلی میں اس کتاب کے اجرا کے موقع پر صدر موصوف نے کہا کہ نہرو کے لئے کسی بھی گروپ کا دوسرے گروپ کے ذریعہ استحصال ناقابل معافی تھا۔ انہیں ہندوستان کی خواتین سمیت دیگر پسماندہ طبقات کا برابر خیال رہا کرتا تھا۔ مسٹر وینکٹ رمن نے پہلی بار پارلی منٹ کا ایک واقعہ بیان کیا جب وہ اس کے ممبر تھے اور ۵۳ء کا خصوصی میرج بل پر مباحثہ جاری تھا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ایک ترمیمی بل پیش کیا جس کے تحت طلاق کی عرضی کا نپٹارہ فریقین کی باہمی رضامندی سے ضلعی عدالتوں کو کرنا تھا۔ اس ترمیم کی گرچہ بڑی شدومد کے ساتھ مخالفت کی گئی تھی لیکن نہرو نے باہمی رضامندی سے ہونے والی طلاق کا خیر مقدم کیا اور کہا میں دو افراد کی اس ناقابل برداشت حالت کو نظر انداز کرنے کو تیار نہیں کہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کریں اور پھر بھی آپس میں بندھے رہیں۔ صدر نے کہا کہ جدوجہد آزادی میں شامل مختلف عظیم عورتوں سے ہونے والی نہرو کی بات چیت اور خط وکتابت سے بے شک عورتوں کے تئیں ان کی خاکساری کے احساس کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ان کی عزت، ان کے مستقبل کی سوجھ بوجھ۔ ان کا مستقبل نہ صرف مردوں کے مساوی پارٹنر کی حیثیت سے بلکہ شاید فطرت کی سب سے زیادہ باوقار تخلیق جو ایک ایسا دل و دماغ رکھتی ہے جسے مرد صرف اپنی تکمیل کے برخلاف نظر انداز کر سکتا ہے۔

مسز ارونا آصف علی نے کتاب کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے کہ نہرو کے لئے انصاف اور برابری ایسے اقدار تھے جن کا مرد اور عورت کے تعلقات سمیت تمام انسانی تعلقات پر اختیار ہونا چاہئے۔ مسز آصف علی تحریر کرتی ہیں کہ اگرچہ نہرو کی تربیت جدید ڈھنگ سے ہوئی تھی لیکن وہ اپنی اہلیہ سے اس بات کی توقع کرتے تھے کہ وہ ان کے تصورات کے عین مطابق چلیں۔ انہوں نے ایسا تصور نہیں کیا کہ انہیں ان کے سانچے میں ڈھل جانا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ نہرو جیسے مردوں نے اپنی بیویوں کے ساتھ اپنے رویے میں جو ذاتی مصالحت پسندی محسوس اور ظاہر کی وہ تمام مردوں کے لئے ایک سبق ہے۔ ارونا آصف علی تحریر کرتی ہیں کہ اس سے انہیں اس بات کی یاددہانی ہونی چاہئے کہ تصورات کی نگہبانی کریں جو مردوں کے اس نسلی یاد میں شامل ہے کہ عورتیں بندھوا مزدور، معاشی طور پر مردوں پر انحصار کرنے والی اور جنسی کھلونا ہیں جن کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں۔

ف۔س۔اعجاز

نہرو اور ایڈوینا

ہندوستان کے اوّلین وزیراعظم اور برطانیہ کے آخری وائسرے کی بیوی کے درمیان کسی قسم کا خاص تعلق تھا' یہ بات اب راز نہیں رہ گئی۔ کتابوں، اخباروں، انٹرنیٹ میں اس ''تعلق خاطر'' کی نوعیت اور معنویت پر محققین اب بھی نئی روشنی ڈالنے کی سعی کرتے نظر آتے ہیں۔ 2012 میں ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن کی 83 سالہ بیٹی پامیلا ماؤنٹ بیٹن (پامیلا ہکس) کی کتاب "India Remembered" شائع ہوئی ہے۔ بیٹی نے نہ صرف اپنی ماں کی اس داستان محبت کی تصدیق کی ہے بلکہ اپنی ماں اور پنڈت نہرو کے معاملۂ عشق کے بعض پہلوؤں کو اجاگر بھی کیا ہے۔ پامیلا نے لکھا ہے کہ جواہر لعل نہرو اور لیڈی ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن کا رومانس 1947 میں ایک پہاڑی مقام مشوبرا کے سفر سے شروع ہوا جس میں خاندان کے افراد اور احباب شریک تھے۔

نہرو نے اُس کے دس سال بعد ایڈوینا کو ایک خط میں لکھا کہ مشوبرا کے سفر سے ہمارے تعلق کی پہلی تشریح قائم ہوئی۔ اُس لمحے میں مجھے پتہ چلا'' کہ ہمارے درمیان ایک گہری وابستگی تھی۔ کوئی ایسی بے قابو طاقت تھی جو ہمیں ایک دوسرے کی جانب کھینچ رہی تھی، جس سے میں دھندلے طور پر ہی واقف تھا۔''

پامیلا کے مطابق وہ عشق جسمانی نہ تھا۔ اس کے برعکس مشہور کتاب "Edwina and Nehru : A Novel" کی مصنف کیتھرین کلیمنٹ نے ٹائمز آف انڈیا کو دیے اپنے انٹرویو میں کہا ہے ''ایڈوینا نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام اپنے خطوط میں لکھا ہے کہ نہرو سے اس کا رشتہ بیشتر افلاطونی ہے۔ بیشتر ''مگر ہمیشہ نہیں''۔ بہرحال یہ عشق افلاطونی رہا ہو یا غیر افلاطونی، اس کا تجسس کسی معنی خیز انجام تک پہنچاتا ہے۔

ایک تکون تھی محبت کی۔ ایک نئی آزاد قوم کا وزیراعظم۔ رخصت پذیر مقتدر قوم کے باوقار وائسرائے کی بیوی۔ اور خود وائسرائے اُن دونوں میں سینڈوچ بنا ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ سیاسی مطالب سے عاری نہ تھا۔ اور پھر لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن نے اس رومان کی پرورش میں خود اپنا تعاون بہم پہنچایا۔

اپنی کتاب میں پامیلا نے اپنی بہن پیٹریشیا کے نام اپنے باپ ماؤنٹ بیٹن کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں تحریر ہے ''وہ (یعنی ایڈوینا) اور جواہر لعل آپس میں کتنے شیریں رہا کرتے ہیں۔ وہ واقعی ایک دوسرے پر فدا ہیں۔ پیمی (Pamy) اور میں سمجھدار اور معاون بننے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں''۔ پامیلا نے کتاب میں لکھا ہے ''ان تینوں کے مابین ہر رخ سے کسی سطح پر کوئی مستحکم تفہیم یا مفاہمت پائی جاتی تھی''۔

اس طے شدہ تفہیم سے کہیں زخم خوردگی، حسد اور مکرو فریب کے جذبات بھی جنم لیتے تھے۔ یا شاید لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی بیوی کو اس قدر پیار

کرتے تھے کہ اسے خوش دیکھنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

ایسا سمجھا جاتا ہے کہ نہرو نے 1948 سے 1960 تک تقریباً ہر رات ایڈوینا کو ایک خط لکھا۔ ایڈوینا نے اپنی وصیت میں ایک سوٹ کیس نہرو کے خطوط سے بھرا اپنے شوہر کے نام چھوڑا۔ نہرو کا کسی پر اس حد تک اعتبار قائم ہو جانا جبکہ اُس سے سال میں صرف دو بار ملاقات ہوا کرتی تھی، پامیلا کی نظر میں یہ ایک رشتے کی اہمیت کا ثبوت ہے۔

نہرو کے بارے میں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ایک طرح سے ان کی ذاتی زندگی تشنۂ تکمیل گزری۔ کملا اور اُن کی شادی شدہ زندگی کے ابتدائی برسوں میں طرزِ زندگی میں نمایاں فرق اور بعد ازاں کملا کی پیہم علالت جس کے نتیجے میں وہ قبل از وقت 1936 میں چل بسیں۔ ان ناموافق باتوں نے نہرو کے اندر ایک خلا پیدا کر دیا تھا۔ پی۔ ڈی۔ ٹنڈن نے ''دی اسٹیٹسمین'' کلکتہ کی ہفتہ 28 جنوری 1989 کی اشاعت میں اپنے مضمون میں لکھا ہے: ''کملا کی موت کے بعد کئی خوبصورت خواتین نے جواہر لعل سے شادی کی کوشش کی مگر وہ حد درجہ جذباتی ہونے کے باوجود اس اقدام سے گریز کرتے رہے کیوں کی وہ ان کے ایک قریبی رشتہ دار کے بقول وہ اندرا کو سوتیلی ماں نہیں دینا چاہتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ساری زندگی خوبصورت چیزوں سے پیار کرتے رہے، عورتیں بھی ان سے الگ نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک بار ایمانداری سے کام لیتے ہوئے لکھا تھا'' نوجوانی میں مجھے ایک کشمیری لڑکی کالمس ہمیشہ ہیجان زدہ کر دیا کرتا تھا''۔ [بحوالہ مضمون ''مولانا آزاد کے الزامات اور نہرو کے رومانس از پی۔ ڈی۔ ٹنڈن، ترجمہ: ف۔ س۔ اعجاز۔ انشا۔ کا ''ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ''۔ ص 293]

درج بالا حقائق کی روشنی میں یہ سوچنا غلط نہ ہوگا کہ ایڈوینا میں نہرو کو ایک رازدار، انیس جاں، آتما کا ساتھی مل گیا تھا یا شاید نہرو کو ان میں وہ خاتون نظر آئی جو صحیح معنوں میں اس ترقی پسند، آزاد اور حساس رفیق کا متبادل تھی جو اُن کا آئیڈیل تھی یا جس کے وہ متمنی تھے۔ ان باتوں کے علاوہ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ایڈوینا اور نہرو دونوں طبعاً رومان پسند واقع ہوئے تھے۔ پامیلا نے خود اقرار کیا ہے کہ شادی سے باہر کسی کی محبت میں ملوث ہونا ایڈوینا کا پہلا موقع نہ تھا۔ منعدا کے۔ دتا۔ رے نے کلکتہ کے ''دی ٹیلی گراف'' کے 24 نومبر 2012 کے شمارے میں اپنے مضمون "An affair to remember" میں نہرو۔ ایڈوینا کے رومان کا اُس عہد کے سیاسی اور مدبرانہ پس منظر میں تجزیہ کیا ہے۔ [دتا۔ رے نے ماؤنٹ بیٹن سے نہرو کی پہلی ملاقات جو دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد سنگاپور میں ہوئی کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ بہر حال اس تناظر میں اُن باتوں کا ذکر یہاں غیر اہم ہے]۔ دتا۔ رے نے لکھا ہے کہ نہرو ایڈوینا معاملے کی اصل روداد تو نہرو کے نجی کاغذات میں بند ہے۔ جب تک وہ تحریریں نہ کھولی جائیں سب کچھ طشت از بام نہیں ہو پائے گا۔ البتہ ضمنی شواہد ماؤنٹ بیٹن کے برتاؤ کے دو پہلوؤں کی طرف متوجہ کراتے ہیں۔ اول یہ کہ انہوں نے اپنی بیوی کی مسلسل بیوفائیوں کو کھپایا یا برداشت کیا۔ دوئم نہرو کی جانب ان کا رویہ ان کی دور اندیشی پر مبنی تھا۔ دتا۔ رے نے لکھا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن اور اُن کی

بیوی ایک غیر معمولی ''چمکدار'' جوڑا تھا۔ ان کے سوانح نگاروں نے انہیں معمولی طور پر لیا۔ ایڈوینا اپنے یہودی نسل دادا کی طرف سے بے حد امیر تھی۔ وہ ایک شاہی خاندانی شہزادہ، کافی خوبرو اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا اور بڑا پُرعزم بھی تھا۔ ماؤنٹ بیٹن اور ایڈوینا کے جنسی معاملات کا بھی لندن کی ہے فیئر سوسائٹی میں بہت شہرہ تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک بار ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا ''میں نے اور ایڈوینا نے اپنی ساری ازدواجی زندگیاں دوسروں کے بستروں میں گذاری ہیں۔'' اور ایسی افواہیں بھی کم نہ تھیں کہ وہ بستر لازماً مخالف صنفوں کے نہیں ہوتے تھے۔ یعنی ہم جنس ہونے کا بھی اعتراف ہے۔

بہر حال لوگوں کو جو باتیں آج بھی کشش و پیچ میں رکھے ہوئے ہیں وہ ہیں وہ سیاسی مخوفات جو اس رومان سے وابستہ رہے ہوں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے معاملۂ کشمیر کو اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کو یکم جنوری 1948 کو سونپ دینے کی تجویز پر نہرو کی رضامندی نہرو کی ''تاریخی غلطیوں'' میں سے ایک تھی کیونکہ ہندوستانی طاقتیں پورے کشمیر سے پاکستانی حملہ آوروں کو نکال باہر کرنے کی اہلیت رکھتی تھیں۔ کرن تھاپر کے ٹی وی پروگرام ''شیطان کا وکیل'' (Devil's Advocate) سے پامیلا ماؤنٹ بیٹن کا یہ مکالمہ ملاحظہ فرمائیں:

کرن تھاپر: ہندوستان میں کئی لوگ یہ مانتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کو ریفر کرنے کا جواہر لعل نہرو کا فیصلہ آپ کے والد کے مشورے پر ہوا۔ کیا ممکن ہے کہ آپ کی والدہ کا اثر اس امر میں خاص طور پر کارگر رہا ہو؟۔

لیڈی پامیلا: میرا خیال ہے ایسا ہو سکتا تھا۔ پنڈت جی چونکہ کشمیری تھے اور یقیناً جذباتی پہلو کسی کے اپنے وطن کی جانب سے آتا ہے۔ کیوں، ہے نا؟۔ اور میرے باپ محض ایک خشک مکالے میں اپنا موقف ڈھنگ سے نہ سمجھا سکے ہوں اور میری ماں نے بات کی موثر ترسیل کی ہو جو ان کے دماغ سے زیادہ دل کو اپیل کر گئی ہو کہ ہاں انہیں یہ موقف اختیار کرنا چاہئے۔ میرا خیال ہے ایسا ضرور ہوا ہوگا۔

بہر حال اگر کوئی سکے کا دوسرا رخ دیکھے تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کشمیر کو ہندوستان کا اٹوٹ حصہ بنانے کے لئے اپنا اثر ضرور استعمال کیا۔ اسی کتاب میں پامیلا نے وائسرائے کے 1947 والے دورۂ کشمیر کا ذکر کیا ہے جب انہوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ ''وہ کشمیر کا ہندوستان سے الحاق قبول کرلیں اور نہرو کو ذلت سے بچائیں۔''

ماؤنٹ بیٹن کی نہرو سے قربت کے باوجود معاملۂ کشمیر میں ماؤنٹ بیٹن کا دوہرا پن ضرور ممکن تھا کیونکہ وہ نومولود قوموں کے ساتھ برطانیہ کھلواڑ کر رہا تھا۔ جہاں تک نہرو کی کسی ذاتی شخصی بناوٹ کا تعلق ہے جو کشمیر کی بابت ان کے غلط فیصلے پر اثر انداز ہوئی ہو جس سے ان کا تعلق تھا، اس سوال کا جواب آئندہ نسلوں کے قیاسات پر منحصر رہے گا۔

تمام تاریخی حقائق کے باوجود پامیلا کا خیال ہے کہ نہرو اور ایڈوینا کی رفاقت روحانی اور ذہنی تھی، جنسی نہیں تھی۔ ''دونوں میں سے کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ کسی جسمانی معاملے میں ملوث ہو سکتا اور چاہے جو بھی ہو، ان کی زندگیوں کی عوامی فطرت ایسی تھی جس نے انہیں انوکھے طور پر تنہا چھوڑ دیا تھا''۔

انگریزی: ڈاکٹر خالد سہیل

اردو ترجمہ: ف۔س۔اعجاز

نیلسن منڈیلا اور اس کی عورتیں

جب میں نے تخلیقی شخصیتوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کیا' وہ سائنسداں ہوں یا مصور' شاعر ہوں یا فلسفی' مصلح ہوں یا انقلابی مجھے پتہ چلا کہ آرٹ' شاعری اور فلسفہ کی دنیا میں اپنی عظیم الشان کامیابی کے باوجود ان میں سے کئی کی شادی شدہ زندگی المناک رہی۔ اپنی فن کارانہ' سیاسی اور خاندانی زندگیوں میں توازن قائم کرنے میں ان پر سخت وقت گزرا۔ ان کے مقصد اور تخلیقی عمل سے وابستگی نے ان کی عشقیہ زندگی کو تباہ کر ڈالا۔ موہن داس کرم چند گاندھی' رابندر ناتھ ٹیگور' محمد اقبال' چارلس ڈارون' پابلو نرودا ہوں یا چے گوارا' یہ اپنے رومانی تنازعات کو کامیابی سے کبھی حل نہ کر سکے۔ اس مضمون میں نیلسن منڈیلا کی زندگی میں داخل ہوئی عورتوں کے ساتھ ان کی جدوجہد کو فوکس میں لاؤں گا۔

منڈیلا کی نوعمری میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ تب ریجنٹ نام کا ایک آدمی اس کا گارجین بنا۔ اس کا اپنا ایک بیٹا تھا جسٹس۔ ریجنٹ نے منڈیلا اور جسٹس دونوں کی شادیاں طے کروالیں۔ منڈیلا ریجنٹ کا متبنیٰ بیٹا تھا۔ پھر بھی منڈیلا دل کی گہرائیوں سے ریجنٹ کی عزت کرتا تھا اور اس نے کبھی ریجنٹ کے خلوص و سالمیت پر سوال نہیں اٹھایا۔ لیکن منڈیلا کو یہ بھی معلوم تھا کہ دل کے معاملات میں اسے اپنا فیصلہ خود کرنا ہوگا۔ منڈیلا اور جسٹس دونوں نے اس معاملے پر لمبی بحث کی اور دونوں گھر چھوڑ کر جوہانس برگ (Johannesburg) جاکر کام کرنے لگے اور جینے کا فیصلہ کیا۔ دونوں کے پاس ایک ہی حقیقت پسندانہ فیصلہ تھا' فرار کا۔

گھر کے تحفظ سے بھاگ کر میٹروپولیٹن شہر جوہانس برگ کی وحشی اور الجھا دینے والی دنیا میں داخل ہونا منڈیلا کی زندگی میں بڑی تبدیلی کا موڑ تھا۔ شروع میں تو وہ تنہا ہو کر رہ گیا لیکن اس کے بعد اس نے کچھ بہت اچھے دوست بنائے جیسے والٹر سیسیولو جس نے نہ صرف اس کی پیشہ وارانہ بلکہ سیاسی طور پر بھی مدد کی۔ جوہانس برگ جانا منڈیلا کی زندگی کے بڑے اقدامات میں سے ایک تھا جس کا سلسلہ اس کی شادی سے جڑ گیا۔

جب منڈیلا جوہانس برگ میں جم گیا اور سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہو گیا اس نے سیسیولو کے گھر پر منعقد ہونے والی میٹنگوں میں شرکت شروع کر دی۔ ایک جلسے میں اس کی ملاقات ایک پرکشش نوجوان لڑکی Evelyn Mase سے ہوئی جو ایک زیر تربیت نرس تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے میں جاذبیت محسوس ہوئی اور وہ محبت میں پڑ گئے۔ انھوں نے شادی کر کے گھر

بسانے کا فیصلہ کر لیا۔

جیسے جیسے منڈیلا کی سیاسی سرگرمیاں بڑھیں اس کی خاندانی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ جب کبھی کوئی کشمکش سامنے آتی وہ اپنے کنبے پر سیاسی تحریک کو ترجیح دیتا۔ وہ خوش نصیب تھا کہ اسے ایسی سمجھدار بیوی ملی جو اس کی سیاسی وابستگیوں کی فکر کرتی تھی لیکن اس کا بیٹا چھوٹا تھا اور وہ اپنے باپ کی کمی محسوس کرتا تھا۔ منڈیلا بھی ایک چاہنے والا شوہر تھا اور باپ کے ناتے سے اپنی بیوی اور خوبرو بیٹے مدیبا تھمبیکیلے کے ساتھ وقت نہ گزارنے پر افسوس کرتا۔ اس کے الفاظ ہیں کہ میں گرہستی کا لطف اٹھاتا تھا حالانکہ مجھے اس کے لیے کم وقت ملتا تھا۔ میں تھمبی سے کھیل کر خوش ہوتا تھا' اسے نہلاتا' کھلاتا' بستر پر کوئی کہانی سنا کر سلانا اچھا لگتا تھا۔ دراصل مجھے بچوں کے ساتھ کھیلنے اور باتیں کرنے میں مزہ آتا ہے۔ مجھے اس سے بڑے سکون کا احساس ہوتا ہے۔

کئی سیاسی کارگزاروں اور انقلابیوں کو بتدریج احساس ہو پاتا ہے کہ ان کی شادی کسی مقصد سے ہوئی ہے۔ انتون لمبیدی نے والٹر کی بیوی البرٹینا تم نے ان کی شادی کی سالگرہ پر یہ مشکل یوں بیان کی تھی'' البرٹینا تم نے ایک شادی شدہ آدمی سے شادی کی ہے۔ والٹر نے تم سے ملنے سے بہت پہلے سیاست کے ساتھ بیاہ کر لیا تھا''۔

منڈیلا جتنا جتنا وقت اپنے کامریڈوں کے درمیان گزارنے لگا اتنا اتنا ہی اسے احساس ہونے لگا کہ جدوجہد میں ملوث رہنے والا آدمی دراصل ایک بے گھر زندگی گزارتا ہے۔ منڈیلا کی بیوی ہمیشہ اسے جتاتی رہتی کہ اس کا بیٹا اس کی رفاقت اور اس کے ساتھ کھیلنے کی کمی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے اجنبی بنتا جا رہا ہے۔ منڈیلا نے لکھا'' ایک دن میری بیوی نے مجھے اطلاع دی کہ میرا بڑا لڑکا تھمبی تب پانچ سال کا تھا' اس نے پوچھا'' ڈیڈی کہاں رہتے ہیں؟''۔ منڈیلا اپنی فیملی کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا لیکن اس کے سماجی سروکاروں اور سیاسی وابستگیوں کے سبب سے یہ ممکن نہ تھا۔ اس کے لیے اس کی ساری قوم اس کا خاندان بن گئی تھی۔ لہٰذا اس کا اپنا مختصر خاندان انقلاب کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ رہا تھا۔

بعض انقلابی اور گوریلا جنگجو خود کو تسلی دیتے ہیں کہ گھریلو ذمہ داریوں سے قومی مفادات زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ ان کے بے ذاتی مقصد سے سیاسی مقصد زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ایسے بھی ہیں جو دونوں کو مساوی تصور کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جب انقلابی اور گوریلا جنگجو مسلح جدوجہد کی جانب ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں تو انہیں خاندان کے لیے نئے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب پولس نے دسمبر 1956ء میں منڈیلا کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا تو اسے اپنے ہراساں بچوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے کہا'' یہ اچھا نہیں کہ کوئی اپنے بچوں کے سامنے گرفتار کیا جائے۔ لاکھ چاہے کوئی یہ جانتا ہو کہ گرفتار کیا جانے والا حق پہ ہے لیکن بچے صورت حال کی پیچیدگی کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا باپ سفید وردی والوں کے ہاتھوں بغیر کچھ کہنے کا موقع دیے پکڑا گیا ہے''۔

جوں جوں سیاست میں منڈیلا گھرتا چلا گیا اس کا تعلق اس کی بیوی

ایولین سے بگڑتا گیا۔ ان کے اختلافات بڑھنے لگے اور وہ الگ ہوگئے۔ ایولین نے مذہب میں پناہ تلاش کرلی۔ منڈیلا کو خارجی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ ایولین باطنی تبدیلی پر مصر تھی۔ منڈیلا سماجی اور ایولین روحانی تبدیلی کے متلاشی تھے۔ منڈیلا نے انقلاب کو گلے لگالیا۔ ایولین خدا سے مربوط ہوگئی۔ دونوں ایک ساتھ خوش نہیں رہ سکتے تھے۔ منڈیلا اسے بہت انفعالی passive سمجھتا' وہ منڈیلا کو بہت جارح قرار دیتی۔ منڈیلا نے لکھا ''وہ مجھے ترک نظریہ پر مجبور (proselytize) بھی کرنے لگی ہے تاکہ میں جدوجہد سے وابستگی چھوڑ کر خدا سے وابستہ ہوجاؤں۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا اس سے مجھے یہ سمجھ میں آیا کہ اس کا عقیدہ انفعالیت اور سپردگی سکھاتا ہے جو اصل میں جبر کی صورت ہے اور جسے میں قبول نہیں کرسکتا تھا''۔ ماں باپ کے طور پر بھی دونوں میں اختلافات پیدا ہوگئے جو جھگڑے' تصادم' کشاکش' تاسف اور بالآخر ''جنگ'' تک پہنچ گئے۔ منڈیلا نے اقرار کیا ہے کہ ''ہم نے بچوں کے دماغوں اور دلوں تک کے لیے ایک جنگ کھڑی کرڈالی۔ وہ انھیں مذہبی بنانے پر بضد تھی اور میں سیاسی بنانے کے درپے تھا''۔

ان کا رشتہ پیار سے شروع ہوکر شادی میں تبدیل ہوا اور اب سیاست اور مذہب کی آمیزش سے طلاق کی نوبت آگئی۔ آخر ایک دن جب منڈیلا جیل سے رہا ہوا اس نے خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کیا۔ اس نے تحریر کیا ہے ''جب میں قید خانے سے باہر آیا تو پتہ چلا کہ وہ بچے لے کر جاچکی ہے''۔

کیا ایک انقلابی اور گوریلا جنگجو کا ردعمل طلاق پر عام آدمی کے ردعمل سے جدا ہوتا ہے؟۔ کیا سیاست میں ملوث ہونے سے جذباتی دکھ کم ہوجاتا ہے؟۔ منڈیلا کے معاملے میں کہنا چاہیے کہ اس کا درد بہت گہرا تھا۔ اس نے لکھا ہے ''میں ایک خالی' خاموش مکان میں لوٹا۔ وہ پردے تک اتار کرلے گئی تھی اور کوئی وجہ تھی جس کی خاطر مجھے (در و دیوار کی) اس معمولی سی تفصیل نے بکھیر کر رکھ دیا''۔

منڈیلا نہ صرف اپنی محبوب بیوی سے علیحدگی کے سبب بکھر گیا جس نے اسے جدوجہد کے اتنے طویل برسوں میں اپنا تعاون پیش کیا بلکہ اپنے بچوں کو والدین کی علیحدگی اور طلاق کا دکھ سہنے کا حوصلہ بھی دیا۔ اپنے باپ سے جدائی کے بے پناہ دکھ کو سہارنے کے لیے تھیمبی اس کے ملبوسات سے بہت وابستہ ہوکر رہ گیا۔ منڈیلا نے لکھا ہے ''جدائی کی نتیجے میں تھیمبی اکثر وبیشتر میرے کپڑے پہن لیا کرتا چہ جائیکہ وہ اس کے لیے بہت بڑے تھے۔ لیکن وہ کپڑے اسے بہت دور رہنے والے باپ سے ایک خاص اُنس وقربت کا احساس دلاتے تھے''۔

وقت کے ساتھ بہر حال انقلابی اور گوریلا جنگجو اتنے قریبی رشتوں کے ٹوٹ جانے کے صدمے سے بحال ہوکر دوبارہ اپنی زندگی جینے لگتے ہیں۔ کچھ مجرد رہنے کی ٹھان لیتے ہیں' کچھ مخلوط جنسی تعلق والے بن جاتے ہیں جبکہ دوسرے یک زوجگی کا دستور زندگی اپنا لیتے ہیں۔

منڈیلا ایولین سے طلاق کے اثرات سے نکلا تو اس کی ملاقات ایک دوسری نوعمر کشش انگیز خاتون ونی (Winnie) سے ہوگئی اور ان میں محبت ہوگئی۔ تھوڑے دنوں کی کورٹ شپ کے بعد شادی بھی ہوگئی۔ ایولین ایک نرس

تھی۔ ونی ایک سماجی ورکر۔ ایولین مذہبی تھی' ونی سیاسی تھی۔ ونی نے اپنے باپ سے کہا کہ اس کا نیلسن منڈیلا سے تعلق ہو گیا ہے تو وہ مسکرایا اور بولا ''لیکن تم ایک جیل کے پرندے سے شادی کر رہی ہو''۔

سوال یہ ہے کہ ایولین کے ساتھ دکھ بھرے تجربے کے بعد بھی نیلسن منڈیلا نے دوسری شادی کرنا پسند کیوں کیا؟۔ شاید اسے ابتک امید تھی کہ اگر اسے کوئی صحیح شخص ملے تو وہ اپنی سیاسی اور رومانی زندگی کے بیچ توازن پیدا کر سکتا ہے۔ درپردہ وہ اس امید میں ونی پر زیادہ بھروسہ کر رہا تھا کہ وہ اس کی سیاسی وابستگی اور انقلابی امور پر زیادہ ہمدردی سے غور کرے گی۔ اس نے لکھا ہے ''ایک مجاہد آزادی کی بیوی اکثر ایک بیوہ کی طرح ہوتی ہے اس وقت بھی جب اس کا شوہر جیل میں نہ ہو''۔ منڈیلا نے امید تھا کہ ونی اس چیلنج کو قبول کر پائے گی اور قربانی دے سکے گی۔

منڈیلا کی حمایت میں جذباتی طور پر کہا جائے تو بھی کہنا پڑے گا کہ اس کے ہم کار' رفقاء اور دیگر انقلابیوں کی مدد اس کے لیے ناکافی تھی۔ اسے اپنی رفیق زندگی اور شریک روح ونی سے مزید امداد کی ضرورت تھی۔ ان دونوں کا پیار منڈیلا کے لیے ایک تحریک تھا۔ منڈیلا نے اقرار کیا ہے کہ ''اس کے لیے میری محبت نے مجھے آئندہ جدوجہد کے لیے مزید طاقت بخشی''۔

لیکن جب افریقی حکومت نے کالوں کے لیے' ان کی قبائلی بنیاد پر نئے قوانین بنائے تو ونی اپنے باپ اور شوہر کے مابین کشمکش میں پڑ گئی۔ وہ دونوں ہی سیاسی طور پر سرگرم تھے لیکن مخالف خیموں میں تھے۔ ونی دونوں کو بہت پیار کرتی تھی۔ کس کا ساتھ دے یہ فیصلہ کرنا ونی کے لیے بہت مشکل تھا۔ آخر اس نے ضمیر کے حق میں فیصلہ کیا اور باپ کے بجائے شوہر کے ساتھ ہو گئی۔ پیار وہ دونوں کو کرتی تھی لیکن بقول منڈیلا اس نے باپ کی سیاست کو رد کر دیا۔ گرچہ منڈیلا خوش تھا کہ ونی ایک سیاسی عورت نکلی لیکن جیسے جیسے سیاست میں اس کی شرکت بڑھتی گئی منڈیلا نروس ہونے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور جیل جا کر صعوبتیں سہے۔ اس نے اعتراف کیا ''مجھے ذمہ داری کا احساس تھا' ایک شوہر کے طور پر بھی اور ایک لیڈر کے طور پر بھی۔۔۔ میرے اپنے جذبات ملے جلے تھے کیونکہ شوہر اور لیڈر کے تفکرات ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے''۔ منڈیلا کو دوسرے انقلابیوں کی طرح اپنی سیاسی' رومانی اور گھریلو زندگی میں توازن قائم رکھنا ہمیشہ مشکل رہا۔

جب منڈیلا جیل سے چھوٹ کر آیا ونی کے ساتھ اسے نئے جھگڑوں کا سامنا کرنا پڑا جنہیں وہ دونوں حل نہیں کر سکے۔ آخر کار منڈیلا کو شادی توڑنی پڑی۔ کتنی تلخ بات ہے کہ جو منڈیلا سیاسی لیڈر کے طور پر بہت عقلمند' تجربہ کار' انقلابی اور گوریلا جنگجو واقع ہوا تھا' جس نے وائٹ ساؤتھ افریقی حکومت اور کالے قبائلی لیڈروں سے مسائل حل کر لیے وہ اپنے رومانی تصادم سے کبھی نہیں نمٹ سکا۔ یہ تعلق کیوں ختم ہوا اس کے بارے میں اس نے لکھا ہے ''اس نے جس آدمی سے شادی کی اس نے اسے جلد ہی چھوڑ دیا' پھر وہ آدمی ایک اسطور' ایک myth بن گیا اور وہ جب گھر لوٹ کر آیا تو آخر میں صرف ایک آدمی ثابت ہوا''۔

منڈیلا کو زندگی میں صرف ایک افسوس رہا اور وہ یہ کہ اسے خاندان کے ساتھ جینے کا وقت نہیں ملا۔ اپنے اس احساس کو اس نے اپنی بیٹی زندزی (Zindzi) کی شادی کے موقع پر اس سے شیئر کیا۔ اس نے کہا'' اگر تمہاری زندگی جہاد ہو جیسی کہ میری تھی تو گھر کے لیے تمہیں کم ہی وقت مل پائے گا''۔ زندزی نے اعتراف کیا اور کہا ہے کہ انقلاب کے دوران اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا باپ بابائے قوم بن گیا ہے۔

خاندان کا باپ اور قوم کا باپ بننے میں توازن رکھنا کبھی آسان نہیں رہا۔ سیاسی اور خاندانی ذمہ داریوں میں اعتدال قائم رکھنا زندگی کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ منڈیلا نے کہا'' قوم کا باپ بننا ایک بڑا اعزاز ہے جبکہ خاندان کا باپ بننا بڑی مسرت کی بات ہے۔ لیکن مسرت مجھے بہت کم حاصل ہوئی''۔

منڈیلا کی داستان حیات ایک انقلابی کے مسائل اور خوابوں کو اجاگر کر کے ایک کامیاب گوریلا جنگجو کی زندگی کے خدوخال کو واضح کرتی ہے۔ یہ اس کے سیاسی شعور کی بالیدگی سے لے کر اس کی قوم اور ملک میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے سفر کو بیان کرتی ہے۔ منڈیلا تمام دنیا کے کروڑوں لوگوں کا رول ماڈل بن گیا۔ اس کی قربانیوں نے اسے ایک انقلابی سے امن ساز کے کردار میں تبدیل کر دیا۔ اپنے نظریات اور وابستگی کی خاطر ایک چوتھائی صدی سے زیادہ کی مدت جیل میں رہ کر وہ ایک ہیرو بن گیا۔ اسے نوبل انعام سے نواز کر پوری دنیا نے اس کی خدمات کا اعتراف کیا۔ یہ انعام پا کر وہ سخت متعجب ہوا۔

یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دیگر انقلابیوں اور گوریلا جنگجوؤں کے برخلاف منڈیلا کی لڑائی جمہوری انتخابات پر ختم ہوئی جس کے انجام میں سیاسی اقتدار عوام اور اکثریت کو منتقل کر دیا گیا۔

یہ بات افسوسناک ہے کہ اتنا بڑا سیاسی رہنما جو اپنے سیاسی حریفوں پر غالب رہا اپنی بیویوں کے ساتھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ وہ شوہر سے زیادہ انقلابی' باپ سے زیادہ گوریلا کامیاب ثابت ہوا۔ نانا سے زیادہ سیاسی کارگزار بن کر اسے طمانیت کا احساس ہوا۔ اس کے باوجود منڈیلا لمبی دوڑ والا ثابت ہوا۔ اس نے کبھی آس نہ چھوڑی' سیاست میں اور نہ رومان میں۔ لہٰذا اپنی 80 ویں سالگرہ پر اس نے تیسری شادی کی۔ اس نے گریکا ماشیل (Graca Machel) کو زندگی کا حصہ دار بنایا۔ گریکا صدر موزمبیق سمورا ماشیل کی 35 سالہ بیوہ تھی۔ سمورا ایک سازش کے نتیجے میں ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک کر دیا گیا۔ اس سازش میں موزمبیق' جنوبی افریقہ اور ملاوی کے ایجنٹ ملوث تھے۔ منڈیلا کی تیسری شادی گھر' خاندان اور سیاست کے مابین توازن قائم کرنے کی ایک اور کوشش ہے۔

حوالے

1-Mandela Nelson----The Struggle is My Life
Pathfinder,New York 1990

2-Mandela Nelson---- Long Walk To Freedom
Little Brown and Company, Toranto 1995

شیکسپیئر کی عشقیہ زندگی کے دو مخفی راز

شیکسپیئر شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی کا نام این ہیتھوے Anne Hathway تھا اور سولہویں صدی کی آخری دہائی اور سترھویں صدی کی پہلی دہائی کے بیس برسوں میں تحریر کیے گئے اور گلوب تھیٹر میں اسٹیج کیے گئے ڈراموں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے اس کے عہد میں کسی کو یہ خیال تک نہیں آ سکتا تھا کہ اس کی زندگی کا ایک مخفی پہلو بھی ہے۔ جس شخص نے دو دہائیوں میں انتالیس (39) ڈرامے لکھے ہوں اور ہر ایک ڈرامے کی ریہرسل اور اسٹیج پروڈکشن میں پیش پیش رہا ہو، جس نے ان ڈراموں کے علاوہ ایک سو پچپن (155) سانیٹ لکھے ہوں، اور طویل نظموں کی تعداد اس کے علاوہ ہو، اس شخص کو انگریزی اصطلاح workalcohlic سے تو نوازا جا سکتا ہے، لیکن عشق کے حوالے سے اس کے لیے کوئی لقب تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی یہ بات آج کے طالبعلم کے لیے بعید از شعور و قیاس نہیں ہے کہ شیکسپیئر نے کم از کم دو بار اس میدان میں بھی اپنی شہ سواری کے جوہر دکھائے۔ یہ حقائق اس عرق ریز تحقیق کے نتیجے کے طور پر سامنے آئے ہیں جو گذشتہ تین صدیوں میں انگلستان اور دیگر ممالک کی جامعات میں، مختلف وقتوں میں، اسکالرز نے کی ہے۔

اس مختصر مضمون میں تفصیل سے تو نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ حوالہ جات سب انگریزی کتب یا شیکسپیئر کی تحاریر سے ہوں گے اور اس مضمون کا اختصار اور اردو کی اپنی تنگ دامانی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ طویل انگریزی اقتباسات سے اس کے ظرف کو لبالب بھر دیا جائے۔ تو بھی ضروری ہے، کہ دنیا کے سب سے بڑے شاعر اور ڈرامہ نگار کی ان دو محبوب شخصیتوں کا ذکر کیا جائے، جنہیں شیکسپیئر نے اپنا دل دے کر یہ فرض کر لیا تھا کہ یہ راز مخفی رہے گا۔ The dark lady of Shakespeare's sonnets تو ضرب المثل ہے اور سب جانتے ہیں کہ مرزا غالب کی ''ڈومنی'' کی طرح شیکسپیئر کی بھی کوئی خاتون دوست ایسی تھی، جسے ''ڈارک لیڈی'' کہا گیا ہے۔ لیکن دوسرا کون ہے، جس کا ذکر راقم الحروف اس مضمون میں کرنا چاہتا ہے؟ یہ امر باعث حیرت ہے کہ شیکسپیئر کے سانیٹوں میں واضح اشارے ملنے کے باوجود اس موضوع پر بہت کم کام کیا گیا ہے۔ تو بھی یہ امر باعث مسرت ہے کہ آج بھی شیکسپیئر کے بارے میں زیر زمین مواد کھودنے میں اسکالرز لگے ہوئے ہیں۔

راقم الحروف جب گذشتہ صدی کی ستر کی دہائی کے پہلے برسوں میں

برٹش اوپن یونیورسٹی، ملٹن کینز، انگلستان میں ریذیڈنٹ اسکالر کے طور پر کام کر رہا تھا تو ایک رفیق کار اسی موضوع پر اپنا تھیسس مکمل کر رہا تھا کہ وہ شخص جس کے نام شیکسپیئر نے اپنے پہلے ایک سو چھبیس 126 سانیٹ معنون کیے ہیں اور جسے اس نے Fair Youth کا لقب دیا ہے، اس کا نام کیا ہے؟ دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر وہ مرد ہے تو کیا شیکسپیئر امرد پرستی یا لوطیت کا پیروکار تھا؟ اس زمرے میں بہت کم مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی شیکسپیئر کے بارے میں تنقیدی کتب میں موجود ہے، اس کو پیش کرنا ضروری ہے۔

I -- Fair Youth

اس شخص کی شناخت کے مسئلے میں اور اس ضمن میں کہ شیکسپیئر کو آخر کیا ضرورت آ پڑی تھی کہ وہ اپنے ایک سو چھبیس سانیٹ ایک مرد دوست کے نام معنون کرتا، جن اسکالرز نے سب سے زیادہ کام کیا ہے ان میں یونیورسٹی اسکالرز کے علاوہ ''استادوں کے استاد'' آسکر وائلڈ Oscar Wilde بھی شامل ہے۔ آسکر وائلڈ نے ایک افسانہ بعنوان The Portrait of Mr. W. H. لکھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ شیکسپیئر کے رومانی (جنسی؟) تعلقات ایک نوجوان اداکار سے تھے جس کا نام ولیم ہفس William Houghs تھا۔ اس بات کے باوجود کہ ایک وضاحتی نوٹ میں آسکر وائلڈ نے اس بات کی تردید کی اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہے، اس نے اپنی کہانی

میں ایسے ذو معنوی الفاظ، استعاروں اور انگشت شہادت کے 'اشاروں' کا استعمال کیا کہ پڑھنے والے کے لیے یہ باور کرنا دشوار نہیں تھا کہ مصنف شیکسپیئر یا اس کے محبوب لڑکے کا ذکر کس حوالے سے کر رہا ہے۔

شہرہ آفاق مصنف سیموئل بٹلر Samuel Butler نے یہ خیال پیش کیا کہ شیکسپیئر کا محبوب نوجوان ایک ملاح تھا جو رات گذارنے کے لیے تھیٹر کی گیلری (سستے ٹکٹ کا درجہ) میں بیٹھا رہتا تھا اور کئی بار وہیں سو جاتا تھا۔ ایک اور اسکالر جوزف پیکینو Joseph Pequigney نے اپنی کتاب Such is my Fair Youth میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کچی عمر کا یہ نوجوان ایک Commoner یعنی نادار گھرانے کا فرد تھا جو واقعی شیکسپیئر کے عشق میں گرفتار تھا اور یہ عشق یک طرفہ نہیں تھا۔

کچھ اور اسکالروں نے اس نوجوان کی شناخت شیکسپیئر کے مالی سرپرست Henry Wriothessley, 3rd Earl of Southampton کے طور پر کی ہے، لیکن اس زمرے میں کچھ دیگر محققین نے شیکسپیئر کے آخری دور کے مالی اور سماجی سرپرست ولیم ہربرٹ، William Herbert, 3rd Earl of Pembroke کی شناخت کی ہے۔ قیاس غالب ہے کہ یہ تحقیق نہ صرف شیکسپیئر کے سانیٹوں میں مشمولہ اپنے محبوب نوجوان کی شکل و صورت، لباس، بولنے کے انداز، چال ڈھال اور دیگر شخصی اور ذاتی حوالوں پر

stings:

Gainst chained prisoners what need defence
be sought?

The fierce lion will hurt no yelden things.

Why should such spite be nursed in thy
thought,

Sith all these powers are pressed under thy
wings,

And thou seest and reason thee hath taught

What mischief malice many ways it brings.

Consider eke that spite availeth naught;

Therefore this song thy fault to thee it sings;

Displease thee not, for saying thus me thought.

Nor hate thou him from whom no hate forth
springs;

For furies that in hell be execrable.

For that they hate are made most miserable.

انحصار رکھتی ہے، بلکہ شیکسپیر کی اس عبارت سے بھی براہ راست تعلق رکھتی ہے، جس کا استعمال اس نے سانیٹوں کے اوپر کیا۔ یہ عبارت اس طرح ہے۔

Mr. W. H., the only begetter of
these ensuing sonnets".

دونوں با اثر شخصیات میں اگر فرق ہے تو ان کے ناموں کے پہلے حرفوں کا ہے۔ ایک کا نام H.W. ہے تو دوسرے کا نام W.H. ہے۔ دونوں کم عمر (یعنی شیکسپیر سے دس بارہ برس چھوٹے تھے) تھے اور دونوں حسین اور طرحدار نوجوان تھے۔

اب میں صرف ایک ایسے سانیٹ کو بجنسہ پیش کرنے کی جسارت کروں گا، جو کسی حد تک اس نوجوان کا اتہ پتہ دیتا ہے۔ شیکسپیر کی کسی بھی نظم کا ترجمہ ایک مشکل امر ہے اس لیے اسے انگریزی میں ہی پیش کیا جا رہا ہے۔ اس زمانے کی مروجہ یعنی شیکسپیر کے الفاظ کے ہجے بھی نہیں بدلے گئے:

SONNET 30

Such is the course that nature's kind hath
wrought

That snakes have time to cast away their

II - THE DARK LADY

واضح رہے کہ لفظ dark یہاں 'سیاہ' یا 'گندمی' رنگ کے ہونے کے طرف اشارہ نہیں ہے، تو بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ Blond یا Blonde یعنی سنہرے بالوں اور نیلی یا بلوریں آنکھوں والی، اور Brunette یعنی سیاہ بالوں اور کالی یا براؤن آنکھوں والی خواتین میں سے شیکسپیئر کا اشارہ موخر الذکر کی طرف ہے۔ اس کے علاوہ سولھویں صدی میں 'ڈارک'، پوشیدہ، رازدارانہ یا غیر فصیح کے معانی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا، یعنی شیکسپیئر جیسا ماہر اس لفظ کی ذومعنوی جہت سے ناآشنا نہیں تھا۔

بہر حال محققین اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو صدیوں سے اپنی قبروں میں پڑے آسودگان خاک کو بھی معاف نہیں کرتا۔ شیکسپیئر کی ڈارک لیڈی کے بارے میں بھی مختلف محققین نے مختلف خواتین کی طرف اشارے کیے ہیں۔ لوسی نیگرو Lucy Negro، میری فٹن Mary Fitton، ایملیا لینیئر Emilia Lanier کے نام تو عموماً تجویز کیے ہی جاتے ہیں لیکن نصف درجن کے قریب دوسرے نام بھی ہیں جو شیکسپیئر کے وقتوں میں سماجی سطح پر اعلے خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں [1]۔ تاریخی شعور رکھنے والے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ having a lover یعنی ایک عاشق کو اپنے ساتھ عملی طور پر اس طرح منسلک رکھنا کہ اس بات کا چرچا سوسائٹی میں عام بھی ہو تو بھی جزوی طور پر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس سے اس خاتون کے شوہر کو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ عموماً

---

[1] یہ بھید اب تقریباً کھل گیا ہے۔ اس ضمن میں یہاں میں ایک تازہ ترین تحقیق کا حوالہ پیش کر رہا ہوں جس کی رو سے شیکسپیئر کی سیاہ عورت یعنی ڈارک لیڈی کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ عورت "Lucy Negro" ہو سکتی تھی جو "Black Luce" کے نام سے بھی موسوم تھی۔ لوسی نیگرو شمالی لندن کے کلرکین ویل Clerkenwell چکلے کی بدنام رنڈی تھی۔
مانچسٹر یونیورسٹی کے ایک شیکسپیئرین اسکالر نے تحقیق کی ہے کہ 1930 میں ایسا ثبوت مل چکا تھا جو اس جانب واضح اشارہ کرتا ہے۔ برطانیہ کے اخبار "دی انڈیپنڈنٹ" نے اس تحقیق کا حوالہ دے کر نمایاں خبر شائع کر دی ہے اور کلکتہ کے ٹائمز آف انڈیا نے 29 اگست 2012 کو اس خبر کو بہت اہتمام سے چھاپا ہے۔
ڈنکن سالکیلڈ نامی محقق نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے وہ ریکارڈ دریافت کر لیا ہے جو اس فیصلے پر پہنچاتا ہے کہ لوسی نیگرو ہی اس مشکوک ڈارک لیڈی کا کردار قرار دیے جانے کی صحیح ترین مستحق ہے۔
شیکسپیئر کے سانیٹ نمبر 127 سے 152 تک ایک غیر مشخص عورت کو مخاطب ہیں۔ جو ایک temptress ہے۔ سانیٹ 144 میں اسے شاعر نے "my female evil" اور "my bad angel" گردانا ہے۔
سالکیلڈ نے بلیک لیوسے اور اس کے معاون گلبرٹ ایسٹ دونوں کے حوالے دریافت کیے ہیں جو کلرکین ویل میں ایک اور چکلہ چلاتے تھے۔ یہ حوالہ ایک تھیٹر مالک Philip Henslowe جس نے Rose Theatre قائم کیا اور جس کا ادارہ شیکسپیئر کا حریف تھا، کی ڈائری میں پایا گیا ہے۔
ہینسلوے جس نے شاعر کے ڈرامے بھی کیے رقم طراز ہے کہ وہ گلبرٹ ایسٹ کے ساتھ اکثر ذکر کرتا ہے۔ سالکیلڈ نے دعویٰ کیا ہے کہ چونکہ لوسی اور ایسٹ ہینسلوے کے کرایہ داروں میں سے تھے لہٰذا یہ جوڑا یقیناً تھیٹر کی دنیا سے منسلک تھا اور وہ عورت ضرور شیکسپیئر کی آشنا رہی ہوگی۔
ف۔ س۔ اعجاز

خطاب یافتہ خاندانوں کی خواتین خود جاگیروں کی مالک ہوتی تھیں اور کئی ایک تو اپنے خاوندوں سے بھی زیادہ سماجی حیثیت کی دعوی دار ہونے کا زعم رکھتی تھیں اور ایک (یا ایک سے زیادہ) lover اپنے ساتھ منسلک رکھنا فیشن سمجھا جاتا تھا۔

محققین نے ایک بات خصوصی طور پر نشان زد کی ہے۔ شیکسپیئر کے وہ سانیٹ جو اس کے مرد دوست کے نام ہیں، سبھی افلاطونی عشق کا اظہار یہ ہیں۔ یعنی ایسے عشق کا جس میں جذبات و احساسات کی سطح پر جسمانی یا جنسی اظہار کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، اور اس '' آدرش وادی'' جذبے سے کہیں بھی فرار نہیں ہے، جبکہ 'ڈارک لیڈی' کو معنون سانیٹوں میں تڑپ، بحث و بیچ، بے چینی، ہجر میں ذہنی اتھل پتھل کے شواہد موجود ہیں، اور جسمانی یا جنسی تعلق ایک رسم بعید نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس سلسلے کا پہلا سانیٹ (یعنی سانیٹ نمبر 127) شروع میں ڈارک لیڈی کو 'بلیک' یعنی 'سیاہ' کے صفاتی نام سے پکارتا ہے، لیکن فوراً بعد اس راہ پر گامزن ہو جاتا ہے، جس میں بناؤ سنگھار کے سامان، پاؤڈر، کریم، مصنوعی بال، بھووں کی تراش وغیرہ کو لعن طعن کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ڈارک لیڈی جیسی ہے، ویسی ہی خوبصورت ہے۔ گوری، سنہرے بالوں والی بلانڈ عورتوں سے موازنہ ایک بار پھر سانیٹ نمبر 147 میں ابھرتا ہے، جس میں شیکسپیئر کہتا ہے،

For I have sworn thee fair, and thought
thee bright,
Who art as black as hell, as dark as night.

شیکسپیئر کے زمانے تک شاعر اپنی محبوبہ کی تعریف اسے '' گورا چٹا، سنہرے بالوں والی، چمکیلی نیلی یا براؤن آنکھوں والی حسینہ'' کہہ کر کیا کرتے تھے ۔ یہ ایسے ہی تھا کہ جیسے اردو شاعری میں سیاہ لمبی زلفوں، پتلی کمر، گورے گلابی گال، پتلے ہونٹ اور متناسب ناک اور دہن کو تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے، ویسے ہی محبوبہ کی تعریف میں شیکسپیئر سے قبل اور اس کے معاصر 'بلانڈ' ہونے کو ہی 'خوبصورت' ہونا تصور کرتے تھے۔ یہ روایت یونانی ادب سے چلتی ہوئی رومائے قدیم کے ادب اور پھر وہاں سے وسط اور جنوبی یورپ کی زبانوں کے ادب میں در آئی تھی۔ مثال کے طور پر پیٹرارک Petrarch کے وہ سانیٹ جو لارا Laura کو معنون ہیں، گورے، سنہرے رنگ کو فوقیت دیتے ہیں۔ بحیرہ روم کے یورپی کنارے پر بسے ہوئے لگ بھگ سبھی ملکوں میں یہ رواج رہا ہے، اور یہ شاید اس لیے ہے کہ اس نسبتاً چھوٹے سمندر کے جنوبی کنارے پر افریقہ کے ممالک ہیں، جن میں سیاہ رنگ کی قومیں بستی ہیں، کالا رنگ ہی نمایاں تھا، اور جہاں کہیں بھی خون میں آمیزش آئی ہے (جیسے اسپین میں)، یہ فرق زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔

ایک نقاد لکھتا ہے، '' خدا جانے، اس زمانے میں Brunettes یا سیاہ بالوں اور نسبتاً کم چمکیلی اور گوری رنگت کی جلد والی عورتوں کو کیوں کمتر سمجھا جاتا تھا، جب کہ آج کے زمانے میں گوری عورتیں خود کو براؤن رنگ کی جلد میں

تبدیل کرنے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں اور ساحلِ سمندر پر دھوپ میں لیٹ لیٹ کر، لاکھوں ڈالر [illegible] پر صرف کر کے اپنے جسم کی جلد کو tan کرواتی ہیں۔''

مارک ہیلووے Mark Halloway نے شیکسپیئر کے متعدد ڈراموں میں سے حوالے دے کر یہ منطق پیش کی ہے کہ ''دوزخ کی طرح سیاہ'' اور ''رات کی طرح سانولی'' لکھ کر شیکسپیئر نے عورت سے اختلاط کو ''گناہِ اول'' سے ہم کنار کیا ہے اور اپنی محبوبہ کو اس کے لیے اکسایا ہے۔ اپنے ڈرامے ''میکبتھ'' میں بھی شیکسپیئر نے یہی استعارہ پیش کیا ہے۔

Fair is foul and foul is fair

Hover through the fog and filthy air

(Macbeth. Act I.I.)

فی زمانہ فرائڈ اور یونگ Freud & Jung کی تعلیمات سے متاثر ہونے والے بے شک انسان کے ذو جنسی تشخص کی باتیں کریں اور اس بات پر اصرار کریں کہ ہمارے تحت الشعور میں کہیں وہ حیوان موجود ہے جو انسان کے تہذیبی ورثے سے بے بہرہ ہے اور مرد و زن کے مابین کسی اور رشتے کی دوری کو غیر اہم سمجھ کر صرف جنسی تعلقات کو ہی اس رشتے کی بیخ و بنیاد تسلیم کرتا ہے، لیکن شیکسپیئر نے ان ماہرین نفسیات سے تین صدیاں پیشتر اپنے سانیٹ نمبر 134 میں اپنی محبوبہ 'ڈارک لیڈی' کو مخاطب کرتے ہوئے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے اندر دو شخصیات ہیں، ایک وہ جو نفسِ امارہ سے آزاد ہے اور دوسری وہ جو سرتا پا حیوان ہے، اور یہ کہ وہ اپنی محبوبہ کو دونوں سطحوں پر ہی تعلق میں منسلک دیکھتا ہے۔

So now I have confessed that he is thine

And I my self am mortgaged to thy will

Myself I'll forfeit, so that other mine

Thou wilt restore to be my comfort still

چودہ سطروں کے سانیٹ کی یہ پہلی چار سطریں ہیں۔ آخری مقفےٰ شعر سے پہلے کی آٹھ سطروں میں شیکسپیئر اپنی محبوبہ کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی دونوں شخصیتیں اس کے (محبوبہ کے) سامنے حاضر ہیں، چہ آنکہ وہ خود اس تناظر میں اپنی دوسری (حیوانی!) شخصیت کو زیادہ اہم تسلیم کرتا ہے، تو بھی اپنے دونوں رخ اس کے سامنے پیش کر کے اسے خود ہی انتخاب کی اجازت دیتا ہے، کہ ان دو میں سے کوئی ایک وہ پسند کر لے۔ آخری شعر یہ ہے۔

Him have I lost; thou hast both him and me

He pays the whole, and yet am I not free.

یہی نقاد اس سطر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

".....It is worth noting how far Shakespeare has wrested the tradition of love sonnet from its sweet ideal of courtly and refined love to show how at times the actuality is rather more fleshly and

distinctly of a darker and more savage colour."

یہ امر قابلِ غور ہے کہ شیکسپیئر نے اس سانیٹ میں اس صنفِ سخن کو عشق کے اس روایتی خول سے باہر کھینچ لیا ہے جس میں مرد اور عورت کے مابین عشق کا مطلب مہذب، شائستہ اور شیریں تعلق خاطر تھا، اور اسے جسمانی سطح پر، یعنی صریحاً ایک ''سیاہ'' اور ''حیوانی'' تعلق کی بنیاد پر لا کھڑا کیا ہے۔

شیکسپیئر کے Fair Youth یا پھر Dark lady کا صحیح اتہ پتہ اس زمانے کی سوسائٹی کے حوالے سے نہ بھی معلوم ہو، تو بھی یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے، کہ دونوں شخصیات اس عظیم ڈرامہ نگار کے آس پاس کہیں موجود تھے اور چونکہ ''خوبصورت نوجوان'' سے اس کا عشق جسمانی سطح پر نہیں تھا (کم از کم سانیٹوں میں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا!) تو بھی ''ڈارک لیڈی'' یہ تعلق اس جاندار جسمانی سطح پر تھا جسے جنسی کہا جاتا ہے اور اس کے شواہد 127-152 تک کے سانیٹوں میں جا بجا ملتے ہیں۔

....

آگے ملاحظہ فرمائیں:

شیکسپیئر کے پانچ عشقیہ سانیٹ

|اردو میں ترجمہ بشکل سانیٹس: ف۔س۔اعجاز|

|عنوانات مترجم کے قائم کیے ہوئے ہیں۔|

(سانیٹ:۷۶) پرانا سونا

جانے کیوں ہیں میری نظمیں نئے رنگ سے خالی
ہر ہوتی انہونی سے ہوں کیوں اتنا بیگانہ
سمے کی بدلی دھارا دیکھوں، ایسی خو نہیں ڈالی
نئی نئی ترکیبوں سے ہوں میں بالکل انجانا

کیوں لکھتا ہوں جانے اب تک وہی ایک سے بول
وہی پرانا سبزہ میرا میدانِ تخلیق!
اک اک اکشر پیٹے میرے اپنے نام کا ڈھول
کتنی دور کی راہی ہوگی میری ہر تخلیق؟

لیکن، میری جانِ تمنا! تیرے لئے ہی لکھتا ہوں
تو اور تیری پیت ابھی تک میرا ایک سوال
اسی لئے تو شبد پرانے پھر سے سجاتا رہتا ہوں
تا کہ جس کو خرچ کیا، پھر خرچ کروں وہ مال

جیسے سورج روز نیا ہے جیسے روز پرانا
میری پیت کا کام ہے پچھلے قصے کو دہرانا

(سانیٹ:۱۰۹)

میرا گلاب

جانِ من یہ کبھی نہ کہنا کہ میں دل کا جھوٹا تھا
گر چہ میرا غائب رہنا ایسا ثابت کرتا ہے
لیکن تیرا عاشق کیا یوں ہی تیرا دَم بھرتا ہے
مرتا تھا تو تجھ سے جدا ہونا ہی خوب بہانا تھا

تیرا سینہ ہی میری چاہت کا گھر ہے' ٹھکانا ہے
میں ہوں ایک مسافر ایسا' سے پہ جو لوٹ آئے
ایسے وقت نہیں آتا' جو اُس کا وقت بدل جائے
خود ہی پانی لاتا ہے' اپنے دھبّوں کو مٹاتا ہے

لوگوں کا تُو یقیں نہ کرنا' دیکھ تُو میری سُن
عیب جو میری فطرت میں تھے آپ ہی میں کہہ دوں
ہر وہ نقص تھا مجھ میں جس سے آلودہ ہو جائے خوں
لیکن کیسے چھوڑ دوں تجھ کو' تجھ میں سارے گن

کائنات میں تُو ہے تو لگتا ہے اپنا سب کچھ ہے
تُو ہی تو وہ گلاب ہے جس کے اندر میرا سب کچھ ہے

(سانیٹ:۱۳۸)

جھوٹا سچ

جھوٹی قسموں کے سہارے وہ دلاتی ہے یقیں:
"سچ کہوں، کس لئے میں تم پہ بہت مرتی ہوں
تم ابھی تک ہو جواں اس لئے دم بھرتی ہوں"
اس کی باتوں پہ مگر مجھ کو بھروسہ ہی نہیں

میں سمجھتا ہوں عبث وہ مجھے کہتی ہے جواں
اُس کو معلوم ہے کہ ہے مری مٹی پہ زوال
اب جوانی ہے مری اُس کی ہی باتوں کا کمال
لاکھ اچھی لگے پر بات میں سچائی کہاں؟

پھر بھی وہ کہہ دے تو کیا کوئی غلط کہتی ہے؟
میں نے کب خود بھی کہا اس سے کہ میں بوڑھا ہوں
پیار میں سچے بھروسے کے تحت زندہ ہوں
عشق میں عمر جوانی کی طرح بجتی ہے!

اس لئے جھوٹ روا رکھتے ہیں ہم آپس میں
اک خوشامد سی کیا کرتے ہیں ہم آپس میں

(سانیٹ:۱۳۴) مکافات

میری الفت پاپ ہے، تیری، نفرت کا جنجال
میرے پاپ سے تو نفرت کر، ہے جو جرم پیار
دیکھ بری حالت کے آگے لیکن اپنا حال
اپنے حق میں وہ بھی لفظ نہیں ملیں گے یار

مل بھی گئے تو تیرے منہ سے کب وہ ہوں گے ادا
پاپی لبوں نے لفظوں کے زیور کی عصمت لوٹی
اپنی محبت پہ جھوٹے پیماں کی مہر لگا
جیسے میں نے غیروں کے بستر کی نعمت لوٹی

تجھ کو پیار کروں میں، جیسا تُو کرتا غیروں کو
ہو تیرے افسوس پہ ساری دنیا کو افسوس
تجھ کو میں اس آنکھ سے دیکھوں جس سے تو اوروں کو
اک پل اپنی نفرت پر تُو اپنے دل کو مسوس

اپنے عمل سے جس حق کو تو کرتا ہے انکار
تجھ کو بھی وہ نہیں ملے گا ہرگز میرے یار

(سانیٹ:۱۳۵) جاں بخشی

وہ ہونٹ جنہیں پیار کے ہاتھوں نے بنایا
اُن ہونٹوں سے آواز چلی آتی تھی ''نفرت''
سن کر جسے کیا رنگ اڑا میرا خدایا
پر اس نے جو دیکھی بری بگڑی ہوئی حالت
اک رحم سا محبوب کے دل میں ابھر آیا
پلٹا دیا یوں شیریں وخلاق زباں کو
پھر موت کا عالم مجھے لگتا نظر آیا
دینے لگا دعوت وہ مری جسم جواں کو
''نفرت ہے مجھے'' کہہ کے بدلنے لگا وہ بات
جنت سے جہنم کو چلے جیسے کہ شیطان
دن جیسے بڑے دھیرے سے بن جائے سیہ رات
جب دیکھ چکا وہ برے اُڑتے ہوئے اوسان
''نفرت ہے مجھے'' کہہ کے عجب آگ لگا دی
''پر تم سے نہیں'' کہہ کے بری جان بچا دی

امریکہ کا تخیل پرست شاعر ایڈگر ایلن پو

۱۹ر جنوری ۱۸۰۹ء تا ۴ر نومبر ۱۸۴۹ء

پو ۱۹ر جنوری ۱۸۰۹ء کو بوسٹن میں پیدا ہوا۔ اس کے ماں اور باپ دونوں کسی سفری تھیٹریکلی کمپنی میں ایکٹر تھے لیکن ان کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں کیوں کہ پو ابھی تین ہی سال کا تھا کہ اس کی ماں مرگئی اور باپ کا حال ابتک سوانح نگاروں کو معلوم ہی نہیں ہو سکا۔ پو کو رچمنڈ کی ایک امیر اور بے اولاد عورت مسز ایلن نے لے کر پال لیا۔ اور بہت چاہ سے پرورش کیا۔ لیکن مسٹر ایلن جو اپنی عیش پسند طبیعت کی وجہ سے گھریلو فضا کو کچھ خاص پسند نہ کرتا تھا ہمیشہ پو کا مخالف رہا۔ اس کی یہ مخالفت ہی پو کی زندگی میں سب سے پہلا ایک ایسا واقعہ ہے جس نے آئندہ چل کر اسے تمام دنیا کا مخالف بنا دیا۔ نیز اپنی بیوی سے پو کا یہ زبردستی کا باپ جو بے وفائیاں کیا کرتا تھا لامحالہ ان کا اثر بھی عہد بلوغ میں پو کی زندگی پر یقیناً ہوا ہوگا۔ پو کی ابتدائی تعلیم انگلستان اور امریکہ دونوں جگہوں پر ہوئی اور بعد میں ورجینیا کی یونیورسٹی میں بھی وہ ۱۸۲۶ء میں داخل ہوا۔ لیکن مسٹر ایلن سے اختلافات کی بنا پر پہلے ہی سال کے بعد نوجوان پو بوسٹن سے بھاگ گیا اور وہاں جا کر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ تین سال تک فوج میں رہا۔ طبعی رجحانات نے اسے تلوار کی بجائے قلم کی طرف رجوع کیا اور نوجوانی کے معمول کے مطابق سب سے پہلے اس نے شعر گوئی شروع کی۔ اس زمانے کا کچھ کلام بوسٹن اور نیویارک کے رسائل میں بھی شائع ہوا۔ لیکن باقاعدگی کے ساتھ ۱۸۳۳ء سے بالٹی مور کے مقام پر پو نے لکھنے لکھانے کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ اور پھر غربت سے اس کی کبھی نہ مٹنے والی جنگ شروع ہوئی۔

ابھی تک جن کرداروں کا بیان ہوا وہ پو کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کی حیثیت محض پس منظر کی ہے۔ نمایاں کرداروں میں سب سے پہلا درجہ پو کی ساس مسز کلیم کا ہے۔ اسی عورت کی وجہ سے پو جسمانی طور پر زندہ رہا۔ مسز کلیم گویا پیدا ہی اسلئے ہوئی تھی کہ بغیر سوچے سمجھے اپنے متعلقین کی خدمت گزاری کرتی رہے۔ اپنی سیدھی سادی بیٹی اور پریشان دماغ پو سے اسے ویسی ہی دلبستگی اور محبت تھی جیسی ایک ماں کو اپنے آوارہ بچے سے ہوتی ہے۔ جہاں کہیں بھی وہ ان کے ساتھ گئی اور جیسی بھی حالت میں رہی زندگی کی کشاکش میں ہمیشہ ان دونوں کی اپنے مقدور سے بڑھ کر حفاظت کرتی رہی۔ مکان کے کچھ حصے میں اگر کچھ اور لوگ رہنے کو مل جاتے تو انہیں کے سہارے سے وہ مدد حاصل کرتی۔ پو کے وہ مسودے جن کے مواد کے متعلق اسے رتی بھر علم نہ تھا بغل میں دبا کر وہ اڈیٹروں کے دروازے کھٹکھٹاتی

پھرتی۔ بلکہ آخر عمر میں تو اسے بعض لوگوں نے شہر سے باہر کھیتوں میں بھی دیکھا کہ کوئی نہ کوئی خودرو سبزی جمع کرتی پھر رہی ہے تاکہ غریبانہ دسترخوان پر ایک آدھ چیز کھانے کیلئے زیادہ ہوجائے۔

پو کو بھی مسز کلیم سے ویسی ہی دلبستگی تھی۔ جس بے غرضانہ انداز میں ماں کی ایسی محبت کا تحفہ اسے پیش کیا گیا، اسی انداز میں اس نے اسے قبول کیا۔ جب کبھی پو گھر سے دور ہوتا تو خطوں میں اپنی زندگی کی معمولی سے معمولی تفصیلات کا بھی ذکر کرتا مثلاً آج میں نے ایک چھاتا خریدا ہے کیونکہ بارش کا موسم آن پہنچا ہے۔ اور اسی قسم کی اور باتیں!

سب سے اہم کردار: ساس

پو کے جیون ناٹک میں عورتوں کے لحاظ سے سب سے اہم کردار اس کی ساس تھی جس کی بنیادی خصوصیتوں کو آپ کسی حد تک جان چکے ہیں۔ لیکن ایک بات کا لحاظ رہے۔ بہ ظاہر وہ پس منظر کا ایک کردار معلوم ہوتی ہے اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایسے باہر سے دیکھنے والوں کو ایک بڑھیا میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ دوسرا کردار اسی بڑھیا کی بیٹی ورجینیا کا ہے۔ پو جیسے جوہر خداداد کے مالک اور لاپرواہ آدمی کو دو وجوہ کی بنا پر عورت کی ضرورت تھی۔ ایک اپنی تخلیقی تحریک کے طور پر اور دوسرے اپنی دیکھ بھال کیلئے۔ ورجینیا سے شادی کرکے گویا اس نے ایک تیر سے دو شکار کئے۔ اور یوں ورجینیا تحریکِ تخلیق کیلئے اور اس کی ماں مسز کلیم دیکھ بھال اور حفاظت کیلئے ملی۔ ورجینیا ذہنی اور جسمانی لحاظ سے بچہ سا تھی۔ ابھی اس کی عمر بارہ ہی سال کی تھی کہ پو نے اسے اپنی بیوی بنانے کی کوشش لیکن اس کی کم عمری کے باعث دور نزدیک کے کسی رشتہ دار کی مداخلت نے ایک دو سال تک یہ کام نہ ہونے دیا۔ ورجینیا کی ماں جس طرح اور باتوں میں پو کے دوسرے احکام اور خواہشات کے تابع تھی اسی طرح اس معاملے میں بھی اس کی رضامندی پو کو حاصل تھی۔ یہ دونوں ماں بیٹیاں پو کی ذہنی اور نفسی ضروریات کو کما حقہ، پورا کرتی تھیں۔ ساس میں اسے شاید بچپن کی چھوٹی ہوئی ماں کا عکس نظر آتا تھا اور اس بالی بیوی میں اسے ان نحیف و نزار شکلوں کا سایہ دکھائی دیتا تھا جو ہر وقت اس کے تصورات میں گردش کرتی رہتیں اور پھر اس کی تحریروں میں بقائے دوام پاتیں۔ اس لحاظ سے ورجینیا پو کے تخریب آلود تخیل کو مکمل تسکین پہنچا سکتی تھی۔ طفلانہ ذہنیت، پیلا مریضانہ چہرہ، اونچا ابھرا ہوا ماتھا یہ تمام باتیں مل کر اس کی نظروں میں ایک غیر زمینی پاکیزگی کا تصور پیش کرتی تھیں۔ اور یوں اس کی بیوی ایک ایسا سایہ بن جاتی تھی جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔

محبت کے خیالات

محبت اور عورت کے متعلق پو کے خیالات بہت سیدھے سادے اور شریفانہ قسم کے تھے۔ مثلاً نوجوانی کی محبت کے متعلق وہ لکھتا ہے۔ ''نوجوانی کی شاعرانہ محبت بغیر کسی حیل و حجت کے ایک انسانی جذبہ ہے جو زیادہ سے زیادہ ہمارے ان تصورات سے ہم آہنگ ہوسکتا ہے جو محبت کی پاکیزہ لذت کے متعلق ہمارے ذہنوں میں قائم ہیں''۔ ایک نقاد نے لکھا ہے کہ پو کی تخلیق کے نسائی پیکر یا تو سنگین مجسمے ہیں یا فرشتے اور ایک مصنف کہتا ہے کہ پو عورت کے بجائے

عورت کے تصور کی پوجا کرتا تھا۔ اور یہ رائیں پو کی خیالی اور حقیقی زندگی کے متعلق ایک سنجیدہ گہرائی کی حامل ہیں۔ اگر ہم اس کی زندگی کے اہم واقعہ یعنی ورجینیا سے اس کی شادی پر غور کریں اور اس کے ساتھ ہی اسکی لکھی ہوئی کہانیوں پر نظر دوڑائیں تو دونوں میں ہمیں ایک یکسانیت دکھائی دیتی ہے۔ دونوں کا منبع و ماخذ ایک ہی نظر آتا ہے۔ شادی کا واقعہ اس کوشش کو ظاہر کرتا ہے جنہیں اس نے اعصابی مریضوں کے اسلوب پر ایک خیالی دنیا میں اپنی ذہنی ضروریات کی تکمیل کیلئے بسایا تھا۔

بعض لوگ جو پو سے ذاتی طور پر واقف تھے یہ کہتے ہیں کہ وہ جذبات سے یکسر عاری تھا اور بیوی کے معاملے میں اس کا رویہ اس خیال کی تائید ہی کرتا ہے۔ ورجینیا اور اس کے تعلقات عمر بھر نامکمل ہی رہے۔ روحانی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ اور اس سلسلے میں ایک عجیب حقیقت یہ کہ وہ پیار سے اکثر اپنی بیوی کو "سس" کہا کرتا تھا جو سسٹر یعنی بہن کا مخفف ہے۔

بیوی کی غیر جنسی کشش کا فدائی

یہ بات ہمیں بہت الجھاتی ہے کہ آخر ورجینیا میں وہ کونسی بات تھی جس کی بے پناہ اپیل کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کی کہانیوں (اور نظموں میں بھی) جن فرشتوں اور رنگین مجسموں کی ایسی عورتوں کا ذکر ہے ان کے ہوتے ہوئے یہ اشارہ ہمیں ملتا ہے کہ پو کی خارجی زندگی چونکہ جنسی افعال سے مبرا تھی اس لئے اس کے تصورات بھی ایسی ہی عورتوں کے خیالات سے لبریز تھے۔ اور یہیں سے یہ نظریہ پیدا ہوسکتا ہے کہ ورجینیا کے حسن میں جو ایک غیر جنسی قسم کا رنگ تھا وہی پو کی پسندیدگی کا باعث بنا۔ اور یوں ضبط نفس کا سامنا اسے مجبوراً نہیں ہوا بلکہ اس نے ارادی طور پر اس انداز حیات کو منتخب کیا۔ اس کے دل کو صرف اس دلکشی کا احساس تھا جو نسائی حسن میں اس وقت باقی رہ جاتی ہے جب اس میں سے ہر قسم کے جنسی اجزا الگ ہو جائیں۔ اس طرح پو کہہ سکتا تھا کہ ورجینیا کیلئے اس کی دل بستگی اور رغبت پاکیزگی کی پوجا کا حکم رکھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی تحریروں میں وہ جنسی جذبے کے تصور ہی سے منحرف ہے۔ نیز عملی زندگی میں بھی جب کبھی کسی عورت سے عشقیہ تعلق قایم کرتا ہے تو یہی جنسی پہلو سے علیحدہ رہنے والی بات ہی اس کے تعلق کو درہم برہم کر دیتی ہے تب ہمیں شک گزرتا ہے کہ کہیں پاکیزگی سے یہ غیر معمولی دلچسپی کسی گہری نفسی ممانعت اور الجھن کا ظاہری نشان تو نہیں ہے۔ اور یوں اگرچہ ورجینیا کی دلکشی کے بھید کو وہ خود نہ جان سکا لیکن ہم کسی حد تک پہچان لیتے ہیں کہ نفسی ممانعت اور الجھن ہی اس رغبت کا باعث تھی۔ گویا ورجینیا سے شادی کر کے بیوی کی نوعمری نہ صرف زناشوئی کے تعلقات میں مانع رہی بلکہ دوسری عورتوں سے بھی جب کبھی پو کے تعلقات قائم ہوئے تو وہ پورے طور پر روحانی نہ سہی لیکن پورے طور پر جسمانی بھی نہ ہو سکے کیوں کہ وہ ایک شادی شدہ انسان تھا۔ حقیقی زندگی میں تو بیوی کی کم عمری اور مرض پو کے مکمل تعلق میں حائل ہوئے۔ لیکن ذہنی زندگی میں نہ مرض کا خیال تھا نہ پاکیزگی کا، صرف پو کی اپنی ذات حارج تھی۔

۳۰ رجون ۱۸۴۷ء کے روز ورجینیا کا آخری دن تھا۔ پو کے دل

میں اس کیلئے خواہ کسی قسم کا جذبہ کیوں نہ ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جذبے میں محبت کی نرمی ضرور موجود تھی۔ اور اگرچہ اس نے کافی عرصے سے اس حادثے کیلئے اپنے آپ کو تیار کر رکھا ہوگا۔ پھر بھی جب بیوی کی موت سے سامنا ہوا تو اس کے دل و دماغ گویا غم کے ایک اتھاہ سمندر میں ڈوب گئے اور اس غمناک کیفیت میں رفتہ رفتہ اور بھی پیچیدگی پیدا ہوتی گئی۔ جب کہ اس کا آسودہ جنون اپنے ہنگامی دوروں کو لے کر آن پہنچا۔ جنون سے ابتک دور رہنے کی وجہ اس کی بیوی تھی۔ بیوی کی ہستی اس کی کشمکش سے پُر زندگی اور ذہانت کیلئے ایک سہارا تھی۔ لیکن جب وہ نہ رہی تو اس کے تصورات آہستہ آہستہ پہلے سے زیادہ وحشت ناک ہوتے گئے اور اس کا تخیل اس کے سامنے متواتر جنون و جرائم کی تصویریں لانے لگا۔

اور اب ہم تیسرے اہم کردار کی طرف آتے ہیں۔ بیوی کی موت نے خطرناک طور پر پو کو آزاد کر دیا۔ اور اس کی زندگی میں کسی حد تک ان مضحکہ خیز معاشقوں کا دور شروع ہو گیا جن کی انگیخت سے آخری سین کی تیاری ہونے لگی۔ بیوی کی موجودگی نے پو کے احساسات پر جو پردہ ڈال رکھا تھا وہ اب اٹھ چکا تھا۔ اس لئے اسے اپنے ان ذہنی رجحانات سے جو ابتک آسودہ رہے تھے گہری شناسائی ہوگئی اور جب جنس کا سویا ہوا شیر جاگ اٹھا تو پو کی زندگی عورتوں کے رحم و کرم پر بسر ہونے لگی۔ آج تک کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ اس زمانے میں اسے کتنی عورتوں کی طرف رغبت ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ کم سے کم چار عورتیں ایسی تھیں جن سے اچھے خاصے جذباتی تعلقات قائم ہوئے اور ان میں سے دو کے ساتھ تو نسبت بھی ٹھہر گئی۔ ایک طرف تو اس کی ذہنی کارفرمائیوں کا یہ حال تھا اور دوسری طرف اس کے اندیشہ ناک دل و دماغ کی یہ حالت تھی کہ رات کو جب وہ بستر پر لیٹتا تو جب تک اس کی ساس سرہانے بیٹھ کر اسکی پیشانی کو نہ سہلاتی اسے نیند نہ آتی۔ اور اس سہلانے کے دوران میں ظاہر ہے کہ وہ اپنے وحشیانہ تصورات کی اتھاہ گہرائیوں میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہوگا۔

عشق بازی کے یہ قصے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ورجینیا کی موت سے کچھ عرصہ پہلے ہی شروع ہو گئے تھے۔ شاید اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اب اسکی بیوی کے دن تھوڑے ہیں اور کوئی دن آتا ہے کہ یہ سہارا باقی نہ رہے گا۔ پابندی اٹھ جائے گی اور اس لئے وہ پیش قدمی کے طور پر عشق کی طرف راغب تھا۔ اس زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ مسز اوس گڈ ایک جذباتی شاعرہ تھی۔ پو نے اس سے سلسلہ جنبانی کرتے ہوئے میل جول شروع کر دیا۔ لیکن جلد ہی یہ تعلقات رسوائی کی صورت اختیار کرنے لگے اور رسوائی کے ڈر سے شاعرہ الگ تھلگ ہو بیٹھی۔ اسکے بعد مسز شیو کی باری آئی۔ اس عورت نے پو کو بیہوشی کے دوروں میں نرس کیا تھا۔ یہ خاتون بھی مندرجہ بالا شاعرہ کی طرح پو کے دیوانہ وار جوش سے خوفزدہ ہو کر علیحدہ ہو گئی۔ اور پھر مس روئسٹر کی باری آئی۔ یہ پو کے بچپن کی محبوبہ تھی لیکن یہ معاملہ بھی پہلوں ہی کی طرح ناکیں ناکیں ٹش ثابت ہوا۔ جس طرح ہر معاملے میں پو کو کوئی عجیب طاقت آگے بڑھنے پر مجبور کرتی تھی اسی طرح اس کا ردعمل ہوتا تھا اور کسی بھی

معاشقے سے کوئی مناسب نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب عورتوں میں سے پو کی نظر میں کوئی بھی حقیقی نہ تھی۔ ہاں وہ اس کے الجھنوں سے بھرپور دل و دماغ میں عشقی تحریکات کو برانگیختہ کرتی تھیں لیکن جو تخیل کی دیوی ہر لمحے اس کے تصورات پر چھائی رہتی تھی اس کا ہنگامی نمائندہ بھی وہ انہیں نہ بنا سکتا تھا۔

مسز سارا وٹمن کا قصہ

اس دور کے معاشقوں میں سب سے زیادہ تفصیلات ہمیں مسز سارا وٹمن کے قصے کی معلوم ہیں اور چوں کہ بیوی کی موت نے جس کشمکش اور ہنگامے میں پو کی زندگی کو دھکیل دیا تھا اس پر یہ معاملہ سب سے بڑھ کر روشنی ڈالتا ہے، اس لئے مسز وٹمن کو ہی ہم پو کے تماشائے حیات کا تیسرا اہم کردار قرار دیں گے۔ مسز وٹمن بھی شاعرہ تھی اور زمانے کے رجحانات کے مطابق ادبی ذوق رکھتی تھی۔ وہ طبعاً ایک جذباتی عورت تھی اور اس کے ساتھ ہی بیوہ تھی۔ ذہنی رجحانات کے لحاظ سے اس میں عصبیت بھی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہر وقت اہل بصیرت کا روایتی سفید لباس اس کے زیب تن ہوتا اور ایتھر کا عطر ہمراہ لئے رہتی۔ اپنے اس طبعی انوکھے پن کے باعث وہ پو کا مرکز ذہنی بننے کیلئے بہت مناسب عورت تھی۔ اور پو خاطر خواہ طور پر اس کی ہستی کے ارد گرد اپنے انوکھے اور مجنونانہ تصورات کا تانا بانا بن سکتا تھا۔

پو کی پر جوش توجہ اور اندھا دھند اظہار اشتیاق سے اس کا ذہن بالکل اپنے قابو میں نہ رہا۔ اور بعض دوستوں کے روکنے کے باوجود وہ پو سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی۔ اور اس بات کا اسے خیال نہ آیا کہ پو کی ذات اب ایک کھنڈر کی مانند ہے۔

۱۸۴۵ء کے موسم گرما میں پو شہر پرودی ڈنس سے گزر رہا تھا۔ جہاں مسز وٹمن رہتی تھی۔ چاندنی رات تھی اور اپنے مکان کے باغ میں مسز وٹمن معمول کے مطابق سیر کر رہی تھی۔ پو کا گزر کہیں قریب سے ہوا۔ اور سب سے پہلی بار اس نے سارا وٹمن کو دیکھا۔ اور اگرچہ پو نے بعد میں جا کر یہ لکھا ہے کہ اسی لمحے میں اسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ عورت بھی اس کی اپنی ہستی کی طرف ایک ''ہم قسمت روح'' ہے۔ لیکن ان دونوں کی ملاقات ورجینیا کی موت کے بعد ہوئی۔ ملاقات کا قصہ یوں ہے کہ کسی محفل میں پو نے سارا وٹمن کے متعلق کچھ تعریفی کلمات کہے۔ ان سے متاثر ہو کر مسز وٹمن نے پو کے اعزاز میں ایک نظم لکھ کر شائع کی اور جب پو کی نظر سے گزری تو اس نے سارا کے نام ایک خط لکھا۔ جس کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔ ان اقتباسات سے پو کی وہ ہذیان آلودہ ذہنی کیفیت صاف ظاہر ہے جو موت تک برابر قائم رہی۔

''میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ سب سے پہلے میں نے تمہارا نام...... سے سنا۔ وہ گفتگو میں اپنے قول کے مطابق تمہاری انفرادی افتاد طبع کے متعلق اشارہ کر رہی تھی۔ نیز اس نے کنایتہً کچھ تمہارے غم کے بارے میں بھی کہا۔ پہلی بات نے میری توجہ پر ایک عجیب گرفت کی اور دوسرے کنائے نے میری اس توجہ کو پابند اور مرکوز کر دیا۔ اس نے تمہارے ایسے خیالات، رجحانات اور کیفیات کا ذکر بھی کیا جنہیں میں جانتا تھا کہ یہ میرے دل کی باتیں ہیں۔ توجہ

انسانی میں سے اور کوئی ان میں حصہ دار نہیں ہے۔ چنانچہ یہ سب باتیں سن کر میری روح پر ایک گہری ہمدردی کا احساس چھا گیا۔ جو کچھ مجھے محسوس ہوا اسے میں بہترین طریق پر یوں ظاہر کرسکتا ہوں کہ تمہارا انجان دل مجھے اپنے سینے میں محسوس ہونے لگا اور یہ معلوم ہوا کہ اب یہ دل یہیں رہے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرا دل تمہارے سینے میں محسوس ہوا۔

اسی لمحے سے میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اس لمحے کے بعد جب کبھی میں نے تمہارا نام سنا یا کہیں پڑھا میرے دل پر ایک لرزش سی طاری ہوگئی اور اس لرزش میں اندیشہ و مسرت دونوں کی آمیزش تھی۔ مجھے یہی خیال رہا کہ تم ایک بیاہتا عورت ہو اور گزشتہ چند مہینوں ہی میں مجھ پر حقیقت حال کھلی ہے۔ تمہیں دیکھنا تو جدا رہا میں تم سے بات کرنے کی بھی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ کئی سال تک میں اپنے لبوں پر تمہارا نام تک نہ لایا اور اس دوران میں جب کبھی کوئی تمہارا ذکر کرتا تو اسے میری روح ایک ساغر سمجھ کر نوش کرتی''۔

لیکن یہ عورت بھی جسے پو ایسے جوشیلے الفاظ میں مخاطب کرتا ہے اس قابل نہ تھی کہ اس کے تصورات کی آدرشی عورت کا نمایندہ بن سکتی۔ ہاں، دوسری عورتوں کو دیکھتے ہوئے وہ نسبتاً اس درجے کیلئے موزوں تھی لیکن حقیقتاً نامکمل۔ مگر حقیقت میں پو کی گرفت اور قدر ڈھیلی پڑ چکی تھی کہ اس کی معمولی انفرادیت ہی اس کو غیر زمینی دلکشی کی صورت میں لبھانے لگی بلکہ کچھ عرصے کیلئے تو اس کے ذہن سے ورجینیا کا تصور بھی جاتا رہا۔ ہاں اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے کسی کونے میں یہ احساس موجود تھا کہ اسے مسز وٹمن کے تعلقات کے سلسلے میں کس مشکل کا سامنا ہے۔ وہ اتنا اندازہ تو آسانی سے لگا سکتا تھا کہ مسز وٹمن جسمانی طور پر ایک صحت مند عورت ہے اور اگر اسے بیوی بنا لیا گیا تو اس صورت میں زن و شوئی کے بعض ایسے حقوق بھی اس کو پورے کرنا ہوں گے جن کی تکمیل سے بوجوہ قاصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے دل ودماغ میں ایک چھٹی حس بیدار ہو جاتی اور یہ احساس خوف، بہجت آمیز شادمانی اور ایک ناقابل وضاحت وحشی جذبے سے مل جل کر بنتا اور اس کی مشابہت احساس جرم سے تھی۔ گویا اس کے نفس تحت الشعور نے اسے متنبہ کر دیا تھا لیکن وہ اپنی افتادِ طبع سے مجبور تھا۔ اس معاشقے کے دوران میں پو کی حرکات و افعال کسی ایسے شخص سے ملتے تھے جسے اس بات کا شدید احساس ہو کہ وہ کسی عجیب پیچیدہ مصیبت کے جال میں گرفتار ہے۔ اور اسی لئے وہ اوپر کے خط کی طرح کئی اور خطوط میں بھی اپنی وکالت کرتا رہا۔ لیکن جونہی اسے مسز وٹمن کی رضامندی حاصل ہوگئی۔ اس کی یاس پرستی نے اسے مے خواری کی طرف دھکیل دیا۔ اور اسی مے نوشی نے ان تمام تیاریوں پر پانی پھیر دیا جو شادی کیلئے کی جا رہی تھیں۔ بلکہ الزاماً یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شادی سے ایک آدھ روز پہلے پو نشے میں دھت مسز وٹمن کے سامنے جا پہنچا تاکہ اس کا دل پلٹ جائے اور وہ اسے اس پابندی سے رہائی دے دے جسکی ''ذمہ داریوں'' کو خاطر خواہ طور پر پورا نہ کرسکتا تھا۔

لیکن جہاں تک پو کے سوانح نگاروں نے اندازہ لگایا ہے۔ مسز وٹمن کا معاشقہ کوئی آخری معاملہ نہ تھا۔ بیوی کی موت کے بعد سے اپنی موت

تک پو کا یہی شعار رہا کہ جو بھی عورت اس کے راستے میں آئی اور اس نے اسکے اعصابی ذہن سے ذرا بھی اپیل کی اس کا جنسی تعاقب شروع ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تمام صنف لطیف اس کے ذہن میں ایک ہستی کی صورت میں مرکوز ہو گئی تھی۔ اور اسے اس صنف کے مختلف افراد میں کوئی تمیز نہ رہی تھی اور اس لئے ہر کسی کو وہ واسطے دیتا پھرتا تھا کہ وہ اسے خدا جانے کونسی مصیبت سے ''بچالے''۔ اصل بات یہ تھی کہ ورجینیا اس کی زندگی میں ایک پشتے کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس نے اس کی ذہنی زندگی کے اس ریت محل کو برقرار رکھا ہوا تھا اور جب وہ سہارا نہ رہا تو اسکے تخیل کا وہ گھروندا آنکھ جھپکتے میں ڈھے گیا۔ اور اسے اچانک اس ضرورت کا سامنا ہوا کہ وہ اب کوئی نیا ڈھکوسلا تیار کرلے جس کے بل پر زندگی گزاری جاسکے۔ جس طرح ابتدائی ایام میں وہ اپنی حقیقی قابلیت کے ساتھ اپنی مفروضہ اہلیتوں کے افسانے کو ملا کر اپنے اعصابی مزاج کی تسکین کا سامان مہیا کر لیا کرتا تھا، اسی طرح اب اسے پہلے سے بھی بڑھ کر کسی خود فریبی کی ضرورت تھی۔

جب کبھی اس پر یاس اور اندیشوں کا یہ دورہ پڑتا اور اسے بھلانے کیلئے وہ شراب کا سہارا لیتا تو اس نشے کی حالت میں اس سے عجیب حرکات کے متعلق کوئی وضاحت نہ پیش کر سکتا۔ ہاں ایک صحیح اعصابی مریض اور شرابی کی طرح رہ رہ کر یہ بات کہتا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اب میں کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اب میں نے اپنی کمزوری پر قابو پالیا ہے لیکن جلد یا بدیر پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ یاس اور اندیشے اور پھر وہی ہنگامی اور غیر مکمل علاج و میخواری، اور ان دوروں کے بعد اسے اپنے دوستوں سے ایک ہی شکایت رہتی کہ وہ اس کی شراب کو جنون کا باعث سمجھنے کی بجائے جنون کو شراب کا باعث کہتے ہیں۔

ڈاکٹر جان ڈبلیو رابرٹسن نے پو کی شراب خوری کے متعلق ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس میں تمام حالات اور بیانات سے ثابت کیا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک ایسا میخوار تھا جسکی عادت بظاہر نا قابل وضاحت دکھائی دیتی ہے لیکن جسکی کمزوری کی حقیقی وجہ اسکی روح کی مریضانہ کیفیت ہے۔ لیکن یہاں ایک دلچسپ اور اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پو صحیح معنوں میں ایک شرابی تھا تو کیوں ہر عادی میخوار اسکی طرح تخلیق ادب کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اگر اس کے اندیشوں سے لبریز دماغ کو ''سایہ شاخ گل افعی نظر آتا تھا'' تو یہ اسکی میخواری کی وجہ سے نہیں بلکہ اسکے جوہر طبع کی وجہ سے تھا۔ گویا وہ طباع پہلے تھا اور شرابی بعد میں۔

نفسیات کے ماہر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ اعصابی مریض کی بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ ایک افسانے کے بل پر زندگی گزارتا ہے اور اس کا یہ عمل اس افسانے کو حقیقت بنانے کیلئے ایک براہ راست یا بالواسطہ کوشش ہوتی ہے۔ اسکی تمام حرکات اور افعال کا یہی ایک مقصد ہوتا ہے۔ ابتدا میں احساس کمتری کے باعث اپنے آپ پر اعتماد پیدا کرنے کے لئے یا اپنی برتری ثابت کرنے کیلئے وہ افسانہ طرازی کرتا ہے اور پھر اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ افسانہ طرازی کرتا ہے اور پھر اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس افسانے کو حقیقت

کی صورت دیدے۔ ظاہر ہے کہ پو کا مطمح نظر بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ اس کا ثبوت اس کے اپنے الفاظ سے بھی ملتا ہے۔

''اس دنیا کے حقائق مجھے سراب معلوم ہوتے ہیں۔ محض سراب —— اور اس کی بجائے خوابوں کی بستی کے وحشیانہ تصورات اس روز مرہ زندگی کا مواد ہی نہیں بلکہ کلیتاً اپنی ہستی نظر آتے ہیں''۔

پو کے ذہن نے جو الگ تھلگ دنیا بنا رکھی تھی اگر ہم اس کی نوعیت اور علت تخلیق کو سمجھ لیں تو ہم اس کی زندگی، اس کی شخصیت اور اس کی تخلیقات ادبی کو صاف اور واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اور ہمدردانہ زاویہ نگاہ سے غور کر سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہمارا راستہ دشوار منزلوں سے پٹ جاتا ہے، بلکہ ہم صحیح معنوں میں کسی راستے پر گامزن ہی نہیں ہو سکتے۔

اور اب پو کے تماشائے حیات کے آخری سین کی طرف آتے ہیں۔

اس بات کا بیان تو پہلے کیا جا چکا ہے کہ ورجینیا کی موت کے بعد پو کا ذہن اس کے قابو میں نہ رہا تھا اور اس کے ان گنت معاشقوں نے اس کیفیت میں اضافہ ہی کیا تھا۔ جولائی ۱۸۴۸ء تک وہ یکسر اس قابل نہ رہا کہ اپنی دیکھ بھال کر سکے۔ اس زمانہ میں اس کے جنونی دماغ میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ وہ دوسروں کی ملازمت کی بجائے اپنا ایک ماہنامہ جاری کردے اور اس تجویز کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے روپے کی فراہمی کیلئے وہ رچمنڈ پہنچا۔ لیکن یہاں پہنچ کر پندرہ روز تک وہ شہر کے ذلیل ترین میخانوں میں ڈولتا پھرا۔ اور اس آوارگی اور پریشان حالی سے جان آرتھامپسن نے اسے رہائی دلائی جو اس زمانہ میں ماہنامہ ''پیامی'' (میسنجر) کا ایڈیٹر تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس بات کے باوجود کہ اس نے اس کی فوری ضروریات کو پورا کیا پو اب اس قابل نہ تھا کہ کسی طرح کا بھی اثر اس کی بہتری کیلئے اس پر ڈالا جا سکتا۔ چنانچہ اس پھیرے میں جتنا عرصہ وہ رچمنڈ میں رہا اس کی آوارگی بدستور جاری رہی۔

یہ اس کی خارجی زندگی تھی اور داخلی طور پر اس کا غیر مدلل اور ناقابل فہم ملال اس پر پہلے سے زیادہ گہرائی کے ساتھ تسلط پا رہا تھا۔ اپنی محبوبہ ''اینی'' کو لکھتا ہے۔ ''میرا غم و ملال ناقابل فہم ہے، اور یہ بات مجھے اور بھی غمگین بنا دیتی ہے۔ میرے ذہن میں تاریک پیش گوئیاں چھا رہی ہیں، کسی بھی بات سے میرا غم دور نہیں ہوتا، مجھے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا میری زندگی ضائع گئی ہے۔ ماضی کی زندگی اور مستقبل ایک بے رونق خلاء کی مانند دکھائی دیتا ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس کشمکش اور ان اندیشوں سے پنپ سکوں اور یاس کی اس تاریکی میں بھی امید کی جستجو کو جاری رکھوں''۔

اس سے قریباً ایک سال بعد ۳۰ رجون ۱۸۴۹ء کے روز اس نے ایک بار پھر اور اب کی دفعہ آخری بار رچمنڈ آنے کی تیاریاں کرلیں، اس وقت بھی اس کا ذہن اسی طرح اندیشوں سے پُر تھا۔ چنانچہ اس سفر سے پہلے وہ اپنی ایک دوست مسز لیوس سے ملنے کیلئے گیا اور دوران گفتگو میں کہنے لگا۔

''مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ کو اب کبھی دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے آج رچمنڈ جانا ازحد ضروری ہے، اگر میں نہ لوٹوں تو میرے سوانح حیات ضرور لکھیے گا۔ کیوں کہ مجھے امید ہے کہ آپ میری ذات سے ضرور انصاف

کریں گی''۔

چنانچہ یہ آخری مہلک سفر ان خیالات کے ساتھ شروع ہوا۔ جب وہ فلاڈیلفیا پہنچا جو اس کے سفر کی پہلی منزل تھی تو اس پر جنون کا ایک واضح دورہ پڑا۔ اس دورے میں اسے یوں محسوس ہونے لگا گویا بعض انجان اشخاص اس کا پیچھا کر رہے ہیں اور اس کی جان کے درپے ہیں۔ اس شہر میں جان سارٹین نامی ایک شخص رہتا تھا جس سے پو کی شناسائی قیامِ فلاڈیلفیا میں ہوئی تھی۔ اس کے ہاں پہنچ کر پو نے اس سے درخواست کی کہ وہ اسے ان لوگوں کے چنگل سے رہائی دلائے اور اپنی حفاظت میں رکھے۔ جان سارٹین نے لکھا ہے کہ پو نے مجھ سے کہا کہ جو کچھ میں آپ کو بتاؤں گا اسے آپ مشکل ہی سے سچ سمجھیں گے لیکن اس انیسویں صدی میں بھی ایسی باتیں ممکن الوقوع ہیں۔ اس کے بعد اس نے ذیل کا قصہ سنایا۔ ''میں نیویارک جارہا تھا کہ گاڑی میں اپنی سیٹ سے پیچھے کچھ دور میں نے چند لوگوں کو سازش کرتے سنا کہ کس طرح وہ مجھے مار کر گاڑی کے پائیدان سے نیچے دے پھینکیں گے۔ وہ اس قدر آہستہ آواز میں یہ باتیں کر رہے تھے کہ اگر میری قوت سامعہ غیر معمولی طور پر تیز نہ ہوتی تو میرے پلے کچھ بھی نہ پڑتا''۔ اور اس قتل کے افسانے کے بعد اس نے خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک خاموش رہا اور پھر اچانک بول اٹھا۔ اگر میں یہ اپنی مونچھیں صاف کر ڈالوں تو پھر مجھے پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔ کیا آپ مجھے ایک استرا لا کر دے سکتے ہیں؟ تاکہ میں انہیں مونڈ لوں۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا کہ ایک جعلی چیک بنانے کے جرم میں مجھے مویامینگ کے جیل خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اور اس قید کے دوران میں میں نے دیکھا کہ سفید لباس میں ایک عورت کی شکل نمودار ہوئی اور مجھ سے کچھ باتیں کرنے لگی۔ پھر جو کچھ اس نے مجھ سے کہا میں نہ سن سکتا تو بس یوں سمجھو کہ ابتک خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ وہیں ایک ملازم نے مجھ سے کہا کہ اگر میں چاہوں تو اس کے ساتھ قلعہ کی چار دیواری میں چل پھر کر سیر کر سکتا ہوں۔ میں رضامند ہو گیا۔ یونہی قلعے کے مختلف مقامات کی سیر کے دوران میں ہمیں فصیل کے قریب ایک خُم سے ملا۔ میرے ساتھی نے پوچھا کہ شوق فرمایئے گا؟ میں نے انکار کر دیا۔ اگر میں حامی بھر لیتا تو وہ مجھے اسی خُم کی آتشِ سیال میں ڈبو دیتا۔ یونہی آخرکار وہ لوگ مجھے اذیت دینے کیلئے اور میرے دل کے ٹکڑے کرنے کیلئے میری ساس مسز کلیم کو وہاں لے آئے اور پھر میں نے یہ بصارت سوز منظر دیکھا کہ انہوں نے پہلے ٹخنوں تک اس کے پاؤں آرے سے الگ کر دیئے۔ پھر گھٹنوں تک ٹانگیں کاٹ دیں اور پھر کولہوں تک تمام کی تمام ٹانگیں اڑا دیں''۔

جنون کے اس دورے میں پو کی جو کیفیت تھی اس کا اندازہ اوپر کے وحشت ناک بیان سے کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے روز اس کی ذہنی حالت کافی حد تک درست ہوگئی اور اس بات کا بھی احساس ہونے لگا کہ ایک روز پیشتر اس نے جو داستان سنائی تھی وہ اس تخریب آلود ذہن کا ایک کرشمہ تھا۔

اصل معشوق کون؟

پو کے کلیات اور سوانح حیات کو دیکھنے کے بعد سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنی کہانیوں (اور نظموں میں بھی) وہ متواتر جن دوشیزہ

عورتوں کا ذکر کرتا ہے ان کی تہہ میں کون عورت چھپی بیٹھی ہے، وہ اکثر ان نازنینوں کو مردہ تصور کرتا ہے اور اس لئے بہت سے لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ ان میں وہ اپنی بیوی ورجینیا کا عکس دیکھتا ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ ورجینیا ابھی زندہ تھی تب ہی سے اس کے تخیل نے ان عورتوں کی تخلیق شروع کر رکھی تھی۔ ابھی وہ چودہ پندرہ سال کا تھا کہ اسے اپنے ایک دوست کی ماں مسز اسٹینارڈ سے محبت ہوگئی اور جب یہ عورت مرگئی تو اس کا غم کسی کروٹ چین ہی نہ لیتا تھا، اس کے بعد ایک اور عورت سے اسے رغبت ہوئی جس کا نام میری ڈیورو تھا۔ اس عورت نے پو سے وفا کی۔ ہمارے خیال میں یہی عورت تھی جس کی جدائی کو پو موت کی جدائی تصور کرتا ہے۔ بچپن کی پہلی محبت کا خاتمہ موت نے کیا اور دوسرا تعلق بے وفائی سے ٹوٹا۔ ان دونوں حقائق نے مل کر اس کے دماغ میں مری ہوئی دوشیزاؤں کا تصور پیدا کر دیا۔ اور یوں انکی نظموں اور کہانیوں میں اس کے ان تشنہ افسانہائے محبت کا غیر شعوری اثر ظاہر ہوا۔ یہ نفسی نشوونما طفلی ہی سے شروع تھا۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہوا اور اس کے بعد جس بھی عورت سے اس کا تعلق پیدا ہوا خواہ وہ تعلق ماں کا تھا یا محبوبہ کا، اس میں اسے مکمل تسکین حاصل نہ ہو سکی۔

اس سلسلے میں دوسرا سوال موت کے موضوع سے پو کی غیر معمولی دلچسپی کا ہے۔ خصوصاً جب وہ موت اور نازنین عورتوں کو یکجا تصور کرتا ہے، عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی بیوی کی موت یا کم سے کم اس کی مہلک بیماری کی وجہ سے یہ تصور اس کے ذہن میں جاگزیں ہوگیا۔ لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیئے کہ ابھی پو نے ورجینیا سے شادی بھی نہ کی کہ موت کے موضوع سے اس رغبت کا اظہار ہو چکا تھا۔ اس کی ابتدائی کہانیوں میں دوشیزہ عورتوں کی موت کا نہایت واضح بیان ہے۔ پو نے اس نظریئے کا اظہار بھی کیا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ شعریت سے لبریز ایک حسین دوشیزہ کی موت ہے اور ہمارے خیال میں اس نظریے کی تحریک اس کو ان عورتوں سے ہوئی تھی جو اسے مل نہ سکیں یا اس سے الگ ہوگئیں یا اس کے جذبۂ محبت کو تشنہ چھوڑ کر مرگئیں۔ تیس سال کی عمر سے پہلے چھ ایسی عورتوں کا حال ہمیں معلوم ہوتا ہے جس کا سلسلہ طفلی میں اس کی اپنی والدہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ذہن میں حسن اور موت ہم آہنگ ہو کر رہ گئے۔

اسی مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پو کو نہ صرف موت یا دوشیزہ عورتوں کی موت سے دلچسپی تھی بلکہ وہ اکثر مختلف کرداروں کے زندہ دفن ہونے کا بیان بھی کرتا ہے یا ایسے لوگوں کا حال لکھتا ہے جو اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کیلئے ہمیں جدید نفسیات کے پیغمبر مرحوم ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ کے ایک اقتباس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ وہ لکھتے ہیں ''تھوڑا عرصہ ہوا کہ مجھ پر ان تصورات اور خیالات کی اہمیت واضح ہوئی جو انسان کے ذہن میں زمانہ حمل میں آسکتے ہیں۔ انہیں خیالات اور تصورات میں اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ بہت سے افراد کو بعض دفعہ زندہ دفن ہونے کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ نیز حیات بعد الممات کے اعتقاد کی گہری غیر شعوری دلیل بھی انہیں میں ہے۔ کیوں کہ حیات بعد الممات رحم کی زندگی سے اس دنیا کی

پراسرار زندگی میں آنے کا ایک عکس ہے۔ اس کے علاوہ پیدائش کا عمل انسان کیلئے خوف کا پہلا تجربہ ہے اور اس لئے یہی عمل خوف کے احساس کا نمونہ اور ماخذ ہے''۔ ڈاکٹر فرائیڈ کے مندرجہ بالا نظریے ہی میں ہمیں پو کے اندیشوں اور خوف سے بھرپور افسانوں میں اس کی اپنی ذہنی الجھنوں کے حل کا سراغ ملتا ہے۔ ایک فرد کی جنسی آرزوئیں جب پیاسی رہتی ہیں تو ان میں ایک ناگوار جھلک ایک خوف کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لحاظ سے پو کی زندگی پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس خوف میں اگر پیدائش سے پہلے کا خوف بھی شامل ہو جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ پو کس لئے دوشیزاؤں کے مرنے اور مر کر پھر جی اٹھنے سے دلچسپی لیتا تھا۔

یہ تمام باتیں ایک طرح سے پو کی ذہنی نشوونما کا پس منظر ہیں۔ ان سب سے مل کر اور اس کے ساتھ احساس کمتری کا اضافہ ہو کر اس کے اذیت پرستانہ رجحانات ظاہر ہوتے ہیں۔ نہ صرف اس کی کہانیاں اور نظمیں ہی اس اذیت پرستی کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ وہ زہریلے مضامین بھی اس کے شاہد ہیں جو اس نے ہمعصر مصنفین اور شعرا کے خلاف لکھے۔ گویا وہ درد اور تکلیف کو محض درد اور تکلیف کیلئے پسند کرتا تھا۔ چاہتا تھا اور چونکہ حقیقی زندگی میں یہ کام نہ کر سکتا تھا اس لئے اس نے اپنی ادبی زندگی میں اس گہرے جذبے کیلئے نکاس کی صورت پیدا کر لی تھی۔

تخیل پرستی

پو کی نمایاں خصوصیت تخیل پرستی ہے۔ وہ خوابوں کا رسیا تھا۔ سپنوں کا گیانی اور اس کی ادبی تخلیقات بھی خوابوں ہی کے تانے بانے ہیں۔ وہ خود ایک جگہ ایک کہانی کے کردار کی زبانی جو حسب معمول اس کی اپنی شخصیت کا عکس ہوتا ہے کہتا ہے ''خواب دیکھنا ہی میری زندگی کا حاصل رہا ہے۔ اس لئے میں نے اپنے لئے سپنوں کی ایک کٹیا بنائی ہے''۔ اسی طرح ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ ''جو لوگ خواب دیکھتے ہیں انہیں ابدیت کی جھلک نظر آتی ہے''۔ اس کے علاوہ اس کی نفسیات بھی ایک بچے خوابوں کے رسیا کی نفسیات سے مشابہت رکھتی ہے۔ وہ جو باتیں زندگی میں حاصل نہ کر سکتا تھا ان کے تصورات قائم کر لیتا تھا۔ زندگی میں وہ غریب تھا اس لئے کہانیوں میں وہ امیرانہ محلوں کا بیان کرتا ہے۔ زندگی میں اس کو اپنی محبوب عورتیں حاصل نہ ہو سکیں اس لئے کہانیوں میں وہ موت پر حیات بعد الممات کے نظریے سے فتح حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا یہ انہماک اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اسے حقیقت سے کوئی دلچسپی ہی نہ رہی تھی۔ اس کی کسی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کے زمانے میں امریکہ میں غلامی انسداد کا مسئلہ بھی تھا یا میکسیکو کی جنگ بھی ہوئی تھی۔

اصول شعری

اور اب ہم اس تحریک ادبی کا ذکر کرتے ہیں جس کا بانی سہانی پو تھا لیکن جس کا اثر نہ صرف فرانس بلکہ یورپ کے تمام ممالک پر ہوا لیکن اس سے پہلے حسن اور شاعری کے متعلق پو کے نظریات سے ذرا سی واقفیت حاصل کر لی جائے۔ شعر کے متعلق اگرچہ اس نے ایک سیر حاصل مقالہ ''اصول شعری'' کے عنوان سے لکھا ہے لیکن ذیل کا اقتباس اس کے انداز نظر پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

’’بہت عرصے سے میرا یہ خیال ہے کہ ’’غیر معیّن‘‘ سچے شعر کا نمایاں جزو ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ’’غیر معیّن‘‘ سچی موسیقی کا بھی جزو ہے۔ میرا مطلب راگ کے سچے اظہار سے ہے۔ اگر موسیقی میں ہم کسی قسم کا تعین پیدا کر دیں، اس میں کسی قسم کے ارادی سُر ملا دیں تو یک قلم اس کی مصفانہ آدرشی، بنیادی اور لازمی خصوصیت اور کیفیت جاتی رہے گی۔ اس میں جو خواب کی سی ایک لذت ہوگی وہ باقی نہ رہے گی۔ جس روحانی فضا میں موسیقی تیر رہی ہوتی ہے وہ مٹ جائے گی۔ اس کی تاب پرواز کا ہیدہ ہو جائے گی۔ اس کی بجائے وہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی اور سراہے جانے والی چیز بن جائے گی ـــ اس زمین کی ایک چیز‘‘۔

گویا پو شعر میں کنایتی فضا اور دھندلکے کا حامی تھا۔ شعر کو وہ دو اور دو چار قسم کی کوئی چیز نہ سمجھتا تھا۔ ریاضی اور سائنس کے مسائل سے الگ انداز کا ایک مسئلہ جانتا تھا اور حسن کے متعلق اسی مقالے کے مندرجہ ذیل اقتباس اس کے نقطۂ نظر کو ظاہر کرتے ہیں۔

’’ہمارے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ حسن کے بلند ترین مظاہرات میں ملال کا ایک لہجہ موجود ہوتا ہے۔ نشو و نما کے انتہائی درجے پر پہنچ کر حسن خواہ کسی قسم کا ہو ایک حساس روح کو آنسو بہانے پر مجبور کرتا ہے۔ اور یوں ملال شاعرانہ لہجوں میں سب سے زیادہ مرتبہ رکھتا ہے‘‘۔

’’حسن کی ہر بلندی میں ملال کا یہ شائبہ ضرور نمایاں ہوتا ہے اور جب راگ کے اثر سے ہماری آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں تو اس کا باعث شدت مسرت نہیں ہوتی بلکہ ایک بے قابو کر دینے والا غم اس کی علت نمائی ہے۔ جسے ہم فانی انسان عام طور پر اس اچھوتی بہجت سے ہم آہنگ نہیں بنا سکتے جس کی ایک کنایتی اور غیر معیّن جھلک ہم کو راگ کی بدولت دکھائی دیتی ہے‘‘۔

ظاہر ہے کہ حسن اور شعر کے مندرجہ بالا اندازِ نظر کی تخلیق اس کے ذاتی حالات کے تحت ہوئی لیکن یہ کوئی اعتراض نہیں۔ ہر شخص عالمگیر نظریوں تک بھی ذاتی تجربات اور تفکر ہی کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ ان نظریات کو ہم کمزور نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ ان کے اندرونی زور ہی نے یورپ کی ذہنی اور روحانی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کیا۔

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

۳۶۔ محبت کو جس چیز سے نفرت ہو اسے عمیز نہیں لگاتی۔

The Two Gentlemen of Verona - Act 5, Scene 2

۳۷۔ موسم گرما کی ہوا سے کھلی ہوئی محبت کی کلی ایک حسین پھول ثابت ہو سکتی ہے جب ہم اگلی بار ملیں۔

Romeo & Juliet - Act 2, Scene 1

۳۸۔ عاقل ہو اور محبت کرے۔ یہ مرد کی طاقت سے تجاوز ہے۔

Troilus & Cressida - Act 3, Scene 2

۳۹۔ اس کی نامہربانی میری زندگی کو شکست دے سکتی ہے لیکن میری محبت کو ہرگز داغدار نہیں کر سکتی۔

Othello - Act 4, Scene 2

پروفیسر ایش کمار۔ ایم۔ اے

ایچ۔ جی ویلز-H.G.WELLS

انیس سو تیسویں دہائی میں اپنی ادبی عظمت کی انتہائی شہرت کے دوران ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی ڈائری میں اپنے کچھ معاشقوں کی بابت اعتراف کیا ہے۔ لیکن اسے اپنے معشوقوں کی زندگی میں شائع کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ اور نہ ہی اپنی سوانح عمری میں ان کا ذکر کیا۔ وہ تمام معاشقے اب ایک کتاب H.G. Wells in Love کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ طوفان انگیز تعلق ربیکا ویسٹ Rebecca West کے ساتھ تھا۔ جو خود ایک اچھی خاصی ادیب تھی۔ اور جس نے تین چار سال ہوئے وفات پائی۔ (یہ مضمون ۱۹۸۸ء میں لکھا گیا تھا۔ ف۔ س۔ اعجاز)

۱۹۱۳ء میں اپنے ایک مضمون میں ربیکا نے ویلز کو ایک نقلی سا سائنسدان Pseudo-scientist کہہ دیا۔ جب ویلز کو پتہ چلا تو اس نے یہ پوچھنے کے لئے کہ وہ ایسا کیوں سمجھتی ہے اُسے چائے پر مدعو کیا۔ خوبصورت اور چست تو تھی ہی۔ باتوں باتوں میں اسے ایسا محسوس ہوا کہ ابھی بچپن اور جوانی کی درمیانی حالت میں ہے۔ لیکن نہایت ہوشیار۔ خواندہ اور ذہین۔ جب بحث شروع ہوئی۔ تو خوب سنجیدہ اور بامعنی سوال و جواب ہوئے۔ ویلز کو ایسا معلوم ہوا کہ اس نے اس وقت تک اتنا قابل اور سمجھدار انسان نہیں دیکھا۔ جسم میں توانائی اور دماغ میں چستی۔ ویلز ویسے تو عیاش شخص تھا۔ لیکن آج اسے عجیب سا احساس ہوا۔ ان کی گفتگو تو نہایت سنجیدہ ادبی اور کتابی رہی۔ لیکن الگ ہوتے وقت معلوم نہیں کیوں اور کیسے انہوں نے ایک دوسرے کو چوم لیا۔ یہ ایک اچانک سا بوسہ تھا۔ ارادتاً نہیں۔ پھر کیا تھا۔ وہ جذبات سے لبریز ہوگئی۔ اور محبت کا اظہار کر دیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ بوسہ ایک قسم کا وعدہ ہوتا ہے۔ یہ بھی اسے معلوم تھا کہ ویلز ایک نہایت بے دھڑک جنسی قسم کی زندگی بسر کرتا ہے۔

ربیکا کا اپنا والد بھی ویلز کی طرح بلاٹوک عیاش تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس کی والدہ نہ صرف جنسی زندگی کے برخلاف تھی۔ بلکہ مردوں سے ہی نفرت کرتی تھی۔ اور اپنی تینوں بیٹیوں کو کنواری رکھنا چاہتی تھی۔ جب اسے ربیکا اور ویلز کی خط و کتابت کا پتہ چلا وہ سخت پریشان ہوئی۔ اور اپنی بیٹی کو لیکر سپین (Spain) چلی گئی۔ لیکن اس سے ربیکا کے جذبات میں کچھ فرق نہ پڑا۔ اس کی واپسی پر اس کی والدہ اور بہنوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ خفیہ طور پر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ قسمت کا کرنا کیا ہوا کہ وہ حاملہ ہوگئی۔ جس کا اسے نہایت رنج ہوا۔ اسے اس بات کا گمان تک نہیں تھا۔ وہ اپنے ادبی کام میں

مشغول رہنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے گھر میں رہنا ناممکن ہوگیا۔ الگ مکان کا انتظام کرلیا گیا۔ ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اور وہ بھی ۴ر اگست ۱۹۱۴ کو جس دن انگلینڈ نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اب وہ کھلم کھلا ایک دوسرے سے ملنے لگے۔

ان حالات میں ان کی محبت تو قائم رہی۔ اور ان کے دل صاف۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ادبی شغل میں وہ ایک دوسرے کے بالکل مخالف تھے۔ وہ تاریخ پر ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ لیکن وہ چاہتی تھی کہ وہ کچھ تخلیقی کام کرے۔ وہ خود ڈی۔ ایچ لارنس (D.H.Lawrence) اور جیمز جائیس James Joyce کی دلدادہ تھی جو ویلز کو نہیں بھاتے تھے۔ اور ہمیشہ اسے تنبیہ کرتا رہتا کہ ان کے قدموں پر نہ چلے۔

آخر وہ ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے جس پر ویلز نہایت پریشان ہوا۔ ان کے لڑکے انتھونی (Anthony) نے انہیں کچھ مدت اکٹھا رکھا۔ اس کے بعد وہ جنگ عالم میں فرانس۔ اٹلی اور پھر روس چلا گیا۔ اور چار سال (۱۹۱۶ء—۱۹۲۰ء) باہر ہی رہا۔ جب واپس آیا تو دو عظیم ترین ادیبوں کے تعلقات سرِ عام ہو چکے تھے۔ اور ادیب بھی ایسے کہ ایک شادی شدہ تھا۔ اور دوسری اپنے والدین اور بہنوں سے الگ ہو چکی تھی۔ انگلستان میں ان کا رہنا مشکل ہوگیا۔ اور وہ ۱۹۲۳ء میں پیرس چلے گئے۔ وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ لیکن ان کے ادبی تفرقات بڑھتے ہی رہے۔ اور آخر اس نے کہنا شروع کر دیا کہ اپنی بیوی جین (Jane) کو طلاق دے دو۔ اور مجھ سے شادی کرلو۔ جین اس کی عیاشی سے بخوبی واقف تھی۔ لیکن وفادار بیوی تھی۔ آخر وہ انگلستان واپس آ گئے۔

اب کچھ اور گل کھل گیا۔ مئی ۱۹۲۳ء میں ایک نہایت خوبصورت مگر ستم رسیدہ عورت وائینا (آسٹریا) سے لندن آئی۔ اور ویلز سے ملنے کی خواہش ظاہر کی کہ اسے آسٹریا کے نہایت پُر درد حالات سے آگاہ کرے اور اس کی ایک کتاب کا جرمن زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت چاہے۔ ویلز نے اسے چائے پر بلایا اور اجازت دے دی۔ اس کے بعد وہ کئی بار پھر وضاحت کے لئے آئی۔ ایک دن جب جین گھر میں نہیں تھی۔ اس نے کھلم کھلا نہایت پُر زور محبت کا اظہار کر دیا جو ویلز کو اچھا نہ لگا۔ لیکن وہ ایک ستم رسیدہ جلاوطن عورت کو دھکا نا نہیں چاہتا تھا۔ اور اسے ٹال دیا۔ جین کی وجہ سے نہیں۔ وہ تو اس کی عیاشی سے واقف تھی۔ ربیکا کی وجہ سے۔

اس مصیبت زدہ عورت کے پُر جذبات خطوط برابر آتے رہے۔ ایک بار اس نے لکھا کہ اس کے میزبان خاوند اور بیوی دونوں ویلز کے ادبی مداح ہیں۔ اور چائے پر بلا رہے ہیں۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو میزبان تو غائب تھے۔ لیکن وہ نیم برہنہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسے گھسیٹ کر اوپر کی منزل پر لے گئی اور وہ یہی کہتا رہا کہ یہ معاملہ ختم ہونا چاہئے۔ ختم ہونا چاہئے۔

اس کے بعد وہ آسٹریا واپس چلی گئی۔ لیکن اس کے خطوط برابر آتے رہے۔ اب اسے خیال آیا۔ کہ ان کا رشتہ مستقل سا ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ خود ہی کچھ کمزور نکلی۔ اور وہ پھر واپس لندن آ گئی۔ اور ویلز کو ملنے کی خواہش ظاہر

کی۔ لیکن اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اسے بار بار ربیکا کا خیال آتا۔ گو ربیکا خود اس وقت سینکلیر لیوس (Sinclair Lewis) کے ساتھ کچھ الجھ رہی تھی۔

چونکہ وہ لڑکی بغیر اطلاع دیئے آنے کی عادی ہو چکی تھی۔ ویلز نے اپنی نوکرانی سے کہہ دیا کہ اسے آنے نہ دیا جائے۔ ایک دن وہ کہیں باہر ڈنر پر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی شخص اس کے مطالعے کے کمرے میں داخل ہوا ہے۔ اس دن نوکرانی گھر پر نہیں تھی۔ اور جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے اپنے قالین پر لیٹا ہوا پایا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور واٹر پروف (Waterproof) کوٹ اتار کر پرے پھینک دیا۔ وہ بالکل ننگی تھی۔ اس نے چلانا شروع کر دیا۔ ''آپ مجھ سے محبت کریں ورنہ میں خودکشی کرلوں گی۔ میرے پاس زہر اور استرا دونوں ہیں''۔ ویلز بے بس ہو گیا۔ اسے خوف ہونے لگا کہ ستم رسیدہ عورت سچ مچ کچھ کر ہی نہ گزرے۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی گواہ موجود ہو جائے اور جب وہ چوکیدار کو جو نہایت قابل اعتبار شخص تھا۔ آواز دینے کے لئے مڑا۔ تو اس نے استرے سے اپنی کلائی اور بغل کو زخمی کر دیا۔ اور خون سے لت پت ہو گئی۔ ویلز نے اس سے استرا چھین لیا اور اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ خون برابر بہہ رہا تھا۔ اسے بند کرنے کے لئے وہ ٹھنڈا پانی لے آیا۔ لیکن وہ چیختی ہی رہی۔ ''مجھے مرنے دو۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں''۔

اتنے میں چوکیدار اور دو سپاہی وہاں پہنچ گئے۔ اور اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ لیکن وہ چلاتی ہی رہی ''میں تم سے محبت کرتی ہوں'' جب ویلز نے گھڑی دیکھی تو ڈنر کے لئے پون گھنٹہ دیر ہو چکی تھی۔ اور اس نے معافی کے لئے ٹیلی فون کر دیا۔ اور اس نازک معاملے کی سوچ میں پڑ گیا۔ خوش قسمتی سے پولیس اور پریس دونوں اس کے حق میں تھے۔ اگر برخلاف ہوتے تو وہ مصیبت میں پھنس جاتا۔ کئی اخباروں کا مالک لارڈ بیوربروک (Lord Beeurbrook) اس کا دوست تھا۔ اور اس کے ذریعے لارڈ راتھرمیر (Lord Rothermere) دونوں نے حکم جاری کر دیا۔ کم از کم دو ہفتہ کے لئے اس کی بابت کوئی خبر شائع نہ کی جائے۔

وہ عورت اتنی کمزور دل اور خر دماغ نہیں تھی۔ جتنی معلوم ہوتی تھی۔ ویلز کے پاس آنے سے ایک ہی دن پہلے وہ ربیکا سے ادبی مداح ہونے کی حیثیت سے ملی تھی تاکہ کچھ کوئی سا رشتہ پیدا ہو جائے اور ویلز کو پھنسا لے۔ اور اس تمام قصے کا ذکر بھی اسی لئے کیا گیا ہے کہ اس سے ویلز اور ربیکا کے تعلقات پر گہرا اثر پڑا۔ اس حادثہ کے دوسرے ہی دن ربیکا ویلز سے ملنے آئی گو ان کی گفتگو ادبی تفرقات اور اس حادثہ کے باوجود سنجیدہ سی رہی۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ وہ کسی اجنبی عورت یا مرد سے نہیں ملیں گے۔ لیکن ربیکا کا دل کچھ ٹوٹ سا گیا۔ اور اس نے امریکہ میں کچھ لیکچر دینے کی دعوت منظور کر لی۔ اور اکتوبر ۱۹۲۷ء کو چلی گئی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ اس نے دائمی جدائی کے لئے الوداع کہا ہے۔ وہاں جا کر اسے نئے دوست ملے اور ہر قسم کے نئے تجربات ہوئے اور آخر ۱۹۳۰ء میں اس نے شادی کر لی۔

اس لڑکی کو دھمکی دی گئی کہ وہ انگلستان سے نکل جائے ورنہ اس پر

خودکشی کا مقدمہ دائر کر دیا جائیگا۔ چونکہ وہاں اس کا کوئی دوست یا رشتہ دار نہیں تھا۔ ویلز نے اپنے دوست کی مدد سے اسے واپس بھجوا دیا۔ اس کے بعد اس کی محبت ختم ہوگئی اور کوئی خط نہ آیا۔ پھر معلوم ہوا کہ اس نے شادی کر لی ہے اور آرام سے ہے۔ اس کے بعد اسے جولائی ۱۹۳۷ء میں اپنے جنم دن پر ایک خط ملا۔ جس میں درج تھا کہ اب وہ پھر انگلستان میں ہے۔ شادی کے بعد خوش وخرم ہے۔ وہ ان سے کئی بار ملا اور ادبی ہدایات کیں۔

لنڈا اگڈ مین   مترجم: ف۔س۔اعجاز

خالی

جس وقت تم وہاں کھلی ہوا میں گھوم پھر رہے ہوتے ہو
ڈارلنگ

تم کیا سوچ رہے ہوتے ہو
تم کیا محسوس کر رہے ہوتے ہو
تم کیا دیکھ رہے ہوتے ہو
تم کیا سن رہے ہوتے ہو
تم کیا سونگھ رہے ہوتے ہو؟

اور کس طرح تم یہ سارے کام اکیلے کر لیا کرتے ہو
ان میں میری شرکت کے بغیر؟

میں تم سے پوچھتی ہوں انہی الفاظ میں
کیونکہ آج کی شب میں نے انہیں پڑھا ہے
اس خط میں جو تم نے مجھے پچھلی بہار میں لکھا تھا

اب میں تمہیں واپس بھیج رہی ہوں
تمہارے اپنے الفاظ
صرف اپنے اس اضافے کے ساتھ

.....کہ میرے ساتھ اب ایک ایسا خالی پہلو ہے
جہاں کبھی تم ہوا کرتے تھے
تم نے اتنی بڑی خلا چھوڑ دی ہے
جو کسی مسرت سے پُر نہیں ہو سکتی
سوائے تمہاری موجودگی کے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ۔ بھاگلپور (بہار)

لارڈ بائرن کی حیاتِ مُعاشقہ

انگلستان کے مشہور ترین اور دنیا کے جانے مانے رومانی شاعر جارج گورڈن بائرن کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔

چچا کی موت کے بعد جب بائرن کو لارڈ بنایا گیا تو اس کی ماں نے آس پاس کے امراء کے خاندانوں سے میل جول بڑھانا شروع کیا۔ حتیٰ کے اپنی سوت کے ماں باپ سے بھی رسم و راہ پیدا کی۔ اس طرح بائرن کی ملاقات اپنی سوتیلی بہن آگستا سے ہوئی جو اپنی ماں کے مرنے کے بعد اپنی ننھیال میں رہتی تھی۔

آگستا کی عمر اسوقت پندرہ برس کی تھی۔ اسکی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، خوبصورت چہرہ، سیاہ گھونگھریالے بال اور صراحی دار گردن کے علاوہ رسیلی آواز اور بات کرتے ہوئے ہاتھ ہلانے کا انداز۔ بائرن کو بہت بھلا لگتا تھا۔ سارا دن وہ باتیں کرتے رہتے اور ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ آخر وہ تھے بھی بڑے بھائی۔!

آگستا سے ملاقات کے کچھ عرصہ بعد ہی، یعنی جب بائرن کی عمر ساڑھے بارہ برس کی تھی، اسے ہیرو پبلک اسکول بھیج دیا گیا، جہاں امراء کے بچے پڑھتے تھے۔ یہاں بہت جلد وہ اپنے ساتھیوں میں مقبول ہوگیا۔ اس کے گرد مداحوں کا حلقہ سا قائم ہوگیا جو اس کی ذہانت، شہ سواری، کھیل اور تیراکی کی تعریف کرتے اور وہ اپنے آپ کو ایک شاہ سے کم محسوس نہیں کرتا۔

لیکن Harrow اسکول سے کیمبرج جانے کے بعد اپنی شاہ خرچیوں کی بدولت وہ جلد ہی بارہ ہزار پاؤنڈ کا مقروض ہوگیا۔ کیوں کہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ لندن کے قمار خانوں میں بے تحاشا جوا کھیلتا تھا، شراب پیتا تھا اور عورتوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا تھا۔

یہاں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہت قبل یعنی جب بائرن صرف آٹھ برس کا تھا تو وہ اپنے چچا کی لڑکی میری ڈف پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا تھا۔ اور میری ڈف کی باتیں سن سن کر اور اس کا چہرہ دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتا تھا۔ راتوں کو تارے گنا کرتا تھا اور بے چین رہا کرتا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر بعد میں بائرن نے اپنے جرنل میں کیا تھا۔

لیکن اس دوران آگستا سے اس کی خط و کتابت جاری رہی۔

بالغ ہونے پر اور اپنی جاگیر کا خود مختار مالک بن جانے پر اس نے مشرقی ممالک کے سفر کا ارادہ کیا۔ یونان، اسپین اور دوسرے ممالک کے سفر میں وہ خوب کھل کر کھیلا۔ جہاں بھی رکتا ایک آدھ معاشقہ ضرور لڑاتا اور

یادگار کے طور پر ہر محبوبہ کی زلف اپنے بکس میں رکھ لیتا۔ اسپین میں جب وہ ڈونا جوزفا کے تیر نظر کا شکار ہوا تو اس نے اپنی ماں کو ڈونا جوزفا کی زلف اس تاکید کے ساتھ بھیجی تھی کہ وہ اسے نہایت احتیاط سے اپنے پاس رکھے۔

انگلستان لوٹنے پر اسے بتایا گیا کہ سفر پر بے تحاشہ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ یہ دور اس کیلئے بہت پریشان کن تھا۔ اس نے پوری توجہ شاعری پر مرکوز کردی اور آگسٹا کو لکھا کہ وہ اس کیلئے کوئی صاحب جائیداد بیوی تلاش کرے۔

جب اس کی نظم ''چائلڈ ہیرلڈ'' شائع ہوئی تو اس کی شہرت آسمان سے باتیں کرنے لگی اور لوگ اسے رومانی تحریک کا پیشوا سمجھنے لگے۔ وہ جہاں کہیں جاتا، لوگ خصوصاً عورتیں اسکی ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب ہو جاتیں۔

اب اسے لندن کی اعلیٰ سوسائٹی میں ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ اور لیڈی ہالینڈ، لیڈی جرسی اور لیڈی وسٹ مورلینڈ کے یہاں پارٹیوں میں اسے مدعو کیا جانے لگا۔ جس کے سبب لڑکیوں اور عورتوں کو اپنے دام میں پھانس کر اپنی ہوس کا شکار بنانے میں اسے آسانی ہوگئی۔

اب بائرن اور آگسٹا کے تعلقات کی نوعیت بھی محض بھائی بہن کے رشتے کی نہیں رہی تھی۔

اونچی سوسائٹی کی عورتوں میں سب سے پہلے کیری کیرولین لیمب نے بائرن سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی۔ کیرولین شادی شدہ ہونے کے باوجود عیاش تھی۔ بیک وقت کئی کئی مردوں سے اس کے جنسی تعلقات تھے۔ بائرن کی نظمیں پڑھ کر وہ اس سے ملنے کی مشتاق ہوئی تھی۔ بالآخر لیڈی ہالینڈ کے یہاں دونوں کا تعارف ہوا اور پھر دونوں ایسے شیر و شکر ہوئے کہ لندن کی پارٹیوں میں دونوں کو اکٹھا بلایا جانے لگا۔ لیکن بائرن یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس پر کسی ایک عورت کی اجارہ داری ہو۔ وہ اپنی شہرت سے پورا فائدہ اٹھا کر خوب عیاشی کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تھوڑے دنوں کے بعد جب کیرولین کو اپنی جاگیر پر جانا پڑا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن کیرولین نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور لندن کی گلیوں میں ان کے معاشقے کی داستان عام ہوگئی۔ گھر والوں نے کیرولین پر سختی کی تو گھر سے یہ کہہ کر غائب ہوگئی کہ جلد ہی وہ اور بائرن انگلستان چھوڑ کر بھاگنے والے ہیں۔ لیکن بائرن نے اس سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کہ وہ اس کے ساتھ ایسی زندگی گذار چکا ہے کہ اب وہ اس کے قابل نہیں رہی۔

آگسٹا اب بائرن کے ساتھ ہی رہنے لگی تھی۔

کیرولین سے معاشقے کے دوران بائرن کی ملاقات اینابیلا نام کی ایک لڑکی سے ہوئی۔ یہ لڑکی اپنے چچا اور باپ کی پوری جائیداد کی واحد وارث تھی۔ اس کی دولت کی کشش نے بائرن کو مجبور کیا کہ وہ اپنی شادی کا پیغام بھیجے۔ کئی بار کے انکار کے بعد آخر دونوں کی شادی ہوگئی۔ لیکن چند روز بھی دونوں خوش نہ رہ سکے۔ بائرن کی بے توجہی، نفرت اور شراب کی عادت سے تنگ آ کر اینابیلا اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ وہیں اسے ایک بچی پیدا ہوئی جس کی اچھے ڈھنگ سے پرورش کی۔ غرض وہ پھر کبھی بائرن کے پاس نہیں گئی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اگر بائرن کے پاس چلی گئی تو اس کی بچی کی پرورش

ٹھیک ڈھنگ سے نہ ہو سکے گی۔

ابتدا میں آگسٹا کیلئے بائرن کا پیار بھائی کا پیار ضرور تھا، مگر اب آگسٹا اس کیلئے محض ایک عورت تھی۔ اور جب آگسٹا ایک عورت رہ گئی تو اس نے ایک لڑکی کو جنم دیا جس کا باپ بائرن تھا۔ اور بائرن نے اپنی اس بچی کا نام میڈورا رکھا۔

اینابیلا کی علیحدگی کی خبر اور آگسٹا سے تعلقات کی بات پورے لندن میں آگ کی طرح پھیل گئی اور بائرن کی شہرت کو گہن لگ گیا۔ اس کی شہرت بدنامی میں بدل گئی۔ قرض خواہ اسے تنگ کرنے لگے۔ لوگ بازاروں میں اس پر آوازے کسنے لگے اور اونچی سوسائٹی کی دعوتوں میں جانے کا اب اس میں حوصلہ نہ رہا تھا۔ اس نے انگلستان چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔

اب وہ یورپ کے ملکوں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ لیکن بدنامی نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ روم کے ایک گرجا میں جب ایک انگریز عورت نے بائرن کو آتے دیکھا تو اس نے اپنی لڑکیوں سے کہا کہ وہ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیں۔ اس نے طوائفوں سے دل بہلانے کی کوشش کی۔ نظمیں لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور عزت کی موت کیلئے یونان جا کر ترکوں کے خلاف ایک فوج کی تنظیم کی — اپنی جیب سے سپاہیوں کیلئے کھانے پینے، کپڑے اور تنخواہ کا انتظام کیا۔ مگر احساس جرم اور ازلی بدقسمتی کا خوف بڑھتا گیا اور عزت کی موت چاہنے والا یہ عظیم شاعر، اپنی بیٹی کو دیکھنے کی خواہش دل میں لئے ہوئے موت سے ہم آغوش ہوا!

لنڈا گُڈمین

مترجم: ف۔ س۔ اعجاز

جدی کیلنڈر

Capricorn Calendar

کتنی عمر ہے میری؟
اگلے برس میں ۹۲ سال کی ہو جاؤں گی
حالانکہ کسی دن میں خود کو ۲۰ سال سے
زیادہ کی نہیں بتاؤں گی
سب سالگرہ کارڈ اگر کاٹ ڈالے جائیں
اور انہیں پھینکا جائے
تب بھی میری عمر کا ہندسہ پُر اسرار رہے گا۔ اسے بتانا میرے لئے مشکل ہوگا
جب ٹھوکر کھا کر تمہارے اندر گری تھی
اُس وقت سے اب تک ۵۰۰ سال کی ہو چکی ہوں
پھر بھی ''شہزادی اور مینڈک'' جیسی کہانیوں میں
آج بھی مجھے یقین ہے
شاید میں آج بھی تین سال یا کچھ ایسی ہی عمر کی ہوں
تم کبھی نہیں جان سکو گے
کہ میں کتنی بوڑھی ہو چکی ہوں
پھر بھی میں تمہیں بتاتی ہوں
جس گھڑی ہم دونوں ملے تھے
میرا جنم ہوا تھا
اور آج — میں مر گئی ہوں!

تلخیص: ف۔ س۔ اعجاز

ظ انصاری کی کتاب ''پوشکن'' سے ماخوذ پوشکن کی حیاتِ معاشقہ

پوشکن — اپنی ہی آگ کا خس و خاشاک

(پوشکن: ۲۵ مئی ۱۷۹۹ء تا ۲۹ جنوری ۱۸۳۶ء)

۲۴ء کی خزاں سے ۲۶ء کی خزاں تک، پوشکن کو میخائیلوفسکوئے گاؤں کے پھوس بنگلے میں قیام کے دو برس ملے۔ دو برس یعنی خزاں کے تقریباً تین موسم۔

روس کے ان علاقوں میں خزاں سنہری ہوتی ہے، فرش پر حد نظر تک پیلے پتوں کا مخملی فرش' ہوا میں خنکی — دھوپ نکلنے پر موسم خوشگوار، فضا دھلی ہوئی، مہکی ہوئی، دھوپ نہ ہو تو بارش، فصل کٹ چکی۔ کسان فرصت سے ہیں۔ خزاں باہر گھومنے کا نہیں اندر بیٹھنے کا موسم ہے۔ اور یہی موسم ہے جس میں ہمارے شاعر پر وجد کا عالم طاری ہوتا تھا۔ جب وہ دنیا و مافیہا سے، خود اپنی الجھنوں سے بے خبر، بکھرے ہوئے، اُگے ہوئے، ابلتے ہوئے خیالات اور جذبات کو بے تحاشہ سپرد قلم کرتا چلا جاتا تھا — ذہن سے کاغذ تک کا سفر ان دنوں بہت ہی مختصر اور بے تکلف رہتا اور جو کچھ لکھا جاتا، کسی اور وقت نظر ثانی کے لئے اٹھا رکھتا۔

وہ وقت ہے کہ پوشکن سرکاری ملازمت سے نکالا جا چکا، ماں باپ نے منہ پھیر لیا۔ آنے کے تین دن بعد (۱۱/اگست ۲۴ء) کو ضلع کے صدر مقام پر، سرکاری دفتر میں ''اچھے چال چلن'' کے شرط نامے پر دستخط کرنے پڑے۔ اجاڑ بستی کے اس دو سو برس پرانے نیم شکستہ بنگلے میں بھی چار نظریں اس پر پہرہ دے رہی ہیں، پولیس والے کی اور پادری کی، دوستوں، عزیزوں اور قدردانوں سے دور، اور اپنے مستقبل کی روشنی سے بے بہرہ۔

بلبل ہے آشیانے سے دور اور شکستہ پر

میخائیلوفسکوئے میں چند روز سفر کی تکان اتارتے ہی پہلا تاثر یہ ہے:...... کیا بری جگہ ہے یہ — دم گھٹا جاتا ہے، اداسی میرے سینے پر سوار ہوئی جا رہی ہے...... دم گھٹے جانے کا احساس بار بار راجدھانی میں با رسوخ دوستوں کو خط لکھوا رہا ہے اور یہاں سے رہائی کے لئے سفارشیں کرا رہا ہے، لیکن ابھی دو برس نہیں ہوئے، پوشکن نے اسی ''اجڈ، بے رونق گاؤں'' میں جب اپنے فکروفن کی ہری بھری فصل دیکھی تو لکھا:

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ روحانی صلاحیتیں کمال پختگی کو پہنچ گئی ہیں۔ اب میں ادب تخلیق کر سکتا ہوں...... (ک نمبر ۲۲ ص ۲۵۹)

اداسی، بیزاری اور گھٹن سے لے کر ذہنی راحت اور احساس کمال تک کا طویل فاصلہ جن دو برسوں کی مختصر مدت میں طے ہو گیا، انہی میں ہمیں

پوشکن سے بے تکلفانہ مل لینا چاہیئے۔ یہی وقت ہے اس کے روز و شب خلوت و جلوت اور قرار و بے قراری کے عالم تک رسائی حاصل کرنے کا سبب؟ تو سبب اس کے کلام میں پس منظر کی طرح چھپا ہوا ہے۔ گہرا سماجی شعور رکھنے والے ایک بڑے فن کار کی شخصیت المناک آزمائشوں کی کٹھالی میں تپ کر، گل کر، کندن ہو رہی ہے۔

ماحول کی بے رونقی سے اکتاہٹ کا توڑ یوں بھی نکال لیا تھا کہ پڑوس میں تری گورسکوئے جاگیر والوں سے پوشکن کی دور کی رشتہ داری تھی۔ بچپن میں بھی وہ ایک دو بار ماں کے ساتھ یہاں آچکا تھا۔ اب جو آیا تو دیکھا کہ ۴۰ برس کی ایک خوش باش اور خوش ذوق خاتون مادام اسی پووا میں، ان کی دو نوجوان بیٹیاں ہیں۔ بھتیجیاں، بھانجیاں ہیں، سوتیلی بیٹی ہے اور لڑکا، جو سرحدی مقام ''دورپٹ'' (Durpet) کی جرمن یونیورسٹی میں تعلیم پاتا ہے، کبھی کبھی چھٹیوں میں گھر آجاتا ہے۔ پوشکن کا سب سے پہلے اسی نوجوان سے دل ملا اور اسی کے اصرار پر وہ تری گورسکوئے والے خاندان میں آنے جانے لگا۔ شاعر خصلت بڑی، جو کنبے میں سب سے لئے دیے رہتی تھی، پوشکن پر مرمٹی اور پوشکن چھوٹی پر، دونوں حالتوں میں فریق ثانی ناکام رہا— البتہ اسی محفل بساط پر، سات برس پہلے کی ایک اور محبۂ الفت حسینہ مادام کیرن اتر آئی جو مادام اسی پووا کے ہاں اتفاق سے مہمان آئی ہوئی تھی۔ پیٹرسبورگ میں اس خاتون کے حسن کے چرچے ہو رہے تھے۔ سات برس پہلے کسی فیشن ایبل محفل میں اس آوارہ منش ''حملہ آور'' سے روشناس ہو چکی تھی۔ اور حافظے میں تب کا ایک ہلکا سا نشان رہ گیا تھا۔ بعد میں کسی عمر رسیدہ دولت مند جنرل سے اس کی شادی ہوگئی اور یہ شادی گویا سوسائٹی سے داد حسن لینے اور شدت جذبات کا منہ مانگا انعام پانے کے لئے ایک لائسنس بن گئی۔ پوشکن نے تیور بھانپ لئے اور دو تین ملاقاتوں کے بعد ہی اظہار تمنا کر دیا۔ وہ بھی ایک ایسی نظم کی زبان میں، جو نرم نگاہی، سوز، اور دھیمے بہاؤ کی ملی جلی غنائی کیفیت کی بدولت پوشکن کے بہترین نغموں میں شمار ہوتی ہے:

وہ لمحہ مجھے یاد ہے بے مثال — جب آنکھوں پہ ارم تھا تیرا جمال
فریب نظر تھا کہ حسن پری — گزرتی ہوئی اک جھلک دیکھ لی
سلگتی ہوئی شام تنہائی میں — بھری بزم میں، جلوہ آرائی میں
سنی ہے وہ کومل صدا دیر تک — کبھی خواب میں دیکھ لی ہے جھلک
گئی عمر...... اور ساتھ لیتی گئی — امنگوں کی شورش، مرادوں کے دن
کئی رات، چمکیلی بڑی چاندنی — وہ کومل صدا، اس کی یادوں کے دن
کہیں کالے کوسوں پرانوں سے دور — کٹے ایسے کتنے برس بیش و کم
نہ ذوق سخن اور نہ ایماں کا نور — نہ جینے کی لذت، نہ الفت کا غم
مگر روح جاگی ہے مدت کے بعد — مجھے پھر میسر ہے تیرا جمال
اسی حسن سے آج آنکھیں ہیں شاد — فریب نظر ہے کہ حسن خیال
دھڑکتا ہے دل، جسم کو ہے سرور — ملی دوسری زندگی تازہ دم
سخن کی تب و تاب، ایماں کا نور — مزا زندگی کا، محبت کا غم

یہ شاعر نواز خاتون پوشکن کی موت کے ۲۲ برس بعد تک زندہ رہیں

اور انہوں نے اپنے نام پوشکن کے خطوط اور معاملات ایک ہوش ربا دعوے اور دیباچے کے ساتھ شائع کر دیئے۔ اسی یادداشت میں وہ شاعر کی تصویر یوں کھینچتی ہیں۔

...... اپنے برتاؤ میں بڑا ہی بے ڈھب آدمی تھا (گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ) ابھی قہقہے مار رہا تھا، ابھی منہ لٹکائے بیٹھا ہے، کبھی بالکل دبو، کبھی دھاندلی اور زبردستی پر آمادہ، کبھی بے اعتبار بجھا ہوا اور بعض وقت بے لطف اور اینٹھا ہوا، کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ نہ جانے دم بھر میں کیا موڈ ہو جائے ...... اپنے جذبات پردے میں رکھنا نہیں آتا تھا اسے، جب دیکھو دل کی بات زبان پر۔ اگر کوئی خوش گوار واقعہ ہو گیا ہے تو ناقابل بیان بھلا مانس۔ ایک بار تری گورسکوئے میں ...... کتاب بغل میں دبائے آیا۔ ہم سب اس کے گرد سمٹ آئے۔ اور اس نے ہمیں اپنی نظم بنجارے ("سگانی") سنانی شروع کر دی۔ ایک تو نظم کی روانی اور پھر اس کی خوش الحانی، پڑھنے کے انداز میں اس قدر ترنم بھرا تھا کہ مجھے تو نشہ ہو گیا، وہی بات جو اس نظم میں (جلاوطن اطالوی شاعر) کے بارے میں کہی، وہ خود اسی پر صادق آتی تھی:

اپنے گیتوں سے جادو جگاتا تھا وہ
اور گلے میں کچھ ایسی کرامات تھی
جیسے چشمے ابلتے ہوں
جھرنے اچھلتے ہوں
جس وقت گانے پہ آتا تھا وہ

مگر اس طویل ڈرامائی نظم میں، جو پوشکن نے انہی دنوں صیقل کر کے اشاعت کے لئے تیار کی تھی، نوجوان اور بے باک بنجارن کا وہ گیت بھی شامل ہے، جو پوشکن نے خود بنجاروں کی زبانی سنکر اسی لئے، اسی بے باکی کے ساتھ روسی سانچے میں ڈھالا تھا:

میرے بوڑھے خصم
چاہے خنجر چلا
چاہے زندہ جلا
چاہے کر دے بھسم

مادام کیرن لکھتی ہیں کہ نظم سنانے سے پہلے اس نے مجھ سے کہا کہ خاص آپ کے لئے لایا ہوں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ وہ یہ شاہکار نظم شاعرانہ ترغیب کے طور پر لایا تھا یا شاطرانہ ترغیب کی خاطر۔ نتیجہ بہرحال پوشکن کے حسب منشا نکلا۔ کم از کم تین نظموں میں ہمیں اس "پری جمال" اور "اپسرا خصال" حسن کی جھلک ملتی ہے ـــ لیکن پرائیوٹ خطوں اور تذکروں سے جو تصویر مادام کیرن کی ابھرتی ہے، وہ کچھ اور کہتی ہے۔

خون میں ہے تپش تمنا کی   روح تیرے ستم کی ہے شاکی
پیار کر لے کہ تیرے پیار لذیذ   مجھ کو عود و شراب سے بھی عزیز

میری آغوش میں جھکا لے سر — سو رہوں میں سکون سے دم بھر
اس سے پہلے کہ دن نکل آئے — اور سحر بجائے رات کے سامنے

پڑوسی تری گورسکوئے کی آمد و رفت رائگاں نہیں گئی۔ اس شریف شائستہ اور مطمئن خاندان کے ماحول سے اس نے کردار بھی چنے، قدرتی بھی، چال ڈھال اور ماحول بھی — ورنہ ''ایوگینی آنے گن'' میں بیان کی صداقت صرف تخیل سے کہاں جنم لیتی!

اور بھی موقعے ملے ہوں گے، لیکن روسی قصبات میں پڑے ہوئے اپنے حسب ونسب اور روسی کلچر کے ننگ و ناموس کی خدمت یا حفاظت کرنے والے شرفا کی زندگی اور ان کی بہو بیٹیوں کی نفسیات کے گہرے مشاہدے کا پورا موقع پوشکن کو یہیں ملا۔ ایک مقام پر وہ لکھتا ہے:

میرے پڑھنے والوں میں سے جو لوگ کبھی دیہات میں نہیں رہے، ہرگز تصور نہیں کر سکتے کہ قصبات کی شریف زادیاں ہونا کیا عمدہ بات ہے! صاف ستھری ہوا میں، اپنے باغیچوں کے سیبوں تلے پل کر بڑی ہونے والی یہ لڑکیاں سوسائٹی اور زندگی کا گیان کتابوں کے ذریعہ حاصل کرتی ہیں۔ خلوت کی یکسوئی، آزادی اور کتابوں کی ورق گردانی ان میں قبل از وقت وہ جذباتی تلاطم پیدا کرتی ہیں جس کی ہوا تک ہماری مدہوش حسیناؤں کو نہیں لگتی! گھوڑا گاڑی کی گھنٹیاں بجیں تو لہو کی گردش تیز ہوگئی، پاس کے شہر میں ہوا خوری کر لی تو زندگی بھر کے لئے ایک واقعہ بن گیا۔ کوئی مہمان آ گیا تو ایک زمانے تک بلکہ بعض اوقات عمر بھر اس کی یاد رہ گئی ---- ان میں کردار کی کوئی خصوصیت کوئی انفرادیت ضرور ہوتی ہے۔ جس کے بغیر، بقول ژاں پال کے، انسانی عظمت کوئی معنی نہیں رکھتی .....

(ک ۳۳، ص ۱۶۱)

تری گورسکوئے والوں کی بڑی لڑکی آنا، اس کی بے رخی اور روکھے پن کی شکایت لئے ہوئے قصبے سے باہر چلی گئی۔ اور چھوٹی جسے گھر میں سب پیار سے زیزی (ZIZI) کہتے تھے، بعد میں مسز وولف کی نامور بیوی کہلائی، اگر وہ پوری طرح پوشکن کے کلام کی شہرۂ آفاق ہیروئن تاتیانا نہیں تو کم از کم اس کا ایک رخ ضرور ہے۔ دوسری قصباتی دوشیزاؤں کا لہو پسینہ بھی اس کردار کی رنگ آمیزی میں صرف ہوا ہے۔ مگر ایک بھولی بھالی کسان لڑکی کا ذکر کئے بغیر یہ ذکر نا تمام رہے گا۔

بڑی بی ''ارشیا'' سے سینا پرونا سیکھنے کے لئے آس پاس کی دیہاتی الھڑ کنواریاں آجایا کرتی تھیں۔ ان میں سے ''اولگا'' نام کی ایک لڑکی کافی دنوں پوشکن کی منظور نظر رہی۔ ربط ضبط یہاں تک بڑھا کہ ہمسایوں کو شک ہونے لگا۔ کسی کمیرے کسان کی بیٹی کا یوں نوجوان جاگیردار سے وابستہ ہو جانا کوئی انوکھی بات نہ تھی — (خود پوشکن اپنی ۱۹۱۹ء کی ایک نظم میں اس کا رونا رو چکا تھا) تاہم جب اس میں پوشکن کے بچے کی ماں بننے کے آثار ظاہر ہوئے تو شاعر، نہ جانے بدنامی کے ڈر سے، یا مستقل وابستگی کے اندیشے سے،

احتیاطی تدبیریں کرنے لگا۔ وہ اس کی سادگی اور سپردگی کا دلدادہ ضرور تھا مگر واقعے کو کھلے عام اپنانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک خط اسی اولگا (کلاشنی کووا) کا اور ایک پوشکن کا رقعہ اپنے عزیز دوست پرنس ویازیمسکی کے نام اس حادثے کے در پردہ گواہ باقی بچے ہیں:

پیارے ویازیمسکی، تم اپنا منہ بند رکھو، میں اپنا۔ ہم دونوں اپنے اپنے منہ پر تالا ڈال لیں، کسی دن سو فتے میں اس پر بات ہوگی۔ فی الحال ایک معاملہ آن پڑا ہے۔ میرا یہ خط تم تک ایک نہایت دل کش اور نیک دل لڑکی کے ہاتھوں پہنچے گا۔ اس لڑکی کو تمہارے ایک عزیز دوست نے اپنی حماقت سے حاملہ کر دیا۔ اب صرف تمہاری شرافت مروت اور دوستی کا آسرا ہے۔ ماسکو میں کہیں اس کے سر چھپانے کا انتظام کر دو، جتنی رقم کی ضرورت ہو اسے دے دو۔ بعد میں اسے بولدینو (میرے آبائی گاؤں پر، جہاں مرغے، مرغیاں اور بھالو بھی ہیں) بھیج دینا...... اور سنو، پدرانہ شفقت کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ بال بچہ ہو لے، بیٹا ہو تو اس کی دیکھ بھال کرنا۔ میں اسے (لاوارثی) یتیم خانے کے سپرد نہیں کرنا چاہتا...... دوست، سچ کہوں، مجھے شرم آرہی ہے، یقین کرتا کہ شرمندہ ہوں، مگر میری شرمندگی کا اب کیا حاصل!......

پوشکن نے اور کہیں اس واقعے کا ذکر نہیں کیا۔[1] البتہ کسانوں سے

''حسن سادہ'' اور ''دل سادہ'' کی داد دیتے وقت وہ ایک افسانوی کردار ''ایدا'' کا نام ضرور لیتا ہے۔[2]

پوشکن پر یہ دن بھاری گزرنے لگے، چوتھی بار اس نے غیر ممالک کی ''تازہ ہوا'' کھانے کی کوششیں شروع کیں:

۱۸۲۸ء کا موسم بہار تھا، پوشکن کی طرف سے درخواست گزری کہ قفقاز میں جنگ روس و ترکی کے محاذ پر اسے خدمت کا موقع دیا جائے، انکار ملا، پھر دوسری درخواست دی کہ صحت اچھی نہیں رہتی، تبدیل آب و ہوا کے لئے کہیں باہر — اور کہیں نہیں تو چین میں روسی سفارت خانے پر تعینات کر دیا جائے۔ اس کا جواب وزیر داخلہ کے نام سے اور شاہی ایما سے یہ آیا کہ جب تک خود چینی حکومت نہ چاہے، کسی نئے نام کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

پوشکن سر پٹک کے بیٹھ گیا۔ اس پر خاموشی اور تفکر کے دورے پڑنے لگے۔ ایک طرف یہ بے قراری تھی کہ اس عادی ماحول سے بھاگ نکلے دوسری طرف یہ احساس کہ کہیں مستقل ٹھکانا کر لینے، زندگی اور ادب، دونوں کی گمبھیر نثر میں سر کھپانے کا وقت آگیا ہے۔ چو طرفہ معاشقوں میں سے کسی ایک نشانے کو وہ اپنا محفوظ آشیانہ بنا لینے کی تدبیر سوچتا رہا اور انہی تدبیروں کے

---

[1] پوشکن کے عقیدت مند سوانح نگار، جنہیں بال کی کھال نکالنے میں مہارت حاصل ہے، وہ دوسرے کے ذکر سے دامن بچاتے ہیں۔

[2] خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں (اچھا یہی ہے کہ اپنے محبوبوں کا ذکر دوسروں کا قصہ بنا کر کیا جائے) [illegible] "روسالکا" (جل پری) نام کا منظوم ڈرامہ اسی [illegible] پر پہنچ کر [illegible]

کارن نئی شکارگاہوں میں الجھتا چلا گیا۔

۲۹-۱۸۲۸ء کی سردیوں میں وہ ماسکو کے ایک بڑے دیوان خانے میں مدعو تھا۔ رقص و موسیقی کی محفل تھی۔ درباریوں اور رئیسوں کی بہو بیٹیاں بن سج کر، بڑے رکھ رکھاؤ سے رونق افروز تھیں۔ خود بادشاہ سلامت نے جو خود بھی، قناعت پسند شوہر کہلانے کے باوجود نہایت حسن پسند طبیعت رکھتے تھے، اس محفل کو اپنی موجودگی کا شرف بخشا تھا۔ پوشکن، بال روم ڈانس کا رسیا، ایک گوشے میں چپ چاپ گم، گویا موسیقی کا لطف لے رہا ہے۔ اتنے میں میزبان خاتون خوش اخلاقی کے ساتھ متوجہ ہوئیں اور چھریرے بدن کی ایک ترشی ہوئی نوخیز لڑکی سے، جس پر پوشکن کی نظریں جمی ہوئی تھیں، پوشکن کو خیال آیا کہ وہ عمر کی ۲۹ بہاریں دیکھ چکا ہے اور اسے پہلی بار خزاں کی آہٹ محسوس ہوئی۔

والز کی موسیقی بلند ہوئی تو وہ ادب سے اس لڑکی کی طرف بڑھا، ساتھ ناچنے کی درخواست کی اور موسیقی کی دھن پر قدم سے قدم ملاتے، چکر کاٹتے وقت اس بار یوں محسوس ہوا کہ بے خودی طاری ہوئی جاتی ہے۔ اطالوی مصور رفائیل نے فلورنس میں جس ''میڈونا'' (Madonna) کو خواب میں دیکھ کر تصویر کے پردے پر اتارا تھا — وہ ڈریسڈن (Dresden) کی گیلری سے اتر کر اس کے بازوؤں میں، سانسوں کے قریب آگئی ہے۔ پوشکن کو گویا اس نیم روشن رات جگمگاتی محفل میں اپنے ایک طویل خواب کی تعبیر مل گئی۔ زار کی نگاہ بھی کئی بار اس کمسن صبر آزما حسن کی طرف اٹھ اٹھ کر پھسل

چکی تھی۔ یہ تھی نتالیا نکولائیونا گنچاروا۔ پوشکن نے تیسرے ہی دن پیغام بھجوا دیا۔ بعد کے دو مہینے کسی نہ کسی حیلے بہانے سے وہ گنچاروف خاندان کے چکر لگاتا رہا۔

معلوم ہوا لڑکی کے پردادا نے کالوگا ضلع میں روس کا پہلا کپڑا مل لگایا تھا۔ خوب چلا، تیسری نسل نے فضول خرچی، بدعنوانی اور بدانتظامی میں ساری دولت لٹادی۔ اب نقد رقم نہ ہونے سے کارخانے کے نیلام ہونے کی نوبت آچکی ہے۔

نتالیا نکولائیونا کی دو بہنیں تھیں، ایک بھائی اور ان تینوں میں اگر ماں کو کسی سے مدد کی، مستقبل سدھر جانے کی امید تھی تو اسی سولہ برس کی بیٹی سے جس کے حسن کی دھوم تھی لیکن قابل ذکر رشتہ کہیں سے نہیں آیا تھا۔ ماں باپ کے مزاج اور حالات کے کارن شریف زادے کتراتے ہوں گے۔ پہلا باقاعدہ رشتہ ایک ایسے شاعر کا پہنچا جو اپنے سیاسی اور مذہبی عقائد کے علاوہ چال چلن کے حساب سے بھی شہر میں کافی بدنام تھا۔ ماں نے صاف انکار تو نہ کیا۔ لڑکی کی کم عمری پر ٹال دیا۔

انہی دنوں اس نے ''فن برائے فن'' کے نظریے کی تبلیغ شروع کی اسے بالکل ہی دوسری صفوں سے اپنے حلیف ملنے لگے اور پچھلے حلیف حریف بن گئے۔ اگست (۱۸۳۰ء) تمام ہو رہا تھا۔ خزاں کا رنگ فضا میں بکھرنے لگا تھا کہ پوشکن اجازت لے کر اپنے آبائی گاؤں بولدی نو پہنچا۔ گیا تھا اس خیال سے کہ باپ نے شادی کے مصارف کے سلسلے میں بولدی نو کی جاگیر کا ایک حصہ

اس کے نام کرنے کا وعدہ کیا ہے اسے دستاویزی شکل دے، جاگیر کا انتظام دیکھے، وہاں کالرا پھوٹ پڑا۔ اور قرنطینہ کی پابندیوں نے اسے یہیں خزاں کے تین مہینے گزارنے پر مجبور کردیا۔

وبائی حالات اور آبائی دیہات نے پوشکن کے دل و دماغ پر کیا ستم نہ توڑا ہوگا مگر جس دن وہاں سے رہائی ہوئی، شہر آتے ہی اپنے ہم قلم دوست اوڈیر پلتنیف کو بڑے جوش وخروش سے خبر دیتا ہے۔

> ''دیکھو کیا کیا لایا ہوں'' آنے گن'' کے آخری باب ...... پریس بھیجنے کے لئے بالکل تیار۔ ایک طویل منظوم افسانہ مثن جو اپنا نام دیے بغیر شائع کراؤں گا۔ کئی ڈرامائی مناظر یا یوں کہو چھوٹے المیے (ڈرامے) یعنی کنجوس امیر۔ موزارٹ اور سلیری، پلیگ کی وبا میں دھوم کی دعوت، اور دون جوآن ان کے علاوہ کوئی ۳۰ مختصر نظمیں، خوب؟ اور ابھی فہرست تمام نہیں ہوئی۔
>
> (راز میں صرف تمہیں سے کہتا ہے) نثر میں پانچ طویل افسانے لکھے ہیں ...... وہ بھی ہم مصنف کا نام دیئے بغیر چھاپیں گے میرا نام دینا مناسب نہیں ورنہ وہ ویلیارین کیڑے نکالے گا۔

ان عذابوں میں رہ کر کوئی شخص اتنا نقل نہیں کرسکتا جتنا پوشکن نے لکھ لیا۔ شاید آزمائشوں کی بھٹی میں اس کی روح پگھلتی رہتی تھی اور خلوت میں یکسوئی کے ساتھ وہ پگھلی ہوتی دھات کو طرح طرح کے سانچوں میں ڈھال لیتا تھا۔

یہ محض قیاس نہیں، پوشکن خود بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ ۱۸۳۱ء کی شروع تاریخوں میں جوآن کا اچانک انتقال ہوگیا۔ شاعر کا بیان ہے کہ ایک وہی رہ گیا تھا میرا مونس وہمدم، دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ۱۲ر جنوری کے ایک خط میں اور اس کے چند روز بعد، شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں ۱۰ر فروری کو لکھا:

> ''میں بالکل سردمہری سے دیکھتا ہوں اس صورت حال کے نفع نقصان کو، جو خود میں نے اپنے لئے چنی ہے۔ نوجوانی شوروشغب میں، لاحاصل گزرگئی۔ آج کے دن تک میں زندگی کی روش عام کے خلاف چلا، اس کے برخلاف جیا۔ ''شادمانی صرف عام ڈگر پر [کھری] ملتی ہے'' میں اب ۳۰ سال کا ہوگیا۔ اس عمر تک لوگ عموماً شادی شدہ ہوجاتے ہیں۔ میں بھی اب اوروں کی طرح اس سمت میں بڑھتا ہوں۔ شاید پچھتانا نہ پڑے ...... اسی لئے کسی ترنگ کے بغیر نوجوانی کی سی امنگ کے بغیر شادی کرلوں گا، مستقبل کی تصویر میرے لئے گلاب کی سی خوش آئند نہیں ہونے والی۔ سخت احتیاجوں میں گزرے گی غم میرے لئے کوئی انہونی بات نہیں، وہ تو روزمرہ کا خانگی معمول ہیں، البتہ جو بھی خوشی میسر آئے گی، وہ انہونی ضرور ہوگی''۔

ہم قلم ہم خیال ہمسر دوست کی موت پر فسردہ پوشکن گزراں لمحات میں اداس رہنے کے باوجود کسی وقت بھی امنگوں سے ارمانوں سے خالی نہیں رہا۔ اوپر کے تعزیتی خط سے صرف چند ہفتے پہلے وہ پیترسبورگ کے بازار سے گزر رہا ہے، مصوری نمائش میں ایک تصویر دیکھتا ہے ''میدونا'' کی۔ ایک ارمان چمک اٹھتا ہے اور وہیں کھڑے کھڑے نظم نازل ہوتی ہے جسے وہ خط کی صورت میں اپنی منگیتر ناتالیا گنچارووا کو ڈاک سے بھیج دیتا ہے:

کبھی تمنا نہ تھی کہ میں اپنا گھر سجالوں
پرانے وقتوں کے شاہکاروں کو فن کے دیوار و در سجالوں
جو آئے تکتا رہے وہ پہروں، بڑی توجہ سے دیکھے بھالے
کہ جیسے اہل نظر ہی ہیں پرکھنے والے
یہ آرزو تھی کہ میرے گھر میں، جہاں مشقت ہے ریشہ ریشہ
بس ایک تصویر روبرو ہو، اسی کو دیکھا کروں ہمیشہ
شبیہ دوشیزہ حسن مریم، مسیح پاکیزہ ابن مریم
نگاہ ایسے اٹھے کہ رنگوں کے پیرہن میں نہیں، وہ بادل میں ہیں مجسم
وہ دونوں قدسی صفات چہرے، کئے ہوئے نور اُن کا ہالہ
جبیں پہ عظمت، نظر میں معصومیت کا جادہ
نہ ہو ملائک کا دخل، بس ''زیون''[1] کے سائے میں ہوں وہ تنہا
مراد بر آئی دل کی — پروردگار نے تجھ کو میری خاطر
زمیں پہ نازل کیا، سنوارا یہ روپ دے کر مری ''میدونا''
لطافت و دل کشی کا پیکر، نفاست و حسن کا نمونہ

پوشکن کا یہ ارمان پورا ہوا اور ۱۸ر فروری ۱۸۳۱ء کی دوپہر کو ماسکو کے ایک پرانے چرچ میں شادی انجام پا گئی۔ آدھا شہر یہ تقریب دیکھنے ٹوٹ پڑا تھا۔ چھ دن بعد اس نے پلتنیف کو اپنا تاثر لکھ دیا۔ ''اب میں شادی شدہ ہوں، شاد ہوں، اب اگر کچھ آرزو ہے تو یہ کہ زندگی میں رد و بدل نہ ہو۔ اس سے بہتر کی توقع نہیں رکھتا۔ یہ کیفیت میرے لئے اس قدر انجانی ہے گویا میں نے نئے سرے سے جنم لے لیا''۔

''ملکہ زارینہ کی خواص، مس الیکساندرا روزتی (Alexandra Rossetti) نے ناتالیا کا ماتھا چوما اور آرام کرسی میں دھنس گئی۔ بیٹھتے ہی اپنا ایک دستانہ ہاتھ سے نکالا اور اس کا پنکھا بنا کر جھلنے لگی۔

''تمہارے شوہر گھر پر ہیں؟'' الھڑ بیوی کے چہرے پر بڑی بڑی کالی آنکھیں جماتے ہوئے اس نے پوچھا۔

ناتالیا کشیدہ کاری میں مصروف ایک نیچی کرسی پر بیٹھی تھی۔

''ہیں تو — تمہیں ان سے کیا؟''

''کیوں؟ جل گئیں؟'' الیکساندرا نے سکون سے کہا ''تمہیں معلوم ہے کہ جب تمہارے الیکساندر (پوشکن) کو مجھ سے محبت نہیں تو میں بھی کوئی ان کے عشق میں مبتلا نہیں رہنے والی۔ تمہارا کیا جاتا ہے اگر میں اوپر جا کر ان سے

---

[1] پہاڑی پر وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی Zion

سن لوں۔ ان کا کلام سن لوں؟''

''مجھے تو یہی جتاتے رہے ہیں کہ ان معاملات کا عورتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا'' نتالیا نے منہ پھلاتے ہوئے جواب دیا۔

''لو، اور بھی ثابت ہوگیا کہ وہ مجھے عورت شمار نہیں کرتے''۔ الیکساندرا نے وضاحت کی اور بولی:

''چلو، بس، نتالیا۔ نادان مت بنو۔ میں اوپر جاتی ہوں تمہارے شوہر سے ملنے''

وہ دھم دھم گلدان پھلانگتی، سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی اور دروازہ کھٹکھٹائے بغیر کمرے میں داخل ہوئی۔ پوشکن اونچی پشت کی لمبی آرام کرسی میں دراز تھا، اس کے بال صبح کے غسل سے بھیگے ہوئے تھے۔ کرسی کے اندر اس قدر دھنسا ہوا لیٹا تھا کہ چھریرا بدن اور بھی نازک بلکہ لاغر نظر آرہا تھا۔ ہری شربت کی ایک بوتل نقشوں کی کسی قلمی کتاب پر نزدیک رکھی تھی کہ آسانی سے ہاتھ پہنچ سکے۔

''گڈ مارننگ، عزیز من'' اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لئے اٹھتے ہوئے پوشکن نے کہا — اسے یہ شاہی محل کی (Demi Vierge) بڑی بڑی ''میدونا'' جیسی آنکھوں اور مردانہ خصلت والی لڑکی دل سے پسند تھی۔ اس کے سامنے حسین اور بے زبان نتالیا بے لطف معلوم ہوئی تھی۔ بادشاہ سلامت اس لڑکی کو الیکساندرا کہہ کر (بے تکلفی سے) پکارتے، ژوکوفسکی اور ویازیمسکی (جیسے چلتے کار) اس سے ادب پر بحثیں کرتے۔ عشق و عاشقی کی کئی افواہیں اس کے دم کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ بڑی بے ڈھب لڑکی تھی۔ شائستہ دیوان خانوں میں بیٹھ کر روسی زبان بولنے سے اسے کوئی عار نہ تھا۔ جہنم میں جائے وہ، پیاز کی سی باس آتی ہے اس میں سے، یہ اس کا تکیہ کلام تھا، سرکاری ڈنر کی میز پر بے تکلف دوبارہ شوربے کی فرمائش کر دیتی۔ وہ ان چند عورتوں میں سے تھی جن کے ساتھ پوشکن ادب کے معاملات پر تبادلۂ خیال کر لیتا۔ روزانہ صبح پوشکن کے گھر کا پھیرا کرتی کہ کل رات جو لکھا ہو، اسے سنا ڈالے۔

الیکساندرا ابھی اپنے لباس کا کسا ہوا فیتہ کھول رہی تھی کہ الیکساندرا (پوشکن) نے پانی کا گلاس غٹ غٹ پیا اور پڑھ کر سنانے لگا''۔

ایک یہ الیکساندرا تھی جس کی آمد شاعر کو گراں گزرتی تھی — ایک اور الیکساندرا گھر کے اندر موجود تھی، نتالیا پوشکینا کی بڑی بہن اور قریب قریب ہمشکل، جس نے خانہ داری کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں، جو شاعر پرست، سخن فہم اور ہمدرد ہونے کے باعث پوشکن کا اس درجہ خیال رکھتی تھی کہ باہر سے دیکھنے والے اگر اجنبی ہوتے تو اسی کو شاعر کی رفیقۂ حیات سمجھ بیٹھتے۔ بہنوں میں اسی بات نے مستقل شکر رنجی کی صورت اختیار کر لی تھی۔

پھر شہر میں صحبت یافتہ رئیس زادوں اور فن و ادب میں دخل رکھنے والوں کے دیوان خانے تھے جہاں نوخیز حسینائیں اور آزمودہ کار امیر زادیاں فنکاروں پر مہربان رہتی تھیں — پوشکن کی ہر جگہ رسائی اور پذیرائی تھی۔ پرانی ''رسوائیاں'' بھی ابھی تک چل رہی تھیں۔ جو بیوی کے کانوں تک پہنچتی ہوں گی — حسن اور اقتدار، دونوں، یوں بھی کان کے کچے ہوتے

ہیں۔ جب جو بھی ہو۔ لیکن نتالیا میں اپنے کثیر الاحباب، انجانی مصروف اور نسبۃً شکستہ حال شوہر کی طرف سے کسی قدر بے رخی بلکہ بدگمانی بڑھتی گئی۔ خود پوشکن کی ایک نظم سے ۱۸۳۲ء میں یہ اشارہ ملتا ہے:

ایک سانچے میں ڈھلا اور سڈول
جب میں آغوش میں بھرتا ہوں تمہارا یہ بدن
پیار کے نرم و لاویز سے بول
خود بخود تم کو سنا دیتے ہیں اس دل کی لگن
تم سنی ان سنی کرنے والی
ڈھیلے ہاتھوں سے چھڑاتی ہو لچکتی ڈالی؟
لب پہ آتی ہے کٹیلی مسکان
ایسی مسکان جو کہتی ہے کہ جھوٹے ہو چجن
یاد میں بیٹت کے رکھے ہو پرانی باتیں
بے وفائی کی وہ سچ جھوٹ کہانی باتیں
نہ لگاوٹ، نہ توجہ، نہ جواب
بے رخی کی یہ ادا، روپ کا یہ روکھا پن!
کتنے پرکار تھے کمبخت، انہیں آگ لگے
اس خطاوار جوانی کے تھے ایسے لچھن!
باغ میں، رات کے سناٹوں میں
وہ ملاقات کے حیلے، وہ کسی کے درشن
کیسے کانوں میں کبھی پریم کے منتر پھونکے
رازداری سے کبھی شعر بھی پڑھ کر پھونکے
کتنے عیار تھے، غارت ہوں وہ الفت کے جتن
پہلے تو لاڈ، پھر آنسو کی جھڑی، پھر اَن بَن

۴ر نومبر ۱۸۳۶ء کی ڈاک سے تین گمنام خط پوشکن تک پہنچے جن میں اسے قرمزم ساق شوہر کا خطاب[1] دیا گیا تھا۔ شاعر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دوسرے ہی دن اس نے دانتھیس کے منہ بولے باپ ہیکرن کو ایک نہایت اشتعال انگیز، توہین آمیز خط لکھ مارا جس میں ڈوئل[2] لڑنے کا چیلنج دیا گیا تھا۔

ژوکوفسکی جب تیسرے دن پوشکن کو ٹھنڈا کرنے پہنچے تو یہ کورا جواب ملا:

اس شخص کی حرکتوں نے میری زندگی میں دو سال سے زہر گھول رکھا ہے۔ اب اس قصے کو نمٹانا ہی پڑے گا۔ اگر

---

[1] یعنی ان لوگوں میں صاحب امتیاز جن کے سر پر بیویاں سینگ اگا دیتی ہیں "سینگ دار" کی پھبتی ان پر چپکائی جاتی تھی جن کی بیوی کسی اور سے اختلاط رکھتی ہو۔ ان میں سب سے بڑا نام ایک وزیر کا تھا جس کے متعلق اپنے پرائے بھی یقین رکھتے تھے کہ وہ زار الیکسانڈر کو اپنی بیوی میں شریک کرتا ہے۔ چناں چہ پوشکن کو ایک خط میں یہی اطلاع دی گئی ہے کہ ان موصوف کی صدارت میں کونسل نے یہ خطاب شاعر کے لئے تجویز کیا ہے۔

[2] DUEL کی رسم یورپ کے شرفا میں عام تھی، کسی تحقیر کا انتقام لینے کیلئے دونوں فریق کسی مقام پر اپنے اپنے وکیلوں سمیت پہنچ کر ایک دوسرے پر گولی چلاتے تھے۔ زخمی ہوتے یا مارے جاتے تو قانون اسے جرم شمار نہ کرتا۔ البتہ ثبوت ملنے پر فریقین کو ہلکی سی سزا دی جاتی تھی۔

میں نے ڈوئل میں اسے جان سے مار ڈالا تو مجھے سزا ہوگی، جلا وطن کر دیا جاؤں گا۔ یہی میری آرزو ہے کہ کچھ ہو مگر پائے تخت سے دور نکل جاؤں اور اگر اس نے مجھے مار دیا تو یوں نجات ہو جائے گی۔ وزیر مالیات کو میں نے لکھ دیا ہے کہ حکومت کا ۴۵ ہزار روبل قرض بقایا ہے، دو سو آدمی کی رعایا اور وہ گاؤں جو باپ نے شادی کے موقع پر میرے نام لکھا تھا، دونوں چھوڑتا ہوں، حساب بے باق...... دوسرے قرضے بعد میں دیکھوں گا''۔

یہی ژوکوفسکی ڈچ سفیر ہیکرن سے بات کرنے گئے تو پتہ چلا کہ پوشکن غلط فہمی میں مبتلا ہے، توجہ کا مرکز اس کی بیوی نہیں بلکہ بڑی سالی ہے ایکا ترینا، جس سے دانتھیس شادی کا امیدوار ہے۔ رشتہ منظور ہوا، چیلنج واپس لے لیا گیا۔ ۱۰ جنوری کو شادی ہوگئی۔ شادی بہت ہی بے جوڑ تھی۔ چرچ میں لوگ اس قابل رشک حسین نوجوان اور اتری ہوئی دلہن کے جوڑے کو عروسی لباس میں دیکھ کر صرف اس رعایت سے مسکرا رہے تھے کہ بہرحال یہ خونیں کفن کا بدل تو ہے۔

لیکن اب نتالیا اور دانتھیس کی ملاقاتوں میں رشتہ داری کا حیلہ بہانہ بھی شامل ہوگیا۔ افواہ بازوں نے اس پر پھر گمنام خطوں کا طومار باندھا۔ کئی راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ کئی دن کمرے میں ٹہلتے بیت گئے۔ آخر اس دروغ مصلحت آمیز شادی کے ٹھیک ۱۵ ویں دن یہ واقعہ پوشکن کے علم میں آیا کہ جان پہچان کی ایک کینہ پرور عورت ایدالیا پولی تیکا (IDALIAPOLITICA)[1] نے نتالیا کو اپنے گھر مہمان بلا کر خلوت میں دانتھیس سے بھڑا دیا۔ اسی وقت قلم برداشتہ ایک ایسا زہر آلود بیرن ہیکرن کو لکھا جس کی سیاہی کو فریقین میں سے کسی ایک کا خون ہی دھو سکتا تھا۔

اس بار پوشکن نے بڑی رازداری برتی۔ رسالے کا کام حسب معمول کرتا رہا۔ نوجوان اہل قلم کو مشورے، ضروری خطوں کے جواب، ترجمہ کرنے والوں کو مسودے، بیوی کو پیار اور ملنے جلنے والوں کو ملاقات کا وقت دیتا رہا۔ اندر اندر اس نے اپنے لڑکپن کے ایک دوست کرنل دنزاس کو ڈچ سفارت خانے بھیج کر ڈوئل کی شرطیں طلب کر لیں۔ دنزاس ادھر روانہ ہوا۔ دن کے چار بجے تک پوشکن راجدھانی کی صاف ستھری جرمن بیکریوں اور فرنچ ریستورانوں کے سامنے گھومتا رہا۔ آخر دنزاس وہ خط لے کر جرمن کیفے وولف (Cafe Woolf) میں آ پہنچا شرطیں تین تھیں،

(۱) فریقین کے درمیان بیس قدم کا فاصلہ، (۲) فریقین بھرے پستول تان کر پانچ پانچ قدم آگے بڑھیں گے۔ اور پہلے سے مقررہ نشان تک بڑھ کر گولی چلائیں گے، (۳) فریقین کے وکیل گواہ اور ان شرائط کی تعمیل کے

---

[1] عجیب وغریب نام کی اس عجیب وغریب عورت کو پوشکن سے یوں بھی عداوت تھی کہ اس نے عشق کو رسوا کیا، مذاق اڑایا اور ایک ایسی عورت کو شریک حیات بنایا جس میں حسن کی دمک کے سوا کچھ نہیں دھرا۔ اسی عورت کی ایک رقیب لڑکی سے پوشکن کی منگنی بھی قریب قریب طے ہو چکی تھی۔ بعد میں ٹوٹ گئی۔ ادالیا پوشکن سے اپنا انتقام لینے کی تاک میں تھی اور اس نے یوں انتقام لے لیا۔

پابند رہیں گے۔

دن کے ڈھائی بجے اس پر ڈچ سفارت خانے کے اتاشی نے اور
دنزاس نے دستخط کئے اور کوئی ساڑھے چار بجے شہر سے ذرا باہر ایک خودرو
پارک میں درختوں کی آڑ میں دونوں وکیلوں نے بیس قدم گن کر اپنے اپنے
اوورکوٹ ڈال دیئے۔ سردی بہت سخت اور ہوا کٹیلی تھی۔ راہ گیر دور دور نظر نہ
آتے تھے۔ پوشکن نے اپنے حریف کو خطاب کر کے بے اختیار وہی جملہ کہا جو
اس کے ناول ''ایوگے نی انے گن'' کے ہیرو کی زبان سے ایسے موقع پر ادا ہوا
تھا۔ ''ذرا جلدی کیجئے جناب!''

وکیل نے آہستہ آہستہ اپنا ہیٹ سگنل دینے کے لئے جھکایا ہی تھا کہ
دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ نجانے کتنے ڈوئلوں کے آزمودہ کار
نشانہ باز پوشکن کے قدموں نے ابھی مقررہ نشان چھوا نہ تھا کہ حریف کی سنسناتی
گولی اس کے پیٹ میں اتر گئی، وہ کوٹ پر گرا۔ پستول برف میں دھنس گیا لیکن
فوراً خود کو سنبھال کر بائیں ہاتھ کا سہارا لیا، پکارا:

ٹھہرو، ابھی میرا وار باقی ہے۔

اپنے وکیل دنزاس کے ہاتھ سے دوسرا پستول لے کر لبلبی دبا دی
سامنے دانتھیس گرا۔ اور پوشکن نے بیہوش ہونے سے پہلے نعرہ لگایا— واہ واہ،
مار لیا!

مگر دشمن کا صرف بازو اور ایک شانہ زخمی ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر میں
اٹھ کر زخم بندھوانے میں مصروف ہو گیا۔ پوشکن کو برف گاڑی میں ڈال کر گھر

لائے۔ بار بار اس پر بیہوشی طاری ہوتی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا بھی کہ چیخو، آہ
کرو— اس سے شاید تکلیف کی شدت کم ہو— مگر وہ موت سے ذرا پہلے تک
آہوں کو سینے میں گھونٹتا رہا۔ ''میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ درد مجھ پر غالب
آجائے''۔ اس کا خانہ زاد ملازم نکیتا، غم سے نڈھال تمام وقت اس کی پٹی سے
لگا وہیں بیٹھا رہا جہاں غمزدہ بیوی کو آنے سے روکا جا رہا تھا۔ آخری بار جب
اسے ہوش آیا تو سوکھے ہونٹوں سے صرف اتنا کہا:

''میری بیوی بے قصور ہے۔ اس نے اپنی جان روتے روتے
ہلکان کر لی ہوگی۔ تم طفل تسلی میں مت رکھو اسے۔ اگر دلاسا دیتے رہے، وہ
صبر کر گئی تو دنیا بعد میں حجتیں تراشے گی۔ زار سے کہنا کہ دنزاس کو سزا نہ دے۔
اس کا کوئی قصور نہیں۔ میں اسے راستے میں سے پکڑ کر ڈوئل کے میدان تک
لے گیا تھا۔ میرے قاتل سے انتقام نہ لیا جائے''۔

۲۹ جنوری کو صبح کو اس نے اشارے سے پوچھا، کون کون موجود
ہے۔ معلوم ہوا ژوکوفسکی اور پرنس ویازیمسکی۔

اچھا، مادام کرامزین کو بھی بلاؤ۔ [۱]

شاہی ڈاکٹر نے شہنشاہ روس کا یہ پیغام پڑھ کر سنایا:

---

۱ بزرگ کرامزین کے دیوان خانے میں نوجوان اہل قلم سرپرستی اور ہدایت کی طلب میں آیا
کرتے تھے۔ پختہ عمر کی مہذب خاتون مادام کرامزین سب کی خاطر داری کرتیں اور
پوشکن پر خاص نظر عنایت رکھتی تھیں۔ پوشکن نے خوش فہمی میں مبتلا ہو کر انہیں جذباتی خط لکھ
مارا۔ انہوں نے شوہر کو دکھایا۔ اس بچکانہ مذاق کے بعد مراسم خوردانہ بزرگانہ عمر بھر چلتے
رہے۔ پوشکن ان کا احسان مند رہا۔

"عزیز من، الیکساندر سرگے ایچ، اگر ہماری قسمت میں یہاں
ندہ ملاقات نہیں لکھی ہے تو ما بدولت آپ کی خطائیں معاف کرتے ہیں۔
ر آخری نصیحت یہ کرتے ہیں کہ آپ ایک مسیحی کی موت مرنا قبول کریں۔ اہل
یال کی کچھ فکر نہ کیجئے، ان کی تمام ذمہ داری ہم لیتے ہیں"۔

صبح سات بجے اس نے بیوی کو آخری دیدار کے لئے بلوایا۔ مادام
کرامزین نے نیم بیہوش پوشکن پر صلیب کا نشان بنایا۔ تجہیز و تکفین کے لئے
ایک پادری سرکاری حکم سے بھیجا گیا۔ اور اسی دن آنکھ بند کرنے سے صرف
چالیس منٹ پہلے اس نے پوری قوت سمیٹ کر، تکیے کے سہارے سر اٹھایا،
کتابوں سے بھری الماریوں پر رخصتی نگاہ ڈالی۔ بیوی کے ہاتھ سے ایک چمچ
کھٹے اچار یہ کا لیا، بچوں اور دوستوں کو خدا حافظ کہا اور ٹھیک پونے تین بجے
دن کو اسکی ہچکی پھر گئی۔ سر ڈھلک گیا۔

دیوار گھڑی کی سوئی آج تک وہیں تھمی ہوئی ہے۔

پوشکن کی بیوی نے لگاتار سات سال تک اپنے شوہر کا سوگ منایا۔
سیاہ گلوبند کے بغیر اسے کسی محفل میں نہیں دیکھا گیا۔ تمام عرصے بادشاہ سلامت
بیچاری نو عمر بیوہ پر خصوصیت سے مہربان رہے۔ سوگوار حسن قابلِ رشک
افواہوں کے ہالے میں اور بھی دلکش نظر آنے لگا۔ آخر چار بچوں کی ماں نے
پاویل لانسکوئے کو اپنا دوسرا شوہر بنانا منظور کرلیا۔[1]

یہ وہی فوجی افسر تھا جس نے ۸ سال پہلے نتالیا کو پوشکن کی بیوی کی
حیثیت میں دانتھیس کے بازوؤں تک پہنچانے کی چال چلی تھی۔ وہ کپتان سے
کرنل بنا، پھر جلدی ہی ترقی پا کر جنرل کے عہدے پر پہنچا۔ بادشاہ سلامت اس
کی گھریلو ضیافتوں میں بہ نفس نفیس شریک ہوا کرتے تھے۔ لیکن نتالیا کے لئے خود
کو پوشکن کی قبر پر پھول چڑھانے کے لئے جانا مصیبت ہو گیا۔ میخائیلوفسکوئے
علاقے کے دیہاتی اسے خونخوار نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ ایک بار گئی، پھر نہ
جا سکی۔

تب سے آج تک پوشکن کے مزار پر ہر سال جون کے مہینے میں ہزاروں
عقیدتمند حاضری دیتے ہیں، میلہ لگ جاتا ہے اور بڑے بڑے شہروں، خصوصاً
ماسکو میں اس کے سنگین مجسمے پر کڑاکے کی ان سردیوں میں بھی تازہ گلدستے
چڑھائے جاتے ہیں جب کھلے آسمان کے نیچے پھول نہیں جی سکتے۔

---

[1] لانسکوئے کو پوشکن سے اس لئے بھی کینہ تھا کہ اس کی ایک سالی سے
شاعر کے خفیہ تعلقات بیان کئے جاتے تھے۔

آسکر وائیلڈ OSCAR WILDE

آسکر وائیلڈ کے معاشقوں کا ذکر کرنے سے پیشتر اس کے خانگی حالات کا علم ضروری ہے۔ وہ آئر لینڈ کا باشندہ تھا۔ اس کا والد ولیم وائیلڈ ڈاکٹر تھا۔ اور جنسی زندگی میں نہایت بدتمیز اور بدمزاج۔ یہاں تک کہ ایک خوبصورت لڑکی کو جو انکار کر رہی تھی کلوروفارم دیکر اس سے بدفعلی کی۔ اس کی ایک معشوقہ میری (Mary) تھی۔ جس سے کچھ دیر کے بعد وہ تنگ سا ہوگیا۔ بدلہ لینے کے لئے میری نے اس کے خلاف اس کی بیوی کو خطوط لکھنا شروع کر دئے۔ اور جب ۱۸۶۴ء میں ملکہ وکٹوریہ کے سرجن ہونے کی وجہ سے سر کا خطاب ملا تو میری کو اور بھی طیش آگیا۔ اور اس نے اس کے خلاف ایک کتابچہ شائع کر دیا جس میں اس کی اور کارستانیوں کے علاوہ کلوروفارم کے راز کا بھی انکشاف کیا۔ ولیم نے اس کے باپ کو شکایت کی کہ وہ جھوٹے الزام لگا کر اس سے رقم وصول کرنا چاہتی ہے۔ جس پر میری نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ جس کا فیصلہ اس کے خلاف ہوا۔ اور جس کی وجہ سے اسے نہ صرف پیشہ بلکہ وطن بھی چھوڑنا پڑا۔

اس کے برخلاف آسکر کی والدہ نہایت نیک سیرت اور خوش خلق عورت تھی۔ اور سوشل زندگی میں خوب حصہ لیتی تھی۔ عورتوں کے حقوق اور آئر لینڈ کی آزادی کے متعلق خوب زوردار نظمیں اور مضامین لکھتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے ایک مضمون کی وجہ سے انگریزی سرکار نے وہ رسالہ ہی بند کروا دیا جس میں وہ مضمون شائع ہوا۔

ان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔ آسکر سب سے بڑا تھا۔ خانگی زندگی کی بدمزگی کے باوجود اس کی تعلیم جاری رہی۔ ڈبلن میں تعلیم کے بعد وہ ۱۸۷۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہوا جہاں اس نے یونانی زبان میں ایک سونے کا تمغہ حاصل کیا اور یونیورسٹی بھر میں مشہور ہوگیا۔ مزاج میں وہ اپنے والد اور والدہ کا بیٹا تھا۔ والد سے اس نے جنسی زندگی کے لئے رغبت حاصل کی۔ لیکن شاید اپنے والد کے تجربے کی وجہ سے لڑکیوں سے نہیں لڑکوں سے۔ آکسفورڈ میں اسے ایک لڑکی فلارنس (Florence) سے عشق بھی ہوا۔ لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ کیونکہ اس لڑکی نے کسی اور سے شادی کر لی۔ اپنی والدہ سے اس نے نیک اطوار اور نیک اخلاق سیکھے۔ نہایت خوش مزاج خوش طبع اور خوش گفتار تھا جس سے وہ جلد ہی ہر دلعزیز ہوگیا۔ کہا کرتا تھا کہ خوشی ہی نیکی ہے اور خوبصورتی مذہب۔ نرم مزاج تھا یہاں تک کہ کھیلوں سے اسے نفرت تھی۔ اس کا مقولہ تھا کہ فٹ بال جیسے کھیل سخت جان لڑکیوں کے لئے

ہیں۔ لطیف مزاج لڑکوں کے لئے نہیں۔ زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ لیکن جلد ہی اس کے والد نے وفات پائی۔ اور جائیداد تو کیا وہ کچھ قرضہ ہی چھوڑ گیا۔ لیکن آسکر نے ہمت نہ ہاری۔ ایک دوست کو لکھا کہ میں شاعری اور ڈرامہ میں نام پیدا کرلوں گا۔ اگر نام پیدا نہ کرسکا تو بدنامی کا شکار ہو جاؤں گا۔ زندگی مزے سے گزرے گی۔

آکسفورڈ چھوڑنے کے بعد وہ پہلے امریکہ اور پھر فرانس میں لیکچر دیتا رہا۔ جس سے وہ پیٹ پالتا تھا۔ پیرس میں اسے ۱۸۸۳ء میں آکسفورڈ کے ایک دوست کی بہن کانس ٹنس (Constance) سے محبت ہوگئی۔ جس سے وہ نہایت خوش ہوئی۔ لیکن پیسے کی کمی کی وجہ سے انہیں شادی کے لئے دس سال انتظار کرنا پڑا۔ اس کی آمدنی صرف لیکچروں پر منحصر تھی جس سے وہ مشکل سے اپنا گذارہ کرتا تھا اور کچھ اغلام بازی (Sodomy) پر خرچ۔

آخر شادی ہوگئی۔ کانسٹنس نہایت نیک اور خوش اخلاق بیوی تھی۔ لیکن گھر کے حالات اس کے موافق نہیں تھے۔ بیوی اخلاق اور مذہب کی پابند تھی۔ اور خاوند اگرچہ عیسیٰ مسیح کی نہایت قدر کرتا تھا اس کے مذہب سے لاپرواہ تھا اور کہا کرتا تھا عیسائی مذہب نے دنیا کا نقصان ہی کیا ہے کہ ایک گناہ گار اور پارسا میں صرف یہی فرق ہے کہ پارسا کا ماضی ہوتا ہے اور گناہ گار کا مستقبل۔ مذہب ہر انسان کے لئے مختلف ہے۔ ادب اور آزادی ہی انسان کا مذہب ہیں۔ وہ اپنی بیوی کے اصولوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن ان کی محبت قائم رہی اور وہ اپنے فرائض تندہی سے نبھاتا رہا۔ ان کے دو بیٹے ہوئے جنہیں وہ نہایت خوش رکھتا تھا۔ لیکن اس کی ہم جنسی برابر جاری رہی۔ ایک دن اس نے اپنے بچوں کو دو لڑکوں کی کہانی سنائی جو نہایت شرارتی تھے۔ اور اپنی ماں کو تنگ کیا کرتے تھے۔ اور ان کی ماں بیچاری روتی ہی رہتی تھی۔ اس پر اس کا ایک لڑکا بولا کہ اگر باپ ساری رات باہر رہے اور ماں بیچاری روتی ہی رہے تو باپ کو کیا سزا ملنی چاہئے۔ خوب ہنسی ہوئی۔

ویسے تو وہ دوجنسی تھا لیکن زیادہ رغبت اس کی ہم جنسی کی طرف تھی۔ جو بدنامی کے ڈر سے خفیہ ہی رہتی تھی۔ صرف دو چار لڑکوں کے نام لئے جاتے ہیں لیکن جس لڑکے کا خاص طور پر ذکر ہوتا ہے وہ تھا لارڈ الفریڈ ڈگلس۔ اب اس کا حال سنئے۔ اس کا باپ گو لارڈ تھا لیکن نہایت بد دماغ اور پاگل شخص تھا جسے کتوں اور گھوڑوں سے اپنے بیوی بچوں کی نسبت زیادہ محبت تھی۔ اور ان سے کم ملتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار اس نے ان سب کو گھر سے نکال دیا۔ کیونکہ اس نے اپنے کئی دوستوں کو جن میں اس کی ایک معشوقہ بھی تھی، مدعو کیا۔ اس کی بیوی کئی سال تو برداشت کرتی رہی لیکن جب اس نے اپنی معشوقہ کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہا تو اس نے اسے طلاق دے دیا۔ ان کے تین بیٹے تھے جو نہایت مصیبت زدہ ہوگئے۔ الفریڈ سب سے چھوٹا تھا۔ جب اسے الفریڈ کی آسکر وائیلڈ سے دوستی کا پتہ چلا تو اس نے اس سے کہہ دیا کہ وہ اس سے نہ ملا کرے۔ لیکن وہ آسکر پر نہایت فریفتہ تھا اور اس نے صاف انکار کردیا۔ پھر اسے باپ کا خط ملا کہ اگر پھر کبھی میں نے تمہارے کسی ہوٹل میں آسکر کے ساتھ رہنے کی خبر سنی تو میں تمہارا کچومر نکال دوں گا۔ جس کے جواب میں وہ اسے ہر

بار جب بھی آسکر کے ساتھ رات کا تا تو اسے جان بوجھ کر پہلے اطلاع دے دیتا۔ اور یہاں تک لکھ دیا۔ ''اگر آپ نے مجھ پر حملہ کیا تو میں ایک ریوالور سے مقابلہ کروں گا۔ اس کے باپ نے اس کا خرچ بند کر دیا اور ایک خط میں لکھ دیا کہ میں نے تمہیں پیدا کر کے گناہ کیا ہے۔ شاید کسی اور نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ اس حالت میں مَیں گناہ گار نہیں ہوں۔ تمہارا تنگ آمدہ کہنے کو باپ (Your disgusted so-called father)''۔

اس کے بعد اس نے اپنے بیٹے کا پیچھا تو چھوڑ دیا۔ لیکن آسکر کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔ اور اسے جا بجا بدنام کرنا شروع کر دیا۔ ایک دن اس کے گھر پہنچ گیا۔ اور جب آسکر کھڑا ہو گیا۔ تو اسے دھمکا کر کہنے لگا۔ 'بیٹھ جاؤ'۔ آسکر سے رہا نہ گیا۔ اس نے کہا کہ میں کسی کو کہیں بھی اس طرح بولنے نہیں دیتا۔ کیا تم نے جو کچھ اپنے بیٹے کو میرے اور میری بیوی کے متعلق لکھا ہے اس کے لئے معافی مانگنے آئے ہو۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ اور اپنے نوکر سے کہہ دیا کہ پھر کبھی اسے اندر آنے نہ دینا۔ یہ لندن کا سب سے زیادہ بیہودہ وحشی ہے۔ خوش قسمتی سے معاملہ یہیں ختم ہو گیا ورنہ آسکر اسے جان سے مار دیتا۔

اب آسکر اور الفریڈ کے خطوط چرائے گئے اور بیچے جانے لگے۔

ایک شخص آسکر کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں اگر آپ کے چند خطوط واپس کر دوں تو مجھے کیا دو گے۔ اس نے جواب دیا کہ تم جاہل ہو۔ تمہیں ادب کی پہچان نہیں ہے۔ اگر یہ خط نظم میں ہوتے تو گولڈن ٹریژری (Golden Treasury) میں جگہ پاتے۔ ایک دوسرے شخص کو کہا کہ ان خطوط کی قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ خوبصورتی کی قیمت لعل اور جواہر سے بہت اوپر ہوتی ہے۔ اور جب اس نے اصرار کیا کہ مجھے ایک آدمی نے ساٹھ پونڈ دینا منظور کر لیا تو کہنے لگا مجھے خوشی ہے آپ اسے ضرور دے دو۔ وہ بولا کہ وہ اس وقت یہاں نہیں ہے اور مجھے رقم کی سخت ضرورت ہے۔ تو آسکر نے اسے دس شلنگ یعنی گھر پہنچنے کا کرایہ دے دیا۔ کچھ خطوط الفریڈ کے والد نے خریدے جن سے ان کا بلڈ پریشر اور بھی بڑھ گیا۔ انہی دنوں یعنی ۱۸۸۴ء میں بغیر نام کے ایک کتاب "The Golden Carnation" چھپ گئی جس میں وہ خطوط کسی اور ماحول میں ظاہر کئے گئے۔ اس کتاب کا بہت چرچا ہوا۔

اب آسکر اور الفریڈ نے اکٹھا رہنا شروع کر دیا جس سے الفریڈ کے والد کی حالت اور بھی خراب ہوتی گئی۔ ایک بار اس نے ارادہ کیا 'تھیٹر میں جہاں آسکر کا ایک ڈرامہ دکھایا جا رہا تھا' گاجر اور مولیاں لے جا کر اس پر پھینکے۔ لیکن وقت پر پتہ چل گیا۔ اور اسے اندر جانے کی اجازت نہ ملی۔

ایک دن جس کلب میں آسکر جایا کرتا تھا وہاں جا کر اس کے لئے اپنا ملاقاتی کارڈ چھوڑ آیا جس پر لکھا تھا اغلام باز آسکر کے لئے (For Oscar, the sodomite) اسے آسکر برداشت نہ کر سکا۔ اور کچھ الفریڈ نے اصرار کیا۔ اس نے ہتک عزت کا مقدمہ دائر کیا۔ جس پر وہ پکڑا گیا۔ اور تین سو پونڈ کی ضمانت پر رہا ہوا۔ مقدمے کے خرچ کے لئے الفریڈ نے اپنے گھر کے تمام آدمی اپنی طرف کر لئے۔ لیکن اس کے والد کا وکیل نہایت ہوشیار تھا۔ اس نے کچھ منت سماجت کچھ پیسہ دے دلا کر بہت سے گواہ پیش کر دئے جن میں

کچھ رنڈیاں بھی تھیں۔ اب مقدمہ جیتنے کی کوئی امید نہ رہی۔ اور آسکر کے وکیل نے مشورہ دیا کہ مقدمہ واپس لے لیا جائے اور آسکر انگلینڈ سے باہر نکل جائے۔ وہ نہایت گھبرایا۔ جب وہ کچہری سے باہر نکلا تو اس کے خلاف تالیاں بجیں اور نعرے بلند ہوئے۔ اس کی بیوی نہایت رنجیدہ ہوئی۔ اس کے دوست بھی اس کے برخلاف ہو گئے۔ اخباروں میں ہتک آمیز مضامین شائع ہوئے۔ اس کے قرضداروں نے اس کا سامان بھوسے کے نرخ پر نیلام کروا دیا۔ کچھ سامان چوری ہو گیا۔ اس کے خطوط اور کتابیں جلا دی گئیں۔ اسٹیج پر اس کے ڈراموں کے ساتھ اس کا نام کاٹ دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے بچوں کو بھی اسکول چھوڑنا پڑا۔

اس نے اخبار میں ایک خط لکھا میں نہیں چاہتا تھا کہ الفریڈ اپنے والد کے خلاف گواہی دے اس لئے میں نے مقدمہ واپس لے لیا۔ لیکن کون سنتا تھا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ باہر نکل جائے۔ لیکن اتنے میں مزید شہادت ملنے پر پکڑا گیا۔ اور دو سال کے لئے قید ہو گیا۔

اس کی بیوی کانسٹس نہایت پریشان ہوئی۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ اگر طلاق نہیں تو وہ قانونی علیحدگی (Legal seperation) لے لے۔ آسکر نے کہا کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنی بیوی اور بچوں کو اتنا پریشان کیا ہے کہ اب میرا کوئی حق نہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ بھی کروں۔ مجھے اپنی بیوی پر اعتقاد ہے۔ آخر فیصلہ قانونی علیحدگی کے حق میں ہوا۔ اور اس پر جب قید ہوا تو موت کی خواہش کرنے لگا۔

لیکن آسکر تھا طبعاً خوش مزاج اور خوش طبع۔ جھٹ طبیعت پر قابو پالیا۔ جیل میں قیدیوں کو خوب خوش رکھتا۔ بچوں کی قید سے رہائی کے لئے ہر طرح سے مدد کرتا۔ اور وقت خوب مزے سے کاٹتا۔

یہاں اس کے ایک اور دوست کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا نام تھا رابرٹ راس (Robert Ross) اور جس سے اس کے تعلقات الفریڈ سے پانچ سال پہلے شروع ہوئے تھے۔ اور راس الفریڈ کی وجہ سے آسکر سے کچھ بے تعلق سا ہو گیا تھا۔ اور ہمیشہ حسد کا شکار رہا۔ اب اسے موقع مل گیا۔ وہ اکثر آسکر سے جیل میں ملتا۔ اور اب اس نے اسے کہنا شروع کر دیا کہ الفریڈ کو تمہارا کچھ فکر نہیں ہے۔ وہ نہایت خوشی سے اٹلی میں مقیم ہے۔ اور تمہارے خطوط لوگوں کو دکھا رہا ہے۔ اور تمہیں بالکل بھول چکا ہے۔ آسکر فکر میں پڑ گیا اور راس سے کہا کہ میرے تمام خطوط اس سے واپس لے لو۔ اور میرے مرنے پر انہیں جلا دینا۔ اب یہ بھی ظاہر ہوا کہ مقدمہ الفریڈ نے نہیں، راس نے باپ بیٹے دونوں کو بدنام کرنے کے لئے چلوایا تھا۔ اب الفریڈ کو راس نے یہ کہا کہ آسکر تمہارے خلاف ہے اور تم سے نفرت کرتا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے تعلقات کچھ عجیب طرح سے بنتے اور بگڑتے رہے۔ ایک بار الفریڈ نے یہاں تک کہہ دیا کہ آسکر نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔ اور اسے قتل کرنے کی دھمکی دے دی۔ اور پھر جب دوستانہ تعلقات ختم ہونے لگے تو گھبرا گیا۔ اور مؤدبانہ درخواست پر اتر آیا۔ اور خودکشی کا اشارہ کر دیا۔

آسکر ۱۸۹۷ء میں آزاد ہوا اور راس کے ساتھ ملک سے باہر چلا گیا۔ مگر بدنام اتنا ہو چکا تھا کہ اپنا نام تک بدل لیا۔ جب کسی ہوٹل میں جاتا تو انگریز تمام یا تو اٹھ کر نکل جاتے یا منیجر کو کہہ کر اسے باہر نکلوا دیا جاتا۔ لیکن اس کی اپنی مجلس آرائی اور خوش گوئی بدستور قائم رہی۔ اب الفریڈ پھر اس کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ اس نے یہاں تک لکھا کہ ہم روین کے اسٹیشن پر ملے تو آسکر زار زار رویا۔ ہم سارا دن اکٹھے ہاتھ میں ہاتھ بغل میں بغل دبائے گھومتے رہے۔ ہم نہایت خوش تھے۔ ایک رات اکٹھے گذاری۔ اور پھر پیرس میں ملنے کا وعدہ کر لیا۔ راس کو بہت غصہ آیا۔ لیکن آسکر کہنے لگا کہ میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ مجھے ہر وقت کوئی نہ کوئی ساتھی چاہئے۔ اس کی بیوی کا بھی اس کی وجہ سے انگلینڈ میں رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اور وہ اٹلی آ گئی تھی۔ اور جب اسے اپنے بچوں سے ملنے کی زبردست خواہش ہوئی تو اس نے کہلا بھیجا کہ وہ الفریڈ کا ساتھ چھوڑ دے۔ گو وہ ابھی تک راس کی معرفت اسے مقرر شدہ سالانہ رقم دئے جا رہی تھی۔ لیکن اس کے منع کرنے کا اثر الٹا ہوا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ ملنے لگے۔ اور دو ہفتے نیپلز (Naples) میں اکٹھے گذارے اور نظمیں لکھتے رہے۔ رہائش کا تمام خرچ الفریڈ نے ادا کیا۔

انہیں ایام میں اس کا ایک ڈرامہ سلوم (Salome) برلن میں دکھایا گیا جس کی خوب تعریف ہوئی اور وہ یورپ میں مشہور ہو گیا۔ اس کی کتابیں یورپ کی درجن بھر زبانوں میں فروخت ہونے لگیں۔ اور اس کی مالی مصیبت ختم ہو گئی۔ تمام قرضہ ادا ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۳۶ء تک وہ یورپ اور اپنے وطن میں شیکسپیئر کو چھوڑ کر سب سے زیادہ پڑھا جاتا رہا۔

۱۸۹۸ء میں اس کی بیوی کا جنوا (Genoa) میں انتقال ہو گیا۔ آسکر نے الفریڈ کو لکھا کہ جس رات وہ فوت ہوئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ مجھے ملنے آئی ہے۔ اور میں یہی کہتا رہا چلی جاؤ، چلی جاؤ اور مجھے تسکین میں چھوڑ دو۔ لیکن اس خبر کو سن کر وہ نہایت مغموم ہوا۔ اور جنوا جا کر اس کی قبر پر پھول چڑھائے، رویا اور دعا کی۔ آخری ایام تک یہی کہتا رہا کہ عظیم ترین شاعری اور ڈرامہ کا نہایت پُر لطف مضمون موت ہوا کرتا ہے۔ نپولین اس کا دل پسند ہیرو تھا۔ اس کی بابت اس نے لکھا کہ سینٹ ہلینا (St. Helena) جہاں نپولین مرا تھا موجودہ تاریخ میں ایک ادیب کے لئے سب سے زیادہ دلکش مضمون ہے۔ اپنی بابت اس نے کہا کہ مجھے از حد کامیابی اور از حد شکستگی ملی ہے۔ اور میں نے دونوں سے درس لیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کامیابی سے شکستگی کی قیمت زیادہ ہے۔ اور زیادہ رہے گی۔ مصیبت انسان کی ترقی کے لئے نہایت لازمی ہے۔ لیکن اس کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ تکالیف کا مقابلہ ہمت اور جوانمردی سے کرے جیسا وہ خود کرتا رہا۔ وقت آیا جب ہوٹل والوں نے اسے نکالنا شروع کر دیا۔ نائیوں نے اس کی حجامت کرنا بند کر دیا۔ دوستوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ والدین اسے دیکھ کر اپنے بچوں کو چھپا لیتے تھے۔ انگلینڈ اور امریکہ میں اس کے خلاف نہایت ہتک آمیز مضامین شائع ہوئے۔ لیکن اس نے نہایت صبر اور بردباری سے مقابلہ کیا اور کبھی شکایت نہیں کی۔ ہمیشہ ہنستا رہا۔ خود نہایت زندہ دل تھا۔ اور ساتھیوں کو نہایت خوش رکھتا تھا۔

تمام عمر خوبصورت عورتیں اس کی دلچسپ گفتگو کے لئے اس کے گرد رہتی تھیں۔ اپنی تکلیف سے دوسروں کی تکلیف کو زیادہ محسوس کرتا تھا اور اسے مٹانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ولیم مارس (Willium Morris) انگلینڈ کا مشہور شاعر اپنی موت کے وقت اس کے بغیر کسی اور کو ملنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بیوہ شدہ عورت جو غم میں مستغرق ہو رہی تھی اور قریب تھا کہ موت ہو جاتی۔ اسے اس نے اپنی خوش کن دلآویز گفتگو سے غم سے نجات دلائی۔ اور موت سے بچا لیا۔ یہ اس کا زندگی بھر نہایت دل پسند عمل رہا۔

الفریڈ اپنے باپ کی طرح شروع میں نہایت گھمنڈی، خود پسند، مغرور، گستاخ اور بدتمیز تھا۔ آسکر نے اسے اپنی پرانی عادتوں سے آزاد کرایا اور ہردلعزیز بنا دیا۔ اس کی وجہ سے ہی اسے شہرت ملی اور اس کی تصانیف کی قدر ہوئی۔ گو آخر میں جیسے اوپر ذکر ہوا ہے ان میں تفرقات اور جھگڑے ہوئے۔

آسکر نے ۳۰ رد سمبر ۱۹۰۰ء کو وفات پائی۔ الفریڈ اس کی موت پر آیا اور تمام اخراجات ادا کر دیے۔

ایک آدھ اور بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آسکر نے جیل سے الفریڈ کو ایک بہت لمبا خط لکھا تھا۔ جس کو بعد میں بڑھا چڑھا کر راس کو دے دیا کہ اسے الفریڈ کو دکھا کر اس کی موت کے بعد کتاب کی صورت میں شائع کر دے۔ راس نے کچھ حصہ الفریڈ کو دکھایا اور نہایت ہتک آمیز حصّہ کو چھوڑ کر ۱۹۰۵ء میں اسے ڈی پروفنڈیس (De Profundis) کے نام سے شائع کر دیا۔ اتنے میں رد سوم (Rousome) نے آسکر کی سوانح عمری شائع کی جس میں الفریڈ کے خلاف کئی الزامات تھے۔ الفریڈ نے ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا جس میں راس نے کتاب کا وہ تمام حصّہ سنا دیا جو اس نے شائع نہیں کیا تھا۔ الفریڈ مقدمہ ہار گیا۔ اور بہت گھبرایا۔ پھر راس اور آسکر دونوں پر حملے شروع کر دیے گئے۔ اب راس نے اس پر مقدمہ دائر کر دیا لیکن دل کی بیماری کی وجہ سے واپس لے لیا اور جلد ہی مر گیا۔

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

۴۰۔ کیا یہ محبت کی نسل ہے؟ گرم خون، گرم افکار اور گرم کارنامے؟۔ یہ لوگ مارِ آستین کیوں ہیں؟۔ کیا محبت بدطینتوں کی ایک نسل ہے؟۔

Troilus & Cressida - Act 3, Scene 1

۴۱۔ پیار وقت پر شروع ہوتا ہے اور وقت چنگاری بنتا اور اس سے آگ پیدا کر دیتا ہے۔

Hamlet - Act 4, Scene 7

۴۲۔ جب میں نے تجھے دیکھا تیرے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ اور تو مسکرائی کیونکہ تجھے پتہ تھا۔

Hamlet - Act 2, Scene 2

۴۳۔ شاندار شکار! بدبختی میری جان کو پکڑ لیتی ہے لیکن میں تجھے پیار کرتا ہوں اور جب میں تجھے پیار نہیں کرتا انتشار واپس آ جاتا ہے۔

Othello - Act 3, Scene 3

۴۴۔ پیار کرنے والے اسے پہلے گھنٹے ہمیشہ بھاگتے ہیں۔

The Merchant of Venice - Act 2, Scene 6

ف ۔ س ۔ اعجاز

شیلے ایک انوکھا عاشق

انیسویں صدی کے ابتدائی عرصہ میں کسی روز ایک نوجوان کو ''الحاد کی ضرورت'' (The Necessity of Atheism) نامی کتابچہ شائع کرنے کی پاداش میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔ اس کا نام پرسی شے شیلے تھا۔ وہ Sussex کے نواب کا وارث تھا۔ ایک دن اسے انگلینڈ کا ایک لافانی شاعر بننا تھا۔ وہ ایک عجیب اور خوبرو نوجوان تھا جس کے بال گھنگھریالے، آنکھیں نیلی اور چمکدار' کاندھے گول تھے۔ اس کی قمیض کے کالر میں سے اس کا نسوانی قسم کا گلہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی جاذبیت اور مقناطیسی کشش بالخصوص عورتوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ لیکن وہ کسی طرح اتنا نسائی نہ تھا جتنا نظر آتا تھا۔ وہ ایسے نظریات کا حامل تھا جو اس زمانے میں حیران کن اور بھونچکا کر دینے والے کہے جاتے تھے۔ وہ پورا ملحد اور آزاد محبت کا حامی تھا۔ اسے اس کی پرواہ نہ تھی کہ اسے آکسفورڈ نے نکال دیا ہے۔ یہ قطعی ممکن تھا کہ اگر اس نے کتابچہ شائع نہ کیا ہوتا تو اس سے کوئی دوسرا جرم سرزد ہوتا جو مقتدر ہستیوں کے غیض وغضب کا باعث ہوتا۔

ایک من مانی کرنے والے نوجوان کا غیر معمولی قسم کی محبت میں تجربات سے گذرنا لازمی تھا۔ شیلے کی بدبختانہ وارداتوں سے ایک حیران کن کہانی جنم لیتی ہے۔ المیہ، طربیہ، ڈھونگ، سوانگ، رومان تمام عناصر اس حیرت انگیز کہانی میں موجود ہیں۔ شیلے خوبصورت اور خیال انگیز فطرت کا مالک تھا۔ صداقت کے اس عاشق میں یوں کوئی برائی نہ تھی۔ وہ عورتوں کے لئے تعظیم کا جذبہ رکھتا تھا۔ نیز ایک مرد شجاع، نرم دل اور درگذر کرنے والا آدمی تھا۔

اس کی حساس اور گداز فطرت کی تیاری میں اس ظالمانہ برتاؤ کا دخل ہے جو اس کے ساتھ ایٹن (Eton) میں روا رکھا گیا۔ اس زمانے میں اس جیسے کردار کے نو عمر لڑکے کی پبلک اسکول کی زندگی ایک کابوس (Nightmare) سے عبارت سمجھی جاتی تھی۔ لڑکے اسے ''پاگل شیلے'' کہا کرتے تھے۔ وہ ان کی ملامت اور تمسخر کا نشانہ بنا رہتا تھا، اس پر تشدد آمیز حملے بھی ہوا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس برتاؤ نے اس کی بقیہ زندگی پر ایک زبردست اثر چھوڑا۔

آکسفورڈ چھوڑتے وقت اسے اپنی دلنواز چچیری بہن ہاریٹ گروو (Harriet Grove) سے دلی عشق تھا۔ سوزیکس یعنی اپنے آبائی گھر میں وہ، ہاریٹ اور اس کی بہن الزبتھ کبھی جدا نہ ہونے والے ساتھی تھے۔ شیلے کی پسندیدہ جگہ گرجے سے ملحق قبرستان تھا جہاں وہ تینوں بیٹھا کرتے تھے۔ وہ

دونوں کی کمروں میں بازو ڈالے رکھتا اور وہ دونوں اس کے متعجب کن فلسفۂ زندگی خاص کر شادی اور آزاد محبت کی بابت اس کے نظریات بہت شوق اور دلچسپی سے سنا کرتیں لیکن اب شیلے کی غیر موجودگی میں ہاریٹ کی محبت اور جذبۂ تحسین و توصیف غائب ہو چکے تھے۔ وہ ایک معقول اور صحتمند لڑکی تھی اور اب نوعمر شیلے کے غیر معمولی نظریات نے اسے متاثر کرنا چھوڑ دیا۔

شیلے جب آکسفورڈ سے لندن پہنچا تو اس کا دوست ہاگ (Hogg) بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اسے بھی شیلے کے ساتھ ہی یونیورسٹی سے نکالا گیا تھا۔ شیلے ابھی تک ناکام محبت کی ٹیسیں برداشت کر رہا تھا اور اس نے خودکشی کی کوشش کی تو اس کے باپ نے اسے عاق کر دیا۔ اس کے پاس روپیہ نہ تھا۔ اس کی بہنیں اپنے پاکٹ خرچ میں سے اسے کچھ بھیج دیا کرتی تھیں جس پر وہ زندہ تھا۔ وہ Clapham کے لیڈیز اسکول میں آ گئی تھیں۔ اور یہ وہ جگہ تھی جہاں اپنی بہنوں سے ملتے ملتے شیلے ایک الوہیت کے زیر اثر آ گیا جس نے اس کی ناکامی کو بھلا ڈالا۔ اس لڑکی کا نام بھی ہاریٹ تھا۔ ہاریٹ ویسٹ بروک۔ وہ ایک ریٹائرڈ ہوٹل کیپر کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ اسے ایک مہذب عورت کی تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔

ہاریٹ سولہ سال کی چست اور خوبصورت، سنہرے بالوں اور موتی رنگت والی لڑکی تھی۔ وہ گھر میں دکھی اور اسکول میں اس بات سے ناخوش رہتی تھی کہ شرفاء کی بیٹیاں اس کی پست ذات کی وجہ سے اس کی بہت بے عزتی کیا کرتی تھیں۔ ایک نواب زادے کے ساتھ اپنی بیٹی کے تعلق پر ہاریٹ کا باپ چونکا ضرور ہو گا۔ لیکن ایک دن آدھی رات گئے نوعمر نواب زادہ شیلے اس کی بیٹی سے اس وقت ملنے آیا جب وہ بیمار ہو کر بستر پر پڑی ہوئی تھی تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

شیلے کچھ ایام کے لئے ویلز چلا گیا۔ وہاں عرصۂ قیام میں اسے ایک چٹھی ملی جس میں ہاریٹ نے خودکشی کی دھمکی دی تھی۔ اس کے باپ نے اسے سخت تنبیہ کی تھی کہ وہ اپنے اسکول واپس چلی جائے جس سے وہ سخت نفرت کرتی تھی۔ شیلے جو ہاریٹ کو ملحدانہ نظریات کی تبلیغ کرتا رہا تھا ڈر گیا۔ اس کے دماغ پر اس کے اثرات مرتسم ہوئے۔ اس نے اپنے آپ کو اس لڑکی کی بھلائی کا ذمہ دار فرض کر لیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ لندن پہنچ گیا جہاں دونوں نے محبت کا اقرار کیا اور دونوں محبت کے معاملے میں کافی آگے نکل گئے۔

پرسی بشے شیلے، عمر انیس سال۔ ہاریٹ ویسٹ بروک، عمر سولہ سال نے ایڈنبرگ میل کوچ سے لندن کو خیرباد کہا۔ شیلے نے اپنے ایک دوست سے کچھ پاؤنڈ ادھار لئے لیکن جب وہ دونو اسکاٹ لینڈ پہنچے تو اس کے پاس ایک پنس بھی نہ تھا۔ تاہم ایڈنبرگ میں کارآمد دوست بھی تھے۔ ایک مالک مکان نے جسے اس کا پیشگی خط مل چکا تھا یہ سوچ کر کہ یہ نوجوان بااثر ہے اور اچھے تعلقات رکھتا ہے اسے کمرہ اور ادھار رقم دینے میں کوئی تامل نہ کیا۔ شیلے کے دوست ہاگ نے لندن چھوڑنے سے پہلے ہی اسے سمجھایا تھا کہ شادی کی تباہ کاری کے باوجود اسے ہاریٹ سے بیاہ کرنا پڑے گا ورنہ ہاریٹ ہی کو بہت زیادہ اذیت جھیلنا پڑے گی۔ شیلے نے اپنے اصول کے برخلاف اپنی آمادگی

ظاہر کی اور ان نئے اسکاٹش دوستوں نے شادی کی تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔

شادی کی دعوت میں ایڈنبرگ کے تاجروں نے اچھی تعداد میں شرکت کی۔ اور ان لوگوں نے اتنا بھدا مذاق کیا کہ قہقہوں کے درمیان سے نیا جوڑا اٹھ کر چلے جانے پر مجبور ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دروازے پر ایک دستک ہوئی۔ شیلے نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ مالک مکان اور اس کے دوست نشے میں چور کھڑے ہیں۔

''یہاں ایک رسم ہے'' مالک مکان نے ہچکی لیتے ہوئے کہا کہ ''جب آدمی رات کو یہاں کوئی شادی یا بیاہ ہو تو دلہن کو وسکی سے نہلایا دھلایا جاتا ہے''۔

غصے کے مارے شیلے نے اپنی پستولیں نکال کر انہیں دھمکایا اور گھر سے باہر نکال دیا۔

شیلے نے سوچا تھا کہ اس کا اپنی محبوبہ کے ساتھ لندن کو چھوڑنا جذبے کا نہیں بلکہ ارادے کا عمل تھا۔ لیکن اب اسے ہاریٹ سے سچی محبت ہو گئی تھی۔ ہاریٹ ایک افسردہ اور درست طبیعت دوست ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس نے کافی سنجیدہ مطالعہ کیا تھا اور اپنے محبوب کے زیرِ تعلیم اس نے گوڈون (Godwin) کی کتاب ''سیاسی انصاف'' کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ وہ کتاب تھی جس نے شیلے کو کافی متاثر کیا تھا اور جو اس کے اکثر نظریات کی جنم داتا بنی۔ لیکن اس کے باوجود نو عمر شیلے کو زیادہ سوشل بننے کی ذھن سوار ہو گئی تھی۔ اسے اپنے دوست ہاگ کی صحبت کے کھو جانے کا افسوس تھا۔ اس کی ایک اور دوست بھی تھی۔ جس کی یاد اسے ستانے لگی تھی۔ وہ ایک ٹیچر مس ہچز تھی جسے شیلے کی صحبت کا بہت ارمان رہا تھا۔ شیلے نے اسے خط لکھا کہ تم آجاؤ اور ہمارے ہنی مون میں ہماری شریک ہو۔

''تم سوال کرو گی کہ کس طرح میں' ایک کافر ملحد' شادی کی رسم کیلئے آمادہ ہو گیا، کس طرح میرے ضمیر نے یہ گوارا کیا۔ پھر بھی میری بہترین دوست میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں۔ بھلے تم مجھے کوئی الزام کیوں نہ دو۔ بس تم میری غلطی پر افسوس ہی کرتی رہو''۔ لیکن شیلے کے اس خط سے مس ہچز مطمئن نہ ہو سکی۔

ہاگ آگیا اور شیلے اپنے باپ اور ایک پرانے دوست کو دیکھنے انگلینڈ چلا گیا۔ اسے امید تھی کہ وہاں سے اسے ایک اچھی رقم مل جائے گی جس کی اسے سخت ضرورت تھی۔ اس نے اپنی دلہن کو ہاگ کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیا۔ اور ہاگ کو اس کی دلہن سے محبت ہو گئی۔ لیکن اس سے کوئی نقصان نہ پہنچا کیونکہ شیلے کی بہن الیزا بروقت پہنچ گئی اور ہاریٹ کو اپنے جذبات پر قابو پانا پڑا۔ فراخدل شیلے نے جب اپنے دوست کے بارے میں یہ سنا تو اس نے اپنے دوست کو معاف کر دیا جس نے اس کی عزت سے کھیلنا چاہا تھا۔

شیلے کے باپ نے اپنے ایک دوست کی مداخلت سے اپنے بیٹے کے لئے ایک الاؤنس کا بندوبست کر دیا۔ اپنی شادی کے فوراً بعد شیلے نے ''سیاسی انصاف'' کے مصنف گوڈون کی صحبت حاصل کر لی تھی۔ آزاد محبت کے اس حامی نے دو شادیاں رچائی تھیں۔ پہلے میری وولسٹون کرافٹ (Mary

Wollstone Craft) سے جو ایک باصلاحیت مصنفہ تھی۔ پھر ایک بیوی مسز کلیر مونٹ سے۔ پہلی بیوی سے ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کا نام تھا میریؔ۔

جب شیلے خاندان آئرلینڈ اور ویلز چلا گیا اور ہاریٹ کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی تو شیلے نے میریؔ سے بیاہ کرلیا تھا اور اس وقت تک وہ اپنی شادی کے بارے میں کسی بھی قسم کے خیال پر سوچنا چھوڑ چکا تھا۔ وہ ہاریٹ سے محبت ترک کر کے سرد ہوگیا تھا۔ وہ اکثر اسے چھوڑ کر اپنی بہن الیزا کے وہاں چلی جایا کرتی تھی اور اس کے بارے میں افواہیں مشہور تھیں کہ اس کا کسی میجر ریان سے تعلق قائم ہوگیا ہے۔ ادھر شیلے کا گوڈون خاندان سے بہت قریبی رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ دو لڑکیاں فینی (Fanny) اور جین (Jane) تو اسے پوجنے ہی لگی تھیں۔ انہوں نے اس کا نام ''شریر بونا بادشاہ'' رکھ دیا تھا۔ بعد ازآں میری جو اسکاٹ لینڈ میں تھی واپس آگئی۔ شیلے، میری وولسٹون کرافٹ کی بیٹی سے ملنے کے امکان پر بے پناہ مسرور تھا کیونکہ اس نے اس کے حسن و دلکشی کے بہت چرچے سن رکھے تھے۔

شیلے نے اسے سفید و سنہرے لباس میں دیکھا۔ اس کا چہرہ پیلا اور خوبصورت تھا۔ بال سنہرے چمکدار، آنکھیں بادامی اور نرمی کے احساس سے پُر۔ اس چھریرے اور کانچ کے سے نازک وپُر شباب بدن نے نہ صرف شیلے کے شاعرانہ تخیل کو جگا دیا بلکہ اس کے سارے وجود کو تہ و بالا کردیا۔ جب وہ دونوں ہمکلام ہوئے تو شیلے کو اپنی بیوی کے تضاد کی یاد آئی۔ ہاریٹ سطحی، بیہودہ وغیر سنجیدہ نخرے باز عورت تھی جس نے اس کے خیالات میں جھوٹی دلچسپی ظاہر کی تھی۔ میریؔ اپنے باپ سے ذہنی طور سے بہت متاثر تھی۔ اور ایک شائستہ ومختلف لب ولہجہ میں بات کرتی تھی جس سے شیلے نے رائے قائم کی کہ اس کے پاس وہ روح ہے جو اس کی روح سے ہم آہنگ ہے۔

شیلے کو یقین تھا کہ اس نے اپنا آئیڈیل پالیا ہے۔ میریؔ کو یقین تھا کہ شیلے میں یونانی دیوتا کی تجسیم ہوئی ہے۔ اس کی بہنیں اس کے نام لکھے گئے خطوط میں پہلے ہی اس کی دلکشی کی واضح تصویر کشی کرچکی تھیں لیکن کسی ادیب نے کیا خوب کہا ہے کہ اس کی کوئی بھی تفصیل کبھی حقیقت کو بیان کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔

میریؔ نے دیکھا کہ شیلے ناخوش ہے۔ اگرچہ شیلے نے اس سے کبھی یہ کہا نہیں تھا۔ میری اپنی سوتیلی ماں کی وجہ سے اپنے گھر میں تنہا اور کڑھتی رہتی تھی۔ تقریباً ہر روز ہی اسے اپنی ماں کی قبر پر جاکر وہ سکون حاصل ہوتا تھا جو کبھی سینٹ پنکر اس گرجا کے قبرستان میں جاکر حاصل ہوتا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ جاتی اور پڑھتی رہتی۔

ایک دن شاعر اس کے ساتھ چلا گیا اور دور تک پھیلی ہوئی لاتعداد قبروں کے درمیان اس نے اپنے عشق کا اظہار کردیا۔ (یہ ماحول شیلے کا پسندیدہ ماحول تھا)۔ اس نے اپنی روح نچھاور کردی اور میریؔ نے بغیر کسی تکلف یا ہچکچاہٹ کے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ شیلے نے اسے اپنی نظم ''کوئین ماب'' (Queen Mab) کی ایک نقل پیش کی۔ یہ نظم ہاریٹ کے نام معنون تھی۔ میریؔ نے اس قیمتی کتاب کو سنبھالا اور آخر کے خالی صفحات میں

کئی باتوں کے درمیان یہ بھی لکھا:

''یہ کتاب میرے لئے مقدس ہے اور کیونکہ کوئی دوسری مخلوق اسے کبھی نہیں دیکھے گی اس لئے میں جو جی چاہے اس پر لکھ سکتی ہوں۔ لیکن میں کیا لکھوں؟ کیا یہ لکھوں کہ میں اظہار کی تمام قوتوں سے بڑھ کر کتاب کے مصنف کو پیار کرتی ہوں اور یہ کہ میں اس کے جسم (گویا پسلی سے) تیار ہوئی ہوں؟ محبوب ترین اور اکلوتے پیار کے سہارے ہم نے ایک دوسرے سے وفا کرنے کی قسم کھائی ہے۔ اگرچہ میں شاید تمہاری نہ ہوسکوں لیکن میں کسی اور کی بھی ہرگز نہ ہوسکوں گی''۔

670

میری کو شاعر سے اپنی وابستگی کے بارے میں اگر کچھ شبہات تھے تو وہ اس تحریر کے چند ہفتوں کے اندر دور ہوگئے۔ ایک دن ماہ جولائی میں شیلے نے اپنی بیوی سے ہمیشہ کے لئے اجازت لے لی۔ اس نے ہاریٹ سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ اب ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ اس وقت ہاریٹ حاملہ تھی اور شیلے کے اس حکم سے اسے صدمہ پہنچا جو اس کی خطرناک علالت کا سبب بن گیا۔ لیکن شیلے ایسے حالات میں عورت کو گزند پہنچانے والا مرد ہرگز نہیں تھا۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کی خدمت ایسے خلوص اور عقیدت سے نہیں کرسکتا جیسی شیلے نے اس بحران میں ہاریٹ کی کی جو اس کے رویے سے پیدا ہوگیا تھا۔ البتہ میاں بیوی میں صلح کا کوئی امکان پیدا نہ ہوسکا۔ جب اس کی طبیعت ٹھیک ہوگئی تو اس نے اپنے شوہر کی فطرت میں ذرا بھی تبدیلی نہیں پائی۔ شیلے نے اس سے کہا

''استقلال کے دامن میں کوئی نیکی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اکثر اس کے جلو میں آوارگی چھپی ہوتی ہے''۔ ہاریٹ پسپا ہوگئی اور اس نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اس نے سارا الزام میری کے سر تھوپ دیا۔ اس نے سوچا کہ اسی چھنال کی کرتوت ہے جو اس نے قبرستان میں اپنی ماں کی یادوں کا استحصال کرکے شیلے کے جذبات کا استحصال کیا ہے۔ ہاریٹ اس آفت کی پرکالہ کے خلاف سخت غیظ وغضب میں تھی۔

شیلے نے اپنے بینکر کو تاکید کی کہ اس کے الاؤنس میں سے بڑی رقم ہاریٹ کو ادا کردے۔ اس طرح وہ مطمئن ہوگیا کہ ہاریٹ اور اس کا خاندان اب اپنا گذر کرسکے گا۔ اپنے اس خیالی اطمینان پر تکیہ کرکے شیلے میری کو ایک بگھی میں بٹھا کر ڈوور، جزائر برطانیہ کو چلا گیا۔

اس طرح رومانس میں یہ ایک زبردست فرار یا اغوا شروع ہوا۔ ذرا کوئی تصور تو کرے، علی الصباح چار بجے یہ جوڑا نکل بھاگنے کے لئے تیار ہوا اور ساتھ میں میری کی بہن جین کلیر مونٹ بھی تھی! بھلا ایسا ڈھونگ لکھنے والا کون ادیب رہا ہوگا۔ اس عجیب عاشق نے اس زبردست رسوا کن سفر میں اپنی محبوبہ کی بہن تک کو ساتھ لے جانے میں کوئی ہیچ محسوس نہیں کی۔ اسی روز دوپہر کو یہ تینوں ڈوور کے جزیرے پر ملاحوں سے کلائس پہنچنے کے لئے ایک چھوٹی کشتی کی اجرت پر تکرار کررہے تھے۔ بھلا کوئی سوچ سکتا ہے یہ سب؟

دو کنواریوں کے ساتھ کشتی کے سفر میں بالخیر چل رہی تھی کہ ایک جھکڑ آیا۔ میری سخت بیمار پڑگئی اور ساری رات شیلے کے کاندھے پر اپنا سر جھکائے

بیٹھی رہی۔ اور پھر رات کے اندھیرے میں بڑا بھیانک طوفان آ گیا۔ لیکن صبح کے وقت خاموشی اور دھوپ پھیلی نظر آئی۔ کلائس کے ساحل پر وہ لوگ اپنے سامان کا انتظار کر رہے تھے جو دوسری کشتی سے آ رہا تھا۔ لیکن یہ سامان مسز گوڈ ون کے ساتھ پہنچا!۔ سوتیلی ماں نے میری کو واپس چلنے کے لئے بہت پھسلایا لیکن ناکام رہی۔ پھر اس نے جین کو رضامند کرنا چاہا۔ لیکن جین نے ان غیر قانونی ہنی مون منانے والوں کے ساتھ رہنے کی ٹھان لی تھی۔ آخر کار مسز گوڈ ون کو ان دو خودسر اور ضدی لڑکیوں سے مار کھا کر لوٹنا پڑا کہ ان پر شیلے کی چکنی چپڑی کا اثر بے حد و حساب تھا۔

وہ تینوں تین گھوڑے والی بند گاڑی میں پیرس پہنچے۔ لیکن پیرس میں تین دنوں بعد تینوں ٹوٹ بکھر گئے۔ شاعر صاحب نے اپنی گھڑی اور سونے کی زنجیر گروی رکھ دی اور پھر اپنے ایک آشنا فرانسیسی مسٹر تاونیئر (TAVER NIER) سے ساٹھ پاؤنڈ قرض حاصل کیا۔

اس المیہ و طربیہ کا اگلا منظر یہ ہے کہ وہ تینوں پیرس سے پیدل جا رہے ہیں۔ ساتھ میں ایک مال بردار گدھا ہے جسے شیلے نے سامان لادنے کے لئے خرید لیا ہے۔ گدھا تھک کر ڈھیر ہو گیا ہے اور اسے دونوں لڑکیاں گھسیٹ رہی ہیں۔ آنے والے گاؤں میں اس گدھے کو بیچ کر ایک خچر خرید لیا جاتا ہے۔

وہ ایک ضلع کا سفر کر رہے تھے جو ابھی حال میں جنگ میں تباہ ہوا تھا، لہٰذا اچھی رہائش گاہیں تلاش کرنا مشکل تھا۔ تمام سرائیں کیڑوں اور بڑے بڑے چوہوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان تینوں نے فارم کچن میں اپنی رات گزاری۔ اس تمام مصروفیت میں شیلے ہاریٹ کو بھول نہیں سکا تھا۔ اسے اس کی خاطر افسوس تھا۔ کیا اس شاعر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ہاریٹ کا شوہر ہوتا تو اسے ایسا خط لکھ سکتا تھا:

''تم سوئزرلینڈ آ جاؤ گی تو تمہیں ایک ایسا مستقل دوست ملے گا جسے تمہاری دلچسپیاں بے حد عزیز ہوں گی، اور جو کبھی تمہارے محسوسات کو ٹھیس نہیں پہنچائے گا''۔

ہاریٹ نے اس خط کا جواب نہیں دیا۔ کیا کوئی عورت اس طرح چپ سادھ لیتی؟ سوئزرلینڈ آ گیا۔ لیکن قدیم شاتو حویلی جس کے دو کمرے کرائے پر اٹھے ہوئے تھے شکستہ و خستہ حال تھی۔ وہ لوگ بدترین صعوبت گزار رہے تھے اور جب شیلے نے سوچا کہ اب ہمارے پاس صرف ۲۸ پونڈ بچ رہے ہیں تو سبھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب ایک ہی جگہ رہ گئی ہے جسے گھر بنایا جائے!

وہ لوگ روٹرڈم پہنچ گئے۔ اس وقت ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ لیکن شیلے نے بحری جہاز کے کپتان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ انہیں لندن پہنچا دے۔ انہوں نے ایک ٹیکسی کی جس کا کرایہ دینے کے لئے ان کے پاس رقم نہ تھی۔ شیلے نے یہ مسئلہ اپنی بیوی ہاریٹ سے کچھ پونڈ قرض لے کر حل کیا۔

ہاریٹ اب تک سوچتی تھی کہ اس کا شوہر میری سے تھک کر اپنے گھر واپس آ جائے گا۔ لیکن یہ ایک بے کار امید تھی۔ اسی سال اس کو ایک دوسرا بچہ پیدا ہوا جو لڑکا تھا۔ لیکن اس کی ولادت بھی طرفین کو ایک دوسرے کے قریب نہ

لا گئی۔ شیلے اور میری تمام مشکلات کے باوجود بہت خوش تھے اور جین جس نے اپنا نام بدل کر کلائرے رکھ لیا تھا، ان سے خواہ مخواہ چپکی رہتی تھی۔ وہ ایک پریشان کن رکاوٹ بن کر رہ گئی تھی۔ اسے اعصاب کا مرض ہو گیا تھا۔ درحقیقت اسے خود شاعر سے محبت ہو چکی تھی۔ اس درمیان شاعر کی حالت اتنی پتلی ہو چکی تھی کہ قرقی کرنے والے یعنی بیلف (Bailiff) اس کی تلاش میں تھے اور وہ اس طرح روپوش ہونے پر مجبور ہو چکا تھا کہ میری سے صرف انتہائی رازداری میں مل سکتا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو محبت بھرے پیغامات بھیجے۔ دادا یعنی سر بشے کی موت شیلے کے لئے کچھ باعث راحت ہوئی کیونکہ اس سے وہ براہ راست نوابی کا حقدار ہو گیا تھا۔ سر بشے اس کے لئے بے بہا خوش بختی کا سامان چھوڑ گئے تھے۔ اس نے ہاریٹ کے لئے ایک اچھا الاؤنس مقرر کیا اور اپنے مقروض خسر کی مدد کی۔

میری کا بچہ پیدا ہونے اور ایک ماہ بعد اس بچے کی موت ہونے پر میری کو احساس ہوا کہ وہ کلائرے کی موجودگی اب اپنے گھر میں ذرا بھی برداشت نہ کر سکے گی۔ حسد اس کی خاص وجہ تھی۔ کلائرے چالاک اور ایک پرکشش لڑکی تھی۔ لیکن میری یہ سوچنے پر مجبور تھی کہ خود شیلے کا وفا شعار دل بھی کسی محبت کرنے والی عورت سے آنکھیں نہیں پھیر سکتا۔ خاص طور سے اس عورت سے جو رات بھر اس کے ساتھ گپ شپ کرنے کی عادی رہی ہو۔ اور جو اس سے تجرید کے سبق لیتی رہی ہو۔ میری عارضی طور سے کلائرے سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ اس جذباتی لڑکی نے جب یہ سمجھ لیا کہ وہ شیلے کو اپنی بھن سے نہیں جیت پائے گی تو اسے کسی اور محبت کی ضرورت پڑی۔ اور اس محبت کی تلاش میں وہ ایک دوسرے شاعر کے آغوش میں جا پڑی۔ وہ عظیم شاعر لارڈ بائرن تھا۔ لیکن یہ ایک دوسری کہانی ہے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جب شیلے اور میری انگلینڈ میں برادری سے باہر کر دئے جانے کے بعد کفایتی طرز زندگی پر گزر بسر کرنے کے لئے گئے تو کلائرے ان کے ساتھ تھی۔ بہت جلد بائرن بھی ان سے آملا۔ بائرن اور کلائرے میں تھوڑی مدت کے لئے تعلقات رہے لیکن بائرن اس سے جلد ہی اکتا گیا۔ ان کے تعلق سے الگرا نام کی بچی پیدا ہوئی جو 5½ سال کی عمر میں مر گئی۔

جب شیلے سوئزر لینڈ میں تھا تو النا کی اس کے پیر چوم رہی تھی۔ بیچاری فینی گوڈون تین بہنوں میں سے اکیلی تھی جو اپنے گھر میں اپنی ماں کے ساتھ بدحال زندگی گزار رہی تھی۔ اسے اپنی بہنوں کی آزادانہ زندگی پر رشک آتا تھا جسے وہ ان کے نام لکھے اپنے خطوط میں چھپا نہیں پائی۔ وہ خود شیلے کے دام محبت میں گرفتار تھی۔ اس کی زندگی بدحالی میں گزر رہی تھی۔ شیلے، میری، اور کلائرے شہر باتھ جانے کے لئے انگلینڈ پہنچے تو انہوں نے لندن میں فینی کو دیکھا۔ فینی شاعر کو الوداع کہتے ہوئے بہت دلگیر اور مغموم تھی۔

اس نے برسٹل سے شیلے وغیرہ کے نام ایک خط لکھا۔ فینی نے انہیں ان جملوں کے ساتھ الوداع کہا ''میں ایک ایسی جگہ جا رہی ہوں جہاں سے اب کبھی واپس آنے کی امید نہیں کی جا سکتی''۔ میری کی درخواست پر شیلے برسٹل چلا گیا جہاں معلوم ہوا کہ فینی سوان سی (Swan Sea) جا چکی ہے۔

دوسری صبح وہ مردہ پائی گئی۔ افیم ملی شراب کی بوتل میز پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک جذباتی خط بھی چھوڑا تھا۔

اس صدمے کی بے پناہی میں مسز گوڈون کے اس الزام نے اور اضافہ کر دیا کہ فینی نے شیلے کی محبت میں خودکشی کی تھی۔ شیلے ناکامی و نامرادی کی گہرائیوں میں گر پڑا تھا۔ ہیمپسٹیڈ میں لیہ ہنٹ (Leigh Hunt) نامی ادیب کے گھر پر مختصر قیام سے شیلے کو ذرا قرار آیا لیکن اسے ایک اور زبردست چوٹ لگنے والی تھی۔ ہاریٹ روپوش ہو گئی تھی۔ شیلے نے اسے تلاش کرنے میں اپنے دوست ہوکھام کو خط لکھ کر اس کی مدد چاہی۔ ہیمپسٹیڈ سے شاعر کو لوٹنے پر ہوکھام کا یہ پیغام رکھا ہوا ملا:۔

''محترم! ایک ماہ قبل آپ کا خط مجھے ملا تھا اور اس میں شک نہیں کہ آپ میرے فوری جواب نہ دینے پر کافی متعجب ہوئے ہوں گے۔ میں نے جواب جلد دینا چاہا تھا مگر آپ کی مطلوبہ معلومات کی تحقیق میں بڑی دشواری ہوئی۔ مسز شیلے کا پتہ ڈھونڈ نکالنے پر مجھے یہ اطلاع ملی کہ وہ مر چکی ہیں، انہوں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا تھا۔ آپ یقین کریں کہ میں نے اس خبر کو غیر مصدقہ سمجھا۔ میں جناب ویسٹ بروک کے ایک دوست کے گھر پہنچا جہاں مجھے پتہ چلا کہ مسز شیلے کو گزشتہ منگل کو دریائے سرپنٹائن سے نکالا گیا ہے۔ لاش کے معاملے میں کوئی قابلِ قدر خبر نہیں مل سکی۔ آپ کے بچے اچھے ہیں۔ اور دونوں لندن میں ہیں''۔

''دی ٹائمس میں درج ذیل رپورٹ شائع ہوئی:۔

''جمعرات کو ایک معزز حاملہ عورت جس کا حمل کافی بڑھا ہوا تھا، دریائے سرپنٹائن سے مردہ برآمد ہوئی۔ اسے برومپٹن کے کوئین اسٹریٹ میں اس کی رہائش گاہ پر لے جایا گیا۔ وہ چھ ہفتے سے گمشدہ تصور کی جاتی تھی۔ اس کی انگلی میں کافی قیمتی انگوٹھی پائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کردار میں وقعت و وقار حاصل کرنے کی متمنی تھی اور اس تمنا میں وہ اس برے انجام کو پہنچی۔ اس کا شوہر باہر گیا ہوا تھا''۔

ہاریٹ کو خودکشی پر مجبور کرنے والے حالات کی تہہ میں پہنچنے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔ اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ اس کے خاندان نے اس سے اس کے بچے چھین لئے تھے اور اس سے کوئی تعلق قائم نہیں رکھا تھا۔ اپنے خاتمے سے پہلے وہ دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔

شیلے اس سانحہ سے کافی رنجیدہ تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار نہیں مانتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے جو کیا درست کیا اور ہاریٹ سے کبھی ظالمانہ سلوک نہیں کیا۔

ہاریٹ کی لاش پانی سے برآمد ہونے کے دو ہفتہ بعد میری گوڈون اور شیلے نے سینٹ ملڈریڈ کے گرجا، واقع بریڈ اسٹریٹ، لندن میں شادی کر لی۔ شادی کے رجسٹر پر مسٹر اور مسز گوڈون نے دستخط کئے۔ لیکن شادی کا اعلان کرتے ہوئے مسز گوڈون نے اپنے دوست کو ایک خط میں یہ بھی لکھا:

''میری کا شوہر سر تھومی شیلے کا لڑکا ہے جو سوزیکس، بیرونٹ کے ضلع فیلڈ پلیس کے نواب تھے۔ عرف عام میں یہ کہنا چاہئے کہ میری صحیح طور پر بیاہی جا چکی ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ نوجوان اس کا اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ لیکن تمہیں میرا یہ خیال جان کر حیرت ہوگی کہ یہ لڑکی جس کے پاس پھوٹی کوڑی کا مستقبل نہیں ہے کس طرح نواب زادے کے لئے اچھا جوڑ ثابت ہوگی۔ مگر یہ دنیا کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں فکرمند تو ہوتا ہوں لیکن دولت کے بارے میں مجھے کوئی خاص فکر نہیں ہے۔ اس کے برعکس میری رائے میں عزت' اختیار اور قناعت کسی لڑکی کی اصل منزل ہونی چاہئے''۔

شیلے نے سوچا تھا کہ پہلے ازدواج سے اس کے بچے میری کی نگرانی میں رہیں گے۔ لیکن چانسری کی عدالت نے فیصلہ اس کے برخلاف دیا۔ فیصلے میں تھا کہ شیلے یا ویسٹ بروک کی فیملی میں سے کوئی بھی بچوں کا مناسب ذمہ دار بننے کا اہل نہیں ہے۔ لہٰذا بچوں کو ایک آرمی ڈاکٹر اور اس کی بیوی کے سپرد کر دیا گیا۔ شیلے کو اجازت دی گئی کہ وہ سال میں بارہ مرتبہ اپنے بچوں سے ان کے گارجینوں کی موجودگی میں مل سکتا ہے!۔

ان چوٹوں نے شیلے پر گہرے نشانات چھوڑے۔ وہ ایک بوڑھے آدمی کی طرح خمیدہ ہوگیا۔ اعصابی تکلیف اسے راتوں کو سونے نہ دیتی تھی۔ دل شکستگی نے اس کا وزن کافی گھٹا دیا تھا۔ آندرے موروئز (ANDRE MOROIS) نے اس کی ذہنی حالت ان لفظوں میں بیان کی ہے:

''وہ ہوائی قلعے اور چمچماتے ہوئے شیش محل جن پر ابخرات کی تجلی چڑھی ہوئی تھی، انہوں نے حقیقی دنیا کو اس کی نظروں سے اب تک اوجھل رکھا تھا۔ اور اب وہ قلعے اور محل زمین چھوڑ کر فضا میں کہیں معلق تھے جیسے کسی ان دیکھی قوت نے اپنی کشش سے انہیں خلاء میں تھام رکھا ہو۔ وہ تھمتے نہیں تھے. صرف ہلکی جنبش اور حرکت کے ذریعہ خالص شاعری کی روشن ترین بلندی تک پہنچنے میں مصروف تھے۔ جو مقام اسے اب نصیب ہوا تھا وہاں سے شیلے دنیا کو اس کے اصلی اور سچے روپ میں دیکھ سکتا تھا۔ خیالی زمین جس میں کاشت کی جا سکتی ہے، بھدے اور کرخت چہروں والے مرد، اعصاب اور ہسٹریا کے خلل میں مبتلا عورتیں، ظالم اور مزاحم معاشرہ جس سے وہ فرار پانا چاہتا تھا''۔

اس نے گریٹ مارلو میں ایک مکان خرید لیا تھا جہاں وہ میری اور اپنے دو بچوں کے علاوہ لارڈ بائرن اور کلارئے کی بے پناہ حسین لڑکی الگرا کے ساتھ رہتا تھا۔ موسم گرما کے دنوں میں شیلے کا زیادہ سے زیادہ وقت دریا کنارے گزرتا تھا۔ اس کے شعری تخیل کی خوراک وادی ٹھیمس کا بے پناہ اور انوکھا حسن تھا لیکن دنیا اسے کبھی اکیلا جینے دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی دولت کے حصہ دار بڑھتے چلے گئے۔ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی ذمہ داری اٹھانا پڑ رہی تھی۔ اپنے خاندان کے علاوہ کلارئے' اس کی بیٹی اور کبھی کبھار گوڈون کا سارا کنبہ، لیہ ہنٹ، اس کی بیوی اور پانچ بچے بھی اس کے پلے پڑ جاتے تھے۔

انگلینڈ میں زندگی اب ناقابل برداشت ہو چلی تھی۔ کلارئے اور اس کی بچی کی موجودگی نے اس کے بارے میں رسوائی آمیز باتیں پھیلا دی

تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ شیلے کی اولاد ہے۔ چنانچہ وہ لوگ اٹلی چلے گئے۔

یہاں اٹلی میں شیلے کی حیات و موت اور لارڈ بائرن سے وابستگی کے بارے میں لکھنے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ شیلے یہاں اپنی بیوی سے پہلے پہنچا۔ اور میری کے سفر میں السنا کی داخل ہوگئی۔ ان کی چھوٹی بچی کلارا وینس میں مرگئی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کلائرے یہاں بھی ان کی شریک اور ہمسفر تھی۔ وینس سے وہ لوگ روم اور نیپلس چلے گئے۔ اس کے بعد دوسرا سانحہ پیش آیا۔ ان کا چھوٹا لڑکا ولیم بیمار پڑ گیا اور پیچش سے مرگیا۔

اس دوسرے صدمے نے میری کا دل توڑ کر رکھ دیا۔ اس کا باپ جس نے اسے غم کے بارے میں سوچنا سکھایا تھا کمزور اور بزدل تھا۔ وہ پہنچا۔ اس نے اپنی بیٹی سے کہا کہ تم اپنے آپ کو ''عورت ذات کے معمولی پن'' کے ساتھ برباد کر رہی ہو۔ شیلے نے اپنی ایک نظم میں شکایت کی:

''میری پیاری میری کہاں کھو گئیں تم
مجھے چھوڑ کر اس اندھیرے جہاں میں
حقیقت تو یہ ہے کہ چہرہ تمہارا
بہت پیارا پیارا
یہاں رہ گیا ہے (تصور میں میرے)
یہ مانا کہ تم خود فرار ہو چکی ہو
اس اندھیارے پتھ سے
جو غم اور اداسی کے

سب سے سیہ آشیانے کو پہنچے''

فلورنس میں ایک اور لڑکے کی پیدائش کے بعد جب پرسی فلورنس کے نام کے ساتھ اس کا بپتسمہ ہوا تو میری ایک بار پھر خوش ہوگئی۔ وہ لوگ اٹلی میں تنہا ہوگئے تھے مگر یہاں انہیں کچھ بہتر دوست مثلاً ایڈورڈ ولیم اور اس کی پرکشش بیوی جین مل گئے۔ شیلے نے جلد ہی دریافت کیا کہ وہ جین سے پیار کرنے لگا ہے۔ لیکن وہ ایک چالاک اور حساس عورت تھی۔ اور ان کی قربت کبھی حد سے آگے نہ بڑھ سکی اور نہ اس سے فضا ناہموار ہو پائی حالانکہ مسز شیلے ایک حاسد عورت تھی۔

ان دنوں شیلے کا ایک دلچسپ معاملہ ایمیلیا نامی خوبصورت اطالوی حسینہ سے بھی تھا جسے اس کے ظالم باپ نے کونوٹ کی فضا میں قید کرا دیا تھا۔ شیلے کے پرفریب رجحانات بری طرح بیدار ہوگئے۔ وہ اسے کونوٹ میں دیکھتے ہی اس پر عاشق ہوگیا۔ اس نے میری سے اصرار کیا کہ وہ اس سے ملے اور اس پر ایک رومانی نظم کہی۔ میری اس نئے رومانس سے تھک گئی اگرچہ یہ بے ضرر تھا۔ نظم مکمل ہونے سے پہلے ایمیلیا کی شادی غیر رومانی طریقے سے کہیں ہوگئی۔ میری نے اپنی ایک سہیلی کو بعد میں خط لکھا: ''ایمیلیا کی شادی بائنڈی (BIONDI) سے ہوگئی۔ سنا ہے کہ وہ اپنے شوہر اور ساس کی زندگی یعنی شیطان کی ڈور خود کھینچتی ہے''۔ شیلے کی زندگی پر اس وقت تک نئی رسوائی کے بادل چھانے لگے تھے۔ یہ رسوائی کلائرے سے وابستہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اٹلی میں شیلے سے کلائرے نے بچہ جنم دیا تھا اور شیلے کے کلائرے اور میری سے

خراب سلوک کے جھوٹے الزامات بھی بری طرح مشہور ہو گئے تھے۔ زبردست صدمے سے چور شیلے نے اس کہانی کے بارے میں کہا کہ یہ بری نیت سے اس کے خلاف مشہور کی گئی ہے۔ یہ رسوائی ختم ہو گئی اور وہ لوگ پیا میں رہنے لگے جہاں قدرے سکون رہا۔ اس کے بعد کا سا ماگنی چلے گئے۔

شیلے اور اس کے دوست ولیمز کی المناک موت کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہے۔ شیلے موت کی بہت تحقیر کرتا تھا۔ ایکبار وہ مسز ولیمز اور اس کے دو بچوں کے ساتھ کاسا ماگنی کے ساحل سمندر پر ایک آفت کھڑی کر آیا۔ وہ ایک بہت چھوٹی کشتی پر سوار تھے۔ جو اتنی ہلکی تھی کہ معمولی بہاؤ سے الٹ سکتی تھی۔ مسز ولیمز نے سمجھا کہ وہ صرف کنارے پر کی سیر کے لئے کشتی چلاتا رہے گا لیکن وہ خاصی دور تک چلا گیا۔ پھر اس نے کشتی روکی اور چلایا "آؤ اب ہم اس عظیم اسرار کو سمجھ لیں"۔ مسز ولیمز بڑی چالاکی سے اسے بہلا پھسلا کر کنارے پر لے آئی۔

اسی موسم گرما میں ایک دن شیلے اور ولیمز ایک کشتی میں سمندر میں سفر کر رہے تھے کہ ایک طوفان آ گیا جس کے بعد وہ زندہ نہیں رہے۔ شیلے کو سمندر کی موجیں دور بہا لے گئیں۔ ولیمز کی لاش بھی مشکل سے ملی۔ ان کے بچے کچھے جسموں کو سمندر کنارے جلا ڈالا گیا۔

لنڈا گڈمین

مترجم: ف۔س۔اعجاز

پہلی پہلی بار

میں خوش ہوں کہ محبت کے چھلکتے
کنووں کو تم نے پہلی بار میرے اندر جگا دیا تھا
دن کی دھوپ میں
چنانچہ میں دیکھ سکتی تھی
جذبہ وفخر سے لبریز تمہارا تبسم
اور تم میری حیرت زدگی کے جھلکوں کو دیکھ سکتے تھے
اس غیر مشتبہ راز پر آتے تھے
جس کے بارے میں میں کبھی نہیں جانتی تھی
کہ یہ میرے منتظر بدن میں موجود تھا۔
اکیلی منتظر...... صرف تمہارے لمس کے لئے
تاکہ میں
اپنے عورت ہونے کے اسرار کے باوصف
تم پر بھروسہ کر سکوں
اب میں ایک سمندر کی طرح محسوس کروں گی
ہاں، اب میں جان گئی ہوں کہ کس طرح ایک سمندر
دریا سے جھپٹ کر مل جانا چاہتا ہے
جو اُسے کھینچ کر...... بار بار گھسیٹ کر
ندی کی طرف لے جاتا ہے
اور پھر کائنات کے آخری اتحاد میں
مدغم کر دیتا ہے۔

ف۔س۔اعجاز

آرتھر شوپنہار

ARTHER SHOHOPENHAUER

۱۳ر فروری ۱۷۸۸ء تا ۲۱ر ستمبر ۱۸۶۰ء

یاسیت وقنوطیت کا جرمن مفکر آرتھر شوپنہار اپنی تصنیف ''دی ورلڈ ایز ول اینڈ آئیڈیا'' (The world as will and idea) یعنی 'دنیا بطور ارادہ وخیال' کے لئے بہت مشہور ہے۔ جس میں اس نے اپنے عہد کے اس تصور کو چیلنج کیا تھا جو 'جینے کے ارادے' سے وابستہ تھا۔ جینے کا ارادہ انسانی زندگی کا محرک اور انسانی اذیت وابتلا کی بنیاد تھا۔

شوپنہار شکل سے ہی فلاسفر نظر آتا تھا۔ پستہ قد اور الف قامت، بڑے سر اور تیز نیلی آنکھوں والا۔ ہمیشہ اچھے کپڑے پہنے رہتا۔ اس کی مزاجی کیفیت بہت گہری تھی۔ غرور بہت رکھتا تھا اور اس سے متفق نہ ہونے والے پر صبر کھونے میں اسے کچھ دیر نہیں لگتی تھی۔ اس کے والدین — ماں باپ دونوں قوی دماغ والے، ذہین اور فیصلے تھے۔ اس کی ماں جوہانا اس کی صلاحیتوں کی بہت حاسد تھی۔ اور وہ دونوں آپس میں بہت لڑا کرتے تھے۔ ایک بار اس نے آرتھر کو سیڑھی سے نیچے گرا دیا۔ اس کا باپ سخت اور تیز مزاج اور کامیاب تاجر تھا۔ اس نے ۱۸۰۵ء میں خودکشی کر لی۔ شوپنہار اپنے باپ کا مداح تھا اور اس نے اپنا فیملی بزنس برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن کاروبار سے اسے نفرت ہوگئی۔ اور جب اس کی ماں نے اسے فلسفہ پڑھنے کا حوصلہ دیا اس نے مشتاقانہ اس مضمون کو اپنا لیا۔ بیوہ جوہانا ''شہر شعراء'' ویمر کو منتقل ہوگئی جہاں وہ ایک ناول نگار اور سیلون میں میزبان کی حیثیت سے کافی مشہور ہوگئی۔ ۱۸۱۳ء میں نو عمر شوپنہار بھی ویمر چلا گیا جہاں اس نے ایک نوجوان مُلر وان گسٹنبرگ پر اپنی ماں کو ملتفت پایا۔ جوہانا کی یقین دہانی کے باوجود کہ یہ افلاطونی اور پاک روحانی معاملہ ہے شوپنہار نے یہی سوچا کہ اس کی ماں مصلحت ناکوشی کی مرتکب ہوئی ہے۔ اس نے اپنی ماں کو کہا ''تمہیں میرے اور وان گسٹنبرگ کے درمیان فیصلہ کرنا ہوگا!''۔ اس نے گسٹنبرگ کو چن لیا اور شوپنہار نے اسے زندگی میں کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

جب شوپنہار اپنی والدہ سے ویمر میں متصادم تھا تو اس کا ایک افیئر درباری تھیٹر کی اداکارہ کیرولن جگرمان سے ہوگیا جو ڈیوک کارل آگسٹ کی تسلیم شدہ معشوقہ تھی۔ شوپنہار کے اس تعلق کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں البتہ وثوق سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس نے زندگی میں اتنی رومانویت کے ساتھ کسی دوسری عورت کے بارے میں نہیں سوچا جتنا کیرولن کے بارے میں سوچا۔ شوپنہار ''دنیا بطور ارادہ وخیال'' کی اشاعت کے بعد اٹلی منتقل ہوگیا جہاں اس کے افکار گہرے اور تہہ دار ہوگئے۔ اس نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ جنسی

جذبہ "ارادے کا سب سے صریح اور واضح ترین اظہار ہے"۔ اس نے اعتراف کیا "میں کوئی صوفی سنت یا سادھو نہیں ہوں"۔ اٹلی میں جہاں کوئی گناہ نہ کرنا ہی سب سے بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا وہ ایک امیر، خوبصورت، پروقار خاتون ٹریزا سے ملا۔ اس نے شادی کے متعلق سوچا لیکن پھر اس خیال کو اس وقت ایک دم ذہن سے جھٹک دیا۔ جب ٹریزا ایک دن کھلے عام لوگوں کے سامنے اس سے دامن چھڑا کر لارڈ بائرن کی بغل میں چلی گئی۔ اس نے لکھا ہے "مجھے دیوث بائرن کے سینگوں سے ڈر لگ رہا تھا"۔

وہ برلن یونیورسٹی واپس آ گیا لیکن اس کے لیکچروں میں سامعین بہت کم ہوا کرتے تھے۔ برلن میں اس پر ذاتی حملے کے الزام میں ادھیڑ عمر کیرولن مارکوئٹ نے مقدمہ دائر کر دیا جسے اس نے اپنے کمرے سے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا۔ سبب اس کا صرف یہ تھا کہ وہ بار بار اس کے سامنے آ کر سلائی کا کام کرنے لگتی اور اسے غصہ دلاتی۔ وہ عورت مقدمہ جیت گئی اور شوپنہار کو اسے باقی ساری زندگی ہرجانہ چکانا پڑا۔ اس واقعہ کے بعد وہ پھر اٹلی چلا گیا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ عورت سے نفرت کی بنا پر بار بار عورتوں سے محبت اور شادی کرتا چلا گیا۔ اور وہ ہر اگلی عورت کو پچھلی عورت سے زیادہ تحقیر سے دیکھتا۔ اس کا خیال تھا کہ جنسی ترغیب "ایک بلا ہے جو گمراہ اور محدود کر دیتی ہے اور ہر شئے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہے"۔ ایسی تباہی کے لئے وہ عورتوں کو ذمہ دار قرار دیتا تھا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ محبت فطرت کا محض ایک فریب ہے جسے وہ صرف عورت کے ایک مقصد (Procreation) کے لئے استعمال کرتی ہے۔" یہ

صرف مرد ہے جس کی ذہانت اس کے عاشقانہ مزاج اور جنسی رغبت کے غبار میں دھندلا جاتی ہے جس کی بنا پر وہ چھوٹے قد کی تنگ شانوں، بھرے کولہوں اور چھوٹی ٹانگوں والی مخلوق کو صنفِ نازک کا نام دے بیٹھتا ہے"۔ صنفِ نازک کی تضحیک کرتے ہوئے شوپنہار نے اس کی صرف ایک طاقت کا اعتراف کیا ہے اور وہ ہے اس کے شباب کی چمک جو شادی کے بعد ماند پڑ جاتی ہے۔ اپنے زبان وادب اور میجک پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے شوپنہار جوان و پرشباب خواتین میں مقبول تھا۔

ایک برس بعد وہ پھر میونخ لوٹ گیا اور بیمار پڑ گیا۔ کئی ماہ صاحب فراش رہا۔ تب اسے اندیشہ ہوا کہ یہ مرض اس کے دماغ پر اثر انداز ہو کر رہے گا۔ بحال ہونے کے بعد اس نے اپنے نظریہ تعدد ازدواج کے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ اس کے بعد اس کا مضمون "آن ویمن" (پاروگا، ۱۸۵۱ء) میں شائع ہو کر شادی یا عورت سے نفرت کے حوالے سے اس کے لئے باعث توقیر بن گیا۔

اس کے باوجود وہ زندگی میں کبھی خواتین سے لاتعلق نہیں رہ سکا۔ ایک رسالے میں اس نے ایک خوبصورت اداکارہ "فرالین میڈون" کا ذکر کیا ہے۔ جس کے ساتھ وہ رہا اور جس کا اس نے دل جیت لینے کے بعد شادی کی بابت سوچا۔ اس کا تجزیہ تھا کہ فرالین ایک محبوبہ ہی نہیں ایک بیوی کے طور پر بھی بالکل اطمینان بخش تھی۔ لیکن ایک بار پھر اس کی فطری احتیاط اور سنک عود کر آئی۔ اس نے عشق کیا مگر وہ ٹھہرا ایک فلاسفر۔ اس کی قنوطیت غالب آ گئی

اور شادی کا خیال ادھورا رہ گیا۔ شوپنہار سوچتا تھا کہ اس کے کارنامے کی لافانیت اس کی ممکنہ اولادوں سے بڑھ کر معنی خیز اور اہم تھی۔ لہٰذا ۷۲ سال کی عمر میں پھیپھڑے کے ہیمرج میں چھڑا مر گیا۔

شوپنہار نے کوچۂ عشق میں خواہشات کا ماتم ضرور کیا لیکن ان کا منکر کبھی نہ ہوا۔ ''جتنا جتنا میں مردوں سے ملتا ہوں اتنا اتنا ان کو کم پسند کرنے لگتا ہوں۔ کاش یہی بات میں اپنی معشوقوں کے بارے میں کہہ سکتا تو بڑی خیریت ہوتی''۔

نظم

ف۔س۔اعجاز

روانگی

مے کدہ شام کا پھر سے روشن ہوا
ایک خواہش مرے کام پھر آ گئی
تیرے رنگیں تصور میں ڈوبا ہوا
اپنا دل، اپنے دل کی تمنا لئے
منتظر دیدہ کا قُرب کا منتظر
کون سا نام لے کر پکاروں تجھے
کیا پکاروں تجھے
کیا پکاروں تجھے؟
میری آواز تو سن نہیں پائے گی
دور مجھ سے ہے تو
اس قدر دور ہے
جتنا سورج سمندر میں ڈھلتا ہوا
پھر بھی جانِ ادا، میری جانِ بہار
آن کی آن میں
یہ تخیل مجھے لے کر اڑ جائے گا
تو مجھے اپنے در پر کھڑا پائے گی
نہ چاندی، نہ سونا، نہ موتی سمندر کے اُگلے ہوئے
میری جھولی میں ہیں
میں تو بس گنگناتی جوانی لئے
تیرے در پر اچانک پہنچ جاؤں گا
مٹھیوں میں اک ایسا الاؤ لئے
تن بدن جس سے تیرا دہکنے لگے
مے کدہ شام کا پھر سے روشن ہوا
ایک خواہش مرے کام پھر آ گئی
...........میں روانہ ہوا

☆☆☆

ف۔س۔اعجاز

کارل مارکس

۵۔مئی ۱۸۱۸ء تا ۱۴۔مارچ ۱۸۸۳ء

یہودی پادریوں کے ایک طویل سلسلے سے تعلق رکھنے والے کارل کا چھ سال کی عمر میں اس کے وطن پرشیا کے شہر ٹرائر کے ایوانجلیکل چرچ میں بپتسمہ کیا گیا۔ اس بپتسمہ کی گزارش خود اس کے باپ نے کی تھی جس نے خاندانی عقیدے کو ٹھکرا دیا تھا۔ بعد میں کارل نے خود سارے مذاہب کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ "مذہب عوام کی افیون ہے"۔ اُس کے اس اعلان کے نتیجے میں اُس پر سامراج مخالف کا الزام لگا دیا گیا تھا۔

۱۶ سال کی عمر میں اسے ایک امیرزادی جینی وان ویسٹفالین سے عشق ہو گیا جس سے اس نے ۸ سال بعد اپنی تعلیم مکمل کر کے شادی کی۔ اس نے یونیورسٹی آف جینا سے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ وہ ادبی اور ثقافتی رسالوں کے لئے جس قسم کے اشتعال انگیز مضامین لکھا کرتا تھا ان کی وجہ سے اسے پیرس، پھر کولون اور اس کے بعد برسلیز سے نکال باہر کر دیا گیا۔ وہ انڈرگراؤنڈ سوشلسٹ تحریک کا سرگرم رکن بھی تھا۔ پیرس میں وہ فریڈرک انگلز سے ملا جو ایک امیر کپڑا ساز کا بیٹا تھا۔ انگلز اس کا زندگی بھر معاون بنا رہا۔ ان کے مشترکہ کاموں میں "کیمونسٹ مینی فسٹو" (۱۸۴۸ء) بھی ہے جسے کیمونسٹ لیگ کے لئے لکھا گیا۔

۱۸۴۹ء میں وہ لندن چلا آیا۔ انگلز بھی اپنے باپ کی کپڑا کمپنی میں مانچسٹر منتقل ہو گیا۔ یہاں انہوں نے سر جوڑ کر انقلاب لانے کی فکر کی۔ لیکن برطانوی حکومت کی غیر رضامندی کی بنا پر ان کی انقلاب لانے کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ دولت کو مارکس نے اپنے لئے شئے ممنوعہ بنا رکھا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو "روپے بنانے کی مشین بنانے" سے انکار کر دیا۔ اس لئے اس کا اور اس کے خاندان کا گذارا اس کی نگارشات سے حاصل ہونے والے معاوضہ یا انگلز اور رشتہ داروں کی امداد سے ہوا کرتا تھا۔ مارکس نے اپنے بچوں کو قرض خواہوں کو یہ جواب دینے کی تربیت دے رکھی تھی "مسٹر مارکس اوپر گھر میں نہیں ہیں اس لئے آپ واپس چلے جائیں"۔ حالانکہ بعد میں مارکس کی تقدیر بدل گئی تھی۔ مارکس کے سات میں سے تین بچے جوانی تک پہنچے اور ان تین میں سے دو نے خودکشی کر لی۔ مارکس اپنے دن کے اوقات برٹش میوزیم کے دارالمطالعہ میں گزارتا تھا جہاں اس نے سرمائے پر اپنی تحقیق (DAS KAPITAL) کا کام انجام دیا اور انگلز کے ساتھ "ڈیلی ٹریبون" کے لئے مضامین اور اداریے تحریر کئے۔ اس کی صحت کمزور تھی۔ اختلاج اور گھبراہٹ طاری رہتی تھی۔ وہ شاید ہی غسل کرتا تھا اور زندگی کے آخری بیں

برسوں میں اس کے سارے بدن پر پھوڑے اُبلتے رہے۔ اور معدہ اور آنکھ کے امراض میں وہ مبتلا رہا۔ وہ ایک وکٹورین فرمانروا تھا اور تنقیص و طنز کا عادی تھا۔ دوسروں کی رائے اس کے لئے ناقابل برداشت ہوا کرتی تھی۔ اس کی سیاہ رنگت کی وجہ سے اس کا پکار کا نام MOOR (مور) یعنی کالا بھیڑ پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر لمبی داڑھی رکھ لی تھی تاکہ یونانی خدا زیوس "ZEUS" کے مجسمہ سے اپنے چہرے کی مماثلت کو نمایاں کر سکے۔ زیوس کا ایک مجسمہ اس کے کمرۂ مطالعہ میں رکھا رہتا تھا۔

مارکس نے زندگی میں صرف ایک سنجیدہ محبت کی۔ اور اس کی سبز رنگ آنکھوں اور بھورے بالوں والی محبوبہ کا نام جینی تھا جو اس سے عمر میں ۴ سال بڑی تھی۔ جینی ایک انگریز نواب کی بیٹی تھی۔ وہ شریف خصلت اور عالمانہ خصوصیت کی حامل تھی۔ لیکن وضع اور اسٹائل کے ساتھ ایک بے جا غرور بھی اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ ایک سال ٹرائر میں اسے "کوئین آف دی بال" کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اس کے بعد اس نے کارل کو پسند کر لیا جسے وہ لاڈ سے عجیب عجیب ناموں سے پکارتی تھی۔ مثلاً ایک نام اس نے اس کا "ننھا کالا وحشی" رکھ چھوڑا تھا۔ دونوں کے خاندان ان کی شادی کے مخالف تھے۔ جینی نے اپنے عشقیہ خطوط میں کارل کے لئے "تمام انتہائی محبت جو تھی اور ممکن ہے" اکثر پیش یا معنون کی ہے گرچہ ان دونوں کی محبت شادی سے پہلے بھی مکمل نہ ہوئی۔

۱۸۴۳ء میں کارل اور جینی نے ایک پروٹسٹنٹ چرچ میں شادی کرلی۔ اور ہنی مون منانے سوئزرلینڈ چلے گئے۔ اس کے لئے پیسے جینی کی ماں نے فراہم کئے۔ وہ اپنے پیسے ایک دو ہنڈلوں والی صندوقچی میں لے گئے جس کا وہ قصداً ہوٹل کے کمروں میں ڈھکن کھلا چھوڑ دیا کرتے تھے کہ جو چاہے اس میں سے کچھ مال غنیمت سمجھ کر اٹھا لے۔ ان کا پہلا بچہ پیرس میں پیدا ہوا۔ جینی اپنی بیٹی کو وطن لے گئی کہ رشتہ دار دیکھ لیں۔ وہاں سے کارل کو اس نے خط لکھا کہ اسے پیرس جاتے ہوئے اس لئے محتاط ہونا پڑ رہا ہے کہ کہیں دوسرا بچہ نہ پیدا ہو جائے۔ (حالانکہ بچہ تو پھر پیدا ہوا ہی)۔ زچگی کا خوف اور ایک اور انسان کی خوراک کے مسئلہ نے ان کی ازدواجی زندگی کو دکھی بنا دیا۔ مارکس ایک گھریلو آدمی تھا۔ وہ جینی کو سیماب صفت قرار دیتا تھا اور اپنے خطوط میں اس کے "آنسوؤں کے طوفانوں" کا خاص طور سے ذکر کیا کرتا تھا۔ اس نے انگلو سے بھی کہا "جب میں اپنی بیوی کی مصیبت اور اپنی بے طاقتی اور مجبوری دیکھتا ہوں تو خود کو شیطان کے جبڑے میں پھنسا ہوا محسوس کرتا ہوں"۔ مارکس کو کرائے کی عدم ادائیگی کی صورت میں کئی جگہ گھروں سے بے دخل کر دیا گیا۔ ایک بار اسے اپنی یک سالہ بچی کی موت پر کفن دفن کے لئے بھی قرض لینا پڑا۔ جب حال اچھا ہوتا تو وہ اپنے کنبہ کے ساتھ اتوار کے روز پکنک منانے لندن کے پارکوں میں چلا جاتا۔

۱۸۴۵ء میں جینی کی ماں نے اسے ۱۱ یا ۱۲ سال کی ایک کسان لڑکی بطور گھریلو خادمہ اپنی جانب سے دے دی۔ اس کا نام ہیلن ڈیموتھ (لنچن) تھا۔ لنچن سارے خاندان کو بڑی سختی سے اپنے انتظام میں رکھتی تھی۔ حتیٰ کہ شطرنج کھیلتے وقت مارکس کو پیٹ بھی دیا کرتی تھی۔ مارکس کا اس سے لگاؤ

ہو گیا۔ ۱۸۵۱ء میں لنچن کے ایک بچہ ہوا جس کا نام ہنری فریڈرک رکھا گیا۔ مارکس نے اسے نہیں قبولا۔ اسے ایک دوست گھرانے نے پالا۔ مارکس اس سے صرف ۱۸۸۲ء میں ایک بار ملا۔ لنچن مارکس گھرانے میں کارل کی موت تک یعنی ۱۸۸۳ء تک نوکری کرتی رہی۔ دو سال بعد جینی بھی چل بسی۔ اس کے بعد وہ انگلز کے پاس کام کرنے چلی گئی۔

مارکس نے دو معمولی معاشقے بھی کیے۔ ایک ۳۳ سالہ فرانیگ نامی ایک شادی شدہ اطالوی امیر کی بیوی سے اور دوسرا اپنی کزن انتوئنے فلپس سے جو اس سے عمر میں ۱۹ سال بڑی تھی۔ انتوئنے نے ۱۸۶۳ء میں مارکس کی دیکھ بھال کی تھی جب اسے پھوڑے نکل آئے تھے۔ بحال ہوتے ہوتے مارکس نے انتوئنے کی گہری آنکھوں کے بارے میں لکھا ''اس کی آنکھیں میری دیکھ بھال کرتے کرتے اچانک خطرناک طور پر چمکنے لگتی ہیں''۔

مارکس بہت شفیق انسان تھا۔ بیوی کو مارنے والوں سے اسے بہت چڑ تھی اور کہتا تھا بیوی کو زد و کوب کرنے والے کو وہ پیٹ پیٹ کر موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ سیاسی طور پر وہ بورژوائی شادی کا مخالف تھا گرچہ اس نے خود بورژوائی طرز پر شادی کی۔ وہ کہتا تھا کہ بورژوائی نظام عورتوں کو غلام بنا دیتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے انگلز کی محبوبہ کو سختی سے رد کر دیا کیونکہ وہ نچلے طبقہ کی عورت تھی۔ مارکس کی طبیعت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ سولہویں صدی کی شہوانی شاعری، ننگے لطائف وغیرہ کا زبردست رسیا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ یہ چیزیں عام صحبتوں میں سنتا سناتا نہیں تھا۔

نظم

ف۔س۔اعجاز

بٹن

اثر انوکھا ہوا

جب آستیں کا بٹن گر کے کھو گیا جاناں

تمہاری یاد کا سینہ ہزار چاک ہوا......

وہ ایک نور کا دھاگہ دھیان میں آیا

کسا ہوا سا کوئی تار ساز کا جیسے

لگا کے پیچ گئی، دل کو باندھنے کی ادا

گلابی ہونٹوں سے ہو کر گذرنے والی ڈور

تمہارے دانتوں سے کیا پٹ سے ٹوٹ جاتی تھی

کشادہ آنکھوں کے گوشوں سے سُر ابلتے تھے

اب ایسے بانسری پہ کوئی لب نہیں رکھتا

تمہاری طرح بٹن اور کون ٹانکے گا؟

بس ایک سانس کی سوئی ہے زخم سیتی ہے!

☆☆☆

JEAN JACQUES ROUSSEAU

جین جیکس روسو

۲۸رجون۱۷۱۲ء تا ۲رجولائی۱۷۷۸ء

سوئزرلینڈ میں پیدا ہونے والا فرانسیسی فلاسفر، ناول نگار اور نظریہ ساز روسو ''دی سوشل کنٹراکٹ'' (معاشرتی معاہدہ) نیز سوانحی ''اعترافات'' (Confessions) نامی کارنامے چھوڑ گیا ہے۔ رومان، تعلیم، حکومت اور اخلاقیات پر اس کی نگارشات نے فرانسیسی انقلاب نیز ''رومانی تحریک'' کے سربراہوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کا فلسفہ اس خیال میں مضمر ہے کہ آدمی فطرتاً شریف ہے اور سماج یا معاشرت کے ساتھ تمام معاہدات بدعنوان اور فاسد ہیں۔ روسو اتنا متنازعہ اور با اثر تھا کہ جارج سینڈ نے اسے ''سینٹ روسو'' والٹیر اور ڈیوڈ ہوم نے ''آسمانی بلا'' کا نام دے ڈالا۔ جبکہ ٹالسٹائی نے کہا کہ روسو اور انجیل، ان دو نے اس کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر چھوڑا۔

ایک خانگی جھگڑے کے بعد روسو کا رنڈوا باپ جنیوا چلا گیا تو جین جیکس اور اس کا بھائی فرانکوئز اپنے چچا کے ساتھ رہ گئے۔ فرانکوئز جلد ایک جگہ اپرنٹس کی نوکری پر لگ گیا۔ اور جین جیکس کو ایک وزیر کے ساتھ رہنے کیلئے بھیج دیا گیا جس نے اسے کلاسیکس پڑھائیں۔ سولہ سال کی عمر میں جیکس کو جنیوا سے باہر ایک بھرپور اور طویل سفر پر نکلنا پڑا۔ فطرت سے بے پناہ محبت اسے گاؤں دیہاتوں کی طرف لے گئی۔ اس نے ایک نوٹری (Notary) ایک نقش کنندہ اور ایک درباری خوشامد باز کے یہاں ملازمت کا تجربہ حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ ایک موسیقی کا استاد بن گیا۔ ۳۷ سال کی عمر میں اس نے ایک مضمون نویسی کا مقابلہ جیتا اور لیکھک بن گیا۔ ۴۶ سال کی عمر میں وہ ایک نامی قلمکار بن گیا تھا۔ وہ اونچے طبقے میں بے حد مقبول ہو چکا تھا۔ حالانکہ وہ عوام پر مظالم کا سخت مخالف تھا۔ ۱۷۶۲ء میں جب اس کی کتاب "EMILE" کی گرجا اور حکومت دونوں نے سخت مذمت کی تو وہ پیرس فرار ہو گیا۔ برنے (BERNE) سے نکالا گیا۔ پھر ایک سال اس نے لندن میں پناہ حاصل کی۔ زندگی ختم ہونے کے قریب روسو کا رجحان جنون عظمت (Paranoia) اور تیاگ (Reclusiveness) کے لئے حد سے گزر گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے دوست اس کے نام پر بٹہ لگانے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس کا یہ سوچنا جزوی طور سے غلط نہیں تھا کیونکہ اس نے اپنے بہترین دوستوں کو غم و غصہ میں جلا کیا تھا اور اپنے عجیب اور ناقابل برداشت خیالات سے انہیں پریشان بھی کیا تھا۔ ایک تنہا اور غمزدہ انسان کی حیثیت سے اس نے بیشتر زندگی جسمانی اذیت اور جذباتی دکھوں کے ساتھ گزاری۔ اور اپنی موت سے پیشتر پیرس کے باہر کئی بار

ذہنی بیماری کا عرصہ بھی گزرا۔

جاذبِ نظر اور رومان پرور روسو خواتین میں کافی دلپسند تھا۔ لیکن اس کی حیاتِ محبت بہت پریشان کن اور متنازعہ فیہ تھی۔ اس کا اولین جنسی سابقہ اس کے بچپن میں ہوا جب اس سے ایک معمولی جرم سرزد ہوا اور اسے اپنی استانی مادام موئزلے لیبرشیر سے سزا ملی۔ بعد میں اس نے لکھا ''آٹھ سال کی عمر میں یہ بچپن کی سزا یعنی ۳۰ سال کی تجربہ کار عورت (دراصل اس کی عمر ۱۱ سال اور خاتون کی عمر ۴۰ سال تھی) سے سابقہ میرے شوق، میری خواہشات، میرے جذبات اور میری باقی ماندہ زندگی کے لئے میرے خود تحفظات کو طے کرنے کے اسباب بنے۔ بہرحال ان سب نے اس کے جذبۂ شہوانی کو گہرا اور انگیز کر دیا۔'' لیکن ان تکلیف دہ لذتوں نے مجھے اپنی پسندیدہ حسیناؤں کے بارے میں زیادہ آرزومند بنا دیا اور ایک خاموش پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ میں نے کبھی اپنے خاص ذوق اور پسند کے بارے میں اظہار نہیں کیا۔ البتہ ان تعلقات سے قدرے تسکین ضرور حاصل کرتا رہا جن سے اس معاملے کی ایمائیت ظاہر ہوتی تھی۔ ایک باعظمت داشتہ یا معشوق کے قدموں میں بیٹھ کر جھوٹ بولنا، اس کے احکام کی غلامی کرنا، اس کی معافی کا خواستگار ہونا ــــ یہ میرے لئے ایک دلچسپ اور پسندیدہ مشغلہ تھا''۔

اپنی نوجوانی میں اس کی فضول خرچی، زیادہ عمر کی خواتین سے اس کے ناپختہ تعلقات کا سلسلہ دراز رہا۔ آہستہ آہستہ اسے زندگی کی حقیقتوں کا ادراک حاصل ہو گیا۔ اور مادام ذی وارنز نے اس کی حسی بالیدگی میں بہت کچھ مدد کی۔ چیمبری، سیوئے میں اس کی رسائی مادام وارنز کے گھر تک ہوئی جہاں وہ اس کے اور اس کے نگران محبوب کلاؤڈے این کے ساتھ رہنے لگا۔ روسو اس کا معتقد ہو گیا اور اس نے مادام کا نام 'مامن' رکھ ڈالا جبکہ وہ اسے ''ننھا بلّہ'' کہہ کر پکارتی۔ پانچ سال بعد 'مامن' نے اسے خود کو اینٹ کے ساتھ بانٹنے کی تجویز پیش کی۔ ''ننھا بلّہ'' ۲۱ اور مامن ۳۴ سال کی تھی۔ یہ اس کے لئے کامل مرد بننے کا وقت تھا۔ اس نے اسے فیصلہ پر پہنچنے کے لئے ایک ہفتہ کی مہلت دی۔ اس نے اپنی رضامندی تو دے دی مگر وہ اس کے ساتھ معانقہ کے خیال سے متفق نہ ہو سکا۔ کیونکہ پانچ سال بعد وہ اپنے آپ کو بجائے عاشق کے اس کے بیٹے جیسا تصور کرنے لگا۔ تین سال تک اس طرح روسو اینٹ کے انتقال (۱۷۳۴ء) تک گزارتا رہا۔ جب کہ مامن نے روسو کے سوا بھی ایک محبوب کو تلاش کر لیا تھا جو ان دونوں کے ساتھ رہتا تھا۔ تین سال روسو نے مادام دے وارنز کے ساتھ گزارے۔

روسو کا اگلا رومان ۱۷۴۵ء میں ہوا۔ پیرس کے ایک ہوٹل میں ۲۳ سالہ تھریزے لے ویسینو ر چیمبر کی خادمہ سے قربت حاصل کی جو تاحیات قائم رہی۔ اس نے اسے شروع میں یہ کہہ دیا تھا ''میں تمہیں کبھی چھوڑوں گا نہیں لیکن تم سے کبھی شادی نہیں کروں گا''۔ لیکن ۲۳ سال بعد اس نے اس سے بیاہ کر لیا۔ ایک دوست کے نام ایک خط میں اس نے لکھا کہ ربع صدی کا عرصہ آزمائشی شادی (ٹرائل میرج) کے لئے بہت کافی ہوتا ہے۔ تھریزے خوبصورت، مہربان اور خوش مزاج اور عمدہ باورچن تھی لیکن ذہانت کے اعتبار

سے روسو کا جوڑ ہرگز نہ تھی۔ وہ صرف گھڑی دیکھ کر وقت بتا پاتی تھی۔ اسے بچے تک نہیں آتی تھی، وہ سال کے مہینے بھول جایا کرتی تھی اور روپے گنتا اسے نہیں آتا تھا۔ وہ روسو کے لئے ایک عقیدتمند بیوی ثابت ہوئی بلحاظ اس کے کہ روسو کی فطرت بڑی عجیب اور پیچیدہ تھی اور وہ اپنے پانچ ناجائز — شادی سے پہلے پیدا ہونے والے — بچوں پر بہت ظلم کرتا تھا۔ تھریزے کے احتجاج کے باوجود اس کا اصرار ہوتا کہ ہر بچہ FOUNDLING اسپتال میں جنا جائے جہاں بن ماں باپ کے بچے جنے جاتے ہیں۔ اس کے لئے اس کا ہر جواز فالتو اور کمزور ہوا کرتا تھا۔ مثلاً اس کا یہ کہنا کہ چونکہ ان کی شادی نہیں ہوئی ہے اس لئے تھریزے کی ''عزت برقرار رکھنے کا'' یہی ایک واحد راستہ ہے۔ بعد کے عرصہ میں اسے اپنے اعمال و افعال پر کافی تاسف ہوا۔ لیکن بعد میں اس نے تھریزے سے نئی گرمجوشی کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے اس کے سرد پڑ جانے کی شکایت کی لیکن جیمس باسویل نے جو روسو کا زبردست مداح تھا کچھ اور ہی بات بتائی۔ تھریزے سے ایک ہی لغزش ہوئی کہ وہ باسویل سے چند ایک بار قریب آئی۔ تھریزے نے باسویل سے کہا کہ اگرچہ روسو ''پُرقوت'' ہے مگر اسے محبت کا 'آرٹ' نہیں آتا۔

روسو نے اپنے سب سے وحشیانہ جذبے کا ثبوت اس وقت دیا جب وہ ۴۴ سال کا ہوا۔ کاؤنٹس سوفی ڈی ہاؤڈی ٹوٹ ایک سیدھی سادھی شادی شدہ خاتون تھی۔ سوفی کا شوہر تو کوئی مسئلہ نہیں بنا بلکہ مسئلہ یہ ہوا کہ وہ اپنے محبوب کو بے پناہ چاہتی تھی جو روسو کا آفیسر دوست تھا اور اکثر ڈیوٹی پر شہر کے باہر چلا جایا کرتا تھا۔ حسب معمول روسو نے اسے اتنا ٹوٹ کر چاہا کہ اسے حاصل نہ کر سکا۔ لیکن اس وجہ سے اس کی کوششیں رک نہیں گئیں۔ ''تین ماہ کی انتھک اور مسلسل خلوت نصیب ہوئی جس نے مجھے تھکا دیا اور میں کئی سال صحتیاب نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ خون کی ایک رگ پھٹ جانے سے مجھے ہرنیا ہو گیا جسے میں اپنی قبر تک ساتھ لے جاؤں گا...... یہ تھا میری عاشقانہ تسکین کا عالم''۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ اس کا پہلا اور سچا عشق ہے۔ اور سوفی نے اس کے ناول "THE NEW HELOISE" کے زبردست اخلاقی کردار جولی کو جنم دیا۔

روسو کی بعض حرکات بڑی عجیب تھیں۔ وہ بے جان چیزوں کے ساتھ انتہائی وجد میں آجایا کرتا تھا۔ جب وہ مادام دے وارنز کے ساتھ رہتا تھا تو اس کے گھر میں خالی چکر لگاتا رہتا۔ کبھی اس کی کرسی کے ہتھے کو چومتا، کبھی خوابگاہ کے پردے کا بوسہ لیتا حتیٰ کہ کبھی صحن کو بھی چوم لیتا۔ (ہمارے ایک معاصر شاعر مشیر جھنجانوی کا شعر مجھے یہاں پیش کرنا اچھا لگ رہا ہے

جس ہاتھ نے اس شوخ کی زلفوں کو چھوا تھا
چھپ چھپ کے اسی ہاتھ کہ ہم چوم رہے ہیں

ایک اور محبوبہ نے اسے اپنی ایک اترن بھیج دی جس کے بارے میں روسو نے لکھا ہے ''وہ چاہتی تھی کہ میں اس کے پیٹی کوٹ کی صدری بنا کر پہن لوں...... گویا اس نے میرا تن ڈھانپنے کے لئے اپنے بدن کی دھجیاں کر ڈالیں...... میں نے اس شدید جذبے میں اس کی تحریر اور پیٹی کوٹ کو روتے

روتے ہیں بوسے دیے"۔ تھریزے کے خیال میں وہ پاگل تھا)۔

جب وہ نوعمر تھا تو ایک عرصہ تک اس کے سر پر خود نمائی بلکہ اپنی برہنہ نمائش کا بھوت چڑھا رہا۔ وہ بند گلیوں میں چھپ جاتا اور جب کوئی عورت گزرتی تو اسے اپنی ننگی پیٹھ دکھانے لگتا کہ شاید کوئی جری خاتون اس کے لات رسید کر دے اور مل بیٹھنے کا بہانہ ہاتھ آ جائے۔ ایک دفعہ کچھ لڑکیاں کنوئیں سے پانی نکال رہی تھیں تو اس نے ایسا ہی عمل کیا۔ اس نے اپنے "CONFESSIONS" میں لکھا ہے کہ وہ منظر کسی کو ور غلاتا اکساتا تو کیا الٹا میرے لئے مضحکہ خیز ہو گیا"۔ جب ایک لڑکی چیخی تو روسو کو ایک غصیلے مرد اور کئی بوڑھی خواتین نے دھر لیا اور جھاڑو کے دستوں سے اس کی پٹائی کی مگر خوش نصیبی سے روسو مزید بکھیڑا کھڑا ہونے سے پہلے بھاگ نکلا۔

روسو کی حیات معاشقہ کا ایک اور واقعہ اس کی ابتدائی جوانی میں گزرا۔ جب وہ وینس میں مقیم تھا۔ وہ بازاری عورتوں کا سخت مخالف تھا لیکن چند ایک بار ان سے ملا بھی۔ بازار میں ایک حسن مجسم ژلی اینا سے ملتا ہوا جسے اس نے اپنے تصور میں دیوی کا درجہ دے ڈالا۔ لیکن جب وہ اس سے پہلی بار قریب ہونے لگا تو آپے سے باہر ہو گیا اور زور زور سے چلانے لگا "یہ کیا مذاق ہے ایک لافانی دیوی اور صرف طوائف؟"۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ضرور اس عورت کے ساتھ گڑبڑ ہے اس میں کوئی عیب ہے جس نے اسے گھناؤنا اور کریہہ بنا ڈالا ہے۔ اس عورت نے اسے ہموار کیا۔ عین موقع پر اسے اس کے عیب کا پتہ لگ گیا۔ اس کی چھاتیوں میں غیر موزونیت کا ایک غیر معمولی نقص

تھا۔ کیسانووا کا اس عورت سے تین سال قبل تعلق رہ چکا تھا۔ مگر اس نے اعترافات میں اس نقص کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ لیکن روسو نے اس غیر معمولی نابرابری کے بارے میں سوچنا اور حیران ہونا شروع کر دیا۔ لکھتا ہے "مجھے اس خیال سے صدمہ ہوتا ہے کہ یہ ناموزونیت فطرت کی وجہ سے تھی۔ [1] میں نے دن کی روشنی میں دیکھا کہ فطرت کی رد کردہ کوئی بلا تھی جو میرے بازوؤں میں سما گئی تھی۔ اف! انسان اور محبت"۔ جب اس نے اس کی بیشی کے بارے میں ژلی اینا کو بتایا تو اس نے جھڑک کر جواب دیا۔ "میاں عورتوں کو اکیلا چھوڑ دو اور جا کر مکتب میں حساب پڑھنا شروع کر دو"۔ [2]

روسو کی ناخوشی کا بڑا سبب اس کا بلیڈر کا روگ تھا جس کے درد کے ہاتھوں وہ بیچارہ ساری زندگی پریشان رہا۔ اسے شدت کی تکلیف اور بخار وغیرہ رہا کرتا تھا۔ تھریزے اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ آخری ۲۳ برسوں میں اس نے عورتوں کی طرف مائل ہونا چھوڑ دیا۔

---

[1] یہاں اگر میرے مضمون "حسن کے نظریات" میں ارسطو کا نظریہ حسن پڑھ لیا جائے تو بہتر ہے۔
[2] یہاں مضمون "حسن کے نظریات" سے افلاطون کا نظریہ ذہن میں رکھا جائے تو بہتر ہے۔

ف۔س۔اعجاز

لیو ٹالسٹائی

۹۔ستمبر ۱۸۲۸ء تا ۲۰۔نومبر ۱۹۱۰ء

ایک امیر روسی گھرانے میں پیدا ہونے والا ٹالسٹائی بچپن میں ہی یتیم ہو گیا۔ پھر اس کی پرورش رشتے داروں نے کی۔ اس نے کازان یونیورسٹی چھوڑ کر خاندانی جائداد سنبھالنا چاہا۔ لیکن پھر ماسکو اور سینٹ پیٹر سبرگ کی سماجی زندگی کو پسند کر لیا جہاں اس نے ایک اوباش زندگی گزاری۔ اپنی لامقصدیت سے اوب کر ٹالسٹائی ۱۸۵۱ء میں کوکیس چلا گیا اور آرمی میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس نے اپنے پہلے ناول پر کام کرنا شروع کیا۔ یہ نیم سوانحی قسم کی چیز تھا۔ اس کا عنوان تھا "بچپن" (CHILDHOOD)۔ جب اس کی اشاعت ہوئی تو صرف ایک سال کے اندر ٹالسٹائی ایک مقبول ادیب مان لیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں ۳۴ سال کی عمر میں اس نے ۱۸ سالہ صوفیہ (سونیا) آندریونا بہرز سے شادی کر لی جس نے تیرہ بچے جنے اور ٹالسٹائی کو تخلیقی کاموں کا حوصلہ دیا۔ اگرچہ اس کے ناولوں اور مختصر کہانیوں نے اسے شہرت اور دولت بخشی اور اس کا گھرانہ خاصا خوش تھا پھر بھی ٹالسٹائی اپنے آپ سے مطمئن نہیں تھا۔ جب وہ "اینا کیرے نینا" پر اپنا کام ختم کر رہا تھا اس دور میں اسے ایک اخلاقی اور روحانی بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے سوال کیا کہ زندگی کیا ہے اور جواب نہ پا کر خودکشی کی کوشش کی۔ اس کا غم و غصہ کرسچن بن جانے کے بعد ختم ہوا۔ اور اس نے دریافت کیا کہ خدائے واحد میں عقیدہ کسی کے وجود کو معنویت ادا کر سکتا ہے اور لوگوں کو محبت اور مساوات کے بندھن میں باندھ کر ایک انسانی برادری قائم کر سکتا ہے۔ اپنے نئے عقیدے کے مطابق جینے کے لئے اس نے اپنے واسطے کسان کا لباس تیار کرایا۔ اور کھیت مزدور بن کر کام کرنے لگا۔ اس نے اپنی جائداد بھی فروخت کرنا چاہی۔ لیکن واقعتاً اس نے اپنی جائداد کو اپنی بیوی سونیا اور بچوں کے نام میں منتقل کر دیا اور سونیا کو اپنی گزشتہ تصانیف کو شائع کرنے کے حقوق بھی دے دیے۔ اپنے پرانے ڈھنگ سے ہٹ کر ٹالسٹائی نے اخلاقی کہانیاں اور سماجی و دینی مضامین لکھنا شروع کر دیے۔ اس کی تعلیمات سے اسے کئی پیروکار مل گئے۔ مگر ٹالسٹائی کو اس کا دکھ تھا کہ سونیا اس کے "سنیاسی پن" میں شرکت کرنا نہیں چاہتی۔ اس سے ازدواجی زندگی بگڑنے لگی۔ حتیٰ کہ ۸۲ سال کی عمر میں ٹالسٹائی سکون اور بہتری کے لئے سونیا کو چھوڑ کر چل دیا۔ جبکہ اس کی جسمانی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی اور یہ اس کی روحانی خام خیالی بھی تھی۔ چنانچہ استاپوو نامی چھوٹے ریلوے اسٹیشن پر وہ ڈھے گیا۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں وہ آخری گھڑیاں گن رہا تھا مگر سونیا کو اس کے بستر تک آنے کی اجازت نہیں دی گئی تاوقتیکہ وہ بے ہوش نہیں ہو گیا اور اسے پہچاننے کے قابل نہیں رہ گیا۔ سات دن بعد وہ چل بسا۔

ٹالسٹائی نے ۱۶ سال کی عمر میں ایک ایسی جگہ اپنا کنوار پن کھویا جو

اس زمانے میں ایک مرد کے لئے عام جگہ سمجھی جاتی تھی یعنی طوائف خانہ میں۔
جیسا کہ اس نے بعد میں تحریر کیا'' پہلی بار جب میرے بھائی مجھے کھینچ کر زبردستی ایک جسم فروشی کے اڈے پر لے گئے اور جب میں نے وہ عمل کر لیا تو اس عورت کے پلنگ کا پایا پکڑ کر دیر تک بیٹھا روتا چلاتا رہا''۔ اس طرح ساری زندگی ٹالسٹائی کا افسوس اور اس کی جنسی خواہشات ایک دوسرے پر نازل ہوتے رہے۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے'' عورتوں کی صحبت کو ایک لازمی سماجی برائی سمجھو اور ان سے جہاں تک ممکن ہو بچتے رہو''۔ لیکن وہ خود اپنے مشورے پر عمل نہیں کر پایا۔ بعد میں اس نے انتون چیخوف سے اعتراف کیا'' میں مطمئن نہیں ہو پاتا''۔ ۱۸۴۹ء میں جب اپنی جائداد پر گزر اوقات کرتا تھا ایک گہری سیاہ آنکھوں والی کنواری ملازمہ گاشا سے ربط قائم کر لیا۔ اس نے اپنے آپ سے کراہیت کے ساتھ سوال کیا'' میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ عجیب ہے یا خوفناک؟''۔'' واہ! یہ تو دنیا کرتی ہے۔ ساری دنیا کا چلن ہے یہ تو!''۔ کچھ عرصہ بعد وہ ایک اور خادمہ سے ملوث ہو گیا۔ جب ۶۹ سال کا تھا تو اسے '' دیناشا'' کا حسن اور شباب خوب یاد آتا تھا، اس کا مضبوط نسائی بدن۔'' کہاں ہے اب؟ بس ایک ہڈی کا پنجر رہ گئی ہے وہ''۔

ٹالسٹائی نے انتہائی کامیاب اور خوشحال ادیب بن جانے کے بعد ایک بیوی کی تلاش شروع کر دی۔ حالانکہ اسے اپنے چہرے پر کوئی گمان نہ تھا۔ اس کی چوڑی ناک، بے دانت کا منہ، موٹے ہونٹ اور نیم باز آنکھیں تھیں۔ اپنی کسان داشتہ اگزنیا (AXINYA) کو اس نے تین سال رکھ کر رد کر دیا (اس سے ایک لڑکا ہوا تھا)۔ اس کے بعد اس نے سونیا سے شادی کا فیصلہ کر لیا جسے ایک عظیم مصنف کی بیوی بننا قابل فخر بات معلوم ہوئی۔ لیکن اس شادی کی کامیابی کے امکانات موہوم ہو گئے جب شادی سے کچھ قبل ٹالسٹائی نے اپنی ڈائری پڑھنے کے لئے مجبور کر دیا جس میں اس نے اپنے ہر جنسی تعلق کو تفصیلاً لکھ چھوڑا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شادی سے پہلے وہ اس کے بارے میں ہر بات جان جائے۔ لیکن جو ہوا وہ اس کے برخلاف تھا۔ سونیا یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی کہ ٹالسٹائی کو صرف اس کے جسم کی چاہ ہے۔ ان کی پہلی شب عروسی میں گویا ایک بوالہوس اور کنواری کا آمنا سامنا تھا۔ شادی کے دو ہفتہ بعد سونیا نے لکھا '' ٹالسٹائی کا جسمانی اظہار سخت نفرین کے قابل ہے''۔ اس طرح وہ ساری زندگی لطف اندوز نہ ہو سکی۔ اس کی بیوی کی معصومیت اور خوف نے صرف ٹالسٹائی کی بھوک میں اضافہ ہی کیا۔

کھردری کسان دوشیزاؤں کو اکسانے والا خاندانی زندگی سے لطف اندوز ہونے لگا تھا اور اپنے اولین شاہکار '' جنگ اور امن'' (WAR AND PEACE) میں خاندانی آہنگ اور استحکام کو اجاگر کرنے کے درپے تھا۔ گرچہ اس نے انفرادی آزادی کی مدافعت میں قلم سنبھالا لیکن اپنی چھت کے نیچے وہ ایک مطلق العنان تھا جس کا عقیدہ تھا کہ عورت کو اپنے خاوند کی خوشی کے لئے خود کو وقف کر دینا چاہئے۔ سونیا نے اسے خوش کرنے کی بہت کوشش کی۔ وہ اس کا سارا گھر بار سنبھالتی اور لکھنے میں مدد پہنچاتی اس نے '' جنگ اور امن'' کے مسودے کی سات بار نقل کی تب کہیں ٹالسٹائی کو اپنے مسودے پر اطمینان ہوا۔

۱۸۸۹ء میں تالستائی نے THE KREUTZER SONATA لکھ کر لوگوں کو تنبیہ کی کہ وہ جنس کو ٹھکرا دیں اور تجرد کو اپنائیں۔ اس نے توضیح کی کہ شادی سے بچنا چاہئے کیونکہ ایک عیسائی کو جنس سے دور رہنا چاہئے۔ سونیا یہ پڑھ کر گنگ ہو گئی۔ اشاعت کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ امید سے ہے۔ اسے بہت غصہ آیا اور اس نے تالستائی کو اپنے پیٹ میں پل رہے بچے کے بارے میں لکھا: ''یہ تمہاری تصنیف کا صحیح پوسٹ اسکرپٹ (یعنی پس نوشت) ہے''۔

تالستائی نے اپنے نئے عقیدے پر عمل کرنے کی بے حد کوشش کی لیکن کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی جنسی خواہش کبھی کم نہ ہوئی جیسا کہ سونیا نے اپنی ڈائری میں اس کے بارے میں حوالے رقم کئے ہیں۔ ۸۲ سال کی عمر سے پیشتر وہ ترک خواہشات کا اعتراف نہ کر سکا۔ وہ سونیا کو الزام دیتا تھا کہ یہ مجھے اپنی طرف رجوع ہونے پر مجبور کر دیتی ہے اور میں گناہ میں داخل ہو جاتا ہوں۔ اس کے برعکس سونیا اس کی اخلاقی منافقت کو سخت ناپسند کرتی تھی۔

تالستائی نے ایک بار میکسم گورکی سے عرض حال کرتے ہوئے کہا ''آدمی، زلزلہ، وبا، بھیانک مرض، روحانی بحران سب کچھ جھیل سکتا ہے لیکن اس کے لئے سب سے بڑا المیہ جو ہے اور رہے گا وہ ہے خوابگاہ کا المیہ''۔

مندرجہ بالا کتاب کی پہلی اشاعت کے ۷ سال بعد سونیا اور تالستائی کے ازدواج کو جھٹکا لگا جب سونیا ایک پرانے فیملی فرینڈ پیانو نواز سرگئی تانایو کے دام الفت میں گرفتار ہو گئی۔ تانایو کے لئے سونیا کے دلکش اور دوشیزہ نما انداز تالستائی کے دل کو چھید گئے۔ اس نے سونیا کے اس تعلق کو بوڑھاپے کی آوارگی سے تعبیر کیا اور اسے چڑیل کے نام سے پکارنے لگا لیکن اسے جلد ہی راحت مل گئی کیونکہ ایک سال بعد سونیا کا معصوم جذبہ معدوم ہو گیا۔ تالستائی نے دھیرے دھیرے سونیا میں دلچسپی لینا کم کر دیا۔ سونیا نے سمجھا کہ خاص تعلق کے علاوہ وہ بیوی کی حیثیت سے رد کر دی گئی ہے۔ دونوں میں نوک جھونک اس حد تک بڑھ جاتی کہ اکثر سونیا گھر سے باہر بھاگ جانے اور خودکشی کرنے کی دھمکیاں دیا کرتی۔ پھر بھی ایک شب آسودگی کے بعد والی صبح زن وشو کے لئے بڑی طمانیت اور سرور بخش ہوا کرتی تھی۔

تالستائی نے خواہش نفس کے لئے اپنی ڈائری میں چند نکات لکھ چھوڑے تھے۔ وہ یہ کہ آدمی نفسانی خواہش کے ساتھ سب سے مناسب سلوک یہ کرے کہ

— اسے اپنے اندر کچل ڈالے یا پھر
— ایک وفادار اور باحیا عورت کے ساتھ گزارا کرے جس سے اولاد یں پیدا ہوں، جس طرح وہ عورت بچوں کی افزائش میں مدد کرتی ہے اسی طرح مرد عورت سے اس کام میں تعاون کرے۔ یہ نہ ہو تو
— اپنی سرکش آرزو کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے لئے بازار حسن میں چلا جائے۔ یہ قابل قبول نہ ہو تو
— تھوڑی تھوڑی زندگی مختلف عورتوں کے ساتھ گزار دے۔ مگر کسی کا بن کر نہ رہے۔ ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہو تو
— جس کے ساتھ جو چاہے کرتا پھرے مگر
— بدترین کام یہ ہے کہ وہ ایک بے وفا اور بداخلاق عورت کے ساتھ زندگی گزارے۔

ف۔س۔اعجاز

چارلس ڈِکنس

۷رفروری۱۸۱۲ءتا۹رجون۱۸۷۰ء

چارلس ڈکنس اتنا بڑا انگریزی ناول نگار گزرا ہے کہ انگلستان کی شناخت اس سے ہوتی ہے۔ حالانکہ اس کی تحریروں میں جابجا جذباتیت اور میلوڈرامائیت داخل ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود اس کی موت کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی لوگ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اب تک اس کی کئی سوانح عمریاں تصنیف کی جا چکی ہیں۔ پہلی سوانح عمری اس کی موت کے بعد اس کے دوست جان فورسٹر نے لکھی تھی۔ سوانح نگاروں کے لئے ڈکنس بیک وقت خواب بھی ہے اور قابوس بھی۔

ڈکنس کے دادا دادی میں سے ایک گھریلو ملازم اور دوسرا قبن باز تھا۔ ڈکسن کا باپ ایک کلرک تھا۔ اس نے اچھی زندگی گزاری لیکن وہ شاہ خرچ تھا' سو آخر میں ۱۸۲۴ء میں مقروضوں کے جیل میں مرگیا۔ چارلس ۱۲ سال کا تھا تو اسے اسکول سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ تب اسے ایک کارخانے میں نوکری کرنا پڑی۔ اس کے بعد چند سال تک وہ ایک اخبار کا رپورٹر رہا اور اس نے اخبار میں ایک مزاحیہ سیریل "Pickwick Papers" کے عنوان سے ۱۸۳۶ء میں شروع کیا۔ چند مہینوں میں وہ انگلستان کا سب سے مقبول ادیب بن گیا۔ اگلے تیس برسوں میں اس نے کئی کامیاب کہانیاں لکھیں جن سے امیروں اور غریبوں دونوں میں اس کی مقبولیت بے انتہا بڑھ گئی۔ ڈکنس زبردست طربیہ گفتگو کرنے والا آدمی تھا اور ہمیشہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ بعد کی زندگی میں اسے لگا کہ نئی چیزیں لکھنے سے زیادہ لطف و نفع کی بات یہ ہے کہ عوام میں اپنی تحریروں کو پڑھ کر سنایا جائے۔

پبلک ریڈنگ اس کا نشہ تھی۔ وہ کبھی نہ تھکنے والا تخلیق کار تھا لیکن اپنی تخلیقیت پر اسے بہت گھمنڈ تھا۔ اس کے باوجود روچسٹر اور لندن کے مختلف علاقوں میں دربدر پھرتا اور اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے تماشائے اہل کرم دیکھنا اس کا شعار تھا۔

ڈکنس غضب کا اداکار تھا۔ تھیٹر سے اسے ساری زندگی عشق رہا۔ شاید اسی سبب سے وہ رنگ برنگے' بھڑک دار کپڑے پہنا کرتا تھا۔ ناانصافی سے اسے سخت نفرت تھی۔ غریبوں کا بہت ہمدرد اور امیروں اور مقتدروں کی منافقت کا سخت ناقد تھا۔ غلاظت' بیماری' مفلسی کا کم عمری سے ہی دشمن تھا۔ بڑھتی ہوئی عمر میں بھی اس کے سماجی سروکار بن گئے۔ اس پر اعتراض ہے کہ وہ نسائی کرداروں کو ڈرامائیت' جذباتیت' چٹپٹا پن یا اتفاقیت کے بغیر مکمل نہیں کرپاتا تھا۔ وہ قارئین کو رلانا بہت ضروری سمجھتا تھا۔ ٹریجڈی اس کے ناول کی طاقت

ہے۔ ''ڈومبی اینڈ سن'' میں ڈکنس نے ننھے پال ڈومبی کی موت اسقدر غم انگیز دکھائی ہے کہ بقول کلارزے نومالن بالٹیاں بھر بھر رلاتا ڈکسن کا ارادہ تھا! چنانچہ اس کے سامعین جذبات سے مغلوب ہو کر تھیٹر چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ اپنی اداکاری میں وہ بہت وفور پیدا کر دیا کرتا تھا۔ ۴۷۰ سے زائد پروگرام اس نے پیش کیے۔ قیاس ہے کہ اسی وفور جذبات کے ہاتھوں وہ قبل از وقت ۵۸ سال کی عمر میں چل بسا۔

اس کی شخصیت جس قسم کی بنی اس میں اس کے غیر مستحکم بچپن اور نوجوانی میں جھیلی مشقتوں اور سختیوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ سب کے سامنے اس کے باپ کا قرض کی عدم ادائیگی کی وجہ سے گرفتار کر لیا جانا' پھر اس کا اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اوائل عمری میں طرح طرح کی نوکریاں کرنا' کالم لکھنا ان باتوں نے اسے اندر سے سخت اور جابر بنا دیا تھا۔ لندن کے اسکول اور قید خانے اس پر بے رحم تھے۔ اس کی بے پناہ تخلیقیت کے اسباب اس کی جھیلی ہوئی اذیت میں پنہاں ہیں جو اس کے مندرجہ ذیل شاہکار ناولوں میں دکھائی دیتے ہیں:

(1)Little Dorrit (2)Oliver Twist (3)David Copperfield (4)Great Expectations (5)Hard Times (6)The Old Curiosity (7)Nicholas Nickleby (8)Black House (9)Dombey And Son

چارلس ڈکنس کی عشقیہ زندگی کے معلوم حقائق مقناطیسی کشش رکھتے ہیں۔ اس کے لکھے ہوئے خطوط کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے اور وہ تمام محفوظ ہیں۔ اس کے برعکس اس کے نام لکھے گئے مکتوبات تقریباً ناپید ہیں۔ ایک مکمل خاندانی زندگی بسر کرنے والے کے طور پر اپنی نیک نامی سے وہ آگاہ تھا۔ ہر سال وہ ایک Bonfire جشن منعقد کرتا اور اپنے نام موصول خطوط کو اس موقع پر نذر آتش کر دیتا تھا۔ جب وہ ۱۷ سال کا تھا تو ماریہ بیڈنیل (Maria Beadnell) نامی ایک ۱۸ سالہ دل پھینک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ ماریہ نے اس سے خوب کھیل کھیلا۔ حتیٰ کہ چار سال تک اذیت میں مبتلا رہنے کے بعد جب ڈکنس کے فخر کو بڑی ٹھیس لگی تو اس نے ماریہ سے ترک تعلق کر لیا قطع تعلق کا یہ تجربہ اس قدر قوی تھا کہ اس کی بدولت اس نے اپنے جذبات کو دبانا سیکھ لیا اور کئی سال بعد اس نے لکھا کہ وہ اپنے بچوں تک پر اپنے جذبات ظاہر ہونے نہیں دیتا تھا۔ حتیٰ کہ جب اس نے ایک عورت کو اپنی بیوی بنانے کے لیے پسند کیا تو اس نے بڑا الگ طریقہ اپنایا۔ ڈکنس نے شروع میں ہی واضح کر دیا تھا کہ خاموش طبع کیٹ ہوگارتھ (Kate Hogarth) سے اُسے امید ہے کہ وہ بچے پیدا کرے گی اور جو کچھ اُس سے کہا جائے گا وہ کرے گی۔ دس بچے جننے کے بعد کیٹ یعنی کیتھرین بہت موٹی ہو گئی اور ڈکنس کی ہر خواہش کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی تھی۔ سال پر سال بیت گئے۔ تب ڈکنس کے دل سے اپنی عورت کے لیے محبت غائب ہو گئی۔ بلکہ کیٹ ہوگارتھ کو اپنا شریک حیات بنانے پر اسے پچھتاوا ہونے لگا۔ وہ لاتعداد فلرٹوں میں پڑ گیا۔ ان میں سے زیادہ تر بالکل نوعمر لڑکیوں کے ساتھ تھے جو اس کی نظر میں کامل معصومیت کا

جو ہر تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ چارلس ڈکنس کی محبت کی زندگی میں سب سے اہم عورت اس کی بیوی کیٹ نہیں بلکہ اس کی بیوی کی بہن میری تھی۔ جب چارلس اور کیٹ کی ۱۸۳۶ء میں شادی ہوئی ۱۶ سالہ میری ان کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ تینوں بہت اچھی طرح رہ رہے تھے۔ میری کیٹ اپنی بہن جتنی خوبصورت نہ تھی۔ لیکن ادب کی بڑی دلدادہ تھی اور ڈکنس کو اس کا ساتھ پُر لطف لگتا تھا۔ پھر ایک ہفتے کی رات کو مئی ۱۸۳۷ء میں کیٹ، میری اور چارلس ایک تھیٹر سے واپس لوٹے اور ایک دوسرے کو شب بخیر کہا۔ اس کے بعد چارلس نے میری کے بیڈ روم سے ایک انوکھی چیخ سنی۔ میری کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ چارلس نے اس کی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور اپنی انگلی میں پہن لی اور ساری زندگی اسے پہنارہا۔

کئی مہینوں تک وہ ہر رات میری کے خواب دیکھتا رہا۔ اس نے اس کے کپڑے بچا کے رکھ لیے تھے جنہیں وہ اس کی قبر میں اس کے ساتھ دفنانے کی خواہش رکھتا تھا۔ کوئی شخص ڈکنس کے دل اور دماغ کا میری ہوگارتھ سے موازنہ کرنے کا اہل نہ تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اس کی یادوں سے لڑ سکتا جو وقت میں منجمد رہ کر بغیر خراب ہوئے کنواری چل بسی ہو۔

بہرحال اگر کسی میں ڈکنس میں ایسے محسوسات جگانے اور شادی کی بوریت سے نجات دلانے کی صلاحیت تھی تو وہ تھی اس کی پہلی محبوبہ ماریہ بیڈنیل جس کی تحریر کو اس نے ۱۸۵۵ء میں ایک خط میں پہچانا۔ اپنے شباب کے ۲۰ سالہ رومانس کے بعد ماریہ نے اسے خط لکھا تھا۔ تب وہ ماریہ ونٹر بن چکی تھی۔ دو لڑکیوں کی ماں۔ حالانکہ اس نے لکھا تھا کہ وہ دانت گنوا چکی ہے، موٹی، بوڑھی اور بھدی نظر آتی ہے پھر بھی ڈکنس کا دل پرواز کرکے ۱۸۳۰ء میں اس تک جا پہنچا۔ ایکبار پھر اُس نے اُسے جذباتی اور اشاراتی خطوط لکھے اور اکیلے ملنے کا بندوبست کیا۔ جب واقعی ملاقات ہوئی ڈکنس کا وحشی تصور چکنا چور ہوگیا۔ ماریہ موٹی اور احمق ہوگئی تھی اور اب اس کی شباہت نوجوانی کی ماریہ بیڈنیل سے زیادہ ملنے لگی تھی۔ جیسے ہی ڈکنس نے اسے دیکھا اس نے سوچا کیوں نہ اس نئے پریشان کن رشتے کو توڑ دیا جائے۔

گرچہ ڈکنس نے کئی عورتوں کی محبت میں خاصا وقت گزارا لیکن یہ ممکن ہے کہ جنسی تعلق اس کا کسی ایک سے ہی رہا ہو۔ ماریہ ونٹر کے صدمے کے دو سال بعد ۴۵ سالہ ڈکنس ۱۸ سالہ اداکارہ ایلن ٹرنن سے ملا۔ ایلن کی عمر ڈکنس کی بڑی بیٹی کی عمر کے برابر تھی۔ ایلن روشن رخ والی ذہین عورت تھی۔ اس کا پکار کا نام نے لی (Nelly) تھا۔ کیٹ کو اس سے بڑا حسد ہوگیا۔ ایک سال نہیں گزرا تھا کہ لوگ ڈکنس کی اپنی ۲۲ سالہ رفیق زندگی کیٹ سے علیحدگی کا اعلان پڑھ کر سکتے میں آگئے۔ غضب کی بات یہ تھی کہ ڈکنس کے اس علیحدگی کے اعلان نے اس افواہ کا خاتمہ کردیا کہ اس کا ایلن ٹرنن سے کوئی معاملہ چل رہا ہے۔ اس کے برعکس اس نے کیٹ کی ہی ایک بہن جارجینا ہوگارتھ سے تعلق قائم کرلیا تھا جو پندرہ برس کی عمر میں ۱۸۴۲ء میں ڈکنس کے گھر میں داخل ہوگئی۔ نہ صرف اس نے اپنی بہن سے خاتون خانہ کی ذمہ داری اچک لی بلکہ

ان کے بچوں کی پرورش کا ذمہ بھی اپنے سر لے لیا۔ شاید کبھی جارجینا اور ڈکنس نے ایک دوسرے سے پیار کیا ہو۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حیرت یہ کہ جارجینا نہ صرف ایلن ٹرنن سے حسد کرتی تھی بلکہ اس کی مداح بھی تھی!۔

زندگی کے آخری برسوں میں ڈکنس نے ایلن اور اس کے خاندان کے ساتھ کافی وقت گزارا اور انھیں مالی سہارا بھی دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈکنس اور ایلن کے ایک بچہ ہوا جو کمسنی میں چل بسا۔ لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے۔ اس نے اپنی وصیت میں ایلن کا نام پہلے لکھا تھا۔

کلائرے ٹومالن (Claire Tomalin) نے حال میں چارلس ڈکنس کی ایک سوانح عمری کچھ نئی معلومات کے ساتھ لکھی ہے جو اشاعتی ادارے Viking نے شائع کی ہے۔ جس میں ڈکنس کے بعض نامعلوم دوستوں اور روابط کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ 1853 کی بات ہے کہ فرانس کریسٹلون (1836-58) مس کاؤٹس کے گھر میں داخل ہوا اور وہاں اس نے ایک بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا جس کی پاداش میں اپریل 1854 میں اسے برطرف کر دیا گیا۔ بعد میں وہ ''شورے ڈچ ورک ہاؤز'' (Shorey Ditch Work House) میں چل بسا۔ مس کاؤٹس نے ڈکنس کے مشورے اور حوصلہ افزائی سے گری ہوئی عورتوں کے لئے ایک پناہ گھر قائم کیا تھا۔ ڈکنس نے خود کو ایسی لڑکیوں کی فلاح اور بہتر مستقبل کی تعمیر کی کوششوں سے سنجیدگی سے وابستہ کر لیا تھا اور یہ صرف ہمدردی کی بنا پر تھا۔

ڈکنس کا ایک دوست اور تھا۔ ایمیلے دے لاریو (Emile de La Rue) وہ ایک سوئز بینکر تھا۔ 1844 کی بات ہے۔ وہ Genoa میں برسر ملازمت تھا۔ اس کی انگریز بیوی اُوگسٹا عرف گرانیٹ نفسیاتی خلل میں مبتلا تھی۔ دے لاریو نے ڈکنس سے کہا 'ممکن ہو تو تم اس کا علاج کر دو۔ ڈکنس مسمریزم یعنی عمل تنویم کے ذریعہ اس کا علاج کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اس نے علاج کیا گرچہ گرانیٹ کو پوری شفا نہیں ملی۔

مذکورہ مثالوں سے ڈکنس کی متنوع دلچسپیوں اور کارگزاریوں کا اندازہ ضرور ہوتا ہے جو کم قابل تعریف نہیں۔ لیکن ڈکنس سے اختلاف کرنے والے بھی تھے۔ مثلاً انتھونی ٹرولوپ (Anthony Trollope) بھی ڈکنس کا ایک دوست تھا جو بقول ٹومالن ڈکنس کے اسٹائل کو ناپسند کرتا تھا اور تھیکرے اور جارج ایلیٹ کو ڈکنس پر فوقیت دیتا تھا۔ اس کی نظر میں ڈکنس ایک ''طاقتور' چالاک' پُر مزاح ...... لیکن بہت غلط شعار اور موٹی چمڑی کا آدمی تھا جو بزعم خود اپنا خدا آپ بنا بیٹھا تھا۔''

☆☆☆☆☆

ف۔س۔اعجاز

میکسم گورکی

۲۸؍مارچ ۱۸۶۸ء تا ۱۸؍جون ۱۹۳۶ء

الکسئی میکسیمووچ پشکوف نے اپنے لئے ''گورکی'' (بمعنی تلخ) تخلص پسند کیا۔ یہ تخلص زار کے دور کے روسی کسانوں کی مظلوم غربت کا علامیہ ہے۔ سوویت لٹریچر میں گورکی سب سے عظیم پرولتاری ادیب مانا گیا ہے۔ وہ ۱۹۰۶ء میں اپنی انقلابی سرگرمیوں کے لئے جلاوطن کر دیا گیا۔ کئی سال تک وہ اٹلی میں رہا لیکن ۱۹۲۸ء میں جب روس لوٹا تو اس کی حیثیت ایک ہیرو کی تھی۔ اس کے تمام کام تیس جلدوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

گورکی متضاد جنسی قدروں کے سبب پریشان رہا۔ اس کے رومانی خیالات ہمیشہ سخت اور کھردری حقیقتوں سے نبرد آزما رہے۔ وہ اپنی زندگی میں ایک منفاس کا متلاشی تھا۔ ۱۳ سال کی عمر میں اسے ایک بے پناہ خوبصورت نوجوان بیوہ سے عشق ہوگیا۔ اس عورت نے اسے شاعری کی کتابیں تحفے میں دیں اور اسے کتب بینی اور مطالعہ پر اکسایا۔ نیز اسے نسوانیت اور جنس سے متعارف کرا کے اسے بے پناہ متاثر کیا۔ وہ اسے ''ملکہ مارگوٹ'' تصور کرتا تھا اور ہر اتوار کو اس کے پاس جایا کرتا تھا اور اس کے بستر پر دراز ہو کر اسے اپنے دل کے راز بتایا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے اس کا لباس غور سے دیکھا۔ ''اس نے میری موجودگی میں اسٹاکنگ پہنے اور میں بہت بے چین ہوگیا۔ اس کی برہنگی میں کوئی چیز بہت صاف اور واضح تھی''۔ ایک دن وہ اس کے گھر پہنچا تو اسے بستر پر ایک اور مرد کے ساتھ لیٹا پایا۔ اس نے بعد میں یہ تحریر کیا ''دراصل میں اپنی ملکہ کے بارے میں یقین نہیں کر سکا کہ وہ اپنی محبت دیگر عام عورتوں کی طرح لٹا رہی ہے''۔ اس کے بعد سے وہ عورتوں کے بارے میں کسی خالص جذبے یا ہم وجودیت کے خیال کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ گورکی نے جنس کے بارے میں کم سنی میں ہی علم حاصل کر لیا تھا۔ ایک کسان کا نچلی سطح کی زندگی میں یہ سب دیکھنا کچھ حیرت انگیز نہ تھا لیکن یہ ایسا ہی تھا کہ کوئی ٹھونس کر حلق تک کھانا بھر لے مگر اس کھانے سے اسکی طبیعت سیر نہ ہو۔ بعد ازآں اس کی کہانیوں میں کچے اور ناہموار جنسی تعلقات اجاگر ہوتے رہے جو حسی رفعتوں سے عاری تھے۔ ان میں کوئی معنویت پیدا کرنے کے لئے باہر سے اخلاق کا رنگ چڑھا دیا جاتا تھا۔

۱۸۸۷ء میں گورکی ۱۹ سال کا پریشان حال اور الجھا ہوا نوجوان تھا جسے محبت اور خلوص کی تلاش تھی۔ وہ اپنے آپ کو غریبی اور تنہائی سے بچانا چاہتا تھا اور بالآخر اس نے خودکشی کی کوشش کی۔ اس نے خود پر گولی چلائی مگر گولی اس کے دل کو چھیدنے کے بجائے پھیپھڑے میں اتر گئی۔ صحت یاب

ہونے کے بعد اس نے ایک ماہر نفسیات سے رجوع کیا جس نے اسے مشورہ دیا "اپنے لئے ایک ایسی لڑکی تلاش کرو جو کھیل کھیلنے کی ماہر ہو۔ تمہارے لئے ایسی لڑکی اچھی رہے گی"۔ گورکی نے اپنی عمر سے دس سال بڑی ایک شادی شدہ عورت کو دریافت کیا۔ اس کا نام اولگا کامسکایا تھا۔ وہ بہت حسین اور پرکشش تھی اور پیرس میں رہتی تھی۔ لیکن گورکی کی مصیبت اس وقت بڑھ گئی جب اس اولگا نے اپنے شوہر کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ گورکی دور چلا گیا لیکن دو سال بعد ۱۸۹۲ء میں ان کی ملاقات پھر ہوئی۔ جب گورکی کو پتہ چلا کہ وہ تنہا رہتی ہے تو اسے شادیٔ مرگ ہوگئی اور وہ خوشی سے بے ہوش ہوگیا۔ انہوں نے شادی کر لی اور ایک پادری کے مکان کے پشت والے حمام خانے میں جا کر بس گئے جہاں پانی کی قلت تھی۔ دو سال تک ان میں گہرا پیار رہا۔ گورکی کی دھان پان چست اور لڑکی جیسی چھریری بناوٹ میں مست رہا۔ جب اولگا نے فیشن کے انداز میں عشق شروع کر دیئے تو اس نے اسے چھوڑ دیا۔

۱۸۹۶ء میں گورکی ایک اخبار میں ملازم تھا۔ دوران ملازمت اسے ایک پروف ریڈر کیتھرین پاولونا وولترینا سے محبت ہوگئی۔ جو اس سے دس سال چھوٹی تھی۔ انہوں نے شادی رچالی اور دو بچوں کو جنم دیا مگر شادی ناکام ثابت ہوئی۔ وہ گوری چٹی اور سخت بدن والی تھی۔ گورکی نے اسے ایک بار "بپھری ہوئی چڑیا" کا نام دیا تھا۔ بہر حال شادی ٹوٹنے کے بعد بھی وہ ایک دوسرے کے دوست ثابت ہوئے۔ انہوں نے آپس میں طلاق نہیں لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ان کی بھاری غلطی تھی۔

بیچ میں ایک مدت ایک جوان طوائف کے ساتھ بسر کی جس کے بارے میں گورکی نے کہا کہ وہ اس کی اصلاح کر رہا تھا۔ اس کے بعد فلم اداکارہ ماریا فیودوروونا آندرے یینا ایک شادی شدہ عورت سے اس نے ۱۹۰۱ء میں تعلق پیدا کر لیا۔ وہ اس کے ساتھ امریکہ کے سفر میں ۱۹۰۶ء شریک رہا جہاں صدر روزولٹ، مارک ٹوین اور ولیم ڈین ہوویل نے اس کا استقبال کیا۔ گورکی نے ماریا فیودوروونا کا تعارف اپنی بیوی کی حیثیت سے کرایا۔ کیونکہ اس کے سفر کا مقصد انقلابی کاز کے لئے حمایت حاصل کرنا تھا۔ اس لئے زار شاہی اسے رسوا کرنا چاہتا تھا۔ روسی سفیر نے مشتہر کرا دیا کہ گورکی اپنی داشتہ کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ امریکن پریس نے اسے ایک زانی اور دو بیویوں والے کے نام سے مشہور کر دیا۔ جس سے وہاں کے مقتدر لوگ اس کے خلاف ہوگئے۔ اور اس کا سفر ناکام ہوگیا۔ ایک کے بعد دوسرا ہوٹل وہ لوگ بدلتے رہے لیکن انہیں کہیں کمرہ نہیں دیا جاتا تھا۔ ایک ہوٹل کے منیجر نے تو انہیں سڑک پر یہ کہہ کر دوڑا دیا کہ "یہ یورپ نہیں ہے......" نیویارک کے اخبار "انڈی پنڈنٹ" نے ان "معزز خواتین" کا مضحکہ اڑایا جو روسی کمیٹیوں کے لئے امداد فراہم کرتی تھیں تاکہ ان کے بنیاد مضبوط ہو سکے۔ نوجوان کی حیثیت سے گورکی نے جنسی بدمستیوں کی محفلوں میں حاضری ضروری تھی لیکن جنسی بدمستیوں میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس وہ ایک دیوار کے مقابل کھڑا ہو کر بدمستوں کے لئے اس امید کے ساتھ دیہاتی گانے گایا کرتا تھا کہ وہ اپنی اصلاح کرنا پسند کریں گے۔

CARL GUSTAV JUNG

کارل گستو ینگ

۲۶ ۔ جولائی ۱۸۸۵ء تا ۶ ۔ جون ۱۹۶۱ء

(JUNG) ینگ ، سگمنڈ فرائیڈ کا ہمعصر ، ایک جرمن تھا ۔ وہ تحلیلی نفسیات کا خالق اور معمار تھا ۔ اس نے کئی نظریات کو جنم دیا ۔ جن میں ''اجتماعی لاشعور'' ، ''خارج بین'' و ''اندرون بین'' اور چار افعال (فکر ، وجدان ، احساس ، سنسنی) کے نظریات شامل ہیں ۔

ینگ جب چھوٹا تھا تو ایک زبردست تخیل والا بچہ تصور کیا جاتا تھا ۔ وہ ایک وزیر کا بیٹا تھا اور جوہان وولف گنگ وان گوئٹے کا پڑ پوتا تھا ۔ اس کے نظریات بڑے روشن تھے ۔ اس نے کسانوں سے لوک کہانیاں سن سن کر اپنے عوامی معتقدات کی پرورش کر لی اور دعویٰ کیا کہ اس کی دو شخصیتیں ہیں ۔ گرچہ وہ ایک ماہر آثار قدیمہ بننا چاہتا تھا لیکن عملی وجوہات کی بنا پر اس نے طب کا پیشہ اختیار کیا ۔ ۱۹۰۳ء میں شادی کی اور زیورچ کلینک میں نفسیات کی پریکٹس کرتے ہوئے اس نے لفظی تعلقات کا مطالعہ شروع کر دیا جو اسے سگمنڈ فرائیڈ کا ہم پلہ بنا گیا ۔ ینگ اور فرائیڈ ۱۹۰۷ء میں ایک دوسرے سے ملے ۔ ینگ کا خیال تھا کہ فرائیڈ پہلا اہم آدمی تھا جس سے اس کی ملاقات ہوئی اور فرائیڈ ینگ کو عظیم سمجھتا تھا ۔ ان میں کافی اختلافات تھے ۔ مثلاً فرائیڈ کو ینگ کے PARA PSYCHOLOGY شوق سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ینگ کو فرائیڈ کے جنسی نظریات سے مکمل اتفاق تھا ۔ جب ۱۹۱۳ء میں ان کا اشتراک ایک تلخ موڑ پر آ کر ختم ہو گیا تو فرائیڈ کے ایک نائب سنڈور فیرینزی نے اعلان کیا: ''ینگ کو فرائیڈ میں اب کوئی عقیدہ نہ رہا''۔ ینگ اپنا مکتب اور انسٹی ٹیوٹ بنانے اور کتب نویسی کے درپے ہو گیا ۔ وہ نیو میکسیکو اور افریقہ کے سفر پر چلا گیا تاکہ وہاں وہ قدیم کلچروں کا مطالعہ کر سکے ۔ ان مطالعوں سے اس نے تمام کلچروں کے مشترک اساطیری (دیو مالائی) اقسام کے نظریئے کی ساخت کی ۔ اس نے لیک زیورچ کے کنارے پر آباد بولنگن میں اپنے لئے ایک منارہ نما گھر اور انیکسے (ANNEXE) تعمیر کیا جس میں وہ متمکن ہو گیا ۔ وہاں وہ ایک سادہ زندگی گزارتا رہا ۔ روز اپنی لکڑیاں کاٹ کر لاتا ، پتھروں کو تراشتا ، ان پر نقش بناتا اور مراقبہ میں پڑا رہتا ۔

ینگ کی ابتدائی محبتوں میں ایک دیہاتی لڑکی تھی جس سے اس کی ملاقات اگرچہ مختصر رہی مگر وہ ملاقات اسے وجد و کیف میں لے آئی ۔ اور ایک معاشقہ اس کے دوست کی خوش شکل ماں سے رہا جو قدرے بھینگی تھی ۔ ایک فرنچ سوئز لڑکی جس سے اس کا تعلق ایک طالبعلم کا تھا ، سے بھی اس کا معاملہ رہا ۔

ایما راؤ شباس جس سے اس کی شادی ۱۹۰۳ء میں ہوئی ۔ اس کی

زندگی کی صحیح محبت تھی۔ جب وہ ایک نوعمر میڈیکل اسٹوڈنٹ تھا اور خاندان کے دوستوں کے یہاں دورے پر جایا کرتا تھا تو اس کی نظر اس پر پڑی۔ اس کے بال بہت خوبصورتی سے گندھے ہوئے تھے اور وہ سیڑھی پر کھڑی تھی۔ ینگ نے ایک دوست سے اپنی رائے بیان کی کہ یہ لڑکی میری بیوی بنے گی۔ چھ سال بعد وہ واقعی اس کی بیوی بن گئی۔ ایما بلا کی ذہین اور خوبصورت تھی لیکن بارہ سال کی عمر سے ہی اپنے باپ کا بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھاتی چلی آرہی تھی۔ اس کا باپ اندھا ہوکر بیٹی کا سہارا لینے پر مجبور ہوگیا تھا۔ ینگ بہت خوش گفتار اور ذہین تھا۔ اس نے فرار کا پروگرام بنایا۔ بعد میں اس نے اپنے ہنی مون کے بارے میں جو انہوں نے لیک کومو میں منایا، لکھا ہے: ''میری بیوی کو خدشہ تھا لیکن سب ٹھیک ہوگیا۔ ہم نے شوہروں اور بیویوں کے درمیان پیسے کی صحیح اور غلط تقسیم کے موضوع پر بہت بحث کی۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اٹلی میں ہنی مون منانے کے لئے کسی سوئز بینک پر پورا بھروسہ کرنا چاہئے''۔ ان کے پانچ بچے ہوئے۔ چار لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ ابتدا میں ان کی شادی آئیڈیل گزرتی رہی۔ لیکن ۱۹۰۶ء سے ینگ کو کئی خواب دکھائی دینے لگے جن میں سے ایک دو گھوڑوں کے بارے تھا جس کی تشریح فرائیڈ نے یہ کہہ کر کی کہ یہ ایک امیرانہ شادی کی ناکامی کا علامیہ ہے۔ لیکن ینگ نے اسے یہ جواب دیا'' ...... میں اپنی بیوی کے ساتھ ہر معاملے میں خوش ہوں ...... کوئی جنسی ناکامی نہیں ہوئی ...... ''اس کا خیال تھا کہ یہ خواب'' دراصل ایک ایسے ناجائز جنسی خواہش کی پرورش ہے جو دن کی روشنی نہ دیکھے تو اچھا ہو''۔

۱۹۰۷ء میں وہ ایما کے ہمراہ عباسیہ کا سفر کر رہا تھا کہ اس کا دل کچھ عرصہ کے لئے ایک عورت پر آگیا۔ ۱۹۰۹ء میں اس کی ایک مریضہ نے چاہا کہ ینگ سے اس کے ایک بچہ پیدا ہو۔ ینگ نے اعتراف کیا کہ اس کا یہ پروفیشنل تعلق تعدد ازدواج والی نوعیت کا سا تھا۔ بہرحال یہ دو تجربات اپنی جگہ خاص اہم نہیں کہے جا سکتے تاہم انہوں نے ینگ کی زندگی میں ایک اور عورت کے داخلے کی راہ ہموار کی۔ اس کا نام ٹونی وولف تھا جو اس سے تیرہ سال چھوٹی تھی اور بڑی دلکش اور پیاری صورت کی مالک تھی۔ وہ ایک مریض کی حیثیت سے اس کے پاس ۱۹۱۰ء میں آئی تھی۔ بعد ازآں جب ینگ کا ''سامنا'' اس کے ''لاشعور'' سے ہوا اور ۱۹۱۳ء میں تقریباً اس کا بریک ڈاؤن سا ہو چلا تو ٹونی نے اسے اس کی فطرت میں نسوانی حیوانیت کا عنصر تلاش کرنے میں مدد پہنچائی۔ ینگ کی زندگی میں جو عورتیں آئیں ان میں ینگ کے مطابق ٹونی ''ایک جوش اور تخلیقی تحریک پیدا کرنے والی خاتون تھی'' جبکہ ایما صرف بیوی اور ماں تھی۔ ایما حسد کی آگ میں پھنک رہی تھی لیکن ینگ کا دل ایک مثلث میں اٹکا ہوا تھا جسے اس نے بعد میں باجواز قرار دیا' جب اس نے شادی کے متعلق اپنے نظریات کی توضیح کی۔ ایسی شادی جس میں ''کئی چہروں والا ہیرو'' (ینگ) ''معمولی جسم کی مکعبی ڈلی (CUBE) ایما سے کچھ زیادہ کا ضرورتمند اور ازدواجی زندگی سے باہر اپنی تسکین کا متلاشی ہے۔ اس کی شخصیت اتنی پرقوت اور مقناطیسی تھی کہ وہ دونوں عورتوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگیا کہ یہ مثلث ایک پسندیدہ اور مثالی شے ہے۔ یہ مثلث چالیس سال تک برقرار رہا۔ ایما اور ٹونی دونوں نے ماہرین نفسیات کے طور پر پریکٹس جما ڈالی تھی۔ ایما

(Holy grail) مقدس جام خونیں (مسیح کی اعشائے آخری کا پیالہ) پر لیکچر دیا کرتی تھی۔ اور فرائیڈ سے تبادلۂ خیال کرتی تھی۔ ٹونی نے نسائی افعال کے بارے میں اصل نظریات کو جنم دیا۔ بہرحال ٹونی جو ایک محبوبہ داشتہ کے طور قناعت کئے ہوئے تھی، نے چھٹکارا مانگنا شروع کر دیا۔ ینگ نے انکار کر دیا اور اس پر تنقید کی۔ مثال کے طور سے اس نے کہا ''ٹونی کو صرف سنگ مرمر کے ستونوں والے ایک محل اور ایک کمرۂ مطالعہ کی ضرورت ہے جیسا کہ سویلتی کے پاس تھا''۔ شکستہ دل ٹونی سگریٹ اور شراب کثرت سے پینے لگی۔ اور ۶۴ برس کی عمر میں دورۂ قلب سے مرگئی۔ اس کے دو سال بعد ۵۵ء میں ایما بھی مرگئی۔ ینگ اور اس کا ازدواج ۵۲ سال رہا۔ ''وہ ایک ملکہ تھی! بالکل ملکہ تھی وہ!'' ینگ اس کی وفات کے بعد اکثر چلایا کرتا تھا۔

اس کی کئی پیروکار جوان خواتین تھیں جو ذہین اور دانشور تھیں جو اس کے بھالو جیسے ڈیل ڈول کی پرستش کرتی تھیں، اس کی ذہانت اور عورتوں کے لئے ہمدردی کو سراہتی تھیں۔ ینگ کی ایک ضعیف مریضہ فرائیڈ کے نزدیک ظاہری طور سے 'بدنما عورت' تھی جبکہ ینگ کی نظر میں وہ ایک خوشنما عورت تھی جو کئی محبت آمیز مغالطوں میں مبتلا کر سکتی تھی اور پیاری اور دلچسپ باتیں کیا کرتی تھی۔

اس کی خواتین دوستوں میں ایک شعلۂ حسن اولگا فروبے کپتین نامی خاتون تھی جو پہلے سرکس رائٹر رہ چکی تھی۔ جس نے ایرانوس نامی ایک جماعت بنائی جو اس کے گھر آنے والے کئی دانشوروں پر مشتمل تھی۔ جن میں کئی عورتیں بھی تھیں جو ینگ کے بارے میں مختلف رائیں رکھتی تھیں۔

ایما کی موت کے بعد رتھ بیلی نامی انگریز خاتون جو ینگ کو افریقہ میں ملی تھی اور کم سے کم ۳۵ سال سے اس کی دوست تھی، نے اس کا گھر سنبھال لیا اور اس کا ساتھ نبھایا۔ ۸۰ سال کی عمر میں وہ مزاجاً بہت جھگڑالو ہو گیا تھا۔ ایکبار وہ دو ٹماٹروں پر جھگڑا کھڑا کر لیا اور رتھ سے بولا: ''تجھے اتنا یاد رکھنا ہے کہ تو مجھے غصہ دلانے کا کوئی کام نہ کرے''۔ اس کا قول تھا ''اچھی شادی کی پیشگی ضرورت ہے بے وفا ہونے کا لائسنس حاصل کرنا''۔

''ہمارے ادب کو اگر لوگوں کے ضمیر کا آئینہ دار ہونا ہے، اسے نیکی اور سچائی سے ان کی محبت کا، انصاف اور حسن کے ان کے تصور کا اظہار کرنا ہے تو اسے زندگی کو ایک ہی آنکھ سے نہیں دیکھنا چاہئے اور دوسری آنکھ کو شرما کر بند نہیں کر لینا چاہئے۔ آدھی سچائی جھوٹ سے بدتر ہے کیونکہ یہ آپ کو سماج کے مفاد کے بجائے اپنے خودغرضانہ مفاد کی تکمیل کے لئے زندہ رہنا سکھاتی ہے۔ ہمارے ملک میں سچے ادیبوں نے سچائی کو کبھی نہیں چھپایا اور اس گہرے احساس سے لکھا ہے کہ ان کی تخلیقات قارئین تک پہنچیں گی۔ اس قسم کی اشاعتیں انصاف کی جیت ہیں اور اس تعمیر نو کے سلسلۂ عمل کی مظاہر ہیں جس کا انحصار ماضی اور حال کے متعلق سچائی پر ہے''۔

ایک روسی رسالے سے اقتباس۔

سید سفیر حیدر۔ پاکستان

کافکا کی آخری محبت

(وہ خود کو مسز کافکا لکھتی تھی ......)

نوٹ: یہ فرانز کافکا کی محبت کا پورا راست ماجرا نہیں ہے لیکن مضمون کی خوبی یہ ہے کہ کافکا کی ذہنی پرتوں کو کھول کر ڈورا ڈائمنٹ اور کافکا کے تعلق سے ان کی رومانی زندگی کا پُراثر کلائمکس پیش کرتا ہے۔ ف۔س۔اعجاز

عالمی ادب میں انتہائی منفرد لب و لہجے اور طرز فکر کے حامل ادیب فرانز کافکا کی زندگی کے شب و روز 'کافکائیت' کا سرچشمہ ہیں۔ بچپن میں باپ کی مطلق العنانیت کا روگ اور بعد ازاں اپنی شخصیت میں توازن کی لاحاصل کوششیں اور پھر اکتالیس برس کی عمر میں موت۔ اس مختصر مگر پیچیدہ کہانی میں کئی بار دلچسپ 'کایا کلپ' نظر آتی ہے لیکن آخری دنوں میں کافکا روحانی طور پر زندگی کی طرف لوٹ آنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور کافکا پر کوئی 'فیصلہ' یا 'فتویٰ' دینے سے پہلے اس کے آخری دنوں کے احوال کو سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ دن کافکا کے فلسفۂ حیات میں تبدیلی کے داعی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں کافکا اپنی بہن اور اس کے بچوں کے ساتھ بالٹک کے ساحلی علاقے 'Murtiz' میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں وہ برلن جیوش پیپلز ہوم میں گیا جس سے اس کی دلچسپی اور ہمدردی کافی پرانی تھی۔ یہاں اس نے باورچی خانے میں ایک نوجوان یہودی کو کام کرتے دیکھا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے ''ایسے نازک ہاتھ اور ایسا سخت کام'' یہ لڑکی ڈورا ڈائمنٹ (Dora Diamant) تھی۔ کافکا کی آخری محبت۔

ڈورا ڈائمنٹ پولینڈ کے ایک راسخ العقیدہ یہودی خاندان کی لڑکی تھی لیکن اس نے اپنے باپ کی تنگ نظری اور بے جا پابندیوں کے خلاف بغاوت کی اور گھر چھوڑ دیا۔ عبرانی زبان سیکھی پہلے 'بریسولا' میں کام کرتی رہی اور پھر برلن چلی آئی اور جیوش پیپلز ہوم میں ملازم تھی۔ کافکا بھی ان دنوں خشوع و خضوع کے ساتھ عبرانی سیکھ رہا تھا۔ کافکا کو کئی حوالوں سے ڈورا میں کشش محسوس ہوئی۔ مثلاً عبرانی میں مہارت، جیوش پیپلز ہوم میں خدمات، اس کے فطری عادات و اطوار، صحت مندی، خوبصورتی اور گھریلو پابندیوں سے حصول آزادی کا اقدام (جو کافکا کا قدیمی خواب تھا) اور کسی قسم کے الجھاؤ سے پاک زندگی۔ دوسرے لفظوں میں وہ روحانی آزادی کے ساتھ ایسی زندگی گزار رہی تھی جسے کافکا 'Authentic Life' سمجھتا تھا۔ رات کو وہ معزز مہمان کی حیثیت سے ڈنر میں شامل تھا۔ کیتھی ڈائمنٹ نے ''کافکا کی آخری

محبت'' میں ایک واقعہ درج کیا ہے کہ ڈنر کے دوران ایک بچہ جس کی عمر پانچ یا چھ سال ہوگی، کوئی چیز لانے کے لیے تیزی سے اٹھا تو اس کا پاؤں دہرا ہوگیا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ ہراساں چہرے کے ساتھ جلدی جلدی اپنا پاؤں سہلاتا ہوا اٹھا۔ ڈورا کے بقول ''قہقہے شروع ہونے اور بچے کے لوگوں میں ذلت محسوس کرنے سے پہلے ہی کافکا نے تعریف کے لہجے میں کہا ''تم کتنی پھرتی سے گرے اور کیسی مہارت سے اٹھ کھڑے ہوئے''۔ کافکا کی یہ بات ڈورا کو عمر بھر یاد رہی۔ کئی سال بعد اس نے لکھا ''جب میں الفاظ سوچتی ہوں تو ان میں پنہاں معانی بتاتے ہیں کہ ہر چیز بچائی جا سکتی ہے، سوائے کافکا کے۔ کافکا کو نہیں بچایا جا سکتا تھا''۔ [۱]

کافکا گرمیوں کی تعطیلات کے بعد گھر لوٹا تو وہ بہت پُرجوش اور پُرامید تھا۔ اس نے تمام بندشوں کو توڑ کر برلن میں زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا اور اس نے اپنے دوست میکس بروڈ کو لکھا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اتنی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ ڈورا کے ساتھ Steglitz کے قصبے میں مقیم تھا۔ وہیں اس نے اپنی خوشگوار کہانی ''چھوٹی عورت'' لکھی۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسی عورت تھی جو تمام عمر اپنی ہی انا کے ساتھ جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھی برسرِپیکار رہی۔ دراصل یہ عورت کافکا کی مالک مکان تھی جو مسلسل اس جوڑے کے لیے مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ چھ ہفتے بعد یہ جوڑا ایک خاتون معالج ریتھبرگ (Rethberg) کے ساتھ اس کے گھر میں ٹھہر گیا جو کافکا کی تخلیقی عظمت کی مداح تھی۔ یہ وہ دور تھا جس میں کافکا نے ایسی خودمختاری حاصل کی جس کا خواب وہ برسہا برس سے دیکھ رہا تھا۔ یعنی اپنے باپ کی آمریت سے آزاد زندگی کی سلطنت۔ ان دنوں کافکا زندگی کو اپناتا ہوا نظر آتا ہے۔ میکس بروڈ نے اسے ایک اشاعتی ادارے 'Die Schmieze' سے متعارف کرایا اور کافکا اپنی کتاب شائع کرانے پر رضا مند ہوگیا۔ Villi کو انتہائی خوشگوار خط لکھا۔ جب موسم خوشگوار ہوتا کافکا اور ڈورا اکٹھے سیر پہ نکلتے۔ ایک دن جب وہ قریبی پارک میں گئے تو ایک بچی کو روتے ہوئے دیکھا۔ ڈورا کے مطابق ''فرانز نے اس سے رونے کا سبب پوچھا جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ اس کی گڑیا گم ہوگئی ہے۔ اچانک کافکا نے ایک کہانی گھڑی اور گڑیا کے گم ہونے کا جواز بتایا'' تمہاری گڑیا ایک سفر پر نکلی ہے، میں جانتا ہوں کیونکہ گڑیا نے مجھے خط لکھا ہے''۔ معصوم بچی تذبذب کا شکار نظر آئی ''کیا وہ خط آپ کے پاس ہے؟''۔ ''نہیں میں غلطی سے اسے گھر چھوڑ آیا ہوں لیکن میں کل وہ خط اپنے ساتھ لاؤں گا''۔ بچی اب تجسس میں پڑ کر اپنی پریشانی بھول چکی تھی۔ کافکا فوراً گھر لوٹا۔ اسی سنجیدگی کے ساتھ 'رائٹنگ ٹیبل' پر بیٹھ کر خط لکھنا شروع کیا جیسی توجہ سے اپنا تخلیقی کام کرتا تھا۔ اگلے دن وہ خط لے کر پارک میں گیا تو بچی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بچی کو پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے اس نے بلند آواز میں پڑھ کر گڑیا کا خط سنایا۔ گڑیا نے خط میں لکھا تھا کہ وہ مسلسل ایک ہی خاندان کے ساتھ رہ کر اکتا چکی تھی اور فضا کی تبدیلی چاہتی

---

[۱] Kathe Diamant, Kafka's Last Love, Newyork Basic Books, 2003, P. 9.

تھی۔ اس لیے گھر سے دور جانا پڑا اور یہ کہ بچی سے گڑیا کو بہت پیار تھا لیکن اس سے جدا ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ گڑیا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر روز اسے خط لکھا کرے گی۔ یوں کافکا ہر روز گڑیا کی طرف سے ایک نیا خط لکھتا اور کوئی نیا واقعہ بیان کرتا۔ چند روز تک بچی کو کھوئی ہوئی گڑیا کے نقصان کا اتنا احساس نہ رہا اور گڑیا کے خط میں دلچسپی بڑھتی گئی۔

گڑیا بڑی ہوئی، اسکول گئی نئے نئے لوگوں سے ملی اور بچی کو اپنی محبت کا یقین دلاتی رہی۔ تقریباً تین ہفتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ کافکا اس سلسلے کو بڑی احتیاط سے پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا کیونکہ اس کا مقصد اس انتشار کو نظم میں بدلنا تھا جو گڑیا کے کھو جانے سے پیدا ہوا تھا۔ وہ گھنٹوں میز پر بیٹھا، ہاتھوں سے سر تھامے سوچتا رہتا۔ بہت زیادہ کشش و پیچ کے بعد کافکا نے گڑیا کی شادی کا فیصلہ کیا۔ ایک نوجوان کا ذکر کیا، منگنی کی رسم ہوئی۔ دیہات میں شادی کی تیاریوں کی تفصیل اور پھر نوجوان جوڑے کے گھر کا جزئیات کے ساتھ ذکر کیا۔ گڑیا نے کہا تھا ''تم خود دیکھ سکتی ہو اب ہمارا ایک دوسرے سے رابطہ مشکل ہوگا''۔

ڈورا کے الفاظ میں ''کافکا نے اپنے فن کے ذریعے ایک بچے کی کشمکش ختم کر دی۔ دنیا کو کسی نظم میں لانے کے لیے بھی اس کے پاس یہی بہترین انداز تھا''۔ [1]

۱۹۲۳ء کے موسم سرما میں بیماری کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ یہ اس کا آخری موسم سرما بھی تھا۔ اس کی بیماری آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ ان دنوں ڈورا ڈائمنٹ نے میکس بروڈ کو بتایا کہ ''ہر مرتبہ جب کافکا اس پرسکون قصبہ (Steglitz) سے برلن جاتا ہے تو وہاں سے ایسے لوٹتا ہے جیسے میدان جنگ سے آرہا ہو...... اس نے ایسے کرب اور اذیت کے ساتھ زندگی ہے کہ وہ اپنی اس زندگی میں ہزاروں بار مرا ہوگا''۔

کافکا کا واحد معاشی وسیلہ اس کی پنشن تھی اور وہ انتہائی مجبوری کی حالت میں اپنے خاندان کی کسی مالی امداد کو قبول کرتا تھا۔ اسے اپنی کمزور معاشی خودمختاری انتہائی عزیز تھی۔

۱۹۲۳ء کی کرسمس کی چھٹیاں اس کے لیے شدید بخار کا سندیسہ لے کر آئیں اور گرتی ہوئی دیوار بدن کو مزید کھوکھلا کر گئیں۔ سترہ مارچ کو اسے پراگ میں والدین کے گھر لایا گیا اور باقاعدہ علاج شروع ہوا۔ بعد ازاں سینی ٹوریم میں داخل کروایا گیا۔ پھر ویانا کلینک لے جایا گیا لیکن اس کلینک میں 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' والا معاملہ ہوا۔ کچھ یہاں اس کا علاج بھی بہتر انداز میں نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے لیے کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ اس لیے اسے جنرل وارڈ میں رکھا گیا۔ اس صورتحال کے پیش نظر اسے کیزلنگ میں ایک سینی ٹوریم میں داخل کروایا گیا۔ یہاں ایک خوبصورت اور رنگا رنگ پھولوں سے سجے ہوئے کمرے میں کافکا نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے۔ وہ اپنے مرض کی سنگینی سے آگاہ تھا لیکن آخری وقت تک اپنی حسِ مزاح اور حسنِ فطرت سے لگاؤ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ مثلاً اگر کوئی اس کی

---

[1] ایضاً، ص 51-52

زبوں حالی پر اظہار ہمدردی کرتا تو وہ اپنی مالی نا آسودگیوں کو مزاحیہ انداز میں بیان کرنے لگتا۔ مثلاً ایک بار اسی طرح کی گفتگو میں اس نے میکس بروڈ سے مل کر ایک چھوٹا سا ہوٹل چلانے کا منصوبہ بتایا جس میں اس کی شریک حیات ڈورا کھانا پکائے گی اور وہ خود وہاں بیرہ گیری کرے گا۔

آخری چند ہفتوں میں اسے وقفے وقفے سے خون آلود کھانسی کے دورے پڑتے تھے جس سے اس کے پھیپھڑوں میں شدید درد اٹھتا تھا اور وہ بستر پر لوٹنے لگتا تھا۔ ڈاکٹر آسکر بیک اور پروفیسر نیومین کو بطور خاص اس کے علاج کے لیے بلایا گیا۔ انہوں نے واضح طور پر ڈورا ڈائمنٹ کو بتایا کہ کافکا اب چند دن کا مہمان ہے۔ اس کے پھیپھڑے قابل علاج نہیں رہے تھے۔ آخری ایام میں اسے کم بولنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں سے کاغذ پر انتہائی مختصر جملے لکھ کر گفتگو کرتا تھا۔ بعد میں یہ رقعات "Conversation Slips" کے نام سے چھپ کر سامنے آئے۔ مثلاً ایک دفعہ اس نے لکھا ''کہانی کا عنوان اب بدل رہا ہے۔ یہ اب یوں ہوگا ''گلوکار جوزیفائن اور چوہوں کی قوم''...... گو ایسے ضمنی نام جاذب نظر نہیں ہوتے لیکن اس معاملے میں اس کا خاص مفہوم ہے''۔ ایک چٹ پر ڈورا کو لکھا ''مجھے حوصلہ دینے کے لیے میری پیشانی پر ہاتھ رکھو''۔ اسی طرح رابرٹ کلوپسٹک اور ڈورا کے لیے تشکر آمیز اداس جملے لکھے ''تم کب تک میرے سرہانے کھڑے رہ سکتے ہو، میں کب تک تم کو اس طرح اپنی خاطر کھڑے دیکھ سکتا ہوں۔ بلاشبہ یہ بات مجھے بہت دکھ دیتی ہے کیونکہ تم سب میرے لیے بہت اچھے ہو''۔

اپریل کے آخر میں اس نے والد کو خط لکھا کہ وہ ڈورا سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اس نے وضاحت کی تھی کہ اگرچہ وہ ایک راسخ العقیدہ یہودی نہیں تھا لیکن وہ اپنی مذہبی غفلت پر نادم تھا اور اپنے آپ میں تبدیلی لانا چاہتا تھا۔ آخر میں اس نے درخواست کی تھی کہ اسے اس جیسے پارسا انسان کے خاندان کا فرد بننے کا اعزاز بخشا جائے۔ ڈورا کے والد نے مشورے کے لیے اس کا خط لیا اور مذہبی باپ سے رجوع کیا۔ اس نے یہ خط پڑھا اور مختصر ترین جواب دیا ''نہیں''۔

جب ۱۲ مئی ۱۹۲۴ء کو میکس بروڈ کافکا کے پاس پہنچا تو ڈورا کے والد کا انکار پر مشتمل خط تھوڑی دیر پہلے پہنچا تھا۔ کافکا کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ شادی کے لیے ڈورا کے والد کی اجازت ضروری نہ تھی۔ اس کے لیے معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ ایک اور شکست تھی۔ ایک ''باپ'' سے سند قبولیت حاصل کرنے میں ایک اور ناکامی۔ میکس بروڈ نے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

تھوڑی دیر بعد ڈورا اسے ایک طرف لے گئی اور بتایا کہ اس نے رات کو فرانز کی کھڑکی میں ایک اُلو دیکھا، موت کا پرندہ۔ لیکن فرانز جینا چاہتا تھا اور میکس کے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ وہ ڈاکٹر کی ہدایات پر بغیر کسی احتجاج کے سختی سے عمل کر رہا تھا۔ یہ خلاف معمول بات تھی۔ اس خوشگوار تبدیلی کا سرچشمہ ڈورا کی ذات تھی۔ بقول میکس بروڈ ''وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے حیرت انگیز طور پر موافق تھے۔ ڈورا کا مذہبی پس منظر اور سوجھ بوجھ کافکا

کے لیے کشش کا باعث تھے۔ اسی طرح نوجوان ڈورا جو ابھی مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ نہیں جانتی تھی۔ اس کے لئے کافکا ایک ایسا استاد تھا جس کی ہمیشہ اس نے خواہش کی تھی۔ وہ اس کے لئے بے پناہ محبت اور احترام کے جذبات رکھتی تھی۔ وہ تجسس آمیز خوابوں میں رہتی اور اس کھیل کو پسند کرتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے۔ مثال کے طور پر مجھے یاد ہے کہ کس طرح دونوں ایک ساتھ اپنے ہاتھ تسن میں ڈبو کر کہتے ''پورا خاندان غسل کر رہا ہے''۔

ڈورا نے مجھے بتایا کہ فرانز کس طرح خوشی کے ساتھ چلا اٹھا جب بیماری کے آخری مرحلے میں ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ گلے کی حالت قدرے بہتر ہے۔ اس نے بار بار ڈورا کو گلے لگایا اور کہا کہ اس نے زندگی اور صحت کی اتنی خواہش پہلے کبھی نہیں کی جتنی اب ہے''۔ لے

یہاں کافکا اپنے داخلی وجود کی سطح پر زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ وہ اس دائمی یاس کے عفریت سے بھی چھٹکارہ پا چکا تھا جو عمر بھر اس کا خون چوستا رہا لیکن یہ باطنی رجائیت اس کے کچھ کام نہ آئی کیونکہ اس وقت تک وہ جسمانی طور پر اپنے خاتمے کو التواء میں ڈالنے کی سکت کھو چکا تھا۔ گویا:

ے واپسی کی کوئی امید نہیں
گھر سے نکلے ہیں آنسوؤں کی طرح

رابرٹ جب ویانا سے اس کے لیے چیریاں اور اسٹرابری لے کر آیا۔ اس نے نہ صرف دونوں چیزیں خوشی خوشی کھالیں بلکہ دیر تک ہاتھوں میں پکڑ کر ان کی خوشبو سونگھتا رہا۔ پھر والدین کو خط لکھا اور اپنی بہتر دیکھ بھال کا یقین دلایا۔

۳ جون کی صبح چار بجے وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ ڈورا نے رابرٹ کو جگایا جو فوراً ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے 'Camphor' کا ٹیکہ لگایا۔ جب دوسرے ٹیکے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا تو رابرٹ نے خط کے بہانے ڈورا کو یہ کہہ کر ڈاکخانے بھجوا دیا کہ کافکا ہر حال میں صبح کی ڈاک سے خط روانہ کرنا چاہتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ کافکا نے رابرٹ سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اس کے آخری لمحات میں ڈورا کو اس سے دور رکھے گا۔ درد کی شدت سے نڈھال کافکا نے اپنی تمام بچی کھچی طاقت سے برف کی تھیلی کو نوچ کر پھینک دیا اور مارفیا کا تقاضا کرنے لگا۔

''مجھے اور اذیت نہ دو'' وہ چلایا۔ ''چار سال سے تم مجھ سے وعدہ کرتے آئے ہو۔ جاؤ میں تم سے بات نہیں کرتا۔ میں اسی طرح مر رہا ہوں''۔

رابرٹ نے دو ٹیکے لگائے مگر صورتحال کافکا کے اپنے کہے ہوئے الفاظ "So the help goes away without helping" کی عملی تصویر بن چکی تھی۔ کافکا نے غصے سے کہا'' مجھے دھوکا نہ دو، تم مجھے Antidote دے رہے ہو۔ مجھے مار دو ورنہ تم قاتل کہلاؤ گے!'' (Kill me either you will be a murderer!)

لے Max Brod, The Biography of Franz Kafka,
London: Secker & Warburg, 1947, P. 162.

رابرٹ نے ایک اور ٹیکہ لگایا جس سے وہ ذرا سنبھلا'' یہ اچھا ہے، لیکن اور، اور، اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑ رہا''۔

اور جب رابرٹ سرنج حاصل کرنے کے لیے بستر سے ہٹا تو وہ بولا ''مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ''۔ ''میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جا رہا''۔ رابرٹ نے جواب دیا'' لیکن میں جا رہا ہوں''۔ کافکا نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

چند لمحوں بعد جب رابرٹ نے اس کا سر اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا وہ نیم بیہوشی میں سمجھا کہ اس کی بہن ایلی ہے۔

''ایلی دور ہو جاؤ' اس قدر قریب نہ بیٹھو، اس قدر قریب نہیں''۔ اس نے سرگوشی کی۔

اسے ہمیشہ یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ اس کی بیماری کے جراثیم کسی اور کو منتقل نہ ہو جائیں۔

رابرٹ پیچھے ہٹ گیا'' ہاں اس طرح، یہ اچھی بات ہے''۔ [1]

آنے والے سالوں میں 'Willy Haas' نے اپنے مضمون ''ایف کے کی موت، آخری ایام'' میں سسٹر انا (Anna) کے حوالے سے کافکا کے آخری لمحات کے متعلق معلومات میں اضافہ کیا۔

سینی ٹوریم میں دم توڑنے والے مریضوں کی آنکھیں بند کرنے کی ذمہ داری سسٹر انا کی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق جب وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ کافکا دنیا سے رخصت ہو چکا ہے تو پھولے سانسوں کے ساتھ ڈورا کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پھول تھے۔ اس نے پھول اس کے چہرے کے سامنے رکھے'' فرانز! خوبصورت پھولوں کو دیکھو، ذرا سونگھ کر تو دیکھو''، ڈورا نے سرگوشی کی۔ بقول سسٹر انا'' مردہ آدمی نے خود کو اوپر اٹھایا پھولوں کو سونگھا، اس کی بائیں آنکھ بھی دوبارہ کھلی، یہ نا قابلِ یقین تھا''۔ [2]

ڈورا نے اس کی دھڑکن کو نہایت مدھم اور پھر رکتے ہوئے محسوس کیا اور کافکا نے آخری سانس لی۔ نرس نے کافکا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ہمیشہ کے لیے انہیں بند کر دیا۔

ڈورا میت سے لپٹ گئی۔'' بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ فرانز مر جائے''۔ اس نے کافکا کی اجڑی حالت دیکھی۔'' وہ کبھی بھی ایسا نظر نہیں آنا چاہتا تھا''۔

دراز سے کافکا کا پسندیدہ 'ہیئر برش' نکالا اور اس کے بال سنوارے۔ بقول رابرٹ ڈورا تمام رات سسکیاں بھرتی رہی'' او میرے خدایا، میرا پیار، میرا پیار......''

ڈورا نے کئی سال بعد لکھا۔'' فرانز کی موت، میرے لیے اپنی موت کا تجربہ تھی'' [3]

اور وہ کافکا کی موت کے بعد خود کو 'مسز کافکا' لکھتی تھی۔

فرانز کافکا کی لاش کو ایک چوبی تابوت میں پراگ لایا گیا۔ گیارہ جون کو چار بجے سہ پہر کو یہودیوں کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ بعد ازاں کافکا

---

[1] Kathe Diamnt, Kafka's Last Love, Newyork, Basic Books, 2003, P. 118, 119.
[2] ایضاً، ص120
[3] ایضاً، ص121

کے مسودات کو کھنگالتے ہوئے میکس بروڈ کو کافکا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو رقعے ملے۔ ایک 1921ء کے بعد کی تحریر تھی جبکہ دوسرا رقعہ قدرے پرانا تھا اور تحریر بہت شکستہ تھی۔ عبارت کچھ یوں تھی۔

''یہ میری آخری خواہش ہے کہ میرے تمام
مسودات کو بغیر پڑھے جتنی جلدی ممکن ہو سکے جلا دیا جائے''۔

اپنی موت سے کچھ عرصہ پیشتر کافکا نے میکس بروڈ کو ایک خط میں بھی یہی بات کہی تھی۔

''عزیز میکس! میری تم سے آخری استدعا ہے کہ میری الماریوں میں، درازوں میں، میرے کمروں میں، دفتر میں یا جہاں بھی میری کوئی تحریر، روزنامچوں مسودات، خطوط یا کسی بھی اور صورت میں تمہیں ملے اسے بغیر پڑھے جلا دو۔ جو لوگ میرے خطوط واپس کرنے سے انکار کریں ان سے انہیں جلد جلا دینے کا وعدہ لو...... تمہارا فرانز''۔ [1]

میکس بروڈ نے بغیر کسی خاص ہچکچاہٹ کے کافکا کی وصیت کو پس پشت ڈال دیا۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ میکس بروڈ کافکا کی زندگی میں اس کی یہ خواہش پوری کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کر چکا تھا۔ یوں اسے کافکا کی جو تحریر ملی اس نے شائع کرا دی۔

---

[1] Max Brod, The Biography to Franz Kafka, London: Secker & Warburg, 1947, P. 65

ف۔س۔اعجاز

سرد بوسے

آنکھیں خالی
تن افسردہ
مرجھائے گورے رخسار
لاکھ برے افسانے پر بھی
جذبوں کو بھڑکانے پر بھی
برف زدہ ہونٹوں سے اُس نے
مجھ پر بوسے ثبت کئے جب
میں اس جانب سوچ رہا تھا
کھلی فضا میں، چیت کی شب میں
اس لئے اُس کو میں لایا تھا
ہم تھوڑا سا پیار کریں گے
لیکن اب تو اندیشہ ہے
خلوت کی نازک گھڑیوں میں
تاج محل کے ٹھنڈے پتھر
مجھ کو بھی پیار کریں گے

☆☆

ف۔س۔اعجاز

ہنرک ابسن

(۲۰ مارچ ۱۸۲۸ء سے ۲۳ رمئی ۱۹۰۶ء)

ابسن اسکینڈ نا روے کے مطلق العنان سوداگر کی دوسری اولاد تھا۔ افواہ تھی کہ وہ ناجائز بچہ تھا۔ نتیجے میں اسے ایک تنہا بچپن ملا جس کی وجہ سے وہ لوگوں کی قربت سے خائف رہا کرتا تھا۔ 16 سال کا ہوا تو گھر چھوڑ کر چلا گیا اور ایک عطار کا ملازم ہو گیا جہاں مطالعہ مصوری اور شاعری لکھنے کا اسے بہت وقت ملا۔ وہ فطرتاً غیر ملنسار اور الگ تھلگ رہنے والا انسان تھا۔ نوعمری میں کرسٹیانا (اب اوسلو) منتقل ہو گیا اور ادبیات کا مطالعہ کرنے لگا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ڈرامہ نگار بن گیا۔ برگن میں نارویجین تھیٹر میں ایک ڈرامہ مصنف کی جانب سے اسے پیشکش ملی جسے اس نے قبول کر لیا۔ چھ سال تک غریبی اور ناکامی کے تلخ تجربے کے ساتھ جیا لیکن اپنا ہنر اس نے سیکھ لیا۔ اس عہد کو اس نے ''یومیہ اسقاط'' (ڈیلی ابورشن) سے تعبیر کیا ہے۔ 1856ء میں تھیٹر کمپنی نے اس کے ڈرامے "The Feast of Solhaug" کی نمائش کی۔ اسی سال میں اس کی ملاقات اس کی ہونے وا[لی] بیوی سُوزانہ تھورسین سے ہوئی۔ وہ اس کے تئیں وفادار تھی۔ جب 1858 میں دونوں کی شادی ہوئی تب سے ان کی روم، ڈریسڈن اور میونخ میں 27 سالہ خود جلاوطنی کا آغاز ہوا۔ ابسن شہرت زدہ آدمی تھا لیکن شہرت آسانی سے نہیں آتی۔ وہ شادی، مذہب اور انسانی برتاؤ سے وابستہ کافرانہ اور غیر اخلاقی نظریات کا حامی ڈرامہ نگار ہونے کی وجہ سے ناپسند کیا جاتا تھا۔ جب 63 سال کی عمر میں وہ ناروے لوٹا تب بین الاقوامی شہرت کا حامل تھا۔ دل پر د[و] حملے سہنے کے بعد وہ جسمانی توانائی کھو بیٹھا تھا۔ 78 سال کی عمر میں اس نے دنیا سے کوچ کیا۔

ابسن حقیقت پرست کے طور پر بہت مشہور تھا۔ لیکن جنس کے تئیں بزدل واقع ہوا تھا۔ ڈاکٹر سے اپنا خاص معائنہ کرانے سے ہچکچاتا تھا۔ ہیجانی قصوں کا شیدائی تھا لیکن اپنے کارناموں میں انھیں استعمال نہیں کر پاتا تھا۔ ایک نوجوان ہونے کے باوجود خواتین سے حیرت انگیز طور پر شرماتا تھا۔ لیکن یہ بات Else Jensdatter کے ساتھ ملوث ہونے میں اس کی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ اس کی خادمہ تھی۔ اس سے دس سال بڑی۔ تب وہ ایک عطار کا اسسٹنٹ تھا۔ اُلسے سے جب ایک لڑکا پیدا ہوا تو ابسن 18 سال کا تھا۔

برگن میں اپنی نوجوانی میں وہ چودہ سالہ Rikke Holst سے ملا اور اس نے اسے پروپوز کیا۔ وہ اتنا شرمیلا تھا کہ رکّے نے خود اسے ہوٹل کی سیڑھی پر گھیرا اور اپنے گلدستے سے اس کے چہرے پر وار کیا۔ رکّے کا باپ ہنرک کو

ناپسند کرتا تھا اور جب ایک دن اس نے اپنے شاگرد کو اپنی بیٹی کو پیار کرتے دیکھا تو غصے سے بے قابو ہوگیا۔ ابسن دم دبا کر وہاں سے بھاگ گیا۔

کامیابی کی وجہ سے اس کا حلقۂ احباب وسیع ہوگیا تو ابسن کی ایک دن اس عورت سے ملاقات ہوئی جسے مستقبل میں اس کی بیوی بننا تھا۔ سوزانہ تھورنسین ایک پادری کی بیٹی تھی۔ اس کے دراز بال ٹخنوں تک پہنچتے تھے۔ وہ بہت مضبوط اور انتہا پسند نظریات کی حامی تھی۔ ابسن نے اسے لکھا اگر تم اپنی منزل میری منزل سے جوڑ لو تو میں ادب کی دنیا میں ایک اہم ہستی بن جاؤں گا۔ 1858ء میں ان کی شادی ہوگئی۔ ابسن سوزانہ کو "میری بلی" کہتا اور پورے طور پر اس پر منحصر ہوگیا۔ اس کا ماننا تھا کہ عورت جو سب سے بڑا کام کرسکتی ہے یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ جنگ میں اتر پڑے اور اس کی بصیرت کو شعلہ بنا ڈالے۔ 1859ء میں انہیں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سانگرڈ رکھا گیا۔

ابسن نوعمر عورتوں کے بارے میں مسلسل ایک وہم یا غلط خیال میں مبتلا رہا کرتا تھا۔ سوزانہ کے بقول وہ ان کی خوبصورت خادماؤں کو تاکتا رہتا تھا لیکن صرف نظرِ جمالیات سے جیسے کوئی کسی پینٹنگ یا مجسمے کو دیکھتا ہو۔ ایک مشہور مصنف ہونے کے باوصف اس نے کئی نوعمر خواتین کو شائستہ کیا۔ وہ شہرت کو ایک بڑی طاقت سمجھنے لگا تھا۔ لیکن اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے پر نہ تو وہ رضامند تھا اور نہ اس میں اس کی صلاحیت تھی۔ کئی پُر شباب عورتیں اس کی گرویدہ ہوگئیں اور وہ صرف انھیں اپنے کرداروں کے ماڈل بناتا رہا۔ اگر وہ اس کے جذبے کو بھڑکاتیں تو وہ اس کا اظہار اپنے تصور میں کرتا۔ ابسن اس تخیل میں محو رہتا کہ اگر وہ امیر ہوتا تو دنیا کا سب سے بہترین سمندری جہاز خریدتا اور ایک اچھی آرکسٹرا لے کر چند اچھے دوستوں اور دنیا کی حسین ترین عورتوں کے ساتھ کسی استوائی جزیرے پر جا اترتا۔ نوعمر حسیناؤں کے لیے اس کا انتظار کبھی تمام نہیں ہوا البتہ اس کے جنسی اطمینان کی کسر کی تلافی ان حسیناؤں کی صحبت سے ہو جایا کرتی تھی۔ بیرونی ممالک میں کئی لڑکیاں اس سے ملاقات کرنے اس کے ہوٹل کے کمرے میں آتیں۔ وہ انھیں اپنی دستخط شدہ تصویریں دیتا' بوسے دیتا لیکن جنسی عمل انجام دینے سے خائف رہتا تھا۔

ابسن نے کبھی کوئی اسکینڈل نہیں بنایا۔ نہ اپنی بیوی کو پریشان کیا لیکن 1889ء میں ایک 18 سالہ ویئنی لڑکی ایمیلی برداش (Emilie Bardach) کی جانب ملتفت ہوگیا۔ اس معاملے نے اسے پہلی بیوی سے طلاق اور دوسری شادی پر اکسا دیا۔ وہ اپنی نئی محبوبہ جسے وہ "ستمبر کی زندگی میں مئی کا سورج" کہتا تھا' کے ساتھ دنیا کی سیر کو نکل گیا۔ ایمیلی لوٹ کر وی اینا چلی گئی اور اگرچہ دونوں میں لطف و مہر والی خط و کتابت جاری رہی لیکن ابسن کے دل میں اس کی جگہ ایک اور نوجوان پرستار ہیلن ریف (Helen Raff) نے لے لی۔ یہ تعلق بھی ایک ارفع جذبے کی توسیع تھا۔

1891ء میں وہ 63 سال کا ہوا تو ابسن ایک پیانو نواز ہلدہ در آندرسن سے جذباتی تعلق میں پڑ گیا۔ وہ 27 سال کی تھی اور ابسن اس سے پہلی بار جب ملا تھا اس کی عمر دس سال تھی۔ اب جو اسے عورت بنا دیکھا تو وہ چاہنے لگا کہ وہ سدا اس کے ساتھ رہے۔ جب کبھی اس کی بیوی سفر پر کہیں گئی

ہوئی ہوتی ابسن ہلدور کے ساتھ وقت گزارتا۔ ایک بار سوزانہ لمبے سفر پر گئی ہوئی تھی کہ اسے اس کی سوتیلی ماں کی چٹھی ملی جس میں اسے آگاہ کیا گیا تھا کہ ابسن ہلدور کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے اور سوزانہ سے طلاق لے کر ہلدور سے شادی کا ارادہ رکھتا ہے۔ سوزانہ نے اپنے شوہر کو خط لکھا اور یہ بات دہرائی۔ ابسن نے جواب دیا کہ اس نے جو سنا اس میں ایک بات بھی درست نہیں ہے۔ تمہاری سوتیلی ماں ذہنی مغالطے میں پڑی ہوئی ہے' وہ عورت پرانی پاپی ہے' فتنہ کھڑا کرنے والی۔ بس وہ ہلدور کا آخر تھا۔ جب کبھی وہ سخت بیمار پڑا اور ہلدور نے ملنے کی اجازت طلب کی سوزانہ اسے اجازت نہ دیتی۔

ان پُر شباب عورتوں میں سے کئی نے ابسن کے ڈراموں کی کردار سازی میں ابسن کو انسپائر کیا۔ ایمیلی برداش Hedda Gabler کے لیے ماڈل نمونہ بن گئی۔ ایک اور شناسا عورت ''گڑیا گھر'' (A Doll's House) میں نورا (Nora) کا کردار بن گئی۔ ابسن ایک نو عمر بیوی Laura Kieler سے خصوصاً متاثر ہوا جسے قرض لینے اور ایک چیک فورج کرنے کے الزام میں اس کے شوہر نے پاگل خانہ میں ڈلوا دیا تھا۔ ان ڈراموں کی تصنیف سے ابسن ''نئی عورت'' پر لکھے گئے ادب کا ماہر بن گیا۔ ڈینش ادب میں اسے بہ یک وقت خود اعتماد اور تشکیک پسند قرار دیا جا چکا ہے۔ ''بہت سے لوگ بغیر جئے مر جاتے ہیں'' ابسن نے کہا تھا ''خوش نصیبی ہے کہ انہیں اس کا عرفان نہیں ہوتا''۔

رسول حمزتوف

ترجمہ: ف۔ س۔ اعجاز

ہوئی

سانجھ سویرا، دن اور رات
سب ہیں ماہی گیر کے ہاتھ
دنیا ایک سمندر ہے
اور میں ایسا سوچ رہا ہوں
ہم اور تم مچھلی کی صورت
اس کی تہوں میں تیر رہے ہیں!

دنیا ایک سمندر ہے!
اور مچھیرے تاک میں بیٹھے
پھیلائے ہیں اپنا جال
جس ڈوری ہیں تیار
جانِ من کچھ تم کو خبر ہے
کب اور کتنی جلدی مجھ کو
وقت بہا کر لے جائے گا
زریں مچھیرن کی جالی میں؟

یا پھر دن کے کانٹے پر؟

ف۔س۔اعجاز

فیودور دوستووِسکی

(Fedor Dostoevski)

۱۱رنومبر ۱۸۲۱ء تا ۹رفروری ۱۸۸۱ء

ناٹا، دبلا اور بے ڈول دوستووسکی زبردست گھبراہٹ کا ایسا مریض تھا کہ سماجی تقریبات میں اس کا چہرہ تن جاتا اور ہونٹ بھینچ جاتے۔ عنفوان شباب میں گھبراہٹ کے حملے پڑنے سے وہ بیس اور تیس کی عمر کے درمیان مرگی کا مریض ہوگیا۔ ایک عصبی حملے کے دوران اس کی دائیں آنکھ برباد ہوگئی جس کے نتیجے میں آنکھیں نابرابر دکھائی دینے لگیں۔ دوستووسکی ایک جذباتی آدمی تھا۔ جب وہ مشتعل ہوجاتا جلال میں آجاتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے تھے۔

اس کے ذاتی واقعات ثابت کرتے ہیں کہ وہ غم واندوہ اور جرم تک میں مبتلا ہوجایا کرتا تھا۔ جب وہ تیرہ سال کا ہوا اس کی ماں بلانوشی میں چل بسی اور اس کے پانچ سال بعد اس کا کنجوس اور بداطوار باپ عالمِ مدہوشی میں اپنے نوکروں کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ اس کے فوراً بعد دوستووسکی اپنا ملٹری انجنیئر کا کردار ختم کرکے ایک ادیب بن گیا۔ اور پچیس سال کی عمر میں اس نے اپنا پہلا ناول "Poor Folk" لکھا جس کی اچھی پذیرائی ہوئی۔ اس کے باوجود چند سال بعد ایک سوشلسٹ تنظیم میں ملوث ہونے کے سبب کسی انقلابی سازش کے الزام میں ماخوذ کرلیا گیا۔ اسے سزائے موت دی جاتی تھی لیکن آخری وقت میں سزا معاف کردی گئی اور وہ سائبیریا میں نظربند کردیا گیا۔ دس برس بعد وہ سینٹ پیٹرس برگ (اب لینن گراڈ) پہنچا اور اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ مزید سات سال بعد اس کے اہم کام منظرعام پر آئے۔ خراب صحت، الم ناک زندگی، ناکام معاشقوں اور غریبی کے باوجود دوستووسکی ۵۹ سال کی عمر تک جیا اور ایک بامراد شادی شدہ آدمی کی طرح مرا۔ موت سے قبل اسے تخلیقی اور مالی استحکام اور قدرومنزلت نصیب ہوچکی تھی۔

دوستووسکی کے ہم عصر ادیب ترگنیف نے اسے روس کا مارکوئیز دے سادے (Marquis de Sade) قرار دیا۔ ۳۴ برس کی عمر تک اس کا کوئی اہم رومانی واقعہ نہیں ہے۔ تیس برس کا ہونے تک وہ خوداعتمادی اور موقع سے محروم رہا جبکہ کبھی کبھی طوائفوں سے ملتا رہا۔ گزربسر کے لیے اسے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ جب اسے سپاہی کی حیثیت سے سائبیریا بھیج دیا گیا تو جنسی معاملات میں زیادہ ملوث ہوگیا۔ ہر آئے دن اسے کوئی خوبصورت نوجوان عورت مل جاتی۔ ایک دن اس کی ملاقات ماریہ اِسایئوا (Maria Isayeva) سے ہوئی۔ وہ شادی شدہ تھی۔ تھوڑے عرصہ بعد بیوہ ہوگئی۔ پھر دوستووسکی اور ماریہ نے شادی کرلی۔ ماریہ کی نسائی خوبیوں کے علاوہ اس کی مشکلات ومصائب کی وجہ سے دوستووسکی اس کی جانب ملتفت ہوگیا تھا۔ وہ شراب زیادہ پیتی تھی۔ (اس کا مرحوم شوہر بھی الکوحل زدہ تھا۔)

دوستووسکی اور ماریہ شادی کے بعد ہنی مون منانے گئے۔ اس دوران دوستووسکی کو مرگی کا ایک شدید دورہ پڑا۔ یہاں سے ان کی رومانی زندگی بدل گئی۔ دونوں بہت ناخوش اور صحت سے نامطمئن رہنے لگے۔ سات سال بعد ماریہ چل بسی۔ ماضی میں کبھی دوستووسکی اپولینا ریا سلوواتا می ایک لڑکی سے ملا تھا۔ اور 'پولینا' سے اس کے مراسم بھی قائم ہوئے تھے۔ ماریہ کی موت کے بعد ان مراسم کی تجدید ہوئی۔ سرخ بالوں والی پولینا ایک آزاد منچلی عورت تھی۔ دوستووسکی سے عمر میں بیس سال چھوٹی۔ اس کی ذہانت اور شخصیت قابل داد تھی۔ دونوں نے ایک سال ایک ساتھ ایسے گزارا کہ پولینا صرف اسے چھیڑتی 'تیز' کرتی۔ کئی سال تک وہ اسے اذیت دیتی رہی۔ آخر یہ معاملہ ختم ہوگیا۔ بعد میں یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ Sadomasochastic اور خود جنسی طور پر سرد واقع ہوئی تھی۔ اس خصلت کا انسان اپنی مسرت کے لیے کسی پر ظلم کرنا روا سمجھتا ہے۔ جنس مخالف کی مصیبت و تحقیر پر خوش ہوتا ہے۔ دوستووسکی جنسی طور پر معمول سے زیادہ صحیح تھا۔ پولینا کی بدسلوکی بھلانے کے لیے اسے جُوا کھیلنے کی عادت پڑ گئی۔ اس کی یہ لت اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک بار جب وہ پولینا کے ساتھ سفر کر رہا تھا اپنے دونوں کے قیمتی سامان اس نے گروی رکھ دیے اور مزید روپیوں کے لیے اپنے رشتے داروں سے بھیک مانگنے لگا۔ جوے کی اس علت سے وہ اپنی اگلی شادی سے پہلے پیچھا نہ چھڑا سکا۔

پولینا کے بعد دوستووسکی نے ایک ایسی عورت سے شادی کا ارادہ کیا جس کی معیت میں پہلی بار وہ ایک قسم کا گھریلو نظام قائم کرسکتا تھا۔ وہ ۴۵ سال کا تھا جب اس نے اپنی اسٹینوگرافر انا اسنٹکیوا (Anna Snitkiva) جو اس سے ۲۰ سال چھوٹی تھی' سے شادی کی۔ وہ اسے پوجتی تھی۔ اس نے لکھا تھا "میں اپنے گھٹنوں پر اپنا سر رکھے رکھے اس کی خاطر زندگی گزار سکتی ہوں"۔ انا نو عمر اور ناتجربہ کار تھی۔ اس کا شوہر اس سے محبت کرنے میں انتہائی غضبناک ہو کر تشدد پر بھی اتر آتا تھا۔ اس کی حالت کبھی ایسی ہو جاتی تھی جیسی پہلے مرگی کے دورے پڑنے پر ہو جایا کرتی تھی جس کے بعد وہ ایک مردے کی طرح بے حس و حرکت لیٹا رہتا تھا۔ اس کے شہوانی تخیلات بھانت بھانت کے ہوا کرتے تھے جن میں جسمانی سزا کا بھی عمل دخل تھا' اصلی ہو چاہے بناوٹی۔ بدقسمتی سے انا اپنے نام لکھے دوستووسکیکے خطوط کی تفصیل کو نظر انداز کر جاتی تھی۔ بہرحال دوستووسکی کے غیر معمولی غضبناک چلن کا علم ان دونوں کی شادی کے وقت بھی سب کو تھا۔ خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ دوستووسکی انا سے خوب لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ دونوں میں وقتاً فوقتاً علیحدگی ہو جاتی لیکن اس کے بعد وہ خود پر قابو پالیتا لیکن اسے یہ ڈر رہتا تھا کہ انا وفادار نہیں ہے۔ حالانکہ اس کا یہ خیال غلط تھا۔ اس کی جوان اور خوبصورت بیوی اس سے اپنی آسودگی کا اظہار کرتی تھی۔ ایسے میں وہ اصرار کرتا انا اپنی آسودگی کا ذکر اور طویل کرو' اس موضوع پر اور بات کرو۔ انا سے دوستووسکی کی محبت ختم نہیں ہوئی بلکہ چودہ سالہ شادی شدہ زندگی میں اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ۵۷ سال کی عمر میں اس نے سنجیدگی سے یہ کہا کہ میرا جذبہ اور جوش و جنون کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

دوستووسکی پیروں کا پجاری (Fetisht) تھا۔ انا کے نام اس نے اپنے مکتوبات میں اس کے پانوؤں کے لیے اپنی بے صبر چاہت کا ذکر جا بجا کیا ہے۔ ایک خط میں لکھا ہے "میں اپنے زانو پر تمہارے سامنے جھکتا ہوں اور

تمہارے قدمِ نازک کو لاتعداد بوسے دیتا ہوں۔ میں ہر لمحہ اس پائے نازک کا تصور کرتا ہوں اور اس کا لطف اٹھاتا ہوں۔۔'' انا اس پر بہت متامل ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ اصرار کرتا '' میں تمہارے دونوں پنجوں کو چومنے کو بے تاب رہتا ہوں۔ اپنے اس ارمان کی گواہی پیش کرسکتا ہوں اور تم دیکھو گی میں اپنا ارادہ پورا کرلوں گا''۔

وہ جوان لڑکیوں سے خائف رہا کرتا تھا۔ ایک افواہ مشہور تھی کہ دوستو وسکی نے ایک بچی کے ساتھ جنسی ارتکاب کیا تھا۔ وہ ایک جسم فروش کی اولاد تھی۔ اُس کی گورنیس اُسے دوستو وسکی کے غسل خانہ میں لے آئی تھی۔ یہ بالکل سچ ہے کہ دوستو وسکی کی باتوں اور ناولوں میں ایک ایسے بوڑھے کی تمثیل بار بار بیان ہوئی ہے جو ایک کمسن لڑکی کا مستقلاً استحصال کرتا ہے۔ دوستو وسکی کے دماغ پر یہ خیال ہمیشہ سوار رہا کرتا تھا۔ اس کا شاہکار ناول ''جرم و سزا'' (Crime and Punishment) بھی اس کے عشقی، جنسی اور ذہنی رویوں کا غماض ہے۔

رمیش سہگل کی ہندی فلم ''پھر صبح ہوگی'' کافی حد تک اس ناول پر مبنی تھی۔ اس فلم میں ہیروئن مالا سنہا پر ایک بوڑھے مرد کی جنسی جارحیت کا منظر بہت واضح تھا۔ اس میں شک نہیں کہ دوستو وسکی کے فنی اور تخلیقی رویے میں تہہ داری اور پیچیدگی پائی جاتی ہے۔

غالب کی '' کے پاؤں'' والی ردیف کی غزل کا مطلع کیا خوب ہے:

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں   رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

کیا غالب بھی کوئی پاؤں کا پجاری تھا؟

کمال امروہی کی فلم ''پاکیزہ'' اور ایچ ایس روپل کی ''لیلیٰ مجنوں'' کے چند مناظر میں اس نزاکت کو مکالموں اور کیمرے کے ذریعہ ابھارا گیا ہے۔ (اعجاز)

شیکسپیئر کے ۵۲ اقوالِ محبت

۴۵۔ میں وینس میں ایک عورت کو جانتا ہوں جو ننگے پاؤں چل کر فلسطین پہنچی ہوگی محض عاشق کے نچلے ہونٹ کے ایک لمس کے لیے۔

Othello - Act 4, Scene 3

۴۶۔ میں نہیں جانتا محبت میں لفظ کیسے چبایا جاتا ہے۔ بس مجھے سیدھی طرح یہ کہنا آتا ہے کہ میں تمہیں پیار کرتا ہوں۔

Henry V - Act 5, Scene 2

۴۷۔ ایک عورت کی آغوش میں میں اپنی جنت بنالوں گا۔

Henry VI Part 3 - Act 3, Scene 2

۴۸۔ تیرے ہونٹوں میں جادوگری کا فن ہے۔

Henry V - Act 5, Scene 2

۴۹۔ کیٹ مجھے چوم لو۔ اتوار کو ہماری شادی ہوجائے گی۔

The Taming of the Shrew - Act 2, Scene 7

۵۰۔ میں ایک کوے پر اپنے کتے کا بھونکنا پسند کروں گی بجائے اس کے کہ ایک آدمی قسم کھائے کہ وہ مجھے محبت کرتا ہے۔

Much Ado About Nothing - Act 1, Scene 1

۵۱۔ شب بخیر، شب بخیر۔ جدائی میں ایسی میٹھی اداسی ہے کہ میں اگلا دن آنے تک تجھے شب بخیر کہتا رہوں گا۔

Romeo And Juliet

۵۲۔ دیکھو کس طرح وہ اپنی تھوڑی اپنے ہاتھ پر رکھتی ہے! کاش میں اس کا دستانہ ہوتا تو اس کی تھوڑی کو چوم لیتا۔

Romeo And Juliet

خلیل جبران کی محبتیں

''اس کرۂ ارض پر سب سے زیادہ جنس پرست، تخلیق کار، شعراء، مصور اور موسیقار ہیں۔ شروع ہی سے ان کے لئے جنس ایک خوبصورت چیز رہی ہے۔''

اور یہ حقیقت ہے کہ جذبۂ شہوانیت کا تخلیقیت سے بہت گہرا رشتہ ہے اور یہ جذبہ جبلی اور فطری ہے۔ اسی لئے زیادہ تر تخلیق کار erotic ہوتے ہیں، جنسی لذت کے شیدائی و خلوت کے سودائی۔ اور شاید یہی شہوانی آوارگی ان کی تخلیق کی قوت محرکہ بنتی ہے۔ ایک ماہر نفسیات کا خیال ہے کہ:

Good and rumpy pumpy sex has been the driving force of creativity.

ہمارے عالمی تخلیقی سرمایہ کی ثروت مندی جنس کے بنیادی تصورات، محرکات اور ہیجانات کی ہی رہین منت ہے۔

ہر جینوئن تخلیق کار میں جنسی جذبے کا وفور ہوتا ہے کہ اس کا حواس خمس سے تعلق ہے اور ان حسیات سے بھی جو ادب کی تخلیق کا محرک بنتی ہیں۔ خلیل جبران میں بھی جنسی جذبہ تھا مگر انہوں نے اسے وجدانی اور جمالیاتی سطح پر استعمال کیا اور شہوانیت کو محبت کے ارفع جذبہ میں تبدیل کر لیا کہ انہیں داخلی حسیت کی جستجو تھی اور اُن پہ یہ راز منکشف ہو گیا تھا کہ محبت فطرت کے داخلی اسرار کے اظہار کا نام ہے اور اسی داخلی اسرار کی تلاش میں جب ایک فن کار نکلتا ہے تو نت نئے تجربوں سے آشنا ہوتا ہے اور انہی تجربوں کو اظہار کی زبان دے کر وہ فطرت کی رنگینیوں کو دنیا پر یوں آشکار کرتا ہے کہ دنیا محو حیرت رہ جاتی ہے۔ ایسے ہی تجربوں سے نئے نظام فکر اور جہان معنی تشکیل پاتے ہیں اور اس میں اس محبت کا سب سے زیادہ عمل دخل ہے جو ہمارے وجود کا اصلی جوہر ہے، جو انسانی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ محبت کسی سے بھی اور کسی بھی سطح پر ہو سکتی ہے۔ اس کے رنگ مختلف ہیں اور ہر رنگ میں محبت، سب سے مقدس اور حسین شے نظر آتی ہے۔ محبت ہی دراصل کائنات میں ترسیل کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ محبت اجتماعیت اور اشتراک وجود کی ایک اہم مظہر ہے اور یہی دنیا کی بقا کی ضامن بھی ہے۔

فطرت سے محبت ہو یا انسان سے، یہ انجانی خوبصورت انسانی تجربہ ہے اور ایک زبردست تخلیقی محرک بھی۔ دنیا کا قدیم سے قدیم ادب بھی محبت کے نغموں سے سرشار ہے۔ محبت نے نہ جانے دنیا کو کتنے ہی عظیم شاہ کار، قدر اول کے فن پارے دئے ہیں، کتنے گیت، کتھائیں، کتنی غزلیں، کتنی نظمیں محبت کے زیر

اڑ لکھی گئیں اور جریدۂ عالم پر اپنے گہرے نقش چھوڑ گئیں۔ اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ محبت کے نور سے ہی وہ ادب جنم لیتا ہے جو ہیلن کی طرح حسین، قلوپطرہ کی طرح قتالۂ عالم، نوسیکا کی طرح نازک اندام اور نینون ڈی لنکلوس کی طرح نو بہار حسن و جمال ہوتا ہے۔

دنیا کے عظیم سائنس داں ہوں یا مفکر۔ فلسفی ہوں یا ادیب، ملوک ہوں یا ارباب تصوف و سلوک، سبھی کا وجود محبت کی خوشبوؤں سے ہی معطر ہے۔ ایک دبی دبی سی چنگاری محبت کی ضرور ان کے دلوں میں سلگ رہی ہوتی ہے۔

عالمی شہرت یافتہ ادیب، مصور، مفکر اور فلسفی خلیل جبران (پ: 6 جنوری 1883 بمقام بشری لبنان۔ م: 10 اپریل 1931 بمقام نیویارک، امریکہ) کے ہاں بھی محبت کا خصوصی تصور ہے جس سے خلیل جبران کا پورا نظامِ فکر عبارت ہے مگر ان کے یہاں محبت کا ایک عمومی تصور بھی ملتا ہے کہ ہر بڑے فن کار کے یہاں کسی بھی فکر کے تئیں عموم اور خصوص کی نسبت بنی رہتی ہے۔

عام تصور کے لحاظ سے بھی دیکھیں تو خلیل جبران، ایک دل گداختہ رکھنے والے فنکار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں مگر انہوں نے اپنی دل گداختگی کو اپنے فن پر قربان نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے محبت میں ناکامیوں کے لطف بھی اٹھائے اور محبت کی محرومیوں نے ہی انہیں خوبصورت فلسفے بھی عطا کئے اور زندگی کے نئے تصور سے آشنا بھی کیا۔ محبت نے ہی ان پر انفس و آفاق کے سارے در کھول دیے۔ اگر وہ محبت کے رمزوں کنایے سے آشنا نہ ہوتے تو ان کی تخلیق میں نہ قوت ہوتی نہ تاثر۔ محبت نے ہی انہیں نفرت کرنا سکھایا اس نظام سے جو جبر و استحصال اور عدم مساوات پر مبنی ہے۔ غلامی اور محکومی سے بھی نفرت اسی محبت کی دین ہے۔ انہوں نے فطرت کے رموز و اسرار کو محبت کی ہی روشنی میں سمجھا۔ تبھی تو ان کا خیال تھا کہ ''پوری دنیا میرا وطن ہے اور تمام لوگ میرے ہم وطن'' محبت نے ہی ان کے اندر آفاقیت پیدا کی تھی۔ ایک عقیدے کی اولاد کا تصور بھی اسی محبت کا فیض ہے۔ محبت کے وسیع ترین تصور کو انہوں نے اپنے تخیل میں اس قدر جاگزیں کرلیا تھا کہ اپنی قبر پر یہ الفاظ کندہ کرانے کی خواہش ظاہر کی تھی:

"میں بالکل تمہاری طرح ہوں۔ اور تمہارے پاس کھڑا ہوں۔ تم اپنی آنکھیں بند کرو اور آس پاس دیکھو تو مجھے اپنے سامنے کھڑا پاؤ گے"

یوں تو خلیل جبران کی پہلی محبت حلا الزہر تھی۔ مگر یہ ناکام محبت تھی کہ دونوں کے درمیان سماجی طبقاتی نظام کی دیواریں حائل ہوگئیں کیوں کہ حلا ایک صاحب ثروت، اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس سانحہ نے خلیل جبران کو باغی، روایت سے منحرف اور مشرق سے بیزار بنا دیا جہاں شادی یا محبت کا کوئی واضح اور مثبت نظام نہیں۔ ''شکستہ بازو'' میں انہوں نے اپنی اس ناکام محبت کی پوری تفصیلی روداد لکھی ہے۔ اس ناکامی کے بعد انہیں پہلی سچی محبت جوزفین پیبڈی (Josephine Peabody) کی صورت میں ملی جو جبران سے عمر میں کافی بڑی تھیں اور تخلیقی دنیا میں شہرت یافتہ بھی تھیں۔ جبران اس وقت پندرہ سال کے تھے مگر جبران کی مصورانہ ذہانت نے وہ معجزہ دکھایا کہ جوزفین اس کے فن کی اسیر ہوگئیں۔ اور قسمت نے یاوری کی کہ جوزفین، خلیل جبران کے

ہر باب میں اولیت اختیار کرتی گئیں۔ یہی وہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے جبران کی پہلی ڈرائنگ کی نمائش کا اہتمام کیا، انہوں نے ہی ان نظموں کے ترجمے سب سے پہلے انگریزی میں کئے، اور سب سے پہلے جبران پر نظمیں بھی انہوں نے ہی کہیں۔ اور یہی وہ خاتون ہیں جنہیں جبران کے کرداروں میں اولیت حاصل ہے۔ جوزفین کی وجہ سے محبت، مسرت اور غم کے مفاہیم سے آشنا ہوئے۔ جوزفین نے ہی جبران کے ذہنی زاویے بدلے کہ خود جوزفین غیر معمولی فہم و ادراک کی حامل تھیں۔ ایک شاعرہ اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت مستحکم کرچکی تھیں۔ ان کی پہلی کتاب Old Greek Folk Stories Told Anew تھی جو 1897 میں شائع ہوئی تھی پھر ان کی نظموں کا مجموعہ "Wayfarers" یک بابی ڈرامہ Fortune and men's eyes شعری ڈرامہ Marlowe، کے علاوہ The Chameleon اور Portrait of Mrs W شائع ہوئے۔ دونوں میں جوزفین کو جبران سے بڑی محبت تھی اس لئے ان پر نظمیں بھی کہیں اور ڈائری بھی تحریر کرتی رہیں جو Psychic کے نام سے شائع ہوئی۔ جوزفین نے Lionel Marx سے شادی کی تھی اور جرمنی چلی گئی تھیں۔ بہت دنوں تک ملاقات نہیں ہوئی پھر جوزفین نے جبران کو چائے اور ڈنر پر مدعو کیا اور اپنے بچوں کی البم دکھائی۔ یہ البم ایک بڑی معنی خیز علامت تھی۔ جبران نے 82 خطوط جوزفین کو لکھے تھے۔ وہ خط جوزفین کی ڈائری کے ساتھ سلیم مجیس نے شائع کردیے ہیں جن سے دونوں کی محبتوں اور قربتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خلیل جبران کی دوسری محبت میری الزبتھ ہیسکل (Mary Ellizabith Haskell) تھیں۔ بوسٹن کے امریکن اسکول کی ہیڈ مسٹریس جو 1904 میں فرشتے کی مانند غم اور اداسی کے لمحوں میں روشنی بن کر نمودار ہوئی تھیں۔ تاریک راہوں میں اجالے بکھیرنے والی میری، جبران کے فن کی پرستار اور شیدائی تھیں۔ یہ ان کے آرٹ کی اس قدر دیوانی تھیں کہ آرٹ کی نمائش کے سارے انتظامات خود کرتی تھیں۔ انہوں نے ہی پیرس کے دو سالہ قیام کے دوران خلیل جبران کی مصوری سیکھنے کے مصارف برداشت کئے تھے۔ خلیل جبران پر یہ محبتوں اور عنایات کی ہمیشہ بارش کرتی رہیں اور حق رفاقت یوں ادا کیا کہ جبران کے دل میں بھی ان کے لئے شدید والہانہ مگر افلاطونی محبت پیدا ہوگئی۔ مس ہیسکل جبران سے عمر میں دس سال بڑی تھیں جبران کو دل و جان سے پیار کرتی تھیں اور ان کے لمس اور قرب کے لئے کسی بھی حد کو پار کر جاتی تھیں۔ وہ ایک گرم جوش اور شہوانی خواہشات سے مغلوب ہوکر اسٹوڈیو میں جبران کے سامنے بالکل عریاں ہوگئیں۔ جبران نے ان کے شہوانی جذبے کا احترام کرتے ہوئے ان کے کہسار نما پستانوں کو ملائمت سے چھوا اور اپنی بانہوں میں بھر کر شباب کی گرم دہکتی آگ کو سرد کردیا مگر نہ تو ان کے اندر شہوت کی آگ بھڑکی اور نہ ہی لذتوں کی ہمالیائی بلندی تک پہنچنے کی کوئی خواہش پیدا ہوئی۔ 1923 میں ہیسکل جارجیا چلی گئیں اور کرنل جیک فلورینس مینس (Jacob Florance Minis) سے شادی کرلی۔ ان کی جبران سے 23 سالہ رفاقت رہی۔ جس کے دوران تقریباً چھ سو خطوط جبران نے لکھے۔ ان میں قربتوں کی کہانیاں بھی تھیں اس لئے

ہیسکل نے انہیں نذر آتش کرنے کا ارادہ کرلیا تھا مگر ان خطوط کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر ہیسکل نے یہ سارے خطوط نارتھ کیرولینا یونی ورسٹی کی چیپ ہل لائبریری کے حوالے کردیے جو 1972 میں Belovec Prophet کے عنوان سے شائع ہوئے۔

ایک انتہائی حسین، خود اعتمادی سے بھرپور فرانسیسی خاتون ایمیلی میشل (Emilie Michel) بھی خلیل جبران کے پیچھے سائے کی طرح بھاگتی رہتی تھی۔ یہ بھی جنسی قوت وحرارت سے بھرپور عورت تھیں۔ جبران کے قرب کی تمنا میں پاگل ہوئی جارہی تھیں۔ مگر ناکام رہیں، بالآخر شادی پر اصرار نے دونوں کی چاہتوں کا خاتمہ کردیا۔

باربرا ینگ جبران کی چوتھی محبت تھی۔ یہ بے حد حسین، بھوری آنکھوں اور سفید رنگت والی نوجوان خاتون تھیں جو جبران کی 'دی پرافٹ' (The Prophet) پڑھ کر ان پر عاشق ہوگئی تھیں۔ پہلے تو دونوں کے درمیان خط و کتابت کے سلسلے چلتے رہے۔ پھر رہ و رسم آشنائی اتنی بڑھی کہ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ طور پر ملنے لگے۔ جبران نے باربرا کو اپنا سکریٹری بھی مقرر کرلیا تھا۔ خلیل جبران سے بے پناہ محبت کرنے والی خاتون نے ان کے انتقال کے بعد اپنی محبتوں کا خراج ادا کرنے کے لئے جبران کے ساتھ گزرے لمحوں اور یادوں کو ایک کتاب کی شکل میں پیش کیا اور اپنی سات سالہ رفاقت کے حوالے سے وہ سب لکھا جو عام لوگوں کی نظروں سے اب تک مخفی تھا۔

ان کے علاوہ خلیل جبران کے دل میں مصری ادیبہ می زیادہ (11 فروری 1886...17- اکتوبر 1941) کی محبتیں بھی بسی رہیں۔ یہ روشن خیال ادیبہ ''مشرقی فیمنزم'' کی موید تھیں اور آزادی نسواں کے لئے سرگرم رہتی تھیں۔ ان کی بیشتر تحریروں کا ارتکاز نسائی مسائل اور موضوعات پر ہے۔ فرانسیسی، انگریزی، جرمن، اطالوی، لاطینی اور عربی زبانوں کی ماہر می زیادہ نے باحثۃ البادیہ، سوانح فتاۃ، ظلمات واشعہ، کلمات واشارات، الصحائف، غایۃ الحیاۃ، المساواۃ، بین الجزر والمد جیسی تصانیف سے عربی کی ادبی اور فکری ثروت میں اضافہ کیا۔ المحروسہ کے مدیر الیاس زیادہ کی صاحبزادی می مشرقیت اور رومانیت سے گہرا ذہنی لگاؤ رکھتی تھی ایک نہایت ذہین، تخلیقی ذہن اور حساس تخیل کی حامل می نے شادی نہیں کی تھی مگر جبران سے اس قدر شدید ذہنی قربت تھی کہ ان کی وفات کا صدمہ برداشت نہ کرسکیں اور ڈپریشن کی شکار ہوگئیں۔ می لامرٹائن، بائرن، شیلے اور جبران سے بہت متاثر تھیں اور ان کے افکار ان کی تحریروں کے اعماق میں محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ ان کی رہائش گاہ مصری دانشوروں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، جہاں ادبی محفلیں سجتیں، ادب کے عصری موضوعات پر مباحثے اور مذاکرات ہوتے، خلیل جبران کا ذکر بھی نکل پڑتا۔ انہوں نے خلیل جبران کو ایک تعریفی خط لکھا تھا جسے پڑھ کر خلیل جبران کی دیوانگی شروع ہوگئی اور ان کے خیالوں میں کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ جبران کو بھی می زیادہ کے فن سے بہت محبت تھی۔ دونوں دوریوں میں ذہنی قربتوں کا لطف اٹھاتے رہے، جبران مختلف موضوعات پر ان کی رائے طلب کرتے اور ان رایوں کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خلیل جبران نے انہیں ایک بار لکھا تھا کہ ''می! کیا تم جانتی ہو کہ صبح وشام میں اپنے آپ کو قاہرہ کے

اس گھر میں موجود پاتا ہوں جہاں تم سامنے بیٹھی ہوئی وہ مضمون پڑھ رہی ہو جو میں نے لکھا ہے یا تم نے مگر ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔'' جبران نے ان میں زیادہ کو بہت سارے خط لکھے ہیں اور ہر خط میں ادب کے عصری مسائل و موضوعات پر انتہائی فلسفیانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

خلیل جبران نے زیادہ تر بڑی عمر کی عورتوں سے ہی محبت کی ہے۔ جبران کی جن عورتوں سے والہانہ شیفتگی رہی ہے ان میں لوئس گوئنے (1861---1920) للا کیبوٹ پیری (1848---1933) سارہ سیرس (1858---1935) کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہ تو تھیں جبران کی وہ محبتیں جو ان کی نظموں یا کرداروں میں تحلیل ہو کر رہ گئیں یا لفظوں میں قید ہو کر صدیوں تک چمکا کریں گی۔ ان محبتوں سے انہوں نے لفظوں کے سناٹوں کو توڑ دیا مگر ان کے اندر سناٹا ہی رہا۔ اپنی زندگی کی داخلی ویرانی کو مٹانے کی انہوں نے کبھی سنجیدہ کوشش ہی نہیں کی۔ زندگی کا یہ سفر انہوں نے تنہا ہی طے کیا۔ عجیب داخلی تضادات کا شکار تھا یہ عظیم فن کار کہ انسانی جسموں کی عریاں تصویریں تو بنائیں مگر عریاں جسموں کی لذتوں میں کھویا ہوا رہنا انہیں کبھی اچھا نہیں لگا۔ وہ یہ مانتے تھے کہ ایک عریاں جسم زندگی کی سب سے سچی اور مہذب علامت ہے۔ مگر عملی طور پر کبھی بھی انہوں نے اس مہذب علامت کو اپنی زندگی کے دائرے میں داخل نہیں ہونے دیا۔

ایسا نہیں ہے کہ جبران، جنسی اعتبار سے کمزور یا نامرد تھے۔ انکے اندر بھرپور جنسی قوت تھی مگر انہوں نے ساری حرارتیں اور قوتیں تخلیق کی نذر کر دی تھیں اور اپنی خواہشات کا ارتفاع کر لیا تھا۔ مس ہیکل نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ '' جبران مباشرت کے خطرناک عواقب سے خوف زدہ تھے۔ عورتوں کے حمل کی مشقت اور درد زہ کے کرب ان سے نہیں دیکھے جاتے تھے اور عورتوں کے تئیں عزت و احترام کا جذبہ بھی ان پر اس قدر غالب تھا کہ انہوں نے تمنا سی اور خوابوں کے سہارے زندگی گزار دی''۔ مس ہیکل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ '' جب جبران سے یہ پوچھا گیا کہ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟ تو انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اگر میرے پاس بیوی ہوتی اور میں مصوری کر رہا ہوتا یا نظمیں لکھ رہا ہوتا تو اس کے وجود کو بھول جاتا اور وہ مجسم انتظار بنی رہتی اور شاید کوئی بھی عورت ایسے شوہر سے نباہ نہیں کر سکتی۔''

جبران کا تجرد بلا جواز نہ تھا کہ شادی ایک دوسرے کے جذبات کے احترام کی ڈور سے بندھی ہوئی ہوتی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جنس ایک حیاتیاتی ضرورت ہے، اس کے بغیر انسان نامکمل ہے اور انسانی نفسیات کے ماہر اس عالمی فن کار نے اس نفسیاتی حقیقت کو بھی عمداً فراموش کر دیا کہ جسموں کے کچھ اور تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ انہیں اذیت و کرب سے گزرنے ہی میں لذت و تسکین ملتی ہے ورنہ جسم کی جڑیں سوکھنے لگتی ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ خلیل جبران نے اپنی پہلی محبت کی ناکامی کا انتقام لینے کے لئے زندگی کا یہ نیا فلسفہ وضع کر لیا ہو ورنہ کون ایسا فنکار ہے جو جسم کی وادیوں کی سیر اور لذتوں کے سمندر میں غوطہ نہیں لگانا چاہتا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ دانتے کا بیاترچے، شیکسپیئر کا ڈارک لیڈی، سارتر کا سائمن دی بوار، بائرن کا اگستا، لارنس

کافریڈ اور بودلیر کا کئی عورتوں کے ساتھ معاشقہ رہا اور ان کی تحریروں پر انہیں حسیناؤں کے حسن کا جلال و کمال ہے۔ ہنری طرنے تو حد ہی کر دی کہ کئی شادیاں کیں اور اپنی ماں کی عمر کی ایک بیوہ پولیس سے سات سال تک غیر ازدواجی رشتہ قائم رکھا۔ تیلگو شاعر ویمنا انتہائی عیاش تھا اور منگلا ایک شہوت پرست شاعر۔ نوبل انعام یافتہ میجک ماؤنٹین، بلیک سوان، دی ہولی سینر جیسی کتابوں کا مصنف ٹامس مان انتہائی درجے کا عیاش ادیب تھا۔ گراہم گرین کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اس کی جنسی طاقت تخلیقی قوت کا اشاریہ تھی۔ سینتالیس طوائفوں سے اس کے گہرے جنسی تعلقات رہے ہیں۔

خلیل جبران نے عریاں تصویریں اور مجسمہ بنانے کے باوجود اس جنسی عمل سے کیوں حذر کیا جس کے بارے میں میراجی کی رائے یہ ہے کہ قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت و برکت ہے۔ یہ بات فہم سے بالاتر ہے اور خلیل جبران کی جنسی زندگی اب تک ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔

●●

حقانی القاسمی کے مضمون کے بعد خلیل جبران کی دو نظمیں، اس کے بہترین مجموعۂ منظومات "The Prophet" سے ماخوذ، یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔
یہ نظمیں عشق و حسن پر جبران کے خیالات کا مظہر ہیں۔

مترجم: میر گوہر علی خان (حیدرآباد)

مترجم: میر گوہر علی خان

محبت پر ON LOVE

المترا نے پوچھا۔
محبت کے بارے میں کچھ بتاؤ؟
اُس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ مجمع کی طرف نگاہیں دوڑائیں۔ ان سب پر گہری خاموشی طاری تھی۔ گرج دار آواز میں یوں گویا ہوا:

جب محبت تم کو آواز دیتی ہے تو اس پر لبیک کہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی ڈگر مشکل اور راستہ ڈھلوان ہے۔

جب وہ تمہارے لئے پر پھیلا دے تو اس میں سما جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا اندرونی حصہ تمہیں کچھ زخمی کر دے! جب وہ تم سے گویا ہو تو اس کی بات پر یقین کرلو۔

ممکن ہے کہ اس کی کرخت آواز تمہارے خوابوں کے محل کو ڈھا دے۔
جس طرح شمالی ہوائیں چمن کی تباہی کے در پے ہوتی ہیں۔

محبت اگر تمہاری تاج پوشی کرتی ہے تو تم کو سولی پر بھی چڑھا سکتی ہے۔ ایک طرف وہ تمہاری اڑان میں مدد ہے تو دوسری طرف تمہارے پر بھی نوچ سکتی ہے۔

ایک لمبے درخت کی طرح وہ تم کو آسمان کی بلندیوں تک لے جاتی ہے۔ تمہاری ننھی کونپلوں سے ملاقات کرتی ہے تو دوسری طرف زمین کی گہرائیوں میں اترتی ہے۔ تو یہ مت بھولو کہ محبت مضبوطی سے زمین سے جڑی تمہاری جڑوں کو اکھاڑ کر پھینک بھی سکتی ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ محبت جسم کو راحت اور روح کو سکون بخشتی ہے۔

تمہیں اپنے اطراف مکئی کے دانوں کی طرح جمع کرتی ہے۔ پھر تمہیں کوٹ پیس کر باریک دہ بنا کر دیتی ہے۔ ایک چھلنی سے گزارتی ہے۔ یہاں تک کہ تم بن سنور کر دودھ کی طرح سفید رنگ والا آٹا نہ بن جاؤ۔ اس عالم آٹے کی ایک متبرک روٹی بنتی ہے۔ اسے متبرک آگ پر سینکا جاتا ہے۔ پھر وہ متبرک دیوتا کے دسترخوان کی زینت بن جاتی ہے۔

محبت کی یہ ساری ادائیں اس لئے ہیں کہ تم اپنے دل کے راز جان جاؤ۔ ان رازوں کو جاننے کے بعد کائنات کے دل میں اپنی جگہ بنالو۔ تم چاہتے ہو کہ محبت ڈر اور خوف پیدا کرنے کے بجائے تمہیں صرف لذت ہی سے آشنا کرتی رہے تو بہتر ہے کہ تم اپنی برہنگی کو ایک لبادہ کے اندر چھپالو اور محبت کے راستے سے خاموشی کے ساتھ گزر جاؤ۔ اس اجڑی بستی کے طرف جہاں ہنسی ہے بغیر قہقہوں کے۔ گریہ وزاری ہے بغیر آنسوؤں کے۔

محبت تمہیں کچھ نہیں دیتی سوائے اپنے اور نہ کچھ مانگتی ہے سوائے اپنے۔

محبت نہ کسی کو اپناتی ہے نہ اسے اپنایا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ محبت خود محبت کی کفیل ہے۔

جب تم محبت کرو تو یہ مت کہو کہ خدا میرے دل میں ہے۔ یہ کہو کہ میں خدا کے دل میں ہوں۔

یہ مت سوچو کہ تم محبت کو راہ دکھا سکتے ہو۔ محبت اگر تمہیں لائق سمجھتی ہے تو وہ خود تمہیں راہ دکھاتی ہے۔

محبت کوئی خواہشات نہیں رکھتی۔ سوائے اس کے وہ خود ایک خواہش بن جائے۔

جب تم محبت کرتے ہو اور اس کے ساتھ خواہشات بھی رکھتے ہو، ایک بہتے ہوئے چشمہ کی طرح ہو جاؤ جو شب کی ظلمتوں کو اپنا نغمہ سناتا ہے۔

ایک نرم دل اپنے سینے میں رکھو تاکہ دوسروں کا دکھ درد سمجھ سکو۔

راضی خوشی اپنی خواہشات اور خوشیوں کا خون بہاؤ۔

اپنی دانست میں جسے محبت سمجھتے ہو اس کے تیر سے زخمی ہو جاؤ۔ صبح بیدار ہو تو ایک مطمئن دل کے ساتھ آنے والے یوم محبت کے لئے شکریہ ادا کرتے ہوئے۔

دوپہر میں قیلولہ کرتے ہوئے محبت کے راز و نیاز کے بارے میں مراقبہ کرتے رہو۔

اور جب شام کو گھر لوٹو تو اس کی شکرگزاری کے گن گاؤ۔ جب سونے کی تیاری میں ہو تو اپنے دل میں براجمان معشوق کے لئے دعا کرو۔ اس سے تمہارے ہونٹوں پر دل آویز نغمہ ہونا چاہئے۔

●●

مترجم: میر گوہر علی خان

حسن پر ON BEAUTY

ایک شاعر نے کہا، کچھ خوبصورتی کے بارے میں بتایئے۔
اُس کا جواب تھا:
تم حسن کو کہاں تلاش کرو گے؟ اور اس کو کہاں پاؤ گے؟
یہ اس وقت ہی ممکن ہے جب حسن خود تمہارا ہی راستہ اور رہبر بن جائے۔
زخم خوردہ کہتے ہیں۔ خوبصورتی رحم دل اور نرم خو ہے۔
نئی نویلی ماں کی طرح جو شرماتی لجاتی ہم سب کے بیچوں بیچ خراماں خراماں چلتی ہے۔ اپنی آن بان کی جانکاری رکھتے ہوئے۔
جذباتی کہتے ہیں۔ نہیں۔ وہ طاقتور اور دل کو ہلا دینے والی کیفیت ہے جو ہولناک طوفانوں کی طرح ہمارے قدموں تلے پامال ہوتی ہوئی دھرتی اور دوسروں پر سایہ کئے ہوئے آسمان کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔
تھکے ماندے کہتے ہیں حسن ہمارے لئے سکون آمیز سرگوشی ہے۔ وہ ہمارے اندرونی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔
خوبصورتی ہماری خاموشی کا جواب اس طرح دیتی ہے۔ جس طرح گھپ اندھیرے گھبرائی ہوئی دیئے کی لو تھرتھرایا کرتی ہے۔
بے چین انسان کہتے ہیں کہ انہوں نے حسن کی چیخیں پہاڑیوں کے بیچ سُنی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ گھوڑوں کے سُموں کی وحشناک ٹاپ چڑیوں کے پروں کے خوف و ڈر کے مارے پھڑ پھڑاہٹ۔ اور ببر کی دل ہلا دینے والی مسلسل دھاڑیں بھی ان کے کانوں کے پردوں سے ٹکرایا کرتی ہیں۔
شہر کے رات کے چوکیداروں کا یقین ہے کہ صبح صبح مشرق سے جھانکتی ہوئی شفق کے ساتھ حسن کی سواری بھی نکلتی ہے۔
دوپہر میں دھوپ کی تمازت میں کام کرنے والے مزدور اور راستہ چلتے ہوئے مسافروں کا کہنا ہے کہ انہوں نے غروبِ آفتاب کے وقت خوبصورتی کو دھرتی کی کھڑکی سے جھانکتے دیکھا ہے۔
موسم سرما میں برف سے ڈھکی پہاڑیاں یوں گویا ہوتی ہیں کہ حسن موسم بہار میں ہم پر پھول نچھاور کرنے کے لئے آئے گا۔
موسم گرما میں کڑی دھوپ میں کام کرنے والے کسان کہتے ہیں کہ ہم نے خوبصورتی کو خزاں رسیدہ سوکھے پتوں کے ہمراہ رقص کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کے بالوں پر اِدھر اُدھر جمے ہوئے برف کے ننھے ننھے ٹکڑے سفید موتیوں کی طرح لگ رہے تھے۔

حسن کے بارے میں اب تک تم جن خیالات کا اظہار کر چکے ہو وہ تمہارے مطمئن دلوں کا راز نہیں ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ تم نے حسن کی تعریف نہیں کی ہے بلکہ اپنی ان خواہشات کا اظہار کیا ہے جو اب تک پوری نہیں ہو پائی ہیں۔

حسن ایک ''ضرورت'' نہیں بلکہ خود سپردگی کا ایک جذبہ ہے۔ وہ کوئی پیاسے ہونٹ نہیں اور نہ ہی کوئی خالی ہاتھ جو آگے کی طرف پھیلائے گئے ہوں۔ بلکہ وہ ایک گھائل دل اور زخمی روح ہے۔

یہ کوئی پرچھائیں نہیں کہ تم اس کو دیکھ سکو۔ اور نہ ایک گیت ہے جسے تم سن سکو۔ وہ ایک ایسا سایہ ہے جسے تم اپنی بند آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو۔ اور ایسا نغمہ ہے جسے تم اپنے بند کانوں سے سن سکتے ہو۔

وہ درختوں کی چھال کے درمیان بہنے والا گودا بھی نہیں ہے۔ اور نہ کوئی ایسا پر ہے جو کسی کے پنجے میں اٹکا ہوا ہو۔ وہ ایک ایسا چمن ہے جس پر ہمیشہ تازگی چھائی رہتی ہے۔ وہ فرشتوں کا ایک ایسا جھنڈ ہے جو ہمیشہ محوِ پرواز رہتا ہے۔

آرفالیس (ORPHALASE) کے لوگو حسن زندگی ہے۔ ایسی زندگی جو خود اپنا چہرہ اپنے گھونگھٹ کے باہر نکالتی ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ تم خود ہی زندگی ہو۔ اور تم ہی گھونگھٹ۔

خوبصورتی ایک لازوال شئے ہے جو خود اپنا چہرہ شیشے میں بار بار دیکھا کرتی ہے۔ نہیں! تم ہی ایک لازوال شئے اور تم ہی خود ایک شیشہ ہو۔

••

ف۔س۔اعجاز

ایک منظر

اُفق پر کالے بادل ــــــــــ
کالے کالے بادلوں کے درمیاں
بگلا سفید
یوں اچانک جھلملا کر گم ہوا
جیسے تُو
میری اندھیری زندگی کے بیچ میں
آ کر اچانک کھو گیا

کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی

نوٹ: اس کتاب کی پوری تیاری ہو چکی تھی۔ ٹھیک اشاعت کے وقت یہ مضمون ملا۔ چنانچہ آخر میں اضافی طور پر اسے شامل کیا جا رہا ہے۔

ف۔ س۔ اعجاز

کرشن چندر کی شادی دسمبر ۹ ۱۹۳۹ء کو جے گوپال کپور، منیجر نیشنل بینک لاہور کی اکلوتی بیٹی ودیاوتی سے ہوئی۔ ایک سال قبل ان کی منگنی ہوئی تھی۔ ودیاوتی نے شادی کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور بی اے کا امتحان نہیں دے سکیں۔ یہ شادی ان کے گھر والوں کی پسند سے ہوئی تھی۔ کرشن چندر اور ودیاوتی کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ ودیاوتی سے ان کی ذہنی ہم آہنگی اور قلبی رفاقت نہیں تھی۔ ان کی زندگی میں آسودگی نہیں تھی۔ کرشن چندر نے اپنی شادی شدہ زندگی میں کئی معاشقے کیے اور جنسی بے راہ روی کا شکار بھی رہے۔ انھوں نے چند مخصوص عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ خود ان کا اعتراف ہے:

"میں نے محبت کا مفہوم دیر میں سمجھا اور بہت دیر تک بھٹکتا رہا اور بہت سے گناہوں کے داغ میں نے اپنے سینے پر لے لیے اپنے دل کے آئینہ خانے کو بار بار طرح طرح کی صورتوں سے سجایا لیکن کہیں پر مجھے وہ صورت نہ ملی جس کی تلاش میں میں عرصے سے سرگرداں تھا کیوں کہ کسی انسان کا آئینہ اس کی محبت کے چہرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا اس لیے میں اپنے دل کے زخم لیے ہزار وادیوں میں بھٹکا اور سینکڑوں روپہلے لمحوں میں اس ایک لمس کو ڈھونڈتا رہا جسے صرف ایک بار چھو لینے سے ہی میں کندن ہو سکتا تھا۔"

(آئینہ خانے میں۔ افکار اکتوبر ۱۹۶۲ء۔ ص ۲۶)

کرشن چندر نے دو فلمیں بنائیں "سرائے کے باہر" اور "دل کی آواز"۔ دونوں کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کرشن چندر تھے اور ہیرو مہندر ناتھ۔ فلم کی ہیروئین ثمینہ جعفری تھی جو ان کی محبوبہ تھی۔ اس نے ان کے نام کرشن کی مناسبت سے رادھا نام رکھا تھا۔ عادل رشید کے الفاظ میں:

"محبوبہ دل نواز کی دل داریاں انھیں کچھ اور سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ہی نہ دے رہی تھیں۔ وہ اس زمانے اور اس ماحول کے بہت بڑے ہیرو بنے تھے اور روپیہ اس انداز سے اڑا رہے تھے جیسے وہ روپیہ نہیں بلکہ پتنگ اڑا رہے ہوں جیسے وہ کرشن چندر نہیں بلکہ مغل شہنشاہ محمد شاہ ہوں۔"

(میرا ہم دم میرا دوست۔ "شاعر" کرشن چندر نمبر ۱۹۶۷ء)

سلمیٰ صدیقی سے کرشن چندر کی ملاقات ۱۹۵۳ء میں پہلی بار دہلی میں ہوئی۔ یہ ملاقات مجاز نے کرائی تھی۔ ان دنوں سلمیٰ صدیقی علی گڑھ میں پڑھاتی تھیں۔ بطور انشائیہ نگار مشہور ہو چکی تھیں۔ ان کی شادی خورشید عادل منیر سے ہو چکی تھی۔ وہ ایک لڑکے راشد خورشید منیر کی ماں تھیں اور سلمیٰ خورشید منیر کے نام سے لکھا کرتی تھیں۔ کرشن چندر کی تحریریں وہ بے حد پسند کرتی تھیں۔ کرشن چندر سے قربت کے بارے میں انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے والد رشید احمد صدیقی نے انھیں کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ ''ہم وحشی ہیں'' پڑھنے کے لیے دیا تھا اور بے حد تعریف کی تھی۔ سلمیٰ صدیقی ان کی تحریر سے بے حد متاثر تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ ''شمالی ہند کے تقریباً ہزاروں گھر کی لڑکیاں بسم اللہ کے گنبد سے نکلتی تھیں اور کرشن چندر پر ایمان لے آتی تھیں''۔ ایک بار وہ اپنے شوہر کے ساتھ کرشن چندر سے ملی تھیں خورشید عادل منیر نے خود تعارف کروایا تھا۔

۱۹۵۳ء میں وہ پہلی بار سلمیٰ صدیقی سے ملے اور دونوں ایک دوسرے سے عشق کرنے لگے۔ کرشن چندر بار بار دہلی اور علی گڑھ کے چکر لگاتے۔ اس کی تصدیق محمد ہاشم (پبلشر) کے بیان سے ہوتی ہے:

''کرشن جی الٰہ آباد آئے اور مجھ سے کہا عباس حسینی سے ملنا چاہتا ہوں میں نے کہا میں پہلے ان سے وقت لے لوں تب چلیں۔ اور پھر اس دن شام کو کرشن جی عباس بھائی کے گھر گئے اور ایک کتاب ''برف کے پھول'' عباس بھائی کو چھپوانے کے لیے دی اور کہا کہ پرسوں دہلی پہنچ رہا ہوں۔ مجھ کو عباس بھائی نے دہلی بھیجا۔ جب میں دہلی گیا تو سیدھا کرشن جی کے گھر تیس ہزاری پہنچا۔ معلوم ہوا کہ کرشن جی ابھی دہلی نہیں آئے۔ ان کی ماں نے کہا بیٹا وہ الٰہ آباد گئے ہیں۔ کب آتے ہیں معلوم نہیں۔ میں نے معاملہ کی نزاکت سمجھتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ میں خود ہی ایک ہفتہ سے آیا ہوا ہوں' اب وہاں سے جب میں نکلا تو مجھ کو میرے دوست نے کہا کرشن جی کے ٹیلی فون آ چکے ہیں اور وہ ہوٹل میں ہیں اور انھوں نے ہوٹل فون کیا۔ کرشن جی نے کہا کہ فوراً آ جاؤ۔ ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ''بھائی میں علی گڑھ رُک گیا تھا۔ سلمیٰ میرے ساتھ ہے۔ تم نے گھر پر تو نہیں بتایا۔ میں نے کہا نہیں۔ پھر معلوم ہوا کرشن کی پہلی بیوی ودیا ان کو تلاش کر رہی ہیں۔ اور وہ ممبئی بھی نہیں جا سکتے۔''

(انٹرویو محمد ہاشم بتاریخ ۲۷ر اپریل ۱۹۹۱ء بمقام الٰہ آباد)

''شریمتی ودیاوتی نے راقم الحروف کو بتایا کہ کرشن چندر بار بار دہلی اور علی گڑھ کے چکر لگاتے۔ شریمتی ودیاوتی نے بتایا کہ چار بنگلہ کے وسیع بنگلے میں وہ بچوں کے ساتھ تنہا رہتیں اور کرشن چندر کئی کئی دن غائب رہتے۔ کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی کے عشق کا جب انھیں پتہ چلا تو انھوں نے اپنے والد سے شکایت کی۔ جئے کپور صاحب نے کرشن چندر کو سمجھایا کہ ودیاوتی وہاں ممبئی میں اکیلی رہتی ہیں وہ ممبئی واپس ہو جائیں لیکن کرشن چندر نہیں مانے۔ ان کا

کہتا ہے کہ مسز جینے کپور کا انتقال بھی اسی صدمے سے ہوا۔"
(انٹرویو: شریمتی ودیاوتی۔ بمقام ممبئی بتاریخ ۶ رفروری ۱۹۸۱ء)

راقم الحروف کو سلمیٰ صدیقی نے بتایا کہ ان کی کرشن چندر سے شادی ۷رجولائی ۱۹۶۱ء کی شام' نینی تال میں ہوئی۔ نکاح سوئس ہوٹل میں ہوا۔ اس وقت نینی تال کی مسجد کے مولانا نے نکاح پڑھایا۔ گواہوں میں رام پور کے دو دوست مہارانی جہانگیر آباد اور کرشن چندر کے اعتماد کے آدمی محمد کاظم کی موجودگی میں جو رام پور کے رہنے والے تھے اور کسی ایمبیسی میں ڈرائیور تھے نکاح ہوا۔ ان کی خواہش پر کرشن چندر نے اسلامی طریقہ پر نکاح کیا اور مسلمان ہونا قبول کیا۔ اپنا نام وقار ملک رکھ لیا۔

(شخصی ملاقات بتاریخ ۵ رفروری ۱۹۸۱ء بمقام ممبئی)

اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" لکھتے ہیں:

"سلمیٰ صدیقی کی والدہ محترمہ بضد کہ شادی اسلامی طریقہ سے ہوگی کرشن چندر کی شگفتگی کا یہ عالم کہ سلمیٰ کو شریک حیات بنانے کے لیے (وقتی طور پر) مسلمان ہونا قبول کر لیتے ہیں۔ باقاعدہ نکاح ہوتا ہے اکیاون ہزار روپے کا مہر بندھتا ہے (مرنے سے چند دن پہلے اس نکاح نامہ کی نقل کرشن نے سلمیٰ کو اصرار کر کے دی اور کہا حفاظت سے رکھنا)

(حرف آخر: شاعر کرشن چندر نمبر' ۱۹۷۷ء ص ۱۰۴)

اعجاز صدیقی کے بیان سے دو باتوں کا انکشاف ہوتا ہے ایک تو کرشن چندر نے عارضی طور پر مسلمان ہونا قبول کر لیا تھا۔ دوسرے انھوں نے باقاعدہ نکاح کیا تھا۔ لیکن دونوں ہی باتیں ثابت نہیں ہوتیں۔ اس معاملے میں کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی دونوں بھی شاید سنجیدہ نہیں تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ساتھ زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ لیکن ہندوستانی سماج اسے قبول نہیں کرتا۔ جس کا اثر ان کے خاندان پر بھی پڑ سکتا تھا۔ اس لیے نکاح اور مسلمان ہونے کی بات مشہور کر دی گئی۔ سلمیٰ صدیقی نے رحمٰن نیر مدیر بیسویں صدی کو انٹرویو میں بتایا کہ

"یقیناً وہ (کرشن چندر) انسانیت پر یقین رکھتے تھے کسی ازم یا کسی مذہبی روایات کے پابند نہیں تھے لیکن وہ مجھے کسی قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور ادھر میری والدہ کی ضد تھی کہ ہم اسلامی طریقے پر شادی کریں۔ آج میرے نکاح نامے کی ایک نقل میرے اور دوسری میری والدہ کے پاس ہے۔"

("کرشن چندر بیوی اور دوستوں کی نظر میں"
بیسویں صدی۔ کرشن چندر نمبر مئی ۱۹۷۷ء ص۔ ۳۴)

کیا سلمیٰ صدیقی سے شادی کرنے کے لیے کرشن چندر واقعی مسلمان ہوئے تھے؟ کرشن چندر نے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

"میں مذہب اور خدا کا قائل نہیں۔ مذہب کے نام پر بے حد مظالم ہوئے ہیں جن کے خیال سے ہی رونگٹے کھڑے ہو

جاتے ہیں۔ میں تمام مذاہب کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کر چکا ہوں۔
اور اگر خدا سے ملاقات ہوگئی تو پوچھوں گا میاں یہ کیسا دھندا پھیلا رکھا
ہے۔ میں مذہب اور خدا کا قائل نہیں اس لیے میں یہ جانتا ہوں کہ
بعض لوگ میرے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے لیکن میں انھیں
دعوت دیتا ہوں کہ وہ مجھے قائل کر دیں تو میں ان کا پاؤں چھولوں گا یا
پھر وہ خود قائل ہو جائیں اور اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔''

(مشتاق احمد۔ کرشن چندر سے انٹرویو۔
تحقیق و تدقیق۔ ص ۸۵۔۸۶)

''سلمیٰ صدیقی بھی کہتی ہیں'' میں بھی دو چار لفظ اپنے
اور اپنے کرشن جی کے دین و مذہب کے بارے میں کہنا چاہتی
ہوں پہلی بات یہ کہ بنیادی اعتبار سے کرشن جی مکمل طور پر
مارکسسٹ تھے وہ کسی مذہب اور کسی کے بھی خدا کو نہیں مانتے تھے
بلکہ اپنے عقیدہ ہی کو سب کچھ مانتے تھے آخری وقت تک ان کے
عقیدے اور نظریئے میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔''

(سلمیٰ صدیقی۔ شخصیت اور فن۔
آپ بیتی نمبر شمارہ ۷ ستمبر ۱۹۷۸ء ص۔ ۲۵۸)

کرشن چندر کے مسلمان ہونے کی بات صرف سلمیٰ صدیقی کی شادی
کے سلسلے میں سنی گئی اور پوچھی گئی۔ سلمیٰ صدیقی نے اپنی سماجی پوزیشن کے پیش نظر
روایتی انداز کی تنقیدوں سے بچنے کے لیے کرشن چندر کے اسلام قبول کرنے اور
باضابطہ نکاح کرنے کی بات مشہور کی۔ کرشن چندر اور ان کے دوستوں نے بھی
اس کی باضابطہ تصدیق نہیں کی۔ اسلام قبول کرنے اور نکاح کے بارے میں سوال
کرنے پر کرشن چندر اکثر برہم ہو جاتے یا مذاق میں ٹال جاتے۔

رحمٰن نیر مدیر بیسویں صدی لکھتے ہیں:

''ایک بار میں نے کرشن چندر جی سے پوچھا تھا کہ کیا
سلمیٰ بھابھی سے شادی کے وقت انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا او
ران کا نام نکاح کے وقت ''اللہ رکھا'' طے کیا گیا تھا؟ لیکن کرشن
جی نے ایک زوردار قہقہہ لگانے کے بعد کہا تھا۔'' بھائی میرا یہ نام
رکھنے کی تجویز ضرور پیش کی گئی تھی لیکن میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ
چاہے مجھے سلمیٰ ملے یا نہ ملے یہ نام ہرگز نہیں رکھوں گا۔''

(کرشن چندر: بیوی اور دوستوں کی نظر میں'
بیسویں صدی کرشن چندر نمبر مئی ۱۹۷۷ء ص ۳۴)

''کیا انھوں نے باقاعدہ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ سے نکاح کیا
تھا؟ سلمیٰ بھابھی کچھ دیر خاموش رہتی ہیں لیکن جب میں کوئی دوسرا سوال نہیں کرتا
تو وہ کہتی ہیں ہاں کرشن جی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے باقاعدہ
نکاح کیا تھا اور ان کا نام وقار ملک رکھا گیا تھا۔ دراصل ملک لفظ انھیں بہت پسند تھا
اور وقار کے ساتھ ملک کے اضافے کی تجویز انھوں نے ہی رکھی تھی۔''

(ایضاً ص ۳۴)

راقم الحروف کو بھی سلمیٰ صدیقی نے یہی نام بتایا تھا۔ اس کے ثبوت

میں نکاح نامہ دیکھنے کی گذارش کی تو انھوں نے ناگواری کا اظہار کیا اور بتایا کہ نکاح نامہ ان کی والدہ کے پاس محفوظ ہے۔ راقم الحروف جب بیگم رشید احمد صدیقی سے ملا تو انھوں نے نکاح نامہ کی موجودگی سے انکار کیا اور کہا کہ ان کے پاس کوئی نکاح نامہ کی کاپی نہیں ہے۔ سلمیٰ صدیقی نے ان سے بتایا کہ نکاح ہو گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وقار نام انھیں پسند تھا۔ وہ کرشن چندر کو وقار ہی بلاتی تھیں۔ سلمیٰ صدیقی کے ایک اور بیان سے کچھ اور انکشاف ہوتا ہے

''میں نے جھنجھلا کر کہا'' یہ بھی کوئی نام ہوا آخر؟''

کرشن جی کھڑکی کے باہر دھندلائی ہوئی پہاڑیوں کو دیکھتے ہوئے بولے جب میں پونچھ میں چوتھی جماعت میں تھا تو میرے دو دوست تھے ایک کا نام وقار تھا دوسرے کا ملک۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ میں نے پہلی بار غالب کا شعر اس گھر میں سنا تھا۔ عید کی پہلی سیویاں وہیں چکھی تھیں۔ شامی کباب اور بریانی کا ذائقہ وہیں جانا تھا۔ خاصدان سے پان کی گلوری وہیں اٹھائی تھی اور گھر آ کے اپنی ماں جی سے خوب جھگڑا کیا تھا کہ ہمارے گھر میں عید کیوں نہیں منائی جاتی۔''

(فن اور شخصیت'' آپ بیتی نمبر'' شمارہ ۷، ستمبر ۱۹۹ء۔ ص ۲۵۷)

سلمیٰ صدیقی کے دونوں بیانات میں تضاد ہے۔ پہلے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام وقار رکھا گیا جس میں کرشن چندر نے اپنی پسند سے ملک کا اضافہ کیا لیکن بعد کے بیان سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کرشن چندر نے اپنے دونوں دوستوں کے نام جوڑ کر یہ نام رکھا۔ کرشن چندر کی یادداشت پر مبنی دو ناولوں ''میری یادوں کے چنار'' اور ''مٹی کے صنم'' جہاں بچپن کی یادوں کا تذکرہ ہے یہ دونوں نام نہیں ملتے۔

''کرشن چندر کے دوستوں کا رویہ بھی مبہم سا ہے۔ رحمٰن نیر کے ایک سوال کے جواب میں سردار جعفری کہتے ہیں '' یہ سچ ہے کہ کرشن چندر نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ انھوں نے مرنے سے قبل سلمیٰ کو اس کی اجازت بھی دے دی تھی کہ وہ جیسے چاہیں کرشن کی آخری رسومات انجام دے دیں لیکن ہم سلمیٰ کی خاموشی، دکھ اور پریشانی دیکھ کر چپ رہے۔'' جعفری صاحب سے ملاقات کے بعد میں عباس صاحب سے ملتا ہوں لیکن جب میں انھیں کرشن جی کے اسلام قبول کرنے کی بات بتاتا ہوں تو وہ چونک کر کہتے ہیں اچھا کرشن نے اسلام قبول کر لیا تھا؟۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ یہ بات قبول نہیں کرنا چاہتے کہ وہ اس معاملے سے واقف ہیں۔ وہ پھر کہہ رہے ہیں میرے علم میں نہیں تھا۔ پھر وہ مجھ سے پوچھتے ہیں سردار سے ملے؟ جی ہاں وہ اعتراف کرتے ہیں۔ خود سلمیٰ صدیقی نے بھی تصدیق کر دی ہے۔ عباس صاحب کے پاس بیٹھ کر میں راہی معصوم رضا سے ملنے ان کے فلیٹ واقع جینز اسٹینڈ پہنچ جاتا ہوں۔ میں ان سے بھی کرشن جی کے سلسلہ میں یہی بات کرتا ہوں کہ وہ کہتے ہیں اب جب کہ کرشن جی ہمارے درمیان نہیں اخباروں میں یہ بحث نہیں اٹھائی جانی چاہیے۔''

(بیسویں صدی کرشن چندر نمبر مئی ۱۹۷۷ء ص ۳۶)

صرف سلمیٰ صدیقی اور کرشن چندر کے تعلقات کے سلسلے میں کرشن
چندر کے مسلمان ہونے اور دونوں کے نکاح ہونے یا نہ ہونے کی بحث ہوتی
ہے۔ سلمیٰ صدیقی اور کرشن چندر شادی کے سوال پر اکثر برہم ہوجایا کرتے تھے۔
اس شادی کا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں ہے۔ سلمیٰ صدیقی نکاح نامہ کسی کو دکھاتی
ہیں اور نہ اس کی کاپی کہیں شائع کروا کے معترضین کا منہ بند کرتی ہیں۔ کرشن چندر
کے قریبی احباب اس موضوع پر گفتگو کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ اعجاز صدیقی
صاحب نے بھی نکاح نامہ کی کاپی شائع نہیں کی۔ مشتاق احمد لکھتے ہیں:

"اگرچہ کرشن چندر نے سلمیٰ صدیقی کے سوال کو حذف
کرنے کی ہدایت کی تھی اس کے باوجود میں نے اس سوال کو شائع
کردیا۔ مظہر امام کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اس سوال کی اشاعت
سے جز بز تھے۔ رام لال بھی اس انٹرویو کی اشاعت سے ناراض
تھے۔ ممکن ہے اور لوگوں کو بھی غصہ آیا ہوگا جس کا مجھے علم نہیں۔"

مشتاق احمد نے کرشن چندر سے سوال کیا تھا۔

سوال: آپ نے سلمیٰ صدیقی سے کس ایکٹ کے
تحت شادی کی ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب دینے سے میں معذور
ہوں۔ یہ ہرگز ممکن نہیں کہ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں۔
میری شادی سلمیٰ سے کن وجوہ کی بنا پر ہوئی یہ میں ہی جانتا ہوں۔
ویسے میں اس معاملے کو پریس اور عوام کے سامنے لانا نہیں
چاہتا۔ یہ ذاتی معاملہ ہے۔ اگرچہ رشید احمد صدیقی (سلمیٰ صدیقی
کے والد محترم) پرانے رسم ورواج پر سختی سے کاربند ہیں پھر بھی میں
ان کی عزت کرتا ہوں اس لیے کہ وہ بزرگ ہیں اور ان کی ہستی
قابل احترام ہے۔ ہر انسان کا اپنا اپنا خیال ہوتا ہے۔ اور خیال کو
مشکل سے بدلا جاتا ہے۔ آپ میری والدہ ماجدہ کو لیجئے وہ کٹر مذہبی
ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھ کا چھوا ہرگز نہیں کھائیں گی اب آپ اس کو
کیا کرسکتے ہیں اس وقت ان کی عمر ۷۵ سال سے زیادہ ہے۔ ان
کے خیالات کو بدلنا ممکن نہیں دوسری طرف میں مذہبی قیود سے آزا
دہوں۔ ویسے میں تمام اخبارات کا شکرگزار ہوں جنھوں نے مجھ
سے ہر ممکن تعاون کیا اور اسے ایک قابل تحسین فعل قرار دیا۔ یہ
سوال بالکل لغو ہے کہ میں نے سلمیٰ سے شادی کیوں کی؟ آپ بھی
کسی ہندو لڑکی سے شادی کرلیجئے۔ میں روکتا تھوڑا ہی ہوں یہ تو اپنا
ذاتی معاملہ ہے جس میں دخل انداز ہونے کا کسی کو اختیار نہیں"

(مشتاق احمد: کرشن چندر سے انٹرویو، تحقیق وتدقیق ص ۸۱)

یہ بات تو صد فی صد درست ہے کہ یہ کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی کا ذاتی
معاملہ تھا اور اس میں دخل انداز ہونے کا کسی کو اختیار نہیں۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں کہ
تمام اخبارات نے تعاون کیا اور اسے قابل تحسین فعل قرار دیا۔ سلمیٰ صدیقی نے
راقم الحروف کو بتایا کہ کئی دن تک انھیں ٹیلی فون پر دھمکیاں دی جاتی رہیں۔
پروفیسر رشید احمد صدیقی سلمیٰ صدیقی سے سخت ناراض تھے۔ ان پر برہمی کا اتنا

زبردست غلبہ ہوا تھا کہ انھوں نے رسائل کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ نہ ان کا کوئی خط چھاپا جائے اور نہ ان پر نمبر نکالا جائے۔ سلمیٰ صدیقی کی اپنے شوہر سے علیحدگی اور کرشن چندر کے ساتھ تعلقات نے انھیں سخت روحانی اذیت پہنچائی تھی۔ ایک عرصے تک انھوں نے سلمیٰ صدیقی کا سامنا نہیں کیا اور نہ ان کا نام لینا پسند کیا۔

''آل احمد سرور بھی اس اقدام سے سخت ناراض تھے ان کا کہنا تھا کہ یہ لوگ (ترقی پسند) نکاح نہیں کریں گے۔ شادی نہیں کریں گے اور نہ بچوں کے والد کے طور پر اپنا نام لکھوائیں گے۔ اس پر گروپ کا خیال تھا کہ مرد اور عورت دوست کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔''

ودیاوتی (کرشن چندر کی بیوی) کے بیان کے مطابق کرشن چندر ۱۹۶۷۔۶۸ء سے سلمیٰ صدیقی کے ساتھ رہنے لگے۔ انھوں نے کرشن چندر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی اور نہ عدالت گئیں۔ کرشن چندر ان سے قانونی علیحدگی اختیار کیے بغیر سلمیٰ صدیقی کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ اس طرح رہنے پر وہ قانونی چارہ جوئی کر سکتی تھیں اور اس جرم میں کرشن چندر کو جیل بھی ہو سکتی تھی۔ ودیاوتی اور ان کے لڑکے رنجن نے کہا کہ کرشن چندر نے سلمیٰ صدیقی سے شادی نہیں کی اور وہ غیر قانونی طور پر سلمیٰ صدیقی کے ساتھ رہتے تھے سلمیٰ صدیقی کی حیثیت ان کی بیوی جیسی ہرگز نہیں تھی۔ اس کے ثبوت میں ودیاوتی اور رنجن چوپڑہ نے راقم الحروف کو کرشن چندر کی وصیت دکھائی جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

Will

Where as I was married to Smt. Vidyavati Chopra but she has been living seperately from me at B/40 Shri Society Kopri Colony, Thana East for the last many years.

And whereas I have friendly relations with one Smt. Salma Siddiki who in turn has been having tender feeling for me.

And where as I have been following profession of a writer I have been another of............

23rd April, 1974

وصیت کے مطابق شریمتی ودیاوتی کتابوں سے ملنے والی رائلٹی کی 2/3 حصے کی حقدار اور محترمہ سلمیٰ صدیقی 1/3 حصے کی حقدار قرار پائیں۔

سلمیٰ صدیقی کا اس رشتے کے بارے میں یہ موقف تھا کہ:

''کسی عذاب' ثواب' حساب کتاب انعام عتاب او رسود و زیاں کے دائرے میں' میں محصور نہیں ہوں اور ایسا کرنے میں ایسا سوچنے میں بہ حیثیت ایک انسان کے حق بجانب بھی ہوں۔ جانے وہ دن کب آئے گا جب ہم بعض رشتوں کی عظمت اور منصب سے آگہی حاصل کریں گے۔ ہمارا رشتہ تھا اور وہ عقیدہ جیسے دل سے مانا جاتا ہے۔ وہ کرشن جی تھے میں نے جنھیں

بے دلیل مانا بے دلیل چاہا۔"

(شخصیت اور فن: آپ بیتی نمبر ستمبر ۱۹۷۸ء۔ ص ۲۵۷)

سلمیٰ صدیقی کے اس بیان کا ایک ایک لفظ ان کے دل سے نکلا ہوا ہے۔

کرشن چندر کے عشق میں انھوں نے سب کچھ تیاگ دیا۔ ان کے والد رشید احمد صدیقی کوئی گمنام شخصیت نہیں تھے۔ پہلے شوہر کو چھوڑا' مذہب اور سماج کی پرواہ نہیں کی۔ کرشن چندر نے انھیں کوئی قانونی حیثیت نہیں دی۔ سلمیٰ صدیقی نے ان کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ جس وقت وہ کرشن چندر کے ساتھ رہنے کے لیے بمبئی آئیں اس وقت ان کے لڑکے راشد خورشید منیر کی عمر 11 برس تھی۔ کرشن چندر نے بھی سلمیٰ صدیقی سے بے پناہ محبت کی لیکن ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا۔ دونوں گھروں کا خرچ اٹھایا۔ ذمہ داریاں پوری کیں۔ پہلی بیوی کو طلاق نہیں دی' سلمیٰ صدیقی سے شادی نہیں کی۔ وقتی طور پر بھی مذہب تبدیل نہیں کیا۔ کوئی ہندو اپنا مذہب تبدیل کرے تو اس کی شادی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اپنی کتابوں کی رائلٹی میں زیادہ حصہ اپنی بیوی کے نام کیا۔ آخری رسومات کے بارے میں کوئی تحریری وصیت نہیں چھوڑی۔ بلراج ساہنی' ایم سی چھاگلہ اور ن۔ م۔ راشد کی طرح بھی وصیت نہیں کی کہ انھیں مذہبی رسوم کے بغیر الکٹرک بھٹی میں جلا دیا جائے۔ سلمیٰ صدیقی خود نہیں چاہتی تھیں کہ انھیں کرشن چندر سے کوئی اولاد ہو۔ کرشن چندر بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ دو چاہنے والوں کے درمیان بھی بچہ نہیں ہو۔ وہ جہانگیر' نور جہاں اور Duke of Windsor کی مثال دیا کرتے تھے۔ سلمیٰ صدیقی بتاتی ہیں کہ انہیں مکان حاصل کرنے میں تکلیف ہوئی۔ دھمکیاں دی گئیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ دونوں سے ہونے والا بچہ ساری تکلیفیں جھیلے۔

سلمیٰ صدیقی نے ان کی زندگی بدل دی۔ سب کچھ ڈھنگ سے ہونے لگا۔ سلمیٰ صدیقی کے ساتھ جب وہ رہنے لگے نہ ان کی ذاتی کار تھی اور نہ ذاتی بنگلہ' بینک بیلنس بھی نہ تھا اوور ڈرافٹ کا چکر چلا کرتا تھا۔ اوپر سے بیماریاں۔ تین بار دل پر حملہ ہوا اور پیسہ بے تحاشہ خرچ ہوا۔ سلمیٰ صدیقی کی زندگی میں پریشانیاں زیادہ تھیں۔ راقم الحروف کو سلمیٰ صدیقی نے بتایا تھا کہ کرشن چندر نے ان سے کہا تھا کہ "میرے پاس کچھ نہیں ہے ہو سکتا ہے۔ تمھیں جھونپڑے میں رہنا پڑے' انھوں نے بتایا وہ آسائش کا زمانہ ان کے ساتھ سے قبل کا زمانہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ کرشن چندر نے بھی سلمیٰ صدیقی کو بھرپور پیار دیا۔ سلمیٰ صدیقی کے ساتھ مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ روسی ادبا کی یونین کی دعوت پر روس گئے تو وہاں سے انگلینڈ' فرانس' سوئٹزرلینڈ' ہنگری اور لبنان گئے۔ اس طرح گیارہ ماہ بیرونی ممالک کا سفر کیا۔ اپنے رسوخ سے راشد خورشید منیر کو پونا انسٹی ٹیوٹ سے ڈائرکشن اور فوٹو گرافی کا کورس کروایا۔ اپنے اخراجات سے ۱۹۷۶ء میں راشد کی شادی کی جس میں بیگم رشید احمد صدیقی شریک ہوئیں۔ کرشن چندر کو یہ خوف بھی تھا کہ ان کے بعد سلمیٰ صدیقی پریشانیوں میں گرفتار ہوں گی۔ اسلئے مرنے سے پہلے وہ بار بار اس کا اظہار کرتے رہے۔ آخر بار دل کا دورہ پڑا اور دواخانے میں داخل ہوئے تو اپنے دوست کشن لال سے کہا تھا:

"بھائی صاحب اب ہمت نہیں رہی بس کچھ دنوں کی بات ہے" آپ سلمیٰ کا دھیان رکھیے۔ اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔"

(سلمیٰ صدیقی۔ اتم ادھیائے۔ آدھے سفر کی پوری کہانی (ہندی) ص ۴۲)

اس طرح اپنے بیٹے رنجن سے بھی وعدہ لیا تھا۔ بیگم رفیق زکریا سے بھی یہی کہا تھا۔ وہ سلمیٰ صدیقی سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ انھوں نے مرنے سے قبل سلمیٰ صدیقی سے کہا تھا

''مکان نہ چھوڑنا اور کبھی مستقل قیام سے علی گڑھ نہ جانا۔ جس شہر میں میری اور تمہاری عزت نہ ہو وہاں جا کر کیا کروگی۔ کبھی سخت وقت آ پڑا تو پاکستان چلی جانا جہاں میرے چاہنے والے بہت سے لوگ ہیں۔''

(سلمیٰ صدیقی: اتم ادھیائے۔
آدھے سفر کی پوری کہانی (ہندی) ص ۴۲)

کرشن چندر نے علی گڑھ پر پاکستان کو ترجیح دی۔ کرشن چندر کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ سلمیٰ صدیقی کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ آخری دنوں میں انھیں اس کا پچھتاوا بھی تھا۔ انہوں نے بیگم رفیق زکریا سے کہا تھا ''سلمیٰ کا دھیان رکھنا''۔ آخری وقت کہا ''بس اتنا ہی ساتھ تھا۔ مجھے معاف کردو۔ کوئی سکھ تمہیں نہیں دے سکا ویسے میں نے بھرپور زندگی بتائی ہے۔ I have no regret (مجھے کوئی پچھتاوا نہیں) بس تھوڑے سے کام باقی تھے۔ لیکن ایسا بھی کون ہوگا جس نے سارے کام پورے کر لیے ہوں۔ نیچر سے اتنا لڑنا ٹھیک نہیں ہے Now I must surrender''

(سلمیٰ صدیقی۔ اتم ادھیائے۔
آدھے سفر کی پوری کہانی (ہندی) ص ۱۶۔۱۶۳)

اس طرح کرشن اور سلمیٰ کی محبت کی کہانی ختم ہوگئی۔

میں نے یہ ساری تحقیق صداقت کی بازیافت کے لیے کی۔ میرا مقصد کرشن اور سلمیٰ کے رشتے کو بدنام کرنا نہیں تھا۔ ممبئی یونیورسٹی کی ایک ادبی تقریب میں راشد خورشید منیر بھی آئے۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔ لنچ کے وقفے میں افسانہ نگار انور قمر نے راشد خورشید منیر سے کہا ''بیگ صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ سلمیٰ صدیقی صاحبہ اور کرشن چندر جی کی شادی نہیں ہوئی۔ کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ آر۔ کے۔ منیر نے کہا نہیں شادی تو ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے وہ ثبوت دیجیے یا خود بیان دیجیے میں۔ اسے شامل کرلوں گا۔ سارے ترقی پسند مجھ سے خفا ہیں۔ سچائی سامنے آجائے گی تو میں بھی خود کو Guilty محسوس نہیں کروں گا۔'' آر۔ کے۔ منیر نے وعدہ کیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ شادی اور Relationship خالص ذاتی معاملہ ہے۔ دونوں چاہنے والوں کی مرضی کی بات ہے کہ وہ جس طرح چاہے تعلقات رکھیں اور من پسند زندگی گزاریں۔ ذاتی طور پر میں سلمیٰ صدیقی صاحبہ کے اس موقف سے اتفاق کرتا ہوں جس کا اظہار انہوں نے فن اور شخصیت کے آپ بیتی نمبر ستمبر ۸۔۱۹۷۷ء میں کیا اور جسے میں نے پچھلے صفحات میں درج کیا ہے۔ عشق کرنے کے لیے کسی جواز اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ آر۔ کے منیر کے انتقال کے بعد سلمیٰ صدیقی ممبئی میں تنہا زندگی گزار رہی ہیں۔ کرشن چندر کے ساتھ انھوں نے جتنا بھی وقت گزارا وہی ان کا قیمتی سرمایہ ہے۔

مصنف کے مختصر کوائف

ف۔ س۔ اعجاز کی پیدائش اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق 2 مئی 1948 کو دہلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم فتحپوری مسلم ہائی اسکول دہلی میں ہوئی۔ میٹریکلیشن 1964 میں پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول کلکتہ سے کیا۔ پری یونیورسٹی 1966 میں اور بی اے 1969 میں سینٹ زیویرس کالج کلکتہ سے کیا۔ وکالت (LLB) کلکتہ یونیورسٹی سے 1972 میں بوجوہ آخری سال میں چھوڑ دی۔

وہ ایک شاعر، افسانہ نویس، تنقید نگار اور مترجم کے علاوہ سفرنامہ نگار اور صحافی ہیں۔ ان کی کتابوں کی تعداد 20 ہے۔ جن میں غزلوں اور نظموں پر مشتمل چھ اردو مجموعے، ایک افسانوی مجموعہ ایک مجموعۂ غزلیات ہندی میں، دو نثری کتابیں ''اسلامی تصوف اور صوفی'' اور ''ازدواجی سکھ'' تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''موقف''۔ علامہ نیاز فتحپوری کا مونوگراف، دو سفرنامے ''یوروپ کا سفرنامہ'' اور ''سیریا میں دس روز'' شامل ہیں۔ ترجمہ نگاری کی حیثیت سے انھوں نے خواب اور نیند سے متعلق ایک انگریزی نفسیاتی کتاب (The Secrets of Dreams) کا ترجمہ ''خوابوں کے اسرار'' کے عنوان سے کیا جس میں ان کا طبعزاد تحقیقی مقالہ ''ادب میں خواب کے اجزا'' شامل ہے۔ اس کے علاوہ نیتا جی سبھاش چندر بوس کی سوانح حیات جو اُن کے بھتیجے سسر کمار بوس نے انگریزی میں "The Flaming Sword Forever Unsheethed" کے عنوان سے لکھی اس کا اردو ترجمہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے لئے کیا۔ ''منعکس'' کتاب میں انھوں نے مختلف ممالک کی انگریزی سے 94 بہترین نظموں کا ترجمہ پیش کیا۔ 2006 میں ساہتیہ اکاڈمی کے لئے رمنیکا گپتا کے مرتبہ دلت افسانوں کے مجموعے کا ہندی سے اردو میں ترجمہ ''منتخب دلت کہانیاں'' کے عنوان سے پیش کیا جو 450 صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو زبان میں دلت کہانیوں کا یہ واحد جامع کتابی حوالہ ہے۔ تازہ ترین پیشکش ''ادیبوں کی حیات معاشقہ'' کا کتابی ایڈیشن اور مجموعۂ غزلیات ''چاند پردیا'' ہیں۔

2012 میں ف۔ س۔ اعجاز کا افسانوی مجموعہ ''پلوٹو کی موت'' شائع ہوا۔ 2009 میں سیر نگر جی نے اُن کی نظموں کا انگریزی میں "A Fairy In

"The Goblet" کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے جس کا پیش لفظ گلزار صاحب نے تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تین سو سے زائد کتابوں پر تبصرے اور کئی فیچر لکھے ہیں۔ اُن کے مضامین ہندوستان، پاکستان، برطانیہ کے معتبر رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔

ف۔س۔ اعجاز ایک سرگرم ادبی صحافی ہیں۔ ان کی ادارت میں 29 سال سے ''ماہنامہ انشاء'' پابندی سے کلکتہ سے شائع ہوتا ہے جس کے اب تک 22 خاص نمبر بھی منظر عام پر آئے ہیں جن میں احمد سعید ملیح آبادی نمبر، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نمبر، ادیبوں کی حیات معاشقہ، قمر رئیس نمبر، نیاز فتحپوری نمبر، اسکنڈے نیو یائی ادب نمبر، کلکتے کا عصری ادب نمبر، نثار احمد فاروقی نمبر، گوپی چند نارنگ نمبر، گلزار نمبر، جلال الدین رومی نمبر، گفتنی نمبر، (انشاء کے 23 سال کے منتخب اداریے)' مجوزہ خصوصی شمارہ ''سلور جبلی۔ٹیگور نمبر'' اور ''ایک شمارہ مکتوبات'' شامل ہیں۔

معروف نقاد و محقق ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط (مہاراشٹر) نے ف۔س۔ اعجاز کی حیات اور کارناموں پر ایک وقیع کتاب ''ف۔س۔ اعجاز، ہشت پہلو فن کار'' شائع کی ہے۔

ف۔س۔ اعجاز کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ترجمہ (2011) 'مغربی بنگال، یو۔پی، بہار اردو اکیڈمیوں اور آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ کے کئی ایوارڈوں کے علاوہ انتر راشٹریہ میتھلی سمیلن دہلی، (برائے اردو زبان 2007)۔ ''لوک سبھا ستانا ایوارڈ'' کلکتہ برائے اردو شاعری و خدمات اردو بوسیلہ ماہنامہ انشاء اور ''روزنامہ اخبار مشرق ایوارڈ'' حاصل ہو چکے ہیں۔ ایک ایوارڈ انشاء کے ''عالمی اردو افسانے نمبر'' پر ڈنمارک سے مہاجر ایشیائیوں کی انجمن سے ملا۔ وہ مشاعروں اور کانفرنسوں کے سلسلے میں روس، ناروے، ڈنمارک، لندن، پیرس، دبئی، سعودی عرب، شام، قطر، موریشیس اور امریکہ کا سفر کر چکے ہیں۔

ان کی آئندہ کتابوں میں دو شعری مجموعے' مضامین کے دو مجموعے اور افسانوں کا ایک مجموعہ شامل ہیں۔

Adeebon Ki Hayat-e-Muasheqa 2nd Edition, revised and updated, 2014

Connoiseurs have been keenly awaiting the 2nd edition of "Adeebon Ki Hayat-e-Muasheqa" (Love life of the litterateurs) compiled by Fay Seen Ejaz , author of 19 books , editor "Mahnama Insha" internationally recognised Urdu literary and cultural magazine since last 29 years.

Synopsis of the work :

Many articles in the compilation seem to visualize romances of prominent classical and modern writers but the core of the contents demands their categorization as biographical research and psychoanalysis of those geniuses. Hence , the study of their affairs becomes the study of human nature.That's why Gurbachan Chandan, a veteran Urdu critic and journalist while defininig "Adeebon Ki Hayat-e-Muasheqa" as love with life itself , had written "Upon Cupid (the god of love) I swear that a miracle has been compiled by Fay Seen Ejaz for the lovers of literature".

Not only the 720 page book contains articles written by authentic scholars (mostly by Ejaz himself) on nearly 75 eminent poets, writers and thinkers but also several theoretical essays are there to help formulate intellectual views about the concepts of 'beauty' and 'love'. A bouquet of Shakespeare's love quotes and love poetry of selected poets is yet another feature. More surprising is that no sensation or scandal has been given way to the book. Everything has been discussed on academic level. Contributors have rather narrated the impact and influence of the affairs of the writers on their mind and creativity *vis-a-vis* their individual and social persona. This novel approach is apt to change the outlook and pursuit of romantic literature.

Articles deal at large on the following writers:

Bhartrihari, Mir Taqi Mir, Momin, Ghalib, Iqbal, Shibli Nomani, Fani Budayuni, Akhtar Sheerani, Majaz Lucknowi,Munshi Premchand , Manto, Jigar Moradabadi,Shaad Arifi, Md. Ali Jinnah,M.K.Gandhi, Nehru, Nelson Mandela,Firaq Gorakhpuri, Sagher Nizami, Bengali poets Chandi Das, Rabindranath Tagore, Kazi Nazrul Islam, Michel Madhusudan Dutt, Sarat Chandra Chatterjee, Samaresh Basu, Telugu writer Chalam, Dagh Dehlavi, Shakespeare, Edgar Allen Poe, H.G.Wells, Pushkin, Oscar Wilde, Charles Boudelier, P.B.Shelley, Arthur Schohpenhaur,Jean Jaques Rosseau,Maxim Gorky,Carl Gustav Jung,Henrik Ibsen,Faiz Ahmed Faiz,Jan Nisar Akhtar, Sahir Ludhianvi, Amrita Pritam, Sahir Hoshiarpuri, Charles Dickens,Dostoeovsky,Kahlil Gbran, Tolstoy, Spainish Arabic poetesses Wallada and Hafsa and many Mughal writer princes and princesses.

There are confession articles by Balraj Verma, Khalid Sohail,M.M.Rajinder, Agha Jani Kashmiri, Qateel Shifai, Rashmi Badshah, Iqbal Mateen, Josh Malihabadi and Musharraf Alam Zauqi etc.